علی مہدی رضوی

موت سے کہہ دو جواہر لال مر سکتا نہیں

آج پھر دلی ترا بدلا ہوا انداز ہے
درہم و برہم نشاطِ محفلِ صد ناز ہے
زندگی ویران ہے ٹوٹا ہوا ہر ساز ہے
کس کے غم میں ذرہ ذرہ گوش بر آواز ہے

دوپہر میں موت آئی کس کے استقبال کو
کھو دیا خاکِ وطن تو نے جواہر لال کو

کہہ رہے ہیں چاہنے والوں کے آنسو زندہ باد
غنچۂ گل میں بسی ہے تیری خوشبو زندہ باد
تو نے سلجھائے ہیں دھرتی ماں کے گیسو زندہ باد
مرنے والے اے جواہر لال نہرو زندہ باد

غم کی ڈھارس بے سہاروں کے سہارے زندہ باد
زندہ باد اے دھرتی ماتا کے دلارے زندہ باد

کتنے ہی خطرے ہوں لیکن مرد ڈر سکتا نہیں
منتشر ہونے پہ شیرازہ بکھر سکتا نہیں
ناخدا کیا ڈوب جانے پر ابھر سکتا نہیں
موت سے کہہ دو جواہر لال مر سکتا نہیں

روحِ بیداری کی خاطر سو گیا آرام سے
قوم زندہ ہو گئی جس کے امر پیغام سے

پھیکا پھیکا سا ہے رنگِ داستاں تیرے بغیر
اب بھٹکتا پھر رہا ہے کارواں تیرے بغیر
رو رہا ہے مے کدہ پیرِ مغاں تیرے بغیر
بجھ گیا جیسے دلِ ہندوستاں تیرے بغیر

صلح کا دل ابنِ عالم کی جوانی لے گیا
کچھ نہ لے جانے پہ روحِ زندگانی لے گیا

اپنے ماتھے کا پسینہ دے دیا مزدور کو
اپنی آنکھوں کی بصارت دیدۂ کم نور کو
اپنا استقلال بخشا ہند کے دستور کو
کس خوشی سے دے دیا دل سینۂ جمہور کو

شمع سی تھی گل ہوئی اس انجمن کے واسطے
خاک میں تو مل گیا خاکِ وطن کے واسطے

آج کل دہلی (جواہر لال نہرو نمبر)
نومبر ۶۴ء



ایک آدی باسی لڑکا کرگھا چلا رہا ہے

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل سالنامہ

دہلی

افسانہ نمبر

سالانہ چندہ:۔
ہندوستان میں:۔ سات رُپے
پاکستان میں:۔ سات رُپے (پاک)
غیر ممالک سے:۔ ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ:۔
ہندوستان میں:۔ ۶۰ پیسے
پاکستان میں:۔ ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے:۔ ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ گورنمنٹ

ترتیب

سرورق:۔ ایک کتھک رقاصہ
...ے کی پشت پر:۔ پرائم منسٹر ہاؤس۔ جسے ایک قومی یادگار بنا دیا گیا ہے

جلد ۲۴ - نمبر ۱

شراون شک سمت ۱۸۸۶
اگست ۱۹۶۴ء

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
...ل مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

ملاحظات

پنڈت جواہرلال نہرو کے انتقال کے بعد ملک پر جو افسردگی چھائی تھی اس کے آثار گو ابھی باقی ہیں لیکن یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ ان کے جانشینوں نے ان کے نقشِ قدم پر چل کر دنیا پر ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان کی یک جہتی بے مثال ہے اور وہ اتحاد و آشتی کی راہ پر چلتا رہے گا۔

اردو کے ہمہ جہت ادیب اور شاعر ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد افق کی صد سالہ برسی دلی میں منائی جانے والی ہے۔ افق مرحوم بڑے طباع شاعر، قابل مترجم اور اچھے نثر نگار تھے۔ ان کی نظمیں آج سے ساٹھ ستر برس پہلے کورس میں شامل تھیں۔ راماین، مہابھارت اور ٹاڈ راجستھان کے ترجمے آج تک مقبولِ عوام ہیں۔ اس تقریب کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل ہو چکی ہے جس کے صدر جناب گوپی ناتھ امن اور اراکین میں افق صاحب کے صاحبزادے جناب منوّر لکھنوی بھی شامل ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ تقریب حسن و خوبی سے سرانجام ہوگی اور افق صاحب کے غیر مطبوعہ کلام کو شائع کرے گی۔

مصر اور یورپ میں چھ سال کے قیام کے بعد اردو کے مشہور ادیب جناب ملک رام صاحب دلی تشریف لے آئے ہیں۔ ان کے ورودِ مسعود پر ادارہ ان کی خدمت میں ہدیۂ خوش آمدید پیش کرتا ہے اور متوقع ہے کہ 'آج کل' پر ان کی سابقہ نوازشات کا سلسلہ جاری رہے گا۔

یہ خبر نہایت اندوہ ناک ہے کہ پاکستان میں حال ہی میں دو نامور ادیبوں کا انتقال ہو گیا۔ افسوس کہ مولانا صلاح الدین احمد اور الحاج مولانا حامد حسن قادری اس عالمِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

مولانا صلاح الدین احمد نے اردو زبان و ادب کی بہت خدمت کی۔ انھوں نے پنجاب اکادمی قائم کی اور بعد میں اردو فاؤنڈیشن کی طرح ڈالی۔ جس کا نصب العین اردو کی کلاسکی کتابیں شائع کرنا تھا۔ مولانا نے زندگی میں سیکڑوں بلند پایہ مضامین لکھے۔ امید کی جاتی ہے کہ ان کے مضامین کا مجموعہ جسے ڈاکٹر وزیر آغا مرتب کر رہے تھے 'صریرِ خامہ' کے نام سے شائع ہوگا۔ مولانا صلاح الدین احمد نے اپنا مکان، ادبی دنیا کا سارا اثاثہ اور ذاتی لائبریری اردو فاؤنڈیشن کی تحویل میں دے دی تھی۔ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوں گے۔

پروفیسر حامد حسن قادری اردو کے مشہور ادیب، مشہور نقاد اور مشہور استاد تھے۔ آپ ۱۸۸۷ء میں بچھراؤں ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ ایک مدت دراز تک سینٹ جانس کالج آگرہ میں استاد رہے۔ آپ کو اردو، فارسی اور عربی پر یکساں عبور تھا۔ موصوف چالیس کے قریب کتابوں کے مصنف ہیں جن میں داستانِ تاریخِ اردو، نقد و نظر، کمالِ داغ، انتخابِ مومن اور تاریخِ مرثیہ گوئی کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ اپنے بچوں کے پاس کراچی چلے گئے تھے اور وہیں آپ کا انتقال ہوا۔

تاریخ ہائے وفات

منجانب غم زدہ تمنا بجنوری
۱۹۶۴ء

قطعہ تاریخ وفات جانگزا
۱۹۶۴ء

حاکم عالی جاہ پنڈت جواہر لعل نہرو آنجہانی
۱۳۷۱ ف
وزیر اعظم ملک ہند

کہ بعارضۂ ازانواع قلب
۱۳۷۱ ف
بتاریخ مخالف
۱۹۶۴ء
موسومہ بست و ہفت منسوب ز ماہ مئی
۱۳۷۱ ف

سن دگرگوں یک ہزار نہ صد و شصت و چار عیسوی
۱۹۶۴ء
بروز چہارشنبہ بوقت ساعت دو

انتقال فرمود

غم باندازۂ نہرو
۱۳۷۱ ف

تمنا گفت تاریخش کہ ہیہات
جواہر لعل نہرو رفت و بگزشت
۲۰۲۱ بکرمی

•

سید مسعود حسن لکھم پور

تیرے سینے پر مہکتا تھا گل شاداب امن
ذات سے تیری تھی روشن محفل ارباب امن

ایک مدت سے تھا ملک ایشیا بیتاب امن
تو نے چھڑکا سوختہ جانوں کے دل پر آب امن

صرف کر دی صلح کی کوشش میں ساری زندگی
محو ہے خواب عدم میں کر کے پورا خواب امن

تیری ذات نیک تھی بحر سیاست کا صدف
قلب میں تیرے تھا پنہاں گوہر نایاب امن

دیکھ کر دور خزاں کو سب عنادل تھے خموش
تو نے چھیڑا بوستاں میں نغمۂ مضراب امن

مل گیا مسعود کو یہ مصرعۂ سال وفات
ہو گئے رخصت جواہر لال نہرو باب امن
۱۹۶۴ء

•

[...]ام احمد اسد

کہاں سے آئے زمانے کو اب قرار اے دل
دکھائی دیتے ہیں سب لوگ سوگوار اے دل

اسد نے ایسی مصیبت کی ضبط کی تاریخ
کنار ہند سے رخصت ہوئی بہار اے دل
۱۹۶۴ء

•

حامد بہاکادی

پنڈت نہرو سے

سکوت کیسا ہے ان لبوں پہ
یہ کیوں اداسی سی چھا رہی ہے ؟

یہ لب جنھوں نے
فضائے خاموش کو ترنم عطا کیا ہے
یہ لب جنھوں نے
مسائلِ زندگی کے عقدوں کو وا کیا ہے
خموش کیوں ہیں ؟

یہ لب جنھوں نے
ہمیں تکلم کی حسن کاری
ہمیں تبسم کا راز بخشا
خموش کیوں ہیں ؟

یہ لب جنھوں نے
ہمیں شعورِ وطن پرستی
حیات کا بانکپن دیا ہے
خموش کیوں ہیں ؟
یہ خامشی، زندگی کی قدروں کی ترجماں ہو سکے گی کیسے ؟
یہ خامشی زندگی کی خاطر علامتِ جہد ہو گی کیسے ؟

رحمٰن جامی

بے تاج بادشاہ

(سانیٹ)

ہے دل ہر ایک آج غم سے گھائل
جدائی اس کی سہی نہ جائے
ہے بات دُکھ کی کہی نہ جائے
کہ قوم کی قوم اب ہے بسمل

دلوں پہ اس کی تھی حکمرانی !
وہ ایک بے تاج بادشہ تھا
وہ بے سہاروں کا تھا سہارا
تھا دل ہر ایک اس کی راجدھانی

•

وہ ایک ہندوستاں کا دھن تھا
تھی جس کی عزت دلوں میں سب کے
تھی اک محبت دلوں میں سب کے
وہ ایک مہکا ہوا چمن تھا

نہ مل سکے گی پھر ایسی خوشبو
چمن چمن اب ہے ذکرِ نہرو

•

کرشن چندر

کنواری

میگی ایلیٹ اسی برس کی پُر وقار خاتون ہیں۔ بڑے قاعدے اور قرینے سے سجتی ہیں۔ یعنی اپنی عمر، اپنا مرتبہ، اپنا ماحول دیکھ کر سجتی ہیں۔ ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک، بالوں میں دھیمی سی خوشبو، رخساروں پر پوڈر کا شائبہ سا۔ اتنا ہلکا کہ گالوں پر رنگ معلوم نہ ہو بلکہ جیسے اندرونی جذبے کی چمک معلوم ہو۔ ہر شام ان کی لاغر کلائی کا کنگن بدل جاتا ہے۔ میگی ایلیٹ کے پاس چاندی کے چھ سات کنگن ہیں جنھیں وہ بدل بدل کر پہنتی ہیں۔ کسی مرد کو اپنے قریب دیکھ کر میگی ایلیٹ آج بھی اچانک شرما جاتی ہیں۔ پھر رک کر کچھ عجیب طرح سے شرما کر مسکراتی ہیں جیسے یہ مسکراہٹ دیکھنے والے سے اپنا بدن چرا رہی ہے۔ اس مسکراہٹ کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ مس میگی ایلیٹ اپنی طویل عمر کے باوجود ابھی تک کنواری ہیں۔ ان کے تبسم میں ایک عجیب ان چھوئی سی کیفیت ہے...!

میگی ایلیٹ پیرونٹ کریم بھائی کے خاندان میں ستائیس برس پہلے آگئی تھیں۔ وہ کار زوال کی رہنے والی تھیں۔ پیرونٹ کریم بھائی انھیں لندن سے اپنی سیکرٹری بنا کے لائے تھے۔ اور میگی ایلیٹ نے بمبئی جانا اس لیے پسند کر لیا کہ وہ انگلینڈ میں اپنی محبت کی بازی ہار چکی تھیں۔ وہ اس تکلیف دہ ماحول سے دور بھاگ جانا چاہتی تھیں جہاں انھیں اپنی محرومی کا احساس اسی پالتو کتے کی طرح اپنے پیچھے پیچھے تعاقب کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ لندن چھوڑ کر بمبئی آگئیں۔ مگر سیکرٹری کی حیثیت سے زیادہ دیر تک نہ چل سکیں۔ کیونکہ ان کی محرومی کا احساس نیا نیا تھا۔ اس لیے وہ پیرونٹ کریم بھائی سے ملاقات کرنے کے لیے آنے والے مردوں سے بلا ضرورت تلخی کا سلوک کرتی تھیں۔ پیرونٹ کریم بھائی نے انھیں سیکرٹری کے عہدے سے الگ کر دیا۔ مگر نرم دل کے آدمی تھے اس لیے انھوں نے میگی ایلیٹ کو مسز کریم بھائی کی سیکرٹری بنا دیا۔

کئی برس میگی ایلیٹ مسز کریم بھائی کی سیکرٹری رہیں۔ جب مسز کریم بھائی کی وفات ہو گئی تو انھیں مسز کریم بھائی کے بچوں کی گورنس بنا دیا گیا۔ پیرونٹ کریم بھائی مر گئے۔ بچے جوان ہو گئے۔ لڑکیوں کی شادی ہو گئی وہ خاندان سے باہر چلی گئیں۔ مگر میگی ایلیٹ خاندان کے اندر ہی رہیں۔ اب وہ پیرونٹ کریم بھائی کے سب سے بڑے لڑکے ارشاد کریم بھائی کی بیوی سکینہ کو انگریزی پڑھانے اور مغربی آداب سکھانے پر مامور تھیں۔ اور ان دنوں پیرونٹ کریم بھائی کے خاندان کے ساتھ بمبئی سے مسوری آئی ہوئی تھیں۔ کیونکہ گرمیوں میں پیرونٹ مرحوم کا سارا خاندان مسوری آتا تھا۔ ڈفل ڈوک کے مشہور پہاڑوں والی گھاٹی پر دو منزلہ کریم کاٹیج انگریزی گھاس والے لان اور انگریزی پھولوں والے تختوں اور سلیٹی بجری والی روشوں اور سکینہ کریم بھائی کی اونچی سوسائٹی والی پارٹیوں کی وجہ سے بے حد مشہور تھا۔ جی۔سی کلب کی رکنیت مشکل نہ تھی مگر سکینہ کریم بھائی کی دعوتوں میں بلایا جانا بہت مشکل تھا اور اس کے لیے بڑی تگ و دو کرنا پڑتی تھی۔ میں چونکہ تاش کا عمدہ کھلاڑی ہوں اور سکینہ کو برج سے عشق ہے، اس لیے میں اپنی دو ہزار روپے ماہوار کی قلیل آمدنی کے باوجود

کریم کاٹیج کی دعوتوں میں بلایا جانے لگا۔ پھر اسی تاش کے چسکے کے طفیل سکینہ مجھے سہ پہر کی چائے میں بھی بلانے لگی۔ ہوتے ہوتے میرے دن کا بیشتر حصہ کریم کاٹیج میں گزرنے لگا اور سکینہ کی لڑکی عائشہ مجھے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ دیکھتی رہے، کیا ہرج ہے۔ اوّل تو سکینہ خود اس قدر سمجھدار ہے کہ اپنی سب سے بڑی لڑکی کو کبھی اپنی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ پھر مس ایلیٹ اس قدر محتاط رہتی ہیں۔ پھر میں خود اس قدر ڈرپوک ہوں کہ کبھی کسی لڑکی کو لے کر بھاگ نہیں سکتا۔ اس لیے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھنا، انگلیوں کو چھو لینا، عائشہ کے ہات سے چائے کا پیالہ لے لینا، اس کی بڑھائی ہوئی پلیٹ سے مورین کریم کھا لینا اور کبھی کبھی تاش کے دوران میں ذرا مخصوص لہجے میں اُسے 'پارٹنر' کہہ دینا بھی میرے لیے کافی ہے۔ چلئے زندگی میں پارٹنر نہ بنے تاش کے کھیل میں بن گئے! اور یوں غور سے دیکھا جائے تو زندگی کی بازی بھی ایک طرح سے تاش کا کھیل ہے۔ اس میں کبھی ہار ہے، کبھی جیت ہے۔ کبھی پتّے اچھے آتے ہیں کبھی بُرے آتے ہیں۔ کبھی پارٹنر سے جھگڑا ہوتا ہے صلح وصفائی بھی ہوتی ہے۔ حساب کتاب بھی ہوتا ہے۔ اس طرح اپنے پتّے کھیلتے کھیلتے ہم بھول جاتے ہیں کہ ان پتّوں سے باہر بھی کوئی دنیا ہے۔ جہاں گلاب کھلتے ہیں۔ مالی کی بیوی بیمار ہے۔ ایک لکڑ ہارا لکڑیاں لے کر بیچنے کے لیے بازار جا رہا ہے۔ ڈونڈی والوں کے کپڑے پھٹے ہیں۔ آسمان پر سپید بادل گھوم رہے ہیں۔ دیودار کی شاخ میں بلبل نے گھونسلہ بنایا ہے۔ مالی کے بیٹے نے گرچھیا سنبھالا ہے۔ یکایک ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے چنبلی کے پھولوں کی خوشبو فضا میں تیر نے لگتی ہے اور عائشہ تنک کر مجھ سے کہتی ہے — 'کیا سوچ رہے ہو؟ اپنا پتّا جلدی سے چلو۔'

میں گھبرا کر اپنے پتّے دیکھنے لگتا ہوں۔ کیوں کہ تاش کا کھیل کسی کے لیے زیادہ دیر تک رک نہیں سکتا۔ پھر وہ وقت بھی آئے گا۔ جب زندگی کی ساری تاش سمیٹ کر الگ رکھ دی جائے گی۔ تمہاری قسمت کا بادشاہ اور یکّہ بیگم اور غلام سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور تم اس تاش میں سے ایک پتّہ نکال نہ سکو گے۔ کسی کو پارٹنر نہ کہہ سکو گے۔ تمہاری بازی ختم ہوئی اور بس آتی ہی تمہاری بازی تھی ..... اس لیے اپنا پتّا جلدی سے چلو۔

اصل میں جو میں اس طرح سے سوچتا ہوں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک دفعہ محبت کی بازی ہار چکا ہوں۔ دوبارہ زندگی کو داؤ پر لگانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میری طرح سنا ہے مس ایلیٹ بھی اس میدان میں ہار چکی ہیں۔ مگر پھر بھی داؤ لگانے سے باز نہیں آتیں یہ بھی ان کی زندگی سے گہری محبت کا ثبوت ہے۔ ہمیشہ مجھ سے چہل کرتی رہتی ہیں۔ حالانکہ جانتی ہیں، کچھ نہیں ہو سکتا۔ بھلا بتّیس برس کے مرد اور اسّی برس کی عورت کے درمیان کیا ہو سکتا ہے۔ مگر چہل کرنے سے باز نہیں آتیں۔ "پاشا اپنے ماتھے کی لٹ سنبھال لو۔ ورنہ میرا دھیان اپنے پتّوں میں نہیں رہ سکتا۔" "پاشا کہاں دیکھ رہے ہو، کیا دیودار کے اس پیڑ پر تاش کے پتّے لٹکے ہیں؟" — "اب کے میں ضرور جیتوں گی۔ کیوں کہ میرے پتّوں میں ایک پاشا بھی ہے۔" وہ میرے نام کی خاطر بادشاہ کو پاشا کہنے لگی ہیں۔ مس ایلیٹ کے معصوم مذاق سے سبھی محظوظ ہوتے ہیں۔ عائشہ بھی ہنس دیتی ہے۔ پھر میری طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ کر آنکھیں جھکا لیتی ہے۔ وہ جھکی جھکی آنکھیں مجھے اپنے پاس بلاتی ہیں۔ فاصلہ بھی زیادہ نہیں ہے۔ میں دونوں ہات بڑھا کر عائشہ کو اپنے بازوؤں میں لے سکتا ہوں۔ مگر نہیں لے سکتا۔ کیوں کہ تاش کھیلنے والے دوسرے بھی تو ہوتے ہیں۔ ایک طرف عائشہ کی ماں سکینہ بیٹھی ہے۔ دوسری طرف کریم بھائی اسٹیٹ کے منیجر عاقل فاضل بھائی بیٹھے ہیں، جنھوں نے عائشہ کے لیے نیروبی کے ایک کروڑپتی تاجر کا بیٹا ڈھونڈ رکھا ہے۔ زندگی کی تاش کس قدر آسان ہوتی اگر دوسرے کھیلنے والے نہ ہوتے۔ اب تم ان سہمی سہمی نگاہوں سے چھوٹے چھوٹے پتّے میری طرف کیوں پھینکتی ہو عائشہ۔ ان دُگّی تگّیوں سے کیا ہوگا۔ جبکہ یکّہ اور بادشاہ بیگم اور غلام اور نہلے پر دہلا دوسروں کے ہات میں ہیں؟ نو ٹرمپ پارٹنر!

اپنا ہنسی مذاق مس ایلیٹ سے تو چلتا ہی تھا۔ مگر اس کی کیفیت ایک معصوم چہل سے زیادہ نہ تھی۔ البتہ ماسٹر متین احمد کے سلسلے میں مس ایلیٹ زیادہ سنجیدہ نظر آتی تھیں اور دن بدن گہری دلچسپی

وقت دے رہی تھیں۔ ماسٹر متین احمد یہاں مسوری میں آکر تین ماہ پہلے ملازم رکھے گئے تھے۔ بچوں کو پڑھانے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے۔ اسسٹنٹ منیجر فاضل بھائی نے بہت سوچ سمجھ کے متین احمد صاحب کو ماسٹر مقرر کیا تھا۔ کیوں کہ ماسٹر متین احمد خاصے بوڑھے تھے۔ ۷۰ برس کے قریب عمر ہوگی۔ دو بیویاں یکے بعد دیگرے وفات پا چکی تھیں۔ پوتوں پوتیوں والے تھے۔ چھڑی ٹیک کر اور سر جھکا کر اور اپنی گری ہوئی مونچھوں کو اور بھی گرا کر چلتے تھے۔ سرخ و سپید رنگت میں بڑھاپے کا پیلا پن اور بڑھاپے کی جھریاں آگئی تھیں مگر اس عمر میں بھی حوصلہ جوان رکھتے تھے گردوں گیر تخلص کرتے تھے۔ اپنا کلام جو آج تک کہیں نہ چھپا تھا مس ریلیٹ کو ہر روز سناتے تھے۔ مس ریلیٹ ہر چند کہ اردو شاعری میں کوئی استعداد نہ رکھتی تھیں، اب مصرع پہ مصرع اٹھاتی تھیں اور اس کوشش میں رہتی تھیں کہ کسی طرح گرہ بھی لگ جائے۔ حالانکہ اس نیک دل خاتون کی شاعرانہ صلاحیتوں کی معراج ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل سٹار سے آگے نہ بڑھی تھی۔ مگر اب وہ دونوں ماسٹر متین احمد اور مس میگی ریلیٹ کبھی کبھی برآمدے کے کسی کونے میں بیٹھے ہوئے، کبھی کسی لان میں ٹہلتے ہوئے، ڈفل ڈوک کے دیوداروں میں گھومتے ہوئے شاعری پر بحث کرتے رہتے تھے۔ اور بحث کے دوران میں میگی ماسٹر جی کا مفلر ٹھیک کرتی جاتی تھیں ورنہ سردی لگ جانے کا اندیشہ ہے اور سردی میں شعر ٹھٹھر جاتے ہیں۔ کبھی ان کے سر کی ٹوپی کا رخ بدل دیتی تھیں۔ کہ "یوں زیادہ اچھا لگتا ہے۔" کبھی ان کا ہاتھ پکڑ کے ڈوک کے نالے کے پتھروں پہ قدم جما کر چلتی ہوئی نالہ پار کر جاتیں۔ ہر روز شام کو نالہ پار کرنا ضروری تھا۔ مرد کے بازو کا سہارا کتنا اچھا لگتا ہے۔ مرد کی انگلیوں کا مضبوط لمس، جیسے کسی کمزور بیل کو پیڑ مل جائے۔ صحت میں آج بھی میگی ماسٹر جی سے بہتر نظر آتی تھیں۔ مگر نالہ دیکھتے ہی چھ سال کی بچی کی طرح ڈرنے اور کانپنے لگتی تھیں اور اپنے سارے جسم کا بوجھ غریب ماسٹر جی پہ ڈال دیتی تھیں۔ ماسٹر جی بھی ہانپتے کانپتے ہونٹ چباتے دمے کے مریض کی طرح سانس لیتے ہر روز بڑی بہادری سے مس میگی ریلیٹ کو نالہ پار کرا دیتے تھے۔ پھر دم اس قدر پھول جاتا کہ نالے کے اس پار پتھر پہ بیٹھ کر دیر تک منہ سے کچھ نہ بول سکتے۔ وادی کا منظر دیکھتے رہتے۔ اپنے سانس کی دھونکنی ٹھیک کرنے میں انھیں کئی منٹ لگ جاتے۔ مگر وہ خاموشی کے اس لمبے وقفے کو کسی طرح اپنی جسمانی کمزوری پہ محمول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جب دم میں دم آتا تو کہتے: — "یہاں سے وادی کا منظر اس قدر خوب صورت دکھائی دیتا ہے کہ یہاں آتے ہی میں دم بخود ہو جاتا ہوں۔ منہ سے کچھ بول نہیں سکتا۔"

"یہی حالت میری بھی ہوتی ہے۔" میگی بھی اپنی پھولی ہوئی سانس کو قابو میں کرتے ہوئے کہتی — "یہ وادی بالکل تمھاری شاعری کی طرح خوب صورت ہے۔"

بہت دیر تک وہ دونوں چپ رہتے۔ کیونکہ واپسی میں نالے کو پھر پار کرنا ہوتا۔ ماسٹر متین احمد بڑی ناامیدی سے نالے کو دیکھتے اور ان کی ہمت ڈوب ڈوب جاتی اور وہ دل ہی دل میں سوچتے کل سے میں میگی کو ادھر سیر کرنے کے لیے نہیں لاؤں گا۔ مگر میگی کی یہی تو ایک کمزوری تھی۔ نالے کے اس چند گز کے پاٹ میں وہ سب کچھ پا لیتی تھی۔ وہ سب کچھ جو اُسے اس زندگی میں کبھی نہ ملا۔ اس مختصر سے فاصلے میں وہ کسی کی بیوی ہو جاتی، کسی کا سہارا لے لیتی۔ کسی کے کندھے سے سر لگا دیتی۔ کسی کی گہری قربت کا احساس کر لیتی۔ بالکل اس الھڑ کنواری کی طرح ہو جاتی جو کسی خطرے کے سمے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کسی مرد سے لپٹ جاتی ہے۔ نالے کے پار جا کر وہ پھر ایک انگریز عورت ہو جاتی تھی۔ اپنے آپ میں مکمل، مضبوط اور خود مختار۔ مگر نالہ پار کرتے ہوئے کمزوری کے یہ چند لمحے بڑے قیمتی ہوتے تھے۔ اور وہ ہر روز بڑی بے صبری سے ان چند لمحوں کا انتظار کرتی تھی۔

پھر ایک دن اس کی زندگی میں پام آگئی۔ پامیلا تھورات اس کی بمبئی کی سہیلی تھی۔ پامیلا نے بمبئی کے ایک تاجر سے شادی کی تھی۔ چند سال بمبئی میں رہ کر مسٹر تھورات اور ان کی بیوی منگلور چلے گئے تھے چند سال خط و کتابت ہوتی رہی۔ پھر خط و کتابت بند ہو گئی۔ اب بیس بائیس برس کے طویل وقفے کے بعد جب پامیلا تھورات اچانک مسوری میں اسے نظر آگئی تو دونوں سہیلیوں کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ نہ صرف یہ کہ دونوں نے کئی منٹ تک مصافحہ کیا بلکہ آواز میں

لرزش بھی تھی اور آنکھوں میں آنسوؤں کا شبہ تک پیدا ہو گیا تھا۔

پام اس مرحلے میں دو شوہر بھگت چکی تھی۔ وہ بے چارے دونوں مر چکے تھے مگر پام ساٹھ برس کی ہو کر بھی اپنی شوخی و طراری کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔ اپنی فطرت میں پام میگی سے بالکل الگ تھی۔ میگی دبلی تھی تو پام موٹی۔ میگی سنجیدہ تھی تو پام بات بے بات قہقہہ لگانے والی۔ میگی ہلکا سا میک اپ کرتی تھی تو پام بالکل گہرا۔ بالکل جوان عورتوں کا سا میک اپ کرتی تھی۔ اس کی آواز ابھی تک بہت اچھی تھی اور اُسے بہت سے فنی لطیفے یاد تھے۔ نہیں نہیں۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ پہلے شوہر سے ایک لڑکی ہوئی تھی۔ وہ دو سال کی عمر میں چل بسی۔ دوسرا شوہر ایک اینگلو انڈین تھا۔ وہ ہر وقت شراب میں دُھت رہتا تھا اور کبھی کبھی اُسے پیٹتا بھی تھا۔ کبھی کبھی مرد پیٹے تو بڑا مزا آتا ہے۔ پام نے میگی کو سرگوشی میں بتایا۔ کیوں کہ اس کے بعد مرد پر پچھتاوے کا ایک شدید دورہ پڑتا ہے۔ اس میں وہ عورت کو بڑی شدّت سے منانے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس دورے میں بڑی احمقانہ باتیں کرتا ہے۔ روتا ہے۔ ہاتھ جوڑتا ہے۔ پاؤں پڑتا ہے۔ کبھی کبھی اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر نیا فراک تک سلوا دیتا ہے۔ پام کو جب بھی کسی نئے فراک کی ضرورت ہوتی تھی وہ اپنے شوہر کو کسی نہ کسی طرح پیٹنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ شوہر رکھنا عمدہ چیز ہے مگر آہ....
اب تو بڑھاپا آگیا۔ پام اک آہ بھر کے چپ ہو گئی۔

"تم تو بالکل بچّہ ہو۔ بالکل بچّہ! میگی نے بڑی عمر کی بہن کا رشتہ لیا اور پام کی اُلجھی لٹ ٹھیک کرنے لگی۔ "یہ بال کیسے بنا رکھے ہیں...؟" میگی کے لہجے میں ممتا کی لرزش سی آگئی۔ جسے سن کر پام کچھ اور مچل گئی۔ اٹھلا کر بولی:

"اب ہم سے نہیں ہوتا میگی۔"

"تم کہاں ٹھہری ہو؟" میگی نے پام سے پوچھا۔

پہلے تو کلارکس میں ٹھہری تھی۔ ایک گجراتی فیملی کے ہمراہ احمد آباد سے آئی تھی۔ ان لوگوں کو جلد ہی واپس جانا پڑ گیا۔ خاندان میں کوئی موت ہو گئی تھی۔ وہ لوگ سب چلے گئے ہیں۔ مگر ایسی گرمی میں واپس احمد آباد نہیں جا سکتی۔ اس لیے میں ان کی ملازمت سے الگ ہو گئی ہوں۔ اور اب مسز ٹریورز کے چھوٹے سے بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہری ہوں۔ بڑی کمینی عورت ہے۔ ابھی تک دو دو روز کی اُبلی ہوئی پتیوں کی چائے پیتی ہے۔ جیسے یہ مسوری نہ ہو۔ انگلینڈ ہو اور جنگ ابھی تک جاری ہو۔"

میگی پامیلا کو مسز ٹریورز کے بورڈنگ ہاؤس سے کریم کاٹیج میں اٹھا لائی اور اس سے ایسی محبت اور شفقت سے پیش آنے لگی جیسے پام اس کی برابر کی سہیلی نہ ہو۔ کوئی چھوٹی سی بچی ہو۔ میگی پام کے بال بناتی۔ پام کے کپڑے نکالتی۔ اس کے کپڑوں پر استری کرتی۔ اس کو مشورہ دیتی۔ وہ کون سی چیز کھائے، کون سی چیز نہ کھائے۔ کبھی کبھی اُسے ایک سخت گیر ماں کی طرح ڈانٹ بھی دیتی اور پام میگی کی محبت پا کر بے طرح اٹھلانے لگی تھی اور ساٹھ برس کی ہو کر تیس برس کی خاتون کی سی ادائیں دکھانے لگی۔ اور جب دیکھتی کہ میگی کی محبت بہت زور مار رہی ہے تو تتلا تتلا کر باتیں کرنے لگتی!

اب میگی، پام اور ماسٹر جی (ماسٹر متین احمد) کا تگڈم بن گیا تھا۔ تینوں برآمدے کے دوسرے کونے میں الگ لے جا کر بیٹھتے تھے۔ تاش کھیلتے تھے۔ اپنی بیماریوں اور ان کی دواؤں پر مختلف زاویوں سے بحث کرتے تھے اور ہر وقت تین شریر بچوں کی طرح مسرور اور مگن نظر آتے تھے۔ آپس میں ان کی کیا باتیں ہوتی تھیں یہ تو ہم نہیں جان سکے البتہ اتنا ضرور احساس ہونے لگا کہ ان تینوں میں گاڑھی چھن رہی ہے۔ ماسٹر جی جو پہلے صرف میگی پر اپنی پوری توجہ صرف کرتے تھے اب میگی کے اصرار کرنے پر پام پر بھی کسی قدر اپنی توجہ دینے لگے۔ آہستہ آہستہ یوں ہوا کہ تعلقات برابر کے ہو گئے۔ ماسٹر جی اپنی آدھی توجہ میگی اور آدھی توجہ پام کو دیتے تھے اور کسی طرف ڈنڈی نہ مارتے تھے۔ بہت دنوں تک یہ سلسلہ چلا۔ پھر ہوتے ہوتے غیر شعوری طور پر پام کی طرف پلڑا جھکتا چلا گیا۔ کیوں کہ پام ساٹھ برس کی تھی اور میگی اسّی برس کی۔ پام کے چہرے پر جھرّیاں بہت کم تھیں اور پام کسی قدر زندہ دل تھی اور کیسے عمدہ لطیفے سناتی تھی۔ میگی کی روح بلاشبہ پام سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ اس کے جذبے میں سچائی اور شدّت بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر جسم کو جدھر سے

دیکھو بڈیاں سی نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور پام تو بالکل گرم پانی کی بھری ہوئی ربڑ کی بوتل کی طرح آرام دہ معلوم ہوتی ہے۔ اور مسٹر یہ پام پلڑا اپنی طرف جھکتے دیکھ کر غریب ماسٹر کو اور بھی اُلجھانے لگی اور اکساتی لگی۔ اور اپنی سہیلی کی ساری خاطر و مدارات بھول کر اُسے جلانے پر تُل گئی۔

بے حیا پن! میگی نے دل ہی دل میں سوچا۔ پہلے تو میگی نے طرح دی اور بار بار وہ طرح دیتی رہی۔ کبھی نگاہیں پھیر لیتی جیسے اس نے کچھ دیکھا نہ ہو۔ پھر یوں غائب ہو جاتی جیسے اس نے کچھ سنا نہ ہو۔ پھر جب دل خون ہونے لگتا اس وقت بھی یوں ہنس دیتی جیسے کچھ ہوا نہ ہو۔ مگر پلڑا جھکتا ہی گیا۔ اور ہم دیکھتے رہے اور ان تینوں سے دور ہی دور اپنے برج کی میز سے اس دل چسپ ڈرامے کو دیکھتے رہے جو اب اپنی معراج کو پہونچ رہا تھا۔

ایک مہکتی ہوئی تاریخی شام میں جب ہوا کی خنکی بڑھ گئی تھی اور ہم لوگ جی۔سی کلب میں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ عائشہ اور میں کالے سنگ مرمر کے شیروں والے چبوترے پر کھڑے سکینہ اور فاضل بھائی کا انتظار کر رہے تھے، جو اپنے اپنے کمرے میں کپڑے بدلنے گئے ہوئے تھے۔ گئی تو عائشہ بھی تھی مگر کمرے سے جلدی نکل آئی تھی کیونکہ اس طرح سے ہم دونوں کو اکیلے میں ساتھ رہنے کے لیے چند منٹ مل جاتے تھے۔ اس وقت عائشہ ایک کالے شیر کی پیٹھ پر بیٹھی ہوئی تنک مزاجی سے بار بار اپنے دائیں پاؤں کا سینڈل ہلا رہی تھی اور قریب کے مرمریں ستون پر چڑھی ہوئی زرد گلاب والی بیل سے پھولوں کی کچی کلیاں توڑ توڑ کر میرے پاؤں پر پھینک رہی تھی۔ ایک کلی میری پتلون کی موہری میں جا اٹکی اور میں اسے نکالنے کے لیے جو جھکا تو مجھے عائشہ کا سُرخ ہوتا ہوا چہرہ اور اس کے سینے کے تھرتھراتے ہوئے ابھار اپنے بہت قریب نظر آئے۔ کیونکہ عائشہ بہت قریب سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جھکے جھکے اس کی طرف ایک لمحہ کے لیے دیکھا۔ وہ میرے اس قدر قریب تھی کہ میں اس کے سانس کی آنچ اور اس کے حسن کی پگھلتی ہوئی لَو اپنے رخساروں پر محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے گلابی ہونٹ ذرا سے کھل گئے تھے اور بالکل منتظر تھے۔ ایسے میں میں نے سکینہ کو برآمدے کے اندر کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں نے جلدی سے پتلون کی موہری سے زرد گلاب کی کچی کلی کو نکالا اور سیدھا ہو کر اُسے زور سے دور پھینک دیا۔

"بزدل!" عائشہ ناگن کی طرح پھنکاری۔ پھر سکینہ کو آتے دیکھ کر سنبھل گئی۔

میگی اور پام اور ماسٹر جی بھی تینوں باہر جا رہے تھے مگر کلب کو نہیں۔ نالے پر سیر کرنے کے لیے کچھ دنوں سے یہ اکٹھے سیر کرنے کے لیے نالے کو جاتے تھے۔ آج سردی بڑھتی ہوئی دیکھ کر میگی اپنے دبلے چھریرے بدن میں تھرتھری محسوس کر کے کانپ اُٹھی۔ اس نے پام اور ماسٹر جی دونوں کی طرف دیکھ کر کہا:

"ٹھہرو! میں اندر سے اپنا اونی کوٹ پہن کے آتی ہوں...."

"اونی کوٹ موسم گرما کی رت میں؟" پام نے طنز آمیز انداز میں سوال کیا۔

مگر میگی اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دے کر اندر چلی گئی۔

چند لمحوں تک تو پام چپ رہی اور اپنے دونوں کولھوں پر ہات رکھ کر ادھر اُدھر ڈولتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں ایک شریر چمک نمودار ہوئی اور اس نے سر کے اشارے سے ماسٹر متین احمد کو اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔

ماسٹر متین احمد نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا۔ بہت بے چین نظر آئے۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پام کے پیچھے ہو لیے۔ پام نالے کی سمت جا رہی تھی ماسٹر متین احمد کو ساتھ لے کر۔

چند لمحوں میں وہ دونوں نظر سے اوجھل ہو گئے۔ جب نظر سے اوجھل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ماسٹر جی پام کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ پام نے ان کے بازو کا سہارا لے لیا تھا، وہ بازو جو اب تک صرف میگی کے لیے وقف تھا۔ ان کے جانے کے بعد ہی میگی کچھ گنگناتی ہوئی اپنا ہلکا گرے اونی کوٹ پہن کر باہر نکل آئی۔ جب اس نے دیکھا کہ ماسٹر جی اور پام نہیں ہیں تو وہ ایکبارگی ٹھٹھک گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اک دم اس کے کوٹ کی طرح گرے ہو گیا

زیرِ لب ہونٹوں کی گنگناہٹ اک دم رک گئی - اس نے اِدھر دیکھا، اُدھر دیکھا - جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سکینہ نے پوچھا:

" یہ لوگ کہاں ہیں ؟ "

" چلے گئے! " سکینہ نے بے حس لہجے میں کہا -

میگی کی ڈولتی ہوئی پتلیاں بڑی تیزی سے اِدھر اُدھر گھومیں جیسے کوئی پرندہ اچانک زخمی ہو کے تڑپنے لگے - سکینہ ان آنکھوں کی اذیت کی تاب نہ لا سکی - بڑے غصے سے بولی :-

" میگی تمہیں ہوا کیا ہے .... ؟ دیکھتی نہیں ہو - یام تم سے عمر میں کتنی کم ہے ؟ "

میگی نے ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک کر سیدھا سکینہ کی آنکھوں میں دیکھا - پھر بڑی نخوت سے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی :-

" عمر کم ہے تو کیا ہوا .... میری طرح کنواری تو نہیں ہے !! "

پھر مس میگی ایلیٹ عمر اسی سال - ایک عورت، اپنی ایڑی پر گھوم گئی اور ایک ناقابلِ تسخیر غرور سے سر اٹھائے ہوئے برآمدے میں چلی گئیں ـــ واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں ـــ دروازہ بند ہو گیا ہم دیکھتے ہی رہ گئے - یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ ہنسیں ـــ یا روئیں ؟

سکینہ اک دم بہت سنجیدہ ہو گئی تھی - اس نے اپنی آنکھیں ہم سے چرالی تھیں - اور اب تیز تیز قدموں سے آگے چل رہی تھی - ان کے پیچھے پیچھے فاضل بھائی جلدی جلدی سے قدم بڑھانے لگے -

عائشہ نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا -

میں نے گلاب کی بیل سے ایک زرد کلی کو توڑ لیا - اور اسے سونگھتے ہوئے بولا :-

" نوبڈی پارٹنر ! "

جینت نارلیکر ـــ ایک قابلِ فخر ہندوستانی نوجوان

گزشتہ دنوں مشہور و معروف سائنس دان آئن سٹائن کی کششِ ثقل کی تھیوری پر مزید تحقیق کر کے ہندوستان کے ایک نوجوان سائنس دان ڈاکٹر جینت وشنو نارلیکر نے دنیائے سائنس میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے - ڈاکٹر نارلیکر نے جب سے پروفیسر فریڈ ہائل کے اشتراک سے رائل سوسائٹی میں حاضرین کے سامنے کششِ ثقل سے متعلق اپنی نئی تھیوری پیش کی ہے، اپنا نام لندن کے اخبارات میں نمایاں طور سے دیکھنے لگے ہیں اور آج کیمبرج یونیورسٹی کے لئے باعثِ فخر شخصیت ہیں -

۲۵ سالہ ڈاکٹر نارلیکر نے نئی تھیوری پیش کر کے ثابت کر دیا ہے کہ کششِ ثقل کے بارے میں بین الاقوامی شہرت یافتہ سائنس دان آئن سٹائن کی تحقیق مکمل نہیں تھی - نیز وہ اس سلسلے کی آخری کڑی بھی نہیں تھی -

ڈاکٹر موصوف کی پیدائش ۱۹ جولائی ۱۹۳۸ء میں کولہاپور میں ہوئی لیکن ہوش سنبھالنے سے پیشتر ہی وہ اپنے والد کے ساتھ جو آج کل راجستھان پبلک سروس کمیشن کے صدر ہیں، بنارس آ گئے، جہاں ان کا تقرر ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت سے ہو گیا تھا -

ڈاکٹر جینت وشنو نارلیکر نے اپنے والد کی سرپرستی میں علمِ ریاضی کی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۵۷ء میں بنارس یونیورسٹی سے بی - ایس - سی کی ڈگری حاصل کی - اس کے بعد ریاضی، طبیعیات اور اعداد و شمار کے مطالعے کے لئے وہ کیمبرج یونیورسٹی تشریف لے گئے - پہلے وہ فٹز ولیم ہاؤس سے وابستہ رہے - گزشتہ سال انہیں کنگ کالج کا فیلو بنا لیا گیا اور اب وہ وہیں مقیم ہیں -

علی عباس حسینی

وراثت

نصیر اور نسرین کی ملاقات چوبیس برس بعد پالم کے ہوائی اڈے پر ہوئی۔

نصیر اس طویل مدت کے بعد ہندوستان پلٹا تھا۔ وہ وطن سے بھاگا تھا اسی نسرین کو بھلانے کے لئے۔ وہ نہ جانے کتنے ملکوں میں مارا مارا پھرا، اس نے ان گنت تکلیفیں اٹھائیں، سختیاں جھیلیں، اسی نسرین کے ہجر میں۔ اسی غم میں وہ دوسری جنگِ عظیم میں ایک معمولی سپاہی کی طرح بھرتی ہو گیا۔ سیکڑوں بار گولیوں کی بوچھار سے گزرا، کئی بار زخمی ہوا، مرتے مرتے بچا۔ جب آخری بار پاؤں کی ہڈی ٹوٹنے سے ہلکا سا لنگ صحت یاب ہونے پر بھی باقی رہ گیا، تو اسے فوج سے فارغ خطی مل گئی۔ پھر وہ اپنے طور پر ایشیا، افریقہ، جنوبی و شمالی امریکہ، الاسکا، کناڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، انڈونیشیا، ملیشیا میں سیر کرتا رہا۔ کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی تجارتیں بھی کیں، کہیں اپنے فرم کی شاخیں بھی کھولیں، کہیں اپنے کارخانوں کے بنے ہوئے مال کے لئے نئے نئے معاہدے بھی کئے۔ اس لئے کہ نصیر حقیقتاً ہندوستان کے بڑے پونجی پتیوں میں سے تھا۔ بمبئی اور احمدآباد میں اس کی کاٹن ملیں تھیں۔ کانپور میں ایک ٹینری تھی، گورکھپور میں ایک شکر مل، بھدوہی میں قالینوں کا کاروبار، اور کلکتہ میں جوٹ مل۔ اس کی ایک ٹی اسٹیٹ آسام میں بھی اور ایک کرالا میں۔ اس کی غیر حاضری میں یہ سارا کاروبار اس کے اعزاء اور اس کے معتمد ملازمین بڑے سلیقے سے چلاتے رہے۔ اس کے پاس بے انتہا دولت تھی۔ اس کے پاس بہت سے کام تھے۔ اس کے پاس دل بہلانے اور غموں کے بھول جانے کے بڑے ذرائع تھے۔ لیکن اس نے لاکھ چاہا کہ نسرین کا خیال دل سے نکال دے، پر وہ نہ نکلا، نہ نکلا۔ ایک ہمہ نشین کانٹے کی طرح رگِ جاں میں گھسا وہ ہمیشہ کھٹکتا رہا۔

نسرین اس کی محبوبہ و معشوقہ نہ تھی، اس کی سچی عاشق بیوی تھی۔ کیسے پیار اور محبت کے تین مہینے دونوں نے ساتھ گزارے تھے! سچ مچ دن عید تھے اور راتیں شب برات۔ جو دیکھتا یہی کہتا کیسا اچھا جوڑا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر فدا۔ دونوں حسین، دونوں پڑھے لکھے مہذب اور دونوں دولت مند۔ نصیر احمدآباد کے سب سے بڑے تاجر کا اکلوتا بیٹا اور نسرین سیٹھ عبدالکریم کروڑپتی کی واحد چشم و چراغ۔ مگر بے عیب ذات خدا کی۔ نصیر میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ اور وہ بھی اس انوکھے طور پر کرتا تو مہینوں ایک قطرہ نہیں۔ یا جب پینے پر آیا تو پانچ سات دن سوائے شراب کے اور کچھ نہیں۔ وہی کھانا وہی پینا، وہی اوڑھنا وہی بچھونا، وہی زمین، وہی آسمان، وہی عزیز، وہی دوست، وہی معشوق، وہی بیوی! پلنگ اور اس کے ارد گرد کا حصہ ہر طرح کی آلائش سے پُر، ڈاکٹر کھڑے ہیں، نرسیں نگرانی کر رہی ہیں مگر اس دوران میں کوئی چیز سوائے شراب کے حلق سے اترتی ہی نہیں۔ اسے لوگ کہتے تھے "برسٹ" ہونا یعنی خراب نوشی کے خلاف سارے بندھن ٹوٹ جاتے تھے اور مستی و بے خودی کے اس سیلاب میں نصیر کی غیرت، حمیت، شرافت، انسانیت، محبت تک بہہ جاتی تھی اور

وہ ایسی ایسی حرکتیں کر بیٹھتا تھا جن کا اس جیسے آدم کے بارے میں وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

نہ نسرین اس کمزوری سے واقف تھی اور نہ نصیر کے سسر سیٹھ کریم کو اس کی خبر تھی۔ نصیر کے ہوا خواہوں نے انھیں اس کی ہوا تک نہ لگنے دی تھی۔ سیٹھ پابند مذہب دیہاتی ہی نہ تھے بلکہ نئے ڈھنگ کے "بزنس مین" ہونے پر بھی حد درجہ پرانے ڈھنگ کے آدمی۔ وہ بھلا ایسے شرابی کو اپنا داماد کیسے بنالتے؟ خود نسرین کو شراب سے "الرجی" تھی۔ اسے اس کی بو سے قے آتی تھی۔ دور سے دیکھ لینا ہی اس کے دردِ سر کے لئے کافی بہانہ ہوتا تھا کسی مے خانے یا بار کے سامنے سے گزر جانا ہی اس کو مضمحل بنا دیتا تھا۔

ایسی نازک مزاج بیوی پر نصیر نے اچانک "برسٹ" کی آفت ڈھائی۔ وہ ایک شب میں ایک دوست کے ہاں دعوت میں اکیلا ہی گیا۔ نسرین کی ادھر پندرہ بیس دن سے کچھ طبیعت ماندی تھی۔ لیمو چاٹنے، کھٹی چیزیں کھانے کا شوق بڑھ گیا تھا۔ اس رات میں گرانی سر کی وجہ سے شوہر کے ساتھ نہ جا سکی تھی۔ نو ہی بجے سے بستر پر لیٹی نیند بلاتی رہی تھی۔ وہ بڑے ناز نخرے سے آئی۔ سر تین مہینے سے کسی کے بازو اور سینے کو تکیہ بنانے کا عادی ہو گیا تھا، وہ شادی کے بعد اس شب پہلی دفعہ پہلو میں نہ تھا۔ غرض بڑی دقتوں سے گیارہ بجے کے قریب نیند کی دلھن بڑی منتوں، سماجتوں کے بعد خراماں خراماں آئی۔ اور اب وقت تھا بارہ کا کہ دفعتہً نسرین کو محسوس ہوا کہ پورا اسٹاک اس کسی نے منہ پر انڈیل دیا۔ وہ تڑپ کر جاگی۔ دیکھا تو نصیر شراب میں نہایا دو بوتلیں ہاتھ میں لئے اس پر پیار کرنے کو جھکا ہے، محسوس ہوا شوہر نہیں گندگی سے شرابور کوئی بنڈیلا ہے۔ وہ جھڑک کر نصیر کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی گرفت سے نکلی اور تھو تھو کرتی باتھ روم میں بھاگی۔ نصیر نے لڑکھڑاتے ہوئے پیچھا کیا۔ نسرین سنک میں منہ کی کلیاں اگل رہی تھی کہ نصیر نے پیچھے سے آکر اسے دبوچنا چاہا۔

"اب کہاں تڑ لئے گی، میری فری!" نصیر نے نشے میں چور آواز سے کہا۔

نسرین باز کے چنگل میں پھنسی ہوئی کبوتری کی طرح پھڑکی۔

اور اس نے میاں کو پوری قوت سے ڈھکیل دیا۔

نصیر لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور زمین پر گر پڑا۔

وہ بولا۔ "اتنا ام سے لڑتا شا ملتی ہے، تو فر یہ لے! یہ لے!" اور اس نے نسرین کی ٹانگ اس زور سے کھینچی کہ منہ کے بل حمام کے مرمریں فرش پر گرتے ہی اس نے چوٹ لگنے پر ہائے کی تھی کہ "یہ لے" کی ہر لے کے ساتھ منہ پر طمانچے پر طمانچے پڑے۔ پہلے تو وہ تڑپ رہی تھی لیکن طمانچوں نے اسے بت کی طرح ساکت اور بے حرکت بنا دیا۔

نصیر شراب کے نشے میں سمجھا دشمن کو زیر کر لیا۔ دو ہاتھ اور جھاڑ کر گالی دے کر بولا "ام سے لڑتی ہے۔۔۔۔! نکل جا اس گھر سے: نکل، ابھی نکل!"

نسرین خاموشی سے اٹھی اور اس نے بڈ روم میں جا کر باہر نکلنے والے کپڑے پہن لئے۔ وہ اپنا پرس اٹھا کر جا ہی رہی تھی کہ نصیر منہ سے بوتل لگائے باتھ روم سے جھومتا نکلا۔ نسرین کی تیاری دیکھ کر دھاڑا

"اتنا جاہتی ہے، تو جا! ہمیشہ کے لئے جا! میں نے تجھے طلاق دی!"

اور جب وہ اس پر حسرت بھری نظر ڈال کر چلی گئی تو نصیر آدھی بوتل ایک سانس میں خالی کر کے بولا "شلی گئی، شالی شلی گئی!" اور ہنستے ہنستے رونے لگا اور بوتل پہ بوتل خالی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بے ہوش ہو گیا۔

نسرین نے پالم کے ایرڈ روم پر جب نصیر کو ٹیکسی سے اترتے دیکھا تو وہ اسے مشکل سے پہچان سکی تھی۔ بیس برس کا جوان رعنا اب چوالیس برس کے ایک سوکھے سے بوڑھے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ گورا رنگ جھلس گیا تھا، کنپٹیوں کے پاس کے بال سفید ہو گئے تھے اور وہ جس کا ہر قدم مضبوط پڑتا تھا اب ہلکا سا لنگڑانے لگا تھا۔ چہرے پر گہرے نشانات تھے، اور اس کی بڑی بڑی مست آنکھیں پھیکی اور بے آب تھیں۔

چوبیس برس کا زمانہ ایک عمر ہوتا ہے۔ کم سے کم

نسرین کو تو وہ ایک جھٹکا محسوس ہوا۔ وہ سترھویں میں تھی کہ اس کی شادی ہوئی تھی۔ صرف تین مہینے اس نے خوشی، عیش اور جنت کے دیکھے، پھر چوبیس برس کا بے آب وگیاہ صحارا شروع ہو گیا اور دل کی پیاس بجھانے والی ایک بوند بھی نہ ملی۔ یہ پیاس ایسی بھی تھی اس لئے کہ نسرین ان بیویوں میں سے تھی جو زندگی بھر ایک ہی جام سے پی سکتی تھیں اور وہ پیالہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا، ٹوٹ گیا تھا۔ اسے اب بھی نعیر سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اسی رات احمد آباد سے بمبئی چلی گئی تھی۔ اور اس نے سیٹھ عبدالکریم کی کوٹھی میں پہنچتے ہی غصہ اور غم کے زیر اثر باپ سے ساری روداد سنا دی تھی۔ انھوں نے دوسرے ہی دن ایک وکیل کے ذریعہ نعیر کو نسرین کے مہر کا نوٹس بھیج دیا تھا۔ نعیر نے بے عذر ڈیڑھ لاکھ کا دین مہر کا چیک بھیج دیا تھا اور ڈاکٹروں کی اجازت ملتے ہی وہ یورپ چلا گیا تھا اور جہاں تک نسرین کو علم تھا آج وہ پہلی بار وطن کی پاک زمین پر دکھائی دے رہا تھا۔

نسرین کے دل میں جو غم وغصہ کا طوفان اس رات کے واقعہ سے اٹھا تھا وہ کب کا ختم ہو چکا تھا، بس ایک آندھی تھی جس نے تھوڑی دیر رنجشوں کی گرد اڑائی، پھر آنسوؤں کا چھینٹا پڑتے ہی غبار چھٹ گیا۔ دل کا مطلع صاف ہو گیا تھا۔ اس صفائی کا باعث مہر کی بے عذر ادائیگی ہی نہ تھی بلکہ اس میں سب سے بڑا ہاتھ دونوں کی محبت کے پھل منیر کی پیدائش کا تھا۔

نعیر کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اپنی نشانی نسرین کے ہاں چھوڑ گیا تھا اور نہ سوائے چند لوگوں کے سیٹھ نے اس کی کسی کو کانوں کان خبر ہونے دی۔ طلاق کے چھٹے مہینہ جب منیر پیدا ہوا تو نانا نے گویا اولادِ نرینہ پالی تھی۔ اسے آنکھوں کا تارا سمجھا۔ وہی اس کے باپ اور اس کی ماں بلکہ سارے خونی رشتوں کا ذخیرہ بن بیٹھے۔ کسی کو منیر کی پرورش و پرداخت کے سلسلہ میں ایک پیسہ خرچ کرنے کی اجازت نہ دی۔ نسرین تک کو وہ اس معاملے میں رقیبانہ نظر سے دیکھتے تھے وہ اس کے روادار نہ تھے کہ نسرین اپنے پیسے سے منیر کے لئے کوئی قمیص، کوئی نیکر، دودھ کا ڈبہ، کوئی کھلونا یا کسی طرح کی کوئی چیز خرید سکے۔ ایسے میں بھلا وہ اس کی کیسے اجازت دیتے کہ پاجی نعیر کو اس کی اطلاع مل جائے کہ سیٹھ جی کی کوٹھی میں اب بھی کوئی ایسی شے ہے جس پر اس شرابی کا بھی کوئی حق ہے جسے وہ شرعاً اور قانوناً اپنا سکتا ہے اور سیٹھ جی سے چھین لے جا سکتا ہے۔ انھوں نے نواسے کی جگہ اسے اپنا ہی بیٹا کہہ کر لوگوں سے اس کا تعارف کرایا اور نسرین کو بھی "ممی" اور "امی" کی جگہ منیر سے "آپا" ہی کہلوایا۔

خود منیر کو بھی چودھویں سال تک اپنے حقیقی باپ کا نام نہیں معلوم تھا۔ اتفاقاً اسے اس سال جونیر کیمبرج کے امتحان کا فارم بھرنا تھا۔ سیٹھ جی کو مجبوراً منیر کو اس کے باپ کا نام بتانا پڑا۔ مگر نعیر کا نام جس تمہید کے ساتھ انھوں نے منیر پر ظاہر کیا اس نے منیر کے دل میں نعیر کی طرف سے ہمیشہ کے لئے نہ دور ہونے والی نفرت بھر دی۔ سیٹھ جی نے بیٹی اور نواسے کو بڑے اہتمام سے کرسیوں پر بٹھایا۔ پھر منیر کو ایک گمنام شرابی کی کہانی سنائی جو اپنی بیوی پر طرح طرح کے ظلم کرتا تھا، اور جس نے آخر ایک رات کو بارہ بجے شراب کے نشے میں اسے خوب پیٹا اور طلاق دے کر گھر سے نکال دیا اور ایسی حالت میں اسے گھر سے نکالا جب بیچاری کے بطن میں اس پاجی کا تین مہینے کا بچہ بھی تھا۔ پوری کہانی اس ڈرامائی انداز میں کہی گئی اور شوہر کے کردار کی اتنی تاریک تصویر پیش کی گئی کہ چودہ سالہ منیر غصے سے بوٹیاں نوچنے لگا۔

جب اس کی یہ حالت دیکھی تو سیٹھ نے عجیب طرح مسکرا کر کہا "یہ ہیں تمھارے باپ کے کرتوت! اس کا نام ہے نعیر!"

منیر چیخ پڑا "نہیں! نہیں! وہ میرا باپ نہیں! میں ایسے سور آدمی کو اپنا باپ نہیں مان سکتا!" اور وہ نانا کی گود میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

نسرین کے دل پر دو طرح کی چوٹیں لگیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے منہ پر اس کے چہیتے میاں کی ذلت کی گئی۔ نعیر اتنا تو برا ہرگز نہ تھا جتنا بھیانک بنا کر سیٹھ جی نے اسے پیش کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ منیر بجائے اس کے کہ ماں کی گود میں سر ڈال کر

ہوسکتا۔ ناتا کے زانو سے پیشاب رو رہا تھا۔ اس کا بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ وہ منیر کو سیٹھ کی گود سے کھینچ کر دو طمانچے مارے کہ تیرا باپ اتنا گرا ہوا نہیں ہے کہ تو اسے "سور" کہے اور پھر بیٹے کو چھاتی سے لگا کر اس کے اور اپنے آنسوؤں سے ساری دنیا کو جل تھل بنا دے۔ مگر اس نے چودہ سال میں وہ ہمت کھو دی تھی جس سے وہ منیر کو اپنے باپ سے چھینتی یا شوہر کے متعلق اسے جھٹلاتی۔ عورت ہمیشہ مرد کی پشت پناہی کی طالب ہوتی ہے یہ اس کی فطرت ہے۔ نسرین کی زندگی کے دو مردوں میں سے ایک نصیر تھا اور دوسرا سیٹھ۔ نصیر جس کی محبت دل سے نکالے نہ نکلتی تھی، اس کی زندگی سے اس طرح غائب ہوا تھا جیسے جلتے توے سے ٹھنڈے پانی کی بوند۔ اب جو کچھ سہارا تھا وہ سیٹھ کا تھا۔ اس لئے وہ اس رسی کو مضبوط پکڑے تھی۔ اگر یہ بھی ہاتھ سے چھوٹی تو نہ جانے وہ کس کھڈ میں جا کر گر پڑے — اس لئے وہ نصیر کی بُرائی خاموشی سے سنتی رہی اور بیٹے کے دل میں باپ کی طرف سے حقارت و نفرت کے بیج کو سرسبز ہوتے، پودے سے درخت بنتے اور اس میں شاخیں اور پھول نکلتے دیکھتی رہی۔ بے بس عورت! شوہر سزا دے چکا تھا۔ اب اپنا ہی باپ، اپنا ہی بیٹا، اس کے "جست" وکیل بن کر اسے سزا دے رہے تھے۔

سیٹھ کے انتقال کے بعد جب اکیسویں سال منیر نے ناناکے کارخانے اور ان کی دولت پر مالکانہ تصرف شروع کیا تو نسرین کو زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ وہ دل میں اسی پر کڑھتی رہی کہ منیر اس سے بھی زیادہ جائداد اور دولت کا صحیح طور پر حقدار ہونے کے باوجود اس کا دعویدار بننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ اپنے وجود میں باپ کی شرکت نہ چاہتا تھا۔ گویا وہ بن باپ ہی کے پیدا ہو گیا تھا۔ نسرین نے دو ایک بار بیٹے کے دل سے باپ کی نفرت نکالنے کی کوشش کی، لیکن اس پر تو نصیر کے تذکرے ہی سے جیسے بھوت سا سوار ہو جاتا تھا۔ اب کے البتہ جب وہ بیمار ہوئی اور اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا تو اس نے بیٹے کا دل باپ کی طرف سے نرم کرنے میں کچھ کامیابی حاصل کی تھی۔ اسے بے کم و کاست سچے سچے واقعات سُنا دئے تھے۔ اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ اسی شرابی کی یادھی جس نے سیٹھ کے اصرار کے باوجود اسے دوسرے نکاح پر آمادہ نہ ہونے دیا۔ ماں کی زبان سے چند مہینوں کی خوشی و غم سے بھرپور زندگی کا حال سُن کر منیر کے ہاں تھوڑی دیر کے لئے ایک غیر شعوری نرمی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اب چودہ برس کے لڑکے کی جگہ تیئیس برس کا تعلیم یافتہ جوان تھا، وہ انسانی کمزوریوں سے واقف ہو گیا تھا اور اس میں ایک طرح کی رواداری سی آگئی تھی۔ پھر بھی باپ سے نفرت نانا نے اس کے خمیر میں ڈال دی تھی۔ اسے اس نفرت سے محبت تھی۔ پہلی ہی کوشش میں اس نفرت کا دل سے نکل جانا آسان نہ تھا اس لئے گو ماں کی خاطر باہری سطح ٹھنڈی پڑ گئی تھی مگر ہانڈی کے اندر وہی کھولن باقی رہی جو سیٹھ جی کے زمانے میں تھی۔

نسرین بمبئی سے صحت یاب ہو کر اپنے مخصوص ماہر قلبی علاج کو دکھانے دلی آئی تھی۔ آج وہ اس کے سینی ٹوریم سے بالکل ہی تندرست ہو کر نکلی تھی اور ہوائی جہاز سے بمبئی واپس جا رہی تھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ایسے موقع پر اگر نصیر آ جاتا تو باپ بیٹے میں بہ آسانی وہ صلح کرا دیتی۔ اور شاید اس کی اجاڑ زندگی پھر سے آباد ہو جاتی۔ اس نے نئی تعلیم یافتہ ہونے پر بھی سیٹھ جی کی خاطر سے برقعہ نہ چھوڑا تھا۔ اس لئے گو اس نے نصیر کو پہچان لیا، لیکن وہ اسے پہچان نہ سکا۔ نقاب نے اس چہرے پر پردہ ڈال رکھا تھا جس کی تصویر دل کے پردوں پر کھنچی ہوئی تھی۔ نصیر نے اسباب تو قلی کے حوالے کیا اور خود اپنی نشست کے لئے جگہ ڈھونڈنے لگا۔ سبھی صوفے اور کرسیاں بھری تھیں۔ صرف برقعہ پوش نسرین کی بغل میں ایک کرسی خالی دکھائی دی۔ وہ اس پر ایک تھکے ہوئے مسافر جیسی لمبی سانس لے کر بیٹھ گیا۔

وہ آج ہی صبح کلکتہ سے دلی آیا تھا۔ دن بھر اس نے نئے بھارت کی نئی راجدھانی کے دیکھنے میں اپنا وقت صرف کیا تھا۔ جو بیس برس پہلے کی دلی پہچانی نہ جاتی تھی۔ وطن کے یوسف جواہر لال نہرو نے اس زلیخا کو پھر سے جوانی بخش دی تھی۔ بڑھاپے کے جو آثار کہیں کہیں باقی رہ گئے تھے وہ اس کے نکھار کو بڑھاتے تھے۔ انھیں میں وہ قطب مینار بھی تھا جسے اس نے آخری بار

رین کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس سیر سے ایک خاص یاد وابستہ
ں جو نسرین کی کمزوری کی صورت میں ظاہر ہوکر اس کے لئے بہت
شیریں بن گئی تھی۔ وہ نصیر کے ساتھ ہنستی بولتی قطب کے سب سے
نچے حصے تک چڑھ گئی تھی۔ لیکن جیسے ہی اس نے وہاں سے جھانک
نیچے دیکھا تھا وہ کانپنے لگی تھی۔ خوف نے اس میں اس بلا کی
ودری پیدا کر دی تھی کہ وہ تقریباً سات بار مختلف جگہوں پہ
لتی ہوئی نصیر کے سہارے سے نیچے اُتری تھی۔ نصیر نے اس
قت بار بار یہی سوچا تھا کہ قطب مینار کو باقاعدہ تفریح و
برگاہ بنانے کے لئے اس میں اسی طرح کی لفٹ کیوں نہ لگا دی
ئے اور اسی طرح رستوران کیوں نہ کھول دیا جائے جیسا کہ پیرس
ہ آئیفل مینار میں ہے۔ اگر سرکار اس خرچ کے لئے تیار نہ ہو تو
ب پرائیویٹ کمپنی کے ذریعہ یہ ضروری کام کیوں نہ انجام دے
یا جائے۔ لیکن پونا پہنچتے ہی اس کے "بُرسٹ" ہونے نے زندگی
ی تہ و بالا کر دی تھی۔

وہ انہیں خیالات میں ڈوبا برقعہ پوش نسرین کی بغل میں
کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اسے اس مخصوص سنٹ کی خوشبو محسوس
وئی جو نسرین کا دل پسند تھا۔ اس نے گھبرا کر نسرین کی طرف دیکھا۔
رقعہ میں لپٹی ایک سکڑی سکڑائی خاتون نظر آئی۔ وہ اپنے خیالات
جذبات سے پریشان ہو کر کرسی سے اُٹھ کر لوبح کو میدان سے
دا کرنے والی ریلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور مختلف طرح
ی یادوں میں کھو گیا۔

نسرین کے دل میں نیکھے لگے تھے۔ جب نصیر بغل میں آکر
بیٹھا تھا تو وہ کانپنے لگی تھی۔ اب جب کہ نصیر اُٹھ کر ریلنگ کے
س جا کر کھڑا ہو گیا تو اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ آہستہ آہستہ
ل کر نصیر کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اور اس سے گفتگو کا بہانہ
ڈھونڈنے لگی۔ نصیر جو ستاروں سے آنکھیں لڑائے ان کی جھلک
لک میں نسرین کی آنکھوں کے ڈبڈبائے آنسو دیکھ رہا تھا، پھر
سی محبوب خوشبو سے چونکا۔ اس نے پلٹ کر برقعہ پوش کو دیکھا۔
نسرین نے کانپتے ہاتھوں سے نقاب الٹ دی۔ وہی پیارا چہرہ،

گر چوبیس سال کا غم زدہ، وہی غزالی آنکھیں مگر مستی کی جگہ
درد بھرے دو کٹورے، وہی برگ گل ہونٹ مگر اب خزاں دیدہ
مُرجھائی ہوئی پنکھڑیاں۔

نصیر کے جسم میں زلزلہ سا آگیا۔ بوٹی بوٹی کانپی۔ مشکل سے
منہ سے آواز نکلی "نسرین!"

اس نے گھٹی آواز میں جواب دیا "ہاں، وہی تمہاری
لونڈی!"

نصیر بمشکل اپنے کو قابو میں رکھ سکا۔ اس نے ریلنگ
دونوں ہاتھوں سے زور سے پکڑ لی، اور میدان کی طرف رُخ کر کے
کہا "بس یہی ایک آرزو تھی کہ تم سے ایک بار معافی مانگنے کا موقع
مل جائے۔ اسی امید میں آج بمبئی جا رہا تھا اسی کا اقرار کرنے چوبیس
برس بعد وطن آیا ہوں کہ میں نے تمہیں دھوکا دیا، اپنی شرابی نشی
چھپائی اور نشے کی حالت میں تم پر بڑے بڑے ظلم کئے۔ میں
نے اپنے جرموں کی پاداش میں اپنے کو خود کافی سزا دی ہے۔ ہندوستان
سے جاتے ہی چھ مہینے آسٹریا کے ایک کلنک میں پڑا رہا۔
شراب کی لت پر فتح پاکر ہی وہاں سے نکلا۔ اس رات کے بعد
سے آج تک ایک بوند حلق سے نہیں اتاری۔ کتنا دکھ ہوتا ہے
ان لتوں کے چھوڑنے میں اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔
لیکن میں نے ان تکلیفوں کو اپنے جرم کی سزا سمجھ کر مردانہ وار
برداشت کیا۔ پھر بھی زندگی بے کار سی معلوم ہوئی۔ میں فوج
میں بھرتی ہو گیا۔ نہ جانے کتنی بار گولیوں کی بوچھار سے گزرا۔
سوائے ٹانگ ٹوٹنے کے حسب خواہش سزا نہ ملی۔ یہی ہے
موت کا وقت معین ہے!..."

نسرین نے اس کے ہاتھ کو اپنے نازک ہاتھ سے تھپک
تھپک کر کہا "شراب ترک کرنے کے بعد کاش تم نے مجھے اطلاع
دے دی ہوتی! پھر ہماری زندگیاں اس طرح اُجاڑ نہ
گزرتیں!"

نصیر نے تعجب سے پوچھا "کیا تمہیں مجھ سے نفرت
نہیں؟"

اس نے نظریں نیچی کرکے کہا "محبت میں نفرت کی گنجائش نہیں!"

نصیر نے اسے اور بھی گھبرا کر دیکھا "ارے کیا سیٹھ جی نے تمھاری دوسری شادی نہیں کر دی؟"

نسرین نے غرور سے سر اونچا کرکے کہا۔ "انھوں نے شروع میں تو زور دیا، مگر جب ہمارا منیر پیدا ہو گیا تو پھر ہم دونوں اسی کی خدمت و پرورش میں لگ گئے۔"

اس نے کانپتے ہونٹوں سے پوچھا "یہ منیر کون؟"

وہ آہستہ سے بولی "تمھارا بیٹا! وہ تین مہینے کا پیٹ میں تھا جب میں گھر سے نکالی گئی۔"

نصیر نے "اُف اُف!" کہہ کر اپنے ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ "ارے میرا بیٹا تمھاری امانت میں اور مجھے کچھ خبر نہیں۔ مجھ سے یہ بات چھپا کر سیٹھ جی نے مجھ کو سب سے بڑی سزا دی!"

نسرین نے کہا "انھیں یقین تھا تم اسے ان سے چھین لے جاؤ گے اور اپنا ہی جیسا بنا دو گے۔"

وہ بولا۔ "غلط نہ تھا ان کا یہ اندیشہ! مگر یہی بچہ شاید میری زندگی یوں برباد ہونے سے بچا لیتا۔ وارث کے نہ ہونے سے ہر مرد علاوہ بے پروا ہو جاتا ہے۔ نہ کسی پر اس کی ذمہ داری اور نہ اس پر کسی کی ذمہ داری۔ مجھے ہر وقت محسوس ہوتا رہا کہ میں ایک بے سود سی زندگی بسر کر رہا ہوں .... مگر اپنا بیٹا، اپنا وارث! ......" اور وہ بڑی بے چینی سے پوچھنے لگا۔ "اب تو وہ جوان ہو گیا ہوگا؟ شکل صورت کیسی ہے؟"

وہ مسکرا کر بولی "ہوبہو باپ کی جوانی کی تصویر!"

وہ آب دیدہ ہو کر بولا "خدا نہ کرے کہ باپ جیسی سیرت بھی ہو!"

وہ فخر سے سر اٹھا کر بولی "کون کہہ سکتا ہے اس کے باپ کی سیرت کو برا؟"

اتنے میں ہوائی جہاز کے چھوٹنے کا اعلان ہوا۔ اندر جانے کے لئے پھاٹک کھول دیا گیا۔ دونوں جہاز میں دو پاس پاس کی سیٹوں پر بیٹھے۔ گلے شکوے بھی ہوئے اور میٹھی میٹھی پیار کی باتیں بھی۔ کئی گھنٹے کا رستہ آنکھ جھپکاتے میں کٹ گیا۔ آپس میں طے ہو گیا کہ وہ ہفتہ عشرہ بمبئی میں ضرور ٹھہرے گا اور بیٹے کو اپنے سے مانوس کرنے کی آہستہ آہستہ کوشش کرے گا۔ پھر نسرین کسی مناسب موقع پر باپ بیٹے میں میل کرا دے گی۔

سینٹا کروز میں وہ اترے تو منیر ماں کو لینے نہ آیا تھا۔ گاڑی لئے غفور ڈرائیور موجود تھا۔ وہ سیٹھ جی کا پرانا ملازم تھا اور نصیر کو بھی پہچانتا تھا۔ اس نے جو "دولھا میاں" کو "بٹیا" کے ساتھ دیکھا تو باغ باغ ہو گیا۔ نسرین نے اس سے پوچھا "منیر کیوں نہیں آیا؟"

وہ کچھ سٹ پٹا کر بولا "کسی دعوت میں گئے ہیں۔ مجھے حکم دیا کہ میں جا کر آپ کو لے آؤں۔" اس نے نسرین کا اسباب ڈکی میں رکھوایا پھر نسرین کے خاموش اشارے پر نصیر کا اسباب بھی وہیں رکھوا دیا۔ نصیر نے ہوٹل میں قیام کا نام لیا اور موٹر میں سوار ہونے سے عذر کرنا چاہا تو نسرین بولی "کوٹھی میرے ہی نام ہے۔ اب وہ میرا گھر ہے یا تمھارے بیٹے کا۔ ہمارے گھر میں ٹھہرنے میں عذر کا کون سا پہلو ہے؟"۔ اسے خاموش ہو کر نسرین کے ساتھ بیٹھ جانا ہی پڑا۔ اس کا دل خود بھی تو یہی چاہتا تھا!

موٹر اسی جانی پہچانی سہ منزلہ عمارت کے سامنے پورٹیکو میں رکی جہاں آتے جاتے سیٹھ جی کی موجودگی میں بھی اسے ہمیشہ مسرت ہوتی تھی۔ نئی نئی قلعی اور مرمت ہوئی تھی اور اس کے پرانے پن میں ایک خاص طرح کا حسن تھا۔ نسرین اسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ دروازے کے بالکل مقابل ہی سیٹھ جی کی قدآدم تصویر لگی تھی۔ نصیر کو محسوس ہوا جیسے سیٹھ جی کھڑے اسے بڑی نفرت اور حقارت سے دیکھ رہے ہیں۔ جیسے تصویر کے بے جان لب ہل رہے ہیں اور ان سے آواز آ رہی ہے "بے شرم، بے غیرت شرابی! تو پھر اس گھر میں اسے برباد

کرنے آیا!" - اور نصیر دروازے ہی پر ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

نسرین اپنے غیرت دار شوہر کی رگ رگ سے واقف تھی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچتی ہوئی بولی - "اندر آؤ! اب ڈیڈی ہمارے درمیان نہیں آسکتے!"

نصیر نشست کی جانب جو کھڑکی تھی وہاں جا کر کھڑا ہو گیا۔ ادھر ایک چھوٹا سا چمن تھا اس میں چٹکی چاندنی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس چمن کی بہاریں اس نے کئی بار نسرین کے ساتھ لوٹی تھیں اور ان کی آپس کی چھیڑ چھاڑ پر وہاں کے اکثر پھول مسکرائے اور ہنسے تھے۔ شیریں یادوں کا یہ سلسلہ غفور کے دروازہ کھولنے اور اندر جھانکنے نے توڑا۔ اس نے پوچھا "بٹیا" دولہا میاں کا سوٹ کیس کس کمرے میں رکھ دوں؟"

نسرین نے کچھ شرما کر، کچھ سٹ پٹا کر کہا - "مہمان والے کمرے میں!"

جب غفور دروازہ بھیڑ کر چلا گیا تو وہ نصیر سے اپنی صفائی میں بولی "میں چاہتی ہوں کہ منیر تم سے آہستہ آہستہ ہل مل جائے تو اسے تمہارا نام بتاؤں......"

نصیر نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "ہاں نہ جانے کتنا بس سیٹھ جی نے اس کے دل میں میری طرف سے بھر دیا ہوگا۔ ...... مگر اپنے لئے کوئی نیا نام بھی سوچ لینا پڑے گا!...."

وہ بڑی تلخی سے مسکرایا۔

اتنے میں ایک موٹر زور زور سے ہارن دیتی پورٹیکو کی طرف بڑھتی سنائی دی۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے دو موٹروں میں ہلکی سی ٹکر ہوئی اور شیشوں کے ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی اور غفور کی ہلکی سی چیخ۔

نسرین "ارے کیا ہوا؟" کہتی کمرے کے باہر لپکی۔ نصیر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ منیر ٹکر مارنے والی موٹر سے دھاڑتا ہوا نکلا —

"یو ڈیم فول! ام ہارن پر ہارن بجاتا ہے۔ تم ہمارا راستہ کیوں نہیں دیتا!"

غفور جو دونوں موٹروں کے درمیان کچھ دبا سا کھڑا تھا۔ بولا "بھیا میں ڈکی سے بٹیا اور دولہا میاں کے اسباب اتار رہا تھا، میں موٹر کیسے ہٹاتا؟"

منیر بولا "بٹیا، بٹیا، بٹیا، او 'ام سمجھا' آپا!"

نسرین نے قریب آکر پوچھا۔ "ارے کیا ہوا غفور؟"

منیر اس کی طرف لڑکھڑاتا ہوا بڑھا "تم آگیا آپا! امارا پیارا آپا!"

لیکن جیسے ہی وہ نسرین کے قریب آیا، وہ غصہ سے بھڑک کر بولی "ارے تو نے شراب پی ہے! تھو! بے غیرت! بے شرم! تھو! تھو......"

وہ ہنس کر بولا۔ "بہت نہیں پی آپا! بس تمہاری صحت کے..... تین جام! ڈیر آپا! ڈارلنگ آپا!"

نسرین منہ پر رومال رکھ کر ابکائی لیتی ہوئی بولی - "ارے باپ کی وراثت مل گئی تجھ کو! ہائے اللہ! باپ کا خون رنگ لاکر ہی رہا!"

اور وہ "اوا، اوا" تھو تھو کرتی قریب ترین باتھ روم کی طرف بھاگی۔

شراب کے نشے نے منیر کے سچے جذبات زبان سے کہلوا دئے۔

وہ ماں کے پیچھے لپکتا ہوا بولا "میرے شوہر باپ کا نام تم نے کیوں لیا آپا؟ اُس کی وراثت! اس شوہر کا خون نہیں — ہرگز نہیں! آٹر تو یہ تہذیب... نوجوان... تھوڑی بہت پیتا ہے! یہ تہذیب کا ورثہ!"

اور دفعتاً اس نے باتھ روم کے قریب رکھے ہوئے گملوں میں سے ایک سے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل آرہا۔

غفور اپنی چوٹ بھول کر اسے اٹھانے دوڑا، مگر نسرین نے باتھ روم کا دروازہ دھڑاکے سے بند کر لیا۔ - اور نصیر رومال سے چہرہ پونچھتا ہوا سب کی نظریں بچا کر تیزی سے کوٹھی کے باہر نکل گیا۔

ٹوپیاں اور ڈاکٹر

گوئل صاحب لکھنؤ میں بھارت ٹائمز (دہلی کلکتہ) کے مقامی نامہ نگار تھے۔ حلقۂ احباب میں وہ خاصے شوقین مزاج مشہور تھے۔ دوستوں نے انھیں اسکول میں صافہ باندھتے اور کالج میں ننگے سر پر گھنگھریالے بالوں کی لٹوں کو بار بار جھٹکاتے، چھیلا بنے گھومتے بھی دیکھا تھا اور تحریکِ آزادی میں دودھیا کھادی کے لباس پر ٹیڑھی گاندھی ٹوپی سجائے بھی۔ بعد میں وہ سیاہ شیروانی اور ٹوپی میں بھی ملبوس نظر آئے تھے اور سوٹ ہیٹ سے مزین بھی۔ چند سال قبل اخبار نویسوں کے ایک وفد میں وہ روس گئے تو وہاں سے ایک خوبصورت مخملی ہیٹ لے آئے۔ دو سال تک ڈیڑھ سو روبل کے اس قیمتی ہیٹ کا رعب وہ دوستوں پر غالب کرتے پھرے۔ ۱۹۵۴ء میں وہ کابل گئے تو وہاں سے قراقلی خرید لائے اور دو تین سال وہی احباب سے خراجِ تحسین حاصل کرتی رہی۔ اس کا جادو اترا تو گوئل صاحب کشمیر سے چار پانچ کشتی نما ٹوپیاں لے آئے...... ان نت نئی ٹوپیوں اور انھیں کے مطابق لباس کی تبدیلیوں کے باعث وہ خاصے خوش پوشش اور شوقین مزاج کہلاتے تھے۔ یہ کوئی نہ جانتا تھا کہ ان کی اس خوش پوشی کی تہہ میں کیسی مجبوری پنہاں ہے۔

بات دراصل یہ تھی کہ ان کا سر بے حد حساس تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ کبھی ٹوپی نہ پہنتے۔ ان کے بال اتنے خوب صورت سیاہ اور گھنگھریالے تھے کہ ان پر کوئی ٹوپی پہننا انھیں خاصا ناگوار ہوتا تھا۔ مگر سر کی اس کمزوری کے ہاتھوں وہ بُری طرح مجبور تھے۔ ذرا سی بھی سردی ہوتی اور سر ننگا رہ جاتا تو انھیں زکام ہو جاتا تھا...... اپنی اس کمزوری کو انھوں نے شوق کے پردے میں چھپا لیا تھا۔ کالج کے بعد کے ایک دو سال انھوں نے ننگے سر گزارے ہوں تو دوسری بات ہے۔ لیکن بعد میں تو انھوں نے ہمیشہ ٹوپی کو اپنا سرپرست بنا لیا تھا۔ روس سے وہ جو ہیٹ لائے تھے وہ انھیں اتنا پسند تھا کہ اگر ان کا بس چلتا تو اسے تا زندگی پہنتے۔ لیکن ہیٹ کے ساتھ یہ مصیبت تھی کہ مجلسوں یا دعوتوں میں اُسے سر پر نہیں پہنا جا سکتا تھا اور ننگے سر بیٹھنے کا مطلب تھا۔ ہفتوں زکام سے پریشان رہنا۔ قراقلی میں یہ وقت تھی کہ سردی میں تو خوب کام دیتی لیکن گلابی جاڑوں میں اُسے پہننا مشکل ہو جاتا۔ بے حد گرم تھی۔ سردی کے باوجود سر پسینے سے تر ہو جاتا۔ ٹوپی اتارتے تو چھینکیں آنے لگتیں۔ کشمیر کے سفر نے ان کی یہ مشکل آسان کر دی تھی۔ وہاں کشتی نما ٹوپیاں پانچ سے پچاس روپے تک کی تھیں گلابی جاڑوں کی بات تو دور رہی، وہاں تو ایسی ٹوپیاں بھی تھیں جو گرمیوں میں بھی پہنی جا سکتی تھیں۔ چناں چہ وہ ہر قسم کی کم گرم، درمیانی، خوب گرم .... سفید، سیاہ، بھوری، چتکبری مختلف النوع ٹوپیاں خرید لائے تھے۔ جس سوٹ کے ساتھ جو میچ کرتی وہی پہن لیتے۔ احباب ان کے سوٹ یا ٹوپی کی تعریف کرتے تو گوئل صاحب مسکرا کر شکریے کا اظہار کرتے۔ لیکن کبھی کبھی اندر ہی اندر ان کا دل بے حد

اداس ہو جاتا۔ یہ احساس کہ ٹوپی کے بغیر ان کا کام ہی نہیں چل سکتا۔ ان کی زندہ دلی کو افسردگی سے بدل دیتا۔ وہ شام کو حضرت گنج کی سیر کو جاتے اور دیکھتے کہ سخت سردی میں بھی لوگ نہ صرف ننگے سر پیدل گھومتے ہیں بلکہ سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں پر اڑتے پھرتے ہیں تو ان کا جی چاہتا کہ ٹوپی کو اتار کر سڑک پر پھینک دیں اور کسی کو اٹھانے نہ دیں اور اسے موٹروں، سائیکلوں اور تانگوں کے نیچے کچلتے اور تار تار ہوتے دیکھ کر خوش ہوں۔ لیکن ادھر جب سے انھوں نے عمر کے اکتالیسویں سال میں قدم رکھا تھا، انھیں ٹوپی کے نیچے مفلر تک پہنچنے کی ضرورت پڑنے لگی تھی۔ موٹر سائیکل چلاتے وقت کانوں کو سرد ہوا لگتی تو ناک سے پانی بہنے لگتا۔ وہ موٹر سائیکل روک کر گلے کا مفلر سر کے اوپر سے کانوں پر لپیٹ کر گلے میں باندھ لیتے۔ پھر ٹوپی سر پر جماتے اور جب آگے بڑھتے

ادھر ان کی افسردگی میں اضافہ کرنے کا ایک اور سبب پیدا ہو گیا تھا۔ پچھلے سال سے لکھنؤ کی نمائش میں کشمیر سے آنے والے دوکاندار ڈھیروں کشتی نما ٹوپیاں لانے لگے تھے۔ اور گوئل صاحب کی تقلید میں ان کے تقریباً تمام دوستوں نے اتنی گراں نہ سہی سستی ہی، مگر ویسی ہی کشتی نما ٹوپیاں پہننی شروع کر دی تھیں اور ان کی اپنی امتیازی شان ختم ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اب کوئی ان کی ٹوپی کی تعریف ہی نہ کرتا تھا۔

انھیں دنوں بسنت آ گیا۔ گوئل صاحب پنجابی تھے اور اگرچہ ان کے گھر کے لوگوں نے پگڑی کا استعمال ترک کر دیا تھا لیکن ان کے والد محترم اب بھی پگڑی ہی باندھتے تھے اور ستر سال کی عمر ہونے کے باوجود بسنت کے روز اسے بسنتی رنگ میں رنگا بھی لیتے تھے۔ اس بار جب گوئل صاحب نے اپنے والد کو پگڑی رنگواتے دیکھا تو خدا جانے ان کے دل میں کیا آئی کہ انھوں نے عمدہ ململ کی پگڑی منگائی، اسے بسنتی رنگایا۔ سر پر نہایت نفاست سے سجایا اور بسنت کے روز سارا دن موٹر سائیکل پر پگڑی کا شملہ ہوا میں لہراتے گھومتے رہے۔ جب احباب نے ان کی پگڑی کی خوب تعریف کی اور کہا کہ تمام ٹوپیوں کے مقابلے میں پگڑی ان پر زیادہ کھلتی ہے اور جاننا چاہا کہ پہلے انھوں نے پگڑی کیوں نہیں باندھی تو گوئل صاحب کے دماغ کی تمام تر افسردگی یک لخت کافور ہو گئی اور انھوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ہمیشہ پگڑی ہی باندھا کریں گے۔ چوک میں وہ ایک دوست سے ملنے گئے تو لگے ہاتھوں ایک رنگریز سے بھی بات کر آئے کہ وہ اسے تین چار پگڑیاں لا دیں گے اور وہ انھیں ایک ہی دن میں رنگ کر دے دے۔ اپنے جوش میں انھوں نے رنگ بھی طے کر لئے۔ فاختئی، گہرا خاکستری، موتیا اور ہلکا جوگیا۔

لیکن چار بجے کے قریب ان کے سر میں سخت درد ہونے لگا۔ مدتوں سے انھوں نے پگڑی نہیں باندھی تھی۔ لمبے لمبے بال صفائی سے پگڑی باندھنے کے بعد بری طرح بھنچ گئے تھے۔ وہ کافی ہاؤس میں دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے جب انھیں محسوس ہوا کہ وہ کوئی دوا نہ لیں گے تو ان کے لئے وہاں بیٹھنا مشکل ہو جائے گا اور انھوں نے ارگا پائرین کی ایک گولی منگا کر کافی کے ساتھ نگل لی۔ لیکن بجائے کم ہونے کے درد میں اضافہ ہو گیا ساتھ ہی جی بھی متلانے لگا آخر احباب سے اجازت لے کر وہ گھر آ گئے۔

باہر ہی سے انھیں معلوم ہو گیا کہ ان کی بیوی بڑے دوستوں کے ساتھ گومتی پر بسنت منانے گئی ہوئی ہے۔ وہ دھڑ دھڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں گئے۔ پگڑی اتار کر انھوں نے پلنگ پر زور سے پٹک دی۔ آئینے میں شکل دیکھی تو انھیں پگڑی کے پیچوں میں کسی ہوئی بالوں کی گنجلک جوڑے کی سی سر پر بنی نظر آئی۔ آنکھیں جھنپی، ماتھے کی نسیں تنی ہوئی اور چہرے پر غیر معمولی اضمحلال! وہ ہاتھ روم گئے۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، گیلے ہاتھ بالوں پر پھیر کر انھیں سنوارا۔ پھر باہر آ کر انھوں نے الماری سے ایک رومال نکالا۔ اسے تہہ کر کے اس کی پٹی ماتھے پر باندھی۔ پلنگ پوش کو پگڑی سمیت برابر کے پلنگ پر الٹ دیا اور بیکون جیسے بغیر لحاف میں دبک گئے۔

اگرچہ انھوں نے رومال کی گانٹھ عین کنپٹی پر دی تھی مگر سر کے

درد کو ذرا بھی آرام نہ ہوا تھا۔ ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک — کوئی کنپٹی پر مسلسل ہتھوڑے مار رہا تھا۔ ان کا جی بُری طرح گھٹا جا رہا تھا انھوں نے اٹھ کر پانی کا ایک گلاس پیا اور پھر بستر پر دراز ہو گئے۔

کچھ دیر بعد انھیں بڑی گرمی محسوس ہونے لگی چنانچہ وہیں بستر میں بیٹھے بیٹھے پتلون اُتار دی اور اُسے بھی سامنے کے پلنگ پر بسنتی پگڑی اور پلنگ پوش کے اوپر پھینک دیا۔ جی میں آئی کہ نائٹ سوٹ پہن لیں لیکن انڈرویر پہنے ہوئے ہی لیٹے رہے۔

لیکن انھیں اب بھی آرام نہ ملا۔ سامنے دروازے پر لگے ہوئے پردے کے ایک سرے سے غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں آنکھوں پر پڑ رہی تھیں۔ انھیں محسوس ہوا کہ وہی کرنیں کنپٹیوں پر ہتھوڑے چلا رہی ہیں۔ مگر ان میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ اٹھ کر پردہ ٹھیک کر سکیں۔ انھوں نے کروٹ بدل لی اور دیوار کی طرف منھ کر کے آہستہ آہستہ کراہنے لگے۔

"ارے کیا بات ہے؟"

ان کی بیوی کمرے کی چوکھٹ ہی سے شوہر کو یوں لیٹے اور کراہتے دیکھ کر چلائیں۔

گوئل صاحب نے کروٹ نہیں بدلی۔ ویسے ہی لیٹے کراہتے رہے۔

مسز گوئل نے عمدہ سلک کی بسنتی ساڑی اور اسی رنگ کا ریشمی بلاؤز پہن رکھا تھا۔ کندھوں پر اورنگ آبادی پیلی شال ڈال رکھی تھی جس پر ریشم کا بہت خوب صورت کام تھا۔ جوڑے پر گیندے کے زرد پھولوں کا گجرا تھا۔ مسلسل بیماری کے باعث زرد نظر آنے والا ان کا چہرہ بسنتی ساڑی کے باوجود (جس کا عکس زرد چہرے کو اور بھی زرد بنا دیتا ہے) تیوہار کی خوشی سے یا باہر دھوپ میں چلنے کے باعث تمتمایا ہوا تھا۔ انھوں نے شال ایک طرف پھینک دی اور گوئل صاحب کے سرہانے بیٹھ گئیں۔ شوہر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انھوں نے پھر پوچھا۔ "بات کیا ہے؟"

گوئل صاحب نے کروٹ بدلی۔ "سر میں شدید درد ہے۔ کنپٹیاں پھٹی جا رہی ہیں۔"

"بلاڈونا تیس" کی چار گولیاں کھا لیتے۔"

گوئل صاحب کا جی چاہا زور سے قہقہہ مار کر ہنس دیں لیکن دردِ سر کے باعث محض مسکرا کر رہ گئے۔ بولے۔ "تمھارے بلاڈونا سے کیا ہوگا۔ تین ارگا پائرین کھا چکا ہوں۔"

"اب میں آپ کو کیسے بتاؤں۔" داہنے ہاتھ سے اُن کا ماتھا دباتے ہوئے مسز گوئل بولیں۔ "میں نے خود ڈاکٹر اوستھی کو سخت سے سخت درد کا علاج انھیں گولیوں سے کرتے دیکھا ہے۔"

"ارے تمھارے اس اوستھی کو کچھ آتا بھی ہے۔" گوئل صاحب بیوی کا ہاتھ ہٹا کر انگوٹھے اور درمیانی انگلی کی مدد سے دونوں کنپٹیاں ایک ساتھ دبا کر بولے۔ "وہ مریض کی جنم پتری دیکھ کر علاج کرنے والا کلرک....."

"لیکن مجھے تو آرام ہے۔"

"تمھیں ہر نیا ڈاکٹر بدلنے کے بعد آرام آنے لگتا ہے۔"

"آپ کو تو ہر بات کا مذاق اڑانے کی عادت ہے۔ سارے شہر میں ڈاکٹر اوستھی کی دھوم ہے۔ کیا سب کے سب لوگ بے وقوف ہیں؟"

گوئل صاحب خاموش ہو گئے۔ بیوی سے بحث کرنا انھوں نے فضول سمجھا۔ ان کی بیوی کو آنتوں کی پرانی شکایت تھی۔ شہر کے تقریباً تمام ڈاکٹروں کو وہ آزما چکی تھیں اور سبھی پر ایمان لا چکی تھیں اور ان دنوں ڈاکٹر اوستھی کی قصیدہ خوانی کیا کرتی تھیں۔

ڈاکٹر اوستھی کوئی سند یافتہ ڈاکٹر نہیں تھے۔ سیکرٹریٹ کے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں وہ سینیئر کلرک تھے۔ مگر کلرکی کے ..... ساتھ ساتھ ہومیوپیتھی کی پریکٹس بھی کرنے لگے تھے اور آہستہ آہستہ ڈاکٹر زیادہ اور کلرک کم رہ گئے تھے۔ خوش رو، خوش طبع، ادب و آرٹ کے دل دادہ۔ ان کی بڑی شہرت تھی۔ ان کا کام دفتر کے کلرک نمٹا دیتے اور اوستھی جی دفتر میں بیٹھے ہومیوپیتھی کی موٹی

موٹی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے یا بڑے بڑے افسروں کی خدمت میں پہنچ کر ان کی شکایتیں سنتے اور پڑیاں تقسیم کرتے۔ منسٹروں سے لے کر چپڑاسی تک ان کے مریض تھے۔ یوں ان کی پریکٹس اتنی چل گئی تھی کہ انھیں ملازمت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ لیکن تھے تو کلرک ہی۔ چار یا پانچ سال میں ریٹائر ہونے والے تھے۔ پنشن کا لالچ انھیں دفتر سے باندھے ہوئے تھا۔ سیکرٹریٹ میں یہ قصہ عام تھا کہ ایک سخت مزاج سپرنٹنڈنٹ نے انھیں ایک بار ڈانٹ دیا تھا کہ اگر وہ دفتر میں دیر سے آئیں گے یا کوئی دوسرا کام کریں گے تو انھیں برخاست کر دیا جائے گا۔ لیکن ایک ماہ بعد ہی خود سپرنٹنڈنٹ کا لڑکا سخت بیمار ہو گیا۔ جب شہر کے تمام ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو وہ اوستھی جی کی خدمت میں پہنچا اور ان کے قدموں پر گر پڑا کہ جس طرح بھی ہو سکے میرے لڑکے کو بچا لیجئے۔ اوستھی جی نے چار پڑیوں میں ہی اسے بھلا چنگا کر دیا۔

مسز گوئل بڑے جوش سے اس قصہ کا بکھان کیا کرتیں —

"وہ دن سو آج کا دن" قصہ سنا کر وہ کہتیں۔ "سپرنٹنڈنٹ تو درکنار سیکرٹری یا منسٹر تک کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ انھیں وہ لفظ کہے۔"

ان دنوں مسز گوئل اپنے واقف کاروں کو ہر بیماری میں ڈاکٹر اوستھی سے مشورہ لینے کی رائے دیتیں اور ایلوپیتھی کے مقابلے میں ہومیوپیتھی کے گن گاتیں۔ "ہومیوپیتھی تو بہن جی (یا بھرا جی) تیر کی طرح نشانے پر لگتی ہے۔" وہ کہتیں "جن بیماریوں کو بڑے بڑے سرجن بھی ٹھیک نہیں کر پاتے انھیں ہومیوپیتھی کی یہ سرسوں برابر گولیاں دنوں میں ہی ٹھیک کر دیتی ہیں!" اور وہ بتاتیں کہ کس طرح ڈاکٹر اوستھی نے ان کی ایک سہیلی کے رحم کی رسولی ایک ہی بار کی دوا سے ٹھیک کر دی تھی۔ بچے کی پیدائش کے بعد اس کی ناف کے نیچے بھاری پن رہنے لگا تھا۔ جب رکشا کے دھچکے سے بھی درد ہونے لگا تو اس کا شوہر اسے اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "رسولی ہے۔ اپریشن کرنا پڑے گا۔ سردیوں میں آ جیئے۔" اپریشن کے نام ہی سے ان کی سہیلی کی جان نکل گئی۔ اسی دوران میں کسی نے اوستھی جی کا پتہ بتا دیا۔ انھوں نے دوا کی چار خوراکیں دیں۔ مسز گوئل کی سہیلی چوک میں رہتی اور اوستھی جی پارک روڈ پر۔ وہ دوا تو اس نے کھا لی لیکن پھر نہیں گئی۔ اس کے شوہر کچھ شکی تھے۔ دسمبر شروع ہوتے ہی وہ اسے اسپتال لے گئے کہ اگر اپریشن کرانا ہو تو کمرہ وقت سے بک کرا لیا جائے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور وہ حیران ہو کر بولی۔ "اٹ از ناٹ دیر۔ اٹ ہیز کمپلیٹلی وینشڈ"

اور مسز گوئل اپنی مہین آواز اور کانونٹ زدہ لہجے میں اسی جملے کو دوبارہ اٹ کر کہتیں۔ "سچ! ڈاکٹر نے کہا۔ اٹ ہیز کمپلیٹلی وینشڈ۔ اٹ از ناٹ دیر (رسولی بالکل غائب ہو گئی ہے۔ اس کا کہیں پتہ نہیں ہے)"

وہیں لیٹے لیٹے گوئل صاحب کے دماغ میں اپنی بیوی کی ساری باتیں گھوم گئیں۔ درد سر کے باوجود ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کچھ لمحوں کے بعد انھوں نے کہا۔ "تم مجھے ایسپرو کی دو ٹکیہ دے دو۔"

"ایسپرو تو گھر میں نہیں ہے۔" مسز گوئل نے کہا۔ "میں ڈاکٹر اوستھی کو فون کر کے پوچھتی ہوں کہ وہ کیا کہتے ہیں؟"

اور اس سے قبل کہ وہ انھیں روکیں، مسز گوئل دفتر میں گئیں انھوں نے ڈاکٹر اوستھی کو فون کیا اور آ کر بولیں۔ "میں نے کہا تھا نا کہ بلاڈونا ۳۰ کی چار گولیاں کھا لیجئے۔ اوستھی جی نے بھی یہی کہا ہے۔"

"تم ذرا ڈاکٹر چیٹر جی کو فون کر لیتیں۔" گوئل صاحب نے اپنے محبوب ایلوپیتھ کا نام لیا، جسے ان کی بیوی کب کا چھوڑ چکی تھیں۔

"فون پر بھی انھوں نے دوا بتائی ہے۔" مسز گوئل کھسیانی ہو کر بولیں۔ "جو اب بتائیں گے۔ آپ چاہتے ہیں تو میں فون کر دیتی ہوں۔ آ کر دیکھ جائیں گے۔ لیکن اب فون کروں گی تو ساڑھے نو بجے تشریف لائیں گے۔ نو بجے تو وہ سیوا آشرم ہی سے اٹھتے ہیں۔ آپ میری بات مانیئے۔ چار گولیاں میں آپ کو بلاڈونا کی دیتی ہوں۔

ذرا آرام آیا تو جس ڈاکٹر کا نام لیجئے گا، بلادوں گی۔"

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، ان کی بیوی انگیٹھی پر پڑی ہوئی ایک چھوٹی سی شیشی اٹھالائیں۔ اخبار سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر انھوں نے چار گولیاں اس میں گرائیں اور گوئل صاحب سے کہا "منہ کھولئے۔"

گوئل صاحب نے بادل ناخواستہ منہ کھول دیا۔ مٹھاس کے ساتھ ایک ہلکا سا تیکھا پن انھیں زبان پر محسوس ہوا۔ گولیاں شاید دوا سے گیلی تھیں کیونکہ کاغذ پر ایک دو جگہ نشان پڑ گئے تھے۔

آدھ گھنٹے کے بعد گوئل صاحب کے سر کا درد دور ہو گیا۔

دوسرے دن گوئل صاحب وہی پرانی کشتی نما ٹوپی پہنے اپنی بیوی کے لئے دوا لینے ڈاکٹر اوستھی کے ہاں پہنچے تو دوا بناتے ہوئے ڈاکٹر اوستھی نے ان کا حال چال بھی پوچھا کہ اب ان کے سر کا درد کیسا ہے۔ گوئل صاحب نے کہا کہ بلاڈونا لیا تھا جس سے آرام آگیا ہے اور یہ سن کر ڈاکٹر اوستھی بلاڈونا کے فوائد گنانے لگے۔

وہ ہومیوپیتھی کے معجزے بیان کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ انھوں نے کس کس کا کیسی کیسی خطرناک بیماری میں علاج کیا ہے کہ گوئل صاحب نے اپنے درد سر کا سبب بتایا اور بولے "ساری دنیا ننگے سر گھومتی ہے۔ ایک میں ہوں کہ سردیوں کا کیا ذکر گرمیوں تک میں ٹوپی پہننے پر مجبور ہوں۔ آپ میرا علاج کریں تو جانوں۔

وہ کہاوت ہے نا کہ رسی کی مستقل رگڑ سے پتھر پر بھی نشان پڑ جاتا ہے۔ آخر کار بیوی کی باتوں کا گوئل صاحب پر بھی اثر ہو ہی گیا تھا۔

"ہوں۔" پڑیا بناتے بناتے ڈاکٹر اوستھی نے کہا اور پھر ایک بڑی سی کتاب سامنے رکھ کر اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔

چند لمحوں کے بعد بولے۔ "یہ لیجئے مل گئی۔"

اور انھوں نے بلند آواز سے پڑھا۔ "اسے پرسن ہو ویرز اے ہیٹ ڈریس ایون ان سمر" اور کتاب بند کر کے ایک شیشی سے گولیاں نکالیں، دوسری شیشی کو ملا کر اس میں سے ایک دو قطرے ان پر ٹپکائے اور بولے۔ "منہ کھولئے۔"

گوئل صاحب نے منہ کھول دیا۔ ڈاکٹر اوستھی نے پڑیا ان کے منہ میں انڈیل دی اور بولے۔ "لیجئے، بھگوان نے چاہا تو تین دن میں آپ کی ٹوپی اُتر جائے گی۔"

تین دن میں گوئل صاحب کی ٹوپی اتر گئی۔ لیکن انھیں دل میں ایسی گھبراہٹ محسوس ہوئی کہ وہ پھر ڈاکٹر اوستھی کے پاس پہنچے۔ انھوں نے پھر پڑیا بنائی اور ان کا منہ کھلوا کر انڈیل دی۔

جب تین دن تک کچھ آرام نہ آیا، گھبراہٹ بڑھتی گئی، پیشاب پیلا پیلا آنے لگا تو گوئل صاحب نے ڈاکٹر چیٹرجی کے سیوا آشرم کا رُخ کیا۔

وہاں بہت بھیڑ تھی۔ باہر کے بڑے ہال کے عین درمیان جو گول میز اور اس کے گرد گول بنچ متوسط طبقہ کے مہذب اور تعلیم یافتہ مریضوں کے لئے تھی وہ کھچا کھچ بھری تھی۔ دروازہ کے دونوں طرف نچلے طبقے کے مریضوں کے لئے جو بنچیں پڑی تھیں ان پر تل رکھنے کی جگہ نہ تھی بلکہ کچھ عورتیں نیچے فرش پر بیٹھی تھیں۔ گوئل صاحب موٹر سائیکل دروازے کے پاس کھڑی کر کے اندر گئے۔ گول میز پر سے انھوں نے 'دیکلی' کا ایک پرانا پرچہ اٹھایا اور دائیں طرف کاؤنٹر کے ساتھ کہنی ٹکا کر کھڑے ہو گئے۔ لیکن 'دیکلی' کھول کر بھی وہ اسے پڑھ نہ پائے۔

گوئل صاحب کو ڈاکٹر چیٹرجی کے کلینک کی صفائی، قرینہ اور حسن انتظام بہت پسند تھا۔ اگر ناپسند تھی تو یہ بھیڑ۔ پہلے آؤ یا بعد میں، اپنی باری کے لئے ڈیڑھ دو گھنٹے وہاں ضرور بیٹھنا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر چیٹرجی صبح آٹھ بجے سے بارہ بجے تک اور شام کو چھ بجے سے نو بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ باری سے پہلے وہ کسی کو نہ دیکھتے تھے، خواہ کوئی کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو۔ مطب کے وقت وہ کبھی وزٹ پر نہ جاتے۔ اگر کوئی پہلی باری لینے کے لئے وقت سے پہلے وہاں پہنچتا تو اسے ڈاکٹر صاحب کے آنے کے انتظار میں، اور اگر بعد میں پہنچتا تو دوسرے مریضوں کے نمٹانے

جانے کے انتظار میں اتنا وقت ضرور بیٹھنا پڑتا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد گوئل صاحب کی باری آئی۔ ڈاکٹر چیٹرجی اپنے چھوٹے سے کمرے میں چھوٹی سی میز کے پیچھے چاق و چوبند بیٹھے تھے۔ ان کی چھوٹی سی میز پر کتابیں قرینے سے چنی ہوئی تھیں اور چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر وہ بڑی تیزی سے نسخے لکھتے تھے (جنھیں صرف ان کا کمپاؤنڈر ہی پڑھ سکتا تھا) میز کے شیشے کے نیچے مریضوں کی جانب کو انھوں نے تین ہدایتیں ٹائپ کرا کے چسپاں کر رکھی تھیں۔

- کہنیاں میز پر نہ ٹکائیے
- میز پر پڑی کسی چیز کو نہ چھیڑیئے۔
- پیچوں کو میز سے پرے رکھیے

ان کے پیچھے ایک پارٹیشن تھا جس کے دونوں طرف دو دروازے تھے جو دو چھوٹے چھوٹے کمروں کو جاتے تھے ان میں سے ایک متوسط طبقے کے مریضوں کے لئے تھا دوسرا نچلے طبقے والوں کے لئے۔ مریضوں کے نمٹانے میں چیٹرجی کی تیزی دیکھ کر گوئل صاحب محوِ حیرت ہو جاتے تھے۔ وہ ایک مریض کو دیکھ کر معائنے کے کمرے کے باہر آتے تو نسخہ لکھنے سے پہلے گھنٹی پر ہاتھ مارتے اور اگلے مریض کو دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کر دیتے۔ نسخہ لکھ کر مریض کو دیتے اور دوسرے مریض کو دیکھنے چلے جاتے۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی کمپاؤنڈر دوا اور مریض بھیج دیتا۔ گوئل صاحب کبھی کبھی ڈاکٹر چیٹرجی کی اس تیزی پر حیران ہو کر سوچا کرتے کہ ڈاکٹر یل اپنی میز سے معائنے کے کمروں میں آنے جانے میں کتنے میل روز چل لیتے ہوں گے۔

کمرے کے اندر جاتے ہی انھوں نے ڈاکٹر چیٹرجی کو نمسکار کیا جو انھوں نے بدستور نسخہ لکھتے ہوئے قبول فرمایا۔

ڈاکٹر کے پیچھے پارٹیشن پر ایک نقلی تلچٹا پن کے سہارے ٹکا تھا، جس کے نیچے دم کو خم کئے ایک چھپکلی لگی تھی۔ پہلی بار جب گوئل صاحب ڈاکٹر چیٹرجی کے کلینک میں آئے تھے تو انھیں دونوں چیزیں بالکل اصلی معلوم ہوئی تھیں اور وہ دیر تک اس بات کا انتظار کرتے رہے تھے کہ کب چھپکلی جھپٹ کر تلچٹے کو اپنے جبڑے میں دبوچ لیتی ہے۔ اگرچہ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ نقلی ہیں، تاہم گوئل صاحب جب وہاں جاتے تھے تو ان کی نظریں ان پر جم جاتی تھیں۔

تلچٹے اور چھپکلی کو دیکھتے دیکھتے گوئل صاحب بے خیالی میں کہنیاں میز پر ٹکانے ہی جا رہے تھے کہ شیشے کے نیچے موٹو پر ان کی نظر پڑ گئی اور وہ فوراً سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ عین اسی وقت ڈاکٹر نے ان سے پوچھا۔ "کہیئے۔"

گوئل صاحب نے اپنی تکلیف بیان کی کہ ان کا جی بھاری بھاری رہتا ہے، بھوک یکسر غائب ہو گئی ہے اور قارورے کا رنگ گہرا زرد ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے انھیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جا کر لیٹ گئے، تو کچھ لمحوں کے بعد ڈاکٹر صاحب بھی اندر آ پہنچے۔ انھوں نے ان کی نبض دیکھی، زبان دیکھی، ذرا سا پیٹ کو ٹٹولا اور پھر بولے۔ "آپ دن رات کام کرتا ہے۔ پھٹ پھٹیا پر گھومتا ہے۔ آپ کو تھوڑا پیدل چلنے کو مانگتا ہے۔"

اور وہ باہر نکل آئے۔ جب گوئل صاحب باہر آئے تو ڈاکٹر چیٹرجی نے نسخہ ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "تین دن کا دوا ہم دیا ہے، کیلشیم اور وٹامن بی کامپلیکس کا انجکشن لینا ہوگا۔ دوا پیؤ، انجکشن لو، تھوڑا گھومو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے، جہاں کوئی نیچی ذات کا مریض کمری میز پر بچھے بھورے موم جامے پر لیٹا تھا اندر جا کر ڈاکٹر صاحب نے پردہ کھینچ دیا۔

گوئل صاحب نے باہر آ کر نسخہ دیا۔ آدھ گھنٹے میں نسخہ بنا۔ جس کی قیمت پانچ روپے ساٹھ پیسے کمپاؤنڈر نے لے لئے سیوا آشرم کی سیڑھیاں اترتے وقت گوئل صاحب نے ایک نظر ان بنچوں پر بیٹھے مہتروں مزدوروں پر ڈالی جن سے ڈاکٹر چیٹرجی کسی قسم کی رعایت نہ کرتے تھے اور انھیں ڈاکٹر چیٹرجی کے

مطب کے نام سیوا آشرم پر بے ساختہ ہنسی آگئی۔

انھیں دنوں اچانک کشمیر، شملہ، نینی تال اور مسوری میں زوروں کی برف باری ہوئی اور لکھنؤ میں بھی سخت سردی کی لہر دوڑ گئی۔ یا تو ان کو گرمی لگنے لگی تھی اور دھوپ کی تمازت برداشت نہ ہوتی تھی یا اتنی سخت سردی پڑی کہ اوور کوٹ تک نکالنے کی نوبت آگئی۔ گوئل صاحب سردی میں یوں بھی باہر کم نکلتے تھے لیکن ان دنوں ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق روزانہ سیر کو جاتے تھے۔ انھیں اندر اتنی حدت محسوس ہوتی کہ وہ اوور کوٹ، مفلر اور ٹوپی لئے بغیر کبھی گومتی پل تک اور کبھی شیواجی مارگ تک پیدل گھومتے۔ مگر اتنی سیر کرنے کے باوجود انھیں ذرا بھی فائدہ نہ ہوا۔ ان کا جی بدستور بھاری رہا۔ اور بھوک ویسی ہی غائب رہی۔

انھوں نے تین انجکشن لئے تھے کہ ایک دن ان کی بیوی نے کہا کہ "آپ کی آنکھیں تو پیلی پیلی نظر آتی ہیں۔"

گوئل صاحب شام کو ڈاکٹر چیٹرجی کے پاس پہنچے اور کہا کہ "مجھے یرقان ہو گیا ہے۔" ڈاکٹر نے ان کی دونوں آنکھوں کے پپوٹے ذرا نیچے کر کے دیکھے۔ بجلی کی روشنی میں وہ ہلکا پیلا پن بھلا کہاں نظر آتا۔ بولے "تم لوگ بہت وہم کرتا ہے۔ یرقان پھرقان کچھ نہیں۔ صبح آنا۔ دیکھے گا۔"

دوسرے روز گوئل صاحب پھر گئے تو ڈاکٹر چیٹرجی نے آنکھیں دیکھ کر بے پروائی سے کہا۔ "ہاں، کچھ جانڈس معلوم ہوتا ہے۔ یہ دوا نہیں چلے گا دوسرا انجکشن لینا ہوگا۔"

گوئل صاحب کہنے جا رہے تھے کہ انھوں نے تو پہلے ہی کئی بار کہا تھا کہ انھیں پیشاب پیلا آ رہا ہے .... لیکن ڈاکٹر چیٹرجی نے ان کی بات نہیں سنی۔ نسخہ لکھ کر دیا اور یہ ہدایت دے کر کہ دودھ، گھی، روٹی کچھ دن کے لئے ترک کر دینا ہے اور پھل اور ابلی سبزیاں کھانا ہے۔ وہ اندر معائنے کے کمرے میں لیٹے ہوئے مریض کو دیکھنے چل دئے۔

گوئل صاحب پر اس عرصے میں بیس پچیس کی چپت پڑ چکی تھی۔ انھیں ڈاکٹر پر بے حد غصہ آیا۔ میں کہتا تھا کہ میرے قارورے کا رنگ پیلا ہو گیا ہے، میرا جی گھبراتا ہے۔ بدن میں بہت گرمی ہے ... اور وٹامن بی کے انجکشن لگا دئے ——

اور پہلی بار انھیں ڈاکٹر کی وہ تیزی کھلی جس سے وہ ایک بار میں تین مریض نمٹاتے تھے اور جس کی گوئل صاحب دل ہی دل میں بہت تعریف کرتے تھے۔

گھر آ کر انھوں نے بیس گالیاں ڈاکٹر کو دیں۔ دوائیاں اٹھا کر پھینک دیں اور بیوی سے کہا کہ آج سے وہ صرف گنے کا رس پئیں گے اور پھلوں اور ابلی ہوئی سبزیوں کا استعمال کریں گے۔ ان کے چھوٹے بھائی کو ایک بار یرقان ہو گیا تھا اور صرف گنے کا رس پینے سے اسے آرام آگیا تھا۔ وہی علاج وہ بھی کریں گے اور کسی ڈاکٹر کے چکر میں نہیں پڑیں گے۔

مسز گوئل نے ایک بار دبی زبان سے کہا کہ شاید ڈاکٹر اوستھی نے کوئی ہائی پوٹینسی کی دوا دے دی ہے۔ ذرا ان سے کہئے کہ وہ کوئی اینٹی ڈوٹ دے دیں!

لیکن اس بات پر جن قہر آلود نظروں سے گوئل صاحب نے انھیں دیکھا اس سے انھیں آگے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی اور انھوں نے چپ چاپ ملازم کو موسمبی، سنترے اور کچھ سبزیاں لانے کے لئے بھیج دیا۔

گوئل صاحب کی طبیعت خاصی خراب ہو گئی۔ آنکھوں کے ساتھ ہی ان کا تمام جسم زرد پڑ گیا۔ مگر انھوں نے کسی ڈاکٹر سے رجوع نہ کیا۔ ان کی بیوی ان کے قریب کرسی پر بیٹھی کچھ کاڑھتی بنتی رہتیں۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتیں۔ مگر بھول کر بھی انھوں نے ڈاکٹر اوستھی یا ہومیوپیتھی کا نام نہیں لیا۔ رفتہ رفتہ گوئل صاحب کی طبیعت کچھ سنبھلنے لگی۔ انھیں بھوک لگنے لگی اور آنکھوں کی زردی بھی کم ہونے لگی۔ جبھی ایک دن ان کی بیوی نے حکیم چشتی کا ذکر کیا۔

مسز گوئل اپنے بھانجے کے لئے اونی ٹوپی بُن رہی تھیں۔ ہر سال وہ لوگ پہاڑ پر جاتے تھے۔ اور وہ وقت سے اپنے

انجے کو سوٹ بنا کر بھیج دینا چاہتی تھیں) اچانک وہ کہنے لگیں ۔ پانڈے کی بیوی حکیم چشتی کی بے حد تعریف کر رہی تھیں۔ ان کی بہن کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ پھر جانے کیا گرمی اس کے سر کو چڑھ گئی کہ وہ پاگل ہو گئی۔ تمام ڈاکٹر جتن کر کے ہار گئے۔ ڈاکٹر اوستھی بھی کچھ دن علاج کرتے رہے۔ (یہ بات انھوں نے گوئل صاحب کو خوش کرنے کے لئے کہی) لیکن کوئی کچھ نہ کر سکا۔ آخر انھوں نے رائے دی کہ اسے آگرہ، بریلی یا کانکے بھیج دیا جائے۔ کانکے کی سب نے تعریف کی۔ جوان جہاں بہن ۔۔۔ وہ بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی رچانے کی سوچ رہے تھے۔ انھیں گرمیوں میں لگن تھا۔ بریلی یا کانکے بھیجنے کو پانڈے جی تیار نہ ہوئے اور گھر میں اس کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ تبھی کسی نے حکیم چشتی کا پتہ بتلایا۔ ستر سال کی ان کی عمر ہے اور وہ بہت مشہور حکیم ہیں۔ یہاں سے کلکتہ اور امرت سر تک جاتے ہیں۔ انھوں نے چھ مہینے میں اسے ٹھیک کر دیا۔ آپ کہیے تو میں بلواؤں انھیں۔"

گوئل صاحب نے ان کی بات نہیں سنی۔ وہ اس سرخ ٹوپی کو دیکھ رہے تھے جو ان کی بیوی کے ہاتھوں میں تقریباً مکمل ہو گئی تھی۔ یکایک انھوں نے کہا۔ "تم میرے لئے دو ایک ایسی گول ٹوپیاں نہیں بن سکتیں؟"

"ٹوپیاں!" ان کی بیوی نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

"یہ رنگ تو بہت شوخ ہے۔ تم ڈارک بلو یا ڈارک گرے رنگ کی میرے سوٹوں سے میچ کرتی ہوئی دو ٹوپیاں بن دو تو بہت اچھا ہو۔"

"میں آج ہی اون لا کر شروع کر دوں گی۔" اور انھوں نے پھر حکیم چشتی کا ذکر چھیڑا۔ "تم کمزور ہو گئے ہو۔ حکیم چشتی کو بلواتی ہوں۔ ایسی دوا دیں گے کہ گرمی بھی نہ ہو اور جسم میں طاقت بھی آ جائے۔"

"میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔" گوئل صاحب نے قدرے ہنس کر کہا۔ "کیونکہ میرے سر کو پھر ٹھنڈ لگنے لگی ہے۔ تم نے غور نہیں کیا۔ آج میں دو تین بار چھینکا ہوں۔ تم بس میرے سوٹوں کے رنگ کا اون لے کر دو ایک ٹوپیاں بن دو۔"

ایک ہفتہ بعد جب گوئل صاحب مکمل طور پر صحت یاب ہو کر نیلا سوٹ پہنے ہوئے باہر نکلے تو ان کے سر پر بائیں طرف کو جھکی سوٹ کے ساتھ میچ کرتی ہوئی گول ٹوپی تھی۔ دوستوں نے جب ان کے کچھ کمزور ہو جانے پر اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے ان کے چہرے پر کھلنے والی اس ٹوپی کی تعریف کی تو گوئل صاحب ڈاکٹر دل کی تمام زیادتیاں بھول گئے۔

بلونت سنگھ

گلیاں

جب وہ کلبلا کر مکان کے کونے والے کمرے میں سے باہر نکلی تو اس نے انتہائی پریشانی کے عالم میں نگاہیں چاروں طرف دوڑائیں —— سہ پہر کے وقت گلی سنسان تھی اور اتفاق سے کسی نے بھی اُسے نہیں دیکھا۔ اس نے جھپٹ کر بھاگتے ہوئے اپنے گریبان کو سنبھالا اور خوف کے مارے کانپتی ہوئی اُنگلیوں سے بٹن بند کرنے لگی۔

اس کے پیچھے ہی بیلا سنگھ اور چھیلا سنگھ بھی لپک کر باہر آئے۔ یوں تو وہ آپس میں چچیرے بھائی تھے لیکن ایسے موقعوں پر وہ حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ اتفاق کا مظاہرہ کرتے ...... وہ تین ٹول کی ماں کو دبوچ لینا چاہتے تھے لیکن وہ ان کے چنگل سے بگٹٹ بھاگی جا رہی تھی۔

ان مردوں کے چہرے ایسے تھے جیسے گلال ملا گیلا آٹا چار دن تک جوں کا توں پڑا رہنے سے خمیرہ ہو کر پھول آئے۔ ناک کے نتھنوں کے بال منڈی کی مونچھوں کی طرح باہر کو جھانک رہے تھے۔ کنپٹیوں اور گالوں پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئی تھیں۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ رانیں پھڑک رہی تھیں — سانس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے انھوں نے آنکھیں سکیڑ کر فرار ہوتی ہوئی عورت پر آخری نگاہ ڈالی ..... اور پھر مایوس ہو کر بڑے گھیرے کی شلواریں پھڑپھڑاتے، بھالوؤں کی طرح پاؤں زمین پر پٹختے وہ دونوں واپس مکان میں جا گھسے۔

فرار شدہ عورت یوں بھاگی چلی جا رہی تھی جیسے وہ اسی طرح بھاگتی ہوئی اس دنیا کی حدوں کو پار کر جائے گی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سانولا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں جن پر وہ بار بار زبان پھیر رہی تھی۔ لیکن اس وقت زبان بھی تو سوکھ گئی تھی۔ میل کے کارن گردن کا پسینہ بھی گدلا ہو گیا تھا۔ آنکھیں پھٹی پھٹی۔ زور زور سے دھڑکتا ہوا دل پسلیوں کی دیوار سے سر پٹخ رہا تھا — اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج وہ جان دے دے گی۔

پچھلے ایک برس میں کئی بار اس کے دل میں مرنے کا خیال آیا کیونکہ موت کے سوا اس کے مسائل کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا.... اور آج اس نے آخری فیصلہ کر لیا تھا اور اسے عملی جامہ پہنانے کا مصمم ارادہ بھی کر لیا تھا۔ آبادی کے باہر ادھر دو اڑھائی فرلانگ کے فاصلے پر ایک گہرا کنواں تھا، بس اسی کنوئیں میں چھلانگ لگا دینے سے اس کے سارے مسائل یک قلم حل ہو سکتے تھے۔

اس کا جنم اسی گاؤں میں ہوا تھا، لیکن اب اسے گاؤں کہنا سراسر زیادتی تھی۔ نئی نئی اسکیمیں چلیں۔ ایک میل پرے نئے کارخانے کھل جانے سے گاؤں کی آبادی بڑھی۔ کارخانوں میں کام کرنے والے بہت سے لوگ اسی گاؤں میں رہنے لگے۔ کنوؤں کی جگہ ہینڈ پمپ لگ گئے۔ بعض مکانوں میں کچی اینٹوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ پکی اینٹوں کی دیواریں بھی کھڑی ہو گئیں۔ اکثر مکانوں کے آگے بہنے والی نالیاں بھی پختہ ہو گئیں۔ پہلے گنتی کی تین گلیاں

ہیں۔ اب گلیوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔ سادہ لوح دیہاتیوں کو یہاں یاں ہی گلیاں دکھائی دیتی تھیں ۔ اور پھر جس عورت کو خودکشی نے کی جلدی ہو اُسے یہ گلیاں بھول بھلیاں دکھائی نہ دیں تو اور کیا ہ ۔ ؟

اس کے دادا نے کافی لمبی عمر پائی۔ وہ ہر صبح نہار منہ آدھ پاؤ سرسوں کا خالص تیل پی جایا کرتے تھے اور اسے ہی اپنی صحت اور لمبی عمری کا سبب بتاتے تھے ۔ دیگر لوگ ان کی نصیحت پر عمل کرتے وئے تیل پیتے تو وہ ان کے پیٹ میں رکنے نہ پاتا، جوں کا توں خارج ہو جاتا۔ اسے ہضم کر لینا بھی ان کے سینہ کا راز تھا۔ گو اس راز سے وہ خود بھی واقف نہیں تھے۔ اگر ہوتے تو دوسروں کو بتانے سے گریز نہ کرتے۔ وہ پرانی قسم کے شاعر بھی تھے :

الف آکھیا پیرن مجاہت نے . . . . . .

ب بنا رجا (رضا) رب دی توں تبا دی نہ کھڑکدا اے

آج کے لوگ انھیں جو چاہے سمجھیں لیکن اپنے زمانے میں وہ صوفی سمجھے جاتے تھے ۔ وہ کہتے تھے کہ انسان کے خیالات گلیوں کے مانند ہیں ایسی گلیاں جن میں چلتا ہوا انسان نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے ۔ جب کسی کے دماغ میں ایک خیال آیا تو سمجھو کہ اس کے سامنے ایک گلی کھل گئی۔ کیوں انسان ایک خیال یا گلی پہ دوسرے خیال یا گلی کو ترجیح دیتا ہے ؟ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا۔ دادا اس مسئلے پر گھنٹوں باتیں کیا کرتے ۔ ان کے ہم عصر ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتیں سنا کرتے، لیکن ان کی ننھی پوتی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا . . . . . . وہ ذرا پرے ہٹ کر کھڑی ہوئی اپنی روکھی سوکھی چوٹی کو گرہیں دیتی رہتی ۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے دادا کیسی کیسی گرہیں اور کون کون سی گتھیاں کھول اور سلجھا رہے ہیں ، اسے تو محض ان کا چہرہ بھلا لگتا تھا، حالانکہ جھدری داڑھی کے پاس ان کے گال پر ایک بڑا سا مسّہ تھا جس میں سے کانٹوں کی طرح تین چار بال سیدھے کھڑے عجیب سے لگتے ۔

ایک مکان کی نکڑ سے دوسرے مکان کی نکڑ تک، گارے کی بنی ہوئی سپاٹ دیواریں یا کچی اینٹوں کی دیواریں جن کی درازوں میں پلستر کے جال۔ ایک نالی کے بعد دوسری نالی کو پھلانگتی ہوئی، دوسری سے تیسری، تیسری سے چوتھی . . . . مکان، دیواریں، نالیاں . . . گزرتی جا رہی تھیں۔

گرد آلود آسمان میں سورج اپنی شدت کی گرمی کے مارے خود تلملا رہا تھا۔

اس خوف سے کہ کہیں پاؤں کشادہ پائنچوں میں اُلجھ جانے سے وہ گر نہ پڑے اور چوٹ کھا جائے اس نے شلوار سمیٹ کر نیفے میں اُڑس لی تھی ۔ اسے اس پر ہنسی نہیں آرہی تھی کہ جب موت کو لبیک کہنے کی ٹھان ہی لی تو پھر چوٹ کھانے سے ڈرنا کیا . . . . . اس کے ٹخنے اب بھی چھلے تھے ۔

یہیں پر اس کا بچپن بیتا تھا۔ اسے اپنی سگی ماں کی صورت تک یاد نہیں تھی ۔ سوتیلی ماں نے بُرا سلوک نہیں کیا اس سے، لیکن اس عورت کو پیار کرنا نہیں آتا تھا، نہ بچوں سے نہ شوہر سے۔ عجیب ٹھس عورت تھی۔ کلائی میں لوہے کا موٹا سا کڑا چڑھائے رکھتی۔ اس ٹائپ کی عورت تھی اس کی ماں ۔ ہاں دادا جب تک جیتے رہے اسے بہت ہی لاڈ پیار کرتے رہے۔ دادا کی باتیں اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آئیں ۔ مگر وہ ان کی خاموش محبت کو سمجھتی تھی جس طرح اس کے گاؤں کی گلیوں کی تعداد محض تین تھی اسی طرح ان دنوں اس کے دماغ میں خیالات کے گلیوں کی تعداد بھی ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی . . . . . . دن، مہینے، سال گزرتے گئے۔ نگر کی گلیوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی ۔ اس کے دماغ کی گلیاں بھی شاخ در شاخ پھیلتی گئیں . . . . اُلجھتی گئیں . . . . جب دادا مر گئے تو اس کے دماغ کی بہت سی گلیاں قبرستانوں میں تبدیل ہو گئیں ۔

پھر وہ زمانہ بھی آیا جب اس کے بدن پر پھول کھل اُٹھے ۔

پیلاں دیاں چھانواں وے
مُڑ مُڑ کے نہ تکیاں کر
متریئی ماں دی دھی آں وے
مُڑ مُڑ کے نہ . . . .

اس کی ایک منہ لگی سہیلی نے یہ بول سنے اور کہا کہ تجھے ایک

وہاں ایک نظر دیکھنے کے لئے تیری گلی کے چکر لگایا کرتا ہے۔ وحشت بن کر وہ بھاگی۔ اس کے گھر میں ایک چھوٹا سا ٹوٹا ہوا آئینہ تھا جس میں پورا چہرہ دیکھنا ناممکن تھا۔ چناں چہ وہ ایک سہیلی کے گھر پہنچی۔ کسی حیلے سے ان کے بڑے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہاں اس نے اپنے آپ کو سر سے لے کر ناخن تک دیکھا۔ مطمئن ہو کر واپس لوٹی۔ پہلے اس دل پھینک آوارہ کو اچھی طرح دیکھا بھالا، کچھ جانا بوجھا اور پھر جب اسے دور ہی سے دیکھ پاتی تو صحن کا دروازہ دھڑاک سے بند کر دیتی۔ یہ امر یقینی ہے کہ اگر جلد ہی اس کی شادی نہ ہو جاتی تو وہ صحن کے دروازے کو اسی طرح ایک دن توڑ ڈالتی۔

وہ نہیں جانتی کہ وہ جوان کس طرح اس سے اپنا رشتہ جوڑنے میں کامیاب ہوا۔ کس گلی سے سہرا باندھ کر آیا اور روتی ہوئی سہیلیوں کے جھرمٹ میں سے اسے دلہن بنا کر چلتا بنا.... اور پھر اسے تین بچے دے کر نہ جانے کس گلی میں گھس گیا جہاں سے وہ لوٹ کر نہیں آیا۔

جب اس کا شوہر زندہ تھا تو وہ محلہ بھی آباد تھا جہاں وہ رہتی تھی۔ صبح کے وقت چڑیوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ بیتل کے چمٹوں اور ڈھولک کی آوازیں دور کے گوردوارے سے سنائی دیتیں۔ اونگھتی ہوئی فضا میں گوربانی کے شبد سنہرے پروں والے پرندوں کی طرح اڑ نکلتے، چک پھیریاں لیتے، ان جانی، ان سمجھی، ان بوجھی روپہلی گلیوں میں سے تیرتے ہوئے نکل جاتے اور اپنے پیچھے سنہری اور روپہلی چنگاریوں کے بل کھاتے اور رقص کرتے غبار کے راستے بناتے چلے جاتے۔ اس کے من کی گہرائیوں میں نیلے پانی کی جھیل تھی جس کے کناروں پر جگنوؤں کے بادل فراٹے بھرا کرتے تھے۔ پانی کی سطح پر کنول تھے جو اس دھندلی روشنی میں اسے صاف دکھائی نہیں دیتے تھے۔ جب یکے بعد دیگرے اس نے تین بچوں کو جنم دیا تو ان بچوں میں غیروں کو تو کوئی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دی لیکن ان کی ماں انھیں پہچان گئی۔ جب بچے گلی کی دھول میں کھیلا کرتے تو ماں کا سینہ خوشی کے مارے پھول جاتا.......

وہ بچے کیسے اندھیرے میں کیسے آجاتے ہیں آ گئے تھے.....

"کیسے آجاتے ہیں؟" — بچوں کا باپ مر گیا تو اس نے بار بار اس سوال کو اپنے من میں دہرایا۔

دوڑتی ہوئی جب وہ پیپل کے ایک چھوٹے سے پیڑ کے قریب سے گزری تو اس کو پتہ نہیں چلا کہ اس پہ بیسیوں ہرے بھرے طوطے بھی بیٹھے تھے۔ اسے تب پتہ چلا جب طوطے جھپاک سے گزرتی ہوئی، سہمی ہوئی اور مرنے پہ تلی ہوئی عورت سے ڈر کر پیڑ سے یوں پھٹ کر اڑے جیسے اناروں سے چنگاریاں چھوٹتی ہیں.... حالاں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ طوطے باتیں بنانے میں بڑے استاد ہوتے ہیں۔

اگر اس کے مرد کی موت سے پہلے کوئی اس سے کہتا کہ بیت راتے کے، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ایک تاریک گلی سے دوسری تاریک گلی میں چلتے ہوئے ایک سال گزارا جا سکتا ہے تو وہ کبھی اس بات پہ یقین نہ کرتی۔ لیکن اب اس نے خود یہ کارنامہ سر انجام دے دیا تھا۔ عجیب بات ہے۔ جس کام کو کبھی سوچا نہ تھا، جس کے تصور سے دل کانپ جاتا، وہی کام کیا — کرنا پڑا۔

واہگورو اکال پرکھ کی کرپا سے کسی نے اسے بیلا سنگھ اور چھیلا سنگھ کے مکان میں سے ایسی بری حالت میں نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بدنامی سے بچ گئی۔ اگر اسے اس بات کا علم ہوتا کہ اس مکان میں بلانے کے بعد اس سے اس بات کی توقع رکھی جائے گی تو وہ بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کرتی۔

کچھ روز پہلے جب کہ سورج تاریک تالاب میں چھلانگ لگانے سے پہلے افق پہ کش مکش کی حالت میں کھڑا تھا۔ مویشی گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ گھنٹیوں کی موٹی پتلی آوازوں سے نگر کے آس پاس کے کھیت گونج اٹھے تھے۔ وہ اپنے صحن والے تندور کو بھس ملے گارے سے لیپ رہی تھی تو اسے باہر والے دروازے کی دہلیز پہ موٹے موٹے بھاری جوتے دکھائی دیئے جو گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ ہر جوتے کی اکلوتی مونچھ اوپر کو اٹھ کر بچھو کے ڈنک کی طرح گھومی ہوئی تھی....... اس کا دل زور سے دھک

دھک کرنے لگا۔ مرد کے جوتے تھے وہ!

دھیرے دھیرے اس کی پلکیں اوپر کو اُٹھنے لگیں اور ان کے ساتھ ساتھ نگاہ بھی۔ جگمگاتے ہرے رنگ کا تہبند۔ سلک کا کرتا۔ نیچے کو لٹکتا ہوا پگڑی کا شملہ۔ ٹھڈی پر کالی داڑھی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی ...... اس کے اوپر وہ سمجھ گئی کہ مسکراتے ہوئے ہونٹ اور ناچتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیں گی۔ ایک بار جی چاہا کہ وہ یہیں سے اپنی نگاہ واپس لے آئے۔ لیکن جی چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس نے مجاً اوپر دیکھا تو ہونٹ مسکراہٹ سے مبرا اور چہرہ سنجیدہ تھا۔

بیلا سنگھ سر پر سجی سجائی پگڑی اٹھائے کھڑا جلیبیاں کھا رہا تھا ...... ان جلیبیوں کو وہ جلیب کہتے تھے —

"جلیب لے کر ادھر سے گزرا تو دروازہ کھلا دیکھ کر رک گیا ..."

کیوں رک گئے؟ — اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن وہ دل میں اتنا تو سمجھتا تھا کہ عورت کے من میں یہ سوال سر اُٹھا سکتا ہے۔

"بچے کہاں ہیں؟"

عورت کے چپ رہنے پر اس نے سوال کیا۔

شام یکایک کتنی خاموش ہو گئی تھی۔ شاید سارے مویشی اپنے اپنے گھر میں پہنچ چکے تھے عورت کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے گھر کے باہر ہانک دیا ہو۔

مجاً جلیبی کھاتے کھاتے بیلا سنگھ کا ہاتھ رُک گیا اور منھ کھلے کا کھلا رہ گیا — پل بھر کو یوں لگا جیسے وہ اب اپنے کشادہ منھ میں جلیبی کی بجائے عورت کو رکھ لے گا .... لیکن نہیں، ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جن بچوں کی بیلا سنگھ کو تلاش تھی وہ مکان میں سے ہی نکل آئے۔ فوراً آگے بڑھ کر اس نے جلیبیوں کا بڑا سا دونا ان کے حوالے کر دیا۔ "لو جلیب کھاؤ .... لو ... لو ... کھاؤ۔"

وہ منھ ویکھتی رہی۔ بیلا سنگھ بچوں سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے صحن کے دروازے سے پیچھے سر باہر نکال کر احتیاط دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ اس نے موقع کا فائدہ اُٹھایا۔ فوراً پاؤں گلی میں رکھا ...... اور گلیوں کے دھندلکے میں کھو گیا۔

بیلا سنگھ کی یاد تازہ ہو جانے سے اس کے پاؤں کو پر لگ گئے۔ اس کی وحشت اور دہشت اور بڑھی ..... وہ اور تیزی سے بھاگی ..... آسمان کورا تھا، البتہ اس وسیع اور صاف شفاف نیلی جھیل کے کنارے پر چند نیلی، پیلی، لال، سرمئی بدلیاں جل پریوں کی طرح سہمی سی ٹھٹکی کھڑی تھیں ...... کچھ عورتوں، مردوں، بچوں، گایوں، بھینسوں اور کوؤں نے اس فرار ہوتی ہوئی عورت کو سرسری نظر سے دیکھا اور پھر اپنے کاموں، خیالوں، گلیوں میں کھو گئے۔

کچھ روز مسلسل کسی دھندلی گلی میں سے بیلا سنگھ دھوئیں کے مرغولے کی طرح بل کھاتا ہوا آتا رہا۔ بظاہر بچوں سے پیار کرتا، انھیں مٹھائی کھلاتا، بڑی سنجیدگی سے۔ بچوں کی ماں کو سر سے پاؤں تک دیکھتا ..... کبھی یوں لگتا جیسے وہ ٹھنڈی آہ بھر کر کہہ رہا ہو "دیکھو رنگ کرتار دے۔" یعنی بھگوان کی لیلا نیاری ہے۔

اب وہ مکان اس کی ملکیت نہیں رہا تھا ..... رہن لو سود در سود کے چکر میں وہ اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بیلا سنگھ نے کہہ دیا — یہ بڑا ظلم ہے — چناں چہ وہ وہیں رہتی رہی۔ ساہوکار نے چپ سادھ لی۔

کتنی بار اسی قسم کے واقعات پیش آ چکے تھے۔ ان سب کا ایک ہی نتیجہ نکلتا تھا ..... فرار — بھاگ بھاگ کر وہ تنگ آ چکی تھی۔ بیلا سنگھ اور دوسرے لوگوں میں ایک بہت بڑا فرق تو یہ تھا کہ یہ شخص سنجیدگی کا پُتلا تھا۔ دوسروں کی ناچتی ہوئی پتلیوں کے پیچھے ہوس جڑے پھیلائے دکھائی دیتی تھی۔ اب چھیلا سنگھ بھی آنے لگا تھا۔ وہ بچوں کے لئے ایک اسکول کھولنے والے تھے۔ پڑھی لکھی نہ ہونے پر بھی وہ گورمکھی جانتی تھی۔ بیلا سنگھ اور چھیلا سنگھ بھی محض اتنا ہی چاہتے تھے۔ کہ وہ بچوں کو اوڑا 'ایڑا' ایڑی پڑھا دیا کرے۔

دراصل وہ اس کی مدد کا کوئی وسیلہ نکالنا چاہتے تھے۔ وہ تین بچوں کی ماں تھی۔ اس سنسار میں اس کا کوئی نہیں تھا۔

بھاگتے بھاگتے اس نے خوش قسمت عورتوں کو دیکھا جو اس وقت اپنے گھروں کی ٹھنڈی ڈیوڑھیوں میں بیٹھی چرخے کات رہی تھیں۔ اٹیرنے پر سوت لپیٹ رہی تھیں۔ بعض لاڈلے بچوں کے جھرمٹ میں بیٹھی موج مار رہی تھیں۔

آخر آج وہ ان کے مکان کے نکڑ والے کمرے میں پہونچ گئی۔ وہ ڈرتے ڈرتے ٹھٹک ٹھٹک کر قدم اٹھاتی ہوئی لوہے کی ایک کرسی کی طرف بڑھی۔ شلوار سنبھال کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے اس سینہ کو جس پر تین بچے پل چکے تھے، دوپٹے سے اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ اس کے بالوں کی مانگ بالکل سیدھی تھی جیسے کالی گھٹا میں اڑتے ہوئے سفید بگلوں کی قطار۔ اس نے سر پر بھی دوپٹہ اس انداز سے اوڑھ رکھا تھا کہ بال اچھی طرح ڈھک گئے تھے۔ اس کے دونوں ہونٹ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے خوابیدہ سے دکھائی دیتے تھے — وہ بڑی اچھی، بڑی پیاری، بڑی سلجھی ہوئی اور بڑی سگھڑ ماں دکھائی دے رہی تھی۔

بیلا سنگھ پہلے سے بیٹھا تھا۔ چھیلا سنگھ بعد میں آیا۔ ان کی آنکھوں میں لال لال ڈورے تھے، چہرے تمتمائے ہوئے تھے۔ وہ کھانا کھا کر آئے تھے یا پی کھا کر آئے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں ببول کا ایک ایک کانٹا تھا جس سے وہ دانتوں کو کرید رہے تھے — وہ دونوں اب بھی بڑے سنجیدہ تھے جیسے کوئی گہرا مسئلہ درپیش ہو۔

وہ نئے اسکول کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی تھی۔ ابھی تک تنخواہ کا فیصلہ بھی نہیں ہوا تھا، اور پھر اس کے ننھے تین بچے بھی تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ گلیوں کی خاک چھانتے پھریں اور بڑے ہو کر آوارہ ہو جائیں۔ اپنے سوالات اور مسائل اس نے ان کے سامنے رکھے۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے ضرورت محسوس نہیں کی یا شاید اسے کوئی جھجک ہو .... اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں نہیں کیں۔

اسی طرح سر جھکائے وہ ان کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ پل گزرتے گئے۔ خاموشی گہری ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے محسوس کیا کہ وہ دونوں اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے ہیں۔ شاید اپنی کالی گھوڑیوں پر سوار ہو کر کھیتوں کو نکل گئے ہوں ...... انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، آخر اس نے سر اوپر اٹھایا تو دیکھا کہ وہ کمرے میں جوں کے توں اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ بھاری بھرکم۔ لحیم شحیم۔ بھوت نما — اب انھوں نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ ان کی مونچھیں پھڑپھڑائیں — باچھیں چرگئیں، اور وہ ہنسنے لگے۔ آج پہلی بار وہ اس کے سامنے بے جھجک ہو کر بڑی بے تکلفی سے ہنسے۔

اسی رفتار سے اب وہ نگر کے کنارے تک پہونچ چکی تھی۔ وہ گوردوارے کے احاطے کے پاس سے گزر رہی تھی .... گلی کی جانب گوردوارے کی چار فٹ اونچی دیوار تھی اس کی اینٹیں ننگی تھیں۔ دیوار اور بڑے پھاٹک کی مرمت ہو رہی تھی۔ صحن میں جو کافی طویل و عریض تھا پرانے زمانے کا ایک چبوترا تھا اور چبوترے کے پاس چھوٹا سا تالاب تھا۔ اس تالاب کو مذہبی اہمیت حاصل نہیں تھی لیکن اس میں برگد اور شرینہ کے پیڑ تھے جن کی گھنی چھاؤں تلے کافی ٹھنڈک ہوتی تھی۔ اس سے گوردوارے کے گرنتھی جی ریٹھے اُبلے پانی میں سر دھو کر چھاؤں تلے بیٹھے کیس سکھا رہے تھے۔ تالاب کے کنارے کنارے پانی میں ادھ ڈوبے مینڈک انھیں اپنی اُبلی اُبلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ برگد کے پتے شاخوں سے ناتہ توڑ کر ہوا میں اٹکھیلیاں کرتے ہوئے پانی کے سینہ سے سینہ جا ملاتے اور ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں ڈولتے ننگے بچے پانی کی سطح پر اٹھلاتے۔

گلی کے قریب ایک جالی دار چبوترے سے سنگ مرمر کے حجرے میں سنت اوتار سنگھ ایک تان پورہ اپنے بازو کے حلقہ میں لئے بیٹھے تھے۔ انھوں نے بنا نکڑ کے گول ڈھنگ سے صافہ سر پہ لپیٹ رکھا تھا۔ گہرے گندمی رنگ کے ماتھے پر سوچ وچار اور وجدان کے دو گہرے بل خوابیدہ تھے۔ چوڑی دار پائجامے پہ

کھڑکا کرتا۔ گلے میں گیندے کے پیلے پھولوں کا ہار لئے نیم واشام کے کرتوں میں گائے جانے والے ایک شبد کی مشق کر رہے تھے۔ ایک ہاتھ کی انگلیاں تان پورے کے تاروں پر رقصاں تھیں۔ دوسرے ہاتھ سے کچھ کچھ وقفے کے بعد پہلو میں لٹکی ہوئی نو انچ لمبی کرپان کے دستے کو سہلاتے کیونکہ وجد میں آکر جب وہ جھومتے تو کرپان کا دستہ ان کے کولھے میں چبھنے لگتا۔ ان کی آواز میں درد رقصاں تھا۔ . . . لے ایسی جیسے نیم روشن سرنگ میں گہرے پانی کی ندی بہتی چلی جائے۔

کبوتر، لالیاں، ممٹریاں پہ کالے داغ لئے چڑے اور کئی پرند گوردوارے کی پھلواڑی میں چہچہا رہے تھے۔ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے وہ کسی جیتے جاگتے کیڑے پر چونچ کا وار کرتے۔ کیڑا کلبلا کر تڑپتا، بل کھاتا، سرکتا، اچکتا۔ آخر جان دے دیتا۔ اور اپنا مردہ جسم ان کا پیٹ بھرنے کے لئے تیاگ دیتا۔

گوردوارے کی حدود سے نکل کر وہ کھیتوں میں داخل ہو چکی تھی۔ اب منزل اور اس کے درمیان کھیت تھے اور چند پگڈنڈیاں۔ ایک جانب ایک رہٹ کے آگے اونٹ بے ڈول چال سے دائرے میں چکر لگا رہا تھا۔ دائرہ تھا اور اونٹ کے چکر۔ اور دوسری طرف ایک نیچے لمبے پھیلے بے برگ و گل بیری کی جھاڑیوں کی آڑ میں سے اس کنوئیں کی بوسیدہ منڈیر دکھائی دے رہی تھی جس میں چھلانگ لگا کر وہ ڈوب مرنا چاہتی تھی۔

جس تیزی سے اس کے قدم اٹھ رہے تھے اس سے بھی زیادہ تیزی سے اس کی نظریں تیرتی، تھرکتی، پھسلتی کھیتوں میں لہلہاتے ہوئے پودوں کی کونپلوں کو چومتی افق تک جا پہنچیں۔ کہیں کہیں کھیتوں میں مدفون بیج انگڑائیاں لے رہے تھے۔ روزِ روشن کے نور اور ان کے درمیان ظلمت اور مٹی کی تہ اور ان جانی دیکھی گلیوں کا جال حائل تھا۔

عورت اور دھرتی کا ایک سا حال تھا۔ دھرتی کے سینہ پر سے بھی بھرے ہوئے بادل کا رواں در کارواں اُچھلے ہوئے موتی برساتے گزر جاتے تھے۔ کن شاہراہوں سے آتے تھے اور کن منزلوں کی طرف گزر جاتے تھے . . . . دھرتی نہیں جانتی تھی۔ وہ اپنی کوکھ سے جنم دینا جانتی تھی۔ کتنی شکتی تھی اس میں۔ بیجوں میں سے پھوٹتی ہوئی وہ کونپلیں جو گرم ہوا کے ایک جھونکے سے مرجھا سکتی تھیں مٹی کے ذروں سے لڑتی بھڑتی ایں

توڑتے پھوڑتے ایک روز آفتاب و ماہتاب سے نگاہیں لڑاتیں۔

کائنات اور زندگی کے بے معنی پن پر کڑھنا، الجھنا، رونا بسورنا آسان ہے لیکن کس میں اس بے معنی پن کے حسن کے جلوے کو دیکھنے کی تاب ہے۔ یہ شہزادی ایک کہکشاں سے دوسری کہکشاں تک، ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک جھولا جھولتی ہے۔ بے معنی مسکراہٹیں بکھیرتی ہے لیکن یہ بھی تو یاد رکھنے کی بات ہے کہ اگر ہماری خوشی کسی کارن پر مبنی ہے تو ہم کب تک خوش رہ سکتے ہیں؟

کچھ دیر بعد وسیع آسمان کے گوشوں سے تاریکی جلوس در جلوس نکلے گی اور ان کا نگر اس تاریکی میں گم ہو جائے گا۔ اس کے پیچھے تاریک تہ گلیوں کو سنسان پا کر بلک بلک کر رو دیں گے۔

کنوئیں میں ڈوب مرنے کا پروگرام بھی ہو تو گلیوں میں سے ہو کر بھاگنا پڑتا ہے۔ اگر منزل تک پہنچنے کے لئے ایک گلی بھی پار نہ کرنی پڑے وہ منزل کیسی؟ یا شاید منزل اسی مقام پر ہوتی ہے جہاں سے انسان منزل تک پہونچنے کے لئے بھاگ نکلتا ہے۔

معاً وہ رک گئی۔ . . اس کے پاؤں سے اٹھنے والے دھوئیں کے بادل اس کی پنڈلیوں کے آس پاس منڈلانے لگے۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کے زیر و بم کو متوازن کرنا چاہا۔ اسے کنوئیں اور اس کی گہرائی میں پوشیدہ موت سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ پھر بھی دھیرے دھیرے گھوم کر اس نے پیٹھ کنوئیں کی طرف پھیر دی —— وہ بہادر نہیں بن گئی تھی۔ اسے اپنا مستقبل روشن نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے اصول اور اپنی عفت کی قربانی نہیں دینے جا رہی تھی . . . . . . تاہم اس نے بڑے سگھڑ پن سے اپنے سینہ پر دوپٹے کی تہ جمائی اور اس کا پلو سر کے اگلے حصہ تک کھینچ لیا، یہاں تک کہ اس کی آبناک پیشانی اور دوپٹے کے لب ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے اور آنسوؤں سے دھلی دھلائی صاف و شفاف جگمگاتی آنکھوں سے نگر پر ایک ناتمام نگاہ ڈالی۔

کب اور کس گلی سے دھرتی ماتا آئی، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی، کب اور کس گلی میں وہ گھل مل کر کھو گئی۔

جیلانی بانو

کلیجے کی پھانس

کہتے ہیں جھوٹ اور تیل کبھی تہہ میں نہیں بیٹھتے۔
لیکن مجال تھی کہ شاہد کی صورت دیکھ کر کوئی پہچان لیتا!
اور پھر ایسے وقت تو جناب بڑے سے بڑے گھاگ کے چھکے
چھوٹ جاتے ہیں۔ شاہد بے چارا کس شمار و قطار میں تھا۔

ویسے جھوٹ بولنے کا ارادہ ہو تو انسان پہلے سے منصوبے بناتا ہے۔ ایکٹنگ کی ریہرسل ہوتی ہے۔ لہجہ کے اتار چڑھاؤ کی مشق کر لیتے ہیں۔ یوں نہیں کہ میر صاحب جیسے فرشتہ صفت بزرگ نے ابا کی موجودگی میں اچانک اس سے پوچھ لیا

"ذرا سننا شاہد میاں، وہ جو کہتے ہیں کہ ہم کل جب اجمیر شریف سے آئے تو ــــ وہ جو کہتے ہیں ــــ میرا مطلب ہے کہ اسٹیشن پر ــــ وہ یعنی کہ عورتوں کے ڈبے کے پاس تم ہی تھے نا ــــ وہ جو کہتے ہیں کہ کسی لڑکی سے باتیں کر رہے تھے"۔۔

"ہیں ــــ؟" شاہد اچھل پڑا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ ابا اور میر صاحب کے سامنے کہے تو کیا کہے! "جی نہیں دادا جان ــ میں کیوں کسی لڑکی سے باتیں کرتا ــ!" وہ گھبرانے کے باوجود بڑی دلیری سے بولا اور اپنے ابا کی طرف یوں دیکھا جیسے اس احمق بڈھے کے بہتان سے بے حد خفا ہو۔

واہ بھئی ــ یہ میر صاحب بھی چھپے رستم نکلے۔ کہاں تو پارسائی کا یہ ڈھونگ کہ محلے کی بڑی بوڑھیاں اپنی لڑکیوں کو قرآن اور حدیث پڑھوانے کے لیے ان کے پاس بھیج دیتی ہیں۔ اور جناب وہ خود اجمیر شریف سے تشریف لائے تو سیدھی نگاہ پہنچی عورتوں کے ڈبے پہ۔

ــــ "تم نہیں تھے ــــ؟" وحشت کے مارے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ہاتھ پیر لرزنے لگے اور وہ بڑے بے چین سے نظر آنے لگے۔

ــــ "تم نہیں تھے ــــ؟" انھوں نے پھر شاہد کو ناقابل یقین نظروں سے دیکھا۔

"جی نہیں ــ میں کیوں ہوتا" ــ! شاہد نے ڈرتے ڈرتے ابا کی طرف فریادی نظروں سے دیکھا تو وہ بھی میر صاحب کو ناگوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ماجد صاحب کو شاید زندگی میں پہلی بار میر صاحب جھوٹے نظر آ رہے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ انھیں شاہد کی پاکبازی پر بڑا اعتماد ہو۔ لیکن میر صاحب کے اس وقت کہنے کا انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے وہ شاہد پر بہت بڑے الزام کا آغاز کرنا چاہتے ہوں۔ ورنہ کسی لڑکے کا عورتوں کے ڈبے کے پاس کھڑا ہونا ایسی کون سی انوکھی بات ہے کہ وہ خود شاہد سے اس بات کا اقرار کروانا چاہتے تھے! ماجد صاحب کے آفس کا وقت ہو چکا تھا۔ لیکن آج میر صاحب کو اپنے ہاں دیکھ کر وہ اتنے مسرور تھے کہ انھیں گلی کے موڑ تک رخصت کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ تاکہ محلے والوں پر بھی ذرا رعب پڑے کہ میر صاحب صرف ان ہی کے ہاں آیا کرتے ہیں۔

"اچھا تو میں چلتا ہوں ــ" وہ دونوں جہاں ہارے ہوئے جواری کی طرح اٹھے۔

"معاف کرنا میاں ــــ وہ جو کہتے ہیں کہ میں سمجھا وہ تم

ہی تھے — بالکل تمہاری صورت۔ ایسے ہی بھلے بال —— خیر جانے دو ——

وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھے تو ماجد صاحب کی چھوٹی عادت تھی کہ ابھی انھیں رخصت کرنے نہ آئے۔ جانے کیوں آج انھیں میر صاحب کی اس بات پر بڑا غصہ آ رہا تھا حالانکہ وہ بھی سب کی طرح ان کی عظمت سے سخت متاثر تھے۔

اور صرف ماجد صاحب ہی کیا میر صاحب کی دیانت داری اور شرافت پر تو سارا محلہ جان دیتا تھا۔ پتہ نہیں کیسے محلے کے بوڑھے اور بچّے نے اپنے اعتماد کا ووٹ انھیں دے دیا تھا — ہر لڑائی جھگڑے کا تصفیہ وہی کرتے۔ اتنی جائداد کے مالک ہونے کے باوجود اپنے اوپر کچھ خرچ نہ کر سکتے تھے۔ ان کی سچائی اور شرافت کے قصّے محلے کی عورتوں کو زبانی یاد تھے۔ ایک بار وہ اجمیر کے ٹکٹ چیکر سے ایک آنہ زیادہ لے آئے تھے۔ وہ آنہ لوٹانے خود اجمیر گئے — ایک بار انھوں نے اپنی ماما کو بے قصور ڈانٹ دیا تھا تو اس کے گھر جا کر معافی مانگی — جوانی میں بھی کبھی کسی عورت کو نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا —— اور ایک بار میرے تو —— اور مجھے — میرے ساتھ — سب اپنی اپنی کہنا چاہتے تھے۔ زیادہ عقل مند اور ترقی پسند قسم کے لوگ میر صاحب کی ان عادتوں کو وہم اور مراق کہہ کر مسکراتے تھے۔

اسی لئے ماجد اور شاہد کو سویرے ہی سویرے ان کے آنے پر تعجب ہوا تھا کیونکہ میر صاحب کبھی کسی کے ہاں نہ جاتے تھے۔ ستر پچہتر کے پیٹے میں آ چکے تھے۔ اس پیکر در بدن اور کمزور آنکھیں — پھر دنیا دیکھنے کی ہوس کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ دن رات اپنے سجدوں اور تسبیحوں میں مصروف رہتے۔ گھر سے مسجد اور مسجد سے اخبار کی دوکان — بس اسی لکیر پر چلتے تھے۔ البتہ شام کو محلے کا ہر مرد ان کی بیٹھک میں جمع ہوتا اور دنیا بھر کے مسائل پر باتیں ہوا کرتیں۔ اب تو لوگ اس بات کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ محلے میں کسی کا کوئی عزیز رشتہ دار مر جاتا تو وہ بھی خود ہی میر صاحب کے پاس آتا تھا تسلی کے الفاظ سننے کے لئے۔

تیسرے دن شاہد اپنے دوستوں میں بیٹھا رمی کھیل رہا تھا کہ میر صاحب کا نواسہ اُسے بلانے آیا۔ وہ سمجھ گیا کہ میر صاحب اپنی غلط فہمی پر اس سے معافی مانگیں گے۔ بے چارے بڑے بھولے اور راست گو تھے۔ بعض لڑکے تو یوں ہی تفریحاً انھیں ستانے کے لئے ان پر کوئی بڑا سا الزام لگا دیتے تھے اور وہ بے چارے ایک ایک سے اپنی صفائیاں کرواتے پھرتے تھے۔

شاہد ان کے ہاں پہنچا تو میر صاحب حیران پریشان سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کئی راتوں سے سوئے نہیں ہیں۔ شاہد کو دیکھتے ہی لپکے اور بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر اندر لے گئے۔ دالان سے کمرے میں اور کمرے سے ایک تہہ خانے نما کوٹھری میں۔ پھر اس کا بھی دروازہ بند کر کے بولے،

"بھئی اس دن مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی تھی کہ وہ جو کہتے ہیں کہ تمہارے ابا کے سامنے ہی وہ بات پوچھ بیٹھا —— ہاں تو وہ جو کہتے ہیں کہ بیٹے تم ہی تھے نا اسٹیشن پر ——؟"

"جی نہیں۔ میں کیوں ہوتا ——؟" شاہد جھنجھلا گیا۔ آخر اس بڈھے کو ایسی باتوں سے دلچسپی کیوں ہے۔ وہ کیوں اقرار کروانا چاہتا ہے! وہ فوراً دروازے کی طرف جانے لگا۔

"لیکن پوری بات تو سنتے جاؤ میاں —" وہ بھی شاہد کے پیچھے لپکے۔ ان کا ایک ہاتھ دل کو سہلا رہا تھا اور دوسرا کانپ رہا تھا۔

"کیا بتاؤں بیٹے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ پرسوں سے میں بڑی الجھن میں ہوں۔ مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ جو کہتے ہیں کہ تم کہیں میری بزرگی کا لحاظ کر کے تو نہیں چھپا رہے ہو!"

پھر انھوں نے شاہد کے چہرے پر برہمی کے آثار دیکھ کر کہا۔

"اگر میری بوڑھی آنکھوں نے دھوکا کھایا ہے تو پھر — تم — سچ بتاؤ بیٹے تم تو بالکل سچ کہہ رہے ہو نا —؟"

انھوں نے بڑے منت بھرے انداز میں پوچھا تو جانے کیوں شاہد کو ہنسی آ گئی۔ عجیب سنکی بڈھا ہے —

کئی دن گزر گئے اس بات کو۔ یہاں تک کہ شاہد نے اپنے جن دوستوں کو یہ لطیفہ سنایا تھا وہ دوسروں کو سنا سنا کے بور ہو گئے

اس دوران میں شاہد نے کئی بار اپنے آپ سے سوال کیا کہ میر صاحب بیمار ہیں تو اسے ذرا سکون سا ملا ۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ اپنی بیماری میں لگ کر وہ بات بھول گئے ۔ ورنہ پھر کسی دن یقیناً آ دھمکتے ۔ اس سے اقرار کروانے ۔

لیکن میر صاحب تو نہ آئے البتہ ایک دن ان کا بھتیجہ احسن آگیا جو شاہد کے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا ۔ آتے ہی اس نے بڑے اداس لہجے میں سنایا کہ ہمارے تاؤ میاں بہت بیمار ہیں اور آج انھوں نے مجھے بلایا تھا کہ

اتنا سنتے ہی شاہد نے اس کی بات کاٹ دی ۔

" تم سے پوچھا ہوگا کہ فلاں دن اسٹیشن پر ایک لڑکی سے تم ہی باتیں کر رہے تھے ؟ "

" مجھ سے —— ! احسن نے تعجب سے کہا —— " نہیں تو —— مگر انھوں نے مجھ سے یہ ضرور کہا ہے کہ میں تم سے یہ بات کسی طرح معلوم کروں —— "

" اُفوہ " شاہد اچانک غصّہ میں آگیا ۔

" آخر تمھارے تاؤ میاں میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں ۔ کیا انھیں یہ شبہ ہے کہ میں ان کے خاندان کی کسی لڑکی کو بھگائے لئے جا رہا تھا —— ورنہ اس لڑکی سے انھیں اتنی دل چسپی کیوں ہوگئی ہے ۔ بھئی تم سب بھائی بھی تو ہو —— کبھی تم لوگوں کی مصروفیتوں کا حال کیوں نہیں پوچھتے ! شاہد غصّہ میں بکتا رہا ۔ احسن چپکا بیٹھا سنتا رہا —— بات تو معقول تھی ۔ اگر تاؤ میاں اس کے پیچھے یوں ہاتھ دھو کر پڑ جائیں تو اسے کس کس بات کے اقرار کرنا پڑیں گے !

پھر احسن نے سگریٹ سلگا کے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا ،

" میرا خیال ہے تاؤ میاں کو تمھارے رومان کی کھوج نہیں ہے نہ اُن بیچارے کو اس لڑکی سے دل چسپی ہو سکتی ہے ۔ شاید وہ اس بات پر پشیمان ہوں کہ انھوں نے ایک جھوٹی بات . . . . "

" خیر —— خیر " —— شاہد نے ہاتھ اُٹھا کر اسے خاموش کر دیا ۔

" ہوا کریں پشیمان —— میں سچ کہہ رہا ہوں یار —— کہ آئندہ اگر انھوں نے مجھ سے یہ سوال کیا تو —— تو میں —— "

وہ سٹپٹا گیا ۔ وہ میر صاحب کی عزّت کرتا اس کے خاندان کی روایتوں میں شامل تھا ، اس دن کے بعد سے میر صاحب بھی جیسے ہار گئے ۔

حالانکہ کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ وہ حکیم صاحب کے ہاں سے دوا لے کر آتے وقت شاہد کو چوراہے پر ملے ۔ اس نے بڑی سعادت مندی سے انھیں سلام کیا اور وہ حسب عادت گردن ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے ۔

پھر جس دن شاہد اپنی امی کی دوائی لینے گیا تو میر صاحب حکیم صاحب کے سامنے بیٹھے اپنا حال سنا رہے تھے ۔

" بس یہاں تکلیف ہے —— انھوں نے اپنے سینے پر داہنی طرف ایک حلقہ سا کھینچا —— " ایسا لگتا ہے حکیم صاحب جیسے میرے کلیجے میں کوئی پھانس چبھ گئی ہے ۔ سارے بدن میں شدید کرب ہے ۔ اب تو مجھے کوئی ایسی دوا دیجئے کہ میرے سوچنے سمجھنے کی قوت ہی ختم ہو جائے ۔ "

دوا لے کر جب وہ چھڑی کے سہارے اُٹھے تو شاہد نے بڑھ کر انھیں تھام لیا ۔ اس کے دماغ سے میر صاحب کی وہ بات بالکل نکل چکی تھی ۔ خود میر صاحب بھی شاید بھول بھال گئے ہوں ۔ کیونکہ وہ راستے بھر شاہد کی امی کا مزاج پوچھتے رہے ۔ ان کی بیماری کے لئے اپنے آزمودہ نسخے بتائے ۔ پھر سیاسی حالات پر تبصرہ ہوتا رہا ۔ میر صاحب نے اس زمانے میں علی گڑھ سے بی ۔ اے کیا تھا ، جب بی ۔ اے پاس کرنے والوں کو لوگ چل چل کر دیکھنے آتے تھے ۔

جب گھر قریب آگیا تو میر صاحب نے سلام کے جواب میں پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا ،

" بیٹا ۔ اب تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو —— ؟ "

ان کے اتنے نرم لہجے کو دیکھ کر شاہد کو بڑی شرم آئی ۔

" جی نہیں دادا جان ، میں آپ سے کیوں خفا ہوتا —— "

" مگر بیٹا ، وہ جو کہتے ہیں کہ میرے دل میں تو ایک پھانس چبھ کر رہ گئی ہے ۔ تم شاید مجھ سے شرما رہے ہو یا خفا ہو —— ارے بھائی جوانی میں لوگ کیا کچھ نہیں کرتے —— ! تو مجھے کیا کرنا ہے تمھاری ان دل چسپیوں سے ۔ میں تو —— وہ جو کہتے ہیں

کو ـــــ "

اتنا سنتے ہی شاہد پھر انگاروں میں نہا گیا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس خبطی بڈھے سے کہے تو کیا کہے!

" آپ مجھے جھوٹا کیوں سمجھتے ہیں۔ اور میرا اعتبار نہیں تو اس لڑکی کی خبر لیجیے نا جسے آپ نے میرے ساتھ دیکھا تھا۔ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں ـــ " اس نے انتہائی غصے میں سنبھل سنبھل کر کہا۔

" نہیں بیٹا غصے میں مت آؤ۔ " وہ ڈر کے مارے کانپنے لگے۔ " وہ جو کہتے ہیں کہ میرا مطلب یہ نہیں تھا ـــ خیر، تم جاؤ اللہ حافظ ـــــ "

تھوڑی دیر جانے کے بعد شاہد نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ میر صاحب وہیں سڑک کے کنارے دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے تھے۔

اب تو میر صاحب کا نام ہی شاہد کی چڑ بن گیا تھا۔ دوست احباب اسے چڑاتے تو وہ سچ مچ دیوانوں کی طرح مارنے دوڑتا۔

کوئی کہتا ـــ " بیچارے کو رقیب بھی ملا تو کیسا بوڑھا کھوسٹ لیکن اس لڑکی پر کوئی تمہاری اجارہ داری تو نہیں ہے۔ ذرا میر صاحب کو بھی اپنے کلیجے کی پھانس نکالنے دو۔ "

" یار خدا کے لئے اب اس پاگل کا نام میرے سامنے مت لو " وہ سچ مچ غصے میں آجاتا تھا ـــ " ان سے کہہ دو کہ وہ لڑکی عنقریب حور کے ڈریس میں انھیں جنت کے دروازے پر ملے گی۔ " اور پھر سب خوب ہنستے۔

ایک ہفتے بعد شاہد نے سنا ـــ میر صاحب کا داماد چوک میں کھڑا کسی سے کہہ رہا تھا ـــ " اب ان کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ اللہ جانے کس چیز میں دم اٹکا ہے کہ سانس کا ڈورا چل رہا ہے ـــــ "
شاہد آگے بڑھ گیا۔ جانے کس کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ لیکن اسے کچھ گمان سا ہوا کہ یہ ذکر خیر میر صاحب کا تھا۔

•

ایک رات شاہد سیکنڈ شو سے واپس آیا تو ابا کے ڈر سے دروازہ کھلوانے کی ہمت نہ پڑی۔ چناں چہ حسب عادت دیوار سے صحن میں کود آیا تو کسی نے اسے دبوچ لیا۔ " جلدی چلو میر صاحب کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں ـــ " یہ ابا تھے جو میر صاحب کی بیماری سے گھبرا کر اسے گالیاں دینا بھی بھول گئے۔

" اونہہ ـــ میں نہیں جاؤں گا۔ " وہ چھوٹے بچوں کی طرح مچلنے لگا ـــ " وہ پھر وہی اسٹیشن والی بات سب کے سامنے دہرائیں گے! "

" کیا بکتا ہے ـــ ؟ " ابا اسے قہر آلود نظروں سے گھورنے لگے ـــ " آج ان باتوں کا وقت ہے ـــ ؟ محلے کے سارے لوگوں کے سامنے انھوں نے کہا کہ میں شاہد کو دیکھنا چاہتا ہوں ـــ سب جل گئے ' ہماری اتنی قدر افزائی ہے ـــ " ماجد صاحب کی خوشی کے مارے باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ اب وہ میر صاحب کا یہ واقعہ زندگی بھر لوگوں کو سنا کے مرعوب کیا کریں گے۔

پھر وہ اڑیل ٹٹو کی طرح گھسٹتا ہوا وہاں گیا ـــــ سارے شہر کی خلقت ان کے ہاں جمع تھی۔ عورتیں دوپٹوں سے منہ چھپائے سسکیاں لے رہی تھیں۔ مرد سرخ آنکھوں کو پونچھ کر آہیں بھر رہے تھے اور حکیم صاحب میر صاحب کی نبض تھامے بیٹھے تھے۔ اتنے لوگوں کو دیکھ کر شاہد گھبرا گیا مگر سب یوں خوش ہو گئے جیسے میر صاحب کا مسیحا آن پہنچا ہو۔ حکیم صاحب نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر میر صاحب کو بیدار کیا ـــ

یہ دیکھ کر شاہد کے دل کو دھکا سا لگا۔ میر صاحب واقعی لب دم تھے۔ اتنے دنوں میں وہ پلنگ کو لگ کر رہ گئے تھے۔ انھوں نے اپنی پتھرائی ہوئی آنکھیں شاہد پر گاڑ دیں اور ہاتھ اٹھانا چاہا تو اٹھ ہی نہ سکا۔

" شاہد بیٹا ـــ " شاہد کو ان کی بات سننے کے لئے ان کے لبوں پر جھک جانا پڑا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔
" وہ اس دن ـــ اسٹیشن پر ـــ تم ـــ تم ـــ "

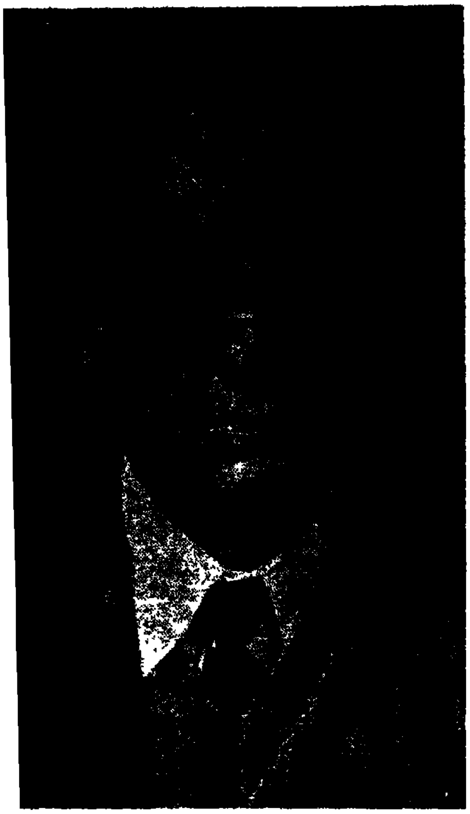
شاہد کے دل پر جیسے کسی نے گھونسا مار دیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ میر صاحب کے پیروں سے لپٹ جائے اور چلا چلا کے کہے کہ وہاں وہ میں تھا ـــ مگر شدید دکھ کے مارے اس کی آواز گھٹ گئی۔ اتنا سننے کے بعد ماجد صاحب آگے بڑھے۔ شاہد کو پیچھے ہٹا کر بولے ـــ

...کی سا بوجھ تھا اس وقت کیسے ڈھیل کر کے ...میں محسوس کیا — وہ سب مرتے نہیں تھے ...اس نے شاہد کو زبردستی دروازے کے باہر دھکیل دیا۔ ...پھسل کر نیچے گر پڑا۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ پھر وہ اُٹھ کر زور سے چلایا — ہاں وہ میں تھا — وہ میں تھا — لیکن میر صاحب کی منتظر نگاہیں اب اسے اقرار کرتے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

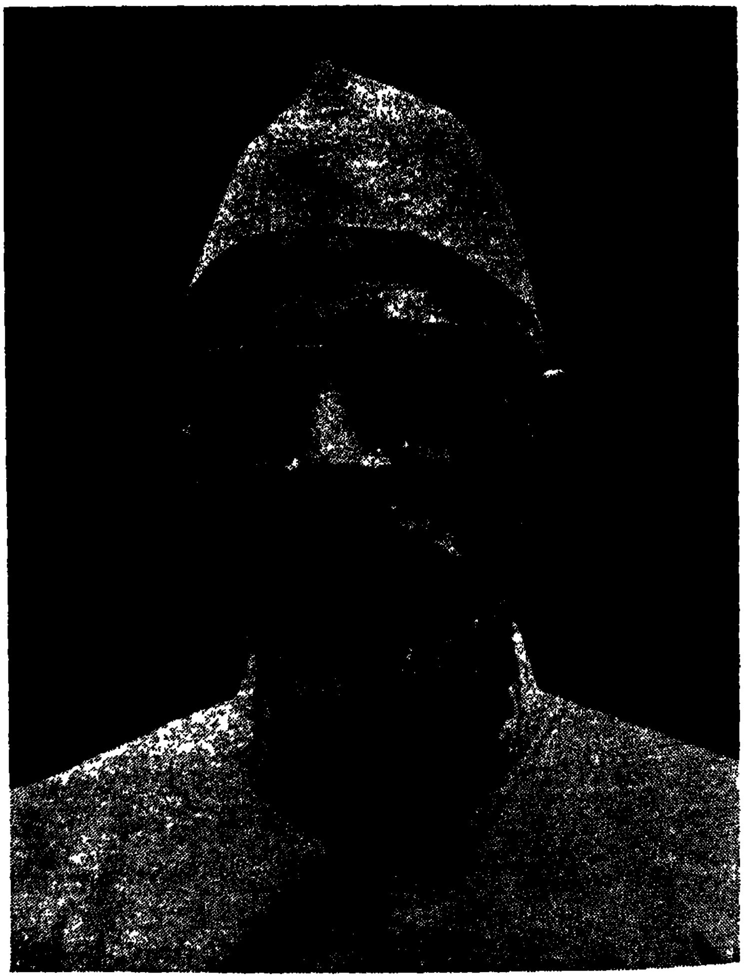
پھر وہ اُٹھ کر بھاگا — اس کے پیچھے پیچھے میر صاحب کے گھر سے بلند ہونے والی چیخیں دور تک آ رہی تھیں — لیکن وہ گلیوں میں چلّاتا پھر رہا تھا — وہ میں تھا — وہ میں تھا —

شاہد کے گلے میں گھسنے نے ایک کو ادھ مار کے چھوڑ دی تھی۔

اس شمارے کے لکھنے والے



کرشن چندر



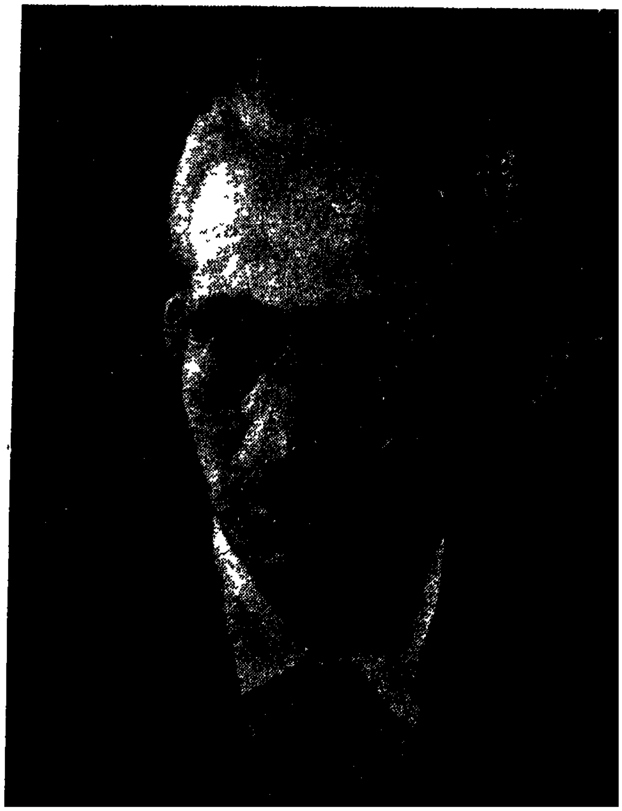
علی عباس حسینی



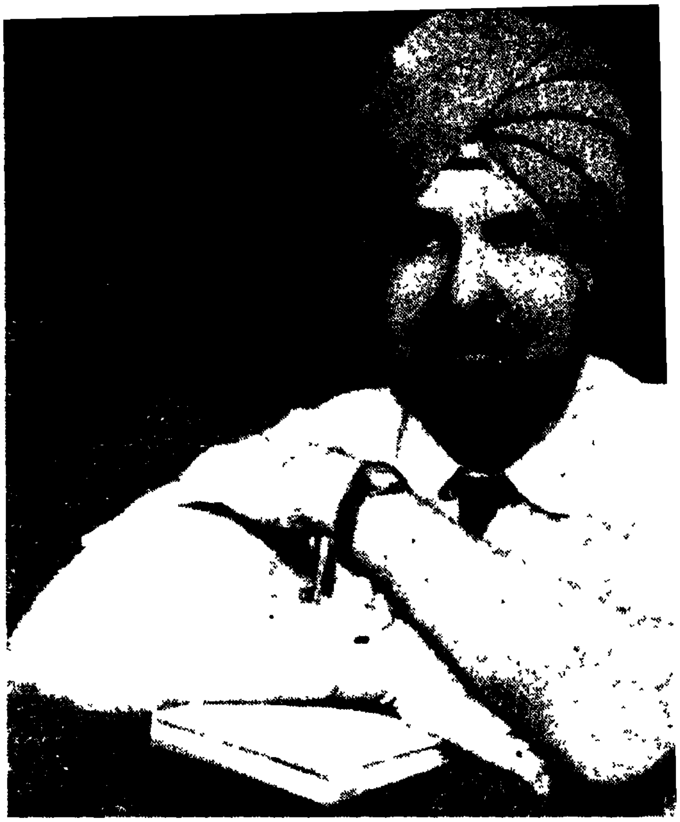
اپندر ناتھ اشک



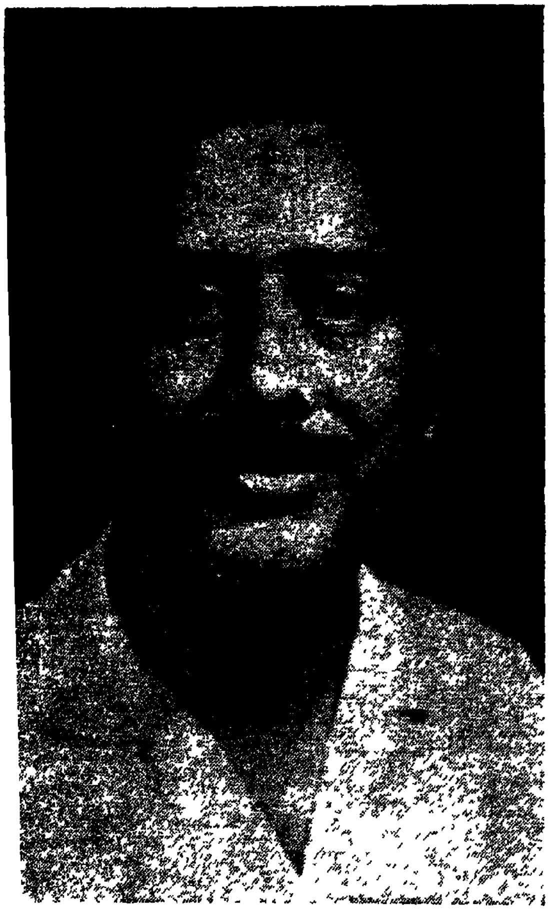
اختر اورینوی



کنہیا لال کپور



بلونت سنگھ



پریم ناتھ در



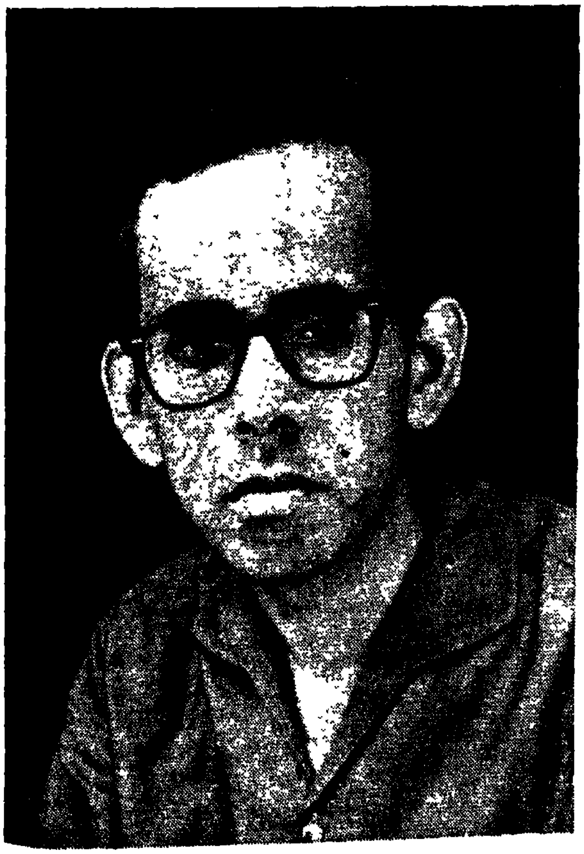


نریندر لوتھر



واجدہ تبسم





اختر اورینوی

محشر

بلا وجہ طبیعت اداس نہیں تھی۔ زندگی کی کوئی سی کل سیدھی تھی۔ اور احساس تو سب سے بڑی اذیت ہے۔ فن کار اپنی ذکاوتِ احساس سے نالاں تھا۔ لوگ کہتے تھے وہ جذباتی ہے۔ ہاں گدازِ دل بھی بُری بلا ہے۔ اچھائی سے محبت مصیبت ہے۔ بُرائی سے نفرت زحمت ہے۔ جذباتی آدمی محبت و نفرت کے تندور میں تپتا رہتا ہے۔

وہ دن بھر کتابیں پڑھتا رہا اور سوچتا رہا تھا۔ کوئی ایک کتاب ڈھنگ سے نہیں پڑھ رہا تھا۔ بس کتابوں کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ چند صفحے اس کے پڑھے، چند اس کے۔ کبھی ٹالسٹائے کے ناول، کبھی ہنری جیمز اور ہارڈی کے، کبھی پریم چند، پیسیڈنگ کے۔ ابھی 'گنگا دریا' سامنے موجیں مار رہا ہے اور ابھی 'گلستان' لہلہا رہا ہے۔ دن بھر وہ 'بالِ جبریل' کے سہارے پرواز کرتا، 'اقبال' چلتا، فلکِ قمر کی سیر کرتا دوری سے گزر کر حضوری تک پہنچا۔ مگر اسے اطمینان اور چین نصیب نہ ہوا۔ وہ زمین پہ اُتر آیا اور شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھنے لگا۔ اس کے المئے۔ دل اور کڑھا۔ کتابیں بند کر دیں اور پڑ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند نہ آئی۔ آج تو اسے بھوک پیاس بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا ذہن بڑے کرب میں مبتلا تھا اور اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔

فن کار کو دنیا کے حسن سے محبت تھی۔ اپنے وطن اور اپنے ہمسایوں سے محبت تھی۔ اُسے کبھی کبھی خدا سے بھی محبت سی ہونے لگتی تھی۔ لیکن یہ دنیا تو صد چہرہ تھی۔ خوبصورت چہرے، بدصورت چہرے اور دونوں کا پیار؟ کبھی گل و لالہ، کبھی آہ و نالہ! ہمسائے؟ کبھی نسیمِ گلشن، کبھی برقِ نشیمن! اور نہ جانے خدا نے انسان کو آزاد کیوں پیدا کیا۔ اور کیا آدمی بالکل آزاد ہے؟ کاش جبر مستقل ہوتا یا اختیار کامل۔ اور ابنِ آدم خیر و شر کے بھنور میں گرفتار نہ ہوتا۔ خیر ہی خیر ہوتا۔ حُسن ہی حُسن ہوتا!

فن کار اُٹھ بیٹھا۔ سگریٹ جلائی اور بستر پہ بیٹھا بیٹھا دھوئیں کے مرغولے بناتا رہا۔ بک شیلف سے فانی کی 'باقیاتِ فانی' نکالی تو پڑھنے لگا .... خواب ہے دیوانے کا —!

ہوئے کفن دامنِ بہار میں ہے! پہلے نے تو نوحے لکھے تھے۔ ہم سبھوں کو صرف نوحے لکھنے چاہئیں۔ مرثیے! صرف مرثیے! آسماں را حق بود گر خوں بہ بارد بر زمیں! .... فن کار اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

جب غم ناقابلِ برداشت ہو گیا تو وہ رونے لگا۔ رونا غم کا تیکھا پن نہیں، ہلکا پن ہے۔ اس نے سوچا کیا وہ اتھاہ دُکھ کا اظہار بھی کر سکتا ہے؟ کیا دکھ کی شدت کا اظہار ہو بھی سکتا ہے؟ خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری!

فن کار نے میز کی دراز میں رکھے ہوئے کاجو نکالے اور انھیں بڑے چاؤ سے کھانے لگا۔ جیسے زندگی کا سارا حسن، سارا رس، سارا لطف صرف کاجو کھانے میں ہے۔ ساری نیکی صرف

کا جو کہانی میں ہے۔ وہ کھاتا رہا۔ پھر اُسے پیاس لگی۔ وہ غسل خانے میں چلا گیا اور وہاں ڈلڈکا کے ٹوک سے خوب پانی پیا اور اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ اس نے دریچے کھول دئے۔ پتہ چلا شام ہو چکی ہے۔ مگر وہ باہر نہ نکلا۔ بجلی کی روشنی گُل کر دی۔ اب وہ پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ شام کے دھندلکے میں بیٹھا سوچتا رہا۔ بے ربط، جالوں سے اُلجھے ہوئے جالے۔ وہ اچانک ایک شعر گنگناتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا --

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل
یہی ہے فصلِ بہاری یہی ہے بادِ مراد

فن کار نے روشنی جلائی اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔ کرشن چندر؟ 'ہم وحشی ہیں! نہیں ہم تو نہایت مہذب ہیں۔ نہا.... یت مہذب! نہیں، ...... " اپنے دُکھ مجھے دے دو"! 'موذیل' کی ہتک نہ کرو۔ زندگی کو 'موتری' نہ بناؤ۔ "کالی شلوار" "ٹیڑھی لکیر" اتنے سارے کردار، اتنے واقعات! خالق و مخلوق، فن کار اور اس کا فن! فن کار نے ساری کتابیں بند کر دیں اور اپنے افسانوں کے مجموعے پہلی بار پڑھنے کے لئے کھولے۔ اُسے اپنی تخلیقات سے اچانک بڑی کشش محسوس ہوئی۔ وہ نہ جانے کب تک انھیں پڑھتا رہا۔ اور اسی عالم میں شاید سو گیا، شاید جاگ گیا —— ! اور اس نے پایا کہ وہ صاحب عرش و کرسی ہے۔ اس نے 'کُن' کہا اور 'فیکون' کی جلوہ گری ہوئی۔ اس کا کرہ عالم کون و فساد بن گیا۔ اس کی کہانیوں کے مجموعے دُخانی ہیولوں کی طرح رقص کرنے لگے۔ ان سے بہتیرے کُرے بن گئے اور فضائے بسیط میں ناچنے لگے۔ اُن کُروں پر جن و انس کی آبادیاں پیدا ہوئیں۔ انواع و اصناف نمودار ہوئیں۔ طرح طرح کی مخلوقات نے جنم لیا۔ حیات اور معاشرہ کے سوتے پھوٹ پڑے۔ ایک ایک کُرہ اس کے سامنے رقص کناں آیا۔ اس کی مخلوقات کی حاضری ہوئی۔ ایک ایک فرد کی پیشی ہوئی۔ اس نے خالق ہونے کا فخر محسوس کیا۔ اس کے ذہن کی ساری کہانیاں جی اٹھی تھیں۔ ساری شخصیتیں بیدار ہو گئی تھیں۔ "منظر و پس منظر" جاگ چکے تھے۔ اس کی تخلیق کی بوقلمونی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ زندگی کے سارے رُخ حقیقت کا رُخ دھار چکے تھے۔ اس کی "کلیاں اور کانٹے"، اس کی "تعمیر و شکست" "سیمنٹ اور ڈائنامیٹ"، "حیات کی روشن راہیں" اور "پہیلیاں"، اس کی "انارکلی" اور "بھول بھلیاں" سب ظاہر ہو گئی تھیں۔ افراد و اقوام کی "حسرتِ تعمیر" کا قصہ ذی حیات بن گیا۔ مخلوقات کے عروج و زوال کی داستان جاندار ہو گئی۔ اس کی "کہانیاں اور بال جبریل" مرتعش تھے۔ "سپنوں کے دیس" جیتی جاگتی تاریخ بن گئے۔ عدم معدوم تھا اور وجود حشر ساماں۔

اس کی تخلیق کے کُرے رقص کرتے رہے اور فن کار پندارِ خالقیت میں محو ہو گیا۔ اس کے دل میں اپنی مخلوقات کی محبت کا ایک بے پایاں جوش اُٹھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ ان سب کو اپنے قریب جمع کرے۔ اس نے اپنا داہنا ہاتھ پھیلایا اور ہر کُرے سے تمام مخلوقات کو سمیٹ کر اپنے بائیں کفِ دست پر اکٹھا کر لیا۔ ایک بے کراں محشرِ تخلیق سامنے تھا۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ لطیف و خبیر اور سمیع و بصیر ہے۔ اس کی پیدا کی ہوئی ایک ایک ہستی مکمل طور پر اس کے پیشِ نظر ہے۔ اس کی مخلوقات فن اس سے سرگرمِ تکلم ہیں، اپنی انفرادیت اور ماحول کے ساتھ —— !

ٹائپسٹ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ہے۔ داڑھی منڈی ہوئی مگر حجامت کو ترسی ہوئی۔ سانولا رنگ، چوڑی ہڈی مگر ڈھیلا ڈھانچہ، چہرے پر شکن، ماتھے پر بل، ناک پر ایک پُرانی سی عینک جس کی ٹوٹی ہوئی کمانیوں کو دھاگے سے جوڑا گیا تھا —— اس کا مفلوک الحال رین بسیرا، بھوکی بیوی، فاقہ زدہ خاندان، بیمار دم توڑتا بچہ، سود خوار قرض خواہ اور موت کا منڈلاتا ہوا سایہ۔

ٹائپسٹ نے کہا —"ہائے میرے بچے!" اور پھر فن کار کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ میرے خالق! 'ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے'!

فن کار خاموش تھا۔ ایک اور کردار اُبھرا ——

ماما دھیا — اس کا مستحکم عقیدہ تھا کہ دنیا کو اس کی بہت ضرورت ہے۔ وہ اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لئے قریباً گھر کی ہر بات میں دخل دینا چاہتی اور دخل دیتی۔ ایک آنکھ میں موتیا بند اور دوسری کمزور۔ اسّی سال سے اوپر کی ہے۔ اس نے گھر کے سارے ملازمین کے خلاف محاذ قائم کر رکھا ہے۔

'شبراتیا آج تک بھر پیٹ کھانا نا نکالس۔ اور سلمتا کوڑھی دن بھر بہت تنگ کرتا رہے ہے۔ گھر میں پلّو کے طرح آدمین اُپلائے چلیں۔ مر ٹیو نہ جائیں سب!.....'

اور شبراتیا باورچی گرجا — 'بڑھیا کھردار! ہم سب کو اکو سامت کرا!'

ماما دھیا کی بے تابانہ چیخ سُنی گئی۔

'ہائے ہائے! سب پھیک پھاک دہس۔ میجا ہو سلمتا کو پلنگ میں مرسے!...... اب کا بابو! برتیا کے باوا ای سیسی دہس تھا!'

سلمتا فن کار کے کف دست پر بالکل گھبرایا ہوا کھڑا تھا۔ کاٹو تو لہو نہیں۔ اور بڑھیا کے سرمہ کی شیشی چکنا چور ہو چکی تھی۔

بڑھیا نے فن کار سے پوچھا — 'تم میرے مرے ہوئے کھاوند کا بھید کاہے کھولیو؟' —

— اور تبسم، ایک دل دوز اداکھا تبسم، پُردرد، بیتی، مایوس، مترنم۔ وہ ایک مزدور ہے۔ عمر رسیدہ ...... اس کا سارا جسم عریاں ہے، صرف کمر میں ایک میلی سی پھٹی ہوئی لنگوٹی ہے ...... بولا ...... 'مجبور، کوئی کام!....... سرکار جو کام کا حکم ہو۔ کام مل جاتا تو پیٹ پالنے کا سہارا ہو جاتا۔ بچے سب بھوکے ہے۔ کوئی کام نہیں ملتا ......' پھر بولا — 'مجبور ہم کو بھوکھا کتا کاہے بنا دیا؟"

— نہار لراتی ہوئی رحمو کے ساتھ آگے بڑھی۔ بولی: 'کوئی سفید پوش مجھے ملتا۔ رحمو قسمت میں کیوں ٹھوک دیا گیا۔' اور شکور بولا۔ 'آنکھ کا اندھا، اکل کا پورا، تیری جو ردو تو منشی کی رکھنی ہے۔ سب کے آگے تو آچکی ہے۔ پیتر والے سے بھی بدتر ہے۔' اور پھر رحمو نے فریاد کی: 'ہم کو بے بس کاہے لا بنایا؟'

ایک پلّے کے بھونکنے کی آواز نے فن کار کی توجہ اپنی جانب منعطف کرائی۔ ایک بھکارن پلّے کے پاس پہنچی۔ اسے اپنے میلے آنچل کی پوٹری سے نکال نکال کر ہڈیاں اور سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے کھلاتی رہی۔ جب بھکارن پلّے کو کھلا چکی تو اس نے خود کچھ روٹی کے کنارے کھائے اور اس کے بعد پلّے کو کھونٹی سے کھول کر گود میں لے لیا۔ اور بجھی ہوئی پیال پر جا کر اسے پہلو میں لئے لیٹ گئی۔ بھکارن کچھ لوریاں سی گاتی جا رہی تھی ......

جینے کے سہارے! بھکارن اپنے خالق سے ہم کلام ہوئی۔ 'لوریاں نہیں، گھٹے ہوئے نالے ہیں، جنھیں تو ناحق نغمہ بنوانے کی کوشش کر رہا ہے۔'

اور پلّے نے شکوہ کیا۔ 'تم ہی بنایا تھا مجھے تو ایک بھکارن کا پالتو نہ بنایا ہوتا۔'

— پھر خرگوش اور ناصر شاکرہ کی جذباتی زندگی میں داخل ہو گئے۔ شاکرہ چاہتی، ناصر بھی شوخ چنچل ہوتا اور اچھی اچھی باتیں کرتا۔ مگر وہ تو ایک بے وقوف سا، مضمحل، اُم گو لڑکا تھا۔ اور شاکرہ کو موٹی، گول مٹول، باتونی، نصیحت افزا، کچر کچر پان چبانے والی خالہ جی سے پالا پڑا تھا۔ اس نے فن کار سے کہا — 'کاش ناصر کی آنکھوں میں کچھ زندگی کے آثار ہوتے!'

— شکور دادا اپنی مخصوص بذلہ سنجانہ ترنگ میں گانے لگے "نیم شبے مترو اتو چہ گفتی، چہ گفتی، چہ گفتی رے! نیم شبو سے ......! لیکن وہ بہت جلد تھک گئے۔ شکور دادا نے اپنی مشتاق ہوئی آنکھوں میں زندگی کی ساری حسرتیں مجتمع کر کے نہایت پُرسوز گلوگیر لہجے میں کہا — "بڑے فن کار بنے ہو! رشید بٹیا سے اتنا بھی نہ لکھوا سکیو کہ اس کو کتنا پریشانی ... ٹھنٹ ... فنڈ کار دپیہ ملا۔ ہائے کمیت خریدوا کے ہم سے امیر بھی نہ بنوا لیو!"

آنگ پاجامہ، چھوٹی بنیاین، کندھے جھکے ہوئے، سر نہوڑائے، آنکھیں زمین دوز، پر آنکھیں ہوں بھی۔ وہ تو گویا

اندھا ہے۔ شمشیر والے آزردہ ہو کے سوچا، کاش اس کی آنکھیں ہوتیں تو وہ بھی دنیا کے تماشے دیکھتا۔ "ہاں یار! بڈھا مانے ہے تیر پھر بیا" شمشیر والے نے شرما کے کہا: "سات بیست حرامجادہ! اک پیرے ہے کی پھر دیح جان ہم پہ جاسک ہیں۔ منہ تو دیکھے اپنا مرنی چوہ! مرنے کا بخا!" اور شمشیر والے نے فن کار سے بھی یہ شکوہ کیا —

کیا ظالم کو مرے عشق کا چرچا کر کے
خود بھی رسوا ہوئے آخر مجھے رسوا کر کے

— اور وہ تعداد میں تو تین تھیں، گوری، سانولی، گوارا اور ناگوار۔ بعض ان میں دلکش کہی جاسکتی تھیں مگر خوب صورت کوئی نہیں۔ سبھوں نے ایک ساتھ بڑھ کے فریاد کی — فن کار بابو! آپ نے ہمیں بس ایک گڑیا کیوں بنایا؟ اور وہ بھی خوب صورت نہیں!"

— اور گوپال نے فریاد کی: "مجھے تو موت ہی آئی شباب کے بدلے!"

اور منگتی رام مارواڑی آگے بڑھا۔ بہت ہی موٹا تازہ تین من اس کا وزن تھا۔ یہ غریب ساڑھے تین سال سینا ٹوریم میں رہ کر بغیر شفایاب ہوئے واپس آگیا تھا۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں بڑے بڑے غار تھے۔ بولا — "تم جھوٹے ہو فن کار، جھوٹے یا جانب دار، میرے لئے کسی نرس سے تم نے لب و رخسار ارزاں نہ کروائے۔ میری خاطر تو کسی دیوی نے بس گھول کر نہیں پیا، نہ محبت کے امرت میں ملا کر، نہ ہوس کی آگ میں بجھا کر۔ بے ایمان!"

اور کرن پاگلوں کی طرح آگے بڑھا، چیختا ہوا — "زندگی نہ خدا کے پاس ہے، نہ شیطان کے پاس، نہ کسی اور خالق کے پاس۔ ان سبھوں نے مل کر مخلوقات کے دل و جگر خون کئے ہیں اور بس! خون! خون! خون! خو.....ن!"

فن کار نے گھبرا کر اپنے بائیں ہاتھ کی مٹھی بند کرلی اور آہ و بکا کا ایک شور محشر اٹھا۔ سارے کردار چیخنے لگے۔ اس نے اپنی مٹھی کھول دی۔ اس کے کف دست پر دیر تک شور مچتا رہا۔ آخرش سکون ہوا اور — ایک اور چہرہ فن کار کے مقابل میں آیا۔ "راشدہ کی زیست معلق سی تھی، بے بنیاد۔ کوئی وسیلہ ایسا نہیں تھا جو حیات کے مختلف حصوں میں ربط، تسلسل اور موزونیت پیدا کردے ....." راشدہ نے جل کر فن کار سے پوچھا — "مجھے رومانی بنایا۔ میرے رومانوں کو مٹی میں ملایا اور اس پر ستم یہ کہ میرے سارے راز بھی افشا کر ڈالے۔ واہ!" —

— "پیشانی بالکل آپ کی طرح ہوگی اور آنکھیں اور بھویں — پر خدا نہ کرے کان آپ جیسے ہوں، ورنہ بالکل خرگوش معلوم ہوگا۔" — پلٹ کر بیوی میاں دونوں نے فن کار سے کہا — "آپ نے تو ہمیں نام بھی نہیں عنایت فرمائے۔ تو پھر بے نام لوگوں کو آپ اولاد کیوں بخشتے! آپ کی تخلیق میں درد و گداز کیسے پیدا ہوتا بھلا! ہم تو آپ کے فن پر قربان ہوئے۔ شکریہ!"

اور ایک ہجوم فن کار کے کف دست پر مظاہرہ کرنے لگا۔ نعرے لگنے لگے۔ احتجاجی شور و غل پیدا ہوا اور حسرت تعمیر و ناتمامیٔ تخلیق کی لامتناہی شکایتیں پیش کرنے والا کرداروں کا ایک وفد فن کار کی ہتھیلی کے ٹیلے پار کرتا ہوا اس کی کلائی تک بڑھ آیا۔

— یوس محبوب اس وفد کا لیڈر تھا، بولا — "بھائی جان! آپ فن کار نہیں، بدمعاش اور مجرم ہیں۔ مجھے پاگل ہی بنا دینا تھا تو میرے خوابوں کو حقیقت تو بن جانے دیتے۔ اگر میں برلا، ڈالمیا یا جمشید جی بن جاتا تو آپ کا فن زیادہ دلچسپ ہو جاتا۔ آپ مردم آزار بھی ہیں اور احمق بھی! قصہ کی روح رواں کو آپ نے پاگل بنا دیا۔ واہ! چہ خوب! تراگادوی ہے یہ! نہ ہوئی قسمت! کم از کم "فسانۂ آزاد" تو پڑھ لینا چاہیئے تھا تجھے۔ میں آزاد سے بڑا ہیرو بن سکتا تھا اور لے کے تو نے مجھے کانکے پہنچا دیا۔ اب تو خود کانکے کے قابل ہے ...."

— اور ایسا لگا کہ وفد کے سارے ارکان نے ایک ساتھ چیخ کر کہا — "ہم سب کو ٹیڑھا میڑھا کیوں بنایا۔ ڈھنگ کی ایک شخصیت بھی نہ بنائی۔ بنانا نہ آئے تو بگاڑو کیوں؟...."

پیارے پنڈت، سردو، سردار، اور سیر محبوب، جمیل اور بیگم شمشیر الدولہ، کپتان ڈیوڈ امام، عذری، شانتی، میر گھوسی،

دیوان سنگھ وغیرہ وغیرہ کے چہرے ایک دوسرے سے گڈمڈ ہوتے تھے۔ پس منظر میں سلمیٰ سوگیت کے پہلو میں منظر کا ڈول ابھرا، اس کے تھرتھراتے ہوئے لب اور شرمیلی آنکھیں۔ "آہ سرد کھینچ کر بولا — "مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی!" —

اچانک فن کار کے کفِ دست پر تاریک رات چھاگئی اور بوس محبوب کے سامنے ایک سیاہ گداز جسم اپنی فطری صحرائی صحت مندی کی ہلک لئے ہوئے چمکا ....'

آدی باسی لڑکی بولی — "مالک یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے!" اور ایک شورِ قیامت برپا ہوا۔ چاروں طرف آدی باسی چہرے اُبھرے۔ ٹنگا، ٹیکی اور ان گنت آدی باسی مزدور اور کسان۔ یہ سب کردار اپنے تیرکمان لئے فن کار کے سینہ کی طرف دوڑ پڑے اور جھاڑکھنڈی بولیوں میں چیخ چیخ کر بولنے لگے — "فن کار! اپنی دنیائے تخلیق میں تم نے آدی باسیوں کو اہم جگہ کیوں نہ دی؟ ہم سب صرف بھرتی کے کردار بنائے گئے۔ دنیا تو تم نے بوس محبوب، بیگم شمشیر الدولہ اور سلمیٰ سوگیت کی بنائی! جھاڑکھنڈ زندہ باد! فن کار مردہ باد!" — اس وحشی جلوس کے پیچھے بھٹکتا ہوا سکھ جیودہ "انارکلی" اور "بھول بھلیاں" کی پتریا کے ساتھ چلا آرہا تھا۔ وہ سائیکل پکڑے ہوئے تھا اور اس کے پیچھے اور بہت سے کردار تھے۔ ایک اور شور مچا — "ہم کو شکایت کا موقع بھی نہ ملا! ہم شکوہ بھی نہ کر سکے! انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد!"

فن کار نے بڑے رعب داب کے ساتھ بہ آوازِ بلند کہا — "خاموش!" اور اس کے بائیں کفِ دست پر سناٹا چھاگیا —

فن کار نے بڑے وقار سے کہا — "اے کردارو! اپنے خالق کا احسانِ تخلیق بھول گئے۔ بڑے عجلت پسند اور ناشکرے ہو۔ میں تمہیں عدم سے وجود میں لایا۔ تم بے نام و نشان تھے۔ میں نے تمہیں شخصیت بخشی اور تمہاری شخصیت کو انفرادیت عطا کی اور پھر تمہیں قابلِ ذکر بنایا۔ میں نے تمہیں آزادی اور بیباک داری سے نوازا۔ مگر تم عقل، تدبر اور فکر سے کام نہیں لیتے۔ تمہارے اندر سب صلاحیتیں موجود ہیں۔ مگر تم صرف اعتراض کرتے ہو، شکوہ و شکایت پہ اُتر آئے ہو۔ کیسا انقلاب ذہن و فکر ہے کہ خلقت خود خالق کا حساب لینے پر تُلی گئی ہے۔ جمہور آمر و حاکم کا محاسبہ کر رہی ہے اور آمر بھی وہ جو تمہارا خالق اور تمہاری پیدائش و تربیت کرنے والی ہستی ہے۔ سنو، غور کرو اور سمجھو۔ خالق کو یہ حق ہے کہ وہ جیسا چاہے بنائے۔ فن کار تخلیق کی جدت و بداعت میں آزاد ہے۔ طربیہ کردار ہو یا المیہ، بُرا ہو یا بھلا۔ فن میں نیرنگ و تنوع کے بغیر نہ حسن ہے، نہ تاثیر۔ آزاد فن کار نے تمہیں بھی آزاد و ممتاز پیدا کیا۔ کاش تم احسان مانتے!"

"باز آئے ہم آزادی و امتیاز سے۔ اس کی قیمت بہت گراں ادا کرنی پڑی، ناتمامی، محرومی، دردمندی، دل ریشی، مظلومی ......" مجمع فن کار کے کفِ دست پر جوش سے بولتا رہا اور فن کار اپنی مخلوق سے مایوس ہونے لگا۔ وہ یاس و غمگینی میں مبتلا ہوگیا۔ کیا وہ اپنے فن کی توانائی کی تخلیق پھر سے کرے؟ کیا وہ اپنی تجدید آپ کرے؟ — اس نے پھر ایک بار اپنی مخلوق کو سمجھانا چاہا — "یہی سچی بات ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔ یہی حق ہے کہ میں نے اپنے علم و بصیرت کے مطابق تمہارے وجودوں میں بڑے امکانات پیدا کیے۔ فن کار کی قوتِ اختراع اور اس کا بے ساختہ پن رنگ لطیف و پُرحکمت مقصد کے ساتھ ہم آہنگ ہوا اور تم پیدا کیے گئے۔ تمہارا وجود عبث نہیں۔ ابدیت تمہارا انعام ہے۔ اور فانی انسانوں کو حساس، ذکی، ہم درد اور ذہین بنانا تمہارا کام۔ ان کے اندر انقلابِ فکر و نظر برپا کرنا تمہاری تخلیق کا مقصد۔ تم اپنے خالق کی نعمتوں کا کب تک انتظار کرو گے؟"

میدانِ حشر میں پھر ایک شور مچا — "یہ جبرِ تخلیق ہے! .... یہ خود بینی ہے! .... ڈبویا مجھ کو ہونے نے!

...... مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو؟ ..... جہاں تیرا ہے یا میرا؟
.... انسانوں کی ہمدردی سے ہمیں کیا؟ ....
قصۂ آدم کو ہمارا لہو کیوں رنگین بنائے؟ ....."

فن کار سوچنے لگا — "تخلیق دردِ سر نہیں، اذیتِ روح، دردِ ذہن و کربِ دل ہے۔ اے میری مخلوق تیرا دردِ جگر میرے غم کے سامنے ہیچ ہے!"

اور فن کار کی بے قرار روح کے اندر ایک آواز گونجی —
تم نے سینوں کا دلیس پیدا کیا اور خدا سازی پر تُل گئے۔ تم کائنات کا راز جاننا چاہتے تھے اور تمہیں حسرت کے سوا کچھ نہ ملا۔ بھٹکنے والے اوہام! تم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ امیبا ہو یا جیلی فش، مینڈک، ہو یا میمون، گوریلا ہو یا ڈاروِن۔ تم زہریلی روح کی محض ایک کیچلی ہو۔ تم بالِ جبریل بننے کی لاحاصل کوشش کر رہے ہو۔ تم مشیّت کی بگڑی ہوئی تصویر ہو ملعون!"

فن کار کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس پر انتہائی یاس و حسرت طاری تھی۔ دل جیسے آخری سانس لے رہا ہو۔ وجود جیسے فنا ہو رہا ہو۔ دور کہیں فائر انجن خطرے کی گھنٹیاں بجاتا ہوا تیز جا رہا تھا۔ شہر میں آتشِ زندگی کی وبا آئی ہوئی تھی۔ زندگی جل رہی تھی۔ انسانیت کے ساز و برگ خاکستر ہو رہے تھے۔ اس کے لاشعور سے ایک مصرع اُبھرا

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک!



پریم ناتھ در

بے تال لمحے

سرکاری کوارٹروں کے اس چھوٹے نگر میں تین درجوں کے مکان ہیں۔ رہن سہن میں تین سطح کا فرق ہے۔ لیکن نگر کے اِس پار اور اُس پار، اس کے مغرب میں یا مشرق میں، اس کی اونچ میں یا نیچ میں، بڑی سڑک کے اِس کنارے یا چھوٹی سڑک کے اُس طرف، نکھرتی صبح ہو یا ڈھلتی شام، نگر بھر کی نپی تُلی زندگی کا ایک مقررہ انداز ہے، ایک بنیادی آہنگ ہے، ایک سیدھی سیدھی پھیکی پھیکی آواز جس کی تال نہیں بدلتی جس کے سُر نہیں بدلتے۔

یک رنگی سے اُکتا کر تبدیلی کی تلاش میں آدمی کو اس نگر سے باہر ہی جانا پڑتا ہے۔ لیکن یہاں بھی کبھی کبھی دل کی پیاس بجھانے کی کوئی بات ہوتی ہے۔ مثلاً پچھلے مہینے کی بات ہے جب ایک شام کو میں دن بھر کی تھکاوٹ سے مجبور ہو کر گھر تک کے فاصلے کو کم کرنے کے لئے چھوٹے گھروں کے بیچ میں سے نکل رہا تھا تو اتفاق سے ایک کوارٹر میں مار پیٹ ہو رہی تھی۔ واقعہ میں دلچسپی کی ایک یہ بھی بات تھی کہ ایک جوان سی بیوی اپنے مضبوط سے شوہر کے ہاتھوں پٹ رہی تھی۔ اب موقع ایسا تھا کہ بلا تردد ایک کمیاب واقعہ کی تفصیلات اپنی آنکھوں سے دیکھی جا سکتی تھیں۔ کیونکہ مار پیٹ کی تمام کھینچا تانی اور گرمجوشی ایک کمرہ کے مکان میں سما نہیں سکتی تھی۔ اس بات کا بھی مجھے احتمال تھا کہ یہاں اتنی بڑی بات بھی فوراً ختم ہو جاتی ہے جب چار پڑوسی اور چار راہگیر آگے بڑھتے ہیں، بیچ بچاؤ کرتے ہیں، وہ اس کو سُناتے ہیں وہ اس کو اور پھر زندگی ان چھوٹے کوارٹروں میں بھی اسی اپنی تال پر آ جاتی ہے، پھر اپنے قدم اسی اپنے رنگ میں جاتی ہے اور زیادہ سے زیادہ کچھ دیر کے لئے پڑوس کی عورتیں سڑک کے موڑ پر کچھ اور باتیں کرتی ہیں اور پھر زندگی کے اپنے اپنے ڈربے میں گھس جاتی ہیں۔

لیکن جب میں جلدی جلدی آگے بڑھا۔ میں نے دیکھا کہ عورت جو پٹ رہی ہے وہ اور کوئی نہیں ہماری ہسن دئی ہے۔ چار و ناچار مجھے دخل دینا پڑا، چار پڑوسیوں اور چار راہگیروں کے ساتھ مل کر ہسن دئی کو اس کے شوہر کے چنگل سے نکالنا پڑا۔ کچھ دیر میں کھڑا رہنا پڑا جب تک کہ وہ آدمی برآمدے کے ایک کونے میں بیڑی سلگا کر بیٹھ گیا اور ہسن دئی کی ہچکیاں رک گئیں۔ پھر سڑک کے موڑ پہ جمع ہوئی عورتیں بھی اپنے اپنے کوارٹروں میں گھس گئیں اور کھمبے کے پاس ہسن دئی کا بڑا بیٹا امام چند چار چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اور زندگی اسی اپنی تال پہ لوٹ آئی اور میں اپنی تھکن کے علاوہ اپنے گھر کے لئے خواہ مخواہ ایک ذہنی بوجھ کو ساتھ لے آیا۔

ہسن دئی کے اپنے گاؤں میں ہندو کم ہیں اور مسلمان زیادہ، شاید اسی لئے اس کی بولی میں شہری محاورہ ہے، شاید اسی لئے اس کے ایک بیٹے کا نام امام چند ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ خود اسے ہسن دئی کا نام دینے والوں پر حُسن یا حسین لفظ کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اثر تھا تو اس کے اپنے منہ کا۔ منہ پہ ہمیشہ کے لئے پھیلی ہوئی

ایک ہنسی کا، کھدری ہوئی ان لکیروں کا جو سدا کے لئے ایک ہنسی میں کھچی ہوئی تھیں، جو لکیریں ماں پیٹ کا سارا حال بتاتے ہوئے بھی مٹی نہیں تھیں۔

حسن دئی ہے کہ ہنسنے والی مرادی، کم بخت اب بھی ذرا سی بات پر ہنس اٹھتی ہے، اب بھی جب ڈھیلے ہونٹوں کا پھیلاؤ دبلے ہوئے گالوں کو ابھارتا نہیں بلکہ ان پر ایک سلوٹ ڈالتا ہے، جب چہرے کی کھال اور آنکھوں کا ماتم اس کی ہنسی کو باہر نکلی ہوئی ناک کے نیچے ہی روک دیتا ہے، جب کم بخت ہنستی کیا، ہنسی ہنسی میں ایک ایسا چہرہ سامنے رکھ دیتی ہے جیسے کسی ادھورے فن کار نے مٹی مسلنے کا ناٹک رچایا ہو اور ایسی عورت تیار کی ہو جو آدھے میں ہنس رہی ہے اور آدھے میں کوس رہی ہے۔

حسن دئی اپنے گاؤں میں ہوتی، آدھا ہنستی آدھا روتی ہمیں کیا تھا۔ ملک بھر کی کڑکتی دھوپ اور جھلستی ہوئی مٹی میں گاؤں ہی گاؤں ہیں، اور گاؤں والے ہیں، بے شمار، بے حساب، شکل و شباہت میں ایک جیسے، عمل و حرکت میں ایک جیسے، زندگی کے تنگ راستوں پر، کھیروں کی طرح، نہ کسی کی ہنسی میں نئی بات ہے، نہ کسی کے رونے کا الگ انداز، دھرتی پر ایک جیسے کنکر، یا دھول میں ایک جیسے تنکے۔

لیکن یہاں دلّی جیسے شہر میں ہمیں تکلیف یہ ہے کہ حسن دئی ہمارے گھر میں کام کرنے آتی ہے، ہر روز، بلاناغہ، صبح شام، دونوں وقت — لگتا ہے کہ میرے گھر کے تمام لمحات پر اسی کا قبضہ ہے کیونکہ جب وہ چلی بھی جاتی ہے ہم لوگ اکثر سوتے دم تک اسی کی باتیں کرتے ہیں۔

حسن دئی کے بدن میں دیہاتی چستی قائم ہے۔ ہر مشکل کام کو اپنا شکار سمجھتی ہے۔ رسوئی میں جتنے زیادہ برتن ہوں گے اتنی اس کی نسیں ابھر آئیں گی، اس کے نتھنوں میں اتنا تناؤ آئے گا، اس کی انگلیوں میں اتنا جوش آئے گا اور وہ برتنوں کے ڈھیر کو ہاتھوں کے شکنجے میں پکڑ کر ایک ہی بڑے حملے میں چمکا دے گی۔ ایک سانس میں دونوں برآمدوں اور چاروں کمروں میں جھاڑو لگائے گی۔ بھاری بھاری صندوق ہٹا کر، بڑے بڑے پلنگ کھسکا کر اور گرے ہوئے بچھونے جھاڑ کر — اور جب پونچھا اٹھائے گی تو بڑے بڑے گھیروں میں تیز ہاتھ چلا کر مکان بھر کو صاف کر دے گی — وہ ایک دو گھڑی میں بس کام کرتی ہے اور صرف چھ سال کے قلیل عرصے میں اس نے پانچ انسانوں کو پیدا کیا ہے۔

اب مصیبت یہ ہے کہ ہمارے گھر میں حسن دئی کی بے حد ضرورت ہے۔ نہ معلوم کام کہاں سے نکلتے ہیں جنہیں کوئی اور نہیں کر سکتا۔ وہ کالے پوچھن کو سفید کرنا جانتی ہے، جلے ہوئے برتن کو چمکانا جانتی ہے اور تیل مالش کے لیے ہاتھ چلاتی ہے کہ میری بیوی کی دکھتی رگیں سو جاتی ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ ڈھیر سارا مسالہ کوٹتی ہے، پیٹھی پیستی ہے، کوئلے توڑتی ہے، چولھے لیپتی ہے، آگ سلگاتی ہے، گیہوں بینتی ہے، چاول پھٹکتی ہے، آٹا گوندھتی ہے اور کم بخت اسی اپنی ہنسی کے ساتھ دلیا پر سے دُم کٹی چھپکلی کو بھگاتی ہے۔ سونگھ سونگھ کر مرے ہوئے چوہوں کو ڈھونڈ نکالتی ہے۔ کوٹھری میں سے بلّی کے بچوں کے لوتھڑے اٹھاتی ہے، روتی ہوئی بلّی کو بھگاتی ہے، اور یہاں تک کہ سامنے باہر اپنا بچہ بلک رہا ہے اس کے لئے پریشان نہیں ہوتی، اپنا کام چھوڑ کر باہر نہیں جاتی۔

پریشان تو خیر ہم ہی ہو جاتے ہیں۔ بھلا بتائیے کوئی کہ اپنی چوکھٹ پر کسی کا بچہ رو رہا ہے تو ہمیں گھر کے اندر کیا چین ملے گا۔ کمرے کی کھڑکی بھی بند کیجئے بچے کی آواز دیوار پھاڑتی ہوئی اندر آتی ہے اور خواہ مخواہ حسن دئی سے پوچھنا پڑتا ہے کہ آخر اس بچے کو گھر پر کیوں نہیں چھوڑتی۔ اسی بات پر حسن دئی کی رام کہانی شروع ہو جاتی ہے اور ہم کو یہ غصہ آنے لگتا ہے کہ ہم کیا کریں۔ ٹھیک ہے کہ بچے کو بخار ہے اور اسے دو سال کی بیٹی چھوکری سنبھال نہیں سکتی، اسی لئے گھسیٹتی کھینچتی وہ اسے یہیں لاتی ہے کہ گھر میں سب سے بڑا لڑکا امام بخش ہے جسے پوری چوتھی کا امتحان دینا ہے، وہ اسکول میں ناغہ کرے تو کیسے کرے۔ لیکن ہم بھی کریں تو کیا کریں۔ ہم مفت میں سوچنے لگتے ہیں کہ آخر اس بچے کا کیا ہوگا کہ اگر حسن دئی کو ایک دن کی چھٹی بھی دی جائے اور گھر کا کام خود کیا جائے۔ ایک دن کی بات سے کیا ہوگا، کیونکہ روز ہی حسن دئی کا کوئی نہ کوئی بچہ بیمار رہتا ہے اور روز ہی یہ عجیب عورت آکر خبر سناتی ہے، اسی اپنی ناک سے نیچی نیچی ہنسی کے ساتھ۔

حسن دئی دیہاتن نہ ہوتی، شہر کی ہواؤں میں پلی ہوتی تو وہ ہم کو

خبر بھی نہ ہوتی کہ بس کا کوئی بچہ بھی ہے۔ ہمارے گھر میں شاید ہی کبھی سے کوئی نہ پوچھتا کہ اس کا گھر والا کہاں ہے۔ دلی میں رام کہانیاں سننے کو کسے فرصت ہے؟ یہاں تو کہانی ہوتی بھی نہیں، کیونکہ کہانی وہی ہے جس میں کوئی نئی بات ہو، جس میں حیرت کا عنصر ہو۔ ہسن دئی کے پانچ بچے ہیں، اس میں کون سی نئی بات ہے، لیکن یہی بچے ہماری جان کا روگ ہو گئے ہیں۔

ہسن دئی انہیں بچوں کی خاطر میرے گھر کے کونے کونے کی خبر رکھتی ہے کہ کون سی روٹی کہاں بچ گئی، کون سا کپڑا پھٹنے لگا، کون سا جوتا چھوٹا ہو گیا، کس کی ٹوپی مٹی میں گر گئی، کس کے بستے میں دو قلم ہیں، کہاں کس کی کاپی فالتو پڑی ہے، اور بندی ہے، کھاٹ ہے، چٹائی ہے چادر ہے، جس پر نظر پڑی اسی کو مانگتی ہے، نہ بی بی جی ناکر سکتی ہے نہ بابو جی غصے کا اظہار۔ یہ لگائی بالکل نہیں سوچتی کہ بابو جی کوئی دھنا سیٹھ نہیں کہ آخر اس نے بھی تنکا تنکا اکٹھا کر کے اپنے بچوں کے لئے گھر کا ایک آشیانہ سا بنا رکھا ہے، کہ ان تنکوں میں سے وہ کتنے لے مرے گی جو اس کے پانچ بچوں کا گھر بھر جائے۔

ہم ہسن دئی سے یہ پوچھتے کہ تیرا کیا اپنا گھر والا نہیں جو تمہارے گھر کی فکر ہم کریں۔ لیکن نہ پوچھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کہیں ہمارے پوچھنے سے ہی ہسن دئی کے گھر کی فکر کرنے والا پیدا نہ ہو جائے اور وہ ہمارے گھر میں کام کرنا ہی چھوڑ دے۔ خیر ہسن دئی ایسی کہاں جو سوالوں کا انتظار کرتی اور اپنے گھر والے کی باتیں چھپائے رکھتی؟ اس نے تو اپنے ساتھ اپنے میاں کو بھی ہمارے ذہنوں پر سوار کر رکھا ہے۔ بنا پوچھے بھی میں اس کے آدمی کی بات بات کو جانتا ہوں کہ وہ چپڑاسی کا کام بھی جانتا ہے، چوکیدار کا بھی، کہ وہ خانساماں بھی ہے اور بیرا بھی، کہ وہ پان بھی لگا سکتا ہے اور چاٹ کی چھابڑی بھی۔ کمپنی ہو یا کوٹھی ہو، دونوں جگہ کا کام کر سکتا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں اُسے آج تک کوئی پکا کام ملا ہی نہیں کہ دس کام جو اس نے خود شروع کئے ایک بھی ان میں سے چلا نہیں۔ وہ آدمی بڑا سیلانی بھی ہے اور قسمت کو بلا بلا کر آزمانے والا۔ آج ایک جگہ ہے تو کل دوسری جگہ جائے گا۔ وہ ایک کھونٹی میں بندھنے والا نہیں۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا ہے مستقبل کو دیکھتا ہے، اسی لئے اس کی مونچھ کے دونوں نوک بنے ہوئے ہیں۔

ایسے آدمی کے ساتھ شاید ہسن دئی کو بھی گھومنا پڑتا اور نہ معلوم ہمارے ہاں کون اور کام کرتا ہوتا اگر ہسن دئی کا سسر سرکار کا چپڑاسی نہ ہوتا، اگر ہماری سرکاری کالونی میں اس کا بھی کوارٹر نہ ہوتا، سسر کے ساتھ ہسن دئی کی ساس بھی زندہ ہوتی تو شاید اپنے بچوں کی فکر میں ہسن دئی اکیلی نہ ہوتی، تو شاید اس کی ناک اس حد تک باہر نہ آئی ہوتی، تو شاید اس کی ہنسی چہرے کی کھال پر کچھ اور پھیلتی۔

ہسن دئی کا سسر ہے تو کس کام کا؟ یہی غنیمت ہے کہ کوارٹر کے کمرے میں رہنے دیتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے، بلکہ یوں کہو کہ کھانے کو دیتا ہے نہ پینے کو۔ اس کا چولھا ہے وہاں نہ چوکا۔ برآمدے میں ایک کھاٹ پڑی ہے جو گرمیوں میں کوارٹر کی چھت پر چلی جاتی ہے۔ اور جب سے اس کی بیوی مری ہے وہ تب ہی سے اپنے گھر سے اُکھڑ گیا ہے اور تب ہی سے اس کا کھانا پینا اس کی بھاوج کے ساتھ ہے، وہیں اس کی قبر ہے، وہیں دبا پڑا رہتا ہے۔

وہ بیٹے سے ناراض تو ہے لیکن لگتا ہے کہ جیسے بہو نے بھی اس کا کچھ بگاڑ رکھا ہو۔ کہتا ہے کہ کھانے کو دے گا تو بیٹا سنبھلے گا نہیں، کسی ایک کام پر ٹکے گا نہیں اور بچے بھوکے رہیں گے، آنکھوں کے سامنے بلکیں گے، اپنا کلیجہ کٹے گا، تب ہی کام کرنے نکلے گا، روزی کمائے گا اور انسان بنے گا۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن تبھی نا جب وہ آدمی گھر رہے، بچوں کو بلکتا دیکھے، بھوک کے نقشے پہچانے۔ وہ تو آج یہاں ہے تو کل وہاں۔ اور جب آجاتا ہے، نئی امیدیں لاتا ہے، دیا سا جلاتا ہے، رونق سا کرتا ہے، جب ہسن دئی کا دل پہلے دھڑکنے لگتا ہے، پھر اس کی نسیں ڈھیلی ہو جاتی ہیں، پتلیاں دم توڑتی ہیں اور اسے نیند سی آنے لگتی ہے۔ لیکن کئی بار وہ اسے پھر پیٹ کر چلا جاتا ہے، جب ہسن دئی کو ہوش آتا ہے اور کھوپڑی میں سمجھ کر قرضہ کتنا اور بڑھ گیا ہے اور کتنے فاقوں سے اتر جائے گا۔

پچھلی مارپیٹ کے بعد جب بسنتی دئی کا گھر والا پھر چلا گیا۔ چار دن کے تقاضے کے بعد بسنتی دئی نے سسر سے چار روپے منگوا لئے تھے۔ اس نے روکھا جواب دیا تو وہ چاندی کی بچی ہوئی ہنسلی دوکاندار کے پاس گروی رکھنے گئی لیکن اس نے بھی کہا کہ آدمی کو ساتھ لے آؤ تبھی روپے دوں گا۔ پھر وہ کہاں جاتی؟ آئی ہمارے پاس اور لے گئی۔ چار روپے کا آٹا ختم ہو گیا تو قسمت سے پڑوس میں شادی تھی تو وہیں سے تین دن اس کے اور اس کے بچوں کے لئے پوریاں ملیں۔ بسنتی دئی نے شادی کے تینوں دن پراتوں آٹا گوندھا، ٹوکریاں پوریاں نکالیں اور درجنوں گیت گائے۔ اس کے بعد آئی تو آنکھوں کا ماتم بڑھ گیا تھا۔ کھال اور پھیکی ہو گئی تھی لیکن وہ ہنسی وہیں تھی، انھیں اپنی لکیروں میں جو جوڑوں کا درد بتاتے ہوئے بھی مٹی نہیں۔

اب سوال پرانا یہی تھا کہ ناک کے نیچے نیچے بھی ہنسی کی یہ لکیریں مٹ کر چہرے کی کھال اور آنکھوں کے رنگ میں کیوں نہیں کھو جاتیں؟ لگتا ہے کہ یہ ہنسی چہرے کے اس کونے پر کھڑی کچھ لمحوں کا انتظار کرتی رہتی ہے اور وہ لمحے شاید آ بھی جاتے ہیں جب زندگی ایک نئی تال پر چلنے لگتی ہے جب سانسوں کی چال تیز ہو جاتی ہے، جب دنیا سر لسبہ بدلی ہوئی معلوم دیتی ہے۔

اور کل شام کو جب پڑوسی کی دعوت ختم ہو گئی تھی۔ بسنتی دئی رات کے گھنے اندھیرے میں بیٹھ کر میری بیوی سے الساتی ہوئی ہنسی کے ساتھ کہہ رہی تھی کہ جب وہ آئے گا وہ دروازہ بند کر لے گی — اور پھر اور پھر — وہ برآمدے کے کونے میں کھڑا ہو جائے گا، کھڑکی کے اندر جھانکے گا، پھر امام چند کو بلائے گا، پھر ہنسے گا — اور پھر اور پھر — بچوں کو ایک ایک کر کے پیار سے بلائے گا۔ کھڑکی میں سے ہی خربوزے کا تھیلا پکڑائے گا یا مونگ پھلی کی پوٹلی اور پھر، اور پھر۔ بچوں سے بولنے لگے گا، بہانے بنائے گا، کھڑے کھڑے کوئی نئی بات سنائے گا — اور پھر اور پھر — بسنتی دئی دروازہ کھولے گی۔

لیکن صحن میں چارپائی پر لیٹے لیٹے ہی جب میری بیوی نے کہا "کہ اندر آ کر لاٹھی اٹھائے گا — اور پھر، اور پھر۔ کسی بہانے سے تمھیں پھر مارے گا۔"

بسنتی دئی کی ہنسی ایک موڑ کھا کر رک گئی اور کہنے لگی کہ ماں جی بار کہہ چکی ہے کہ چلی آ گاؤں — چھوڑ دے اسے کسی قدردان کے پاس بیٹھے گی — لیکن بی بی جی، جب اس نے خبر نہ رکھی جو بیاہ کے لایا تھا وہ کیا رکھے گا جس کے پاس بیٹھ جاؤں گی —" پھر اس بار مجھے ایسا محسوس ہوا کہ برسوں سے کونے پر جو ہنسی کھڑی تھی وہ کھو گئی ہے، کہ وہ لکیریں جو سوا کے لئے کھدی ہوئی تھیں، مٹ گئی ہیں لیکن گھنے اندھیرے میں دکھائی کچھ بھی نہ دیا اور بسنتی دئی اس رات پھاٹک سے نکلتے ہی اندھیرے میں گھل گئی، چپ چاپ چلی گئی۔ اس کی آہٹ تک نہ سنائی دی اور نہ معلوم کیوں مجھے ایک تسلی سی ملی کہ بسنتی دئی کے چہرے پر ایک توازن آ گیا ہوگا۔ ناک کے نیچے بھی وہی رنگ ہوگا جو ناک کے اوپر تھا، کہ آنکھوں سے شروع ہو کر ایک واضح کہانی ہونٹوں پر ختم ہوتی دکھائی دے رہی ہوگی، کہ ابتدا انتہا ہم آہنگ ہوں گے۔

لیکن صبح ہوتے ہی روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ بسنتی دئی دروازے بجاتی اور اعلان کرتی ہوئی آئی کہ وہ آ گیا ہے۔ آیا ہی نہیں بیٹے کی سگائی بھی لایا ہے۔ بسنتی دئی کے بیٹے امام چند کی، اسی کی جو چھ برس بعد پوری چوتھی کی پڑھائی کر رہا ہے۔

"امام چند کی سگائی —؟" میں اپنے بستر سے اچھل پڑا۔

"جی آج مجھے جلدی جانا ہے۔ دو گھنٹوں میں درزی سے جوڑا بنوانا ہے۔ چاندی کی تین چیزیں خریدنی ہیں —"

بسنتی دئی کی بوٹی بوٹی نرم ہو کر لچکدار ہو گئی تھی اور مجھے لگا کہ نہ صرف اس کی ہنسی ناک سے اوپر تک آ گئی ہے بلکہ چہرے کی کھال پر پھیلنے لگی ہے اور ایک نئی کہانی کی ابتدا سی نیچے ہونٹوں سے ہی ہوتی ہے اور آنکھوں میں آ کر بھی ابھی ادھوری ہے۔ آنکھوں سے بھی کہیں آگے جا رہی ہے اور چہرے پر واقعی ایک توازن آ گیا ہے۔ پھر شام کو نہ جانے کیوں میں بسنتی دئی کے کوارٹر سے ہی گزر کر بازار گیا۔ دیکھا کہ پڑوس کی عورتیں بہو کا جوڑا اور چاندی کی تینوں چیزیں دیکھ چکی ہیں اور وہیں سڑک کے موڑ پر کچھ اور باتیں کر رہی ہیں — اور امام چند اپنے چار بھائی بہنوں کے ساتھ کھیل میں مصروف ہے۔

کنہیا لال کپور

شاطر صاحب

اگر کوئی شخص آپ کو اس مشاعرے کے اختتام پر ملے جس کے آپ اسٹیج سیکرٹری تھے اور آپ کو داد دینے کی بجائے یہ شکوہ زبان پر لائے کہ آپ نے نہایت بے ہودہ شعراء کو پڑھوایا اور خواہ مخواہ سامعین کا وقت ضائع کیا تو یقیناً آپ حیران ہوں گے، خاص کر جب آپ کی اس شخص سے راہ و رسم تک نہ ہو۔ لہٰذا اسی صورت حال سے مجھے دوچار ہونا پڑا، جب اس اجنبی سے میری ملاقات ہوئی جو ایک کی بجائے تین تخلص کرتا تھا اور جناب بھڑک دہلوی کا شاگرد تھا۔ میں نے اس سے یہ کہہ کر جان چھڑانا چاہی کہ شعراء کو مدعو کرنے والے اور حضرت تھے خاکسار نے تو صرف سٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دئے تھے لیکن وہ مجھے معاف کرنے پر آمادہ نظر نہ آیا، کہنے لگا — "اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو آپ کو ان جہلا کی تعریف کرنے کا کیا حق تھا۔ غضب خدا کا، آپ انھیں شاعر کہتے ہیں میں تو تک بند بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔"

"آپ کی تعریف؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"مجھے شاطر جنتیاوی کہتے ہیں۔ شاطر کے علاوہ آپ مجھے برباد یا عذاب جنتیاوی بھی کہہ سکتے ہیں۔"

"تو گویا آپ کے تین تخلص ہیں۔"

"جی ہاں، اور یہ اس لیے کہ بندہ بیک وقت رومانی، مزاحیہ اور ترقی پسند شاعر ہے۔"

"آپ کا شغل؟"

"خاکسار ایک مقامی اسکول میں کلرک ہے۔"

"بہت مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔"

"اجی صاحب رسمی باتیں رہنے دیجیے۔ میں دراصل یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ آئندہ جب کبھی مشاعرے کا اہتمام کریں خاکسار کو فراموش نہ کریں، خاص کر جب وہ جناب بھڑک دہلوی کا شاگرد ہے۔"

چند دنوں کے بعد شاطر صاحب میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ ان کی گفتگو سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ جناب بھڑک دہلوی اور اپنے علاوہ کسی کو شاعر نہیں مانتے اور بھڑک صاحب کو بھی اس لیے کہ وہ ان کے استاد تھے۔ اتفاق سے میری میز پر ایک مشہور اردو رسالے کا سالنامہ پڑا تھا۔ شاطر صاحب اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ ادھر ادھر سے دیکھنے کے بعد انھوں نے بڑی حقارت سے سالنامے کو زمین پر پٹکتے ہوئے کہا "تف! یہ خرافات ہے یا شاعری۔ ایک بھی کام کی غزل نہیں۔ بخدا ان سے بہتر غزلیں تو بندہ اچکن کے بٹن بند کرتے وقت کہہ لیتا ہے۔ خدا جانے اس عہد میں شاعروں کو کیا ہوا۔"

میں نے سوال کیا۔ "آپ کون سے رسالے کو اپنا کلام بھجواتے ہیں؟"

منہ بنا کر کہنے لگے۔ "کسی رسالے کو بھجوانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب سخن شناس ہی اٹھ گئے تو بھینس کے آگے بین بجانے سے فائدہ؟ شروع شروع میں ایک رسالے کی سرپرستی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ غزل بھجوائی۔ ایڈیٹر صاحب نے اس معذرت کے ساتھ

واپس کردی کہ آپ کا کلام کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ سبحان اللہ! یہ ہے پڑھے لکھوں کی سخن فہمی کا عالم۔ یوں نہیں کہتے کہ بالکل گنوار ہیں اس لیے ہمیں معذور سمجھا جائے۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں۔ اچھا کوئی اپنا شعر سنائیے۔"

کیسا شعر سنیں گے آپ۔ رومانی، مزاحیہ یا ترقی پسند؟"

"مزاحیہ۔"

بہتر۔ تو سماعت فرمائیے۔ عرض کیا ہے:

شاطر تمہارے عشق نے سب بل دئے نکال

مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

شعر سن کر مجھ پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ شاطر صاحب کو یہ ناگوار گزرا فرمانے لگے۔ "آپ نے داد نہیں دی۔"

میں نے عرض کیا۔ "معاف کیجیے شاطر صاحب، یہ شعر تو علامہ اقبال کا ہے۔"

شاطر صاحب نے بالکل نہ گھبراتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ پہلے شخص نہیں ہیں جنھوں نے یہ اعتراض کیا ہے۔ دراصل آپ کو اس شعر کا پس منظر معلوم نہیں۔ یہ شعر میں نے ایک مشاعرے میں پڑھا تھا۔ وہاں اتفاق سے علامہ اقبال بھی موجود تھے۔ انھیں اتنا پسند آیا کہ آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے۔ "کاش آپ میرا سارا دیوان لے لیں اور یہ شعر مجھے دے دیں۔" میں نے عرض کیا "آپ کا دیوان آپ کو مبارک۔ آپ بخوشی یہ شعر لے سکتے ہیں لیکن اس پر کاپی رائٹ میرا رہے گا۔"

"واقعی آپ نے بڑی فراخدلی دکھائی، شاطر صاحب۔"

"جی ہاں۔ اصل میں جو شخص فراخ دل نہیں وہ کبھی بڑا شاعر نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہو گیا۔ اسی مشاعرے میں علامہ آرزو بھی شرکت فرما رہے تھے۔ انھوں نے درخواست کی "چونکہ اس شعر کے دوسرے مصرع (مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی) میں میرا تخلص اتفاق سے آگیا ہے اس لیے یہ مصرع مجھے عنایت کریں لیکن میں نے ان سے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔ "جب میں سارا شعر اقبال کو دے چکا ہوں تو اس کا ایک مصرع آپ کو کیسے دے سکتا ہوں۔"

"بہت خوب۔ اچھا کوئی اور شعر سنائیے۔"

"ایک رومانی شعر سنیئے۔"

"ارشاد۔"

"عشق نے شاطر نکما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے"

"دوبارہ معاف کیجیے شاطر صاحب لیکن یہ شعر تو۔۔۔۔"

"آپ کا مطلب ہے غالب کا ہے۔"

"جی ہاں۔"

"آپ کو بھی مغالطہ ہوا لیکن اس میں آپ کا قصور نہیں۔ اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ جس مشاعرے میں پڑھا گیا۔ وہاں صاحب صدر نے اس کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا "ایسا شعر تو غالب ہی کہہ سکتا ہے"۔ اتفاق سے سامعین میں ایک کاتب بھی موجود تھا کہ جو انھیں دنوں 'دیوانِ غالب' کی کتابت کر رہا تھا۔ اس نے ازراہِ عقیدت یہ شعر بھی غالب سے منسوب کر دیا۔ ورنہ اہلِ دل جانتے ہیں کہ یہ شعر غالب کا نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ آپ بھی جانتے ہوں گے غالب نے آموں کے علاوہ کسی چیز سے عشق نہیں کیا اور کوئی شخص لذیذ آم کھا کر نکما نہیں ہو سکتا۔"

ایک دن یونہی بازار میں شاطر صاحب کے ساتھ تصادم ہو گیا۔ انھوں نے کہا۔ "میں آپ کی ہی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔"

"فرمائیے۔"

"لکھنؤ میں آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا ہے منتظمین نے دعوت نامہ بھجوایا ہے۔ آپ کے خیال میں مجھے وہاں جانا چاہیئے یا نہیں۔"

"ضرور جائیے۔ بھلا اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔"

"لیکن معاوضہ بہت قلیل ہے۔ صرف پانچ سو روپے اور فرسٹ کلاس کا کرایہ۔"

"یہ قلیل تو نہیں۔"

"کیا کہا۔ قلیل نہیں۔" شاطر صاحب نے گرج کر کہا ــــ "بھڑک دہلوی کے اکلوتے شاگرد کے لیے صرف پانچ سو روپے۔ یہ میری ہی نہیں بھڑک صاحب کی بھی توہین ہے۔"

"تو مت جائیے۔"

"لیکن آج کل ہاتھ ذرا تنگ ہے۔ سوچتا ہوں چلا ہی جاؤں۔"

"تو چلے جائیے۔"

"آپ کا مطلب ہے اس توہین کے ساتھ سمجھوتہ کرلوں۔ یہ ہو سکتا ہے۔ بزرگ صاحب نے وصیت کی تھی کہ صاحبزادے ایسے ذلیل حرکت کا ارتکاب کرنا لیکن قلیل معاوضہ قبول نہ کرنا۔"

"پھر تو آپ کو ہرگز نہیں جانا چاہیئے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں انھیں آج ہی تار بھجوا دیتا ہوں کہ مجھے ور سمجھا جائے۔"

شاطر صاحب کا اس مشاعرے میں شرکت نہ کرنے کا بڑا شہرہ سارے شہر میں ان کی دھوم مچ گئی۔ ہر شخص نے ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے محسوس کیا کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی بلند مزاج شاعر موجود ہیں۔ ایک رئیس کو جب پتہ چلا تو اس نے شاطر صاحب کو چائے پر مدعو کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان کے لڑکے کا (جس کی شادی مستقبل قریب میں ہو رہی تھی) سہرا لکھیں۔ بحث و تکرار کے بعد شاطر صاحب نے ان کی فرمائش منظور کرلی۔ ساڑھے سات سو روپیہ معاوضہ قرار پایا۔

دلدادگانِ شعر و سخن بڑے اشتیاق سے شاطر صاحب کے سہرے کا انتظار کرنے لگے۔ آخر وہ دن بھی آ پہنچا جب شاطر صاحب کو سہرا پڑھنا تھا۔ وہ ایک نئی شیروانی میں ملبوس ہو کر سٹیج پر تشریف لائے۔ سامعین کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ دو ایک بار کھانسے اور رئیس صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "حضور عرض کرتا ہوں —

"سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا"

شاطر صاحب نے ابھی دو شعر ہی پڑھے تھے کہ سامعین میں سے کسی نوجوان نے پکار کر کہا "اجی صاحب! یہ کیا مذاق ہے غالب کا سہرا آپ اپنے نام سے پڑھ رہے ہیں۔"

شاطر صاحب نے چلا کر جواب دیا — "کون کہتا ہے یہ سہرا غالب کا ہے۔"

"میں کہتا ہوں" اس نوجوان نے چیلنج کرتے ہوئے کہا۔

"ثبوت؟" شاطر صاحب نے مطالبہ کیا۔

"یہ رہا ثبوت؟" نوجوان نے جیب میں سے 'دیوانِ غالب' کا پاکٹ ایڈیشن نکالتے ہوئے کہا۔

جلسے میں ہلچل مچ گئی۔ شاطر صاحب کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ رئیس نے غرّا کر کہا — "یہ کیا حرکت ہے؟" اور شاطر صاحب یہ کہتے ہوئے 'معاف کیجئے، مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا' جلسے سے ٹوک دم بھاگے۔ دوسرے دن ہم نے سنا کہ شاطر صاحب نے شہر چھوڑ کر غبڑیا ہے میں سکونت اختیار کرلی ہے۔

ضروری گزارش

غیر مطلوبہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ بھیجے جائیں (ادارہ)

واجدہ تبسم

راہ

دالان کی پچھلی طرف سے نرگس دوڑتی ہوئی اور ہانپتی ہوئی بولی

"اے بی بی جلدی کیجئے، جلدی چلئے صنوبر تڑپ تڑپ دے رہی ہے —"

بڑی بیگم نے ایک زوردار دھڑاک کے ساتھ پاندان کے ڈھکنے کو گرایا اور کچھ مسکراتی کچھ جھلاتی ہوئی بولیں —

" آج اس کی شادی کردو تو اگلے برس بچہ جننے کو تیار ہو جائے اور دیکھو تو کم بختیا کو بات کرنے بھر کا سلیقہ نہیں — میں پوچھوں کیوں دی۔ بچہ جینس دیتی ہے یا عورت — ؟

ماما نے ہنس کر بی بی کی بات سے بات ملائی — "بی بی یہ آپ کا لاڈ پیار ہی تو ہے کہ شادی کے قابل ہوتے ہوا تے بھی سب اپنے آپ کو بچہ ہی جانتے ہیں اور بات کرنے کی گت بھی نہ آئے ہے —"

مگر ماما کی بات پوری ہونے سے قبل ہی بڑی بیگم لپک جھپک انگلی سے ہلکا چونا چاٹتی نوکر خانے تک پہونچ چکی تھیں — وہاں دیکھا تو سچ مچ صنوبر کا حال تباہ تھا — درد کی شدت سے اس کا منہ پہلے سے ہرا نیلا پڑ چکا تھا۔ دائی اپنی سی کوشش کر کے ہار چکی تھی۔ صنوبر کا حال دیکھا نہ جاتا تھا — یہاں سے وہاں تک جتنی مامائیں، نوکرانیاں، ان کی ملنے جلنے والیاں تھیں سب بدحواس — سبھوں کی زبانیں آپ ہی دعا مانگے جا رہی تھیں۔

"مولا! نورخاں کا باغ بستا رکھیو — !"

" خدایا بچپن ہے، ارمان بھری جان ہے، اپنا فضل کر دیو —"

خود نورخاں باہر کھڑا ہوا جو اپنے ہاتھ مل رہا تھا — کیسے کیسے ارمانوں سے چاؤ چونچلوں سے بیاہ کر لایا تھا — ابھی سال بھی تو نہ گزرا تھا — وہاں پان سی لڑکی نو مہینے بچے کو سنبھالتے سنبھالتے پیلی پڑ چکی تھی اللہ نے اسے اتنی استطاعت دی ہی نہیں تھی کہ پھل پھلاری دودھ گھی کھلا کر حاملہ کو صحت کی طرف پھیر لیتا — اور غریبوں کے دن جس طرح گزرتے ہیں ایسے ہی نورخاں اور صنوبر کے بھی گزرتے تھے — ہاسپٹل لے جانے کا حیلی میں نہ کوئی رواج تھا نہ اس کی ضرورت ہی سمجھی — اپنے اماں باوا نے ہی کون سے ہاسپٹلوں میں جنم لیا تھا کہ ہم انگریز میموں سے مشورے لیتے رہیں —

" ارے خدایا مر گئی — مولا میری مشکل آسان کر دے —"

صنوبر کی باریک اور تیز چیخ خدایا نے سن لی اور واقعی اس کی مشکل آسان کر دی — صنوبر کی چیخ کے ساتھ ہی ایک اور ننھی منی سی چیخ اس دنیا میں گونجی — دائی نے اعلان کیا "بیٹی —"

لیکن دائی کی بات سننے کی کسی کو فرصت نہ تھی — سبھی اور خاص طور سے بڑی بیگم اس خون کی ندیا کو سہم کر دیکھے جا رہی تھیں جس میں کسی کی زندگی کی ناؤ ڈولتی ڈگمگاتی جا رہی تھی — ڈوبی جا رہی تھی —

" ہائے میا — " دائی سہم کر بولی — دیکھنے دکھانے کو تو سوکھے پتے سا پیلی تھی اور یہ ندی — ؟"

بڑی بیگم حیران پریشان پتھر سی مورت بنی کھڑی تھیں۔ وہ بڑی ہی حوصلے والی عورت تھیں۔ پریشانیوں کو مسکرا کر ٹال جانے والی۔ بڑے سے بڑے اور کٹھن سے کٹھن لمحات بھی ان کی مسکراہٹ کو ملیامیٹ نہیں

رکھتے تھے ۔ ان کی سوچ کا انداز سب سے نرالا تھا اگر وہ ایسی ہمت والی نہ ہوتیں تو اپنی اتنی زندگی بغیر مرد کے سہارے کے یوں نہ گزار سکتیں ۔ ان کی ساری زندگی یونہی گزر رہی تھی کہ ایک دیوار آڑ با ندھ گھنگھرو چھنک رہے ہیں اور طبلہ دھنک رہا ہے ۔ اس چھن چھن اور دھن دھن کے تھوڑے زندگی بھر اس دل پر ایسے پڑے کہ وہ فولاد بن کر رہ گیا ۔ مگر اس وقت وہ سارے حوصلے بھول چکی تھیں — یہ نہیں کہ انھوں نے آج تک کوئی موت نہ دیکھی ہو — کون بشر ایسا ہوگا جس نے اپنی زندگی میں دو ایک بار حیات کا تار ٹوٹتے نہ دیکھا ہوگا ۔ بڑی بیگم بھی کوئی الگ نہیں تھیں لیکن زندگی کا یہ روپ وہ آج پہلی بار دیکھ رہی تھیں جب کوئی اپنے جیون کا سارا رس کسی ایک ننھے منے پودے کو دے دیتا ہے کہ وہ پھلے پھولے اور خود فنا ہو جاتا ہے ۔

بڑی بیگم نے بچوں کے سے ڈر جانے والے جذبے کے ساتھ سہم کر منو بہو کی طرف دیکھا جس کا سونے کی طرح پیلا اور دمکتا ہوا چہرہ ابھی ابھی دائی نے سرخ چادر سے ڈھک دیا تھا — وہ سہاگن مری تھی نا ؟ اُسے ایک دلہن کی طرح پورے سنگار، چاؤ اور سرخ لباس میں دفنایا جائے گا — اُسے ایک بار پھولوں کا گہنا پہنایا جائے گا ۔ ایک بار پھر اس کا دولہا اس کی ڈولی کو سہارا دے گا — وہ دلہن بن گئی ہے نا !

بڑی بیگم نے لرز کر دیکھا — سامنے اس کا دولہا کھڑا تھا ۔ ابھی سال بھر پہلے جب بڑی بیگم خود بیٹے کی طرح پال پوس کر جوان کئے ہوئے اس بیٹے کو دولہا بنا کر دلہن بہو کو لانے کے لئے گئی تھیں تو یہی چہرہ خوشیوں اور امیدوں سے کس طرح چڑھتے سورج کی طرح جگ مگ جھگ مگ کر رہا تھا — آج چہرے کا سورج غروب ہو چکا تھا اور دل کی وادیوں میں گھٹا ٹوپ اندھیروں کا راج تھا — دائی نے ننھی منی سی گڑیا کو چادر میں لپیٹ کر باپ کی گود میں دے دیا ۔ باپ نے ایک لمحہ کو اُسے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ پھپھک کر عورتوں کی طرح رو پڑا ۔

" میں اسے کیسے پالوں گا — ! میں کیا کروں — خدایا ! "

اک دم بڑی بیگم ہوش میں آ گئیں — میاں کی بے وفائی سے ٹوٹا دل انھوں نے سدا اسی طرح جوڑنے کی کوشش کی تھی کہ سدا دوسروں کے غموں کو اپنا جانا — یہ چیز رفتہ رفتہ ان کی عادت، ان کی فطرت بن گئی اور اب یہ تھا کہ خدا ترسی کا ایسا جذبہ ان کے دل میں گھر کر چکا تھا کہ وہ کہیں ایسے موقعے پر پیچھے نہ ہٹیں — ان کی اپنی تو لے دے کے دو ہی اولادیں ہوئی تھیں جو جوان ہونے کے بعد بیاہی بھی جا چکی تھیں ۔ بیٹی اپنے گھر کی تھی اور بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ گاؤں میں چھوٹے سے رجواڑے کو سنبھالے ہوئے تھا — اور بڑی بیگم کی زندگی کا اب یہی مصرف تھا کہ کسی یتیم لڑکی کو لے کر پال لیا ، کسی ناجائز اولاد کو کلیجے سے لگا لیا ۔ کوئی بھیک منگی منگتی ان کی حویلی کے دروازے پر آ نکلی تو اسے اپنے دامن میں پناہ دے دی ۔ کسی نے لجاجت سے دو روٹی مانگی تو انھوں نے گھر کا کونا ہی دے دیا — بے پناہ دولت کا ، انھوں نے یہی خرچ کا ذریعہ بنا رکھا تھا ۔ ان کی حویلی کیا تھی اچھا خاصہ لنگر خانہ تھا ۔ پھر یہ تھا کہ پالی پوسی لڑکیوں لڑکوں کی شادی خود ماں بن کر کر رہی ہیں ۔ زچگیوں میں عمل دخل دے رہی ہیں ۔ کسی کی بسم اللہ کا ہنگامہ مچا رہی ہیں ۔ کسی کی ختنہ کا دھوم دھڑکا مچا رکھا ہے ۔ ایسے میں وہ گھونگھرو کے چھناکے اور طبلے کے دھماکے بالکل بھول چکی تھیں ۔ وہ سوچتیں میرا دل تو دنیا میں بہل ہی گیا ۔ عاقبت بھی خدا ضرور روشن کر دے گا ۔ کسی یتیم یسیر کے سر پر ہاتھ پھیر دینے سے اتنی ہی نیکیاں شمار ہوتی ہیں جتنی کہ اس کے سر پر بال — تو یہاں صرف سر پر ہاتھ پھیرنے کا سوال تو نہ تھا ۔ وہ تو جسے بھی اپنی گود میں ایک بار لے لیتیں ، خدا کے بعد بس اس کا واحد سہارا بن جاتیں ۔ اس کی زندگی سنوار دیتیں — اس کی خوشیاں ان کی اپنی خوشیاں ہو جاتیں اور اس کا ہلکا سا غم بھی ان کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہا دیتا — نور خاں بھی انھیں کا پروردہ تھا ۔ بعد میں تھوڑا بہت پڑھا لکھا کر انھوں نے اسے اپنی زمینوں کا حساب رکھنے کے لئے منشی کا درجہ دے دیا تھا — اس کی شادی بھی انھوں نے ہی اپنی پسند سے پار سال ہی کروائی تھی — انھوں نے سوچا بھی نہ تھا ۔ نئی نئی بہار سے بھری یہ بگیا دم بھر میں یوں اُجڑ کر رہ جائے گی !

نور خان حویلی سے ملحق، گر ایک کمرے میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی حیثیت نوکروں کی سی نہ تھی۔ وہ پڑھا لکھا تھا اور دوسروں کے علاوہ وہ خود بھی اپنے آپ کو اوروں سے ذرا ممتاز سمجھتا تھا۔ اس نے بڑی بیگم سے کہہ رکھا تھا اور بڑی بیگم نے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ منور کے ماں بننے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی زمین پر خود کاشت کر کے خود مختار زندگی گزار سکتا ہے۔ بڑی بیگم نے زمین بھی اس کے نام کر دی تھی لیکن بیس ایکڑ زمین پر جا کر بسنے کی بجائے منور نے پانچ ہاتھ ٹکڑے کو زیادہ ترجیح دی — اب سارے ارمان دفن ہو چکے تھے اور وہ — کہ جس کے دل میں ایک لمبی اور بھری پُری زندگی گزارنے کا ارمان تھا۔ کھڑا رو رہا تھا —

"میں اسے کیسے پالوں گا — ؟ میں کیا کروں خدایا — ؟"

"لاؤ میاں اسے مجھے دے دو۔ میں نے تمھیں پال پوس کر بڑا کیا تو کیا اس ننھی منی جان کو نہیں کر سکتی — ؟" ایک دم بڑی بیگم کا لہجہ اعتماد سے بھر گیا

نور خاں کے بہتے آنسو ایک دم رک گئے۔ ارے — خدا کے بعد اس عظیم سہارے کو وہ کیسے بھول گیا تھا ؟ وہ زندگی کو بوجھ کیوں تصور کر بیٹھا تھا ؟ ان تجربہ کار ہاتھوں اور خدا ترس اور رحمت بھرے دل میں چھپ کر تو یہ ننھی کلی دنوں ہی دنوں میں پھول بن جائے گی — میں کیوں فکر کرتا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر چادر میں لپٹی ننھی سی جان بے حد محفوظ ہاتھوں میں دے دی۔

اس ذمہ داری پر بڑی بیگم کا دل ایک لمحے کو کانپ سا گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ اس قسم کی عظیم سے عظیم ذمہ داریاں اپنے سر لے چکی اور انھیں نبھا چکی تھیں۔ لیکن یہ اپنی نوعیت کی پہلی ذمہ داری تھی کہ اتنی ننھی سی جان کہ جو ابھی چند گھنٹوں کی بھی نہ ہوئی تھی، ان کے سایۂ عاطفت میں آئی آج تک کے پلنے والے بچوں میں کوئی دو سال سے کم کا نہ تھا، لیکن یہ جان جس نے ماں کے دودھ کو منہ تک نہ لگایا۔ اوپر کے دودھ سے کس مصیبت سے پلے گی — ؟ لیکن ان کے کانپتے دل کو قرار اسی لمحہ آ گیا جب انھوں نے ساتھ ہی یہ بھی سوچا کہ جتنی کٹھنائیاں مجھے پالنے پوسنے میں پیش ہوں گی جنت کا اتنا ہی اونچا مقام مجھے ملے گا —"

اور وہ بے حد پرسکون ہو گئیں —

بڑی بیگم کی زندگی کا یہ دور سب سے جدا تھا — نئے نئے تجربے ہو رہے تھے۔ نئی نئی مشکلیں ٹوٹی پڑ رہی تھیں اور دل سمجھاتا تھا انھیں نغا منا روپ مت دو۔ یہ بڑے بڑے معرکے ہیں، جو تمھاری جنت کو جانے والی راہوں کو استوار کر رہے ہیں — بڑی بیگم کے اپنے بھی دو بچے ہوئے تھے مگر ان بچوں کو پالنے اور اس بچی کو پالنے میں واقعی زمین آسمان کا سا فرق تھا۔ وہ ان کے خود کے بچے تھے، وہ ماں تھیں، خود ہی اپنا دودھ پلاتی تھیں۔ اوپر کے دودھ کی کھٹ کھٹ اور مصیبت کا انھیں کچھ اندازہ ہی نہ تھا۔ پھر یہ تھا کہ اپنے بچے اپنے ہی بچے ہوتے ہیں۔ مار دو، ٹھونک دو، غصہ آئے تو جھڑک دو — کون بازپرس کرنے چلا ہے — مگر اب وہ بات نہ تھی ہر چند کہ یہ بھی اپنی ہی بچی جیسی تھی مگر اس کی مسلسل روں روں سے تنگ آ کر کبھی ان کا جی اُسے ایک آدھ دھپّہ جڑ دینے کو چاہتا تو ایسا لگتا کہ خدا کی آنکھیں صرف انھیں پر مرکوز ہیں — اور وہ ڈگمگا جاتیں — "ایسے سے مجھے جنت کیسے مل پائے گی ؟" ان کے اپنے بچوں پر آیائیں تھیں — میاں لاکھ بے وفا اور بے دل تھے، مگر مرد کی ذات کا پورا کمینہ پن ان میں موجود تھا جو عورت کو تو جوتی تلے کی چیونٹی سمجھتا اور دبانا اپنا حق جانتا ہے، مگر اپنی اولاد کو کلیجے کی کور سمجھتا اور اس کی آسائش اور آرام کا پورا خیال رکھتا ہے۔ نواب صاحب بھی بالکل مرد تھے — بیوی کو جتنی بے توجہی بخشی، اولاد کو اتنی ہی توجہ اور محبت کی گرمی دی ذرا بھی آواز سنتے تو دوڑے آتے کہ بچہ کیوں رویا — کیسے رویا ؟ انھوں نے ایک ایک بچے پر دو دو آیائیں رکھ چھوڑی تھیں۔ دودھ ماں ہی پلاتی تھیں نگرانی بھی ان کی اپنی ہی تھی۔ یہاں یہ اڑچن آن پڑی تھی کہ اگر آیا نہ رکھتیں تو خدا کے آگے جواب دہ ہوتیں کہ اپنے برتے پر لیا تھا تو پھر آرام کی کیوں سوچی — ؟ ڈبے کا اوپر کا دودھ بنانا، رات بے رات جگنا، اپنے ہاتھوں گو موت کرنا۔ بس بڑی بیگم بن دامون

ی غلام بن کر رہ گئیں۔

انھیں دنوں ایک دل ہلا دینے والا واقعہ رونما ہوگیا نورخاں بیل گاڑی میں زمینوں پر سے حساب کتاب کی جانچ کر کے واپس آرہا تھا کہ بیل گاڑی اوبڑ کھابڑ راستوں سے، پتھروں سے ٹکراتی نیچے آپڑی اور اس کے تلے نورخاں مرچی دھنیے کی طرح پس کر رہ گیا۔ جانے والا تو اپنی جان سے گیا مگر بڑی بیگم ذمہ داری کے دوہرے بوجھ تلے دب گئیں۔ اب وہ ایک معصوم یتیم یسیر کی نگہدار ٹھیریں۔ کیسے کڑے مقام پہ خدا نے انھیں لاکر کھڑا کر دیا تھا —! انھیں اس بوجھ سے اپنی کمر ٹوٹتی محسوس ہوئی مگر اسی خداترسی کے جذبے اور جنت کی آس نے انھیں سہارا دیا اور وہ تن من دھن سے جٹ گئیں —

ننھی چونکہ ان کی عاقبت کی خوشیوں کا سہارا بن کر آئی تھی، اس لئے انھوں نے اس کا نام مسرت رکھا۔ ویسے تو انھوں نے اسے ہزار نام دے رکھے تھے — بالکل اسی طرح، جیسے کہ ایک ماں سگی ماں اپنی سگی اولاد کو ہزار دل ہی پیار بھرے ناموں سے پکارتی رہتی ہے۔

بڑی بیگم نے اب تک جتنے بھی بچوں کو پالا تھا، یہ سمجھ کر پالا تھا کہ بس بچے ہیں۔ پل جائیں بڑے ہو جائیں، اپنے اپنے ٹھکانوں سے بیٹھ جائیں۔ مگر مسرت کی بات ہی کچھ اور تھی۔ انھوں نے ایک دن ہر خاص و عام میں اعلان کر دیا کہ مسرت میری بیٹی ہے

کسی بات کو منہ سے کہہ دینا اور ہے نباہنا اور۔ مگر دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ بڑی بیگم نے منہ سے اگر یہ بات نکال دی تو واقعی دل سے اُسے نباہ کر ہی چھوڑا۔ زمانہ بدل رہا تھا۔ انھوں نے عربی اردو تعلیم کے ساتھ ساتھ مسرت کے لئے ایک انگریز مس بھی رکھی جو اسے بے حد جانفشانی سے انگلش پڑھانے لگی۔ ساتھ ہی سیون پسدوں، نٹنگ، پکوان، سلیقہ قرینہ، غرض کوئی بات ایسی نہ چھوٹی جس کا بڑی بیگم نے بطورِ خاص خیال نہ رکھا ہو —! مسرت ابھی آٹھ نو سال کی ہی ہوگی کہ اس نے خود بھی بڑی بیگم کی محبت کو پرکھ لیا۔

کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی موقعے پہ کوئی نہ کوئی تو پوچھ ہی بیٹھتا — "ارے بڑی بیگم — آپ تو بچی کے پیچھے جان تباہ کئے دے رہی ہیں —"

تو وہ مسرت کے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہتیں — "وہ تو میری بیٹی ہے اور یہ تو سوچو یتیم یسیر ہے۔ اس کے طفیل تو مجھے جنت ملے گی —"

انھیں دنوں رمضان کے مبارک مہینے کی بات ہے۔ یو۔ پی سے ایک مولانا صاحب بطورِ خاص تراویح کی نمازیں پڑھانے کے لئے گاؤں بلوائے گئے۔ مہینے بھر تک انھوں نے ہر کس و ناکس کے منہ سے یہی بات سنی کہ بڑی بیگم کس قدر خداپرست ہیں۔ کس طرح غریبوں کے لئے ان کی تجوری کا منہ کھلا ہوا ہے — کیسے کیسے انھوں نے اپنی زندگی تمام تر انھیں لوگوں کے لئے وقف کر رکھی ہے جو قسمت کے مارے ہیں اور یہ کہ ایک یسیر اور یتیم لڑکی کو کس طرح جگر کا ٹکڑا بنا کر رکھا ہے۔

مہینے کے ختم پر جب وہ واپس یو۔ پی جانے لگے تو پردے کی آڑ سے بڑی بیگم سے بات چیت ہوئی۔ انھوں نے بغیر کسی قسم کی خوشامد چاپلوسی کے واقعی سچائی کے ساتھ کہا

"بیگم صاحبہ آپ یہ سب جو کچھ کر رہی ہیں خدا کے ہاں آپ کی نجات ہی نجات ہے۔"

بڑی بیگم کی تشکر سے بھرائی آواز آئی — "مولانا صاحب بس یہی دعا ہے کہ خدا عاقبت بخیر کرے۔ دنیا کے مزے تو چکھ لئے اب آخرت کی دھن ہے"

"ارے یہ آپ کیا کہتی ہیں۔ آپ کچھ نہ کرتیں لیکن صرف ایک یتیم یسیر لڑکی کو پال کر ہی آپ نے وہ کچھ کیا ہے کہ جس کا اظہار الفاظ میں ممکن ہی نہیں —"

بڑی بیگم نے تڑپ کر بات کاٹی — "مولانا صاحب اسے یتیم لڑکی کے نام سے نہ پکاریئے — میری بیٹی ہے وہ — سامنے اسی طرح مخاطب کیجئے جیسے وہ ....." ان کی آواز پھوٹ بہی۔

"مرحبا — مرحبا —" مولانا صاحب بے اختیار ہو کر پکار اٹھے "مبارک ہیں آپ — مبارک ہیں وہ در و دیوار جن کی پناہ میں آپ رہتی ہیں۔ مبارک ہے وہ زمین جس پہ آپ قدم دھرتی ہیں آپ کی جگہ برحق ہے — جنت میں آپ کا بلند مقام برحق ہے...."

اور وہ اللہ ہو — اللہ ہو کا ورد کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے —

اس دن سے بڑی بیگم پر ایک نئی دنیا کے دروازے کھل گئے۔ ان کی محنت خدا نے قبول کر دی — اتنے بڑے مولانا فرما گئے کہ جنّت بر حق ہے تو یقیناً ہوگی۔ اور یہ سب نیک اعمال کا نتیجہ ہے — اور یہ احسان مسرّت کے قدموں کے طفیل ہیں۔ وہ اسے جی جان سے نہارنے لگیں

صالحہ ان کی اپنی بڑی بیٹی سال کے سال ان کے ہاں گرمیاں گزارنے اور آم کھانے آتی تھیں — ماں نے مسرّت کو گود لیا تھا تبھی سے وہ کھٹکیں۔ لیکن منہ سے کچھ بول نہ پاتی تھیں۔ جانتی تھیں کہ ماں نے زندگی بھر ہر طرح کے دُکھ سہے اب بڑھاپے میں دل بہلانے کی خاطر یہ سہارے پال رکھے ہیں۔ اور ان کی برابری کا کوئی جوڑی دار ہوتا تو شاید طوفان اٹھا لیتا بھی۔ مگر جانتی تھیں کہ جتنے ہیں سب ایسے ویسے ہی ہیں۔ کسی کے ماں باپ نے غربت کے مارے لا کر گود ڈال دیا ہے۔ کوئی حرام کا تھا تو کوئی کونے کھدرے، نالے پرنالے سے برآمد کیا ہوا ہے۔ کوئی بھٹکتا بھٹکاتا آ کر گلے پڑ گیا ہے۔ لیکن مسرّت کو جن چاؤ چونچلوں سے لیا تھا وہ دل بُرا کر دینے کے لئے بہت کافی تھا، مگر ٹال گئیں ہر برس آتیں اور جدا رنگ دیکھ کر جاتیں۔ ماں نے جب اعلان کیا تھا کہ مسرّت بیٹی ہے تو ان کا ماتھا ٹھنکا اب تو یقیناً یہ بھی جائداد کی ایک وارث ٹھہری۔ مگر ماں کے آگے بھلا بول ہی کیا سکتی تھیں۔ لیکن اس سال تو پیمانہ ہی چھلک گیا۔ بڑی بیگم کی زندگی کا رُخ ہی مولانا صاحب نے پھیر دیا تھا۔ جب سے انھوں نے اتنے پہونچے ہوئے بزرگ کے منہ سے یہ بات سن لی تھی کہ وہ جنّت کی واقعی مستحق ہیں، ان کی محبت مسرّت سے کچھ زیادہ ہی سوا ہو گئی تھی۔ وہ یہ ہی کہ انھوں نے اپنے مہر میں ملنے والی تمام جائداد بھی مسرّت کے نام جیتے جی لکھ دی جو کم و بیش سوا لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی بنتی تھی — یہ وار ایسا نہ تھا کہ بیٹی چین سے سہار جاتیں — جبھی ظاہر ہے کہ اس کے بیچ میں یہ نصیبوں جلی مسرّت نہ ٹپک جاتی تو یہ انھیں کا تو حق ہوتا نا —

بڑے ارمان سے ماں سے کہا — "امّاں بیگم — آپ نے بنا سوچے سمجھے اتنی بڑی جائداد مسرّت کے نام کر دی — بڑی بیگم بے حد مطمئن انداز سے مسکرائیں — تو کیا ہوا بیٹی تمھارے جہیز میں بھی تو کم و بیش ایک لاکھ نقد اور ایک لاکھ کا زیور کپڑا گیا ہے

وہ بھی تو میری ہی بیٹی ہے — رکتے رکتے صالحہ بولیں — "مگر امّاں بیگم — گود لی ہوئی اور سگی اولاد میں کچھ تو فرق رکھتیں آپ — کیا سچ مچ وہ میری برابری کر سکتی ہے — اور کیا سچ مچ آپ اُسے مجھ سے زیادہ چاہ سکتی ہیں۔

اسی لمحے مسرّت کسی کام سے ادھر آ نکلی — لمحے بھر کو تو صالحہ بھی اُسے دیکھ کر بات کرنی بھول گئیں — غضب خدا کا۔ کیا رنگ روپ پایا تھا۔ کیا دبدبہ کیسی شان۔ کیسی پاکیزگی برس رہی تھی صورت پر۔ سچ ہے خدا حسن کی دولت جسے چاہتا ہے دے دیتا ہے، اس میں غریب امیر کی تخصیص نہیں رکھتا۔ بڑے بڑے پائنچوں کے گلابی غرارے گلابی فراک اور ہلکے سبز دوپٹے میں کیسی نکھر رہی تھی کہ جی چاہتا تھا انگ انگ کو چوم چوم لیں۔

بڑی بیگم ان کی بات کا جواب دے رہی تھیں "بٹیا محبت نفرت کا کیا ہے جانور کو پالو اُس سے بھی ہو جاتی ہے اور دل پھر جائے تو سگی اولاد کی طرف ہو لگنے تک کو جی نہیں چاہتا — مسرّت کی بات ہی اور ہے — میں نے اُسے جی جان کا ٹکڑا بنا کر پالا ہے۔ سچ کہتی ہوں اتنی محنت اور توجہ میں نے تم دونوں بہن بھائی پر بھی نہیں صرف کی تھی۔ مجھے سچ مچ اس کی اتنی ہی محبت آتی ہے جتنی تم دونوں کی — کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تم سے بھی زیادہ — اس کی یہی وجہ ہے وہ یتیم یسیر ہے۔ اُسے میں نے جتنی محبت دی ہے، اس کے صلے میں مجھے اتنی ہی نیکیاں ملیں گی — وہ میری بیٹی بھی ہے میری عاقبت میری نجات اور میری جنّت کا راستہ بھی —"

مسرّت نے ایک ٹک سے رک کر یہ ساری باتیں سنیں۔ اس نے پہلے بڑی بیگم کی طرف دیکھا، پھر صالحہ کی طرف — منہ سے کچھ نہیں بولی —

صالحہ بیگم بھی چپ رہ گئیں — بات آئی گئی ہو گئی —

چند سال اور گزر رہے — مسرّت نے شہر جا کر میٹرک کا امتحان بھی دیا اور پاس بھی ہو گئی۔ اب بڑی بیگم کو اس کے مستقبل کی — شادی کی فکر تھی۔ مگر خود مسرّت چاہتی تھی کہ ابھی کچھ اور پڑھ لے

زمانہ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے پیروں پہ آپ کھڑی ہونا چاہتی تھی۔ ایک دن بڑی بیگم کے سامنے اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو وہ حیران حیران سی بولیں —

"بیٹی — تجھے کمانے دھمانے کی کون حاجت ہے — میں نے تیرے نام اتنی اتنی بھی نہیں ڈیڑھ لاکھ کی جائداد کر دی ہے۔ کچھ نہ کرے، اگر صرف بینک میں ہی یہ رقم رکھی رہے تو ہر ماہ ۶۔۷ سو آجائیں۔ کیا اتنے میں تیری گذر بسر نہیں ہو سکتی —"؟

"نہیں۔ امی — ایسی کوئی بات نہیں۔۔" مسرت بے بسی سے بولی "آپ سمجھتی نہیں ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا —"

"تو اور کیا مطلب تھا — ؟" بڑی بیگم ذرا بناوٹی غصے سے بولیں — "کیا تو مجھے ماں نہیں سمجھتی — ؟"

مسرت نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پہ رکھ لئے۔ "امی خدا کے لئے یوں نہ سوچئے ۔۔۔ میں نے کب کہا آپ میری ماں نہیں ہیں" وہ بھرائی آواز سے بولی ۔۔۔ "خدا کے بعد تو جو کچھ ہیں آپ ہی ہیں۔ میرے لئے اور کون ہے ۔ ۔ ۔ ۔

آگے اس سے کچھ کہا نہ گیا۔ وہ رو پڑی۔ اس کے ساتھ بڑی بیگم بھی رو دیں۔ مسرت سچ مچ ان کی جان ایمان بن کر رہ گئی تھی وہ اس کی آنکھوں میں آنسو کیسے دیکھ پاتیں جبکہ اس کے چہرے پر غم کی ہلکی سی چھاپ بھی انھیں دنوں ملول کر دیتی۔ وہ اس کے آنسوؤں اور مسکراہٹوں، غم اور خوشیوں، اس کے اندھیروں اجالوں کی — سبھی چیزوں کی وہی ذمہ دار تھیں۔ یہ ناممکن تھا کہ ان کے جیتے جی کوئی مسرت کی طرف انگلی بھی اُٹھا سکتا اور اُسے ایک بول بھی بول سکتا — بیٹے سے تو اسی مارے مدت ہوئی بول چال بند ہو چکی تھی جب سے کہ انھوں نے جائداد کا وارث مسرت کو قرار دے دیا تھا — صالحہ بھی بگڑیں بہت۔ مگر قدرتی بات ہے کہ بیٹیاں ماں سے زیادہ قریب ہوتی ہیں اس لئے وہ ماں سے ٹوٹ تو نہ سکیں ہاں شیشے میں بال ضرور پڑ گیا۔ مگر یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس کی وجہ سے بڑی بیگم بددل ہو کر بیٹے بیٹی کی بات مان جائیں۔ وہ جس مقصد کو لے کر چلی تھیں وہ مقصد — وہ راہ سیدھی جنت تک پہونچتی تھی۔

مسرت خوبصورت تھی، جوان تھی، تعلیم یافتہ تھی اور پیسے والی بھی۔ جب یہ ساری خوبیاں ایک جگہ جمع ہوں تو پیام یوں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے آندھی پانی سے کچی امیاں ٹپاٹپ گرتی ہیں قریبی لوگوں کو معلوم بھی تھا کہ مسرت بڑی بیگم کی اپنی سگی بیٹی نہیں۔ مگر ڈیڑھ دو لاکھ کی جائداد نے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ پیام لانے والوں میں وہ بھی تھے جنھوں نے بڑی بیگم کے اس اقدام پہ ناک بھوں چڑھائی تھی کہ اور کچھ نہیں سوجھا تو غلام زادے کی یتیم یسیر لڑکی کو ہی بیٹی بنا ڈالا — اور وہ بھی جو اس نیک قدم کو جی جان سے سراہتے تھے اور چاہتے تھے کہ واقعی اس بے مثال ہیرے کی جوت انھیں کے مقدر کی جوت بن جائے۔

بڑی چھان بین کے بعد آخر کار بڑی بیگم نے ایک خاندانی لڑکا پسند کر ہی لیا۔ لڑکا بے حد قابل، بے حد سمجھ بوجھ والا تھا۔ سول انجینئر تھا۔ گھر کا بھی کھاتا پیتا تھا اور تنخواہ بھی آٹھ سو تھی۔ زیادہ زر زیور دولت کی بڑی بیگم کو لالچ تھی نہ خواہش۔ خدا کا دیا ان کی مسرت کے پاس اتنا کچھ موجود تھا کہ زندگی بھر چاہتی تو چار کو کھلا کر خود کھا سکتی تھی۔ وہ صرف شرافت پہ جان دیتی تھیں سو خدا نے ان کی سن لی۔

جہیز کا جوڑ جاڑ ہونا شروع ہوا تو بس یوں لگتا تھا کہ گھر ہی دوکانیں کھل گئی ہیں۔ حویلی کتنی بڑی تھی۔ اس کمرے میں کپڑے سل رہے ہیں۔ اس کمرے میں جوڑوں پہ گوٹا کناری ٹنک رہا ہے۔ اس کمرے میں سنار بیٹھا ٹھک ٹھک کر رہا ہے۔ اس کمرے میں برتنوں کا ڈھیر لگا ہے تو اس کمرے میں تیار زیورات کی جانچ ہو رہی ہے —

رقعے چھپے اور مقررہ تاریخ پہ لوگ باگ آنے شروع ہوئے ان میں جلنے والے بھی تھے اور سچے دل سے خوش ہونے والے بھی — مسرت مایوں بیٹھ چکی تھی۔ سنہرے لباس میں اس کا حسن اور نکھر آیا تھا۔ جو دیکھتا بس دیکھتا رہ جاتا۔ بڑی بیگم کا کمرہ اس کے کمرے سے ہی ملحق تھا۔ ملنے جلنے والیاں آتیں۔ اس کا چہرہ دیکھ جاتیں

اور پھر وہ ان جہیز کا نظارہ کرتی بڑی بیگم کے پاس پہونچ کر گفتگو کا ایک ہی ایک موضوع باقی رہ جاتا۔ "بیگم آپ نے تو واقعی حد کردی حد۔ کیا دل پایا ہے کہ بس واہ —!" بڑی بیگم مطمئن لہجے میں بڑے انکسار سے کہتیں —"میں نے کیا کیا ہے بی بی — سب حوصلہ خدا کا دیا ہوا تھا ورنہ میں کیا کر سکتی تھی۔ بس خدا نے سن لی۔ لڑکی اپنے گھر کی ہو جائے اور بس۔ پھر میں اللہ اللہ کروں۔ سوائے عاقبت کے اب کوئی فکر نہیں۔"

کہنے والیاں ہاں میں ہاں ملاتیں "اور کیا۔ اب آپ نے اتنا بڑا ایثار کیا ہے تو خدا کے ہاں جنت تو آپ کی ہی منتظر ہے بس —"

"ہاں بی بی۔ حضور صلعم نے فرمایا ہے کہ جس نے تین لڑکیوں کو پال پوس کر جوان کیا اور بیاہ دیا وہ جنت کا مستحق ہو گیا۔ یہ میرے ہاتھوں گیارھویں لڑکی بیاہی جارہی ہے۔ صرف جنت کی اور خدا کی خوشنودی کی آس ہے ورنہ اب دنیا میں اور کیا رہ گیا ہے —"!

بازو کے کمرے میں مسرت بیٹھی سنتی رہتی۔ بیٹھے بیٹھے آپ ہی آپ اس کی سسکیاں اُبھرنے لگتیں۔ کون جانے میکہ چھوٹنے پر یہ آنسو بہتے تھے یا اور کوئی غم چپکے چپکے اُسے کھائے جاتا تھا —!

اگلا دن عقد خوانی کا تھا۔ ایک دن پہلے مہندی ہوتی تھی۔ ہرے ہرے جوڑے میں مسرت کومل ڈالی کی طرح جھکی جارہی تھی جھینی پتوں میں سے عارض کی تابانی جھلکتی تو کچھ یوں لگتا کہ شاید صبح ابھی ادھر ہی سے طلوع ہوگا۔

مہمان بیبیاں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ وہ دھوم دھڑکا تھا کہ کان پھٹ کر رہ جائیں — زنانے مردانے دونوں جگہ لوگوں کا ہجوم تھا — لوگوں کا اندازہ تھا کہ وہاں جہیز کو تو چھوڑو، صرف بارات اور مہمانوں کا اوپری خرچ ہی کوئی تیس چالیس ہزار کا پڑ جائے گا کل کا دن تو بڑے ہنگامے کا ہوگا۔ اس خیال سے حویلی میں آج ہی سے جہیز جانا شروع کر دیا گیا۔ بھر بھر کرے جہیز سے اٹے پڑے تھے۔ بڑے وسیع ہال میں جگ مگ کرتی کار — ریڈیو سیٹ، گراموفون ریڈیو گرام — صوفہ سیٹ — ڈبل بیڈ — کیا کیا نہ تھا۔ بس حویلی کیا تھی دوکانوں کا روپ ہو کر رہ گئی تھی۔

بڑی بیگم مسرت کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھیں بار بار بھر آتیں اور وہ آنسو پی جاتیں کل مسرت پرائی ہو جائے گی۔ کتنی مصیبتوں سے پالا۔ کتنی محبت اُسے دی — سب چیزسے منہ موڑ کر سارے بندھن توڑ کر وہ بڑی بیگم کو اکیلی چھوڑ کر چلی جائے گی —! جھر جھر بہتے آنسوؤں کو اب انھوں نے روکنے کی کوشش کی بھی نہیں — اسی دن کے لئے تو وہ آس مند تھیں صرف اسی دن کے لئے اتنی ساری کٹھنائیوں کو وہ غربت جان کر پی گئی تھیں کہ بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے۔ آخر کو یتیم اسیر تھی۔ کوئی اونچ نیچ ہو جاتی تو ساری دنیا مل کر ان کے منہ پر کالک تھوپ گدھے پر بٹھا دیتی۔ کل اس کے وداع ہوتے ہی ان کی نامکمل جنت میں آخری اینٹ بھی رکھ دی جائے گی اور وہ اپنے خدا کے آگے سرخرو ہو سکیں گی۔

بڑی بیگم اپنے خیالات سے جب چونکیں، تب ممانی جان نے ان کا شانہ تھپ تھپا کر کہا

"مبارک ہو بہن — خدا نے تمھاری دیرینہ آرزو پوری کی۔ لڑکی اپنے گھر کی ہو جائے اس سے زیادہ ایک ماں کی تمنا اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"ہاں بی بی۔" بڑی بیگم اور کچھ نہ کہہ سکیں — پھر بھر آنے والے آنسوؤں نے ان کا گلا دبوچ لیا۔ مہمان بیبیوں میں سے کوئی بولیں —

"مگر بڑی بیگم آپ پہ واقعی کمال حیرت ہے۔ آپ نے کس طرح بیس برسوں تک اپنے وجود کو بھلا کر بالکل ایک نوکرانی کی طرح بٹیا کی خدمت کی ہے۔ کبھی دیکھنے والوں کو ایسا لگا ہی نہیں کہ یہ آپ کی سگی بٹیا نہیں —"

"نہیں نہیں —" بڑی بیگم تڑپ کر بولیں "ایسا نہ کہئے ایسا نہ سوچئے — وہ میری سگی بیٹی ہی ہے بلکہ سگی سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسے اس منزل تک پہنچا کر میں خود بھی تو جنت کی اہل ....

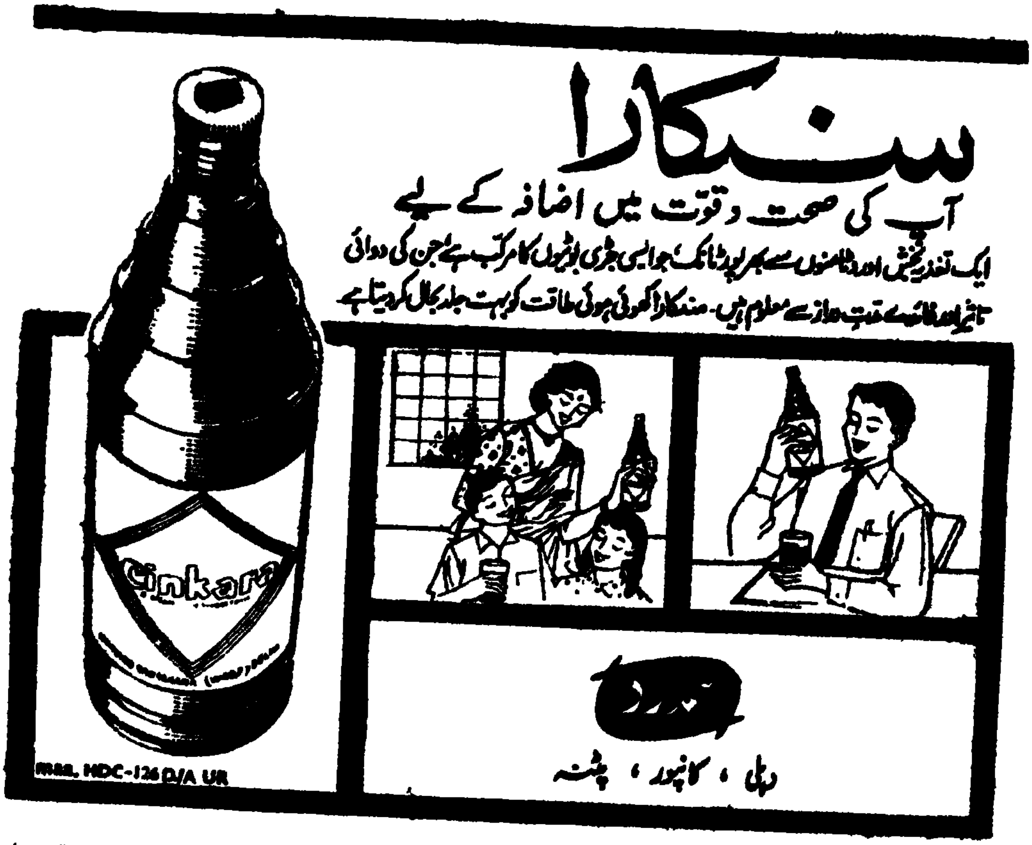
بات ابھی بڑی بیگم کے منہ میں ہی تھی کہ مسرت کی کانپتی آواز پوری طاقت کے ساتھ کمرے میں ابھری — "میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں بڑی بیگم — میں آپ کی بیٹی نہیں بیس برسوں سے اس جملے کو سنتے سنتے خدا گواہ ہے میرے کان پک گئے ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ میں آپ کی بیٹی نہیں صرف وہ راہ ہوں جس پر چل کر آپ جنت تک جا سکیں گی — آپ نے زندگی میں کبھی مجھے ماں کی محبت نہیں دی۔ کبھی باپ کا پیار نہیں دیا۔ کبھی مجھے اپنی اولاد نہ جانا — جانا تو بس یہ جانا کہ میں ایک سہارا ہوں آپ کی جنت کے حصول کا — آپ کی دولت، عزت، جائداد، دان دہیز یہ سب فریب ہے، دکھاوا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اصلیت کیا ہے۔ اصلیت صرف یہ ہے کہ آپ کو جنت چاہیئے تھی جو آپ نے میرے خون کے بدلے واقعی حاصل کر لی — ....

بڑی بیگم نے گھبرا کر دیکھا۔ "مسرت — مسرت یہ کیا کہہ رہی ہے تو — کیا ہو گیا ہے تجھے — تو ہوش میں ہے یا نہیں — لوگ کیا سوچیں گے، کیا کہیں گے بیٹی۔ ذرا ہوش کی لے —"

مسرت پلنگ پر سے اُٹھ کر بھاگی —

"میں ہوش میں ہوں — پورے ہوش میں بیس برس سے ہوش میں ہی تو ہوں — لیکن آج میں اپنے ہر نفس کو بھول جانا چاہتی ہوں — لیکن ایک دعا کرتی جاؤں گی کہ خدا آپ کو واقعی جنت دے۔ بیس برسوں تک آپ نے جس خلوص اور جس چاہت سے جنت کی آرزو کی ہے، اگر خدا نے نہ دی تو اس جیسا ناانصاف کوئی نہیں —"

بڑی بیگم اسے سنبھالنے کو لپکیں مگر وہ سب سے بلند اور اونچی ٹیک پر سے نیچے چھلانگ لگا چکی تھی — انھوں نے ہولا کر نیچے جھانکا جیسے سُرخ سُرخ خون کی ندی سی بہہ نکلی تھی — ان کی قطعاً سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ندی جنت کو جا رہی ہے یا دوزخ کو — !



نریندر لوتھر

بند کواڑ

وہ پانچ سال کے بعد وطن واپس آیا۔ یکے بعد دیگرے وہ کئی شہروں، کئی ایسی جگہوں پر گیا جہاں اس نے زندگی کے حسین لمحات گزارے تھے۔ مگر نہ جانے کیوں ہر جگہ اسے اداسی نظر آئی جہاں پہلے ہر طرف مسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں نظر آتی تھیں وہاں اب ویرانی سی تھی۔ شہر وہی تھے جگہیں وہی تھیں۔ وہ کیا چیز تھی جو پانچ سال پہلے اس کو وہاں نظر آتی تھی اور اب نہیں تھی ؟ جس کی وجہ سے زندگی میں کچھ خلا سا محسوس ہو رہا تھا۔ ویسے تو ہر جگہ کافی ترقی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ لیکن ترقی اور چیز ہے اور رونق اور چیز۔ ایسا لگتا تھا جیسے شہروں نے سودا کر لیا ہو کہ لے جاؤ ہماری ساری رونق اور ہمیں ترقی یافتہ بنا دو۔ جگہ جگہ نئے مکان بھی نظر آتے تھے۔ ایسے مکان جو لوگ کرایہ حاصل کرنے کے لئے بنواتے ہیں خود رہنے کے لئے نہیں۔ پیسے بنانے کا ایک اور دھندہ۔ ڈبوں میں کنبوں کو گھسیٹر دو۔ اور پھر یہ امید کہ وہاں انسانی زندگیاں پھولیں پھلیں گی۔

لیکن یہ بھی کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ ایسا تو تب بھی تھا۔ ہاں پانچ سال میں لوگ بدل گئے۔ کالج کے سب طلبا نکل چکے تھے اور جو نئے نئے بچے فرسٹ ایر میں فول بنائے جاتے تھے وہ بھی اس بڑی دنیا میں روزی کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ بیشتر پروفیسر ریٹائر ہو چکے تھے۔ اور جو لوگ اسے اچھی طرح جانتے تھے وہ بھی کچھ ٹھنڈے ٹھنڈے سے نظر آ رہے تھے۔ اداسی اس کے چاروں طرف تھی۔ اس ویرانی میں اسے اپنی تنہائی کا شدید احساس ہوا۔ کیا دنیا واقعی بدصورت اور بے رونق ہو گئی تھی یا یہ سب میرے دل کا عکس تھا۔ اس نے اپنے سے سوال کیا۔

بہرحال یہاں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ پھر اس نے سوچا چلو رام پور چلتے ہیں۔ وہاں شاید دل لگ جائے۔ پانچ سال پہلے رام پور جنت نشان تھا۔ اب بھی ویسا ہی ہوگا۔ وہاں اس کے چچا رہتے تھے۔ اپنے چھوٹے سے کنبے کے ساتھ ان کے گھر میں ہمیشہ اسے عجیب سی تسکین اور شانتی ملتی تھی۔ اس گھر میں اس کی بہت عزت تھی۔ سب لوگ اسے ایک چھوٹا سا دیوتا مانتے تھے۔ جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا، کبھی چوری نہیں کرتا، کبھی کوئی پاپ نہیں کرتا۔ کبھی کوئی غلطی کر ہی نہیں سکتا۔ ایک عجیب سی غیر مرئی شخصیت کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ سارے کنبے کا دوست۔ ہر کوئی اسے اپنا محافظ صلاح کار تصوّر کرتا اور اس کی صلاح کے بغیر کوئی کام نہ کرتا۔ تنیش اس سے بے پناہ محبت کرتا۔ چھوٹی بہن۔ کیا نام تھا اس کا۔ ریتا اسے اپنا ہمجولی سمجھ کر اس کے ساتھ ہر قسم کا کھیل کھیلتی۔ اور رتنا کے ساتھ اسے گہرا انس تھا۔ رتنا نے ابھی کالج میں قدم رکھا ہی تھا۔ حالانکہ عمر میں اس سے قدرے چھوٹی ہی تھی، لیکن تھی بڑی سلجھی ہوئی اور سمجھدار لڑکی۔ سارے کنبے میں صرف وہی لڑکی اسے دکھائی دیتی تھی جو کچھ سوچ وچار کر سکے۔ باقی سب لوگ تو بڑے ماڈرن قسم کے دقیانوسی لوگ تھے جو یہ مانتے تھے کہ ایشور اپنی

جاسکتی ہے اور جو ہونا ہے سو ہوتا ہے۔ ان کے دماغ کے سوچ وچار کے دائرے محدود تھے جو ہزاروں برس پہلے منو مہاراج مقرر کر گئے تھے اور وہ انھیں حدوں میں خوش تھے۔ اس گھر میں ونود کو صرف رتنا ہی ایسی نظر آتی تھی جو سمجھ سکتی تھی کہ کنوئیں کے باہر بہت سارے وسیع تالاب بھی ہیں۔ دریا ہیں، سمندر ہیں۔ وہ بارہا اس کی مدد سے ان کے خیالات اور ان کے نقطۂ نظر کو پرانے راستوں سے ہٹا کر نئے راستوں پر لانے کی کوشش کرتا لیکن رتنا کی بساط ہی کیا تھی۔ فرسٹ ایر کی چھوکری اور وہ بھی تو اسے ایسا ہی سمجھتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا جیسے وہ ایک چھوٹی سی بچی ہو اور وہ سالار کارواں۔ یہ کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ ان کا آپس میں سوائے "کزن" کے اور کوئی بھی رشتہ ممکن ہو سکتا ہے۔

ان دنوں ونود نے ابھی پڑھائی ختم ہی کی تھی اور کسی نوکری کی تلاش میں تھا۔ اس کے دل میں قوم کی خدمت کرنے کا اسے ابھارنے کا بے پناہ جذبہ تھا اس لئے وہ ادھر اُدھر کی کئی سوسائیٹیوں کا کرتا دھرتا بن بیٹھا۔ ویسے وقت گزارنے کے لئے وہ ایک کالج میں دو گھنٹے روز پڑھانے بھی چلا جایا کرتا تھا۔ اس کے کالج کے اوقات ایسے تھے کہ وہ سب کے بعد جاتا اور سب سے پہلے گھر واپس آجاتا۔ صبح جب لوگ اپنے کاموں کو جاتے تو وہ گھر میں ہوتا اور شام کو جب وہ واپس آتے تو بھی وہ گھر میں ہوتا۔ اس لئے سب لوگ اسے چھیڑنے کے لئے کہتے کہ وہ تو کوئی کام ہی نہیں کرتا۔ انکل اکثر کہتے "بھیا جو لوگ کام سے خالی ہیں وہی سوشلسٹ ہو سکتے ہیں۔ ہمیں کام سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے جو تمھاری طرح قوم کی ترقی کے بارے میں سوچیں!"

جب وہ کالج سے واپس آتا تو ڈریسنگ روم میں آکر ریڈیو لگا کر بیٹھ جاتا اور جیسے جیسے دوسرے لوگ واپس آتے وہ بھی وہیں ڈھیر ہو جاتے۔ پھر ایک دو بجے کھانا لگ جاتا اور اس کے بعد سب لوگ واپس اپنے کام پر چلے جاتے یا اپنے بلوں میں۔ پانچ بجے کے قریب سب لوگ اکٹھے ہو جاتے۔ شام کو وہ عموماً اکیلا ہی باہر جاتا۔ کبھی لمبی سیر ہو جاتی کبھی پرانی کتابوں کی تلاش اور کبھی کسی کونے میں بیٹھ کر زندگی کے مسئلوں پر گہرا وچار۔ کبھی کبھی وہ لوگ اسے گھسیٹ کر پکچر وغیرہ لے جاتے۔ حالانکہ وہ اس پروگرام سے ہمیشہ کتراتا۔ زندگی ایسے ہی گزر رہی تھی۔ ندیا کنارے کنارے جا رہی تھی اور پانی میں موجوں کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔

شہر وہی تھا، گھر وہی تھا اور لوگ وہی تھے۔ لیکن پانچ سال کے عرصے میں بچے بڑے ہو گئے ہوں گے۔ رتنا کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ اتنی دور سے وہ شادی میں نہ آسکا تھا۔ صرف ایک مختصر سا تار بھیج دیا تھا۔ "جیون میں دیپ جلتے رہیں راستوں میں پھول کھلتے رہیں۔" اسے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ اس کے نہ آنے سے ان لوگوں نے بہت بُرا منایا تھا۔ انھیں ہرگز یہ امید نہ تھی کہ زمانے کے ساتھ وہ بھی بدل جائے گا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ بدلا نہیں وہ کبھی نہیں بدلے گا۔ اب بھی وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ تمام غلط فہمیاں دُور کر دے گا۔ سُنا تھا رتنا بھی وہیں آئی ہوئی ہے۔

گھر کے باہر کار کھڑی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ سب لوگ گھر میں ہی تھے۔ برآمدے میں ایک کتا بیٹھا ہوا تھا۔ "ارسٹو" اسے اچانک یاد آگیا۔ یہ تو وہی کتا ہے۔ کیا نام تھا اس کا۔ کوئی موٹا سا تاریخی نام تھا اس کا۔ بے چارہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ بے چارے کتوں کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ بس دس بارہ سال۔ اور یہ کتا اب آٹھ سال کا تو ضرور ہو گا۔ کتا اُٹھا اور اس کی طرف بڑے سست قدموں سے بڑھا۔ اسے کتوں سے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔ پتہ نہیں بھونکتے ہی حملہ کر دیں اور اگر نہ بھی کاٹیں تو بھی افراتفری میں انسان کی ساری "ڈگنیٹی" درہم برہم ہو جاتی ہے۔ لیکن کتے کی دم ہل رہی تھی۔ تو کیا وہ پہچان گیا تھا ونود کو۔ اسے سخت ندامت کا احساس ہوا کہ اسے تو کتے کا نام بھی یاد نہیں تھا اور کتے نے پانچ سال کے بعد بھی اسے پہچان لیا تھا۔ اپنی خفت چھپانے کے لئے اس نے بڑی شفقت سے کتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ اور اس کو ساتھ لیتے ہوئے برآمدے تک پہونچ گیا۔ کال بیل کا

بتی دباتے ہی ساتھ والے کمرے سے اُٹھنے کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھلا اور اندر سے کسی نوجوان نے جھانکا۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے ونود کو دیکھا اور پھر "ارے آپ" کہہ کر اس سے لپٹ گیا۔ اچھا تو یہ ستیش تھا۔ "اماں یار تم پورے مرد بن گئے ہو۔ کیا کمال کیا ہے۔"

ستیش اسے اندر لے گیا۔ انکل نے کتاب سے نظر ہٹا کر ونود کو دیکھا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا وہ اسے پہچان نہ سکے۔ "ونود بھیا" ستیش نے اعلان کر کے انکل کا کام آسان کر دیا۔ "اچھا اچھا" کہہ کر انکل اُٹھے اور ونود کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے "ہونہہ" کہہ کر گویا بہت کچھ کہہ دیا۔ ونود نے دیکھا اس کے سامنے کھڑا ہوا آدمی اب جوان نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ان کے بال پک گئے تھے۔ آنکھوں کی چمک دمک ختم ہو چکی تھی۔ ہلکی سی کھانسی میں زندگی کی آواز کم اور موت کی زیادہ تھی۔ ایسا لگتا کہ انکل زندگی کو کہیں پیچھے بھول آئے ہوں۔ اب وہ کچھ کھوئے کھوئے سے دکھائی پڑتے تھے۔ ان سے مل کر اسے خوشی کی بجائے شدید غم کا احساس ہوا۔

"گھر کے باقی لوگ کہاں ہیں؟" ونود نے گھر کے سونے پن کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ سب ہسپتال گئے ہوئے تھے۔ ہسپتال خیر تو ہے نا — اوہو تو رتنا کے بچہ ہوا ہے۔ صرف دو ہی دن ہوئے ہیں۔ آنٹی اور سبھی وہیں ہیں تو اسی لئے گھر سونا سونا لگ رہا ہے۔ "چلو ہسپتال چلیں!" ونود نے مشورہ دیا۔

لیکن اب تو بہت دیر ہو چکی تھی اور ملنے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ انکل نے صلاح دی اور پھر نوکر کو بلا کر ونود کے لئے کھانا بنانے کو کہا۔ وہ سب لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ اسے اپنی خاطر کوئی بھی اہتمام پسند نہیں تھا۔ اس نے کہنا چاہا کوئی بات نہیں۔ پھر سوچا کون سنے گا میری بات۔ چلو جو بھی ملے گا کھا لوں گا۔

رات سونے کے وقت پھر اسے گھر کے سونے پن کا احساس ہونے لگا۔ یہ کیا ہو گیا ہے ان لوگوں کو۔ اتنے بوڑھے کیوں دکھائی پڑتے ہیں یہ سب لوگ۔ یہ سب گزشتہ پانچ سال کی برکت ہے کیا۔ شاید وہ بھی دوسروں کے لئے اتنا ہی بدل گیا ہو۔ تبھی تو اسے ایک دم پہچانا نہیں جا سکا۔ نہیں یہ سونا پن صرف آنٹی اور رتنا کی غیر حاضری کی وجہ سے ہے۔ ان سے مل کر سب کچھ دور ہو جائے گا۔ ان کے واپس آنے پر پھر گھر میں رونق آ جائے گی۔ سب کچھ خود ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ دو چار دن وہاں رک جائے گا۔ شاید اداسی کچھ کم ہو جائے۔

صبح ایک سرسری قسم کے بریک فاسٹ کے بعد وہ انکل کے ساتھ ہسپتال چلا گیا۔ انکل کو کسی ضروری کام سے کہیں اور جانا تھا۔ اس لئے وہ اس کے ساتھ اندر نہ جا سکے۔ اسے انھوں نے گیٹ پہ ہی اُتار دیا۔ اور کمرے کا نمبر بتا کر کار آگے بڑھا دی۔ ونود نے سوچا۔ کیا ضروری کام ہو گا انکل کو جو وہ پانچ منٹ کو بھی نہیں آ سکے۔ جوں جوں انسان بڑا ہوتا جاتا ہے اس کے فروعی کام بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ اس نے انکل کو بلانا چاہا لیکن پھر سوچا، چلو جانے دو۔ ویسے بھی کار کافی دور جا چکی تھی۔

کمرہ اسپیشل وارڈ میں تھا۔ پاس جا کر اس نے دیکھا کمرہ ادھ کھلا تھا۔ دروازے کے شیشے پر اس نے انگلی سے تین چار بار ٹھک ٹھک کی۔ اندر سے آواز آئی۔ "کون؟ — آ جائیے!" یہ آنٹی کی آواز تھی۔ یہ پانچ سال کی مدت تھی جس نے آواز میں کچھ کمزوری کا اثر ڈال دیا تھا۔ یا شاید اسپتال میں اور خاص کر اسپیشل وارڈ میں لوگ آہستہ ہی بولتے ہیں کہ تندرست آدمیوں میں بھی زندگی کچھ دبی دبی سی رہتی ہے۔ اسپتال میں بیماروں کا راج ہوتا ہے۔ تندرست کو تو صرف اس شرط پر داخلے کی اجازت ملتی ہے کہ وہ زیادہ شور نہ کرے۔ شاید وہ سمجھتی ہوں ڈاکٹر ہے یا نرسنگ نرس۔ کچھ بھی ہو اس ٹھک ٹھک سے انھیں یہ تو نہیں معلوم ہو گا کہ باہر "وہ" کھڑا ہے۔ پانچ سال کے بعد اکیلا۔ اس کی دل کی دھڑکن کچھ تیز ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اور آہستہ سے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

ایک لمحہ کے لئے آنٹی نے اُسے بیگانہ پن سے دیکھا

اور پھر" ارے تم کہاں سے آن ٹپکے نہ خط نہ پتر۔ وہی پرانی عادتیں۔"
ونود نے ہاتھ جوڑ دئے۔ دائیں طرف پلنگ تھا جس پر رتنا لیٹی ہوئی تھی۔ رتنا کا صرف منہ اور بازو دکھائی دیتے تھے۔ باقی جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ چادر شاید وہ گھر سے لائے ہوں گے۔ اسپتال کی چادریں اتنی سفید اور اتنے اچھے کپڑے کی نہیں ہوتیں۔ اس نے رتنا کی طرف مڑتے ہوئے ایک ہی نظر میں رتنا اور اس کے بچے کی طرف دیکھ کر لمبا سا "ہیلو" کہا۔

رتنا کے جوان چہرے پر ایک مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ اب بچی نہیں تھی۔ بچے کی ماں تھی۔ اس کی مسکراہٹ نے ونود سے کہا دیکھا اب میں کتنی بڑی ہو گئی ہوں۔ اب تو میں تمہارے برابر کی ہو گئی نا؟

آنٹی نے ونود کو کندھے سے ہلاتے ہوئے کہا — "لڑکا ہے — سفید — لیکن بالکل رتنا کی طرح۔" اور یہ کہہ کر آنٹی نے رتنا کا منہ چڑا دیا۔

وہ جھکا اور کپڑوں میں لپٹی ہوئی اس ننھی سی انسانی زندگی کو دیکھنے لگا۔ اس عمر میں سب کے بچے ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق جو کوئی کچھ بھی کہہ دے ٹھیک ہی ہوتا ہے۔ بچے کا بغور معائنہ کرکے اس نے بہت گہری مسکراہٹ کے ساتھ رتنا کو دیکھا اور پوچھا۔ "رتنا تم خوش ہو نا"

اس سوال میں کتنے ہی سوال تھے۔ وہ کس بات کے بارے میں پوچھ رہا ہے کہ وہ خوش ہے۔ شادی ہو جانے کی وجہ سے، یا بچہ ہونے کی وجہ سے، ماں باپ کے پاس آنے کی وجہ سے، یا 'ان' کے ساتھ اس کے اچھے تعلقات کی وجہ سے، یا خود اس کی اپنی آمد کی وجہ سے۔

"بہت خوش۔" رتنا نے آنکھیں میچ کے کہا۔ اس کے اس چھوٹے سے جواب میں کتنے ہی جواب تھے۔ اس جواب نے ونود کو بتایا کہ رتنا کا شوہر اچھا ہے۔ اس کا خیال رکھتا ہے۔ وہ ماں بن گئی ہے اور اب اس کا ایک چھوٹا سا خوب صورت گھر ہے جہاں وہ کچھ دنوں کے بعد واپس چلی جائے گی۔ ونود کو گویا ایک دھکا سا لگا۔

وہ جیسے اس جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ "بہت خوش" اس نے پوچھنا چاہا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم کسی اور کے ساتھ کیسے خوش ہو سکتی ہو۔ یاد ہے نا تم نے مجھ سے پیار کیا تھا۔ میرے منع کرنے پر بھی، میرے لاکھ سمجھانے پر بھی۔ اس دن جب میں اکیلا ڈرائینگ روم میں بیٹھا ریڈیو سن رہا تھا اور تم دوسری طرف سے پردے کے پیچھے سے دبی گاتا گنگناتی ہوئی آئی تھیں، کیا بول تھے اس کے۔ 'من کی بات پیا مان جاؤ' — میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا 'ہیلو'۔ جیسے ہمیشہ کہتا تھا جیسے آج بھی کہا اور تم نے میرے بازوؤں میں اپنے آپ کو ڈھیر کر دیا تھا۔ یہ سب چند ہی لمحوں میں اور بالکل انجانے میں ہو گیا تھا کم سے کم میری طرف سے۔ اچانک دوسری طرف سے نوکر آ گیا۔ تم نے ایک دم اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ نہ جانے نوکر نے کیا سوچا ہو۔ لیکن مجھے تو ایسا لگا جیسے تم نے یہ انجانے پن میں نہیں کیا تھا۔ میں تو تمہیں بچی سمجھتا تھا لیکن شاید فلمیں دیکھنے کی وجہ سے یا شاید مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ لڑکیاں سب باتیں اتنی جلدی سمجھنا شروع کر دیتی ہیں۔ اس دن تم خوش تھیں اور آج بھی۔

"کیا سوچ رہے ہو۔" آنٹی نے گویا لاٹھی سی ماردی۔

"مٹھائی کھاؤ۔ میرا پہلا نواسہ ہے۔ چائے پیو گے؟"

"نہیں آنٹی تھینک یو۔ میں تو بریک فاسٹ کھا کے آیا ہوں۔ ہاں آپ کے بغیر کھانے میں مزہ نہیں آیا۔"

"منہ تو میٹھا کر دو نا۔" رتنا نے لیٹے لیٹے اپنی کمزور آواز میں اصرار کیا۔ "ہاں سب کچھ کھائے گا۔ ابھی چائے بناتی ہوں، انہیں بھی تو کھانا ہے نا۔" آنٹی نے ادھر ادھر سے چیزیں اٹھانی شروع کیں۔ ایک ہی کمرہ تھا اور وہ پورا گھر بنا ہوا تھا۔ سب کچھ وہیں کرنا پڑتا تھا۔ اسٹوو کو میز پر رکھ کر انھوں نے اسے صاف کرنا شروع کیا۔

ونود رتنا کے پلنگ کی پائیں بیٹھ گیا۔

"تمہارے 'وہ' کیسے ہیں؟ کیا نام ہے ان کا؟ میں تو بھول ہی گیا۔"

"ہریش بہت اچھے ہیں۔ بہت سیدھے سادے آدمی ہیں۔"

رام لعل

دُکھ کی آتما

شنکھوں کی دھر آواز نے ایک نئے دن کی آمد کا اعلان کیا۔ شری دھر ہوٹل کے کمرے میں کھڑکی سے لگا تاڑ کے اونچے پیڑوں کو دیکھ رہا تھا جو صبح کی نرم ٹھنڈی ہواؤں میں جھوم رہے تھے۔ کئی عورتیں اور مرد اس دیش کی صدیوں پرانی تمل بھاشا میں بھجن گاتے ہوئے مندر کی اور جا رہے تھے۔ اس طرح نئی صبح کا آغاز ہزاروں سال پہلے بھی کئی بار ہوا ہوگا۔ ہزاروں سال پہلے بھی صبح ہوتے ہی اس دھرتی پر سنہری دھوپ کی چادر بچھ جاتی ہوگی۔ اس دھرتی کے مندر اور گیت من کو بے اختیار کھینچتے ہیں۔

یاترا کرتے کرتے جب وہ دکھشنی بھارت آیا اور یہاں چٹانوں سے تراشے ہوئے عالیشان مندر دیکھے تو بالکل کھو سا گیا۔ وہ دھرم سے کہیں زیادہ آرٹ کے قریب تھا۔ ماضی پرست ہونے سے کہیں زیادہ وہ تاریخ کا ایک ذہین اور باشعور طالب علم تھا۔ گھومنا اور مشاہدہ کرنا اس کا خاص مشغلہ تھا۔ اسی میں اسے روحانی اطمینان ملتا تھا۔ ہر دو سال کے بعد وہ اتنا روپیہ یقیناً جمع کر لیتا جس سے دیش کے کسی ایک حصے کا سفر ممکن ہو جاتا۔ وہ تنہا ہی گھومتا تھا۔ تنہائی اس کے اندر افسردگی پیدا نہیں کرتی تھی۔ وہ دنیا کے ان خوش نصیب تنہا آدمیوں میں سے ایک تھا جو اپنی تنہائی سے ہی لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس بار تو وہ بے حد اداس نظر آ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو وہ اب کے اکیلا نہیں تھا۔ یاترا کے دوران میں ایک اور شخص بھی ساتھ ہو لیا تھا۔۔۔ پروفیسر مکرجی ۔۔۔

پروفیسر مکرجی اُسے جلگاؤں میں اچانک مل گئے تھے۔ پہلے سے ملاقات نہیں تھی۔ لیکن ان کی پُرکشش شخصیت نے جو اونچے قد، لمبی سفید داڑھی اور بکھرے بکھرے بالوں کے علاوہ گہرے بھورے رنگ کی پتلون اور اسی رنگ کے لمبے کوٹ سے مل کر بنی تھی، شری دھر کو پہلی نظر میں ہی متاثر کر لیا تھا۔ اس کا سر بے اختیار ایک بے نام سی عقیدت سے ان کے سامنے جھک گیا تھا جس کے لئے اُسے بعد میں کبھی ندامت نہیں ہوئی۔

جب اُسے معلوم ہوا کہ اجنتا کی بودھی خانقاہیں دیکھ لینے کے بعد پروفیسر مکرجی بھی جنوبی ہند کی طرف جائیں گے تو وہ بہت خوش ہوا تھا۔ اتنی بڑی شخصیت کا ساتھ مل جانا یقیناً ایک وردان ہی تھا! لیکن چند ہی منٹ کی گفتگو کے بعد شری دھر نے یہ جان لیا، مکرجی بے حد دکھی انسان ہے۔ بہت ہی افسردہ! وہ یاترا کے ذریعے سے اپنا من بہلانے نہیں نکلا ہے بلکہ خود کو اور دکھی بنانے، اپنی اداسی کو اور بڑھانے کے لئے، کسی ایسے اذیت پسند انسان کی طرح جو بار بار اپنے ہی زخموں کو کریدتا ہے اور اسی میں سکھ پاتا ہے۔

چناں چہ جب شری دھر نے دو ہزار سال پہلے کے مندروں کی دیواروں اور چھتوں پر آبی رنگ سے بنے روغنی فریسکوز کی تعریف کرنی چاہی تو مکرجی نے اُسے روک دیا۔ جیب میں سے پرانی تصاویر کا ایک بنڈل نکالا۔ پانچ دس ایسے فوٹو نکال کر دکھائے جو انہی فریسکوز کے تھے۔ کہا،

"یہ میری بیٹی وندنا نے کھینچے تھے۔ وہ کلا اور گیان کے اِس ہی سلسلے کو آٹھ سو برس تک چلنے والا ایک کہا کرتی تھی۔ ایک ہی طویل نظم جس کی سنسکرتی تو ایک ہی ہے نکتہ نظر بھی ایک ہی۔ لمبی اُسی ایک ہی کلپنا کو ان مورتیوں میں ڈھالنے کا کام کتنی ساری نسلوں نے کیتے۔ سارے ہاتھوں نے کیا تھا۔ کیا یہ حیرانی کی بات نہیں؟"

انھوں نے شری دھر کو وندنا کے بارے میں بہت کچھ بتایا وہ بچپن سے ہی ان کے ساتھ تھی۔ ساتھ ساتھ گھومتی تھی اور ذہنی تربیت پاتی تھی۔ کوئی کوئی بچہ اپنے باپ کا ہی ہو رہتا ہے۔ اپنی ماں کے ساتھ اس کا لگاؤ خاص نہیں ہوتا اور وہ اپنے باپ سے نہ صرف متاثر ہی ہوتا ہے بلکہ اسے بھی متاثر کرتا ہے۔ کرجی کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا وہ اپنی بیٹی کو بے حد چاہتے تھے۔ ان کی بیٹی بے حد ذہین تھی۔ بے حد تیز فہم اور بے حد ہی خوب صورت۔ ایم اے تک تعلیم پائی۔ اتنی اچھی تعلیم و تربیت کا محل کرجی نے ایک اچھے باپ کی حیثیت سے خود اپنے ہاتھوں ایک ایک اینٹ لگا کر تعمیر کیا تھا۔ وہ ایک ایک اینٹ کے رکھنے اور جمانے کی کہانی شری دھر کو سفر کے دوران میں سناتے آئے تھے۔ انھوں نے کہانی کو بار بار دہرایا بھی تھا۔ جہاں جہاں وہ گھومتے پھرے تھے، وندنا کا ذکر بھی چلتا رہا تھا بعض دفعہ کسی خاص جگہ کی خوب صورتی اسی کہانی کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ سفر کی آخری حد تک پہنچتے پہنچتے یہ سارا سفر شری دھر کو ایک نئی ہی قسم کا معلوم ہونے لگا۔ اس سارے سفر میں پروفیسر کرجی کی باتیں چلتی رہی تھیں جو ان کی بیٹی وندنا کے بارے میں تھیں۔ وندنا اب زندہ نہیں تھی۔ پچھلے سال اچانک چل بسی تھی، بن بیاہی ہی! اس کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے ہی کرجی ان سب استھانوں پر بھٹکتے پھرتے تھے جہاں جہاں وندنا کبھی ان کے ساتھ جا چکی تھی۔

شری دھر نے کرجی کا دل نہیں توڑا۔ انھیں بولنے سے کہیں منع نہیں کیا۔ کبھی کبھی وہ اوب گیا تب بھی ان کی باتوں میں دل چسپی دکھائی۔ پروفیسر کرجی ایسی شخصیت ہرگز نہیں تھے جن کا وہ مذاق اڑاتا یا بے رخی دکھا کر ان کا دل توڑتا۔ نہیں ایسا تو شری دھر بھی نہیں تھا۔

شری دھر آج واپس جانے والا تھا۔ مدورائی میں آج اس کا آخری دن تھا۔ لیکن پروفیسر کرجی کا وہاں سے ابھی جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ وہاں سے ترچیوری جانے والے تھے۔ وہاں سری رنگم کے مندر کے ساتھ بھی وندنا کی یاد وابستہ تھی۔

" اُس مندر کی چار سو چونتیس سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وندنا اوپر پہنچی تھی تو تھک کر چور چور ہو چکی تھی۔ چاروں طرف نشیب میں پھیلی ہوئی ہری بھری دھرتی اور بہت سست رفتار سے بہتی ہوئی ندی کاویری کو دیکھ کر اس نے کہا تھا ۔ 'اب آگے بڑھوں گی تو کاویری ندی کی طرح۔ بہت ہی مندگتی سے!' —

— لیکن وہ آگے کہاں بڑھ سکی تھی! اس کے بعد وہ ادھر ہی لوٹ کر چلی گئی جدھر سے آئی تھی!"

یہ سب بتاتے بتاتے کرجی کی آنکھیں ہمیشہ بھیگ بھیگ جاتی تھیں۔

شری دھر وندنا کے بارے میں اتنا کچھ سن چکا تھا کہ اب وندنا اس کے دل و دماغ میں بس گئی تھی۔ ایک تصوّر کی طرح نہیں، جیتی جاگتی، سانس لیتی ہوئی، دل چسپ اور ذہانت سے بھرپور باتیں کرنے والی لڑکی کی حیثیت سے۔ اب شری دھر خود اس کے متعلق بہت کچھ بتا سکتا تھا۔

شری دھر نے اچانک اپنے پیچھے کسی کو کھڑا ہوا محسوس کیا۔ چونک کر سر گھمایا۔ بوڑھے کرجی مسکرا رہے تھے۔ وہ پہلی بار اس طرح مسکرائے تھے۔ شری دھر نے بڑی کربناک خاموشی سے دیکھا۔ کرجی کی آنکھوں سے ساری افسردگی غائب ہے۔ بس ایک عجیب سے اطمینان کی جھلک ہے۔

"چلو بھگوان گنیش کا مندر بھی دیکھ آئیں!"

شری دھر نے کوئی جواب نہ دیا۔ باہر دیکھنے لگا اُسی کھڑکی کے باہر۔

"کیا ہوا شری دھر؟" وہ آگے آکر کھڑے ہو گئے۔ "تم اتنے غمگین کیوں ہو؟ کئی روز سے تمھارے اندر یہ تبدیلی دیکھ رہا ہوں۔ تم پہلے کی طرح خوش کیوں نہیں رہتے؟"

اگست ۱۹۶۳ء

شری دھر کی آنکھوں میں وہی گہرا ملال تھا اور بڑی بے چینی سے کروٹیں لیتا ہوا غم کا سمندر!

مکرجی نے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دئے۔ جھک کر اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں سے ملائیں۔ "بتاؤ نا مترا! آخر بات کیا ہے؟ بیس روز سے تم میرا ساتھ دے رہے ہو، اپنی محبت دے رہے ہو، سہارا دے رہے ہو۔ مجھے بہت کچھ کہنے کے لئے قیمتی وقت بھی، اور آج میں صرف تمہاری وجہ سے ہی خود کو ایک پہاڑ کے نیچے سے نکلتا ہوا سا محسوس کرتا ہوں۔ کتنی عجیب بات ہے میں اپنے اندر مسکرانے کے لئے ایک شدید خواہش بھی پاتا ہوں! لیکن جب ایسا ممکن ہو سکا ہے تو تم نے اپنا موڈ ہی بدل لیا ہے۔"

پروفیسر مکرجی اور شری دھر کے درمیان عمر کا بہت فاصلہ تھا۔ ایک لمبا فاصلہ۔ شری دھر نے اپنے بکھرے ہوئے کالے گھنے بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹا اور ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا:

"کونارک کے سورج دیوتا کا رتھ دیکھ کر وندنا نے کیا کہا تھا؟ سات گھوڑوں اور چوبیس پہیوں کی کوئی اور مثال اس دنیا کی مورتی کلا میں نہیں ملتی؟"

پروفیسر مکرجی کے چہرے سے حیرانی دور ہو گئی۔ لیکن وہ اداس نہ ہوئے۔ اسی طرح مطمئن سے کھڑے کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ وہ شری دھر کی غمگینی کا سبب کچھ کچھ سمجھ گئے۔ بولے،

"تمہیں میں نے بتایا تھا وندنا مر چکی ہے؟"

"بتایا تھا۔"

"پھر بھی تم وندنا کے لئے ——!"

آگے وہ کچھ نہ کہہ پائے۔ شری دھر کے سامنے سے ہٹ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ اسی طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے جیسے کہہ رہے ہوں —— "کتنی عجیب بات ہے میرا سارا دکھ شری دھر کے پاس کیسے چلا گیا —— ؟ وہ اس دکھ کو کہاں تک ساتھ ساتھ لئے پھرے گا؟ کب تک!"

قیصر تمکین

ہزیمت

مشیر مرزا کھانا کھانے بیٹھے ہی تھے کہ ان کا پارہ چڑھ گیا۔ حسب عادت انھوں نے روٹیاں گنیں۔ دسترخواں میں کل چھ چپاتیاں تھیں۔ انھوں نے غصے میں پوچھا۔ "ابھی سکندر کھانے میں باقی ہے؟" لڑکیاں چپ ہوگئیں جس کا مطلب یہ تھا کہ ان چھ روٹیوں ہی میں دونوں باپ بیٹوں کو کھانا تھا۔ انھوں نے بغیر بگھاری ہوئی دال کے ساتھ جیسے تیسے کر کے ڈھائی تین روٹیاں زہر مار کیں اور محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے۔

واپس آکر وہ حسب معمول آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے اور وظیفہ پڑھنے لگے۔ دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ ابھی کچھ زیادہ رات نہیں گئی تھی مگر سب لوگ اس طرح منہ ڈھانپے پڑے تھے گویا اب کبھی اٹھنا ہی نہ ہو۔ جب دستک کی آواز بڑھی تو مشیر مرزا سے ضبط نہ ہوا اور انھوں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سکندر مست ہاتھی کی طرح جھومتا اکڑتا ہوا داخل ہوا۔ مشیر مرزا چپ چاپ پھر جا کر لیٹ گیے۔

دونوں لڑکیاں ابھی تک بنی ہوئی سوئی پڑی تھیں مگر بھائی کے آتے ہی ایک نے کروٹ بدلی کیونکہ اب بھائی کو کھانا کھلانے کے لیے تو اٹھنا ہی تھا۔

ساجدہ نے اٹھ کر کھانا گرم کیا اور جب تک سکندر کپڑے بدلے اس نے دسترخواں بچھا دیا۔ اس وقت دال کے ساتھ ایک تازہ تلا ہوا انڈا بھی تھا۔ سکندر اپنے کھانے کے بارے میں بڑا محتاط تھا اور ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ کھاؤں گا نہیں تو کماؤں گا کیا۔"

روٹیاں صرف تین ہی تھیں۔ سکندر نے کچھ کہنا چاہا وہ شاید زور سے بگڑتا مگر ساجدہ نے ہونٹھ پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پہلے اس گھر میں ڈانٹنے ڈپٹنے کا حق صرف مشیر مرزا کو تھا مگر جب سے ان کی پنشن ہوئی اور بڑا لڑکا سکندر روزی سے لگا۔ یہ حق صرف سکندر کو حاصل ہوگیا۔ چناں چہ اب سب لوگ صرف اس کے غصے سے ڈرتے تھے

مشیر مرزا وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے آہٹوں پر دھیان دیا۔ ساجدہ باورچی خانے سے کچھ روٹیاں چھپا کر لائی اور سکندر کے سامنے رکھ دیں۔ مشیر مرزا وظیفہ بھول گئے۔ ان کے دل پر عجیب گھونسہ سا لگا۔ ان کو دکھ اس بات کا نہیں ہوا کہ انھوں نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا بلکہ قلق اپنی لڑکی کے کردار پر ہوا۔ مگر پھر ان کو یاد آگیا کہ سکندر مرزا جوان ہے، برسر روزگار ہے اور اس گھر میں ان کی پنشن کے لیے جو سرد جنگ کا ماحول پیدا ہوگیا ہے اس میں ان کی حیثیت ایک پیچھے ہٹتے ہوئے شکست یا سپاہی کی سی ہے۔

مشیر مرزا نے اپنی سو روپیے ماہانہ کی آمدنی میں سات اولادیں پالی تھیں جن میں سے چار جوان لڑکے تھے۔ انھوں نے پچھلے بیس بائیس برس برابر بغیر گھی کی دال اور روٹی پر بسر کیے تھے اور صرف ایک وقت کھانا کھانے کی عادت ان کی اس وقت سے پڑ گئی تھی جب سے کہ تنخواہ اور بچوں کی اسکول کی فیس میں تفاوت ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ مگر آج ان کے اشارۂ چشم و ابرو پر چلنے والی بھی ان کا

اگست ۱۹۶۴ء

ساتھ چھوڑ چکی تھیں اور ہر بات پر لڑکے کے ساتھ ہو جاتیں۔ شوہر کے بارے میں وہ یہی کہتیں ۔" ارے چھوڑو انھیں بکنے دو۔ ان کو تو جھک جھک کی عادت پڑ گئی ہے۔"

سکندر نے کھانا کھاتے کھاتے پوچھا ۔ " تو پھر کل کیا بڑے پھاٹک والے آئیں گے ؟"

یہ بات شاہدہ کی نسبت کے بارے میں تھی اس لیے ساجدہ چپ رہی ۔ مگر اس کی ماں بستر سے میں کسمسائیں اور پھر سکندر کو خوش کرنے کی نیت سے اٹھ کر بیٹھ گئیں ۔ " ہاں محوری بوا کہہ تو گئی ہیں ۔"

بڑے پھاٹک والوں نے شاہدہ کے لیے شادی کا پیغام بھیجا تھا اور ماں بیٹے آپس میں مشورہ کر کے اس سلسلے میں فیصلہ کیے لے رہے تھے ۔ مشیر مرزا سے کسی نے رسمی طور پر بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی ۔ مشیر مرزا کو غصہ آ گیا ۔ ان کو خیال آیا کہ اب اگر وہ نہ چونکے تو ساری بازی ہاتھوں سے نکل جائے گی ۔ وہ کھنکھار کر اٹھ بیٹھے ۔ " یہ کیا پھاٹک والوں کا کیا قصہ ہے ؟"

سکندر کو اس دخل در معقولات پر غصہ آ گیا مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے بیوی بول اٹھیں " اے وہی شاہدہ کی نسبت کی بات ۔ ایسے بن رہے ہیں جیسے بچے ہوں کچھ معلوم ہی نہ ہو۔

" کس مردود نے اس نسبت کی بات کی ۔ " مشیر مرزا نے زور سے اپنی پرانی آن بان والی آواز نکالی جس میں آج بھی نہ جانے کیوں ایسی گرج تھی کہ سب سہم اٹھے ۔

" ارے دھیرے دھیرے بولیے ۔ محلے والے کہیں گے کہ کیا رات دن ان کے یہاں ادھم مچا رہتا ہے ۔ " بیوی نے آواز دھیمی کر کے ایک بہت ہی درشت لہجے سے کہا ۔

" میں نے کہہ دیا ۔ میری زندگی میں شاہدہ کا رشتہ اس لفنگے لچے رضوان کے ساتھ نہیں ہو سکتا ۔ " یہ آواز اپنی بازگشت کے ساتھ دور دور تک گونج گئی اور سکندر نے بڑا سا لقمہ نگلتے ہوئے پہلو بدلا ۔ " میں نے کہا اب آپ چپ بھی ہوں گے کہ نہیں ۔ "

بیوی نے فوراً محلے کے خیال سے شوہر اور بیٹے کے ہاتھ جوڑنا شروع کر دئے مگر مشیر مرزا اپنے جلال پر آ چکے تھے اور انھوں نے انگریزی کا سہارا لیا ۔ " یو شٹ اپ "

انگریزی میں ڈانٹنے سے یہ فائدہ تھا کہ آواز کی گرج میں اضافہ ہو جاتا اور محلے کی عورتیں جو ادھم ہنگامے کی آواز سنتے ہی تمام کام چھوڑ کر بڑے ذوق شوق سے اس طرف کان لگا دیتی تھیں ، لڑائی کے چٹ پٹے پن سے محروم رہ جاتیں ۔

ماں بہنیں سکندر کے ہاتھ جوڑتی ہوئی اس کو الگ گھسیٹ لے گئیں اور مشیر مرزا دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھے ہوئے دیر تک غصے میں ٹہلتے اور بڑبڑاتے رہے ۔

دوسرے دن مشیر مرزا اپنے پنشن کے کاغذات پر دستخط کرانے اور بنک کا چکر کاٹنے میں مصروف رہے اور گھر میں شاہدہ کی شادی کی بات طے بھی ہو گئی ۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ عجلت سکندر کو تھی جو جلد سے جلد گھر کے ممبروں کی تعداد گھٹنے کا متمنی تھا ۔

مشیر مرزا زیادہ تر وقت نماز اور وظائف میں گزارتے اور گھر میں شاہدہ کی شادی کی تیاریاں ہوتی رہتیں ۔ وہ جب اندر داخل ہوتے تو سب لوگ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے ۔ کبھی وہ دیکھتے کہ ماں بیٹیوں میں بہت ہی رازداری سے تبادلۂ خیال ہو رہا ہے مگر ان کے آتے ہی باتوں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا اور بیوی مصنوعی غصے کے ساتھ بات بدل کر ساجدہ کو ڈانٹتیں ۔ " اے یہ سوئی تم نے پھر کھو دی نا ۔ مجال ہے کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر رکھی مل جائے ۔"

مشیر مرزا بعض وقت سب کے بیچ میں ایک کرسی ڈال کر بیٹھ جاتے ۔ مگر جتنی دیر وہ بیٹھے رہتے ایسی کشیدگی کی فضا رہتی کہ ایک ایک کر کے سب لوگ کسی نہ کسی طرح ہٹ جاتے اور وہ اکیلے جھک مارتے رہ جاتے ۔

ایک دن مشیر مرزا بیٹھے تھے کہ ایک مراثن آ گئی اور اس نے بہت ہی خوشامدی لہجے میں کہا " میاں مبارک ہو ۔ اب چار ہی دن میں بیٹی اپنے گھر بار کی ہو جائے گی ۔ "

مشیر مرزا سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی انتہائی ناگواری اور بہت ہی سنسنی خیز بدمزاجی سے بولے ۔ " کس کی شادی ۔ کیسی

شادی۔ میری مرضی سے کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔"
مشیر مرزا کی بیوی سناٹے میں رہ گئیں۔ عورت بھی دنگ
رہ گئی۔ مشیر مرزا یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے — "میں اپنے بھتیجی اس
تقریب میں شرکت نہیں کروں گا۔"
بیوی گھبرا گئیں۔ مشیر مرزا نے بہت ہی تلخی اور کچھ بہت
ہی مایوسی میں یہ جملے کہے جن کی چبھن اور درد انگیزی کو وہ محسوس
کیے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس کے علاوہ ان کو یہ بھی ڈر تھا کہ مراثن کس
طرح ان سب باتوں کا بتنگڑ بنا دے گی۔ ..
اور آخر ہوا بھی یہی۔ ادھر تو بیوی مشیر مرزا کی منت سماجت
کرنے لگیں کیونکہ اب یہی راستہ رہ گیا تھا اور دوسری طرف مراثن
نے جا کر پوری بات نمک مرچ لگا کر لڑکے والوں میں کہہ دی۔
وہ لوگ بھی چونک گئے۔ اتنا اندازہ تو سب کو تھا کہ مشیر مرزا کی مرضی
کے خلاف یہ شادی ہو رہی ہے۔ مگر یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ حالات
اتنے سنگین ہیں۔
شام تک دو تین آدمی مشیر مرزا سے ملنے آ پہنچے۔ انھوں نے
ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد پوچھا: "تو پھر اس تقریب میں آپ
کی شرکت یقینی نہیں ہے۔"
تب تک مشیر مرزا کا دل بیوی کی منت سماجت سے پگھل چکا
تھا اور کچھ وہ خود بھی معاملے کی نزاکت محسوس کر چکے تھے اس لیے
فوراً بولے — "کیوں نہیں ، کیوں نہیں ؟"
پوچھنے والے شرمندہ ہو کر بولے — "نہیں مطلب یہ ہے کہ
آپ شاید کچھ زیادہ اس کی موافقت میں نہیں تھے۔"
اگر میں موافقت میں نہیں تھا تو یہ رشتہ ہو کیسے رہا ہے؟
انھوں نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اور ایک خاص انداز سے سیدھے
ہاتھ کا پنجہ گھماتے ہوئے کہا۔
بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر اس واقعے کے بعد لوگوں نے یہ سمجھ لیا
کہ مشیر مرزا نے طوعاً کرہاً اس رشتے کو منظور کر لیا ہے۔ اس لیے اب
ذرا اطمینان اور قدرے بے خوفی سے ان کی موجودگی میں کپڑوں کی
سلائی اور دوسرے انتظامات کا ذکر کرنے لگا۔ پھر بھی مشیر مرزا ہر مسئلے
میں اپنی ٹانگ اڑانے سے باز نہ آئے۔ مثلاً ایک دفعہ جب لوگ
فراک اور جمپر کی سلائی کی باتیں کر رہے تھے کہ عورتوں کی موجودگی
میں وہ بگڑ کر بولے ، "فراک ہمارے یہاں نہیں سلے گی۔ غیر شرعی
چیز ہے۔"
"اے اب آپ عورتوں کی باتوں میں مت بولا کیجیے" —
بیوی نے کہا۔ مگر مشیر مرزا تقریباً نیم دیوانگی کے انداز میں ڈپٹ
کر بولے۔ "کیسے نہ بولوں ، میری لڑکی کی شادی کی بات ہے۔
میرے ہوتے میری لڑکی فراکیں جمپر نہیں پہنے گی۔ صرف قمیص
سلیں گی ، قمیص بس سی لیا — ؟"
سب لوگ چپ ہو گئے۔ فراکیں سلتی رہیں۔ بقول مشیر مرزا
انتہائی غیر شرعی قسم کی فراکیں ، چست جمپریں ، بغیر آستینوں کی
فراکیں — مگر مشیر مرزا کی موجودگی میں ان کا نام "قمیص" لیا جاتا۔
بارات کے کھانے کی فہرست تیار کی جانے لگی۔ مشیر مرزا
نے جھلا ہو کر پھر غصے سے کہا "یہ سب کہاں سے آئے گا ؟ کس
برتے پر بڑائی دکھائی جا رہی ہے۔ بس سادہ سالن اور روٹی
کافی ہے۔ ہماری حیثیت ہے کہ ہم پلاؤ اور مرغ کا انتظام کریں۔"
ایک بار پھر ان کی اور سکندر کی مٹھ بھیڑ ہوتے ہوتے رہ
گئی۔ بہنیں اور بھائی بیچ میں پڑے۔ "رہنے دیجیے بھائی صاحب
رہنے دیجیے۔ آپ ابا میاں کو بکنے دیجیے۔ ان کے جاننے والے
آئیں گے تو خالی سالن روٹی کھلا دی جائے گی۔ بارات کا کھانا
تو ڈھنگ کا ہونا چاہیے۔ نہیں تو سب تھو تھو کریں گے۔"
مہمانوں کی فہرست تیار کی جانے لگی تو مشیر مرزا نے اپنی رضاعی
بہنوں ، مشفق بہن ، قیامن بہن اور رفیق بہن کے نام گنائے۔
اس بار بیوی بپھر اٹھیں۔ یہ سب حرامخوریں کام کے وقت منہ
نہیں دکھاتیں۔ روٹیاں توڑنے اور عیب نکالنے آ جائیں گی۔"
"خاموش۔ بس ایک حرف جو منہ سے نکلا۔ اب تمھاری
یہ ہمت کہ میرے سامنے میری دودھ شریکی بہنوں کو حرامخور
کہو — حرامخور تم — تمھارے گھر والے۔ تمھارے باپ
دادا تمھارے ...

اگست ۱۹۶۷ء

ہرچند کہ سکندر اس وقت گھر میں نہیں تھا اور سب بیٹی بیٹے ماں پر چپ رہنے کے لیے زور دے رہے تھے مگر مشیر مرزا کی بیوی نہ مانیں اور جم کر لڑنے کو تیار ہو بیٹھیں۔ "میں کہتی ہوں نہ شفق بہن، نہ رفیق بہن کوئی نہیں آئے گا اگر یہ ٹنیاں آئیں تو میں چوڑیاں پہن کر کھاؤں گی۔ اسے ماں کوئی سگی بہن ہو تو برداشت کرے ——"

مشیر مرزا جز بز ہوئے اور ڈپٹ کر بولے۔ "میں نے کہا کہ تم چپ بھی رہو گی کہ . . . . ."

"کہ کیا — کیا کر لیجئے گا آپ — میں نہیں چپ رہوں گی۔ نہیں چپ رہوں گی . . . . ."

اتنے میں وہ چار سطے والیاں آ گئیں۔ مشیر مرزا اخبار دیکھنے لگے اور بیوی بڑی شاداب اور شگفتہ مسکراہٹ چہرے پر لا کر بولیں:—

"آؤ آؤ بہن، بڑی دیر کر دی۔ ابھی تمہارے بھائی صاحب کہہ ہی رہے تھے کہ کیا بات ہے احتشامن بہن نہیں آئیں۔"

پھر ذکر چھڑ گیا اگلی پچھلی تمام تقریبوں کا — اور مشیر مرزا ظہر کی نماز پڑھنے مسجد چلے گئے۔

شادی کے دن لڑکے والوں نے کچھ ٹانگیں پھیلائیں اور دولہا میاں نے اپنے مطالبات کی ایک فہرست پیش کی۔ ابھی تک تو مشیر مرزا سب سے خندہ پیشانی سے پیش آ رہے تھے۔ دولہا میاں کی خواہشات سن کر تنگ بگولا ہو گیے اور تیر کی طرح دولہا میاں کے پاس پہونچے اور تلوار کی دھار کی طرح تیز اور کاری طنز کے لہجے میں بولے "میاں صاحبزادے تمہارے باپ دادا نے بھی کبھی ریفریجریٹر دیکھا تھا۔"

محفل میں سناٹا چھا گیا۔ قاضی صاحب ذرا پیچھے کھسک کر بیٹھ گئے اور دولہا میاں برہم ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے — "یہ میری بے عزتی ہے۔"

"بے عزتی — ؟؟ عزت ہے کس کی برخوردار — زندگی بھر مسجدوں میں خیرات کی روٹیوں پر پلنے والے تمہارے باپ کو میں نے ہی پڑھایا۔ میں نے ہی مولوی چراغ حسن کو حیدر آباد بھجوا کر وظیفہ دلایا۔ بھول گیے اپنی حیثیت آج۔ اللہ کی شان آج تم کو ریفریجریٹر چاہیئے — تمہاری حیثیت کیا ہے۔ سو، سوا سو کی کلرکی پر یہ نخرے ہیں۔ اگر کچھ ہوتے تو کیا کرتے —؟"

سکندر آگے بڑھا اس نے باپ کو پیچھے کھینچا اور سب سے کہنے لگا "آپ ان کی باتوں کا برا نہ مانیئے گا۔ آج کل ان کا دماغ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" دو تین اور آدمیوں نے مشیر مرزا کو پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے ان کو لے جا کر کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ لالہ گوری شنکر افسوس کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "چھ چھ الیشور موت دے دے پر پاگل نہ کرے۔"

لیکن مشیر مرزا کی تلخ بیانی بھی کام کر گئی۔ دولہا میاں اور ان کے ساتھیوں کو اپنی حیثیت اچھی طرح یاد آ گئی۔ پھر دولہا میاں کو شاہدہ کا خیال آیا۔ پھر وہ تمام گھرانے بھی یاد آئے جہاں سے ان کی شادی کے پیغام مسترد ہو چکے تھے۔ وہ سکندر کے دو ہی چار جملوں میں من گئے — انھوں نے سوچا "ارے ہاں پاگل کی بات کا برا کیا ماننا۔"

مبارک سلامت کا شور پھر گونجا۔ رات گئے تک شادی کی تقریب اور چہل پہل جاری رہی۔ اندھیری کوٹھری کے کونے میں مرزا چیختے چلاتے اور بکتے جھکتے سچ مچ پاگل ہو چکے تھے۔ انھوں نے دیوار سے اپنا سر پھوڑ لیا تھا اور بے ہوشی کے عالم میں معلوم نہیں کیا کیا بڑبڑاتے ہوئے آخری سانسیں لے رہے تھے۔ کسی کو اس طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

شاہدہ رخصت ہو کر سسرال جا رہی تھی۔ ہاں مگر مشیر مرزا کے جیتے جی نہیں۔

———

دِفاع اور



ترقی کا کام



ساتھ ساتھ چلتا ہے

دِفاعی کوششوں میں براہِ راست شریک ہونے کے لئے فولاد کی صنعت نے اپنی پیداوار بڑھادی ہے اور رولنگ ملوں کے پیداواری پروگراموں میں ضروری ترمیم و تبدیلی کردی گئی ہے۔ مُسلح افواج کے کام میں آنے والی موٹر گاڑیوں کا معیار مقرر کردیا گیا ہے۔ انجینیرنگ صنعت کی صلاحیت بھی بڑھادی گئی ہے۔ برقی پلانٹ چالو کرنے کا کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ ہنگامی صورت میں استعمال کے لئے جنریٹر سیٹوں کا ایک ذخیرہ بنایا جارہا ہے۔ ریلوے ورکشاپوں سے زیادہ تعداد میں مال ڈبے بن کر نکل رہے ہیں۔ اہم و دوسری سڑکوں کو بہتر اور جدید بنایا جارہا ہے۔

ان نئی ترجیحات سے مُلک کے دِفاعی نظام کی مضبوط بُنیاد تیار ہو رہی ہے۔ اس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے جی جان سے ہاتھ بٹائیے:



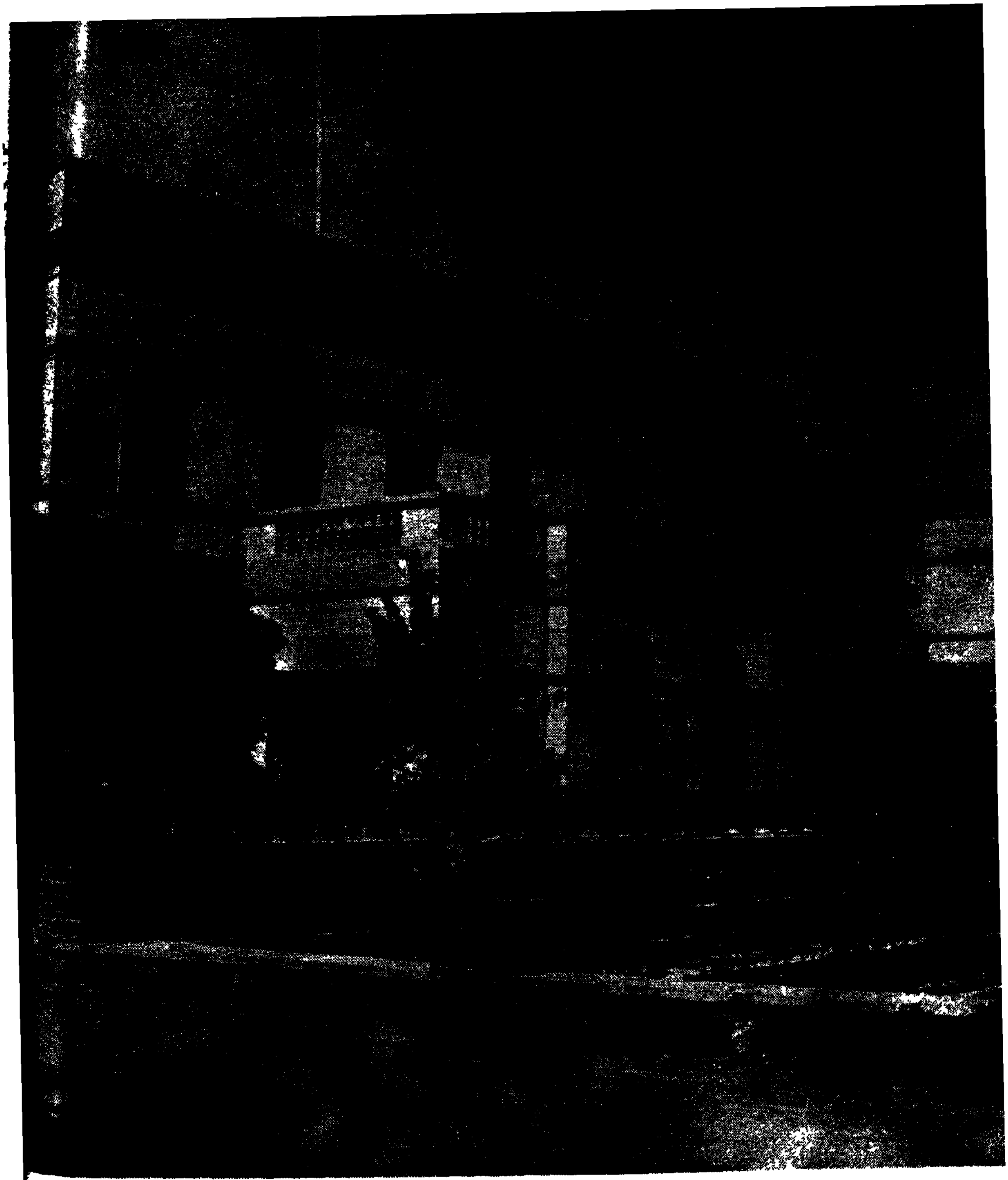
پلان کو کامیاب بنائیے

بھارت کے دِفاع کو مضبوط کیجئے

DA 63/444



مدھیہ پردیش کے کھاردار قبیلے کے لوگ گاؤں میں اپنے جھونپڑے بنا رہے ہیں

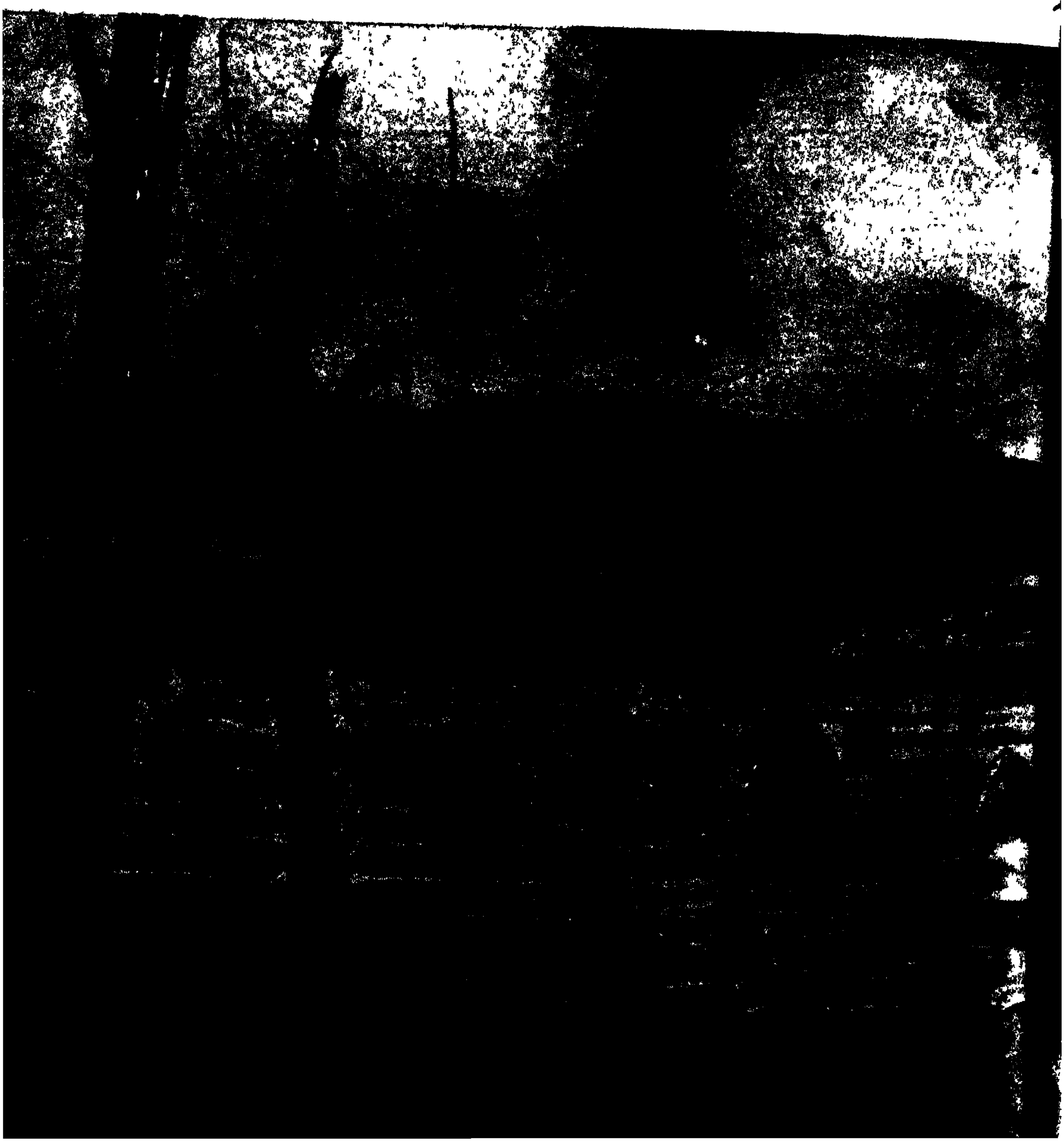


Edited & published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
Printed by Union Printers Co-op. Industrial Society Ltd., Karol Bagh, New Delhi-5

آجکل

۶۰ پیسے

ک سمت ۱۸۸۶
۱۹۶۴ء





اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل دہلی

ترتیب

سرورق :- کشمیر میں دھان کی فصل

رسالے کی پشت پر :- گوآ کا ایک نظارہ

جلد ۲۳ - نمبر ۲

بھادرا شک سمت ۱۸۸۶

ستمبر ۱۹۶۴ء

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- شہباز حسین

سالانہ چندہ :- ہندوستان میں :- سات روپے

پاکستان میں :- سات روپے (پاک)

غیر ممالک سے :- ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ :- ہندوستان میں :- ۶۰ پیسے

پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)

غیر ممالک سے :- ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

ملاحظات

رشوت ستانی اور بدعنوانیوں کے انسداد کے لئے سداچار سمیتیوں کا قیام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کسی ملک کی ترقی و فلاح کے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ اس کا معاشرہ اس لعنت سے پاک ہو۔ ورنہ غلط طریقوں اور ناجائز حربوں کے استعمال کی وجہ سے بڑا عدم توازن پیدا ہو جائے گا جو ملک کی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہوگا۔

اس لعنت کو دور کرنے کے لئے جہاں ایک طرف نگرانی، طریق کار میں ترمیم اور سزاؤں کی ضرورت ہے وہاں دوسری طرف معاشرے کے اخلاقی شعور کو بھی جگانے کی ضرورت ہے۔ انتظامیہ کے لوگ بھی معاشرے کا ہی ایک حصہ ہیں۔ لہٰذا اگر ہمارا سماج ان کی غیر سماجی حرکتوں کو برداشت نہ کرے اور بڑی سختی اور شدت کے ساتھ اس سے بیزاری کا اظہار کر کے اور بے ایمان افراد کا پول کھول دے تو لوگوں کا ایسا رویہ قانونی سخت گیریوں سے زیادہ مؤثر ثابت ہوگا۔ خود شری نندہ کو اس بات کا پورا احساس ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ کرپشن سرطان کی ایک ایسی بیماری ہے جو گہری جڑیں پکڑے ہوئے ہے۔ اس کے انسداد کے لئے ہر ایک کو مختلف سمتوں سے اس پر حملہ کرنا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر سیاسی کارکن صحیح لگن سے اس کام میں جُٹ جائیں اور کرپشن کے خلاف دیش کے لکھو کھا نیک افراد کی کوششوں اور عام آدمیوں کی حمایت کو حرکت میں لے آیا جائے تو جلد ہی بدعنوانیوں پر قابو پا لیا جائے۔

ضرورت ہے کہ ملک کا ہر شہری حکومت کی قائم کردہ ایجنسیوں سے تعاون کرے اور خود اپنے اعمال و کردار کا بھی محاسبہ کرے۔

اجتماعی ترقی اور پنچایتی راج دیہی ہندوستان کی ترقی و خوش حالی کے لئے بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس پروگرام نے بارہ سال کی قلیل مدت میں کئی کارنمایاں انجام دئے ہیں۔ ہندوستان کے ۵½ لاکھ گاؤں کو پس ماندگی اور بدحالی کے راستے سے ہٹا کر ترقی و خوش حالی کے راستے پر آگے بڑھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

۲۰ جولائی ۱۹۶۴ء کو دلی میں اجتماعی ترقی اور پنچایتی راج کی سالانہ کانفرنس ہوئی۔ اس کا افتتاح کرتے ہوئے شری اشوک مہتہ نے کہا کہ ترقی کے لئے موجودہ حالات سے بے اطمینانی اور بہتر حالات قائم کرنے کے لئے لگن دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ آپ نے مزید کہا کہ یہ ادارے ایک سماجی فضا تیار کرتے ہیں اور ان کی توسیع یا تقویت خود ترقی کا ایک عمل ہے۔ اس وقت ملک کو زیادہ پیداوار کی سخت ضرورت ہے اور ان اسکیموں کو فروغ دے کر اور کامیابی سے ان پر عمل درآمد کر کے ہم اپنا مقصد بخوبی پورا کر سکتے ہیں۔

مرکزی وزیر برائے اجتماعی ترقی و امداد باہمی نے کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ان چار مقاصد کا ذکر کیا جنھیں پردھان منتری نے قوم کے سامنے رکھا ہے۔ یعنی عوام کے لئے کم سے کم مدت میں بعض ضروری سہولتوں کا انتظام، بے روزگار کے لئے روزگار کے مواقع پیدا کرنا۔ زرعی پیداوار بڑھانے پر انتہائی زور، اور کمزور و غریب طبقوں کی بھلائی اور آرام کا خاص انتظام۔ ان مقاصد کو پورا کرنے میں اجتماعی ترقی، پنچایتی راج اور امداد باہمی کی انجمنوں کو نمایاں حصہ لینا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ان سے جو مقاصد وابستہ کئے گئے ہیں وہ ضرور پورے ہوں گے اور ایک بہتر اور خوش حال ہندوستان وجود میں آئے گا۔

اردو میں ڈرامائی ادب کو فروغ دینے کی خاطر آندھرا پردیش کی ساہتیہ اکادمی نے اردو ڈراموں کا ایک مقابلہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے سب سے بہترین ڈراما نگار کو ۱۱۱۶ روپے انعام دیا جائے گا۔ اس میں تمام ہندوستان کے اردو ڈراما نویس حصہ لے سکتے ہیں۔

مظفر حنفی ہسوی

شعرائے زنداں

آگرہ جیل کا سیاسی مشاعرہ —— مولانا عارف ہسوی (مرحوم)

ہسوہ (فتحپور۔ یو۔پی) بڑے باکمالوں کی بستی رہی ہے۔ وحید ہسوی، احسان ہسوی وغیرہ انیسویں صدی اواخر کے مقبول و مشہور شعراءؔ تھے۔ اوّل الذکر اس زمانے میں فتحپور سے 'سحر بابل' نامی ایک رسالہ نکالتے تھے اور بذاتِ خود صاحب دیوان و تقریباً ڈیڑھ درجن کتابوں کے مصنف تھے، مولانا محمد فائق ہسوی اور مولانا عبدالسلام ہسوی انیسویں صدی کے صاحب کمال بزرگوں میں گزرے ہیں۔ جو ہندوستان گیر شہرت کے مالک اور درجنوں مذہبی و علمی کتب کے خالق تھے۔ محمد فائق صاحب کا مزار میرٹھ میں مرجع خلائق بنا رہتا ہے۔ اور مولانا عبدالسلام ہسوی خاص ہسوہ میں مدفون ہیں اور ان سے صوفیائے کرام کا ایک وسیع حلقہ متعلق ہے۔

مولانا عارف ہسوی اواخر انیسویں و اوائل بیسویں صدی کی نمایاں شخصیتوں میں تھے۔ موصوف شاعر ہونے کے علاوہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے بے حد جوشیلے اور صفِ اوّل کے رہنماؤں میں سے تھے اور دہلی میں ۱۹۱۵ء میں اخبار 'خطیب' کے بابِ سیاست کے مدیر تھے۔ پھر اخبار 'انقلاب' دہلی کے ایڈیٹر رہے۔ یہ اخبار بعد میں انگریزوں کے عتاب کا شکار ہو گیا۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر کا روزنامہ 'ہمدرد' جو صحافت و سیاست کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، دہلی سے نکلتا تھا۔ مولانا محمد علی بڑے چاؤ سے انھیں اپنے ادارے میں لے گئے۔ مولوی عبدالحمید خاں کے رسالہ 'مولوی' کے اس زمانے کے شذرات و سیاسی کالم مولانا عارف ہسوی ہی کے قلم ہی کا نتیجہ ہیں۔ راشد الخیری، خواجہ فضل احمد رشید، بھیّا احسان الحق (میرٹھی) وغیرہ موصوف کے مقربانِ خاص میں سے تھے۔ موصوف تحریکِ آزادی کے سلسلے میں اظہارِ خیال کو اپنی انتہا تک لے جانا چاہتے تھے اس لیے عمر بھر گھوم پھر کر جوشیلے مضامین لکھتے اور جیل جاتے رہے۔ ۱۹۱۹ء میں جب سردار دیوان سنگھ مفتون نے روزنامہ 'رعیت' مالی دشواریوں کی بنا پر بھیّا احسان الحق کو فروخت کر دیا اور نیاز فتحپوری اس کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے تو مولانا عارف ہسوی اخبار مذکور کی معتدل پالیسی کے مخالف تھے کیوں کہ وہ ان کی انتہا پسند طبیعت سے لاگ نہ کھاتی تھی۔ آخر یہ اخبار بھی بند ہو گیا اور مولانا عارف نے اس سلسلے میں جشنِ مسرت منعقد کیا۔

آپ نے دہلی پراونشل کانگریس کمیٹی کی طرف سے اخبار 'کانگریس' نکالا۔ جس کے اداریوں اور مضامین کی بے باکی اس دور میں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا جگرے کے لوگ تھے۔ مولانا عارف ہسوی پراونشل کانگریس کمیٹی کے صدر بھی تھے۔ اخیر اخیر جب جیل گئے تو سلطان

کا شکار ہو کر باہر آئے اور ۱۹۲۶ء میں انتقال فرمایا۔ موصوف کی بیوہ آج بھی ہسوہ میں کس میرسی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

مولانا عارف ہسوی سیاست سے ہٹ کر ایک شاعرانہ شخصیت کے مالک بھی تھے اور دورانِ قیامِ جیل میں اکثر مشاعرے وغیرہ منعقد کرتے رہتے تھے۔ جس زمانہ میں موصوف آگرہ جیل میں تھے اکئی دوسرے سیاسی قیدی مختلف جیلوں مثلاً الہ آباد، فتح گڑھ، میرٹھ، متھرا وغیرہ سے آگرہ جیل میں منتقل کر دیئے گئے تھے۔ ان سیاسی قیدیوں میں بہت سے شاعر بھی تھے جن کی شرکت سے مولانا عارف ہسوی کے مشاعرے جیل میں منعقد ہونے کے باوجود ہر لحاظ سے آج کے آل انڈیا مشاعروں سے بلند نظر آتے ہیں۔ اسی قسم کے ایک مشاعرے کی کارروائی مولانا عارف ہسوی کی ترتیب دی ہوئی بجنسہ درج ذیل ہے۔ اس مشاعرے کے شرکا میں مولانا خجندی میرٹھ، عبدالمجید خواجہ پرنسپل نیشنل یونیورسٹی علی گڑھ، رگھوپتی سہائے فراق، شاہد فاخری، کرشن کانت مالویہ، منیر حسن شاہ الہ آبادی، مہابیر تیاگی، محمد عثمان علی گڑھ، زمرد سکندر آبادی، حفظ الرحمٰن فرخ آبادی، رام نریش ترپاٹھی، احمق پھپھوندوی زمانہ مذکورہ زمانہ حال کے صفِ اول کے سیاسی لیڈروں میں تھے اور ہمیں افسوس کہ مسودہ پیشِ نظر سے صحیح سنہ اس مشاعرہ کا معلوم نہیں ہوتا لیکن گمان غالب ہے کہ یہ مشاعرہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں کبھی آگرہ جیل میں منعقد ہوا تھا۔ (مظفر حنفی ہسوی)

---

(۱) مولانا خجندی میرٹھ - ۶ ماہ قید

(۱) تشنہ کامی پہ مرے آپ کا احسان نہ ہوا
آبِ خنجر سے بھی تسکین کا ساماں نہ ہوا

۲- وار پر وار کئے پھر بھی میں بے جاں نہ ہوا
ہے یہ ارمان کہ پورا مرا ارماں نہ ہوا

۳- اور ایجاد کرو ظلم و ستم کے انداز
پورا مطلب نہ ہوا آپ کا ہاں ہاں نہ ہوا

۴- منزلِ عشق پہ پہنچا نہیں کوئی اجب تک
پا بجولاں نہ ہوا چاک گریباں نہ ہوا

۵- ذرہ ذرہ میں نظر آتا ہے کس کا جلوہ
رازِ وحدت ترا کثرت میں بھی پنہاں نہ ہوا

۶- آسماں سمجھے ہیں جس کو وہ مری آہیں ہیں
عرش رس کب مرا دودِ دلِ سوزاں نہ ہوا

۷- خلعتِ غیر سے بہتر ہے لنگوٹی اپنی
جذبۂ عشق میں حارج تنِ عریاں نہ ہوا

(تمام غزل مرصع اور استادانہ تھی، بہت پسند کی گئی - مولانا کی غزل سب سے آخر میں ہوئی عارف ہسوی)

(۲) مسٹر عبدالمجید خواجہ پرنسپل نیشنل یونیورسٹی علی گڑھ ۶ ماہ قید محض

۱- کس کو سودا ترا اے زلفِ پریشاں نہ ہوا
کون پابندِ بلائے شبِ ہجراں نہ ہوا

۲- یاد رہتی ہے ترے مصحفِ عارض کی سدا
مجھ سے بڑھ کر تو کوئی حافظِ قرآں نہ ہوا

۳- کاوشِ دشتِ جنوں ہم ہیں اس درجہ پسند
کبھی تلووں سے جدا خارِ مغیلاں نہ ہوا

۴- شور ہے محفلِ عشاق میں وہ آتے ہیں
فتنۂ حشر ہوا، جلوۂ جاناں نہ ہوا

۵- بسکہ سینے میں چھپائی ہے تمھاری تصویر
ہم سے وحشت میں کبھی چاک گریباں نہ ہوا

۶- ناتوانی کی یہ حالت ہے کہ کہنا تو کجا
میرے چہرے سے بھی ظاہر غمِ پنہاں نہ ہوا

۷- تو وہ قطرہ ہے کہ پوشیدہ تھا دریا جس میں
تیری نادانی کہ برپا کبھی طوفاں نہ ہوا

۸- میں وہ ذرہ ہوں کہ پوشیدہ ہے صحرا جس میں
قید ہو کر بھی اسیرِ غمِ زنداں نہ ہوا

(شعر ۸ حاصلِ مشاعرہ مانا گیا۔ عارف ہسوی)

۳- بابو رگھوپتی سہائے صاحب بی۔ اے گورکھپور - ۱۸ ماہ قید محض پانچ سو روپیہ جرمانہ

۱۔ کبھی دولت گہ جاناں دلِ ویراں نہ ہوا
میرے اُجڑے ہوئے گھر میں کوئی مہمان نہ ہوا

۲۔ باغ میں بادِ صبا بھیجنے والے ہر روز
کچھ اسیرانِ قفس پر بھی احسان نہ ہوا

۳۔ کھل گیا صورتِ گل ، دل جو چلا ناوکِ یار
ہو تی اک موجِ صبا تیر کا پیکاں نہ ہوا

۴۔ ~~قتل کرکے ہمیں گل کھلتے ہیں دیکھیے کیا~~ [۱]

- - - - - - - - - -

۵۔ کرکے زخمی ہمیں ہنستے ہیں وہ کس حسرت سے
ہائے اس وقت مرے پاس نمکداں نہ ہوا

۶۔ دلِ ویراں کی یہاں سیر کیا کرتا ہوں
مانعِ دشت نوردی مجھے زنداں نہ ہوا

۷۔ اہلِ زنداں کی یہ مجلس ہے ثبوت اس کا فراق
کہ بکھر کر بھی یہ شیرازہ پریشاں نہ ہوا

(شعر ۳ بہت زیادہ پسند کیا گیا اور اہلِ سخن نے خواب داد دی ۔ مقطع میں فراق صاحب نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مختلف جیل خانوں سے یہاں لوگ اکٹھا کر دیئے گئے ہیں مثلاً الہ آباد ، فتح گڑھ ، میرٹھ ، متھرا ۔ عارف ہسوی

(۴) سیّد محمد شاہد صاحب فرزند مولانا فاخر الہ آباد ۔ ایک سال قید سخت

۱۔ ہم تو ہیں قید میں اور گھر پہ پڑے ہیں پریں
سارے عالم میں کوئی آپ سا مہماں نہ ہوا

۲۔ جان دے دیتے بہت ، ڈوب کے مرتے لاکھوں
جیل کے راستے میں چاہِ زنخداں نہ ہوا

۳۔ خواہشِ دید پہ جھنجھلا کے وہ بولے مجھ سے
جان کا روگ ہوا آپ کا ارماں نہ ہوا

۴۔ ڈارون آپ کی تھیوری کو سنا کریں سنے
لاکھ بندر کو نچایا مگر انساں نہ ہوا

(یہ سب شعر بہت پسند کیے گئے ۔ عارف ہسوی

[۱] صرف ایک مصرع لکھ کر کاٹ دیا گیا ہے ۔ مظفر حنفی ہسوی

۵۔ پنڈت کرشنا کانت مالوی ، ایڈیٹر ابھیودے الہ آباد —
۶ ماہ قید محض رہ گئی پہلے ۱۰ ماہ سخت تھی ۔

۱۔ قوم کی راہ میں سر دے کے جو قرباں نہ ہوا
مضغۂ گوشت ہوا پھر تو وہ انساں نہ ہوا

۲۔ زندگی موت سے بدتر ہے ہمارے حق میں
ملک کا اپنے گر اقبال درخشاں نہ ہوا

۳۔ دعویٰ حبِّ وطن تیرے لئے ہے بیہود
تارِ کھدّر کا اگر مثلِ رگِ جاں نہ ہوا

۴۔ ملک کے عشق کا پرلطف بیاں کیا کیجیے
ہے یہ وہ درد جو شرمندۂ درماں نہ ہوا

(پنڈت جی کے تمام شعر پسند کیے گیے بالخصوص جو درج کیے گئے ۔
(عارف ہسوی)

(۶) سیّد صغیر حسن شاہ الہ آبادی ۔ ۶ ماہ قید

۱۔ تارے کچھ چرخ سے ٹوٹے مرے بالیں آئے
کسی بے کس کی لحد پہ جو چراغاں نہ ہوا

۲۔ نغمہ سنجوں کے سخن سن کے تڑپتے ہیں اسیر
دل ہے بے چین کہ افسوس گلستاں نہ ہوا

(۷) مسٹر مہابیر تیاگی ۔ بلند شہر کے مجسٹریٹ نے آپ ہی کے بیرسے عدالت طمانچے لگوائے تھے ۔ سزا دو سال محض

۱۔ وحشتِ دل کا یہاں تک بھی ساماں نہ ہوا
آگرہ جیل میں چھوٹا سا بیاباں نہ ہوا

۲۔ سچ تو یہ ہے کہ کبھی صاحبِ ایماں نہ ہوا
جان سے مال سے بھارت پہ جو قرباں نہ ہوا

۳۔ مجھ سے بڑھ کر کے بھی ہوگی نہ اہنسا کی مثال
مار کھا کر کے بھی ہرگز میں پریشاں نہ ہوا

(مطلع بہت پسند کیا گیا اور شعر ۳ میں اپنے طمانچوں کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ عارف ہسوی)

(۸) حافظ محمد عثمان صاحب علی گڑھ سزا ۱۵ ماہ سخت

میری ہمت میں بھی توفیقِ خدا شامل تھی
دشمنِ دیں کے ستانے سے ہراساں نہ ہوا

(۳) عہدِ ظلمت میں نمایاں ہے صداقت کی جھلک
ہے یہ وہ چاند جو بدلی میں بھی پنہاں نہ ہوا

(۳) اس کی قسمت میں نہیں لطفِ حیاتِ ابدی
جو دل و جان سے اسلام پہ قرباں نہ ہوا

(۴) مرملکر یہ کوئی دن میں کہیں گے لیڈرنگ
ہند میں ایک بھی پورا مرا ارماں نہ ہوا

(شعر کی بہت داد ملی ۔ عارف ہسوی)

(۹) بابو رتی لال صاحب ذمرد سکندر آبادی

(۱) دل دیا مال دیا زر بھی دیا جان بھی دی
اس پہ طرّہ ہے کہ ان پر کوئی احساں نہ ہوا

(۲) بے حیائی کے تو جینے سے ہے مرنا بہتر
جس کی عزّت نہ ہو دنیا میں وہ انساں نہ ہوا

(۱۰) جناب حفظ الرحمن صاحب فرخ آبادی ۔ سزا ایک سال

(۱) سر اٹھایا نہ گیا، دار کا فرماں نہ ہوا
خوگرِ جور پہ اتنا سا بھی احساں نہ ہوا

(۲) اپنا ایمان ہے وہ صاحبِ ایماں نہ ہوا
جو خلافت کے لیے شوق سے قرباں نہ ہوا

(۳) دل وہ دل ہی نہیں جس دل میں نہ ہو دردِ وطن
سر وہ سر ہی نہیں جو قوم پہ قرباں نہ ہوا

(۴) بیڑیاں بھی تو نہ ڈالیں ترے دیوانے کے
جیل میں آکے بھی پورا مرا ارماں نہ ہوا

(۵) وہ حفیظ آپ کو انساں نہیں کہہ سکتا
جس کو سوراج کا تھوڑا سا بھی ارماں نہ ہوا

(پوری غزل بہت صاف اور سلیس تھی خوب داد دی گئی ۔
(عارف ہسوی)

(۱۱) پنڈت رام نریش ترپاٹھی الہ آباد ۔ ۱۸ ماہ قید سخت
سودو پیہ جرمانہ — ہندی کے اچھے شاعر ہیں اور
بہت سی ہندی کتابوں کے مصنف ہیں ۔

(۱) اس نے سمجھا ہی نہیں حُبِّ وطن کیا شے ہے
جیل میں آکے جو سرکار کا مہماں نہ ہوا

~~(۱۲) محمد محی الدین صاحب رضا کار الہ آباد ۔ ۱۸ ماہ قید سخت~~
~~عمر سولہ سال~~[1]

(۱۳) محمد مصطفیٰ صاحب پھپھوندوی المتخلص بہ احمق ۔ ۔ ۔ [2]

(۱) خبطِ گیسو ہوا عشقِ رُخِ جاناں نہ ہوا
مجھ کو پیچش ہی ہوئی شکر ہے یرقاں نہ ہوا

(۲) صلۂ قوم فروشی کی تمنّا ہی رہی
مر مٹا شیخ خوشامد میں مگر خاں نہ ہوا

(۳) مجھ کو حیرت ہے ترے عہد میں اے دورِ صلیب
کیوں ابھی آرڈرِ ضبطیٔ قرآں نہ ہوا

(۴) گُل عارض پہ ترے بلبلِ شیدا کی طرح
ایک اُلّو بھی تو کم بخت غزل خواں نہ ہوا

(۵) جیل خانے کے چنے جس نے کبھی چاب لیے
پھر وہ صاحب سے مٹن چاپ کا خواہاں نہ ہوا

(۶) اہلِ یورپ نے کیا ہے وہ تماشہ جو کبھی
آپ کے باپ سے بھی حضرتِ شیطاں نہ ہوا

(۷) نہ قفس کی تجھے پروا ہے نہ صیاد کا خوف
شکر کر زاغ کہ تو مرغِ خوش الحاں نہ ہوا

(۸) چارہ گر اس لیے روتے ہیں کہ بیمارِ فراق
تختۂ مشقِ بنفشہ و سپستاں نہ ہوا

(۹) مرگیا موت سے پہلے ہی شبِ ہجر احمق
ملک الموت کا سترمنۂ احساں نہ ہوا

دوسری غیر طرحی غزل جو فتح گڑھ جیل سے آگرہ جیل آتے ہوئے لکھی گئی تھی ۔

---

[1] یہ سطر کاٹ دی گئی ۔ غالباً رضاکار موصوف شاعر نہ تھے ۔
[2] یہاں اصل مسوّدہ پھٹ چکا ہے ۔

سامنے سے مرغی کی بزم میں جاتے ہوئے
وہ نکل جاتے ہیں میرے دل کو برماتے ہوئے

کونسل میں شیخ جی پہنچے جو اِٹھلاتے ہوئے
خوف سے شیطان بھاگے ٹھوکریں کھاتے ہوئے

میں کوئی ہوا نہیں جو آپ کو کھا جاؤں گا
آپ گھبراتے ہیں ناحق میرے پاس آتے ہوئے

دیکھئے ان بندروں کی ہیئت میمونیت
کیا بھلے معلوم ہوتے ہیں یہ فرماتے ہوئے

باوجود اس اکڑ کے خاص کے بھی شیخ جی
بارہا پکڑے گئے ہیں ان کے گھر جاتے ہوئے

کیا سودیشی نا پسندیدہ نہیں اتنا بھی ڈر
ڈوب جائیں انگلینڈ کے جہاز آتے ہوئے

ایسے موقعے سے تو اچھا تھا کہیں انکارِ دل
دو مہینے ہو گئے ظالم کو ٹرخاتے ہوئے

ضبط کونسل نے بہ دوالہ ہی کیا ان کا نکال
نذرِ آتش سیٹھ جی کے سب بہی کھاتے ہوئے

ہے محلے میں تمہارے ہی میرا بھی مکاں
اس طرف بھی آنکلئے گا ادھر جاتے ہوئے

ریل گاڑی میں لکھی ہے ہم نے احمق یہ غزل
فتح گڑھ سے آگرے کی جیل کو جاتے ہوئے

(حضرت احمق کی دونوں غزلیں بہت پسند کی گئیں اور نہایت دل چسپی سے سنی گئیں اور ان کو بار بار پڑھنے کی فرمائش کی گئی۔

(عارف ہسوی)

غزل غیر طرحی بابو رگھوپتی سہائے فراق بی اے گورکھپوری

حشر میں کہتے ہیں کہ وہ یہ مرا قاتل نہ تھا
صدقے اس تقریر کے گویا کہ میں بسمل نہ تھا

غرق کر کے میری کشتی، پھر گئی تو بھی تو موج
تجھ کو سر ہی تھا جو ٹکرانا تو کیا ساحل نہ تھا

کر کے دشمن سب کو میرا تم نے ثابت کر دیا
دعوئ تسخیرِ عالم دعوئ باطل نہ تھا

کیوں نہ موجیں سر پٹکتیں جوشِ غم میں اے حباب
گود میں دریا تھا تو کیا تشنہ لب ساحل نہ تھا

(آئندہ مشاعرہ کے لیے حسب ذیل مصرع طرح تجویز کیا گیا

ع دیا ہے درد اگر تو نے تو اس کو لا دوا کر دے

دوا، دعا، خدا، مزا، آشنا قافیہ۔ کر دے ردیف

(عارف ہسوی)

نازش پرتاپ گڑھی

انتظار

(عظیم عوامی شاعر گوسوامی تلسی داس جی کے حضور میں خراجِ عقیدت)

تو منزلِ سخن ہے میں اُڑتا غبار ہوں
تو جانِ فصلِ گل، میں گدائے بہار ہوں
میں ذرۂ حقیر و عقیدت گزار ہوں
اپنی کم آگہی پہ بہت شرمسار ہوں
عجزِ بیاں ہے جنبشِ لب کر رہا ہوں میں
تلسی! تجھے سلامِ ادب کر رہا ہوں میں

دعوائے ہمسری کرے، کس کی مجال ہے
بزمِ ادب میں ذات تری بے مثال ہے
مضموں ہیں بلند، مقدس خیال ہے
حق ہے کہ تیری فکرِ سخن لازوال ہے
کچھ اس ادا سے عرضِ ہنر کر گیا ہے تو
کنکر کو آب دے کے گہر کر گیا ہے تو

ہر عقدۂ حیاتِ بشر کھولتا ہوا
لفظوں کو موتیوں کی طرح رولتا ہوا
کانوں میں جیسے شہد و شکر گھولتا ہوا
جنتا کے پاس، انھیں کی طرح بولتا ہوا
پہونچا جو تو تو بزمِ سخن عام ہو گئی
جو بات منہ سے نکلی وہ الہام ہو گئی

تسلیم ہے کہ شاعرِ معجز بیاں ہے تو
تسلیم ہے کہ نکتہ ور و نکتہ داں ہے تو
ہے اعتراف رہبرِ منزل نشاں ہے تو
اور یہ بھی اعتراف کہ حق کی زباں ہے تو
اس درجہ جان کر بھی تجھے جانتے نہیں
یعنی ترے پیام کو ہم مانتے نہیں

ہم میں کوئی نہیں جو محبت شعار ہو
ہنومان کے خلوص کا آئینہ دار ہو
میدانِ زندگی میں جو مردانہ وار ہو
ہے کون جو پدر کا اطاعت گزار ہو
سیتا کی پاکبازی کا ہم میں چلن نہیں
بھائی تو بے شمار، کوئی لکشمن نہیں

ہر موڑ پر حیات کا پیغام چاہیئے
علم و شعور آج سرِ عام چاہیئے
خلق و وفا کا، پیار کا کہیں نام چاہیئے
راون تو سینکڑوں ہیں ہمیں رام چاہیئے
تلسی! ابھی حیاتِ بشر ہے اسیرِ غم
کس منہ سے پھر کہیں کہ تجھے جانتے ہیں ہم

جب ہر طرف ملے گی رہ و رسمِ دوستی
جب ہر زباں پہ ہوگی محبت کی راگنی
جب ہر نظر میں جاگے گا ذوقِ خود آگہی
جب عام کر سکیں گے ترا درسِ زندگی
جب سازِ دل میں ہوں گے ترے گیت تیری لے
اس وقت ہم کہیں گے کہ تلسی عظیم ہے

محمود زکی

نذرِ عقیدت

(شاعرِ اعظم کالیداس کی خدمت میں بصد خلوص)

عظیم شاعر سلام تم پر، سلام تم پر عظیم شاعر

تمہارے نغموں کی مستیوں میں ہزار برسوں سے گم ہے دنیا
تمہارے نغمے ہی گونجتے ہیں ابھی دماغوں میں ایشیاء کے
ادب کی وادی میں حسن بن کر کیا اُجالا "شکنتلا" نے
تمہاری جیوتی امر رہے گی سدا چراغوں میں ایشیاء کے
رُتوں کا "سنگھار" کرنے والے تمہارے نغموں کی تازگی سے
نئی بہاریں سنور رہی ہیں تمام باغوں میں ایشیا کے

عظیم شاعر سلام تم پر، سلام تم پر عظیم شاعر

یہ ایشیا کا عظیم بھارت پھر ایک کروٹ بدل رہا ہے
حسین بھارت کہ "میگھ" جس کے پیامِ الفت لئے ہوئے ہیں
تمہاری وادی سے پیار الفت لئے اٹھی ہیں وہی گھٹائیں
جو اپنے دامن میں زندگی کی نئی حقیقت لئے ہوئے ہیں
وہی حقیقت جسے سنا کر جہاں کو تم امر ہوئے ہو
تمہاری عظمت کی تو دلوں میں سبھی عقیدت لیے ہوئے ہیں

عظیم شاعر سلام تم پر، سلام تم پر عظیم شاعر

تمہاری عظمت کا پوچھنا کیا، تمہاری عظمت ہے غیر فانی
زمانہ بیتا مگر سلامت تمہارے نقشِ قدم ملے ہیں
تمہاری راہوں میں درحقیقت حسین و دلکش سی روشنی ہے
تلاش کرنے پہ اہلِ فن کو نئے نئے پیچ و خم ملے ہیں
تمہاری نگری سدا ہی علم و ادب کا مرکز بنی رہی ہے
وہی تمہاری "اونتیکا"[1] جس میں آج اہلِ قلم بسے ہیں

عظیم شاعر سلام تم پر، سلام تم پر عظیم شاعر

یہ اہلِ فن جو یہاں ملے ہیں تمہاری راہوں پہ چل رہے ہیں
انھیں کے دم سے فروغِ سکھ شانتی کا پرچار عام ہوگا
انھیں کے دم سے تمہارا وہ دَور لوٹ آئے گا پھر یقیناً
مسرتوں کے دیئے جلیں گے، محبتوں کا نظام ہوگا
کریں گے مل جل کے سب جو کوشش کبھی اکارت نہ جاسکے گی
یقین مانو تمہارے بھارت کا سب سے اونچا مقام ہوگا

عظیم شاعر سلام تم پر، سلام تم پر عظیم شاعر

[1] اجین

صدرالدین فضا شمسی

ولی کا سالِ وفات

میں یوں تو مقلد ہوں مگر میں ادب میں تنقید کا حامی نہیں کہ اسی تنقید نے اردو ادب کی آزادانہ نشو و نما میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی ہیں اور اس کی انفرادیت کو مسخ کر ڈالا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارا ادب آج ع "تا ثریا رسید کج دیوار" کا مصداق بن کے رہ گیا ہے۔ میں ادب میں بغاوت کو ادب کی زندگی اور زندگی کی توانائی سمجھتا ہوں۔ مگر بغاوت تعمیر کی خاطر ہو تخریب کے لئے نہیں۔

ولی ان بدبخت شاعروں میں ہیں جن کی حیات ملک و ملت کے لئے انمول سرمایہ ہوتے ہوئے بھی ابھی تک پردۂ خفا میں ہے۔ آج تک یہ متحقق نہ ہو سکا کہ ولی کا وطن کہاں تھا، ولی نے کس طرح زندگی بسر کی، ان کے آبا و اجداد کون تھے، کہاں کے تھے اور ان کا انتقال کب ہوا؟

اصل یہ ہے کہ اردو داں طبقہ اس حقیقت سے آشنا دیر میں ہوا کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی حیات اور اس کی وراثت کا گہرا اثر اس کے ادب پر پڑتا ہے۔ اسی لئے قدیم زمانے کے لوگ ادیبوں کی زندگی، ان کی زندگی کے کارنامے، ان کے ماحول، ان کی وراثت اور ان کے مختلف رجحانات کے ذکر سے بے اعتنائی برتتے رہے۔ ولی کا وطن اورنگ آباد تھا یا گجرات، ولی نے دلی کا سفر ایک بار کیا یا چند بار، ہمیں اس سے سروکار معلوم نہیں یہ تو مسلّم ہے کہ ولی ایک آزاد مشرب رندانہ ولی تھے جنھوں نے کوچۂ یار پا کر اپنے وطن کو وطن کی حیثیت سے حرفِ غلط کی طرح مٹایا۔ چونکہ خود ولی نے اپنے وطن کو بھلا دیا قوم نے بھی ان کے وطن کو بھلا دیا، مگر ان کی وفات.....

یہ بھی ایک معمہ ہے! کسی نے کہا ۱۱۴۳ھ میں انتقال ہوا۔ کسی نے ۱۱۵۵ھ میں وفات بتائی اور کسی نے ۱۱۰۱ھ میں ان کو مرحوم و مغفور کر دیا۔ آخر الذکر سنہ تو کسی طرح صحیح نہیں۔ اس لئے کہ ولی نے رسالہ "نور المعرفت" مدرسہ ہدایت بخش کی تعریف میں لکھا تھا، اس مدرسہ کا سنگِ بنیاد ۱۱۰۹ھ میں رکھا گیا اور ۱۱۱۱ھ میں یہ تیار ہو گیا۔ میں نے یہ رسالہ نہیں پڑھا ہے مگر یہ رسالہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی نے شائع کر دیا ہے۔ جناب ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے ولی کا سالِ وفات ۱۱۱۹ھ مان لیا ہے اور ہمارے ادباء نے اس تحقیق کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔

اس سالِ وفات کے ثبوت میں مندرجہ ذیل قطعہ پیش کیا جاتا ہے جو کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے قلمی نسخہ دیوان ولی (نشان ۲۷۹ لم) کے خاتمے پر درج ہے:

مطلع دیوانِ عشق سید ارباب دل — والیِ ملکِ سخن صاحبِ فال ملی

سالِ وفاتش خرد از سرِ الہام گفت[1] — بار پناہ ولی ساقیِ کوثر علی

۱۱۱۹ = ۱ + ۱۱۱۸

(سرِ الہام سے تعمیہ کر کے ۱۱۱۹ پورا کیا گیا ہے) مگر سرِ عبدالحمید کو تعمیہ کی خبر نہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ شاید سہوِ کتابت ہے ورنہ

[1] مصرعہ ناموزوں ہے

تاریخ تو ۱۱۰۸ ہجری نکلتی ہے (اورنٹیل کالج میگزین لاہور ۱۹۳۴ء) اس دیوان کی کتابت سنہ ۲۱ جلوس محمد شاہی (۱۱۱۸ + ۲۱) میں ہوئی اور کاتب کا نام شہوار بیگ ہے۔ اس قطعہ کے مصنف مولوی احسن مفتی ہیں (یادگار ولی ص۶۳) ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کا یہ مضمون سب سے پہلے رسالہ 'اردو' ماہ جنوری ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اور بزم الموسیٰ کے یادگار ولی نمبر میں یہی مضمون بار دیگر شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کے شائع ہوتے ہی مولوی یحییٰ تنہا صاحب غازی آبادی نے زمانہ اپریل ۱۹۳۴ء میں اس تحقیق سے اختلاف کرتے ہوئے بہت سارے دلائل دئے لیکن سالِ وفات ۱۱۵۵ھ مان کر وہ بھی غلطی کر بیٹھے۔ سردار عبدالحمید نے اورنٹیل کالج میگزین لاہور ماہ اگست کے شمارہ میں تنہا صاحب کے مضمون کا جواب بڑے تند و تیز لہجے میں دیا جس میں حقیقت سے زیادہ عقیدت اور روایت سے زیادہ عصبیت کا مظاہرہ کیا۔ سردار موصوف یہ تو بتانے میں کامیاب ہوگئے کہ ولی کا انتقال ۱۱۵۵ھ سے پہلے ہو چکا تھا، لیکن وہ یہ ثابت نہ کر سکے کہ ان کا انتقال ۱۱۱۹ھ میں ہوا تھا۔

یادگارِ ولی میں اس قطعہ کا تیسرا مصرع یوں ہے ع

'سالِ وفاتش خود از سرِ الہام گفت'۔ مجھکو اس مصرع کے پڑھنے سے بڑی اُلجھن ہوئی۔ ایک تو یہ کہ یہ مصرع[1] ناموزوں ہے اور دوسرے یہ کہ اس مصرع سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھا مصرع خود ولی کا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے اور جہاں تک میری نظر پہنچی ہے یہ مصرع ولی کے کسی دیوان میں نہیں۔ میری پریشانی بڑھتی گئی یہاں تک کہ میں نے اس کا ذکر برادرِ مکرم پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی سے کیا۔ انھوں نے مجھے 'ولی گجراتی' نام کی ایک کتاب مصنفہ ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی دی جس کے مطالعہ سے میری یہ اُلجھن ختم ہوگئی اور اس قطعہ کا تیسرا مصرع صحیح طور پر معلوم ہوگیا۔ رسالہ اردو میں بھی لفظ "خـــرد" کچھ اس طرح لکھا ہوا ہے کہ 'خود' بھی پڑھا جاسکے۔ ڈاکٹر موصوف نے یہ کتاب بڑی محنت اور کاوش کے بعد لکھی ہے جو نادر معلومات سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ ولی گجراتی تھے اورنگ آبادی نہ تھے اور یہ طریقہ

استناد و استشہاد اختیار کیا گیا ہے اس سے بظاہر انکار کی گنجائش نہیں۔ مگر اس سلسلہ کی کچھ اور کڑیاں بھی ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اب آئیے ذرا اس قطعہ پر غور کیا جائے۔ چوتھے مصرع کا ترجمہ کیجئے اور دیکھئے کہ حضرت علی کو ساقیِ کوثر اور شفیع فی المحشر بتانا کس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اہلِ سنت والجماعت حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساقیِ کوثر اور شافعِ محشر مانتے ہیں اور اہلِ تشیع حضرت علی کی ذات سے ان صفات کو وابستہ کرتے ہیں۔ ولی کے عقیدہ کی بابت بھی اختلافِ رائے ہے لیکن ان کے کلیات میں کئی مقامات ایسے ہیں جن سے ان کا عقیدہ اہلِ سنت والجماعت کا معلوم ہوتا ہے۔ نعتیہ مثنوی میں چاروں اصحابِ کرام کا یکجا ذکر کیا ہے اور کسی کا بھی ذکر علیحدہ نہیں ہے اس کے علاوہ بزرگانِ دین سے ان کو عقیدت تھی۔ وہ شاہ سعد اللہ گلشن کے مرید تھے۔ یہ باتیں اہلِ تشیع کے عقائد کے منافی ہیں۔

اہلِ سنت میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جسے ہم تفضیلیہ کہتے ہیں۔ یہ فرقہ ترتیبِ خلافت کو صحیح مانتے ہوئے حضرت علی کی فضیلت کا قائل ہے۔ لیکن جس عقیدہ کا اظہار چوتھے مصرع میں ہے وہ تفضیلیت سے بھی زیادہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی احسن مفتی نے دیدہ و دانستہ اس قطعہ میں ولی کی تعریف اپنے عقیدے کے مطابق کی ہے۔

اب پہلے دو مصرعوں پر غور کیا جائے۔ ولی کی پیدائش ۱۰۷۹ میں ہوئی۔ ابھی تک کسی نے بھی کوئی اختلاف نہیں کیا ہے۔ اور نہ ہی کوئی دوسری تاریخ بتائی گئی ہے۔ تذکرہ شعرائے اورنگ آباد میں محمد سردار علی حیدرآبادی نے صراحت سے یہ سال بتایا ہے۔ کتاب یادگار ولی ص۲۲۲ پر ایک فہرست مندرج ہے جس میں دیوانِ ولی کے قلمی نسخوں کا ذکر ہے۔ نمبر۳ میں ایک ایسے مخطوطہ کا ذکر ہے جو ۱۱۴۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہاں اس سلسلہ کی پوری عبارت نقل کر دی جاتی ہے

۳۔ سنہ ۱۱۴۱ھ

[1] مصرع ناموزوں نہیں رہا۔ م

نسخہ میں ولی اور قاضی القضاۃ کی مہریں ثبت ہیں۔ کتب خانہ
حکیم سید محمد قاسم صاحب ناظم سمیات میں موجود ہے اور
اس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:۔

" مختصر حالات ولی سید عبدالغفار نے اپنے والد بزرگوار مولانا سید قاسم صاحب شاہ نوری سے، پیدائش ولی ۱۰۷۹ھ تصنیف پہلے ۱۱۴۱ھ دہ مجلس کے' دیوان دکنی نثر وغیرہ' دہ مجلس و دیوان محمد ولی (محمد شمس الدین المتخلص بہ ولی) حضرت استاذنا و مولانا سید اسمٰعیل صاحب شیخ الحدیث مدرسہ علویہ گجرات متوطن دارالظفر بیجاپور و شاہ نور کے ملاحظہ میں پیش کیا کرتے۔ محمد ولی کی اورنگ آباد میں ولادت ہوئی۔ شوقِ تحصیل علم گجرات کے مدرسہ علویہ میں کھینچ لایا بعد الفراغ تحصیل علم بانیٔ مدرسہ سجادہ نشیں علوی کے عقیدت مندوں میں داخل ہوئے ...... المرقوم ۱۳۰۵ھ

سید عبدالغفار نوری۔

ظاہر ہے کہ یہ عبارت دیوان کی کتابت کے بہت بعد سپردِ قلم ہوئی ہے۔

یہاں پر اس سے بحث نہیں کہ ولی کا وطن کہاں تھا اور ولی دہ مجلس نام کی کسی کتاب کے مصنف تھے کہ نہیں۔ یہاں صرف یہ دکھلانا مقصود ہے کہ ولی ۱۰۷۹ھ میں پیدا ہوئے۔ اب اگر ہم انہیں ۱۱۱۹ھ میں مار دیتے ہیں تو گویا ہم کل چالیس سال کی حیات بخشتے ہیں۔ چالیس سالہ انسان کی موت اس زمانہ میں یقینی جوان موت تھی مگر کسی نے آج تک ولی کو جواں مرگ نہیں بتایا ہے۔ اور جس کسی نے بھی ان کی موت کا ذکر کیا ہے وہ اس طرح ہے جیسے ولی کو حیاتِ طبعی میسر ہوئی تھی اور ان کی موت کی بابت کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں، خود ولی کا ایک شعر ایسا ہے جو ان کی کبر سنی کی طرف اشارہ کرتا ہے

اول سوں تھا ضعیف بہ پابستہ سوز میں
جیوں بال ہے اگن کے اوپر نے قرار دل

اس شعر میں ضعیف سے مراد کمزوری لی جا سکتی ہے لیکن دوسرا مصرع غور کرنے کے لائق ہے۔

بارِ دگر اب پہلے دو مصرعوں کی طرف رجوع کریں تو ہمیں چار بیش بہا صنعتیں ولی کی طرف منسوب کی ہوئی ملتی ہیں:۔

(۱) مطلع دیوان عشق (۲) بسد ارباب دل (۳) والی ملک سخن (۴) صاحب عرفاں۔ ان صفات سے مجموعی طور پر جس احترام اور اعزاز کی شان نکلتی ہے جس بالیدگی شعور اور پختگی تجربات کا پتا چلتا ہے اور چالیس سالہ انسان کے لئے کہاں تک موزوں مناسب ہے۔ اس کا فیصلہ ذوقِ سلیم پر چھوڑتا ہوں۔

یادگارِ ولی کے مضمون 'کلیاتِ ولی کے قلمی نسخے (ص ۲۲۲) سے تنقیس[۳۳] ایسے مخطوطوں کا علم ہوتا ہے جن پر سنہ کتابت درج ہے۔ ان نسخوں میں نمبر ۹ ۱۱۵۳ھ کا لکھا ہوا ہے اس کے خاتمے پہ جو عبارت ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک ولی کا انتقال ہو چکا ہے " تمت ہذا الکتاب دیوانِ ولی علیہ الرحمہ بتم شعب ۲۲ سنہ جلوس" مضمون متذکرہ بالا کے نمبر ا میں دیوان ولی کا وہ قلمی نسخہ ہے جو ۱۱۲۰ھ کا اورنگ آباد میں لکھا ہوا ہے۔ اور نصیر حسین خیال کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ نسخہ بڑا ہی اہم ہے اگرچہ میری نظر سے یہ نسخہ نہیں گزرا ہے لیکن خبر دینے والے نے اس انداز سے خبر دی ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس میں ولی کو مرحوم یا علیہ الرحمہ وغیرہ نہیں لکھا گیا ہے۔ اگر ولی ۱۱۱۹ھ میں فوت ہو چکے تھے تو چونکہ یہ پہلا نسخہ ہے اس لئے اس میں اس کا ذکر کرنا ضرور تھا خصوصاً ایسی صورت میں کہ ولی جواں مرگ تھا۔ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ مخطوطات میں ایک قلمی نسخہ دیوان ولی کا ہے جو ۱۱۴۶ھ میں لکھا گیا اس میں ولی کو مرحوم یا علیہ الرحمہ نہیں لکھا گیا ہے۔

جامع مسجد بمبئی والا نسخہ ۱۱۵۲ھ کا لکھا ہوا ہے اس میں ولی کو مرحوم بتایا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ولی گجراتی ص ۸۰ پر رقمطراز ہیں:۔

" پنجاب یونیورسٹی میں دیوان ولی کا ایک نسخہ رکھا گیا تھا جسے ۲ سنہ جلوس محمد شاہی (۱۱۳۰ھ) میں ثناء اللہ ثقافی نے لکھا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:۔

"دیوان اشعار ولی مسمی سید ولی محمد مرحوم بتاریخ چہاردہم محرم الحرام سنہ از جلوس میمنت مانوس محمد شاہ بادشاہ خلد اللہ تعالیٰ ملکہ و سلطانہ روز چہارشنبہ وقت چاشت در بلدہ خیر البلاد احمد آباد حمیت عن الفساد بخط فقیر حقیر اضعف العباد و کلب محبوب سبحانی نمودنے بود تنا واللہ فانی سمت انجام و صورت اتمام پذیرفت" اس نسخہ کا پتا سردار عبدالحمید نے ۱۹۳۴ء میں دیا تھا۔

(اورینٹل کالج میگزین لاہور۔ ماہ اگست ۱۹۳۴ء)

مولوی احسن مفتی کا زمانہ کیا تھا اس کی تصریح ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے نہیں کی۔ اردو کے کسی تذکرے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مولوی احسن مفتی ولی کے ہم عصر تھے لیکن ولی گجراتی کی یہ عبارت (ص۱۸) مولوی احسن مفتی کے زمانے کی تعین میں مدد کرتی ہے۔ وہ عبارت یہ ہے:

" تنہا صاحب کے جواب میں سردار عبدالحمید نے اس نسخہ کے حوالے سے ایک یہ بھی دلیل پیش کی ہے کہ جب ولی ۱۱۵۵ھ تک بقیدِ حیات تھا تو سنہ ۱۱۵۲ھ میں مفتی احسن نے ولی کی وفات سے تین سال قبل قطعہ سنہ وفات کیوں کہا؟"

اس تحریر سے یہی آشکار ہوتا ہے کہ مولوی صاحب موصوف ولی کے معاصر نہ تھے اور یہ قطعہ ۱۱۵۲ھ میں لکھا گیا۔ سردار عبدالحمید کا طریقۂ استدلال مغالطہ انگیز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

" جب اس نے قطعۂ وفات لکھا تو ظاہر ہے کہ یا تو وہ ولی کا معاصر یا جاننے والا ہے۔ یا اگر ذاتی طور پر جاننے والا نہیں تو اس نے ولی کے کسی جاننے والے کی فرمائش پر قطعہ لکھا ہے۔ قطعہ مذکور بہر حال ۱۱۵۲ھ کے قبل کا نوشتہ ہے۔"

اس انداز سے تو یہی واضح ہوتا ہے کہ احسن مفتی کی بابت خود سردار عبدالحمید کو بھی پتا نہیں کہ وہ کون تھے اور کس زمانہ کے تھے۔ لیکن چونکہ یہ قطعہ ان کی طرف منسوب ہے اس لئے وہ ضرور ولی کے جاننے والے ہوں گے۔ پڑھنے والے خود فیصلہ کرلیں کہ اس میں منطقی استواری کہاں تک ہے۔

یہ عجیب طرح کی بات ہے کہ قطعہ تاریخ وفات، وفات کے تینتیس سال بعد کہا جائے، وہ بھی ایسے شخص کا جس کی وفات کا سنہ بتانے سے ہر تذکرہ نگار قاصر ہے اور ایسا شخص لکھے جو مرنے والے کا ہم عصر نہ ہو، دوست نہ ہو۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ قطعاتِ تاریخ انتقال کے بعد ہی کہے جاتے ہیں۔ مگر یہ تو ایک انوکھا انداز ہے۔ آخر مولوی صاحب موصوف کس بنا پر یہ سال بتاتے ہیں۔ یہ کہیں مذکور نہیں خود اعراس نامہ مملوکہ حسینی پیر صاحب میں ولی کی وفات کی تاریخ ۴ شعبان اور وقت عصر مندرج ہے" مگر سال وفات شاید یہاں بھی نہیں۔ پتا نہیں شہوار بیگ (کاتب دیوان) کو یہ قطعہ کہاں سے ہاتھ لگا۔ ولی کے معاصرین میں کسی نے اس کی خبر نہیں دی اور نہ ہی کسی تذکرہ نگار نے یہ قطعہ درج کیا۔

اب اس سلسلہ کے دوسرے شواہد کا جائزہ لیجئے۔ تذکرہ نگاروں نے ولی کے سفرِ ہند کی تاریخ نہیں بتائی ہے صرف قائم چاند پوری نے مخزنِ نکات میں سفرِ دہلی کا حال بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ولی عالمگیر رح کے ۴۴ سنہ جلوس (۱۱۱۲ھ) میں دہلی گئے۔ دہلی کا دوبارہ سفر مشکوک بتایا جاتا ہے۔ لیکن ایک بار دہلی آنے کا اعتراف سبھی کرتے آئے ہیں۔ تذکرہ گلشن بے خار میں ہے "ولی در زمان عالمگیر بادشاہ بودہ" مصحفی نے تذکرہ ہندی میں حاتم کا حال سپردِ قلم کرتے ہوئے حاتم کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے۔" روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن دویم فردوس آرامگاہ دیوان ولی در شاہجہان آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ" اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دیوان ولی سال مذکور میں دہلی آیا، رہا یہ امر کہ ولی خود آئے کہ نہ آئے اس کی بابت نہ اقرار ہے نہ انکار۔ اگر صرف دیوان آیا تھا تو حاتم کو لازم تھا کہ صراحت کر دیتے اور کس طرح یہ دیوان شاہ جہان آباد آیا اس کی بھی وضاحت کرنا ضرور تھا۔ اس کو بھی چھوڑیئے اگر حاتم کی مراد اس بیان سے واقعی یہ تھی کہ صرف دیوان ولی دہلی آیا، ولی نہ آئے اس لئے کہ وہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے تو اس کا تذکرہ کر دینے میں کوئی قباحت یا

رکاوٹ نہ تھی۔ حاتم کوئی ایسے کم سخن بھی نہ تھے اور فطری طور پر ایسے وقت میں انسان اظہارِ افسوس کرتا ہے اور ولی کی بابت یہ غم اور بھی سنگین تھا کہ وہ کچی عمر میں رحلت کر گئے۔ کم از کم مصحفی نے کوئی ایسی بات نقل نہ کی۔ لطف تو یہ ہے کہ اس تذکرہ میں ولی کا ذکر بھی نہیں۔ اگر ہم مان بھی لیں کہ صرف ولی کا دیوان دہلی آیا تو اس سے یہ کہاں نکلتا ہے کہ ولی کا انتقال بھی ہو چکا تھا۔ یہ امر بھی حیرت انگیز ہے کہ ولی کا انتقال ۱۱۱۹ھ میں ہوا اور دکن والوں نے حق شناسی کی یہ داد دی کہ چودہ سال کے بعد ان کے دیوان کی طرف التفات کی۔ یہ ولی وہ تھے جنھیں مطلع دیوانِ عشق، سید ارباب دل، والی ملک سخن اور صاحب عرفاں کے القاب سے نوازا گیا ہو۔ یہ دکنیوں کی کھلی ہوئی توہین ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ اورنگ آباد ہی میں ان کے دیوان کی نقل ۱۱۲۰ھ میں ہو چکی تھی اور ۱۱۲۵ھ میں اس کی دوسری نقل کی جا چکی تھی۔

ولی کے بہ عہد محمد شاہ دہلی آنے کے ثبوت میں عام طور پر یہ شعر بھی نقل کیا جاتا ہے۔

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

چمنستان شعراء میں یہ شعر مضمون کی طرف منسوب کر کے نقل ہوا ہے بلکہ اس کے علاوہ ایک شعر اور ہے

اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین
کوئی کہے جا کر محمد شاہ سوں
شرم سوں سب پانی ہو جاویں قیب
گر مرا یوسف ملے آ چاہ سوں

تذکرہ گلزار ابراہیم میں مضمون کے نام سے صرف شعر نمبر ۲ لکھا ہوا ہے نمبر ایک نہیں ہے۔

ولی کی طرف جو شعر منسوب ہے اس کا مصرع اول مختلف ہے اور دوسرے مصرع میں بھی الفاظ کا اختلاف ہے۔ اگر ہم مصرع اول پر غور کریں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مضمون دہلی میں ہو کے ہوتے بھی اس طرح کہتے ہیں ع

اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین

دہلی میں رہ کر یہ کہنا کہ دہلی نے دل چھین لیا ہے ایک بھونڈا سا اظہارِ خیال ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے یہ نہ بتایا کہ یہ شعر مضمون کے دیوان میں ہے کہ نہیں اور چمنستان شعراء گلشن بے خار کے علاوہ اور بھی کہیں یہ شعر پایا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ یہ بتا دیتے ہیں کہ ان کے پاس بارہ نسخے دیوان ولی کے ہیں لیکن کسی میں یہ شعر نہیں ملتا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس شعر میں جو مضمون ادا ہوا ہے اس میں توارد بخوبی ممکن ہے اس لئے حتمی طور پر یہ کہنا تحقیق کی شان کے خلاف ہے کہ ولی کا دیوان ہی محمد شاہ کے عہد میں آیا اور ولی نہ آئے۔ اس لئے کہ وہ مر چکے تھے اور جو شعر ولی کی طرف منتسب ہے وہ بھی مضمون ہی کا ہے، ولی کا کسی طرح ہو نہیں سکتا۔

ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کہتے ہیں کہ مزید توضیح و توثیق احمد آباد کے ایک خانگی کتب خانہ کی بیاض سے ہوئی۔ یہ توضیح کس طرح کی ہے یہ ظاہر نہیں اگر کوئی مزید ثبوت فراہم ہوا تھا تو اس کا ذکر واجب تھا اور اگر وہی قطعہ اس بیاض میں پایا جاتا ہے تو محض اس قطعہ کے کئی کتابوں میں اندراج سے کوئی مزید ثبوت ہاتھ نہیں آتا، ہاں اس قطعہ کے مصنف شاعر کا نام معلوم ہو جاتا ہے جس سے بات اور بھی الجھ جاتی ہے سلجھتی نہیں۔

خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کی تصنیف گلشنِ گفتار مرقومہ ۱۱۶۵ھ کو ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی بہت اہم قرار دیتے ہیں مگر وائے مجبوری کہ خواجہ صاحب موصوف بھی ولی کا سال وفات نہیں بتلاتے۔ اس کی طرف رہبری کرنے والا کوئی تذکرہ ہے تو وہ میر کا نکات الشعراء ہے جس کے صفحہ ۹۴ پر یہ عبارت مرقوم ہے:

"مخفی نہ ماند کہ احوال یکے ازیں شاعران سمت دکن کہ پُر بدتیاند گر بعض چنانچہ ولی، سید محمد عبدالولی دسراج و آزاد کہ معاصر ولی بود سررشتہ مربوطہ گوئی بدست ایشاں یافتہ می شود" عبدالولی عزلت کی پیدائش ۱۱۰۴ھ میں ہوئی اور ولی کی موت اگر ۱۱۱۹ھ میں ہوتی۔ گویا عزلت صرف پندرہ سال کے تھے جب ولی کا انتقال ہوا۔ اس لئے صحیح معنوں میں عزلت کو معاصر ولی نہیں کہنا چاہیئے اور میر نے جس غر

سے یہ بیان سپرد قلم کیا ہے وہ بھی حاصل نہیں ہوتی۔ آزاد غالبؔ فقیر اللہ آزاد ہیں اور ان کو معاصر ولی کہنے میں کوئی دشواری نہیں ولی کا یہ شعر خود شاہد ہے:

آزاد سوں شنیا ہوں یو مصرع مناسب
جس سوں وہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

رہا سراج کا سوال، یہ کون سراج تھے؟ شاہ سراج، بشاعر، تاں خیال یہ مشہور ہے کہ میر کی معلومات کا ماخذ عزلت کی بیاض ہے۔ میر نے اپنا تذکرہ ۱۱۶۵ھ میں لکھا۔ گلشن گفتار بھی ۱۱۶۵ھ کا لکھا ہوا ہے لیکن میر کا ماخذ ۱۱۶۵ھ سے قبل کی ایک بیاض ہے۔ اس شخص کی بیاض ہے جو ولی کا معاصر تھا۔ خود میر بھی ایک محتاط تذکرہ نگار مانے جاتے ہیں اس لئے انہیں سوچنا ہوگا کہ ولی، عزلت، سراج اور آزاد کے معاصر کس طرح کہے جا سکے۔

ولی کی ایک غزل کے حسب ذیل دو اشعار سے ان کے کسی دوست سراج کا پتا چلتا ہے جن کی شادی میں ولی شریک ہوئے تھے:

پروانہ ہو کے کیوں نہ گرے جا نذر رخ سوں
فانوس دل میں شوق ترا ہے سراج آج
وہ شوخ مجھ کوں آ کے ملا اس سبب ولی
شادی میں اس کی صرف کیا ہوں میں لاج آج

کلیات سراج کے مؤلف ص ۵۹ پر رقمطراز ہیں "شاہ سراج کی کوئی اولاد وغیرہ نہیں تھی انھوں نے غالباً تمام عمر تجرد کی حالت میں گزار دی اس کی توثیق وہ شاہ سراج کے ایک خط سے کرتے ہیں جس کی عبارت یہ ہے ...... دہر روز دولتے حکیماں بگل می آید یکے بیماری و دویم تنہائی و کسے دل سوز در خدمت نیست" (ص ۱۶۹)

اس تنہائی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ سراج کی شادی نہیں ہوئی۔ مگر صرف اتنا کہنے سے کام نہیں چلتا ہے اس لئے کہ ولی کا کلام ایک ایسی اندرونی شہادت ہے جسے ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔ کلیات سراج میں ص ۱۱۳ سے ص ۱۲۲ تک چار چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں۔ نامۂ شوق، احوال فراق، خط بندگی اور مطلب دل۔ ان نظموں میں سراج کسی محرم راز کی جدائی اور بے وفائی کا شکوہ کرتے ہیں۔ یہ محرم راز بالیقیں کوئی ایسی ہی ہستی ہے جس کو خط بند شاہ صاحب ایسے الفاظ سے یاد کر سکتے تھے۔ ملاحظہ ہو:

نامۂ شوق:۔

کوئی ترے بن محرم جانی نہیں   قدردان راز نہانی نہیں
خلق میں مشہور ہوں تیرا غلام   مجھ کوں تیرا جانتے ہیں خاص و عام

خط بندگی

ماہ رمضاں مجھکوں بھاری ہے   اس کے وعدے کی انتظاری ہے
بندگی کا دیا ہوں خط لکھ کر   روز اول سے تجھ کوں اے دلبر

مطلب دل

حال مرنے کی ہے خبر یک دم   بن ترے کون ہے محرم

مگر مشکل یہ ہے کہ شاہ سراج کی ولادت ۲۸-۱۱۲۷ھ بتائی جاتی ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ شاہ سراج کی شادی ہوئی تھی تو اسی سے بات بنتی نہیں ہے اس لئے کہ ولی ۱۱۱۹ھ میں پیوند خاک ہو چکے تھے۔ اس لئے یہ سراج ان کے معاصر کیسے ہوئے۔ مگر کوئی سراج ان کے معاصر ضرور تھے۔ خود ولی کی ایک مسلسل غزل موجود ہے

ہر طرف ہے جگ میں روشن نام شمس الدین کا
چین میں ہے شور جس کے ابروئے پرچین کا
مہ پہ ہے رنگ خجالت چھوڑ کر معدن گیا
لعل نے سن کر سخن تیرے لب رنگین کا
ہے ترے ہر مو سوں روشن جلوہ گر رنگ وقار
کیا عجب گر تجھ سے پوسے درس نت تمکین کا
دیکھ تجھ پلکاں کوں لولیا عاشق جانباز یوں
مرغ دل کے صید کوں چنگل ہے یو شاہین کا
صورت تسکیں نہیں دستی مگر اس حال میں
اے ولی جب پیو نہ پوچھے حال مجھ مسکین کا

(جناب منظور حسین صاحب علوی) حسینی پیر صاحب کا بیان ہے کہ یہ شمس الدین اسی خاندان (مشائخ گجرات) کے ایک فرد شاہ مرغ

کے فرزند تھے۔ شاہ سراج ولی کے ہمعصر تھے۔ ان کا انتقال ۱۱۱۹ھ میں ہوا۔" ولی گجراتی ص۳۲۔ ممکن ہے شمس الدین کے والد کا نام شاہ سراج ہو مگر یہ سراج وہ نہیں ہو سکتے جن کی شادی میں ولی شریک ہوئے تھے۔ اس کی دو معقول وجہیں ہیں ۱۔ ولی کو اگر شاہ سراج پدر شمس الدین سے دوستی تھی تو ان کے بیٹے کے لئے اس طرح کے اشعار لکھنا ولی کے لئے نامناسب ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔

۲۔ مشہور ہے کہ ولی نے سفر دہلی کے بعد ریختہ گوئی کی طرف توجہ کی اگر سراج کی شادی ۱۱۱۲ھ میں ہوتی تو ولی کے انتقال کے وقت شمس الدین کی عمر کل سات سال کی ہوگی۔ سات سال کے بچے کے لئے یہ شعر بد مذاقی کا ثبوت ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ شمس الدین ان کے کسی دوست کے بیٹے ہی نہیں تھے بلکہ خود ان کے دست ہوں گے۔

یا امر پھر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ آخر وہ سراج کون تھے؟ تحفۃ الشعراء از افضل بیگ خاں قاقشانی کے جو مخطوطے اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان میں سراج کے حالات دو جداگانہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں دو نسخے موجود ہیں لیکن سراج کے حالات دونوں میں مختلف ہیں۔ ایک ہی تذکرہ کے دو مخطوطوں میں اتنا بیّن اختلاف بظاہر ناقابلِ فہم ہے (کلیات سراج ص۱۸) پروفیسر عبدالقادر سروری نے اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے کچھ قیاس آرائیاں کی ہیں۔ لیکن قیاس آرائیوں سے تحقیق و تفتیش کا حق ادا نہیں ہوتا۔ یہ اشکال و اشکال اس لئے رونما ہوئے کہ ولی کی موت ۱۱۱۹ھ میں صحیح مان لی گئی اور ساتھ ساتھ شاہ سراج کی پیدائش ۲۷-۱۱۲۸ھ میں۔ شاہ سراج کے جو اشعار اس سال پر مشتمل ہیں وہ یہ ہیں:

> جب کیا جزو پریشان سخن شیرازہ بند
> تھے برس چوبیس میری عمر کے بنیاد کے
> سال ہجری تھے ہزار و یکصد و پنجاہ و دو[1]
> واقف علم لدنی صاحب اسرار کے

شاہ سراج کا یہ بیان کہاں تک قابلِ اعتبار ہے یہ کہنا مشکل ہے اس لئے کہ منتخب دیوانہا کی تکمیل ۱۱۶۹ ہجری میں ہوئی اور اس وقت سراج نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انھوں نے سترہ سال سے شاعری ترک کر دی ہے۔ حالانکہ ۱۱۶۰ھ میں انھوں نے مثنوی بوستانِ خیال نظم کی۔ جناب احسن مرحوم نے اس تضاد پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ (کلیات سراج ص۱۲۴) یہ باتیں بھی گرہ میں رکھنے کے لائق ہیں کہ بعض وقت کاتب بھی اپنی طرف سے اصل مسودہ میں اصلاح کر دیا کرتے تھے۔ یا ممکن ہے شاہ سراج کے کسی معتقد نے ازرہِ عقیدت لفظ چونتیس کو چوبیس لکھ دیا، شاہ سراج کی کوئی اولاد نہ تھی اور وہ تنہائی کو رفیقِ تنہائی بناتے ہوئے زندگی بسر کرتے رہے۔ اس سے لازمی طور پر یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ان کی شادی ہی نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ کم سنی میں غلبۂ شوق اور جذب و فنون کے آثار محو کرنے کی خاطر بیاہ کر دیا گیا ہو۔ مگر ان کی بڑھتی ہوئی خود فراموشی اور عزلت پسندی کے باعث اہلیہ محترمہ کے ساتھ نباہ نہ ہو سکا۔ ہاں قطعہ مذکورہ کے چوتھے مصرع کے حروف کو صوتی لحاظ سے شمار کر کے بحساب ابجد تاریخ نکالیں تو سال ۱۱۲۹ ہجری حاصل ہوتا ہے۔ وہ مصرع اب اس طرح پڑھا جائے گا

ع یاد بیتا ہے ولی ساقی کوثر علی

اس طرح ولی کو ہم پچاس سال کی عمر دے دیتے ہیں اور شاید تضاد ایک حد تک کم ہو جاتا ہے۔

میں نے ابھی چند قیاسات سے کام لیا ہے۔ گرچہ قیاس تحقیق کے منافی ہے۔ مگر کیا کروں کہ پھر بھی قیاس آرائیاں ادب و نقد اور تحقیق کی آبرو ہیں۔

المختصر مولوی احسن مفتی کا قطعہ قابلِ اعتنا نہیں اور سردست ہم ولی کی رحلت کا سال ۱۱۳۹ھ ہی ماننے پر مجبور ہیں اس لئے کہ ثنا اللہ فانی نے جس دیوانِ ولی کی کتابت سنہ جلوس محمد شاہ میں کی اس سے یہی سال نکلتا ہے (۱۱۳۱ + ۲)

> بروایں دام بر مرغ دگر نہ
> کہ عنقا را بلند ست آشیانہ

---

[1] مصرع ناموزوں ہے

غلام احمد فرقت کاکوروی

ہندوستان کا ایک قدیم شہر — کھمبات

کھمبات کا شہر کئی اعتبار سے ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے اوّل یوں کہ ۴۵ء بعد مسیح روم کے مشہور سیاح ہیپالن نے اسے اور اس کے آس پاس کے علاقہ کو دریافت کیا تھا اور غالباً وہ پہلا شخص تھا جس نے اس سمندری راستہ کو رومی ملاحوں اور بحری سوداگروں سے روشناس کرایا۔ ورنہ اس سے پہلے عرب تاجروں کا اس سمندر پر قبضہ تھا اور وہی ہندوستان اور مغربی ممالک کے درمیان بحری تجارت پر قابض تھے۔ اس سے قبل یا تو عرب تاجر مغربی ممالک سے بحری تجارت کرتے تھے یا پھر خشکی کی راہ میسوپوٹامیہ سے ہو کر فلسطین اور شام کے ساحلی علاقوں تک اونٹ پر لاد کر تجارتی مال لایا اور لے جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں خلیج کھمبات کو بر گزا کہتے تھے کیونکہ مشہور مؤرخ پلینی نے بھی کھمبات کے قریب ساحلی بستیوں اور شہروں کو اسی نام سے یاد کیا ہے۔

کھمبات کی تاریخ اگرچہ بہت ہی دلچسپ ہے مگر سردست ہم کو اس کی تفصیلات میں نہیں پڑنا ہے۔ البتہ جب پارسیوں کو ۷۱۶ بعد مسیح ایران سے نکال باہر کیا گیا تو انھوں نے سنجان میں آکر پناہ لی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ انھوں نے تجارت کا سلسلہ شروع کر کے نیسری اور بروچ پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اس وقت یہ سارے کا سارا علاقہ برگزی کہلایا۔ کھمبات کا شہر اس زمانہ میں کوارکا خوشتر کہلاتا تھا۔ یہاں کے مقدس مندر کے گرد بہت بڑی بستی تھی۔ اس کے بعد پارسی اتنی زیادہ تعداد میں ہو گئے کہ انھوں نے وہاں کے اصل باشندوں پر جو ہندوستان کے رہنے والے ہندو تھے اتنے مظالم کیے کہ انھیں وہاں سے بھاگتے بن پڑا اور تمام جگہوں پر پارسی قابض ہو گئے۔

ان ہندوؤں میں ایک شخص جس کا نام کلیان رائے تھا سورت بھاگ آیا اور اس نے سورت میں زر کثیر جمع کر کے راجپوتوں اور کولی قبیلہ کے لوگوں کی مدد سے پارسیوں پر حملہ کر دیا اور انھیں کوارکا خوشتر چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ کلیان رائے نے پارسیوں کے بنوائے ہوئے شہر کو جس کی بیشتر عمارتوں کو منہدم کر دیا گیا تھا دوبارہ درست کرایا اور اس نے نئے شہر کا نام کھمبات رکھا جس کے معنے "بنیاد پر قائم کرنا" ہیں اس نے قلعہ کی دیواریں تعمیر کرائیں اور اس میں سات پھاٹک لگوائے اور ساحل کے کنارے ایک بندرگاہ بھی تعمیر کرائی جس سے کھمبات ایک پر رونق شہر بن گیا۔

اسی زمانہ میں ایک رقاصہ جس کا نام نگینہ تھا اور جس نے رقص و سرود سے بڑی دولت جمع کر لی تھی کھمبات آئی۔ اور اس نے اپنے نام و نمود اور بدنامی کو نیک نامی سے بدلنے کی غرض سے پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ چونکہ وہ رقاصہ رہی تھی اور اُسے لوگ بہت ہی بدکردار اور بداعمال سمجھتے تھے لہٰذا اس کے ضمیر نے اُسے ملامت کی اور اپنے گناہوں کی عفو کی خاطر خیرات زکوٰۃ پر اتر آئی۔ اس نے شہر کے اندر اور اس کے

نواح میں تالاب بنوائے۔ ان تالابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر تالاب کا نام "ن" سے شروع ہوتا ہے۔ ایک نارنگیر۔ دوسرا نیرا، تیسرا نیزہ اور چوتھا نتوا کہلاتا تھا۔ مگر بعد میں نتوا نامی تالاب کو پاٹ کر اس پر ایک باغ نصب کر دیا گیا جو اسی نام سے اب تک موسوم ہے۔ نارنگیر تالاب اب بھی وہاں کا سب سے بڑا اور حسین تالاب ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ نگینہ کے مرنے کے بعد اس تالاب کی مسلسل نگہداشت جاری رہی جس کے سبب وہ جوں کا توں اب بھی قائم ہے اور آج کل ہندو اسے نگر سیٹھ تالاب کہتے ہیں۔ جس تالاب کا نام نیرا ہے وہ ساحل کے قریب واقع تھا مگر اب اس نے ایک نہایت خوبصورت کنوئیں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس تالاب کی دل آویزی کا اندازہ اس کنوئیں سے کیا جا سکتا ہے جو بے حد خوب صورت ہے۔ کھمبات کی اصل شہرت اس کے کنوؤں سے وابستہ ہے۔ اس کے پاس ہی خواجہ خضر کی ایک مسجد ہے جہاں وہ مسافر جو بحری طوفانوں سے تباہ ہونے والے جہازوں سے بچ جاتے ہیں شکرانے کی نمازیں ادا کرتے ہیں اور سر بسجود ہو کر بارگاہِ ایزدی میں اپنے گناہوں سے توبہ اور استغفار کرتے ہیں۔ اسی جگہ سمندر پر ایک قدیم لائٹ ہاؤس واقع ہے۔ موجودہ کھمبات کے شہر کے قریب ایک گاؤں شکر پور ہے جہاں ایک قبر کا شکستہ کتبہ ہے جسے شکر پاتر کہتے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس جگہ نگینہ کو دفن کیا گیا تھا۔ اس خاتون نے اگرچہ آنے والی نسلوں کے لئے اتنا سب کچھ کیا۔ مگر افسوس ہے کہ اب اگر کوئی اس کا نام لیتا ہے تو وہاں کے گاؤں والے اُسے گالی سمجھتے ہیں۔ اور یہ ایک مقامی محاورہ بن گیا ہے کہ اگر کوئی بدترین خلائق انسان ہوتا ہے تو اسے یہاں کے لوگ 'شکر پاتر' کہتے ہیں۔ گاؤں والوں نے مارے غصہ کے اس کے مقبرہ کو منہدم کر دیا اور اس غصہ کا اظہار اب تک اس ضرب المثل سے ہوتا ہے جو یہاں زبان زد خاص و عام ہے کہ "بد ذات کی قدر بد ذات جانے"۔ سلاطین گجرات کے دسویں بادشاہ سلطان بہادر کے زمانہ میں کھمبات کا بندرگاہ ایک بڑی شان و شوکت کی جگہ تھی۔ اور اسی بادشاہ کے دور میں پرتگالیوں نے کھمبات اور ڈیو میں اپنی پہلی کمپنی قائم کی تھی مگر اس کے فوراً ہی بعد انھیں وہاں سے نکال باہر کر دیا گیا۔

جب مغل بادشاہ ہمایوں سلطان بہادر شاہ پر حملہ آور ہوا تو بہادر شاہ نے اپنا خزانہ مع زر و جواہر کھمبات منتقل کر دیا اور خود ڈیو میں پناہ گزیں ہو کر پرتگالیوں سے مدد کا طالب ہوا۔ لیکن جب حملہ کے بعد ہی ہمایوں واپس چلا گیا تو بہادر شاہ کو افسوس ہوا کہ اس نے ناحق پرتگالیوں سے مدد مانگی۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کے سوا اس کے پاس دوسرا چارہ ہی کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب سلطان بہادر نے اُن سے مدد طلب کی تو پرتگالی کمانڈر نے اُسے اپنے جہاز پر بلایا لیکن سلطان کو اس کے جہاز پر بلوانے سے یہ شک ہوا کہ شاید پرتگالیوں کی نیت نہ خراب ہو گئی ہو لہٰذا جب وہ پرتگالیوں کے کمانڈر سے ملنے گیا تو اپنے ہمراہ کچھ محافظ لے گیا۔ سلطان کا خیال ٹھیک نکلا۔ جب وہ جہاز سے اتر کر ایک کشتی پر چڑھنے لگا تو اس کشتی کی ڈوریوں کو جو جہاز میں بندھی تھیں پرتگالیوں نے کھینچ لیا اور کشتی کو اس زور کا ہچکولا دیا کہ بادشاہ سمندر میں گر پڑا۔ ایک بار پھر وہ سطح سمندر پر ابھرا مگر ایک پرتگالی نے اس پر اتنی زور سے لٹھ مارا کہ پھر اس کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سمندر کی تہہ میں غرق ہو گیا۔ اس کے بعد پرتگالیوں نے ۱۵۳۶ء میں ڈیو پر باقاعدہ طور پر قبضہ کر لیا۔

اس واقعہ کے تقریباً چھتیس سال بعد شہنشاہ اکبر نے بغیر لڑے بھڑے گجرات کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ وہ کھمبات بھی گیا اور اس نے نواح کے دو علاقوں کو اس میں شامل کر کے اس کی آبادی میں اضافہ کر دیا۔ تقریباً ایک سو اسی برس تک گجرات پر مغلوں کا قبضہ رہا۔ اس کے بعد مرہٹوں نے مغلوں سے چھین کر اس پر قبضہ کر لیا۔ بہرحال کھمبات میں گیارہ مضافات شامل تھے مگر اب ان میں صرف ایک یطورسیا دگار باقی ہے۔

کھمبات میں ڈچوں اور انگریزوں دونوں کی کمپنیاں قائم ہوئیں لیکن کھمبات ہمیشہ سورت کے ماتحت رہا۔ آزادی سے

تب تک کمپنی کے انگریزی دفاتر یہاں رہے۔ یہاں ۱۹۳۱ء تک نواب کا اقتدار رہا۔

کھمبات ہی کے بندرگاہ کی وجہ سے بروچ، سورت اور بمبئی کے بندرگاہ وجود میں آئے۔ اور ان کے وجود میں آنے کی وجہ یہ ہوئی کہ کھمبات میں ایسا زبردست جوار بھاٹا آتا ہے کہ سمندر کی لہریں تیس تیس فٹ بلند ہو جاتی ہیں اور ان کی رفتار چھ سات ناٹ فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ جب تک کھمبات میں بندرگاہ نہیں بنا تھا اس وقت تک یہ حالت تھی کہ جب جوار بھاٹا ختم ہو جاتا تو ہر طرف دو تین میل تک کیچڑ ہی کیچڑ نظر پڑتی۔ اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوتا کہ جوار بھاٹے کی وجہ سے بحری جہاز کھمبات کے شہر کے پاس پہنچ جاتے۔ کھمبات ہمیشہ ہی سے بندرگاہ رہا ہے۔ بندرگاہ کی شکل میں نہ سہی مگر بیرونی تجارت کا مرکز ضرور رہا۔ اور اب تو یہ باقاعدہ بندرگاہ بن گیا ہے اور اس کا شمار ہندوستان کے مشہور بندرگاہوں میں کیا جاتا ہے۔

پہلی صدی عیسوی میں پیریلیس کے زمانہ سے یہاں سے معمولی سے معمولی اور قیمتی سے قیمتی جواہر باہر کے ملکوں کو بھیجے جاتے تھے۔ ہیرے جواہر کے علاوہ یہاں کی ململ بھی شہرۂ آفاق ہے اور ایک زمانہ سے باہر کے ملکوں میں بھیجی جاتی ہے۔ ایک زمانہ میں یہاں کے گلدان اور دوسرے ظروف بھی بڑی شہرت رکھتے تھے اور بحر روم کی راہ سے جو ممالک غیر سے ان کی تجارت ہوتی تھی اس میں یہ بڑے بڑے داموں پر فروخت ہوتے تھے۔ کھمبات میں ظروف کا بھی بہت بڑا بازار ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں کا بنا ہوا ایک پیالہ کئی کئی سو روپے میں فروخت ہوتا تھا۔ دو سو برس قبل یہاں کے بنے ہوئے ململ کے تھانوں کا یہ عالم تھا کہ ۵ گز لمبا اور ایک گز چوڑا تھان دو۔ اونس وزن کا ہوتا تھا۔ اس ایک تھان کے بنانے میں پورے آٹھ مہینے لگتے تھے اور یہ تھان بھری برسات میں بنائے جاتے تھے تاکہ ہوا کی رطوبت سے ان کا تار ٹوٹنے نہ پائے۔ تمام ہندوستان کی بنی ہوئی ململ کھمبات بھیجی جاتی تھی۔ ایک زمانہ میں یہاں بڑے قیمتی اور حسین قالین بھی بنے جاتے تھے۔ ململ اور جواہر کا یہاں کی خاص چیزوں میں شمار ہے۔ کھمبات جواہر تراشی کے لئے بھی مشہور ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں یہ فن پورے عروج پر تھا۔ اس دور میں بڑے بڑے سیاح کھمبات آئے۔ چنانچہ ۱۴۱۹ء میں نکولوڈی کانٹی وہاں پہنچا اور وہ کھمبات کی دو چیزوں سے بے حد متاثر ہوا۔ اوّل وہاں کے لعلوں سے جو عقیق کہلاتے ہیں، دوسرے وہاں کی ستی کی رسم سے۔ کھمبات کی ہندو بیواؤں کو اپنے شوہر سے جو روحانی لگاؤ ہوتا ہے اور جس کے جذبہ سے متاثر ہو کر وہ اپنے شوہروں کی چِتا کے ساتھ بہ رضا و رغبت اپنے آپ کو بھی نذرِ آتش کر دیتی تھیں۔ یہ جذبہ کھمبات کی ہندو عورتوں میں شدّت سے پایا جاتا تھا۔

۱۴۶۸ء میں مشہور سیاح اتھاسیس نکیٹن کھمبات گیا تھا۔ پندرھویں صدی عیسوی میں ایک اور سیاح جینونس ہائی رونائی موڈی سانتو اسٹی فیو عدن سے کالی کٹ اور سماترا گیا۔ اور واپسی پر جب اس کا جہاز جزائر مالدیپ کے قریب تباہ ہو گیا اور وہ مجروح ہو کر مفلوج ہو گیا اور اس کو کھمبات اسی حالت میں لایا گیا تو کھمبات کے ایک سوداگر نے ازراہ مہربانی اُسے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ اس کے بعد اسے تری پولی بھجوا دیا۔

ایک اور سیاح جسے دنیا بھر کی سیر کا شوق تھا اور جس کا نام لوڈو وکوڈی ورتھا تھا، بلونا کا باشندہ تھا۔ وہ بھی کھمبات گیا تھا۔ اس نے کھمبات کے بارے میں لکھا ہے کہ کھمبات کے چہار طرف ایک فصیل کھنچی ہے اور یہ ایک حسین شہر ہے۔ یہاں بہت ہی اعلیٰ درجہ کے پھل ہوتے ہیں اور کثیر مقدار میں غلّہ ہوتا ہے۔ اس نے سلطان محمود بیگاڑا کے بارے میں بڑی دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ اس کی مونچھیں اتنی بڑی تھیں کہ جس طرح عورتیں اپنی چوٹی کا جوڑا باندھتی ہیں اسی طرح وہ اپنی مونچھیں اپنے سر کے چاروں

طرف باندھ لیتا تھا اور یہی حالت اس کی سفید داڑھی کی تھی جو اس کے ٹخنوں تک گئی ہوئی تھی ۔ وہ لکھتا ہے کہ

"سلطان زہر خور ہے ۔ اگر وہ اپنی سلطنت یا دربار کے کسی عہدیدار یا امیر کو سزائے موت دینا چاہتا تھا تو اسے بلوا کر پہلے اپنے سامنے ننگا کراتا تھا اس کے بعد اس کے کوڑے لگواتا تھا۔ پھر کچھ پھل اور جڑی بوٹیاں پان کی طرح منہ سے چباکر اور گھونٹ گھونٹ کا عرق منہ میں لے کر اس شخص پر تھوک دیتا تھا جس کے آدھ گھنٹے کے بعد ہی وہ شخص مرجاتا تھا۔"

محمود کے مرنے کے کچھ ہی دن بعد جب باربوسا نامی سیاح کھمبات پہنچا تو اس نے بھی سلطان کی زہر خوری کی عادت کا ذکر کیا ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ سلطان اس قدر زہریلا تھا کہ اگر اس کے ہاتھ پر کوئی مکھی بیٹھ جاتی تھی تو وہ پھول جاتی تھی اور چشم زدن میں مرجاتی تھی ۔

بہرصورت کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگوں کو سلطان سے محض اس بنا پر نفرت تھی کہ وہ بے حد کھاؤ قسم کا انسان تھا۔ کیونکہ دوسری جگہ اسی سلطان کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ بہت ہی طاقت ور، شجاع اور بہادر کسان تھا اور زہر خوری کی داستان کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ شاہ بلوط کا پھل استعمال کرتا تھا اور شاہ بلوط کے پھل کے بارے میں مشہور ہے کہ جو لوگ اس کے پھل کو کھاتے ہیں ان کے جسم میں زہر پیدا ہوجاتا ہے اور وہ زہر کے اثر سے نہیں مرتے ۔

سولھویں صدی کے اوائل میں ایک سیاح باربوسا نامی کا لکھا ہوا ایک سفر نامہ بیرولونا کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا تھا جس میں کھمبات کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ گجرات اور کھمبات میں لوگ کن کن کھیلوں سے دلچسپی لیتے ہیں ۔ انھیں کھیلوں میں ایک کھیل چوگا کہلاتا ہے جو گھوڑے پر بیٹھ کر کھیلا جاتا ہے ۔ خیال ہوتا ہے کہ فارسی میں جسے چوگان اور انگریزی میں پولو کہتے ہیں ۔ یہ وہی کھیل ہوگا ۔

جہاں تک کھمبات کی صنعت و حرفت کا تعلق ہے وہاں ہاتھی دانت کا بھی نہایت نفیس کام ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ سونے چاندی کے زیورات پر اور تلوار اور چاقو کے دستوں پر ہیرے جواہر جڑنے کا کام بھی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا تھا۔ یہاں رنگ برنگی دانوں کی تسبیحیں بھی کثیر مقدار میں بنتی ہیں اور دوسرے ملکوں کو بھیجی جاتی ہیں ۔ یہاں سے چھوٹے پتھروں کو بھی نہایت نفاست سے تراش کر غیر ملکوں میں بھیجا جاتا ہے ۔ یہاں جو جھوٹے موتی ہوتے ہیں ان میں اور سچے موتیوں میں تمیز کرنا مشکل ہوجاتا ہے ۔

شہر کھمبات کے علاوہ ایک اور شہر ہے جو لمودرا یا نمودرا کے نام سے موسوم ہے ۔ یہاں ایک اعلیٰ قسم کا پتھر پایا جاتا ہے جس سے عقیق تیار کرتے ہیں ۔ اس کی تسبیحیں بھی بہت مشہور ہیں ۔ یہ ایک ددھیا پتھر ہوتا ہے جس میں کچھ سرخی ہوتی ہے اور آگ کے سامنے رکھ کر اس کی سرخی کو نکھار کر اور شوخ بنایا جاتا ہے ۔ یہ پتھر کثیر مقدار میں سمندر سے برآمد ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ یہاں ایک پتھر اور دستیاب ہوتا ہے جسے وہاں کی اصطلاح میں سبگور کہتے ہیں ۔ اس پتھر کو عقیدتاً ناموس کی حفاظت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص اسے پہن لے اور وہ جسم کی کھال سے مس ہوتا رہے تو کوئی شخص اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا ۔ آج کل چھوٹے پتھروں کی تراش خراش کا وہ زور نہیں رہا جو اب سے ایک دو صدی قبل تھا بلکہ اب نقلی پتھر سوئیٹزر لینڈ، جرمنی اور فرانس سے منگوائے جاتے ہیں اور انھیں نہایت خوب صورتی اور نفاست سے تراش کر غیر ملکوں کو بھیجا جاتا ہے ۔ عقیق، لعل، پنّا اور سفید کا شمار اب بھی یہاں کے مشہور پتھروں میں ہے ۔

کھمبات میں بہت سی خوب صورت اور قدیم عمارتیں بھی ہیں ۔ یہاں کی جامع مسجد پندرھویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوئی تھی ۔ اس مسجد کی ساخت بالکل ویسی ہے جیسی کہ التمش کی بنوائی ہوئی مسجد اجمیر شریف میں ہے مگر اس مسجد میں

بعض چیزیں اس مسجد سے مختلف ہیں۔ اس میں جو ستون ہیں وہ اندر سے کھوکھلے ہیں۔ یہاں کی دوسری مشہور عمارتوں میں امارا بن احمد گیرانی کا مقبرہ ہے۔ اس مقبرے کو اس نے خود اپنی زندگی ہی میں تعمیر کرایا تھا اور مقبرہ کے علاوہ اس نے ایک مسجد بھی بنوائی تھی جو ایک دو منزلہ عمارت ہے۔ اس میں صرف ایک ہی گنبد تھا۔ یہ گنبد بے جوڑ تھا اس لئے اتنی سو برس بعد یہ منہدم ہو گیا۔ اس گنبد کا قطرہ ۲ فٹ تھا۔ جس جگہ یہ مسجد واقع ہے اس کے گرد و پیش کا منظر بھی بہت ہی دل کش ہے۔

آمر سورتی

پیغامبرِ امن

تھے بصد شوق اُدھر لوگ جدھر تھے نہرو
اہلِ دل، اہلِ وفا، اہلِ نظر تھے نہرو

جس سے ہر شخص ہو خوش سب کو یقیں ہو جس پر
ایسا رہبر ہے کہاں کوئی، مگر تھے نہرو

باغِ انسانیت و باغِ رواداری کے
یہ حقیقت ہے شگفتہ گلِ تر تھے نہرو

جس طرح اپنے مقاصد پہ اٹل رہتے تھے
یونہیں اظہارِ مقاصد میں نڈر تھے نہرو

یاد ہوگا تجھے اے گردشِ حالات ابھی
سامنے تیرے فقط سینہ سپر تھے نہرو

عام ہو امن و اماں ملک میں اس جذبے کے
مبتدا گاندھی اگر تھے تو خبر تھے نہرو

کتنے موڑ آئے مگر قافلہ گم ہو نہ سکا
واقعی واقفِ ہر راہ گزر تھے نہرو

با اثر شخصیتوں پر بھی اثر تھا ان کا
رونقِ محفلِ اربابِ اثر تھے نہرو

شاق کیوں گزرے جدائی نہ دلِ عالم پر
خیر خواہِ ہمہ تن نوعِ بشر تھے نہرو

لوگ کہنے لگے پیغامبرِ امن آمرؔ
کوششِ امن میں یوں شام و سحر تھے نہرو

غزل

پھر گئی تیری نظر اور کوئی بات نہیں
لُٹ گئے شام و سحر اور کوئی بات نہیں

تیرے ابرو پہ پڑے بل، تو نظامِ عالم
ہو گیا زیر و زبر اور کوئی بات نہیں

تو نے کچھ ایسے کیا، دل میں مرے گھر اے دوست!
بھول بیٹھا ہوں میں گھر اور کوئی بات نہیں

تم نے اُلٹا جو سرِ بزم نقابِ رُخ کو
بجھ گئے شمس و قمر اور کوئی بات نہیں

آج تک وجد میں ہیں آٹھ پہر ماہ و نجوم
تم نے دیکھا تھا ادھر اور کوئی بات نہیں

بن گئے راہ کے کانٹے بھی گلِ تر ساقی
اک تری میٹھی نظر اور کوئی بات نہیں

تیرا جینا بھی مرے شیخ! کوئی جینا ہے
رات دن نفع و ضرر اور کوئی بات نہیں

غزل

سنبھالے اپنے دامن میں نئے پندار کے بستے
سب اپنی اپنی رَو میں جا رہے ہیں دوڑتے کستے

وہ گلشن ہو کہ صحرا ہو کہیں پہنچا تو دیتے ہیں
تری آرام گاہوں سے تو بہتر ہیں مرے رستے

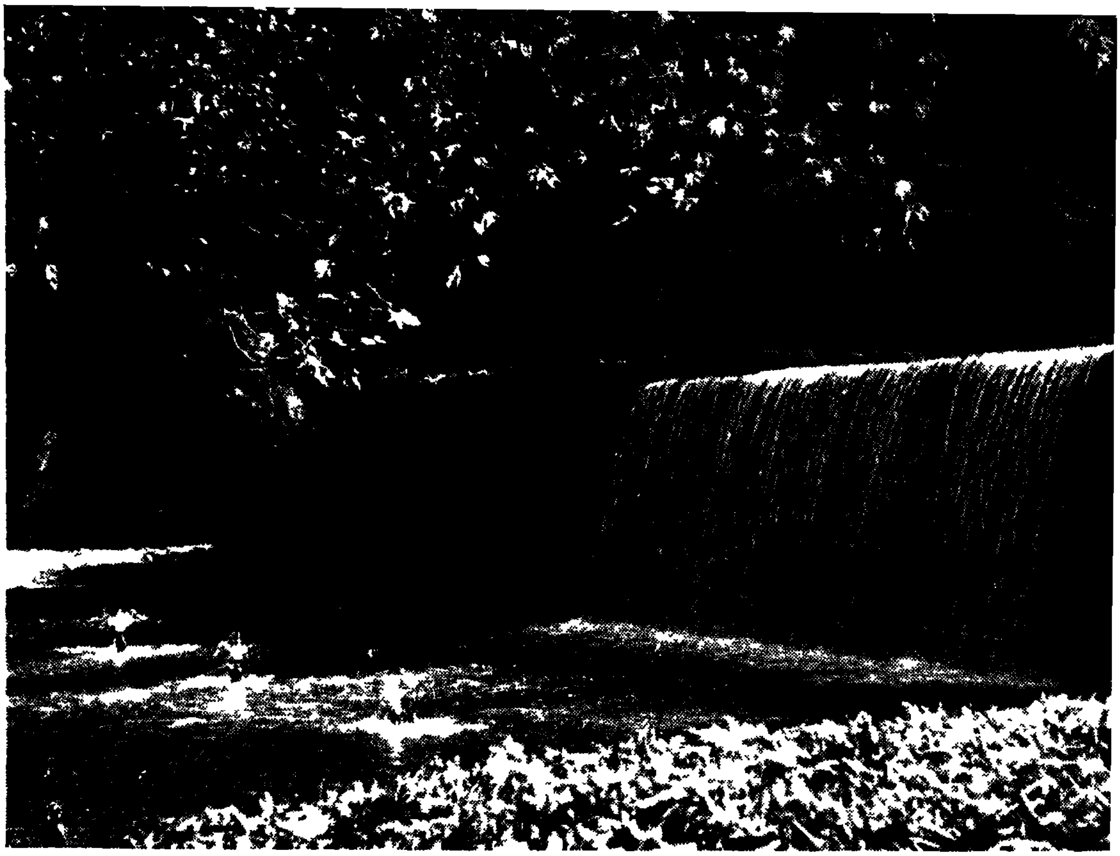
کبھی گرتے ہیں دامن میں کبھی ملتے ہیں مٹّی میں
انھیں آنکھوں کے موتی ہیں کبھی مہنگے کبھی سستے

حیاتِ شوق خاک و خوں ہوئی ہے یوں کہ اب پیہم
مہکتے ہیں مرے دل میں تری یادوں کے گلدستے

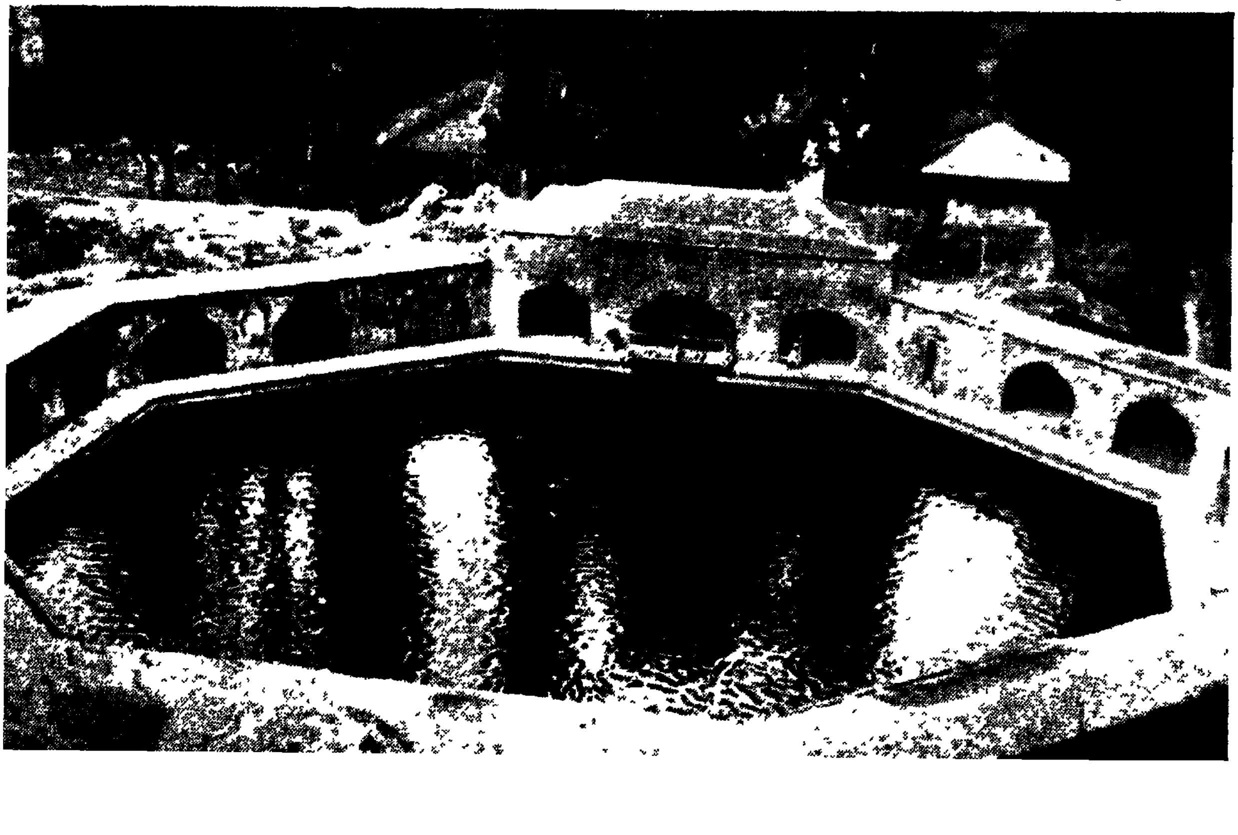
دلِ خود دار کو کچھ دُوریوں کی لاج رکھنی تھی
وگرنہ ہم تو مدّت سے تری بستی میں آ بستے

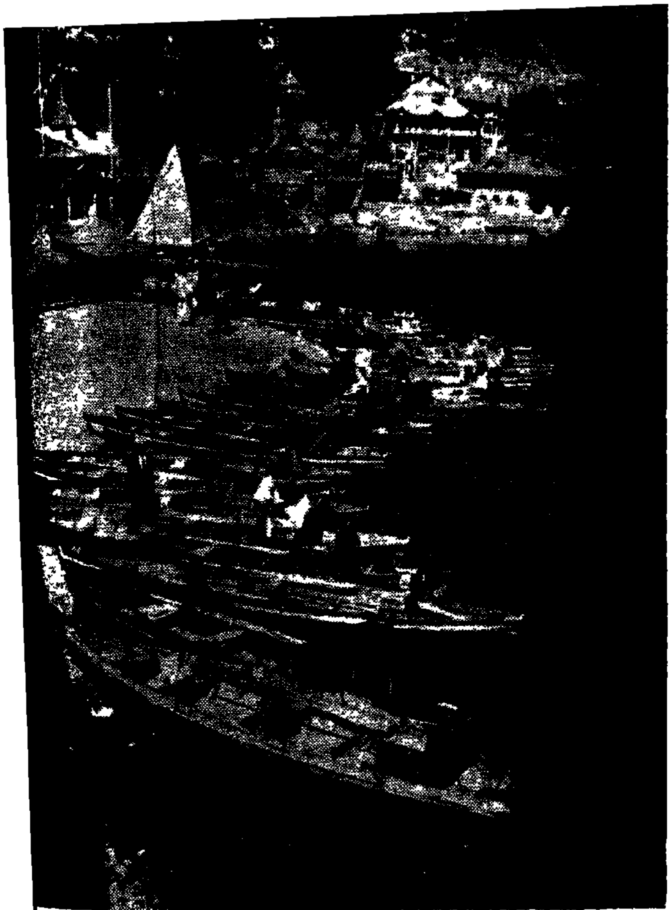
خس و خاشاک جلتے جا رہے ہیں صحنِ گلشن کے
یہ سچ ہوتا تو پھر یہ زیست کے لمحات کیوں ڈستے

کبھی احساسِ ناکامی، کبھی احساسِ رسوائی
ہم اس غم ناک عالم میں اگر ہنستے تو کیا ہنستے



ویری ناگ (کشمیر)



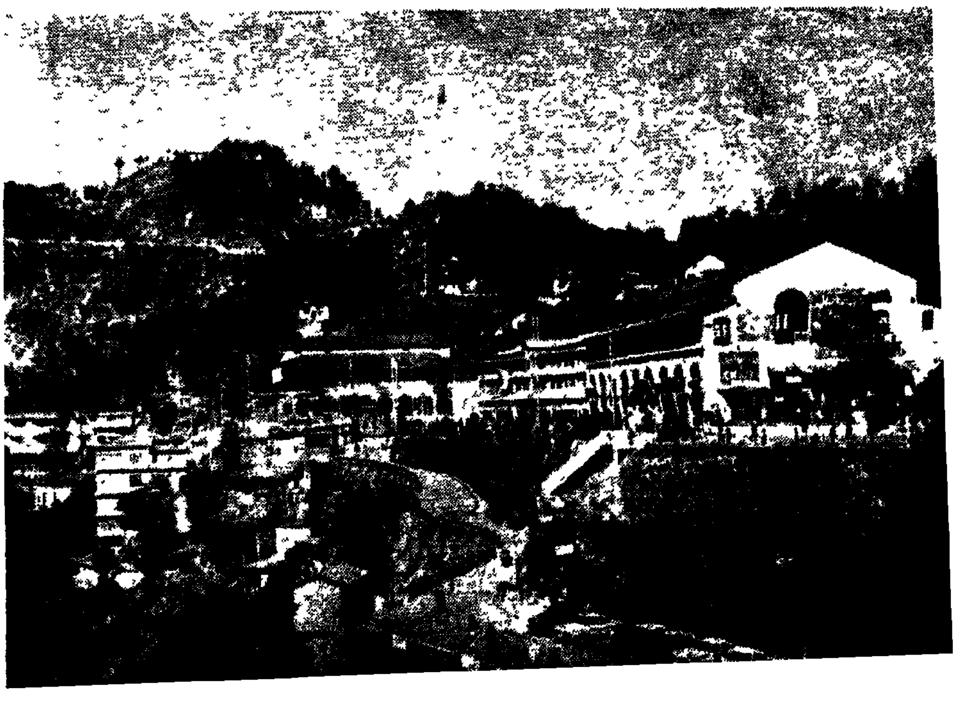


نینی تال

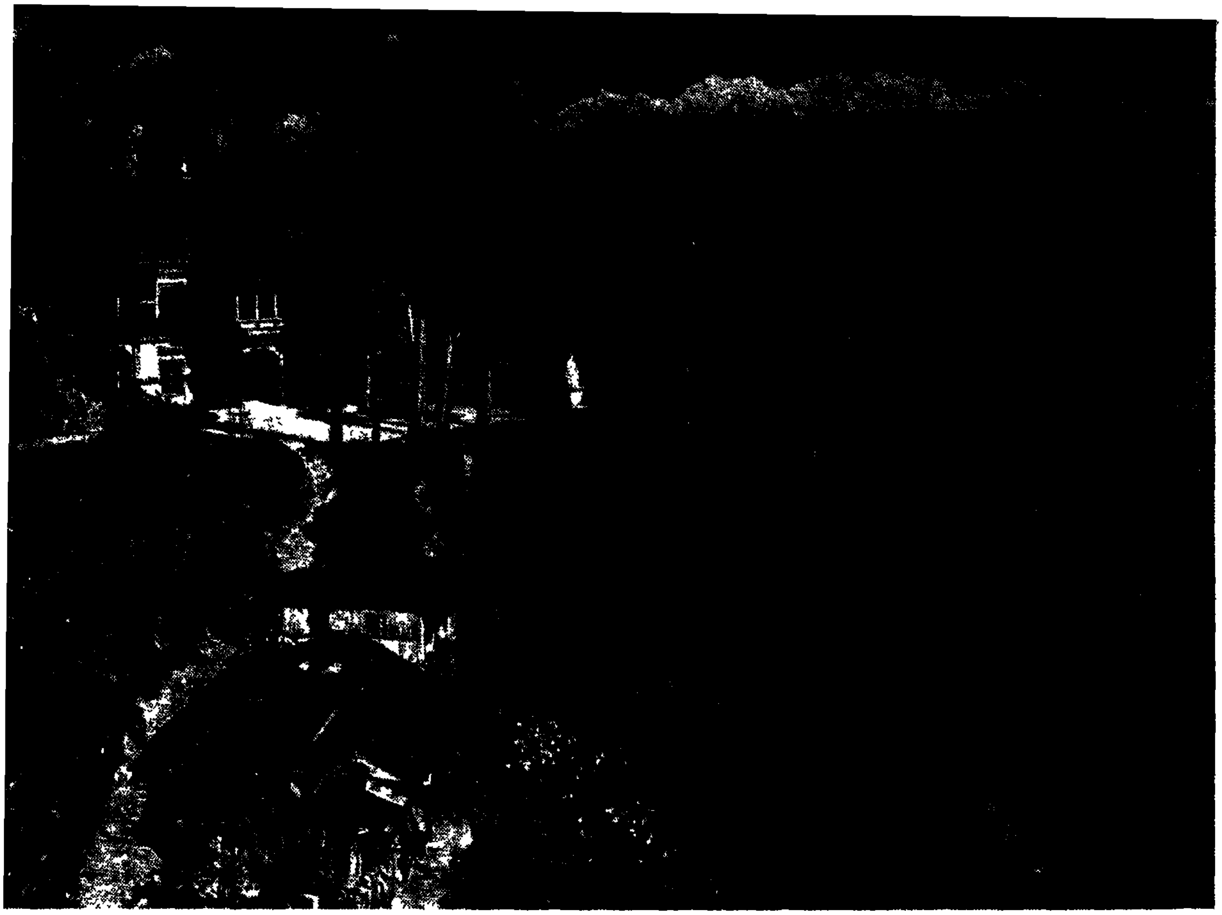


رانی کھیت

گرمیوں کی سیرگاہ

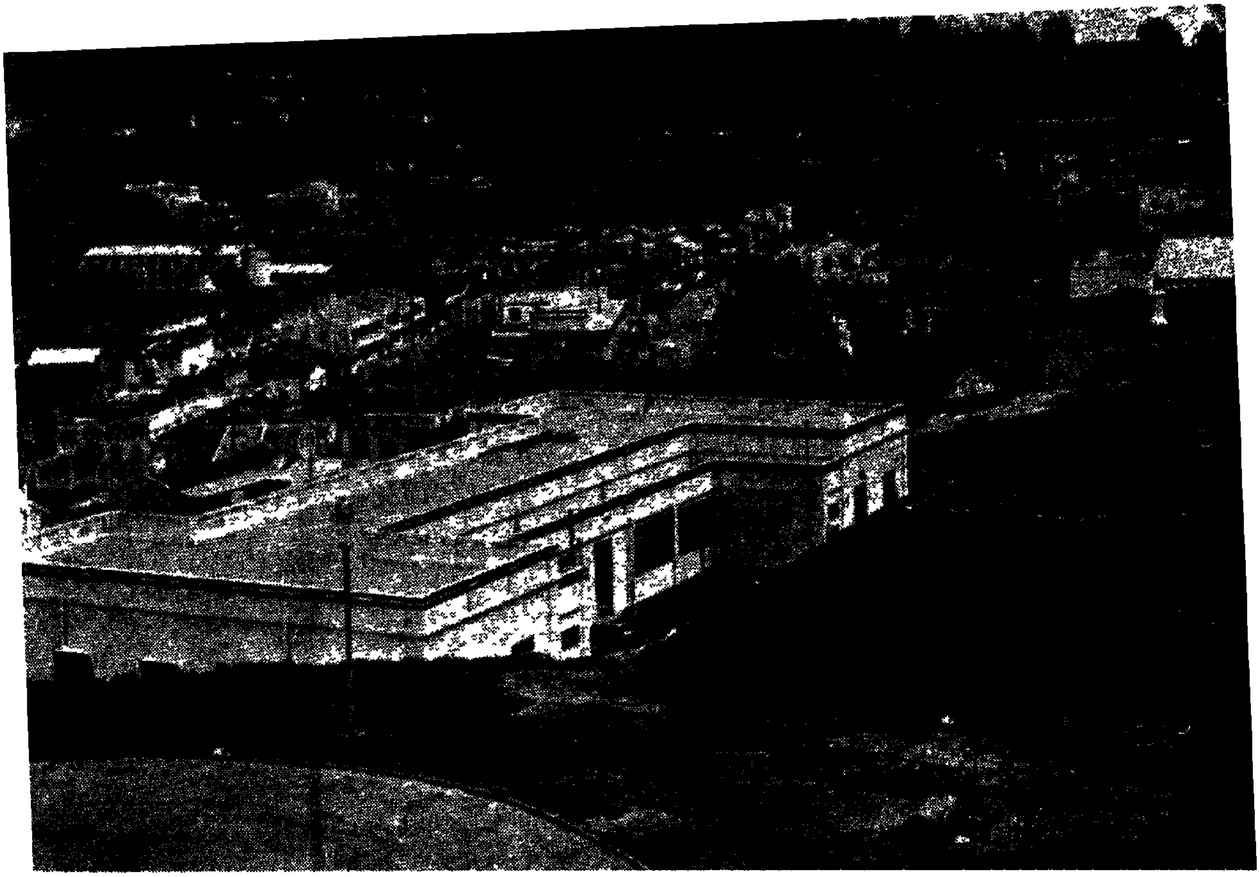


مسوری

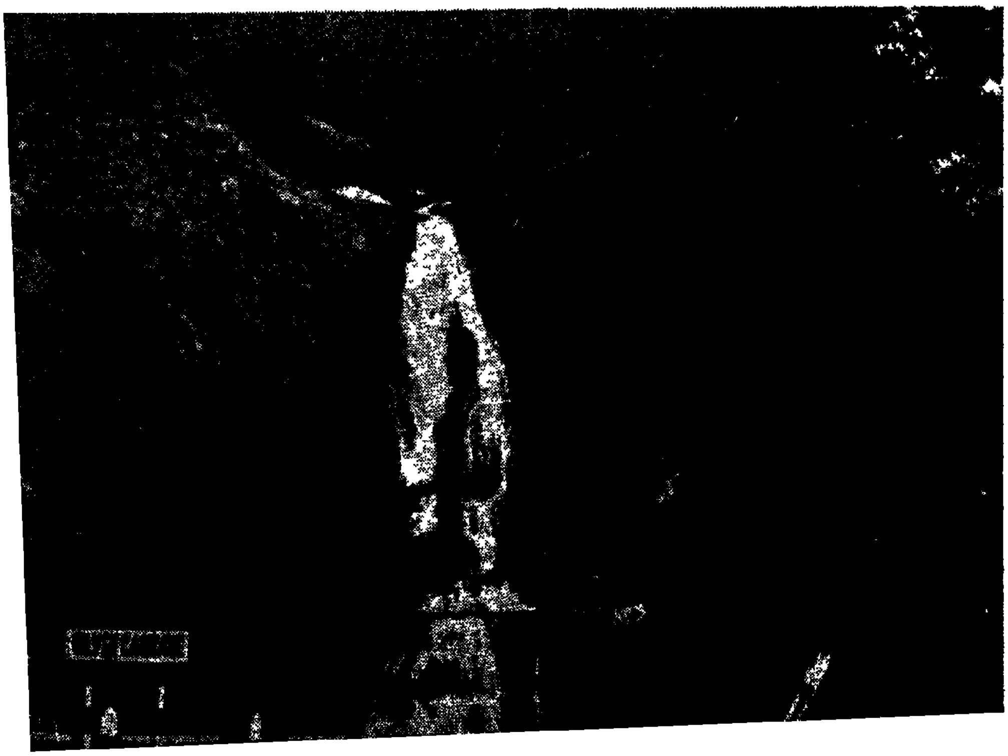




شملہ



اوٹاکمنڈ



کوڈائی کنال کا آبشار

ست پرکاش سنگر

فون پھر آیا دلِ زار...

بیسا کھی رام کا مشورہ قبول کرنا ایک مصیبت ہے، نہ قبول کرنا اس سے بڑی مصیبت۔ ان کے دماغ میں جب کوئی لہر آتی ہے، فوراً بھاگے بھاگے آتے ہیں اور سب سے پہلے مجھے ہی نشانہ بناتے ہیں۔ سردی کے دنوں میں پانچ بجے صبح سیر کرنے جاتے ہیں اور اپنے خصوصی دوستوں پر احسان بانٹتے ہوئے انھیں دروازوں پر دستک دے کر جگاتے ہیں۔ ایک دن میری شامت آئی تو صبح آدھمکے۔ مجھے جگا کر تقریباً چیخنے لگے۔

"رات بارہ بجے تم سے ضروری باتیں کرنا تھیں۔"

"تو آجاتے۔"

"کہنا آسان ہے۔"

"اب بتلا دیجئے۔"

"اس بات میں اب وہ لطف کہاں؟"

"پھر بھی؟"

"یکے بعد دیگرے منشی رام سے دو باتیں سوجھی تھیں۔"

"پھر تو اہم بات تھی۔" میں نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"اس سے مجھے ایک تجویز سوجھی۔"

"خدا خیر کرے۔ کیا؟"

"کہ ہم دونوں ٹیلی فون لگوائیں۔"

"ارے یار۔ چھوڑو بھی۔"

"میں آج ہی اس کے لئے ضروری اقدام اٹھاؤں گا۔ ایس ڈی او اپنے شطرنج کے دوست ہیں۔ ٹیلی فون لگنے میں دیر نہیں لگے گی۔"

"کتنا خرچ ہوگا؟"

"یہی چار یا پانچ سو سالانہ۔"

"دونوں کے۔"

"ایک کے۔"

"مجھے ٹیلیفون نہیں چاہیئے۔" میں نے قطعی فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور مجھے ضرور چاہیئے۔" انھوں نے میرے فیصلہ کو رد کرتے ہوئے کہا۔

"بلا ضرورت کا خرچ۔"

"آدمی کو پیسے کے منہ نہیں لگنا چاہیئے۔ عزت ہے تو پیسے کی بھی قدر ہے۔ عزت ہی سے شہرت ملتی ہے۔ روپیہ آدمی کے ساتھ نہیں جاتا۔"

"عزت اور شہرت بھی ساتھ نہیں جاتی۔"

"یہی تو آپ کی غلطی ہے۔" وہ میری بات کا مذاق اڑاتے ہوئے بولے۔ "عزت اور دھن کو ایک سا درجہ نہیں دینا چاہیئے۔ میری بات کو اہمیت نہیں دیتے نہ دو۔ شاعروں اور سنتوں کی تو سنو۔"

"شاعر اور سنت؟"

"جی ہاں، کبیر، نانک، دادو، تلسی اور سورداس..."

"ٹیلیفون کے بارے میں انھوں نے کیا کہا ہے؟"

'پوچھئے کیا نہیں کہا ؟ مثلاً کبیر جی فرماتے ہیں "۔

کبیرا تیری جھونپڑی گل کٹین کے پاس
جو کرن گے سو بھرن گے توکیوں بھیو اداس

" اس میں آپ والی بات کہاں ہے ؟ "

" یہی تو آپ کی غلطی ہے ۔" بسیاکھی رام بولے ۔"کبیر کو سمجھنا بڑا مشکل ہے ۔ کہتے ہیں ۔

'کبیرا سنگت سادھو کی ...... '

کبیر جی سادھوؤں کی سنگت کا اپدیش کرتے ہیں ٹیلی فون کی نہیں ۔" میں نے ان کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا ۔

" یہی تو آپ کی غلطی ہے دھیان سے پڑھنے پر پتہ چلتا ہے کہ ہمارے سنت اور شاعر اچھی صحبت کا اپدیش کرتے ہیں اور آج کے زمانے میں ٹیلی فون سے بڑھ کر اچھا ساتھی کوئی نہیں ۔ جب جی اداس ہوا، رسیور اُٹھایا اور بات شروع کر دی ۔ دوسرے اس بات کو مت بھولئے کہ فی زمانہ سوشل پوزیشن حاصل کرنا اشد ضروری ہے ۔ اور ٹیلی فون کے بغیر سوشل پوزیشن بنانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا بلاٹکٹ گاڑی میں سفر کرنا ۔"

" بلاٹکٹ گاڑی میں سفر کرنے والوں کی کم تعداد نہیں ہوتی ۔"

" یہی تو آپ کی غلطی ہے ۔" وہ قدرے خفگی سے کہنے لگے " آپ پروفیسر راج گورہی کو لیجئے ۔ جب سے انھوں نے ٹیلی فون لگوایا ہے ، ان کی سوشل پوزیشن کئی گنا بڑھ گئی ہے ۔ جب چاہیں اخبار والوں ، سٹہ بازوں اور سینما گھروں سے بات کر سکتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے ۔" وہ مجھ پر راز انکشاف کرنے کے انداز سے کہنے لگے ۔" آپ کی شہرت بڑھ جاتی ہے ۔"

" شہرت ! وہ کیسے ؟"

" ڈائرکٹری دیوی میں آپ کا نام چھپ جانے سے ۔"

" اس میں تو ہر قماش اور معاش کے لوگوں کے نام ہیں ۔"

" اس سے کیا ؟ آپ کا بھی تو ہوگا ۔ دوسرے ، محلے والوں کو ٹیلی فون کرنے کی اجازت دے کر آپ ان کی خوشنودی حاصل کر سکیں گے ۔ انھیں فائدہ پہنچائیں گے ۔ ان سے فائدے کی امید رکھیں گے ۔ لوگ تو مورکھ ہیں جو اس زمانے کو کلجگ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ۔ یہ کرجگ ہے ۔ اس ہاتھ دے ، اس ہاتھ لے ۔"

" یعنی ایک ہاتھ سے ہم رسیور پکڑیں ، دوسرے سے وہ ۔"

" یہی تو آپ کی غلطی ہے ۔ غلطی نہیں ، مصیبت ہے ۔ آپ بات سمجھتے نہیں ، سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ۔ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ ٹیلی فون لگنے سے آپ کا ٹیکسی اور سکوٹر کا کرایہ بچے گا ۔ دوسروں کے پاس جاکر وقت ضائع کرنے کی بجائے دو منٹ میں بات چیت کر سکیں گے ۔ دونوں ہی کو اس سے فائدہ ہوگا ۔"

" وہ تو تبھی ہوگا اگر دوسروں کے پاس بھی ٹیلی فون ہو ۔"

" یہی تو آپ کی غلطی ہے ۔ آپ کی تقلید کرتے ہوئے وہ بھی لگا لیں گے ۔"

اُن کے اصرار پر مجھے ٹیلی فون لگوانا پڑا ۔ افتتاحی تقریب پر ہم نے ہری جن نیتا اور سابق سیکرٹری ہندو سبھا ، سابق پریذیڈنٹ ضلع سوشلسٹ پارٹی ، سابق خزانچی کانگریس منڈل اور سابق سٹوڈنٹ لیڈر شری مانک رام کو بلایا ۔ شام کے دھندلکے میں ان کی دھواں دھار تقریر کتنی مؤثر تھی ۔ چائے کی پیالیوں میں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا اور میرے دل کی گہرائیوں سے آہوں کا دھواں نکل رہا تھا ۔ چھ ماہ کی لگاتار کاوش کے بعد ہم موجودہ ٹیلی فون کے اور مستقبل کی شہرت کے مالک بننے کے اہل ہوئے تھے ۔

خطبۂ صدارت کے بعد بسیاکھی رام کے مشورے پر ٹیلی فون کا ادگھاٹن جرم ادیوگ کے آنریری اسسٹنٹ سیکرٹری کے کرکملوں دوارا کرایا گیا ۔ انھوں نے رسیور اُٹھایا اور ادا سے ہاتھ میں لے کر بولے ۔

" ہیلو ! "

جواب میں کسی نے کہا

" ہیلو ! "

انھوں نے پھر کہا

" ہیلو ! "

جواب میں بھی کسی نے کہا

"ہیلو!"

وہ بولے۔ "ٹیلیفون خراب ہے۔ اس میں گنبد کی آواز آ رہی ہے۔"

بیساکھی رام کے مشورے پر محلّے والوں کو اس دن فری ٹیلیفون کرنے کی اجازت تھی۔ اس خبر کو سنتے ہی لوگ ایسے آنے لگے جیسے ٹیلی فون نہیں، مفت چلنے والی آئس کریم کی فیکٹری لگی ہو۔ محلّے کے لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ تہذیب و تمدّن کے پروردہ ہونے کے سبب وہ کیو میں کھڑے ہو گئے۔ دیر تک کھڑے ہونے کے کارن اُن کے لئے چائے کا انتظام کرنا پڑا۔ کچھ صاحب تشریف لانے سے پیشتر پوری طرح ناشتہ نہیں کر پائے تھے۔ اُن کے لئے بھوجن کا پربندھ کیا گیا۔

اس تقریب کے سلسلے میں مجھے تین دن کی رخصت لینی پڑی۔ ایک دن تیاری اور ایک دن آرام کے لئے۔

لیکن یہ کوئی کم نہیں تھا کہ ہم ٹیلی فون کے مالک ہو گئے اور ڈائرکٹری میں ہمارا نام درج ہو گیا۔

بیساکھی رام کا مشورہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ ٹیلی فون لگنے سے ہماری پوزیشن پر ایک دم فرق پڑ گیا۔ محلّے میں ہمارا رسوخ کئی گنا بڑھ گیا۔ شہر میں ہمارا نام خاص و عام کی زبان پر آ گیا۔ گھر کی اداسی کافور ہو کر رونق میں اضافہ آ گیا۔ جہاں پہلے ہر وقت خاموشی چھائی رہتی، وہاں اب گھنٹیوں کا پہرہ مسلّط ہو گیا۔ دیر تک گھنٹی بجتی۔ گھنٹی سن کر ہم پڑوسیوں کو بلاتے۔ وہ گھنٹی سننے اور اس کا جواب دینے کے لئے آتے۔ دوسروں تک گھنٹی کی آواز پہنچانے کے لئے دوسرے پڑوسی تشریف لاتے۔ ہم فخریہ کہتے،

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

سردی کی بھیگی راتیں ہوں یا گرمیوں کے لمبے دن۔ گھنٹی کو کبھی آرام کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ کھانے سے فارغ ہو کر سخت لُو اور گرمی سے بچنے کے لئے کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے کمروں کے اندر سو جاتے یا سونے کا بہانہ کر کے لیٹ جاتے۔

ٹن - ن - ن - ن - ن .....

فضا گھنٹی کی آواز سے معمور ہو جاتی۔

ٹن - ن ... ن ... ن ... ن .....

آواز رکنے کا نام ہی نہ لیتی۔

ہر کوئی نیند کا بہانہ کئے آنکھیں موندے لیٹا رہتا۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ ایسی تیکھی آواز تو فرشتوں کی نیند بھی حرام کر سکتی ہے، لیکن سب جیسے کانوں میں تیل ڈالے لیٹے رہتے۔ لاچار مجبور مجھے اٹھنا ہوتا۔

"ہیلو، کون ہے بھائی؟"

"آپ ٹو-ٹو- ٹو-تھی- ٹو-فور سے بول رہے ہیں؟"

"ہاں ہاں ٹو- ٹو- ٹو تھری- ٹو فور سے بول رہا ہوں- تم کون ہو؟"

"تلسی جی۔"

"مہاتما تلسی داس جی؟"

"تلسی جمعدار جی- ڈاکٹر بھارگو کا کلاس فور سرونٹ جی۔"

"اوہ کلاس فور جی! دوپہر کے بارہ بجے کیا مصیبت آن پڑی؟"

"بی بی جی نے دو جھاڑو منگوائے تھے۔"

"ہم سے؟ بی بی جی سے کس نے کہا ہم جھاڑو رکھتے ہیں؟"

"نہیں صاحب بازار سے منگوائے ہیں۔"

"ہم نے کب منع کیا ہے؟"

"نہیں جی- بھاؤ چڑھ گیا ہے۔"

"تو میں کیسے اتار سکتا ہوں؟ کتنا چڑھ گیا ہے بھاؤ؟"

"دو پیسے فی جھاڑو۔ اور بی بی جی ایک پیسہ سستا لانے کے لئے کہہ رہی تھیں۔"

"تم لے آؤ۔"

"صاحب- بی بی جی ...."

"بی بی جی سے نپٹ لیں گے۔"

ریسیور اٹھا کر میں سوئے بستر روانہ ہوا، لیکن قسمت بھی ساتھ ہی تھی- وہاں پہنچنے سے قبل ہی گھنٹی کی آواز نے پھر متوجہ کیا۔

"لیکن ہمارے تو منڈن ہو چکے۔"

"صاحب منڈن کی نہیں، دوسری بات ہے۔"

"فرمائیے۔"

"آپ کا گھر ہے نا۔۔۔"

"ابھی تک تو ہے۔"

"اس کے سرے پر ایک مکان ہے۔"

"صحیح تو تھا۔"

"اس سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر ایک پنواڑی کی دکان ہے۔"

"وہ بھی ہے۔"

"اس سے پانچ دکانیں چھوڑ کر بابو لال نائی کی دکان ہے۔"

"ارے یہ بات پہلے ہی کیوں نہ کہہ دی۔ اسے کون نہیں جانتا۔ وہ تو ہمارا اپنا نائی ہے۔" میں نے فخریہ انداز سے کہا۔

"صاحب اسے اشد ضروری سندیس دینا ہے۔"

"کہو۔"

"وہ یہ کہ پولیس کو اس کے جوا کھیلنے کے اڈے کا پتہ چل گیا ہے۔ دوسرے، جو عورت وہ بھگا کر لایا تھا اسے بانکے بہاری نے اپنے قبضے میں کر لیا ہے، تیسرے جو اس کے پاس ناجائز شراب۔۔۔"

"بس۔ بس۔ بس۔ میں سمجھ گیا۔ اسے ابھی اطلاع بھیج دیتا ہوں۔"

نیند نے اس قدر غلبہ ڈالا کہ ہوش نہ رہا۔ خواب میں گھنٹیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں ایک ایسے دیس میں پہنچ گیا ہوں جہاں گھنٹیاں ہی گھنٹیاں بجتی ہیں۔ ہر زن و مرد کے گلے میں گھنٹیاں بندھی ہیں۔ پرندے اور چوپائے گھنٹیاں لٹکائے پھرتے ہیں۔ جیسے خواب میں مجھے کوئی کہہ رہا ہے:

"گھنٹی بج رہی ہے۔"

"بج رہی ہے۔"

"ٹیلیفون کی گھنٹی ہے۔"

"صاحب! میں تلسی ہوں۔"

"ارے کیا ہے؟ جھاڑو لیا نہیں؟"

"صاحب۔ یہ دھن سنگھ بھی آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

"ہاں دھن سنگھ کہو، گڑ بڑی کی بات ہے؟"

"نہیں، صاحب! مجھے بھی بی بی جی نے تلسی کے ساتھ بازار بھیجا تھا۔ دو گھنٹے سے گھوم رہا ہوں۔ بھنڈی دو آنے سیر سے کم نہیں ملتی، بینگن کا بھاؤ دو پیسے سیر چڑھا ہوا ہے۔ توری کو تو جیسے آگ لگ گئی۔ پورے چھ پیسے کی آدھ سیر ہے اور کوئی سبزی فروش دھنیا اور مرچ مفت دینے کو تیار نہیں اور۔۔"

"تو پیسے دے کے لے لے۔"

"صاحب۔ بی بی جی ناراض ہوتی ہیں۔"

"تو بتلاؤ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

"صاحب۔ بی بی جی سے مل کر ان کی اجازت لے دیجئے۔"

"اس وقت تو سو رہی ہوں گی۔ تم ایسا کرو۔ جو بھاؤ ملے لے آؤ۔ باقی پیسے مجھ سے لے لینا۔"

"صاحب۔۔۔۔"

اور میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"کس سونے والی کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں؟"

شریمتی جی پوچھنے لگیں۔

"آپ ہی تو سو رہی تھیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔"

اور ابھی ابتدائے عشق ہے

ٹن۔۔۔ن۔۔۔ن۔۔۔ن

"ہیلو!"

"صاحب! میں ہوں۔۔۔"

"شبھ نام؟"

"کالی داس۔"

"شکنتلا کے مصنف۔"

"نہیں صاحب پرستی کا گھر والا اور نائی سماج کا اپ منتری۔"

آج کل دہلی

"ہاں ہے۔"
"بج رہی ہے۔"
"سائیکل کی ہوگی۔"
"شاید الارم ہے۔"
گھنٹی کیا ہے۔ مصیبت ہے۔"
"مصیبت کی گھنٹی؟"
نہیں ٹیلیفون کی۔"
"بتلایا کیوں نہیں؟" میں بڑبڑا کے اُٹھا۔
"ہیلو!"
"کہیے کیا حال ہے؟"
"پہلے سے زیادہ اچھا نہیں۔" میں نے کہا۔
مجھے پہچانا نہیں؟"
"پہچان لیا۔"
"بتلائیے کون ہوں؟"
"ستگر دلار سے گرت کما لی۔"
"اجی صاحب میں تو کرشن مراری گوٹہ کناری بزاز ہوں۔"
"میرا مطلب وہی تھا، کہیے۔"
"آپ کے پڑوس میں پروفیسر دیال ہیں نا۔"
"جی۔"
"اُن کی ماں ....."
"کیا کہا؟ .... منہ سنبھال کر بات کیجئے۔"
"ابھی تو رسیور سنبھالے ہوں۔ ہاں۔ ان کی ماں ہماری دوکان پر کپڑا لینے آئی ہیں۔"
"تب ہی۔ میں نے سمجھا .... تب دے دیجئے ..."
"ماں جی کے سوا پانچ آنے نالی میں گر گئے۔"
"بڑا افسوس ہے۔"
"جمعدار انھیں نکالنے کے پانچ پیسے مانگ رہا ہے۔ ذرا ان کی بہو سے اجازت لے دیجئے۔ یہ اونچی دکان ہے۔"
"اور پھیکا پکوان!" میرے منہ سے نکل گیا۔

"نہیں صاحب۔ اس وقت نہیں چلے گا۔ اجازت چاہیئے۔"
دیال صاحب کو جگایا گیا۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو جگایا۔ لڑکے نے بیوی کو۔ اجازت نامہ لے کر کرشن مراری گوٹہ کناری اونچی دکان والے کو بذریعہ ٹیلی فون بھجوایا گیا۔

تین سے چار بجے تک ٹیلی فون لڑکیوں کے لئے ریزرو رہتا۔
"ہیلو سریش۔ گڈ ڈے۔ اچھا گڈ آفٹر نون سہی ...... آئے کیوں نہیں؟ ..... تم بہت خراب ہو.... کل دو گھنٹے گاندھی بھون کے پیچھے لان میں تمھارا انتظار کرتی رہی ...... کہاں چلے گئے تھے؟ .... بھاڑ جھونکنے؟ .... دن کے وقت جھونکا کرو...... کیا کہا؟ پکچر دیکھنے؟ ...... کس کے ساتھ؟ ..... کیلاش؟ .... کون کیلاش؟ کیلاش وتی گماشتہ؟ ..... کیا کہا؟ کیلاش چندر ...... ہی ہی ہی ..... تب سہی ... پابندی؟ ہاسٹل میں؟ ..... کچھ بھی نہیں، سات سے سات تک کی آزادی ہے۔ ..... رات نہیں۔ دن کے .... یہی تو مزے ہیں...... میلہ ..... ہاں جناب ہاسٹل کے باہر میلہ لگا رہتا ہے ...... رشتہ دار ملنے آتے ہیں۔ نہ جانے نت نئے رشتے کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں ..... تو شام کو آؤ گے؟ ہاسٹل کے گیٹ پر...... ہاں، وہیں سے سیر کرنے چلیں گے.... ٹاٹا.....'

کبھی کبھی مسز پروفیسر دستور، سیکرٹری مجلس خواتین اپنی چیئرمین مسز ماجد سے بات کرنے آتیں۔
"ہیلو مسز ماجد..... ہاں ..... کل۔ کل کا پروگرام طے ہوا ہے ...... مینکا گاؤں میں.... بازار سے کھانے پینے کا سامان لے چلیں گے..... چکن سینڈوِش..... ہاں، پیرا ماؤنٹ سے لے لیں گے.... لیکچر! .... ہاں لکھوا لیا ہے .... میں نے ان سے کہا تھا.... انھوں نے اپنے ریسرچ اسکالر سے کہہ دیا تھا...... سب باتیں آگئی ہیں .... گاندھی جی .... ونوبا...... جے پرکاش .... گرنتھ .... چرخہ..... گرام اُدیوگ...... چینی حملہ ... پاکستان....

صادق ... عبداللہ ... ڈانگے کے خطوط کا ذکر نہیں ......
باقی سبھی باتوں کا ہے .... آپ دو تین بار پڑھ لیجئے گا
...... آج بھجوا دوں گی ...... ہار ؟ ...... خرید لئے ہیں۔
سیٹھ بلاقی رام کی بیوی آپ کے گلے میں ڈال دیں گی ......
پریس ؟ ..... وہ سب انتظام ہو گیا ہے ...... 'نیا پیسہ'
کا ایڈیٹر خود ساتھ جا رہا ہے .... پرانی دمڑی کے ایڈیٹر کو
مت منہ لگائیے۔ کمینہ ہے ...... نام بھی کیا ہے ......
جوہر کریدی ! ..... کمرہ مین بھی ہوگا۔ وہی نوجوان لڑکا .....
جمیل ..... وردیاں ؟ ...... ان کا انتظام ہو گیا ہے ....
جلسے کے بعد وردیاں واپس لے لیں گے۔ ان کی جگہ لڈو دیں گے
ہی نا ..... بچے وردی نہیں لڈو پسند کرتے ہیں ......
ہیں ؟ ..... آپ تو جانتی ہیں میری پسند ؟" آہ بھرتی ہیں
...... کون یہ پروفیسر لوگ ؟ یہ چندہ وندہ نہیں دیتے ..
..... ان کی بیویاں ؟ ...... ان سے بھی گئی گزری۔ سماج
سیوا کے کام کا مذاق اڑاتی ہیں۔ گھر کے کام ہی کو سماج مانتی
ہیں ...... یہ لوگ بھی بیویوں کو باہر جانے سے روکتے
ہیں ..... سنتے ہیں تو سن لیں۔ میرا کیا بگاڑ لیں گے ؟
...... آج کل کے زمانے میں بھی یہ لوگ نوکروں سے نہیں
بیویوں سے کام کراتے ہیں .... نوکر رکھ سکتے ہی نہیں۔
...... دھیرے ..... سن رہے ہیں ...."

"نہیں سن رہا۔" ..... میں نے ازراہ پروٹسٹ کہا۔

بسنت سنگھ صابن ساز کو بھی فون کی ضرورت پڑتی ہے۔

"ست سری اکال جی ۔ گورمیت امتحان میں نقل کرتا پکڑا گیا تھا۔ سپروائزر کو بھی مزہ چکھا دیا ہے ...... اور ..... سب ٹھیک کرا لیا ہے ...... آپ نے کہا تھا پرچوں کا پتہ کریں گے .... کر لیا ؟ .... کہاں ...... ؟ رانچی ...... کوئی بات نہیں ...... اپنا ہوٹل ہے وہاں ...... کل ہی سنتوکھ سنگھ کو وہاں بھیجتا ہوں .... بلا ٹکٹ سفر کرنے میں وہ ماہر ہے .... سب ٹھیک ہو جائے گا ...."

یونیورسٹی کے طلبا تک بھی ٹیلی فون لگنے کی بات پہنچ چکی ہے۔ یہاں سے اپنے ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنا انھیں آسان معلوم دے رہا ہے۔ رنبیر سنگھ چہرے پر ایک مخصوص مسکراہٹ لے کر ٹیلی فون کرنے کی اجازت مانگتے ہیں۔

"سنتوش ہے .... ہیلو .... سنتوش سے بات کروں گا ...... رنبیر سنگھ .... سیکرٹری سٹوڈنٹ یونین ..
...... کون سنتوش ... ؟ تم ہو نا ؟ ..... کوڈورڈ ....
رائگل ..... ٹھیک .... سُن لی نیو ڈیولپمنٹ ... ؟
کیا کہا ؟ نہیں سنی ؟ ..... پروفیسر عطا نے دو لڑکوں
کا داخلہ روک لیا ...... ہا۔ ہا۔ ہا ..... لو آپ اپنے دام
میں صیاد آگیا ...... رات کو میٹنگ ہے .... سٹرائیک
کا ریزولیوشن پاس کرنا ہے ..... پولیس کو اطلاع کر دی
ہے۔ کل نعرے تم لگاؤ گے ..... شیشے رشی توڑے گا ...
..... بھوک ہڑتال کا اعلان راجیش کرے گا .... دیال سنگھ
نعرے لگانے میں تمھاری مدد کرے گا ..... 'ہاسٹل کی فیس
کم کرو' ..... 'ہاؤس ایگزامینیشن بند کرو' ....
'تعطیلات کی تعداد بڑھاؤ' ...... 'نتیجے کی کمیٹی میں لڑکوں
کے چنے ہوئے نمائندے رکھو' ...... اور ہر نعرے کے
بعد 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ ضرور ہوگا ......"

نئی پود کے کوی بھی دوسروں سے کیوں پیچھے رہیں۔ وہ 'نئی پود' ششماہی کے ایڈیٹر متری گجانند سے آدھ گھنٹہ تک بات کرتے ہیں۔ لب لباب کچھ یوں ہوتا ہے ......

'صاحب ! 'نئی پود' کے تازہ شمارے میں سنگر کی کہانی چھاپ دی۔ ساتھ ہی جگدیش راہی کی نظم چھاپ دی۔ فیصلہ تو یہ ہوا تھا کہ کسی پرانے لیکھک کی کوئی چیز نہیں چھپے گی۔ اگر گٹ بندی کے ریزولیوشن پر سختی سے عمل نہیں ہوگا تو ہماری تحریک ختم ہو جائے گی۔ دوسرے یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ہر شمارے میں دو پرانے لیکھکوں کی دھجیاں اڑائی جائیں گی۔ تیسرے یہ کہ

نئے کویوں میں سے دو کے بارے میں تعریفی مضامین لکھے جائیں گے۔ میں نے اپنے اوپر خود ہی مضمون لکھ کر 'بیکل' کے نام سے بھجوایا تھا۔ وہ چھپا نہیں .... آخر یوں کام کیسے چلے گا ...... وغیرہ وغیرہ۔

دھن سنگھ چپڑاسی رن سنگھ چپڑاسی سے قسمت کا شکوہ کرتا ہے۔ "رام اوتار چپڑاسی دیوان کرشن کمار کے تلوؤں کی دو گھنٹے مالش کرتا تھا۔ جاتے وقت اسے کلرک بنا گئے۔ اس وقت وہ بھتے سمیت دو سو چالوسے روپے سوا نو آنے پا رہا ہے۔ مجھے نئے صاحب کے تلوے 'جھستے' ہوئے دو سال ہو گئے اور دو روپیہ ترقی بھی نہیں ہوئی ...."

ٹیلی فون لگوانے کے بہت فائدے ہیں۔ گھر والوں کے اندر سماج سیوا اور محلہ سیوا کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ دن کے وقت سونے کی بری عادت سے محفوظ رہتے ہیں۔ چستی ان کے اندر خوب بھر جاتی ہے۔ گھنٹی بجتے ہی محلے والوں کو مطلع کرنے بھاگتے ہیں تو اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔ ورزش ہونے سے بھوک تیز ہو جاتی ہے۔ بھوک لگنے سے صحت اچھی ہو سکتی ہے، لیکن ظالم مہنگائی راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔

لیجئے پھر گھنٹی بجی۔

"آپ کو تکلیف ضرور ہوگی، لیکن گوڑا مل جی سے کہہ دیجئے کہ فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان کی ساس کے بچنے کی اب کوئی امید نہیں۔ وید جی کی دوائی کے کارگر ہونے کی وجہ سے کل ان کی تشویش بڑھ گئی تھی۔ آج وید بدل دیا گیا ہے ...."

کھانے کی میز پر سب کھانے میں مشغول ہیں۔ کانوں کے پردے چیرتی ہوئی گھنٹی کی آواز ماحول کا سکون توڑ رہی ہے۔ کوئی سننے کو تیار نہیں۔ بحث اس بات پر ہے کہ یہ فون نہیں سائیکل کی گھنٹی ہے۔ پرمود کنہیا لال کپور کی شاعری کی مدح سرائی کرتا ہوا کہتا ہے

فون پھر آیا دلِ زار نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگی، کہیں اور چلی جائے گی

راجو کہتا ہے ہوگی نہیں، ہوگا۔ جائے گی نہیں، جائے گا۔ اس پر بحث چل نکلتی ہے۔ دجے کے قول کے مطابق پنجاب میں مذکر ہو کر سائیکل یہاں کی سرحد پار کر کے مؤنث کیوں بن جاتا ہے۔ بحث کا گھنٹی کی آواز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مجھے اٹھنا ہوتا ہے۔

"ٹوٹو۔ ٹوبھی۔ ٹوفو؟"

"ہاں۔ ہاں، میں ٹوٹو۔ ٹوبھری، ٹو فور سے بول رہا ہوں۔"

"تاؤ جی! میں ہوں بلنکے کی لڑکی مزاجو۔ دادی سے کہنا کہ وید جی نے جلیبی کھانے سے منع کر دیا ہے۔ کہتے ہیں بلغم کرتی ہے ماں سے کہہ دینا۔ میں اپنی سہیلی میتو کے گھر کھیلنے جا رہی ہوں۔ شام کو لوٹوں گی۔"

"کل ہی لوٹنا۔" میں ریسیور رکھتے ہوئے کہتا ہوں۔

"یہ موا ٹیلی فون بھی ایک مصیبت ہے۔" کھانے کی میز پر سے آواز آتی ہے۔

"موا ٹیلی فون یا بسیا کھی رام؟"

ٹن - ن - ن - ن - ن

بسیا کھی رام اپنے گھر سے بول رہے تھے۔

"میں نے کہا تھا نا کہ ٹیلی فون کے بہت فائدے ہیں۔"

"لیکن بل ان سے بھی بڑا ہے؟" میں نے کہا۔

"کتنا؟"

"تین سو پینتالیس۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔"

"محلے والے ٹرنک کال کرتے رہے، اب کوئی حساب نہیں بھرتا۔"

"ارے بھائی! چھوڑو ان باتوں کو۔ دان کرو۔ دان کرنے سے دھن کبھی نہیں گھٹتا۔"

"دل؟"

"دلِ ناداں ....."

میں ریسیور رکھ دیتا ہوں۔ گھنٹی بجنے پر بھی اسے نہیں اٹھاتا۔ ضرور بسیا کھی رام ہوں گے۔ ڈر اس بات کا ہے۔ کوئی

اور مشورہ نہ دے دیں۔

ان کے ایک مشورہ سے ہی زندگی کی رونق دو بالا ہو گئی ہے۔ زندگی میں گھنٹی نے کتنی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ الارم کی گھنٹی بجتی ہے تو ٹیلی فون کی گھنٹی معلوم دیتی ہے۔ کال بیل بھی ویسے ہی لگتی ہے۔ دودھ والا یا اخبار والا گھنٹی بجاتا ہے تو ریسیور اٹھانا پڑتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ چاروں طرف گھنٹیاں ہی گھنٹیاں ہیں۔ اندر گھنٹیاں ہیں باہر گھنٹیاں ہیں۔ زندگی ایک گھنٹی ہے لمبی اور نہ ختم ہونے والی، یہ سدا ہی بجتی رہے گی جب تک.... .... جب تک ٹیلیفون ہے .... بیساکھی رام ہے.... اس کا مشورہ ہے......

آج کل اردو کا جواہر لال نہرو نمبر

ماہ نومبر ۱۹۶۴ء کا شمارہ 'جواہر لال نہرو نمبر' ہوگا

صفحات ۷۲ ۔ آرٹ پیپر پر تصاویر کے ۸ صفحے اس کے علاوہ ۔ قیمت ایک روپیہ

جواہر لال نہرو سے متعلق مقتدر ہستیوں اور ادیبوں کے مضامین، موصوف کی زندگی کے اہم واقعات، اکابر عالم کا ان کی وفات پر خراج تحسین اور خود ان کے ارشادات و اقوال اور ان کی تحریروں کے اقتباسات۔ شعراء کا خراج عقیدت اس شمارے میں شامل ہوں گے

ہمارے خاص نمبروں کی بعد میں بہت مانگ ہوتی ہے جسے ہم پورا کرنے سے قاصر رہتے ہیں لہٰذا ایجنٹ حضرات اپنی زائد ضروریات سے بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی کو مطلع کریں

دلیش چترکار

یہ رشتے یہ ناتے

پہلی تاریخ۔!

آج مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ متوسط درجے کے لوگوں، سرکاری دفاتر کے ملازموں بلکہ ملک کی آبادی کے بیشتر حصہ کے لوگوں کے لیے ہر مہینے یہ دن ان کی زندگی میں کچھ دیر کے لیے تازگی بھر دیتا ہے۔ اگرچہ یہ خوشی یہ مسرت، اس کے لیے چند دنوں کی مہمان بن کر آتی ہے۔ کیونکہ گاڑھے پسینے کی کمائی گھر پہنچتے ہی گھر کے اخراجات میں اس طرح منقسم ہو جاتی ہے کہ اکثر کمانے والے کو آہٹ تک نہیں ہوتی کہ تنخواہ کب آئی اور کب ہوا ہو گئی۔

جیوتی بھی جب آج صبح نیند سے بیدار ہوئی تو اسے یہ خیال کہ آج پہلی تاریخ ہے، ہوا کے ایک خوش گوار جھونکے کی طرح اس کے جسم کو جھنجھوڑ سا گیا۔ وہ کوئی نوکری نہ کرتی تھی اور نہ ہی اس کا کوئی ایسا نزدیکی رشتہ دار تھا جس سے کچھ ماہانہ پانے کی امید ہو سکتی تھی۔ قدرت نے نہ جانے اس سے کب کا بدلہ لیا تھا کہ بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ غریب ماں باپ کی چوتھی لڑکی کا فقط ایک سہارا اس کا خاوند ہی تھا جس کی یاد اب اس کے لیے دماغِ ماضی کا ایک کرب ناک خواب بن کر رہ گیا تھا۔

اپنے مرحوم خاوند کی یاد آتے ہی اکثر اس کی خزاں رسیدہ زندگی میں چند لمحات کے لیے موسمِ بہار کی سی تازگی آ جاتی۔ کتنی اچھی صحت اور فراخ دلانہ طبیعت پائی تھی دیپک نے! کندن سا رنگ ایسا کہ یورپین لوگوں کی رنگت بھی شرما جائے، اور جسم کے ہر عضو کی بناوٹ ایسی کہ جو بھی دیکھے رشک کرنے لگے۔ اور جس دن وہ اسے بیاہ کر لایا تھا تو دنیا دنگ رہ گئی تھی، جیوتی کی خوش قسمتی پر! ہر کسی کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ اگر قسمت ہو تو جیوتی جیسی، جسے دیپک جیسا خاوند نصیب ہوا ہے۔ معقول تنخواہ، با مذاق طبیعت اور برتاؤ میں ایسی جاذبیت کہ جس کسی سے سامنا ہو، وہ اسی کا ہو کر رہ جائے۔

لیکن جیوتی کی زندگی کا یہ سنہرا دور دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔ ایک دن دیپک سکوٹر پر دفتر کے لیے ایسا نکلا کہ جب شام کو دفتر سے اس کے واپس آنے کا وقت ہوا، تو جس دیپک کو لوگ گھر پہنچانے آئے وہ دیپک پہلے جیسا دیپک نہ تھا۔ گھر لوٹتے ہوئے ایک شدید حادثے نے دیپک کے جیون دیپک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھا دیا تھا۔

اور اس جہانِ فانی سے دیپک کیا اٹھ گیا، جیوتی کی زندگی اندھیر ہو گئی۔ اس گھور اندھیرے میں اگر جیوتی کے لیے روشنی کی کوئی کرن باقی تھی، تو وہ تھی دیپک کی فقط ایک نشانی — کم سن پتو، جسے جیوتی آج بھی کسی غریب کی پونجی کی طرح سینے سے لگائے ہوئے تھی۔

جیوتی کی بدبختی کی انتہا ہی نہ تھی۔ سسرال والوں نے اس بیچاری پر منحوس ہونے کی تہمت لگا کر اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ دیپک کے والدین کے ذہن میں یہ بات ایک زہر بن کر سما گئی تھی کہ وہ جیوتی کو کیا بیاہ کر لائے ہیں، کہیں سے کسی چڑیل کو پکڑ لائے ہیں۔ ڈائن آتے ہی ان کے ہونہار لڑکے کو نگل گئی!

دیپک کی موت کے بعد جب جیوتی دنیا میں بالکل اکیلی اور بے یار و مددگار رہ گئی تبھی سے وہ اسی گلی میں کرایہ کے پرانے مکان

میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہ رہی تھی، چپ چاپ، دنیا کے شور و ہنگامے سے الگ، اگر کوئی سہارا تھا تو وہ تھا فقط نیلی چھت والے کا اور اس کی بھیجی ہوئی غیبی امداد کا۔ نہ جانے کون سخی یا داتا ایسا تھا جو کہ بڑے کمرے کی گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس رکھی ہوئی میز کی دراز میں ہر ماہ پہلی تاریخ کو ایک لفافے میں بند اڑھائی سو روپے کے کرنسی نوٹ نہایت ہی پُر اسرار ڈھنگ سے رکھ جاتا تھا۔ یہ عمل بلاناغہ پچھلے پانچ برس سے جاری تھا۔ اور یہی تھی اس کی ماہانہ آمدنی جس پر دونوں ماں بیٹے کی بسر اوقات کا انحصار تھا۔

نہ معلوم کتنی ہی بار جیوتی کے دل میں یہ تجسس پیدا ہوتا کہ جیسے بھی ہو، وہ اپنے اس محسن کا پتہ لگائے اور یہ بات وہ ناممکن بھی نہیں سمجھتی تھی، لیکن پھر جانے کیوں، وہ اس بات کو راز ہی رہنے دینے کے لیے اپنے دل کو رضامند کر لیتی اور من ہی من میں اپنے محسن کے قدموں پر عقیدت کے چند پھول چڑھا کر مطمئن ہو جاتی۔ اسے اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں اپنے محسن سے سامنا ہونے پر وہ اپنی بے بسی کے خلاف بغاوت کر دینے پر آمادہ نہ ہو جائے اور محسن کے پاک جذبات کا شیشہ چکنا چور نہ ہو جائے۔ آخر کوئی بات ایسی ہے، کوئی ایسا راز ہے جس کے زیر اثر وہ فرشتہ سیرت انسان اپنے آپ کو چھپا کر بھی ان ماں بیٹے کی جیون ڈور کو سنبھالے ہوئے ہے۔

انھیں خیالات میں ڈوبی ہوئی وہ آج پھر اس بڑے کمرے میں پہونچ گئی۔ مشین کے پرزے کی طرح خود بخود اس کے ہاتھوں نے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس بڑی میز کے دراز کو کھولا۔ حسب معمول سامنے پڑے قدرے وزنی لفافے کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ آج پہلی تاریخ تھی اور اڑھائی سو روپے کی رقم اس لفافے میں آج بھی موجود تھی۔

جیوتی نے لفافے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ خود بخود اس کی آنکھیں بند ہو گئیں، اپنے محسن کے تئیں۔ چاہے وہ کوئی بھی تھا ——
شکر گزاری کے بوجھ سے بوجھل اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے بہہ نکلے۔

جیوتی پر یہ کیفیت نہ جانے کتنی دیر تک طاری رہی کہ اچانک باہر کھڑکی کے پاس کھڑے ننھے پپو کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"ممی! —— ممی!!" بچے کی آواز میں استعجاب آمیز سرگوشی تھی۔

"دیکھو تو رامو دادا کے مکان کے سامنے بہت سے لوگ کھڑے کچھ باتیں کر رہے ہیں۔"

اور جیسے ہی جیوتی نے کھڑکی کی سلاخوں کے پیچھے سے جھانک کر گلی کی نکڑ کی طرف دیکھا تو سچ مچ رامو دادا کے مکان کے سامنے بھیڑ لگی تھی۔ پھر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ سامنے گلی میں کھڑے دو چار پڑوسی کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ اور جیوتی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ ان میں سے لگ بھگ سبھی کی نگاہیں اس کے مکان کی جانب اُٹھ کر رامو دادا کے مکان پر جا رکتی ہیں۔ اور جب اس نے اُن کے درمیان ہونے والی گفتگو کی طرف دھیان دیا تو کچھ اس طرح کے الفاظ سنائی دئے۔

"واقعی ہم اسے سچی انسانی ہمدردی یا ایک انوکھے قسم کا اُنس کہہ سکتے ہیں۔"

"اجی صاحب! کون جانتا تھا کہ دین و دنیا سے بالکل الگ رہنے والے اس بزرگ کے دل میں ایک عظیم جذبۂ ایثار پرورش پا رہا ہے!"

عین اسی وقت جیوتی کو اس کا استعجاب اپنی محفوظ حدود کو پار کرتا ہوا محسوس ہوا جبکہ اس نے دیکھا کہ رامو دادا کے مکان کے سامنے کھڑے لوگوں کے ہجوم کا بیشتر حصہ خود اسی کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے اس نے یہ بھی دیکھا کہ ہجوم کی پیش قدمی ایک تھانیدار کر رہا ہے۔

کچھ ہی منٹوں کے بعد وہ ہجوم جیوتی کے مکان کے دروازے پر کھڑا تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہی دروازے پر ایک ہلکی سی دستک ہوئی۔ جیوتی نے دروازہ کھولا تو سامنے تھانیدار کو دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے!

"معاف کیجئے گا محترمہ!" تھانے دار نے نہایت ہی مؤدبانہ انداز سے کہا۔ "ہم آپ کے لیے ایک نہایت ہی منحوس خبر لے کر آئے ہیں۔"

جیوتی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ دہشت کے مارے زبان گنگ ہو چکی تھی۔

"کیا آپ گلی کے نکڑ پر رہنے والے رامو دادا کو جانتی ہیں؟"

تھانیدار نے پوچھا۔

"گھبراؤ نہیں، جیوتی بہن!" تب اچانک ہی ایک پڑوسی نے آگے بڑھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں....."

اس پڑوسی کے الفاظ نے جیسے جیوتی کی ہمت بڑھا دی۔ بولی — "جی، جی .... نہیں تو ...."

"عجیب بات ہے!" تھانیدار بولا۔

"ہاں، ہاں، تھانیدار صاحب!" ایک دوسرے پڑوسی نے کہا۔ "ہم نے مرحوم رامو دادا کو محلے میں کبھی کسی سے بات تک کرتے نہیں دیکھا۔"

اور اس کے ساتھ ہی سامنے کھڑے دوسرے سبھی پڑوسیوں نے گردن ہلا ہلا کر اس بات کی تائید کر دی۔

اور جیسے ہی جیوتی نے رامو دادا کے نام کے ساتھ لفظ 'مرحوم' کو سُنا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ لیکن نہ جانے کیوں، شاید اس کی معصومیت نے اُسے اور زیادہ دلیر بنا دیا تھا، وہ دوسرے لمحہ ہی سنبھل گئی اور پیشتر اس کے کہ تھانیدار کچھ کہتا، وہ اپنے آپ پر پوری طرح قابو پا چکی تھی۔

"آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ رامو دادا آج صبح اپنے مکان میں مردہ پائے گیے۔" تھانے دار نے اپنی آمد کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ان کی جیب اور لکھنے کی میز سے ہم نے دو خط برآمد کیے ہیں۔ ایک خط سے ان کی موت قدرتی واقع ہوئی ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنی موت کی آمد کی شاید پہلے سے ہی اطلاع ہو چکی تھی۔ اور اسی خط میں رامو دادا نے اپنی تمام جائیداد آپ کے نام کر دینے کی وصیت کی ہے اور آخر میں ایک دوسرے خط کو، جو آپ کے نام ہے اُسے آپ تک پہنچا دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ لیجئے۔"

جیوتی نے جھجکتے اور کانپتے ہاتھوں سے لفافہ لے لیا۔ پھر، جی نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سبھی کی موجودگی میں لفافہ چاک کر دیا۔ پڑھا تو لکھا تھا ——

"پیاری بہن، جیوتی!

کتنی عجیب بات ہے کہ ایک عرصہ سے تمہارے ساتھ اپنے جس رشتے کا اظہار کرنے سے گریز کرتا رہا ہوں، ایسا کرنے کی آج میں اس وقت جسارت کر رہا ہوں جبکہ اس جہانِ فانی سے کوچ کرنے کو تیار بیٹھا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس وقت میرا یہ خط تمہارے ہاتھوں میں ہوگا، میری روح اس قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہوگی —!

بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے، اور وہ اس لیے کہ جب سے میں نے یہاں سکونت اختیار کی تھی، لوگوں سے الگ تھلگ ہی رہا۔ میرے جیسے بظاہر ہر لحاظ سے پُر قناعت زندگی بسر کرنے والے انسان کا دل ہمیشہ بدنصیبی کی آگ میں جلتا رہا۔ ایک اچھے گھرانے کے چشم و چراغ کو سب سے پہلے جس صدمے کا سامنا کرنا پڑا، وہ تھا زندگی میں جوانی کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی ماں باپ کا سایہ اُٹھ جانا! اب میری دنیا فقط اپنی چھوٹی بہن شاردا تک ہی محدود رہ گئی۔ شاردا، جو عمر میں مجھ سے کافی چھوٹی تھی اور جانے کیوں مجھے جان سے بھی عزیز تھی۔ انہیں دنوں میری زندگی کو ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ میں دل کے دورے کی نامراد مرض کے چنگل میں پھنس گیا۔ بہترا علاج کرنے کے باوجود بھی اس موذی مرض نے میرا دامن نہ چھوڑا۔ یہ صدمہ میرے لیے پہلے صدمہ سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ مجھے یہ خدشہ ستانے لگا کہ اس مرض کے ہاتھوں اگر میرا چراغِ زندگی کہیں وقت سے پہلے بجھ گیا تو میرے بعد میری بہن شاردا کا کیا ہوگا؟ اس امکانی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے میں اپنی صحت کے بارے میں نہایت محتاط رہنے لگا۔ یہاں تک کہ میں نے اس وقت تک ازدواجی زندگی کو نہ اپنانے کی قسم کھالی جب تک کہ شاردا کے ہاتھ پیلے نہ کر لوں اور اُسے سکھی سکھی اپنا گھر بساتے نہ دیکھ لوں۔ لیکن قدرت کو شاید یہ سب کچھ منظور نہ تھا۔

ایک دن میری تمام تر کوششوں کے باوجود اس بدبخت بھائی کے ہاتھوں سے بے رحم موت اس کی جان سے بھی پیاری بہن کو چھین لے گئی۔ میری جذباتی زندگی پر یہ سب سے زیادہ کاری چوٹ تھی۔ میری تاریک زندگی میں فقط روشنی کی ایک کرن تھی جو بجھ گئی، ایک تمنا تھی جو مٹ گئی، ایک آرزو تھی جو ختم ہو گئی۔ انھیں صدموں سے بیزار

میں وہ شہر چھوڑ کر یہاں چلا آیا — مایوس، غم زدہ اور خود زندگی سے بے زار!

پھر ایک دن اچانک نہ جانے کہاں سے ایک بار پھر میری تاریک زندگی میں امید کی کرن پھوٹ نکلی مجھے یوں لگا جیسے دیپک تمھیں بیاہ کر کیا لایا ہو، میری بہن شاردا کو دوبارہ زندگی مل گئی ہو۔ وہی ناک نقشہ، وہی رنگ روپ، وہی قدوقامت، وہی چال ڈھال اور وہی جسم کی بناوٹ۔ غرضیکہ تمھیں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے شاردا پھر سے زندہ ہو گئی ہو، جیسے مجھے پھر سے زندگی کا مقصد مل گیا ہو — تمھاری صورت میں مجھے شاردا کی صورت نظر آئی، تمھاری سیرت میں مجھے شاردا کی سیرت نظر آئی۔ یا یوں کہو کہ دنیا کے لیے جہاں تم جیوتی تھیں میرے لیے میری ننھی بہن شاردا ہی تو تھیں۔ میری کھوئی ہوئی مسرت مجھے پھر سے مل گئی۔

لیکن جیسا کہ میرے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ میری یہ خوشی، یہ مسرت بھی دیرپا ثابت نہ ہوئی — دیپک کی اچانک موت نے میرے دل پر جو اثر کیا، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ کیونکہ فطری طور پر اگر دنیا میں مجھے کسی سے اُنس رہا ہے تو وہ تھی میری چھوٹی بہن شاردا — اور شاردا کا عکس پھر تم! مجھے دنیا میں سب سے مقدس چیز کی قسم، اگر اس دن موت کا فرشتہ دیپک کے بدلے مجھے اس دنیا سے لے جانے کو کہتا تو میں بخوشی اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتا۔ کیونکہ مجھے اپنی چھوٹی بہن کا دکھ کسی بھی اور کسی حالت میں بھی قابلِ برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔

دیپک کی موت کے بعد میں نے تمھارے رشتہ داروں کے ناروا سلوک اور تمھاری — نہیں، نہیں، اپنی چھوٹی بہن کی اقتصادی حالت کا بڑے قریب سے جائزہ لیا اور تبھی سے تمھارے لیے اڑھائی سو روپے ماہانہ کی مدد دینا میرا ایک مقدس فرض بن گیا۔ یہ فرض میں نے کس طرح پورا کیا یہ ایک راز ہے جو میرے سینے میں محفوظ ہے اور اسے اپنے سینے میں چھپا کر لے جاؤں گا۔ دنیا مجھے تمھارا محسن تصور کرے یہ مجھے کسی حالت میں بھی منظور نہیں تھا۔ میرے لیے یہ کیفیت بھی ناقابلِ برداشت ہوتی کہ تم خود مجھے اپنا محسن خیال کرو۔ اس کے علاوہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم دونوں بہن بھائی ایک چھت کے نیچے رہیں اور میری دل کی دیرینہ بیماری تمھارے لیے پریشانی کا باعث بنے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ میری خواہشات اور میرے تمام تر اصول اب زیادہ تر میرا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہے۔ اب عمر اور بیماری کا مجھ سے ہر دم یہی تقاضا رہتا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے زندگی کے سفر کو جلد از جلد ختم کر دوں۔ مجھے اپنا انت اب صاف اور قریب نظر آ رہا ہے —! اسی لیے چاہتا ہوں کہ تم پر جن امور کا اظہار جیتے جی نہ کر سکا، انھیں موت کے بعد اس خط کے ذریعے سے واضح کر دوں۔ پیشتر اس کے کہ موت کے آہنی پنجے مجھے آکر دبوچ لیں، میں نے اپنی تمام تر جائداد اور جو کچھ بھی میری ملکیت میں شامل ہے، اسے میں نے ایک وصیت کے ذریعہ اپنی چھوٹی بہن شاردا — نہیں نہیں، جیوتی کو ایک حقیر تحفہ کے روپ میں ارپن کر دیا ہے۔ اس وقف سے متعلق تمام قانونی دستاویزات میرے وکیل کے پاس محفوظ ہیں۔ میری موت کی خبر پاتے ہی وہ تمام قانونی کارروائی مکمل کر دے گا۔ اس کام کے لیے اسے خاطر خواہ رقم بطور فیس پیشگی ادا کی جا چکی ہے۔

اب اجازت دو، بہن! موت کا فرشتہ مجھے اس آخری تحریر کو ختم کر دینے کے لیے مجبور کر رہا ہے۔ موت کی آخری گھڑی میں بھی میرے منہ سے بہن اور اس کے ننھے بچے کی درازیٔ عمر کے لیے دعائیں نکل رہی ہیں۔ بھگوان کرے، تم دونوں خوش و خرم رہو!

تمھارا بدنصیب بھائی
ہری رام"

خط پڑھ لینے کے بعد جیسے ہی جیوتی نے اپنی آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں اوپر اٹھائیں تو دیکھا سامنے تھانیدار کے ہمراہ پڑوسیوں کا ہجوم بالکل ساکت کھڑا ہے۔

عین اسی وقت ہجوم میں سے کسی کی دھیمی آواز سنائی دی — "میری رائے میں مرحوم کے انتم سنسکار میں اب زیادہ تاخیر نہیں ہونی چاہیئے۔"

"جی، میرا بھی یہی خیال ہے —" اس سے آگے جیوتی کچھ نہ بول سکی۔ اس کے الفاظ شدتِ غم اور آنسوؤں کی طغیانی میں ڈوب کر رہ گئے۔

نئی کتابیں اور رسالے

میری حدیثِ عمرِ گریزاں

پنڈت آنند نرائن مُلا کا یہ تیسرا مجموعۂ کلام نہایت آب و تاب سے چھپا ہے۔ قیمت دس روپے پچاس پیسے علاوہ محصول ڈاک۔ یہ کتاب مصنف سے ۲ چاندنا بازار گیٹ لکھنؤ کے پتے سے مل سکتی ہے۔ کتاب بڑی تقطیع کے ۳۰۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔ کاغذ، کتابت جلد، جلد پوش نہایت عمدہ۔ اس کتاب میں مُلا کے پہلے دو مجموعوں 'جوئے شیر' اور 'کچھ ذرّے کچھ تارے' کا انتخاب درج ہے۔ اور آخر میں تازہ کلام۔ مُلا انسانیت دوست شاعر ہیں اور ان کی یہ انسانیت دوستی اُن کی شاعری میں آوازِ حق بن کر گونجتی ہے۔ انھوں نے نئی اور پرانی قدروں کو اپنی شاعری میں سمویا ہے اور اسے اپنے نیک کردار اور حسنِ عمل کا آئینہ بنایا ہے۔ وہ ۱۹۶۱ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کی جج سے ریٹائر ہوئے۔ 'ایوانِ عدالت سے رخصت ہوتے' غالباً اسی وقت کی یادگار ہے

یہ ہمتِ مردانہ پھر آئے کہ نہ آئے
مجھ سا کوئی پروانہ پھر آئے کہ نہ آئے

طاقت کی رعونت کے مقابل بہ لبِ عدل
یوں حرفِ حریفانہ پھر آئے کہ نہ آئے

ساقی سے سوا تشنہ لبوں سے تھا جسے انس
محفل میں وہ پیمانہ پھر آئے کہ نہ آئے

مُلا کی شاعری بقول آلِ احمد سرور کسی ازم کی قائل نہیں البتہ وہ ہیومن ازم کے پرستار ہیں اور جمہوریت پر ان کا ایمان ہے۔

احتشام حسین نے لکھا ہے "مُلا کے صاف اور شفاف اور ذکی الحس ذہن اور انسانی دکھ درد کے تصور سے خون ہو جانے والے دل، دونوں نے مل کر ایک مخصوص شاعرانہ انداز سے زندگی کو فن کی گرفت میں لیا ہے۔"

یہ مجموعۂ سخن اردو کی ان نادر کتابوں میں سے ہے جو عہدِ نو کی تخلیقات میں اولیت کا درجہ رکھتی ہیں۔

سفینۂ خوش گو

دفترِ ثالث بندرابن داس خوش گو کا یہ تذکرہ شعرائے فارسی سید شاہ محمد عطا الرحمٰن عطا کاکوی نے ایڈٹ کیا ہے اور یہ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ سے شائع ہوا ہے۔ یہ کتاب بڑی تقطیع کے ۴۰۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد ۵ روپے۔ غیر مجلد ۴ روپے ۷۵ پیسے۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ خوش گو کا یہ تذکرہ تحقیق کرنے والوں کے لئے بہت مفید ہے۔ بہت اچھا ہوا کہ یہ شائع ہو گیا۔

ترکی/عراق

یہ دو کتابیں ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے شائع ہوئی ہیں۔ پہلی کتاب کے مصنف اکمل ایوبی اور دوسری کے محمود الحق ہیں۔ پہلی کتاب کی ضخامت ۴۴۳ صفحے اور دوسری کی ۲۰۶ صفحے۔ کتابیں ٹائپ میں نہایت صاف چھپی ہیں۔

دونوں ملکوں کی تاریخی، جغرافیائی اور سیاسی صورت حال کے باب میں پوری واقفیت ان کتابوں سے ملتی ہے۔ قیمت درج نہیں۔

مطلع وطن (حصہ اول)

سید علی مہدی رضوی ایڈوکیٹ بلرام پور نے ہندوستان کی تاریخ کو نظم میں لکھا ہے۔ یہ کتاب اس کا پہلا حصہ ہے اور مسلمانوں کے دورِ حکومت سے پہلے کی تاریخ کو منظوم کیا گیا ہے۔ رضوی صاحب کے کلام میں زور اور روانی ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب جلد مکمل ہوگی اور منظوم تاریخوں میں ایک اچھا مقام حاصل کرے گی۔

آپ سے ملئے

مصنف علی جواد زیدی۔ ناشر مکتبہ شاہراہ دہلی۔ ضخامت ۱۷۶ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ قیمت تین روپے۔ کتابت طباعت اوسط۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پوش کی حامل۔ اس کتاب میں زیدی صاحب کے لکھے ہوئے ۱۳ تصوراتی مضمون یا ادبی خاکے شامل ہیں۔ یہ خاکے بڑے دل چسپ ہیں اور زیدی صاحب کے بھرپور مشاہدے پر دال۔ جوش ملیح آبادی، اقبال سہیل اور جگر مراد آبادی کے خاکے بہت دل چسپ ہیں۔ زیدی نے اپنے ہر موضوع سے انصاف کیا ہے۔ وہ اپنے ہر موضوع سے اچھی طرح شناسا ہیں اور ان کے عادات و اقوال، ان کے کردار اور ان کے فن سے واقف ہیں۔

جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری

مرتبہ حمیدہ سلطان۔ ناشر مکتبہ شاہراہ دہلی۔ قیمت دو روپے۔ ضخامت ۲۷۲ صفحے۔ کتابت طباعت اوسط۔ آزاد کی شاعری پر اب تک جن لوگوں نے مضامین لکھے۔ وہ سب اس کتاب میں جمع ہو گئے ہیں۔

الف

رئیس امروہوی کے کلام کا مجموعہ۔ کتابت طباعت جلد عمدہ۔ قیمت پانچ روپے۔ ناشر ادارۂ ذہنِ جدید مانک جی اسٹریٹ گارڈن ایسٹ کراچی۔

رئیس امروہوی ہر رنگ میں کہنے والے ایک پُرگو شاعر ہیں۔ وہ غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی۔ طنز و مزاح پر بھی انھیں قدرت ہے۔

جگر کی غزلیہ شاعری

مصنف اشفاق علی خاں۔ ناشر مجلس ادب و ثقافت علی گڑھ۔ ملنے کا پتہ۔ اشفاق منزل بازید خیل شاہجہان پور۔ یہ کتاب جگر کی شاعری پر ایک تنقید ہے جس میں زیادہ تر ان کے کلام کے نقائص بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب دل چسپ ہے اور پڑھنے کے قابل۔ ضخامت ۳۰۴ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ کاغذ کتابت طباعت، جلد گوارا۔ کتاب جلد پوش کی حامل ہے۔

زمزمہ

جناب صفدر آہ کی رباعیوں کا مجموعہ۔ قیمت دو روپے۔ ناشر پنچ جھون پبلیکیشنز جہانگیر آباد۔ بھوپال۔ ملنے کا پتہ۔ کتابستان محمد علی روڈ بمبئی ۳۔

جناب صفدر آہ بڑے مشاق سخن سنج ہیں۔ ان کی رباعیوں میں ان کے فن کی پختگی اور فکر کی بلندی دونوں شامل ہیں۔ مزاج فلسفیانہ ہے۔ اس لئے ان کی ہر رباعی فلسفۂ حیات کی کسی نہ کسی گرہ کو کھولتی ہے۔

رقصِ طاؤس

سید صفدر حسین کراچی کی نظموں کا مجموعہ۔ قیمت ۴ روپے۔ ناشرین مکتبۂ دانش لاہور۔ ملنے کا پتہ:۔ شرودھانند اسکوائر۔ ارجن روڈ کرشن نگر لاہور۔ تقطیع ۲۲×۳۶/۱۶ صفحات ۱۰۴۔ کاغذ، کتابت، طباعت نہایت عمدہ۔ جلد سادہ۔ جلد پوش خوب صورت۔

اس کتاب کی نظمیں نظم پابند اور نظم آزاد کے درمیان کا خلا پُر کرتی ہیں۔ شاعر نفسیاتی تجزیے کا ماہر ہوتا ہے اور آپ کسی نظم کو کہیں سے بھی پڑھیں تو بیان اور تاثر کا تسلسل ٹوٹتا دکھائی نہیں دیتا۔ کسی نظم میں بھی غنائیت کو قائم رکھنے

کے لئے بحر نہیں بدلتی اور قافیہ اور ردیف کی فرسودہ پابندی نہیں ہے۔ نیاز فتح پوری کے قول کے مطابق ڈاکٹر سید صفدر حسین شاعری کی دنیا میں ایک نئی دریافت ہیں۔ اس مجموعے میں ۱۴ نہایت پیاری اور دل آویز نظمیں شامل ہیں۔

بنت عم کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے

سب سے پہلے تری معصوم نگاہوں کا پیام
جن اداؤں نے شناسان کے تقدس کی قسم
ہیں نہ وارفتۂ الفت تھا نہ سرگشتۂ شوق
ہمہ تن پاک دل و پاک نگہ پاک جہاد
کتنی پاکیزہ تھیں کتنے شرافت کے خیال
مری معصوم فطرت کی قسم کھاتے تھے
جب گریبان ہلالی سے دمکتا تھا وہ حسن
افق روح پہ اک برق سی لہراتی تھی
ایک بے نام ضیا دل کی فضاؤں میں کہیں
اپنے احساس پہ مجبوب سی رہ جاتی تھی

نسیم مغرب

پروفیسر امیر چند بہار گورنمنٹ کالج لدھیانہ نے ۹۰ منتخب انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ ناشر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ہر نظم سے متعلق شروع میں اس نظم کا تعارف بھی نثر میں دیا ہے۔ ترجمہ بڑا کامیاب ہے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے اس کتاب کو سراہا ہے۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے ضخامت ۱۱۰ صفحے تقطیع ۲۲×۳۶/۱۶۔ کاغذ کتابت جلد اور جلد پوش اوسط سے اچھے۔

ملاقاتیں

الطاف حسن قریشی نے اس کتاب میں پاکستان کی ۹ شخصیتوں سے ملاقاتوں کی تفصیل درج کی ہے۔ ناشر اردو ڈائجسٹ پبلیکیشنز لاہور۔ قیمت پانچ روپے۔ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ کتاب اچھی ہے۔ جن شخصیتوں سے ملاقاتوں کا ذکر اس کتاب میں درج ہے، ان میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی تمیز الدین خاں، مولانا صلاح الدین احمد، پروفیسر حمید احمد خاں اور دیگر اصحاب ہیں۔ طرزِ تحریر میں احتیاط اور سنجیدگی ہے۔

سرشار -- ایک مطالعہ

مرتبہ:- پریم پال اشک۔ ناشر آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی۔ قیمت پانچ روپے۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد اوسط۔ جلد پوش صاف ستھرا۔ رتن ناتھ سرشار جتنے بڑے مصنف ہوئے ہیں اتنا ہی کم کام ان پر ہوا۔ اشک صاحب نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے مندرجہ ذیل ابواب ہیں پس منظر، شخصیت، فسانۂ آزاد، تخلیقات، سرشار کا ادب، سرشار کا فن، سرشار کا اردو ادب میں مرتبہ، آخر میں ضمیمہ ہے جس میں مثنوی تحفۂ سرشار، قصیدہ طوفانِ سرشار درج ہیں۔

سازِ نغمہ

بسمل کپورتھلوی کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی۔ کتاب مصنف سے ۱۶/۷ شکتی نگر دہلی کے پتے سے مل سکتی ہے۔ قیمت تین روپے ضخامت ۱۴۴ صفحے۔ کتابت، طباعت، جلد اوسط۔ جلد پوش خوبصورت

اس مجموعۂ سخن میں بسمل صاحب کی غزلیں نظمیں قطعات وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے کلام میں روانی ہے اور بیان میں پختگی۔ غزلوں میں اچھے اچھے شعر نکالے ہیں۔

مستقل غم کا مجھ کو غم ہی نہیں — خلش عارضی سے ڈرتا ہوں
برق کو نذر تھی آشیاں پہ کبھی — آج تک روشنی سے ڈرتا ہوں

موصولات

سورگ کی کھوج - ایک ناٹک۔ مصنف دینو بھائی پنت قیمت دو روپے پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ:- ڈوگری سنستھا پکا ڈنگا جموں

آسان اردو لکھاوٹ مصنف۔ ڈاکٹر جافر حسن۔

ناشر۔ کتابی ایجنسی، بنجارا ہل، حیدرآباد۔ قیمت بیس روپے

جوالامکھی چینی جارحانہ حملہ کے خلاف نظموں کا انتخاب۔
مرتبہ محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ، حکومت آندھرا پردیش، حیدرآباد۔

رسالے

دلی کالج میگزین، اردو۔ میر نمبر ۴۶۴ صفحوں پر مشتمل دلی کالج میگزین کا یہ ضخیم نمبر میر کے سلسلے میں بڑی معلومات کا حامل ہے۔ اسے نثار احمد فاروقی نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ یہ نمبر چار ابواب میں بٹا ہوا ہے۔ باب اول حیاتِ میر، دوم میر کا فن سوم تصانیفِ میر، چہارم خراجِ عقیدت۔ ناشر شعبۂ اردو، دلی کالج، ایوننگ کلاسز، دلی

نگار، پاکستان، سالنامہ ۱۹۶۴ء یہ سالنامہ تذکروں کا تذکرہ نمبر ہے۔ قیمت چار روپے۔ تحقیق کا کام کرنے والوں کے لئے بہت مفید ہے۔

تلاش۔ خاص نمبر۔ قیمت چار روپے۔ ایڈیٹر وشوانا تھ درد۔ ملنے کا پتہ:۔ تلاش پوسٹ بکس نمبر ۲۵۶۰ نئی دہلی ۵۔ یہ شمارہ ۲۸۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں اردو کے ممتاز شعراء و ادباء کی تخلیقات شامل ہیں۔

نخلستان اودے پور۔ ساہتیہ اکیڈمی راجستھان اودے پور کا یہ سہ ماہی رسالہ ابھی ابھی شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ پروفیسر پریم شنکر سری واستوا اس کے مدیر ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں راجستھان کے بہت سے ادیب اور شاعر شامل ہیں۔ راجستھان سے باہر کے ادیبوں کی تخلیقات بھی ہیں۔ لیکن مقامِ مسرت ہے کہ راجستھان میں اردو ادباء اور شعراء کی کمی نہیں۔ اس شمارے کی قیمت دو روپے ہے۔

نواب علی گوہر

غزل

چہرہ اترا ہوا شرمندہ نظر ہے کہ نہیں
ان پہ یہ میری تباہی کا اثر ہے کہ نہیں

اوس کی بوند نقابِ گلِ تر ہے کہ نہیں
تیرے عارض پہ مرا عکسِ نظر ہے کہ نہیں

سردِ خاکسترِ پروانہ ہے، پھر کیا اس سے
چھیڑ کر دیکھ ذرا رقصِ شرر ہے کہ نہیں

ہوس سجدہ سے پہلے یہ سمجھ لینا تھا
درِ محبوب کے شایاں ترا سر ہے کہ نہیں

زندگی کو مری آسودہ بتانے والے
دیکھ اس نرم تموّج میں بھنور ہے کہ نہیں

پھیرے ہستی و عدم کے یونہیں آخر کب تک
تو مسافر سہی، تیرا کہیں گھر ہے کہ نہیں

ہو گیا تجھ میں شعورِ حق و باطل پیدا
میری صاحب نظری کا یہ اثر ہے کہ نہیں

قافلہ سست خرام اور وہی جادہ پامال
رسمِ پارینہ یہ اندازِ سفر ہے کہ نہیں

چھپ گیا چاند تو مایوس ہے کیوں اے ہمدم
دیکھ، وہ نور فشاں نجمِ سحر ہے کہ نہیں

بے خبر آنکھ کو شائستۂ دیدار بنا
وہ پسِ پردہ بھی محسوسِ نظر ہے کہ نہیں

سوئے مشرق ابھی چھایا ہے دھندلکا گوہر
یہ شبِ تارِ گزشتہ کا اثر ہے کہ نہیں

کاش درخت بول سکتے ......



زیادہ درخت لگاؤ

اے ۔ بے لحاظ کلہاڑے ۔ کیا تجھے معلوم ہے ؟

کہ ہمیں گرا کر تم اپنے مالک کی جو خدمت کرتے ہو ہیں اور میرے بھائی اس کی اس سے زیادہ خدمت کرتے ہیں ۔

ہم پانی کو بچاتے ہیں ۔ اس کے بہاؤ کو منضبط کرتے ہیں ، طوفانوں کو روکتے ہیں اور بہتر فصلوں کے لئے زمین کو کٹاؤ سے بچاتے ہیں ۔

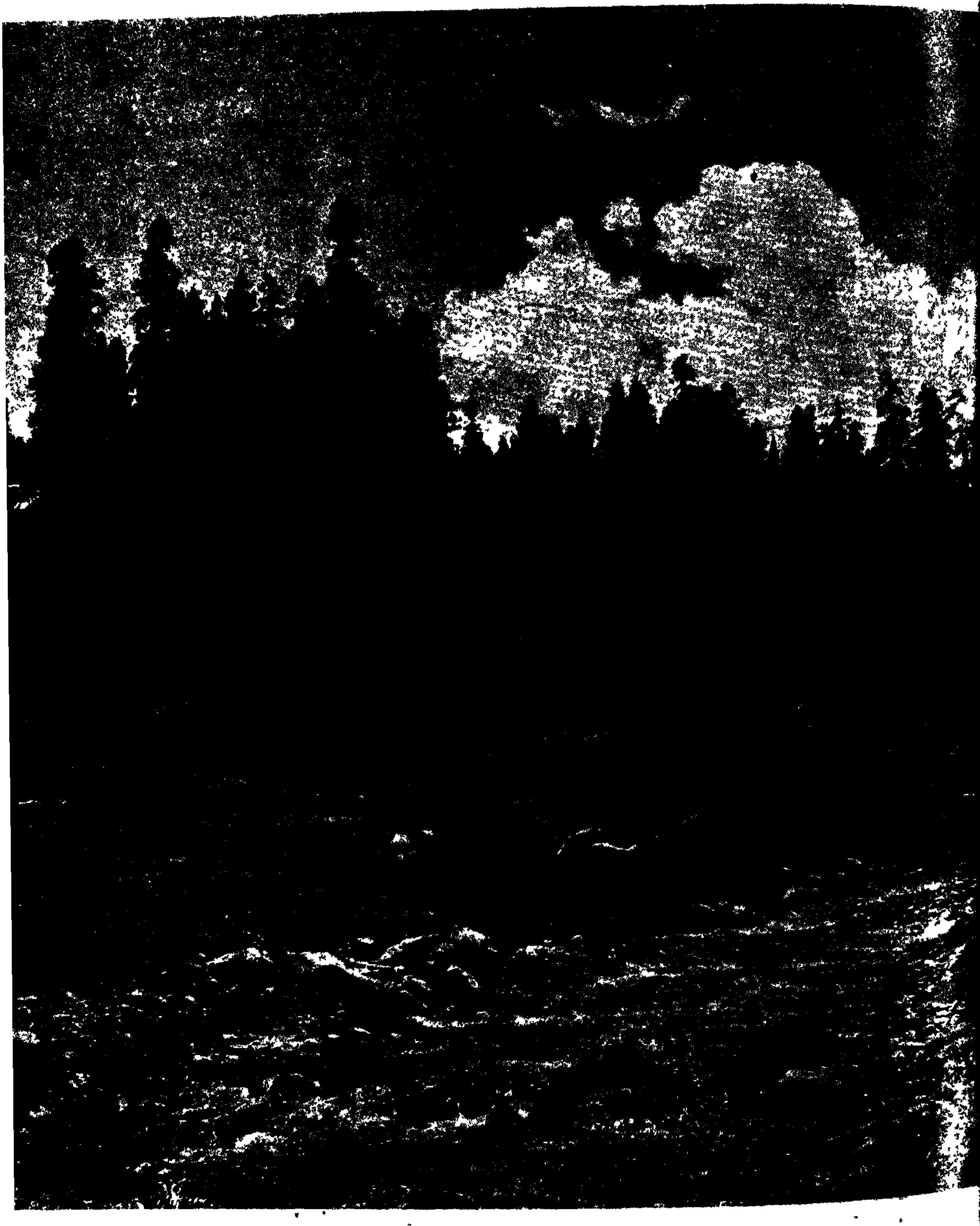
ہم آندھیوں کی رفتار کو کم کرتے ہیں اور موسم گرما اور سرما کی شدت میں کمی لاتے ہیں ۔

کوئی بھی انسانی کام خواہ وہ آباد کاری ہے ، رسل و رسائل یا آبپاشی درختوں کے بنا تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا ۔

اس لئے ہمیں گرانا بند کر دو !

اس وقت تک ملک کا محض ۱۲ فی صدی رقبہ جنگلات پر مشتمل ہے جبکہ قومی جنگلاتی پالیسی کے مطابق نشانہ ۳۳ فی صدی کا ہے ۔

جاری کردہ :۔ محکمہ تعلقات عامہ پنجاب

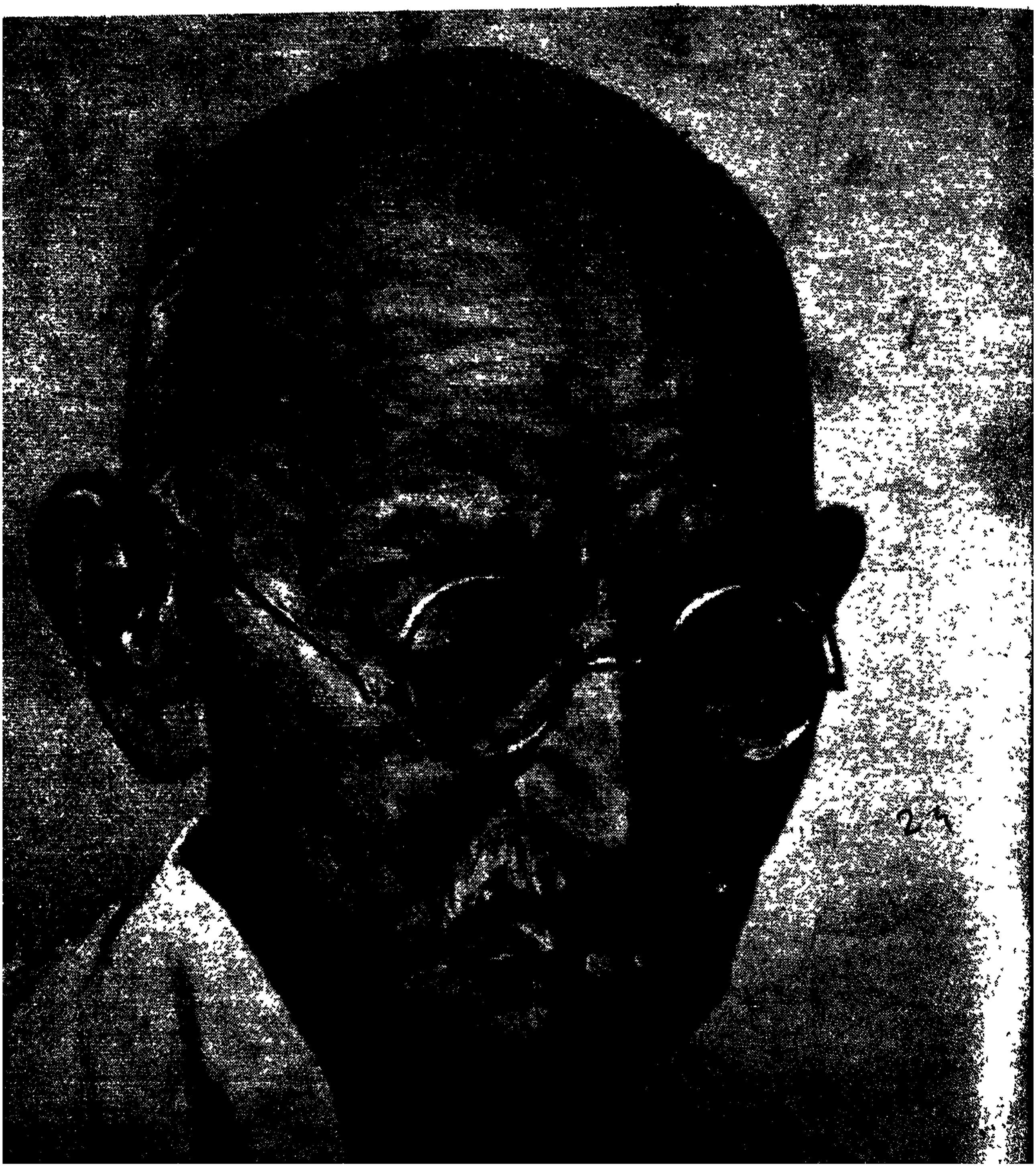


گلمرگ کا ایک منظر

آجکل

ک سمت ۱۹۶۳
بر ۱۹۶۴ء

۶۰ پیسے





ایک یادگاری تصویر

گاندھی جی کے ساتھ کانگریس کے دوسرے اکابر۔ شری جواہر لال نہرو اور خان عبدالغفار خاں نمایاں طور پر نظر آرہے ہیں

ترتیب

سرورق :۔ مہاتما گاندھی

رسالے کی پشت پر :۔ مہاتما گاندھی ۱۹۳۱ء میں چارلی چیپلن سے ایک ہندوستانی دوست کے گھر پر لندن میں ملنے گئے تو وہاں کے باشندوں نے انھیں گھیر لیا۔

جلد ۲۳ — نمبر ۳

اسوج شک سمت ۱۸۸۶

اکتوبر ۱۹۶۴ء

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل دہلی

سالانہ چندہ :۔
ہندوستان میں :۔ سات رُپے
پاکستان میں :۔ سات رُپے (پاک)
غیر ممالک سے :۔ ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ :۔
ہندوستان میں :۔ ۶۰ پیسے
پاکستان میں :۔ ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :۔ ا شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱۔ دہلی

مُلاحظات

ڈاکٹر ڈی سولیوریا ہندوستان کے بہت مشہور انجینئر ہوئے ہیں۔ ان کی خدمات کے صلے میں انھیں ۱۹۵۵ء میں بھارت رتن کا اعزاز دیا گیا تھا۔ وہ ایک نہایت ہی قابل، دیانت دار اور باعمل انسان تھے۔ انھوں نے اپنی حیرت انگیز کامیابی کو ان چار باتوں کی مرہونِ منت گردانا تھا۔

۱۔ سخت محنت: ہندوستان کے عوام عام طور پر سہل پسند ہیں۔ اور زیادہ محنت کے عادی نہیں۔ اسی وجہ سے ملک کی معاشی طاقت کمزور ہے۔

۲۔ نظم وضبط کے تحت کام: اگر کام نظم وضبط کے تحت کیا جائے اور اس کے لئے ہر روز ایک خاص وقت مقرر کیا جائے تو کوششوں میں بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ اس سے کام کرنے والے کی صحت اچھی رہتی ہے اور عمر بڑھتی ہے۔

۳۔ اچھی قابلیت: اچھی قابلیت کے یہ معنی ہیں کہ خوب محنت کی جائے۔ کام درست طور پر نظم وضبط کے تحت عین وقت پر کیا جائے۔

۴۔ خوش اخلاقی اور خدمت: اپنے ساتھیوں سے ہم آہنگ ہو کر کام کرنا مغربی ممالک میں تعریف کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ یہ احساس ہندوستان میں ابھی کم پایا جاتا ہے۔ ہر شہری کو اپنے ساتھ کام کرنے والوں اور پڑوسیوں سے خوش اخلاقی برتنی چاہیئے۔

مرحوم پنڈت جواہر لال نہرو نے سرکاری ملازمین سے اپیل کرتے ہوئے کہا تھا، "اچھے منصوبے بنانا کوئی آسان کام نہیں لیکن ان کی تکمیل اور بھی مشکل ہے۔ ان کی تکمیل کے لئے ہم سب کی مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہے، خاص طور پر سرکاری مشینری کی کوششوں کی۔ اس لئے میں ہندوستان بھر کے تمام سرکاری ملازموں سے اپیل کرتا ہوں کیونکہ انھیں پر حکومت کا بوجھ ہے اور انھیں پر ہر چیز کی کامیابی کا مدار ہے۔ میں ان سے سرکاری ملازمت میں پوری دیانت داری کی اپیل کرتا ہوں۔ اس کو محض ایک خیالی نصب العین ہی نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اس پر عمل ہونا ضروری ہے۔ اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔"

سرکاری ملازموں میں بدعنوانی اور رشوت کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر حکومت نے انسداد رشوت ستانی کے لئے ایک کمیٹی بنائی جس نے اپنی سفارشات میں بہت سی تجاویز پیش کیں۔ ان تجاویز پر بڑی سختی سے عمل کیا جا رہا ہے اور ان ملازموں کو جو بدعنوانیوں اور رشوت ستانی کے مجرم ثابت ہوئے ہیں پوری سزا دی جا رہی ہے۔ صوبوں میں سداچار سمیتیاں قائم ہو چکی ہیں یا قائم ہو رہی ہیں۔ مرکز میں بھی ایک سداچار سمیتی کام کر رہی ہے۔ یہ سمیتیاں غیر سیاسی اور غیر سرکاری ہیں۔ ان کا مقصد ملک میں اچھے قسم کی سیاسی اور اخلاقی فضا قائم کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ عوام کو اس بات پر آمادہ کریں گی کہ رشوت اور بدعنوانی کا قلع قمع ہو۔ ہمیں امید ہے کہ اس ملک کے سرکاری ملازم بالخصوص اور عوام بالعموم ایسی سازگار فضا اس ملک میں قائم کریں گے جس سے اخلاق اور دیانت کا بول بالا ہو۔

ہندوستانی موسیقی کے بہت بڑے ماہر استاد مشتاق حسین خاں ۱۳۔ اگست کو دہلی میں انتقال فرما گئے اور اپنے وطن سہسوان میں دفن ہوئے۔ مرحوم نے بڑے باکمال استادوں سے فن کی تکمیل کی تھی۔ آپ کو ۱۹۵۲ء میں صدر جمہوریہ کا ایوارڈ ملا اور ۱۹۵۷ء میں پدم بھوشن بنائے گئے۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۸۶ سال کی تھی۔ بزم موسیقی کا نور تو پھیلتا ہی رہے گا۔ ع مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

جوشؔ ملسیانی

غزل

یوں ملاقات ہو تو لطفِ ملاقات ہے کیا
آپ تو بات بھی کرتے نہیں یہ بات ہے کیا

وہ یہ کہتے ہیں ذرا صبر سے روداد کہو
کہتے کہتے یہ ہر اک بات پہ ہیہات ہے کیا

دل کے داغوں کی چمک بھی ہے شبِ غم میں فزوں
جس میں تارے نظر آتے نہیں وہ رات ہے کیا

کچھ تو ہے بات کہ چھوڑی ہے خموشی تم نے
ورنہ یہ سلسلۂ حرف و حکایات ہے کیا

اتنی سستی تو نہیں بخششِ حق اے ناداں
آخری وقت یہ توبہ یہ مناجات ہے کیا

اپنے دل اپنے کلیجے میں جگہ دوں ان کو
اس سے بڑھ کر ترے تیروں کی مدارات ہے کیا

آج کیوں چشمِ عنایت ہوئی مجھ پر مبذول
پردۂ لطف و کرم میں بھی کوئی گھات ہے کیا

حسن والوں کا تغافل تو ہے مانی ہوئی بات
آپ کا حسن بھی پابندِ روایات ہے کیا

تو عبادت میں بھی رہتا ہے سوالی اے شیخ
خود ہی انصاف سے کہہ دے تری اوقات ہے کیا

ایک سے ایک کی صورت ہی نہیں جب ملتی
اہلِ دانش کو پھر امیدِ مساوات ہے کیا

زہد و تقویٰ کے مضامیں نہ سناؤ اے جوشؔ
صحبتِ پیرِ مغاں میں یہ خرافات ہے کیا

سمی حسن نقوی

قدیم ہندوستان میں مذہب اور فلسفہ

قدیم ہندوستان اپنے مذہبی جوش وخروش اور فلسفیانہ سرگرمیوں کے لئے ہمیشہ ممتاز رہا ہے فلسفہ کے میدان میں ہندوستان نے سیکڑوں تجربے کئے، اور ان تجربوں کے نتیجہ میں بہت کچھ حاصل کیا۔ لیکن سب سے زیادہ وقیع واہم بات یہ تھی کہ اہل ہند نے ہمیشہ اپنی توجہ زندگی کی قدروں کو متعین و مرتب کرنے پر صرف کی جس کے باعث ان کی کوشش میں مقصدیت اور زندگی میں معنویت پیدا ہو گئی۔

قدیم ہندوستان میں فلسفہ، مذہب ہی کی ایک شاخ کی حیثیت رکھتا تھا۔ فلسفہ کو مذہب سے علیحدہ کبھی نہیں کیا گیا۔ ہندوستانی فلسفہ کے ہر مکتبۂ فکر نے ایک "موکش شاستر" یا علم نجات مرتب کرنے کی کوشش کی۔ فلسفہ کا تعلق تربیتِ ذہن ہی سے نہیں تھا بلکہ عمل سے بھی تھا۔ فلسفہ نام تھا ایک طریقۂ زندگی کا، ایک خاص طرزِ فکر و عمل کا جس کا بس ایک ہی مقصد تھا ——— یعنی حصولِ نجات۔ اگر فلسفہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ محض خیالات و نظریات پیش کرے، اور اس کا تعلق عمل سے بالکل نہ رہے، تو واقعی ہندوستان میں سرے سے کوئی فلسفہ نہیں پایا جاتا تھا، لیکن اس حیثیت سے ہندوستان بہرحال گھاٹے میں نہیں رہا۔

ہندوستان کے مذہب اور فلسفہ کی بنیادیں وادیٔ سندھ ہی کے دور میں رکھی جا چکی تھیں، لیکن وادیٔ سندھ میں بسنے والوں کا حال ہمیں زیادہ نہیں معلوم۔ البتہ ویدوں کے زمانے کے مذہبی رجحانات کا ہم ایک بڑی حد تک اندازہ کر سکتے ہیں۔ رگ وید کی مناجاتی نظموں سے آریائی مذہب کی تین واضح خصوصیات جھلکتی ہیں۔ اولاً یہ کہ ویدوں کے ابتدائی دور میں لوگ ایسے دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے جو مظاہرِ قدرت، مثلاً بادل کی گرج، بجلی کی چمک اور بارش کی نمایندگی کرتے تھے۔ یہ دیوتا ان کے نزدیک لافانی تھے اور جمال، حکمت، شفقت اور عدل وغیرہ صفات سے متصف تھے اور کائنات کے اخلاقی قانون کے نگہبان تھے۔ ان دیوتاؤں میں ورن[1]، اندر اور اگنی سب سے اہم تھے اور رگ وید کے دوسرے دیوتاؤں ——— مترا، پُشن، مارُتس، رُدر اور آسونس کے مقابلے میں انھیں سب سے زیادہ محترم مانا جاتا تھا۔

ان میں بھی ورُن کا شمار آسمانی دیوتاؤں میں تھا، جسے فضا اور کائنات کا شہنشاہ، سب سے زیادہ طاقت ور اور اخلاق کا ضامن مانا جاتا تھا۔ ورُن کے بارے میں جو عقیدہ رگ وید میں پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "وہ ہر جگہ موجود ہے، ہر بات کا جاننے والا ہے، زندگی اور موت کا مالک ہے۔ دوسرے تمام دیوتا اس کا حکم مانتے ہیں۔" اور یہی وہ دیوتا ہے جسے آگے

---

[1] ورن، اندر، اگنی، نظامِ کائنات کی مختلف قوتوں کے نام ہیں جو بالآخر ایک ہی قوت ہے۔ (ادارہ)

چل کر علمائے ہنود نے خدائے واحد مان لیا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ یہ تمام دیوتا قربانیوں سے خوش ہوتے تھے۔ قربانیاں تین قسم کی ہوتی تھیں: دودھ اور اناج کی، سوم[1] کی، اور جانوروں کی۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا رسموں میں باقاعدگی آتی گئی، اور رفتہ رفتہ قربانیوں کے چار واضح پہلو قرار پاگئے۔ وہ رسمیں جو خالص عبادت اور دعا کی خاطر ادا کی جاتی تھیں یا شکر گزاری، کفارے اور سحر کے طور پر بجا لائی جاتی تھیں۔

رگ ویدک مذہب کی تیسری خصوصیت تھی "رت" کا قانون۔ عام طور پر رت کے معنی ہیں نظام، وہ نظام جس کے ذریعہ سے رات کے بعد دن آتا ہے، مقررہ گردش کے ساتھ موسم آتے ہیں اور دریا اپنے رخ پر بہتے ہیں۔ نظام کائنات 'رت' ہی کا دوسرا نام ہے۔ تمام دنیا میں 'رت' ہی کا فرمان چلتا ہے یہاں تک کہ دیوتاؤں پر بھی۔ ہمارے قدیم مفکرین نے نیچر میں یکسانی اور یک رنگی تلاش کرلی، اور اپنے اس عظیم عقیدہ کے ذریعہ نیچر کے کثرتِ وجود کو ایسی وحدت میں تبدیل کر دیا جس سے نظام کائنات میں ایک مشیت جھلکتی ہوئی دکھائی دینے لگی جو واحد ہے۔

رگ وید کہتا ہے۔ "اس وقت نہ شئے تھی نہ لاشئے، نہ ہوا تھی نہ آسمان، ان سب کو اپنے دامن میں کون چھپائے تھا؟ کہاں آرام کر رہے تھے یہ سب؟ اس وقت نہ موت تھی نہ حیات نہ تفرقات لیل و نہار۔ بس ایک وجودِ مطلق تھا، قائم بالذات اس کے ماسوا کچھ نہ تھا۔" آگے چل کر سوال ہے۔ "یہ دنیا کیسے وجود میں آئی اور آیا دستِ قدرت نے اسے ترتیب دیا یا نہیں؟ آسمان میں جو مالک ہے بس وہی بتا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ بتا سکے۔" یہ کوئی معمولی سوال نہ تھا۔ لیکن اس سوال نے تلاشِ حق کے دروازے کھول دئے، اور صدیوں کے غور و فکر کے بعد آخر کار

[1] ایک قسم کا پہاڑی پودا، جس کا رس نشیلا ہوتا ہے اور جسے قربانی کی رسموں میں استعمال کیا جاتا تھا۔

اس کا حل دریافت کر لیا گیا جس کی تفصیل ذیل میں بیان کی جائے گی۔

ویدک دور کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جس میں براہمن لکھے گئے۔ ویدوں اور براہمنوں کے زمانے میں صدیوں کا فاصلہ ہے۔ براہمن دراصل ویدوں کی شرحیں ہیں۔ وید چار ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا علیحدہ براہمن ہے۔ مثلاً ایتریہ، رگ وید کا براہمن ہے، اسی طرح پنچ ونسا اتھروید کا، چھندوگیہ سام وید کا اور ست پاتھ یجروید کا۔ ویدوں کی زبان بہت صاف، سادہ اور سلجھی ہوئی ہے۔ اس کے خلاف براہمنوں کی زبان اور مواد دونوں بہت بھاری بھرکم ہیں اور ان کو پڑھنا اور سمجھنا آسان نہیں ہے۔ براہمنوں میں دیوتاؤں کو پس پشت ڈال کر رسموں پر زور دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ رسموں سے متعلق مٹی کے گھڑے سے کر چمچے اور لکڑی کے ٹکڑوں کی تفصیلات، کون سی چیز کس مقام پر رکھی جائے، اور یہ کہ ان میں کسی قسم کی کمی نہ رہنے پائے۔ ان تمام جزئیات کا بیان بڑی تفصیل کے ساتھ براہمنوں میں موجود ہے۔

تیسرا دور وہ ہے جس میں اپنشد لکھے گئے۔ اپنشد کے لغوی معنی ہیں وہ تعلیم جو استاد کے قریب بیٹھ کر حاصل کی جائے، یا وہ تعلیم جو شاگرد اپنے استاد سے بطور راز حاصل کرے۔ مذہبی ادب کی ان تین شاخوں میں زمانے کے اعتبار سے کافی تفاوت ہے، اور یہ بات ان کے مخصوص اسلوب سے بدرجۂ اتم واضح ہوتی ہے۔ ویدک ادب کی ان تین شاخوں کے زمانے کا تعین اگرچہ ٹھیک ٹھیک نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ اپنشد سب سے بعد کی چیز ہیں اور ان کے زمانے کا تعین بس اتنا ممکن ہے کہ وہ ۶۰۰ ق۔م یعنی بدھ مذہب سے پہلے کے ہیں۔ فکر کی گہرائی اور منطقی نتائج کے اعتبار سے وہ اتنے بلند ہیں کہ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ "براہمنوں اور اپنشدوں کے طرز بیان میں جو فکری تفاوت پایا جاتا ہے وہ ہندوستانی فلسفہ کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے"[1]

[1] بی۔ جی گوکھلے: "قدیم ہندوستان، تاریخ اور سماج"

اپنشدوں میں نہ ورُن، اندر اور اگنی وغیرہ دیوتاؤں کا ذکر ہے اور نہ قربانیوں کا، بلکہ برہما کا ذکر ہے جو دنیا میں چھوٹی سے چھوٹی چیز سے زیادہ چھوٹا اور کائنات کی بڑی سے بڑی چیز سے زیادہ بڑا ہے اور پھر بھی دل کے اندر چھپا رہتا ہے۔ برہما کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔ "ہر شے برہما ہے۔ آتما بھی برہما ہے۔ لیکن آتما کیا ہے؟ آتما وہ ہے جن کے ذریعے سے انسان شکلوں کو دیکھتا ہے، آوازوں کو سنتا ہے، خوشبوئیں سونگھتا ہے، بولتا چالتا ہے اور میٹھے پھیکے کی پہچان کرتا ہے۔" [1]

اپنشدوں میں جگہ جگہ برہما اور آتما کی بحث ملتی ہے جنھیں ہر مقام پر ایک مانا گیا ہے۔ "آتما ہی ذات ہے۔ برہما بھی ذات ہے اور ذات وہی ہے جو ذات ہے۔ آتما وہ حقیقت ہے جو تغیرات میں بھی قائم رہتی ہے، جو خواب و بیداری، رویا، موت، بار بار جنم لینے اور آخر میں، نجات کی مختلف حالتوں میں قدر مشترک ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے کوئی فنا نہیں کرسکتا۔ موت اُسے چھو نہیں سکتی، اور شر اُسے تحلیل نہیں کرسکتا۔ دوام، تسلسل، وحدت، حرکت پیہم، یہ اس کی خصوصیات ہیں۔ یہ بجائے خود ایک دنیا ہے جو کمل ہے۔ کوئی شے اس سے باہر نہیں ہے۔ بس آتما اصل اصول ہے، انسان کا "انا"" [2]

برہما تمام کائنات کا جوہر ہے، فضائے بسیط کی اصل ہے، وہ طاقت ہے جو موجودات عالم میں مادی شکل میں ظہور پذیر ہے، جو پیدا کرتی ہے، زندہ رکھتی ہے، صحیح سالم رہتی ہے، جو تمام عالموں کو اپنے اندر سمو لیتی ہے، ایک لامحدود، لافانی الٰہی طاقت یہی زندگی کا مبدا ہے اور یہی مرجع، یہ وہ ہے جس سے تمام چیزیں پیدا ہوتی ہیں، پیدا ہونے کے بعد اسی کی بدولت زندہ رہتی ہیں، اور مرنے کے بعد اسی کی طرف رجعت کرجاتی ہیں۔ وہ برہما ہے یعنی "ست" (حق)، "چت" (روح)، اور "آنند" (روحانی مسرت) اس لئے آتما اور برہما، داخلی اور خارجی، روحانی اور کائناتی اصول

---

[1] بی جی۔ گوکھلے: "قدیم ہندوستان، تاریخ اور سماج"

[2] ایضاً

کے دو مختلف نام ہیں جو ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ "تت توم اسی" یعنی یہ "کہ تو ہے" یہ ترجیعی کلمات اپنشدوں میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔" [3]

دراصل یہ ایک بڑا انقلابی عقیدہ تھا اور ہندوستانی فلسفہ کی ارتقائی منزلوں میں اہم ترین موڑ۔ آندھی کا ایک جھونکا آیا اور رگ وید کے تمام دیوتاؤں کو پیچھے چھوڑ گیا۔ قربانیاں اور رسمیں فرسودہ قرار دے دی گئیں اور ایک نئے عقیدے نے جنم لیا جس نے آگے چل کر ہندوستانی فلسفہ اور قدیم ہندوستان کی مذہبی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ وہ تھا کرم اور آواگون کا عقیدہ۔ اپنشدوں میں انسان اپنی مسرت اور رنج و غم کا خود ہی معمار بن جاتا ہے، چاہے مسرت حاصل کرے چاہے رنج و غم۔ یہ اس کے اپنے کرم (عمل) پر منحصر ہے۔

"جس طرح تتلی ایک پتی سے دوسری پتی پر جا بیٹھتی ہے، جس طرح سنار ہمیشہ نئے نئے زیور تراشتا رہتا ہے، اسی طرح انسان کا کرم اس کی روح کو ایک قالب سے دوسرے قالب میں ڈھکیل دیتا ہے۔ آخر میں علم و عرفان اور غور و فکر کے ذریعہ وہ معرفت کی اُس منزل میں پہنچ جاتا ہے جس میں وجود کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں، دوئی مٹ جاتی ہے اور وہ برہما میں ضم ہوکر بقائے دوام حاصل کرلیتا ہے۔ اسی کا نام جیون مکتی ہے یعنی سنسار سے مکمل آزادی، اور یہی "ست"، "چت" اور "آنند" کی آخری منزل ہے۔" [4]

اپنشدوں کی تعلیمات کا خلاصہ چار تصورات پر مشتمل ہے۔ آتما، برہما، کرم اور آواگون۔ آتما اور برہما کا تعلق جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، روحانیت سے ہے۔ کرم کا تعلق عمل سے ہے، اور آواگون زندگی اور موت کا وہ قدرتی عمل ہے جس کے ذریعہ سے "سنسار" کی بقا ثابت ہوتی ہے۔ یہ نظریات ویدوں اور برہمنوں

---

[3] بی۔جی۔گوکھلے: "قدیم ہندوستان، تاریخ اور سماج"

[4] ایضاً

کے نظریات سے اتنے مختلف اور ترقی یافتہ ہیں کہ انھیں انقلاب آفرین نظریات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

آتما اور برہما کے ایک ہونے کی دریافت نے فلسفیانہ خیالات کے تانے بانے کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ فلسفہ کی بنیاد اب یہ قرار پائی کہ دیوتاؤں کی خلاف ورزی یا قربانی کی رسموں میں کوتاہی کرنا کوئی پاپ نہیں ہے بلکہ مظاہر قدرت کی کثرت کو تسلیم کرنا اور برہما کی وحدت الوجود سے انکار کرنا پاپ ہے۔ اخلاقی شعار حقیقی شعار قرار پایا جس میں نفس سے مراد نفسِ امارہ نہیں جو تمام برائیوں۔ تنگ نظری، خود غرضی، دناءت اور دوسری کمزوریوں کا مجموعہ ہے، بلکہ انسان کی فطرتِ باطنی مراد ہے جو انانیت کے قید و بند سے آزاد ہے۔

اُپنشدوں کے عہد کے ظہور کے بعد وہ دن بیت گئے جب خیالی دیوتا پہاڑوں میں چھپے رہتے، بجلی کے ساتھ چمکتے، اور بادلوں کے ساتھ گرجتے اور برستے تھے۔ اب انسان نے خدا کو پالیا جو اس کے اندر تھا۔ اب اُسے راضی رکھنے کے لئے قربان گاہ تک جانے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ کوئی شخص اپنے نفس کو جو وہ خود ہے راضی رکھنے کی کوشش نہیں کر سکتا۔ انسان خدا کا ادراک کر سکتا ہے اور اس کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح قربانی کی رسموں کی جگہ علم و عرفان اور باطنی فہم و ادراک نے لے لی۔

چھٹی صدی قبل مسیح کو جس میں چند بہت اہم اپنشد تصنیف ہوئے، ذہنی جوش و خروش اور فلسفیانہ سرگرمیوں کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن تمام ماحول پر اس وقت تشکک کی گرد چھائی ہوئی تھی اور لوگوں کے ذہن و دماغ میں انقلابی خیالات نے ہلچل مچا رکھی تھی۔ اپنشد اس روحانی ہیجان و بغاوت کے صرف ایک پہلو کی ترجمانی کرتے ہیں جس کے ذریعے سے کثرت پرستی کا عقیدہ وحدت پرستی کی منزلیں طے کرتا ہوا وحدت الوجود اور "ہمہ اوست" کی منزل تک پہنچ گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد برہمنی قربانیوں کے خلاف دو[2] اور تحریکیں شروع ہوئیں جن کے رہنما مہاویر "جن" (غالب)، اور گوتم "بدھ" (عارف) تھے۔ یہ دونوں چھتری تھے اور اپنے عقائد کو مرتب کرنے سے پہلے ایک عرصہ تک دونوں غور و فکر، ریاضت اور تپسیا کی تاریکیوں میں بھٹکتے رہے۔ دونوں نے اپنی تحریک کی ابتداء سنیاسی تنظیم کے طور پر کی اور دونوں بہت جلد دو عظیم مذہبوں کے بانی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے ظاہر ہوئے۔ یہ دونوں عظیم ہستیاں خلوص و انسانیت کا پیکر تھیں۔ ان کا شمار اُن عظیم ہستیوں میں کیا جاتا ہے جن پر قدیم ہندوستان بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ ذیل میں ان کی تعلیمات اور سرگرمیوں کا مختصراً جائزہ لیا جائے گا۔

جین مت کے بانی مہاویر تھے جو ویشالی کے ایک امیر سردار کے لڑکے تھے۔ اٹھائیس سال کی عمر میں انھوں نے تلاشِ حق کی مہم شروع کی اور بارہ سال تک سخت تپ کیا۔ اس کے بعد وہ "کیولی" (کامل) کہلانے لگے۔ اپنی عمر کے آخری تیس سال انھوں نے اپنے عقائد کی تبلیغ اور اپنے پیرو سادھوؤں اور راہبوں کی تنظیم کے کام میں صرف کئے[1]۔ انھوں نے اُپری گرہ یعنی ترکِ دنیا، اہنسا، تمام جانداروں پر رحم، اور اخلاقی دیانت داری کا سبق دیا۔ انھوں نے کرم اور آواگون کے رائج الوقت عقائد کو اپنا لیا، لیکن روح کے بارے میں ان کا عقیدہ مختلف تھا۔ اُپنشد کہتے ہیں کہ وجود واحد ہے، دائم و قائم، نہ اس کی ابتداء ہے نہ انتہا نہ تغیر۔ اس کے برخلاف جینیوں کا عقیدہ ہے کہ وجود میں تعمیر، تسلسل، تخریب سب پہلو شامل ہیں۔ اس نظریہ کو وہ "انے کانت واد" کہتے ہیں یعنی یہ کہ روح لامحدود ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام موجوداتِ عالم میں استقلال و استحکام صرف ان کی اصلیت کی حد تک پایا جاتا ہے، لیکن جہاں تک صفات کا تعلق ہے وہ پیدا بھی ہوتی ہیں

---

[1] ان کا دیہانت ۵۲۷ ق م میں ہوا۔ ان کی عمر ۷۲ سال مانی گئی ہے اس حساب سے پیدائش ۶۰۰ ق م قرار پاتی ہے۔ جمعدار نے پیدائش ۵۴۰ ق م اور موت ۴۶۸ ق م قرار دی ہے۔

ہیں اور فنا بھی۔ مادہ اپنی جگہ مادے کی حیثیت سے باقی رہتا ہے، البتہ اس کی صورت اور سیرت میں تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔

روح اور مادے میں فرق ہے۔ روحیں لاتعداد ہیں اور قدوقامت میں اپنے قالب کے مطابق ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ ذکاوت ایسی خصوصیت ہے جو لازوال ہے۔ دنیاوی روحیں جان دار پیکر ہیں اور بار بار جنم لیتی ہیں۔ جسم سے رہائی کے بعد وہ درجۂ کمال حاصل کر لیتی ہیں۔ جین مذہب میں کرم کی کئی قسمیں ہیں۔ کرم سے چھٹکارا پانا، نیا کرم حاصل نہ کرنا اور آخر میں کیولی بن جانا، ان کی منزلِ مقصود ہے۔

دوسری عظیم تحریک بُدھ مت کی تھی جس کے بانی گوتم تھے۔ مہاویر کی طرح گوتم بھی ایک چھتری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد شدھو دھن کپل وستو کے شاکیہ سردار تھے۔ وہ راج محل کے عیش و آرام اور اپنے بیوی بچے کو خیرباد کہہ کر جنگلوں میں نکل کھڑے ہوئے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ سادھو بن گئے۔ یہ زندگی سے فرار نہیں تھا۔ وہ اس بات کی کھوج لگانا چاہتے تھے کہ زندگی کیا ہے اور اس کے ماورا کیا ہے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے زمانے کے بڑے بڑے عالموں سے ملاقات کی، مگر کوئی ان کی تسکین نہ کر سکا۔ پھر انھوں نے سخت تپ کیا۔ لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ جسم کو تکلیف دینا اور نفس کشی کرنا بے کار ہے۔ لیکن انھوں نے تلاشِ حق جاری رکھی۔ اس کے بعد وہ ریاست بہار میں گیا کے قریب ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر سخت غور و فکر میں ڈوب گئے اور انسانی تکالیف کے اسباب اور ان کے علاج کے بارے میں سوچ بچار میں محو ہو گئے۔ آخرکار وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسانی خواہشات ہی تمام تکلیفوں کی جڑ ہیں۔ جہل، طمع اور نفسانی خواہشات وہ ایندھن ہیں جن کے ذریعے سے انسانی جذبات کائنات میں آگ لگا دیتے ہیں، اور اس دہکتی ہوئی بھٹی سے جس کا نام دنیا ہے، بچ نکلنے کا نام 'نروان' ہے۔ انھیں روشنی مل گئی اور وہ "بدھ" (عارف) کہلانے لگے۔

اس دورِ آفریں واقعہ کے بعد گوتم نے اپنا پیغام دنیا تک پہنچانے کا کام شروع کیا۔ ۴۵ سال تک برابر وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے رہے۔ اس دوران میں انھوں نے اپنے 'سنگھ' یعنی بھکشوؤں اور بھکشنوں کی تنظیم کا کام بھی انجام دیا۔ ۸۰ سال کی عمر میں ان کا دیہانت ہو گیا، اور وہ اس منزل میں داخل ہو گئے جسے 'نروان' کہتے ہیں۔ اپنے غم زدہ چیلوں کو جو ان کے بسترِ مرگ کے قریب تھے ان کا آخری پیغام یہ تھا، "دنیا کی ہر شے میں انحطاط اور زوال راسخ ہے، اپنی نجات کا راستہ تن دہی سے تلاش کرو۔"[1]

گوتم برہمن پروہتوں کے دنیادارانہ رویے پر کڑی تنقید، اور قربانی کی رسموں کے خلاف بے باکی کے ساتھ اظہارِ بیزاری کرتے تھے۔ راج محل کو چھوڑ کر انھوں نے اپنے کو کلیتاً عوام کے لئے وقف کر دیا۔ کسی گوالے کی جھونپڑی ہو یا شراوستی کے مہاجن اناتھ پنڈک کا عالیشان مکان، وہ دونوں جگہ یکساں آرام و آسائش محسوس کرتے تھے۔ وہ عوام کی زبان میں وعظ کیا کرتے تھے۔ ریاکاری سے وہ متنفر تھے، جہالت پر کڑھتے تھے، تعیش پر چوٹ کرتے تھے اور نفس کشی کو فضول سمجھتے تھے۔ ان کے مذہب کے آٹھ پاکیزہ اصول تھے جنھوں نے ہندوستان کی اخلاقی زندگی میں جان ڈال دی۔ ان کے اکثر اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے نظریات کو عقل کی کسوٹی پر کستے تھے اور ان پر پورا پورا اعتماد رکھتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ایک راج کمار مذہبی پیشوا، اور ایک فلسفی معلمِ اخلاق میں تبدیل ہو گیا۔

جس بدھ مت کا پرچار گوتم نے کیا اس میں ایک عظیم فلسفۂ زندگی کی سادگی اور بصیرت کی پاکیزگی جھلکتی ہے۔ وہ کہتے

---

[1] بودھ روایات کے مطابق یہ واقعہ ۵۴۳ ق۔م میں پیش آیا۔ لیکن ان کی پیدائش اور موت کی تاریخوں کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ فلیٹ نے پیدائش ۵۶۳ ق۔م اور موت ۴۸۳ ق۔م قائم کی ہے۔ اس کے برخلاف آر۔سی۔ مکرجی نے پیدائش ۵۶۶ ق۔م اور موت ۴۸۶ ق۔م قرار دی ہے۔ ان کی عمر ۸۰ سال ہوئی، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

تھے۔ زندگی میں تکلیف ہی تکلیف ہے۔ زندگی کے ماوراء مسرت ہے۔ انھوں نے وجود کے فلسفہ کی وضاحت علت اور اس کے معلول کے ذریعہ کی۔ وہ کہتے ہیں: "کرم جیون کا ایک بندھن ہے جو خواہشات سے پیدا ہوتا ہے، اور خواہشات جہالت کا نتیجہ ہیں۔ جہالت کو ختم کر دو تو سمجھ لو تمام تکلیفیں دور ہو گئیں، ان کی جڑ کٹ گئی، ان کا سلسلہ منقطع ہو گیا، اور ان کو ختم کرنے کا گویا راستہ مل گیا۔"[1] ان کے نامی گرامی اشٹانگک مارگ کے آٹھ اصول تھے:۔ راسخ عقیدہ، نیک ارادے، حق گوئی، راست بازی، رزقِ حلال، صحیح کوشش، عمدہ خیالات اور کامل مراقبہ۔ مختصراً تعمیرِ سیرت، تربیتِ ذہن، اور ارتقاءِ عقل انسان کا نصب العین قرار دیا گیا۔ مہاویر کی طرح انھوں نے بھی کرم اور بار بار جنم لینے کے عقیدے کو پوری طرح تسلیم کر لیا، لیکن ان کے نزدیک روح میں عقیدہ رکھنے کی کوئی وجہِ جواز نہیں تھی۔ انھوں نے الہام والقا کی بجائے عقل و ادراک کو اہمیت دی اور خود انسان کو اپنا معمار بنا دیا۔ اگر انسان کے خیالات پاکیزہ ہیں اور اس کی رفتار و گفتار، نفسانی خواہشات، عداوت، فریب وغیرہ کی آلودگی سے مبرا ہیں تو اسے دیوتاؤں کے حضور کوئی قربانی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اشنان کے لئے گنگا پر جانے کی ضرورت ہے کیونکہ قریب میں جو کنواں ہے وہ بھی اس مقصد کو پورا کر سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے پیرووں کے سامنے جو نصب العین رکھا وہ سادگی، پاکیزگی اور اخلاقی قدروں کے ایسے امتزاج کا حامل ہے جس کے ذریعہ انسان طمع اور تکلیف کو ختم کر کے 'نروان' کا مستحق ہو جاتا ہے۔

گوتم کے نزدیک انسان کی قدر و قیمت اس کے عمل پر منحصر تھی نہ کہ اس کے اعلیٰ خاندان یا اونچی ذات پر۔ ذات پات کی بندشوں کے وہ قائل نہ تھے اور اسے معیوب سمجھتے تھے۔ ان کے مذہب کے دروازے برہمن اور شودر سب پر یکساں کھلے ہوئے تھے۔ ان کے "سنگھ" کا نظام مکمل طور پر جمہوری تھا۔ یہ برہمنوں کے تشخص الحقوق اور اجارہ داری کے لئے ایک زبردست چیلنج تھا۔ اس طرح بدھ مت نے عوام کے لئے تربیتِ نفس اور حصولِ علم و فن کے دروازے کھول دیئے۔ بدھ "سنگھ" کے بھکشوؤں اور بھکشنوں کی برادری اس زمانے کی مذہبی زندگی میں ایک عظیم تجربہ تھی، اور اس قسم کی تنظیم غالباً مذہبوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی تنظیم تھی۔ اس تنظیم کی بدولت بدھ مذہب کی خوب ترقی ہوئی اور وہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام ایشیا میں بہت تیزی کے ساتھ پھیل گیا۔

ٹھیک اس زمانے میں جب اُپنشد وحدت پرستی اور وحدت الوجود کی تلقین کر رہے تھے، توحید کے ایک جدید عقیدے کے لئے میدان تیار ہو رہا تھا جو چند صدیوں کے بعد 'ویشنومت' کے نام سے مشہور ہوا۔ بدھ اور جین مت کی طرح یہ بھی ایک چھتری تحریک تھی اور اس میں جانوروں کی قربانیوں کی سخت ممانعت تھی۔ بھگوت (مالک) سے والہانہ عقیدت اس کا نصب العین تھا۔ اس لئے وہ 'بھگوت مت' کے نام سے بھی موسوم ہے۔ بدھ اور جین مت دونوں وجودِ باری کے سوال پر خاموش ہیں۔ اس کے برخلاف بھگوت مت میں خدائے تعالیٰ کے تصور کو مرکزیت حاصل ہے جس کی خوشنودی اور لطف و کرم ہی سے نجات ممکن ہے۔ نجات کا ذریعہ 'بھکتی' ہے، یعنی اس ذات ارفع و اعلیٰ کے حضور انسان کی مکمل سپردگی، نفس کشی اور ایک باضابطہ اخلاقی شعار۔

بھگوت دھرم کے تین خاص اصول ہیں — کرم، روح اور خدا۔ کرم بے لاگ ہونا چاہیئے، روح کو دائمی اور لازوال مانا گیا ہے، خدا کا تصور یہ ہے کہ وہ کریم ہے، قادرِ مطلق ہے، لوگوں کے دکھ درد اور جہالت سے متاثر ہوتا ہے۔ 'واسودیو' روحِ ارفع و اعلیٰ ہے، تمام روحوں کی روح۔ وہی خالقِ حقیقی ہے۔ تمام جاندار مخلوق واسودیو ہی کا پرتو ہے۔ اس طرح بھگوت دھرم ایک وحدت پرست مذہب ہے جو خلوص و محبت کے ساتھ خدائے واحد کی پرستش کی تلقین کرتا ہے۔ دوسری صدی ق.م تک اس کے عقائد مرتب ہو چکے تھے اور گپت زمانے میں اس کے ماننے والوں

---

[1] بی۔ جی۔ گوکھلے: "قدیم ہندوستان، تاریخ اور سماج"

کی تعداد کافی ہو چکی تھی۔

اگر واسودیو کرشنا اس فرقے کے امام ہیں تو بھگوت گیتا اس کی کتابِ شریعت ہے۔ ہندوستان میں جو غیر معمولی مقبولیت تمام دماغوں میں گیتا کو حاصل رہی ہے۔ وہ شاید کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔ ہندوستان کی ان گنت نسلوں نے جو تعظیم و تکریم اور توصیف اس کی ہمیشہ کی ہے، اس کی بجا طور پر وہ مستحق بھی ہے۔ بلندیٔ فکر و نظر کے ساتھ ساتھ اس کے مضامین میں رنگینی اور پیغام میں وثوق و قطعیت پائی جاتی ہے۔ اس کے دامن میں اتنی وسعت ہے کہ ہندوستانی فلسفہ کی تمام اعلیٰ قدروں کو اس نے اپنے اندر سمو لیا ہے، اور مختلف نظریات و عقائد کا جو اس کی تصنیف سے بہت پہلے سے نشوونما پا رہے تھے، ایک خوش گوار امتزاج پیدا کر دیا ہے۔ پروفیسر مجمدار کہتے ہیں۔ "اپنشدوں میں وحدت پرستی کا تصوّر موجود تھا لیکن یہ خیالات منتشر حالت میں تھے۔ گیتا نے ان سب کو یکجا کر کے نجات کے ایسے ضابطے میں تبدیل کر دیا جسے ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے اور اس پر عمل کر سکتا ہے۔"[1]

گیتا دراصل مہا بھارت کا ایک جزو ہے اور اس کا ماحول کُرو کشیتر کا مشہور و معروف میدانِ کارزار ہے۔ کوروؤں اور پانڈوؤں کی فوجیں ایک دوسرے سے اپنی اپنی بات منوانے کی ضد میں دُو بدُو برسرِ پیکار کھڑی ہیں۔ ارجن مخالف فوج پر نظر ڈال کر محسوس کرتے ہیں کہ مخالفین میں بہت سے اُن کے استاد یا گورو ہیں جن کی وہ عزّت کرتے ہیں، یا قرابت دار ہیں جن سے وہ محبّت کرتے ہیں۔ یک لخت وہ پس و پیش میں پڑ جاتے ہیں، کیونکہ جنگ کا مطلب تباہی و بربادی ہے اور اُن لوگوں کا قتل و غارت ہے جنھیں کل تک وہ نہایت درجہ عزیز رکھتے تھے۔ پھر یہ سب ہونے والا قتلِ عام کس لئے ہے؟ وہ دل ہی دل میں سوال کرتے ہیں۔ اس کا جواب ان کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس جنگ و جدال کا مقصد سلطنت حاصل کرنا ہے جو خود غرضی پر مبنی ہے۔ لیکن چونکہ اعلانِ جنگ ہو چکا ہے اس لئے چھتری کا فرض ہے کہ وہ جنگ کرے۔ اس طرح ان کے ذہن میں یہ بنیادی کشمکش شروع ہو جاتی ہے اور ان کا خانۂ دل خود ایک رزم گاہ میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں ذاتی اغراض اور فرض برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں۔ کمان ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے اور وہ اس اہم مسئلہ میں اپنے فلسفی رہنما شری کرشن سے مشورہ کے لئے رجوع کرتے ہیں۔ شری کرشن ان کے شبہات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور انھیں ان کے فرض سے آگاہ کرتے ہیں۔ ارجن چھتری ہیں اور چھتری کی حیثیت سے انھیں لڑنا چاہیئے۔ لیکن اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس طرح لوگوں کو قتل کر کے ان کی جان لے لیں گے تو وہ غلطی پر ہیں، کیونکہ روح غیر فانی ہے اور نہ تلوار اسے فنا کر سکتی ہے، نہ آگ، پانی اور ہوا۔ پھر وہ یکے بعد دیگرے مختلف اور متضاد فلسفیانہ نظریات اور ان کے باہمی تعلق پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔ اس کے بعد گیتا کا پیغام آتا ہے، یعنی بے غرض عمل، اور ذاتیات کو پسِ پشت ڈال کر فرض کی انجام دہی کا پیغام۔ گیتا کہتی ہے۔ "تمھارا تعلق عمل سے ہے، عمل کے نتیجہ سے نہیں۔ عمل خود ہی اس کا صلہ ہے اور جزا اور سزا کے تصوّر کے بغیر عمل کرنا بہترین فعل ہے —" شری کرشن جی کہتے ہیں " بے غرض عمل ہی تمھارا فرض ہے، اور یہی راہِ نجات بھی ہے۔ فرض شناسی سب سے بڑا وصف ہے اور اسی کے ذریعہ سے انسان ایشور سے وصال حاصل کر لیتا ہے۔"[2]

گیتا محض ایک مذہبی نظم نہیں ہے، بلکہ اس میں زندگی کا ایک مکمل پیغام موجود ہے۔ اس میں جو مسائل حل کئے گئے ہیں ان میں آفاقیت ہے۔ ہر انسان کا دل کبھی نہ کبھی وقت کُرو کشیتر بن جاتا ہے جس میں ذاتی اغراض فرض سے ٹکراتی

[1] مجمدار: "ہسٹری آف انڈین کلچر"

[2] پی۔ جی۔ گوکھلے: "قدیم ہندوستان: تاریخ اور سماج"

ہیں، اور جب بھی دل میں اس قسم کی ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو گیتا میں اس کا کوئی نہ کوئی جواب ضرور مل جاتا ہے۔ اسی میں گیتا کی عظمت اور بے پناہ مقبولیت کا راز پوشیدہ ہے۔

بھگوت گیتا فلسفیانہ معلومات کا ایک سمندر ہے جس میں ہندوستانی فلسفہ کے تمام مکاتیبِ فکر — "سانکھیہ"، "یوگ"، "نیائے"، "ویشیشکا"، "پوردمی من سا" اور "ویدانت" اور ان کے نزاعی مسائل کا مفصل بیان موجود ہے۔ ذیل میں ان تمام مکاتیبِ فکر کا علیحدہ علیحدہ ذکر مختصر طور پر کیا جائے گا۔

سانکھیہ فلسفہ اپنشدوں کے مثالی وحدت الوجود کے عقیدے کا ایک ردِ عمل ہے۔ اس کا بانی کپیلا نامی مفکر تھا جس نے عقلی دلائل سے مظاہرِ قدرت کی وحدت کی بجائے کثرت کو ثابت کیا۔ اس نے برہما کے تصور کو رد کر دیا اور خالص عقلی معیار پر اپنے اصول کو تجزیہ کیا۔ کائنات کی توضیح کے لئے کپیلا کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ دو غیر فانی حقیقتوں، پراکرتی اور پروشا کا وجود لازمی ہے جنھیں کسی نے خلق نہیں کیا۔ پراکرتی جسے ہم آسانی کے لئے مادے سے تعبیر کر سکتے ہیں، حقیقی ہے، اور پروشا (روح) ایک نہیں، بلکہ لاتعداد روحوں کا مجموعہ ہے۔ مادہ اور روح دونوں قدیم ہیں۔ مادے کے ذریعہ کائنات کا ارتقا عمل میں آیا۔ روح بجائے خود غیر متغیر ہے، لیکن مادے کے ارتقائی عمل کا باعث اسی کا وجود ہوا۔ روح تغیر پذیر نہیں ہے، بخلاف اس کے مادے میں تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ روح صفات سے مبرا ہے، لازوال ہے، غیر متحرک ہے۔ مادہ تین خصوصیات کا حامل ہے: ستو[1]، رجس[2]، اور تمس[3]۔ یہ تین خصوصیات 'گن' (اوصاف)، مسلسل تغیر کے درجات ہیں جن کے دوران گن

بہرحال مستقل اور قائم رہتے ہیں۔ جب کبھی ان تین گنوں کا توازن بگڑتا ہے تو مادے کا ارتقائی عمل شروع ہو جاتا ہے اور غیر شعوری قدیم مادہ روح کا اثر قبول کرتا ہے اور ارتقا پذیر ہونے لگتا ہے۔ روح کی بالفعل موجودگی مادے کو حرکت میں لاتی ہے اور اس لئے مادے اور روح کا امتیاز ادراک ذریعۂ نجات بھی ہے۔

سانکھیہ فلسفہ سے بہت قریب یوگ فلسفہ ہے جس کا بانی پتنجلی تھا جس نے اپنے زمانے کے تمام رائج الوقت عقائد کو ایک باقاعدہ مسلک کی صورت میں مدوّن کیا۔ یوگ فلسفہ نے قریب قریب تمام سانکھیہ عقائد کو اپنا لیا ہے لیکن ایک ایشور کا اضافہ کیا ہے جو نہ خلق کرتا ہے، نہ جزا اور سزا دیتا ہے۔ یوگ فلسفہ کا تمام زور اس بات پر ہے کہ خیالات میں یکسوئی پیدا کی جائے اور حواسِ خمسہ کی تمام قوتوں اور ان کے افعال کو آتما کی طرف مرکوز کر دیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ انسان حواس پر قابو پائے اور تارک الدنیا ہو جائے۔

نیائے نام ہے ایک قسم کے طرزِ منطق کا جس کا بانی گوتم نامی فلسفی تھا جو اکش پاد[1] کے نام سے بھی معروف ہے۔ اس نے منطقیانہ استدلال کا ایک ایسا طریقہ مرتب کیا جو ساتھ ساتھ نجات کے وسائل بھی اپنے دامن میں لئے ہے۔ اس کے نزدیک علم کے ذرائع چار ہیں: ادراک، استنباط، تمثیل، اور عقلی شہادت۔ استنباط کی تین قسمیں ہیں: علت، معلول، نتیجہ۔ نیائے فلسفہ میں قیاس منطقی کے پانچ جزو ہیں: قضیہ، علت، توضیح بالتمثیل، تلخیصِ علت اور نتیجہ۔ حسبِ ذیل مثال سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔ "پہاڑ پر آگ لگ رہی ہے؛ اس لئے کہ پہاڑ پر دھواں دکھائی دے رہا ہے: جہاں کہیں دھواں

---

[1] ہلکاپن، تابانی، بشاشت
[2] تحریک، اشتعال، ایذا
[3] ثقل، مزاحمت اور جمود

[1] لغوی معنی ہیں "چشم پا"

ہوتا ہے آگ ضرور ہوتی ہے: پہاڑ پر دھواں ہے: اس لئے
پہاڑ میں آگ لگ رہی ہے۔"

نیائے سے ملحق 'ویشیشکا' فلسفہ ہے۔ نیائے کے بیشتر نظریات خصوصاً نظریۂ جوہر اور وجودِ کائنات ایک بڑی حد تک ویشیشکا مکتبۂ فکر سے ماخوذ ہیں۔ ویشیشکا طریقت کا بانی کناد[1] کو مانا جاتا ہے جس کے سوتر ۴۰۰ء میں قلم بند ہوئے۔ اس نے مشاہدہ میں آنے والی مختلف چیزوں کو دروّیہ (عناصر) میں تقسیم کیا، مثلاً۔ زمین، پانی، آگ، ہوا، ایتھر (اثیر)، زمانہ، خلا، روح، اور قوتِ متخیلہ۔ عناصر کی یہ تمام خصوصیات کائنات کی تشکیل کا باعث ہوئیں۔ ان سب کے اپنے اپنے علیحدہ خواص ہیں، اور وہ ایک دوسرے سے متضاد رشتے پیدا کر لیتے ہیں۔ زمین، پانی، آگ اور ہوا کے جوہر قدیم ہیں اور انھیں کسی نے خلق نہیں کیا ہے۔ وجودِ کائنات کے بارے میں اس مکتبِ خیال کے مفکرین نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ مادّے کے مختلف جوہر جب ایک خاص انداز میں مجتمع ہو جاتے ہیں تو ارتقائی عمل شروع ہو جاتا ہے اور کائنات وجود میں آجاتی ہے، اور جب وہ جوہر منتشر ہو کر کسی دوسرے انداز میں از سرِ نو مجتمع ہو جاتے ہیں تو ارتقائی عمل بند ہو جاتا ہے اور کائنات فنا ہو جاتی ہے اور ایسے ایسے کئی دَور گزر چکے ہیں۔

پوُروِ می من سا کا دعویٰ ہے کہ وید قدیم ہیں اور انھیں کسی نے خلق نہیں کیا ہے۔ ویدوں اور قربانی کی رسموں کا مطلب سمجھنا اور اس کی صحیح صحیح ترجمانی کرنا اس مسلک کا مقصد ہے۔ اس مسلک کی وضاحت مسلک کے بانی، جیمنی کی می من سا درشن میں کی گئی ہے جو ۲۰۰ء اور ۴۵۰ء کے درمیان کی تخلیق ہے۔

ان تمام مسلکوں میں قدیم ہندوستان کے مذہب اور فلسفہ پر جو بے پناہ اثر اُتّر می من سا یا ویدانت نے ڈالا ہے وہ کسی دوسرے مسلک نے نہیں ڈالا۔ "تت توَم اسی، اہم برہما اسمی" یعنی "کہ تو ہے، میں برہما ہوں" اس کا بنیادی نظریہ ہے۔ لیکن اگر حقیقت اولیٰ واحد ہے تو ہم دنیا میں کثرت کیوں دیکھتے ہیں؟ اس کا سبب مایا (جہل) ہے جو اصلی حقیقت کو جس پر ظاہری کثرت پردے ڈال دیتی ہے، ہماری نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ جہل کے باعث ہم آتما اور اُپادھی (ظاہری خصوصیات؛ بدن اور اعضاءِ بدن) میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتے۔ جہل ہمیں بار بار جنم لینے کے جنجال میں پھانستا ہے، اور یہی دنیا کی تمام تکلیفوں اور مصیبتوں کی جڑ ہے۔

مایا کی ضد ودّیا (علم) ہے جو نجات کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ علم ہمیں آتما اور ظاہری خصوصیّات میں امتیاز کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اس لئے آتما اور برہما کی اصلی حقیقت کا علم عین نجات ہے، اور یہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے کہ آتما اور برہما ایک ہیں۔

ویدانت فلسفہ کے مشہور و ممتاز شارح شنکر اچاریہ تھے جو آٹھویں صدی عیسوی کی شخصیت ہیں۔ انھوں نے بدھ مذہب کے بڑے بڑے عالموں سے مناظرے کئے اور فلسفہ کے میدان میں انھیں شکست دی۔ اس سلسلہ کے دوسرے ترجمان رامانج اچاریہ تھے جو گیارھویں صدی عیسوی کی شخصیت ہیں۔ انھوں نے بھکتی مسلک کا پرچار کیا۔ بھکتی مسلک دراصل شنکر کے ادویت فلسفہ کا ردِّ عمل تھا جس میں برہما کو صفات سے مبرا مانا گیا ہے اور اس میں بھکتی کی، جس میں برہما کا تصوّر ضروری ہے، کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اِدھر آتما، برہما، بھکتی اور رسموں کے ذریعہ نجات کے نظریات ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے، دوسری طرف ایک اور فرقہ آزادی اور استقلال کے ساتھ مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ وہ تھا شیومت، اگر ویشنو مت کی ڈانڈیں اپنشدوں کے دور سے جا ملتی ہیں تو شیومت کی جڑیں بھی آریائی دَور میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

---

[1] لغوی معنی ہیں "جوہر خور"

رُودر، جس کا ذکر رِگ وید میں موجود ہے۔ اس فرقہ کا بنیادی تصوّر ہے۔ رِگ وید میں رُودر کو قہار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ رودر تمام مویشیوں کو مارتا ہے، بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ اس کا غیظ و غضب قربانیوں سے فرد ہو جاتا ہے۔ یجُروید میں قہر و غضب کے ساتھ رُودر میں رحم و کرم کی صفات کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ قربانیوں سے جب اس کا غصّہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو وہ شبھو (مہربان و شفیق)، شنکر (رحیم و کریم)، اور شیو (مبارک اور بھاگوان) بن جاتا ہے۔ اتھروید اسے خدائے تعالیٰ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ "رُودر بس ایک ہے جس کا فرمان اس دنیا میں چلتا ہے۔ تمام جان داروں نے اسی کو خلق کیا اور وہی ان کا محافظ و نگہبان ہے۔"[1] جب تاریکی ہی تاریکی تھی، نہ دن تھا، نہ رات، نہ شے تھی نہ لاشے۔ تو وہ موجود تھا، وہ غیر مرئی ہے، اور صرف باطن کی نگاہوں سے اس کا ادراک ہو سکتا ہے۔ وہ شیو ہے، خالق اور فنا کرنے والا۔ اور اس کی حقیقی معرفت بھاؤ (عشق، عقیدت) اور ریاضت کے ذریعہ ممکن ہے۔

[1] بھنڈارکر، جسے مجمدار نے اپنی "قدیم ہندوستانی سماج کی تاریخ" میں نقل کیا۔

آخر میں، خدا کا جو تصوّر البیرونی نے ہندوستان میں رائج پایا، اس کا ذکر اس مقام پہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ البیرونی کہتا ہے، "ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ خدا واحد ہے، قیوم ہے، نہ اس کی ابتدا ہے نہ انتہا، وہ مختار ہے، قادرِ مطلق ہے، حکیم ہے، حیُ ہے، خالق ہے، حاکم ہے، حفیظ ہے، وہ وہ ہے جس کی بادشاہت نرالی ہے۔ جو مثل و ضد سے ماورا ہے۔ وہ کسی شے سے مشابہ نہیں، نہ کوئی شے اس سے مشابہ ہے۔ خدا کے بارے میں یہ عقیدہ پڑھے لکھے لوگوں کا ہے۔ وہ اسے ایشور کہتے ہیں، یعنی غنی اور کریم، جو بغیر لئے دیتا ہے۔ وہ خدا کی قدرت کو مطلق مانتے ہیں۔ خدا کے علاوہ دنیا کی تمام چیزوں میں اگر وحدت دکھائی بھی دے تو وہ وحدت نہیں کثرت ہے۔ اس کا وجود، وجودِ مطلق ہے، کیونکہ ہر وہ شے جو موجود ہے وہ اس وجودِ مطلق کے باعث وجود میں آئی ہے۔ یہ سوچنا ناممکن نہیں ہے کہ موجودات عالم نہیں ہیں اور "وہ" ہے، لیکن یہ سوچنا ناممکن ہے کہ "وہ" نہیں ہے اور موجوداتِ عالم ہیں۔"[1]

[1] البیرونی: کتاب الہند۔

قاضی عبدالودود کو اعزاز

قاضی عبدالودود بار ایٹ لا فارسی اور اردو کے مشہور اور ممتاز عالم ہیں اور بھارت اور بیرونی ملکوں میں ان کی تنقیدوں کو اردو اور فارسی ادب میں بیش بہا اضافہ تسلیم کیا گیا ہے۔ انھوں نے فارسی اور اردو ادب میں عظیم تحقیقی اور تنقیدی کارنامے انجام دئیے ہیں۔ ان کی ذات بہت سے علم دوستوں کے لئے مشعلِ راہ بنی ہے اور انھوں نے قاضی صاحب کے مشورہ اور نگرانی میں تحقیقی مقالے تیار کئے ہیں۔ اس کے علاوہ قاضی صاحب 'معیار' اور 'تحقیق' نامی دو ادبی و علمی مجلّوں کے مدیر رہے ہیں اور اب غالب کی اردو اور فارسی تخلیقات کی ترتیب و تدوین کر رہے ہیں۔

آپ کو حال ہی میں صدرِ جمہوریہ کا فارسی کا اعزاز دیا گیا ہے

تھا اور مجھے دیکھتے ہوئے مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ اس نے بڑی پُر تکلف چائے پلائی اور ہم تینوں نے ہنس ہنس کر بچپن کے بہت سے لمحات ایک دفعہ پھر گزار دئے۔

جس وقت ہم منّا کے مکان سے لوٹ رہے تھے تو ایک بڑے پکّے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھولا بولا۔

"یہ چندا کا مکان ہے۔ یاد ہے کچھ؟"

"کون چندا؟"

"وہی جیون کی لڑکی۔"

"ارے وہ چندا ۔ شادی ہو گئی تھی اس کی؟"

"ہاں اس کے تو اب کئی بچے ہیں اور بر بھی اتنا سندر ملا ہے کہ کسی کو کیا ملیگا۔ یہ مکان انھوں نے ابھی بنوایا ہے۔"

میں وہیں کھڑا ہو گیا۔ چندا ہماری گلی کی لڑکی تھی اور ہم سب اسے جانتے تھے۔ دس برس کی عمر تک تو وہ ہمارے ساتھ ہی کھیلتی رہی تھی۔ پرماتما نے اسے بڑا بدصورت بنایا تھا اور اس کی ایک آنکھ میں بھی نقص تھا۔ اس کے ماں باپ نے اس کی شادی کی بڑی کوشش کی تھی لیکن ہمارے ہوتے ہوئے تو ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ ان دنوں لڑکی کو دیکھنے دکھانے کا بھی کوئی خاص رواج نہیں تھا۔ میری نظروں کے سامنے وہ دن گھوم گیا جب چندا اور اس کی ماں ہمارے گھر آئے ہوئے تھے اور میری ماں نے ایک پنڈت کو بلا رکھا تھا جسے سب عورتیں اپنا ہاتھ دکھا رہی تھیں۔ چندا کی ماں نے چندا کو آگے دھکیل کر اس کا ہاتھ بھی پنڈت جی کے آگے کر دیا۔ اور پنڈت جی نے اس کا ہاتھ دیکھتے ہی کہا۔ "اس کی قسمت کا ستارہ تو بہت اونچا ہے۔" اور پنڈت جی کی بات سنتے ہی ساری عورتیں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ چندا جیسی بدصورت لڑکی کا جس کے ساتھ کوئی بھی شادی کرنے کو تیار نہیں تھا، قسمت کا ستارہ کیسے اونچا ہو سکتا تھا؟ مگر ان ہنسنے والی عورتوں میں چندا کی ماں شامل نہیں تھی جس نے پنڈت جی کی بات پر یقین سا کر لیا تھا۔ میں نے چندا سے ملنا چاہا اور ہم دونوں آگے بڑھے۔ بھولا نے دروازہ کھٹکھٹایا جو چندا نے ہی کھولا۔ وہ مجھے فوراً پہچان گئی اور بڑی خوش ہوئی۔ وہ ہمیں اندر لے گئی اور ہمارے منع کرنے پر بھی اس نے چائے کا پانی چڑھا دیا۔ جب وہ ہمارے پاس بیٹھی تو مجھے یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کی زندگی واقعی خوشی سے بھرپور تھی۔ اس نے اپنے الھڑ سے انداز میں میرا نام لے کر پوچھا۔

"تمھاری شادی ہو گئی؟"

میں ہنس پڑا اور بولا،

"ہم سب ایک ہی عمر کے ہیں۔ سب کی شادی ہو گئی تو میری کیسے نہ ہوتی۔ میرے تو اب چار بچے ہیں۔"

وہ مسکرا دی اور بولی:

"بالکل ویسے ہی لگتے ہو جیسے چھوٹے سے تھے۔ تم بہت کم بدلے ہو۔"

ہم چندا کے یہاں کچھ دیر بیٹھے۔ چندا کے پتی سے میری ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ وہ اپنے کام پر گیا ہوا تھا مگر چندا سے مل کر جو خوشی ہوئی تھی وہ بیان نہیں کر سکتا۔ پرماتما نے ایک بدصورت لیکن دل کی نیک لڑکی کو اس کی خوشیاں دے دی تھیں۔

بھولا اور اس کا بھائی مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے آئے۔ میری ٹرین روانہ ہوئی تو بھولا دیر تک اپنا رومال ہلاتا رہا اور میں کھڑکی پر سے گردن نکال کر اور ہاتھ ہلا کر اپنے بچپن کو الوداع کہہ رہا تھا۔ میری آنکھیں ایک دفعہ پھر نمناک ہو گئی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ زندگی اس ٹرین کی طرح تیزی سے گزرنے اور بہنے والی ہے۔ دنیا اور گلی کوچے انسانی زندگی سے زیادہ پائیدار ہیں، لیکن محبت اور خلوص کا جذبہ لافانی ہے۔ یہی جذبہ زندگی کی دھند میں چمکنے والا روشن ستارہ ہے اور ایسے ان گنت ستاروں کی کہکشاں اس دھرتی پر بھی جھلملاتی ہے!

حسن نعیم

ندائے تخلیق

سکوتِ نیم شبی میں کسی نے دی آواز
"نعیم دل سے نکالو نہ خارہائے خلش
سکوں ہے تو اسی اضطراب میں کچھ ہے،
گدازِ شوق میں، سوزِ تلاش میں کچھ ہے
جنوں کے جملہ مراحل سے تم گزر دیکھو
جمالِ فکر سے آباد ہے دلِ ویراں
شرارِ دل سے منور جہانِ فردا ہے"
یہ کون مجھ سے مخاطب ہے، اتنی قربت سے؟
یہ کس نے زخم کو دستِ شفا سے چھیڑا ہے؟
اسی خیال میں گم تھا کہ پھر صدا آئی

کہ ایک عمر گزرتی ہے جستجو کرتے
نظر کو تیز، حقیقت کو روبرو کرتے
بس ایک تم کہ تمہارے قدم نہیں اُٹھتے
قیودِ عصر کی زنجیر کاٹنے والے
فرازِ کوہ سے آواز دے رہے ہیں تمہیں
پیمبروں کے مقامات دے رہے ہیں تمہیں
رُخِ سحر سے ہٹاؤ ردائے شب للہ
عذابِ نار سے گزرو کہ طوفِ نور کرو
جگر کے داغ سے رکھو حریمِ جاں روشن
شعاعِ درد کو چومو، گلے لگاؤ، نعیم

"کمالِ عرضِ سخن جس کو تم سمجھ بیٹھے
وہ عجزِ فکر ہے، اقرارِ بے زبانی ہے
نکل کے آؤ ذرا کوچۂ خبر دیکھو
ہر ایک چاک گریباں، ہر ایک گرد آلود
نہ قتل گہہ سے ہراساں نہ سنگساروں سے"

سرِ وجود جھکائے سنا کیا سب کچھ
تمام جسم تھا گویا نشانۂ آواز
تمام روح تھی سامع، تمام غم بیدار
سکوتِ شب میں —
صدا گونجتی رہی پہروں!

شمیم حنفی

فراق گورکھپوری

فراق کا نام رگھوپتی سہائے ہے۔ ۲۸۔ اگست ۱۸۹۶ء کو شہر گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام منشی گورکھ پرساد تھا جو اپنے وقت کے ممتاز ترین وکیل تھے اور عربی و فارسی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ اردو کے اچھے شاعر تھے اور تخلص عبرت تھا۔ فراق کا بچپن اور لڑکپن باپ کے زیرِ سایہ بھائی بہنوں کے ساتھ بہت خوش حالی میں گزرا۔ تعلیم اردو سے شروع ہوئی۔ بعد میں انگریزی اور ہندی بھی ان کے نظامِ تعلیم میں شامل کر لی گئی۔ ۱۹۱۳ء میں جوبلی ہائی اسکول سے اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کا امتحان پاس کیا۔ پھر میور سنٹرل کالج الٰہ آباد میں انھیں ایف۔ اے میں داخلہ دلایا گیا۔ یہاں ان کے خاص ساتھیوں اور ہم جماعتوں میں پنڈت امرناتھ جھا بھی تھے۔ ۱۹۱۵ء میں ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا اور ہزاروں کامیاب طلبا میں فراق کا نمبر ساتواں تھا۔ اس کے بعد بی۔ اے میں داخل ہوئے۔ اس دوران میں ان کی شادی کر دی گئی۔ فراق اس سے زیادہ خوش نہیں ہوئے انھیں سنگرہنی کا روگ ہو گیا۔ ان حالات میں وہ بی۔ اے میں داخل ہوئے اور مہلک بیماریوں، مصیبتوں اور انتہائی روحانی و ذہنی اذیتوں کے باوجود انھوں نے امتحان دیا اور یونیورسٹی میں ان کی چوتھی پوزیشن آئی۔ نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بڑے خاندان کی ذمہ داریوں کا بوجھ فراق کے سر پر آ پڑا۔ چوں کہ ان کی طبیعت اور ذہانت کی شہرت اسی زمانے میں ہو چکی تھی اس لئے فوراً وہ ڈپٹی کلکٹری کے لئے منتخب کر لئے گئے اور کچھ ہی دنوں بعد ان کا انتخاب آئی۔ سی۔ ایس کے لئے ہو گیا۔

لیکن ان کا دل ٹوٹ چکا تھا اس لئے انتہائی غم زدگی کے عالم میں ان ساری حوصلہ افزا مسرتوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے وہ کانگریس میں شامل ہو گئے۔ ڈیڑھ برس کے لئے انھیں پابندِ طوق و سلاسل رہنا پڑا۔ اس کے بعد پنڈت جواہرلال نہرو نے انھیں گورکھپور سے الٰہ آباد بلا لیا اور کانگریس ورکنگ کمیٹی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر کا انھیں انڈر سیکرٹری مقرر کر دیا۔ ۱۹۲۷ء میں جب پنڈت نہرو دو ڈھائی برس کے لئے یورپ اور دوسرے ممالک کے سفر کے لئے نکل گئے تو فراق نے بھی کانگریس میں اپنا عہدہ چھوڑ کر کرسچین کالج، لکھنؤ میں پروفیسری کر لی۔ ۱۹۳۰ء میں انگریزی زبان و ادب میں ایم۔ اے کا امتحان آگرہ یونیورسٹی سے دیا اور ساری یونیورسٹی میں اول آئے۔ فوراً الٰہ آباد یونیورسٹی کی نظر ان پر پڑی اور وہ انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے یہاں بلا لئے گئے جہاں ۳۱۔ دسمبر ۱۹۵۸ء تک وہ شعبے کے مشہور ترین پروفیسر کی حیثیت سے انگریزی زبان و ادب کی تعلیم دیتے رہے۔

اس دوران میں فراق کی شہرت بھی بڑھتی گئی۔ جب وہ میور سنٹرل کالج میں طالب علم تھے اس وقت تمام پروفیسروں کی نگاہیں ان پر پڑتی تھیں۔ پھر گاندھی جی، موتی لال نہرو، جواہرلال نہرو اور کانگریس کے صفِ اول کے لیڈروں کی نگاہِ انتخاب

ان پہ پڑتی رہی۔ ۱۹۵۸ء کے اخیر تک وہ سارے ہندوستان کے لئے ایک جانی پہچانی شخصیت بن چکے تھے۔

فراق زندگی بھر ایک دکھی اور اداس انسان رہے ہیں۔ تنہائی اور بے بسی کے کرب ناک احساس کے باوجود باپ کے مرنے کے بعد انھوں نے ایک بہت بڑے خاندان کی پرورش کی۔ خاندان کا قرضہ ادا کیا۔ بہنوں کی شادیاں کیں، بھائیوں کو اونچی سے اونچی تعلیم دی۔ اپنی لڑکیوں کی شادی کی اور خانہ داری کی تمام ذمہ داریاں پوری کرتے رہے۔ اس لحاظ سے وہ زندگی کی آزمائشوں سے نبرد آزما ایک ہیرو کی شکل میں ابھرتے نظر آتے ہیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد سے یعنی گزشتہ پانچ چھ برسوں سے وہ علم وادب کی غیر معمولی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حالانکہ وہ بارہا خطرناک بیماریوں کا شکار رہے ہیں لیکن اس عالم میں بھی زبان وادب کی جو خدمات انھوں نے انجام دی ہیں انھیں بھلایا نہیں جاسکتا۔ آج کل وہ اپنی انگریزی، اردو اور ہندی تصانیف کو کئی جلدوں میں شائع ہونے کے لئے مرتب کر رہے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۷۲ برس کی ہے اور فراق آج نہ صرف اردو اور ہندی دنیا میں لافانی شہرت حاصل کر چکے ہیں بلکہ بنگال، مہاراشٹر، گجرات اور شمالی ہندوستان کی زبانیں جاننے والوں کے علاوہ یورپ، امریکہ، روس اور دیگر ممالک تک بھی ان کا کلام پہنچ چکا ہے۔

شاعری

فراق ابھی اسکول ہی میں تھے کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ اردو اخباروں اور رسائل سے مضامین منتخب کرکے وہ ان کا رواں دواں انگریزی ترجمہ لیڈر اخبار میں بھیج دیا کرتے تھے جو شائع ہو جاتے تھے۔ ایک پندرہ سولہ برس کے لڑکے سے سیکڑوں اردو جملوں کا نہایت صحیح اور صاف ستھرا انگریزی ترجمہ ہو جانا اور ان کا انگریزی اخباروں میں شائع ہونا ایک ایسا امر ہے جو اس زمانے میں بھی سارے ہندوستان میں مشکل سے ایک دو ہی نوجوانوں سے ممکن ہو سکتا تھا۔ کالج میں آنے کے بعد فراق نے میر اور دوسرے شعراء کے کچھ اشعار انگریزی نظم میں منتقل کئے اور یہ ترجمے بھی انگریزی رسائل میں شائع ہوئے۔ یہ بات واقعی قابلِ غور ہے کہ ایک نو عمر ہندوستانی طالب علم اتنی صحت کے ساتھ انگریزی عروض و قوافی استعمال کرتا ہے۔ اس واقعے سے مس کورووت، شریمتی سروجنی نائیڈو، ہرینڈر ناتھ چٹو پادھیائے وغیرہ کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اسی زمانے میں فراق نے اردو شعراء پر انگریزی مضامین لکھے جن میں مشہور ترین مضمون غالب پر ہے جو ہندوستان کے مقبول ترین انگریزی رسالہ 'ایسٹ اینڈ ویسٹ' بمبئی میں شائع ہوا اور جس کا اسّی فیصدی حصہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اعتراف کے ساتھ اپنی تاریخ ادب اردو میں جوں کا توں شامل کر لیا۔ اس مضمون کا ایک تراشا فراق نے اپنے انگریزی پروفیسر ایس۔ جی۔ ڈن کو دکھایا۔ پروفیسر موصوف نے فراق سے کہا کہ اگر اسے ایک رسالے کی حد تک بڑھا دو تو آکسفورڈ میں شائع کرا دوں گا۔ لیکن فراق مصیبتوں اور انتشار کے شکار تھے۔ ابھی بی۔ اے بھی نہیں پاس کیا تھا اور فوراً ہی بعد والد کا انتقال ہو گیا تھا اس لئے یہ سارے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔

اس کے بعد ہی وہ منزل آئی جب انھوں نے اردو شاعری شروع کی اور ظاہر ہے کہ ابتدا غزلوں سے ہوئی۔ یہ غزلیں ابتدائی کوششیں ہونے کے باوجود بعض اوقات کچھ ایسی کسک اور تڑپ کا ثبوت دیتی تھیں جو آگے چل کر فراق کو فراق بنانے والی تھیں۔

اب فراق کی عمر تئیس چوبیس برس کی ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنی پہلی اردو نظم 'نغمۂ حقیقت' لکھی جس نے فوراً انھیں اچھے نظم گویوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ ساتھ ہی ساتھ ہر ڈیڑھ دو مہینے کے بعد فراق غزلیں کہتے رہے اور عین جوانی کے عالم میں ایسے لازوال شعر ان کے قلم سے نکلے۔

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں — خیر تم نے تو بے وفائی کی
کوئی افسانہ چھیڑ تنہائی — رات کٹتی نہیں جدائی کی

غرض کہ کاٹ دئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

کچھ رنگ سا فضا سے ٹپکتا ہے اے جنوں — جیسے ہوا ہے شیشۂ بادہ بہار کیا

دل دکھے روئے ہیں شاید اس جگہ اے کوئے دوست
خواب کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا

کبھی جب پاس آکر بیٹھ جاتے ہیں وہ اے ہمدم
مدد کا مجھ کو رہ جاتا ہے اپنے پر گماں ہو کر

اسی زمانے میں فراق نے ٹامس ہارڈی اور کچھ دوسرے انگریزی شعراء کی چند مشہور ترین نظموں کے اردو نظم میں ترجمے کئے جنھیں بلند ترین ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔ اردو کے بلند ترین ادیبوں میں بھی آج تک بہت کم ایسے ادیب گزرے ہیں جنھیں دو تین زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہو یا جو نثر اور نظم دونوں میں بلند مقام حاصل کر سکیں۔ یا جو شاعری کی مختلف اصناف میں یکساں کامیابی حاصل کر سکیں۔ کوئی غزل میں شہرت حاصل کرتا ہے تو رباعیوں، نظموں اور معرّی نظموں میں کچھ نہیں کر پاتا۔ کوئی بہت بڑا مرثیہ نگار ہوتا ہے تو غزلیں نہیں کہہ پاتا، کوئی بہت بڑا جدید نظم کا لکھنے والا ہوتا ہے تو غزلوں کے معاملے میں اس کے یہاں سناٹا رہتا ہے۔ اس معاملے میں چھوٹے شاعروں کا ذکر نہیں بلکہ صفِ اوّل کے شعراء کا بھی ذکر آجاتا ہے۔

فراق نے انگریزی اور ہندی میں بلند پایہ اور خوب صورت نثر کے ہزارہا صفحات لکھے اور شایع کئے ہیں۔ افسانے لکھے ہیں۔ غزلوں میں تو ان کا شمار فارسی اور اردو کے بلند ترین شعراء میں ہو چکا ہے۔ رباعیوں میں بھی انھوں نے اپنے لئے اتنی ہی بلند جگہ بنالی ہے۔ ان کی نظمیں بڑے سے بڑے نظم گویوں کی شاہکار نظموں کے ساتھ رکھی جا سکتی ہیں۔ اردو تنقید کو بھی انھوں نے بہت کچھ دیا ہے۔ اس لحاظ سے فراق کا مرتبہ آج ہی کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے اردو کے اِنے گنے بڑے ادیبوں کے ساتھ ہے۔ ایسی چہار رُخی عظمت کم ہی ادیبوں کو نصیب ہوتی ہے۔

جیسے جیسے فراق اردو شاعری میں اپنے کام کو آگے بڑھاتے گئے انھیں کئی باتوں کا احساس ہوتا گیا۔ وہ اس بات کے تو قائل رہے کہ غزل، نظم اور رباعی میں بھی اردو شاعری غیر معمولی ترقی حاصل کر چکی ہے۔ لیکن کئی باتیں اردو شاعری کی انھیں ناآسودہ رکھتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ جذبات کی پاکیزگی، گہرائی، بلندی اور انسانی شخصیت کی صدہا داخلی تہیں ایسی چیزیں تھیں جہاں تک اردو شعراء کم ہی پہونچ سکے تھے۔ دوسری چیز یہ تھی کہ اردو شاعری کو اس کی ضرورت تھی کہ حیات و کائنات پر اس کا ایمان اتنا گہرا ہو جائے اور اتنا عالم گیر کہ اشعار زیادہ سے زیادہ طمانیت روح پیدا کر سکیں۔ عام طور پر اردو شاعری اور خصوصاً غزل مصیبتوں اور ناکامیوں کا رونا رہی ہے۔ جہاں نشاط و طرب یا ہنسی خوشی کا رنگ آیا ہے وہاں گہرائی یا سنجیدگی نہیں رہی ہے اور اگر رہی بھی ہے تو بے حد کم۔ فراق سے پہلے اردو شاعری نے زندگی کو پوری طرح قبول نہیں کیا البتہ اس قبولیت کی کوششیں برابر نظر آتی ہیں۔ اپنی نظموں، غزلوں اور رباعیوں سے فراق نے ان خامیوں اور کمیوں کو جس حد تک پورا کیا ہے اس کی مثالیں میر و غالب کے علاوہ کم ہی شعراء کے یہاں نظر آتی ہیں۔

عام طور سے اردو شاعری میں غنائی عناصر کی کمی تھی بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ بیشتر فقدان تھا۔ فراق صوتیات کے رموز سے غیر معمولی حد تک واقف ہیں۔ اس لئے ان کے کلام میں وہ جھنکار، وہ موسیقی اور وہ رنگا رنگ سنگیت ہمیں ملتا ہے جو ہمارے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور جس سے ہماری زندگی گونجنے لگتی ہے۔

فراق کی شاعری میں ایک انتہائی جانی پہچانی اور مانوس فضا کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں انتہائی رمزیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ درک اور استعجاب کے اس امتزاج کی مثالیں اردو شاعری میں کم ہی ملتی ہیں۔ فراق صرف ایسی باتیں نہیں کہتے جو بجائے خود نہایت قابل قدر ہیں بلکہ انھیں ایسے لہجے میں کہتے ہیں جو سوفی صدی فطری ہوتے ہوئے بے حد سحر کار اثر بھی ہے۔ زندگی کے واقعات اور داخلی زندگی کے سانحات بلکہ پورا وجود اور اس کے جذبات فراق کے یہاں سب کے سب ایک

معجزہ بن جاتے ہیں۔

خیر و برکت کے عناصر اردو شاعری میں گہرے معنوں میں مفقود تھے۔ فراق کی شاعری نے زندگی پر امرت کی برکھا کر دی اور اسے ایسے چمتکاروں سے بھر دیا کہ دیوتاؤں کی آنکھوں میں بھی آنسو آجائیں۔ شاعری کو زندگی کے لئے ایک اشیرواد ہونا چاہیئے جسے سنسکرت میں "پرساد گُن" کہا گیا ہے۔ غم دنیا بھر کی شاعری کا ایک مرکزی موضوع رہا ہے۔ انگریزی شاعر شیلے نے کہا ہے کہ ہمارے میٹھے سے میٹھے گیت انتہائی دُکھ اور غم کے خیالات کے ترجمان رہے ہیں۔ بھوبھوتی نے بھی کہا تھا کہ 'کرُونا رس' رسوں کا راجہ ہے۔ فراق کے یہاں سوز و گداز کی انتہائی گھلاوٹیں ہمیں ملتی ہیں اور ان کی شاعری میں دکھ درد، غم و الم آپ اپنے مرہم بن گئے ہیں۔ شاید اردو کے کسی شاعر کے یہاں میر کو چھوڑ کر ایسی قوتِ شفا نہیں ملتی جیسی ہمیں فراق کی شاعری میں ملتی ہے۔

شاعری کے لئے ایک بہت نازک اور اہم مسئلہ یہ رہا ہے کہ ہر چیز کو، ہر خیال کو، ہر حالت کو، انتہائی حد تک انسانی بنا دے اور شاعری کو پُرخلوص اور حساس انسانیت کا ایک مسودہ بنا دے۔ کائنات کو انسانیت کے سانچے میں ڈھال دے اور اس انسانیت کو بھی انسانیت کے سانچے میں ڈھال دے جو زندگی کی ہلچل کی وجہ سے آپ اپنے سے منحرف ہو جاتی ہے۔ فراق نے انسانیت کا یہ لہجہ محض اپنے اشعار کو نہیں دیا بلکہ دنیا کے ذرّے ذرّے کو انسان بنا دیا۔ کہتے ہیں ؎

پوچھ مت کیفیتِ قلب دمِ فکرِ سخن — میں نے دیکھی ہیں خیالوں کی بھی آنکھیں پُرنم

ان کے لہجے کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک شعر ہے ؎

میں نے اس آواز کو پالا ہے مَر مَر کے فراق
آج جس کی نرم لَو ہے شمعِ محرابِ حیات

اس آواز پر آج لوگ کان لگائے ہوئے ہیں کیونکہ اس کی نرم لو محرابِ حیات کے لئے صرف شمع ہی نہیں بن جاتی بلکہ خود ان کی اپنی بصیرت اور بصارت بنتی ہے۔

ہندو تہذیب کی سب سے قیمتی روایت رہی ہے فطرت کی مناظرِ فطرت سے ہم آہنگی۔ یا آپ چاہیں تو اسے پرستشِ فطرت بھی کہہ سکتے ہیں۔ عربی و فارسی شاعری میں مناظر فطرت کا احترام اور ان کی ہماری زندگی کے ساز سے ہم نوائی، اس کی بہت کمی رہی ہے۔ اردو شاعری میں مناظر فطرت کی تصویر کشی تو کافی ملتی ہے اور کہیں کہیں خوب ملتی ہے۔ لیکن وہ بات نہیں ملتی جو کالی داس بلکہ رگ وید یا انگریزی شاعر ورڈس ورتھ کے یہاں ملتی ہے اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ فطرت کا کوئی بڑا شاعر سنسکرت کو چھوڑ کر ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی نہیں ہوا۔ فطرت کی شاعری کا مطلب محض فوٹوگرافی نہیں ہے بلکہ مناظر کی معنویت اور ان کی لطیف ترین انسانی اپیل، ان کی پاکیزگی، یہاں تک کہ ان کی الوہیت کو ظاہر کرنا ہے۔ یہ کام اردو شاعری کی پوری تاریخ میں تنہا فراق نے انجام دیا ہے۔ دھرتی کی شاعری سب سے بڑی شاعری ہے اور جب ہم دھرتی کا نام لیتے ہیں تو پورا نظامِ شمسی اور اس کے بے شمار مناظر اور ان کی بدلتی ہوئی کیفیتیں سب کے سب ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ فراق نے فطرت اور مناظر فطرت کی شاعری اس طرح کی ہے کہ ان کی تصویروں کے خطوط میں ایک نوح اور لہجہ پیدا ہوگیا ہے۔ ہم ان مناظر کو محض دیکھتے نہیں بلکہ فراق کے ایسے اشعار اور ایسی نظموں کو پڑھتے ہوئے ان مناظر میں ڈوب جاتے ہیں۔ فطرت سے یہ شدید لگاؤ فراق کی شاعری میں ایک ایسی صفت پیدا کر دیتا ہے جسے ہم فضا آفرینی کہتے ہیں اور جو اردو شاعری میں بلکہ اردو کی اس شاعری میں بھی جسے منظر نگاری کہتے ہیں، بے حد کمیاب ہے۔

فارسی اور اردو کے بڑے سے بڑے شاعروں کے یہاں جس موضوع پر بڑے بڑے شعر کہے گئے ہیں اور جن خیالات اور جذبات کا اظہار کیا گیا ہے وہ اپنی تمام شدت اور دل فریبی کے باوجود اپنی حدود سے آگے نہیں بڑھتے۔ یوں براہ راست ذرّے کو صحرا اور قطرے کو دریا تو فارسی اور اردو شاعری میں ضرور کہا گیا ہے۔ جلوے اور پردے کے لفظ بھی اس سلسلے میں کام میں لائے

گئے ہیں لیکن غالباً یونانی مزاج و ادب کا اثر یا غالباً خود اسلام کی معقول پسندی کے کارن فارسی اور اردو شاعری میں محدود و لامحدود کا امتیاز قائم رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ محدود کو براہ راست لامحدود بھی کہہ لیا جائے لیکن فراق کے یہاں محدود و لا محدود کی بحث براہ راست بہت کم اٹھائی جاتی ہے۔ وہ ایسے لہجے میں مخصوص و محدود چیزوں، باتوں اور خیالوں کو پیش کرتے ہیں کہ ان کے سرے ان کے الفاظ کے غنائی اثرات کی وجہ سے لامحدود سے مل جاتے ہیں۔ غالب تک کے یہاں ہر بات پورے رچاؤ اور سجاوٹ کے ساتھ اپنی حدود ہی میں رہتی ہے۔ فراق کے یہاں ہر محدود بات میں پورے آفاق کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آفاق کے کلیے اور قوانین، پورے آفاق کا وجود، اس کی رفتار اور اس کا طرزِ عمل کسی خاص خیال، کسی خاص جذبہ یا کسی خاص واقعہ میں رونما ہوا ہے۔ فارسی اردو شاعری کی لطافتوں کا کیا کہنا۔ لیکن وہ ہر شعر میں کسی نقطے پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے۔ فراق کے یہاں نقطہ لامحدود حلقہ بن جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں موضوعات اپنی حدوں کو توڑتے ہوئے دکھائی اور سنائی پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس بہترین اردو فارسی شاعری جامد تو نہیں ہے لیکن کوئی منجمد چیز نظر آتی ہے یعنی جمود اس میں نہیں ہے لیکن انجماد ہے۔ فارسی اور اردو شعراء فلسفہ اور تصوف کے سہارے محدود کو لامحدود بناتے اور بتاتے ہیں۔ فراق یہ نہیں کرتے وہ محدود کا ذکر اس قدر ڈوب کر کرتے ہیں کہ محدود لامحدود کا اوتار معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس سے ان کی شاعری میں ایک رمزیت، اشاریت، علامیت اور خواب ناکی کا عالم پیدا ہو جاتا ہے۔ کائنات محدود بھی لیکن وہ لامحدود کی اس فضا میں چنگیں لگاتی ہوئی نظر آتی ہے کہ ایک حسین، غیر متعین اور سرمدی ابہام کا احساس کرا دیتی ہے۔ مادیت اور روحانیت کی یہ آنکھ مچولی فراق کی شاعری کو بیک وقت اسی دھرتی کی شاعری بھی بنا دیتی ہے اور کسی دوسری دنیا کی بھی۔ فراق کہتے ہیں ؎

بس اتنے پر ہمیں سب لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا کو ہم اک دوسری دنیا سمجھتے ہیں

روحانیت کی دنیا مادیت کی دنیا سے الگ نہیں ہے اگرچہ یہی مادیت کا نازک احساس ہو سکے۔ یہ نیا احساس ہے جو فراق نے اردو شاعری کو دیا۔ مجسم دنیا غیر مجسم بھی ہے۔ حواس خمسہ، حواس روحانی کی ہی ایک شکل ہیں۔ ہر جسمانی لذت ایک روحانی لذت بھی ہے۔ ہر انسانی غم ایک 'الوہی' عالم و کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ پاک ہے اس لئے وہ ذرّہ بھی ہے اور روحانیت کی ایک جھلک بھی۔

فراق کی شاعری نے ہندوستان کے اعلیٰ ترین دماغوں اور بلند ترین شاعروں اور ادیبوں کو بے حد متاثر کیا ہے۔ اس جگہ اس سلسلے کی ایک ایسی مثالیں دے دینا غالباً غیر مناسب نہ ہوگا کیونکہ اس سے واضح طور پر یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ فراق کی شاعری نے کس حد تک اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کو متاثر کیا ہے۔ سجّاد ظہیر نے ابھی حال ہی میں اردو شاعری کے مسائل پر ایک وقیع مضمون میں فراق کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: "فراق کا درجہ اردو شاعری میں بہت بلند ہے اور اب ان کا شمار اردو کے چند سب سے بڑے شاعروں میں کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ہماری شاعری کو لازوال شعر دیئے ہیں۔ ان کے بلند مرتبہ اشعار کا آفاقی درد، ان کی وہ گہری اداسیاں جن سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے، جسمانی حسن اور شہوانی کیفیات کو روحانی بلندیاں بخشنے کا ان کا مخصوص انداز، ان کے لہجے کی مترنم نرمیاں اردو شاعری کو بہت آگے لے گئی ہیں انھوں نے ہماری انسانیت کو گہرا کیا ہے اُسے سوز و ساز سے بھرا ہے۔"

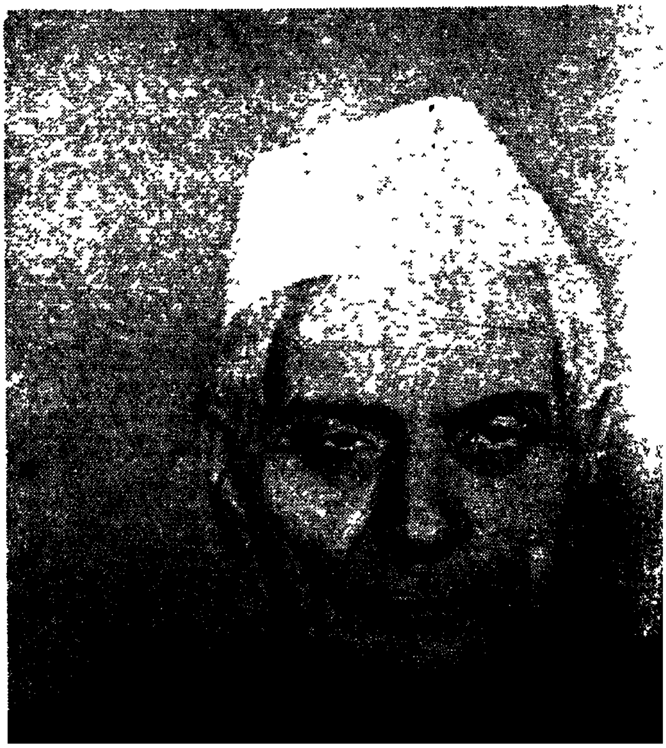
جگر مرادآبادی الہ آباد میں دائرۂ شاہ اجمل میں ٹھہرتے تھے۔ وہاں انھوں نے ایک بار اس امر کا اظہار کیا کہ وہ فراق کی شاعری سے کس حد تک متاثر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فراق کے سامنے تو ہم جیسے بہتوں کا پتہ بھی نہ رہے گا۔ جگر نے غالب کا یہ شعر سنایا ؎

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد



قاضی عبدالودود

آپ اردو اور فارسی کے مشہور محقق ہیں
حال ہی میں آپ کو صدرِ جمہوریہ نے فارسی
زبان کا ایوارڈ دیا ہے۔



پنڈت میلا رام وفا

اردو کے مشہور شاعر اور صحافی
جنھیں حکومت پنجاب نے اردو
کے ادیبِ اعلیٰ کا اعزاز دیا ہے



دھلی میں
رام لیلا کا جلوس

بھارتیہ کلا کیندر کا رام لیلا بیلے۔

رام، سیتا اور

راون، کنبھ کرن اور میگھ ناد







ہنری چرن شنکر رام کے روپ میں



شریمتی کمودنی سیتا کے روپ میں

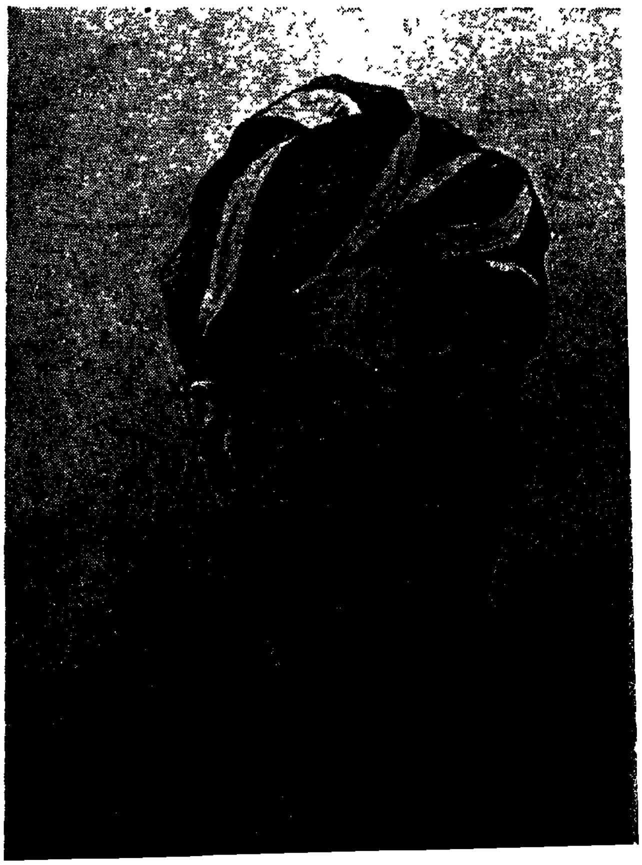
ے کی چند تصاویر



گاؤں کی پنہارنیں ایک رقص کے ذریعے رام کے لانے کی خوشی اور خوش حالی کا مظاہرہ کر رہی ہیں



ہندوستانی موسیقی کے ماہر
اُستاد مشتاق حسین
جن کا حال ہی میں انتقال ہوگیا



مراٹھی زبان کے مشہور مصنف - ہری نارائن آپٹے
متعلقہ مضمون ص ۲۴ پر دیکھئے

اس کے بعد انھوں نے فراق کا یہ شعر سنایا کہ فراق کے شعر میں غالب کے شعر سے کہیں زیادہ معنویت اور شعریت ہے۔

تیرہ بختی نہیں مٹتی دلِ سوزاں کی فراق
شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

اس کے بعد جگر نے کہا۔ "فراق خود نہیں جانتا کہ وہ کتنا بڑا شاعر ہے۔" ایک دوسرا واقعہ سنئے۔ کسی نے ایک بار جگر سے کہا کہ فراق تو اپنے اشعار میں میر و غالب تک سے اپنا مقابلہ کر بیٹھتے ہیں۔ اس پر جگر نے برجستہ کہا ۔ "تو کیا فراق بہت بڑی غلطی کرتا ہے؟"

اصغر گونڈوی اور بابو رام چند ٹنڈن ہندوستانی اکیڈمی میں ساتھ ساتھ کام کرتے تھے۔ اپنے انتقال سے کچھ پہلے اصغر نے ٹنڈن صاحب سے کہا تھا کہ آنے والے دور میں اردو شاعری کی سب سے بڑی شخصیت فراق کی ہوگی۔ اس بات کو آج پچیس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔

نیاز صاحب نے کئی بار نگار میں فراق کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ فراق کے یہاں نزاکت و لطافتِ خیال کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے زیادہ نزاکت اور لطافت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آج سے تیس برس قبل فراق پر ایک مضمون لکھتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ اس وقت اردو میں جتنے چھوٹے بڑے شاعر ہیں ان میں سب سے زیادہ درخشندہ و عظیم مستقبل فراق کا ہے۔

حضرت جوش کی گھن گرج آج تمام اردو دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ ایک صاحب نے کچھ دیر تک فراق کی شاعری کے خلاف جوش صاحب کے سامنے بہت کچھ کہہ ڈالا۔ جوش چپ چاپ سنتے رہے اور بعد میں صرف یہ کہا کہ آپ کی باتیں میں نے سن لی ہیں لیکن فراق کے دیوان میں صدہا ایسے شعر ملیں گے جن کا جواب اردو کے کسی دیوان میں نہیں ملے گا۔

مولانا حسرت موہانی نے ایک مختصر مضمون میں فراق کے دو اشعار کی جی کھول کر داد دی ہے۔ وہ اشعار یہ ہیں:

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

زندگی کیا ہے آج اسے اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

اوروں کو تو جانے دیجئے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد جیسے نقادوں کی تیغِ قلم کے وار سے اردو کا شاید ہی کوئی بڑا شاعر یا ادیب بچا ہو۔ نگار کے غزل نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے آج سے بیس پچیس برس پہلے انھوں نے فراق کو ایک حقیقی شاعر بتایا تھا۔ یہی الفاظ یاس یگانہ نے بھی فراق کے لئے استعمال کئے تھے۔

فراق کی شاعری اردو دنیا کی حدود پار کر چکی ہے۔ ابھی حال ہی میں فرانس میں عالمی ادب سے متعلق ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں فراق کی شاعری اور ان کے ادبی کارناموں کو یہ کہہ کر سراہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے بنائے ہوئے سانچوں میں فراق نے ہندو تہذیب کی قیمتی اقدار سمو دی ہیں۔ کئی غیر ملکی زبانوں میں فراق کے اشعار کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ گجراتی کے ایک مشہور رسالے میں فراق پر ایک سیر حاصل مضمون شائع ہو چکا ہے۔ ہند و پاک کے صدہا اہلِ نظر ادیبوں نے بارہا اس امر کا اظہار کیا ہے کہ فراق نے جو شاعری اردو کو دی ہے وہ وہی ہے جس کا ہم انتظار کر رہے تھے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے ایک سنسکرت پروفیسر نے ایک بار کلاس میں فراق کے کچھ اشعار سناتے ہوئے کہا کہ ان میں تین اشعار ایسے ہیں جن میں سنسکرت کے مشہور ترین شاعروں کی آواز گونج رہی ہے۔ ہندی کے مشہور پروفیسر اور ادیب پنڈت ہزاری پرساد دویدی فراق کی نظم 'جگنو' ہفتوں تک اپنے سرہانے رکھ کر سوتے تھے۔ 'جگنو' ہی سے متعلق ایک اور واقعہ سنئے۔ چند سال قبل مشہور فنکار پرتھوی راج کپور جب الٰہ آباد آئے تو فراق سے ملنے بھی آئے۔ کئی ادیب اور ادب دوست حضرات جمع ہو گئے تھے۔ پرتھوی راج کی فرمائش پر فراق نے 'جگنو' سنائی جب نظم اس جگہ پہنچی جہاں وہ بچہ اپنی اس ماں کو یاد کرتا ہے جو

اسے ایک ہی دن کا چھوڑ کر مرگئی تھی تو فراق تو ضبط کئے ہوئے تھے لیکن سارے مجمع کی آنکھوں میں بار بار آنسو بھر آتے تھے اور لوگ اپنی آنکھیں پونچھتے جاتے تھے۔

فراق نے اپنی شاعری میں ہندو مزاج اور ہندو زندگی کے وہ آفاقی اور عالم گیر عناصر پیش کئے ہیں جنھیں مسلمانوں نے بھی نہایت پیار اور احترام کے ساتھ اپنایا ہے یا سراہا ہے۔ ان کے لہجے کی نرمی اور اس نرمی کا سنگیت ہمیں ہندوستانی معاشرت کی سادگی اور پرکاری کے ساتھ ساتھ اس کی اثر انگیزی کا پتہ بھی دیتا ہے۔

اردو شاعری میں ایک بہت بڑا اور قیمتی اضافہ جو فراق نے کیا ہے وہ دور افتادہ، بالکل غیر متعلق چیزوں اور کیفیتوں کے باطنی اور باہمی ربط کی طرف لطیف اور بلیغ اشارے ہیں۔ حضرت نیاز فتحپوری نے اس امر کی طرف اشارہ کیا جب انھوں نے یہ لکھا کہ فراق کی تعبیرات قدرِ اوّل کی چیزیں ہیں۔ مثلاً محبوب کی یاد کا ہوا کے چلنے سے بظاہر کوئی تعلق نہیں لیکن فراق کے یہ دو شعر سنئے۔

تھی منتظر سی دنیا خاموش تھیں فضائیں ۔۔۔ آئی جو یاد تیری چلنے لگیں ہوائیں
بغیر علم بھی جیسے ہوائیں چلتی ہیں • یونہی کچھ اہلِ محبت کو یاد آئے جا

فراق کے کلام میں سنئے، سچے، گہرے، لطیف اور وجدان پر مستقل طور پر اثر ڈالنے والے اشعار اس کثرت سے ملیں گے جس کی مثال ہمیں پوری اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ فراق کے یہاں وقت کے گزر جانے کا احساس ایک نیا سوز و گداز پیدا کر دیتا ہے۔

ہماری زندگیٔ عشق کا وہ پہلا خواب ۔۔۔ ہمیں بھی بھول چکا ہے تمھیں بھی یاد نہیں

•

پھر بھی سکونِ عشق پر آنکھ بھر آئی بار ہا
گو غمِ عشق بھی فراق کچھ غمِ جاوداں نہیں

خدا یا حقیقت سے متعلق عام خیال یا عقیدہ یہ رہا ہے کہ وہ تبدیلی سے بے نیاز ہے۔ وقت کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن دنیا اور دنیا کی زندگی تغیر پذیر ہے اور یہ خیال حساس وجدان کے لئے نہایت پرسوز و گداز ہے۔ انگریزی شاعر ورڈز ورتھ کے یہاں یہی خیال اس کا مرکزی تصور ہے۔ یعنی چیزیں گزر جاتی ہیں اور ان کی یاد باقی رہ جاتی ہے۔ ہم کئی لحاظ سے فراق کو یادوں کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

دیکھ آئے آج یادوں کا نگر ۔۔۔ ہر طرف پرچھائیاں پرچھائیاں

پھر ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں ؎

یہ وقتِ شام یہ ایامِ رفتہ کی یادیں ۔۔۔ دلِ خراب کی پرچھائیاں ہوئیں پیدا

یہ احساس فراق کے یہاں انگریزی شاعری کے مطالعے سے آیا۔ انھوں نے ورڈز ورتھ کا غائر مطالعہ کیا ہے اور ان سے گہرے اثرات قبول کئے ہیں۔

دنیا کے جتنے بھی بڑے شعراء ہوئے ہیں ان میں شیکسپیئر کو چھوڑ کر ہر ایک کا اسلوب بیان اور اسلوب خیال بیشتر یکساں رہا ہے۔ ایک ہی اسلوب کی پرورش اچھے سے اچھے شعراء نے کی لیکن فراق کے یہاں اسالیب کی وہ رنگا رنگی ملتی ہے جو ہمیں اور کسی کے یہاں نظر نہیں آتی۔ یہی نہیں کہ غزلوں میں فراق کا ایک اسلوب بیان ہے، نظموں میں دوسرا اور رباعیوں میں تیسرا ہے۔ بلکہ ان کی غزلیں بھی رنگا رنگ اسالیب بیان کی حامل ہیں اور بالکل یہی حال ان کی نظموں اور رباعیوں کا ہے۔ لیکن ان رنگا رنگ اسالیب کی تہ میں وہ تمام صفات جھلک جاتی ہیں جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ فراق زندگی کو اس کے ہر روپ میں پہچان لیتے ہیں اور ان کے اسالیب بیان میں ہم زندگی کا بہروپ دیکھتے ہیں۔ جب وہ کسی کیفیت، کسی نفسیاتی حالت، کسی منظر یا عمل کی تصویر کھینچتے ہیں تو وہ اس کی ایک جھلک دکھا کر ہمیں یہ محسوس کرا دیتے ہیں کہ انھوں نے پورے منظر، پوری کیفیت اور پورے تسلسل عمل کا عرفان ہمیں کرا دیا ہے۔ کوئی بھی شخص پورے دریا کو ایک جگہ کھڑا ہو کر نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن دریا کی ایک جھلک دکھا کر صدہا میل تک پھیلے ہوئے دریا کا اندازہ فراق کرا دیتے ہیں۔ جزویات کو عالمگیر بنا دینا اسی کو کہتے ہیں۔

گزشتہ تیس چالیس برس کی اردو شاعری اور خاص کر اردو غزل جس حد تک فراق سے متاثر ہوئی ہے کسی اور شاعر کے کلام سے متاثر نہیں ہوئی۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو فراق کی شاعری کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ فراق سے محض مرعوب و متاثر نہیں ہیں بلکہ اس سے پیار کرتے ہیں۔ اور اس پیار کا راز کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ فراق شعر کہتے وقت ایک ایسے فردِ واحد نہیں رہ جاتے جو عام انسانوں سے مختلف ہے اور جو اپنی انفرادیت کا سکہ دلوں پر بٹھانا چاہتا ہے۔ فراق شعر کہتے وقت پوری انسانیت بن جاتے ہیں۔ وہ کئی کروڑ آدمی بن جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے نیم شعوری یا تحت الشعوری احساسات کو جگا کر دیتے ہیں۔ ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو، اپنے داخلی تاثرات کو، اپنے جمالیاتی ردِ عمل کو کچھ بھول سا گیا تھا جس کی یاد فراق نے تازہ کر دی۔ اس کی شاعری میں ہر شخص اپنی کھوئی ہوئی انسانیت کو بلکہ اپنے آپ کو پا جاتا ہے اور وہ کچھ ہو جاتا ہے جو وہ تھا یا ہے، لیکن جس کی اسے اب تک اچھی طرح خبر نہیں تھی اور جسے دنیا کے جھمیلوں نے اس سے چھین لیا تھا کیونکہ یہ دنیا ہم کو ہمیں سے چھین لیتی ہے۔

ہر زبان کی اچھی سے اچھی شاعری بڑی حد تک ادبی اور کتابی چیز ہوتی ہے۔ دنیا کی شاعری بڑی حد تک پُر تکلف زبان استعمال کرتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں جب ہم ادب کی تخلیق کرتے ہیں تو اتنا بن کر کیوں کرتے ہیں۔ اس حد تک بننا دراصل بگڑنا ہے۔ ایک بار فراق کو ایک نوجوان اچانک کسی ریلوے اسٹیشن پر مل گیا جسے فراق مطلق نہیں پہچانتے تھے۔ اس نے فراق سے کہا کہ آپ نے مجھے ایک بڑی اچھی نوکری دلوا دی۔ فراق نے پوچھا وہ کیسے؟ اس نے کہا کہ ایک گریجویٹ پوسٹ کے لئے انٹرویو میں ممتحن نے مجھ سے کہا کہ اردو کے کچھ اچھے اشعار سناؤ۔ میں نے اسے بہت سے منتخب اشعار سنائے وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر میں نے آپ کا یہ شعر سنایا ؎

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

یہ شعر سن کر وہ اچھل پڑا۔ اس پر کچھ دیر تک وجد کی سی کیفیت طاری رہی۔ پھر اس نے مجھے بہت اچھے نمبر دے کر رخصت کر دیا۔ اردو کے تمام شعراء کے اچھے سے اچھے شعر یاد کرنے کی کوشش کیجئے آپ پائیں گے کہ ان پر ادبیت، انشا پردازی یا تکلف غالب ہے۔ لیکن فراق کے اس شعر میں زندگی خود بول رہی ہے۔ یہ ادب اور شاعری کی زبان نہیں بلکہ زندگی کی زبان ہے۔ رسمیت اور تکلف سے یہ شعر بالکل پاک ہے۔ اس شعر کو زندگی کے ہاتھوں نے رچایا اور سنوارا ہے۔ کسی نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ بلند ادب شاذ ہی ادبی ہوتا ہے۔ جسے ہم مضمون آفرینی کہتے ہیں فراق کے یہاں وہ چیز ایسی تلاش و جستجو بن جاتی ہے جس کے ذریعہ زندگی کی دریافت کی دولت ہمارے ہاتھ آتی ہے۔

ایک بار فراق کی زبان سے ایک مصرعہ یوں موزوں ہو گیا
ع جب یاد کسی کی آنے لگی بڑی کاوش کے بعد دوسرا مصرعہ ہاتھ آیا اور شعر یوں ہو گیا ؎

جب یاد کسی کی آنے لگی ہر غفلت قسمیں کھانے لگی

ایک اور شعر سنیئے ؎

آج آنکھوں میں کاٹ لے شبِ ہجر
زندگانی پڑی ہے سو لینا

اس شعر پر نظر ڈالیئے خاص کر دوسرے مصرعے پر۔ یہ ادب کی زبان ہے یا زندگی کی زبان ہے؟ شاعر بول رہا ہے یا انسان بول رہا ہے؟

فراق کی زبان میں وہی اصول کارفرما ہیں جن کی طرف ورڈز ورتھ نے اپنی نظموں کے دیباچے میں اشارہ کیا ہے۔ یعنی ایسے الفاظ اور فقروں کی تلاش اور ان کا استعمال جو زیادہ سے زیادہ آدمی کسی جذبے کے تحت استعمال کریں یعنی پورے سماج کی زبان کو فراق نے اپنی زبان بنا لیا ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں اس اصول نے ایک نیا سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ہر ہستی لامتناہی سوز و گداز کی حامل ہے۔ یہی عالمگیر سوز و گداز، عالمگیر زبان میں فراق کے اسلوب میں ملتا ہے۔ ان کی آواز میں ہر آدمی اپنی آواز سن

لیتے ہیں۔

عام طور سے شاعری یا تو غم کی ہوتی ہے یا خوشی کی، قنوطیت کی یا رجائیت کی۔ فراق کے یہاں وہ بلند سنجیدگی اور وہ عالمگیر انسانیت نظر آتی ہے جہاں غم اور خوشی، قنوطیت اور رجائیت اور زندگی کی تمام مختلف النوع کیفیات مل کر ایک پوری اکائی بناتی ہیں۔ زندگی نہ صرف غم ہے نہ صرف خوشی، نہ محض ان دونوں کا میزان بلکہ زندگی زندگی ہے۔ ایک ہی زندگی کی ہزارہا کیفیات ہوتی ہیں نہ کہ ہزارہا کیفیتوں کو جوڑنے سے ایک زندگی بنالی جائے۔ پہلے کل تب جزو۔ بقول جرمن فلسفی ہیگل "میزان پہلے ہے، اعداد بعد کو ہیں۔" فراق نے ہمیں توحید حیات کا سبق دیا ہے اور کائنات کی وحدت کا بھی۔

ہر زندہ زبان میں اسالیب بیان کے صدہا امکانات ہوتے ہیں۔ یہی حال اردو کا بھی ہے۔ اردو کا ہر اچھا شاعر اردو زبان کی تہ در تہ سطحوں کو چھوتا ہے۔ فراق آخری تہوں تک پہونچتے نظر آتے ہیں جس سے آگے احساس کے امکانات باقی نہیں رہ جاتے ؎

آگے شاید پڑتا ہے عدم کچھ ٹھیک ہمیں معلوم نہیں
یہ درد کی حد ہے فراق یہیں سے دل کی بستی چھوٹ گئی

اس کے بعد وہ ابدی سکوت زندگی پر طاری ہوجاتا ہے جس کا ہم کچھ احساس تو کر سکتے ہیں لیکن جو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ہے فراق کی تہ در تہ اور موج در موج شاعری۔ حافظ کے یہاں جو چیز سرمستی ہے وہ ہوش کا ایسا ٹھہراؤ ہے جسے ہم ادراک کی قریب آخری منزل کہہ سکتے ہیں۔ فراق کی شاعری میں جو کیفیت ہے وہ سرمستی کی نہیں بلکہ ہوش کی کیفیت ہے یعنی ایسی ہوش مندی جو وجدان کی آنکھیں کھول دے۔ فراق کی شاعری پر گیان اور عرفان کا نشہ چھایا ہوا ہے نہ کہ سرمستی کا۔

فراق کی شاعری کا سب سے بڑا حصہ عشقیہ شاعری کا ہے۔ عشقیہ شاعری کے لئے اردو میں غزل کا سانچہ بہت موزوں اور مناسب سانچہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ اسی وجہ سے فراق کو اس صدی کا سب سے بڑا غزل گو کہا جاتا ہے۔ اردو کی عشقیہ شاعری کے بڑے سے بڑے نمونے مشہور غزل گویوں کے یہاں ملتے ہیں لیکن فراق نے غزل میں عشقیہ شاعری کو اس قدر تہ در تہ اور پہلو دار بنا دیا ہے، حسن اور عشق کے باہمی روابط اور نازک رشتوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ حسن و عشق کی ایک نئی دنیا پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ دنیا نہ غم کی دنیا ہے نہ خوشی کی دنیا بلکہ ایک کیف آفریں ادراک اور عرفان کی دنیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

حاصلِ حسن و عشق بس اتنا آدمی آدمی کو پہچانے

کبھی آپ محبوب کی محبت و مہربانی سے اس حد تک متاثر ہو سکے ہیں کہ شرمانے لگیں؟ اب فراق کا شعر سنیے ؎

اُٹھنے والی ہے وہ نگاہِ کرم عشق بھی کچھ لگا ہے شرمانے

فضا تبسمِ صبحِ بہار رکھتی لیکن
پہونچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی۔

یہ ذلتِ عشق ترے ہاتھوں اے دوست تجھے کہاں چھپائیں

آخری شعر ذرا غور سے دیکھئے۔ معشوق بپھر گیا ہے اور عاشق کے ساتھ نہایت بدسلوکی سے پیش آرہا ہے۔ عاشق کی نظر میں اس کی ہستی اتنی پاکیزہ ہے کہ عاشق اس کا تصور ہی نہیں کر سکتا کہ معشوق کسی ناخوشگوار منظر کو دیکھے۔ مصیبت یہ ہے کہ یہ ناخوشگوار منظر بھی معشوق ہی کے ہاتھوں پیدا ہوا ہے ؎

تو یاد آئے ترے جور و جفا ہرگز نہ یاد آئیں
محبت میں یہ معصومی بڑی مشکل سے آتی ہے

فراق کی غزلوں میں وہ جادو ہے کہ لوگ ان کی نظموں کی طرف زیادہ توجہ نہیں کر سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی نظموں میں بھی وہ بلندیاں ہیں اور شاعری کے وہ شاندار نمونے ہیں جو انھیں بلند سے بلند نظم گویوں کی صف میں لاکر بٹھا دیتے ہیں۔ بلند انگریزی شاعروں کا ایک خاص اثر فراق کی نظموں میں نظر آتا ہے اور وہ اثر ہے لہجہ اور صوتیات کا ایسا رچاؤ جو اردو نظموں میں بہت کم ہے۔ ان نظموں کے لہجے میں دنیا کی بلند ترین شاعری کی تہذیب ہمیں ملتی ہے۔ فراق کی پوری شاعری ایک نئے دارالعلوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

اردو شاعری کے عام لہجے نے اور بلند سے بلند اردو شاعری کے نو سے فی صدی اشعار نے اردو دنیا کے شعور کو ایک خاص سطح سے بلند نہیں ہونے دیا۔ فراق نے اپنے ہزارہا اشعار اور سیکڑوں غزلوں سے اور متعدد نظموں اور رباعیوں سے اس سطح کو بہت بلند کر دیا ہے۔ یوں تو ان کی شاعری اس دھرتی کی شاعری ہے لیکن اس شاعری میں یہ دھرتی آسمان سے باتیں کرتی نظر آتی ہے۔ فراق کی غزلوں میں کوئے جاناں یا کوئے محبوب اس زمین کی جانی پہچانی گلیاں ہیں جن کے سرے دیولوک سے جا ملتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمین کے عناصر ترکیبی روح کے عناصر ترکیبی ہیں۔ بلند سنسکرت ادب اور دورِ حاضر میں ٹیگور کی شاعری جس طرح زمین اور زمین کی زندگی کو جنت نشاں بنا دیتی ہے اسی طرح فراق کی شاعری بھی مادیت کو روحانیت میں بدل دیتی ہے۔ یہ شاعری ایک کیمیاوی اثر رکھتی ہے جو ہماری زندگی کو اندر سے بدل دیتی ہے۔ گوشت و پوست کے جذبات کو روحانی تجربوں اور کیفیتوں میں بدل دینا شاعری کا شاید سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

نذرِ جواہر

منجانب شعرائے قدیم بزمِ سخن بھاگل پور

پھیکی ہے روشنائی تو غمگیں قلم ہے آج	ہندوستاں کے رہبرِ اعظم کا غم ہے آج	کریم اسعدی
چھلنی ہر اک جگر ہے ہر اک آنکھ نم ہے آج	ڈھایا یہ آسماں نے بڑا ہی ستم ہے آج	انجم برہجوی
جس کو بھلا سکیں نہ کبھی وہ الم ہے آج	گاندھی کے بعد یعنی جواہر کا غم ہے آج	ذرنی پانی پتی
دل پر عجیب چوٹ ہے اور چشم نم ہے آج	گاندھی سے بھی عظیم جواہر کا غم ہے آج	عادل غازی پوری
گل ہائے گلستاں پہ یہ طرفہ ستم ہے آج	گاندھی کے بعد آہ جواہر کا غم ہے آج	کامل بھاگلپوری
پرچم ہر ایک قصرِ حکومت کا خم ہے آج	اپنا تو اپنا غیر بھی غم میں بہم ہے آج	اختر بھاگلپوری
رخصت ہوا جو ہند کے گلشن کا باغباں	مرجھائے گل ہیں آنکھ بھی بلبل کی نم ہے آج	شاغل قادری
کس جانِ جاں کے سوگ میں دنیا ہے مبتلا	سونا ہر اعتبار سے کوئے صنم ہے آج	نظر بھاگلپوری
گاندھی و ابوالکلام کے بعد اے مرے ندیم	فخرِ زمانہ یعنی جواہر کا غم ہے آج	قمر بھاگلپوری
سارا جہاں ہے پیکرِ آلام و رنج و غم	وہ آسمانِ پیر نے توڑا ستم ہے آج	میکش بھاگلپوری
سکتہ میں شیخ ہے تو برہمن اداس ہے	خاموش آہ مشعلِ دیر و حرم ہے آج	راہی مجاہد پوری
دنیا سے چل بسے جو وزیرِ عظیم ہند	ہر دل ہے بے قرار ہر اک آنکھ نم ہے آج	حکیم عبدالباقی
سنتے ہی مرگِ رہبرِ محبوب کی خبر	ہر ایک فرد پیکرِ رنج و الم ہے آج	اشہر بھاگلپوری
دنیا کے حکمراں بھی مؤدب چتا پہ ہیں	قدموں پہ مرنے والے کے جاہ و حشم ہے آج	عرفان بمنڈیہی
ماتم کدہ ہے آج بنا صحنِ گلستاں	ہر پھول سوگ میں ہے کلی کو بھی غم ہے آج	مسرور آروی
پیر و جواں سبھی کا کلیجہ ہے پاش پاش	ٹوٹا ہر ایک دل پہ وہ کوہِ ستم ہے آج	نسیم آروی
ہندوستان کی راہبری کے لئے غنی	نہرو نہیں تو نہرو کا نقشِ قدم ہے آج	غنی بھاگلپوری

جب ہری چوڑیاں ٹوٹتی ہیں........"

جب بچّے کی نازک باہیں اپنے ماں باپ کی گردن میں
اک پیار کے بندھن کے بدلے پھانسی کے پھندے ہو جائیں
جب بھائی کی سانسوں میں بھائی بارود کی بو محسوس کرے
تاریخ جہاں کے سادہ ورق جب خون سے گندے ہو جائیں
جب مخلص کے احسانوں کی قیمت تلوار کا پانی ہو
سب نازک رشتے دنیا کے جب گورکھ دھندے ہو جائیں
جب دھرم اپاہج ہو جائے اور ہمدردی ابھی شاپ بنے
اور کچھ ایسا پرورتن ہو انسان درندے ہو جائیں
اس وقت شرافت کہتی ہے اب خون بہانا جرم نہیں
خود اپنی حفاظت کی خاطر ہتھیار اٹھانا جرم نہیں

ہم دیکھ رہے تھے دنیا کی گرتی ہوئی اخلاقی قدریں
فطرت کو بیڑی پہنانے اٹھتے ہوئے ظالم طیارے
طاقت کی ہوس میں قوموں کو انصاف کا قاتل بنتے ہوئے
تہذیب کی نازک کرنوں کو ڈستے ہوئے خونیں اندھیارے
ایٹم میں مجسم ہوتی ہوئی انسان کے سینے کی دوزخ
فصلوں میں اگتے ہوئے فاقے، باغوں میں بکتے انگارے

سائنس کی لو میں جلتا ہوا انسان کا تابندہ ماضی
تہذیب کا فن سکھلاتے ہوئے تعمیر و ادب کے گہوارے
لیکن جب سیما پہ ہم کو کچھ سفّاکوں نے چھیڑ دیا
دنکر[1] کا نگ پتی جاگ اٹھا، پرساد[2] کا ہمالہ جاگ اٹھا

ہم جب بھی جاگے دنیا کو سندیس دیا نو جیون کا
کتنے ہی مہا پرش ابھرے ہیں موقعہ موقعہ کی نزاکت سے
لیکن جب خطرہ ہے سر پر لیکن جب سرحد زخمی ہے
اک بھائی حملہ آور ہے ہم پر دو گز دھرتی کے لئے
جب آگ اگلتی ہیں توپیں ہم امن پرست انسانوں پر
تلوار کی دھاریں تو ڑ چکیں جب پیار محبت کے رشتے
جب ہری چوڑیاں ٹوٹتی ہیں لداخ کی کومل کلیوں کی
تب بدھ اور گاندھی نہیں مگر پرتاپ سے خودسر جاگیں گے
جو اپنے دل کے ٹکڑوں سے یہ ہری چوڑیاں جوڑیں گے
اور ان کو توڑنے والوں کو پاتال میں بھی نہیں چھوڑیں گے

---

[1] رام دھاری سنگھ دنکر کی ہندی کی مشہور نظم "ہمالیہ" کی طرف اشارہ ہے۔
[2] جے شنکر پرساد۔ نظم "ہمالہ کے آنگن میں اسے پرتھم کرنوں کا دے اپہار" کی طرف اشارہ ہے۔

[3] یہ قافیہ غلط ہے۔ ر۔ع۔م

عبدالمجیب سہالوی

کاتب کی کرشمہ سازی

غالب نے اللہ میاں سے فریاد کی تھی کہ ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

غالب کو اللہ میاں سے شکایت تھی کہ دمِ تحریر ان کا کوئی آدمی نہیں تھا کہ وہ دیکھ سکتا کہ کراماً کاتبین غلط سلط ان کے اعمال نامے میں کیا لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن ہمارا تجربہ ہے کہ کاتب چاہے فرشتہ ہو چاہے انسان کبھی بالکل صحیح نہیں لکھ سکتا اور کچھ نہ کچھ ترمیم کرکے اپنی ٹانگ اڑانا ضروری خیال کرتا ہے۔

قریب انیس سال سے ہمارا اور کاتبوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ہم غالب کی طرح یہ بھی شکایت نہیں کر سکتے کہ ع

آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا ؟

ہمارا آدمی یعنی پروف ریڈر ہر وقت کاتبوں کے سر پر اسی طرح سوار رہتا ہے جس طرح کراماً کاتبین ہمارے کاندھوں پر، اور ہم بھی کچھ زیادہ دُور نہیں ہوتے لیکن کاتب کی کرشمہ سازی کی کوئی کاٹ نہیں۔ فرشتہ کاتب اور انسان کاتب کی غلطی میں فرق یہ ہے کہ فرشتے کی غلطی کا خمیازہ آدمی کو آخرت میں بھگتنا پڑتا ہے اور اڈیٹر کو اپنے کاتب کی کرشمہ سازی کا جلوہ صبح ہی صبح صفحۂ اخبار پر نظر آ جاتا ہے۔

غالب کو صرف کاتب سے شکایت تھی ہمیں کاتب اور پروف ریڈر دونوں سے ہے۔ کاتب صاحب تو خیر بھول کر غلط لکھ جاتے ہیں۔ لیکن غضب یہ ہے کہ پروف ریڈر صاحب مارے قابلیت کے جان بوجھ کر صحیح کو غلط بنا دیتے ہیں جو کاتب کی غلطی سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم نے طے کر لیا ہے کہ چاہے کاتب کا غلط لکھا ہوا نہ پڑھیں لیکن پروف ریڈر کا صحیح کیا ہوا ضرور پڑھتے ہیں۔

اس عادت کی بنا پر ہمیں کاتب صاحبان کی کرشمہ سازیوں کے علاوہ پروف ریڈر صاحبان کی کچھ لرزہ خیز اصلاحوں کا بھی تجربہ ہوا ہے۔ فی الحال آپ کاتب صاحبان کی ستم ظریفیاں سنئے اور سر دھنئے۔

غالباً یہی سردی کا زمانہ تھا کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ رات کی دلفیں بکھرنے کے بجائے سکڑ کر گڈی پر آگئی تھیں اور وہ ٹیڈی گرل معلوم ہو رہی تھی اور ہر شخص ٹھٹھرا ہوا تھا۔ کاتبوں کی انگلیاں سخت سردی سے برف ہو رہی تھیں لیکن کتابت کی کرنٹ ان میں گرمی پیدا کر رہی تھی۔ ایک کاتب صاحب سردی کے مارے کسی بڑے بقراط مضمون نگار کا مضمون لکھ رہے تھے۔ مضمون جیسا تھا وہ تھا ہی لیکن خط اتنا خراب تھا کہ دیکھتے ہی ان کے بڑے آدمی ہونے کا یقین ہو جاتا تھا کیونکہ اب بدخط ہونا بڑے ہونے کی نشانی قریب قریب طے کر لیا گیا ہے غالباً اسی لئے مضمون نگار صاحب نے بدخط بن کر اپنے کو بڑا ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ کامیاب اس لئے کہ وہ بدخط ہونے میں

م بڑے آدمیوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔
انھوں نے اپنے مضمون میں ایک جگہ سردی کا زور دکھاتے
ہوئے لکھا تھا کہ "سردی نے اپنی زمہریری چادر فضا میں پھیلا دی"
لیکن چونکہ سردی سے کاتب صاحب کی انگلیاں سکڑی ہوئی
تھیں اس لئے وہ نہ تو "زمہریری" لکھنے کی جرأت کر سکیں اور
نہ "چادر فضا میں پھیلا سکیں" اور انھوں نے ضروری ترمیم کر کے
لکھ دیا کہ "سردی نے اپنی زہر بھری چادر فضا میں پھیلا دی۔"

ایک دوسرے کاتب صاحب معلوم نہیں کیوں بابر سے خفا
تھے۔ شاید یہ وجہ ہو کہ بابر نے ہمایوں کے اچھے ہونے کی دعا کر کے
اپنی جان دے دی لیکن اس نے یہ نہ کیا کہ لوگوں کا خط اچھا کرنے
کی دعا کر کے کاتبوں کی جان مصیبت سے بچا لیتا۔ بہرحال جو وجہ
ہو اُن کا قلم "بابری فوج" لکھنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہوا
اور انھوں نے مضمون نگار کی اجازت لئے بغیر "بابری فوج" کی
جگہ "باہری فوج" لکھ دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ کاتب صاحب سے
یہ غلطی اس وقت سرزد ہوئی جب مضمون نگار اور بابر دونوں
کاتب صاحب کے ہاتھوں اپنی یہ درگت بنتے دیکھنے کے لئے اس
دنیا میں موجود نہ تھے ورنہ کوئی تعجب نہ تھا کہ مضمون کی اشاعت
کے بعد "بابری فوج" اخبار کے دفتر پر دھاوا بول دیتی تو کاتب صاحب
کو پتہ چلتا کہ وہ "باہری فوج" نہیں "بابری فوج" تھی۔

غالب نے اللہ میاں سے کراماً کاتبین کی کتابت پر ایک مرتبہ
شبہے کا اظہار کر کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے تمام کاتبوں کو
خفا کر دیا اور اب وہ غالب کے مشہور سے مشہور شعر کو بھی بغیر کاٹ
چھانٹ کے کبھی نہیں لکھتے۔ غالب کا مشہور شعر ہے ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ہمارے بعض کاتب صاحبان کاتب ہی نہیں بلکہ ماشا اللہ شاعر بھی
ہیں۔ چناں چہ جن کاتب صاحب کے پلّے غالب کا یہ شعر پڑا تھا وہ
شاعر ہونے کے ناتے غالب کی اس خصوصیت سے کہ وہ اکثر انوکھی
بات کہتے ہیں نہ صرف واقف تھے بلکہ اس پر انھیں سخت اصرار تھا
اس لئے انھیں یہ بات پسند نہ آئی کہ عام لوگوں کی طرح غالب بھی
"خدا کی قدرت" جو عام بول چال میں شامل ہے اپنے انوکھے کلام
میں استعمال کریں۔ اس لئے انھوں نے غالب سے معذرت کا اظہار
کئے بغیر "خدا کی قدرت" کے بجائے "خدا کی مورت" کر دیا۔ جب غلطی
کی طرف توجہ دلائی گئی تو نہایت فلسفیانہ انداز میں بولے، "مورت
میں بھی تو خدا ہی کی قدرت کا جلوہ نظر آتا ہے۔" اب آپ ہی بتائیے
اس کے بعد ان سے کچھ کہنے کی کیا گنجائش تھی۔ توجہ دلا کر خود ہی
شرمندہ ہوئے اور ٹوکنے کی معافی مانگی۔

ایک دوسرے کاتب صاحب کے ایک موقعہ پر غالب کا
یہ شعر ؎

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قیمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

لکھتے وقت یہ اعتراض پیدا ہو گیا کہ اس میں عاشق کے گریبان
کے لئے صرف "چار گرہ" کی ناپ رکھی گئی ہے۔ جو بالکل ناکافی ہے۔
کیوں کہ یہ اُس زمانے کی ناپ ہے جب لوگ عشق میں مبتلا ہو کر
صحرا نوردی کرتے تھے اور مجنوں کی طرح سوکھ کر کانٹا ہو جاتے
تھے۔ لیکن اب تلاشِ روزگار کے سلسلے میں فرصت نہ ہونے کی
وجہ سے ایسے لوگوں نے عشق کرنا چھوڑ دیا ہے جنھیں پیدل
صحرا نوردی کرنی پڑے اور سوکھ کر کانٹا ہوں۔ اب یہ کارِ خیر ان لوگوں
نے اپنے سر لے لیا ہے جن کے پاس کار بھی ہے اور ٹہل ٹہل کر
سرد آہیں بھرنے کے لئے گھر کے سامنے لان بھی۔ اس لئے وہ
صحرا نوردی کرنے کے بجائے صرف موٹر پر تفریح کرتے اور کراتے
ہیں۔ ان کے لئے عشق ٹانک کا کام کرتا ہے اور وہ غمِ عشق
میں دبلے ہونے کی جگہ موٹے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ایسی صورت
میں اگر ان کے گریبان کی ناپ چار ہی گرہ رکھی گئی تو گردن اتنی
کس جائے گی کہ خطرناک نتائج برآمد ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس
لئے انھوں نے غالب سے معذرت کے ساتھ شعر میں ترمیم کر کے
"چار گرہ" کی جگہ "چار گز" کر دیا تاکہ گلا کسنے کا کوئی امکان باقی
نہ رہے۔

ایک کاتب صاحب کافی اپ ٹوڈیٹ آدمی ہیں اور چونکہ کوٹ پتلون سے ہر وقت لیس رہتے ہیں اس لئے فرش پر بیٹھ کر کتابت کرنے کی جگہ کرسی پر ٹیک لگا کر کتابت کرتے ہیں ۔ اُن کی زبانِ قلم پر جب یہ شعر آیا ؎

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

تو زبانِ قلم نے بوریا لکھنے سے صاف انکار کر دیا ۔ کیوں کہ اس سے نہ صرف غالب کی ہتک ہوتی تھی بلکہ بوریئے پر چلنا خود ان کے قلم کو سخت ناگوار تھا اس لئے انھوں نے غالب کی بے سروسامانی پر پردہ ڈالنے کے لئے یہی مناسب خیال کیا کہ 'بوریا' کے بجائے 'تولیا' کر دیا جائے تاکہ اگر غالب کسی کی آمد آمد سے گھبرا کر اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھنا چاہیں تو کوئی دقت نہ ہو اور بوریئے کی بدنمائی بھی شعر سے دور ہو جائے ۔ رہا تولیئے کا گھر میں نہ ہونا، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ دھوبی غالب کے زمانے میں بھی کپڑے دیر سے لانے اور کھو دینے کے عادی تھے اور اب بھی ہیں اس لئے گھر میں تولئے کا نہ ہونا یا میلا ہونا اتنا برا نہیں جتنا گھر میں بوریئے کا ہونا یا نہ ہونا ہے ۔

کاتب صاحبان کو غالب سے جتنی پرخاش ہے اتنا ہی مجھے غالب کے اشعار نقل کرنے کا شوق ہے ۔ چناں چہ میں نے کتابت کے لئے ایک اور مضمون دیا جس میں غالب کا یہ شعر کسی موقعہ پر نقل کیا گیا تھا ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

میں غالب کے معاملہ میں کاتب صاحبان کی ہمدردی سے واقف تھا اس لئے میں نے کہا کہ جلد لکھ کر لائیے مجھے جانا ہے میں مضمون دیکھ کر جاؤں گا ۔ وقت کم تھا اس لئے کاتب صاحب باوجود کوشش کے شعر میں کوئی خاص ترمیم نہ کر سکے مگر چلتے چلتے تخلص کا تاج غالب کے سر سے اتار کر آتش کے سر پر رکھ دیا اور یہ چوری اتنی خاموشی سے کی گئی کہ پروف ریڈر صاحب کو بھی اس کا پتہ نہ چلا اور ہم بھی تیزی سے پڑھ گئے ۔ لیکن خلافِ عادت جب غالب کو ننگے سر دیکھا تو ہم چونک پڑے اور چوری کھل گئی ۔ ہم کاتب صاحب کی اس فن کاری پر خفا ہونے کے بجائے خوش ہوئے اور پاس بلا کر انھیں کے ہاتھوں غالب کی تاج پوشی کی رسم ادا کرائی ۔

غالب کے بقول ع

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

کاتب صاحب کے ناوک کا شکار تنہا غالب ہی نہ تھے بلکہ میر پر بھی کاتب صاحبان کبھی کبھی نظرِ عنایت کر دیتے ہیں لیکن بہت معمولی یعنی میر کی جگہ کبھی مُنیر یا پیر لکھ دیتے ہیں ۔ جہاں تک ان کے اشعار میں ترمیم کا تعلق ہے اس کا ہمیں کم تجربہ ہے ۔ کیونکہ ہمیں بدقسمتی سے میر صاحب کے اشعار بہت کم یاد ہیں ۔ اس لئے ہم نقل بھی کم کرتے ہیں ۔ اتفاق سے ایک مرتبہ یہ شعر یاد آ گیا اور ہم نے لکھ دیا ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اُن کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

تو کاتب صاحب نے یہ ستم کیا کہ 'اُنکی' زلفوں کو 'اپنی' زلفوں سے بدل کر شعر کی ساری رنگینی خاک میں ملا دی ۔ جب کہا کہ یہ کیا غضب کیا تو فرمانے لگے کون ہے جو 'اپنی' یعنی 'خودی' کی زلفوں میں اسیر نہیں ۔ خیر میں نے تو کاتب صاحب کی یہ کج بحثی برداشت کر لی لیکن اگر خدا نخواستہ میری جگہ میر صاحب ہوتے تو یقین کیجئے کہ کاتب صاحب کی زلفوں کی خیر نہ تھی ۔

ایک کاتب صاحب جو شاید شاعری کو شیطانی فعل سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ شاعر اپنے اصلی نام کے بجائے فرضی نام سے صرف اس لئے شاعری کرتے ہیں کہ جب میدانِ حشر میں پکار ہو تو ان کا پتہ ہی نہ چلے ۔ ورنہ تخلص کی کوئی خاص اہمیت نہیں ۔ اسی لئے تخلص لکھتے وقت وہ صحت کا کوئی خیال نہیں رکھتے ۔ ایک مرتبہ وہ جگر صاحب پر کوئی مضمون لکھ رہے تھے جس میں کئی جگہ 'جگر مرادآبادی' کا لفظ آیا تھا اور وہ ہر جگہ جگر مرادآبادی کی جگہ 'جگت مرادآبادی' لکھ گئے تھے ۔ میں نے دیکھا تو سر پیٹ

لیا اور کہا کہ آپ نے جگر صاحب پر کیوں ظلم کیا۔ فرمانے لگے میں نے ظلم کیا کہ جگر صاحب نے۔ جگر صاحب مراد آباد میں پیدا تو ضرور ہوئے لیکن قیام ہمیشہ گونڈے میں رہا اور جگ مراد آباد میں بنتے بھی ہیں اور مشہور بھی ہیں اس لئے مراد آبادی کہلانے کا حق جگر صاحب سے زیادہ جگ کو ہے۔ میں نے کہا ایسی ہی ضد تھی تو مراد آبادی نکال دیا ہوتا۔ کہنے لگے اس سے تو بڑا لکھا نیچا پڑ جاتا۔ اس میں تو صرف جگر کی 'ر' کو گھسیٹ کر جگ بنا دیا۔

شروع شروع میں جب سونا کنٹرول قانون لاگو ہوا اور بعد ازاں سوناروں کی ہڑتال' 'سوناروں کی ستیہ گرہ' اور 'سوناروں کے جلوس' کی خبریں لکھتے لکھتے کاتبوں کا قلم سوناروں پر خوب رواں ہو گیا تو اتفاق سے اسی زمانے میں کہیں سے سوکارنو صاحب کے پُرجوش خیر مقدم کی خبر بھی آگئی۔ پھر کیا تھا۔ کاتب صاحب کے قلم نے 'سوکارنو کے بجائے سوناروں' کا وہ پُرجوش خیر مقدم کیا کہ ہم پڑھتے ہی کرسی سے اچھل پڑے۔ خیریت ہوئی کہ اس وقت کوئی تھا نہیں ورنہ کاتب صاحب کے علاوہ ہمیں بھی شرمندگی ہوتی۔

شاعروں اور لیڈروں کے ناموں کے علاوہ کاتب صاحب کا قلم آفت رقم الفاظ پر بھی کم ستم نہیں ڈھاتا۔ 'جمعۃ الوداع' کو جمعیۃ العلماء، اگر افشانی کو ربیع الثانی، برشگال کو پرتگال اور بہنوئی کو بھنوئی بنا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

ایک مرتبہ تو کاتب صاحب کے قلم اعجاز رقم نے وہ معجزہ دکھایا کہ ہم لوگ دنگ رہ گئے۔ ریاستی حکومت کے ایک بہت نیک نام اور سینئر اعلا افسر کے انتقال کی خبر آئی جس میں لکھا تھا کہ پس ماندگان میں ان کے ایک صاحبزادے 'زیرِ تعلیم' ہیں۔ لیکن کاتب صاحب کو اتنے سینئر افسر کے صاحبزادے کا ابھی تک زیرِ تعلیم رہنا پسند نہ آیا اور انھوں نے حکومت سے مشورہ لئے بغیر بہ یک جنبشِ قلم انھیں 'وزیرِ تعلیم' بنا دیا جو ہم لوگوں کے لئے خوش گوار لیکن حیرت انگیز انکشاف تھا۔

اسی طرح ایک مضمون میں کسی مصوّر کی تعریف کرتے ہوئے مضمون نگار نے لکھا تھا کہ وہ متعدد شاہ کاروں کا خالق تھا لیکن 'بیروزگار' تھا۔ کاتب صاحب چوں کہ خود فن کار تھے اور با روزگار تھے اس لئے ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آئی کہ متعدد شاہ کاروں کا خالق 'بیروزگار' بھی ہو سکتا ہے اس لئے قلم کے ایک ہی وار سے 'بیروزگار' کو 'پروردگار' بنا دیا۔

غالباً اسی لغزش سے خفا ہو کر اللہ میاں نے کاتبوں کو 'نقل را چہ عقل' کی بددعا دے دی۔ لیکن اس بددعا کا اثر عقل اور نقل دونوں پر پڑا۔ یعنی نہ تو وہ عقل سے کام لیتے ہیں اور نہ نقل مطابقِ اصل کرتے ہیں۔

مضمون نگار حضرات سے

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھیے
۲۔ اپنا ایڈریس نہایت صاف اور خوش خط لکھیے
۳۔ غیر مطبوعہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ ڈاک کے ٹکٹ اور مناسب سائز کا لفافہ ہوگا۔

(ادارہ)

سودیش دیپک

اندھیرے کا سیلاب

بند دروازے کے سوراخوں سے روشنی کی لکیریں میلے فرش پر بچھ گئی ہیں۔ بستر میں جاگا بیٹھا کب سے انتظار کر رہا ہوں، ہوٹل والا چائے لائے تو اٹھوں۔ تکیوں نے کمرے پر لگا ہی ڈالتا ہوں۔ رات کو سوچ کر سویا تھا کہ صبح اسے صاف کروں گا۔ اب ارادہ بدل لیا ہے اچھا، اگر صفائی کی بھی جائے تو اس کمرے کی شکل و صورت میں کیا فرق آجائے گا؟ ہاں اگر یہ تکوں نے سے چکور ہو جائے...... سر جھٹک کر اس بات کو سوچنا بند کر دیتا ہوں۔ چائے پینے سے پہلے ایسی ہی واہیات باتیں دماغ میں اتھل پتھل مچائے رہتی ہیں۔

چائے والا بھڑا دروازہ کھول کر اندر آتا ہے۔ مکان سڑک پر ہے۔ سامنے سڑک پر گندے غلیظ بچے دھوپ میں پڑی چارپائیوں پر بیٹھے، ادھ لیٹے، ریں ریں کر رہے ہیں۔ اس علاقے میں غلطی سے بھی کوئی مسکراتا بچہ شاید ہی دیکھا ہو۔

"دروازہ بند کرتے جانا۔"

چائے والے سے کہتا ہوں۔

وہ آنکھوں آنکھوں میں مسکراتا باہر چلا جاتا ہے۔ یہ مسکراہٹ میں نے محلے کے سب لوگوں کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔ میرا نام انھوں نے "بند دروازے والا صاحب" رکھا ہے۔

چائے کی چسکی بھر لیتا ہوں۔ ایک پیالے میں آٹھ پیالیوں کی مقدار سے کم شیرینی کیا ہوگی۔ اب؟ اچھا اسے اب ٹھنڈا ہو لینے دو۔ ایک ہی گھونٹ میں پی ڈالوں گا۔ دوائی تو کبھی پینی ہی پڑتی ہے۔

پیلی پیلی دھوپ پورے کے پورے فرش پر لیٹ گئی ہے۔ گندے فرش پر پھیلی دھوپ کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ کسی سڑتے ہوئے پانی کے گندے تالاب کا خیال آجاتا ہے۔

پڑوس والے ریڈیو زور سے بجاتے ہیں۔ ہندی میں خبریں ہو چکی ہیں۔ اب وہی پنجابی میں ہو رہی ہیں تو آفس کا ٹائم ہونے کو ہے۔ خبریں ختم ہونے کا مطلب دفتر کی تیاری۔

جس کی جگہ عارضی کام ملا ہے۔ وہ مہینے بعد آجائے گا — پھر؟ آگ لگاؤ۔ ابھی مہینہ پڑا ہے۔

"ماسٹر جی نمستے" کا جواب دیتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچتا ہوں — آپ؟"

"ہاں بھائی! ایمرجنسی کی وجہ سے میری چھٹی کینسل ہو گئی ہے اس لئے آج جوائن کرنے آگیا ہوں۔"

"لیکن آپ تو مہینے بعد —"

"ہاں، بتایا نا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ آپ چارج سنبھال لیں۔"

دفتر کے لوگ جو مجھ سے ہندی پڑھتے ہیں۔ باہر آ گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے پرانے ماسٹر جی کو آتے دیکھ لیا تھا جس کا مطلب تھا — نئے ماسٹر کی چھٹی۔

سب کہتے ہیں، ملتے رہا کریں۔ ہمیں آپ بہت یاد آئیں گے وغیرہ وغیرہ۔ میں بھی کہتا ہوں — مجھے بہت یاد آئے گی آپ کی، وغیرہ وغیرہ۔

باہر آ جاتا ہوں۔ مسکرا کر سوچتا ہوں کہ اس سر درد سے چھٹی مل کر مہینے بعد کیا ہوگا۔ نہیں تو پورا مہینہ دماغ میں کیڑا سرسراتا رہتا۔

پیچھے سے چپراسی آواز دیتا ہے۔ "آپ کی چٹھی ماسٹر جی! اور کوئی آئے گی تو گھر پہنچا دوں گا۔"

سگرٹ سلگاتا ہوں۔ ایک اُسے دے کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔

خط ایک نگاہ میں پڑھ جاتا ہوں۔ چھوٹی منی نے جو پانچویں درجے میں پڑھتی ہے۔ لکھا ہے کہ چاچا جی سرگباش ہو گئے ہیں۔ سب وہاں گئے ہیں اس لئے وہ خط لکھ رہی ہے۔

خط کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیتا ہوں۔ بے وقوف! تین چاچا ہیں۔ اب کس کی موت ہوگئی ہے؟ کیا معلوم۔ یاد بھی نہیں پڑتا کہ کسی ایک کے بیمار پڑنے کی خبر پہلے گھر سے آئی تھی۔

غبار آہستہ آہستہ کم ہو جاتا ہے۔ ہوگا تینوں میں سے کوئی ایک۔ کوئی بھی ہو۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟

بازار میں ورما مل جاتا ہے۔ پرانا دوست ہے۔ "چلو یار! گھر تک چلیں۔ میں بھی آج آفس نہیں گیا۔"

سوچتا ہوں، اُسے بتاؤں، میری نوکری چلی گئی ہے۔ پھر خیال آتا ہے، اُسے بتا کر کیا ہوگا؟

ورما کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ شادی سے پہلے اس کی بیوی نے میری کچھ کہانیاں پڑھی تھیں۔ بے چاری میری عزت کرتی ہے۔ وہ جب بھی کمرے میں آکر مجھے نمستے کرتی ہے تو ورما کی آنکھوں میں ہمیشہ ناراضگی تیر جاتی ہے۔ وہ اُسے کسی نہ کسی کام سے رسوئی میں بھیج دیتا ہے۔

ایک بار اُسے بیوی سے کہتے سُنا تھا کہ وہ میری موجودگی میں کمرے میں ذرا کم ہی آیا کرے۔ بیوی نے جب دلیل پیش کی تھی کہ میں ان کا دوست ہوں، ایک اچھا لیکھک ہوں تو ورما کے جواب کا آدھا حصّہ ہی کان میں پڑا تھا — "ان لوگوں کا کیرکٹر......"

اس کے بعد میں ورما کے گھر کم ہی گیا۔ اب سگرٹ سلگانے کے لئے ماچس نکالتا ہوں — خالی —

"ماچس ورما!"

وہ رسوئی میں جا کر بیوی سے ماچس مانگتا ہے — "ایک تیلی دے دو۔ خالی ماچس اس کے پاس ہے۔"

اس کی بیوی شاید اعتراض کرتی ہے۔ "یہ بُری بات ہے!"

"نہیں ایک ہی تیلی دے دو۔ ان لوگوں کو تم نہیں جانتیں ماچس جیب میں ہی رکھ لے گا۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔

"ارے! تم چلے۔ بیٹھو۔ چائے......"

"نہیں۔"

میں باہر نکل آتا ہوں۔ ایک رکشا والے سے ماچس مانگ کر سگرٹ سلگاتا ہوں۔

بیوی اور دوستوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں لیکن اس سے اچھا کام صدر بازار کی دکانوں کے بورڈ پڑھنا ہے۔ یہ کام اتنی بار کر چکا ہوں کہ بورڈوں کے کونوں پر چھوٹا سا لکھا ہوا پینیٹر تک کا نام یاد ہے۔

پاس سکوٹر آ کر رکتا ہے۔ پروفیسر شرما ہیں۔ نمستے کرتا ہوں۔

"کیوں بھائی! آج آفس....."

"وہ نوکری ختم، سر!"

"اچھا — کوئی کہانی وانی لکھی کہ نہیں؟ لکھو تو مجھے ضرور دکھانا اچھا ٹائم کٹ جاتا ہے۔"

وہ جھٹ سے سکوٹر سٹارٹ کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ہونہہ! نوکری کی بات کا اثر ہی نہیں۔ بس ٹائم اچھا کٹنا چاہیئے۔

اب کیا کیا جائے؟ جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں۔ ریزگاری کافی ہے۔ ایک سرے سے شروع کر کے اگر ہر دکان پر چائے پیتا

شروع کردوں اور ایک کپ پر آدھا گھنٹہ لگایا جائے تو کافی ٹائم گزر سکتا ہے۔

تھوک کے حساب سے چائے پینا شروع کر دیتا ہوں لیکن بھلا دماغ سوچنا بند کرتا ہے ؟ کون سا چارا ہوگا ؟ نوکری کے بغیر کیسے چلے گا ؟ خرچ کم کرنا چاہیئے۔ آج کی چائے میں ہی....

جھٹ سے انگریزی کا محاورہ یاد کرتا ہوں — 'ڈیل ڈیر ڈونٹ بی پینی وائز پاؤنڈ فلش'

اور چائے کا پروگرام باقاعدہ جاری رکھتا ہوں۔

چائے والے بھی کچھ پہچان گئے ہیں۔ مالک چھوکرے سے کہتا ہے،

"صاحب آئے ہیں — ایک دم سٹرانگ چائے — ایک سو بیس میل کی — دم کی مافِک" (موافق)

چائے بھی کتنی پی جاسکتی ہے ؟ بِمّی کے پاس کیوں نہ چلا جائے ؟ یہ نہیں۔ اس سے تو اچھا خاصا جھگڑا ہو چکا ہے۔ پھر دو دن ہی پہلے اس کی چھوٹی بہن انیتا کی شادی ہوئی تھی۔ اس میں بھی تو نہیں گیا۔

کیا بِمّی سچ مچ اتنی بدصورت ہے، یا کہ دوست یونہی مذاق کرتے ہیں۔ دوستوں کا کہنا ہے کہ میں دیکھنے سننے میں کافی اچھا ہوں۔ اس معمولی سی' کالی سی' لڑکی سے میرا میل جول انھیں عجیب لگتا ہے۔ وہ ہمیشہ کہتے ہیں — ان رائٹروں سے خدا بچائے۔ کہانیوں کی ہیروئن تو یوں کتابی چہرے والی ہوگی — اور اصلی ہیروئن ! توبہ !!

ویسے بِمّی کالی سہی، یونہی سہی۔ پر جانے مجھے کیوں اچھی لگتی ہے ؟

کچھ دن پہلے کی باتیں یاد کر رہا ہوں — وہ اسکول میں پڑھاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے دو تین بچے ٹیوشن پڑھنے آئے تھے۔ وہ کچھ بیمار تھی۔

"تو انھیں آج واپس کیوں نہیں بھیج دیتی ؟

"واہ —! ان کی ممی جلدی بھیجنے پر ناراض نہ ہو جائے گی ؟"

وہ بچوں سے چھوٹے چھوٹے سوال پوچھنا شروع کر دیتی ہے۔

پنجاب کی راجدھانی ؟ "چنڈی گڑھ"

بھارت کے اُپ راشٹر پتی ؟ "ڈاکٹر ذاکر حسین"

"ذاکر" — ذاکر نہیں — ذاکر حسین — اچھا آنٹی"

کانچ کے برتن، کس سے صاف کرتے ہیں ؟ 'دِم سے'

میں بیچ میں بول پڑتا ہوں — ایک کپ چائے بھی !

وہ وہیں سے بیٹھے بیٹھے آواز دے کر موسی کو چائے لانے کے لئے کہتی ہے۔ میں اسے انگریزی میں کہتا ہوں کہ بچوں کو چھٹی کرے۔

وہ کہتی ہے — "بس تھوڑی دیر اور"۔

آخر بچے اپنے چھوٹے چھوٹے سینے تان کر چین کے خلاف ایک گیت گاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

چائے آجاتی ہے۔ بِمّی اپنا سر خود دبا رہی ہے۔

"درد ہے ؟"

"ہونہہ"

"کوئی دوا پی لی ہوتی۔"

"اچھا۔"

میں کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں — اس سے شادی کی بات کروں۔

لیکن یہ میری عادت یا کمزوری ہے کہ بات کو ہمیشہ غلط زاویے سے شروع کرتا ہوں۔

"انیتا کی شادی کب ہو رہی ہے ؟"

"اگلے ہفتے"

کام وام تو بہت ہوگا۔ کچھ مجھے بھی بتاؤ۔

آپ ! آپ کام کریں گے ؟ وہ آہستہ سے ہنس دیتی ہے۔ مجھے اس کی یہی عادت پیاری لگتی ہے۔ کیسے مجھے پورا کا پورا بدھو سمجھتی ہے۔ سوچتا ہوں، اپنی بات کہہ دوں۔

"اچھا، تم شادی کب کر رہی ہو ؟ اب انیتا کی شادی

کے بعد تمھاری ذمہ داریاں ختم۔"

"کروں گی۔ آپ کو کیا چنتا ہے؟"

اب آگے کیا کہوں — سیدھی طرح کیوں نہیں کہہ دیتا —

"تم مجھ سے شادی کب کر رہی ہو؟"

"تم کیا سوچتی ہو؟ تمھارے لئے کوئی خاص بڑا آدمی کہیں سے آئے گا؟

وہ سمجھتی ہے۔ "تمھارے لئے" میں نے اس کے رنگ روپ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بُرا مان جاتی ہے۔

"ہاں بڑے آدمی کا ہی انتظار ہے۔ میں تو کسی ملٹری آفیسر سے شادی کروں گی 'ایسے ویسے' سے نہیں۔"

'ایسے ویسے' کا مطلب میں بخوبی سمجھتا ہوں۔ اس نے مجھے ہی نشانہ بنایا ہے۔ چپ رہ جاتا ہوں۔

"آپ کب شادی کریں گے؟"

"کروں گا — کسی ایسی لڑکی کا انتظار ہے جو بیس تیس ہزار جہیز میں لائے۔"

وہ اداس ہو جاتی ہے۔ معمولی سا چہرہ اور بھی معمولی ہو جاتا ہے۔

"اپنے آپ کو لیکھک کہتے ہیں۔ پھر بھی جہیز کی بات۔"

"لیکھک ہوں تو یہ کب لکھا ہے کہ جہیز نہیں لینا چاہیئے۔"

وہ چُپ — میں چُپ۔

"اچھا" — میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔

وہ باہر تک چھوڑنے آتی ہے۔ رک کر اس سے پوچھتا ہوں۔ "تم نے منّو بھنڈاری کی تپ دق پڑھی ہے؟"

"ہاں۔"

"تمہیں وہی ہو گیا ہے!" اور تیز تیز قدموں سے چل دیتا ہوں۔

اب خیال آ رہا ہے۔ اتنی کڑی بات نہیں کہنی چاہیئے تھی۔ چلوں۔ پھر بتی کے ہاں ہی چلوں — چھوٹی انیتا کے بیاہ کے بعد کتنی اداس ہو گی۔

موسی جی دروازہ کھولتی ہیں۔ سامنے چارپائی پر کمبل اوڑھے بتی سو رہی ہے۔ موسی بتاتی ہیں کہ انیتا کی شادی کے بعد اسے زوروں سے بخار آ گیا ہے۔ عموماً بے ہوش سی رہتی ہے۔ موسی چائے لاتی ہیں۔

"کہو تو بتی کو جگاؤں۔ ویسے کچھ ہی دیر پہلے سوئی ہے۔ بچے پڑھنے آئے تھے۔ واپس بھیج دئے ہیں۔"

موسی کم ہی بولتی ہیں۔ آج میرے پاس بیٹھ جاتی ہیں۔ "سنو! اس دن تم بتی سے جھگڑے تھے کیا؟ روتی رہی۔ تب سے بیمار ہے۔"

"نہ موسی!"

"اچھا۔"

بیٹھے بیٹھے کئی پرچے پڑھ جاتا ہوں۔ کبھی کبھی نظر اُٹھا کر بتی کو دیکھ لیتا ہوں۔ زور زور سے سانس لے رہی ہے۔

ڈھلتے سورج کی کمزور کرنیں چق سے چھن چھن کر اندر پھیل رہی ہیں۔ مدھم مدھم۔

کچھ آواز سی سنائی پڑتی ہے۔ بتی شاید جاگ پڑی ہے۔ کرسی چارپائی کے پاس کر لیتا ہوں۔ پر نہیں۔ وہ تو بدستور سوئی پڑی ہے۔

آواز پھر آتی ہے۔ دھیان دے کر سنتا ہوں۔ بتی بڑبڑا رہی ہے۔ آگے جھکتا ہوں۔

"اچھا۔ بچو! پنجاب کی راجدھانی کا کیا نام ہے؟"

"بھارت کے راشٹرپتی کون ہیں؟"

"کانچ کے برتن کس چیز سے صاف کئے جاتے ہیں؟"

"چین کے خلاف کوئی کویتا سناؤ — پھر چھٹی۔"

وہ چپ ہو جاتی ہے۔ میں بیٹھا ہوں۔ خاموش۔ بے بس۔ محسوس ہوا کہ کوئی بہت تیز ہتھیار جسم کے آرپار گزر گیا ہے گزر رہا ہے۔

اُٹھ کر چل دیتا ہوں۔ ہاں اس راجکماری کو قید سے چھڑانے کوئی ملٹری آفیسر چمچماتی وردی میں کب آئے گا؟ اب سچ سچ اس پریشان سے آتا ہوں کہ بتی کو پورا کا پورا منّو بھنڈاری والا

تپ دق ہو گیا ہے۔

کمرے میں پہنچ کر چپ چاپ پڑا رہتا ہوں۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ بجلی کیا جلاتی ہے؟

دروازے پر کھٹ کھٹ ہوتی ہے۔ اوپر والوں کی بچی پنکی ٹافی لینے آتی ہے۔

"انکل تم اندھیرے میں بیٹھے ہو؟"

"ہاں، بیٹا!"

وہ سٹول پر چڑھ کر بجلی جلا دیتی ہے۔ پنکی کانونٹ میں پڑھتی ہے۔ بڑی پیاری انگریزی بولتی ہے۔

سیڑھیوں پر سے گر پڑی تھی۔ لنگڑا کر چلتی ہے۔

"انکل! آج ممی ڈیڈی سے کہتی تھیں کہ پنکی بڑی ہو جائے گی تو کیا ہوگا؟ اس لنگڑی سے کون شادی کرے گا؟"

"ہونہہ"

"کیوں انکل! کیا لنگڑی لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی؟"

"ہوتی ہے بیٹا!"

پنکی میز پر سے سگرٹ اٹھا کر مجھے دیتی ہے۔

"ڈونٹ یو سیم ٹو بی اپ سیٹ انکل"

"ہاں بیٹا!"

"اچھا تو میں چلتی ہوں۔"

"اچھا بیٹا۔"

"کھڑکی بند کر دوں انکل! اندھیرا اندر آ رہا ہے۔"

"نہ بیٹا! کھڑکی سے اندھیرا تھوڑا آتا ہے۔"

"ڈونٹ مائنڈ اِٹ انکل! یو آر سِلّی۔ جب تم مجھے کہتے ہو۔ کھڑکی بند کرنا پنکی! دھوپ آ رہی ہے۔ تب اندھیرا بھی تو کھڑکی سے ہی اندر آتا ہے۔"

"اچھا بیٹا۔"

وہ کھڑکی بند کر کے لنگڑاتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

دروازہ بند — کھڑکی بند — پھر بھی اندھیرے کا سیلاب ہے کہ امڈتا ہی چلا آتا ہے۔

پڑوس والے ریڈیو لگا دیتے ہیں۔ کوئی غزل گا رہا ہے،

کیسے کہہ دوں کہ ملاقات نہیں ہوتی
ملتے رہتے ہیں مگر بات نہیں ہوتی

دوسرا مصرع بار بار دہرایا جا رہا ہے۔ ملتے رہتے ہیں مگر بات نہیں ہوتی — مگر بات نہیں ہوتی — بات نہیں ہوتی — نہیں ہوتی۔

چاول کی مِلوں میں کام آنے والی مشینیں

مرکزی وزیر خوراک شری سی۔ سبرامنیم نے ملک میں چاول کی ملوں میں کام آنے والی مشینیں تیار کرنے والوں کو یقین دلایا کہ انھیں جدید ترین مشینری کی تیاری کا پورا پورا موقع دیا جائے گا۔ انھوں نے بمبئی کی چاولوں کی ملوں کی مشینری تیار کرنے والوں کی انجمن کے نمایندوں سے جنھوں نے وزیر موصوف سے ملاقات کی، کہا کہ سرکار کی پالیسی گھریلو صنعتوں کی ہر ممکن طریقے سے حوصلہ افزائی ہے۔

شری سبرامنیم نے کہا کہ سرکار باہر سے صرف چھ جدید یونٹ منگا رہی ہے۔ ان یونٹوں سے رہنمایانہ کام لیا جائے گا اور ان کے کام کا اندازہ کیا جائے گا۔ یہ اس لئے نہیں کہ کل مشینری باہر سے ہی منگائی جائے۔ بلکہ ان کے کامیاب ہونے کی صورت میں پہلی کوشش یہ ہوگی کہ یہ دیکھا جائے کہ ہمارے ملک میں اس میں سے کس قدر سامان تیار ہو سکتا ہے تاکہ اشد ضروری حصے ہی باہر سے منگوائے جائیں۔

ابراہیم اختر

ہری نارائن آپٹے

مرہٹی کا ایک ممتاز ادیب

۸-مارچ ۱۸۶۴ء کو ضلع خاندیش کے ایک چھوٹے سے گاؤں پارولہ میں مرہٹی زبان کے عظیم فن کار ہری نارائن آپٹے پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام نانا صاحب تھا جو بڑے مذہبی اور پرانے خیالات کے آدمی تھے۔ ہری نارائن نے بمبئی اور پونا میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور ۱۸۸۳ء میں میٹرک پاس کیا۔ دورانِ تعلیم ہی انھوں نے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں سیکھ لیں اور یورپ کے ممتاز اہلِ قلم مثلاً رینالڈس، ملٹن، شیکسپیئر، سکاٹ، شیلے، کیٹس، موپسیر، ڈکنز، جین آسٹن کی کتابوں کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا اور اسی زمانہ میں انھوں نے رینالڈس کے ناول 'اولڈ لنڈن' کا مرہٹی میں 'بوسیدہ قدریں' کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس طرح انھوں نے ادبی میدان میں پہلا قدم رکھا۔ اس کے بعد لانگ فیلو کی ایک نظم 'سانگ آف لائف' کا بڑی آسان اور سلیس مرہٹی میں ترجمہ کیا۔ مغربی ادب کے مطالعہ نے ہری نارائن کو نئی راہ دکھائی اور بڑی تیزی سے ان کا ذہنی ارتقاء ہوا۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں انھوں نے سنسکرت کے ایک عالم سے سنسکرت میں مہارت پیدا کر لی اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بنگلہ زبان بھی سیکھ لی اور بنگلہ ادبیات کا کافی مطالعہ کیا۔ ۱۸۸۵ء سے ان کی مستقل ناول نگاری کا دور شروع ہوا اور بیشتر مضامین، کہانیاں اور ناول لکھ کر انھوں نے مرہٹی ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔

آج تک مرہٹی زبان میں ہری نارائن آپٹے کے مقابل کوئی دوسرا ادیب پیدا نہیں ہوا۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کو ہمیشہ ادق اور کٹھن زبان سے بچائے رکھا۔ ان کی زبان بڑی لطیف، سادہ، سلیس اور خوب صورت ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی ان کی تحریروں کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہری نارائن عوام اور خواص دونوں میں مقبول ہیں۔ وہ ہری نارائن کی سادہ، سلیس اور پُرخلوص زبان ہی تھی جس نے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا۔ ورنہ وہ زبان دانی کے زعم میں مشکل اور ادق زبان کا سہارا لیتے تو آج بیشتر مرہٹی بولنے والے ان کے نام سے مانوس نہ ہوتے۔

ہری نارائن کے دل میں دیش بھگتی اور قوم کی خدمت کا بے پناہ جذبہ تھا۔ ان کی اس تڑپ اور خلوص کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ جس وقت وہ میٹرک میں تھے۔ اسکول کے دو مدرسین بلونت راؤ تلک اور گوپال راؤ کو اخبار 'کیسری' میں قابلِ اعتراض مضمون لکھنے کے سلسلے میں گرفتار کر لیا گیا۔ ہری نارائن اور ان کے ساتھیوں نے جگہ جگہ جلسے کئے گھر گھر گھوم کر مقدمہ لڑنے کے لیے اخراجات اور ان کی مدد کے لئے پیسہ پیسہ جمع کیا۔ اس دوڑ دھوپ اور کش مکش میں ان کی تعلیم پر بُرا اثر پڑا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہری نارائن اس

سال میٹرک میں ناکام ہو گئے۔ اپنے اس نقصان کا ان کو بالکل افسوس نہیں ہوا اور انھوں نے اپنی ہمت پست نہ ہونے دی۔ ہری نارائن کے دل میں ملک کو غلامی سے آزاد کرانے اور ہندوستانی قوم کی گرتی ہوئی حالت کو سدھارنے کا جذبہ دن بدن پروان چڑھ رہا تھا۔ اپنے اس عزم کو ملک کے کونے کونے تک پہنچانے کے لئے انھوں نے قلم اٹھایا۔

۱۸۹۰ء میں ہری نارائن نے ایک ہفتہ وار اخبار 'مشغلہ' جاری کیا۔ اس اخبار میں وہ برابر انگریزوں کے خلاف مضامین شائع کرتے رہے۔ انھیں عوام کی گرتی ہوئی حالت کا بڑا دکھ تھا۔ اس لئے وہ ہندوستان سے غریبی اور جہالت دور کرنے اور طاقت ور بنیادوں پر نئے سماج کی تعمیر کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ اس اخبار کی وجہ سے وہ ہمیشہ مالی مشکلات میں مبتلا رہے اور اپنی لکھی ہوئی کتابیں بیچ بیچ کر اخبار کو جاری رکھا اور اپنے نصب العین کی خاطر بڑے سے بڑا نقصان بھی برداشت کیا۔ ان کی باغیانہ تقریریں انگریز سرکار کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگیں اور اس نے ہری نارائن کی تمام تخلیقات کو ضبط کر لینے کا حکم دے دیا۔ لیکن ان کے شفیق استاد اور دوست مادھو راؤ رانڈے اور دوسرے رفیقوں کی کوششوں کی بدولت ان کی کتابیں ضبط نہ ہو سکیں اور 'مشغلہ' بھی جاری رہا۔ صرف ان کی ایک انگریزی کتاب جو یورپ میں چھپی تھی جس میں ہندوستانی کاشتکاروں کی زبوں حالی کا بڑا دردناک خاکہ کھینچا گیا تھا اور انگریز حکومت کے ظلم و استبداد کی بڑے پُر اثر انداز میں تصویر کھینچی گئی تھی، اسے ضبط کر لیا گیا کیونکہ اس کے شائع ہوتے ہی انگریزی اور فرانسیسی کے بہت سے اخباروں نے انگریزی حکومت پر نکتہ چینی شروع کر دی تھی۔ اپنی بدنامی سے بچنے کے لئے حکومت نے اسے فوراً ضبط کر لیا۔ ہندوستانیوں کو تعلیمی، سماجی، معاشی اور سیاسی میدان میں آگے بڑھانے کے لئے ہری نارائن نے بھرپور جدوجہد کی۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک ہندوستانی عوام بیدار نہیں ہوتے اس وقت تک آزادی کی لڑائی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

۱۹۱۲ء میں اکولہ میں مرہٹی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں ہری نارائن کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ یہ ہری نارائن کی قومی اور ادبی خدمات کا بڑا اعتراف تھا۔

مرہٹی زبان میں ہندوستان کے ماضی کی تاریخ مرتب کرنے میں انھوں نے بڑی کدوکاوش کی۔ بھگوت گیتا اور مہابھارت پر بھی انھوں نے بڑا کام کیا۔ چیدہ چیدہ واقعات کے خلاصے اور اہم سبق آموز باتیں انھوں نے سلیس اور عام فہم مرہٹی میں منتقل کیں تاکہ ایک عام آدمی بھی ان سے استفادہ کر سکے۔ ان کی زندگی کے دو اہم مقاصد تھے۔ ایک تو ملک کو غلامی سے آزاد کرانا اور دوسرا ہندوستانی عوام کو دنیا کی دوسری ترقی یافتہ اقوام کی صف میں جگہ دلانا۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے انھوں نے آخر وقت تک جدوجہد کی۔ ہری نارائن کو آگے بڑھانے اور انھیں اس جدوجہد کے لئے منظم کرنے میں ان کے مخلص استاد اور ہمدرد دوست راؤ صاحب رانڈے کا بڑا ہاتھ رہا۔ مرہٹہ عوام پر راؤ صاحب رانڈے کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اپنی تعلیم اور تربیت سے تین ممتاز قومی رہنما مہاراشٹر کو دیئے۔ جو اپنے دلوں میں قوم کا درد لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ان تینوں نے مرہٹہ عوام کی حالت سدھارنے انھیں تعلیم کے زیور سے مالامال کرنے اور ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کی، اس لئے ان کی بے لوث قومی خدمات بھلائی نہیں جا سکتیں۔ اور آج مہاراشٹر ان عظیم شخصیتوں پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

ہری نارائن میں قومی خدمت کا جذبہ اتنا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کہ اس جذبے کے بغیر ہم ہری نارائن کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان کے ناولوں میں ہم کو جگہ جگہ اس جذبے کی تڑپ اور شدت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ہری نارائن نے

مرہٹی زبان کی بہت خدمت کی ہے اور اس کو اپنی تخلیقات کی شکل میں قیمتی خزانہ دیا ہے ۔ ان کے بعض ناول اتنے اہم ہیں کہ انھیں دنیا کے عظیم ادب میں جگہ دی جاسکتی ہے ۔ ان کے ناول 'میں' کو مرہٹی ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ اس ناول میں انھوں نے انگریز حکومت کی چالبازیوں کو بڑی خوبی سے بے نقاب کیا ہے ۔ جس کو پڑھنے سے قاری کے ذہن میں انگریز حکومت کے ظلم و زیادتی کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ۔ اس دور میں ہندوستانیوں کی سیاسی، معاشی اور تعلیمی حالت کی پستی کی صحیح عکاسی کی گئی ہے ۔ اس کے علاوہ ان کے دوسرے ناول چیزرگپت، سویرا، کوئی کیوں سوچے ؟ روپ نگر کی راجکماری، پنت رلؤ، راہِ نجات وغیرہ بھی کافی مقبول ہیں ۔ 'راہِ نجات' ان کا آخری ناول ہے ۔ یہ ایک سماجی اور اصلاحی نوعیت کا ناول ہے ۔ اس ناول کے ایک ایک لفظ میں ہمیں ان کے قومی جذبہ کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں ۔ وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ اگر وہ بار بار جنم لیں تو بھی قوم کی خدمت کرنے سے نہیں تھکیں گے ۔ یہ ناول اپنے خاص موضوع اور انداز بیان کے لحاظ سے مرہٹی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔

سیاسی تحریکات میں بھی ہری نارائن نے عملی طور پر حصہ لیا ۔ کانگریس کے بیشتر جلسوں میں انھوں نے شرکت کی اور اس کی سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ہری نارائن کو مختلف پریشانیوں میں مبتلا ہونا پڑا ۔ گھر کے بگڑتے ہوئے حالات اور باہر کی دوسری پریشانیوں نے ان کو کافی نڈھال کر دیا ۔ ناساز گار ماحول اور ناساعد حالات سے مجبور ہو کر ان کو اپنا ہفتہ وار اخبار 'مشغلہ' بند کر دینا پڑا جسے انھوں نے مشکل حالات میں بھی جاری رکھا تھا ۔ ۱۹۱۷ء میں 'مشغلہ' کی اشاعت مسدود ہو گئی اور اس کے دو سال بعد ہی مرہٹی زبان کا یہ عظیم فن کار ۳ ۔ مارچ ۱۹۱۹ء کو فنا کی آغوش میں چلا گیا ۔

مالک رام
ع - م

نئی کتابیں

ماسٹر رام چندر از صدیق الرحمٰن قدوائی

صفحات ۱۹۴+۵۷۔ ٹائپ میں۔ مجلد۔ قیمت ساڑھے آٹھ روپے۔

ناشر: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۶

انیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے یہاں ایک کالج قائم کیا، جو اپنے محلِ وقوع کے باعث "دلی کالج" کہلایا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی شرفا کی اولاد کو مغربی علوم کی تعلیم ان کی اپنی زبان میں دی جائے، جس سے انھیں معلوم ہو کہ مختلف شعبوں میں دنیا کیا ترقی کر رہی ہے۔ اگرچہ یہ کالج ایک خاص غرض سے قائم کیا گیا تھا، لیکن اس کے کارکنوں - اساتذہ و طلبا --- کی محنت اور اخلاص اور مقصدیت نے اسے ادارے کی سطح سے اُٹھا کر ایک تحریک کی شکل دے دی۔ آج اردو ادب کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس میں دلی کالج کے کارناموں اور ان کے دُوررس نتائج کا ذکر نہ ہو۔

خیر اس تفصیل میں جانے کا یہ محل نہیں۔

اس کالج سے طلبہ کا جو پہلا گروہ فارغ التحصیل ہو کر نکلا، ان میں ایک شخص "رام چندر" گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ تعلیم ختم کرنے کے ساتھ ہی کالج میں مدرس مقرر ہو گئے، اور اس حیثیت سے ایسے کامیاب ہوئے کہ "ماسٹر رام چندر" گویا ان کا علم بن گیا، حالاں کہ وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ وہ ریاضی داں تھے، مؤرخ تھے، صحافی تھے، مضمون نگار تھے، مصنف تھے، مصلحِ قوم تھے، غرض ان کی شخصیت بڑی ہمہ جہتی تھی۔ انھوں نے اردو میں صحیح معنوں میں مضمون نگاری کی ابتدا کی اور اس پہلو سے اتنا ذخیرہ جمع کر دیا کہ اسے دیکھ کر آج بھی حیرت ہوتی ہے۔ ادب اردو کا کون سا طالب علم ہے، جو منشی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد، ماسٹر پیارے لال آشوب، مولانا حالی کے ناموں سے ناواقف ہے۔ لیکن شاید یہ بات عام طور پر معلوم نہ ہو کہ ان میں سے اکثر اصحاب نے دلی کالج میں تعلیم پائی، ان میں سے بعض ماسٹر رام چندر کے شاگرد تھے اور بعض جلیس اور دوست۔

ابھی رام چندر اس کالج میں طالب علم ہی تھے کہ انھوں نے یہاں کے پرنسپل فیلکس بوترو کی حوصلہ افزائی اور اپنے اساتذہ کی رہنمائی میں لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیا۔ شروع میں ان کی توجہ زیادہ تر ترجمے پر مبذول رہی، لیکن رفتہ رفتہ خود بھی تصنیف و تالیف کرنے لگے۔ پھر جب نئے پرنسپل ڈاکٹر اشپرنگر آئے، تو ان کی تحریک پر انھوں نے پندرہ روزہ فوائد الناظرین اور ماہانہ محبِ ہند (جس کا نام پہلے خیر خواہ ہند تھا) دو پرچے جاری کیے۔ ان سے انھوں نے اپنے خیالات کی ترویج کا کام لیا۔ یہ دونوں رسالے بہت دن تک جاری رہے۔ ان کے مضامین کی بوقلمونی اور افادی حیثیت اتنی نمایاں ہے کہ انھیں دیکھ کر نہ صرف مسرت ہوتی ہے بلکہ تعجب بھی ہوتا ہے کہ آج سے سوا صدی پہلے ایسے دقیق موضوعات پر اردو میں لکھنے والے موجود تھے! کتاب زیرِ نظر کے مصنف نے

بہت خوب کیا کہ اس کے آخر میں دو ضمیموں کی شکل میں مختلف عنوانوں کے تحت، ان مضامین کی فہرست شامل کر دی، جو ماسٹر رام چندر کے قلم سے ان دونوں پرچوں میں شائع ہوئے تھے۔ ان فہرستوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ماسٹر رام چندر نے اردو زبان کو کیا کچھ دیا، اور اس وقت دیا، جب یہ بہت حد تک تہی دامن تھی۔

اردو والوں کا فرض ہے کہ وہ ماسٹر رام چندر کے احسانات کا اعتراف کریں، لیکن ان پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ توازن نہ کھو بیٹھیں اور بے جا تعریف سے احتراز کریں اور غلط باتیں ان کی طرف منسوب نہ کر دیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ماسٹر رام چندر نے اپنے رسالے 'محب ہند' کی دو اشاعتوں (دسمبر ۱۸۴۹ و جنوری ۱۸۵۰ء) میں ایک مضمون لکھا۔ اس کا عنوان تھا، "تمۂ علوم درباب توہمات و رسوم - طریقۂ خط وکتابت۔" اس میں انھوں نے اس وقت کے 'محمد شاہی' طرزِ خطوط نویسی کا مذاق اڑایا، جس میں پیاز کی طرح چھلکے ہی چھلکے اور گودا غائب ہوتا تھا۔ انھوں نے لکھا کہ یہ روش غلط ہے، اسے ترک کر کے سیدھا سادا، روزمرہ کی زبان میں مفید مطلب طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس سے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی مرحوم کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ غالب نے ماسٹر رام چندر کا یہ مضمون دیکھ کر ہی اردو میں سادہ خطوط لکھنا شروع کیے! انھوں نے یہ بھی لکھا کہ غالب کا پہلا اردو خط ۱۸۵۲ء کا ہے، جب کہ رام چندر کا یہ مضمون جنوری ۱۸۵۰ء میں چھپ چکا تھا (غالب اور اردو خطوط نویسی از کیفی مطبوعہ آج کل، ستمبر ۱۹۵۲ء) کیفی مرحوم اپنے جوشِ عقیدت میں یہ سب کچھ لکھ گئے۔ غالب ۱۸۴۸ء میں غالباً، اور ۱۸۴۹ء میں یقیناً، اردو میں خط لکھ رہے تھے۔ تفتہ اور جواہر سنگھ جوہر کے نام ۱۸۴۹ء کے خطوط موجود ہیں۔ رہی تحریر کی سادگی اور طویل خطاب و آداب کی روش سے بیزاری، تو اس کا اظہار وہ ۱۸۲۵ء میں کر چکے تھے، جب انھوں نے پنج آہنگ کا آہنگِ اول مرتب کیا ہے۔ اس صورت میں غالب کو ماسٹر رام چندر کا مقلد قرار دینا صریح ظلم ہے۔

مصنف نے تیسرے باب میں ماسٹر رام چندر کی تالیفات وغیرہ کی فہرست درج کی ہے اور ان کے تفصیلی حالات بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ مکمل نہیں اور اس میں مندرجہ ذیل اضافہ ہونا چاہیے۔

(۱) ہندسہ بالجبر۔ وود (Waud) کی ایک کتاب (Algebraical Geometry) ہے۔ رام چندر اور رادھا کرشن نے مل کر اسے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب مطبع اردو اخبار میں ۱۸۵۳ء میں چھپی تھی۔

(۲) رسالہ علم ہیئت۔ یہ ہرشل اور ریون کیسل کی کتابوں اور انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے متعلقہ مضمون کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ یہ رام چندر اور اجودھیا پرشاد کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ رسالہ بھی دہلی اردو اخبار پریس میں ۱۸۴۸ء میں چھپا تھا۔

(۳) مولوی عبدالحق مرحوم نے 'مرحوم دلی کالج' میں ان کی ایک کتاب (الجبرا ترجمہ برجز) کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔

(۴) اس کے علاوہ "پنجاب کے سکھ عہد کی تاریخ اور سوانح مہاراجہ رنجیت سنگھ" جو ہنری پرنسپ کی انگریزی کتاب کا شنکر داس کا کیا ہوا ترجمہ ہے، اس پر رام چندر نے اصلاح دی تھی۔ یہ کتاب بھی دہلی اردو اخبار پریس میں ۱۸۴۶ء میں چھپی تھی۔

(۵) مصنف نے کتاب 'عجائباتِ روزگار' کے طبعِ اول کے مطبع کا نام نہیں لکھا، غالباً انھوں نے اس کا نسخہ نہیں دیکھا۔ یہ مطبع دہلی اردو اخبار میں چھپی تھی۔ سرورق کی عبارت ہے:

کتاب عجائباتِ روزگار تالیف کی ہوئی ماسٹر رام چندر،
مدرس مدرسہ دہلی کی ۱۸۴۷ عیسوی کے مطبع
دہلی اردو اخبار میں طبع ہوئی

آخری صفحے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ طباعت "تاریخ ششم ماہ اگست ۱۸۴۷ عیسوی کو ختم ہوئی۔"

(۶) اصول گورنمنٹ کے۔ یہ کتاب نارٹن (Norton) کی کتاب (Principles of Government) کا ترجمہ ہے، جو رام چندر نے طالب علمی کے زمانے میں ایک اور طالب علم مقیم کے ساتھ مل کر

کیا تھا۔ اس کی عبارت کی اصلاح مولوی سید محمد مدرس فارسی نے کی تھی۔ اور یہ دہلی اردو اخبار پریس میں ۱۸۴۲ء میں چھپی تھی۔ مصنف نے اس کا سنۂ طباعت نہیں لکھا۔

ماسٹر رام چندر سے متعلق اردو میں یہ دوسری کتاب ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر زور مرحوم کے قائم کردہ ادارہ "ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ" حیدرآباد کی طرف سے ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تالیف "رام چندر - اردو کے ارتقا میں ان کا حصہ" شائع ہوئی تھی۔ اس میں سوانح عمری کا حصہ بہت تشنہ تھا۔ البتہ رام چندر کی تحریروں کے اقتباس اور انتخاب کا حصہ بہت قابل قدر تھا۔ موجودہ کتاب نے سوانح عمری مکمل کر دی اور رام چندر کے کارناموں اور ادب اردو میں ان کی اہمیت پر بھی بہت متوازن انداز میں نظر ڈالی ہے۔

یہاں یہ لکھنا بھی بے محل نہیں ہوگا کہ بہت دن ہوئے، انڈین ریویو (انگریزی) مدراس کی طرف سے ہندستان کے علما اور سائنس دانوں کی سوانح عمریوں کا ایک مجموعہ انگریزی میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ماسٹر رام چندر کی بھی خاصی تفصیلی سوانح عمری شامل تھی۔ یوں خیال ہوتا ہے کہ نہ ڈاکٹر سیدہ جعفر کو اس کا علم ہے، نہ جناب صدیق الرحمٰن قدوائی کو۔

(مالک رام)

اُوپر کی منزل

کرتار سنگھ دُگل کے دس ڈراموں کا مجموعہ۔ ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ قیمت چار روپے۔ ضخامت ۲۰۴ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ کتابت طباعت اچھی۔ کتاب مجلد اور جلد پوش کی حامل ہے۔

ڈراما نگاروں میں کرتار سنگھ دُگل کا اپنا الگ مقام ہے۔ آپ کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ "دیا بجھ گیا" کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اکثر ڈراموں کے ترجمے ہندی کے علاوہ کئی یورپی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں شائع شدہ دو ڈرامے 'اپنی اپنی کھڑکی' اور 'اوپر کی منزل' 'آج کل' میں چھپ چکے ہیں۔ دُگل صاحب ڈرامے کی تکنیک سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ کے ڈرامے ریڈیو سے بھی نشر ہوتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کے سبھی ڈرامے دلچسپ اور میعاری ہیں۔

مطالعہ

نریش کمار شاد کے ۱۷ مضامین کا مجموعہ۔ ناشر میر اینڈ کمپنی اردو بازار دہلی۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے۔ کتابت، طباعت، کاغذ، جلد، جلد پوش اوسط۔

نریش کمار شاد ایک ذہین شاعر اور ادیب ہیں۔ وہ ہر رنگ میں شعر کہتے ہیں اور ہر رنگ میں نثر لکھتے ہیں۔ ان کے نثری مضامین کا یہ مجموعہ ان کی ہمہ گیری پر دال ہے۔ ان کی ہر تحریر سے ان کے شعور کی صحت مندی اور روایت اور ترقی پسندی کے بین بین ان کی روش کے آثار ملتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ قابلِ قدر مجموعۂ مضامین قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

شہرِ سخن

مصنف ملک زادہ منظور احمد۔ شائع کردہ ملک زادہ پبلیکیشنز ۲۹۔ سیتارام اعظم گڑھ۔ قیمت چار روپے۔

اس کتاب میں ملک زادہ صاحب نے قریب ۲۵ شاعروں کا تعارف لکھا ہے جو بجائے خود دلچسپ ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے تنقید کا صحیح حق ادا کیا ہے۔ پھر بھی یہ بات ان کے حق میں جاتی ہے کہ کسی شاعر کے جسمانی اور ادبی خد و خال کا نقش بناتے وقت ضروری نہیں کہ تنقید کے رنگوں سے کام لیا جائے۔ انھوں نے شعراء کے بارے میں جو رائیں دی ہیں اسے انھوں نے اپنے اسلوب کی رنگینی سے دل کش بنا دیا ہے۔ کتابت طباعت وغیرہ گوارا۔

پیاسی بیل

مانک ٹالہ کے ۱۰ افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت چار روپے۔ طابع و ناشر کرشن گوپال مانک ٹالہ۔ وڈالا۔ بمبئی ۳۱۔

جوگندر پال نے اس کتاب کا حرفِ اول لکھا ہے۔ کتابت طباعت، جلد، جلد پوش عمدہ۔ مانک ٹالہ خود لکھتے ہیں کہ

اس مجموعے کی بہت سی کہانیاں میں نے اپنے بچپن کے ماحول سے حاصل کی ہیں۔ ان کہانیوں میں 'ست یگ کا انسان'، 'ایک پیچ ایک گونج'، 'پونم'، 'گدھوں کی کمی نہیں' اور 'معجزہ' شامل ہیں۔ کچھ کہانیاں انھیں اپنی غیر ملکی سیاحتوں سے حاصل ہوئیں۔ مانک ٹالہ کا اندازِ بیان بڑا جچا تلا ہے اور وہ گھسے پٹے راستوں پر چلنے سے گریز کرتے ہیں۔ بقول خود وہ منفرد ادیب ہیں ۔ مانک ٹالہ کے لفظی معنی ہیں موتیوں کا سوداگر۔ ان کہانیوں کے باب میں وہ لکھتے ہیں کہ اپنی دانست میں میں نے کچھ قیمتی موتی پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ قول اگر خودستائی نہیں تو حقیقت بھی نہیں اور ان کے افسانے قیمتی موتی نہ سہی سنگ ریزے بھی نہیں۔

شامتِ اعمال

دلاور فگار کے مزاحیہ کلام کا مجموعہ۔ قیمت تین روپے۔
ملنے کا پتہ فن کاران جدید، نواب منزل ڈیوڑھیا محل محلہ سوتھہ بدایوں۔

دلاور فگار ہندوستان کے مزاح نگار شاعروں میں بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی ان کے کلام کی یہ ہے کہ ان کے مزاح میں بدذوقی نہیں عریانی نہیں اور ابتذال نہیں۔ ان کے کلام سے ان کے علم اور فن پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کا یہ مجموعہ اہلِ نظر کے نزدیک ان کی شاعری کو شامتِ اعمال نہیں بلکہ برکتِ اعمال ثابت کرے گا۔

موت کی شہنائی

حسن شہیر کی نظموں کا مجموعہ۔ قیمت چار روپے۔
دائرۂ ذہن و انقلاب ۔ ۵ کالی داس مارگ۔ لکھنؤ۔

شہیر خیال اور اندازِ بیان کے لحاظ سے بالکل نئے شاعر ہیں۔ نئے سے مراد تازہ واردِ ملکِ سخن نہیں بلکہ جدید اور محض جدید۔ ان کی اکثر نظمیں ان کی ذہانت پر دال ہیں۔ ان کے یہاں مضامین کا تنوع ہے اس کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں نظم محض خوب صورت نثر بن کر رہ گئی ہے۔

(ع۔م)

آج کل اردو کا 'جواہر لال نہرو نمبر'

ماہ نومبر ۱۹۶۴ء کا شمارہ جواہر لال نہرو نمبر ہوگا

صفحات ۷۲۔ آرٹ پیپر پر تصاویر کے ۸ صفحے اس کے علاوہ۔ قیمت ایک روپیہ

جواہر لال نہرو سے متعلق مقتدر ہستیوں اور ادیبوں کے مضامین، موصوف کی زندگی کے اہم واقعات، اکابرِ عالم کا اُن کی وفات پر خراجِ تحسین اور خود ان کے ارشادات و اقوال اور ان کی تحریروں کے اقتباسات شعراء کا خراجِ عقیدت اس شمارے میں شامل ہوں گے

ہمارے خاص نمبروں کی بعد میں بہت مانگ ہوتی ہے جسے ہم پورا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لہٰذا ایجنٹ حضرات اپنی زائد ضروریات سے بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی کو مطلع کریں۔



اکتوبر ۱۹۳۱ء میں جانوروں کی ایک نمائش منعقدہ اسلنگٹن (لنڈن) میں دو بکریوں کو انعام ملا تھا
۔ گاندھی جی اور پنڈت مدن موہن مالویہ ان بکریوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں



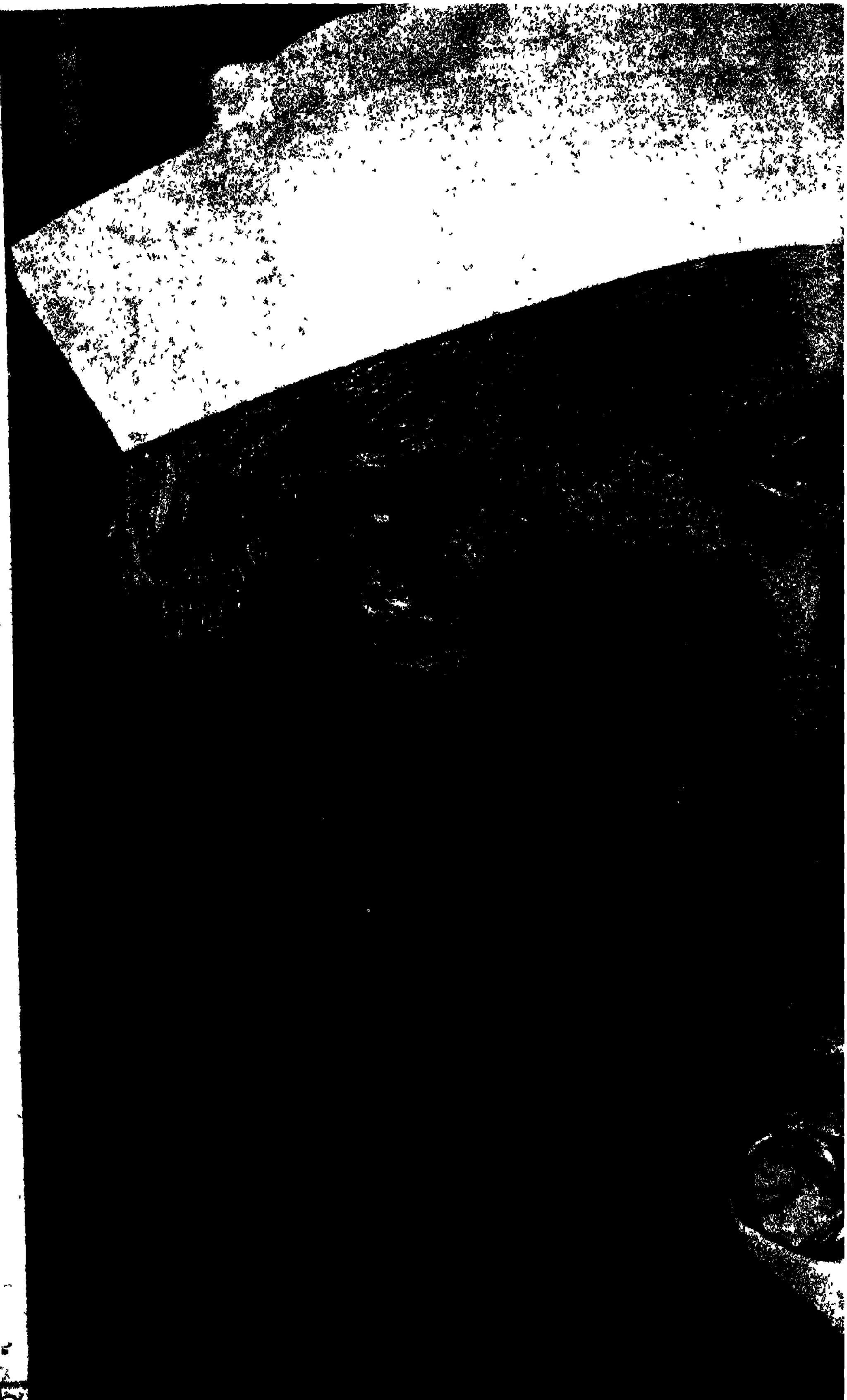
مہاتما گاندھی ایک ہندوستانی دوست کے مکان پر چارلی چپلن سے ملنے گئے تو لندن کے شہریوں نے انھیں گھیر لیا

Edited & published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi

جواہر لال

آج کل

کارتک شک
نومبر



ترتیب

سرورق پشت پر:- لال چوک سری نگر میں عوام پنڈت جواہرلال نہرو کی تقریر سن رہے ہیں۔

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

جواہرلال نہرو نمبر

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- سات روپے
پاکستان میں:- سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے:- ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ:- ہندوستان میں:- ۶۰ پیسے
پاکستان میں:- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے:- ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

جلد ۲۴ — کارتک شک سمت ۱۸۸۶
نمبر ۴ — نومبر ۱۹۶۴ء

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال کمند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو، اولڈ سکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومتِ ہند
پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

جوشؔ ملیح آبادی

کوئی بتائے یوسفِ کنعاں کدھر گیا

تاریک ہے نگاہ میں دُنیا ترے بغیر　　بھارت ہے ایک یاس کا پُتلا ترے بغیر
دہلی کے حُسن پر ہے رنڈاپا ترے بغیر　　جمنا ترے بغیر نہ گنگا ترے بغیر
تو گُم ہوا تو اشک ہمارے نکل پڑے
جب چاند چھُپ گیا تو ستارے نکل پڑے

کل جو برس رہا تھا وہ بادل نہیں رہا　　اب جسمِ دوستاں میں وہ کس بل نہیں رہا
چشمِ عروسِ دہر میں کاجل نہیں رہا　　ہندوستاں کی مانگ میں صندل نہیں رہا
اب ہر نظر ہے قافلۂ چشمِ نم کے ساتھ
ساری برات تھی اُسی دولھا کے دم کے ساتھ

تیرے سدھارتے ہی نگاہیں بدل گئیں　　شیریں صدائیں آہ کے سانچے میں ڈھل گئیں
طاقِ سیاسیات کی شمعیں پگھل گئیں　　خیمے کی جان تھیں جو طنابیں وہ جل گئیں
سارا زمانہ طور سے بے طور ہو گیا
تو کیا گیا کہ رنگ ہی کچھ اور ہو گیا

نکلا ترا جنازہ جو اے میرِ کارواں　　اک لشکرِ عظیم جلو میں ہُوا رواں
تیری چتا کی آگ ہوئی جب شرر فشاں　　نوعِ بشر کے قلب سے اُٹھنے لگا دھواں
دنیا دفورِ گریہ سے منہ ڈھانپنے لگی
رویا جو آسماں تو زمیں کانپنے لگی

جمنا کی سمت آہ ترا آخری سفر　　اس درجہ تھا ہجوم کہ لرزاں تھی رہگزر
جلتے ہوئے جو دل تھے تو پھُنکتے ہوئے جگر　　پروانے کا جنازہ تھا شمعوں کے دوش پر
گلشن تھا آندھیوں کا تسلسل لئے ہوئے
گُل سرنگوں تھے میّتِ بلبل لئے ہوئے

جس کی زبان نغمۂ صد آبشار تھی
جس کی جبیں طلوعِ لبِ جوئبار تھی
جس کی نظر شعاعِ سرِ کوہسار تھی
جس کی ہر ایک سانس نسیمِ بہار تھی
وہ تاجدارِ حسنِ فراواں کدھر گیا
کوئی بتائے یوسفِ کنعاں کدھر گیا

خونِ حیات میں وہ تلاطم نہیں رہا
ہندوستاں کے لب پہ ترنم نہیں رہا
موتی جو رولتا تھا وہ قلزم نہیں رہا
کھلتے تھے جس سے دل وہ تبسم نہیں رہا
کل تک چڑھے ہوئے تھے جو دریا اتر گئے
رخصت ہوا مسیح تو بیمار مر گئے

یارو وہ حسنِ سنبل و ریحاں کہاں گیا
وہ کاروانِ لؤلؤ و مرجاں کہاں گیا
وہ شہریارِ کشورِ دوراں کہاں گیا
قدسی تھے جس سے دنگ وہ انساں کہاں گیا
میرے ندیم لیتب دلاہر کو کیا ہوا
اے دوستو بتاؤ جواہر کو کیا ہوا

تو کیا گیا کہ دولتِ فکر و نظر گئی
تابندگیٔ چہرۂ اہلِ نظر گئی
شور گم ہوئے کمانِ معنیٰ اتر گئی
نغموں پہ اوس پڑ گئی ہر لے ٹھٹھر گئی
شیرازۂ نظامِ تجلی بکھر گیا
سورج کے ڈوبتے ہی اندھیرا ابھر گیا

دریائے سرخوشی میں روانی نہیں رہی
موجِ صبا میں عطرفشانی نہیں رہی
بزمِ طرب میں زمزمہ خوانی نہیں رہی
جو نیند لا سکے وہ کہانی نہیں رہی
تیری حیات موت سے جب زیر ہو گئی
دنیا ہر اک نگاہ میں اندھیر ہو گئی

ہر دل میں غوطہ زن ہے تری ہمتِ جواں
موجوں میں تیری خاک کی غلطاں ہیں بجلیاں
ہر جزر و مد ہے ایک کڑکتی ہوئی کماں
تیرا لہو ہے جگر رگوں میں رواں دواں
تیری چتا کی راکھ ہے گنگا لئے ہوئے
پانی رواں ہے آگ کا دریا لئے ہوئے

ذرّے سیاہ پوش ہیں تارے ہیں سوگوار
دل کے نگر میں اب نہ کبھی آئے گی بہار
تجھ ہم نوا کی موت سے اے یارِ ہر کار
میں اپنی زندگی سے نہایت ہوں شرمسار
دنیائے عاشقی کی یہی رسم و راہ ہے
لیلیٰ کے بعد قیس کا جینا گناہ ہے

فراق گورکھپوری

جواہر لال نہرو

کچھ یادیں — کچھ تاثرات

میں نے بی۔ اے کلاس کی طالب علمی کے زمانے میں جب تحریکِ آزادی کا نام کچھ دنوں کے لیے ہوم رول رکھا گیا تھا، اسی زمانے میں اس تحریک کے سلسلے میں لکھنؤ میں ہونے والے کانگریس کے نہایت اہم اور تاریخی اجلاس سے قبل ایک سبھا میں پنڈت جواہر لال نہرو کو پہلے پہل دیکھا تھا۔ یہ سبھا الہ آباد میں بابو رام پرشاد کے باغ میں ہوئی تھی۔ اتر پردیش کے بہت سے چوٹی کے لیڈر اس سبھا کی زینت تھے۔ مثلاً پنڈت مدن موہن مالوی، پنڈت موتی لال نہرو، سر تیج بہادر سپرو، سمیع اللہ بیگ، منشی ایشور سرن، اور کئی دیگر اکابر و مشاہیر وطن۔ جب بہت سے پختہ کار سیاسی رہنما ہندوستان کے حقوق سے متعلق تقریریں کر چکے تو قریب قریب اخیر میں جواہر لال نہرو کا نام پکارا گیا۔ یہ بات ہے ۱۹۱۶ء کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو جب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو سر سے پیر تک اعلیٰ درجے کے انگریزی کپڑوں میں ملبوس تھے۔ ان کی عمر اس وقت ۲۶-۲۷ سال کی تھی۔ وہ ایک منحنی صورت کے ایسے نوجوان نظر آ رہے تھے جسے تخیل پر انتہائی زور دینے کے باوجود ہندوستان یا کسی ملک کے عوام سے نہ ہم آہنگ کیا جا سکتا تھا، نہ مانوس سمجھا جا سکتا تھا اور نہ کسی لحاظ سے متعلق کیا جا سکتا تھا۔ سب کی تقریریں نہایت سلیس اور مانوس ہندوستانی زبان میں ہوئی تھیں۔ یکہ و تنہا جواہر لال تھے جن کی سات آٹھ منٹ کی تقریر انگریزی زبان میں تھی۔ مجھے اس تقریر کا آغازی جملہ اب تک یاد ہے، وہ جملہ یہ تھا:

After the roaring of lions my words will sound like the bleating of a lamb

یہ تقریر بالکل انگریزوں کے لہجے میں تھی۔ اور یوں بھی کوئی خاص بات اس مختصر سی انگریزی تقریر میں نہیں تھی۔ مجھے اس عالم میں اس نوجوان کو دیکھ کر خواب میں بھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ اب سے ایک نہایت مختصر عرصے کے اندر یہ نوجوان ہندوستان کی تقدیر بننے والا ہے۔ ابھی مہاتما گاندھی ہندوستانی سیاست والوں یا سیاسی کرداروں میں ایک نہایت باعزت لیکن پچھلی صفوں کے ایک فرد کی حیثیت رکھتے تھے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی مہاتما جی نے ہندوستانی سیاست کے اکھاڑے میں باقاعدہ قدم نہیں رکھا تھا۔ یہ اُن کانگریس والوں کا جلسہ تھا جنھیں بعد کو مہاتما گاندھی کی زلزلہ خیز اور انقلابی تحریک کے کارن کانگریس سے الگ ہونا پڑا باستثنائے چند۔ خود مجھ پر فوری اثر جواہر لال نہرو کو دیکھ کر قدرے بلکہ کافی حد تک ناآسودگی کا تھا۔ وہ ان اعتدال پسند سیاست والوں کے زمرے میں ایک اجنبی اور باہری سے آدمی معلوم ہوتے تھے جو محض رسماً ہندوستان کی سیاسی تحریک میں شریک ہو گیا ہو۔ اس وقت مجھے کیا خبر تھی کہ خود مجھے آئی سی ایس کا بلند ترین عہدہ ملنے والا ہے اور میں سب کچھ تج کے ایک دن تحریکِ آزادی میں اپنے آپ کو ڈال دوں گا اور جواہر لال نہرو سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جاؤں گا اور اس قدر مانوس ہو جاؤں گا کہ جذباتی طور پر ان سے زندگی بھر کوئی اور اتنا مانوس نہیں ہو سکا۔ اور یہ سب

باتیں آج ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ چشم زدن میں ہو گئیں۔

۱۹۱۸ء میں میں نے بی۔اے پاس کیا۔ آج ہمارے ہم وطنوں کے لئے شاید یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اسی سال جب میں نے میور سنٹرل کالج سے بی۔اے پاس کیا تھا تو علی گڑھ ایم۔اے۔او کالج سے ہمارے آج کے معزز و محترم نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے بی۔اے پاس کیا تھا۔ اس امتحان میں پورے صوبے میں میری چوتھی پوزیشن آئی تھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی تیسری پوزیشن آئی تھی۔ اب میں آگے بڑھتا ہوں۔ ہم لوگوں کا نتیجہ شائع ہونے کے قریب قریب فوراً ہی بعد پہلی جنگ عظیم ختم ہو گئی اور اس جنگ میں ہندوستان کو اتنی بڑی قربانی دینی پڑی تھی کہ سارے ملک میں ایک ناقابل شکست اور ناقابلِ فنا سیاسی بیداری پیدا ہو گئی تھی جس کا اندازہ کر کے انگریزی ملوکیت کانپ اٹھی تھی۔ لیکن جرمنی پر فتح پانے کے نشے میں اس ملوکیت نے ہندوستانی سیاسی بیداری کو کچل دینا چاہا تھا۔ رولٹ ایکٹ پاس کیا گیا جو تمام سیاسی تحریکوں کا گلا گھونٹنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ ہندوستان کا احتجاج نہایت شاندار تھا جس کا ایک مظاہرہ ۱۹۱۹ء کی گرمیوں میں امرتسر کے اس جلیانوالا باغ میں ہوا جس کی زیارت کا شرف مجھے حال میں ہوا۔ ہندوستان اور ساری دنیا جانتی ہے کہ جلیانوالا باغ میں کیا ہتیا کانڈ ہوا اور کس طرح ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور دوسرے پیارے ہم وطنوں کا خون اس ہتیا کانڈ میں مل کر ایک ہو گیا۔ ہندوستان اب کچھ اس طرح ابھر چکا تھا کہ کائنات کی تمام طاقتیں اس ابھرتے ہوئے ہندوستان کو دبا نہیں سکتی تھیں۔ لیکن میں جواہرلال نہرو سے متعلق اپنی کچھ یادیں اور اپنے کچھ تاثرات قلم بند کر رہا ہوں اس لئے اس داستان کو طول نہ دے کر فوراً وہاں پہنچ جاتا ہوں جہاں مہاتما گاندھی نے ہندوستان کی سیاست کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور ہماری تاریخ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک نیا موڑ دے دیا ؎

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو اس کی رہ گزر آئی (فراق)

لیکن ساتھ ہی ساتھ راقم الحروف کا یہ شعر بھی سن لیجئے ؎

ہر آوازِ جرس پر آ ملیں گے قافلے والے
تجھے معلوم بھی ہے کارواں در کارواں ہم ہیں

مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۰ء کے شروعات میں انگریزی سامراج اور انگریزی حکومت پر جو ان کا اٹل عقیدہ تھا اسے خیرباد کہا۔ جب پنجاب کے گورنر سے انگریزی حکومت نے امرتسر اور پورے پنجاب کے ضمیر سوز مظالم پر کوئی بازپرس نہیں کی تو مہاتما گاندھی کی معصومی مجروح ہو کر اس طرح چونک اٹھی کہ سارا ہندوستان چونک گیا۔ اب آزادی کی جنگ کا مہاتما گاندھی نے کھلا ہوا اعلان کر دیا۔ جس طرح ہندوستان میں بلکہ ہندوستان کی جھونپڑیوں میں مہاتما گاندھی کا نعرہ گونجا اور ایک فلک شگاف آوازِ بازگشت ملک کے ذرّے ذرّے سے آئی اسے سن کر خود ہندوستان بلکہ سارا جہان اس جرأتِ رندانہ اور ہمّت مردانہ پر عش عش کرنے لگا ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
دیکھنا ہندوستان اب کیا سے کیا ہو جائے گا

اب سے لگ بھگ پونے تین ہزار برس پہلے راج کمار سدھارتھ نے کپل وستو کا راج محل چھوڑ کر جلاوطنی اختیار کی تھی اور بودھ گیا میں انھیں گیان ہوا تھا۔ اس بار جواہرلال نہرو کا مسکن آنند بھون خود بخود راج محل سے بودھ گیا میں تبدیل ہو گیا اور جس طرح مہاتما بدھ کی قیادت کو سب سے پہلے ان کے پتا اور دوسرے گھر والوں نے قبول کیا تھا بجنسہٖ اسی طرح اس بار ہندوستان کے نئے سدھارتھ جواہرلال نہرو کے تیاگ اور لگن سے متاثر ہو کر ان کے والد محترم پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے پورے گھرانے نے تیاگ اور قربانی کا باناپہن لیا۔

اس دوران میں میری زندگی ہلاکت آمیز آزمائشوں سے گزر رہی تھی اور نیرنگی آگ کم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جھلس کر رہ گئی تھی۔ میں اکتوبر یا نومبر ۱۹۲۰ء میں گورکھپور سے الٰہ آباد محض جی بہلانے کی کوشش کرنے کے لئے چند دنوں کے لئے آ گیا تھا۔ عدم تعاون کی تحریک اپنی پہلی منزلوں میں تھی۔ سارا ملک

ڈانوا ڈول ہو رہا تھا۔ میں اپنی زندگی سے بیزار تھا۔ آئی۔سی۔ایس کا عہدہ بلکہ کوئی بھی عہدہ میرے لئے کسی قسم کی کشش نہیں رکھتا تھا۔ اسی وقت یہ غیبی تحریک میرے اندر پیدا ہوئی کہ میں آنند بھون جو اب ہندوستان کی زیارت گاہ بن چکا تھا جا کر اپنے آپ کو پنڈت موتی لال نہرو کے قدموں میں ڈال دوں۔ جب میں آنند بھون پہونچا تو پنڈت موتی لال نہرو کی پُر شفقت اور پدرانہ شخصیت سے ناقابلِ بیان حد تک متاثر ہوا۔ انھوں نے بھی مجھ میں کوئی غیبی کشش محسوس کی۔ میں نے انھیں یاد دلایا کہ میں گورکھپور کے وکیل منشی گورکھ پرشاد عبرت مرحوم کا بیٹا ہوں جن کی معیت میں وہ تمکوہی راج کا بہت بڑا مقدمہ لڑ چکے تھے اور جیت چکے تھے۔ پنڈت جی اس یاد دہانی پر نہایت محبت آمیز ڈھنگ سے متاثر ہوئے۔ اسی وقت ملاقات کے کمرے میں پنڈت جواہر لال نہرو آ پہونچے اور پنڈت موتی لال نہرو نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے جواہر لال نہرو کو سونپ دیا۔ ہم دونوں کی نگاہیں ملیں اور ہم دونوں نے ایک ایسا باہمی قرب اور کشش محسوس کی جو قریب قریب نصف صدی تک کم از کم میری زندگی کا ایک بہت بڑا سہارا رہی۔

کھدر اور کھدر پوشی اب ایک زمانے سے کسی قدر اپنی امتیازی دلکشی کھو چکے ہیں۔ لیکن جب پہلے پہل ہزار ہا لکھو کھا ہم وطنوں نے کھدر دھارن کیا تو وہ نفسیاتی طور پر منظم اور ہم آہنگ ہو گئے۔ جب موتی لال نہرو کو اور جواہر لال نہرو کو آنند بھون میں میں نے کھدر میں دیکھا تو خاموش طریقے پر اس منظر میں مجھے ایک جادو نظر آیا۔ اس ملاقات کے بعد گورکھپور چلا آیا اور سرکاری عہدے سے اپنا استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔ میں نے اپنے لئے اور اپنے خاندان کے لئے بڑا بھیانک اقدام کیا تھا۔ میری اور میرے پورے خاندان کی روٹیاں خطرے میں آگئی تھیں کیونکہ ہم لوگوں کے پاس کوئی ذریعہ آمدنی اور اثاثہ گزارے کے لئے نہیں تھا۔ قرضے پر گزارا تھا۔ ہاں! تو اب مختصر وقفوں کے بعد صدہا بار جواہر لال نہرو کا قرب حاصل ہونے لگا۔ اگلے چند برسوں کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اختصار سے بھی بیان کروں تو پوری کتاب ہو جائے گی۔

اس دوران میں جواہر لال نہرو نے خاموش طریقے سے مجھے اس کا احساس کرا دیا کہ وہ میری غیر معمولی قدر کرتے ہیں اور کانگریس میں میری شرکت کو ایک بہت اہم واقعہ سمجھتے ہیں اور یہی احساس مجھے مہاتما گاندھی کے محبت آمیز رویے سے ہوا۔

جب ۱۹۲۱ء میں انگلستان کے ولی عہد ہندوستان آئے تو ان کی اس آمد کا بہت بڑے پیمانے پر بائیکاٹ ہوا۔ اس وقت مہاتما گاندھی کو چھوڑ کر قریب قریب تمام چوٹی کے سیاسی لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ غالباً ۶۔دسمبر ۱۹۲۱ء کو الہ آباد میں یو۔پی کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس سے کچھ قبل پورا نہرو پریوار گرفتار ہو چکا تھا اور پنڈت جواہر لال نہرو مجھے یو۔پی کانگریس کا ڈکٹیٹر نامزد کر کے جیل چلے گئے تھے۔ میں نے اس اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ بجائے میرے رفیع احمد قدوائی مرحوم ڈکٹیٹری کا بار سنبھالیں لیکن عین اسی وقت یہ پورا جلسہ گرفتار کر لیا گیا اور ہم سب لوگ نینی جیل میں بھیج دیئے گئے۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو لمبے جرمانوں کے ساتھ ڈیڑھ برس کی قید ہوئی جسے میں نے آگرہ جیل اور کچھ مہینوں لکھنؤ جیل میں گزارا۔ رہائی کے بعد میں گورکھپور آ کر از سرِ نو ضلع کانگریس کمیٹی کا کام کرتا رہا۔ اس دوران میں کئی بار جواہر لال نہرو کبھی تو تنہا اور کبھی دوسرے کانگریس لیڈروں کی معیت میں میرے مہمان ہوتے رہے۔ چند مہینوں کے بعد جواہر لال نہرو نے کانگریس ورکنگ کمیٹی میں یہ تجویز پیش کی کہ مجھے کانگریس کا انڈر سیکرٹری مقرر کر دیا جائے۔ جنرل سیکرٹری پنڈت جواہر لال نہرو خود تھے۔ اب میں الہ آباد چلا آیا اور گویا آنند بھون کے کنبے کا ایک فرد بن گیا۔ دفتر میں اور دفتر کے اوقات کے بعد دفتر سے باہر روزانہ میرا اور جواہر لال نہرو کا ساتھ رہنے لگا۔ اس زمانے میں میں نے کئی برسوں تک جواہر لال نہرو کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ دفتر کا کام بہت باقاعدگی سے کرتے تھے۔ کبھی ایک آدھ دن کے لئے طبیعت ناساز ہو جاتی تو وہ دفتر کو لکھ بھیجتے کہ "میں شرمندہ ہوں کہ آج بیمار پڑ گیا اور دفتر نہ آسکوں گا۔" وہ بیمار پڑ جانے کے معاملے میں مریض کو ذمہ دار

اور مجرم سمجھتے تھے۔ اسے تقدیر کی بات نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بار دفتر کے کام سے فراغت پاکر جواہر لال نہرو نے مجھ سے پوچھا کہ انیسویں صدی کے دو سب سے بڑے انسان کون تھے؟ خود ان کو اور گاندھی جی کو تو میں بیسویں صدی کا آدمی مانتا تھا۔ میں ذرا سوچ میں پڑ گیا تو انھوں نے خود کہا اور بالکل صحیح کہا کہ ڈارون اور مارکس۔ آج جب ان کی یہ مختصر گفتگو یاد کرتا ہوں تو یہ سوچ کر دل کو ایک چوٹ لگتی ہے کہ کاش ہمارے تمام سیاسی اور سماجی لیڈر، ڈارون اور مارکس کی عالم گیر اہمیت کا احساس کرتے یا کر سکتے تو شاید ہمارا ملک فکریاتی لحاظ سے بہت سی غلطیوں کا شکار نہ بنتا۔

جواہر لال نہرو تن آسانی، عیش و آرام اور لذت پرستی سے بہت دور تھے۔ ان کی شخصیت میں جھول تھا ہی نہیں۔ اور نہ کہیں یا کسی لحاظ سے ڈھیلا پن تھا۔ ایک بار مجھ سے کہنے لگے "جانتے ہو کہ میں الہ آباد ہائی کورٹ میں بیرسٹری کرنے کے خیال سے کیوں بیزار رہا ہوں؟" پھر خود ہی بتایا کہ بار ایسوسی ایشن میں لوگوں کی زندگی میں کوئی گہرائی یا سنجیدگی نہیں تھی بلکہ اس قدر یہ زندگی سطحی اور بے تہہ تھی کہ میں ایک منافرت محسوس کرنے لگا۔ مجھے ایک بات اور یاد کرکے کچھ فخر سا محسوس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی جواہر لال کا موڈ دیکھ کر میں انھیں اردو کے رچے ہوئے اشعار سناتا تھا۔ اردو شاعری پر میری بات چیت وہ بڑے انہماک سے سنتے تھے۔ عجب کیا کہ اردو اور ہندی کے جھگڑے کے معاملے میں جس بلند مدبرانہ روشن خیالی کا ثبوت وہ دیتے رہے اس معاملے میں ان باتوں اور وقفوں کا بھی کچھ حصہ ہو۔ اس زمانے میں وہ اردو بالکل لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہندوستان کے کس خطے کا حسن فوقیت رکھتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے حسن کی خطہ وار تقسیم یا بٹوارہ نہیں کیا تھا۔ کہنے لگے کہ سندھ کے حسن میں سب سے زیادہ دل کشی ہے۔

جواہر لال نہرو کی اور میری ذہنی ادبی دل چسپیوں میں کچھ ہستیاں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ہم دونوں یورپ اور خاص کر جدید یورپ کے کارناموں اور تخلیقات سے متاثر تھے جیسے کروپاٹکن، برنارڈ شا، ایچ جی ویلز۔ اس کے علاوہ بیسیوں اور ادبا اور مفکرین تھے۔ میں یورپ کی بلند ہستیوں کے علاوہ قدیم ہندوستان کے مفکروں، شاعروں اور فن کاروں اور ایران کے ادب و فنونِ لطیفہ سے بھی شدید دل چسپی رکھتا تھا لیکن اس امر پہ میرے ان کے تبادلۂ خیالات کی نوبت بہت کم آئی۔ شاید اس طرف ان کا دھیان قریب قریب اس زمانے میں گیا جب وہ Discovery of India (تلاشِ ہند) کی تصنیف کئی برس بعد جیل میں کر رہے تھے۔ میں نیم شعوری طور پر اس زمانے میں بھی یہ محسوس کرتا رہا کہ جواہر لال نہرو انتہائی سیاسی سرگرمیوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کرکے بھی عالمی یا آفاقی کلچر سے ایک زندہ اور شدید لگاؤ رکھتے ہیں۔ عمل کو وہ علم و فکریات سے الگ نہیں کرتے۔ کاش ہمارے سیاسی کارکنوں میں سطحی اور نری سیاست کے علاوہ آفاقی کلچر سے واقفیت حاصل کرنے اور اس سے متاثر ہونے اور اس کی روشنی میں ہندوستان کی تعمیر کرنے کی لگن اس کی آدھی بھی ہوتی جس کا اندازہ میں نے جواہر لال نہرو کی شخصیت میں کیا تھا۔ جب جب گورکھپور میں جواہر لال نہرو میرے مہمان ہوتے تو رات کو سو جانے سے پہلے سرہانے لالٹین رکھ کر کچھ نہ کچھ ضرور پڑھتے۔ "الیکشن باز" سیاستدانوں یا سیاست نادانوں کو یہ توفیق کہاں؟

جواہر لال نہرو کی خوراک عام آدمیوں سے کافی کم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کھانے پینے کا فرض وہ ایک جھٹکے کے ساتھ انجام دیتے ہیں اور نیم توجہی کے ساتھ پورا کرتے ہیں۔ انھیں ناشتے پر براؤن بریڈ بہت پسند تھا اور کھاتے وقت ان کی انگلیوں کے سرے ہی کھانے کی چیزوں سے بھیگتے تھے۔ یہ سارے محاسن اور لطائف و ظرائف ان کی خاندانی ثقافت اور لڑکپن ہی سے انگلستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمی اداروں کی دین تھے۔ اکثر ان کے ساتھ عام جلسوں میں تقریریں کرتے ہوئے میں ایک روایتی غلطی کا مرتکب ہو جاتا تھا۔ میں ہی کیا۔ یہ غلطی مولانا محمد علی اور ہزاروں لاکھوں دوسرے آدمی بھی کرتے رہے۔ میں نے کئی بار ان کے سامنے دورانِ تقریر میں لوگوں سے کہا کہ جواہر لال نہرو کے پورے گھرانے کے کپڑے پیرس میں

ڈھلتے تھے۔ انھوں نے ایک بار تخلیے میں مجھے بتایا کہ بھائی یہ سب غلط ہے۔ ایسا کرنے سے تو پیرس ہی سے ہم لوگ برابر نئے کپڑے اسی قیمت میں سلوا کر منگا سکتے تھے۔ عجیب عجیب باتیں ہمارے خوش اعتقادوں، اختراع زدہ یا افواہ زدہ یارانِ وطن نے مشہور کر رکھی تھیں جن میں ایک بات یہ تھی کہ جواہر لال نہرو یا پنڈت موتی لال نہرو کے کموڈ کے برتن میں نہایت قیمتی مخمل جڑا ہوا ہوتا ہے۔ میں نے ایسے دوستوں سے عرض کیا کہ کبھی آپ نے یہ بھی غور کیا کہ ایسا کموڈ صاف کیسے کیا جائے گا اور کتنی بار استعمال میں آسکے گا۔ تب لوگوں کی آنکھیں کھلیں۔ کئی بار موٹروں اور دوسری سواریوں پر دیہاتوں کے دور دراز سفر میں جواہر لال نہرو میرے ساتھ تنہا رہے ہیں۔ ایک بار کسی چھوٹے سے شہر میں مقامی کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری کو بھی ہم لوگوں نے کھانے پر بلا لیا تھا۔ جب مٹن کے نام سے ایک چیز تقسیم کی جارہی تھی تو سیکرٹری صاحب نے نہایت معصومی سے پوچھا کہ مٹن میں گوشت تو نہیں پڑا ہے۔ سب کو لطف آگیا۔ ایک بار کچھ مارواڑیوں نے پنڈت جی اور ہم سب کو چائے پلائی۔ لیکن چائے پینے کے ظروف یعنی پیالے سب دھات کے بنے ہوئے تھے۔ سب کے ہونٹ جھلس جھلس جاتے تھے۔ میں خود سوچ نہیں پا رہا ہوں کہ وہ چائے ہم لوگوں نے پی کیسے؟ 'لب سوز' تک تو خیریت تھی لیکن یہ چائے تو 'لب پھونک' تھی یا 'لب جھلس'۔ آپ سمجھے کہ یہ جدت یا بدعت کیوں کی گئی تھی۔ کٹر قسم کے ہندو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ صرف دھات کے برتن استعمال ہونے کے بعد صفائی کے ساتھ مانجے جاسکتے ہیں۔ جواہر لال نہرو ایسے موقعوں پر جھلاتے نہیں تھے بلکہ بیک وقت اپنی ہنسی اور غصے کے امتزاج سے اپنے دل و دماغ میں گدگدی پیدا کر لیا کرتے تھے۔

ایک بار غالباً ضلع بستی میں دورہ کرتے ہوئے پنڈت جی کو شدید بخار ہو آیا لیکن اس عالم میں بھی انھوں نے بخار سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خود اپنی داڑھی شیو کی جو صرف ایک ہی روز کی بڑھی ہوئی تھی۔ میں ان کی اس باقاعدگی پر نم دیدہ ہو گیا تھا۔ آج جب یہ بات یاد آتی ہے کہ ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کی صبح کو جب وہ ناقابل برداشت کرب میں مبتلا تھے اور اس دنیا میں صرف چند گھنٹوں کے مہمان تھے، انھوں نے اپنا شیو بنایا تھا تو کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ یہ شخص آخری سانس تک ایک سپاہی تھا۔ ایشیا کی روایتی کاہلی انھیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔ ہم لوگ پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے پورے خاندان کے متعلق ایک نہایت غلط اور گستاخانہ تصور کو اپنے دلوں میں جگہ دئے ہوئے ہیں۔ وہ یہ کہ یہ پورا خاندان عیش پرستوں کا خاندان تھا۔ میں نے اس خاندان کے ایک ایک فرد کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میری نگاہیں ایکس رے کا کام کرتی ہیں اور اس مضمون کے ذریعے میں ہندوستان اور ساری دنیا کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس خاندان کا ایک ایک فرد فولادی رگ و ریشہ کا آدمی تھا اور ہے۔ نفاست پسندی کو سستی عیاشی سمجھنے کی غلطی ناقابلِ معافی ہے۔ جواہر لال نہرو کو زندگی میں ہزارہا ایسے موقعے آئے ہیں جب انھیں سخت سے سخت جسمانی آزمائش سے دوچار ہونا پڑا ہے لیکن وہ اتنے سدھے ہوئے آدمی تھے کہ کنکروں کے بستر پر بھی انھیں نیند آسکتی تھی۔

ایک ایک واقعہ یاد آتا ہے اور کلیجہ خون ہو جاتا ہے۔ دیش بندھو داس، پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے اور محبانِ وطن کا ایک بڑا حصہ تحریکِ ترکِ موالات کے چار سال بعد یہ چاہنے لگا کہ کونسلوں اور اسمبلیوں کا بائیکاٹ بند کر دیا جائے اور الیکشن لڑا جائے۔ مہاتما گاندھی ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔ جواہر لال نہرو اس امر میں رہے تو خاموش لیکن گاندھی جی سے کھلم کھلا اختلاف کا خیال ان کے راستے میں حائل ہو جاتا تھا۔ باپ بیٹے میں یعنی موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو میں ایک کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ آنند بھون ایک خاموش لیکن ناخوش گوار کشاکش میں مبتلا ہو چکا ہے۔ انھیں دنوں ایک روز جب جواہر لال نہرو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں موجود نہیں تھے دفتر میں ڈاک آئی جو مجھے سونپ دی گئی۔ اس میں ایک لفافہ جواہر لال نہرو کے نام تھا اور پتہ مہاتما گاندھی کا لکھا ہوا تھا۔ اس وقت مجھ سے ایک جرم سرزد ہوا جس کا انکشاف میں آج کر رہا ہوں۔ مجھے کوئی حق مہاتما جی کے جواہر لال نہرو کے نام اس ذاتی خط کو کھولنے کا نہیں تھا

لیکن مجھ سے رہا نہیں گیا اور نہایت احتیاط سے میں نے اس خط کو کھول کر پڑھ لیا۔ مہاتما جی نے جواہر لال کو لکھا تھا کہ اگر تم تکلیف اور پریشانی محسوس کر رہے ہو تو میں تمھیں کسی کالج میں پروفیسری دلانے کی فوراً کوشش کر سکتا ہوں۔ میں نے نہایت احتیاط سے لفافہ بند کر دیا اور دوسرے دن پنڈت جواہر لال نہرو کو لفافہ مل گیا۔ انھیں یا کسی کو پتہ نہیں چلنے پایا کہ میں مہاتما جی کا خط پڑھ چکا ہوں۔ اس وقت مجھے اس امر کا علم اور احساس ہوا کہ باپ بیٹے کی کشیدگی یہاں تک پہونچ چکی ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ ہر سال ایک دن پنڈت موتی لال نہرو تک بھگ دس ہزار روپے جواہر لال کے نام کرنٹ اکاؤنٹ میں بینک میں جمع کر دیتے تھے تاکہ سال بھر تک انھیں اپنے ذاتی اخراجات کے لئے باپ سے کچھ مانگنا نہ پڑے۔ لیکن جب مذکورہ بالا کشمکش پیدا ہو گئی تو اس سال بد دلی کی وجہ سے موتی لال جی نے ایسا نہیں کیا تھا جس سے یہ نازک حالت پیدا ہو گئی تھی۔

ادھر دیش بندھو داس اور موتی لال نہرو وغیرہ کی قائم کردہ سوراج پارٹی کا ؤنسلوں اور اسمبلیوں پر کانگریس کا قبضہ جانے کی کش مکش جاری کئے ہوئے تھی۔ ادھر اس تجویز کے خلاف مہاتما جی کے پیرو اپنی کوششیں جاری کئے ہوئے تھے۔ کانگریس میں ایک تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ اس وقت پنڈت جواہر لال نہرو نے انگلستان کی سیاست اور سیاسی روایتوں کی روشنی میں ایک سمجھوتہ (Compromise) پیش کیا۔ وہ سمجھوتہ یہ تھا کہ کانگریس بحیثیت مجموعی انتخابات نہ لڑے۔ لیکن کانگریس کے ممبروں کو فرداً فرداً اس کی آزادی ہو کہ وہ انتخابات میں حصہ لیں۔ یہ تجویز دلی میں کانگریس کے ایک خاص اجلاس میں پاس ہو گئی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی کوششوں سے کانگریس ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچ گئی۔ نہایت روشن خیالانہ اور مدبرانہ تجویز تھی۔ آنند بھون کی فضا بھی اب مکدر نہیں رہی تھی۔ اس طرح کانگریس نے ہندوستان کی آئینی مجالس پر الیکشن لڑ کر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ دلی اسمبلی میں سوراجیہ پارٹی کے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ پیش آیا جو مجھ سے متعلق ہے۔ پنڈت موتی لال کو ایک ایسے سیکرٹری کی ضرورت پڑ گئی جو پارلیمنٹ کے کاموں میں ان کی مدد کر سکے۔ ان کی نظر انتخاب مجھ پر پڑ گئی۔ یہ بات میرے لئے باعث فخر تھی کیونکہ اس منصب کے لئے غیر معمولی قابلیت کی ضرورت کا احساس کر کے پنڈت موتی لال نہرو نے میرا انتخاب کیا تھا اور نہایت محبت سے مجھے اس جگہ کی دعوت دی تھی۔ جواہر لال نہرو مجھے ایک کنارے لے گئے اور بتایا کہ پاپا کا سیکرٹری ہونے کا مشورہ میں تمھیں نہ دوں گا۔ جب یہ بات پنڈت موتی لال نہرو کو معلوم ہوئی تو ایک عرصہ کے لئے وہ جواہر لال نہرو سے کافی ناخوش ہو گئے۔ لیکن جواہر لال نہرو نے مجھے صحیح مشورہ دیا تھا۔ وہ میرے کردار سے واقف ہو چکے تھے اور جانتے تھے کہ قابلیت سے قطع نظر جس مستعدی، مشقت اور کئی دیگر لوازم کی اس جگہ کے لئے ضرورت ہے وہ میرے مزاج و کردار میں نہیں ہیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ کچھ دنوں کے لئے لکھنؤ کے ولی صاحب اور بعد کو ہندوستان کی ناقابل فراموش ہستی رفیع احمد قدوائی نے اس منصب کو سنبھالا۔

۱۹۲۶ء کی کانگریس کا اجلاس آسام کی ریاست میں ضلع گوہاٹی میں ہوا جس کے صدر سری نواس آینگر مرحوم تھے۔ جن سے پنڈت موتی لال نہرو کی ذرا کم پٹتی تھی۔ اس اجلاس میں کانگریس کے سیکرٹری رنگا سوامی آینگر چنے گئے۔ کانگریس کا دفتر مدراس منتقل ہو گیا۔ میں مدراس نہیں جا سکتا تھا اس لئے میں انڈر سکریٹری کے عہدے سے مستعفی ہو گیا۔ اس اجلاس کے بعد تقریباً دو برس کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو نے یورپ کے ممالک کا وہ سفر کیا جو غالباً ان کی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم واقعہ ہے۔ اس سفر میں بڑے ملکوں کی سیاست اور عالمی سیاست کا جواہر لال نہرو نے اتنا گہرا مطالعہ کیا کہ عالمی سیاست کے وہ دنیا میں سب سے بڑے ماہر بن گئے۔ اتنے بڑے ماہر کہ خود میرے سامنے مہاتما گاندھی نے اعلانیہ اعتراف کیا کہ بین الاقوامی سیاست میں جواہر لال میرے گرو ہیں۔ اسی سفر نے جواہر لال میں وہ صلاحیت پیدا کر دی کہ انھوں نے ہندوستان کی خارجہ پالیسی کو ساری دنیا میں سب سے روشن خیال

پالیسی بنا دیا - اور ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دے دیا - اس سفر میں جواہرلال نہرو نے مجھے بتایا کہ انھیں مسولینی اور ہٹلر نے بہت بُلانا چاہا اور اپنا ہم خیال بنانا چاہا لیکن جواہرلال نہرو نے فاشزم اور نازی ازم کے خطروں کا احساس کر لیا تھا اور وہ اس دام میں نہیں پھنسے - اس سفر میں یورپ کے مختلف ممالک سے جواہرلال نے مجھے پچیس تیس خط بھیجے تھے - یہ خطوط میں اپنے لاُابالی مزاج کا شکار ہو کر کھو چکا ہوں اور ایک مدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ ان خطوط کو کھو کر میں نے ایک ناقابلِ معافی جرم کیا ہے -

میں اب الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہو چکا تھا - جواہرلال نہرو سے کبھی کبھی ملاقاتیں ہو جاتی تھیں - ایک بار اسی دوران میں جب وہ آنند بھون آئے ہوئے تھے میں ان سے ملنے گیا - وہ برسوں تک مجھے رگھوپتی کہا کرتے تھے لیکن یونیورسٹی میں میں سہائے صاحب ہو گیا تھا یعنی رگھوپتی سہائے کا آخری ٹکڑا میرا نام بن گیا تھا - میں نے بے خیالی میں یہ لکھ کر اطلاع کرائی کہ سہائے صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں - وہ اس نام کو پہچان نہیں سکے - جب وہ باہر آکر مجھ سے ملے تو یہ کہتے ہوئے اندر لے گئے کہ اب آپ سہائے صاحب ہو گئے کچھ دنوں میں صرف سہائے صاحب نہ رہ جائیں - اچھا اب یادوں کے باب کو ختم کرتا ہوں اور اس مضمون کے آخر میں کچھ تاثرات قلمبند کرتا ہوں - لیکن ایک یاد عالمِ فراموشی سے ابھر آتی ہے - ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں جواہرلال نہرو اور رفیع احمد قدوائی نے مشورہ کر کے طے کیا کہ اتر پردیش کے چناؤ میں میں کانگریس کی طرف سے کھڑا ہو جاؤں - لیکن اب میں عملی سیاست سے الگ ہو چکا تھا اور میں نے اظہارِ معذرت کر دیا -

آزادی کے بعد جواہرلال نہرو کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں - محض عوام نہیں بلکہ ملک کے خواص اور بڑے سے بڑے مفکروں نے عالمی سیاست کے سلسلے میں انھیں بجا طور پر جگت گرو مانا ہے - اب جواہرلال امر ہو چکے ہیں اور اس صدی کی تاریخ ان کے کارناموں کے بغیر ہرگز مکمل نہیں سمجھی جا سکتی - میں اکثر دل ہی دل میں یہ سوچتا ہوں کہ جواہرلال نہرو اور میں اس قدر باہمی قرب اور ہم آہنگی کیوں محسوس کرتے تھے - میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ مشرقی اور مغربی، قدیم اور جدید کلچر کا جو سنگم ہندوستان کو خود تکمیلی کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے لازمی ہے - وہی سنگم یا وہی امتزاج ہم دونوں چاہتے تھے - نہ محض مغربی زندگی سے کام چلنے والا ہے، نہ صرف بھارت ماتا، بھارت ماتا کی لاٹھی سے کام چلنے والا ہے - ہم دونوں کے دل ایک ہی ساز کے پردوں کی دھڑکن تھے -

۳۱ - مارچ ۱۹۶۴ء کو جب میں دلی میں موجود تھا تو ایک پیام جواہرلال نہرو کے یہاں سے میرے نام آیا کہ پنڈت جی تمھیں یاد کر رہے ہیں - ان کے یہاں دو تین شاعروں کی چھوٹی سی نشست اسی دن رکھی گئی تھی - وہ جب مجھ سے ملے تو دیر تک میرا ہاتھ نہیں چھوڑا - ہم دونوں اپنے آنسوؤں کو روکے ہوئے تھے - میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھ سے صرف چھ سات برس بڑے ہیں - آپ کو کہاں سے یہ حق پہونچ گیا کہ میں تو چلتا پھرتا رہوں اور آپ اس قدر بیمار پڑ جائیں - اس جملے کے خاموش تاثرات کو میں نے کچھ دیر تک آنکھیں بھر کے ان کے چہرے پر دیکھا - دلن ڈوبے صحبت ختم ہوئی - میں جواہرلال نہرو، اندرا گاندھی اور لال بہادر شاستری سے رخصت لے کر بھاری دل سے دلی میں اپنی جائے قیام پر آگیا - مجھے بعد کو لوگوں نے بتایا کہ میرے چلے آنے کے بعد غیر معمولی شفقت اور بہت سی یادوں کی تھرتھراہٹوں کے ساتھ جواہرلال نہرو میرا ذکر کرتے رہے - مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ہم لوگوں کی آخری ملاقات تھی -

بسمل سعیدی

سیلِ غم

ہو گئی ساری داستاں ہمہ غم
از زمیں تا بہ آسماں ہمہ غم

غم ہی غم صبح، شام غم ہی غم
زندگی ہے تمام غم ہی غم

غم ہی غم ہے تمام عالم میں
غرق، عالم تمام ہے غم میں

مہر غمگیں ہے، ماہ غمگیں ہے
کل سفید و سیاہ غمگیں ہے

غم زدہ غایت و غرض غمگیں
ہے غمیں جوہر و عرض غمگیں

عام اک جشنِ مشترک غم ہے
شرق سے لے کے غرب تک غم ہے

پھول غمگیں ہیں باغ غمگیں ہیں
دل ہیں غمگیں دماغ غمگیں ہیں

قیس و لیلیٰ و ساربان غمگیں
کارواں کا ہے کارواں غمگیں

جس قدر غم ہے کس قدر کم ہے
مرگِ انسانیت کا ماتم ہے

ملک در ملک، شہر در شہر آہ
ہر طرف غم ہی غم، خدا کی پناہ

یہ کوئی غم کدہ ہے یا دہلی
کوئی ماتم کدہ ہے یا دہلی

موت کا دوش ہے کہ دھرتی ہے
دوش پر زندگی کی ارتھی ہے

ستم و جورِ آسمانی سے
اٹھ گئے آج دارِ فانی سے

رہ نمائے جہاں جواہر لال
میرِ ہر کارواں جواہر لال

اے بدا دورِ چرخِ بد اسلوب
ہو گیا مہرِ نیمروز غروب

دوپہر کو ہوئی ہے آج وہ شام
روک دی جس نے گردشِ ایام

جسدِ تاریخ جیسے ختم ہوا
رک گیا یوں قلم مورخ کا

لکھ گیا داستانِ آزادی
رہبرِ کاروانِ آزادی

کر گیا ملک و قوم کو آزاد
خاتمِ دورِ جبر و استبداد

ہو گئی قدرِ ہر روایت ختم
شرف و مجدِ آدمیت ختم

دامنِ کائنات نم نہ رہا ۔۔۔ چشمِ ہستی میں اشکِ غم نہ رہا
کس کے مرنے پہ آہ روئیں گے ہم ۔۔۔ موت اب کس کی ہوگی قابلِ غم
حاملِ وصف بے شمار تھے وہ ۔۔۔ کتنے اچھوں کی یادگار تھے وہ
اہلِ فضل ان میں کتنے شامل تھے ۔۔۔ کس قدر جامعِ فضائل تھے
آج کس کس سے ہم ہوئے محروم ۔۔۔ ان سے زندہ تھے کس قدر مرحوم
شخصیت ہو تو شخصیت ایسی ۔۔۔ مرتبت ہو تو مرتبت ایسی
اُن کی محبوبیت میں عظمت تھی ۔۔۔ اور عظمت میں ان کی محبوبی
ان کا انداز کتنا پیارا تھا ۔۔۔ جامہ زیبی نے قول ہارا تھا
ان کے غصے میں پیار شامل تھا ۔۔۔ شامل ان کے دماغ میں دل تھا
صاحبِ طرز مالکِ تحریر ۔۔۔ مایۂ ناز وہ ادیبِ شہیر
کتنی مطبوع طبع مطبوعات ۔۔۔ وجہِ تالیفِ قلب تصنیفات
جن سے محظوظ و مستفید ہوا ۔۔۔ روس، انگلینڈ، جرمن، امریکہ
اُن کی عزت زمانے بھر میں تھی ۔۔۔ اور اتنی ہی جتنی گھر میں تھی
متاثر تھا ان سے سارا جہاں ۔۔۔ امنِ عالم کی تھے وہ رُوحِ رواں
جنگ سے جس جگہ گریز ہو ننگ ۔۔۔ تھا وہاں ذہن میں تصورِ جنگ
ان کا دورِ وزارتِ عظمیٰ ۔۔۔ بابِ زریں ہے اک سیاست کا
تھی زمانے میں بے عدیل و نظیر ۔۔۔ ان کی فہم و فراست و تدبیر
اب کہاں پاسبانِ ملک ایسے ۔۔۔ نیرِ آسمانِ ملک ایسے
ہاں مگر وہ غروب ہو کر بھی ۔۔۔ دے گئے روشنی ہمیں اپنی
سرد ہو کر بھی آفتابِ حیات ۔۔۔ کر گیا ہم کو گرمِ عزم و ثبات
اُن کے آدرش ہم نہ بھولیں گے ۔۔۔ عمر بھر اُن کا غم نہ بھولیں گے
یاد رکھیں گے زندگی اُن کی ۔۔۔ زندگی اب ہے پیروی اُن کی

ہر رہِ پیچ و خم پہ چلنا ہے
اُن کے نقشِ قدم پہ چلنا ہے

کرشن موہن

کرم یوگی نہرو

اے یوگی کیوں توڑ دئے تو نے عہد و پیمان
سب کو روتا چھوڑ گیا اپنے غم میں ہلکان
تیرا جیون تھا سنسار کی شان
کرم یوگ کا مان
ماتو پریم کی خاطر تو نے تن من دھن سے
کام کیا دن رین
تج کر سب سکھ چین

صدیاں بیتیں تو پیدا ہو تجھ سا راہنما
روز کہاں آتے ہیں جگ میں تجھ سے من سمراٹ
جیون کا سمّان لئے تو اُترا کال کے گھاٹ

شانتی میں بھی اک شکتی ہے
ماتو پریم ایشور بھکتی ہے
تو نے ہمیں بتایا
تیاگ کے تن کی مایا

اے آزادی کے مندر کے پریم پجاری
آج ترے انتم درشن کو
آئے ہیں لاکھوں نر ناری
آنکھیں کھول انھیں پہچان
دکھ میں ہیں سارے سنساری
ماتو جیون کا آدرش رہا ہے تیرا یوگ
آج ترے اٹھ جانے سے ہر دل پر چھایا سوگ

پھول، تری پتیاں بکھری ہیں لیکن تیری خوشبو
رہتی دنیا تک من مہکائے گی
تو نے اپنے پران دئے ہیں تیاگ اے سورگ سہاگ
لیکن تیرا کام امٹ ہے، تیرا نام امر
اب تیرے پدچن ہوں گے رہبر

ارتقاء سر بگریباں ہے مرا، اُمّ خاموش
صبحِ نو سوگ میں ہے، کون سنبھالے اس کو
مرثیہ خواں ہو کہ اب وہ دلِ پُر سوز نہیں
قوم کے تازہ اُٹھانے کا سلیقہ کس کو؟

راہِ پُرخارِ سیاست کے خم و پیچ میں بھی
اب کسے ہوگی بھلا پیار کی جنّت کی تلاش
کون ماضی کے اُجالوں کو سمجھ پائے گا
کس کے امکان میں ہوگی نئے بھارت کی تلاش

امتزاجِ عمل و جذبہ تھی جس کی ہستی
پیش کرتے ہی رہے علم و ادب جس کو خراج
ذہن میں حسن، نگاہوں میں شعورِ تاریخ
شیر کا دل تھا جو سینے میں تو شاعر کا مزاج

ہر نفس وہم روایات سے لڑتا ہی رہا
ہر قدم ایک نیا باغ لگایا اس نے
زندگی جب بھی لُٹی، اس کی نظر چیخ اُٹھی
روشنی جب بھی گھٹی، خود کو جلایا اس نے

سخت تر مرحلۂ دار و رسن آئے - مگر
ہاتھ سے عظمتِ کردار کا دامن نہ چھُٹا
اس کے چہرے پہ کوئی گردِ مہ و سال نہ تھی
یہ وہ بوڑھا تھا کہ جس سے کبھی بچپن نہ چھُٹا

دوستوں کا ہے تقاضا میں لکھوں نظم - مگر
مجھ پہ جو بیت رہی ہے وہ کوئی کیا جانے
یوں تو ان میں سے ہر اک فرد ہے مخلص پھر بھی
کون ایسا ہے جو بڑھ کر مرا غم پہچانے

میری دنیا میں بپا موت کا سنّاٹا ہے
لئے جاتا ہے جو سانس اب بھی وہ تنہا میں ہوں
سامنے میرے کئی تازہ جنازے ہیں دھرے
جن پہ رونے کے لئے ایک اکیلا میں ہوں

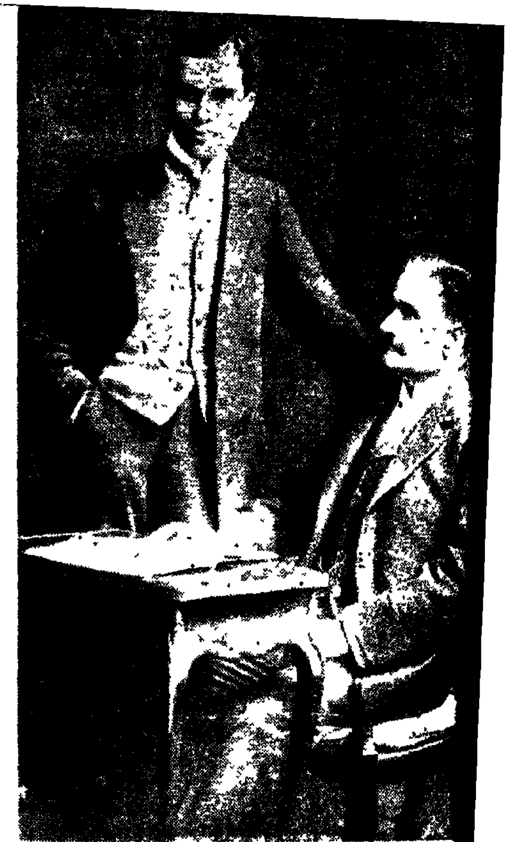
یہ جنازہ ہے بصیرت کا - وہ ہے فکر کی لاش
یہ جنازہ ہے مری راہ کا — وہ منزل کا
یہ مرے ذہن کا مردہ - وہ نگاہوں کی ہے لاش
یہ مرے قلب کی میت — وہ جنازہ دل کا

اس طرف زیرِ کفن ہے مرے کنبے کا بزرگ
اس طرف میرے بھرے گھر کا ہے لاشہ - دیکھو
یہ مرے بھائی کی میت - وہ مرے چاچا کی
یہ مرے کاندھے پہ، خود میرا جنازہ دیکھو

مہر بہ لب جو ہوا ہوں تو یہ مجبوری ہے
ایک دو غم مجھے ملتے تو انھیں کہہ لیتا
داغ ہی داغ ہیں سینے میں، جگر چاک ہی چاک
زخم دو چار جو کھلتے تو انھیں سہہ لیتا

موج در موج بڑھا جاتا ہے سیلابِ الم
ڈوبنے والا ہوں، تنکے کا سہارا دے دو
دوستو! آج تقاضائے سخن کے بدلے
بن پڑے تم سے تو آؤ مجھے پُرسا دے دو

جواہرلال نہرو
زندگی کی جھلکیاں



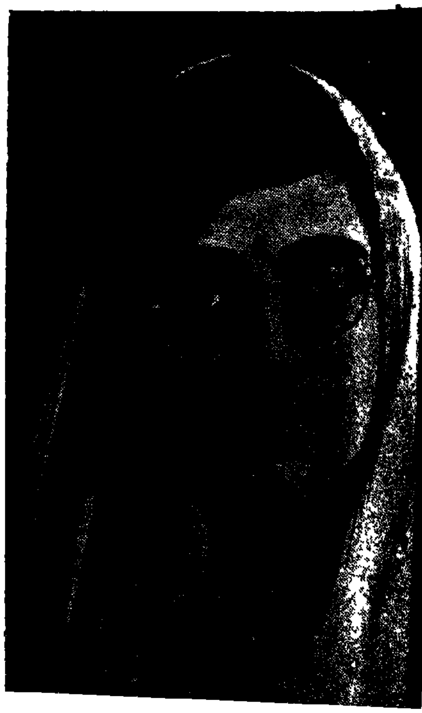
۱۹۱۲ء میں
اپنے والد کے ساتھ



بیٹی اور نواسوں کے سا



کملا نہرو کے ساتھ شادی کے بعد



کملا نہرو



بیرسٹر کے لباس ۱۹۱۲ء،

اپنے رفیقوں کے ساتھ



مولانا آزاد کے ساتھ



خان عبدالغفار خاں کے ساتھ

سردار پٹیل کے ساتھ



ڈاکٹر راجندر پرساد کے ساتھ



خواجہ احمد فاروقی

افسانۂ آں شبے کہ با یار گزشت

یادش بخیر، میرٹھ کالج بھی عجیب ادارہ تھا اور ۳۵ء، ۳۶ء کا زمانہ اس سے بھی عجیب تر۔ ہر طرف مقدمۂ سازش میرٹھ کے چرچے تھے۔ مظفر احمد اور شوکت عثمانی کی کہانیاں الف لیلہ کی طرح مشہور ہو گئی تھیں۔ کالج پر Rationalist Association لنڈن ٹائمس، ہیرلڈ جرنل اور ہریجن کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ پارٹی اور کانگریس کا ہر جگہ ذکر تھا۔ کالج کے پرنسپل کرنل ٹی اف اوڈانل ایک آئرش تھے جو وائسرائے کے اے ڈی سی ہونے کے باوجود ہندوستان کی تحریکِ آزادی سے بڑی ہمدردی رکھتے تھے۔ میں اس زمانہ میں صوبائی اسٹوڈنٹس کانگریس کی مجلسِ عاملہ کا ممبر اور نائب صدر تھا۔ ان صحبتوں نے عروقِ مردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا دیا تھا، دل میں عجیب قسم کا ولولہ تھا۔ خودی بہت بڑھ گئی تھی اور "یزداں بکمند آور" سے کم، طبیعت کسی چیز پر راضی نہ ہوتی تھی۔ نہ معلوم اتراہٹ تھی یا بڑے بننے کا شوق یا کسی مرشد کی تلاش یا یہ جذبہ کہ ان بڑوں کی چھوٹ ہم پر بھی پڑ جائے۔ شاید ہی دلی اور میرٹھ میں کوئی اہم جلسہ ایسا ہوتا ہو جہاں میں نہ پہنچتا ہوں۔ دہلی میں خالدہ ادیب خانم آئیں اور میں صفوں کو چیرتا ہوا پہلی قطار تک پہنچ گیا۔ ٹیگور میرٹھ آئے، میں جب تک روبرو نہ بیٹھ گیا چین نہیں آیا۔ پنڈت جی مسز ارونا آصف علی کے ساتھ میرٹھ آئے، میں نہ صرف ان کے پاس پہنچ گیا بلکہ اپنا دعوت نامہ بھی پیش کر دیا۔ "پنڈت جی ہمارے کالج میں لکچر دے دیجئے۔"

پنڈت جی جیسے بھرے بیٹھے ہوں۔ "جی نہیں، میں الکشن کے لئے آیا ہوں۔ الکشن کو اپنے دماغ سے Switch off نہیں کر سکتا۔ کیسا کالج۔ میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔"

شمشیر کی یہ عریانی دیکھنے کے قابل تھی!

میں نے مؤدبانہ عرض کیا "اس الیکشن کی اہمیت ہی پر کالج میں تقریر کر دیجئے۔"

میری توقع کے خلاف اتنی دیر میں ان کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ اور اب وہ سراپا لطف و کرم تھے۔ فرمایا "عقلمند، تم نے مجھے پہلے سے کیوں نہ لکھ دیا۔ اب تو ایک ایک منٹ بندھا ہوا ہے۔ تم لڑکوں کو میری طرف سے دعوت دے دو وہ یہاں آ جائیں ورنہ میرے اوپر بوجھ رہے گا۔"

"وہ تو بغیر آپ کے بلائے بھی آئیں گے۔ آپ فرماتے ہیں تو ان سے کہہ بھی دوں گا۔"

"تم خفا تو نہیں ہوئے؟ میں اس کی پھر کبھی تلافی کر دوں گا۔"

"آپ سے اور خفگی — اوّل تو خفگی نہیں اور اگر ہے تو اس پر ہزار محبتیں قربان ہیں۔"

پنڈت جی کے چہرے پر جوشِ عشق کی سرخی تھی اور جس سے ان کا پورا پیکرِ گل تابناک تھا وہ مجھے آج تک یاد ہے۔

اس الکشن کی مصروفیت میں جب بلفظِ زمین کی طنابیں کھچ گئی تھیں اور انھوں نے بیل گاڑی سے لے کر ہوائی جہاز تک ہر ممکن

ذریعہ سے سفر کرکے ہندوستان کی ساری زمین کو طے کر ڈالا تھا، اس عالم میں انھیں ایک معمولی لڑکے کی دل داری کا خیال رہے، وہ اس کی پیشانی سے محرومی کی سلوٹیں صاف کریں۔ اس سے پوچھیں کہ تم آزردہ تو نہیں ہوئے — معمولی بات نہیں ہے۔

آوازۂ خلیل ز بنیادِ کعبہ نیست
مشہور گشت زاں کہ با آتش نکو نشست

پنڈت جی سے دوسری ملاقات ۴۶ء میں ہوئی، جامعہ کی جوبلی کے موقع پر، جب چاروں طرف وحشت اور بربریت کا طوفان برپا تھا اور ہماری شریف قدریں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی تھیں۔ ہر محفل میں فسادات کا ذکر تھا۔ اس نفرت، تعصب اور تنگ نظری کا، جو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس موقع پر معلموں اور ذہنی قائدوں کا کام کتنا اہم اور کتنا ضروری تھا، جامعہ کی جوبلی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ بقول آغا حیدر حسن دہلوی ذاکر صاحب نے لگاوٹ کی باتوں کا سروسامان کیا تھا۔ میں اور سیدنا اسداللہ کاظمی[1] صاحب ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ آغا صاحب کا زیادہ وقت ہمارے ساتھ گزرتا تھا۔ ان کی مزے مزے کی باتیں اور حکائیتیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔

اس موقع پر ذاکر صاحب نے ایک عجیب و غریب تقریر کی جس میں انھوں نے انسانیت، رواداری اور شرافت کی قدروں کے بچانے پر زور دیا اور ان چراغوں کی طرف اشارہ کیا جو جامعہ نے آندھیوں میں روشن کیے تھے۔ اس تقریر کی سحر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ مجمع میں ہر شخص کی آنکھیں نم ناک تھیں۔ جب جلسہ ختم ہو گیا تو کاظمی صاحب مجھے پکڑے ہوئے پنڈت جی کے پاس لے گئے اور ان سے میرا تعارف کرایا۔ "پنڈت جی یہ فاروقی صاحب ہیں۔ آپ کے پرستاروں میں ہیں۔ یہ بھی ہوا کے راستے میں چراغ جلانا چاہتے ہیں اور جامعہ کے لیے حافظ صدیق[2] سے اینٹھ کر ۲۵ ہزار کا چیک بھی لائے ہیں۔"

ان کے ریشمی ہاتھوں کا لمس مجھے آج تک یاد ہے۔ کوئی ڈیڑھ منٹ تک وہ بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ پکڑے رہے۔ میں نے انھیں دیکھا اور انھوں نے مجھے۔ دونوں کی آنکھیں فارغ از گریہ تھیں لیکن نہ انھوں نے کچھ کہا نہ میں نے —

امروز کہ چشمِ من و عشرفی بہم افتاد
باہم نگریستیم و گریستیم و گزشتیم

تیسری ملاقات اس وقت ہوئی جب پنڈت جی وزیر اعظم ہو چکے تھے، ۱۹۵۲ء میں۔ اس وقت میں دہلی کالج میں شعبۂ اردو کا صدر تھا۔ یہ ادارہ قدیم دلی کالج کی اولاد معنوی ہے۔ اس کے در و دیوار مجھ سے سرگوشیاں کرتے تھے کہ یہاں پھر طلاب کا وہی کام ہونا چاہیے جو پہلے ماسٹر رام چندر نے اور بعد میں مولانا حالی نے کیا تھا۔ میں اردو زبان و ادب کے دائرے میں یہی کر سکتا تھا کہ ہند آریائی اور دراوڑی زبانوں کے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دوں اور ایک سمپوزیم کی طرح ڈالوں جس میں رام دھاری سنگھ دنکر، آل احمد سرور، من متھ ناتھ گپت، پربھاکر ماچوے، چندر کانت بھٹ، لکشمی راگھون اور وات سائن جیسے ادیب شریک ہوں اور مختلف زبانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے ہندوستانی ادبیات میں وطن دوستی کے تصور پر بحث کریں۔

اس سمپوزیم کا ذکر ایک بزرگ کے سامنے آیا جو آج بھی اپنا نام ظاہر کرنے کے لیے تیار نہیں۔ انھوں نے فرمایا "یہ کام تو اس لائق ہے کہ پنڈت جی کو دعوت دی جائے۔ تمھاری ملاقات ہے؟"

میں نے عرض کیا "صاحب آپ بھولتے ہیں۔ چیلہ کے ایک ادارے میں اردو کا معلم ہوں۔ ملاقات ہے لیکن بہت سرسری دو دفعہ ملا ہوں۔ اب تو بھول بھی گئے ہوں گے۔"

فرمایا "نہیں جی کیا فضول پھر ایسی باتیں کرتے ہو۔

---

[1] جیمت آف یونسکو مشن بغداد

[2] حافظ محمد صدیق مرحوم سوداگر رئیس کان پور

[3] بچھرایوں ضلع مراد آباد کا ایک قصبہ۔ میرا مولد

ٹیلی فون کرو - وقت مقرر کرو ۔ (پھر میرے پس و پیش کو دیکھ کر فرمایا) اچھا میں خود ٹیلی فون کرتا ہوں - تم خط بھیجو اور ابھی میرے سامنے لکھو ۔"

میں نے پنڈت جی کو لکھا کہ -- " ہندوستانی کلچر کی عمارت جس مضبوط بنیاد پر قائم ہے وہ فکر و خیال کی ہم آہنگی سے روشن ہے ۔ اسی نے اس کلچر میں باوجود رنگا رنگی کے ایک خاص قسم کی وحدت، وسعت، گہرائی اور گیرائی پیدا کر دی ہے - یہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں - ان مختلف زبانوں کا ہونا ہماری ہمہ رنگ تہذیب کے حق میں برا نہیں ہے - الفاظ کا اختلاف اتنا اہم نہیں جتنے وہ خیالات اور ان کی یکسانی اہم ہے جو ان الفاظ کے پیچھے نظر آتی ہے ۔ ہم یہ سمپوزیم اسی لیے منعقد کر رہے ہیں کہ مختلف ادیبوں سے روشناس ہوں، ان سے کچھ لیں اور ان کو کچھ دیں - اسی طرح ہندوستانی ادب کے کنگرے بلند ہو سکتے ہیں ۔"

فوراً وقت مقرر ہو گیا اور خط کا جواب بھی معاً آ گیا ۔

سردیوں کا زمانہ تھا اور صبح کا وقت، پنڈت جی ٹھیک آٹھ بجے ڈرائنگ روم میں تشریف لے آئے ۔ گُل ادمی شیروانی، اس میں سرخ گلاب کی کلی لگی ہوئی - چہرہ گلاب سے زیادہ شگفتہ، جسم میں وہ چستی جس پر نوجوانوں کو رشک آئے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرے آنے سے غیر معمولی طور پر خوش ہوں، جیسے اس مجمع میں صرف مجھ ہی سے تعلقات ہوں ۔ کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی ہی شفقت سے کہنے لگے ۔ "فاروقی صاحب آپ نے بہت اچھے کام کی ابتدا کی ہے ۔ میرا جی بڑا خوش ہوا ۔ یہ کام تو ایسا ہے کہ ایک اکیڈمی[1] کی طرف سے باقاعدہ اور مستقل طور پر کیا جائے ۔ میں یہ کام بھی ضرور کروں گا - آپ کو معلوم ہے مجھے اس کام سے کتنی دلچسپی ہے - لیکن میں ابھی چین سے آیا ہوں اور اب پاکستان جانا ہے - معلوم نہیں کون سی تاریخ مقرر ہو اس لیے شاید سمپوزیم میں نہ آ سکوں، لاچاری ہے - لیکن اگر میں دہلی میں ہوا اور کوئی مانع قوی نہ ہوا تو ضرور حاضر ہوں گا ۔"

اس انکار میں اقرار کا سارا لطف تھا ۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرا قد اونچا ہو گیا ہو، جیسے مجھے دولت مل گئی ہو ۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے بلایا اور سمپوزیم کی پوری روداد سن کر میری ہمتوں کو دوبالا کیا --- اس سے اندازہ کیجیے کہ ان کی میزانِ قدر میں ان باتوں کی کتنی اہمیت تھی اور جہاں کہیں ان کو کوئی تعمیری جذبہ نظر آتا تھا اس کی وہ کتنی قدر کرتے تھے ۔ اس کی اگر کوئی وجہ تھی تو صرف یہ کہ خود ان کی ذات میں ان اعلیٰ قدروں کے چراغ روشن تھے ۔

پنڈت جی سے چوتھی ملاقات لندن میں ہوئی - یہ واقعہ ۵ - جولائی ۱۹۵۷ء کا ہے - میں راک فلر ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے مغربی یورپ کا سفر کر رہا تھا اور اس زمانہ میں لندن میں مقیم تھا - پنڈت جی نے ہندوستانی طلبا کو مخاطب کیا اور بڑی پاکیزہ تقریر کی ۔ اس کا ایک جملہ اب تک میرے دل پر نقش ہے :

"آپ لوگ یہاں کی مادی آسائشوں میں رہ کر ہندوستان کے متعلق ایک خاص قسم کی تنقید کرنے لگتے ہیں - تنقید بری چیز نہیں میں اس کو پسند کرتا ہوں - بغیر اس کے ہم اپنی اصلاح نہیں کر سکتے - لیکن اگر مسائل کو سامنے رکھا جائے جن سے ہم ان دس برسوں میں دوچار رہے ہیں تو میں کہوں گا کہ ہماری رفتار غیر اطمینان بخش نہیں رہی بقول شاعر ؎

اس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں
گر پڑے، گر کر اٹھے، اٹھ کر چلے "

اس کے بعد ایک طالب علم سے فرداً فرداً ملے اور اس کے کام کے متعلق غیر معمولی دلچسپی کا اظہار فرمایا - مجھ سے کہنے لگے کہ آپ کو یہاں کے کتب خانے بھی پسند آئے ؟"

میں نے عرض کیا - " انڈیا آفس کا کتب خانہ تو اتنا اچھا ہے کہ بس نہیں چلتا کہ اس میں پہیے لگ جائیں اور میں اسے ہندوستان لے جاؤں ۔"

فرمایا - خیر اپنی ضرورت کے بقدر عکس ضرور لے لیجیے گا

[1] اس وقت ساہتیہ اکادمی وجود میں نہیں آئی تھی ۔

(پھر نصیحت کے طور پر فرمایا) انگریز قوم کی بڑائی اس کی علم دوستی میں ہے۔ انھوں نے صرف حال ہی کو ایک حقیقت نہیں سمجھا بلکہ ماضی کا احترام کیا ہے اور مستقبل پر نظر رکھی ہے۔ ہماری تقدیر کا انحصار بھی اسی حسن تناسب اور اسی علم و عرفان پر ہے۔"

میں ۱۹۵۰ء میں ہندوستان واپس آگیا اور ۱۹۵۹ء میں پنڈت جی کی کوشش سے دہلی یونیورسٹی میں اردو کا علیحدہ شعبہ قائم ہوگیا۔

میں نے یورپ کے کتب خانوں سے کچھ نایاب مخطوطات کے عکس بھی حاصل کیے جو دراصل اردو کی ادبی تاریخ کے گم شدہ اوراق ہیں۔ ادب کے حیات افروز عناصر سے واقفیت بہم پہنچانے اور اپنی کھوئی ہوئی دولت کو پھر پانے کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ دہلی یونیورسٹی کا شعبۂ اردو ان اہم مخطوطات کو حواشی اور تعلیقات کے ساتھ شائع کرے۔ تاکہ ان مآخذ سے تاریخ اور تہذیب کے سمجھنے میں مدد مل سکے۔ اسی لیے شاید ایک مستشرق نے نصیحت کی تھی Know Thy Text' اس سلسلے کی پہلی دو کتابیں (فضلی کی کربل کتھا اور نواب اعظم الدولہ سرور کا عمدہ منتخبہ) پنڈت جی کے نام معنون کی گئیں۔

میرے انتساب کی عبارت یہ تھی:

"ہندوستان کے اس ادبی جواہر پارہ کو جو مغرب کے کتب خانوں میں تقریباً ڈیڑھ سو برس رہ کر پھر اپنے وطن کی محفلوں کو روشن کرنے آیا ہے، احترام اور خلوص کے ساتھ شری جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے جن کی ذات گرامی ہندوستان کی بہترین تہذیبی اقدار کی محرم و محافظ رہی ہے۔"

پنڈت جی نے ازراہ علم پروری اور دل نوازی نہ صرف اس انتساب کو شرف قبول بخشا بلکہ ان دو کتابوں کو لینے کے لیے بنفس نفیس دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بھی تشریف لائے اور انھوں نے تین گھنٹے ہمارے اساتذہ اور طلباء کے ساتھ صرف کرکے ہماری ہمتوں کو بڑھایا اور جو چھوٹا سا تہذیبی اور علمی کام ہم اپنے محدود دائرے میں کر رہے ہیں اس پر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"میں اردو زیادہ جانوں یا نہ جانوں لیکن اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں کہ اردو کی جگہ کیا ہے ہند میں۔ کیا ہونی چاہیے اور وہ بھی خاص کر شہر دہلی میں۔ اس لیے مجھے خوشی ہوئی یہ معلوم کرکے کہ یہ شعبہ اردو کا دہلی یونی ورسٹی نے شروع کیا۔ کیوں کہ اگر دہلی یونی ورسٹی یہ کام نہ کرتی تو وہ ایک عجیب تکلیف دہ بات ہوتی۔ یہ کہ دلی اپنے ایک عزیز بچے کو پہچانی نہیں کیونکہ اردو دلی میں پیدا ہوئی جیسا کہ پروفیسر فاروقی نے ابھی کہا۔ یوں تو اس کا پھیلاؤ بنا رہا اتر پردیش اور بہار کے کچھ حصوں میں۔ دلی اور لکھنؤ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ یوں بھی یہ ایک ادبی چیز ہے اور جو چیز اپنی ہے اس کی طرف توجہ نہ کرنا ایک غلط بات ہے۔ یہ ہماری دولت ہے لیکن اس کے علاوہ خود اردو بھی ایک کافی دولت مند چیز ہے...... بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ اردو کی طرف خاص توجہ ہو ..... تاکہ اس کی جڑیں مضبوط ہوں تاکہ وقت آنے پر جب بھی، ہوا موافق ہو، وہ پوری قوت سے پھیل سکے۔ اب بھی کچھ کم نہیں پھیل رہی ہے لیکن یہ پھیلاؤ اور بھی چاہیے......

"تو غرض کہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ یہاں دہلی یونی ورسٹی نے یہ شعبۂ اردو چلایا ہے اور ڈیڑھ برس میں اس نے اچھا کام کیا ہے اور پانچ برس کا اور منصوبہ بنایا ہے۔ بنیادی کام ہے یہ۔ اور یقینی ہے کہ اس سے فائدہ ہوگا۔ اردو جاننے والوں کو ہی نہیں سارے ملک کو۔ اس کام کو زور سے جاری رکھیں اور اس کے ساتھ اپنے سامنے تصویر رکھیں۔ اردو کو عام لوگوں کی زبان بنانے کی۔ اور آپس کا جو رشتہ ہے آگے بڑھائیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ چل پڑے۔"

نومبر ۱۹۶۲ء

1 آج کل دہلی (جواہر لال نہرو نمبر)

بہرحال پنڈت جی کے ساتھ کامن ویلتھ سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے مجھے کبھی کسی قسم کی کوئی دقت پیش نہ آئی بلکہ یہ زمانہ میرے دورِ ملازمت کا بڑا اطمینان بخش اور خوش گوار زمانہ ہے۔ پاکستان کے بارے میں پنڈت جی کے خیالات، برصغیر ہند کے منقسم شدہ حصوں کے درمیان خوش گوار تعلقات، دونوں طرف کے لوگوں کو یہ محسوس کرانا کہ دونوں کی خوشی اور خوش حالی کا انحصار ایک دوسرے پر ہے اور ان کی قسمتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، ان سب کے بارے میں ان کی جو رائے تھی وہ میری، ایک ہندوستانی مسلمان کی رائے سے پوری طرح ہم آہنگ تھی جو پاکستان سے خون، دوستی اور مذہب کا تعلق رکھتا ہے۔

پنڈت جی چالیس کروڑ ہندوستانیوں کے مسائل کو حل کرنے میں بے حد مصروف رہتے تھے۔ تقسیم ملک نے بڑے ہولناک نتائج پیدا کئے تھے اور لاکھوں آدمیوں نے ترک وطن کیا تھا۔ بڑے پیمانے پر دوسری مصیبتیں بھی موجود تھیں۔ صدیوں کی غلامی نے زبردست غریبی کو جنم دیا تھا۔ پنڈت جی ان مسائل میں ڈوبے رہتے تھے مگر اس کے باوجود وہ آنا فانا وقت نکال لیتے تھے کہ ایک بھگوڑے لڑکے کو اپنے والدین سے ملانے یا کسی بیوہ کو جو سرحد کے اس پار رہ گئی تھی اپنے نزدیکی رشتہ داروں کے پاس پہونچ جانے میں مدد دے سکیں۔ مختصر یہ کہ وہ ہر آنکھ سے آنسو پونچھنا چاہتے تھے اور ہر مصیبت زدہ شخص کی عزتِ نفس کو بلند کرنا چاہتے تھے خواہ اس کا تعلق ہندوستان سے ہو یا پاکستان سے۔ اور اس معاملے میں ان سخت قاعدے اور قانونوں کی پروا نہ کرتے تھے جن کا دونوں ملکوں نے اپنی علیحدگی کے بعد ایک دوسرے سے بے اعتمادی اور منافرت کی وجہ سے ڈھیر لگا رکھا ہے۔

ایک مدبر اور انسان کی حیثیت سے پنڈت جی میں جو خوبیاں تھیں، ان سے قطع نظر پنڈت جی نے ایک نہایت ہی اچھے منتظم کی حیثیت سے بھی مجھے متاثر کیا۔ بڑی ہی پیچیدہ اور گنجلک فائلیں اور بڑے لمبے اور حوالوں سے بھرپور نوٹ شام کو چاہے جتنی دیر سے ان کے پاس بھیج دیجئے اور اس بات کا پورا یقین رکھئے کہ دوسرے دن صبح کو بڑا واضح اور اختصار کے ساتھ دلائل سے بھرپور حکم آپ کو مل جائے گا۔

خطوط اور نوٹ لکھانے کی ان میں بے پناہ صلاحیت تھی۔ مشکل سے مشکل مسئلے پر بھی جب وہ خط یا نوٹ لکھاتے تو اس میں زبان یا واقعے کی کوئی غلطی نہ ہوتی یا جس بات پر زور دینا ہوتا اس پر بالکل صحیح زور ہوتا۔ شاید ہی وہ کبھی کسی محاورے کو بدلتے یا کسی لفظ کو درست کرتے۔ وہ جتنا کام کرتے تھے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جسمانی یا ذہنی طور پر تھکتے ہی نہ تھے، چاہے دن میں کتنی ہی دیر تک کام کیا ہو۔ اگر کسی اہم یا دلچسپ بات پر گفتگو کرنی ہے تو وہ اس کے لئے وقت نکال لیتے اور پھر اگر انھیں اس موضوع سے دلچسپی پیدا ہو جاتی تو تھکن ان کے چہرے سے بالکل غائب ہو جاتی۔

ہندوستان کے بڑے بڑے مسئلوں اور عالمی معاملوں کو حل کرنے میں ایک مدبر کی حیثیت سے پنڈت جی میں کیا خوبیاں ہیں اس کا میں سرسری ذکر کروں گا۔ میں آپ کو یہ یاد دلانا چاہوں گا کہ انھوں نے ۴۰ کروڑ افراد پر مشتمل ایک قوم کو، جو صدیوں پرانی ذات پات، مذہب، تاریخ اور جغرافیہ کے پیدا کردہ اختلافات کا شکار تھی، جذباتی طور پر متحد کرنے کے لئے کیا کچھ کیا۔ تقسیم ملک سے نہ صرف لاکھوں افراد ظلم وستم کا شکار ہوئے اور انھوں نے بے انتہا مصائب برداشت کئے بلکہ اس کی وجہ سے ملک کا معاشی توازن درہم برہم ہو گیا اور وہ اپنی قدرتی سرحدوں سے محروم ہو گیا اور دفاع اور امور خارجہ کے مسائل پیدا ہو گئے۔ بلکہ سب سے بڑھ کر تو یہ ہوا کہ ایک بہت ہی بڑا نفسیاتی مسئلہ پیدا ہو گیا۔

انھوں نے ہندوستان کے لئے ایک ایسی خارجہ پالیسی وضع کی جس کی وجہ سے یہ ملک بین اقوامی مجلسوں میں اپنا سر اونچا اٹھا سکتا ہے اور دنیا کی نہایت ہی طاقت ور قوموں کے ساتھ

برابری کی سطح پہ بات کر سکتا ہے۔
چین کے حملے سے پہلے لگ بھگ دس برسوں تک وہ نہایت پُرامن طریقے سے اور ہندوستان کی آزاد حیثیت سے کسی طرح کا کوئی سمجھوتہ کئے بغیر ملک کو تمام قسم کے بیرونی دباؤ اور دھمکیوں سے الگ رکھنے میں کامیاب رہے۔ ان کی بقائے باہم کی پالیسی مسلسل رکاوٹوں اور قصداً پیدا کی گئی غلط فہمیوں کے باوجود صحیح و درست ثابت ہوئی جس کا ثبوت وہ کوششیں ہیں جو دنیا کی دو بڑی قومیں آپس میں مفاہمت پیدا کرنے کے لئے کر رہی ہیں۔ سرد جنگ کے نازک ترین لمحوں میں ان کی مداخلت نے دنیا کے دور دراز حصوں میں لوگوں کو امن کی امید دلائی ہے۔

ان باتوں پر میں نے تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ میں نے پنڈت جی کے بارے میں صرف وہی باتیں کہی ہیں جنہیں میں نے ذاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔

تلوک چند محروم

ماتمِ نہرو

ہیہات گیا قافلہ سالارِ وطن
وہ راہ برِ منزلِ دشوارِ وطن

وہ ہاتھ کہاں ہیں جو اسے لہرائیں
حیرت میں ہے پرچم نگونسارِ وطن

شہر و صحرا میں سوگ نہرو کا ہے
دشت و دیار میں سوگ نہرو کا ہے

ساری دنیا کا بسکہ تھا وہ غم خوار
ساری دنیا میں سوگ نہرو کا ہے

نہرو کے نام سے تھی توقیرِ وطن
محنت سے بنا رہا تھا تقدیرِ وطن

افسوس، صد افسوس، مصور نہ رہا
تکمیل کی طالب رہی تصویرِ وطن

خونابہ فشاں ہے چشمِ نمناکِ وطن
مصروفِ فغاں ہے دلِ صد چاکِ وطن

نہرو کی خاکِ پاک جب اس میں ملی
سرمایۂ تقدیس ہوئی خاکِ وطن

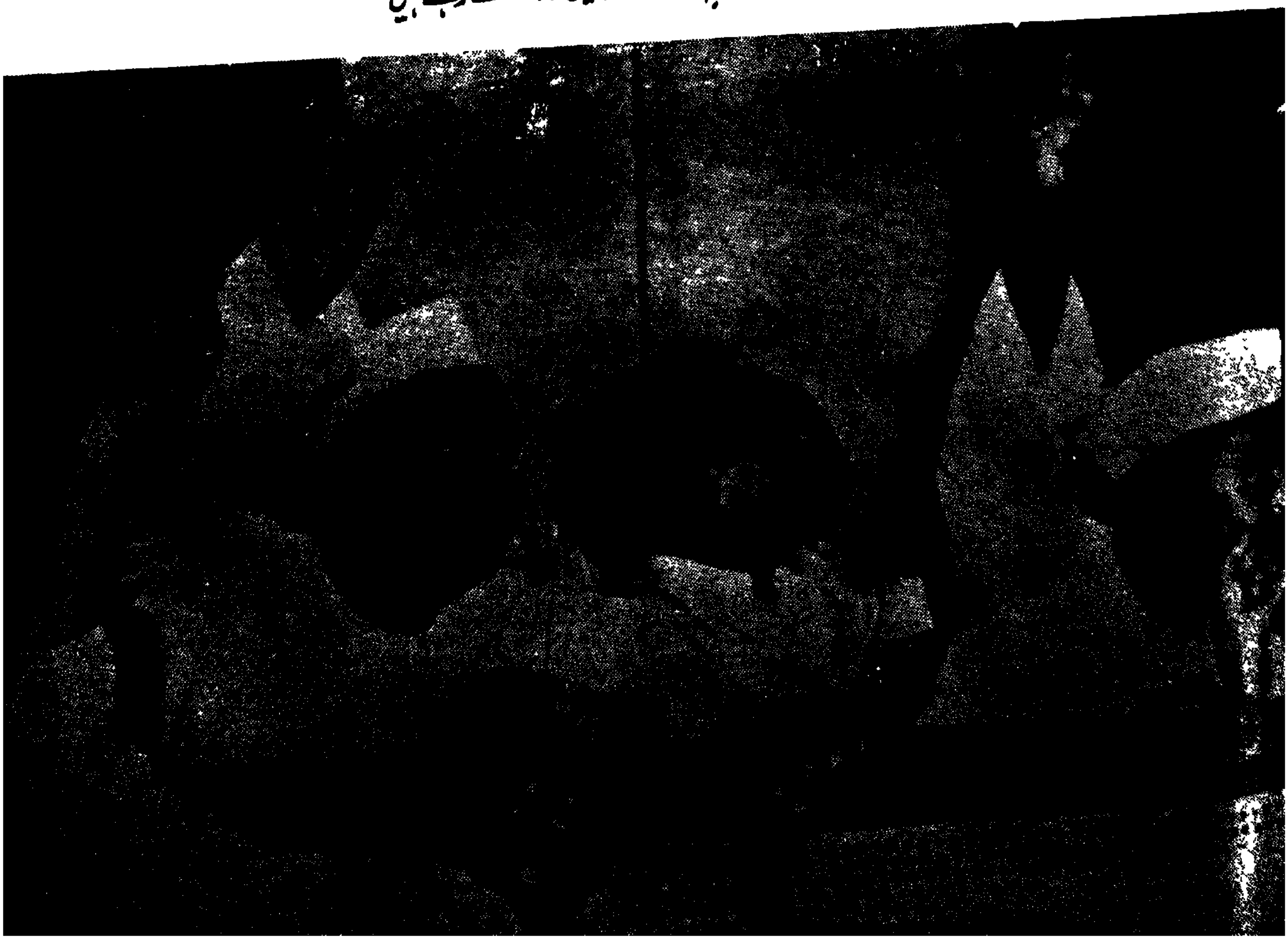
جب تک کرۂ ارض پہ انساں ہوں گے
نہرو کی یاد کے بھی ساماں ہوں گے

مشرق مغرب کے اہلِ دل آ آ کر
نہرو کی سمادھ پر گل افشاں ہوں گے



اپنے مرشد کے ساتھ

۱۵ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیمِ ملک کے حق میں ووٹ دے رہے ہیں





۱۹۴۸ء میں کامن ویلتھ کانفرنس میں
(لنڈن)



قائدِاعظم محمد علی جناح کے ساتھ
(شملہ - مئی ۱۹۴۶ء)

غلام رسول مہر

پنڈت جواہر لال نہرو

دنیا میں روزانہ بے شمار انسان پیدا ہوتے ہیں اور بے شمار مرتے ہیں۔ انبیائے کرام ہوں یا اوتار، اولیا ہوں یا مہاتما، شاہنشاہ ہوں یا مشاہیر کوئی بھی موت کی دسترس سے باہر نہیں رہ سکا، کسی کو بھی اس سے رستگاری نہیں مل سکی۔ پنڈت جواہر لال نہرو بھی انسان تھے۔ ان کے لئے بھی یہاں سے کوچ کی مقرر ساعت آ پہنچی تو سب کچھ چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔

کیا آپ نے سوچا کہ پنڈت جی کا ماتم کیوں اس پیمانے پر کیا گیا جو اکثر شاہنشاہوں اور فرمانرواؤں کو بھی شاید ہی نصیب ہوا ہو؟ کیوں دنیا بھر میں ان کے لیے صفِ ماتم بچھی؟ کیا اس لیے کہ وہ ایک جماعت کے لیڈر اور ایک ملک کے وزیر اعظم تھے؟ لیڈر اور وزیر اعظم تو ہمارے سامنے ایک دو نہیں سیکڑوں گزر گئے، مگر اکثر کا ماتم اہلِ جماعت اور اہلِ ملک نے بھی خاص اہتمام سے نہ کیا۔ انسان کی قدر و منزلت اس کے جسم یا خاندان، عہدے اور منصب کی بنا پر نہیں، اس کے عمل و کردار، اس کے اخلاق و ایثار، اس کے جذبۂ خدمتِ خلق اور اس کے بلند مقاصد و عزائم کی بنا پر ہوتی ہے۔ پنڈت جواہر لال کی عظمت و برتری انھیں جوہروں کی درخشانی پر مبنی تھی، ان کی زندگی کا اصل سرمایہ یہی تھا، جس نے ان میں ہمہ گیر محبوبیت کی کشش پیدا کی۔ یقین رکھیئے کہ انسانیت جسم یا دولت یا املاک یا مناصب کا نام نہیں، صرف حسنِ عمل، خوبیٔ کردار اور اپنی ذات کو دوسروں کی بہبود کے لیے مٹا دینے کا نام ہے۔ اگر یہ ہے تو سب کچھ ہے، یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

نادر خصوصیتیں

پنڈت جی میں قدرت نے ایسی خصوصیتیں جمع کر دی تھیں، جو کسی انسان میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ وہ بڑے دولت مند باپ کے اکلوتے بیٹے تھے، گویا انگریزی محاورے کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ "سونے کا چمچا" منہ میں لیے پیدا ہوئے تھے۔ پھر باپ محض دولت مند ہی نہ تھا۔ اپنے عہد کا ممتاز قانون دان، ملک کا مشہور لیڈر اور معاشرے کا نہایت سربرآوردہ رکن بھی تھا۔ بعد ازاں ان چند لیڈروں میں شمار ہوا، جن کی بدولت تحریکِ آزادیٔ وطن کو ایسی قوت، طاقت اور عوامیت نصیب ہوئی جیسی پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

پھر پنڈت جی کو اعلیٰ فطری صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے وہ تمام سامان بوجہ احسن مہیا ہو گئے، جو بہت کم افراد کے لیے مہیا ہوتے ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پنڈت جی نے اپنے عہد اور ماحول کی بہترین تعلیم پائی، جن سے ان کی خداداد صلاحیتوں کو خاص جلا ملی۔

فطری جوہروں کا ظہور

جب پنڈت جی ولایت میں تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آئے تو اہلِ ملک کے عوامی تصوراتِ عزت و برتری میں عوامیت کی کوئی بھی جھلک نمایاں نہ تھی اور پنڈت جی کی پیدائش سے

تعلیم، تربیت کی تکمیل تک کوئی بھی پہلو ایسا معلوم نہیں ہوتا تھا، جسے عوامیت یا خدمتِ خلق سے کوئی مناسبت ہوتی۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں انسانی فطرت کے حقیقی جوہر گرد و پیش کی تمام مصنوعی دیواروں کو توڑ کر آشکارہ ہوتے ہیں اور انسانوں کے بنائے ہوئے بندھن چند لمحوں میں پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔ اسباب و احوال نے انھیں جس منزل کے لیے تیار کیا تھا، اس سے یکایک رُخ پھیرا اور بے تکلف اس راستے پر گامزن ہو لیے، جو انھیں عظمت و رفعت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچانے والا تھا۔ انھوں نے راحت و آسایش کے بہترین سامانوں کو ٹھکرایا، جو پیدایش کے وقت سے انھیں گھیرے ہوئے تھے، اس کے برعکس زیادہ سے زیادہ تکلیفوں، مشقتوں، پریشانیوں اور اذیتوں کا راستہ اختیار کر لیا۔ فرشِ گل سے اُٹھے اور خارزار میں ننگے پاؤں پھرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس لیے نہیں کہ بڑے آدمی بن جائیں، اس لیے نہیں کہ انھیں عظمت کا بلند درجہ مل جائے۔ ایسی آرزوؤں سے ان کی فطرت کا دامن کبھی آلودہ نہ ہوا۔ اس لیے اور صرف اس لیے کہ ان کے دل اور روح کی آسودگی کا تقاضا یہی تھا۔ ان کے سازِ وجود کا اصلی ترانہ اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ غور فرمائیں۔ عنفوانِ شباب کا دَور، دولت کی ریل پیل، عزّت و آسایش کی فراوانی، اہلِ خاندان کی محبت پروری و دل نوازی بہار آفرینی کون سی نعمت ہے جو انھیں میسّر نہ تھی، لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز جواہر لال کی عناں گیر نہ ہو سکی۔

کایا پلٹ

غالباً یہی دور ہے، جب انھیں ہم وطنوں کی خستگی و بدحالی کا صحیح اندازہ ہوا اور ان کے قلب صافی میں عوام سے گہری محبت کا بیج بویا گیا، یہی دور ہے جس میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک ملک آزاد نہ ہو، معاملات کی باگ ڈور اپنوں کے ہاتھ میں نہ آئے عوام کی بہبود کے لیے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ یوں آناً فاناً پنڈت جی کی کایا پلٹی اور وہ اس دائرے میں پہنچ گئے، جہاں انھیں وقت کے عام تصوّرات کے مطابق کامیاب بیرسٹر اور کامیاب فرد نہیں بننا تھا بلکہ آزاد ہندوستان کا سرتاج بننا اور دَورِ حاضر کے چند اکابر میں شمار ہونا مقدّر تھا۔

یہ بھی واضح رہے کہ آج سے پینتالیس پچاس سال پیشتر وہ راستہ اختیار کرنا سہل نہ تھا جو پنڈت جی نے بہ طیب خاطر اختیار کر لیا تھا۔ اس وقت اجنبی حکومت کی بنیادیں اتنی مضبوط و مستحکم تھیں کہ بڑی سے بڑی قوت کا حوصلہ بھی اس کے ساتھ ٹکرانے کے خیال سے افسردہ ہو جاتا تھا اور کسی کو معلوم نہ تھا کہ آزادی کے لیے جہاد کتنی مدّت میں پایۂ تکمیل پر پہنچے گا، لیکن منزل کی دوری، راستے کی دشواری اور سفر کی صعوبتیں پنڈت جی کے حوصلے پر قطعاً اثر انداز نہ ہو سکیں۔ وہ جانتے تھے کہ استبداد کے پہاڑ کو جانفشانی سے کاٹے بغیر آزادی کی جوئے شیر نہیں بہائی جا سکتی، لہٰذا نتائج سے بے پروا ہو کر پہاڑ کاٹنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ خدا کی رحمت تھی کہ ان کی زندگی میں پہاڑ کٹ گیا اور کم و بیش سترہ سال کی مہلت مل گئی، جس میں وہ ملکی انتظامات کو اپنے تصوّرات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے تگ و دو کر سکے۔ ایسی مہلت بھی زندگی میں بہت کم انسانوں کو میسّر آتی ہے۔

ایک وجود نہیں ایک پروگرام

پنڈت جی کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی خاص توجہ کا محتاج ہے۔ انھوں نے جو راستہ والہانہ طریق پر اختیار کر لیا تھا، ان کے خاندان کا ایک ایک فرد بالکل انھیں کی طرح اسی راستے پر چلتا رہا۔ دار و گیر کی سختیاں اور قید و بند کی پریشانیاں جس طرح پنڈت جی نے خوشی خوشی قبول کر لیں، اسی طرح ان کی اہلیہ، ان کی بیٹی، ان کے والد، ان کی والدہ اور ان کی بہنوں نے بھی یہ سب کچھ قبول کیا۔ اگر پنڈت جی جیسی شخصیتیں بہ آسانی نہیں مل سکتیں تو ان کے خاندان جیسا ایثار پیشہ خاندان بھی کہاں نظر آتا ہے۔ گویا اس ایک وجود نے سب کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔

پنڈت جی ایک وجود نہیں تھے، ایک پروگرام اور ایک لائحہ عمل تھے۔ حق کے لئے سعی و جہد میں سب سے آگے، باطل کی مخالفت میں سب سے بڑھ کر سرگرم، دوستوں، رفیقوں اور

علی مہدی رضوی

موت سے کہہ دو جواہر لال مر سکتا نہیں

آج پھر دلّی ترا بدلا ہوا انداز ہے
درہم و برہم نشاطِ محفلِ صد ناز ہے
زندگی ویران ہے ٹوٹا ہوا ہر ساز ہے
کس کے غم میں ذرہ ذرہ گوش بر آواز ہے

دوپہر میں موت آئی کس کے استقبال کو
کھو دیا خاکِ وطن تو نے جواہر لال کو

کہہ رہے ہیں چاہنے والوں کے آنسو زندہ باد
غنچہ و گل میں بسی ہے تیری خوشبو زندہ باد
تو نے سلجھائے ہیں دھرتی ماں کے گیسو زندہ باد
مرنے والے اے جواہر لال نہرو زندہ باد

غم کی ڈھارس بے سہاروں کے سہارے زندہ باد
زندہ باد اے دھرتی ماتا کے دُلارے زندہ باد

کتنے ہی خطرے ہوں لیکن مرد ڈر سکتا نہیں
منتشر ہونے پہ شیرازہ بکھر سکتا نہیں
ناخدا کیا ڈوب جانے پر اُبھر سکتا نہیں
موت سے کہہ دو جواہر لال مر سکتا نہیں

روحِ بیداری کی خاطر سو گیا آرام سے
قوم زندہ ہو گئی جس کے امر پیغام سے

پھیکا پھیکا سا ہے رنگِ داستاں تیرے بغیر
اب بھٹکتا پھر رہا ہے کارواں تیرے بغیر
رو رہا ہے مے کدہ پیرِ مغاں تیرے بغیر
بجھ گیا جیسے دلِ ہندوستاں تیرے بغیر

صلح کا دل امنِ عالم کی جوانی لے گیا
کچھ نہ لے جانے پہ روحِ زندگانی لے گیا

اپنے ماتھے کا پسینہ دے دیا مزدور کو
اپنی آنکھوں کی بصارت دیدۂ کم نور کو
اپنا استقلال بخشا ہند کے دستور کو
کس خوشی سے دے دیا دل سینۂ جمہور کو

شمعِ حق گل ہو گئی اس انجمن کے واسطے
خاک میں تو مل گیا خاکِ وطن کے واسطے

آج کل دہلی (جواہر لال نہرو نمبر)
نومبر ۱۹۶۴ء

سو رہا ہے بے خبر آخر جگائیں کس طرح
آنسوؤں سے آتشِ غم کو بجھائیں کس طرح
دیدۂ دل رو رہا ہے مسکرائیں کس طرح
روٹھنے والے بتا تجھ کو منائیں کس طرح

اب تجھے پا ہی نہیں سکتے کسی تدبیر سے
اپنا دل بہلا رہے ہیں ہم تیری تصویر سے

سوگوار و سوگ ہی سے کام چل سکتا نہیں
آنسوؤں سے قیمتی موتی نکل سکتا نہیں
اوس کے چھینٹوں سے ہرگز باغ پھل سکتا نہیں
صرف آہوں سے وطن کا دیپ جل سکتا نہیں

دل میں ہو جوشِ عمل بھی آنکھ کے پانی کے ساتھ
ہم ابھاریں ہیش کو بھی غم کی طغیانی کے ساتھ

غم کا بادل اس طرح برسے کہ کھیتی لہلہائے
متحد کر دے ہمیں نفرت کے شعلوں کو بجھائے
یہ نظر کے ماتم ہوئے اہلِ وطن کو ہوش آئے
جس سے مزدوروں کی محنت کا پسینہ جگمگائے

موت کے مے خوار سے بھی زندگی کا جام لے
اے ترقی بڑھ کے تو نہرو کا دامن تھام لے

ساحلِ امن و اماں سے جنگ کے طوفاں ڈریں
دم میں دم باقی ہے جب تک ہم وفا کا دم بھریں
جو ادھورا رہ گیا ہے کام اسے پورا کریں
دیش کی خاطر جئیں ہم دیش کی خاطر مریں

فرض کے احساس سے جائے نظر انجام پہ
اپنی ہستی وقف کر دیں ہم وطن کے نام پہ

اب وطن کو اور بھی خوش حال بننا چاہیئے
سورماؤں کو وفا کی ڈھال بننا چاہیئے
اہلِ پستی کو بلند اقبال بننا چاہیئے
ذرے ذرے کو جواہر لال بننا چاہیئے

گلشنِ عالم پہ چھا جائیں بہاروں کی طرح
بات تو جب ہے کہ ہم چمکیں ستاروں کی طرح

اپنے دامن کو بچائیں شعلۂ پیکار سے
گوشِ عالم کو رکھیں ناآشنا جھنکار سے
جس سے نہرو نے کیا تھا وار اسی ہتھیار سے
جنگ کا سر کاٹ لیں ہم امن کی تلوار سے

ساز الفت سے بدل دیں تیغ کی جھنکار کو
[illegible] بیدار کر

نومبر ۱۹۶۷ء

شری



۱۹۳۹ء میں الہ آباد میں کانگریسی کارکنوں اور والنٹیروں کا ایک گروپ
جس میں مولانا ابوالکلام آزاد، شری پرشوتم داس ٹنڈن، پنڈت جواہرلال نہرو اور شری لال بہادر شاستری موجو



ڈ نب



ملکۂ الزبتھ کے ساتھ



مارشل ٹیٹو کے ساتھ



شری جمال عبدالناصر صدر متحدہ عرب جمہوریہ
اور
شری سیوکارنو صدر انڈونیشیا کے ساتھ

بر کے ساتھ



مسٹر خروشچیف کے ساتھ



واشنگٹن میں امریکہ کے سابق صدر مسٹر کینیڈی کے ساتھ



پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے ساتھ

کھیلوں کا مشتاق

جواہر لال



کرکٹ کھیلنے کے لئے
تیار



گریزی کھیل کراکے کھیلتے ہوئے



بلیرڈ کھیلتے ہوئے



جھولا جھولتے ہوئے



گوپی ناتھ امن

جنگِ آزادی کا سپاہی ــــ جواہرلال نہرو

دنیا کی تمام عظیم ہستیوں کی طرح پنڈت جواہرلال نہرو کی زندگی کے بھی بہت پہلو ہیں، لیکن ان میں سے بیشتر اس لئے اُجاگر ہوئے کہ وہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے سپاہی تھے۔ یہ بھی عجیب جنگ تھی۔ ان سپاہیوں کے پاس تلوار نہ خنجر، نہ توپ نہ تفنگ۔ ان کے لیڈر مہاتما گاندھی نے کہا کہ بے جان ہتھیاروں پر نہیں بلکہ اپنے آپ پر اور اپنے اصولوں پر بھروسہ رکھو۔ کچھ لوگوں نے مذاق اڑایا، کچھ نے سنجیدگی سے بحث کرکے اسے ناقابلِ عمل بتایا، کچھ ناراض ہوئے لیکن لاکھوں نے اس پروگرام کو اپنایا۔ ان میں سے ایک پنڈت جواہرلال نہرو تھے جن کی پہلی ملاقات مہاتما گاندھی سے ۱۹۱۶ء میں ہوئی تھی اور جو ۱۹۱۹ء میں ان کے پیروؤں میں داخل ہوئے اور بالآخر گاندھی جی نے انھیں اپنا جانشین قرار دیا۔ جنگِ آزادی کے سپاہی کی حیثیت سے پنڈت جواہرلال نہرو اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

انڈین نیشنل کانگریس ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی تھی لیکن اس نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی قبول کرنے سے پہلے انقلابی پروگرام نہیں اپنایا تھا۔ گاندھی جی کے عملی پروگرام میں سردار پٹیل، راجندر بابو، راج گوپال آچاریہ کرپلانی پنڈت جواہرلال نہرو سے پہلے شریک ہو چکے تھے۔ پنڈت جواہرلال نہرو تو ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی کے کیمپ میں آئے لیکن یہ حضرات ۱۸-۱۹۱۷ء میں ہی گاندھی جی کے رفیق کار بن چکے تھے۔ پنڈت جواہرلال نہرو کی عملی سیاست میں آنے سے پہلے موتی لال نہرو ملک کے سیاسی لیڈروں میں تھے ۱۹۱۷ء میں یو۔پی پراونشل کانفرنس کی صدارت کر چکے تھے۔ رولٹ بل کا ایکٹ بن جانا اور جلیانوالہ باغ میں قتلِ عام ہونا وہ واقعات تھے جنھوں نے پنڈت جواہرلال نہرو کو بہت متاثر کیا۔ وہ گاندھی جی کے ستیاگرہیوں میں شامل ہو گئے اور ۱۹۲۰ء میں وکالت کو خیر باد کہا، تحریکِ ترکِ موالات میں شریک ہوئے اور جلد ہی گاندھی جی کی نظروں میں چڑھ گئے۔ چناں چہ اس تحریک کے ابتدائی دور میں جب پنڈت موتی لال نہرو صوبہ کانگریس یو۔پی کے صدر تھے تب جواہرلال جی سیکرٹری تھے۔ یہی زمانہ تھا جب پہلی سزا یابی کا تھا پنڈت موتی لال نہرو لکھنؤ جیل میں اور پنڈت جواہرلال نہرو نینی جیل میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہرو خاندان جنگِ آزادیٔ وطن میں شریک ہونے میں پیش پیش تھا۔ پنڈت جواہرلال نہرو کے ماں باپ، بیوی اور بہنیں سب اس تحریک میں شریک ہوئے لیکن بالآخر پنڈت جواہرلال نہرو سب پر سبقت لے گئے۔ پنڈت موتی لال نہرو دو بار کانگریس کے صدر رہے اور پنڈت جواہرلال پانچ بار۔ ملک میں پنڈت جواہرلال نہرو کی عزت اور شہرت ان کی قربانیوں سے ہی بڑھی ع

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ترکِ موالات کی تحریک ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئی۔ مہاتما گاندھی کی اس تحریک کو کلکتہ کے خاص اجلاس میں انڈین نیشنل کانگریس نے

لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں منظور کر لیا۔ اس میں سرکاری عہدوں، ملازمتوں، تقریبوں، کالجوں، سکولوں اور عدالتوں کا بائیکاٹ شامل تھا۔ چناں چہ پنڈت موتی لال نہرو نے بھی اپنی وکالت ترک کر دی لیکن پنڈت جواہر لال نہرو ان سے پہلے ہی بیرسٹری چھوڑ چکے تھے۔ جواہر لال جی نے صرف بیرسٹری ہی نہیں چھوڑی بلکہ اپنی زندگی میں زبردست انقلاب پیدا کیا۔ انھوں نے نہ صرف گاندھی جی کی ہدایت کے بموجب بدیشی کپڑا پہننا ترک کیا بلکہ لباس بھی بہت سادہ کر لیا۔ انھوں نے دیہات کی طرف رُخ کیا۔ سیاسیات میں یہ رجحان پہلا تھا گاندھی نے کھیڑا اور چمپارن کی کسان تحریکوں کے ذریعہ پیدا کیا تھا ورنہ اس وقت تک کانگریس کی سیاست صرف شہروں تک محدود تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے الہ آباد کے کسانوں میں بیداری پیدا کی۔ اودھ کا کسان خاص طور پر پچھڑا ہوا تھا۔ اس میں بھی ایک نئی زندگی کی لہر دوڑی۔ اب وہ جواہر لال جو پہلے بہترین انگریزی سوٹ میں ملبوس رہتا تھا۔ کُرتہ دھوتی اور چپل پہنے گاؤں میں گھومتا پھرتا تھا۔ ہاں کُرتے پر ایک واسکٹ بھی ہوتی تھی جو بعد کو جواہر جاکٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج میں آندھیوں اور طوفانوں میں بھارت کا یہ سپوت کبھی پیدل کبھی سائیکل پر، کبھی موٹر پر تو کبھی یکّہ پر گاؤں میں پھرتا تھا۔ نوجوانوں میں اس کے لئے خاص کشش تھی اور اس میں نوجوانوں کے لئے جواہر لال نہرو کو اب ویر جواہر یا بیر جواہر کہا جانے لگا۔

اس تحریک کے دوران ۲۲-۱۹۲۰ء میں اسے دو بار سزا ہوئی۔ ایک بار تین مہینے کی اور ایک بار چھ مہینے کی، لیکن

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ ہر سزا کے بعد

ایک سال بعد جیتو میں سکھوں کا مورچہ لگایا۔ ریاست پٹیالہ اور ریاست نابھہ کے اختلاف نے سیاسی صورت اختیار کر لی۔ برٹش سرکار نے جو مہاراجہ نابھہ کے قوم پرور نظریہ سے کھٹکتی تھی انھیں گرفتار کر کے کوڈائی کنال میں نظر بند کر دیا۔ اسی ریاست میں جیتو ایک مقام ہے جہاں سکھوں نے مورچہ لگایا۔ گرفتاریاں شروع ہوئیں پنڈت جواہر لال نہرو بھی وہاں پہنچے انھیں بھی گرفتار کر لیا گیا اور ایک معمولی قیدی کی طرح حوالات میں بند کر دیا گیا جہاں رات بھر چوہے ان کے جسم پر سے گزرتے رہے اور دوسری صبح انھیں اور شری کے سنتانم کو ایک ہی رسّی سے کمر باندھ کر عدالت میں پیش کیا گیا لیکن یہ مقدمہ زیادہ نہیں چلا۔ پنڈت موتی لال نہرو اور حکومت کے درمیان خط و کتابت ہوئی۔ جس کی وجہ سے مقامی حکومت کو جواہر لال جی کو چھوڑنا پڑا۔

گاندھی جی مارچ ۱۹۲۲ء میں گرفتار ہو چکے تھے۔ اس وقت تک جواہر لال جی صوبہ کانگریس یو۔ پی کے سیکرٹری تھے مگر جب گاندھی جی ۱۹۲۴ء میں رہا ہو کر آئے تو پنڈت جی آل انڈیا کانگریس کے سیکرٹری تھے۔ گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد فرقہ وارانہ تحریکیں بہت زور پکڑ چکی تھیں گاندھی جی نے رہا ہونے کے بعد ان تحریکوں کی سخت مخالفت کی، لیکن پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے والد ماجد پنڈت موتی لال نہرو نے ان تحریکوں کی مخالفت پہلے ہی سے شروع کر رکھی تھی اور پنڈت جواہر لال نہرو ان تحریکوں کو برٹش سامراج کا کھیل سمجھتے تھے۔

۱۹۲۲ء میں گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد کانگریس کے اندر ایک اور انتشار پیدا ہوا۔ یعنی ایک طبقہ کی رائے تھی کہ اب چوں کہ گاندھی جی نے سول نافرمانی کو ختم کر دیا ہے اور محض تعمیری پروگرام میں اتنی کشش نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو پوری جاذبیت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ رکھ سکے اس لئے اب کونسلوں اور اسمبلیوں میں داخل ہونا چاہیئے۔ دوسرا طبقہ اس کے خلاف تھا۔ عجیب دلچسپ بات یہ تھی کہ پنڈت موتی لال نہرو داخلۂ کونسل کے حق میں تھے اور پنڈت جواہر لال نہرو اس کے خلاف، اسی طرح سردار وٹھل بھائی پٹیل جو بعد کو پریزیڈنٹ پٹیل کے نام سے مشہور ہوئے اس داخلہ کے حق میں تھے اور ان کے چھوٹے بھائی سردار ولبھ بھائی پٹیل جو باردولی کے ستیہ گرہ کے بعد سردار پٹیل کہلانے لگے اس کے سخت خلاف تھے۔ مخالفینِ داخلۂ کونسل کو عام طور پر بایاں بازو سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ پنڈت موتی لال نہرو، دیش بندھو چترنجن داس اور مسٹر وٹھل بھائی پٹیل تو داخلۂ کونسل کے حق میں تھے اور پنڈت جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، ڈاکٹر انصاری اور راجندر بابو اس کے مخالف تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے ہم خیال حضرات کا یہ کہنا تھا کہ اگر

ہم انتخابی چکر میں پڑ گئے اور ہماری توجہ کونسل اور اسمبلی کی بحثوں کی طرف ہو گئی تو پھر ہمارے اندر انقلابی آگ کے شعلے بجھ جائیں گے۔

آخر مولانا آزاد نے ۱۹۲۳ء میں دلی کے خاص اجلاس کانگریس میں دونوں میں یہ سمجھوتہ کرا دیا کہ جو کانگریسی الیکشن لڑنا چاہیں وہ کانگریس کی طرف سے نہیں لڑیں گے لیکن انتخاب لڑنے پر ان سے کسی قسم کی باز پرس نہ کی جائے گی۔ اس مسئلہ پر بڑی کش مکش رہی۔ دیش بندھو چترنجن داس نے ۱۹۲۲ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ختم ہوتے ہی کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور ایک کانگریس خلافت سوراج پارٹی بنائی جس کا نام بعد میں صرف سوراج پارٹی رہ گیا۔ جواہرلال جی ذاتی طور پر داخلۂ کونسل کے خلاف تھے لیکن وہ اپنے والد پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے دوست شری چترنجن داس کا احترام بھی بہت کرتے تھے اس لئے انھوں نے یہ زور نہیں دیا کہ داخلۂ کونسل کے حامیوں کو کانگریس سے نکال دیا جائے۔ پنڈت جواہرلال نہرو کو یہ صدمہ ہوا کہ کانگریس کے بڑے بڑے ارکان کو جیسے گاندھی جی کے پروگرام میں وشواس نہیں رہا اور اعتماد کی یہ کمی قوتِ عمل کی کمی سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ انگریز حکومت سے کونسلوں اور اسمبلیوں کے اندر نہیں بلکہ عوامی میدان میں لڑنا چاہتے تھے، اگرچہ وہ لڑائی اہنساتمک یا عدم تشدد کی لڑائی تھی۔

۱۹۲۷ء میں مدراس میں ڈاکٹر انصاری کی زیر صدارت انڈین نیشنل کانگریس کا جو اجلاس ہوا اس نے ظاہر کر دیا کہ ایک بار پھر برٹش حکومت سے براہ راست ٹکراؤ ہونے والا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند کے مشورے سے ایک کمیشن حکومت برطانیہ نے اس لئے مقرر کیا کہ وہ اس بات کا جائزہ لے کہ ہندوستان کس درجہ تک حکومت خود اختیاری یا ذمہ دار حکومت کے قابل ہوا ہے۔ اس کمیشن کے سات ارکان تھے اور سب کے سب انگریز۔ چوں کہ اس کمیشن کے صدر سر جان سائمن تھے اس لئے اس کا نام سائمن کمیشن پڑا۔ ہندوستان میں اس کے خلاف زبردست ہیجان پیدا ہوا اور نہ صرف کانگریس بلکہ مسلم لیگ نے بھی اس کا بائیکاٹ کیا۔ جب ۱۹۲۸ء میں یہ کمیشن ہندوستان آیا تو جا بجا اس کے خلاف مظاہرے کئے گئے۔ لکھنؤ میں جب یہ کمیشن پہنچا تو اس کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں میں پنڈت جواہرلال نہرو اور پنڈت گووند بلبھ پنت تھے۔ ان دونوں پر بھی لاٹھیاں برسائی گئیں۔ لیکن پنڈت نہرو کے ارد گرد کالج کے طلبا ان سے لپٹ گئے ورنہ انھیں مار ڈالنے کا ہی منصوبہ باندھا گیا تھا۔ اسی اثنا میں کسی نے پنڈت نہرو کے ہاتھ میں ریوالور دینا چاہا مگر انھوں نے لیا نہیں غالباً یہ شخص کوئی خفیہ پولیس کا آدمی تھا جو ایک سنگین جرم میں انھیں گرفتار کرانا چاہتا تھا۔ مگر پنڈت نہرو اس کی چال میں نہیں آئے۔ پنڈت نہرو تو معمولی علاج کے بعد ٹھیک ہو گئے لیکن پنڈت گووند بلبھ پنت کے جسم میں رعشہ ہو گیا جو آخر عمر تک رہا۔

سائمن کمیشن کا جواب دینے کے لئے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک آل پارٹیز کمیٹی بنی اور پنڈت جواہرلال نہرو آل انڈیا کانگریس کے سکریٹری کی حیثیت سے اس کمیٹی کے بھی سکریٹری تھے۔ چونکہ اس کمیٹی نے مکمل آزاد ہندوستان کا آئین نہیں بنایا بلکہ درجۂ نوآبادیات کا اس لئے پنڈت جواہرلال نہرو کو اس سے اطمینان نہ تھا اس لئے انھوں نے ایک انڈی پینڈینس لیگ بنا لی جس کا مقصد ہندوستان کو مکمل طور پر آزاد کرانا تھا۔ پنڈت جواہرلال نہرو اور نیتاجی سبھاش چندر بوس دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کے اجلاس کانگریس میں بطور احتجاج اس روز بھی شریک نہیں ہوئے جس روز آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ اس میں منظور کی گئی۔ گاندھی جی نے منع کر دیا ورنہ یہ دونوں کھلے اجلاس میں آکر مخالفت کرتے۔ گاندھی جی نے دیکھا کہ معاملہ بگڑ گیا ہے۔ کش مکش بڑھ رہی ہے۔ اس لئے جب ۱۹۲۹ء کے اجلاس کانگریس کے لئے جو لاہور میں ہونے والا تھا ان کا نام پیش ہوا تو انھوں نے اپنا نام واپس لے کر پنڈت جواہرلال نہرو کا نام پیش کر دیا چنانچہ لاہور کے اجلاس میں پنڈت جواہرلال نہرو کی زیر صدارت آزادی کامل کا ریزولیوشن پاس ہو گیا اور پنڈت موتی لال نہرو نے جو ۱۹۲۸ء میں دوبارہ صدر منتخب ہوئے تھے انھیں صدارت کا چارج دیتے ہوئے کہا ع

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

آزادی کامل کا ریزولیوشن ۳۱۔ دسمبر ۱۹۲۹ء کو رات کے بارہ بجے پاس ہوا تو سرحد کے خدائی خدمتگاروں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنے حلقہ میں لے لیا اور ناچنے لگے۔ پنڈت جی نے ان کے ساتھ رقص کرتے ہوئے کہا کہ اسی جوش کے ساتھ گولیاں بھی کھانی ہوں گی۔ چند مہینے بعد قصہ خوانی بازار میں سرحدیوں نے ترنگے جھنڈے کی حفاظت کے لئے سینکڑوں کی تعداد میں جان دے کر اس کی تصدیق کردی۔ مہاتما گاندھی نے حسب عادت انگریزوں سے خط و کتابت کی کہ اگر وہ گیارہ مطالبات مان لیں تو ان میں آزادی کامل کا جوہر آجاتا ہے۔ لیکن انگریز حکومت نہ مانی۔ آخر نمک ستیاگرہ کی تحریک شروع ہوئی اور پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے لیڈر گرفتار ہوگئے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک پنڈت جواہر لال نہرو کا بیشتر زمانہ جیل میں گزرا۔ ۱۹۳۱ء میں جنوری کے آخر میں وہ رہا ہوئے تھے۔ اس کے دو ہفتہ کے بعد ان کے والد ماجد پنڈت موتی لال نہرو کا انتقال ہوگیا۔ انگریز حکومت نے گاندھی جی کو بات چیت کے لئے ولایت بلایا۔ اسی مقصد کے لئے انہیں جنوری ۱۹۳۱ء میں چھوڑا گیا تھا۔ ۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو گاندھی اروِن معاہدہ ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو ذاتی طور پر اس معاہدہ کے خلاف تھے مگر ڈسپلن کے بھی انتہائی پابند تھے۔ اس لئے انہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کی اکثریت رائے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ بہرحال سول نافرمانی کی یہ شاندار لڑائی پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت کے زمانے میں لڑی گئی۔

مہاتما گاندھی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے ولایت گئے لیکن وہاں فرقہ پرست ہندوؤں اور مسلمانوں کی کشمکش کی وجہ سے (جسے انگریزوں نے اور ہوا دی) مسئلہ حل نہ ہو سکا اور گاندھی جی ہندوستان واپس آئے اور جیسا انہوں نے کہا مایوسی اور شرم کے ساتھ واپس آئے کیونکہ نہ فرقہ پرست ہندو ان کی بات ماننے کو تیار تھے نہ فرقہ پرست مسلمان۔ پنڈت جواہر لال نہرو ان سے ملنے کے لئے بمبئی جا رہے تھے کہ راستے ہی میں گرفتار کر لئے گئے۔ یہ واقعہ دسمبر ۱۹۳۱ء کا ہے۔ جب جواہر لال جی کی رفیقۂ حیات

کملا نہرو تپ دق کے مہلک مرض میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ پنڈت جی کی طویل سزاؤں نے کملا جی کو اور بھی نڈھال کر دیا۔ یورپ میں بھی ان کا علاج ہوا لیکن شریمتی کملا نہرو جانبر نہ ہو سکیں اور ۱۹۳۶ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مگر پنڈت جواہر لال نہرو کو ماتم کی فرصت ہی کہاں تھی۔ اسی سال وہ پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوگئے۔ اپنے صدارتی ایڈریس میں انہوں نے کملا جی کی موت کا ایک ہلکا سا اشارہ یہ کیا کہ

'میں اس انجمن میں بھی کچھ تنہائی سی محسوس کر رہا ہوں'

اسی سال کانگریس انتخاب لڑی۔ ۱۹۳۷ء میں پنڈت جی پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور ان کی صدارت کے زمانے میں صوبہ سرحد، اترپردیش، بہار، بمبئی، مدھیہ پردیش، [illegible] اور آسام میں کانگریسی وزارتیں بن گئیں۔ لیکن ابھی یہ وزارتیں دو سال بھی نہ چلی تھیں کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان کی رائے لئے بغیر اسے جنگ میں شامل کر لیا جس کے خلاف احتجاج کے طور پر تمام کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دے دئے اور ایک بار پھر کانگریس اور برطانوی حکومت میں ٹکر ہوگئی۔

مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں شرکت جنگ کے خلاف تحریک شروع ہوئی جو انفرادی ستیاگرہ کی تحریک کہلائی۔ اس میں سب سے پہلی گرفتاری آچاریہ ونوبا بھاوے کی ہوئی۔ دوسری گرفتاری (جو اس ستیاگرہ کی شرکت کے لئے نہیں بلکہ بغاوت کے لئے تھی) پنڈت جواہر لال نہرو کی ہوئی اور انہیں چار سال کی سزا دی گئی۔ لیکن جاپان کے حملہ کر دینے پر حکومت اور کانگریس میں ایک بار پھر سمجھوتہ ہوا اور پنڈت جواہر لال نہرو گرفتاری کے ایک سال بعد ہی چھوڑ دئے گئے۔ میں نے ۱۹۴۰ء میں پنڈت جی کی سزا یابی پر جو نظم لکھی تھی اس میں ایک شعر تھا

دیکھئے ہوتا ہے کیا دنیا کا حال
کون رکھے گا قفس میں چار سال

پنڈت جی ۱۹۴۱ء میں کتنے عرصہ میں رہا ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں

سر اسٹیفورڈ کرپس۔ برطانوی حکومت کی طرف سے ایک اسکیم لے کر آئے جسے مہاتما گاندھی نے پہلے ہی نامنظور کر دیا اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے مزید غور و خوض کے بعد سر اسٹیفورڈ کرپس اُدھر کانگریس کو کوستے ہوئے ولایت واپس گئے۔ اِدھر گاندھی جی نے بھارت چھوڑ دو کی تحریک چلا دی۔ گاندھی جی کی صحت اس قابل نہ تھی کہ وہ ملک میں گھوم پھر کر اس کا پرچار کریں۔ یہ کام پنڈت جواہرلال نہرو اور ان کے رفقائے کار کے حصہ میں آیا۔ انھیں دنوں گاندھی جی نے اعلان کیا کہ جواہرلال نہرو میرے جانشین ہوں گے۔ آخر بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کا وہ تاریخی اجلاس ہوا جس میں "بھارت چھوڑ دو" کا ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ اس کے بعد جو ہونا تھا وہی ہوا یعنی تمام لیڈر بمبئی میں ۹۔ اگست کی صبح کو گرفتار ہو گئے۔ مہاتما گاندھی، ماتا کستوربا گاندھی اور مہادیو ڈیسائی کو تو آغا خاں پیلس میں بند کر دیا گیا اور مولانا آزاد صدر کانگریس، پنڈت جواہرلال نہرو اور دوسرے لیڈروں کو جو بمبئی میں گرفتار ہوئے تھے، احمد نگر کے قلعہ میں بھیج دیا گیا اور ایک مدت تک یہ پتہ بھی نہیں چلا کہ یہ لوگ کہاں رکھے گئے ہیں۔ ۹۔ اگست کو ہی جا بجا صوبوں میں بھی کانگریسی لیڈروں کی گرفتاریاں ہوئیں، ہنگامے ہوئے اور تمام ملک میں بغاوت پھیل گئی۔ ہزاروں آدمی ہلاک اور لاکھوں گرفتار ہوئے۔ نہ جانے کتنوں کی جائدادیں ضبط اور تباہ ہوئیں اور کتنے لاٹھیوں کی مار سے زخمی ہوئے۔ آخر ۱۹۴۵ء میں جنگِ عظیم کے ختم ہونے پر کانگریسی لیڈروں کو چھوڑ دیا گیا اور پنڈت جواہرلال نہرو بھی جیل سے باہر آ گئے۔ ایک طرف مسلم لیگ سے اور دوسری طرف برطانوی سلطنت سے بات چیت شروع ہوئی۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں پنڈت جواہرلال نہرو ایک بار پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اس سے پہلے وہ کشمیر میں عارضی طور پر گرفتار بھی ہوئے تھے۔ یہ ان کی زندگی کی آخری گرفتاری تھی۔ آخر لارڈ ویول اور مسٹر جناح سے بات چیت کے نتیجے کے طور پر ۱۹۴۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کی ملی جلی وزارت پنڈت جواہرلال نہرو کے مشورے سے قائم ہوئی لیکن مسلم لیگی حضرات تو کیا مسلم لیگی وزرا بھی پنڈت جواہرلال نہرو کو وزیر اعظم تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس ملی جلی

انٹیرم وزارت کا زمانہ پنڈت جی کے لئے بڑا صبر آزما گزرا کیونکہ لیگی وزیر نہ پنڈت جی سے مشورہ لیتے تھے نہ ان کے مشوروں میں شریک ہوتے تھے بلکہ براہ راست لارڈ ویول سے تعلق رکھتے تھے۔ پنڈت جواہرلال نہرو کی یہ وزارت ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو قائم ہوئی تھی اور نومبر ۱۹۴۶ء میں انھوں نے میرٹھ میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں کہا کہ میں دو بار استعفیٰ دے چکا ہوں۔ اسی دوران پنڈت جی سرحد کا دورہ کرنے گئے تو جا بجا ان پر گولیاں چلائی گئیں۔ معاملہ ہمیشہ راز میں رہا کہ یہ حرکت کن لوگوں کی تھی اور کن کے اشارے سے کی گئی تھی۔ بہرحال یہ دورہ بھی پنڈت جی کی بے خوفی کا نمونہ تھا اور ملک کو اطمینان ہوا کہ وہ اس دورے سے صحیح و سلامت واپس آئے۔

آخر اس انٹیرم وزارت کے نہ چلنے پر پاکستان ماننا پڑا۔ ملک آزاد ہوا مگر تقسیم ہو کر جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ زبردست ہنگامے ہوئے۔ پنڈت جی نے جس طرح ۱۹۴۶ء میں کئی جگہ اپنی جان خطرے میں ڈالی تھی اب پھر اسی طرح خطرے برداشت کر کے گاندھی جی کی ہم آہنگی کرتے ہوئے تشدد پسند طاقتوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر سکون ہوا۔ پھر بھی بہت سا نقصانِ جان و مال ہوا جس کی خلش ابھی تک دلوں میں باقی ہے۔

پنڈت جواہرلال نہرو نے وزیر اعظم ہند ہونے کے بعد کہا کہ ہماری جنگ اب بھی جاری رہے گی۔ اب تک یہ جنگ انگریزی سامراج کے خلاف تھی، اب یہ جہالت، غریبی اور تعصب کے خلاف ہوگی۔ انھوں نے یہ جنگ جاری رکھی۔ وہ مردِ مجاہد تھے آخر تک یہ لڑائی لڑتے رہے اور لڑتے لڑتے ہی اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ البتہ ہمارے لئے یہ سبق چھوڑ گئے ہیں کہ ہم بھی جہالت، غریبی اور تعصب کے خلاف جنگ جاری رکھیں۔

بدرالدین طیب جی

پنڈت جی میری نظروں میں

۱۹۲۰ء میں یا اس سے ایک دو سال پہلے جبکہ مہاتما گاندھی نے برطانوی حکومت کے خلاف عدم تعاون کی اپنی پہلی تحریک شروع کی تھی، پنڈت موتی لال نہرو اپنے اکلوتے لڑکے جواہر لال نہرو کے ساتھ ہمارے گھر سمرسٹ لاج (بمبئی) تشریف لائے تھے۔ اس واقعہ کا میرے ذہن میں بڑا دھندلا سا نقش ہے۔ ممکن ہے یہ بات میں نے اپنے گھر والوں سے سنی ہو اور میرے ذہن میں ایک خیالی تصویر بن گئی ہو یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے یہ بات صحیح طور سے یاد نہ ہو۔ بدقسمتی سے میرے عزیزوں میں کوئی ایسا بڑا بوڑھا زندہ نہیں ہے جس سے میں اس کی تصدیق کر سکتا۔ لہٰذا میں پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتا، لیکن ان باپ بیٹوں کا نقشہ جیسا کہ اس وقت میں نے انھیں دیکھا تھا میرے ذہن میں حیرت ناک حد تک صاف اور واضح انداز میں موجود ہے۔ ایک لمبا چہرہ اور اس کے تیکھے ریاضی نقوش، پُر وقار انداز، لباس اور حرکات و سکنات میں طبلِ کا دیدی اور نفاست، اچانک بے تکلف ہو جانے اور کسی شخص میں حل میں لینے کا مل پذیر ڈھنگ، پھر اس طرح اپنے آپ میں کھو جانے اور اپنے گرد و پیش سے بے خبری جس میں ایسی سی دوری کشش اور خنکی ہوتی تھی۔ یہ تمام باتیں مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ اس وقت میری عمر دس اور تیرہ سال کے درمیان ہوگی۔

اس کے بعد جواہر لال نے میرے تصور میں ایک سورما کی صورت اختیار کر لی۔ مجھے تاریخی رومان پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ اس لئے جب میں نے مہا بھارت پڑھا تو مجھے موتی لال نہرو اور ان کے بیٹے کے اس ابتدائی تصور کو پانڈوں کے راجہ اور ارجن سے مماثلت دینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ان دونوں میں کسی کا براہ راست میری زندگی پر اثر نہیں پڑا جیسا کہ وقتاً فوقتاً گاندھی جی کا پڑتا رہتا تھا، کیونکہ میرے خاندان کے کئی افراد سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ لہٰذا یہ دونوں نہرو میرے ذہن پر ہیرو بن کر چھائے رہے۔

۱۹۲۹ء میں جب میں پہلی بار ٹرین سے بمبئی سے دہلی جا رہا تھا تو مجھے یاد ہے کہ میں نے جواہر لال کو دوبارہ دیکھا۔ کسی چھوٹے اسٹیشن پر ان کی ایک جھلک دیکھی۔ مجھے صرف ان کا تاب ناک تبسم اور روشن آنکھیں یاد ہیں۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے تاریخی اجلاس کی صدارت کرنے جا رہے تھے جو راوی کے کنارے پر ہوا تھا اور جس میں ہندوستان کا نصب العین کامل آزادی قرار دیا گیا تھا۔

اس کے فوراً ہی بعد میں آکسفورڈ چلا گیا اور انڈین سول سروس کے امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ پھر ہندوستانی سیاست

یہ مضمون اس تحریک کا حصہ ہے جو شری جواہر لال کی سترھویں سالگرہ کے موقع پر جناب بدرالدین طیب جی [illegible] جن کو [illegible] [illegible] جب وہاں متعین تھے (۱۹۵۹)

اور جواہر لال کی شخصیت وہاں کی انڈین مجلس کے مباحثوں کے لئے ایک علمی بحث بن گئی۔

انڈین سول سروس میں کامیاب ہو کر جب میں ہندوستان واپس آیا تو مجھے پنجاب میں مقرر کیا گیا اور پنڈت جی سے میری ملاقات ۱۹۴۵ء سے پہلے نہیں ہوئی جب کہ میں حکومت ہند میں نئی دلی آ گیا۔

اس وقت میں نے انھیں ان کے چچا زاد بھائی رتن نہرو[1] کے مکان پر پہلی بار قریب سے دیکھا اور صحیح معنوں میں ان سے واقفیت یہیں سے شروع ہوئی۔ جب ان سے میرا تعارف کرایا گیا تو انھوں نے فوراً ہی کہا۔ ہاں، ہاں، ان کو ہی نہیں بلکہ پورے طیب جی خاندان کو جانتا ہوں۔ مجھے یہ سن کر فخر محسوس ہوا اور بڑا سکون ملا۔ میں نے سوچا کہ یہ ان کی شرافت ہے کہ انڈین سول سروس میں ملازم طیب جی میں اور طیب جی خاندان کی قوم پرستی کی وجہ سے جیل جانے والے افراد میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ لیکن مجھے ان کی طبیعت کے چونچال پن، وسیع دل چسپیوں اور بھرپور تجسس نے زیادہ متاثر کیا تھا۔ اس وقت کا ایک چھوٹا سا واقعہ میرے حافظے میں جم کر رہ گیا ہے۔ جب ان کے لئے خاص چینی چائے لائی گئی تو انھوں نے چائے بنانے کے فن، اس کی اقسام، تاریخ اور کاشت وغیرہ پر بکر عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی اور یہ باتیں انھوں نے اتنی عمدگی اور جولانیٔ طبع کے ساتھ بیان کیں کہ ہم لوگ مسحور ہو کر سنتے رہے۔

ستمبر ۱۹۴۶ء میں عبوری حکومت قائم ہوئی۔ پنڈت جی اس میں وائسرائے کی کونسل کے نائب صدر تھے۔ آزاد ہندوستان کے لئے دستور بنانے کے لئے دستور ساز اسمبلی بلانے کا انتظام کیا جا چکا تھا اور سر بی۔ این راؤ دستوری مشیر تھے۔ اس وقت مجھے پنڈت جی سے سرکاری اور ذاتی حیثیت میں تقریباً روزانہ ملنے کا موقع ملا۔

سر بی۔ این۔ راؤ پنڈت جی کے معتمد تھے اور اس وقت کانگریس پارٹی، مسلم لیگ اور برطانوی حکومت کے درمیان جو نازک سیاسی اور دستوری گفت و شنید ہو رہی تھی اس میں ان سے برابر اصلاح لیا کرتے تھے۔ دستور ساز اسمبلی بلانے کے سلسلے میں ابتدائی تیاریوں کے لئے سر بی۔ این راؤ نے اپنے ایک نائب کی حیثیت سے میرا انتخاب کیا تھا۔ دستوری مشیر کار کی حیثیت سے وہ جو بھی کام کرتے تھے اس کے بارے میں مجھ سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ اپنی شخصیت، کردار اور دستوری معاملوں کی وسیع معلومات کی وجہ سے سر بی۔ این۔ راؤ کی حیثیت اس زبردست سیاسی تناؤ، دستوری گفت و شنید اور ہلچل کے زمانے میں کلیدی ہو گئی تھی۔ اس وقت اس سوال پر غور کیا جا رہا تھا کہ ہندوستان کو سیاسی لحاظ سے کس طرح صحت مند بنایا جائے۔ یہ اس وقت کا سب سے اہم موضوع تھا کہ اس کی صحت کے لئے طبیب (فزیشن) کی ضرورت ہے یا سرجن کی۔ سر بی۔ این راؤ بلاشبہ ایک طبیب تھے سرجن نہ تھے۔

ہندوستان کی بدقسمتی سے میدان ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو سیاست میں عمل جراحی کے قائل تھے۔ انجام کار ملک کی تقسیم کا فیصلہ ہو گیا اور بڑی سخت گیری اور تیزی کے ساتھ اس پر عمل شروع ہو گیا۔ اس بحران کے زمانے میں جبکہ ہر روز فساد، قتل اور منافرت کی خبریں آ رہی تھیں، حالانکہ مہاتما گاندھی، پنڈت جی، مولانا آزاد اور سر بی۔ این۔ راؤ جیسے لوگوں کی جینیئس اور انسان پرستی اس جبر و تشدد کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی لیکن اس میں رفتہ رفتہ مصالحت پسندی آ گئی تھی۔ میں نے نظریوں اور شخصیتوں کی اس اندرونی کشمکش کو کافی حد تک دیکھا ہے اور اس طرح میرے سامنے ان طاقتوں کی توانائی اور زور کا واضح نقشہ آ گیا جو ان آدرشوں اور اصولوں کے خلاف صف آرا تھیں جن کے پنڈت جی علمبردار تھے اور جن کے لئے وہ ساری عمر لڑنے کے لئے تیار تھے۔

ان بیتے دنوں کو یاد کرتے ہوئے بعض اوقات سوچتے

---

[1] شری آر۔ کے نہرو جو اس وقت مصر میں ہندوستان کے سفیر تھے اور حال ہی میں سکریٹری جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

لگتا ہوں کہ کیا پنڈت جی اپنی پوزیشن کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکتے اگر انھیں مہاتما گاندھی کی حمایت حاصل نہ ہوتی۔

اس وقت جو کام ہو رہے تھے ان میں پنڈت جی کی دلچسپی کی وجہ سے میرا ان سے براہِ راست تعلق پیدا ہو گیا۔ چوں کہ دستور ساز اسمبلی کو بلانے کے سلسلے میں جو انتظامی امور تھے وہ کم و بیش میرے سپرد تھے اس لئے مجھے اکثر انھیں یہ بتلانے کا موقع ملتا تھا کہ ہم کیا کچھ کر رہے ہیں۔ میری ان سے ملاقاتیں بڑی فرحت بخش ہوتی تھیں۔ وہ بڑے خوش مزاج تھے، فوراً ہی تعریف یا نکتہ چینی کرتے، جو کچھ بھی کہنا چاہتے، صاف صاف کہہ دیتے۔ وہ اپنی رائے بدلنے کو تیار رہتے اگر وہ یہ محسوس کرتے کہ ان کی رائے کے برعکس جو رائے پیش کی گئی ہے اس میں کچھ کارآمد باتیں ہیں اور یہ کہ انھیں سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ بالکل برابری کا سلوک کرتے تھے اور ایک مساوی سطح پر آجاتے تھے اور کوئی بات چھپاتے نہ تھے۔ ان کے نزدیک سرکاری سلسلۂ مدارج، سررشتۂ آداب و رسوم کی نزاکتیں اور تقدم کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ دراصل انھیں ان کی خلاف ورزی کرنے میں ایک گونہ مسرت حاصل ہوتی تھی۔

پنڈت جی کی گرم مزاجی مشہور تھی۔ میں نے اس کا ایک دلچسپ مظاہرہ دیکھا جب کہ ۱۹۴۷ء میں نئی دلی کے پرانے قلعے میں پہلی افریشیائی کانفرنس ہوئی تھی۔ میں اس کے اجلاس میں لیفٹیننٹ کی خدمات انجام دے رہا تھا جس اجلاس میں مہاتما گاندھی کو تقریر کرنی تھی اس میں گڑبڑ پیدا ہو گئی۔ جو جگہ مہمانوں کے لئے مخصوص کی گئی تھی اس میں لوگوں کی بھیڑ گھس آئی۔ اس بھیڑ کو روکنا اور مدعو کردہ مہمانوں کو ان کی نشستوں پر بٹھانا تقریباً ناممکن تھا۔ اجلاس شروع ہونے کے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے سے یہ غیر مساوی جدوجہد جاری تھی اور ہم منتظمین بالکل تھک چکے تھے اور تقریباً ہار چکے تھے۔ اس وقت پنڈت جی [illegible] کر مائیکروفون کے پاس پہنچے اور بڑے پُرجوش انداز میں مجمع سے خطاب کرنے لگے۔ اس کا فوری اثر ہوا مگر انسانوں کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا فوراً پیچھے مڑنا کوئی آسان نہ تھا۔ پھر کچھ شرارت پسند عناصر بھی ہوتے ہیں جو ہمیشہ ایسے موقعوں پہ موجود ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ پنڈت جی کی قوتِ برداشت بھی تیزی سے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک وہ ڈائس سے کود کر اس بھیڑ میں جا گھسے اور دائیں بائیں گھونسے چلانے لگے۔ مجمع میں نظم و ضبط پیدا ہو گیا اور امن قائم ہو گیا۔

جن غیر ملکی ڈیلی گیٹوں نے ہندوستان کے وزیر اعظم کو ایک پولیس مین کے فرائض انجام دیتے ہوئے دیکھا وہ نظم و ضبط قائم کرنے کی ان کی اس صلاحیت سے کافی متاثر ہوئے۔

میرا خیال ہے کہ پہلی مرتبہ میں ان کے غصے کا شکار اس وقت ہوا جب میں ان کی عارضی غیر حاضری کے زمانے میں دستور ساز اسمبلی کے سیکرٹری کا کام انجام دے رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مسئلہ یہ تھا کہ بعض سابقہ دیسی ریاستوں سے دستور ساز اسمبلی کے لئے جو امیدوار چنے گئے تھے ان کے بارے میں یہ الزام لگایا گیا تھا کہ ان کے چناؤ میں راجوں یا ان کے ایجنٹوں نے دخل اندازی کی ہے یا زور زبردستی سے کام لیا ہے۔

یہ شکایتیں ریاست کی عوامی تنظیموں نے کی تھیں۔ جو کانگریس پارٹی کی شریک کار تھیں۔ جیسا کہ ہندوستان میں ایسے موقعوں پہ ہوتا ہے۔ تاروں اور درخواستوں کا تانتا بندھ گیا۔ جس میں حکام کے خلاف ہر قسم کے الزامات لگائے گئے تھے۔ میں ایک سابق ضلع آفیسر کی حیثیت سے اپنے تجربے اور ٹریننگ کی بنا پر جانتا تھا کہ ایسی شکایتوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دینی چاہیئے یا کم سے کم اس وقت تک صحیح نہیں سمجھنا چاہیئے جب تک کسی غیر جانب دار شہادت کے ذریعے اس کی تصدیق نہ ہو جائے۔

پنڈت جی کی فطرت اور ان کا پس منظر اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ کام کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے اور [illegible] ختم کے

مسائل نے انھیں پریشان کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ابھی حکومت ہند کی وسیع انتظامی مشینری اور کام کاج سے پوری طرح واقف نہ ہوئے تھے اور اس پر پورا بھروسا بھی نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا ان کی خواہش تھی کہ جو لوگ اس نئے جمہوری طریقۂ کار کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے مرتکب ہوئے ہیں ان کے خلاف فوری اور سخت کارروائی کی جائے۔

میں نے انھیں مشورہ دیا کہ جب تک کسی غیر جانبدارانہ تحقیقات کے ذریعے یہ الزامات صحیح ثابت نہ ہو جائیں ہمیں کوئی کارروائی نہیں کرنی چاہیئے۔ وہ نوکر شاہی (بیوروکریسی) کی تاخیر پسندی اور بےحسی کو بنیاد بنا کر مجھ پر برس پڑے۔ میں ان کے غصے اور بےصبری کا بلاوجہ نشانہ بنا تھا۔ انھیں واقعی غصہ آ گیا تھا مگر اس میں ان کی شریف النفسی ہی کارفرما تھی جس کا احساس مجھے اسی وقت ہی ہو گیا تھا۔ حالانکہ حقائق کی روشنی میں ان کی ناراضی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ لہٰذا ان کے رویے سے نہ تو مجھے غیر ضروری حیرت ہوئی اور نہ میں مرعوب ہوا۔ اس کے برعکس میرے دل میں اس شخص کے لئے جو خواہ مخواہ اپنے آپ کو سزا دے رہا ہے، وفاداری اور ہمدردی کا عجیب و غریب احساس پیدا ہوا۔

لہٰذا میں اپنی بات پر ڈٹا رہا اور ان کے غصے کے کم ہونے کا منتظر رہا۔ خوش قسمتی سے مجھے اس قسم کے مزاج والوں سے سابقہ پڑ چکا تھا اور مجھے اس کا تجربہ تھا۔ میرے والد کا اور خود میرا مزاج بھی اسی قسم کا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ جو کچھ وہ مجھے حکم دیں گے میں وہی کروں گا۔ مگر میری رائے میں ان حالات میں ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہمیں دونوں فریق کی باتیں سننی چاہئیں۔

اس پر پنڈت جی نے اپنے دونوں بازو پھیلا دئے اور بڑی ہی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا —— "جو تم کرنا چاہتے ہو وہی کرو، لیکن کچھ کرو ضرور۔"

پنڈت جی کے ساتھ کام کرنے کا مجھے اس وقت سب سے زیادہ خوش گوار تجربہ ہوا جبکہ دستور ساز اسمبلی کے سکریٹریٹ میں ہندوستان کے قومی جھنڈے اور قومی نشان کا ڈیزائن طے کرنے کا مسئلہ زیر غور تھا۔

میں کافی پہلے ہی دستور ساز اسمبلی کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد سے گزارش کر چکا تھا کہ ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کے دن اور اس کے بعد استعمال کرنے کے لئے دستور ساز اسمبلی سے منظور شدہ ایک قومی جھنڈا اور نشان ہونا چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی بنا دی گئی تھی جس کا میں سکریٹری تھا۔ قومی جھنڈے کے متعلق میرے ڈیزائن کو منظور ہونے میں کوئی خاص دقت نہ ہوئی۔ پنڈت جی نے اس بات کو فوراً منظور کر لیا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے جھنڈے پر جو چرخہ بنا ہوا ہے اس کی جگہ دھرم چکر رکھا جائے۔ یہ نکتہ ان کے ذہن نشین ہو گیا کہ قومی جھنڈے کو قومی ہونا چاہیئے کسی پارٹی کا جھنڈا نہیں۔ مگر گاندھی جی کے لئے اس تبدیلی کو قبول کرنا ذرا مشکل تھا۔ ہندوستانی کسانوں کی حالت سدھارنے کے لئے چرخہ ان کی خاص دین تھی لیکن جب انھیں بتایا گیا کہ اگر جھنڈے پر چرخہ بنایا گیا تو صرف اس کا ایک رُخ صحیح دکھائی دے گا اور دوسری طرف جھنڈا اُلٹا نظر آئے گا تو پھر وہ اس تبدیلی کے لئے راضی ہو گئے۔

لیکن قومی نشان کے بارے میں جلد فیصلہ نہ کیا جا سکا۔ سارناتھ میں اشوک کی لاٹ پر بنے ہوئے شیروں کو قومی نشان کی حیثیت اختیار کرنے کا ارادہ تو میرے دل میں شروع ہی میں پیدا ہو گیا تھا لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ اس میں کچھ اور علامتیں شامل کر دی جائیں جو ہندوستان کی تاریخ کے دوسرے ادوار سے لی گئی ہوں۔

ان خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت سے ڈیزائن تیار کئے گئے اور اس سلسلے میں بار بار پنڈت جی سے ملا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ نہایت اہم اور ضروری کاموں میں مصروف ہوتے تھے لیکن انھوں نے کبھی مجھ سے ملاقات کرنے میں معذوری کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی اس کام کی رفتار سے غیر مطمئن ہوئے۔

اب تک جو نتائج برآمد ہوئے تھے ہم دونوں اس سے غیر مطمئن تھے لیکن دونوں یہ تہیہ کیے ہوئے تھے کہ اس وقت تک کوشش جاری رکھی جائے جب تک کہ واقعی کوئی عمدہ اور مناسب نمونہ تیار نہ ہو جائے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں بالکل ہی غلط راستے پر چل رہا ہوں۔ اشوک کی لاٹ پر بنے ہوئے شیروں کے ساتھ کوئی اور ڈیزائن اور نمونہ کھپ ہی نہیں سکتا۔ یہ بذات خود آرٹ کا ایک مکمل نمونہ ہے۔

میں پنڈت جی کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھیں بتایا کہ ہندوستان کا قومی نشان اشوک کی لاٹ پر بنے ہوئے شیر ہی تو ہو سکتے ہیں کچھ اور نہیں۔ وہ فوراً ہی مجھ سے متفق ہو گئے اور حکومت نے اس نشان کو منظور کر لیا۔ اس کے نیچے سنسکرت کا مقولہ "ستیہ میو جیتے" (سچ کی جیت ہوتی ہے) بہت بعد میں بڑھایا گیا ہے۔

اس وقت یارک روڈ کی ۱۷ نمبر کی کوٹھی میں پنڈت جی رہتے تھے۔ یہ کوٹھی نسبتاً چھوٹی تھی اور یہاں جو کچھ انتظامات کیے گئے تھے وہ عبوری حکومت کی طرح عارضی نوعیت کے تھے اس کا فائدہ بھی تھا پنڈت جی سے ملنے ملانے میں زیادہ دقت پیش نہ آتی تھی۔ ایک وزیراعظم کے گرد حفاظتی انتظامات کا جو حصار بندھ جاتا ہے وہ ابھی پنڈت جی کے گرد نہیں بنا تھا۔

آزادی کے فوراً بعد شمالی ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا زور تھا۔ دلی ان شہروں میں سے تھا جو فسادات سے بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ پاکستان سے بے شمار پناہ گزین آ رہے تھے اور اسی طرح مسلمان دلی چھوڑ کر جا رہے تھے۔ تقسیم ملک نے لوگوں کے ذہنوں کو ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا اور لوگ فرقہ وارانہ جذبات کی شدت سے دیوانے ہو رہے تھے۔ چند مہینوں کے لئے میرے جیسے مسلمان کے لئے زندگی گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ ہر وقت جان کو [illegible] لگا رہتا تھا۔ اس پر آشوب زمانے میں پنڈت جی نے [illegible] انسان [illegible] ایک شریف اور مہذب شخص اور [illegible] کا ثبوت دیا۔ [illegible]

پر جیت پسند عناصر کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے ان لوگوں کو بھی سمجھانے بجھانے اور ان کا غصہ فرو کرنے کی کوشش کی جنھوں نے خود مصائب جھیلے تھے اور اب دوسروں سے اس کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ اپنی ان کوششوں میں انھوں نے جس ہمت، سرگرمی اور وسیع النظری کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی تاریخ میں کم ہی مثالیں ملیں گی۔

اس زمانے میں میرے ساتھ جو کچھ گزری وہ میرے حافظے میں محفوظ ہے۔

میں نے بیوی بچوں کو حیدرآباد بھیج دیا تھا اور خود ایک غیر مسلم دوست دیوان چمن لال کے مکان میں پناہ لی تھی کیوں کہ نئی دہلی میں تمام مسلمانوں کے مکانوں پر حملے ہو رہے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد کسی نے مجھے ٹیلی فون کے ذریعے اطلاع دی کہ میرا مکان لوٹا جا رہا ہے۔ میں اپنے میزبان کے ایک ملازم کو ساتھ لے کر فوراً کار میں سوار ہوا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ جب میں مکان پہ پہنچا تو دیکھا کہ لٹیروں کی ایک ٹولی میرا سامان اٹھا کر لے جا رہی ہے، جو کہ اسٹور روم میں حفاظت کے خیال سے بند کر دیا گیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ان میں سے چند بڑی دلیری سے میری کار تک آ گئے۔ وہ سب مسلح تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی بندوق کی نال میرے سینے سے لگا دی اور پوچھا کہ کیا میں مسلمان ہوں؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں میں مسلمان ہوں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ بہرحال میرے ہندو ساتھی کی حاضر دماغی سے میری جان بچ گئی۔ اس نے بندوق کی نال پکڑ لی اور کسی طرح بھی کر انھیں میری جان لینے سے باز رکھا۔

وزیراعظم کو اس واقعہ کی خبر آدھی رات کو ملی اور وہ فوراً ہی میرے گھر پہنچے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ وہاں جا رہے ہیں تو میں بھی اپنے گھر کی طرف چل پڑا اور ان کے آنے کچھ دیر بعد وہاں پہنچا [illegible] میں جو لٹا ہوا دیکھا وہ بھی [illegible] [illegible]

لٹ آئے تھے۔ کوئی انھیں سے چاک دستیدہ کر رہا تھا۔ کیا تھا اور اس سے ہمارے نیچے کچھ سامان پر اپنے دستخط کرنے لگے اور پھر پولیس کو جو وہاں آ پہونچی تھی ہدایت کی کہ وہ ان کی اچھی طرح حفاظت کرے۔

اس وقت سے میں نئے ہندوستان میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگا کیونکہ اس ملک کی قیادت پنڈت جی ایسے انسانوں کے ہاتھوں میں تھی۔

اس کے بعد میں شام کے وقت زیادہ تر پنڈت جی کے گھر جانے لگا۔ اکثر وہ اتنے مصروف ہوتے کہ کبھی ان کی دل کش مسکراہٹ یا محض چند الفاظ پر ہی قناعت کرنی پڑتی۔ لیکن یہ مکان اور اس کی ضو ریز شخصیت ہم جیسے لوگوں کو زبردست تقویت پہونچاتی تھی جو اپنے پیارے وطن میں حالات کے دھارے کی وجہ سے نہ صرف اپنی جان کا خطرہ محسوس کرتے تھے بلکہ سخت ذہنی اور جذباتی دباؤ میں بھی مبتلا تھے۔

دہلی میں فسادات کئی ہفتے تک ہوتے رہے اور امن و امان قائم نہ ہو سکا۔ ہزاروں آدمی اپنے گھر میں جو اب ایک نیا ملک بن گیا تھا زبردست مظالم کا شکار ہو کر چلے آرہے تھے۔ اس طرح ہزاروں آدمی اپنے مال و اسباب سمیت دہلی سے پاکستان جا رہے تھے اس وقت سب سے زبردست مسئلہ یہ تھا کہ کسی طرح پناہ گزینوں کے ان گروہوں کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہونے نہ دیا جائے کیونکہ اس طرح فرقہ وارانہ جذبات کے بھڑک اٹھنے کا ڈر تھا جو اس وقت اپنی انتہا کو پہونچے ہوئے تھے۔

کارامل[1] کو اور مجھے گشتی ڈیوٹی سونپی گئی۔ ہم لوگ بندوقوں سے مسلح جیپ میں چکر لگاتے تاکہ بدمعاشوں کو نہتے شہریوں پر حملہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ چکر لگانے کے بعد ہم زیادہ تر ۱۷ یارک روڈ لوٹ جاتے اور جو کچھ ہم نے کیا ہوتا اور دیکھا ہوتا اس سے وزیر اعظم کو آگاہ کرتے۔

ایک دن شام کو ہم نے انھیں بتایا کہ مسلمان پناہ گزینوں کو شہر سے پرانے قلعے (جو نئی دلی کی دوسری طرف واقع ہے) کے مہاجر کیمپ جانے میں سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ انھیں منٹو روڈ سے گزرنا پڑتا ہے اور یہاں اکثر مسلح فسادی مسلمانوں پر حملے کر دیتے ہیں اور ان کا مال اسباب لوٹ کر آس پاس کے مکانوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔

یہ سنتے ہی پنڈت جی دوڑتے ہوئے اپنے کمرے میں گئے اور وہاں سے ایک ریوالور لے آئے جو انھوں نے بتایا کہ ان کے والد کا ہے۔ پھر انھوں نے ایک بڑی حیرت انگیز تجویز پیش کی۔ وہ کہنے لگے کہ میں تم لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔ ہم لوگ خستہ حال پناہ گزینوں کا سا بھیس بدل کر منٹو روڈ پر ادھر ادھر چکر لگائیں۔ مسلمان سمجھ کر فسادی ہم پر حملہ کریں گے اور اگر انھوں نے حملہ کیا تو ہم انھیں گولی مار دیں گے پھر اس طرح ان کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ہم لوگوں نے بہت سمجھایا اور بڑی مشکلوں سے اس بات پر راضی کیا کہ وہ اپنی تجویز پر عمل کرنے سے باز رہیں۔

اس سلسلے میں تیسرا واقعہ جو مجھے یاد ہے وہ یہ کہ ہمیں خبر ملی کہ مغربی پنجاب سے لٹے لٹائے اور مسلمانوں کے ستائے ہوئے بہت سے پناہ گزین دہلی پہونچے ہیں اور دہلی شہر کے وسط میں کیمپوں میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور دہلی کے مسلمانوں سے بدلہ لینے کی قسمیں کھا رہے ہیں۔ پنڈت جی نے فوراً وہاں جانے اور ان سے باتیں کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اس وقت ان کے پاس تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو ہمیں دور متوسط کے میدان جنگ کا نقشہ نظر آیا۔ کئی ہزار فوجی میدان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں تلوار، درانتیاں اور دوسرے زرعی اوزار تھے۔ وہ غصے سے پاگل اور انتقام لینے کے لئے بے چین ہو رہے تھے اور اس فکر میں تھے کہ انھیں کچھ مل جائے جس پر وہ اپنا غصہ اتار سکیں۔ پنڈت جی کے ساتھ

---

[1] آپ ۱۹۵۹ء میں ترکی میں بھارت کے سفیر تھے۔

صرف ایک اور کانگریس لیڈر دیوان چمن لال تھے جو آنند جی کی طرح نڈر اور دلیر تھے ۔ اس کے علاوہ شاید تین یا چار پولیس میں تھے ۔

ہم نے اپنی موٹر اس مجمع کے بیچ میں روکی ۔ پنڈت جی فوراً ہی کار کے بونٹ پر چڑھ گئے اور انھیں سمجھانے لگے ۔ انھوں نے ان کی تعریف کی کہ وہ بڑی بہادری کے ساتھ لڑتے بھڑتے ہندوستان پہنچ گئے ۔ ان کا جو جانی اور مالی نقصان ہوا تھا اس کے لئے ان سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا ، لیکن پھر بڑی شعلہ فشانی کے ساتھ ان پر برس پڑے کہ وہ ان بے ضرر اور معصوم لوگوں سے بدلہ لینا چاہتے ہیں جن کا قصور صرف یہ ہے کہ ان کا تعلق اس مذہب سے ہے جس سے تعلق رکھنے والوں نے انھیں ستایا اور نقصان پہنچایا ہے ۔

جراٰت اور ہمت کا یہ بڑا غیر معمولی مظاہرہ تھا ۔ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک تنومند اور چھریرے بدن کا آدمی کھڑا تھا اور اس کے آگے انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو قتل و غارت گری پر تلا ہوا تھا اور پوری طرح مسلح تھا ۔ ان کے ایک وار سے ہندوستان کی اس مایۂ ناز ہستی کی زندگی ختم ہو سکتی تھی ۔

اس اور ایسے بہت سے دوسرے موقعوں پر پنڈت جی نے جس زبردست خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا اور اپنے اخلاقی اقدار میں یقین کامل کی بدولت انھوں نے جس طرح بڑے بڑے مجمع کو ٹھنڈا اور شانت کیا ہے جو اپنے جان و مال اور عزت و آبرو کے لٹ جانے کی وجہ سے نہایت بے چین اور آمادۂ فساد تھا وہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا جنگ وغیرہ کے زمانے میں اگر ایسی ہی صورت حال پیدا ہو جائے تو ان کے اس کارنامے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

وزارت خارجہ میں کام کرنے کی وجہ سے قدرتی طور پر پنڈت جی سے میرا زبردست رابطہ قائم ہو گیا ۔ میں صرف خارجی امور کے سلسلے میں ان سے ملاقات نہیں کرتا تھا بلکہ وہ ہر چیز میں دلچسپی لیتے تھے ۔ وہ ہر اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے اپنا وقت دیتے اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کے لئے تیار رہتے اگر انھیں یقین ہو جاتا کہ اس کام سے ملک و قوم کو فائدہ پہنچے گا ۔

۱۹۵۲-۵۳ء میں میں کامن ویلتھ سیکریٹری بنا اور پاکستان کے ساتھ تعلقات کا محکمہ میرے تحت آیا اور اس حیثیت میں سرکاری طور سے میں ان کے قریب آیا ۔ پاکستان کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں میں نے ان کی ان خوبیوں کو سراہا جن کو میں نے کئی واقعات بیان کر کے آپ کے سامنے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے ۔ یقیناً یہ واقعات بذاتِ خود کچھ زیادہ اہم نہیں ہیں لیکن کم سے کم میرے نزدیک یہ ان کے وجود کے اندرونی گوشوں کو روشن کرنے والے ہیں ۔

بلاشبہ ریفوجیوں کا مسئلہ ، نہری پانی کا جھگڑا اور کسی وقت بھڑک اٹھنے والا کشمیر کا مسئلہ ہمیشہ ہماری توجہ کا مرکز بنا رہتا تھا اور ان کی وجہ سے ہم بڑے متردد رہتے تھے لیکن ان کے علاوہ ان گنت دوسرے مسائل بھی تھے ۔ یہ سوچا جا سکتا ہے کہ میرے جیسے ہندوستانی مسلمان کو ان مسائل سے نپٹنے میں مشکل کا سامنا ہوا ہوگا ۔ حالانکہ میرے خاندان کے زیادہ تر لوگ ہندوستان میں تھے اور کئی نسلوں سے انڈین نیشنل کانگریس میں شامل تھے ۔ میرے خاندان کے کچھ لوگ تقسیم سے پہلے پاکستان جا کر آباد ہو گئے تھے مگر کچھ لوگ تقسیم کے بعد بھی وہاں گئے تھے ۔ لیکن میرے بہت سے دوست ، انڈین سول سروس کے ساتھی اور دوسرے لوگ اپنے سیاسی اعتقادات ، جائے سکونت یا دیگر وجوہ کی بنا پر پاکستان گئے تھے ۔

اس کی وجہ سے جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی وہ مضحکہ خیز ہونے کے ساتھ بڑی الم ناک بھی تھی ۔ میں ایک مثال کے ذریعے اس کی وضاحت کروں گا ۔ جب میں کامن ویلتھ سیکریٹری کی حیثیت سے سرکاری طور پر پاکستان گیا تو ہوائی اڈے پر پاکستان کے چیف آف دی پروٹوکول نے جو میرے ماموں تھے ، پورے سرکاری لوازمات کے ساتھ میرا استقبال کیا ۔

[illegible] کو بھی شناسائی ہوگئی اور بعد کو بھی۔

پنڈت جی کے یہی قدم سے ہمارے اندر کام کا ایک نیا حوصلہ ایک نئی توانائی پیدا ہوئی اور یہ شاخ بارآور ہوگئی۔

ہماری پکا بیں آفسٹ اور ٹائپ میں چھپی تھیں۔ چائے کے موقع پر ایک صاحب اردو رسم خط کی بعض خامیوں کی طرف اشارہ کرنے لگے۔ اس موقع پر پنڈت جی نے اس کی خوبصورتی اور اس کے پرمعنی اختصار پر اتنی بلیغ اور دل کش گفتگو کی کہ ہم سب حیران رہ گئے۔

پنڈت جی کے دل میں بڑی خواہش تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی کے تعلقات ہوں۔ یہ رکاوٹیں کم ہوں اور یہ پڑوسی ملک ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس خواہش کے پیش نظر انھیں دنوں ایک ہند و پاک ثقافتی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ ڈاکٹر تارا چند اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر چنے گئے اور میں اس کا سکریٹری منتخب ہوا۔

ڈاکٹر تارا چند میرے مخدوم ہیں اور بڑے فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ جلسے کے روز پنڈت جی سے کہنے لگے "یہ پروفیسر فاروقی ہیں۔ کانفرنس کے سکریٹری، یہ سب کیا دھرا انھیں کا ہے۔" پنڈت جی نے بڑی دل نوازی سے فرمایا "میں جانتا ہوں یہ بڑے کام کے آدمی ہیں۔" اس کام میں بڑے بڑے نازک مقام آئے لیکن ان گتھیوں کو ان دونوں بزرگوں نے منٹوں میں سلجھا دیا اور ہم لوگوں کو جو ان کے چراغ کا اعنی پرتو ہیں، بڑی تقویت رہی کہ ہر مشکل ان کے ناخنِ تدبیر سے جلد دور ہوگئی۔

اگست ۱۹۶۱ء میں میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے امریکہ کی یونیورسٹی آف وس کان سن میں چلا گیا۔ میرے دورانِ قیام میں (۱۹۶۱ تا ۱۹۶۲ء) پنڈت جی امریکہ تشریف لائے لیکن میں واشنگٹن [illegible] سے اس طرح گھرا ہوا تھا کہ ان کی خدمتِ اقدس میں حاضر نہ ہوسکا۔ لیکن "نعمت ملاقات" کی ایک عجیب و غریب بلکہ تاریخی صورت نکل آئی۔

اتفاق ایسا ہوا کہ سے ڈی سی میں جہاں میں مقیم تھا،

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم جمعیۃ علمائے ہند تشریف لے آئے۔ وہ غریب کینسر میں مبتلا تھے اور زندگی کے دن گن رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ بڑی مایوسی کا وقت تھا لیکن وہ راضی برضا تھے اور ان کو خدا پر ایسا محکم یقین تھا کہ وہ کسی وقت بھی ناامید نہیں ہوئے بلکہ جس طرح وہ غیر ملکی دشمن سے لڑتے رہے تھے اسی طرح پامردی سے مرض کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ان کی دانشوری حب الوطنی اور معاملہ فہمی کا میرے دل پر گہرا نقش ہے۔ ان کے پاس الجمعیۃ روزانہ آتا تھا۔ اس میں عثمان صاحب کا ایک اداریہ سہ لسانی فارمولہ پر شائع ہوا جو میں نے مولانا کو پڑھ کر سنایا۔ اس میں لکھا تھا کہ یو۔پی میں اس کی عجیب و غریب تعبیر کی گئی ہے کہ سہ لسانی فارمولہ میں ہندی، سنسکرت یا جنوبی ہند کی زبانیں اور انگریزی شامل ہے اور اردو اس فہرست سے یکسر خارج ہے۔ مجھے اس کا یقین نہیں آیا کہ یہ تعبیر ہوسکتی ہے بلکہ یہ شبہ ہوا کہ شاید اڈیٹر سے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ میں نے مولانا کے سامنے تجویز پیش کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو میں پنڈت جی کو ان کی طرف سے خط لکھوں تاکہ یہ معاملہ قطعی طور پر صاف ہوجائے اور غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے۔ انھوں نے اس رائے پر صاد کیا اور مسودہ کو پسند فرمایا۔ یہ خط اس وجہ سے اور زیادہ موثر ہوگیا کہ مولانا بسترِ مرگ پر تھے اور انھوں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے اس پر دستخط کئے تھے۔ پنڈت جی نے فوراً جواب دیا اور لکھا کہ میں نے اس معاملہ کی وزیر تعلیم سے مزید تصدیق کی۔ سہ لسانی فارمولہ کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اس میں (۱) ہندی شامل ہو جو سرکاری زبان ہے (۲) دوسرے کوئی ایسی زبان شامل ہو جس میں انگریزی بھی ہے (۳) تیسرے کوئی بھی جدید ہندوستانی زبان شامل ہو جس میں لازماً اردو کا بھی شمار ہے۔

میں نے امریکہ سے پنڈت جی کے اس خط کا ترجمہ کرکے اڈیٹر ہماری زبان کو رجسٹری سے بغرضِ اشاعت بھیجا تھا لیکن نہ معلوم اس پر کیا افتاد پڑی کہ وہ شائع نہیں ہوسکا اور مہینوں تک سہ لسانی فارمولہ میں بحثیں چلتی رہیں۔

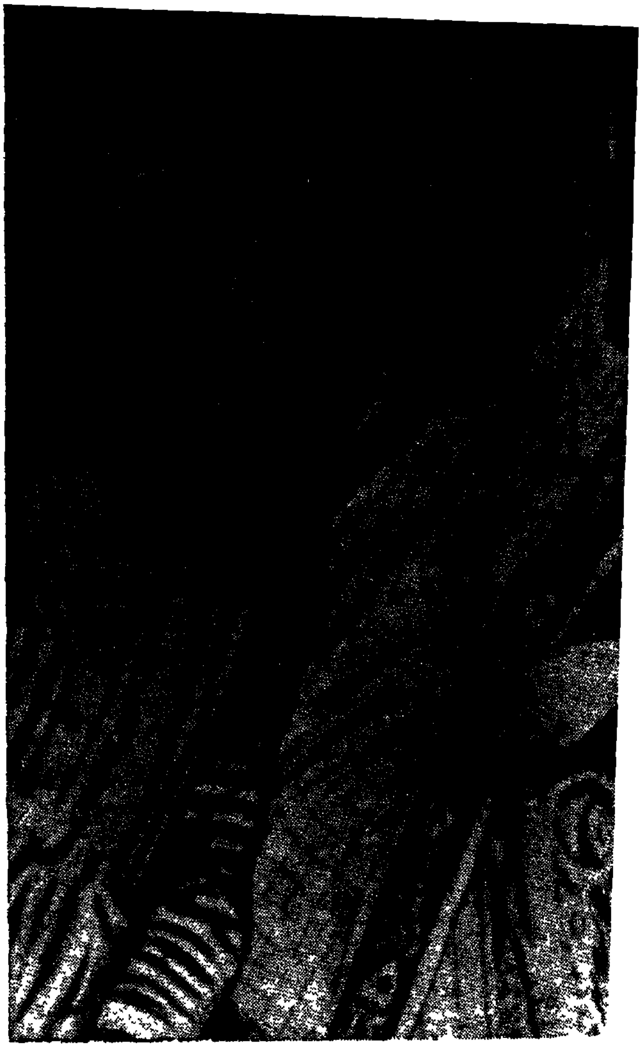
آخری مرتبہ میں نے پنڈت جی کو اپریل ۱۹۶۴ء میں دیکھا۔ میں علم اور ڈی کی سنٹرل کمیٹی کا ممبر تھا اور اس حیثیت سے میرا ان سے خصوصی تعارف وگیان بھون میں کرایا گیا۔ بیماری نے ان کو بے حد نڈھال کر دیا تھا لیکن ان کا عزم اسی طرح جوان اور حافظہ بدستور تھا۔ مجھے پہچان لیا اور قبل اس کے کہ میں مزاج پرسی کروں، فرمایا "اچھے ہیں آپ۔"

پنڈت جی کے انتقال پر رنج اور غم کے الفاظ معمولی نظر آتے ہیں ان سے ہمارے دکھ کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ میں تو اس

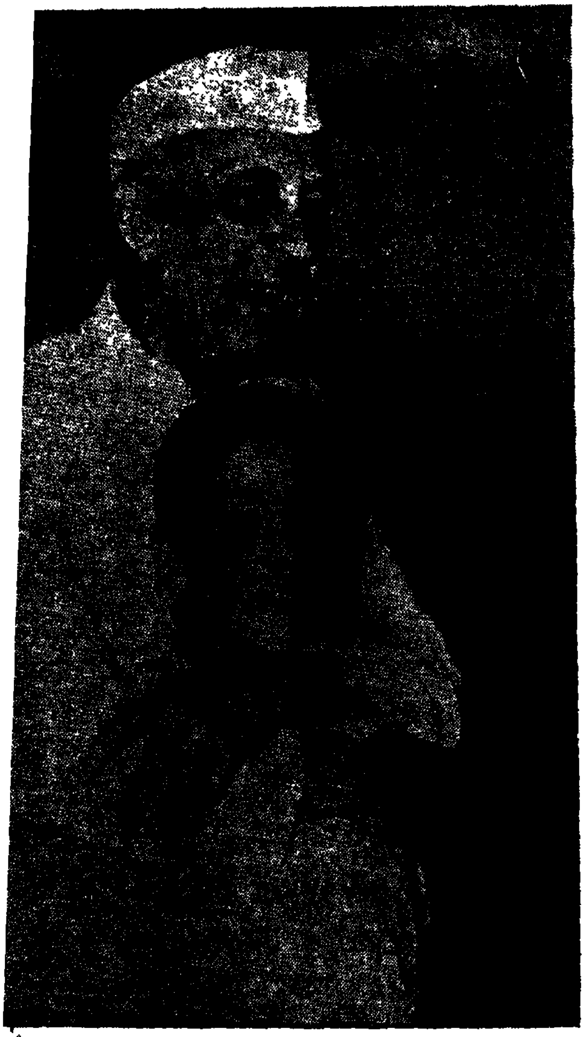
رنج پہ صبر ہی کیسے کہ [illegible]
ایک قسم کی بے وفائی ہے جس کو میں روا نہیں رکھتا۔
ایک ستون تھا جو گر گیا، ایک روشنی تھی جو گل ہو گئی،
ایک آئینہ تھا جس میں نئے ہندوستان کی تصویر تھی جو ٹوٹ گیا۔ ایک ساغرِ جم تھا جس میں جلوۂ آفاق کی جھلک تھی۔ جو ہم سے ہمیشہ کے لیے چھین لیا گیا۔

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

جواہر لال نہرو
بچپن میں ماں
کے ساتھ

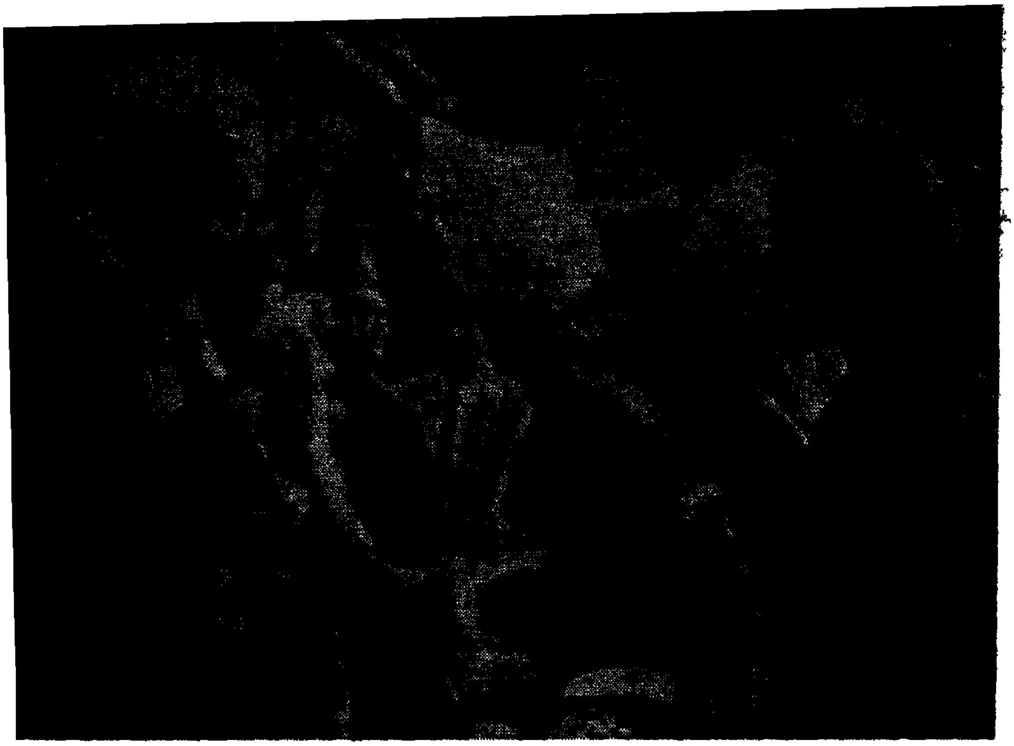


نواسے سے کھیل رہے ہیں



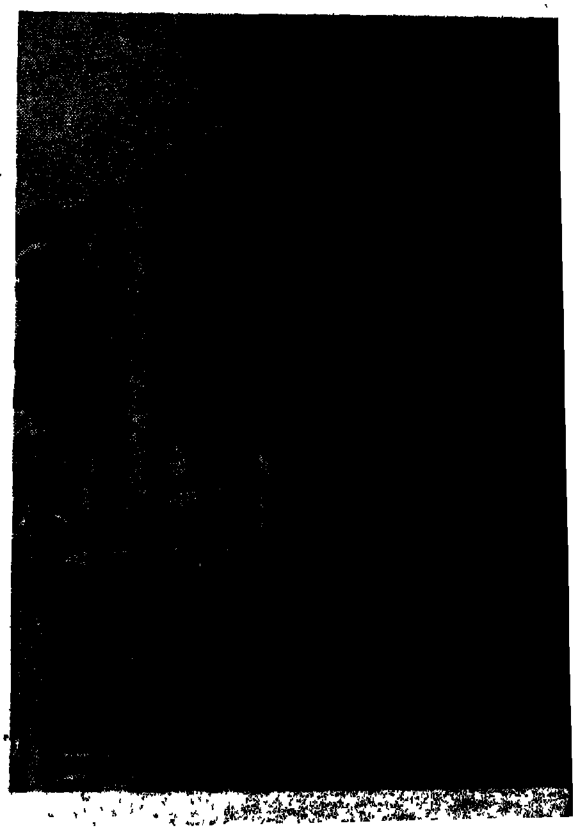
شگفتہ مزاجی کے عالم میں





بچوں کے ساتھ





تری کارکنوں کی ہمدردی اور اعانت ان پر منحصر ہے تاکہ اہلِ وطن کو ہمیشہ مسلسل و پائدار استوار، فرقہ وارانہ امتیازات سے بالا، مذہبی تعصبات سے پاک، ایثار و قربانی میں لگا دے۔ اس کا روشن ترین ثبوت اور کیا ہوگا کہ جو کچھ انہیں ورثے میں ملا پا سکتا تھا، وہ اس وقت خوشی خوشی قوم کی نذر کر دیا، جب آزادی کے لیے جدوجہد کی مصیبتوں میں مبتلا تھے اور اپنا کوئی مادی ورثہ قائم نہ کیا۔

پنڈت جی کی میراث

ان کی نہایت قیمتی زندگی کے پچاس سال کی مقاصد کے لیے وقف رہے۔ ملک آزاد ہو، تمام قومیں آزاد ہوں، وہ باہم امن و خیرسگالی کی زندگی بسر کریں، عوام کی حالت زیادہ زیادہ خوش گوار و اطمینان بخش ہو جائے۔ مذہبی تعصبات ختم ہو جائیں۔ اونچ نیچ مٹ جائے اور کشمکش باقی نہ رہے، انسانی شرف انسانی سے بہرہ مند ہوں، بھائیوں، خویشوں اور ایک کنبے کے افراد کی طرح زندگی گزاریں۔ یہی ان کی زندگی کا واحد سرمایہ تھا، یہی ان کی میراث ہے۔ انھوں نے اپنے لیے بھول کر بھی شہرت یا عزت یا برتری کی آرزو نہ کی۔ خدا نے انھیں شہرت، عزت اور برتری اس پیمانے پر عطا کی، جو بہت کم انسانوں کے حصے میں آتی ہے۔ یہی جواہر لال تھے، جن کا ماتم دنیا بھر نے کیا اور جن کی محبت بھری یاد نہ صرف اہلِ ہند بلکہ دنیا کے ہر انسانیت دوست اور امن پسند طبقے میں برابر قائم رہے گی۔ دوام صرف اللہ کے لیے ہے۔

تریق کمار شاد

جاوداں نہرو

(مکمل نظم پانچ بندوں پر مشتمل ہے۔ دو بند کہیں اور شائع ہو گئے ہیں۔ یہاں صرف تین بند ہی درج کئے جاتے ہیں۔ ادارہ)

یوں تو اکثر ملول رہتا ہوں   لیکن امشب کچھ اور ہے عالم
بولتا ہوں تو ہونٹ جلتے ہیں   بات کرتا ہوں تو بڑی مبہم
سوچتا ہوں تو ایسے لگتا ہے   ہے خیالوں کی آنکھ بھی پُرنم
دیکھتا ہوں تو دیکھتا کیا ہوں   صفِ انجم بھی ہے صفِ ماتم
اس جہاں میں گویا وجودِ وجود   ہر کوئی گام زن ہے سوئے عدم
اس کا انجام دل شکن ہے بہت   زندگی ہی کی دل کشی کی قسم
اس کی تعمیر شان دار سہی   اس کی بنیاد تو سہے نا محکم
خاک میں مل کے خاک ہو جانا   کیا یہی کچھ ہے قسمتِ آدم
جب یہی کائنات ہے اس کی   خاک ہے پھر جہانِ آتش و نم
اس طرح کے اداس اداس خیال   آ رہے ہیں دماغ میں پیہم
کائنات آبدیدہ ہو جیسے   غم میں ایک ایک چیز ہو مدغم
ایک مغموم فلسفی کی طرح   سرنگوں میرے دیس کا پرچم
کر رہا ہے زبانِ حسرت سے   شکوۂ بے ثباتیٔ عالم

گونجتی ہوں فضا کے سینے میں
جیسے یہ دل خراش آوازیں

جس نے بخشی نئی حیات ہمیں   وہ مسیحا وہ صاحبِ اعجاز
جس کی توقیر ملک کی توقیر   جس کی آواز قوم کی آواز
جس کو مہدِ وطن نے پالا تھا   لبِ ہستی کا وہ تبسمِ ناز
جس کی دھن میں کی فکر جس کا فکر   طالبِ جانِ فسردہ روح نواز
جس کی تعلیم جدوجہدِ عمل   جس کا پیغام مستقل تگ و تاز
جس کی گہرائیٔ نظر بے کل   اور آکاشں ذہن کی پرواز
کشتیٔ حیات کا [illegible]   [illegible] دلاں حیات کا ہمراز
[illegible] عشق سر تا پا   گاہ محمود اور گاہ ایاز
[illegible] کے گھر میں جیسے   جیسے ایمان چھوڑ رہا ہو نماز

ایک ایسا سپوت جس کا وجود   مادرِ ہند کا تھا اک اعزاز
ایک اتنا بڑا سیاست داں   جو سیاست پہ تھا اثر انداز
ایک دنیائے نور جس کا شعور   جس کا دل اک جہانِ سوز و گداز
جانِ حکمت و بصیرت کی   جس کے اندیشہ ہائے دور و دراز
رہنماؤں کا رہنما یعنی   رہنمایانِ دہر میں ممتاز

ہائے کیا بے نظیر تھا نہرو
وائے افسوس چل بسا نہرو

لیکن اے میرے دیس کے لوگو!   اے ستم خوردگانِ لیل و نہار
آج ہیں ہم شکستہ دل بے حد   اور ہیں بے شمار غم بکنار
پھر بھی غم کی ہنسی اڑائیں کیوں   ہو کے اس دیوتا کے غم کا شکار
کس لئے دل بجھا کے بیٹھ رہیں   غم تو ہے ایک چشمۂ انوار
غم سے خیر آشنا تو ہوتے ہیں   غم سے مر کے نہیں کبھی خوددار
آدمی بے ثبات ہے لیکن   آدمیت نہیں زوال آثار
آدمیت کی بھی ہے موت اگر   مان لی جائے حادثات سے ہار
موت اک امرِ ناگزیر سہی   کیوں کیا جائے زندگی سے فرار
کیوں نہ اہلِ وطن قسم کھائیں   کہ رہیں گے اسی کے پیروکار
جو تھا جمہوریت کا پیغمبر   عالمی امن کا جو تھا اوتار
ہم رہیں گے رواں دواں پیہم   منزلیں ہوں گی راستے کا غبار
کیونکہ اپنے ہی دیوتا کے بقول   یہ جہاں ہے عمل کا ایک دیار
للہ الحمد اس سکوت میں بھی   سن رہا ہوں یہ وقت کی للکار
اصل میں قابلِ پرستش ہیں   یہ جو غم کے بھڑک رہے ہیں شرار

کیوں نہ کام اس سے بھی لیا جائے
خود کو بے سود کیوں کھپا جائے

طُرفہ بھنڈاروی

جواہر لال

کبھی دلّی میں لب کھولے کبھی کشمیر سے بولا
سیاسی گتھیوں کو ناخنِ تدبیر سے کھولا

سمیٹا اپنی پیشانی میں مشرق کے دماغوں کو
اُجالے مرحمت فرمائے بھارت کے چراغوں کو

سموئے راستی اور امن کے رنگ اپنے پرچم میں
نہ رکھا فرق کچھ بھی عظمتِ سیتا و مریم میں

ہر اک تازہ بلا کو مسکرا کر ٹالنے والا
بہادر، وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والا

ہیں اب بھی اہلِ یورپ معترف جس کی درایت کے
سودی مملکت نے گائے گُن جس کی فراست کے

کبھی بھوٹان میں پہنچی کبھی نیپال تک پہنچی
نوا اِس سازِ خوش آہنگ کی پاتال تک پہنچی

بہاروں نے جبینِ ہر چمن میں نکہتیں بھر دیں
تقدّس حُور کا غلماں کے رُخ کی طلعتیں بھر دیں

طرب زارِ محبت بن گئی اس دیس کی بھومی
کیا ہنسا کو زیرِ گام اہنسا کی جبیں چومی

بہاریں اپنی رکھ دیں جس کے چرنوں میں ہمالے نے
ہمیشہ پاؤں چھوئے جس کے گنگا اور جمنا نے

وہ جس نے حوصلوں سے آندھیوں کی دُھول اُڑائی ہے
وہ جس کو دیکھ کر طوفان کی بھی آنکھ آئی ہے

وہ جس کی ہر نظر کو پردہ ہائے آب و گل کہیے
وہ جس کو ایشیا کی آنکھ اور بھارت کا دل کہیے

وہ جس کے ہوش میں آتے ہی ذہنی انقلاب آیا
وہ جس کے عہد میں فہم و فراست پر شباب آیا

وہ جس کے گھر کی چھت پر شانتی کی جوت لہرائی
وہ جس کی گود میں امن و اماں نے پرورش پائی

وہ جس کے سامنے ہر وقت ہر اک رام اک رب تھا
وہ جس کا دھرم تھا انسانیت، اخلاق مذہب تھا

وہ جس کے غور و فکر و عزم میں فطرت ہی فطرت تھی
وہ جس کے دل میں سوز اعصاب میں بجلی کی قوت تھی

[1] امریکہ

نومبر ۱۹۶۴ء

آج کل دہلی (جواہر لال نہرو نمبر)

وہ جس کی رہگزر میں منزلِ حق و صداقت ہے
وہ جس کا نقشِ پا نقشِ دوامِ آدمیت ہے

وہ جس کو مادرِ ہندوستاں کا لاڈلا کہیئے
وہ جس کو بے جھجک انسانیت کا دیوتا کہیئے

وہ جس کے دست و بازو میں قیادت مسکراتی تھی
وہ جس کے آستانے پر سیاست سر جھکاتی تھی

وہ جس کی موت پر دھرتی کا بھی سینہ دہل جائے
چتا پر جس کی چرخِ آبدیدہ پھول برسائے

وہ جس نے راکھ ہو کر بھی وطن سے منہ نہیں موڑا
رہا مٹ کر بھی ماں کی گود میں دامن نہیں چھوڑا

وہ جس کی زندگی کو موقعِ ملک و ملل کہیئے
فلاحِ قوم کی تحریک کا حسنِ عمل کہیئے

وہ جس کے خامۂ پُرکار کو پُرکار کہتے ہیں
محاسب، زاویہ سازِ حد، دُربار کہتے ہیں

وہ جس کے سامنے آتے ہوئے ضیغم بھی ڈرتے تھے
گرجنے والے پانی جس کے دروازے پہ بھرتے تھے

وہ جس کے ذہن میں سلجھی ہوئی تدبیریں آتی تھیں
لکیریں جس کی پیشانی کی تقدیریں بناتی تھیں

وہ جس کی راکھ کھیتوں میں اماں کے گیت گاتی ہے
امر ہے وہ، اُسے معدوم کہتے شرم آتی ہے

جو نقش اپنے بنائے ہیں انھیں رنگِ ضیا دے دو
صفائے قلب کی نورِ سویدائے وفا دے دو

رہے تاریخ کے اوراق پہ نام و نشاں اس کا
پڑھا جائے بعنوانِ وفا روشن بیاں اس کا

دیا ہے جو پیام اس نے اسے فرضِ وفا سمجھو
دکھائی ہے جو اس نے راہ اس کو حق نما سمجھو

خزاں میں بھی رہو آئینۂ حسنِ چمن بن کر
چمک اپنی دکھاؤ غازۂ روئے وطن بن کر

پڑیں طوفان لاکھوں، زلزلے پر زلزلے آئے
بلا کی آندھیوں میں بھی ترنگا اپنا لہرائے

اخوت، دوستی، مہر و صداقت عام ہو جائے
محبت سب کا ورثہ ہے محبت عام ہو جائے

تپش باقی رہے دل میں نہ مطلق اب شقاوت کی
نظر آئے نہ چنگاری کہیں بغض و عداوت کی

جو ہیں مظلوم انھیں بڑھ کر لگاؤ اپنے سینے سے
جو اُجڑے ہیں انھیں جاکر بساؤ پھر قرینے سے

کسی عنواں سے بھی سامنے آئے نہ رسوائی
نہ ہونے پائے ناموسِ وطن پر حرف آرائی

وطن کی آن کو سمجھو وطن کی شان دہراؤ
وطن سے ہے محبت تو جواہر لال بن جاؤ

نتا کا جواہرلال



بمبئی کے لوک ناچ آرٹسٹوں
کے ساتھ اُن کے لباس میں



ناگاؤں کے لباس میں



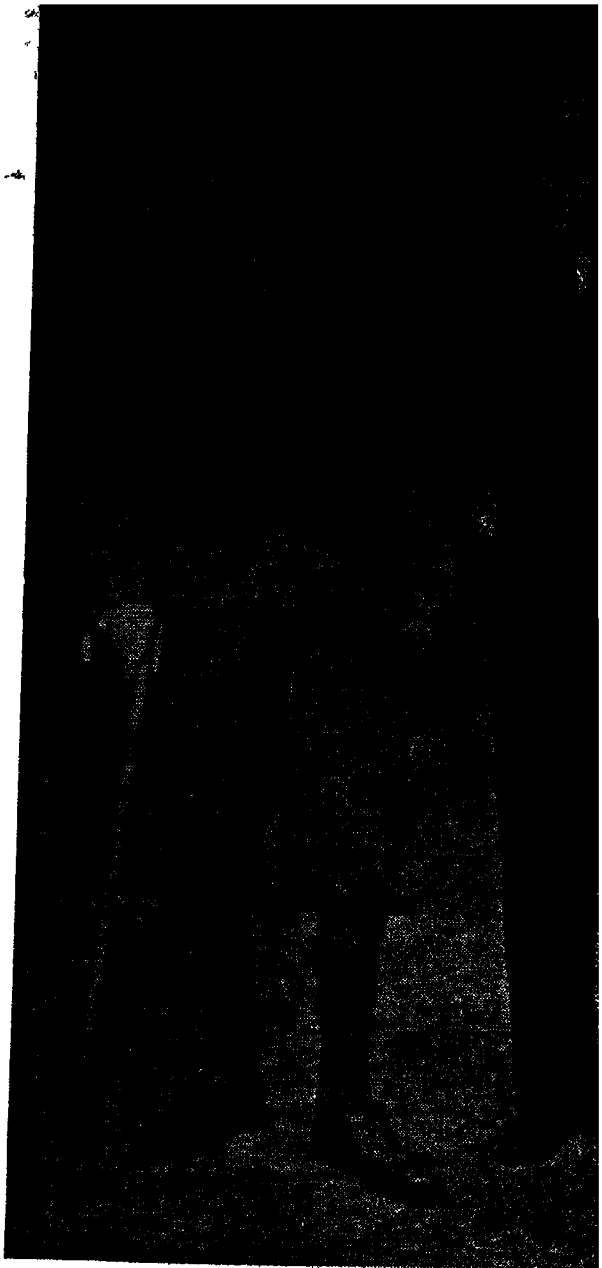
یوم جمہوریت کے موقعے پر
لوک ناچ کرنے والوں کے ساتھ

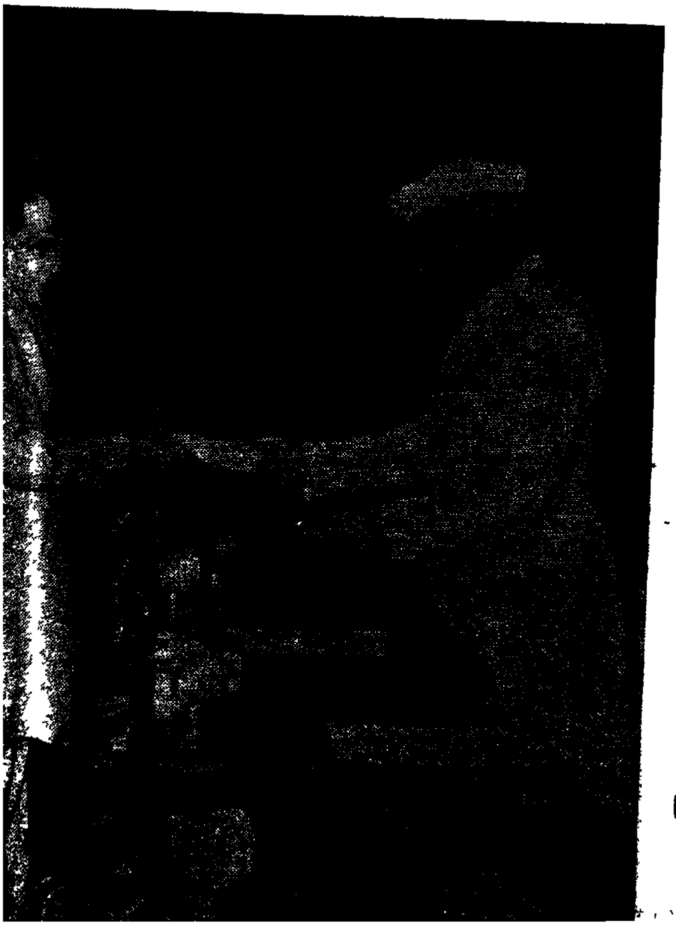


ادیبوں کا دوست

جواہرلال

برنارڈ شا کے ساتھ





فراق گورکھپوری کو
ساہتیہ اکادمی کا انعام
دے رہے ہیں۔

ہمایوں کبیر

نہرو — ایک ادیب کی حیثیت سے

جواہرلال کی تحریروں سے اس بات کا تازہ اور معقول ثبوت ملتا ہے کہ ایک ادیب میں جو خصوصیتیں ہوتی ہیں وہ وہی ہوتی ہیں جو ایک انسان کی حیثیت سے اس میں موجود ہوں۔ ایک ادیب جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے وہی اس کے تجربے کی بنیاد ہوتی ہے۔ اس کا پس منظر، کردار اور اس کی تربیت بالکل ذاتی اور شخصی ہوتی ہے، مگر یہی چیزیں عوام سے اس کے رابطے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کو دبانے یا چھپانے کی لاکھ کوشش کرے مگر اس کی شخصیت کا اظہار ہو ہی جاتا ہے۔ اس اصول کا اطلاق تمام فن کاروں پر ہوتا ہے خواہ وہ شاعر ہوں یا مصور، موسیقار ہوں یا بت ساز یا فنِ تعمیر کے ماہر۔

شری نہرو کی بنیادی خصوصیت یہ رہی ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات اور ان کے اظہار میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ تسلیم نہیں کی۔ ان کے نزدیک فکر کا مطلب احساس اور احساس کا مطلب قول یا عمل کے ذریعے اس پر عمل ہے۔ ان کی تیزی اور ذہنی جودت ذہنی رکاوٹ کو اُلجھن میں ڈال دیتی تھی اور بعض اوقات ان میں غصہ بھی پیدا ہوتا تھا۔ ان کے ردِ عمل کی تیزی سے بوکھلا کر بعض لوگ انھیں تُند مزاج سمجھتے تھے اور بعض اوقات ان کی تحکم پسندی پر محمول کرتے تھے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ اس سے نہ ان کی تنک مزاجی کا اظہار ہوتا تھا۔ اور نہ تحکم پسندی کا۔ اس سے تو درحقیقت ان کے فن کارانہ جذبے کا انکشاف ہوتا ہے۔ کیونکہ فن کار کے یہاں تجربہ اور اس کا اظہار دونوں کا عمل ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔

نہرو کی تحریروں کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ وہ براہ راست ہوتی ہیں اور ان میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں زور بھی ہے اور سادگی بھی، جس سے پڑھنے والا پہلی ہی نظر میں ان کا مداح ہو جاتا ہے اور اس کی یہ تحسین بعد میں بھی برقرار رہتی ہے۔ یہ علامت اس بات کی ہے کہ نہرو کے دل میں کسی قسم کی اندرونی کش مکش نہیں ہے۔ خواہ مظاہرِ فطرت ہوں یا انسانی تجربہ، دونوں سے ان کے دل میں ایک ایسا ردِ عمل ہوتا ہے جس میں ان کی شخصیت پوری طرح کام کرتی نظر آتی ہے۔ پہاڑ انھیں دل کش نظر آتے ہیں۔ غروبِ آفتاب کا نظارہ انھیں بار بار یاد آتا ہے۔ حسین و جمیل الفاظ اور اچھے کام انھیں بے حد پسند ہیں۔ ان سب کے بارے میں جب ان کا قلم اُٹھتا ہے تو اتنی نزاکت اور قدرت کے ساتھ اُٹھتا ہے جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی قوتِ ادراک و احساس کیسی عمدہ اور نفیس ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ اکثر فن کار غصّے یا ہمدردی کے جذبات کے تحت سیاست کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ عام آدمی کے دل میں موجود خرابیوں کے خلاف غیظ و غضب کا جو شعلہ بھڑکتا ہے وہ امتدادِ وقت سے سرد پڑ جاتا ہے۔ مگر فن کار کے یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی

ہمایوں کبیر کا یہ مضمون ٹائمز آف انڈیا کی شائع کردہ کتاب "A Study of Nehru" سے لیا گیا ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے اور تجربہ بڑھتے جاتے ہیں اس کے احساسات اور جذبات میں بھی شدّت پیدا ہوتی جاتی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ اسے اپنے تصوّرات کی دنیا میں ذرا دیر کے لئے بھی چین نہیں لینے دیتے۔ دکھ اور مصیبت کے ساتھ ہمدردی کا نتیجہ بھی یہی نکلتا ہے۔ پھر فن کار اپنی شخصیت کے خول میں چھپا نہیں رہ سکتا اور خواہ وہ پسند کرے یا نہ کرے اسے اس خول سے باہر نکل کر بُرائیوں کے خلاف مورچہ لینے کے لئے مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔ یہی نہرو کی قسمت میں بھی تھا، کیوں کہ ان کا تخیل انھیں اس وقت تک چین سے نہ بیٹھنے دیتا جب تک وہ سیاسیات کے اکھاڑے میں کود نہ پڑتے۔

نہرو ایک عملی سیاست داں تو بن گئے لیکن ان کے اندر چھپے ہوئے فن کار نے دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا۔ عملی آدمی کو تو ان باتوں سے مطلب ہوتا ہے جس سے فوری طور پر اس کا واسطہ ہو۔ ہر جگہ اور خاص طور پر ہندوستان میں ایسا شخص اپنے ذاتی تعہدات اور آلام کے بوجھ سے دبا ہوتا ہے۔ خود اپنی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد اس میں دوسروں کے آلام و مسرّت میں شریک ہونے کی سکت بہت تھوڑی باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن ایک فن کار کی کیفیت اس سے مختلف ہوتی ہے۔ اسے اپنی تخیل کی دنیا میں جن آلام سے سابقہ پڑتا ہے وہ انھیں اسی طرح محسوس کرتا ہے جیسے یہ آلام خود اس پر گزر رہے ہوں۔ اس کا اس پر اسی طرح شدید ردِّ عمل ہوتا ہے جس طرح براہِ راست واسطہ پڑنے کی صورت میں ہوتا۔ کسی فن کار کے دل میں دُکھ اور درد کا جو شدید احساس ہوتا ہے اس احساس کے تحت نہرو کا دل بھی دور دراز ملکوں کے لوگوں کے دُکھ اور مصیبت کا حال سُن کر اسی شدّت کے ساتھ تڑپ اٹھتا ہے جتنی شدّت کے ساتھ گرد و پیش کے لوگوں کے حال زار پر تڑپتا ہے۔ بعض لوگ اس کا جواز انھیں ایک بین الاقوامی شخصیت کہہ کر پیدا کرتے ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ دکھ درد اور مصائب کے بارے میں ان کا رویہ ایک فن کار کا رویّہ ہے۔

نہرو کی پہلی تصنیف 'باپ کا خط بیٹی کے نام' دنیا کی تعمیر اور اس کی نشو و نما کی داستان ہے۔ ان کی اس تصنیف کو بچوں کے پڑھنے کے لائق سائنس کا محض ایک کتابچہ سمجھنا غلط ہوگا۔ اس میں علم الارض اور علم الحیات کا بیان گہرے انسانی جذبات کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ہماری زندگی کے آلام اور خوشیاں کائنات کی ایک وسیع تر زندگی میں مدغم ہو جاتی ہیں اور اُن کو ایسی پائداری حاصل ہو جاتی ہے کہ پھر ان پر انقلابات وقت کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ اس کی حدود سے بالاتر ہو جاتی ہیں۔ فرد واحد کے ردِّ عمل اور دنیا کے عوامل کے درمیان جو تغیّر پذیری ہوتی رہتی ہے اس کا کبھی خاتمہ نہیں ہوتا۔

Glimpses of the World History (تاریخِ عالم کی جھلکیاں) اور اس کے بعد کی تصنیف Discovery of India (تلاشِ ہند) دونوں کتابیں معاملات انسانی کے بارے میں شدید ترین جمالیاتی احساس اور وسیع تر دلچسپی کے امتزاج کی مظہر ہیں۔ "تاریخ عالم کی جھلکیاں" میں انسانی تہذیب کی نشو و نما کا ذکر وسیع اور جامع الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ازمنۂ گزشتہ کے پُر شکوہ مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے نہایت نمایاں شکل میں پیش ہوتے رہتے ہیں۔ کینوس بہت وسیع ہے لیکن مصنف کی شخصیت ہر وقت موجود نظر آتی ہے۔ ہم یہ بات بھی فراموش نہیں کر سکتے کہ دنیا کا مرقع خود مصنف کا مرقع ہے اور صرف یہی نہیں ہے نہرو تو مسحور کن سادگی کے ساتھ پُر جوش واقعات کے دوران میں اپنے ذاتی محسوسات سے بھی آگاہ کرنے لگتے ہیں یا اس تنہا پھول کا ذکر کرنے لگتے ہیں جو جیل کے صحن میں کِھلا ہے۔ ایک معنی میں ہر آرٹ تجریدی ہوتا ہے۔ جہاں تک نہرو کی تصنیفات کا تعلق ہے قید خانے کی زندگی کی پابندیاں اکثر ایک ایسے چوکھٹے کا کام کرتی ہیں جس میں رنگا رنگ تصویریں لگی ہوں۔

'تلاشِ ہند' کے مطالعے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں فرد اور دنیا کا یکساں خیال ہے اور ان میں غم ذات کو غم کائنات سے ہم آہنگ کر دینے کی قدرت ہے۔ ان کی یہ تصنیف ہندوستان کی کھوج تو ہے ہی مگر ان کی شخصیت کو آشکار کرتی ہے۔ [illegible]

باہم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہر فرد کی زندگی فی الواقع ایک ایسا نقطۂ ماسکہ ہے جس میں تمام کائنات نظر آتی ہے۔ ایک معمولی انسان کا مشاہدہ غیر شعوری اور کورانہ ہوتا ہے لیکن فن کار کا مشاہدہ تو شعوری ہوتا ہے اور پھر اس کی تمام تخلیقوں کو معنی و مقصد عطا کرتا ہے۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے کہا ہے کہ فن کا کوئی اعلیٰ نمونہ نہ صرف پہلے کے تمام فنی کارناموں سے متاثر ہوتا ہے بلکہ اپنے وجود میں آنے کے بعد سابقہ فن پاروں میں تغیر و تبدّل کا باعث بنتا ہے۔ اس طرح آرٹ کی دنیا میں اس بنیادی قانون کی خلاف ورزی ہو جاتی ہے کہ پہلے سبب ظاہر ہوتا ہے اور پھر نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ کسی قدر غور و خوض کرنے سے معلوم ہوگا کہ ایلیٹ کے بیان کا تضاد صرف ظاہری ہے۔ فنی تخلیق کا وجود انسان کے ذہن میں ہوتا ہے۔ کسی نئے فن پارے کے بارے میں ہمیں جو تجربہ ہوتا ہے اس کا دار و مدار ان تجربات پر ہوتا ہے جن سے ہم گزر چکے ہیں۔ جب ایک بار ہم اس تجربے سے گزر جاتے ہیں تو وہ ہمارے وجود کا ایک حصّہ بن جاتا ہے اور حتّٰی کہ پرانے اقدار سے متعلق ہمارے احساسات کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس لئے کسی نئی فنی تخلیق کا ادراک سابقہ فنی تخلیقوں کے بارے میں ہماری پسند میں تبدیلی لے آتا ہے۔ لہٰذا 'تلاش ہند' میں ہندوستان کی کھوج کے ساتھ ساتھ تجربات کی دل کش دنیا 'جو خود نہرو کی ذات ہے' کا بھی پتہ چلتا ہے۔

بہرحال نہرو کی خود نوشت سوانح عمری ادبی دنیا میں ایک بلند ترین کارنامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سوانح عمری میں بیک وقت غنائی شاعری اور رزمیے کا لطف ملتا ہے۔ اس سے ایک مصنّف اور ایک انسان کی حیثیت سے متعدد خوبیاں مترشح ہوتی ہیں۔ ان کی اپنی زندگی کی کہانی، قوم کی کہانی اور آزادی کے لئے کی گئی اس کی جد و جہد سے ہم آہنگ ہے۔ ان کی سوانح عمری کے ہر صفحے سے خلوص، صاف گوئی اور گرمیٔ جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ واقعات کے انبار سے انھوں نے بڑی اچھی طرح کام لیا ہے اور انسانوں اور مسائل کے بارے میں بڑی صحیح رائے قائم کی ہے۔ اس کے باوجود یہ تصنیف ظرافت اور احساسِ تناسب سے بھری ہوئی ہے۔

ان کی خود نوشت سوانح عمری ہندوستان کی قومی جد و جہد کی داستان کی حیثیت سے اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس معرکہ خیز دور میں جن لوگوں نے ہندوستان کی قسمت بنانے میں حصّہ لیا ہے اس میں سے چند کے کردار کے ہمدردانہ مطالعے کی حیثیت سے غالباً اس کتاب کا کوئی جواب نہیں ہے۔

ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو کا کردار داستان پر کچھ اس طرح چھایا ہوا ہے کہ بیٹے کی خود نوشت سوانح عمری بیک وقت باپ کی سوانح عمری بن گئی ہے۔ طے شدہ مقصد یا کسی شعوری کوشش کے بغیر باپ کی زبردست ذہانت اور دلیری کا موازنہ بیٹے کے جوشیلے پن اور جذباتی خوبی سے ہو گیا ہے۔ جواہر لال نہرو کی نگاہ میں گاندھی جی کا کتنا احترام تھا یہ تمام دنیا کو معلوم ہے۔ لیکن اس سوانح عمری میں انھوں نے مہاتما گاندھی کو بھی خورد بین سے دیکھا ہے۔

انسانی دماغ کا تحقیقی تجزیہ کرنے کی قدرت سے مصنّف میں دروں بینی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر دوسری طرف تاریخ کی وسیع محرکات کے احساس سے خارجی اندازِ فکر کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اس امتزاج کے ساتھ ساتھ جب ہم موسموں کے ردّ و بدل اور رنگ و نور کے تغیرات کے معاملے میں نہرو کی سریع الحسی اور اس چھوٹی سی زندگی کے کھیل میں ان کی بے پناہ خوشی، شام اور صبح کے بدلتے ہوئے انداز کے متعلق ان کے احساسات کا بھی اضافہ کر دیتے ہیں تو ایسی حالت میں اگر کسی شخص کو یہ افسوس ہوتا ہے کہ ایک عظیم سیاسی رہنما کو پا کر ہندوستان ایک ایسے مصنّف سے محروم ہو گیا ہے جو اس سے بھی زیادہ عظیم ہو سکتا تھا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

ہمیں پنڈت نہرو کی تمام تصانیف میں ایک ایسا توازن اور ایک ایسی سنجیدگی ملتی ہے جو ایک سائنسی مزاج کا مابہ الامتیاز ہوتی ہے۔ انھوں نے انسانوں اور ان کے متعلق تمام معاملات کا مطالعہ کرنے میں سائنس کا غیر شخصی اور خارجی انداز اختیار کیا ہے۔ وہ تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنے کی کوشش کرتے تھے اور اسی لئے ان کے نکتہ چیں ان کو ہندوستانی سیاسیات کا "ہیملٹ"

رہتے تھے۔ اس کا ان کی عوامی سرگرمیوں پر جو اثر پڑا اس کے بارے میں سب کو تو نہیں کچھ لوگوں کو البتہ افسوس ہوا مگر کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ جہاں تک ان کی تصنیفات کا تعلق ہے اس کا بے حد فائدہ ہوا۔ وہ بنیادی طور سے سائنسی مزاج کے مالک تھے۔ ان میں تجسس و تلاش کا جذبہ اور ناقدانہ نظر تھی۔ اس میں شاعر کے تخیل اور ایک انسان دوست کی عالی ظرفی کا بھی اضافہ ہو گیا۔

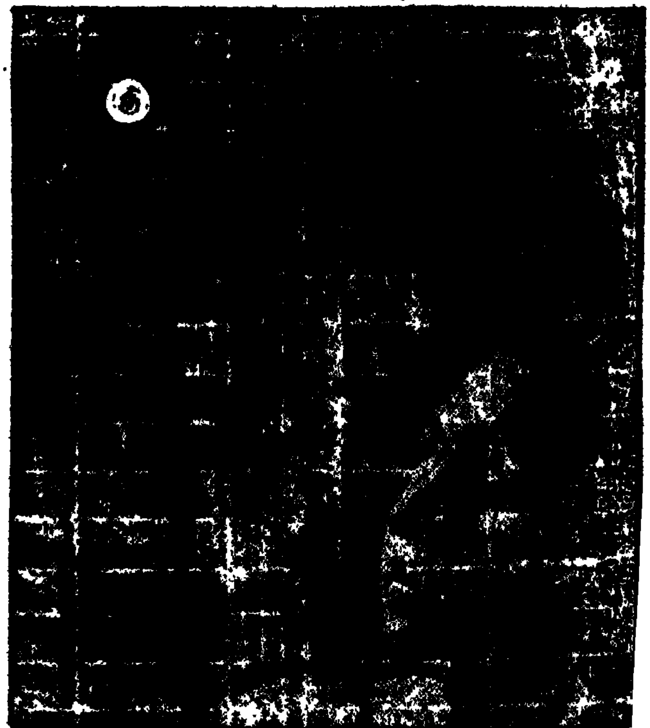
اپنی خود نوشت سوانح عمری کی بدولت نہرو نے دنیائے ادب میں ایک مستقل جگہ حاصل کر لی ہے۔ ان کے دیگر تمام کاموں کے مقابلہ میں یہ کتاب ان کی بھرپور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو کہیں زیادہ اجاگر کرتی ہے۔ ایک فن کار کی طرح ان کے دل میں درد و کرب کا احساس تو موجود ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ غلط کاری کے خلاف ان کے دل میں ایک جنگجو کا سا غیظ و غضب بھی پایا جاتا ہے۔ خود نوشت سوانح عمری میں ان کی شخصیت کے دونوں پہلوؤں کا مکمل اور اطمینان بخش اظہار ملتا ہے۔ پست اور درماندہ لوگوں کے دلوں میں ان کے شعلہ انگیز الفاظ مسرت پیدا کرتے ہیں۔ ان کی آواز تاریکی کو چیرتی ہوئی بد دلی اور مایوسی کے شکار لوگوں کو امید کی کرن دکھاتی ہے۔ وہ نہایت شد و مد کے ساتھ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی معاملے کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے میں ہمیشہ معقول پسندی سے کام لیا جانا چاہیئے اور ان کا یہی وہ وصف ہے جس سے ان کی تصانیف میں معاملہ فہمی اور کشادہ نظری کی خوبیاں موجود ہیں۔

ان کی خود نوشت سوانح عمری سے جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں وہ ان کی دوسری تصنیف "کچھ پرانے خطوط" سے اور بھی زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں۔ یہ کتاب ایسے خطوط کا مجموعہ ہے جو زیادہ تر نہرو کے نام لکھے گئے ہیں۔ چند ایسے ہیں جو انہوں نے لکھے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا جو خط ملتا ہے وہ ۱۹۱۷ء کا لکھا ہوا ہے اور آخری خط ۱۹۴۸ء کا ہے جو ان کے نام ہے۔ ان میں بعض خطوط خالص سیاسی نوعیت کے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن میں فرد و فکر اور ذاتی تاثرات کی آمیزش ہے اور ملک کی سماجی اور معاشی بہتری کے لئے کچھ کرنے کی خواہش کا اظہار ہے۔ یہ کہنا غالباً نا مناسب نہ ہوگا کہ یہ خطوط پچھلے چالیس یا ان سے کچھ زیادہ برسوں کی ہندوستان کی تاریخ کا نچوڑ ہیں۔ ان سے ہمارے اس تصور کی تصدیق ہوتی ہے کہ نہرو عوامی زندگی میں ایک آرٹسٹ تھے۔ اس کے علاوہ ان میں ایک اور بھی پہلو نمایاں ہے جو ان کی خود نوشت سوانح عمری میں زیادہ واضح نہیں تھا۔ بسا اوقات لوگوں نے نہرو کو غلط سمجھا ہے اور اس لئے انھیں جذباتی انسان قرار دیا ہے۔ نہرو جذبات کی رو میں اکثر بہہ جاتے ہیں لیکن ان خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے جذبات کی اس وقتی اور عارضی ہیجان انگیزی کی تہ میں ایک گہرا اور نہ بدلنے والا مقصد بھی چھپا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ ان کی ذاتی دل کشی اور ان کے اندازِ گفتگو کی دل نشینی اور آب و تاب سے مسحور ہو جاتے ہیں مگر ان کی قوت ارادی کتنی زبردست تھی اور وہ اپنے مقاصد پر کتنی مضبوطی سے جمے اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ ان خطوط سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ چالیس سال یا اس سے زیادہ مدت کے دوران نہرو اکثر بلند شخصیتوں کے آگے سر جھکائے نظر آتے ہیں بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار انھیں کا اندازِ فکر اور انھیں کا فلسفۂ زندگی سب پر غالب رہا۔

'کچھ پرانے خطوط' سے نہرو کے کردار کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے جس سے ان کی شخصیت کی دل کشی میں اضافہ تو ضرور ہوتا ہے لیکن جو بعض مرتبہ سیاسی عمل میں کمزوری کا باعث بھی ثابت ہوا ہے۔ جو قدریں انھیں واقعی عزیز تھیں ان پر نہایت صبر و استقلال کے ساتھ عامل رہے لیکن اس کے باوجود ان کے کردار میں ایک حد تک برداشت اور رواداری کا مادہ بھی تھا اور اس کا امکان ہے کہ سرسری نگاہ سے دیکھنے والوں کی نظروں سے یہ پہلو نظر انداز ہو جائے۔ ان خطوط سے اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ وہ کام کرتے تھے ان سے بعض اوقات شدید اختلافات پیدا ہو جاتے تھے مگر ان کی طرف سے کبھی کوئی ایسی بات [illegible] کہ ان اختلافات [illegible]

کو دوست کی حیثیت سے قبول کریں گے۔ وہ اس حد تک اشتراک اور تعاون کے لئے تیار رہتے ہیں جب تک کہ ایسا کرنا ممکن ہے۔ اگر قطع تعلق کی نوبت آ ہی جاتی تو پہل ان کی طرف سے کبھی نہیں ہوتی۔

کچھ پرانے خطوط سے اس بات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ حالانکہ نہرو گاندھی جی کے بڑے مداح تھے پھر بھی ان کا عالمی نقطۂ نظر گاندھی جی کے نظریہ سے بنیادی لحاظ سے مختلف تھا۔ دراصل وہ گاندھی جی کے مقابلہ ٹیگور کے زیادہ قریب تھے۔ زندگی کے بارے میں ٹیگور کا نظریہ بنیادی طور سے جمالیاتی تھا۔ شاید نہرو عوامی زندگی کے بہترین فنکار ہیں۔ ٹیگور نے اپنے جذباتی محسوسات کے ساتھ زبردست تشکیک پسندی کو بھی شامل کر لیا تھا جس کی وجہ سے انھیں موجودہ مغربی زندگی اور ثقافت کو قبول کرنے میں آسانی ہو گئی تھی۔ نہرو نے بھی مغربی اقدار کو قبول کر لیا تھا۔ ٹیگور کا خیال تھا کہ جمالیات اور فن کے ذریعے روح انسانی میں بالیدگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ نہایت آزادی اور شدت کے ساتھ اس غلامی سے بھی نجات چاہتے تھے جس کا امکان مشینوں کے استعمال کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ مستقبل کے ہندوستان کا جو تصور نہرو کے ذہن میں تھا اُس میں وہ ایک ایسا معاشی نظام چاہتے تھے جہاں ہاتھ سے کام کرنے کی مہارت کو مشینوں کے زیادہ سے زیادہ استعمال سے بہار ملے۔ ٹیگور کی طرح نہرو کی ہستی بھی ایک بین الاقوامی ہستی ہے جن کے دل میں ہندوستان کے لئے زیادہ گہری ہمدردی ہے کیونکہ ہندوستان نے بیرونی اثرات کے لئے اپنا دروازہ کبھی بند نہیں کیا۔ بجائے اس کے اس نے تو ہمیشہ اپنے قدیم ساحلوں پر آنے والی نہ جانے کتنی تہذیبوں اور ثقافتوں کو خوش آمدید کہا ہے۔



نجیب دانش

آہ...... ٹھہرو!

پیامِ صبح دے کر ڈوبنے والے آخری تارو — !
وہ شب بیدار جو تم سے بھی پہلے جاگ اٹھتا تھا
ابھی سویا ہے، تھوڑی دیر سو لینے دو، پھر آنا

ہواؤ! اتنی تیزی سے نہ گزرو صحنِ گلشن سے
وہ دانش ور، امیرِ قافلہ تھی فکرِ رسا جس کی
ابھی خوابیدہ ہے، بیدار ہو لینے دو، پھر آنا

زمیں پر خُلد کی تعمیر کے بے باک منصوبو!
وہ انساں جس کی باہوں میں تمھیں آرام ملتا تھا
جہاں سے اٹھ گیا ہے اس پہ رو لینے دو، پھر آنا

اگر آؤ تو پھر نوحے پڑھو اپنی زبانوں میں
تمھارا نام بھی شامل ہے اس کے سوز خوانوں میں

•

رنگین کی حسیں کلکاریو! خاموش ہو جاؤ
وہ آنکھیں مُند گئی ہیں پھول جیسی وہ حسیں آنکھیں
جو تم میں دیکھتی تھیں ایک بہتر نسلِ انساں کو
بشاشت [illegible] گلابوں کے
گماں کا شاخِ گل پر [illegible] ضرورت ہے
[illegible] اپنے جیب و داماں کو
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

تھکی آنکھو! تمہاری دسترس سے دور ہے نہرو
بس اب چھپتے ہوئے سورج کی کرنیں اس کو دیکھیں گی
کہ دن ڈھلتے ہی لے کر چل پڑا ہے اپنی منزل کو

وہ ہاتھ اب دہر کی تزئین کرنے سے گریزاں ہیں
کہ جن کے لمس سے پتھر پگھل کر موم ہوتے تھے
وہ دل گم ہے جو دھڑکاتا تھا ہندوستاں کے دل کو

وہ مشعل بجھ گئی ہے جس کے بے پایاں اجالے میں
جبینِ مادرِ گیتی کی افشاں جگمگاتی تھی
وہ لب چپ ہیں جو چونکاتے تھے سازوں کی سلاسل کو

فرشتے اس کی کومل آتما کو لے کے اٹھتے ہیں
وہ دیکھو آسماں [illegible] کی جانب کو مڑتے ہیں

•

مری دنیا سے آج اک امن کا پیغمبر گم ہے
جہاں ڈھونڈ کر اک چاند ہو پہنچا ہے خلاؤں میں
افق کے ماہ پارو! اس کو اپنی بزم میں ڈھونڈو
زمینو! تم میں ہوگا کوئی منظر جس کی کایا کا
جو حصہ تھا تمہارا، تم میں آ کر مل گیا ہوگا
[illegible] اس کو اپنے حرم میں ڈھونڈو
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

روشنی بجھ گئی

محفلِ ہند ہے وقفِ تیرہ شبی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی
چار سُو ہے بپا شورشِ ماتمی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

ہمہمی ہمہمی فضائیں سیہ پوش ہیں، مچلی مچلی تمنائیں خاموش ہیں
کلفتِ رنج و غم اور بھی بڑھ گئی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

ہو گیا گُل چراغِ سرِ رہگذر، اب کہاں وہ تب و تابِ قلب و نظر
ظلمت آگیں ہوئی پھر شبِ زندگی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

اک دمکتا سا انگارا بجھلا گیا، ایک شعلہ بھڑکتا سا سنولا گیا
اے غمِ بے کسی اے غمِ بے کسی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

وہ ستارا تھا سورج تھا یا چاند تھا، اس کے آگے یہاں ہر کوئی ماند تھا
اب کہاں وہ فروغِ مہ و مشتری روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

اب وہ رقصِ شرر کی نمائش کہاں، اب وہ آب گہر کی تراوش کہاں
اب کہاں مہرِ روشن کی تابندگی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

شمعِ سوزاں تھی یا قمقمۂ برق کا آخری لمحہ تک جو چمکتا رہا
ہر طرف پھر مسلط ہوئی تیرگی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

جس کی ہر ہر ادا غمزۂ دل نشیں، جس کا ہر ہر نفس تھا حیات آفریں
ڈھونڈتی ہے اسے آنکھ ہر ایک کی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

بادۂ ناب مینا میں باقی رہا اور نہ مینا بکف کوئی ساقی رہا
مے کشو اب نہیں لذتِ مے کشی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

قوم روتی ہے فخرِ وطن اُٹھ گیا، پھول کہتے ہیں رشکِ چمن اُٹھ گیا
اب نہیں ہے بہاروں میں وہ دلکشی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

داغ سینے کے جا کر دکھائیں کسے، داستانِ شبِ غم سنائیں کسے
حالِ دل اپنا نجمی نہیں گفتنی روشنی بجھ گئی روشنی بجھ گئی

بشر نواز

صداقت مر نہیں سکتی

ہوائیں چلتے چلتے تھم گئیں گھٹا گیا سورج
بگولے تلملاتے خاک اُڑاتے چار سو نکلے
فضائیں ماتمی چیخوں سے بوجھل ہیں گلستاں میں —
نسیمِ صبح چلتی ہے تو ہوتا ہے گماں جیسے
کئی ناکام روحیں دردِ صحرا میں سسکتی ہیں
وہ غم ہے اشک آنکھوں میں لبوں پر حرفِ ماتم جم کے رہ جائے
رگوں میں دوڑتا خوں لمحہ بھر کو تھم کے رہ جائے
مغنی سر برہنہ اور چاک داماں ہے
کہ تنہا فرد کا نوحہ بھی مانگے ہے لہو دل کا
یہاں اِک قوم کا اِک دور کا نوحہ سنانا ہے
مغنی سر برہنہ ہے
کہاں سے ساز پائے کون سی آواز لے آئے
وہ کیسے اس غمِ جانکاہ کا اظہار کر پائے
گھٹا جاتا ہے دم بڑھنے لگے ہیں رات کے سائے
مگر اِک پیار میں ڈوبی ہوئی آواز کی مشعل
[illegible] ہے

یہ کہتی ہے
محبت کی صدا چاہت کا نغمہ مر نہیں سکتا
وہ نغمہ پھیل جاتا ہے
کبھی خوشبوئے گل بن کر کبھی رنگِ چمن بن کر
کسی گلنار چہرے پر تبسم کی کرن بن کر
کبھی حرفِ وفا بن کر
کبھی بلبلِ وفا بن کر
کسی معصوم کے ہونٹوں پہ پاکیزہ دعا بن کر
وہ نغمہ پھیل جاتا ہے
نئے سورج کی گاتی ناچتی کرنوں کی صورت میں
سمندر کی اُبھرتی ڈوبتی موجوں کی صورت میں
کسی دلبر کسی دلدار کے اشکوں کی صورت میں
محبت کی صدا چاہت کا نغمہ اک صداقت ہے
صداقت مر نہیں سکتی وہ ہر محفل میں جیتی ہے
ہمیشہ دامنِ انسانیت کے چاک سیتی ہے

اخلاص و عقیدت کے پھول

ہدیہ بحضورِ عزت مآب رہنمائے ملک عالیجناب پنڈت جواہر لال نہرو آنجہانی

۱۹ (از حروفِ غیر منقوط) ۶۴ء

منجانب خلوص کیش عبد الرب عرفان ام اے

۱۹۶۴ء

صدرِ شعبۂ فارسی ودربھ مہا ودیالیہ (کالج) امراوتی

۱۹۶۴ء

ہند کے اے رہبرِ ہر دل عزیز ۔ کیوں نہ تیرے غم میں دل ہو داغ داغ
تجھ سے پا کر منزلِ انسانیت مل گیا انساں کو انساں کا سراغ
راہِ ہستی میں ترا ہر نقشِ پا دے رہا ہے ایک منزل کا سراغ
حق یہ ہے حاصل کسی لمحہ نہ تھا فکرِ ملک و قوم سے تجھ کو فراغ
پھر بھی بل آیا نہ ماتھے پر کبھی تیرے قابو میں رہے قلب و دماغ
آہ تیری طبعِ روشن کے بغیر ہو گئی بزمِ سیاست بے چراغ
پا رہے ہیں تیرے کھو جانے کے بعد ہم "تلاشِ ہند" سے تیرا سراغ

کہہ دو یوں عرفان تاریخِ وفات
ہوگیا گل امن کا روشن چراغ

۱۹۶۴ء

تاریخ کی مشعل بجھی

وامق سیتاپوری

زندگی نے سانس بجھے انداز سے کر ڈسی لی
نبضِ فطرت چلتے چلتے بے ارادہ رک گئی
وقت کو ٹھوکر لگی تاریخ کی مشعل بجھی
لڑکھڑا کر رہ گئی ہے جیسے پوری اک صدی

وقت کے کچے گھروندے میں ہمالہ کھو گیا
دیش پہ جا ہے ادھوری اور شوالہ کھو گیا
ایک عظمت چھن گئی ہے اک جیالا کھو گیا
ساحلِ جمنا پہ طوفانوں کا پالا کھو گیا

بن گیا طوفاں کا رہبر مشعلوں کا قافلہ
کتنے ہی معصوم پھولوں کا تبسم لٹ گیا
اک چتا نے آگ اگلی امن کا سورج چھپا
چند شعلے پھڑ پھڑا اٹھے "امر ہے آتما"

کون کہتا ہے جواہر لال نہرو مر گیا
زندگی خوش ہو ترا معیار اونچا کر گیا

سحر عشق آبادی

قطعاتِ تاریخِ وفات

(جواہر لال نہرو)

مُرگ میں جانے کی اِچّھا کا سبب کچھ ہو تو ہو
راگ میں نہرو کے دردِ آدمیت کی ہے لَے
دیش کی نشکام سیوا سے مُکتی ہوتا ہے مُکت
موت بھی مر جائے گی ہو گی امر جیسی مکان شے
اب جواب ان کا ہزاروں سال ہو سکتا نہیں
حکم پہ چلنے کا وعدہ کرتے ہیں، چلتے ہیں کے ؛
قیدِ جنّت میں جواہر لال جا سکتے نہیں
شامل اُس پرماتما میں آتما نہرو کی ہے

(۲۷-مئی) ۱۹۶۴ء

پھر سے آوا گون کے اچھے نیتا ہیں بڑی
جو دل و جاں دیں وطن پر موکش پاتے ہیں وہی
مُرگ کا لالچ نہ رکھتے تھے جواہر لال جی
ایشور کی جوتی میں نہرو کی جوتی مل گئی

(جیٹھ بدی ۶) ۱۸۸۶ شاکھا

ہے آپ کے حق میں آوا گون مصیبت
لیکن میں اب امر ہوں منزل وہ پا گیا ہوں
جو سیل جاں مٹی لائی ہے وہ قضا ہے
میں تیرا بندہ نہرو اسیر غم آ گیا ہوں

(۲۴ محرم) ۱۳۸۴ ہجری

پریم پال اشک

ایک شہنشاہ ایک غلام

(سانیٹ)

پھول کی پتی سے کاٹا تو نے پتھر کا جگر
تجھ کو گھٹی میں ملا گوتم کا لافانی شعور
تیری رگ رگ میں سرایت نانک و چشتی کا نور
تیری ایک ایک بات میں تھی وسعتِ قلب و نظر

زندگی بھر تو نے کھیلے جنگ کے زہریلے ناگ
تو نے شنکر بن کے سب زہرِ ہلاہل پی لیا
کرشن کا سندیش تو نے کُل زمانے کو دیا
عمر بھر تو نے لگائی حرص کی لنکا کو آگ

کر دئے تو نے کھڑے اک صف میں محمود و ایاز
دُور تو نے کر دکھایا امتیازِ خاص و عام
تو اخوت کا شہنشہ تو محبت کا غلام
کون ہے بندہ کسی کا کون ہے بندہ نواز

تو نے دُنیا کو سبق دی ہمیشہ ہر دل نا کام کو
تو نے ہمیشہ میں آ کر کیا گردشِ ایام کو

جواہر لال نہرو کی وصیّت سے اقتباسات

مجھے ہندوستان کی جنتا سے اتنا پیار ملا ہے کہ چاہے جو کچھ بھی کروں وہ اس پیار اور محبت کے چھوٹے سے حصے کا بھی بدلا نہیں ہو سکتا اور بلاشبہ پیار جیسی بیش قیمت چیز کی کوئی قیمت بھی ادا نہیں کی جا سکتی۔ بہت سے ایسے لوگ گزرے ہیں جن کی قدر و منزلت کی گئی۔ کچھ ایسے ہیں جن کے ساتھ نہایت عزت و احترام کا سلوک کیا گیا لیکن میرے حصے میں ہندوستان کے ہر طبقے کے لوگوں کی اس قدر اور بے پایاں محبت آئی کہ میں اس کے بوجھ سے دب گیا ہوں۔ میں صرف اس امید کا اظہار کر سکتا ہوں کہ اپنی زندگی کے بقیہ دنوں میں بھی میں اپنے لوگوں کی توقعات اور ان کے پیار و محبت کے ناقابل ثابت نہیں ہوں گا۔

میں پوری سنجیدگی کے ساتھ یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ میری موت کے بعد میرے لئے کوئی مذہبی رسم ادا نہ کی جائے۔ اس قسم کی رسوم پر میرا عقیدہ نہیں ہے اور محض رسمی طور پر ان کے ادا کئے جانے پر راضی ہونا ریاکاری اور اپنے آپ اور دوسروں کو دھوکا دینے کے مترادف ہوگا۔

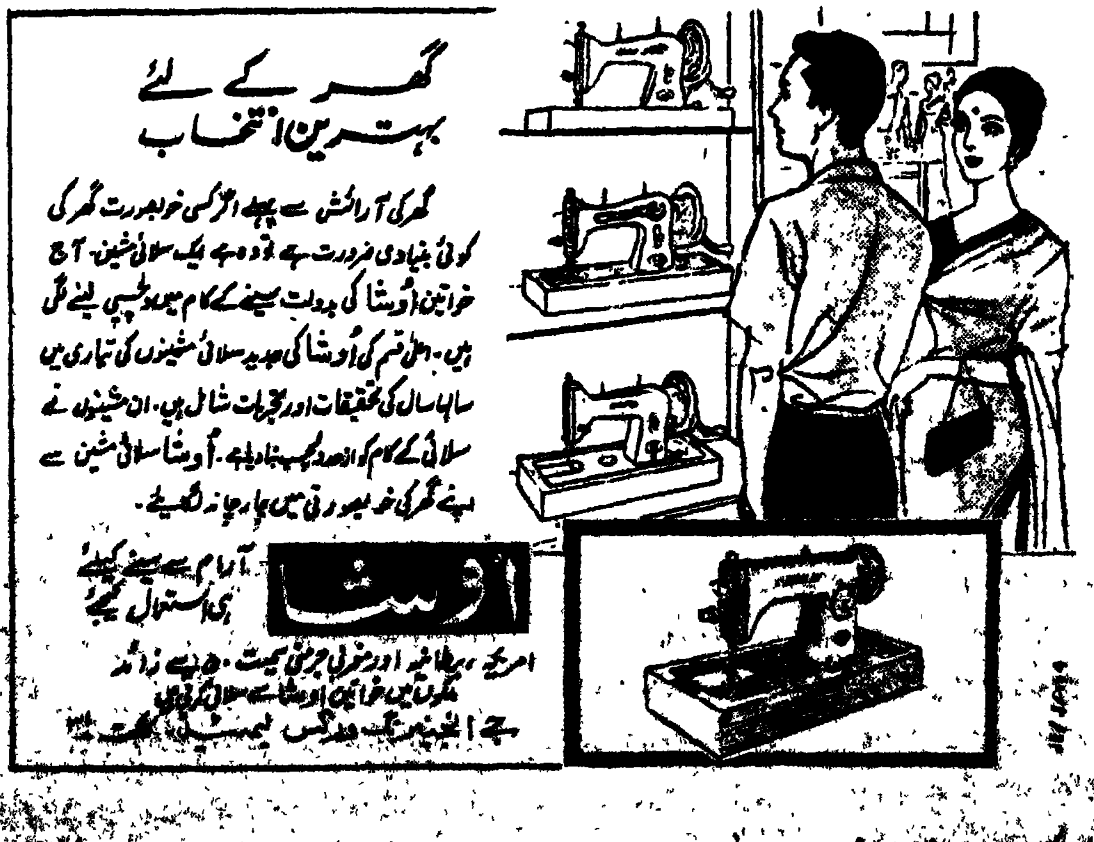
میری خواہش ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری لاش جلا دی جائے۔ اگر میں کسی غیر ملک میں مروں تو میری لاش وہیں جلا دی جائے اور میری خاک الٰہ آباد بھیج دی جائے۔ اس میں سے مٹھی بھر خاک گنگا میں ڈال دی جائے اور اس کا بیشتر حصہ اس طرح ٹھکانے لگایا جائے جیسا کہ میں نے نیچے لکھا ہے۔ میری استھیوں کا کوئی حصہ ہرگز بچایا یا محفوظ نہ رکھا جائے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میری اس خواہش کے پیچھے کوئی مذہبی جذبہ نہیں ہے کہ میری مٹھی بھر خاک الٰہ آباد میں گنگا میں بہا دی جائے۔ بچپن سے ہی مجھے الٰہ آباد میں گنگا اور جمنا سے لگاؤ رہا ہے اور جیسے جیسے میں بڑھتا گیا یہ لگاؤ بھی بڑھتا گیا۔ جیسے جیسے موسم بدلتا ہے میں نے ان ندیوں کے بدلتے ہوئے مزاج کو دیکھا ہے اور میں اکثر اس تاریخ، دیو مالا، روایت، گیت اور کہانی کے بارے میں سوچا ہے جو اس سے زمانۂ قدیم سے وابستہ چلی آ رہی ہے اور اس کے بہتے ہوئے پانی کا حصہ بن گئی ہے۔

خاص طور سے گنگا ہندوستان کی ندی ہے۔ اس کے گرد اس ملک کی تہذیبی یادیں، اس کی امیدیں اور اندیشے، فتح مندیوں کے گیت اور اس کی ہار اور جیت کا تانا بانا بنا ہوا ہے۔ وہ ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب اور تمدن کی علامت ہے۔ سدا بدلتی اور ہمیشہ بہتی پھر وہی گنگا کی گنگا رہتی ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں اور گہری گھاٹیوں کا خیال آتا ہے جن سے مجھے بے حد محبت ہے۔ مجھے اس کے نیچے کے وہ وسیع اور زرخیز میدان یاد آ جاتے ہیں جہاں میری زندگی اور عمل کی راہیں متعین ہوئی ہیں۔ صبح کی روشنی میں مسکراتی و ناچتی اور شام کے پھیلے ہوئے سائے میں تاریک، اداس اور پُراسرار بنی ہوئی اور جاڑے میں دامن سمیٹے آہستہ خرامی اور دلیری کے ساتھ بہتی ہوئی اور برسات میں سینہ پھلائے ہوئے گرجتی، دھاڑتی یعنی سمندر بنی ہوئی اور اسی کی طرح تباہ کر دینے والی طاقت کا مظاہرہ کرتی ہوئی یہی گنگا میرے لئے ہندوستان کی ماضی کی علامت اور اس کی یاد ہے۔ یہ ماضی سے بہتی ہوئی زمانۂ حال میں آئی ہے اور مستقبل کے عظیم

سمندر کی طرف بہتی چلی جا رہی ہے۔ اگرچہ میں نے بہت سی قدیم رسموں اور روایتوں کو ترک کر دیا ہے اور مجھے اس کی بڑی فکر ہے کہ ہندوستان ان تمام بندھنوں سے نجات پا جائے جو اسے جکڑے اور دبائے ہوئے، اور اس کے عوام میں پھوٹ پیدا کئے ہوئے اور ان کی بڑی تعداد کو کچلے ہوئے ہیں اور ان کے جسم و روح کی ترقی میں حائل ہیں۔ گو کہ میں یہ سب کچھ چاہتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں اپنے آپ کو اس ماضی سے بالکل منقطع کرنا نہیں چاہتا۔ ہندوستان کا جو قدیم ورثہ رہا ہے اور جو اب بھی ہمارا ہے، میں اس پر فخر کرتا ہوں اور مجھے اس کا احساس ہے کہ میں بھی اپنے تمام دوسرے ہم وطنوں کی طرح اس سلسلۂ زنجیر کی ایک کڑی ہوں جس کا سرا ہندوستان کی قدیم ترین تاریخ تک پہنچا ہے۔ میں اس زنجیر کو توڑنا نہیں چاہتا کیونکہ میں اس کی قدر کرتا ہوں اور اس سے جوش اور حوصلہ حاصل کرتا ہوں۔ اپنی اس خواہش اور ہندوستان کے تہذیبی ورثے کو اپنا آخری خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ مٹھی بھر میری خاک الہ آباد کے پاس گنگا میں ڈال دی جائے تاکہ وہ بہہ کر اس مہان ساگر میں جا گرے جو ہندوستان کے کنارے سے ٹکرا رہا ہے۔

میری خاک کے بیشتر حصے کو دوسرے ڈھنگ سے ٹھکانے لگایا جائے۔ اسے ہوائی جہاز میں رکھ کر کافی اونچائی پر لے جایا جائے اور وہاں سے ان کھیتوں میں بکھیر دیا جائے جہاں ہندوستان کا کسان اپنا پسینہ بہاتا ہے تاکہ میری راکھ ہندوستان کی مٹی اور خاک میں اس طرح مل جائے کہ پہچانی نہ جا سکے۔



خراجِ عقیدت

میرے پاس آج بولنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ دنیا نے انسانیت کا ایک پرستار کھویا ہے اور اپنے دیس کی جنتا نے وشانی قائد۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ غم کرنے کا موقع نہیں ہے۔ اس وقت ہم سب کو ہمت رکھنی چاہیئے۔ آپس میں اتحاد، محبت، الفت اور شفقت بڑھانی چاہیئے......

—— ونوبا —— بھودان تحریک ——

ہر کام کے کرنے والے کو قدردان کی تلاش رہتی ہے اور پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنی قوم پر جو احسانات کئے ان میں سے ایک نمایاں احسان یہ ہے کہ انھوں نے اپنی قدرشناسی کی بدولت ہزاروں لاکھوں کی ہمت بڑھائی اور ملک میں اس یقین کو عام کر دیا کہ اس کا جوہر شناس رہنما ہر کمال کی پوری اور سچی قدر کر سکتا ہے۔ اس سے کیا کیا شوق اور ولولے پیدا ہوئے یہ ان گمنام یا غیر معروف لوگوں سے پوچھئے جن کو ملول کو جواہرلال کے حیات آفریں تبسم نے نئی زندگی عطا کی.....

—— محمد مجیب —— کتاب نما، دہلی ——

وہ آزاد ہندوستان ہی کے بانی اور اس کے معمار نہ تھے بلکہ پورے ایشیا کی آبرو اور دنیا کی عظیم شخصیتوں میں سے تھے۔ انھوں نے نصف صدی تک ہندوستان کی مسلسل اور ان تھک خدمت کی۔ وہ جنگِ آزادی کے سپہ سالار بھی تھے اور آزاد ہندوستان کے معمار بھی..

—— شاہ معین الدین احمد ندوی —— معارف ——

..... شروع ہی سے زندگی پاکیزہ، سنجیدہ، شریفانہ رہی۔ اور ظرف بڑا ہی عالی رہا۔ پڑھنے لکھنے میں برق، علمی بلندیوں کے شیدا ملک کی آزادی اور وطن کی خدمت ہی کو شروع سے اپنا مقصودِ زندگی بنا لیا اور اس لگن کو آخر تک نباہ دیا۔ نہ دنیا کا لالچ کیا، نہ مال و جاہ کی محبت کو سینے میں جگہ دی۔ نہ اپنے کو بڑا مانا نہ کسی پر اپنا تفوق جتایا۔ خدمت لینے کی نہیں، خدمت کرنے کی دھن سوار رہی.....

—— عبدالماجد دریا بادی —— صدق جدید ——

سب سے پہلے تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس خیال سے میرا دل بیٹھا جا رہا ہے کہ میرے محبوب دوست پنڈت جواہرلال اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں، اور میں بدبخت، ابھی تک جی رہا ہوں شاد عظیم آبادی کا یہ شعر میرے دل کا خون کئے دیتا ہے کہ:۔

پس از معشوق، جینا، عشق کو بدنام کرتا ہے
خدا مجنوں کو بخشے مر گیا، اور ہم کو مرنا ہے

پنڈت جی کو میں اس وقت سے جانتا تھا جب کہ میری مسیں بھیگ رہی تھیں، اور انھوں نے سیاست کے میدان میں پہلا قدم رکھا تھا۔

ان کی شخصیت میں اس قدر جاذبیت و محبوبیت اور ان کے تبسم میں اس بلا کی دلکشی تھی کہ جب ان کی جانب نظر اٹھاتا تھا تو مجھ کو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا جیتا جاگتا اور ہنستا بولتا تاج محل سانس لے رہا ہے۔

پنڈت جی، آپ چلے گئے، اب ہیں بھی آپ کے پاس بہت
جلد آنا ہے، میرا انتظار کیجئے، کیا، اے یار رفتہ، آیا

— جوش ملیح آبادی —

..... پنڈت نہرو واقعی ایک عظیم سیاست دان تھے۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ وہ ان معمر سیاست دانوں کے عمر و تجربہ کے لحاظ سے سرخیل تھے جو پچھلی نصف صدی میں ایشیائی قوموں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتے رہے .....

.... اب اس مرتبہ اور اس صف کا کوئی راہنما نہیں رہا وہ بیک وقت کئی تصویروں کا مرقع تھے۔ وہ وزارت عظمیٰ کے لئے وجہ افتخار تھے۔ ان کے قلم کا سکہ چلتا تھا۔ انگریزی کے انشاپرداز کی حیثیت سے یورپ کے نامور اہل قلم بھی ان کا اعتراف کرتے تھے ...

— شورش کاشمیری — چٹان لاہور، پاکستان —

ہزار رنگ ملے، اک سبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گل کا غبار، مشت بہار
ہوا ہے، وادیٔ جنت نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے بہت دور جستجو بن کر

— مخدوم — حیدرآباد

وہ چاند چھپا جس چاند سے روشن بھارت تیرا امبر تھا
وہ پھول جھڑا جس پھول سے مہکا آنگن آنگن گھر گھر تھا
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

— [illegible] —

مرے وطن کی زمیں کے اداس آنچل میں
نہ آج رنگ نہ خوشبو، بھری ہوئی ہے دھول
خبر نہیں ہے کہ کس دل جلے کی راکھ ہے یہ
کہ سر جھکا کے پہاڑوں نے بھی کیا ہے قبول
سنا ہے جس کی چتا سے یہ خاک آئی ہے
وہ فصل گل کا پیمبر تھا، عہد نو کا رسول
اُسے خبر تھی خزاں کس چمن میں سوتی ہے
وہ جانتا تھا کہ کیا ہے بہار کا معمول
سکھایا کشمکش جنگ و امن میں اس نے
جراحتوں کو چمن بندیٔ جہاں کا اصول
اُنھیں دلوں میں محبت کی کیاریاں لہرائیں
اُگے ہوئے تھے جہاں صرف نفرتوں کے ببول
جو آج موت کے دامن میں اک ستارہ ہے
وہ زندگی کے گریباں میں تھا گلاب کا پھول

— سردار جعفری —

پھول رنجیدہ، صبا غمگیں، چمن افسردہ ہے
آج تاباںؔ انجمن کی انجمن افسردہ ہے
ایک دیوانہ تھا وہ بھی اپنے رستے چل دیا
سوگ میں ڈوبا ہے صحرا اور ویرانہ افسردہ ہے

— غلام ربانی تاباں — جامعہ —

.... نہرو اب اس دنیا میں نہیں ہیں، ذہن اس امر کو تسلیم نہیں کرتا۔ ٹھیک ہے کہ وہ کافی عرصہ سے بیمار چلے آرہے تھے اور ان کی صحت سے تشویش پیدا ہو رہی تھی لیکن ان کی موت پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا [illegible]

— [illegible] —

جواہرلال نہرو جی کا سعودی عرب میں رسول السلام کہہ کر استقبال کیا گیا تھا اس دنیا کو امن کا پیغام سناتے سناتے آخر ابدی نیند سو گئے۔ ہندوستانی قوم کہتی ہے کہ ہمارا انمول جواہر کھو گیا لیکن دنیا کی دوسری قوموں اور ان کے لیڈروں میں بھی محرومی کا اسی قدر شدید احساس پایا جاتا ہے۔ ساری دنیا ان کے غم میں سوگوار ہے....

— عشرت علی صدیقی — قومی آواز لکھنؤ —

ملک اپنے سب سے بڑے دوست سے محروم ہو گیا۔ قوم کے سچے غمخوار اور شفیق کا سایہ اس کے سر سے اُٹھ گیا۔ ایشیا اور افریقہ ایک انقلابی لیڈر سے تہی دامن ہو گئے۔ دنیا ایک ایسے گوہر تابدار بلکہ سورج سے محروم ہو گئی جو مایوسی اور تاریکی میں اس کی ہمت بندھایا کرتا تھا اور اسے امن و امان اور عالمی بھائی چارے کا پیغام سکون افزا دیا کرتا تھا۔

وہ اس صدی میں ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی عظیم ترین شخصیت تھے۔ اپنے ملک اور دنیا کو بہت کم لوگوں نے اتنا متاثر کیا جتنا انھوں نے کیا.... ہند — کلکتہ

نہرو کے عظیم نظریات ہر دور میں ہماری رہنمائی کر سکیں گے....

— انقلاب - بمبئی —

.... جواہرلال نہرو جیسی شخصیتیں کسی ملک میں تو کیا پوری دنیا میں کم ہی پیدا ہوا کرتی ہیں۔ ان کا اُٹھ جانا صرف ہندوستان کا نہیں پوری ترقی پسند دنیا کا نقصان ہے....

— اجمل — بمبئی —

ہندوستان کی تاریخ میں یوں تو کئی عظیم الشان شخصیتوں کے نام آتے ہیں لیکن جواہرلال نہرو کا کوئی بدل نہیں اور کوئی مقابلہ نہیں۔ جواہرلال نہرو نے اپنے فکر و عمل سے ہندوستان اور ایشیا کی تحریک آزادی کی رہنمائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ جواہرلال نہرو ہندوستان اور ساری دنیا کے ایک عظیم قائد تھے۔ ہندوستان کی یہ یقیناً بدقسمتی ہے کہ آج ہمارا ایک ایسا قائد اُٹھ گیا ہے کہ جس نے دنیا میں نئے ہندوستان کو ایک مقام دیا تھا....

سیاست — حیدرآباد —



With its fabulous gardens, lakes, glaciers and magnificent falls, Kashmir offers you a variety of entertainment and that too at a moderate cost.

Visit Kashmir and return home loaded with fresh energy.

For travel particulars and advice consult Jammu and Kashmir Government Tourist Offices at Manekji Wadia Building, 129-Mahatma Gandhi Road, Fort, Bombay-1, 88-Janpath, New Delhi and Railway Station Pathankot.

Issued by

Director of Tourism,
Jammu & Kashmir Government,
Srinagar.



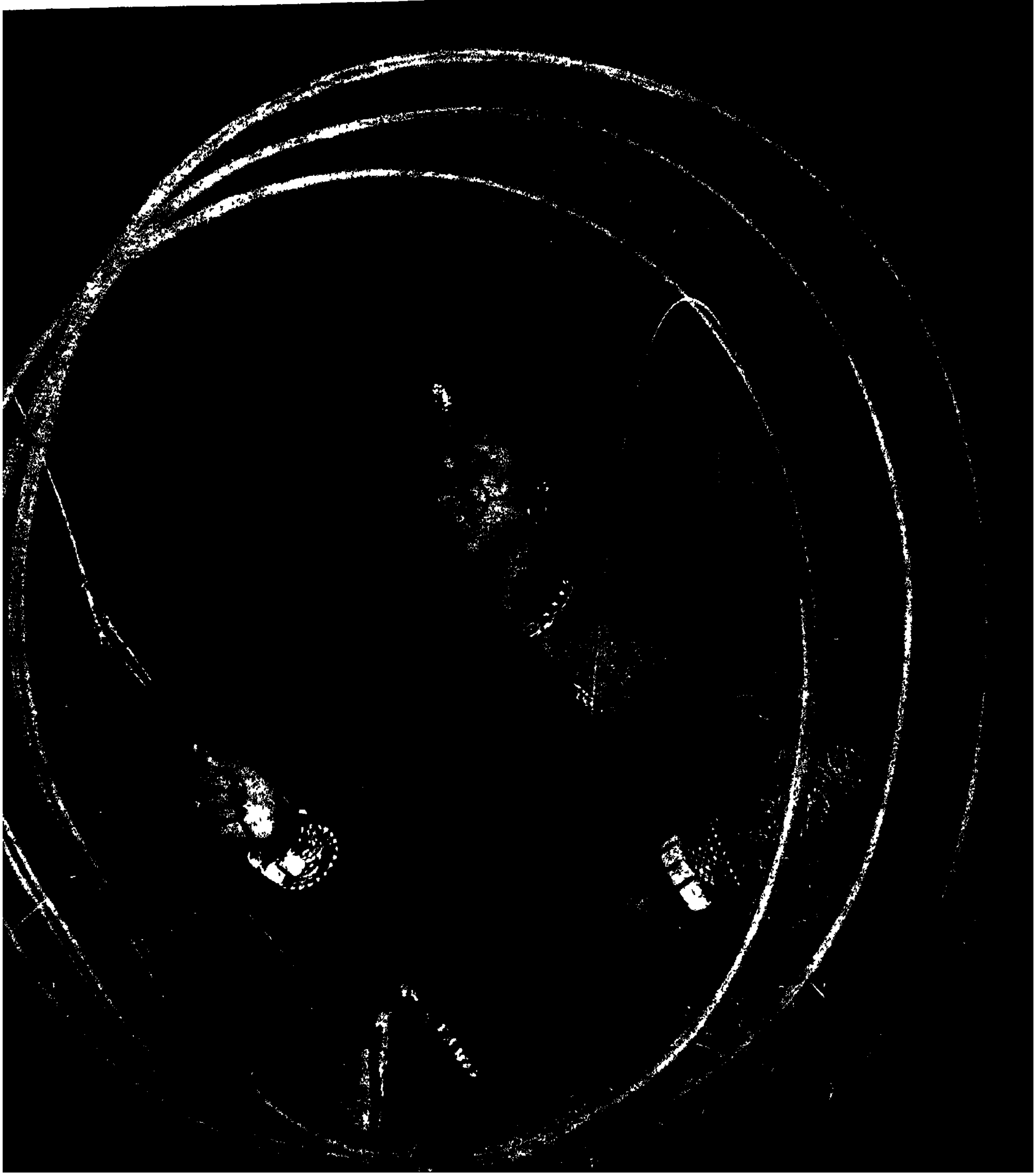
Edited & published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
Printed by Union Printers Co-op. Industrial Society Ltd., Karol Bagh, New Delhi-5

Regd. No. D-509

آجکل

رہائن شک سمت ۱۸۸۶

دسمبر سنہ ۱۹۶۴ء





ہندوستان کی ہاکی ٹیم جو ٹوکیو کے اولمپک ہاکی میچوں میں حصہ لینے کے لئے چنی گئی تھی۔
اس ٹیم نے ہاکی کی عالمی چیمپئن شپ جیت کر سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ کھلاڑیوں کے نام یہ ہیں: -

پہلی قطار (بائیں سے دائیں) چرنجیت سنگھ (کپتان)، ہری پال (وائس کپتان)
دوسری قطار (" " ") دھرم سنگھ، جگجیت سنگھ، گوربخش سنگھ، جوگندر سنگھ اور ہربند ر سنگھ
تیسری قطار (" " ") درشن سنگھ، پرتھی پال سنگھ، اودھم سنگھ، علی سعید اور مہندر پال

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل
دہلی

ترتیب

سرورق :- آئی ولپانی

جلد ۲۳ - نمبر ۵

اگرہائن شک سمت ۱۸۸۶

دسمبر ۱۹۶۴ء

5/1/65

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- شہباز حسین

سالانہ چندہ :-
- ہندوستان میں :- سات روپے
- پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
- غیر ممالک سے :- ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ :-
- ہندوستان میں :- ۶۰ پیسے
- پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
- غیر ممالک سے :- ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو، اولڈ سیکرٹریٹ، دہلی

مرتبہ و شائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ، حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱، دہلی

ملاحظات

ماہ دسمبر کے شروع میں بمبئی میں رومن کیتھولک عیسائیوں کی ایک عالمی کانفرنس دیوکرسٹک کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ اس میں پوپ پال ششم بہ نفس نفیس شامل ہو رہے ہیں۔ عیسائی قوم ہندوستان کی ایک اہم اقلیت ہے اور حب الوطنی میں وہ کسی سے کم نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ دنیا بھر کے رومن کیتھولک عیسائیوں کا یہ نمائندہ اجتماع کامیاب ہوگا اور اس سے ہندوستان کی یکجہتی کو تقویت ملے گی۔

عیسائی مذہب صلح و آشتی کا پیغامبر رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ تقدس مآب پوپ کی قیادت میں یہ کانفرنس دنیا میں بقائے امن کے مسئلے کو حل کرنے میں مدد و معاون ہوگی۔ ہندوستان میں پوپ کا پہلی بار تشریف لانا ایک بہت ہی قابل ذکر واقعہ ہے۔

چین جہاں اپنی جارحیت کے اقدامات کو کسی طرح ڈھیلا نہیں کرتا اسی طرح وہ امن عالم کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس کا تازہ ثبوت ایٹم بم کی تیاری ہے۔ حال ہی میں سنکیانگ میں چین نے پہلا جوہری تجربہ کیا۔ دنیا کے مختلف ملکوں کی تجربہ گاہوں نے ایٹمی بم پھٹنے کے اثرات محسوس کئے۔ ہندوستان ہمیشہ اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ جوہری توانائی کو ابن آدم کی بہبود کے لئے استعمال کرنا چاہیئے نہ کہ اس کی ہلاکت کے لئے۔ اس وقت جبکہ اس بات پر غور کیا جا رہا ہے کہ نہ صرف ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال ہی ممنوع قرار دیا جائے بلکہ اس قسم کے تمام مہلک ہتھیاروں کو تباہ کر دیا جائے، چین کا ایٹم بم تیار کرنا ایک ایسی حرکت ہے جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان جب یہ دیکھتا ہے کہ اس کی سرحدوں پر چین اپنی لاتعداد فوجیں جمع کر رہا ہے اور ادھر ایٹم بم تیار کر چکا ہے تو لازماً اسے اپنے تحفظ کی زیادہ فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ اپنے اصول سے ادھر ادھر نہ ہوتے ہوئے بھی ہمیں یہ لازم ہے کہ ہم خبردار رہیں اور تحفظ کے سلسلے میں اپنی سرگرمیوں کو تیز سے تیز تر کریں۔

یہ خبر کتنی مسرت انگیز تھی کہ ٹوکیو میں ہونے والے اولمپک کھیلوں میں ہندوستان کی ہاکی ٹیم نے سونے کا تمغہ حاصل کیا اور دنیا میں پہلے درجے کی ٹیم قرار پائی۔ یہ امتیاز تو ہندوستان کو ۱۹۲۸ء سے حاصل تھا لیکن چار سال پہلے ہندوستانی ٹیم روم میں پاکستان کی ٹیم سے ہار گئی تھی۔ اب بھی آخری مقابلہ ہندوستان اور پاکستان کی ٹیموں کے درمیان ہی تھا۔ یہ بات اور بھی قابل مسرت ہے کہ پہلی دونوں ٹیمیں برصغیر ہند کی ہیں۔

دکن میں اردو کے مصنف اور حیدرآباد کے مشہور ادیب نصیر الدین ہاشمی صاحب حیدرآباد میں انتقال فرما گئے۔ جناب عبدالمجید حیرت شملوی کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم بڑے اچھے غزل گو تھے۔ ادارہ مرحومین کے لواحقین سے اظہار ہمدردی کرتا ہے۔

مقام مسرت ہے کہ ہندوستان کی کرکٹ ٹیم آسٹریلیا کے ساتھ تین ٹیسٹ میچوں کے سلسلے میں برابر رہی۔ کلکتے کا میچ ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر ختم ہو گیا۔ بمبئی کا میچ ہندوستانی ٹیم نے جیتا اور مدراس کا آسٹریلیا کی ٹیم نے۔

ڈاکٹر نگیندر

تحقیق و تنقید

ڈاکٹر نگیندر دلی یونی ورسٹی کے شعبۂ ہندی کے صدر اور ہندی کے مشہور نقاد ہیں۔ ان کے مضمون کا یہ اردو ترجمہ قارئین کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگا ۔

اختلاف مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے تحقیق کی دو قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں ۔ سوپادھی یعنی وہ جو سند (ڈگری) حاصل کرنے کے لئے کی جائے اور نر اپادھی یعنی وہ جس کا ڈگری حاصل کرنے سے کوئی تعلق نہ ہو۔ درحقیقت یہ بالکل موٹی تقسیم ہے۔ تحقیق کے مقصد، عمل اور حاصل کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ یعنی ڈگری تو محض ایک ضمنی اور پیشہ ورانہ کامیابی ہے۔ اس سے تحقیق میں غرض مندی آجاتی ہے۔ لیکن چونکہ ہم میں سے اکثر غرض کے بندے ہیں ۔ اس طرح کی تحقیق کا بھی ہمارے لئے ایک خاص مقام ہے۔ یہاں ہم اس طرح کی تحقیق سے بحث کریں گے۔ اس طرح کی تحقیق کے لئے عام طور سے مندرجہ ذیل ضابطے متعین کئے گئے ہیں :۔

۱۔ اس میں نامعلوم حقائق کی کھوج یا معلوم حقائق یا اصولوں کا نئے انداز سے تجزیہ ہونا چاہیئے۔ ہر حالت میں اس کتاب سے یہ بات ظاہر ہونی چاہیئے کہ تحقیق کرنے والے میں تنقیدی نقطۂ نگاہ سے پرکھنے اور ہر گر فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہے۔ امیدوار کو یہ بھی واضح کرنا چاہیئے کہ اس کی تحقیق کس حد تک اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے اور وہ اس خاص موضوع کے مطالعہ کو کہاں تک آگے بڑھا سکا ہے۔

۲۔ اسلوب بیان وغیرہ کے لحاظ سے اس کی شکل و وضع تسلی بخش ہونی چاہیئے تاکہ اسے جنسبہ شائع کیا جاسکے۔ (آگرہ یونی ورسٹی کے پی۔ ایچ۔ ڈی سے متعلق قوانین صفحہ ۴) آگے چل ڈاکٹر آف لیٹرز کے سلسلہ میں عام طور سے ان ہی خصوصیات کا ذ[کر] کیا گیا ہے۔ صرف ایک بات نئی ہے۔ وہاں موضوع کے مطالعہ "آگے بڑھانے" کی بجائے "علم کی حدود کی توسیع" کا مطالبہ کیا گیا. ڈی۔ لٹ کی ڈگری کی عظمت کو دیکھتے ہوئے یہ مناسب بھی ہے دوسری یونیورسٹیوں کے قوانین میں بھی لگ بھگ یہی الفاظ [ہیں] ہیں۔ اسی طرح یونی ورسٹی قوانین کے مطابق تحقیق میں تین عنا[صر] ہونے چاہئیں :۔

۱۔ نامعلوم حقائق کی کھوج

۲۔ معلوم حقائق یا اصولوں کو دوبارہ پیش کرنا

۳۔ علم کی حدود کی توسیع یعنی جدّت

۴۔ اس کے علاوہ ایک اور عنصر بھی ہونا چاہیئے۔ یہ ۔ اچھا اسلوب بیان ۔

تحقیق کے ان چار عناصر میں سے جدّت اور اسلوب بیا[ن] کو حسن کی اہمیت تو ادب کی تقریباً تمام اصناف میں ایک سی ہے۔ لیکن نئے حقائق کی کھوج اور معلوم حقائق یا اصولوں کو نئے اندا[ز] سے پیش کرنا ۔ یہ دو باتیں تحقیق کی اپنی خصوصیات ہیں۔ یونیورسٹی کے قوانین میں ان میں سے ایک کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اسی [کے] متعلقہ دفعہ میں 'یا' لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ نئے حقائق کی کھوج تو ٹھیک ہے لیکن معلوم حقائق یا اصولوں کی

بیان کو تحقیق کیوں مانا جائے۔ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ محض بیان کرنا ہی تحقیق نہیں ہے۔ ان کو نئے انداز سے بیان کرنا تحقیق ہے۔ "نیا پن" ہی یہاں بھی ثبوت ہے۔ حقائق کے بیان کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ان سے باہمی رشتہ کی نقاب کشائی کی جائے۔ حقیقت اپنی خارجی شکل میں غیر متحرک ہوتی ہے۔ لیکن انسانی زندگی کے تعلق سے یعنی شعور انسانی کی آمیزش سے وہ متحرک بن جاتی ہے۔ شعور انسانی کی آمیزش سے اس میں نئے مفہوم کی جو بجلی کوند جاتی ہے اس کو 'کنایہ' کہا گیا ہے۔ دراصل حقائق کے بیان کا مفہوم اسی کنایہ کو واضح یا مشرح شکل میں پیش کرنا ہے۔ اگرچہ کنایہ کی ماہیت لفظی معنوں کے تابع ہونے کی بنا پر محدود ہوتی ہے لیکن ان حدود کے اندر بھی معنی کے نازک اور لطیف فرق کے امکانات چھپے رہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے حقائق کی نئی تشریح کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے اور اس لئے تحقیق کے لئے پوری گنجائش رہتی ہے۔ اس لحاظ سے حقائق کی نئی تشریح کرنا یا ان کو دوبارہ بیان کرنا تحقیق میں شامل ہے۔

آپ لوگوں کی سہولت کے لئے میں اختصار میں حقائق کی کھوج اور حقائق کے بیان کے فرق کو واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ صداقت کی ہر شکل کے ساتھ بہت سے حقائق جڑے ہوتے ہیں۔ صداقت کی اس خاص شکل کو واضح کرنے کے لئے ان بنیادی حقائق تک رسائی حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس میں سے کچھ حقائق تو ظاہر رہتے ہیں لیکن بہت سے اکثر پوشیدہ ہوتے ہیں یا وقت کے پردے سے ڈھکے ہوتے ہیں اور ان کی کھوج ضروری ہو جاتی ہے۔ عام طور پر حقائق کی کھوج کا تعلق زمانہ سے مان لیا گیا ہے اور اس خیال نے جڑ پکڑ لی ہے کہ حقائق کی کھوج قدیم موضوعات کی تحقیق کے سلسلہ میں ہی ممکن ہے۔ عام طور پر قابلِ تسلیم ہوتے ہوئے بھی یہ ضروری نہیں ہے کیونکہ ہر موضوع میں بہت سے پوشیدہ حقائق بھی تو ہوتے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عام طور سے حقائق کی کھوج کی دو صورتیں ہیں (۱) ان حقائق کی کھوج جو رفتارِ زمانہ کے دست بردِ کا شکار ہو چکے ہیں (۲) موضوع سے متعلق مخفی حقائق کی کھوج۔ مثال کے طور پر تلسی کے عہد کے حالات، ان کی زندگی کے واقعات ان کی تخلیقات، ان کی تخلیقات کے مختلف نسخے، ان کی تخلیقات سے متعلق حالات وغیرہ تلسی سے متعلق تحقیق کا خارجی مواد ہیں جن کا تعلق زمانہ سے ہے یعنی جنھیں وقت کی تہوں کو چیر کر نکالنا پڑتا ہے ان کے علاوہ تلسی کی شاعری میں چھپے ہوئے مختلف اندرونی حقائق ہیں۔ جیسے تلسی کے اقوال فلسفیانہ خیالات، اخلاقی نظریات، زبان و بیان کے عناصر، ذخیرۂ الفاظ وغیرہ جو اندرونی تحقیق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں حقائق کی کھوج ہوتی ہے اور چونکہ قدیم اور جدید دونوں ادب کی تحقیق میں دونوں ہی طریقے کم و بیش کام میں لائے جاتے ہیں۔ اس لئے حقائق کی کھوج کو قدیم ادب تک محدود کر دینا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میتھلی شرن گپت یا پرساد کی زندگی کو جاننے کے لئے "عہدِ قدیم کے شاہی فرمان' مخطوطات، پتھر کے کتبوں وغیرہ کی چھان بین کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی تحقیقات کے مختلف نسخوں کا تقابلی مطالعہ بالکل غیر ضروری ہے۔ ان کے عہد کے حالات سے واقف ہونے کے لئے بھی گہری چھان بین کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی ایسے حقائق رہ جاتے ہیں جن کی تحقیق میں اتنی ہی کوشش کرنی پڑے گی جتنی تلسی کی شاعری سے متعلق حقائق کی چھان بین میں کرنی پڑ سکتی ہے۔ یہاں تک تو میں نے حقائق کی تحقیق کے متعلق بحث کی ہے۔ اب حقائق کے بیان کو لیجئے۔ مندرجہ بالا تمام باتیں خواہ وہ خارجی ہوں یا داخلی، محض بنیاد کا کام دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر قدیم شاہی فرمانوں میں تلسی کا جو ذکر ملتا ہے اس کی حیثیت محض بنیاد کی ہے۔ اصل چیز تو تلسی کی زندگی کے حالات ہیں جو ان میں ملتے ہیں۔ اس طرح شاہی فرمانوں میں تلسی سے متعلق جو مواد ہے اور اس سے تلسی کی زندگی کے جن حالات پر روشنی پڑتی ہے ان کو واضح شکل میں پیش کرنا ان حقائق کا بیان یا تجزیہ ہے۔ حقائق کا اظہار کئی صورتوں میں ہو سکتا ہے اور اسی لحاظ سے ان کے بیان میں نیا پن ہو سکتا ہے حقائق کی کھوج کی یقیناً موٹی قسم ہے۔ اس کے بعد تلسی کی زندگی کے واقعات خود مواد بن جاتے ہیں اور تلسی کی جو شخصیت ان سے ظاہر ہوتی ہے اس کی خامیوں اور خوبیوں پر محقق روشنی ڈالتا ہے یہ حقائق کی تحقیق کی دوسری منزل ہے۔ آگے چل کر شخصیت کی یہ خوبیاں اور

خامیاں خود مواد بن جاتی ہیں اور محقق ان کے سہارے تلسی کی ذہنی سطح تک پہونچنے کی کوشش کرتا ہے ۔ یہ خارجی حقائق کے بیان کا عمل ہے ۔ داخلی حقائق کے بیان میں تلسی کی شاعری کو مرکزی حیثیت دی جاتی ہے ۔ اس میں تلسی کی تخلیقات کا سلسلہ متعین کیا جاتا ہے، ان کے فلسفیانہ اور اخلاقی نظریات، زبان و بیان کے عناصر، ذخیرہ الفاظ وغیرہ کا تجزیہ کیا جاتا ہے ۔ یہ سب بھی دراصل حقائق کی تحقیق کے تحت ہی آئے گا ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ حقائق خارجی نہیں بلکہ داخلی ہیں ۔ لیکن یہ ہیں حقائق ہی ۔ ان کا بیان بھی اتنا ہی ضروری ہے ۔ ورنہ یہ بھی غیر متحرک ہیں ۔ ان کے بیان کا بھی مطلب یہی ہوگا کہ ان سے جو اشارے ملے ہیں ان کی وضاحت کی جائے ۔ نہچھو، اور منگل وغیرہ ابتدائی تصانیف ہیں اور وفے پتریکا بعد کی ۔ یہ واقفیت بہت ہی اہم ہے لیکن یہ محض ایک وسیلہ کی حیثیت سے ہی اہم ہے ۔ یعنی اس سے تلسی کی شاعری کے ارتقاء کے بارے میں جو اشارات ملتے ہیں وہ کہیں زیادہ اہم ہیں اور شاعری کے تدریجی ارتقا سے ان کی شاعرانہ شخصیت پر جو روشنی پڑتی ہے وہ تو اور بھی زیادہ اہم ہے ۔ اسی طرح تلسی کے شعری اسلوب کے عناصر کا تجزیہ محض حقائق کی تحقیق ہے لیکن ان سے تلسی کی شاعری کی جو ماہیت ظاہر ہوتی ہے اس کی تحقیق حقائق کا بیان ہوگی ۔ مثال کے طور پر رام نریش ترپاٹھی کی تصنیف 'تلسی داس اور ان کی کویتا' میں حقائق کی تحقیق کا رجحان زیادہ ہے اور اچاریہ شکل کی مشہور تصنیف 'گوسوامی تلسی داس' میں حقائق کے بیان پر زیادہ زور دیا گیا ہے ۔ حقائق کے اجتماع کو دیکھ کر سچا محقق سوال کرے گا ۔ اس سے کیا ؟ اور پھر ان کے سہارے وہ اندرونی تجسس کی دنیا میں ۔ شاعری کے رموز کی نقاب کشائی میں ۔ گم ہو جائے گا ۔ تلسی کی شاعری میں ہم صنفت منالع کی تعداد متضاد صنعت منالع کے مقابلہ میں زیادہ ہے ۔ اس بات کا ایک افادی پہلو ہے ۔ یہ اس بات کی ترجمان ہے کہ تلسی کی شاعری میں فن کے مظاہرہ کے مقابلہ میں 'رس' (جمالیات) کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے ۔ آگے چل کر یہ بات اس صداقت کی غماز بن جاتی ہے کہ تلسی کی شاعری قلب کو طمانیت بخشنے والی شاعری ہے، عقل کو متحیر کرنے والی شاعری نہیں ہے ۔ اس طرح ایک حقیقت دوسری لطیف تر حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعری کے رموز تک پہونچنے میں معاون ہوتی ہے ۔ حقائق کے بیان سے یہی مراد ہے ۔

گزشتہ کئی سالوں سے تحقیق سے میرا بیشہ دراز تعلق رہا ہے مختلف موضوعات کے محققوں سے تبادلۂ خیال کے مجھے بہت سے مواقع ملتے رہے ہیں ۔ ایسے مواقع پر تحقیق سے متعلق بہت سے سوالات میرے سامنے آئے ہیں ۔ ایک بار ہندی کے ایک مشہور عالم نے ہماری تحقیق کے ایک موضوع 'ریتی کال کے پرمکھ اچاریہ' پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس موضوع پر تھیسس کیسے لکھا جائے گا ۔ تھیسس سے ان کا مطلب تھا ایک سلسلۂ فکر کی تحقیق جس میں اچاریوں یعنی استادوں کی کثرت سدِّ راہ بنی ہوئی تھی ۔ اسی طرح تحقیقی بورڈ کے ایک جلسہ میں تاریخ کے ایک عالم نے 'ہندی شاعری کے ارتقاء میں سکھ شعراء کا حصہ' موضوع کے متعلق تجسس کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا کہ اس موضوع پر محقق کیا تحقیق کرے گا ۔ میں نے جواب دیا کہ یہ سارا مواد بھی نامعلوم ہے ۔ پہلا محقق اس کا تنقیدی جائزہ پیش کرے گا ۔ بعد کے محقق اس کی مدد سے داخلی تجزیہ کریں گے ۔ میرا جواب سن کر کئی تجربہ کار عالموں کا ردِ عمل یہی ہوا کہ تنقیدی جائزہ تحقیق کے دائرے میں نہیں آتا ۔ صورتِ حال واضح کرنے پر انھوں نے یہ مان لیا کہ کتابوں کے متن کی تحقیق اور تدوین تو تحقیق کے دائرے میں آسکتی ہے لیکن تنقیدی جائزہ نہیں آسکتا ۔ جائزہ اور تحقیق تو ایک دوسرے کے برعکس ہیں ۔ یہ دونوں باتیں تحقیق کی ماہیت پر خاطر خواہ روشنی ڈالتی ہیں ۔ انگریزی کا ایک لفظ ہے 'تھیسس' جس کا مفہوم سنسکرت نیائے شاستر (منطق) کے 'پرتگیا' لفظ کے مفہوم سے بہت قریب ہے ۔ اس کا مطلب ایسے جدّت آمیز دعویٰ سے ہے جسے استنباطی یا استقرائی طریقہ سے صحیح ثابت کیا جاتا ہے ۔ بہت سے عالموں کا خیال ہے کہ یہی دعویٰ اور اسے ثابت کرنے کا عمل تحقیقی مقالہ کی امتیازی خصوصیت ہے ۔ اسی لئے انگریزی میں تحقیقی مقالہ کے لئے 'تھیسس' لفظ ہی استعمال ہوتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اچھے تحقیقی مقالہ

کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں کوئی دعویٰ کیا گیا ہو اور اس دعویٰ کو صحیح بھی ثابت کیا گیا ہو۔ اس سے موضوع تحقیق کے خدوخال اور معلوم کی گئی صداقت کی ماہیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن ہر معاملہ میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ دراصل اس طرح کی تحقیق انھیں شعبوں میں ممکن ہے جہاں مطالعہ کی حدود کافی وسیع ہو چکی ہیں۔ مثال کے طور پر ہندی کے سگن بھکتی کال، ریتی کال اور جدید دور کے بہت سے شعراء پر اتنا کام ہو چکا ہے کہ اس طرح کی تحقیق کے لئے زمین ہموار ہو چکی ہے اور اس میدان میں اس طرح کا تحقیقی کام ہو بھی رہا ہے۔ گزشتہ سال میں نے دو تحقیقی مقالے دیکھے۔ ایک اچاریہ رام چندر شکل پر تھا اور دوسرا بہاری پر۔ ایک میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ اچاریہ شکل کا خاص نظریہ 'بھاو یوگ' اور ان کا سارا ادب تنقید، مضامین، شاعری وغیرہ، اسی فلسفہ سے متاثر ہے۔ دوسرے مقالہ میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ بہاری کی شاعری کنایہ کی شاعری ہے اور اسی دعویٰ کی روشنی میں بہاری کے سارے شعری سرمایہ کا جائزہ لیا گیا تھا۔ بلاشک وشبہ تحقیق کی یہ بلند تر منزل ہے۔ یہاں محقق کثرت میں وحدت کی تحقیق کے لئے براہ راست کوشش کرتا ہے۔ کثرت میں وحدت ڈھونڈ نکالنے کا نام ہی صداقت ہے اور شرح سے ہم آہنگ ہونا بھی اسی کو کہتے ہیں لہٰذا تحقیق کی یہ شکل صداقت یا شرح کی ہم آہنگی سے زیادہ سے زیادہ قریب ہے لیکن ریاضت کی بلند تر منزل ہمیشہ کٹھن ہوتی ہے اس لئے محقق کو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح کی تحقیق میں ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ بنیادی دعویٰ ہی کہیں غلط نہ ہو یا محقق اپنے دعویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے جوش میں حقائق کو مسخ کر کے نہ پیش کرے یا ان کی غلط تشریح نہ کرنے لگے۔ اس کا امکان اکثر موجود ہوتا ہے اور اسی لئے تحقیق کا یہ طریقہ زیادہ خارجی نہیں تسلیم کیا گیا۔ تحقیق کے خارجی طریقہ میں بنیادی اصول یہ ہے کہ حقائق ہی محقق کو اپنی گرفت میں رکھیں۔ وہ ان پر حکمرانی نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا طریقہ میں موخرالذکر کا خطرہ لگا رہتا ہے لیکن ریاضت کی بلند تر منزل خطرے سے کب خالی رہی ہے۔

تحقیق کا تیسرا اہم عنصر ہے "علم کی حدود کی توسیع"۔ دراصل یہی اس کی روح یا امتیازی خصوصیت ہے۔ نئے حقائق معلوم کرنا اور معلوم حقائق یا اصولوں کی نئی تشریح کرنا یہ دونوں عمل اسی مقصد کے حصول کا وسیلہ ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک عنصر یا تمام عناصر مل کر علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ علم کی یہ توسیع دراصل تحقیق کا بنیادی مقصد ہے۔ توضیح، اصول بحث، ارسال خیال کی خوبی وغیرہ بھی تحقیق کی اہم خصوصیات ہیں۔ لیکن یہ اس کی امتیازی خصوصیت نہیں ہیں۔ کیونکہ ایک تو ان کی عدم موجودگی میں بھی تحقیق ممکن ہے اور دوسرے یہ کہ مطالعہ کے دوسرے شعبوں میں بھی ان کی اتنی ہی بلکہ کچھ زیادہ ہی اہمیت ہے۔ اس کے برعکس علم کی توسیع نہ کرنے کی حالت میں تحقیق کی صورت مسخ ہو جاتی ہے۔ ایسی بحث جو علم کی توسیع میں معاون نہ ہو تحقیق کے دائرے میں نہیں آئے گی یا کم از کم وہ خالص تحقیق نہیں مانی جائے گی۔ خیال یا جذبہ کا ارسال بذات خود ادبی مطالعہ کا بہت ہی اہم عنصر ہے۔ ایک لحاظ سے اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے لیکن وہ تحقیق کا جزو لاینفک نہیں ہے۔ لہٰذا ہم یہی نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ علم کی توسیع ہی تحقیق کی امتیازی صفت ہے۔

تنقید

الوچنا (تنقید) کے لفظی معنی ہیں ہمہ گیر مشاہدہ۔ ادب میں تنقید کا مطلب ہے کسی ادبی تخلیق کا ہمہ گیر جائزہ۔ تنقید میں تین ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا پڑتا ہے (۱) اثر قبول کرنا (۲) تشریح و تجزیہ اور (۳) قدر و قیمت کا تعین یا فیصلہ۔ تنقید میں فنی تخلیق کے مطالعہ سے دل میں پیدا ہونے والے تاثرات کا اظہار کیا جاتا ہے یعنی دل کش یا غیر دل کش ردِ عمل کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد تنقید ردِ عمل کے دل کش یا غیر دل کش ہونے کے اسباب کا تجزیہ کرتی ہے۔ جمالیات کے مطابق ہیئت کا، نفسیات کی روشنی میں فنکار اور قاری کی ذہنی کیفیات کا اور سماجی علوم کی روشنی میں دونوں کی سماجی حالت کا تجزیہ کر کے یہ واضح کرتی ہے کہ کوئی فنی تخلیق قاری کو اچھی یا بری کیوں لگتی ہے۔ آخر میں دونوں طریق عمل کی مدد سے فنی تخلیق کی قدر و قیمت متعین کی جاتی ہے۔ تنقید کی یہ تین منزلیں ہیں جن سے نقاد کو گزرنا ہی پڑتا ہے۔ نتائج میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اچھی تنقید میں ان تینوں میں سے کسی کو بھی نظر انداز کرنا مشکل ہے۔

تحقیق اور تنقید کا باہمی تعلق

مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہے کہ تحقیق اور تنقید نہ صرف ہم جنس ہیں بلکہ ان کی نوع جنس بھی ایک ہی ہے۔ لہٰذا دونوں میں بہت مماثلت ہے۔ دونوں کا طریق عمل بہت حد تک یکساں ہے۔ دونوں میں ہی تشریح و تجزیہ سے کام لیا جاتا ہے اور کوئی فیصلہ کیا جاتا ہے۔ تحقیق میں ہم جسے حقائق کا بیان کہتے ہیں وہ تنقید میں تشریح و تجزیہ ہے۔ دونوں میں بحث و اسباب و نتائج کی کھوج، باہمی تعلق، مفاہیم وغیرہ کی وضاحت یکساں طور پر ملتی ہے۔ اسی طرح موضوع کی موافقت اور مخالفت میں تمام دلائل کا موازنہ کرنے کے بعد نتائج اخذ کرنے اور فیصلہ دینے کا طریقہ بھی دونوں میں عموماً یکساں ہے۔ حقائق کا تجزیہ کرنے کے بعد اصل نتائج اخذ کرنا بہت ضروری ہوتا ہے اس کے بغیر حقائق کا تجزیہ بے معنی ہوگا۔ لہٰذا نتائج اخذ کرنے اور فیصلہ دینے کی اہمیت تحقیق اور تنقید دونوں کے لئے یکساں طور پر تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے بغیر سلسلۂ فکر پورا نہیں ہوتا۔ حقائق کی بنیاد تحقیق کے لئے تو لازمی ہے ہی لیکن تنقید میں بھی اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ حقائق کی مضبوط بنیاد کے بغیر تنقید میں یقین کا عنصر مضبوط نہیں ہونے پاتا۔

ان سب کے باوجود تحقیق اور تنقید ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہیں۔ سنسکرت صرف و نحو میں جو نفسیات کی کسوٹی پر بھی صحیح ثابت ہوئے ہیں یہ قاعدہ ہے کہ کوئی بھی دو الفاظ پوری طرح ہم معنی نہیں ہوتے۔ ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ لفظ 'انوسندھان' (تخلیق) کا اصل مادہ 'دھا' ہے جس میں 'سم' کا سابقہ لگا کر 'سندھان' لفظ بنتا ہے، اس کے معنی ہوتے ہیں نشانہ باندھنا اور 'الوچنا' (تنقید) کا اصل مادہ ہے 'لوچ' ([illegible]) جس کے معنی ہیں دیکھنا۔ اسی اصل مادہ کے مفہوم کی بنیاد پر دونوں کے مروجہ مفہوم ہیں۔ آگے چل کر فرق ہو جاتا ہے۔ ایک کا مطلب ہے نشانہ باندھ کر اس کے پیچھے بڑھنا اور دوسرے کے معنی ہیں پوری طرح سے دیکھنا پرکھنا۔ یہی دونوں کا بنیادی فرق ہے۔ تحقیق میں حقائق کی دریافت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور تنقید میں جانچنے پرکھنے پر۔ اگرچہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے غیر متعلق نہیں ہیں تاہم حقائق معلوم کرنے کا کام جانچ پرکھ کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جانچنے پرکھنے کا عمل بھی پہلے حقائق کی دریافت سے شروع ہوتا ہے۔ پھر بھی تحقیق اور تنقید کے میدان کی وسعت یکساں نہیں ہے۔ تحقیق کی بعض قسمیں ایسی ہیں جو خالص تنقید کے تحت نہیں آتیں اور تنقید کی بھی کچھ قسمیں خالص تحقیق کے دائرے میں نہیں آتیں۔ مثال کے طور پر سوانح حیات کے تحقیق، متن کی تحقیق، لسانیاتی تحقیق وغیرہ تنقید کے زمرے میں شمار نہیں کی جاسکتیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں تنقید کا فقدان ہوتا ہے یا ان موضوعات کا محقق تنقیدی صلاحیت اور فیصلہ کرنے کی قوت سے عاری ہوتا ہے دراصل ان سبھی شعبوں میں بھی جانچنے، پرکھنے اور نتائج اخذ کرنے کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی دوسرے شعبوں میں، لیکن لفظ تنقید کا استعمال ہم یہاں ادبی تنقید کے مروجہ معنوں میں ہی کر رہے ہیں۔ عام معنوں میں بھی جانچنے پرکھنے کے معنوں میں نہیں۔ اسی طرح تنقید کی کچھ ایسی قسمیں بھی ہیں جیسے تاثراتی تنقید کی مختلف قسمیں — جو تحقیق کی متانت کی متحمل نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ تحقیق اور تنقید کی وسعت یکساں نہیں ہے۔

اپنے مطلب کو اور واضح کرنے کے لئے تنقید کے اصطلاحی مفہوم کو اور واضح کرنا ضروری ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہمارے کسی امتحان کے پرچہ میں سوال تھا کہ 'تنقید آرٹ ہے یا سائنس؟' مجھے یاد نہیں ہے کہ اس وقت میں نے اس سوال کا کیا جواب دیا تھا لیکن آج میرے ذہن میں اس کا جواب واضح ہے۔ تنقید (یعنی ادبی تنقید) آرٹ کی سائنس ہے۔ تنقید نہ تو اس مفہوم میں اس کا ادب (تحقیقی ادب) ہے جس مفہوم میں شاعری، ناول، افسانہ وغیرہ ہے اور نہ اس مفہوم میں وہ علمی ادب ہے جس مفہوم میں فلسفہ، نفسیات یا منطق ہیں۔ یہ اپنی مستند شکل میں تخلیقی ادب کا سائنسی مطالعہ ہے۔ موضوع کا اثر اس کے اسلوب اظہار پر لازمی طور پر پڑتا ہے۔ کیونکہ موضوع کے عناصر، مقاصد وغیرہ اس کو لازمی طور پر متاثر کرتے رہتے ہیں۔ احساس اور تخیل ادب کے اجزائے ترکیبی ہیں اور رس (جمالیات) اس کی روح ہے۔ لہٰذا ادبی جائزہ میں ادب کے اجزائے ترکیبی یعنی احساس اور تخیل اور اس کی روح یعنی رس (جمالیات) کی آمیزش

ہو ہی جاتی ہے۔ اسی طرح تنقید میں آرٹ کے عناصر لازمی طور پر موجود رہتے ہیں۔ اس میں شخصیت کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں ضرور ہوتا ہے۔ تحقیق کے متعلق یہ سوال نہیں کیا جاسکتا کہ وہ آرٹ ہے یا علم۔ وہ بلاشک و شبہ علم ہے۔ اس کو آرٹ کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ علم کو ہو سکتی ہے۔ کیونکہ علم کا بھی اپنا ایک آرٹ ہوتا ہے، ایک اسلوب ہوتا ہے جو اُسے ایک امتیازی خصوصیت عطا کرتا ہے۔ تحقیق کی دُنیا میں 'مناسب' یا 'تسلی بخش' شکل و وضع کا مطلب اسی قدر ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مثال کے طور پر انشائیہ کا لطیف طرزِ بیان تحقیق کے لئے نہ تو مناسب ہوگا اور نہ "تسلی بخش" اس بحث سے ہم یہی نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ شخصیت کا اظہار یا آرٹ کا عنصر ادبی تنقید کا ضروری جزو ہے لیکن ادبی تحقیق میں اس کی اہمیت ضمنی ہے۔ اس کے برعکس حقائق کی دریافت، حقائق کی خارجی تشریح اور سائنسی طریق کار تحقیق کے لئے اہم ہی نہیں ہیں بلکہ یہ اس کے خاص اجزاء ہیں۔ کسی نہ کسی کے خارجی یا داخلی حقائق کی دریافت کے بغیر تحقیق ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ان حقائق کی تشریح میں محقق کا زاویۂ نگاہ خالصاً خارجی ہونا چاہیئے تاکہ حقائق ہی اس کی رہنمائی کریں، وہ حقائق کی رہنمائی نہ کرے۔ یوں تو تنقید میں بھی ایسا زاویۂ نگاہ بہت ضروری ہے۔ لیکن تحقیق کے لئے یہ بالکل لازمی ہے۔ تحقیق کا میدان خالصاً ریاضت کا میدان ہے۔ اس میں زیادہ سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ تنقید میں شاید اتنے سخت ذہنی انضباط کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں داخلیت کی تھوڑی بہت آمیزش سرے سے ممنوع نہیں ہے۔ اسی طرح سائنسی طریق کار تحقیق کے لئے بالکل لازمی ہے۔ حوالہ وغیرہ کی پوری تفصیل، اشاریہ، ضمیمہ، فہرست کتب، حاشیہ وغیرہ اسی طریق کار کی علامتیں ہیں۔ دراصل یہ طریق کار تنقید کے لئے بھی غیر مفید نہیں ہے۔ لیکن اس کے لئے یہ لازم نہیں ہے۔ خالص تنقید میں موضوعِ تنقید کی روح سے ہم کلام ہونے کے لئے نقاد اور قاری اتنا بے قرار رہتا ہے کہ اس طرح کے حقائق کو وہ نظر انداز کر سکتا ہے۔ حقیقت ان سے اصل موضوع سے ان کی توجہ کے ہٹنے کا امکان ہو سکتا ہے۔

تحقیق اور تنقید کا مقصد براہ راست بھی ایک نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ہم ابھی ثابت کر چکے ہیں۔ تحقیق کا مقصد علم میں اضافہ ہے لیکن تنقید کا مقصد ہے علم کی واقفیت۔ جو تحقیق علم کی توسیع میں معاون نہیں ہوتی وہ اصولی طور پر ناکام ہے۔ لیکن تنقید کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ جو تنقید ادب کی روح سے ہم کلام ہونے کا موقع نہیں دیتی یعنی اس کی روح کو صاحبِ ذوق تک منتقل نہیں کر سکتی اور فن کار اور صاحبِ ذوق کے درمیان ذہنی رفاقت کا رشتہ قائم نہیں کرتی اور اپنے بنیادی مقصد میں ناکام رہتی ہے۔ انجام کے اسی فرق کی بنا پر دونوں کے آغاز میں بھی نمایاں فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔ نقّاد کا اوّلین فرض ہے اثر پذیری یعنی موضوعِ تحقیق کی جانب جذباتی ردِّ عمل۔ محقق کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ یہ اس کے کام میں مانع بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اپنا کام حقائق کی فراہمی سے شروع کرتا ہے جس میں اس کا نقطۂ نگاہ بے لاگ رہنا چاہیئے۔ اس طرح تحقیق و تنقید کے آغاز و انجام میں ظاہری فرق ضرور ہے۔

اب تک میں نے انتہائی غیر جانب داری سے تحقیق اور تنقید کی مماثلت اور فرق پر روشنی ڈالی ہے۔ اگر آپ اعتراض نہ کریں تو میں اپنے نتائج یہاں اختصار میں لکھ دوں تاکہ آگے بحث میں سہولت ہو۔

مماثلت :- (۱) تحقیق اور تنقید ایک ہی علم — علم ادب کی دو قسمیں۔

(۲) دونوں کا طریق کار بہت حد تک ایک سا ہے۔ دونوں میں عام طور سے حقائق فراہم کرنے، ان میں سے کچھ ترک کرنے اور کچھ قبول کرنے، ان کی تشریح اور تجزیہ کرنے اور نتائج اخذ کرنے کے طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔

اختلاف :- (۱) لیکن تحقیق اور تنقید ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ اوّل الذکر (تحقیق) میں کھوج پر (اس لفظ کے اصل مادہ کا مفہوم بھی یہی ہے) زیادہ زور دیا جاتا ہے اور تنقید میں جانچنے پرکھنے پر۔

(۲) تحقیق کی مختلف قسمیں ہیں جو تنقید کے دائرے میں نہیں آتیں اور اس طرح تنقید کی بعض قسمیں تحقیق کی شرطوں کو پورا نہیں کرتیں۔

(۳) شخصیت کا اظہار یا فنی عنصر تنقید کا لازمی عنصر ہے لیکن تحقیق میں اس کی ضمنی اہمیت ہے۔

(۴) بے تعلق سائنسی نقطۂ نگاہ اور سائنسی طریق کار کی اہمیت

[illegible] کی [illegible] ہے۔
[illegible] اور تنقید کا مقصد ہے
اس [illegible] جاسکتی۔

اب میں [illegible] تحقیق و تنقید کے بارے میں آپ کے تصور کچھ واضح ہو گئے ہوں گے۔ لیکن [illegible] ایک نیا رخ ہے یا آپ [illegible] کیا اس کی حیثیت ہمارے موضوع بحث کے لئے حقائق کی بنیادی ہے [illegible] اپنے آپ سے اور آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ کیا خالص تنقید کیا اعلیٰ تنقید [illegible] پر اعلیٰ تحقیق نہیں ہے [illegible] اعلیٰ ادبی تحقیق اپنی بلند ترین سطح پر تنقید سے مختلف رہتی ہے [illegible] طالب علم ہونے کی حیثیت سے میرے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے [illegible] اعلیٰ تنقید [illegible] اعلیٰ تحقیق بھی ہے [illegible] تنقید سے مختلف نہیں رہتی۔ ہندی میں [illegible] اعلیٰ تنقید کا بہت اچھا نمونہ ہے اور میں اسے [illegible] تحقیق [illegible] بہترین نمونہ مانتا ہوں۔ اس میں جو حقائق کی بنیاد بھی بہت مضبوط ہے [illegible] کی گنجائش ہے۔ [illegible] شکل کے [illegible] ہندی [illegible] کی ترقی میں ان کا حصہ ہے کیا اس کے [illegible] کیا جا سکتا ہے یعنی کیا تحقیق کے اعتبار سے [illegible] ہے۔ آپ شاید ہندی کے ایک اور [illegible] پیش کرنا چاہیں گے۔ میرا اشارہ [illegible] ناقد ہیں لیکن آپ [illegible] کا شک ہوا ہے۔ اس سلسلے میں [illegible] تصانیف کی تحقیقی اہمیت کے بارے میں [illegible] اہمیت [illegible] بالکل مسلم نہیں ہے۔ [illegible] تنقید عام طور [illegible] جہاں متوازی انداز [illegible] کی شاعری کے حسن کی [illegible] تحقیق کے نقطۂ نظر [illegible] ہیں

آپ نے کسی ایسے تحقیقی مقالے کا نام جاننا چاہا ہو [illegible] سے عاری ہونے کے باوجود اعلیٰ تحقیق کا نمونہ ہو [illegible] یا تاریخ سے متعلق تحقیق کی کچھ مثالیں پیش کرچکا ہوں [illegible] تحقیق کا ذکر کر رہا ہوں۔ ادبی تحقیق سے متعلق کچھ تحقیقی [illegible] آپ شاید نام لینا چاہیں۔ میں اس سلسلے میں یہی عرض کروں گا کہ ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔ ایسے مقالے جن کی حیثیت حقائق کی دریافت سے زیادہ نہیں ہے اعلیٰ تحقیق کے زمرے میں شمار نہیں ہوں گے اور ان کو محض حوالے کے نقطۂ نظر سے ہی اہمیت حاصل ہوگی۔ مغرب میں اور مغرب کے اثر سے اس ملک میں بھی ایسی مثالوں کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔ میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا لیکن ان کی حیثیت تو محض تحقیق کے وسائل کی ہے۔ ہندی میں ایسی کئی اہم کتابیں ہیں جن میں بہت بڑی تعداد میں نیا مواد اکٹھا کیا گیا ہے۔ ان سے ہندی ادب اور ہندی ادب کے محقق کو بلاشک و شبہ بہت فائدہ پہونچا ہے لیکن ان کو معیاری تحقیق کا درجہ دینے پر اصرار نہ کیجئے۔ ان کی حیثیت تو معیاری تحقیق کے خاکہ کی ہے۔ اگر ہم بہت باریکی سے غور کریں تو ہمیں تمام علوم کا ایک ہی مقصد نظر آئے گا اور وہ ہے صداقت کی دریافت۔ صداقت اور حقیقت میں یہ فرق ہے کہ ایک کا تعلق ادراک سے ہے اور دوسرے کا احساس سے۔ ادراک سے مراد ایسی واقفیت سے ہے جو حواس خمسہ یا عقل کے ذریعہ حاصل ہو اور احساس کا مطلب ہے اصلیت کا مشاہدہ کرنا۔ اصلیت کا مشاہدہ کرنے کے لئے حقائق کے ادراک سے آگے بڑھ کر اس میں صداقت کی واقفیت ضروری ہے جس کا اظہار حقائق کرسکتے ہیں۔ یہی تنقید کی بلند ترین سطح ہے اور میں کہوں گا کہ تحقیق کی بلند ترین سطح بھی یہی ہونی چاہیئے۔ اس کے بغیر تحقیق محض حقائق کے ادراک تک محدود رہے گی، صداقت کو پانے کا ذریعہ نہ بن سکے گی۔ ایسی صورت میں اس کا شمار [illegible] علم میں نہ ہوگا بلکہ اسے آپ وقتی یا ضمنی علم ہی مانا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ مزاج اور پیشہ دونوں کے لحاظ سے محقق ہونے کی بنا پر آپ کو تحقیق کی یہ منزل منظور نہ ہوگی۔

تحقیق کے میدان میں تنقید کی اس مخالفت کی بھی ایک تاریخ ہے پندرہ بیس سال قبل جب ہندی میں تحقیق کا کام باقاعدگی سے شروع ہوا

اس وقت ادبی تنقید کے میدان میں اچاریہ رام چندر شکل کی حکمرانی تھی۔ اچاریہ شکل کے طریق تنقید میں بنیادی عناصر پر اتنا زیادہ زور دیا جاتا تھا کہ حقائق کی وہ زیادہ فکر نہیں کرتے تھے۔ ان کے "ہندی ساہتیہ کا اتہاس" مقدمات اور نظریاتی مقالوں میں حقائق کی بنیاد واضح طور پر کمزور ہے۔ دراصل روحِ ادب کی تحقیق ہی ان کا مقصد ہوتا تھا۔ حقائق جمع کرنے اور اعداد و شمار کو اپنی تخلیق کی بنیاد بنانے سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن اس کا ایک اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ جائسی، سور اور تلسی کی شاعری میں جن دل کش رموز کو وہ اپنے مقدمات میں بے نقاب کر گئے ہیں ان میں بعد کے محققین اپنی ضخیم کتابوں کے ذریعہ بھی کوئی حیرت انگیز اضافہ نہیں کر سکے۔ بہاری، گھنانند وغیرہ شعرا کے بارے میں فکر کے جن نکات کا اظہار انھوں نے اپنی تاریخ میں کر دیا۔ بعد کے محققین نے آج تک حقائق کی روشنی میں یا تو ان کی تائید کی ہے یا محض توسیع۔ فی الواقع تحقیق کا موضوع کیا ہے؟ اصل عنصر ہی نہ، عناصر کی تحقیق کے عام طور پر دو طریق کار ہیں۔ ایک فلسفہ کا اور دوسرا سائنس کا۔ پہلا طریقہ سیدھا ہے اور اس سے کام بھی تیزی سے ہو سکتا ہے۔ وہ براہِ راست نشانہ پر تیر پھینکتا ہے۔ دوسرے بنیاد زیادہ مضبوط و مستحکم ہے لیکن اس کی رفتار سست ہے۔ دونوں کے اپنے محاسن و معائب ہیں۔ پہلے کے نتائج بآسانی سمجھ میں تو آ جاتے ہیں مگر مبہم بھی ہو سکتے ہیں۔ دوسرے میں ابہام کا احتمال نسبتاً کم ہے مگر اس میں ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ محقق کی نظر حقائق کے دام میں الجھ جاتی ہے اور اصل عنصر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اچاریہ شکل کی تحقیق میں پہلے طریق کار کے محاسن و عیوب تھے۔ تقریباً اسی زمانے میں ہمارے کچھ علماء مغرب سے تحقیقی کام کر کے واپس آئے تھے جہاں سائنسی طریق کار سے ادبی تحقیق میں بھی کام لیا جا رہا تھا۔ یہاں آ کر انھوں نے دیکھا کہ ہندی تحقیق میں اس کا سراسر فقدان تھا۔ اس کا طریق کار نامکمل اور غیر منظم تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر دھیرندر ورما وغیرہ نے ہندی تحقیق میں سائنسی طریق کار کو مروج کرنے کی منظم کوشش کی اور اس کے نتیجے میں تحقیق کا ایک نیا طریقہ معرضِ وجود میں آیا جو روایتی طریقہ سے مختلف تھا۔ سائنسی طریقہ کار اور روایتی طریقہ کار کی باہمی ٹکر نے اس فرق کو جنم دیا کہ تحقیق تنقید نہیں ہے اور ان دونوں کی علیحدگی سے فائدہ بھی ہوا اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ ہوا کہ تحقیق میں حقائق تلاش کرنے کی اہمیت بڑھی۔ حقائق کی مضبوط بنیاد پر ٹکی ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ مستند ہوئی اور اس کی ساکھ میں اضافہ ہوا۔ طریق کار و عمل میں سائنسی ترتیب اور کاملیت پیدا ہوئی۔ خارجی نقطۂ نظر سے تنقید و تبصرہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ انفرادی مذاق کی رنگارنگی میں اعتدال آیا اور اس سے جو غلط نتائج نکل رہے تھے ان پر قابو حاصل کیا گیا۔ اس سے نہ صرف ہندی تحقیق کو بلکہ ہندی تنقید کو بھی فائدہ پہونچا۔ اگرچہ نقصان بھی کچھ کم نہ ہوا۔ اس سے بصیرت میں کمی آئی۔ حقائق پر نظر مرتکز ہو جانے کی وجہ سے اصل عنصر کی اہمیت کم ہونے لگی۔ محقق شاخوں میں الجھ کر جڑ کو بھولنے لگا۔ تجزیہ کی جگہ اعداد و شمار کی بہتات ہونے لگی۔ دل کے لطیف رموز کے اظہار کے لئے میکانکی تنقید کا سہارا لیا گیا۔ چونکہ تخیل کو پابند کرنے پسند کر دیا جاتا تھا۔ اس لئے خیال اور فکر بھی کمزور پڑ گئے۔ بیرونی ہیئت کا اتنا بول بالا ہوا کہ ادب کی اصل روح منتشر ہونے لگی۔ ادب کی روح کے مشاہدہ کو نئے نقاد چھایا وادی تنقید کہنے لگے۔ ہندی تحقیق کو ایک انتہا پسندی سے تو نجات ملی۔ مگر وہ دوسری انتہا پسندی کا شکار ہو گئی۔ یہ میلان اور بھی تشویش ناک تھا اور اگر بروقت اس پر قابو نہ پایا جاتا تو ہمارے یہاں علم کا معیار یقیناً گر جاتا۔ درحقیقت اس میلان کے پس پردہ اس بنیادی نظریہ کو نظر انداز کیا گیا تھا کہ ہر موضوع کے مطالعہ کا طریق کار اس کے اپنے مزاج سے ہی اخذ ہونا چاہیئے۔ مطالعہ کے اصول اور طریق کار کا اپنا علیحدہ وجود نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ موضوع پر ہی مبنی ہوتے ہیں۔ لہٰذا جو عالم سائنس کے غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر اور خالصتاً خارجی طریق کار کو جوں کا توں ادب میں برتنا چاہتے ہیں وہ اس بنیادی اصول کو فراموش کر دیتے ہیں کہ خارجی شکل تو روح کا عکس محض ہے۔ لہٰذا روحِ ادب کی تحقیق کے لئے سائنس کا استعمال اس حد تک تو مناسب اور مفید ہے جس حد تک روحِ انسان کی ترقی کے لئے مختلف طبعی اور سماجی علوم کا۔ لیکن اس سے آگے بڑھنا خطرناک ہوگا۔ اس سے ادبی قدروں کے درہم برہم ہو جانے کا احتمال ہے۔

اور یہ ڈر آج ہندی تحقیق کے میدان میں سچ ثابت ہو رہا

ہے۔ اس غلط خیال سے کہ تحقیق تنقید نہیں ہے۔ دو سری غلط فہمیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ ہندی کا محقق یہ سمجھنے لگا ہے کہ تحقیق کا کام محض تلاش ہے — اچھے اور برے ادب، یہاں تک کہ ادب اور غیر ادب کی پرکھ سے اس کا کیا واسطہ۔ نتیجہ کے طور پر آج ادبی تحقیق کے نام پر ایسی چیزیں سامنے آ رہی ہیں جو کسی بھی طرح ادب کی ضمن میں نہیں آتیں۔ میں نے بھارتیہ ہندی پریشد کی بزمِ مقالہ میں صدر کی حیثیت سے یہ سوال اٹھایا تھا۔ اس وقت وقت کی کمی کی وجہ سے میں اپنے مقصد کو واضح نہیں کر سکا تھا۔ میرا مطلب اصل میں یہ ہے کہ ادبی تحقیق ادب کے دائرے تک ہی محدود رہنی چاہیئے۔ ایسے مواد کو جو ادب کے زمرے میں نہیں آتا یعنی جو اپنے موضوع اور اسلوب بیان کے ذریعہ صاحب ذوق کے دل کو مسحور کرنے میں یکسر ناقابل ہے ادبی تحقیق کے تحت قابلِ تعریف نہیں سمجھنا چاہیئے۔

آج ہندی کے محقق آدی کال، بھکتی کال اور جدید ہندی ادب کے نصف اوّل سے متعلق ایسے مواد کا ڈھیر لگاتے جا رہے ہیں جو ادب نہیں ہے۔ مثال کے طور پر رام اور کرشن سے متعلق شاعری کے تحت کو دس پندرہ سال میں جدّت پسند محققین نے ایسی متعدد فرقہ وارانہ کتابوں سے بڑھا دیا ہے جو کسی بھی لحاظ سے ادب کے درجہ میں نہیں آتیں۔ آپ کہیں گے کہ ان کی تاریخی و ثقافتی اہمیت ہے۔ بجا ہے میں بھی اسے تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن تحقیق کا موضوع رام کاویہ یا کرشن کاویہ ہے۔ رام بھکتی یا کرشن بھکتی فرقوں کی تاریخ نہیں ہے۔ غیر شاعرانہ مواد کا استعمال پس منظر کے لئے تو کیا جا سکتا ہے مگر شاعری کی تحقیق کے نام پر اس کی تحقیق کرنے کی زحمت نہ کیجیے۔ آدی کال کو ہی لیجیے۔ ہمارے محققین نے ناتھوں اور سدھوں کی سینکڑوں تصانیف کا ڈھیر لگا دیا ہے آیوروید، زراعت، اس عہد کی سیاست وغیرہ سے متعلق تصانیف ہندی ادب کو وسعت دے کر آیوروید اور علم زراعت تک پھیلا رہی ہیں۔ نرگن سنتوں کی بانیاں خالصاً فرقہ وارانہ مقصد سے وجود میں آتی ہیں اصلاً ان میں شعری عنصر بالکل مفقود ہے۔ اس لئے کسی بھی قدیم صاحب ذوق ناقد نے ان کا بھول کر بھی تذکرہ نہیں کیا۔ لیکن آج سائنسی تحقیق کے نتیجہ کے طور پر یہی بانیاں ہندی ادب میں اضافہ کا باعث بن رہی ہیں۔ اسی طرح موجودہ دور میں بھارتیندو اور دویدی عہد کی تمام تر صحافت ہندی ادب میں جلد کی توں شامل کی جا رہی ہے۔ ادھر عوامی ادب کا سیلاب بھی آ گیا ہے۔ لوک ساہتیہ (عوامی ادب) تک تو غنیمت تھا کیونکہ لفظ ادب کے ربط سے عوام کے الم و طرب کے احساسات سے اس کا کچھ نہ کچھ تعلق رہتا تھا۔ لیکن اب تو ہماری تحقیق 'لوک وارتا' (عوام کی بات چیت) تک کے دائرے میں داخل ہو چکی ہے۔ جس کے بارے میں سنسکرت شاعری کے قدیم استاد کا فیصلہ تھا:۔

"سورج غروب ہو گیا، چاند چمک رہا ہے، پرندے اپنے گھونسلوں میں جا رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی شاعری ہے۔ اسے تو وارتا (عامیانہ بات چیت) کہتے ہیں۔"

(ـــــ کاویہ النکار)

یعنی 'وارتا' کو ہمارے شعری ادب میں شاعری سے مختلف تسلیم کیا گیا ہے۔ میں ایک غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے دوسری غلط فہمی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے اپنے مفہوم کو کچھ اور واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں ایک ثانیہ کے لئے بھی اس طرح کے مواد کی قدر و قیمت کو کم کر کے دیکھنا نہیں چاہتا۔ تہذیبی، سماجی اور تاریخی تحقیق میں اس کی اپنی مخصوص اہمیت ہے۔ بھارت کی ازمنہ وسطیٰ کی تہذیب کی تاریخ پیش کرنے میں سدھوں، ناتھوں اور سنتوں کی بانیوں کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ ملک کے نشاۃ ثانیہ کی تاریخ بھارتیندو اور دویدی عہد کے صحافیوں کی مرہونِ منت رہے گی۔ اسی طرح عوامی تمدن اور عمرانیات کے لئے 'لوک وارتا' کی اہمیت بھی ہمیشہ رہے گی۔ ازمنہ وسطیٰ یا عہد حاضر کے ہندی ادب کے پس منظر کے طور پر بھی مندرجہ بالا مواد بہت بیش بہا ہے۔ محرک ذرائع کے طور پر اس کا استفادہ کیا جا سکتا ہے اور شاعر کی ذہنی تعمیر میں متعلقہ عہد کے ماحول کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن وہ تو میدان ہی دوسرا ہے۔ آج تو سنت کاویہ، رام کاویہ، کرشن کاویہ عنوانوں کے تحت اس قسم کے غیر شاعرانہ مواد کو شامل کیا جا رہا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ یہ غلط خیال کہ تحقیق تنقید نہیں ہے اس لئے ناقدانہ نظر کی عدم موجودگی میں محقق شاعری کے

[illegible] اس پیرشیائی پیرے سے آمیزش کر دیتا ہے جس کو ہمارے شمال جیسے [illegible] ادبی معروف سے تقال کر پھینک دیا تھا۔ جیسا کہ میں نے انہیں اندر عرض کیا ہے۔ یہ سب کچا مال ہے۔ اسے تنقید کی رفتار میں صاف کر کے کم ہی استعمال کرنا چاہیئے۔ آخر شاعری کی تحقیق کا مقصد کیا ہے؟ صداقت شعری کی تحقیق ہی نا؟ جن تحقیقات میں شعریت یعنی شاعری کی [illegible] ہی گم ہو جائے تو وہ پھر اور کس کی تلاش کرنا چاہتا ہے۔

میں مزاج اور پیشے سے استاد ہوں۔ کلاس میں لیکچر کے بعد میں اس بات کا یقین کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ سبھی طلبا میرے لیکچر کو سمجھ گئے ہیں یا نہیں۔ میرے بیان سے ان کے ذہن میں کچھ غلط فہمیاں تو پیدا نہیں ہو گئیں۔ نیز میں نے جو مواد ان کے سامنے پیش کیا ہے اس کا مناسب استعمال طالب علم کس طرح کر سکیں گے۔ آپ کو طلب علم ہے کہ [illegible] کیونکر سمجھ لوں۔ البتہ اس یقین کے ساتھ کہ آپ سب متجسس جذبے سے یہاں تشریف فرما ہیں۔ میں اپنے اس طریق کار کا پھر اعادہ کرنا چاہتا ہوں اور تحقیق سے متعلق اپنے موضوع کے بارے میں چند عملی اشارے دے کر آج کے بیان کو ختم کروں گا۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

(۱) تحقیق اور تنقید یقینی طور پر ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہیں۔ محقق کو یہی سمجھ کر اپنا کام شروع کرنا چاہیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ حقائق کی تلاش کی طرف سے باخبر رہے گا اور اس کے تجزیہ کی حقائق سے متعلق بنیاد مستحکم ہو جائے گی۔ وہ دوسروں کے جمع کئے ہوئے حقائق پر منحصر نہ رہ کر خود بھی نیا مواد فراہم کرنے کی کوشش کرے گا یا کم از کم جو مواد فراہم ہو چکا ہے اس کے مستند ہونے کے متعلق اپنا اطمینان ضرور کرے گا۔ ہر ایک محقق کو اس میلان کو بڑھانا چاہیئے۔

(۲) متعدد موضوعات ایسے ہو سکتے ہیں جن میں محض حقائق کی دریافت سے بھی کام چل سکتا ہے۔ کم از کم پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند کے لئے کارگزاری کافی ہو سکتا ہے لیکن یہ تحقیق کا آغاز ہے۔ انجام نہیں۔ اسی موضوع پر حقائق کی تشریح اور مواد کی تنقید کے ذریعہ اور بھی گہری [illegible] کے اعلا [illegible] سے استفادہ کر سکتا ہے [illegible] کرنا چاہیئے۔ [illegible] کی زندگی اور شاعر اور نثر [illegible] محقق محدود [illegible] کی شاعری کے [illegible] فلسفیانہ پس منظر وغیرہ پر گفتگو کر سکتا ہے۔

(۳) حقائق کی تلاش تحقیق کی صرف بنیاد ہے اور ابتدائی شکل میں ہونے کے سبب نسبتاً پست درجہ کی بھی ہے۔ طالب علم کے لئے اس قسم کے تحقیقی کام کی جب تک کہ اس کا میدان بہت ہی وسیع نہ ہو، میں سفارش نہیں کر سکتا۔

(۴) میں ایسے اعلیٰ درجے کے محقق کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس میں تنقیدی صلاحیت موجود نہ ہو۔ تحقیق کے قوانین کے مطابق محقق کو اس کی تصدیق کرنی پڑتی ہے کہ محقق نے اپنے مقالے میں تنقیدی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ صداقت کے تین مدارج ہیں۔ حقائق جمع کرنا۔ فکر اور یقین اور مسلم۔ حقیقت کو فکر میں تبدیل کئے بغیر علم میں اضافہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ حقیقت کو فکر کی شکل دینے کے لئے شدت احساس کی ضرورت پڑتی ہے اور فکر کو یقین میں بدلنے کے لئے نظریہ لازمی ہے اور یہ دونوں ہی ادبی تنقید کے جزو بلاشبہ ہیں۔ ہٰذا اعلیٰ ادبی تنقید ادبی تحقیق کی بہترین شکل ہے۔ محقق کو اس اہم حقیقت کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔

اس لئے میرے نوجوان دوستو! آپ اپنی قوت و ذہانت کے مطابق اپنی منزل مقصود کا تعین کریں۔ آپ کی نظر اگر پیشہ ورانہ ہے تو عام طور سے نامعلوم یا نیم معلوم شاعر یا ادیب کے فن سے ہی حقائق کی تحقیق کے بعد آپ کو ڈگری مل جائے گی۔ اگر آپ کو اپنی صلاحیتوں کا احساس ہے اور آپ کا ذہن معمولی قسم کی کامیابی سے مطمئن نہیں ہوتا تو آپ کو اپنی تنقیدی قوت کو سنوارنا ہوگا تاکہ آپ حقائق کے پیچھے [illegible] کر سکیں [illegible] کو سمجھا سکیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اگر آپ تحقیق کے میدان میں کارنمایاں انجام دینا چاہتے ہیں تو آپ کو مسلسل کاوش سے [illegible] ادب کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت کو بڑھانا پڑے گا۔

([illegible])

غلام ربانی تاباں

غزل

فرصت کہاں جو دل کی جراحت کا غم کریں
اک تیر اور کھائیں کہ آنکھوں کو نم کریں

موجِ ستم کو سر سے گزرنا بھی آ گیا
اب وقت ہے سپاسِ عزیزاں رقم کریں

بزمِ مغاں سے رکھتے ہیں ہم تشنگی کا ربط
آسودگانِ جام غمِ بیش و کم کریں

ذوقِ جفائے حسن کی تسکیں تو ہو گئی
یہ اور بات نازِ شکستوں پہ ہم کریں

شامِ فراق آئی ہے ملنے کو یادِ دوست
اک انجمن نشاط کا ساماں بہم کریں

ہر آرزو میں بھرتے چلیں حسرتوں کا رنگ
اک تازہ اہتمام سے جشنِ الم کریں

اُن کی خوشی وہ عہدِ ستم کا بھی توڑ دیں
تاباں مگر جو فرضِ وفا ہے وہ ہم کریں

روش صدیقی

دو غزلیں

چارۂ دردِ کائنات کرو
جھوم اُٹھے زندگی وہ بات کرو

خمِ زلفِ بتاں کے دیوانو
فکرِ آرائشِ حیات کرو

ہے یہی حسنِ وضع داری کا
احترامِ تغیرات کرو

بڑھ گئی دل کی تنگ دامانی
اور تسخیرِ کائنات کرو

دُھن اگر ہے کسی سے ملنے کی
شام کو صبح، دن کو رات کرو

شکوۂ رنجِ سکوتِ لب نہ ہو
بول اٹھیں خود صنم وہ بات کرو

ہے تکلف اگر تو چشمِ کرم
ہر بنائے تکلفات کرو

ہم ازل سے ہیں گوش بر آواز
کبھی ہم سے بھی کوئی بات کرو

کوئی راز آشنا ملے تو روش
بُتِ نا آشنا کی بات کرو

شاید کمالِ سوزِ نہاں کا ظہور تھا
وقتِ سحر جو شمع کے چہرے پہ نور تھا

ذوقِ طلب پہ ایک قیامت گزر گئی
دنیا قریب تھی ترا دامن ہی دور تھا

یہ کیا کہوں کہ عمرِ گریزاں سے تھی امید
ہاں اعتبارِ وعدۂ فردا ضرور تھا

توفیقِ دردِ بادۂ مینا گداز تھی
روزِ ازل سے شیشۂ دل چور چور تھا

واعظ پہ فاش رازِ رگِ جاں نہ ہو سکا
ناداں اسیرِ حلقۂ نزدیک و دور تھا

دار و رسن سے حق کی صدا دے رہا تھا عشق
منبر پہ شورِ جنت و حور و قصور تھا

تھیں بے نیازیوں میں عجب دلنوازیاں
تیرے نیازمند کو کیا کیا غرور تھا

محرم نہ تھے کلیم تو اے خلوت آشنا
کیا گوشۂ نقاب اُٹھانا ضرور تھا

کیا کیا بھرے مرقعِ شام و سحر میں رنگ
نقاشِ انتظارِ دلِ ناصبور تھا

بچ کے جو گردِ کوئے ملامت سے ہم روش
یہ احتیاطِ وضعِ محبت سے دور تھا

عطاالله پالوی

آہ نہرو!

ویسے تو نومبر میں بہت سی بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں مثلاً ۲۲- نومبر ۱۵۴۲ء کو شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر، یا ۳۰ نومبر ۱۸۷۴ء کو برطانوی ہیرو سر ونسٹن چرچل جنہوں نے دوسری جنگ عظیم جیتی یا ۳۰ نومبر ۱۸۵۸ء کو سر جگدیش چندر بوس- مگر الہ آباد نے نومبر میں صرف دو ہی مقتدر ہستیاں پیش کیں۔ ایک ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو سید خاندان میں جسے دنیائے ادب و شعر میں اکبر الہ آبادی کہا گیا۔ اور دوسری ۱۴- نومبر ۱۸۸۹ء کو پنڈت گھرانے میں جسے دنیائے ادب و سیاست میں جواہر لال نہرو کہا گیا۔ ہاں وہی جواہر لال نہرو کہ آج جس کے غم میں کوہ کوہ سوگ بپا ہے، ڈیوڑھی ڈیوڑھی ماتم ہے۔

دلی میں ارباب حکومت نالہ کناں ہیں کہ وزیر اعظم ہند رخصت ہو گیا۔ وہ وزیر اعظم جو دنیائے حکومت و سیادت کا اس لحاظ سے منفرد شخص تھا کہ وہ سترہ برس تک کرسئ وزارتِ عظمیٰ پہ مسلسل متمکن رہا۔

اصحاب سیاست نوحہ خواں ہیں کہ نہرو ان سے چھن گیا۔ وہ نہرو جو بساطِ سیاست کا اس اعتبار سے ممتاز مہرہ تھا کہ وہ سیاستِ عالم پر اثر انداز ہوتا تھا۔ ہاں بے شک ہندوستان کو رونا ہی چاہئے۔ شاید یہ ماہ مئی کی ایک امتیازی ستم ظریفی ہے کہ وہ مقبول حکمرانوں کو ان کے معتقد عوام سے زبردستی چھین لیا کرتی ہے۔ اسی مئی میں ایک بار انگلینڈ بھی خوب اشک باری کر چکا ہے جبکہ ۶ مئی ۱۹۱۰ء کو ان کا مقبول بادشاہ ایڈورڈ ہفتم ان سے چھنا تھا۔ ہاں اسی مئی میں ایک مرتبہ فرانس میں بھی آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی جب کہ ۵ مئی ۱۸۲۱ء کو شہنشاہ نپولین نے رخت سفر باندھا تھا۔ ہاں اسی مئی میں ایک زمانے میں سرنگا پٹم نے بھی آنسوؤں سے منہ دھوئے تھے جب کہ ۴- مئی ۱۷۹۹ء کو سلطان ٹیپو نے جام شہادت نوش جاں فرمایا تھا۔ ہاں اسی مئی میں ایران نے بھی سینہ کوبی کی تھی جبکہ ۲۴- مئی ۱۱۵۷ء کو اس کا پیارا حکمران سلطان سنجر فوت ہوا تھا پھر اگر ہندوستان اسی مئی میں خوں فشاں اور غم نہرو میں اشک بار ہے تو کیا غلط ہے؟ اور وہ بھی محرم میں۔

۱۴- مئی کو ہجری سال ۱۳۸۴ شروع ہوا (یکم محرم) مگر بڑا المناک آغاز ہوا- ابھی لوگ ۲۳- مئی (۱۰- محرم) کو غم حسین منانے کے بعد ٹھیک سے ہوش میں بھی نہیں آنے پائے تھے کہ ۲۷- مئی (۱۴ محرم) کو نہرو نے داغِ مفارقت دیا۔ ہم اس عظیم انسان کو کس طرح بھلا سکتے ہیں؟ کیونکہ ایسا محبوب رہنما، ایسا مقبول قائد، ایسا شفیق سرپرست اور ایسا مخلص انسان، ایک شخصیت میں مجتمع، اب کبھی ہندوستان کو نصیب نہ ہوگا۔ ایسی ہمہ گیر ہستی جسے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب ہی اپنا سمجھتے ہوں، نہرو کی موت پر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ یہی سبب ہے کہ ساری دنیا کے اکابر و اصاغر نے اظہارِ غم اور اعترافِ عظمت کیا ہے۔ کون ملک ہے جس نے اپنے خصوصی نمائندے پرسہ کے لئے دہلی نہیں بھیجے؟ کون بڑا آدمی ہے جس نے حکومت ہند اور خاندانِ نہرو کو تعزیت نامے ارسال نہیں کئے۔ حد تو یہ ہے کہ چین بھی، جو ہندوستان کا دشمن ہے، نہرو کی موت پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور چینی وزیر اعظم مسٹر چاؤ این لائی

نے بھی نہرو کی موت پر افسوس ظاہر کیا جس ہستی پہ دشمن بھی روئے وہ ہستی عظیم الشان ہے۔

بے شک سرزمین ہند زرخیز و گل پاش واقع ہوئی ہے اور یہاں سے بڑی بڑی شخصیتیں اٹھیں، مگر نہرو کے سوا، دوسرا کون ہے جس کی موت پر دلّی کی آنکھوں نے یہ قابلِ رشک منظر دیکھا ہو کہ بلا کسی دعوت و تحریک کے اس کی لاش پر ایک طرف مسلمان قرآن خوانی کر رہے ہوں، تو دوسری طرف ہندو گیتا پڑھ رہے ہوں؟ اگر ایک جانب عیسائی انجیل پڑھ رہے ہوں تو دوسری جانب سکھ گرنتھ صاحب۔ کوئی شک نہیں کہ نہرو اسی محبت آب خراج کا مستحق بھی تھا۔ نہرو کی عظیم ہستی ایک ایسی ہستی تھی جس کو سارے ہندوستانی، بلا لحاظ رنگ و نسل اور بلا تفریق مسلک و مشرب، اپنا ایک ایسا محبوب قائد اور قابلِ فخر ہیرو سمجھتے تھے جس کا دل آلائش سے پاک اور جس کا دماغ ہر تعصب سے خالی تھا۔ وہ سارے ہندوستانیوں کے لئے یکساں روتا تھا اور دل سے روتا تھا، لہٰذا اس کے لئے سب ہی ہندوستانی رو رہے ہیں اور دل سے رویا کریں گے۔ کیونکہ اب خاک ہند کوئی نہرو نہیں اگلے گی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور ہمیشہ مسلّم رہے گی کہ جتنی آنکھیں نہرو کی موت پہ خوں فشاں ہوئیں وہ ہندوستان کے دوسرے کسی بھی بڑے سے بڑے سیاسی یا مذہبی رہنما کی وفات پر نہیں ہوئیں۔ اور آنسوؤں کے آبدار و تابناک موتیوں کا جتنا بڑا خراج متفقہ طور پہ سارے ہندوستانیوں نے جواہر لال کی لاش کو پیش کیا اور سینہ چاک و دریدہ دامن پھول، جس قدر نہرو پہ چاروں طرف سے بے اختیار نثار ہوئے اس کی مثال تاریخِ ہند میں نہ آج موجود ہے اور نہ کل ملے گی۔ ہاں اعتراف ہے کہ ادھر ایک صدی کے اندر ہندوستان نے متعدد گراں قدر ہستیاں پیش کیں اور جب وہ رخصت ہوئے ہیں تو لاکھوں آنکھیں ان پہ روئی بھی ہیں۔ مگر یہ اشک باری بہرحال محدود و مقید تھی۔ ارباب سیاست میں سے کوئی رخصت ہوا تو صرف ارباب سیاست رو لئے۔ کوئی حکمراں چل بسا تو حکومت کے ممنونِ احسان اہل کار روئے۔ مذہبی رہنما رخصت ہوئے تو بس مذہبی دنیا روئی۔ کوئی ادیب مرا تو صرف ادبی حلقہ متاثر ہوا لیکن ۲۷ مئی کو جو ہندوستانی مرا وہ ایسا مرا کہ جس پہ

پورا ہندوستان رویا۔ ساری دنیا روئی۔ آسمان و زمین تک روئے۔ ۲۷ مئی کو جب نہرو کی روح، قفسِ عنصری چھوڑ کر عالمِ بالا کو روانہ ہوئی تو آسمان نے آہ و زاری کی۔ دلّی میں آندھی آئی اور اس طوفانِ خاک کا اختتام چشمِ فلک کی اشک باری کے بعد ہی ہوا اور ۲۸ مئی کو جب فرشِ خاک پہ نہرو کی لاش نذرِ آتش ہونے کو ہوئی تو زمین نے کرب و اضطراب ظاہر کیا اور دلّی میں زلزلے کا جھٹکا محسوس کیا گیا۔

ہاں ۲۸ مئی (۱۹۶۴ء) کو نہرو کے مردہ جسم کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ شاید مئی کی یہی تاریخ (۱۴۳۱ء) تھی کہ جون آف آرک کے زندہ جسم کو آگ میں جلایا گیا تھا۔ دونوں کے جسم راکھ بن کر بظاہر معدوم ہو گئے مگر دونوں زندہ ہیں۔ نہ وہ فرانسیسی ہیروئن کبھی مرسکی اور نہ یہ ہندوستانی ہیرو کبھی مرے گا۔ موت اور حیات کا تعلق جسم سے نہیں عمل سے ہے۔ مرنا اور جینا ماہ و سال سے نہیں ایثار و قربانی سے ہے اور ان دونوں سرخ و سپید اور نرم و نازک جسم والی ہستیوں کی پوری زندگی مجسّم ایثار اور سراپا قربانی تھی۔ بھلا انھیں کون مار سکتا ہے؟

فطرت کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں جس مئی میں پنڈت موتی لال نہرو کی پیدائش (۶ مئی ۱۸۶۱ء) ہوئی تھی۔ اسی مئی میں ان کے بیٹے جواہر لال نہرو کی موت ہوئی۔ دونوں باپ بیٹے الہ آبادی یا کشمیری تھے مگر موتی لال نے لکھنؤ میں وفات پائی اور جواہر لال نے دلّی میں۔ شاید اس لئے کہ دونوں کی مادری زبان اردو تھی اور اردو کا مرکز یہی دونوں اہم شہر ہیں۔

نہرو کی موت پر اہلِ ادب اور اصحابِ قلم بھی سوگوار و ماتم دار ہیں۔ بے شک ان کی نوحہ خوانی و سینہ چاکی جائز اور درست ہے اس لئے کہ نہرو صرف سیاسی لیڈر اور ہندوستان کا پرائم منسٹر ہی نہ تھا بلکہ بہت بڑا ادیب اور متعدد کتابوں کا مصنف بھی تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ادیب تھا۔ ادب کا مقصد تنظیمِ انسانیت ہے، تشہیرِ ذات نہیں۔ لٹریچر کا حاصل تعمیرِ حیات ہے تفریحِ طبع نہیں۔ اور نہرو کا پیش کردہ ادب ایسا ہی ہے کہ اس کی بنیادیں وادیٔ حیات میں نصب اور قائم ہیں۔ [illegible] ہندوستان میں ' یا

ہندوستان کا اتحاد' یا 'ہندوستان کی دریافت' نہرو کی معتبر کتابیں تو ہیں ہی مگر 'میری کہانی' اور 'تلاش ہند' تو زندہ جاوید کتابوں میں سے ہیں۔ نہرو کا اپنا ایک خاص طرز تھا۔ وہ جو کچھ لکھتا تھا زندگی سے متعلق لکھتا تھا اور اس انداز سے لکھتا تھا کہ بہ باطن بہت کچھ بلکہ سب کچھ کہتا تھا مگر بہ ظاہر بہت ہی معمولی بات کہتا تھا۔ نہرو کی تحریریں پڑھنے سے زیادہ سمجھنے، سمجھنے سے زیادہ سوچنے اور سوچنے سے زیادہ عمل کرنے کی ہوتی تھیں۔ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ اس میں کیا کیا کچھ ہے، تشریح طلب نہیں۔ اس نے ایک جگہ لکھا ہے :-

" مختلف ممالک نے، مختلف قسم کے جانوروں کو اپنے مقصد یا سیرت کے اظہار کے لئے، علامت کے طور پر اختیار کر رکھا ہے۔ مثلاً ریاست ہائے متحدہ اور جرمنی نے عقاب، انگلستان نے شیر اور بل ڈاگ اور فرانس نے جنگجو مرغا۔ قدیم روس کا نشان ریچھ تھا۔ کیا جانوروں کو قومی نشان بنانے سے قوموں کی سیرت پہ کچھ اثر پڑتا ہے؟ ان میں سے اکثر لڑنے والے جانور بلکہ درندے ہیں۔ لہٰذا یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ جن قوموں نے اس قسم کی مثالوں کو سامنے رکھ کر نشو و نما پائی ہے انھوں نے خود بھی قصداً اس قسم کے عادات و خصائل اختیار کر لئے ہیں۔ وہ دوسروں پہ جھپٹتے ہیں، غراتے ہیں اور موقع پا کر دبوچ لیتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہندوؤں کے دل میں رحم اور عدم تشدد کا غلبہ ہے تو اس پہ بھی کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ان کا قومی نشان 'گائے' ہے۔

ہندوؤں کو یہ جانور محبوب ہے، وہ اس کی دیکھ بھال کیا، پرستش تک کرتے ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات اس کے لئے بلوے بھی ہو جاتے ہیں۔ با ایں ہمہ 'گائے' سے کچھ بہت اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے عبادت کے ساتھ شفقت کا ہونا ضروری نہیں"!

نہرو ایک نہایت فاضل اور بے حد وسیع النظر ادیب تھا اور اس کی ایک یہ بھی اپنی آپ خصوصیت تھی کہ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں اگر کسی شخصیت کا حوالہ دیتا تھا تو وہ اس کے نصب العین سے بڑی ہم آہنگ ہوتی تھی۔ ایک جگہ نہرو نے ایراسمس کا نام لیا ہے۔ میرے لئے یہ نام بالکل نیا تھا۔ مگر چونکہ یہ نام اس تحریر میں تھا جو ہندوستانی طالب علموں سے متعلق تھی۔ لہٰذا میں نے اس شخصیت کو جاننا چاہا۔ بڑی کوشش کے بعد پتہ چلا کہ ایراسمس ایک ڈچ اسکالر تھا۔ یہ ۲۸۔ اکتوبر ۱۴۶۶ء کو ہالینڈ کے شہر روٹرڈم میں پیدا ہوا اور ۱۲۔ جولائی ۱۵۳۶ء کو سوئٹزرلینڈ کے شہر باسل میں فوت ہوا۔ وہ ایک کھلے دل اور صاف نگاہ کا ادیب اور مصنف تھا۔ وہ بنی نوع انسان میں، کسی داخلی یا خارجی تفریق و تقسیم کا قائل نہ تھا اور احترام ذاتِ انسانی کا بڑا مبلغ تھا۔ اس کا قول تھا کہ ایک انسان کا بہ حیثیت انسان احترام کرنا چاہیئے، چاہے رنگ و نسل، ملک و قوم اور مذہب و مشرب کے لحاظ سے وہ جو بھی ہو۔ وہ رومن کیتھولک مذہب رکھتا تھا مگر نہ صرف دوسرے مذاہب ہی کا احترام کرتا تھا، بلکہ وہ اپنے مخالف معاصر مارٹن لوتھر کی ذات اور اصلاحی تحریک سے بھی ہمدردی رکھتا تھا۔ اتنا کچھ جاننے کے بعد سمجھ میں آیا کہ نہرو نے اس شخصیت کا نام کیوں اپنے نوجوان طلباء سے لیا تھا۔

ایسا ادیب جس کا سارا ادب، حیات کی تعبیر پہ مشتمل اور زندگی کی تفسیر پہ حاوی ہو، نہرو کے سوا ہندوستان میں دوسرا کوئی نہ تھا، اس لئے ہندوستانی ادیب، اگر نہرو کو روتے ہیں تو انھیں رونا ہی چاہیئے۔ واقعی یہ ماہ مئی ان کے لئے بڑا منحوس ثابت ہوا ہے۔ شاید ماہ مئی ادبی دنیا کے لئے اذیت رساں ہے۔ ہندوستان کے ادیب اگر اس ماہ میں نہرو کو رو رہے ہیں تو کوئی انوکھی بات نہیں۔ اسی ماہ مئی میں پولینڈ کی جنتا بھی ایک مرتبہ خوب رو چکی ہے، جب ۲۴۔ مئی ۱۵۴۳ء کو اس کا بے مثل جواہر کوپرنی کس ان سے چھینا گیا تھا۔ وہ کوپرنی کس جس نے دنیا کو پہلی بار بتایا تھا کہ زمین ساکن نہیں، جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا یا سمجھایا جاتا رہا ہے بلکہ متحرک ہے، اور سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا بلکہ زمین ہی سورج کا طواف کرتی ہے۔ ہاں اسی ماہ مئی میں فرانس کے

معنیقس بھی ایک بار بہت آنسو بہا چکے ہیں، جب ۳۰ مئی ۱۷۷۸ء کو ان کا بھی (نومبر ۲۱ - نومبر ۱۶۹۴ء) میں پیدا شدہ گراں قدر مصنف اور عظیم فلاسفر والٹیر انھیں داغ مفارقت دے گیا تھا۔ ہاں اسی ماہ مئی میں جرمنی کے ادیب بھی ایک موقع پر خوں فشانی کر چکے ہیں جبکہ ۹ - مئی ۱۸۰۵ء کو ان کا بھی (نومبر ۱۰ - نومبر ۱۷۵۹ء) میں پیدا شدہ مایۂ ناز شاعر شیلر ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ اس ماہ مئی میں انگلستان کے اہلِ علم و قلم بھی ایک بار سینہ کوبی کر چکے ہیں جبکہ ۱۶ مئی ۱۹۳۰ء کو ان کے شہرۂ آفاق ادیب و ناول نگار لاک کو موت نے ان سے چھینا تھا حالانکہ اہلِ انگلستان 'مئی ڈے' مناتے ہیں اور زمانۂ قدیم میں اس کی پرستش ہوتی تھی اور اسے بطور تیوہار منایا جاتا تھا۔ پھر جب مئی نے انگریزوں پہ رحم نہ کیا تو وہ ہندوستانیوں پہ کیا رحم کرتا۔ وہ آیا اور نہرو کو لے کر چلا گیا۔ وہ نہرو جس نے 'میری کہانی' کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے :-

"نہایت عجز و انکسار سے میں حکیم جلیل سقراط کا یہ قول نقل کرتا ہوں کہ "مجھے نہیں معلوم موت کیا ہے، ممکن ہے وہ کوئی اچھی چیز ہو، اس لئے میں اس سے نہیں ڈرتا۔ مگر یہ میں خوب جانتا ہوں کہ اپنے فرض سے منہ موڑنا برا ہے اور جس چیز میں بھلائی کا احتمال ہو، اسے میں اس چیز پہ ترجیح دیتا ہوں جس کی برائی کا یقین ہے۔"

زندہ باد قوم کے جواہر! پائندہ باد ہندوستان کے لال! تو زبانِ حال سے دائمی اور اپنے نامِ گرامی سے مُعلن ہے کہ "نہ رو" مگر ہم مجبور ہیں کہ تجھ کو روئیں۔ اس لئے نہیں کہ میرا رونا تیرے کام آئے گا بلکہ اس لئے کہ اس سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے اور میرا اپنا فائدہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تو ہمیشہ دوسروں کے لئے روتا تھا۔

احمد جمال پاشا

صلاح کار

ہر آرٹ ایک مصیبت ہوتا ہے مگر مصیبت خود ایک آرٹ ہے۔

میری مصیبت یہ ہے کہ میں مزاح نگار واقع ہوا ہوں اور اس رعایت سے میرے عزیز، احباب اور شناسا جو دراصل میرے واقف کار کم اور صلاح کار زیادہ ہیں، انھیں دیکھ کر میری کیا حالت ہوتی ہے، نہ پوچھئے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ مجھے دیکھ کر ان حضرات و خواتین کی وہی حالت ہوتی ہے جو عجائب گھر میں بن مانس کو دیکھ کر، حضرت انسان کی اس اشرف المخلوقات ہونے کے ساتھ ساتھ دن، رات، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے یہ اپنے قیمتی اور بالکل مفت کے مشوروں سے سرفراز اور گوناگوں خطرات سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ جن کی وجہ سے آرٹ کے ساتھ اب آرٹسٹ کی بھی خیر نظر نہیں آتی۔

جناب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ جہاں بات صلاح و مشورے اور تذکیر و تانیث کی حدوں کو پھلانگ کر ذاتیات تک پہونچ جائے اور عالم یہ ہو کہ مثلاً ایک عزیز کو سپردِ خاک کرتے وقت، سب پر عجیب رقت کا عالم طاری ہو گیا، میں بھی بے ثباتیٔ عالم پر دم بخود تھا کہ ایک عزیز نے چپکے سے کان میں کہا۔

"جس شخص کو زندگی بھر کوئی سہارا دینے والا نہ ملا، اس کی قبر پر لاتعداد مٹی دینے اور رونے والے جمع ہو گئے۔

پھر بولے

آپ آخر اس پر طنز یہ کیوں نہیں لکھتے۔

میرے ایک نہایت مشفق اور بے روزگار دوست ہمیشہ آنے کے بعد اور جانے سے پہلے، عین عالم جوانی میں نزول روزگار کی پیروی کا قصیدہ پڑھنے کے بعد زبردست اصرار کرتے۔

'بھئی خدا کے لئے اپنی خاطر بھی کچھ کرو!"

اور اس کر گزرنے سے ہمیشہ ان کی مراد ایک معقول ملازمت حاصل کرنے سے ہوا کرتی تھی۔ اس موقع پر وہ ہمیشہ مثال کے طور پر اپنے آپ کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا کرتے تھے۔ کہتے۔

"میاں! یاد ہے، جب میں جوتیاں چٹخایا اور دفتروں میں عرضی گزارا کرتا تھا تو میرا کیا حلیہ ہوتا تھا۔ اور اب دیکھو تمھارے سامنے مجسم موجود ہوں، یہ سوٹ جو اس وقت میں پہنے ہوئے ہوں بھلا تین سو روپے سے کیا کم ہوگا۔ ملازم سرکار ہونے کے بعد سے اب تک ایسے ایسے چھ سوٹ سلوا چکا ہوں، گزشتہ ماہ ہاؤسنگ سوسائٹی سے پلاٹ آپ کے سامنے ہی خریدا تھا۔ بھلا نوکر نہ ہوتا تو مکان بنوانے کے لئے آسان قسطوں پر قرضہ یوں مل جاتا، ضمانت کہاں سے لاتا، تنخواہ نہ ملتی تو ادائیگی کی کیا صورت ہوتی۔ یہ روزگاری بھی کس قدر منحوس چیز ہوتی ہے۔ چھپر پھاڑ کر رقم مل جانے اور بغیر ہاتھ پیر ہلائے دولت ہاتھ آجانے کے لئے سٹے بھرنے اور انعام کے انتظار میں چائے خانوں میں بیٹھے فلمی گانے سنتے جا رہے ہیں۔ چائے پی پی کر سوکھا اور سگرٹ پہ سگرٹ پی کر کلیجہ جلایا جا رہا ہے۔ لعنت ہے ایسی بے روزگاری اور بے کاری کی زندگی پر۔ مجھے دیکھو، دفتر جاتا ہوں دورے کرتا ہوں اور ٹھاٹھ سے گھر پر رہتا ہوں۔ چائے، پان، سگرٹ، دنیا کی کسی

خراب لت میں نہیں، لہٰذا جناب دیکھئے۔ وہ دن بھی دور نہیں جب آپ کے دروازے پر موٹر کھڑی ہوگی۔

اس کے بعد بطور لاٹن کلیر سائیکل کی گھنٹی بجاتے ہوئے، وہ سائیکل پر سوار ہوکر تاکید کرتے ہوئے گزر جاتے۔ عرصہ بعد وہی حضرت، واقعی موٹر ہی پر سوار تھے۔ مگر میں بھی اس دوران بے روزگاری کا پل صراط پار کر چکا تھا لہٰذا ان کو اپنے پابہ زنجیر ہونے کی بشارت دی۔ فوراً لاحول پڑھتے ہوئے بولے۔

"ہمت بیتر ہے کی! پانی وہیں مرا جہاں پہ نشیب تھا۔ خراب ہوگئے ہو اب اس پر بھی کچھ لکھ ڈالو!"

ایک عزیزترین دوست اچانک ہماری محفلوں سے کافور ہوگئے۔ ایک دن سر راہے پکڑ لئے۔

پوچھا۔

"اتنے دن کہاں غائب رہے، حضرت؟"

بولے۔

"بھئی خفا ہوں، اس لئے نہیں آتا۔"

خفگی کی وجہ دریافت کی۔

دماغ پر زور ڈالتے ہوئے وانزدارانہ انداز میں بولے۔

"بھائی ایمان کی بات پوچھئے تو اب اصل واقعہ خود مجھے بھی نہیں یاد۔"

میں نے گزشتہ را صلواۃ کرتے ہوئے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ موصوف بڑی گرمجوشی کے ساتھ بغلگیر ہوئے اور چلتے وقت تاکید کر گئے۔

"بھئی یہ بھی خوب رہی — اس پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھئے گا۔!"

میرے ایک دوست مقامی سینما گھروں پر عاشق ہوگئے۔ عشق بھی ایسا کہ فلم اچھا ہو یا بُرا، بار بار دیکھا جا چکا ہو یا دیکھنے کے لائق تک نہ ہو، آندھی، طوفان اور جھکڑ چل رہا ہو یا اولے گر رہے ہوں بس ان کو تو سینما ہال میں بیٹھ کر تین گھنٹے گزارنے سے مطلب، وقت گزاری کے لئے احباب کا سہارا لیتے، فلم دیکھتے میں بتاتے بھی جاتے۔

"یہ فلم میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا تھا جب آپ ماشاءاللہ شیر خوارگی کا دودھ پیتے اور گھٹنوں کے بل چلتے تھے۔ اس وقت اس فلم کے گانے اور مکالمے بالکل صاف اور سمجھ میں آجاتے تھے . . .

جب پچیسویں بار میں یہ فلم دیکھ رہا تھا تو مجھے اب بھی اچھی طرح یاد ہے کہ میرے ایک دوست، جن کو میں نے اپنے پاس بلا کر جگہ بھی دی تھی اور انھوں نے میرے برابر بیٹھتے ہوئے مجھے بتایا تھا۔

"دوست! ابھی ابھی ریڈیو پر خبر آئی ہے کہ نازی جرمنی نے ہتھیار ڈال دئے۔ اتحادی فوجیں برلن میں داخل ہوگئیں اور ہٹلر لاپتہ ہوگیا۔"

ایک دفعہ ہمارے ایک دوست اس چکر میں کہ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟ ان کے ساتھ ان کی پسندیدہ فلم دیکھنے کے لئے چلے گئے۔ ہمارے دوست کا کہنا ہے۔

"فلم میں متحرک تصویروں کی جگہ چادر پہ چھائیاں تھیں اور آواز کے لئے منیجر سینما ہذا بھونپو کا آزادانہ استعمال کر رہا تھا اور میرے دوست خاموش فلموں کے آرٹ پہ مسلسل تقریر کر رہے تھے۔"

ہمارے دوست نے فلم سے واپسی پر اپنی داستانِ غم سناتے ہوئے بڑی عاجزی کے ساتھ اصرار کیا۔

"بھئی اس واقعہ پر ضرور کچھ لکھنا!"

ہمارے ایک دوست کو جب یہ معلوم ہوا کہ اب ہمارا بھی تعلق کسی اخبار سے ہے تو انھوں نے "اخبار کی اشاعت میں اضافے کے فن" پر ایک مدلل تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"اگر آپ خالی وقت میں لوگوں کو جا کر اپنا اخبار سنایا کریں تو اخبار کی مقبولیت میں چار چاند لگ سکتے ہیں۔"

پھر بولے:-

"اور اس پر بھی . . . . !"

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا

"سمجھ گیا! سمجھ گیا مہربان۔ اس پر بھی ضرور کچھ لکھوں گا!"

مگر صاحب آپ جانئے کہ ایک بزرگ نے تو بالکل کمال ہی کر دیا۔ آتے ہی بجائے علیک سلیک کے بگڑنا شروع کر دیا۔

"غلہ مہنگا کرنے کی خبر پر خوردار لکھلے ہی لکھلے چھاپ دی، ہمیں ہوا تک نہ دی . . . . اگر سیلاب کی خبر پہلے سے بتا دیتے تو یوں سر پر پاؤں رکھ کر نہ بھاگنا پڑتا۔ واہ پڑوسی ہونے کا

خوب حق ادا کیا۔ اتنا ہی دکھلا سکے کہ اب کی بارش میں یہ مکان ضرور گر جائے گا۔"

اس کے بعد چلتے وقت کھو کھلا قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے بولے
"اس آئے دن کی رانداری پر بھی کچھ لکھو!"
اس قسم کے صلاح کار بلا اتفاق سب سے زیادہ اخباری نمایندے معلوم ہوتے ہیں اور آتے ہی اصرار شروع کر دیتے ہیں۔
"آخر آپ کو اس خبر کے چھاپنے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے کہ شہر سے جو بچے غائب ہو رہے ہیں وہ فکر سنگھ نہیں لے جا رہے ہیں بلکہ دریا کے نئے پل کی بنیاد میں ڈالے جا رہے ہیں — بھئے صاحب! اس پر اپنے اخبار میں کچھ لکھئے، کہ آخر یہ طریقہ کیا ہے؟"
لکھنے لکھانے کا سب سے زیادہ اصرار اس قوم کی طرف سے کیا جاتا ہے جس کو عرف عام میں ایڈیٹر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ صلاح کار کم اور مدیر زیادہ ہوتے ہیں اور اپنے رسالوں میں بیٹھے اپنی تازہ بستیاں آباد کرتے رہتے ہیں۔ آبادی میں اضافے کے لئے خاص خاص موقعوں پر اپنے خاص نمبر اور سال نامے نکالتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی عام نمبر بھی نکال دیتے ہیں۔ جہازی سائز کے بھاری بھرکم اسپیشل نمبر نکالتے رہنے کی وجہ سے ان کے پاس اتنا وقت نہیں رہتا کہ وہ عام نمبر نکال سکیں۔ ان کی ریل پیل دیکھ کر شبہہ ہوتا ہے کہ شعرائے کرام کی طرح مدیران رسائل بھی لاتعداد ہو چکے ہیں اور چھاپنے والوں کے مقابلے میں چھپنے والوں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے۔ مضمون منگوانا تو خیر ایک بہانہ ہوتا ہے ورنہ ان کا بس چلے تو مصنف سے پورا رسالہ لکھوا لیں۔ مگر وہ تو کہئے کہ لکھنے والے ان کے ہاتھ نہیں لگے ہیں۔ یہ صلاح کار غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ لکھنے والا بھی کچہری کے منشی کی طرح ہر وقت کان میں قلم لگائے تیار بیٹھا رہتا ہے کہ ادھر کوئی درخواست آئی اور منشی جی نے کان دبا کر کھٹ سے نقل تیار کر دی۔ اسی وجہ سے ادب کم اور نقلیں زیادہ نظر آتی ہیں۔

صبح شام جہاں دو ہی سے ڈاکیے کی صورت نظر آئی اور آپ کی روح فنا ہوئی کہ منشی جی سے درخواست نقل کروانے کی درخواست ہوگی اور بطور دستی پیچھے رسالے لائے گا اور اس کے بعد خطوط کی شکل میں پوری پلٹن ہوگی جو رفتہ رفتہ ایکسپریس ڈیلیوری اور ٹیلیگرام کی صورت اختیار کرلے گی۔ ان خطوط کو چاک کرنے کی نوبت نہیں آتی اور لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں۔ اس قسم کے مہربان پہلے انتہائی بے تابی کے ساتھ خیریت دریافت کرتے ہیں پھر کسی لیبے نمبر کی خوش خبری سناتے ہیں جو نہ ان سے قبل کسی مسوّدے کو سوجھا تھا اور نہ ان کے بعد دُور دُور تک اس کے نکلنے کا امکان ہے یا اس پر شرمندگی کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ بغیر آپ کی اجازت کے سال نامے کا اعلان کر دیا۔ اب عزت آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ فوراً مضامین، اشتہار اور کچھ خریدار بھجوائیے۔ یا افسوس صد افسوس کہ اچانک علامہ ہری چگ کی وفات حسرت آیات کے عمل میں آجانے سے اردو ادب میں دُور دُور تک سناٹا ہو گیا ہے جس کو دور کرنے اور کھوئی ہوئی رونق کو دوبارہ لانے کے لئے آپ ہمیں اپنی پہلی فرصت میں علامہ ہری چگ نمبر کے لئے ایک مضمون بعنوان "آہ! آہ علامہ ہری چگ" (عنوان کا اعلان کیا جا چکا ہے) بھیج دیجئے۔ یا سُنا ہے کہ آج کل آپ فلاں کتاب پڑھ رہے ہیں۔ یہ کتاب ہمارے پاس بھی آئی ہے۔ مہربانی کر کے اسے نوٹس بنا کر پڑھئے اور اپنی پہلی فرصت میں اس پر تبصرہ کر کے بھیج دیجئے۔ یا یہ خوش خبری سنانے کے بعد کہ برخوردار سعادت آثار فلاں یونی ورسٹی یا کالج میگزین کے اڈیٹر بنا دئے گئے ہیں مگر ابھی حالات مشکوک ہیں لہذا اڈیٹری پکی کرنے کے لئے متعلقہ پرنسپل یا ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس لئے مہربانی کر کے آپ ان کی حیات جاوید پر ایک مقالہ لکھ کر بھیج دیجئے۔ کیونکہ موصوف اپنی تعریف سن اور پڑھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارا فرسٹ کلاس اور فری شپ بالکل یقینی سمجھئے۔ اور دوسری سہولتیں ملنے کا بھی قوی امکان ہے۔" غرض مضمون کا تقاضہ ہو، یا خط اور پیغام کی فرمائش، آخر میں اس پر ضرور اصرار ہوتا ہے — کہ کچھ تو لکھئے — اوروں کی نہ سہی ہماری خاطر سہی — مگر خدا کے لئے لکھئے ضرور —"

لیکن صلاح کاروں کی بھیڑ بھاڑ اس وقت دیکھنے والی

ہوتی ہے جب مجھ پر کسی بیماری اور تیمارداروں کا حملہ ہوتا ہے۔ زندگی ہی میں اپنے عرس کے مزے آ جاتے ہیں۔ آتے ہی کوئی نبض دیکھ رہا ہے کوئی پیشانی یا گردن دبا رہا ہے۔ پیٹ دبانے اور سینہ بجانے کے بعد حلق کھلواتے ہوئے تلوؤں میں جان ڈھونڈ رہا ہے۔ کوئی تھرما میٹر کی تلاش کے دوران سورۂ یٰسین پڑھ کر دم کر رہا ہے۔ یا پڑھا ہوا پانی پلانے کے بعد امام ضامن باندھ رہا ہے۔ کسی کو آسیب کا خلل معلوم ہوتا ہے۔ کوئی ان کے درد کو درد گردہ کے آثار بتا کر یقین دلا رہا ہے کہ "اگر فوراً ڈاکٹر نہیں بدلا گیا تو تپ کا خطرہ ہے جو کسی وقت بھی تپ دق میں تبدیل ہو سکتا ہے — ملا سیانوں کے پاس لے جانے کے الگ مشورے ہو رہے ہیں۔ تیر بہدف قسم کے مجرب نسخے، فقیری ٹوٹکے، خاندانی چٹکلے اور حکیم ڈاکٹروں کے تجربے اور معجزے بیان کئے جا رہے ہیں۔ گنڈے، تعویذ کی کونسلنگ کے ساتھ ساتھ خواتین مجھ کے رہنے میں صحت کے پنہاں راز افشا کر رہی ہیں۔ کوئی آتے ہی غرا رہا ہے۔

"اطلاع کیوں نہ دے دی، پہلے سے بتا کر بیمار کیوں نہیں پڑے چھپانے سے فائدہ، بھلا بیماری اور عشق بھی کہیں چھپائے چھپے ہیں اچھا حال چال بتاؤ۔"

کوئی کہا سنا معاف کروانے کے لئے گھگی باندھ رہا ہے تو کوئی محبوب کی کمر کی طرح ہم کو بستر کی سلوٹوں میں ڈھونڈ رہا ہے کہ کدھر ہو؟ اماں نظر نہیں آ رہے ہو۔۔؟"

اور ہمارے جیسے ہٹے کٹے کو ہڈیوں کا ڈھانچا بتاتے ہوئے دریافت کر رہا ہے کہ۔

"ارے کس کی نظر لگ گئی تم کو۔ اے ہے۔ بالکل پیلے پڑ گئے۔ ایکدم زرد!"

ان نظر آنے والوں میں لطف یہ ہے کہ عیادت اور تیمارداری کے لئے سوائے ڈاکٹر اور محبوب کے سب ہی پہنچتے ہیں اور ہونے والوں میں سب سے زیادہ تعداد بن بلائے اور ناپسندیدہ مہمانوں کی ہوتی ہے۔ جو آتے ہی چارپائی کم اور گھر زیادہ گھیر لیتے ہیں۔ مجبوراً قرض کی لعنت، بن بلائے مہمانوں کی مصیبت اور صلاح کاروں کے قیمتی مشوروں سے بچنے کے لئے خود ہی دو چار دن میں لوٹ پوٹ کر اچھے ہو جاتے ہیں۔ لیکن اچھے ہونے پر بھی قصور معاف نہیں ہوتا اور یہ سزا تجویز کی جاتی ہے۔

"اس پر بھی کچھ لکھو۔"

قصہ مختصر اب رفتہ رفتہ یہ سمجھ میں آ رہا ہے کہ ان صلاح کاروں کی صلاح سے کچھ لکھوں یا نہ لکھوں مگر ان کی دن رات کی فرمائشوں پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھوں۔

لہٰذا اس وقت بھی جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ اس کو بھی اس سلسلے کی تمہید کی ابتداء کا آغاز سمجھا جائے۔

مضمون نگار حضرات سے!

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوشخط لکھئے۔

۲۔ غیر مطبوعہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جا سکتے ہیں جبکہ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ اس کے ہمراہ ہوں۔



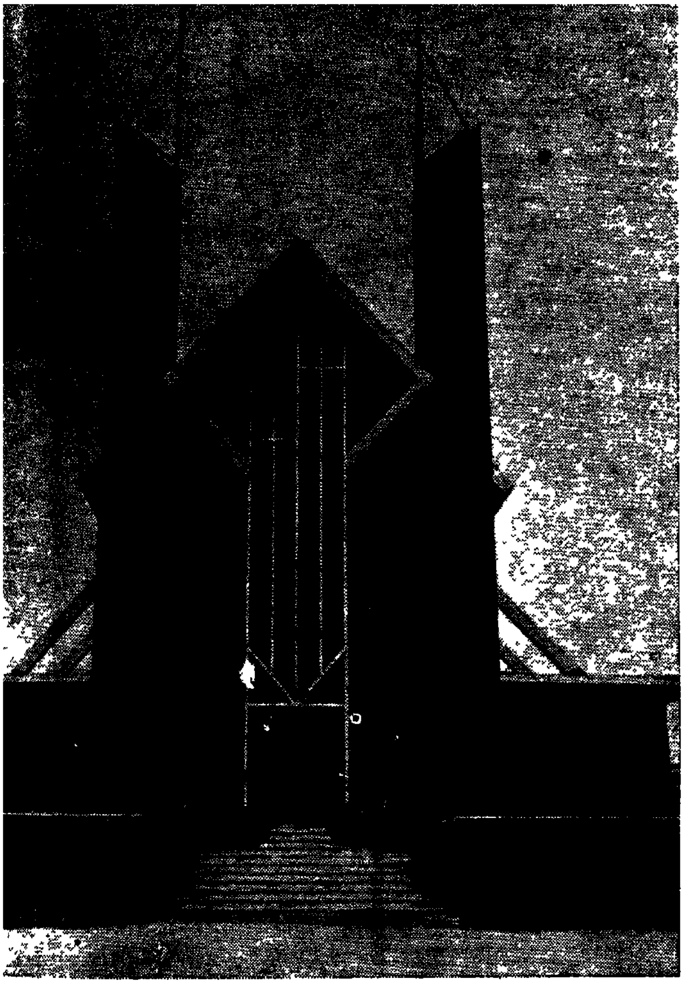
پوپ پال ششم
رومن کیتھولک عیسائیوں کے عالمی پیشوا



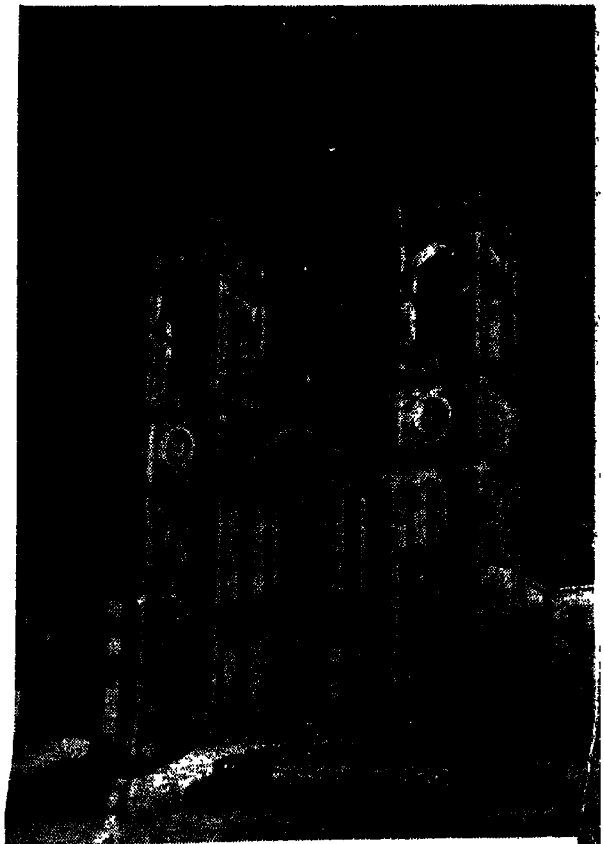
پہلے ہندوستانی کارڈینل - کارڈینل گراشیاس



سینٹ تھامس کیتھیڈرل، سن ٹوم، مدراس



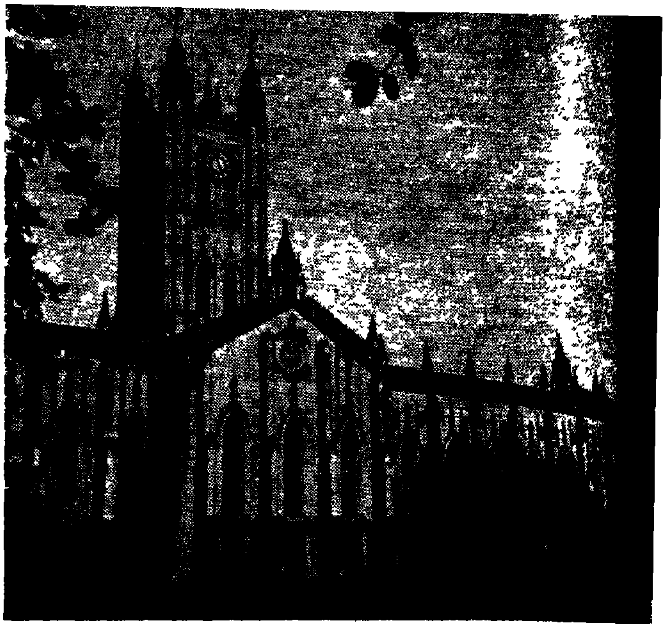
سینٹنری چرچ (میتھوڈسٹ) لودی روڈ، نئی دلی



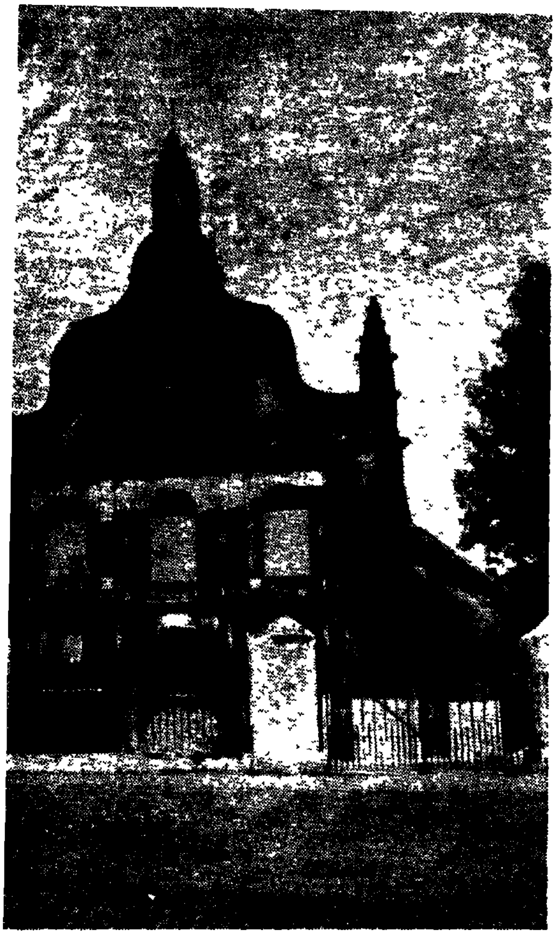
سینٹ جوزف کیتھیڈرل، حیدرآباد

سینٹ جیمس چرچ (اینگلیکن) کشمیری گیٹ، دلی



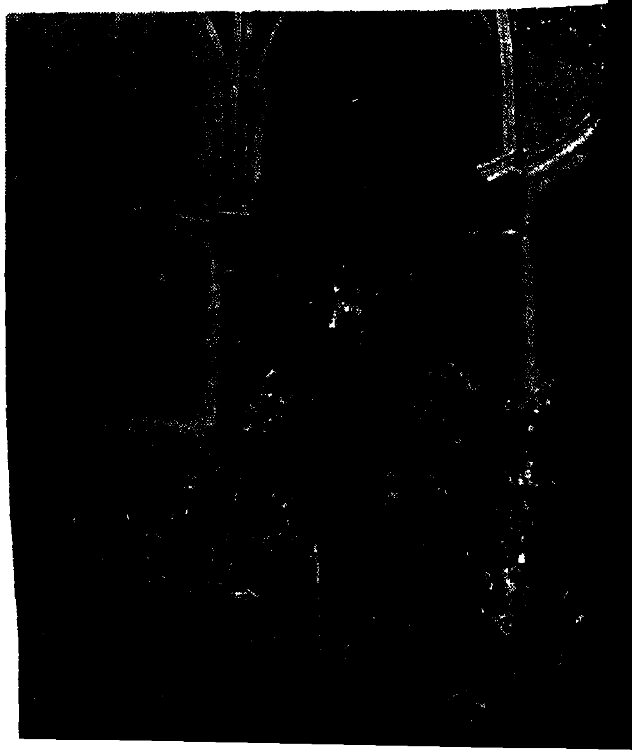


سینٹ پال کیتھیڈرل، کلکتہ

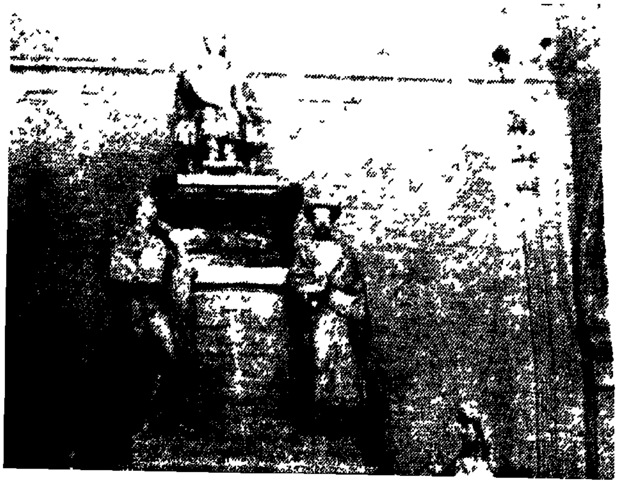


سینٹ فرانسیس چرچ، فورٹ کوچین
جہاں واسکوڈی گاما دفن ہیں

سینٹ میری کا گرجا، باندرہ بمبئی



سردھنا (ضلع میرٹھ) کے گرجے کا ایک اندرونی منظر





جناب نصیر الدین ہاشمی مرحوم

صاحب نظر گیا

(مولوی نصیر الدین ہاشمی کی وفات حسرت آیات پر)

صاحب نظر، مزاج شناسِ ہنر گیا
اردو کی انجمن سے پھر اک دیدہ ور گیا
وہ ہاشمی، وہ مرکزِ انوارِ جستجو
تحقیق کی تلاش میں جانے کدھر گیا
مہتابِ فکر و فن کا سرِ شام گُل ہوا
شہرِ نوا میں صبح کا اک گیت مر گیا
خونِ جگر سے گلشنِ اردو کو سینچ کر
اپنا نہیں دکن کا بھی وہ نام کر گیا
پیمانہ ہے اُداس تو ساغر خموش ہیں
میخانہ رو رہا ہے کہ اک شیشہ گر گیا

وقار خلیل

وحید اختر

طوفاں گزر گیا

سنتے ہیں اپنے سر سے وہ طوفاں گزر گیا
انداز جس کا کھیلنے والا حیات سے
رفتار جس کی تیز حدِ ممکنات سے
لب پر مبارزت کہ لڑے گا ثبات سے
جو قطرہ قطرہ جمع کیا ماہ و سال نے
وہ جام چھین لے گا تمنا کے ہات سے

تلوار اٹھ گئی تھی مگر وار اچٹ گیا
قاتل کا ہاتھ اپنے ہی حربے سے کٹ گیا

سنتے ہیں اپنے سر سے وہ طوفاں گزر گیا
یہ تم ہو یا تمھاری محبت کا معجزہ
سنتے ہیں آزمائشِ زخمِ جگر ہوئی
کھوئے رہے ہم اپنے، نہ کچھ بھی خبر ہوئی
ایجادِ ظلم و جور نہ کچھ کارگر ہوئی

گزرے غمِ حیات کی راہوں سے اس طرح
دامن سے مس نہ خاکِ سرِ رہ گزر ہوئی

جاں کے زیاں کا خوف، نہ فکرِ معاش تھی
نشتر نکل بھی آیا رگِ جاں میں ڈوب کر
سرشارِ قربِ حال میں اپنے مگن رہے
اندیشۂ فراق ہی سے آنکھ تر رہی
دیکھا نہ گردشِ ستمِ دہر کی طرف
گیسو کی شام، رُخ کی سحر پر نظر رہی
دامن ہوا تبھی، نہ ہوئی آستین نم
ہر کاوشِ سموم و صبا بے اثر رہی
آنکھوں میں گرد اڑی نہ غبار آیا قلب میں
رستے کی خاک رستے کے دامن ہی پر رہی

تم جب تلک ملے نہ تھے راہِ حیات میں
سر پر گرجتا رہتا تھا طوفانِ صبح و شام
دل میں اُترتی رہتی تھی اک تیغِ بے نیام

ضد تھی ہوا کو پاؤں زمیں سے اکھاڑ دے
ہر غم کو آرزو تھی کہ چہرہ بگاڑ دے
ہر حادثے کو فکر کہ دل میں غبار آئے
ہر ظلم چاہتا تھا کہ سینہ فگار ہو
اصرارِ یاس کو کہ ہر امید خوار ہو
آلام کا تقاضہ حدِ ضبط ٹوٹ جائے
خود زیست ملتجی "مرا دامن تو چھوٹ جائے"
ہر صبح قتل کرتی تھی، ہر شام سنگسار
ہر روز مانگتا تھا لہو دل کا روزگار
ہر شب بنانے آتی تھی امید کا مزار

یہ سب اسی لیے تھا کہ تنہا تھی آرزو
رسمِ حیات سے نہ شناسا تھی آرزو
تب آرزو کسی کو بھی پہچانتی نہ تھی
سب دیکھتی تھی، کچھ بھی مگر جانتی نہ تھی
جب سے تمہیں نگاہِ طلب مانگنے لگی
چہرہ ہر ایک چیز کا پہچاننے لگی
انداز کائنات کے سب جاننے لگی

تم سے ملے تو ہم پہ کھلا رازِ زندگی
اب حادثاتِ وقت کا کوئی اثر نہیں
طوفان سر سے گذرا تو دل کو خبر نہیں

بشریٰ ناہید

غزل

دردِ دل دردِ جاں فزا بھی نہیں
انتہا ہے کہ ابتدا بھی نہیں
سر کہ تیرے حضور خم ہے مگر
لب کہ تیرے حضور وا بھی نہیں
پرسشِ چشمِ یار کے صدقے
بات کرنے کا حوصلہ بھی نہیں
کون کہتا ہے اپنے دل کی بات
کیا کہا آپ نے سُنا بھی نہیں
آپ اور اس قدر کرم فرما
کیا ستم کی یہ انتہا بھی نہیں
سر بہ سجدہ ہیں گام گام مگر
در خورِ لطف و اعتنا بھی نہیں
دل کو جس سے لگاؤ ہے بشریٰ
وہ صنم بھی نہیں خدا بھی نہیں

اقبال متین

جھوٹی سچائی

دوراہے پر پہنچ کر اس کا جی چاہا سیدھے راستے پر چل پڑے اس کے باوجود بھی کہ وہ طویل تھا لیکن اس نے خود کو لعنت ملامت کی۔ بزدل — موت بھی کوئی ڈرنے کی چیز ہے جس کا آنا یقینی ہے اور جس وقت اس کو آنا ہے وہ آکر رہے گی۔ پھر وہ سوچنے لگا یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے۔ اس کو ٹالا بھی جا سکتا ہے۔ وہ چند روز توقف بھی کر سکتی ہے۔ انسان کے بس میں کیا نہیں ہے۔

لیکن اس کی سائیکل سیدھے راستے پر دور تک نکل گئی۔

اس نے سوچا اب بھی واپس لوٹ کر پھر اس راستے پر چل پڑے جو اس کی منزل کو قریب تر کر دیتا تھا لیکن اس کے ذہن میں ایک اور منطقی استدلال اُبھر آیا — اور وہ سوچنے لگا کہ اس طرح واپس لوٹنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ میں اس خیال کو اہمیت دے رہا ہوں جو میرے دل و دماغ پر آہستہ آہستہ حاوی ہو رہا ہے۔

"اب جبکہ یہاں تک چلے آئے ہیں تو چلو یہی راستہ سہی۔

واپسی میں تو ادھر سے آسکتے ہو۔"

دل نے جیسے چوری پکڑ لی۔

اس نے خوف کی پرچھائیوں کو پیچھے چھوڑنے کے لئے اتار پر سائیکل تیز کر دی اور ہواؤں میں تتلی کی طرح ڈولنے لگا۔ اس طرح خود اپنے آپ کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ وہ تر نگ میں ہے اور کوئی خوف اس کا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔

"واپسی میں — یقیناً ادھر ہی سے آؤں گا۔" اس نے دل ہی دل میں اس طرح طے کیا جیسے عزم کر رہا ہو — اور پیٹی بجا کر سائیکل پر ہواؤں میں ڈولتے ہوئے اس نے خود کو زندگی کی گود میں ہمکتا ہوا محسوس کیا۔

دفتر سے واپسی پر جب اس کی سائیکل اس کمان کے پاس تک پہنچ گئی جس میں داخل ہو جانے سے وہ راستہ شروع ہو جاتا تھا جس پر سے ہو کر گزرنے سے اس کا گھر نسبتاً بہت قریب پڑتا تھا تو بادلِ ناخواستہ وہ اس راستے پر مڑ گیا۔

کاش مجھے یاد نہ آتا کہ میں نے اس راستے سے واپسی کا عزم کیا ہے — یہ خواہش اس کے دل میں تھی لیکن وہ اس خواہش کو مان لینے کے لئے تیار ہی نہ تھا۔ اس لئے کہ ایک خوف سا اس کے دل و دماغ کو آہستہ آہستہ اپنی گرفت میں لیتا جا رہا تھا جس کے آگے سپر ڈال دینا اسے گوارا نہ تھا۔ اگر وہ اپنی شکست تسلیم کر لیتا تو پھر یہ راستہ اس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا۔

اس کی نظر میں اس راستے کے مسدود ہو جانے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

فرض کیجئے کہ بیچ راستے پر حکومت کوئی بلڈنگ کھڑی کر دینا چاہے اور اس طرح یہ راستہ بالکل بند ہو جائے جو اس کے گھر اور دفتر کے درمیان خطِ مستقیم بنا ہوا تھا تو اس کو حکومت پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

کوئی باغی کسان سیمنٹ روڈ اکھیڑ کر اس پر ہل چلا دے اور اس طرح بیچ سڑک پر کھیتی لہلہانے لگے تو بھی اس کو کوئی اعتراض نہ تھا۔

پچ پوچھئے تو ایسی کوئی تبدیلی اس کے لئے ایک چھپی ہوئی مسرت کا باعث تھی جس کو وہ علی الاعلان ماننے کے لئے بھی آمادہ نہ تھا۔

جب اس کی سائیکل قبرستان کے رد بر رو سنگ تراش کی دوکان کے برابر پہنچ گئی تو اس نے سوچا کہ میں سنگ تراش کی دوکان کی جانب نگاہ کئے بغیر ہی کیوں نہ گزر جاؤں — پھر خود ہی اس نے اس خیال کی تردید کی کہ یوں چوروں کی طرح نظر اٹھائے بغیر گزر جانا کسی خوف کی نشان دہی کرتا ہے جسے میں جھٹلا رہا ہوں۔

اس کے ذہن میں ایک جھنجھلاہٹ سی آ گئی — اتنا سارا راستہ میں نے یہ سوچے بغیر کہ میرے جوانب میں کیا ہے طے کر دیا۔ اِدھر اُدھر نظر اٹھائی بھی تو کوئی شے نظروں میں کھب کر تو نہیں رہ گئی اور نہ یوں ہوا کہ کسی خوف سے نظریں جھکی جھکی رہ گئی ہوں — لیکن سنگ تراش کی اس دوکان سے گزرتے وقت آخر مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ آج کتنے دن سے میں اس خیال سے لڑ رہا ہوں کہ واہمہ زندگی کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔ کتنی ہی بار گھر سے چلتے وقت میں نے طے کیا ہے کہ آج سنگ تراش کی اس دوکان سے اس طرح گزر جاؤں گا جیسے مسافر راستے سے گزر جاتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اس خیال نے جھنجھوڑ دیا کہ سنگ تراش کی دوکان سے گزرنے کے لئے قبل از قبل ذہن کو ہموار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مسافر اس راستے سے اس طرح تو نہیں گزرتے بس گزر جاتے ہیں — یہ قبل از قبل سوچ بچار اسی خوف کی بنیاد ہی تو ہے جو میرے دل میں جاگزیں ہو رہا ہے۔

لیکن — لیکن میں اس خوف کو اپنے دل سے نکال پھینکوں گا۔ اور اس نے اپنے جوان ارادوں کی قسم پکڑ کر بڑی ہی بے اعتنائی سے سنگ تراش کی دوکان کی جانب نظریں اٹھائیں تو ترشا ترشایا قبر کا تعویذ جوں کا توں دھرا تھا — اس کے دل پر ایک دھچکا سا لگا لیکن اس نے اس دھچکے کو اس طرح محسوس کرنے کی کوشش کی جیسے کسی میلے میں وہ کسی دوشیزہ سے ٹکرا گیا ہو لیکن قبر کا تعویذ بہرحال دوشیزہ نہ بن سکا۔

اس نے قبر کے اس تعویذ سے آنکھیں چرا کر سنگ تراش کی دوکان کا جائزہ لیا۔ قبروں کی بندش کے لئے بلا ترشے ہوئے پتھر اور قریب قریب ایک سائز کی کٹی ہوئی چھوٹی اور بڑی پتھر کی کڑیاں اس دوکان کے احاطے میں چوطرف ڈھیروں سے بکھری ہوئی تھیں اور انھیں میں ترشا ترشایا مردانی قبر کا بھاری بھرکم تعویذ، زنانی قبر کے تعویذ کے برابر ہی نمایاں طور پر رکھا گیا تھا کہ آسانی سے راہ گیروں کی نظر پڑ سکے۔ لیکن اس کے باوجود بھی کتنے ہی مسافر اس تعویذ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ اس بے اعتنائی میں ان مسافروں کا کوئی دوش نہیں تھا۔ زندگی انھیں فرصت ہی کہاں دیتی تھی کہ وہ لمحہ بھر کے لئے موت کی طرف توجہ دیتے اور اگر سنگ تراش کی اس دوکان سے گزرتے ہوئے عاقبت کا کوئی مبہم سا تصور اس کے ذہن میں ابھرتا بھی ہوگا تو یہ ایک لمحہ بہتے ہوئے وقت کے سمندر میں مل کر خود اپنی موت آپ مر جاتا ہوگا اور زندگی وقت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر بن کر ہر مسافر کے آگے پھیل جاتی ہوگی جس سے بہرحال اس کو پار اترنا ہے۔

لیکن وہ جب پہلی بار اس راستے سے گزرا تھا تو سنگ تراش کی دوکان کے احاطے میں دھرے ہوئے اس بھاری بھرکم پتھر کے تعویذ کو دیکھ کر اس کے دل میں اچانک ایک خیال آیا تھا کہ خدا جانے وہ شخص اب کہاں ہوگا اور کون ہوگا جس کی قبر پر یہ تعویذ رکھا جائے گا۔ پھر اچانک ہی اس خیال نے کچھ اس طرح کروٹ لی تھی کہ وہ شخص اب یہیں ہے اور وہ خود ہے — اور وہ بوکھلا گیا تھا — کیا بکواس ہے کیسی بزدلی ہے یہ — اگر یوں ہوگا تو یوں ہی سہی — لیکن لیکن یوں ہوگا ہی کیوں —

راہ چلتے ایک خیال تھا جو اس کے ذہن سے یوں گزر گیا

تھا جیسے کسی چھوٹے سے ویران پلیٹ فارم سے ایکسپریس ٹرین بغیر ٹھہرے دندناتی گزر جاتی ہے اور پٹڑیاں کانپتی رہ جاتی ہیں اور اسٹیشن کی بلڈنگ منہ کھولے حیران حیران سی تکتی رہ جاتی ہے۔

اور پھر ٹرین کے گزر جانے پر اس پلیٹ فارم کی کس مپرسی زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے، اداسی زیادہ ہی ابھرتی ہے۔

اس کے دل سے بھی دندناتی ایکسپریس ٹرین کی طرح ایک خیال گزرا تھا اور پھر وہی سب کچھ ہو گیا جو اُجڑے پلیٹ فارم پر سے ٹرین کے گزر جانے سے ہوتا ہے۔

اب روزانہ کا اس کا معمول یہی تھا کہ دفتر جاتے ہوئے اور دفتر سے لوٹتے ہوئے یا تو وہ خود کو فریب دے کر اس قریبی راستے سے احتراز کرتا جو قبرستان اور سنگ تراش کی دوکان کے درمیان سے گزرتا تھا یا پھر اپنی اندرونی اضطراری کیفیت اور ذہنی اُلجھن کو دُور کرنے کے لئے خود کو آمادہ کرتا اور اسی راستے پر چل پڑتا — لیکن سنگ تراش کی دوکان کے پاس پہنچ کر اس کی نظریں اسی اُلجھن اور بے کلی کے عالم میں سنگ تراش کے احاطے کی جانب اُٹھ جاتیں جہاں بھاری بھرکم تعویذ اس طرح دھرا رہتا جیسے اس کے سینے پر دھرا ہو — اور وہ سینے پر اس کے بوجھ کو محسوس کرنے لگتا۔

ایک دن گزرتے گزرتے اس نے جھلا کر طے کر لیا تھا کہ میں نہ صرف آج سنگ تراش کے احاطے کی طرف نہیں دیکھوں گا بلکہ مکمل پانچ دن تک ادھر نظریں نہ اُٹھاؤں گا اور اس طرح بھول جاؤں گا کہ کوئی سنگ تراش کی دوکان راہ میں پڑتی ہے جس کے احاطے میں ایک قبر کا بھاری بھرکم تعویذ دھرا ہے جو کسی نہ کسی مرنے والے کا منتظر ہے — اور وہ مرنے والا — اور وہ مرنے والا — اور وہ مرنے والا — میں — میں — میں — اور وہ نظریں اُٹھائے بغیر سنگ تراش کے احاطے کے برابر سے گزر گیا — شام جب وہ دفتر سے لوٹ رہا تھا تو کمان میں مڑتے ہی اسے خیال آ گیا کہ اس کو سنگ تراش کے احاطے کی جانب نظریں اُٹھائے بنا ہی گزر جانا ہے سو پھر اس نے ایسا ہی کیا۔

اب تو تین روز سے اس کا یہی معمول تھا۔ اس نے روزانہ دو بار کے حساب سے چھ وقت اسی راستے سے گزرنے کے باوجود سنگ تراش کے احاطے کی جانب نظر نہ اُٹھائی تھی۔ چوتھے دن اس راہ سے گزرتے ہوئے اس نے ایک عجیب طرح کی بے چینی محسوس کی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اب وہ دزدیدہ نگاہوں سے احاطے کی طرف دیکھ لے — شاید وہ بھاری بھرکم تعویذ نہ رہا ہو — شاید کسی نے کسی بدنصیب کے لئے اسے خرید لیا ہو۔ لیکن پھر وہ اپنے آپ کا پا لیتا۔ یاد کرتا کہ اس نے مکمل پانچ دن اس سمت نظر نہ اُٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پھر اس کو اُلجھن سی ہونے لگتی۔ جب وہ فیصلہ کر چکا ہے تو پھر اس کا دل اس احاطے کی طرف مائل ہی کیوں ہے۔ پھر وہ اپنے ہی استعمال کئے ہوئے الفاظ کی اصلاح کرتا — مائل ہونے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ وہ تو خائف ہے اور اسی خوف کے ازالے کے لئے وہ ادھر دیکھنا چاہتا ہے اور اس طرح غیر شعوری طور پر وہ اس بات کا معترف ہو چکا ہے کہ وہ قبر کے اس بھاری بھرکم تعویذ سے خوف کھاتا ہے۔

واپس ہوتے ہوئے اس نے سوچا کہ کل کا ایک دن ہی تو باقی ہے۔ پرسوں میں احاطے کی طرف دیکھوں گا — اور اگر تعویذ جوں کا توں دھرا ہے تو — تو کیا — دھرا رہے گا — میرا کیا لے جائے گا بھلا — میں بھی پھر دس دن تک ادھر نظر نہ اُٹھاؤں گا۔ اور وہ نظریں نیچی کئے تیز تیز سائیکل دوڑاتا قبرستان اور سنگ تراش کے احاطے کے درمیان سے گزر گیا۔

پانچواں دن تو گویا اس کے صبر و تحمل کا امتحان لے رہا تھا، دفتر جاتے ہوئے جب وہ اس راستے پر مڑا تو اس کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ بھاری بھرکم تعویذ نہیں رہا ہوگا — یقین ہو گیا گیا تھا۔ وہ یقین کر لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اتنے بڑے شہر میں روزانہ کتنے ہی لوگ مرتے ہوں گے۔ پھر کسی نہ کسی کے لئے کسی نہ کسی نے یہ پتھر ضرور خرید لیا ہوگا۔

نہیں بھی خرید سکتا ہے — یہ ایسا سوچتے ہوئے وہ کچھ اداس سا ہو گیا۔ لیکن اس نے سائیکل پر چڑھتے ہوئے تیز تیز پیڈل مار کر جھوٹی ترنگ اپنے میں اس طرح پیدا کی

جیسے کہیں سے مستعار لی ہے۔

شام کو جب وہ دفتر سے لوٹ رہا تھا تو اس کو کسی کام سے اپنے ایک دوست کے ساتھ کہیں اور جانا پڑا اور اس طرح وہ اُس راستے سے واپس نہ ہو سکا۔ لیکن جب وہ گھر پہنچا تو اس کے ذہن میں رہ رہ کر اس بھاری بھرکم تعویذ کا تصور اُبھر رہا تھا — اس نے گھر والوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ اپنے بچوں کو لے کر سڑک پر گھومنے کے لئے نکل گیا۔ انھیں سوئیٹس دلائے۔ خود بڑھیا سگریٹ خرید کر حظ اٹھانے کی کوشش کی لیکن کوئی بہلاوا بھی اس کو اس بھاری بھرکم تعویذ کے خیال سے چھٹکارا نہ دلا سکا۔ ایک ترشا ترشایا بھاری سا پتھر تھا جس کا بوجھ اپنے سینے پر وقفے وقفے سے وہ محسوس کرتا۔

رات اس نے خواب دیکھا کہ سنگ تراش کے احاطے میں ایک چھوٹا سا باغیچہ ہے اور مردوں عورتوں اور بچوں کی کئی مورتیاں اِدھر اُدھر رکھی ہوئی ہیں جن کے چہرے مسخ ہیں لیکن پتھروں کے وہ انبار نہیں نہ وہ بھاری بھرکم قبر کے تعویذ — اس کو سنگ تراش کے احاطے کا یہ پُراسرار ماحول کچھ اتنا نامانوس اور خائف کن نظر نہ آیا جو وہ پہلے دیکھتا رہا تھا لیکن یکایک جب اس کی نظر اپنے ہی مجسمے پر پڑی تو وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا مجسمہ بالکل تازہ تازہ تراشا گیا ہے اور اتنا مسخ نہیں ہے جتنے دوسرے مجسمے ہیں۔ کسی نامعلوم خوف سے وہ بیدار ہو گیا۔ آنکھیں کھلیں تو خود کو بستر پر پا کر اسے سکون ہوا لیکن جوں جوں اس خواب کی مبہم تصویریں اس کے ذہن میں اُبھرتی گئیں وہ کچھ مضطرب سا ہوتا گیا اور اسی اضطراب کے عالم میں کئی بار اس نے بھاری بھرکم پتھر کے تعویذ کو اپنے سینے پر محسوس کیا۔ اسے پھر گہری نیند نہ آئی۔ صبح تک وہ غنودگی، بیداری اور نیم بیداری کے عالم میں کروٹیں لیتا رہا۔ صبح اُٹھا تو اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ ذہن پر ایک بوجھ سا تھا اور اعضا میں اضمحلال سا۔ اس نے نہا دھو کر کچھ فرحت محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن اُسے وہ تازگی نصیب نہ ہوئی جو وہ ہر صبح نہا دھو کر محسوس کرتا تھا۔ اس نے چائے کی [illegible]

لئے ایک انڈا خریدا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر کس طرح انڈا کھا سکتا ہے۔ اس نے سارے گھر کے لئے ایک ایک انڈا خریدا۔ حالانکہ کئی بار وہ تنہا انڈا کھا چکا تھا۔ نیم برشت انڈے میں بھی اُسے وہ لذتِ کام و دہن نہ ملی جس سے وہ آشنا تھا۔ وہ انڈے کو دوا کی گولی کی طرح نگل گیا اور گھڑی کی طرف نظر اُٹھا کر اس طرح دیکھا جیسے پھر دیکھنے کی تمنا ہو اور بوجھل بوجھل قدم اُٹھاتا آنگن میں دھری سائیکل تک پہنچا۔ کمانی دار قفل میں کنجی لگا کر جب اس نے پچھلے پہیے کی زنجیر کھولنی چاہی تو وہ فوراً نہ کھلی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ اگر آج یہ قفل نہ کھلے تو وہ اسی بہانے سے دفتر نہ جائے گا۔ ویسے وہ چاہتا تو دفتر نہ جاتا۔ اسے رخصت کا حق تھا اور بھلا گھر میں اسے کون روک سکتا تھا۔ لیکن وہ تو آج دفتر نہ جانے کے لئے بھی کسی نہ کسی جواز کا متلاشی تھا۔ قفل کھل گیا اور سائیکل باہر نکال کر وہ بادلِ ناخواستہ دفتر کے لئے روانہ ہو گیا۔

آج جانے کیا بات تھی کہ پتھر کا تعویذ بار بار اس کے تصور میں اُبھر رہا تھا۔ بات کیا ہوگی۔ یہی ہوگی کہ پانچ دن گزر گئے تھے اور آج چھٹا دن تھا اور آج وہ سنگ تراش کے احاطے کی جانب نظر اُٹھا کر دیکھنے کا اپنے ہی معاہدہ کی رو سے مجاز تھا۔ وہ جوں جوں سنگ تراش کے احاطے کے قریب ہوتا جاتا اسے اپنی نبضیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ عقلی دلائل سے اپنے اس واہمے پر بھرپور وار کیا۔ کیا یہ انسانی عقل کا دیوالیہ نہیں ہے کہ ایک پتھر نے مجھے اتنا خائف اور ہراساں کر دیا ہے۔ کیا یہ رب العزت اور معبودِ حقیقی کی توہین نہیں ہے کہ میں موت کے ایک متعینہ وقت پر ایقان و ایمان نہیں رکھتا ہوں۔ یہ کیسی بزدلی ہے جس کا میں شکار ہو گیا ہوں۔ میں اپنے ان توہمات کی داستان بھی تو کسی کو نہیں سنا سکتا۔ میرے ہمدرد خود مجھ پر ہنسیں گے مذاق اڑائیں گے۔ اور اس نے جھرجھری سی لے کر اپنے ذہن کو اس طرح صاف کر دینے کی کوشش کی جیسے سلیٹ پر بھیگا ہوا کپڑا پھیر کر حروف مٹائے جاتے ہیں لیکن اس کے دل نے جیسے آگے [illegible] رُک

چپکے سے آفس پہنچ گیا اور اتنا اداس رہا کہ دوپہر کو انٹرول میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نہ اس نے کھانا کھایا نہ بات ہی کی۔ اس نے دل ہی دل میں محسوس کیا کہ پانچ دن تک اس جانب نظر نہ اٹھانے کا تہیہ کر اس نے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ ان پانچ دنوں سے اس نے غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر کچھ ایسی امیدیں وابستہ کر لی تھیں کہ چھٹے دن پتھر کے منحوس تعویذ کو نہ دکھلانے کا اس کی آنکھوں نے جیسے اس سے وعدہ کر رکھا تھا۔ لیکن آج انھیں آنکھوں نے پھر وہی تعویذ دکھلایا تھا۔ اس کو لمحے بھر کے لئے اندھوں کی قسمت پر رشک آیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کو اپنا یہ خیال بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوا۔ ساتھ ہی کچھ دیر بعد اس کو یہ خواہش ضرور ہوئی کہ میں نے دنیا تو دیکھ لی ہے۔ چاند، ستارے، سورج، جھاڑ پہاڑ، آگ، پانی، بادل، ہوا، زمین آسمان پھول پھل، بیوی، بچے اور اس کے بعد اگر میں اندھا ہو جاتا تو میری بقیہ زندگی قبر کے اس تعویذ کو دیکھے بغیر ہی سکھ چین اور آرام و خوشی سے گزر جاتی اور اس کو اپنے بینا ہونے پر دکھ سا ہوا۔

آفس ختم کرکے جب وہ لوٹنے لگا تو اس نے قریب قریب اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ وہ اس طرح سوچنے لگا تھا کہ اس کو یک لخت اس راستے سے آمد و رفت بند کر دینی چاہئے۔ ایک عجیب سا تنہائی کا احساس اس کے وجود کو دنیا کی چہل پہل سے اس طرح جدا کر رہا تھا جیسے دنیا دنیا نہ ہو ایک وسیع و عریض قبرستان ہو جس میں دھری ہوئی اپنی میت کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

ضد نہ کرو۔ اس کا دل اس سے کہہ رہا تھا۔ اس راستے سے گزرنا ہی چھوڑ دو۔ کچھ ہی دن میں تم بھول جاؤ گے کہ وہاں کوئی قبرستان ہے جس کے سامنے ہی سنگ تراش کی دوکان ہے اور اس دوکان کے احاطے میں پتھر کا ایک بھاری بھرکم تعویذ ہے جس نے تمہاری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ لیکن عقل نے پھر دلیلوں کا سہارا لیا۔ تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو اور اس بات پر تیار ہو چکے ہو کہ اب تم بزدلوں کی سی زندگی گزارو گے۔ ایک واہمہ جب دل میں جاگزیں ہوتا ہے تو ہزار واہمے دامن دل تھام ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ تم نے کاش اتنا علم حاصل نہ کیا ہوتا۔ اپنی ساری کتابیں

ہنسیں گے، مذاق اڑائیں گے تو شاید ان کے اسی رویے سے تمہیں تقویت پہنچ سکے۔ اور یہ بوجھ تمہارے ذہن سے ہٹ سکے۔ یہ پتھر تمہارے سینے پر سے سرک جائے۔ لیکن اس نے دل کے ہاتھوں شکست تسلیم نہیں کی۔ اپنے ذہن کو نئی دلیلوں سے اس طرح تیار کیا جیسے خود مدافعت کے لئے مسلح ہو رہا ہو۔

جب وہ اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے سیدھے گزر جانے پر وہ سنگ تراش کے احاطے کو چھوڑ بھی سکتا تھا تو اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے کوئی موٹر سن کرکے اس کے برابر سے گزر گیا ہو اور وہ بال بال اس حادثے سے بچ گیا ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ سائیکل پر سے اتر پڑے اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا سنگ تراش کے احاطے اور قبرستان کے درمیانی راستے سے بہت اطمینان اور سنجیدگی سے گزر جانے کی سعی نامشکور کرے۔ لیکن پھر اس کے دل نے ہی تردید کی۔

"سارا راستہ کیا پیدل طے کرکے آئے ہو۔"

"نہیں۔"

"تو پھر یہاں یہ خصوصیت کیوں برت رہے ہو — چلو۔۔ چلتے رہو۔ رکو مت۔" اور وہ سائیکل کے پیڈل گھماتا بڑھتا رہا لیکن اس کی رفتار جانے کیوں سست ہو گئی تھی۔

جب وہ قریب پہنچ گیا تو اس نے ایک عزم صمیم کے ساتھ نظر اٹھائی تو قبرستان میں پھیلی ہوئی نئی پرانی قبروں پر دھوپ پھیل رہی تھی اور کتبوں کے سائے لمبے لمبے تھے۔ اور جب دوسری سمت سنگ تراش کے احاطے کی جانب اس نے نظر اٹھانے کی ہمت کی تو مردانی قبر کا بھاری بھرکم تعویذ جوں کا توں دھرا تھا لیکن اس کے پہلو سے زنانی قبر کا تعویذ غائب تھا جس کو وہ فوری محسوس بھی نہ کر سکا لیکن پھر اسے خیال آ ہی گیا کہ یہاں کچھ اور بھی تھا۔

اداسیوں نے جیسے چاروں طرف سے اس پر یلغار کر دیا تھا۔ اس کا عالم یہ تھا جیسے اسے کوئی گلے لگا لے تو وہ رو پڑے گا لیکن وہاں قبر کے بھاری بھرکم تعویذ کے سوا اس کا اپنا تھا ہی کون۔ کسی راہ رو کو اس کی دلی کیفیات [illegible] واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ [illegible] ایک بوجھ سا اپنے دل و دماغ پر اٹھائے

جلا دو — علم کی توہین انسان کی توہین ہے اور انسان رب العزت کا نائب خصوصی ہے اور تم —

"چلو میں بھی شہر چل رہا ہوں"۔ اس کے دوست نے پیچھے سے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور وہ چونک پڑا جیسے سینے پر پتھر کا تعویذ آ لگا ہو۔

منٹ بھر میں اس نے اپنے حواس درست کئے اور دوست کا ساتھ اس کے لئے ہمت اور طاقت بن گیا لیکن یہ طاقت بھی زیادہ دیر اس کی اپنی ہو کر نہ رہ سکی۔ جب وہ اس موڑ پر پہنچے جہاں کمان میں سے ہو کر انہیں اسی قریبی راستے سے گزرنا ہوتا تھا تو اس کے دوست نے اپنی سائیکل اسی سمت یہ کہتے ہوئے گھما لیا کہ "آؤ تمہیں ایک قریبی راستے سے لے چلوں، شاید تم واقف بھی نہ ہو۔" تو وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا اور خاموشی سے اپنی سائیکل بھی اسی سمت موڑ لی۔

اس کا دوست دنیا بھر کی باتیں کر رہا تھا اور وہ ہوں ہاں کئے جا رہا تھا۔ اگر وہ پوچھ بیٹھتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں تب بھی وہ اسی طرح ہوں ہاں کر دیتا جیسے دوست کی کسی بات سے اتفاق کر رہا ہو۔

ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ اپنے ساتھی کو روک کر وہ سائیکل سے اتر پڑے اور اس کے سینے پر سر رکھ کر دل کا بوجھ ہلکا کرے جو اس کی آنکھوں کے راستے بہہ جانے کے لئے تلا کھڑا تھا اور اس سے کہہ دے کہ آؤ ہم اس تعویذ کو اٹھا کر کسی دریا میں پھینک آئیں تاکہ میں — تاکہ میں کچھ اور زندہ رہ سکوں — وہ یہی سوچتا ہوا جب سنگ تراش کے احاطے کے قریب پہنچا تو اس کو خبر بھی نہ ہوئی کہ اس نے آدھا راستہ طے کر لیا ہے — وہ اپنے ساتھی سے تو کچھ نہ کہہ سکا — خود اپنے آپ سے اس نے اتنا کہا کہ اب میں کبھی اس راستے سے نہ آؤں گا اور جب آخری بار دزدیدہ نگاہوں سے اس نے احاطے کی طرف نظر کی —

"اُف — اس کی زبان سے اس طرح نکلا کہ اس کے ساتھی نے بھی اس کی آواز سن لی۔

"کیا بات ہے —؟" اس کے ساتھی نے پوچھا۔

لیکن کچھ جواب دئے بغیر ایک لاگ اضطراری کیفیت میں وہ اپنی سائیکل سے کود پڑا تھا۔

سنگ تراش کے احاطے میں مرحوم قمر کا وہ بھاری بھرکم تعویذ موجود نہ تھا۔

"تم جاؤ — میں ذرا یہاں ٹھہروں گا — مجھے کچھ کام ہے۔"

اس نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

اس کے ساتھی نے بغور اس کو دیکھا اور کچھ سمجھے بغیر چلا گیا تو اس نے سنگ تراش کے احاطے کا رُخ کیا۔

جب وہ اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا چھوٹی سی پتھریلی حصار کے قریب پہنچا تو اس کے ایک دوست نے باہر نکلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"خیریت تو ہے؟"

ہاں بھئی اللہ کا احسان ہے — اس نے اس کو واقعہ چھپاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اس کو خیال آیا کہ اسے بھی تو خیر خیریت پوچھنی چاہیئے جبکہ اس کا دوست سنگ تراش کے احاطے سے نکل رہا تھا، اور اس نے فوری سوال کیا۔

"کیا بات ہے، سب خیریت سے تو ہیں؟ — تم اس احاطے میں کہاں گئے تھے۔"

اس کا دوست کچھ کہے بغیر اس کے برابر سے گزرنے لگا تو اس نے اس کی بانہہ پکڑ کر بڑی نرمی سے پوچھا۔

"کچھ تو بتاؤ — تم اتنے دلگیر کیوں ہو؟"

اس کے دوست نے رک کر نظریں اٹھائیں تو وہ آبدیدہ تھا۔ کچھ دیر توقف کر کے جب وہ اپنے جذبات پر قابو پا سکا تو اس نے کہا۔ "ریاضت مر گیا ہے۔"

"کب؟"

"آج پانچواں دن ہے۔ آج ہم نے اس کی قبر بھی پختہ بنوا دی ہے۔"

"کیسا کڑیل جوان تھا یار۔" اس نے افسوس کرتے ہوئے اس طرح کہا جیسے خود اپنی ہی آواز نہیں پہچان رہا ہو۔

اس کے دوست نے کچھ سنبھل کر پوچھنا شروع کیا

"آج فاتحہ۔ میں اس کی قبر پہ ہی جا رہا ہوں۔ آج ہم نے اس کی قبر کا تعویذ یہیں سے خریدا تھا اور اب کتبہ دیکھنے کے لئے آیا تھا لیکن کوئی اچھا کتبہ یہاں نہیں ہے۔"

"چلو میں بھی چلتا ہوں۔" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

جب وہ قبر پہ پہنچے تو کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔

ہاتھ اُٹھا کر جب وہ فاتحہ دے رہا تھا تو اس کے سامنے ہی مردانی قبر کا وہ بھاری بھرکم تعویذ پھولوں سے ڈھکا ہوا آبدیدہ انسانوں کے درمیان دھرا تھا اور اس کے ذہن میں یہ خیال بار بار ابھر رہا تھا کہ وہ آخری بار اس تعویذ کو دیکھ رہا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔۔۔

لیکن اس پر کوئی یہ تہمت کیسے لگا سکتا تھا کہ اس کے یہ آنسو صرف غم و اندوہ کا اظہار نہیں ہیں بلکہ کسی ڈھکی چھپی خوشی کا سبب بھی ہیں۔

ابو محمد سحر

امیر مینائی کے واسوخت

امیر کو اپنی عمر کے ابتدائی حصّے میں واسوخت نگاری سے بڑی دل چسپی تھی۔ ۱۲۸۰ھ میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے واسوختوں کا ایک مجموعہ شعلۂ جوالہ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ امیر کے چھ واسوخت جن کے تاریخی نام واسوخت اردو، شکایت رنجش، غبار طبع، حسد اغیار، صفیر آتش یار اور بانگ اضطرار ہیں پہلی بار اسی مجموعے کی جلد اوّل میں شائع ہوئے تھے[1]۔ اس کے بعد یہی واسوخت دائرۂ ادبیہ لکھنؤ نے ۱۹۲۱ء میں مینائے سخن کے نام سے ایک علیحدہ مجموعے کی شکل میں شائع کیے۔ اس مجموعے کی طباعت بھی مطبع نول کشور میں ہوئی۔ امیر کا ساتواں واسوخت ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا تھا۔ اس کے متعلق ممتاز علی آہ لکھتے ہیں :-

"ایک واسوخت چھپنے سے رہ گیا۔ ایک دن میں نے دیکھا اور عرض کی اس کو بھی چھپوا دیجئے۔ مسکرا کر فرمایا۔ بیٹا یہ واسوخت بھی جوانی میں کہا تھا اب تو اس سفید داڑھی پر واسوخت کی اشاعت نہیں پھبتی[2]۔"

لیکن امیر کو کیا معلوم کہ جس واسوخت کو انھوں نے اپنی سفید داڑھی کا پاس کرتے ہوئے جیتے جی چھپنے کے لائق نہ سمجھا تھا وہ ان کی وفات کے اٹھاون برس کے بعد شائع ہو کر رہے گا۔ اس واسوخت کا ایک ناقص الاول قلمی نسخہ اسرائیل احمد مینائی نبیرۂ امیر مینائی کے پاس محفوظ تھا جس کو ان سے حاصل کر کے کریم الدین احمد نے اردو، کراچی بابت جنوری ۱۹۵۸ء میں شائع کرا دیا ہے[1]۔ اس واسوخت کے کچھ ابتدائی بند ضائع ہو گئے ہیں مطبوعہ صورت میں پہلا بند حسب ذیل ہے :-

ہم سے وہ لطف وہ الفت وہ مدارات نہیں
بات کیسی کہ کبھی نام کو وہ بات نہیں
پہروں خاموش کبھی حرف و حکایات نہیں
وصل کی رات کہاں دن کی ملاقات نہیں
گر کبھی کہیے کہ منظور ہے آرام کہاں
ہنس کے کہتے ہو کہ آرام کا ہنگام کہاں

امیر نے احسن اللہ خاں ثاقب کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے :

"میرے پاس نعتیہ مسدسات جن کے نام ذکر شاہ انبیا، صبح ازل، شام ابد، لیلۃ القدر ہیں موجود ہیں۔ مراۃ الغیب، گوہر انتخاب، محامد خاتم النبین، مضامین دل آشوب نہیں ہیں[2]۔"

---

[1] ملاحظہ ہو شعلۂ جوالہ جلد اوّل ص ۴۸ تا ۱۷۴

[2] امیر مینائی از ممتاز علی آہ ص ۲۸۰

[1] اردو، کراچی جنوری ۱۹۵۸ء ص ۶۰ تا ۶۸

[2] مکاتیب امیر مینائی مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب ص ۲۴۴

اس تحقیق کی بنیاد پر ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی جنھوں نے امیر پر قلم اُٹھانے سے پہلے بعض نا گزیر ماخذ کو دیکھنے کی بھی زحمت نہیں اُٹھائی "مضامین دل آشوب" کے متعلق رقمطراز ہیں :۔

"نظم ہے۔ ثاقب صاحب کے نام امیر مینائی کے ایک خط میں "مضامین دل آشوب" کا ذکر ملتا ہے۔ امیر نے اس خط میں صرف نام لکھنے پر اکتفا کی ہے۔ "تاریخ ادب اردو" اور "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" وغیرہ میں یہ نام کہیں نظر نہیں آتا۔"[1]

لیکن "مضامین دل آشوب" امیر کی کوئی علیحدہ تصنیف نہیں بلکہ ان کے چھ واسوختوں ہی کے مجموعے کا تاریخی نام ہے۔ ممتاز علی آہ نے لکھا ہے :۔

"منشی صاحب نے واسوخت بھی سات کہے۔ ان میں سے چھ "شعلۂ جوالہ" میں منشی نول کشور آنجہانی کے مطبع میں پہلے چھپ چکے تھے۔ اس مجموعے کا تاریخی نام "مضامین دل آشوب" (۱۲۸۴ھ) ہے۔"[2]

ممتاز علی آہ نے مزید لکھا ہے :۔

"ان کا سالِ طبع مراۃ الغیب سے پہلے ۱۲۸۴ھ ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا نام بھی تاریخی ہے ...... اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی سال کے نتائج افکار ہیں۔"[3]

لیکن ان دونوں باتوں کے بیان میں ممتاز علی آہ سے سہو ہوا ہے۔ واسوخت پہلی بار "شعلۂ جوالہ" جلد اوّل میں شائع ہوئے تھے جس کی تاریخ طباعت ۱۲۸۰ھ ہے۔[4] چھ واسوختوں کے نام بلاشبہ تاریخی ہیں اور سب سے ۱۲۸۴ھ برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ان واسوختوں کا سالِ تصنیف نہیں اور نہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ سب ایک ہی سال کے نتائج فکر ہیں۔ امیر کا ایک واسوخت جس کا پہلا مصرع ہے

الحذر جوشِ جنوں سلسلہ جنباں پھر ہے

اور جو "شعلۂ جوالہ" میں "مغیرۂ آتشبار" کے عنوان سے شائع ہوا ہے رضا لائبریری، رام پور میں قلمی شکل میں موجود ہے۔ اس کی ابتدا میں بطور عنوان یہ عبارت ملتی ہے :

"واسوخت طبع زاد میاں امیر احمد صاحب مفتی عدالت دیوانی"

اور خاتمہ پر یہ تحریر ہے :

"راقم آثم بلند خاں مورخہ ۲۲ شعبان ۱۲۸۱ھ"[1]

اسی طرح رضا لائبریری، رام پور میں امیر کے ایک اور واسوخت کا قلمی نسخہ ہے۔ اس کا پہلا مصرع ہے

دھوم ہے خسروِ اقلیم جنوں آتا ہے

"شعلۂ جوالہ" میں یہ واسوخت "شکایت رنجش" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس نسخے میں بھی اس عنوان کا کہیں پتہ نہیں۔ کاتب کا نام بلند خاں اور تاریخ کتابت ۱۲۸۲ھ درج ہے۔[2] اسی جلد میں امیر کا واسوخت

آج اک سانحۂ تازہ بیاں کرتا ہوں

"شعلۂ جوالہ" میں جس کا عنوان "واسوخت اردو" ہے معمولی خط میں لکھا ہوا ہے۔ اس میں نہ تو عنوان درج ہے، نہ کاتب کا نام اور نہ تاریخ کتابت۔[3]

ان قلمی نسخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر کے واسوخت "مغیرۂ آتشبار" اور "شکایت رنجش" ترتیب وار ۱۲۸۱ھ اور ۱۲۸۲ھ میں یا اس سے پہلے کہے جا چکے تھے اور ان کی تاریخ کتابت کے وقت تک انھوں نے ان کے تاریخی نام نہیں رکھے تھے۔ "واسوخت اردو" کے قلمی نسخے میں اگرچہ تاریخ کتابت درج نہیں لیکن اس میں عنوان کا نہ ہونا اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ واسوخت

---

[1] صبا سے مینائی تک از ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی ص ۲۰۶
[2] امیر مینائی از ممتاز علی آہ ص ۲۸۰
[3] " " ص ۲۸۰
[4] شعلۂ جوالہ جلد اوّل قطعہ تاریخ طبع از فدا علی عیش مرتب مجموعہ ص ۲

[1] مجموعۂ اشعار۔ رضا لائبریری، رام پور۔ مخطوطہ ۱۰۲۰
[2] " " " " ۱۳۳۱
[3] " " " " "

بھی اپنے تاریخی نام سے پہلے وجود میں آچکا تھا۔ اسی طرح دوسرے واسوختوں کے متعلق بھی یہ فیصلہ کرنا کہ ان کے تاریخی نام جن سے ۱۲۸۴ھ نکلتا ہے بعد میں رکھے گئے ہیں اصولِ تحقیق کے منافی نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان واسوختوں کے تاریخی نام سالِ تصنیف کے بجائے سالِ ترتیب سے تعلق رکھتے ہیں یعنی ان کے تاریخی نام امیر نے اس وقت رکھے جب ان کو ایک مجموعے کی شکل میں مرتب کیا۔ اس مجموعے کا تاریخی نام "مضامین دل آشوب" جس سے وہی سال برآمد ہوتا ہے جو واسوختوں کے تاریخی ناموں سے برآمد ہوتا ہے اس کا ایک اور قوی ثبوت ہے۔

جلیل مانک پوری نے لکھا ہے کہ امیر نے اپنے ساتوں واسوخت یکے بعد دیگرے لکھنؤ میں کہے تھے[1]۔ انھوں نے امیر کے پانچویں واسوخت موسوم بہ "صفیرِ آتش بار" کے متعلق ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق اس وقت تک لکھنؤ میں بینی و ابرو کی تعریف میں میر انیس اور مرزا دبیر کی دو تشبیہیں بہت مشہور تھیں۔ مرزا دبیر کا مضمون یہ تھا کہ ایک علم ہے اور اس پر دو تلواریں لٹکی ہوئی ہیں۔ میر انیس نے بینی کو ایک روشن شمع قرار دیا تھا اور ابروؤں کے لیے کہا تھا کہ کوچۂ زلف سے جب ہوا آتی ہے تو اس سے شمع کی لو کبھی ادھر جھک جاتی ہے اور کبھی ادھر جھک جاتی ہے۔ امیر نے اپنے واسوخت میں معشوق کا سراپا لکھا تو بینی و ابرو کی تعریف میں ایک بالکل نیا تشبیہی مضمون پیدا کیا۔ ان کا بند ہے

ایسا مضموں بندھے بینی و ابرو کا کہ واہ
نوبتیں بجنے لگیں سب کہیں سبحان اللہ
چاندنی رات ہے افشاں سے وہ گیسوئے سیاہ
دیکھتے ہوں جیسے تارے وہ کرے خوب نگاہ
واہ کیا شکلیں ہیں قابل ہیں یہ تصویروں کے
دیکھو نکلی ہے زرہ سامنے ہیں شمشیروں کے

[1] سوانح امیر مینائی از جلیل مانک پوری ص ۱۷

یہ تفصیلات پیش کرنے کے بعد جلیل لکھتے ہیں۔

"اس عجیب و غریب تشبیہ کی ہر طرف سے داد دی گئی۔ چناں چہ میر انیس تک جب یہ بند پہنچا تو وہ امیر کی طباعی اور نازک خیالی کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے ایک عزیز کو امیر کے مکان پر بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ اب تک صرف دو تشبیہیں ہوئی تھیں۔ ایک مرزا دبیر نے کہی تھی اور ایک میں نے۔ مگر آپ نے جو جدید اور نازک تشبیہ پیدا کی ہے اس پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔"[2]

امیر کے شاگردوں اور عزیزوں کو مبالغہ آرائی اور افسانہ سرائی کا اتنا چسکا ہے کہ کسی مستند تاریخی حوالے کی موجودگی کے بغیر ان کی بیان کی ہوئی روایتوں پر کما حقہ یقین نہ لانے کی گنجائش اکثر باقی رہتی ہے۔ سو اتفاق سے جس واسوخت کا جلیل نے ذکر کیا ہے اس کا ایک بند ہے:

لکھنؤ گو نہ رہا لاکھوں ہیں دنیا میں حسیں
عالم آباد ہزاروں صنم زہرہ جبیں
چلمنیں سیکڑوں ہیں آنکھ لگائیں گے کہیں
قحطِ صورت کا مرقع میں کسی شکل نہیں
نقدِ دل ہے تو ہیں یوسف سرِ بازار بہت
سر سلامت ہے تو ہیں سر کے خریدار بہت

اس کے پہلے مصرعے میں 'لکھنؤ گو نہ رہا' کا ٹکڑا پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا زائیدۂ فکر ہے۔ بہت ممکن ہے امیر نے یہ واسوخت اولاً لکھنؤ میں ۱۸۵۷ء سے پہلے کہا ہو اور پھر رام پور میں اس نے کچھ بند بڑھائے ہوں لیکن اس سے اس کے زمانۂ تصنیف کے متعلق جو شبہات پیدا ہو جاتے ہیں ان کا دور کرنا آسان نہیں کیوں کہ حتمی ثبوت کی عدم موجودگی میں تحقیقی احتیاط سے کام لیتے ہوئے صرف ایک ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ امیر کی واسوخت نگاری کی ابتدا لکھنؤ میں ہو چکی تھی اور

[2] سوانح امیر مینائی از جلیل مانکپوری ص ۱۸

اس کا سلسلہ رام پور میں ۱۲۸۴ھ تک جاری رہا۔ یہ دونوں خیال کہ انھوں نے اپنے ساتوں واسوخت لکھنؤ میں لکھے یا ۱۲۸۴ھ یعنی رام پور میں لکھے نہ صرف یہ کہ باہم متناقض ہیں بلکہ اپنی اپنی جگہ پر بھی تحقیق کے خلاف ہیں۔

شعلۂ جوالہ میں امیر کے چھ واسوختوں کی اشاعت ان کی ادبی شہرت کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی پہلا موقع تھا جب ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ چونکہ واسوخت ایک عام پسند صنف سخن تھی اور امیر کے واسوخت بہت سے دوسرے مشہور واسوختوں کے ساتھ شائع ہوئے تھے اس لیے انھوں نے شائقین سخن کے ایک وسیع حلقے تک رسائی حاصل کی۔ بقول امیر احمد علوی "اسی مجموعے نے پہلی بار امیر کی شہرت کا ہندوستان کے ہر گوشے میں ڈنکا بجایا[1]"

---

[1] طرۂ امیراز امیر احمد علوی ص ۳۵

بچن سنگھ

دن ڈھل رہا تھا۔ چلچلاتی دھوپ مدھم پڑنے لگی اور شام کا تھکاماندہ سورج کانسے کے تھال کی مانند گھومنے لگا۔ ریتیلی زمین کے وہ ذرے جو دوپہر میں نگینوں کی طرح چمکتے تھے، دوبارہ مٹیالے ہو گئے۔ تب بیلا سنگھ بڑھئی نے پھاوڑا پھینک دیا۔ کمر پہ ہاتھ رکھ کر اپنی دکھتی پیٹھ کو سیدھا کیا اور ایک لمبی سانس لی۔ دن بھر کی گرمی اور مشقت سے اس کا بدن چور چور ہو گیا تھا۔ کاش! اس وقت کہیں سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آ جاتا۔ لیکن ٹھنڈی ہوا کا جھونکا نہ آیا اور اپنی ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں پسینے سے بھیگے بالوں کو سہلاتا ہوا بیلا سنگھ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ سب ابھی تک کام میں جٹے ہوئے تھے۔ پینسٹھ برس کا بڈھا گمر سنگھ لگاتار پھاوڑا چلا رہا تھا اور اس کے پیچھے گاؤں کے دوسرے لڑکے مٹی کی ٹوکریاں بھر بھر کر کھیتوں کی مینڈ پر پھینکتے جاتے تھے۔ لال مٹی کی [illegible] دھول نے ان کے چاروں طرف ایک دھندلکا سا بنا دیا تھا۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی ٹیڑھی کرنیں دھندلکے پر گلال چھڑک رہی تھیں اور بیلا سنگھ کو یوں لگا جیسے سڑک پر کام کرتے ہوئے کسان ایک تصویر ہوں۔

لیکن وہ سب ابھی تک کام میں مصروف تھے۔ گاؤں والے کی [illegible] جلدی نہ تھی۔ بیلا سنگھ [illegible] کسان تھا۔ [illegible] پہلا کام [illegible] نہیں ہونا چاہتا تھا۔ یہ [illegible]

آدمی والے تک بڑھئی [illegible] گاؤں میں اتنا کام اس کے لئے اکٹھا ہو گیا تھا اور وہ [illegible] کی طرح پھاوڑا لے کر [illegible] سڑک کھودتا تھا۔ لیکن اس کے دل میں یہ چاؤ اور امنگ جاگ اٹھی تھی کہ وہ بھی گاؤں کی سڑک میں اپنی محنت و مشقت کا حصہ ڈال سکے۔ [illegible] کسی کے سامنے دوسرے خیال ٹھہر سکے۔

تھوڑا سا سستانے کے لئے وہ گمر سنگھ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ [illegible] "بابا [illegible] تیری [illegible] عمر ہے۔ تجھے اتنی کڑی محنت نہیں کرنی چاہئے۔"

پھاوڑا اٹھا کر بڈھے گمر سنگھ نے مٹی کا ایک بڑا ڈھیلا سامنے والے کھیت کی مینڈ پر پھینکا اور اپنی چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی آنکھیں بیلا سنگھ کے چہرے پر جما کر بڑے طنز کے ساتھ بولا:—

"[illegible] آنا [illegible] کوشش کرے مجھ سے!"

بیلا سنگھ نے بڈھے کی چوڑی چھاتی کی طرف دیکھا۔ اس کے بازوؤں کے پٹھے مچھلیوں کی طرح پھڑک رہے تھے۔ اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اپنی الجھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ایک کھسیانی ہنسی ہنسا اور پھر [illegible]

گاؤں کا اسکول ماسٹر ایک [illegible] تھا۔ گمر سنگھ کی بات سن کر [illegible] [illegible] [illegible]

محنت کا حال سنہری الفاظ میں لکھا جائے گا۔

اپنی تعریف سے کتراتے ہوئے گمر سنگھ نے بات بدلنی چاہی اور بولا۔ "منشی یہ نقشہ سا کیا اُٹھائے پھرتا ہے؟"

اسکول ماسٹر بولا۔ "یہ اس سڑک کا نقشہ ہے جو ہم بنا رہے ہیں اس میں اونچائی، نیچائی اور موڑ سبھی کھینچے ہوئے ہیں۔"

"لے بھلا!" گمر سنگھ نے کہا۔ "اس نقشہ کی کیا ضرورت تھی؟ صرف سڑک ہی تو بنانی تھی۔ حساب کے سوالات تو نہیں حل کرنے تھے۔ یہ تو ہوا لکھو وال، اور یہ رہا کوٹ گوجر سنگھ کا اور یہ بیچ میں سڑک نکال دو۔" بابا نے سارا پراجیکٹ اپنی ہتھیلی پر ہی نپٹا دیا۔

وہ سب اب گاؤں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ اچانک بیلا سنگھ بڑھئی نے پیچھے گھوم کر دیکھا اور بولا۔ "وہ دیکھو نا، بچن سنگھ ابھی تک کھودتا ہی جا رہا ہے۔"

اسکول ماسٹر مڑ کر بچن سنگھ کی طرف دیکھتا رہا اور بہت دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔ "بچن سنگھ کی کیا بات ہے!"

گمر سنگھ کے دل میں نہ معلوم کیا آیا۔ اس نے لڑکوں کی ٹولی میں سے بچن سنگھ کے لڑکے بلبیر کو اپنے پاس بلایا اور آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "بیریا، تیرا باپو کیا گھر نہیں جائے گا؟

وہ ابھی نہیں جائے گا۔ وہ کل رات بھی یہیں سویا تھا میں گاؤں سے روٹیاں لے آیا تھا۔ پھر میں بھی یہیں سو گیا تھا۔ آج بھی یہی کچھ کرنے کو کہا ہے۔ کہتا ہے میں صبح ہوتے ہی کھدائی پہ لگ جاؤں گا۔"

"لیکن چارپائی تو کہیں نظر نہیں آتی۔" گمر سنگھ نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

لڑکے نے بھولے پن سے کہا۔ "چارپائی نہیں ہے۔ ہم نے کھیتوں کی مینڈھ پہ ہی چادر بچھالی تھی۔"

گمر سنگھ نے پیار سے لڑکے کو اپنی چھاتی سے لگا لیا اور بولا "تم باپ بیٹا دونوں ہی دُولے (بہادر) ہو۔"

بچن سنگھ ابھی تک کھودے جا رہا تھا جیسے اُسے کوئی لگن لگ گئی ہو۔ [illegible] اس کی خصوصیت تھی کہ جس کام کو ہاتھ میں لیتا تھا اسے اپنی ہمت اور طاقت سے پورا کر کے چھوڑتا تھا۔

فصل کٹائی کے وقت بھی وہ اسی طرح کام کرتا تھا۔ اس جیسا نوجوان کسان بیس گاؤں میں بھی دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔ اس کی درانتی میں بجلی کی سی تیزی تھی۔ فصلیں اس کے جادوئی لمس سے دھرتی پر جیسے بچھتی چلی جاتی تھیں۔ صبح سویرے اس کھیت میں جو دور دراز تک لمبے لمبے گنے جھوم رہے ہوتے تھے۔ دوپہر تک وہ دھرتی پر لیٹے نظر آتے تھے۔

پھاوڑے کی چوٹ گونجنے لگی۔ پتھریلی زمین آگئی تھی۔ بچن سنگھ نے پھاوڑا چھوڑ کر گینتی پکڑ لی۔ جس طرح وہ کام کر رہا تھا اس سے معلوم ہوتا تھا، وہ آج ہی سڑک مکمل کر کے رہے گا۔ اور وہ یہی کرتا اگر اس کا بس چلتا۔ لیکن ابھی پورے پانچ فرلانگ کھدائی باقی تھی اور پچھلے ڈیڑھ فرلانگ پر ابھی کنکر توڑنے باقی تھے۔

جب سے ربیع کی بوائی شروع ہوئی۔ سڑک کا کام بالکل سست پڑ گیا تھا۔ اب سڑک پر کام کرنے والوں میں زیادہ تر بوڑھے اور بچے ہی تھے۔ نوجوانوں نے تو پھر کندھے پہ جُوا اور ہاتھ میں چابک پکڑ لی اور کھیتوں کی طرف چل پڑے تھے۔ اس بار برسات دیر سے ہوئی تھی۔ اگر کہیں سڑک پکی ہونے سے پہلے ہی ساون کی پھواریں برس پڑیں تو ساری محنت اور مشقت پر پانی پھر جائے گا۔

اور جیسے بچن سنگھ اور ساون کے درمیان مقابلہ شروع ہو گیا ہو۔ وہ پہلے برستا ہے یا یہ پہلے سڑک ختم کرتا ہے؟ اس دوڑ میں وہ پیچھے نہیں رہے گا۔ مضبوط ارادے کی گرمی نے بچن سنگھ کا دل بڑھایا۔ اور اسی لئے کل رات بھی وہ سویا نہیں تھا۔ گاؤں پانچ کوس پیچھے رہ گیا تھا۔ گاؤں سے صبح کام پر پہنچنے میں کافی وقت لگتا تھا۔ تاروں کی چھایا میں جاگتے رہ کر آج اس نے پھاوڑا اُٹھایا اور ساتھ ہی بلند آواز میں جپ جی صاحب کا پاٹھ شروع کر دیا۔

طوطوں کی آخری ٹولی ایک قینچی کی شکل میں سر کے اوپر سے گزر گئی۔ بدلوں کی دھندلی پرچھائیاں مٹ گئیں۔ رات اپنی چادر پھیلانے لگی۔ تب آہستہ سے ایک ٹیلے کی اوٹ سے چاند کی گول ٹکڑی اُبھر آئی۔ شفاف اور دُھلی چاندنی خوابوں کو ٹٹولنے لگی۔

کتنی ہی دیر سے بچن سنگھ ایک بڑے پتھر کے اردگرد سے مٹی کھود رہا تھا۔ گینتی کی مضبوط چوٹوں سے آخر اس نے وہ پتھر اکھاڑ پھینکا لیکن اس کی کمر دوہری ہو گئی اور سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ گینتی کے دستے پہ باہیں ٹکا کر وہ اس پتھر پہ بیٹھ گیا۔ تب پورب کی طرف سے ہوا کا ایک ٹھنڈا اور خوشگوار جھونکا آیا۔ بچن سنگھ کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ سویا نہیں تھا مگر جاگ بھی نہیں رہا تھا۔

اس نے دیکھا کہ سرمئی رنگ کی ایک چوڑی سڑک کے دونوں طرف آم کے گھنے سایہ دار درخت ہیں جن پہ ہرے طوطے کلکاریاں مار رہے تھے۔ دو دو کوس کے فاصلے پر سڑک کے اوپر بنے چھوٹے موٹے پلوں کے تلے سے چھوٹی چھوٹی نہریں گزرتی تھیں۔ یہ نہریں بھاکڑہ سے آتی تھیں اور وہاں سے پانی اپنے ساتھ لاتی تھیں۔ اب ان گاؤں میں پانی کی باری کے لئے خون خرابہ نہیں ہوتا تھا۔ گاؤں میں اب خاندانی دشمنیاں قتل، پھانسی اور کالا پانی غائب ہو گئے تھے۔ پانی اتنا تھا کہ سماتا نہیں تھا۔

اس نے دیکھا کہ مکھووال اور کوٹ گوجر سنگھ کے درمیان بنجر دھرتی اچھی کھاد کے استعمال سے ہری بھری ہو گئی تھی۔ بے پناہ کھیتیاں مرمر کر رہی تھیں۔ گندم، گنا اور کپاس میں سمندر کی طرح ہریں اٹھ رہی ہیں اور وہ صدیوں کی بنجر دھرتی گندم کی سنہری چمک دمک سے، سرسوں کے بسنتی پھولوں سے، ہری ہری گھاس سے ڈھک گئی ہے۔

اس نے دیکھا کہ اس چوڑی سرمئی سڑک پر مکھووال کے لڑکوں کی ٹولی سائیکلوں پر سوار ہو کر کوٹ گوجر سنگھ کے سرکاری ہائی اسکول میں پڑھنے جا رہی ہے۔ وہ سبھی اس کے جانے پہچانے ہیں۔ اپنے ہی گاؤں کے جانے پہچانے لڑکے تھے اور سب سے آگے پیلے رنگ کی پگڑی اور خاکی نیکر پہنے بلبیر سائیکل کی گھنٹی بجا رہا ہے۔

اس بے خوابی کی حالت سے وہ یکایک چونک پڑا اسے کوئی بلا رہا تھا، پکار رہا تھا۔ "باپو! باپو!" پکارنے اس نے بلبیر کی آواز سنی اور وہ آواز کے رُخ میں بھاگ کھڑا ہوا۔

اس نے دیکھا بلبیر نے ایک ببول کو کس کے پکڑا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر تھیلے سے روٹیاں، پیاز اور گلاس زمین پر ڈھلک گئے تھے۔ تھک ہار کر وہ لڑکے کو بے سدھ لٹکا۔ تو اس کے ہوش حواس اڑ گئے۔ لڑکے کو پیشانی سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ بنجر دھرتی کے کسی ڈھیر پہ اڑنے والے سانپ نے وار کیا تھا۔ میان سے چھوٹی کرپان نکال کر بچن سنگھ نے ڈسی ہوئی جگہ کو کاٹ کر خون نچوڑ دیا مگر زہر اثر کر چکا تھا۔ لمحہ بھر میں لڑکے کا چہرہ کالا ہو کر اس کی گود میں لڑھک گیا۔

سونی آنکھوں سے وہ مرے ہوئے بیٹے کے چہرے کو تاک رہا تھا اس کے منہ سے آواز تک نہ نکلی کیسا پتھر دل باپ تھا وہ! اس کی ماں زندہ ہوتی تو گھائل گھوڑی کی طرح ہنکارتی سارے گاؤں کو جمع کر لیتی اور بتاتی کہ کیسے اس کا ایک ہی بھائی جلیاں والے باغ میں گولی سے اڑا دیا گیا کیسے اس کے دو بڑے بیٹے فسادات کی نذر ہو گئے اور کیسے آج اس کی کوکھ کی آخری نشانی موت نے ہتھیا لی۔

اس نے آہستہ سے لڑکے کو کھیت کی مینڈ پر لٹا دیا۔ اپنے سر سے پگڑی اتار کر سرہانے کی طرح اس کی نازک گردن تلے رکھ دی اور جوش میں آ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ رات ہی رات میں وہ لڑکے کا اپنے ہاتھ سے سنسکار کر دے گا۔ اس نے سوچا، مگر نہیں، کسی خیال نے اس کو روک دیا۔ بلبیر بہادروں کی موت مرا ہے۔ کسان باپ کا بیٹا پانچ کوس سے روٹی لے کر آیا تھا۔ راستے میں موت گھات لگائے بیٹھی تھی اس کو دیکھ کر جھپٹ پڑی۔ صبح اس کے دوست اسے دیکھنا چاہیں گے۔ گاؤں کے نوجوان، گاؤں کے بزرگ، گاؤں کی عورتیں، سبھی اس ہنس مکھ اور خوش مزاج بلبیر کو جانتے تھے وہ سبھی اس کا منہ دیکھنے کو آئیں گے۔ مگر ایک دوسرے خیال نے بچن سنگھ کو بے چین کر دیا.... اس طرح کتنا وقت ضائع ہو جائے گا۔ سب کا وقت ضائع ہو گا۔ کھدائی کا کام اور بھی پیچھے پڑ جائے گا اس کو ابھی پورا کرنا چاہیئے اور بچن سنگھ اس طرف چل دیا جہاں پھاوڑے اور گینتیاں پڑی تھیں۔

سویرے پیلے پھولوں سے ڈھکے ببول تلے لوگوں کی بھیڑ لڑکے کی لاش کے اردگرد جمع تھی۔ بیلا سنگھ بڑھئی نے دور افق کی طرف اشارہ کیا جہاں پھاوڑہ چلاتے ہوئے بچن سنگھ کا جسم دھندلا نظر آ رہا تھا۔ ایک ہی رات میں وہ سڑک کو آدھ میل آگے لے گیا تھا۔

بابا گمر سنگھ نے آنکھیں پونچھیں اور بولا۔ "واہ دو ولیوں (بہادروں) واہ ولیوں!!"

اسکول ماسٹر نے دہرایا۔ "واہ زندگی کے مست شہزادو! تمہارے کیا کہنے!"

(مترجم - [illegible])

الیسا ڈورا ڈنکن

(یورپ کی عظیم رقاصہ)

دنیائے رقص میں الیسا ڈورا ڈنکن کا نام شاید کبھی بھی بھلایا نہ جاسکے گا۔ اعضاء کی حرکات سے روح کی پُراسرار گہرائیوں تک مظاہرہ کرنے والی یہ زندہ جاوید امریکی رقاصہ اپنے فن سے زیادہ اپنی شخصیت کے اسرار اور عجیب وغریب افسانوں کی بنا پر جانی جاتی ہے۔

مردوں کے بارے میں اس کا عجیب و غریب رویہ، جارج برنارڈ شا سے اس کی مفروضہ محبت یا اپنے بچوں کی موت کے بعد زندگی بھر نہ سنبھل سکنے کی طاقت یا اس کا رقص دیکھ کر بیماروں کو شفا مل جانے کے افسانے یہ سب مل کر بھی وہ مکمل تصویر نہیں پیش کرسکتے جس کا اصل پیکر بیسویں صدی کے اوائل کی ماہر رقاصہ الیسا ڈورا ڈنکن تھی۔

یورپ میں ایک ایسا بھی دور گزرا ہے کہ جب کبھی کسی ملک میں کوئی جذباتی حادثہ پیش آیا یا کہیں کسی نوجوان نے خودکشی کی تو اس کا کسی نہ کسی طرح کا تعلق الیسا ڈورا ڈنکن سے نکلا۔ اس کو اپنی مقبولیت اور انتہائی خوبصورتی کا پورا پورا علم بھی تھا۔ اس نے ایک بار کہا کہ "میرے زمانے میں کسی بھی ایک فردِ واحد کو مجھ سے زیادہ چاہا اور پوجا نہیں گیا۔"

خود اس نے بھی محبت کی مگر وہ بھی ایک بار۔ ایک قصہ یہ بھی بہت مشہور ہے کہ اس نے جارج برنارڈ شا کو لکھا کہ "اگر ہم آپ شادی کرلیں اور ہمارا بچہ آپ کے ذہن اور میری خوب صورتی کا مالک ہو تو یہ کتنا عظیم امتزاج ہوگا۔"

کہا جاتا ہے کہ جارج برنارڈ شا نے اپنے مخصوص انداز میں الیسا ڈورا ڈنکن کو جواب دیا۔ "فرض کیجئے اس شادی کے نتیجے میں جو لڑکا ہو وہ میرا الیسا حسن اور آپ کا سا ذہن لے کر پیدا ہو تو کیا ہوگا!"

مگر خود جارج برنارڈ شا نے الیسا ڈورا ڈنکن سے اپنی ملاقات کا جو ذکر کیا ہے وہ اس قصے سے قطعی مختلف ہے۔ خود شا کے الفاظ ہیں کہ "دراصل ہماری ملاقات بڑی شگفتہ ثابت ہوئی۔ ہم نے ایک گھنٹے تک مختلف موضوعات پر دلچسپ طور پر تبادلۂ خیال کیا۔ اس موقع پر اور بھی لوگ موجود تھے۔ ہاں الیسا ڈورا ڈنکن نے یہ ضرور کہا تھا کہ میں زندگی بھر آپ کی پرستار رہوں گی۔"

شا کا خیال ہے کہ یہ محض قدردانی کے الفاظ تھے۔ وہی قدر جو ایک ادب دوست ایک ادیب کی کرسکتا ہے مگر اس کو رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کرکے افسانہ بنا دیا گیا۔

الیسا ڈورا ڈنکن ۲۷۔ مئی ۱۸۷۸ء کو سان فرانسسکو میں پیدا ہوئی اس کا باپ ایک ناکام مغنی اور اسکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ اس کی ماں آئرلینڈ کی تھی۔ مذہب اور خدا کے بارے میں اس کا رویہ کچھ عجیب سا تھا اس لئے اس نے اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم بالکل نہیں دی۔ مگر الیسا ڈورا ڈنکن نے باپ کے ساتھ مل کر مختلف سازوں کی آوازوں پر ناچنا ضرور سیکھ لیا۔

چونکہ باپ کچھ کماتا نہیں تھا اس لئے ماں نے اس سے علیحدگی اختیار کرلی اور باپ اور بھائی بہنوں کی معیت میں ایساڈوراڈنکن نیویارک چلی گئی۔ وہاں ۱۰ برس کی عمر میں اس نے ایک نائٹ کلب میں اپنے رقص کا مظاہرہ کیا مگر یہ کوشش کامیاب نہیں رہی اور اس نے سب کو مجبور کیا کہ وہ فن کے ذریعے پیسہ کمانے کے لئے یورپ چلیں۔

ایساڈوراڈنکن کے باپ کو قدیم یونانی رسوم، ادب اور اساطیری داستانوں سے عشق تھا۔ یہ عشق ایساڈوراڈنکن کو ورثے میں ملا اور وہ خود بھی یونان قدیم کی پرستار بن گئی۔

کہا جاتا ہے کہ ایساڈوراڈنکن جیب میں ایک کوڑی کے بغیر انگلستان کے عجائب گھروں میں دن دن بھر گھوما کرتی۔ وہ کئی کئی وقت کھانا نہ کھاتی اور سارا وقت یونانی مورتوں اور آثار قدیمہ کے نمونوں کو دیکھنے میں صرف کردیتی۔ ایک دفعہ برٹش میوزیم میں وہ وینس کے ایک قدیم مجسمے کو دیکھ کر اتنی متاثر ہوئی کہ کئی گھنٹے تک لگاتار اس کو تکتی رہی۔ میوزیم کے گارڈ نے ہمدردی سے پوچھا کہ اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہے۔

ایک دفعہ ایک قدیم مرتبان پر اس نے کلاسیکی انداز کے رقص کی کچھ شبیہیں ابھری ہوئی دیکھیں۔ یہ انداز ایساڈوراڈنکن کو ایسا پسند آیا کہ اس نے طے کرلیا کہ وہ کلاسیکی یونانی رقص کی تجدید کرے گی۔

اس زمانے میں اس کے نیویارک کے کچھ دوستوں نے انگلستان کے ممتاز آرٹسٹوں سے ایساڈوراڈنکن کا تعارف کرایا۔ اس نے ان آرٹسٹوں اور ان کے سرپرستوں کے یہاں اکثر اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ یہ کوششیں بہت ہی کامیاب رہنے لگیں اور اس کا نام جگہ جگہ اعلیٰ حلقوں میں لیا جانے لگا۔

تھوڑے سے ہی عرصے بعد ایساڈوراڈنکن کو پیرس میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا۔ اس نے اس طرح یونان قدیم کی اصل روح کو اپنی روح کی گہرائیوں سے ہم آہنگ کرکے پیش کیا کہ مصوروں اور فنکاروں کے حلقوں میں شور مچ گیا۔ ہر سنگ تراش یونانی انداز میں اس کے رقص کے مختلف پہلوؤں کو پتھر پہ تراشنے لگا اور سینکڑوں مصوروں نے یونانی پس منظر میں ایساڈوراڈنکن کی تصویریں بنائیں۔ غالباً ابھی تک دنیا میں کوئی ایسی رقاصہ نہیں گزری ہے جس کے اتنے مجسمے اور تصویریں بنائی گئی ہوں جتنی یورپ کے فنکاروں نے ایساڈوراڈنکن کی بنائیں۔

ایساڈوراڈنکن یونانی انداز کی ایک لمبی سی چادر شانوں سے پیروں تک ڈالے رہتی اور یونانی دیویوں کے انداز میں اس کے بازو عریاں رہتے۔ بالوں کو گوندھ کر وہ اس طرح جوڑا بناتی کہ اکثر لوگ شبہے میں پڑجاتے کہ کیا سچ مچ کوئی یونانی دیوی تو نہیں اتر آئی ہے۔ اس نے چپل بھی اسی انداز کے بنوائے جیسے کہ وینس کے مجسمے میں دکھائے جاتے ہیں۔ یونانی داستانوں کی پیروی میں اس نے لڑکوں کی ایک ٹولی جمع کی (یہ سب لڑکے یونان کے تھے) جو اس کے رقص کے دوران میں بالکل یونانی انداز میں گیت چھیڑتے۔ ان سب باتوں نے ایساڈوراڈنکن کو یورپ کی ملکہ رقص و ترنم نہیں رقص و ترنم کی دیوی کا منصب دے دیا۔

یہ وہ دور تھا جب اس کی شہرت رفتہ رفتہ پھیلنے لگی جب وہ ہنگری پہونچی تو اس کے رقص نے پورے ملک میں ہلچل پیدا کردی۔ بوڈاپسٹ کی سڑکیں مضافات سے آنے والوں سے بھری رہنے لگیں اور حکام کو ٹریفک کے نئے قواعد بنانے پڑے مگر ایساڈوراڈنکن جو اس وقت کروڑوں عوام کے دلوں کی ملکہ تھی، ایک ایکٹر کے عشق میں بُری طرح مبتلا ہوچکی تھی۔ تاہم جب اس کو اس ایکٹر کے اصل کردار کا علم ہوا تو اس نے اس کا خیال ہی ترک کردیا اور اس کے بعد غالباً زندگی بھر مردوں کے بارے میں اس کا رویہ کچھ عجیب سا رہا۔ اس نے ایک بار کہا کہ مرد تو جوتوں کی لمبی قطار کی طرح ہیں۔ آپ کو باہر نکلنے یا آرام سے چلنے کے لئے جوتا پہننا پڑتا ہے لیکن جہاں اس میں کیل نکل آئی یا پیر دبے تو اس کو بدل کر دوسرا پہن لیجئے۔

شہرت و مقبولیت کی انتہا پر پہونچ جانے کے بعد بھی فن کے بارے میں اس کا رویہ بالکل نہیں بدلا۔ اس نے یورپ کے مشہور شہروں، پیرس، برلن، لندن اور ماسکو وغیرہ میں کلاسیکی رقص کی تربیت گاہیں قائم کیں جن میں داخلے کے لئے انتہائی امیر اور غریب

ہونا شروع تھا۔

ایسا ڈورا ڈنکن کے دو بچے تھے اور دونوں مختلف باپوں سے تھے۔ اس نے باقاعدہ شادی نہیں کی تھی۔ مگر دونوں بچے انتہائی خوبصورت تھے اور ان کی خوبصورتی کی مثال دی جاتی تھی۔ ایسا ڈورا ڈنکن کو ان سے بہت محبت تھی مگر ان دونوں کا عجیب حسرت ناک انجام ہوا۔

ایک بار ایسا ڈورا ڈنکن نے ایک شخص کو آگاہ کیا کہ وہ فلاں عورت سے ہوشیار رہے۔ یہ عورت اس شخص سے محبت کرتی تھی اور جب ایسا ڈورا ڈنکن کا مشورہ مان کر اس مرد نے اس سے قطع تعلق کر لیا تو اس عورت کو سخت غصہ آیا۔ پیرس کے ایک مشہور مقام پہ اس عورت نے ایسا ڈورا ڈنکن کو بددعا دی اور کہا "خدا شاہد ہے کہ تو نے میرے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ میری آہ تجھ پر اور تیرے بچوں پر پڑے گی۔"

ایسا ڈورا ڈنکن یہ بددعا سن کر لرز گئی اور ہر وقت اپنے بچوں کی نگرانی کرنے لگی۔ مگر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بچے ڈرائیور کے ساتھ دریا کی سیر کو اکیلے چلے گئے۔ ایسا ڈورا ڈنکن کو علم بھی نہیں ہوا۔ راستے میں ڈرائیور کا ایک جاننے والا مل گیا۔ وہ کار ایک طرف کھڑی کر کے اپنے ملنے والے سے بات کرنے چلا گیا۔ اس نے گاڑی کا انجن بند نہیں کیا۔ اتفاق سے کار کے بریک کھل گئے اور موٹر کار تیزی سے خود بخود چلنے لگی اور سیدھی دریا میں گر پڑی۔ دونوں بچے مع ایک نرس کے موٹر کے اندر پھنسے ہوئے ہی ڈوب گئے۔

اتفاق کی بات — یہ وہی جگہ تھی جہاں کچھ دنوں قبل (بالکل اسی جگہ) اس عورت نے ڈورا ڈنکن کو بددعا دی تھی۔

ایسا ڈورا ڈنکن اس حادثے سے سنبھل نہیں پائی۔ بعد میں اس کے ایک بچہ اور ہوا مگر وہ پیدا ہوتے ہی مر گیا۔

اس دوران میں یورپ اس صدی کے زبردست سانحے سے دوچار ہوا۔ پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔

یورپ کے ان نگار خانوں اور کلبوں میں جہاں ایسا ڈورا ڈنکن اطمینان سے گھر کی طرح گھومتی تھی پہرے لگ چکے تھے۔ فن اور تہذیب کے ذریعے متحد شدہ دنیا اب مختلف قوموں اور نسلوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ بہت سی راجدھانیوں میں ایسا ڈورا ڈنکن کا داخلہ بند ہو چکا تھا۔

مایوس ہو کر اس نے جنوبی امریکہ کا دورہ کیا جو اس عالمگیر اضطراب اور پریشانی کے دور میں انتہائی ناکام ثابت ہوا۔ اس کی مایوسی اور بڑھ گئی۔ زندگی کا لطف دو بچوں کے مرنے کے بعد کھو چکی تھی اور فن کی قدردانی اس مرتی مارتی دنیا کے بس کی بات نہیں تھی — وہ انتہائی شدت اور کثرت سے شراب پینے لگی۔

جنگ عظیم کے بعد یورپی تہذیب و تمدن کی مجروح شدہ روح نے ایک بار پھر سر اٹھا کر اطمینان کی سانس لینا شروع کی۔ تمام نائٹ کلب اور رقص گاہیں پھر سے آباد ہو گئیں۔ مگر نقادوں کے قلم کچھ رکے رکے سے تھے۔ پیرس میں ایک اخبار نے لکھ دیا کہ "ایسا ڈورا ڈنکن اب موٹی ہو گئی ہے۔ وہ رقص کرنے کی بجائے تھرکنے لگی ہے۔"

اس دن سے ایسا ڈورا ڈنکن نے اپنے عزیز فن کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔

اور یہ وہ زمانہ تھا جب سوویت روس میں انقلاب آ چکا تھا تمام لائبریریوں اور کلچرل مرکزوں میں ایسا ڈورا ڈنکن کی تعریف میں لکھے ہوئے تبصرے بدلے جا چکے تھے۔ ماسکو کی اکاڈمی برائے رقص کے کورس میں جہاں ایسا ڈورا ڈنکن کی تعریف درج تھی یہ جملہ بڑھا دیا گیا — "تاہم وہ ایک بورژوا رقاصہ ہے۔"

"ہاں میں بورژوا، پست ذہن اور عیاش رقاصہ ہوں۔" بہت تھک کر ایسا ڈورا ڈنکن نے سوچا۔ جب اس پر قرض کا بوجھ بڑھ چکا تھا اور وہ پھر ایک بار زندگی کی ادنیٰ ترین ضروریات سے محروم ہو چکی تھی۔ وہ خود ماسکو گئی وہاں لوگوں سے ملی اور بڑی مشکل سے حکومت سے ماسکو میں ایک رقص گاہ کھولنے کی اجازت لے لی۔ مگر روس اس وقت انقلاب کے بعد کی تعمیرات میں مصروف تھا اس لئے بڑے پیمانے پر کوئی امداد نہیں مل سکی۔

اسی زمانے میں ایسا ڈورا ڈنکن روس کے ممتاز اور نوجوان شاعر یسینن سے ملی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی زبان بھی نہیں سمجھتے تھے مگر جذباتی طور پر دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے اور ۴۴ سال کی عمر میں ایسا ڈورا ڈنکن نے اپنے سے پندرہ سال چھوٹے شاعر یسینن سے شادی کر لی۔

وہ دونوں تھوڑے دنوں تک ساتھ ہی ساتھ روس میں رہے مگر ایسا ڈورا ڈنکن کی مالی پریشانیاں برابر بڑھتی گئیں اور ایک بار پھر اس کو پیسہ جمع کرنے کی امید سے امریکہ جانا پڑا مگر یہاں بھی مالی پریشانیوں میں اضافہ ہی ہوا کیونکہ یسینن خود کچھ نہیں کرتا تھا بلکہ وہ مستقل طور پر شراب پیتا اور شراب پی کر بیوی کو مارتا پیٹتا تھا۔ مگر ایسا ڈورا ڈنکن ان باتوں کا کسی سے ذکر نہ کرتی بلکہ ہمیشہ اور ہر موقع پر اپنے شوہر کی طرفداری ہی کرتی۔ اگر کوئی کچھ کہتا تو وہ اس کو اُلٹا بُرا بھلا کہتی۔ تاہم یہ صورت حال زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہی اور ایسا ڈورا ڈنکن کو یسینن سے طلاق لینا پڑی۔ یسینن کا بھی زیادہ دنوں تک اکیلے دل نہیں لگا وہ ماسکو کے انھیں علاقوں میں اکیلا گھومتا رہا جہاں وہ کبھی کبھی ایسا ڈورا ڈنکن کے ساتھ رہا تھا۔ پھر اس نے اس کمرے میں خودکشی کر لی جہاں اس نے ایسا ڈورا ڈنکن کے ساتھ قابل یادگار دن گزارے تھے۔

ایسا ڈورا ڈنکن اس زمانے میں بہت مقروض تھی پھر بھی یسینن کی خودکشی کے بعد اس کی بچی کھچی دولت جو وہ اپنی سابقہ بیوی کے لئے چھوڑ گیا تھا اس نے قبول نہیں کی اور مفلسی کی حالت میں ہی فرانس چلی گئی جہاں اس نے نائس میں ایک بار پھر شادی کر لی۔ اس بار اس کا شوہر اطالوی تھا۔

پیرس میں ستمبر ۱۹۲۷ء میں ایسا ڈورا ڈنکن ایک بار شام کو سیر کے لئے نکلی۔ اس روز ٹھنڈک بہت تھی۔ ایسا ڈورا ڈنکن نے ایک لمبی شال اچھی طرح گلے میں لپیٹ رکھی تھی۔ پھر بھی شال کا کچھ حصہ کار کے باہر نکل کر لہرانے لگا۔ اس کو پتہ بھی نہیں چلا۔ تھوڑی دیر بعد شال کا کونا موٹر کے پہیے میں پھنس گیا اور ایک زور کے جھٹکے کے ساتھ ایسا ڈورا ڈنکن کار سے اُچھل کر دُور جا گری۔ اس کے گلے میں لپٹی ہوئی شال اس کے لئے پھانسی کا پھندا بن گئی۔ جب تک کار رُکے ایسا ڈورا ڈنکن کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں اس کے دونوں بچے موٹر کے حادثے میں ہلاک ہوئے تھے اور یہ ستمبر کی وہی تاریخ تھی جب ایک ناکام عورت نے ایسا ڈورا ڈنکن کو بددعا دی تھی۔

۱۹۶۳-۶۴ء میں شائع شدہ کتابیں

۱۹۶۳-۶۴ء میں بھارت میں چھپنے والی کتابوں میں تعلیمی نوعیت کی کتابوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ تنظیم اور سماجی سائنسوں کے موضوعات پر ۲۲۳۵ اور ۱۳۳۰ نصابی کتابیں انگریزی اور عام بھارتی زبانوں میں شائع ہوئیں۔ زبان وار تعلیمی نوعیت کی سب سے زیادہ کتابیں انگریزی میں شائع ہوئیں۔ ان کی تعداد ۳۷۱۹ تھی۔ البتہ نصابی کتابیں سب سے زیادہ ہندی میں شائع ہوئیں۔ ہندی میں ۲۱۴ اور انگریزی میں ۳۲۶ نصابی کتابیں شائع ہوئیں۔ ادبی نوعیت کی ۴۰۷۱ کتابیں شائع ہوئیں۔ ہندی میں ۹۲۶ تعلیمی نوعیت کی اور ۵۰۶ ادبی نوعیت کی کتابیں شائع ہوئیں۔ انگریزی میں ان کی تعداد علی الترتیب ۷۱۴ اور ۲۳۴ تھی۔ بنگالی، مراٹھی، تامل، تیلگو اور اردو میں شائع شدہ ادبی کتابوں کی تعداد ۶۴۴، ۱۶۵۵، ۲۹۳، ۴۰۰ اور ۱۰۲ تھی۔ ہندی میں انھیں زبانوں میں شائع شدہ تعلیمی نوعیت کی کتابوں کی تعداد علی الترتیب ۴۴۵، ۳۰۴، ۲۰۹ اور ۴۲ تھی۔ قدرتی اور اپلائڈ سائنس پر انگریزی میں ۳۲۱۳ اور ہندی میں ۲۳۵ کتابیں شائع ہوئیں۔

نئی کتابیں

بادہ وجام

جناب شارق میرٹھی کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر مکتبہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔ کتاب مجلد ہے۔

شارق صاحب متین اور سنجیدہ شخصیت کے مالک ہیں اور یہی جوہر ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ زیر نظر مجموعے میں غزلیات، رباعیاں، قطعات اور نظمیں سبھی کچھ ملتا ہے۔ شارق صاحب نے قدامت کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا لیکن ان کے تصورات میں ذرا بھی فرسودگی نہیں انھوں نے صحت مند شاعری کی ہے۔ آزادروی تو ان میں ملتی ہے لیکن یہ بے راہ روی کا شکار نہیں ہوئے۔

رخسارِ سحر

خورشید احمد جامی کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر انجمن ترقی اردو حیدرآباد۔ قیمت دو روپے پچھتر پیسے۔

یہ مجموعہ جامی صاحب کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان کی زبان سادہ ان کا اندازِ بیان صاف اور ان کا تصور رنگین ہے آسانی نہیں۔ یہ غزل کے مزاج دان ہیں۔ یہ غزل کی لطافتوں سے آشنا بھی تو یہ شعر کہہ دیا

دلِ غریب سے اک اور حادثہ سمجھا
ترے دیار میں احساس کامرانی کو

گیت گووند

مترجم منور لکھنوی سنسکرت میں جے دیو کی یہ منظوم تخلیق کلاسکی حیثیت رکھتی ہے اور وشنو بھگتوں کے حلقوں میں بہت مقبول ہے۔ ان سرمدی نظموں کا منظوم ترجمہ منور صاحب نے ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کا یہ ادبی کارنامہ آپ کے دوسرے ادبی کارناموں کی طرح معروف و مقبول ہوگا۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ آدرش کتاب گھر ۵۲۷۰-۲۹ فیض گنج، دریا گنج دہلی۔

ادب ونفسیات

دیویندر اسر ہمارے نئے پڑھے لکھے ادیبوں میں بہت اچھا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ مکتبہ شاہراہ دہلی نے ان کے مضامین کا یہ مجموعہ حال ہی میں شائع کیا ہے۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے۔ یہ عنوانات سب کے سب ادب اور نفسیات سے متعلق ہیں اور ان کے مطالعہ سے نفسیاتی تسکین ہوتی ہے۔ اس کتاب میں ادب اور نفسیات کے مسئلے پر بھی جامع اور مستند بحث کی گئی ہے۔ ناشر کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ ادب اور نفسیات کے باہمی رشتے پر مستقل کتاب ہے۔

عندلیب تواریخ

مصنف خان بہادر سید مسعود حسن صاحب مسعود۔ ناشر ادارہ انیس اردو الہ آباد۔ تاریخ گوئی فارسی اور اردو ادب میں ایک خاص فن کی حیثیت سے قائم رہی ہے۔ اب یہ فن مٹتا چلا جا رہا ہے۔ مقام مسرت ہے کہ مسعود صاحب اس پیرانہ سالی میں بھی اس فن کے علمبردار ہیں۔ وہ اس فن کے ماہر اور رمز شناس ہیں۔ قدیم اور جدید تاریخوں کا یہ فنکارانہ مرکہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مجموعے میں بے شمار تاریخیں ہیں۔ سب کی سب برجستہ اور زیادہ تر تعمیہ اور تخرجہ کے بغیر ہیں۔ کتاب ۲۰۴ صفحوں پر مشتمل ہے قیمت فی جلد دو روپے پچاس پیسے۔

قدم مِلا کے چلیں
مِل کر کام کریں

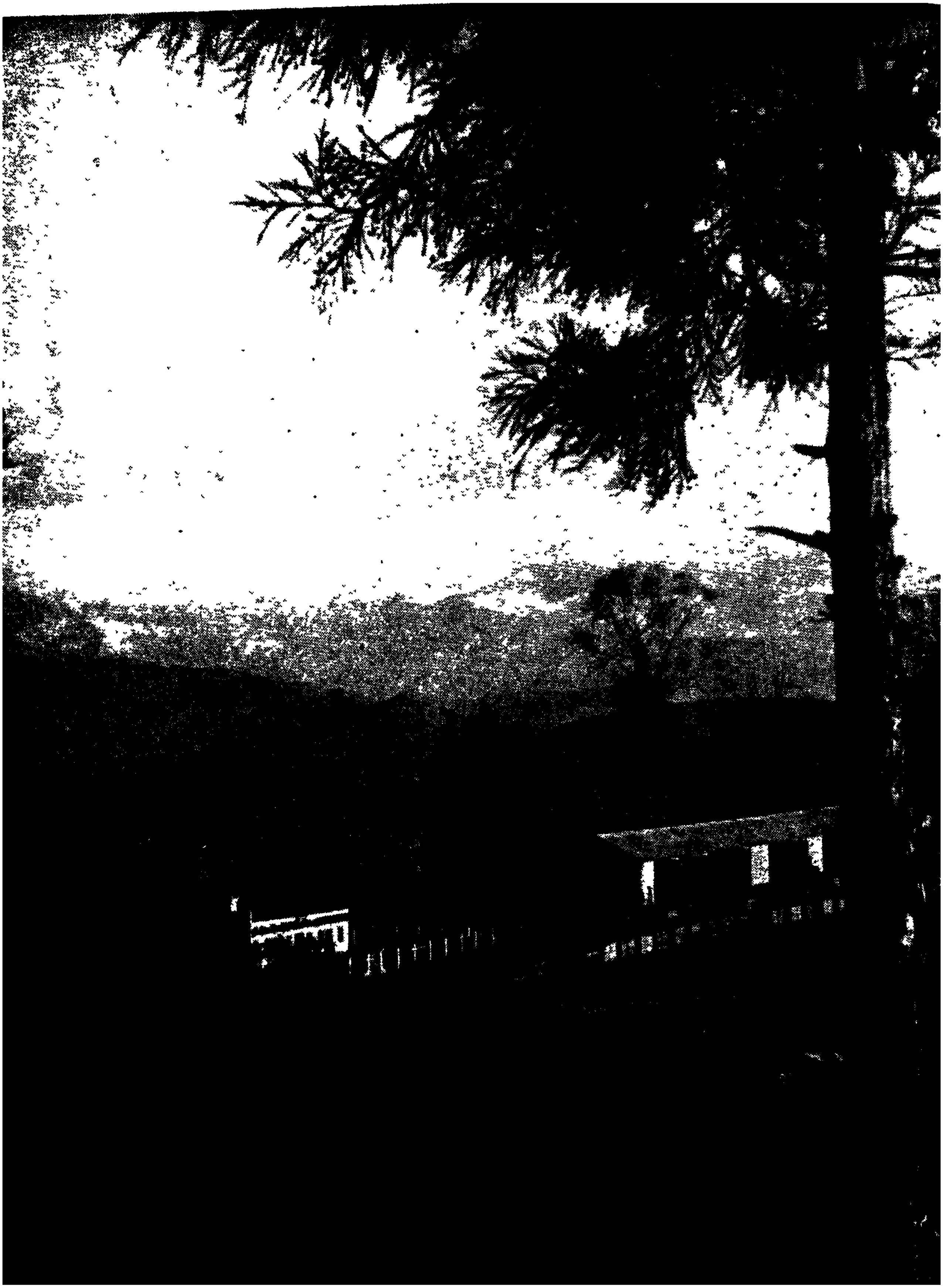
"ملک کے مختلف حصّوں میں رہنے والے عوام کو خواہ بعض معاملوں میں اُن کے خیالات کتنے ہی مختلف ہوں، یہ نہیں بھولنا چاہئیے کہ وہ اوّل ہندوستانی ہیں اور یہ کہ اُنہیں اپنے تمام اختلافات قوم اور مُلک کے ناقابلِ تبدیل ڈھانچے ہی میں رہتے ہوئے دُور کرنے ہیں۔ آیئے: ہم ایکتا کے اس احساس کو بڑھاوا دینے کی ہر ممکن کوشش کریں اور قومی یک جہتی کے کام کو آگے بڑھائیں۔"

لال بہادر شاستری
وزیرِ اعظم

بھارت کو مضبوط کرنے اور اُس کے سبھی باشندوں کے لئے آزادی و خوشحالی کو یقینی بنانے کا ہمارا راستہ صاف اور سیدھا ہے۔
قدم مِلا کے چلیں، ایک قوم کی طرح مِل کر کام کریں۔ اپنے اندر حوصلہ، عزم، بُردباری اور خیر سگالی کا جذبہ پیدا کریں۔

جے ہند

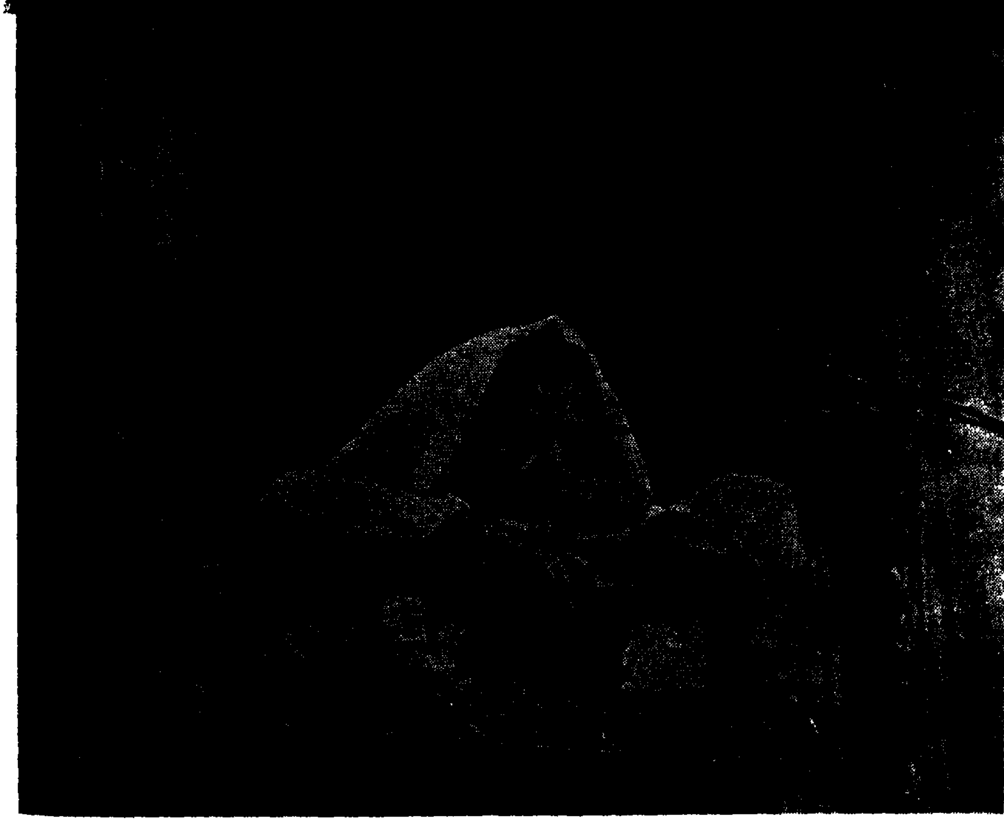
ایکتا بنائے رکھیئے ۔ آزادی کی حفاظت کیجیئے





بیم (گوا) کے گرجا میں جہاں سینٹ فرانسس زیویرس کے تبرکات محفوظ ہیں
وزیراعظم شری جواہرلال نہرو شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ (۲۳۔ مئی ۱۹۶۳ء)

Edited & published by the Director, [illegible]
Printed by Union Printers Co-op. [illegible]



اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل دہلی

ترتیب

سرورق: — گوا کا ایک منظر

رسالے کی پشت پر — جونسار کی لوک رقاصائیں

جلد ۲۳ — نمبر ۶

پوس شک سمت ۱۸۸۶

جنوری سنہ ۱۹۶۵ء

سالانہ چندہ: —	ہندوستان میں: —	سات روپے
	پاکستان میں: —	سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے: —		۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر
قیمت فی پرچہ: —	ہندوستان میں: —	۶۰ پیسے
	پاکستان میں: —	۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے: —		۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ

بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ وشائع کردہ

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ملاحظات

روس کی کمیونسٹ پارٹی میں حال ہی میں کچھ تبدیلیاں آئیں اور ایک نئی حکومت بنی۔ لیکن اس نئی حکومت کے لیڈروں نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ روس کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں کریں گے۔ چنانچہ شریمتی اندرا گاندھی جب ماسکو تشریف لے گئیں تو ان کے اعزاز میں بھارتی سفیر شری ٹی۔ این کول نے ایک لنچ دیا۔ اس موقع پر روس کے نئے وزیراعظم مسٹر اے۔ این کوسی جن نے کہا —— شریمتی اندرا گاندھی سے ہماری ملاقات اور باہمی دلچسپی کے مسائل پر گفت و شنید ہمیشہ ہی ہمارے لئے باعث خوشی رہی ہے۔ ہمیں وہ خوشگوار وقت یاد آتا ہے جو کہ میں نے اپنی بیوی کے ہمراہ بھارت میں گزارا۔

انھوں نے کہا کہ بھارت سے ہماری دوستی کوئی عارضی نہیں ہے۔ یہ دوستی بھارت اور روس کے عوام کی ہے اور ہر دو ملکوں کے درمیان ایک بہترین دوستی خیال کی جاتی ہے۔"

کویت کے وزیراعظم اور شہزادہ ولی عہد ہزایکسی لینسی شیخ صباح السلیم الصباح کی آمد پر نئی دہلی میں ان کا پرتپاک خیرمقدم کیا گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اگرچہ یہ میرا بھارت میں پہلا دورہ ہے تاہم بھارت ہمارے لئے اجنبی نہیں ہے۔ ہم آپ سے آپ کے عظیم ذہنی ورثے کے توسط سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ کی جدوجہد آزادی کے توسط سے ہم آپ سے متعارف ہیں۔ آپ کی ترقی کی بدولت آپ سے واقف ہیں۔ بین الاقوامی امن کی خاطر آپ کے رہنماؤں کے تعمیری کاموں کے سبب آپ کو جانتے ہیں۔ گاندھی نیز نہرو کی عظیم شخصیت کے سبب آپ سے واقف ہیں اور آپ کے بھائیوں کے توسط جو کویت میں بھارتی برادری کے افراد کے ذریعے آپ سے متعارف ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں خوشی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ رہنے میں بالکل گھر کا سا آرام سمجھتے ہیں۔

امداد باہمی کے کل ہند ہفتہ پر ایک پیغام میں اجتماعی ترقی اور امداد باہمی کے مرکزی وزیر شری ایس۔ کے۔ ڈے نے کہا ہے کہ امداد باہمی سے متعلق ۱۹۶۴-۶۵ء کے سال میں بھارت سرکار ایک نیا باب شروع کرنا چاہتی ہے۔ اقتصادی، انتظامی اور ٹیکنیکل طاقت سے اس سال بھاری امداد پیش کی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بے عمل اور جعلی سوسائیٹیوں کو ختم کرنے کے لئے دوررس اقدام کئے جائیں گے۔ اور اس تحریک کی سرگرمیوں اور اداروں کو طاقتور اور مضبوط بنانے کی تدبیریں کی جائیں گی تاکہ وہ ایک معقول مدت کے اندر اندر اپنی صلاحیت پر بھروسہ کرنے والے یونٹ بن جائیں۔

شری ڈے نے کہا کہ تحریک سے مفاد پرست طبقوں کو خارج کرنے کے لئے کوششیں کی جائیں گی۔ تحریک کو فروغ دینے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور ملک کے مختلف حصوں کے امداد باہمی کے مختلف شعبوں میں جو کام ہو رہا ہے۔ تحریک دوستوں کو اسے دیکھنے کی سہولتیں دی جائیں گی۔

تا دم تحریر بھارت کو چھوڑ کر ۳۰ ملکوں نے بھارت کے تیسرے بین الاقوامی فلمی میلے میں شرکت کے لئے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا ہے۔ یہ میلہ بھارت کی فلمی صنعت میں ایک بڑے واقعہ کی حیثیت سے ہوگا۔ توقع ہے کہ عنقریب ہی چند اور ملکوں کے نام بھی شرکت کی غرض سے آ جائیں گے۔

اے وطن، میرے وطن!

اے مرے خوابوں کی دنیا، سرزمینِ آرزو!
جنتِ قلب و نظر، اے جلوہ گاہِ رنگ و بو!
اے مری بزمِ طرب، اے محفلِ جام و سبو!
نغمہ و شعر و شراب و سرخوشی کی انجمن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

اے چمن زارِ سکوں، اے کشورِ جنت نشاں
تیرے گلشن میں سدا لطفِ بہارِ بے خزاں
مہرباں روزِ ازل سے اس زمیں پہ آسماں
تازگیٔ جاں کا گہوارہ تری بزمِ کہن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

تیرے دامن میں وہ غنچے ہیں جو مرجھاتے نہیں
وقت کی صرصر کے جھونکے اس طرف آتے نہیں
گردِ دوراں سے ترے آئینے دھندلاتے نہیں
تو وہ سورج ہے کبھی لگتا نہیں جس کو گہن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

نور بہ نور جلوے فضاؤں میں لٹاتی آئی ہے
نت نئے عالم نگاہوں کو دکھاتی آئی ہے
زندگی کو اپنا دیوانہ بناتی آئی ہے
لیلیٰ فطرت کہ تیرے نجد میں ہے خیمہ زن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

عہدِ سرما کے وہ دن اوڑھے ردائے شبنمیں
گرمیوں کی چاندنی راتیں وہ قشقہ برجبیں
کوئی موسم ہو، فضا تیری حسین و دل نشیں
قدرتی پیکر پہ زیبا ہے ترے ہر پیرہن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

جھوم کر چلتی ہے جب برکھا کی متوالی ہوا
ابرِ رحمت بن کے برسے جب کسانوں کی دعا
ایک جشنِ نو تری دھرتی پہ ہوتا ہے بپا
تیرے نظاروں میں آ جاتا ہے تازہ بانکپن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

ہمیشہ دار، ارم، گنگ و جمن کی وادیاں
چونکتی ہیں خواب سے لیتی ہوئی انگڑائیاں
لہلہاتی، پھولتی پھلتی ہزاروں کھیتیاں
وجد میں آئے ہوئے دشت و جبل، کوہ و دمن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

کوہساروں پہ وہ بادل چھاؤنی چھاتے ہوئے
ندیوں کے راستے وہ پیچ و خم کھاتے ہوئے
جانور، سرسبز میدانوں میں اٹھلاتے ہوئے
جھومتے پیڑوں پہ پنچھی گیت گانے میں مگن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

پنگھٹوں پر رنگ برساتی وہ رنگیں ساریاں
گھر کے آنگن میں مہکتی پیار کی پھلواریاں
گاؤں کی مہماں نوازی، شہر کی دلداریاں
یہ بہار اندر بہاراں، وہ چمن اندر چمن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

اے کہ تیری فطرتِ معصوم ہے بے ریو و ریا
تیرے آئینے میں تاباں جوہرِ صدق و صفا
تیری محفل میں فروزاں مشعلِ مہر و وفا
پھوٹتی ہے تیرے مشرق سے محبت کی کرن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

ہے صنم خانوں میں تیرے زندگی کی بت گری
تیرے ہر بت گر کو حاصل ہے کمالِ آذری
سنگ ریزے ہیں ترے آئینۂ اسکندری
ہر کھنڈر میں ہے ترے حسنِ اجنتا کی پھبن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

آج بھی رخشندہ تر ہے آج بھی تابندہ تر
ثبت جو تو نے کیا تاریخ کے اوراق پر
کہکشاں نقشِ کفِ پا ہے ترے، ہر رہگزر
تیرے ہاتھوں میں سدا ہے مشعلِ فہم و فطن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

دیو، گوتم تیرے گلشن کے نوا سنجِ بہار
کرشن کی مرلی بھی تیری انجمن میں نغمہ بار
چشتی و نانک بھی تیرے میکدے کے میگسار
تو نے دنیا کو سکھائے دین و دانش کے چلن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

کہہ رہے ہیں تیرے اوجِ مرتبت کی داستاں
مسجدوں کے یہ منارے، مندروں کی برجیاں
تیری عظمت کی امیں، آوازِ ناقوس و اذاں
تیری حرمت کے محافظ تیرے شیخ و برہمن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

آندھیاں اٹھتی رہیں، طوفان بھی آتے رہے
ناخدا تیرے، تری کشتی بچا لاتے رہے
خون کے گرداب میں بھی جھومتے گاتے رہے
کر گئے طے ہنستے ہنستے منزلِ دار و رسن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

مجھ کو بھی دھن ہے کہ تیرے زمزمے گاتا رہوں
اپنے نغموں سے تری محفل کو گرماتا رہوں
تیرے گلشن میں صبا کی طرح لہراتا رہوں
میرے دم سے تازہ تر ہوں یہ ترے سرو و سمن
اے وطن، میرے وطن، میرے وطن، میرے وطن

صباح الدین عبدالرحمٰن

ہندوستان کی فارسی شاعری میں ہندوستان کی مدح

ہندوستان کے فارسی شعراء میں سب سے پہلے امیر خسرو (۶۵۱ - ۷۲۵ھ / ۱۲۵۳ - ۱۳۲۴ء) کے کلام میں اس سرزمین سے شیفتگی، وارفتگی اور فریفتگی کے نشانی دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں ایک ہی وقت میں جلوہ ہائے صدرنگ نظر آتے ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے، ادیب بھی، صوفی بھی، درباری بھی، ماہرِ موسیقی بھی، اور کشتۂ محبت و طن بھی۔ اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان میں سے ان کا کون سا وصف زیادہ دل کش اور دل آویز تھا۔ لیکن اُن کی زندگی اس کی اعلیٰ مثال ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقیدہ میں راسخ ہونے کے ساتھ ہر مجلس اور ہر طبقہ میں مقبول اور محبوب رہے۔ وہ سراپا عشق و محبت تھے، ان کے ہر بُنِ مو سے عشق و محبت ہی کے نغمے بلند ہوتے تھے۔ ان کو عشقِ الٰہی، عشقِ رسول، عشقِ مادر، عشقِ دوست، عشقِ سلاطینِ وقت کے ساتھ عشقِ وطن اور عشقِ ہم وطن بھی رہا۔ جس کی ایک جھلک اس مضمون میں بھی نظر آئے گی۔

وہ اپنے مولد پٹیالی (ضلع ایٹہ) سے آکر دہلی میں اپنے نانا عمادالملک کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ جہاں کچھ دنوں کے بعد ان کو دہلی سے عشق ہوگیا۔ اسی لئے اپنی مثنوی قران السعدین میں جو ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء میں لکھی گئی۔ کہتے ہیں کہ یہ عدن کی جنت ہے، یہ شہر اپنی صفات کی وجہ سے باغِ ارم بن گیا ہے۔ اس بوستان کا قصہ سن کر کعبہ بھی اس کا طواف کرنے لگے، اور مدینہ اس کی شہرت سن کر بہت ہوجائے۔ یہ اپنی خصوصیات سے قبۂ اسلام بن گیا ہے۔

حضرت دہلی کنف دین و داد جنت عدن است کہ آباد باد
ہست چو ذات ارم اندر صفات حرسہا اللہ عن الحادثات
گر شنود قصۂ این بوستان مکہ شود طائف ہندوستان
شہر نبی را لب او قسم شہر خدا گشتہ زمینش اصم
قبۂ اسلام شدہ در جہان لبتہ او قبۂ ہفت آسمان

پھر دہلی کے لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا ہر گھر اپنی زینت و آرائش کی وجہ سے گوشۂ بہشت ہے۔ اس کی صنعت کاریوں میں بکثرت روپیہ لگائے گئے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی تعریف میں کہتے ہیں کہ یہ فرشتہ صفت اور جنت والوں کی طرح خوش دل اور خوش خو ہوتے ہیں۔ وہ صنعت، علم و ادب، آہنگ و ساز اور نیزہ و پیکاں کے ہنر میں بے نظیر ہیں۔ امیر خسرو اس شہر کے پگڑی باندھنے اور چہرہ لگانے والے محبوبوں کے ناز و ادا سے بھی متاثر تھے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ شوخ اور سادہ حسین محبوبوں کی وجہ سے مسلمان بھی سورج کے پجاری ہوگئے ہیں اور یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ یہاں کے مہ چہروں کو دیکھ کر خود وہ یعنی خسرو، خراب اور سرمست ہوگئے ہیں۔

ساکن او جملہ بزرگان ملک گوشہ بگوشہ ہمہ ارکان ملک
گوشۂ ہر خانہ بہشتے شگرف گشتہ بہ صنعت زر بے قدر صرف
مردم او جملہ فرشتہ سرشت خوش دل و خوش خوئے چو اہل بہشت
بیشتر از علم و ادب بہرہ مند و اہل سخن خود کہ شمارد کہ چند

واز بہشت نیزہ ہ پیکان و تیر   ہر کہ در آید بہ نظر بے نظیر
اے دہلی واے بتان سادہ   پگ بستہ و ریشہ کج نہادہ
خورشید پرست شد مسلمان   زین ہندوگان شوخ و سادہ
کردند مرا خراب و سرمست   این مغ بچگان تاک زادہ

امیر خسرو کو دہلی کی آب و ہوا بہت پسند تھی، اسی لئے کہتے ہیں کہ اس ملک کا پانی اگر کوئی پی لے تو پھر خراسان کا پانی پینا نہ چاہے۔ پھر کہتے ہیں کہ یہاں کی ہوا گرم ضرور ہے لیکن غایت محبت میں اس کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آفتاب کو یہاں سے عشق ہے۔ اسی عشق کی گرمی کی وجہ سے یہاں کی ہوا گرم ہو گئی ہے اور پھر یہیں سے ساری دنیا کی ہوا گرم ہو گئی۔

ہر کہ درین ملک دمے آب خورد   گشت دل از آب خراسانش سرد
گرچہ دریں ملک ہوا ہست گرم   از خنکیہائے خراسان چہ شرم
ہر فلک گرم شد اندر وفاش   گرم ازان گشت جہان را ہواش

امیر خسرو کو دہلی کی ہر چیز پیاری تھی۔ اس لئے دہلی کی جامع مسجد، منارہ، حوض شمسی، یہاں کے پھولوں، میووں، کیلوکھری کا قصر نو، شاہی دربار کے جشن نوروز، شاہی دعوت اور رقص کرنے والی عورتوں کی مصوری میں ان کی محبت غیر معمولی طور پر بیدار ہو کر ان کے قلم کو بہت ہی نشاط انگیز بنا دیتی ہے۔

امیر خسرو نے اپنی مثنوی دول رانی خضر خاں ۷۱۵ھ / ۱۳۱۵ء میں لکھی تو اس میں ہندی یعنی سنسکرت زبان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فارسی زبان سے کم نہیں۔ عربی کے علاوہ اور تمام زبانوں پر اس کو فوقیت حاصل ہے۔

غلط کردم گر از دانش زنی دم   نہ لفظ ہندی ست از پارسی کم
بجز تازی کہ میر ہر زبان ست   کہ بر جملہ زبانہا کامران ست

وہ اس مثنوی میں ہندوستان کے مختلف پھولوں مثلاً سوسن، سمن، بنفشہ، کیوڑہ، بیلا، گل نسرین، گل سرخ، ریحان، گل کوزہ، گل لالہ، گل سفید، سپرغم، صدبرگ، نسترن، یاسمین، مدنا، کرنا، نیلوفر، ڈھاک، چمپا، جوہی، کیوڑا، سیوتی، گلاب، مولسری وغیرہ کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ بنفشہ، سمن اور نسترن تو ایران سے ہندوستان میں لائے گئے، ورنہ اور تمام پھول ہندوستانی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پھول کی تعریف میں اپنا شاعرانہ کمال بھی دکھایا ہے مثلاً رانے چمپا کو امیر خسرو پھولوں کا بادشاہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی خوشبو ایسی ہوتی ہے جیسے شراب میں کسی نے مشک ملا دیا ہو۔ یہ چنبیلی جیسے بدن والے معشوق کی طرح نازک ہوتا ہے اور اس میں زردی عاشقوں کے چہرے کی طرح ہوتی ہے، اس سے جو تیل نکالا جاتا ہے وہ سر میں مشک سے زیادہ اثر کرتا ہے۔

دگر آں رانے چمپ شاہ گلہا   کہ بویش مشکبار آمد چو صہبا
چو معشوق سمن بر ناز پرورد   ولے رنگش چو روئے عاشقاں زرد
بروغن پرورندش بہر سرہا   کہ سر از مشک تر گیرد اثرہا

سیوتی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بھونرا اس کے لئے جان دیتی ہے اور مرنے کے بعد بھی اس سے لپٹی رہتی ہے۔ معشوق عاشق کی طرح اس کے لئے سرگرداں رہتے ہیں۔ یہ پھول معشوقوں کا معشوق ہے۔

چو پیکاں بلبلہ سیوتی خورد   کہ جانہا بر آں پیکاں ہوس برد
ز عشق بوئے او جاں دادہ زنبور   نگشتہ بعد مردن نیز از و دور
ہمہ خوبانش عاشق وار جویاں   کہ معشوقیست نزد خوبرویاں

آخر میں وہ ہندوستان کے عام پھولوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ دنیا کے تمام پھولوں سے بہتر ہیں اور بہشت میں بھی ایسے ہی پھول ہوں گے۔ اگر اس جگہ کی طرح پھول روم و شام میں ہوتے تو وہاں کے لوگ ان کی تعریف تمام دنیا میں کرتے پھرتے۔

گل مارا بہ ہندی نام زشت ست   دگر نہ ہر گلے باغ بہشت ست
گر ایں گل خاستے در روم یا شام   کہ بودے پارسی یا تازیش نام
شدے معلوم تا مرغان آں بوم   چساں غلغل زدندے در کشور

امیر خسرو نے اس مثنوی میں یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستان کی حسین عورتیں مصر، روم، قندھار، سمرقند، ختن، [illegible]

جنوری ۱۹۷۶

نخ اور تمام حسینانِ عالم پر اپنے حسن کی صفات میں فائق ہیں۔ کہتے ہیں کہ چین اور نخ کا حسن بھی ہندوستان کے حسن کے برابر نہیں۔ کیونکہ اقلیم الاکبر کے حسین تیز چشم اور ترش رو ہوتے ہیں خراسان کے حسین سُرخ اور سفید ضرور ہوتے ہیں لیکن ان کے جیسے پھول ہیں ویسے حسین بھی ایک ہی رنگ ہے لیکن بو نہیں۔ روس اور روم و ترکی کے حسینوں میں عجز و انکسار نہیں پایا جاتا، وہ برف کی طرح سرد اور سفید ہوتے ہیں۔ تاتاری حسینوں کے ہونٹوں پر ہنسی دکھائی نہیں دیتی۔ ختن کے حسن پر نمک نہیں ہوتا سمرقند اور بخارا کی خوب صورتی میں شیرینی نہیں۔ مصر اور روم کے سیمیں بدن ہندوستان کے حسینوں کی طرح چالاک اور حسین نہیں ہوتے۔

بتانِ ہند را نسبت ہمیں ست بہر یک خوش نشاں مدملک چیں ست
چو گیری تمام از ہمہ او از نخ کہ قالب تیز چشم اند و ترش رخ
چو یاد آری سپید و سرخ و زرد چو گلہائے خراساں رنگ بے بو
و گر پرسی خبر از روم و از روس از ایشاں تیز تابید لابہ و کوس
سپید و سرد ہمچو کستہ و یخ کز ایشاں دم فرو دکافونِ دوزخ
لب تاتار خود خنداں تباشد ختن را خود نمک چنداں نباشد
سمرقندی و آنچہ از قندھار بجز نامے ز شیرینی ندارند
بمصر و روم ہم سیمیں خدانند و لے چستی و چالاکی ندانند

امیر خسرو نے ایک اور مثنوی نہ سپہر ۷۱۸ھ میں لکھی تو اس میں ہندوستان کا ذکر اس سے زیادہ بے خود ہو گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو ہندوستان سے اس لئے محبت ہے کہ یہ ان کا مولد، ماویٰ اور وطن ہے، اور رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ وطن کی محبت ایمان کا جز ہے۔

دین ز رسول اللہ چنیں یاد دہد حبّ وطن ہست ز ایماں یقیں

پھر فرماتے ہیں کہ ہندوستان ایک جنّت ارضی ہے اور اس کے بہت سے اسباب بتاتے ہیں جن میں کچھ یہ ہیں کہ یہاں [illegible] کے ساتھ عطریات اور خوشبویات ہیں۔ [illegible] جیسے پھول ہوتے ہیں لیکن ہندوستان کی سرزمین خوشبودار پھولوں سے ہمیشہ گلزار رہتی ہے۔ مسلمان ساری دنیا کو ایک قید خانہ سمجھتے ہیں، لیکن ہندوستان ان کے لئے خلدِ برین ہے

کافر کہ در ہند مسلمان نیست تا بتنش از آذر جانست رمق
گرچہ کہ بر نسبت فردوس نہاں با ہمہ لطفش چو زنداں بہست جہاں
لیک بہ ہند است نسیمش دگرم تا شد از روئی دہد از جنّت اثر
زاں سبب خاص بر اصحاب یقیں ہند کواں گفت کہ خلد است بریں

وہ ہندوستان کی آب و ہوا کا ذکر کرتے ہوئے اس کو دوسرے ممالک کی آب و ہوا سے بہتر بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں کی سردی سے نقصان نہیں پہونچتا۔ غریبوں کو زیادہ سرمائی سامان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہاں پورے سال گل و گُل کی بہار رہتی ہے۔ یہاں کے پھول خشک ہونے کے بعد بھی خوشبو دیتے رہتے ہیں۔ یہاں آم، کیلا، الائچی، کافور اور پان جیسی نادر چیزیں ہوتی ہیں۔ پھر ہندوؤں کے علوم و فنون کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں فلسفہ بھی ہے، منطق بھی نجوم بھی اور علم کلام بھی۔ پھر کہتے ہیں طبیعیات، ریاضیات اور ہیئت میں تو ہندوستان اپنی مثال آپ ہے۔ ہندوؤں کے عقائد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ خداوند تعالےٰ کی وحدت، اس کی ہستی اور قدم کے معترف ہیں۔ اس کی قدرت ایجاد اور اس کے رازق، خالق افعال، فاعل مختار اور عالم جز و کل کے قائل ہیں۔ امیر خسرو نے ہندوؤں کے مذہب کا بھی اسلام کے علاوہ اور تمام مذہبوں سے مقابلہ کیا ہے اور اس کو ان سے بہتر بتایا ہے، اگر چہ بہت ہی جوش و خروش سے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان تمام ممالک سے بہتر اور برتر ہے اور اس کے دس اسباب بتائے ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں کہ یہاں دنیا کی بہ نسبت علم نے زیادہ وسعت حاصل کی۔ ہندسہ، ریاضی اور ایجاد صفر یہاں کی خاص چیز ہے۔ کلیلہ و دمنہ جیسی کتاب یہاں لکھی گئی۔ شطرنج یہاں کی ایجاد ہے۔ یہاں جو موسیقی کی ترقی ہوئی کہیں اور نہیں ہوئی۔ یہاں کی موسیقی سے آہوئے صحرا بھی بے جان ہو جاتے ہیں۔

امیر خسرو کو ہندوستان کی ہر چیز سے انس ہے تو یہاں کے جانوروں سے بھی اپنی الفت کا اظہار کرتے ہیں اور اسی جذبہ میں کہتے ہیں کہ یہاں کے طوطے آدمی کی طرح بول سکتے ہیں۔ یہاں کے کوے مستقبل کی خبر دیتے ہیں۔ یہاں کے طاؤس میں دلہن کی سی رعنائی ہے۔ یہاں کے بگلے تھوڑی تربیت کے بعد عجیب و غریب کرتب دکھاتے ہیں۔ یہاں کے گھوڑے تال اور سُر کے ساتھ ٹاپ مارتے ہیں۔ یہاں کی بکری ایک پتلی لکڑی پر چاروں سم رکھ کر ٹھہر سکتی ہے۔ یہاں کے بندر ناقص بشر کی علامت ہیں۔ یہاں کے ہاتھی بظاہر حیوان ہیں لیکن عمل میں انسان ہیں۔

امیر خسرو یہاں کی جادوگری کا بھی ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں سانپ کے کاٹے ہوئے مردوں کو چھ مہینے کے بعد بھی زندہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کے جوگی حبس دم کر کے ایک عرصۂ دراز تک زندہ رہ سکتے ہیں۔

ہندو مرد اور عورت میں وفا شعاری کا جو جذبہ ہوتا ہے امیر خسرو اس سے بھی متاثر ہوئے اور کہتے ہیں کہ ہندو مرد اپنے بت اور مالک کے لئے اپنی جان بھینٹ چڑھا دیتا ہے اور ہندو عورت اپنے شوہر کی خاطر راکھ ہو جاتی ہے۔ اگر اسلام کی شریعت اس کی اجازت دے تو بہت سے لوگ اس سعادت کو حاصل کر لیں میں اپنی جانیں قربان کر دیں۔

ہست عجب مردن ہندو بوفا   مرد لیش از تیغ دز آتش بجفا
زن ز پئے مرد بسوزد بہ ہوس   مرد ز بہر بت و یا منعم و بس
گرچہ در اسلام روا نیست چنیں   لیک چہ بس کار بزرگست ببیں
گر بشریعت بود ایں نوع روا   جان بدہند اہل سعادت بہوا

خسرو کا قلم ہندوستان یا اس کے مختلف حصوں کی تعریف میں آخر آخر وقت تک نہیں تھکا۔ انھوں نے جب اپنا آخری دیوان نہایۃ الکمال مرتب کیا تو اس کے ایک قصیدہ میں دیوگیر (دکن) کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کو میں جنت کہتا، لیکن ڈر ہے کہ کہیں جنت شداد نہ تصور کی جائے۔ اس کی مزید تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مصر نے اس کی شہرت سن کر اپنا جامہ اُتار کر نیل میں ڈال دیا اور بغداد دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔ اس کی ہوا جنت کی ہوا ہے جس کی خوشبو سے تمام پھول معطر ہوتے ہیں۔

ادب نگر کہ اگر جنتش لقب گویم   شود بغرق تحریم کہ جنت شداد
گر خبر ز چنیں شہر یافتہ کہ مصر   فگندہ جامہ بہ نیل و دو نیمہ شد بغداد
ہوا چنانکہ از مژدۂ نشاط دہد   بسان نعمت موعود ما لکان میعاد

یہاں کے آموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ شہد اور دودھ سے بھرے ہوئے سنہرے ڈبے ہیں۔ اور چوسنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصری کے پانی سے منہ بھر گیا ہے۔

نبہے حلاوت نغز کہ ہست در ہر گرم   نبات اینا من کل لذت الفواد
بشکل ہست پر از شہد و شیر حقۂ زر   کہ آب از دہن کوزۂ نبات کشاد

یہاں کے کپڑوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ اتنے باریک ہوتے ہیں کہ چاند کی جلد اگر علیحدہ کر دی جائے اور اس سے موازنہ کیا جائے تو بھی یہ کپڑا باریکی میں بڑھ جائے۔ اس کا ایک سو گز سوئی کے ناکے میں سما سکتا ہے۔ اس کا لباس بنا کر بدن پر پہنا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بدن پر صاف و شفاف پانی پڑ رہا ہے۔

چہ وصف جامہ کنم کاینچناں نباشد اگر   ز مہ بسلخ کشد پوست اختر جلاد
بچشم سوزن صد گز بگنجد از پس لطف   درو بجلہ خرد نوک سوزن پولاد
بسان قطرۂ آبی تو انش گفتن اگر   چکد ز چشمہ خور قطرہ ہا متعاد

امیر خسرو نے وطنی محبت کی جو شمع روشن کی۔ اس کو ان کے بعد فارسی شعراء نے فروزاں رکھا۔ چودھویں صدی عیسوی میں عصامی ایک بہت ہی مشہور شاعر گزرا ہے۔ وہ دہلی میں ۱۳۱۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کا دادا عزالدین عصامی سلطان غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ - ۱۲۸۶ء) کے عہد میں سپہ سالار تھا۔ سلطان محمد بن تغلق

راقم نے 'خسرو اور ہندوستان' کے عنوان سے پورا ایک رسالہ خسرو اکیڈیمی دہلی کے لئے مرتب کیا ہے۔ اس میں خسرو کو ہندوستان سے جو شیفتگی اور فریفتگی رہی، اس کی پوری تفصیل ملتی ہے۔ اسی لئے زیر نظر مضمون میں اجمال اور اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

(۱۳۵۱ - ۱۳۲۵ء) نے دہلی سے دولت آباد دارالسلطنت منتقل کیا۔ تو امیر الدین عصامی بھی اپنی پیرانہ سالی میں اپنے پوتے کو لے کر دہلی سے دولت آباد چلا گیا۔ جہاں پہونچ کر کچھ دنوں کے بعد عصامی علاء الدین حسن شاہ بہمنی کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور یہیں اس نے ۱۳۵۰ء میں غزنویوں، خلجیوں اور تغلقوں کا ایک شاہ نامہ فتوح السلاطین کے نام سے لکھا، جس میں بارہ ہزار اشعار ہیں، اس میں جا بجا ہندوستان کی مدح بھی کرتا جاتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے کہ ملک ہندوستان کی رونق کیسی اچھی ہے۔ اس بوستان پر جنت کو بھی رشک آتا ہے۔

خوشا رونق ملک ہندوستاں   کہ جنت برد رشک ازیں بوستاں

پھر کہتا ہے کہ اس کی سرزمین تمام روئے زمین کے لئے زینت ہے اسی طرح جیسے کسی نازنین کے رخسار پر تل ہو

سزاوش شدہ زیب روئے زمیں   چو خالے بہ رخسار ہر نازنیں

اس کی خاک سے سرخ گندھک پیدا ہوتی ہے اور اس کے چاروں موسم کی ہوا بہشت کی ہوا ہے۔

چو کبریت احمر دمد خاک کشت   بہر چار فصلش ہوائے بہشت

یہاں کوئی بھی دی (جاڑے کے پہلے مہینہ) میں پوستین نہیں پہنتا ہے اور کسی کو بھی تموز میں (جب آفتاب برج سرطان میں رہتا ہے) یہاں پسینہ نہیں آتا ہے

درو پوستینی کس پوشد بہ دی   دگر کس در تموز اندر و کرد خوی

یہاں قدم قدم پہ جوئبار (ندیاں) ہیں، جن کا پانی آب حیات سے بھی زیادہ بہتر اور صحت مند ہے اور پھر یہ پانی آب حیات ہے، لیکن آب حیات کی طرح اس پہ تاریکی چھائی ہوئی نہیں ہے۔

رواں ہر قدم اندرو جوئبار   بہ حیواں ہمہ آب او سازوار
شدہ آب او آب حیواں تمام   ولیکن ز ظلمات بیروں مدام

یہاں کے موسم خزاں میں بہار کا لطف آتا ہے۔ یہاں اگر کانٹا بویا جاتا ہے تو پھول اگتا ہے۔

بہ فصل خزاں درو آید بہار   دمد گل درو گر نکارند خار

اس کی ساری مٹی میں گلاب ملا ہوا ہے، اور اس کی مٹی پہ شبنم بادل ہی کی طرح اثر کرتی ہے۔

سرشتہ ہمہ خاک او با گلاب   دمد شبنمے ہمچو فیض سحاب

یہاں کے موسم میں باد سموم صبا بن جاتی ہے اور زقوم (تھوہر کا زہریلا درخت) یہاں کی مٹی میں گندنا (ایک قسم کی سبزی) بن جاتا ہے۔

سموم اندریں باغ گردد صبا   زقوم اندریں گل شود گندنا

یہاں کی صبح ہو یا شام ہو ہر وقت آدمی کے لئے یہ خوشی کی آرام گاہ ہے۔

چہ در صبح گاہ و چہ در شام گاہ   درو آدمی را خوش آرام گاہ

یہ میووں اور پھولوں کی وسیع سرزمین ہے، درختوں کی شاخوں سے اس کی سرزمین ٹھنڈی اور سایہ دار رہتی ہے۔ اس کی خاک بوئے گل سے معطر ہے اور اس کا پانی گلاب سے معطر ہے۔

کشایش ہمہ گلبن و میوہ دار   زمیں سایہ در سایہ از شاخسار
معطر شدہ خاکش از بوئے گل   معطر شدہ آبش از روئے گل

انسانیت کی اصل اسی کی خاک کی وجہ سے قوی ہوتی ہے اور اس کی ہوا صبح کی ہوا کی طرح خوش گوار ہوتی ہے۔

ز خاکش قوی گشتہ اصل البشر   ز بادش شدہ خوش ہوائے سحر

جو کوئی بھی اس بوستان طرب میں عراق، عرب، عجم، سندھ اور غرب سے آیا، اس کا دل اس اچھے ملک میں ایسا لگتا ہے کہ اس کا مولد اس کو بہت کم یاد آتا ہے۔

کسے کاندریں بوستان طرب   رسید از عراقین و سند و عرب
چناں بست دل اندریں خوش بلاد   کہ از مولد خود کم آورد یاد

دنیا کے بڑے بڑے سیاح کسی جگہ ایک مہینہ سے زیادہ نہیں ٹھہرتے، اور اگر وہ یکایک اس دیار میں آجاتے ہیں تو سیاحت چھوڑ کر یہاں سکونت پذیر ہو جاتے ہیں اور یہاں سے باہر کم جاتے ہیں۔ اور اس ملک سے ان کو ایسا لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کی جان بھی جائے تو دل گیر نہیں ہوتے۔

جہاندیدگانے کہ گرد جہاں   بگردند دایم سیاحت کناں
نبندند خاطر بہ ہیچ از دیار   نگردند ملبہ بہ شہر ستقرار

ہم آخر چو در ملک ہندوستاں درآیند ناگہ سیاحت کناں
سیاحت گزارند و ساکن شوند بدل زین دیار و دمن کم روند
چناں دل دریں کشور خوش نہند کہ دل بر نگیرند اگر جان دہند

بعض شعراء کو ہندوستان کا کوئی شہر یا یہاں کی کوئی مخصوص چیز پسند آجاتی، تو اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنے کلام میں کرتے رہتے۔ مثلاً بدر چاچ (المتوفی ۷۵۴ھ / ۱۳۵۴ء) سلطان محمد بن تغلق کا درباری شاعر تھا، اور فخر الزماں کے خطاب سے سرفراز ہوا تھا، اس نے نگرکوٹ (موجودہ کانگڑہ) کا قلعہ دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ ہندوؤں کو قلعہ بنانے میں بڑی مہارت تھی اور انھوں نے ان کی تعمیر میں جو فن دکھایا وہ دنیا کی زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ قوموں کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ وہ پہاڑوں کے سینے چاک کرکے اور دریاؤں کی موجوں سے کھیلتے ہوئے قلعے بناسکتے تھے۔ نگرکوٹ کا قلعہ بھی اس زمانے میں بڑا مشہور تھا، پہاڑ کی چٹانوں سے دریا کے کنارے بنایا گیا تھا۔ بدر چاچ اس کی مضبوطی اور صلابت کو دیکھ کر دنگ ہو گیا تھا، چنانچہ کہتا ہے

زہے حصار کہ بلی زعلو در او ست محیط نہ رابعش ہفت قلعہ مینا
چہ قلعہ ایست کہ فرشی بود ز فرق اُو فضائے عرصہ بام رواق اُو ادنا
چہ بام چشم بلند ست ہمچو مردم چشم ازاں سواد دے میانہ دنیا
نہاد او ز صفا بود واں صلابت داشت کہ مردرانہ سکندر گرفت نے دارا
بروں او ہمہ دیوان چنیں اندر اند درون او ہمہ حوران آفتاب لقا

سلطان محمد بن تغلق نے ۷۴۴ھ / ۱۳۴۳ء میں تغلق آباد میں ایک محل بنوایا تھا جو ہزار ستون کہلاتا تھا۔ یہ محل اس ہزار ستون نامی محل کے علاوہ ہے جس کو سلطان ناصر الدین محمود نے رائے پتھورا کے قلعہ میں بنوانا شروع کیا تھا اور غیاث الدین بلبن نے اس کو پورا کیا تھا۔ محمد تغلق نے ایک جدید محل بنوایا تھا۔ اس کا ایک تو وہ قلعہ تھا جو دارا سرا کہلاتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا قلعہ ۷۴۴ھ میں ظہیر الدین معمار کے اہتمام میں تعمیر ہوا تھا۔ جو خرم آباد، محمد آباد اور عادل آباد تینوں نام سے موسوم تھا۔ اب یہ قلعہ بالکل ویران ہے اور اس کے بعض آثار تغلق آباد میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ تعمیر ہوا تھا، تو اس کی شان و شوکت سے متاثر ہوکر بدر چاچ نے کہا تھا

سواد قلعہ دہلی اگرچہ در دنیا ست ہزار بار فزوں تر ز جنۃ الماوا ست
چہ قلعہ ایست کہ قوسی ز حلقہ دارد محیط نہ رابعش ہفت طارم اعلیٰ است
بہ پیش قلعہ ایوان بارگاہش قاف نمود کمتر ازاں نقطہ کہ بر سر خا ست
چناں ہوائے درش در علو غلو دارد کہ قصر قیصر ازخشت آستان سرا ست
چہ قلعہ ایست جلالت کہ بارہ اندی محیط کشش جہت و ہشت و نہ رفیع اعلیٰ ست

فیروز شاہی عہد (۱۳۵۱ - ۱۳۸۸ء) کا ایک مشہور شاعر مطہر کڑہ تھا۔ وہ فیروز شاہ کے دربار سے بھی وابستہ رہا۔ وہ اپنے زمانہ کی دہلی اور اس کی عمارتوں کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔

می گشتیم در اطراف و عمارت ہر سوی تا ببینیم تماشای بنای احجار
راستی چونک بدیدیم ہمہ ساحت صحن قاں سر گنبد واں چشمہ روشن بکنار
قبہ قصر چو ماہی و کواکب برگرد صو فیاں حرم و سایہ خلوۃ دوار
گفت انیست ہنوز اول بیت المعمور باش تا جنت فردوس ببینی و انہار

پرانی دہلی میں جو جامع مسجد تھی اس کی تعریف میں کہتا ہے کہ ایسی مسجد دنیا میں کہیں اور نہ ہوگی۔ حوریں بھی دیکھ کر اس پر عاشق ہو جائیں۔ اس کی محرابیں قوس قزح ہیں۔ اس کے قبے ابر بہار ہیں وغیرہ۔

مسجدے دیدہ ز مسجد کہ جہانی در وے آسمانی ز گہر کردہ زمینی ز نظار
چہ قرینہ بہشتی کہ اگر بیند حور بدل و دیدہ شود بر رخ او عاشق زار
طاق بر طاق بر آراستہ چوں قوس قزح قبہ بر قبہ برافراختہ چوں ابر بہار
خط ایوان وے و دائرہ طاقش را رشتہ جمع شدہ مسطر گردوں پرکار
بام و صحن فلک آسا و زمیں پیمائش آنچناں بردہ ترش از عدد و ہم افکار

فیروز شاہ کے ساتھ مطہر ٹھٹھہ (سندھ) بھی گیا۔ اس شہر کو دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ شہر نہیں ہے ایک آراستہ و پیراستہ بہشت ہے۔ جہاں حوریں ہیں سلسبیل ہے ہزاروں نہریں ہیں اس کا پانی گلاب کی طرح ہے۔ زمیں سیم ناب (خالص چاندی) کی طرح ہے۔

نے نے کہ شہر نیست بہشتی ست دلپذیر آراستہ بسندس واستبرق و حریر

حوراں درو کواعب اتراب بے نظیر   سلسال و سلسبیل درو چشمہ و غدیر
و ز شربت و شراب غیرش درآب گیر   جاری ہزار چشمہ ز انگبین و شیر

آبش ہمہ گلاب و گلابش ہمہ عبیر
خشتش ز زر سرخ و زمینش ز سیم ناب

اس کے ساتھ ہی اس کے حصار وغیرہ کی مدح ہے۔ فیروز شاہ نے جب فیروز آباد آباد کیا تو مطہر نے اس کی بھی دل کھول کر ایک طویل ترکیب بند میں مدح کی۔ اس کو بھی ایک جنت قرار دیا ہے۔ جہاں کی عمارتوں کی ہر طرف 'نزہت صحرا' و 'تماشای سواد' تھا۔ اس کے قصر کے سامنے دنیا کی اور عمارتیں ہیچ نظر آتی تھیں۔ اس محل کا ہر منظر روح افزا تھا۔ ہر منزل خلد تھی۔ ہر طرف صفائی تھی۔ یہاں کا پانی آب حیات تھا۔ یہاں کی ہوا جاں فزا تھی۔ اس کے نسیم میں مشک کی خوشبو تھی، وغیرہ وغیرہ۔

حبذا شہر گزین حضرت فیروز آباد   کہ در دو جوی خلد است و بناہا بعلاد
ہر طرف طرفہ عمارات ارم ذات عماد   ہر سوئے نزہت صحرائے و تماشای سواد
لشکر آسودہ رعیت خوش و بازاری شاد   اینک آں شہر گر انصاف سخن خواہی داد
آفریں باد بریں شہر و بدیں شاہ جواد   کاچنیں شہر جہانگیر ازو شد بنیاد
کو بکو در ہمہ آفاق کسے دارد یاد
ایں چنیں جنتی آراستہ بر آب رواں

ایں عمارت کہ شہنشاہ جہاں فرمود است   وایں بناہا کہ سرش بر سر گردوں سود است
کس ندیدست در آفاق و کسے نشنود است   نہ ازیں پیش بود آں طرح نہ وقتی بود است
یارب ایں قصر چہ قصر است کہ دل بربود است   ویں چہ جاییست کہ راحت جاں افزود است
قصر گر نیست عمارات جہاں بیہود است   وآں کہ گر ہست جز ایں بلوہ ہمہ بیہود است
چرخ بر منظر او نقطۂ نیل اندود است۔
تا بگردش نرسد چشمۂ زخم از دوراں

ہر یکے منظر ساز روح فزائے دگر است   ہر یکے منزلے از خلد نمای دگر است
زیر ہر صفہ و ہر سقف سرائے دگر است   پیش ہر ساحت و ہر صحن فضای دگر است
ہر طرف نسحی و ہر سوی صفائی دگر است   ہر جہت وجدی و ہر کوی ہوای دگر است
بر سر ہر شرفی ساختہ جائی دگر است   ہر یکے جای نظری و بہائی دگر است
آں نہ قصر است کہ در عہد سمای دگر است
واں نہ شہر است کہ در دہر بہشتی است عیاں

ہمچنیں شہر کہ در ہمہ آفاق کجاست   وچنیں قصر ز شاہان جہانگیر کجاست
کاب او آب حیات و ہوا جاں افزاست   آں نم چشمۂ خضر آں دم عیسیٰ ہواست
باد مشکینش نسیمی ز نفسہای صباست   آب شیرینش گلابی اگر دارو شفاست
ایں ہمہ از اثر رحمت و الطاف خداست
کاچنیں جامی تواں دید در اطراف جہاں

اسی ترکیب بند میں یہاں کی جامع مسجد کی بھی تعریف ہے۔

آگے چل کر ہندوستان کے فارسی شعراء میں فیضی (المتوفی ۱۵۹۵ء) کو ہندوستان کی ہر چیز سے عشق رہا۔ جس کا ثبوت اس نے لیلاوتی جیسی خشک کتاب کا فارسی میں ترجمہ کر کے دیا۔ پھر یوگ وشسٹ، بھگوت گیتا اور اپنشد میں ہندوؤں کے جو فلسفیانہ خیالات ہیں ان کو ایک رسالہ شارق المعرفت میں منتقل کیا۔ اسی طرح سومدیو کی کہانیوں کے مجموعہ کتھا سرت ساگر کو فارسی والوں میں فارسی زبان کے ذریعہ سے روشناس کیا اور آخر میں اپنی معرکۃ الآرا مثنوی نل دمن لکھی جس کے متعلق فیضی کے سب سے بڑے نکتہ چین ملا عبدالقادر بدایونی کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ اس قسم کی کتاب تین سو سال کے اندر نہیں لکھی گئی۔ خود فیضی کو یہ مثنوی لکھتے وقت ایک خاص لذت محسوس ہوتی۔ کہتا ہے کہ اس پرانے قصہ کو لکھ کر وہ بزم عشاق میں ناز و نیاز کے سینکڑوں تحفے پیش کر رہا ہے جس کو پڑھ کر لوگ محسوس کریں گے کہ اس سرزمین (ہندوستان) میں عشق و عاشقی کے سرمست عشق کی راہ میں دل و جگر برباد کر کے کس طرح آتش عشق کے خاکستر بن کر رہ گئے ہیں۔

نو ساز فسانۂ کہن را   عشق نل و خوبی دمن را
از ناز و نیاز ایں دو مشتاق   صد تحفہ برم ببزم عشاق
در ہند ببیں کہ عشق چوں بود   دلہا بچہ گونہ غرق خوں بود
زیں خاک چگونہ عشق بازاں   رفتند دل و جگر گدازاں
آتش زدہ خود بخود گشتند   خاکستر دیر عشق گشتند

پھر کہتا ہے کہ وہ بت و برہمن کی شرح بیان کر کے ایک نیا آتش کدہ تیار کر رہا ہے، ایک نیا دیر بنا رہا ہے۔ زمانہ کی گردن میں زنار ڈال رہا ہے۔ ایک ساز سے فلک کے ناقوس کو ہم آواز کر رہا ہے۔

آتش کدۂ ز فکرتم طرح — عشق بت و برہمن دہم شرح
دیری کشم دلیں خرابہ — کیں نامہ شود بروکتابہ
زیں خط فکنم برہمنادہ — زنار بگردن زہادہ
ہر زمزمہ کہ بر زنم بریں ساز — ناقوس فلک کنم بر آواز

آگے چل کر کہتا ہے کہ ہندوستان میں جیسا جذبۂ عشق ہوتا ہے، کہیں اور نہیں ہوتا۔ اس کی خاک کا ذرّہ ذرّہ آفتاب ہے، اور ہر ذرہ نہ سپہر کا چراغ ہے، یہاں کے عشق کی زیادہ گرمی ہی کی وجہ سے یہاں کے آفتاب میں گرمی زیادہ ہوتی ہے۔

ہند است ہزار عالم عشق — ہندست وجہان جہان غم عشق
بے نقش وفا خط جبیں نیست — بے رنگ جگر گل زمیں نیست
خاکش ہمہ ذرہ ذرہ مہرست — ہر ذرّہ چراغ نہ سپہرست
ایں شعلۂ ہند گرم خیز ست — زنجاست کہ آفتاب تیز ست
عشق عرب و عجم شنیدم — از ہند بجز غم آنچہ دیدم

فیضی اکبر کے ساتھ اس کے چونتیسویں سال جلوس ۹۹۷ھ / ۱۵۸۹ء میں کشمیر گیا تو اس کی رعنائی اور دل آویزی دیکھ کر مست ہو گیا، اور ایک طویل قصیدہ لکھا جس میں وہ لکھتا ہے کہ اس کی ہوا میں ایک نقاش کی خیال آرائی کا تنوع ہے۔ اس کی سرزمین میں صفحۂ تصویر کی رنگا رنگی ہے۔ اس کی فطری بوقلمونی اور نقاشی کارخانۂ قدرت کے عجائب میں سے ہیں۔ اس کا غبار آنکھوں کی دوا ہے اور اس کی گھاس روح کے لئے اکسیر ہے۔ اس کا پانی بدن کے لئے ایسا ہے جیسے گلاب اور اس کی شراب ہو، اس کی ہوا روح کے لئے ایسی ہی ہے جیسے دودھ کے لئے شکر ہو۔ اس کی نسیم سحری کے سامنے دم عیسیٰ بھی مسموم ہے اس کے آب رواں کے نزدیک زلال خضر بھی تالاب کا محض جا پانی ہے اس کے پانی کی آواز میں ارغنوں کی صدا سنائی دیتی ہے۔ اس کی صندلی زمین کافوری برف سے نم رہتی ہے اور اس میں گلاب و عبیر کی بھی آمیزش ہے۔ یہاں گھاس کے بجائے زعفران ہوتا ہے کہ اس کی مٹی میں یہی تاثیر ہے۔ قدرت کی فیاضی سے یہاں ہزاروں چشمے ابلتے رہتے ہیں اور ہر جگہ قدرتِ ازلی کی صناعی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ انگور کی یہاں بڑی کثرت ہے۔ سیب کی خوشبو سے روح تازہ ہو جاتی ہے اور ناشپاتی کی خوشبو سے فرحت ہوتی ہے، انجیر بھی بہت اچھی ہوتی یہاں کے میووں اور پھولوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مشک بھرے ہرنوں کے جلوے بھی یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس قصیدے کے کچھ اشعار بھی ملاحظہ ہوں

ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر — کہ بار عیش کشاید بہ عرصۂ کشمیر
تبارک اللہ ازاں عرصہ کہ دیدن آں — ورق نگار خیال است و نقش بند ضمیر
ہوا لطافتش از تنوع چو فکرت نقاش — زمیں ز دلکشی چو صفحۂ تصویر
غبار او بتواں خواند چشم را دارو — گیاہ او بتواں گفت روح را اکسیر
بتن موافقت آب او چو بادہ و گل — بجاں مناسبت باد او چو شکر و شیر
بہ پیش فیض نسیمش دم مسیح سموم — بہ نزد آب روانش زلال خضر غدیر
گرد بمیکدۂ عشق خانقاہ ورع — بدل بہ نوحستانہ سبحۂ تذکیر
خرد کوس ز جوش و خروش سے ایا — صدائے آب ز آوازۂ ارغنوں تعبیر
ز جوش می پرد الاکبرایں چہ صداست — خراش نعرۂ تہلیل و غلغل تکبیر
فصول او تشابہ ز اعتدال ہوا — بہم یکے دی و اردی بہشت و ہم حاتیر
زمیں صندلیش نم ز برف کافوری — بیاد مادہ ز آمیزش گلاب و عبیر
نسیم او ز سر آب تیز می گزرد — کہ باد را نتواں داشت پاسکے و زنجیر
ز سر جہاں شود ار یک نسیم صبح دمش — کند قسمت بر جزو جزو عالم پیر
درو بجائے گیا زعفراں ہمی روید — کہ آب و خاک طرب را چنیں بود تاثیر
بہر طرف روی ز بحر فیض مالا مال — ہزار چشمۂ جوشندہ چوں دل تحریر
ز اعتدال ہوائش شگفت نیست شگفت — کہ سر زند ز ثمر عناب از نہال زریر
بیر تم کہ چو آثار قدرت ازلی ست — بہر نظارہ بتازد نظر بصنع قدیر
درین دیار منحی ترانہ ساز مکن — بس ست از لب مرغان نغمہ سنج صفیر
شراب خوردہ حریفاں بجائے آب ودل — کہ تشنگان ہوس را ہمی برد تقدیر
خراب از ایں ہمہ نقش شوم کہ ہست چو مشق — بہ عقل و رنگ و تاز و لیموند دگر
بعینہ زر محلول آید نظر — اگر از زنگی قطرۂ بچشمۂ و قبیر
اگر دماغ لطافت شود گلاب طلب — کند از آلت ایں بادہ برگ گل تقطیر
خزینہ کردہ عنب در حیس سیاہ سپاہ — کش از میاں فواکہ گرفتہ اند امیر
نسیم سیب و بدمزدہ را ترطیب — نسیم بھکعر لطیف ذوق و تحلیلسر
پسند نیست مگر پیکرش چو سن زنخ — [illegible]

بجز معترفم در شمار میوہ و گل کہ ہست بر ورق معنی لباس حرف قصیر
بجلوہائے فریب آہوان مشکینش کشیدہ شیر دلان را بدام عشق اسیر
ز بسکہ مست کند نکہت ریاحینش کنند مستی حالی بگردن نخچیر

اکبری عہد کے شاعر عرفی (المتوفی ۱۵۹۰ء) نے دل کھول کر کشمیر کی تعریف کی کہ کشمیر آکر سوختہ جان بھی تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ اس کی ہوا میں کچھ ایسی لطافت ہے کہ چاشت کی ہوا بھی نسیم سحری معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کشمیر کے دروازہ پر آگئی ہے۔ کشمیر کی رعنائی سے زال فلک میں بھی عشوہ گری آگئی ہے۔ یہاں کے سبزے، چشمے، لالہ، گل کی شرح کرنا آسان نہیں۔ یہاں لالہ کی پیداوار اتنی ہے کہ پتھر اور تیشے کے منہ سے بھی لالے ہی نکلتے ہیں۔ کشمیر میں اتنی طراوت اور رطوبت ہے کہ گرد و غبار بھی شبنم بن جاتی ہے۔ کشمیر کی رنگارنگی طاؤس ایسی ہے اور جمال دلہن کی طرح ہے۔ کشمیر ایک بہشت ہے۔

ہر سوختہ جانے کہ بکشمیر در آید گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید
بنگر کہ ز فیضش چہ شود گوہر یکتا جانے کہ خزف گردد و آنجا کہ گہر آید
و انگہ بچنیں فصل کہ در سلطنت گل زا از لطف ہوا چاشت نسیم سحر آید
از بلبل خاموش دل باغ گرفت است او را چہ گنہ محمل گل دیر تر آید
گل ہم چہ کند باد صبا خواست کہ فرقش آید سوئے کشمیر و گلشن ہر افتد آید
نشگفتہ گل اما بشل برگ شاخے گر پائے نہم خون گلم تا کمر آید
فردوس بدروازہ کشمیر رسیدست کو مدعی گر نگریزہ است در آید
زیبائی کشمیر گرش باعث عشوہ است من می خرم از زال فلک عشوہ گر آید
ایں سبزہ و ایں چشمہ مایل لالہ و ایں گل آں شرح ندارد کہ بگفتار در آید
آں چشمہ کہ خواں چو رود تشنہ لبوش کوثر بسرش تیز ترو تشنہ تر آید
آں لالہ کہ ہنگام تراشیدن خارا از رخنۂ سنگ و دہن تیشہ بر آید
کشمیر بہشتی است فریبندہ کہ شبلی آید چو در و صومعہ بر وے سقر آید
طاؤس مثالی کہ برافشاندہ پر و بال ہر لحظہ برنگ دگر اندر نظر آید
زیبندہ عروسی کہ بہ سبز و دو جمالش ہر دم بنظر خوشتر و شاداب تر آید

شاہ جہاں کے دربار کے ملک الشعراء حاجی جان محمد قدسی نے بھی کشمیر کی رعنائی سے متاثر ہو کر اشعار کہے جن میں وہ کشمیر جنت نظیر کے سبزہ زاروں اور پھولوں کی تعریف کے ساتھ وہاں کی آب و ہوا کی مدح سرائی اس طرح کرتا ہے

خوشا کشمیر و خاک پاک کشمیر کہ سر بر زد بہشت از خاک کشمیر
سوادش سرمۂ چشم بہار است بہشت و جوی شیرش آب لا راست
ز جوش سبزہ در کوہ و بیاباں زمین کشتہ و ناکشتہ یکساں
جز آں گلہا کہ مشہور جہانست گل ایں جا بوستاں در بوستانست
کند در بلبل عمر جاودانی ہوا لیش کا آب زندگانی
بزیر سبزہ و در کوہ و صحرا چو از عقد زمرد رشتہ پیدا
بود مایل بسبزی خاک پاکش گر آب زمرد خوردہ خاکش
ز فیض ابر می روید دریں کاخ ز تار شرع گل پیش از رگ شاخ
کند گل بر سر دیوار ریشہ شود فولاد سبز از آب تیشہ
نگاری بر ورق گر صورت خار ز تاثیر ہوا گل آورد بار
گر افتد از کف ساقی پیالہ دواند ریشہ در گل ہمچو لالہ
ببینا گر کند فیض ہوا کار ببالد چوں کدوی تازہ بر تار

شاہ جہاں کے درباری مورخ عبدالحمید لاہوری (المتوفی ۱۰۶۵ھ) نے اپنی تاریخ بادشاہ نامہ میں کشمیر کی دل آویزیوں کا ذکر بہت ہی انشاپردازانہ انداز میں کیا ہے۔ وہ سری نگر کے ڈل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہاں درختوں، پھولوں اور سبزہ زاروں کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرش زمردیں اور ایک بساط رنگیں بچھی ہوئی ہے۔ ان کا عکس پانی میں پڑتا ہے تو ظاہر ہوتا ہے کہ

بہشتی از تہ دریا نمودار چناں کز دیدۂ تر عکس دلدار
چمنہا درمیان آب پیدا چو روی نوخطاں از دیدۂ ما
بہشت است آنکہ تا کشمیر را دید سر از شرمش بزیر آب دزدید

شاہجہانی عہد کا مشہور منصب دار ظفر خاں احسن کشمیر کا حاکم مقرر ہوا تو وہ خود بھی ایک شاعر تھا۔ اس لئے اس نے کشمیر پر ایک مثنوی لکھی جس میں یہاں کے تنبولی، بقال، عطار و رنگا سنے والوں کے علاوہ پھولوں، مولسری، کیوڑہ، کچنار، بیل، جوہی، کنول، پھلوں میں کٹھل، کمرک، فالسہ، بیر، آم، کیلا اور پان، پرندوں میں طوطے، مینا، کوئل اور پپیہے کی تعریف کرتا ہوا لکھتا ہے

زتنبولی و از نقالِ عطّار — بسر گرم است در ہر کوچہ بازار
نسے شکل کہ خیزد دیگر آہنگ — زرشک بانسلی دارد دل تنگ
کمانچہ ہم از یں حلقہ بجستہ — زتیر طعن سارنگی سخت خستہ
پکاور گشت تا با دھلی ساز — بتاں را گرم شد ہنگامۂ ناز
نہال بوسری آں زیب گلشن — کز و گل می کناں بر دن بخسرمن
دگلہا کیورہ گردید ممتاز — در د پپیہ بہ چوں نغمہ درساز
شگفتہ آنچناں گل ہائے کچنار — کہ گوئی آتش افتادہ بگلزار
زکہتل دیدہ تا رنگ اصالت — بود در رنگریزی از خجالت
زجوش بیل وازجوہی و جاہی — نگہ را می شود کشتی تباہی
زطوطی وز مینا و ز کوئل — زہر یک آنکہ آہنگس برد دل
زلمک بزم مستاں گشت روشن — زشمع او گلستاں گشت روشن
بود از پالسہ وز بیر و جامن — بہ گلشن باغباں را چشم روشن
زکیلہ چوں بہ تقریبی سرود دم — بود بر روح افیونی ... دم
زوصف پان کنم رنگیں سخن را — کہ نامش می کند رنگیں دہن را
گرفتہ یک قلم اقلیم دل را — جہانگیری مسلّم شد کنول را

شاہجہانی دور کے شعراء میں مرزا محمد طاہر آشنا ظفر خاں حاکم کشمیر کا بیٹا تھا۔ شاہ جہاں نے اس کو اپنا ندیم خاص بنا رکھا تھا، وہ شاہی کتب خانہ کا داروغہ مقرر ہوا۔ اس نے اپنی عمر کا آخر حصّہ کشمیر میں گزارا۔ جہاں کی رعنائیوں سے محظوظ ہو کر ایک مثنوی بھی لکھی۔

شاہ جہاں کے دربار کا ایک شاعر میر صیدی طہرانی بھی تھا۔ جو اپنی شاعری کی نازک خیالی اور بلندیٔ فکر کے لئے مشہور تھا۔ اس نے بھی کشمیر پر ایک مثنوی لکھی۔ دارا شکوہ کے مرشد ملّا شاہ شاعر بھی تھے۔ پہلے لاہور میں سکونت پذیر تھے۔ آخر میں کشمیر میں رہنے لگے۔ انھوں نے فارسی میں کئی مثنویاں لکھی ہیں جن میں ایک رسالہ تعریفات خانہا و باغہا و منازل کشمیر ہے۔ اس میں اپنی قیام گاہ کے علاوہ کشمیر کے پھلوں، پھولوں، باغوں کے ساتھ ونتی پور، بجبہارہ، اینچ، باول اودری ناگ، کوثر ناگ، ادھراور دیولاخ وغیرہ جیسی دل پذیر جگہوں کی بھی تعریف کی ہے، پھر اپنی ایک دوسری مثنوی رسالہ نسبیت میں ہندوستانی پھولوں میں گل سپند، گل گلاب، گل انگور، گل رعنا، گل زیبا، نسرین، یاسمن، نرگس، بنفشہ، نسترن، گل تاج خروس، گل جعفری، گل عباسی، گل زعفران، گل داؤدی، گل نیلوفر اور گل دیوداج وغیرہ کی تعریف کی ہے۔

کشمیر نے ہندوستان سے باہر کے فارسی شعراء کو بھی اپنی طرف مایل کیا ہے۔ حافظ شیرازی کو سیہ چشمانِ کشمیری کی یاد برابر آتی رہی۔ اس لئے کہتے ہیں

بشعر حافظ شیراز می گویند و می رقصند
سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی

جامی نے بھی کشمیر کو رشک فردوس بریں کہا ہے

یکے گفتا کہ در اقصائے کشمیر — زشیرینی نباشد ہیچ تقصیر
مقام خوبرویاں آں زمیں است — بخوبی رشک فردوس بریں است

ہندوستان کے مختلف مقامات نے ان فارسی شعراء کو لبھایا اور جن شعراء کو جن خطّوں سے محبت پیدا ہوئی۔ ان سے اپنی شاعری میں والہانہ لگاؤ کا اظہار کرتے رہے۔ مثلاً شاہ جہان کے دربار کے ملک الشعراء ابوطالب کلیم (المتوفی ۱۶۵۱ء) کو اکبرآباد (آگرہ) بہت پسند تھا۔ اس لئے اس کی تعریف میں ایک پورا قصیدہ لکھا ہے جس کی ابتداء اس طرح کرتا ہے

خوشا ہندوستاں ما وائے عشرت — سوادِ اعظم اقلیم راحت
زخاک پاک او برداشتن کام — چناں آساں کہ برداردکسے کام
متاع خاطر جمع و دل شاد — بے ارزاں بود در اکبرآباد
سوادش مشق کردہ تختۂ خاک — وزاں تختہ سبق خوانست افلاک
ہزاراں معمورہ ہر کوچہ اش گم — چو نیلش رود ہائے پر تلاطم

اس کے بعد اکبرآباد کے محلوں اور عمارتوں کا ذکر کرتا ہے۔ حسن میں اس کے یہاں کے طاق سنگ خارا پر ایسی تزئین کاری کی گئی تھی کہ ان میں نقش شیریں اور صورت فرہاد نظر آتی تھی۔

بنا ہا سر بسر زسنگ خارا — زہر سنگے ہنرہا آشکارا
زنقش تیشہا بر صفحۂ سنگ — سراسر کوہیا پر نقش ارژنگ
زصورت بس کہ دارد سنگ تزئین — نماید بے ستون و نقش شیریں
نہ پائے بر بنائے اکبرآباد — بہ یک پا ایستادہ شرح فرہاد

وہ اکبر آباد کے بازاروں کی تصویر کھینچتا ہے تو وہاں کے خوبان گل اندام کا ذکر مزے مزے سے کرتا ہے۔ وہاں کے بزاز کی دلبری، صراف کی عشوہ گری، تنبولن کی دلکشی اور دھوبی کے حسن شستہ سے بہت لطف اندوز اور محظوظ ہوتا ہے۔

باز ارش ز خوبان گل اندام — شگفتہ گلبنی بینی بہر گام
تماشش دلبری بزاز دارد — کہ بردیبائے چینی ناز دارد
بت صراف با صد عشوہ و ناز — بہ نقد قلب ما کے بنگرد باز
بہ پیش روئے او از حسنش زر — نیاید مشتری از زر برابر
بہ این مغرور زر عاشق چہ سازد — باین برحق کر این حیلہ بازد
ز تنبولی دلے دارم ہمہ ریش — ز خم پیچیدہ ہمچو پرہ بر خویش
منہ بر وعدۂ تنبولیاں دل — کہ جز خون خوردن از وے نیست حاصل
ز حسن شستہ دھوبی چہ گوئیم — ازاں بے پردہ محبوبے چہ گوئیم

وہ اکبر آباد کے حسین باغوں کے رنگین پھولوں کا ذکر بھی پر کیف طریقہ پر کرتا ہے۔ مثلاً

چہ چنپہ شعلۂ شمع است بے دود — کہ آتش می زند در خرمن عود
ز موزونان نظر در یوزہ دارم — کہ وصف مولسری را بر نگارم
گل گڑہل نہ تنہا است موسم — شگفتہ چو رخ یار است دایم

کلیم کو ہندوستان سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ ایک بار اس کو اپنے عزیزوں کے ساتھ ایران جانا پڑا تو روتا دھوتا گیا اور ہندوستان کی یاد میں مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا جیسا کہ وہ خود کہتا ہے

اسیر ہندم و زیں رفتن بیجا پشیمانم
کجا خواہد رسانیدن پر فشانی مرغ بسمل را
بہ ایراں می رود نالاں کلیم از شوق ہمراہان
بپائے دیگراں ہمچو جرس طے کردہ منزل را
ز شوق ہند زاں ساں چشم حسرت بر قفا دارم
کہ رو ہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را

اکثر شعرا نے ہندوستان کو اپنا وطن نہیں بنایا لیکن یہاں آکر کچھ دن مقیم رہے تو ان کو بھی اس سرزمین کا رنگ اچھا لگا۔ مثلاً

ایرانی شاعروں میں علی قلی سلیم (المتوفی ۱۶۴۷ء) کہتا ہے کہ ایران میں تحصیل کمال کا سامان نہیں ہے۔ حنا ہندوستان ہی میں جاکر رنگین ہوتی ہے۔

نیست در ایران زمیں سامان تحصیل کمال
تا نیامد سوئے ہندوستان حنا رنگیں نشد

اسی طرح دانش مشہدی بھی کہتا ہے

راہ دور ہند با بستِ وطن دارد مرا
چوں حنا شب درمیان فرقِ ہندوستاں خوش است

میرزا صاحب کچھ دنوں ہندوستان میں رہا لیکن پھر ایران واپس چلا گیا اور آخر زندگی تک ایران سے باہر نہیں نکلا تاہم ہندوستان کی یاد اس کو برابر ستاتی رہی۔

ہمچو عزم سفر ہند کہ در ہر دل ہست
رقص سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

بعض شعراء کے کلام میں ہندوستان کے مختلف شہروں کی محبت پر بہت سے اشعار ملیں گے۔ مثلاً ملا محمد صوفی (المتوفی ۱۶۲۵ء) مازندران کے شہر آمل میں پیدا ہوئے۔ اکبر کے زمانے میں اپنے وطن ہندوستان آئے اور گجرات جاکر سورت میں متوطن ہوئے۔ گجرات اور سورت کی تعریف میں کہتے ہیں:۔

بہ گجرات آرزو با خود مبر دل — کہ آنجا دل ربا بیش از شمار است
مقر من ازاں شد شہر سورت — کہ دانستم کہ این دار القرار است
جمال این جا ندارد یاد قا جنگ — صباحت با ملاحت یزیار است

دارا شکوہ کے مرشد ملا شاہ کی مثنوی نسبت کا ذکر اوپر آیا ہے اس میں کشمیر، لاہور، ملتان، پٹن، سندھ، دہلی، اجمیر، اکبر آباد، احمد آباد، دکن اور بنگال کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ ہر جگہ کی خصوصیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ تلمیحات کی طرف ناظرین کا ذہن خود منتقل ہو جائے گا۔

دلم افتاد جانب کشمیر — ہفت و ہشتش بہشت عنبر وشیر
روم از شوق جانب لاہور — کہ در آنجا میانست معدن نور
وہ چہ ملتان نرفتہ زیر زمیں — آفتاب یقیں بہاؤ الدیں
چہ چنیں ما است زیر خاک نہاں — کہ غنیمت آفتاب آں

درزمیں سر است بر نہفتہ   از میان تا میاں گل اشگفتہ
شاہ را عطر گل جہاں گیر است   تازہ او از گل میاں بیراست
ملکہ در ہند روئے مہ دیدیم   آفتابی کہ بودہ رہ دیدیم
مطلع آفتاب سند بود   خانۂ آفتاب ہند بود
درزمیں دہلی ہائے پنہا نند   کہ نظامی و خسرو ش دانند
زمیاں تاکہ یافت ماہ یقیں   خفتہ آنجا بزار قطب الدین
دگرم باز میل اجمیر است   کہ بخوبی نظیر کشمیر است
وہ چہ اجمیر ہاست زیر زمیں   منزل آفتاب شیخ معین
اکبرآباد شہر نیک طراز   ہست اللہ اکبریں شیرا ز
احمدآباد ہا شدہ گلہا   شاہ عالم دراوست عالمہا
خفتہا دکنند و بنگالہ   ہمہ محبوب چاردہ سالہ

ابوالبرکات منیر لاہوری (المتوفی ۵ - ۱۰۴۴ھ) نے بنگال پر ایک مثنوی لکھی جس میں ہندوستانی پھولوں میں چنبیلی، رائے بیل، نسترن، سیوتی، رائے چنبہ، کیوڑہ، جوہی، جاہی چنبہ وغیرہ اور پھلوں میں کیلا، بربل اور کرک وغیرہ کی تعریف کی ہے۔

جعفر بیگ بنیش کشمیری شاہجہانی عہد کا شاعر تھا۔ اورنگ زیب کی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں وفات پائی۔ اس نے بہت سی مثنویاں لکھیں۔ اس کا وطن تو کشمیر تھا لیکن اپنی مثنوی بنیش البصار میں دہلی کی تعریف کرتا ہوا لکھتا ہے کہ دہلی کی ایسی رنگینی کسی شہر میں نہیں پائی جاتی ہے۔

دہر بود گلشن خوش رنگ و بو   شہر دہ از تازہ نہالان او
سرو درین باغ بود کوہسار   شبنم او بحر بود گل دیار
برگ سگے دشت زلستان او   زود بود طرح خیابان او
چہرہ یک قطعہ دریں بوستاں   نیست لب سبزۂ ہندوستاں
بود البسیار خوش ایں چمن   نیست بجز دہلی گل پیرہن
شہرہ بخوبی بہمہ شہرہاست   شہر برنگینی دہلی کجا است

پھر یہاں کے لوگوں کی سیرت، عقل، صداقت پسندی، حسن اور وفاکیشی کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے

اوست زارباب صفا سے بدل   ہیچ صرف مشت بجسر دلیل

دالش تو مش از بسکہ پسندیدہ اند   خوب تر از مردمک دیدہ اند
ہشت دو پراستہ بازارہا   راستی آموز خریدارہا
لالہ رخانش ہمہ خوش خط و خال   ہوش ربا چون شفق برشگال
نیست بہ گلزار خوشش آوارگی   شہر باین ہستگی و تازگی
بسکہ بود از بر ساتش اثر   بگذرد در دشت سبزہ چو کاکل زہر
مردو زنش بسکہ وفا پرورند   بہر غریباں پدر و مادر اند

پھر دریائے جمنا، حضرت شیخ نظام الدین اولیا اور امیر خسرو کی مدح سرائی ہے۔

بنیش کشمیری کی دوسری مثنوی "گلدستہ" میں پنجاب کی ستائش بڑی بلند آہنگی سے کی گئی ہے۔

پنجاب بود سواد اعظم   خالیست بطرف روئے عالم
پنجاب امیر ہر دیار است   رے بندۂ او چو شہریار است
پنجاب ولایتے است مشہور   ہر پرگنہ اش چو مصر مشہور
پنجاب بزرگ و دہر کوچک   او پیر است و زمانہ کودک
پنجاب بود رئیس عالم   وے است جہاں واد مقدم؟
پنجاب گر بہشت خوانش   چو خلد نکو سرشت خوانش
پنجاب سر است و تن بود ہند   جان پنجاب و بدن بود ہند
پنجاب چو سرزمین ماہست   خاک سیاہش مدستگاہست

اس کے بعد لاہور کا ذکر ہے۔ بنیش کی ایک تیسری مثنوی گنج رواں میں بنارس کی تعریف ہے جس میں وہاں کے عشق و محبت سے بھرے ہوئے مردوں، عورتوں اور خوب صورت برہمن زادوں کی خوبیوں کو بیان کرکے کہا گیا ہے کہ ہندوستان گلستان ہے تو بنارس سنبلستان ہے اور یہاں کعزو ایمان ہمراز بن گیا ہے۔

بنارس را عجب آب و ہوائیست   برائے عشق بازی طرفہ جائیست
زن و مرد از محبت گشتہ مفتوں   چو زلف لیلے و زنجیر مجنوں
کف خاکے کہ با آں سرزمیں است   چو پشت دست خوبان دلنشیں است
بتانش از نمک نیکو سرشتند   کہ موج سبزۂ باغ بہشتند
برہمن زادگان فتنہ آئین   چو گل وارند در بر جامہ پرچیں

ملارہتا اسی طرح ہے

بود بازاہا تیغ کشیدہ　　بود سبزہ چو جوہر آرمیدہ
ز دل خود مرا سر گل فروشند　　ہم چوں صدف گوہر بجوشند
ہمہ سبزاں چو جمع فیض تاثیر　　نمک پروردۂ حسن جہاں گیر
شدآں رونے کہ ہندوستان گلستاں　　ز سبزاں شد بنارس سنبلستاں
سیاہش از نمک چوں سبزہ سرشار　　سفیدش را بود شور نمک زار
درین کشور کہ از عشق فسوں ساز　　ہم کفر و مسلمانیست ہمراز

علی حزیں (المتوفی ۱۷۵۹ء) نے بنارس کی تعریف تو بہت ہی اچھوتے انداز میں کی۔ وہ کہتے ہیں:

از بنارس نروم معبد عام است ایں جا
ہر برہمن لپسرے لچھمن و رام است ایں جا

ایک دوسرے شعر میں بنارس کے برہمن زادوں کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

برہمن زادۂ زنار بندی بردہ ایمانم
کہ سودا ئی کند با کفر زلفش دین و دنیا را

اور پھر بنارس کے پری رخوں کا ذکر عجیب پر کیف طریقہ پر کیا ہے۔

پری رخان بنارس بہ صد کرشمہ و رنگ
پئے پرستش مہدیو چوں کنند آہنگ
بگنگ غسل کنند و بہ سنگ پا مالند
زہے شرافت سنگ و زہے لطافت گنگ

ہماری نئی مطبوعات

آج کل کی کہانیاں - اردو کے مشہور افسانہ نگاروں کی لکھی ہوئی کہانیوں کا مجموعہ۔ صفحات ۲۶۴۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت ۳ روپے پچاس پیسے۔

ندیا کنارے - علی عباس حسینی کا لکھا ہوا ناول - نئے بھارت کا نیا رومان - دل چسپ اور شگفتہ - صفحات ۲۱۶ - قیمت ایک روپیہ

دو شہروں کی کہانی - چارلس ڈکنس کی شہرہ آفاق تصنیف A TALE OF TWO CITIES کا نہایت سلیس اور رواں ترجمہ - خوبصورت گرد پوش - قیمت ۵ روپے

(ملنے کا پتہ)

بزنس منیجر۔ پبلیکیشنز ڈویژن، اولڈ سیکریٹریٹ دہلی ۶

عزیز تمنائی

ساحلِ مدراس کی رنگین شام

وقت کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام
سوئے زمیں رخِ فلک کا خرام
حسن و محبت کی گزرگاہِ عام

منظرِ نقاشیٔ ربِّ انام
ساحلِ مدراس کی رنگین شام

ایک طرف سہما ہوا آفتاب
سرمئی آغوش میں چہرہ گلاب
اور ادھر قلزم پُر اضطراب

سلسلہ در سلسلہ موجوں کا دام
ساحلِ مدراس کی رنگین شام

سینۂ گیتی پہ حسیں سلوٹیں
زیست بدلتی ہے جہاں کروٹیں
وقت کی آہستہ رواں آہٹیں

ریت ہے یا عکسِ نقوشِ خرام
ساحلِ مدراس کی رنگین شام

زلفِ معنبر سے معطّر ہوا
جلوۂ اصنام سے خودسر ہوا
لمسِ لبِ گل سے سخن در ہوا

لائی ہے لمحاتِ حسیں کا پیام
ساحلِ مدراس کی رنگین شام

شام نوردوں کا دیارِ طرب
رقصِ براندام و ترنّم بلب
ایسی جگہ اور لحاظِ ادب ؟

توسنِ اظہارِ جہاں بے زمام
ساحلِ مدراس کی رنگین شام

شوخ اداؤں کے رواں جمگھٹے
شعلہ صفت گرد سے آنچل اُٹھے
تاب کہاں ذوقِ نظارہ ہٹے

دیدۂ بینا کی ہے جائے قیام
ساحلِ مدراس کی رنگین شام

ہر کے سرگم میں ہے صدیوں کا ساز
ریت پہ تاریخ کے سائے دراز
اونچے قرنوں کے نشیب و فراز

[illegible] رواں سے معطّر شام
ساحلِ مدراس کی رنگین شام

تیز ہوا سست رواں کشتیاں
زیر و بمِ موجِ محیطِ زماں
گاہ ہے عیاں گاہ ہے نہاں پر نشاں

آیۂ فطرت کی ہے شرحِ مدام
ساحلِ مدراس کی رنگین شام

وہاب اشرفی

کافر بھی ہوئے، سجدہ بھی کیا

'کہاں ہو جی چھوٹی، بڑی ادھر آؤ، ہائے اللہ کیسا زمانہ آیا ہے، حد ہے بھلا —'

بڑی اماں گرتی پڑتی، ہلتی، ہانپتی دروازے سے آنگن میں آئیں اور اپنی دونوں بہوؤں کو پکارا۔

بڑی بھابی جلتے توے پر روٹی چھوڑ کر بڑی اماں کی طرف بھاگیں اور چھوٹی بھابی نے مشکل سے اپنی ہنسی روکی اور چھوٹے بھیا سے اپنا دوپٹہ چھڑاتے اور سنبھالتے بڑی اماں کے پاس آگئیں۔

'میں کہتی ہوں کہ اب قیامت نزدیک ہے۔ ان بوڑھی آنکھوں کو کیا کیا نہ دیکھنا پڑے گا، توبہ ہے — بڑی اماں کی سانسیں اب تک تیز چل رہی تھیں۔

'لیکن بات کیا ہے؟' — بڑی بھابی جلدی کچھ سن لینا چاہ رہی تھیں۔

'ہاں ہوا کیا؟' چھوٹی بھابی کو بھی عجلت تھی کہ چھوٹے بھیا ان کا انتظار کر رہے تھے۔

کیا پوچھتی ہو بہو۔ کہا نا قیامت کو اب دیر نہیں ہے۔ جو کچھ دیکھا یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا' بڑی اماں کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ معاملہ بڑا سنگین ہے۔

'اب کہئے بھی' — چھوٹی بھابی دق ہو کر بولیں — اور بڑی بھابی کے ذہن میں بہت سی باتیں آگئیں۔

کہ آج پھر کلوا کی بیوی تیل سے نہائے بالوں والے ستھری لونڈے سے آنکھیں لڑاتے ہوئے پکڑی گئی۔

کہ شاہ اللہ رکھے کی بیوی نے پھر اس کی داڑھی پکڑ لی اور میلی ٹوپی سے اس کی ڈھکی ہوئی چکنی چندیا پہ بے تحاشہ جوتیاں برسائیں۔

'میں جیسے ہی دروازے سے گلی میں گئی، دیکھا سوٹ بوٹ پہنے ادھر ہی آرہا ہے۔ ایک دم صاحب کی طرح۔ میں جو پردے کے لئے بھاگی تو وہ بول پڑا ہم ہیں دادی، ہم ہیں دادی، تب میں نے اسے کنکھیوں سے دیکھا۔ جانتی ہو وہ گنیشوا تھا، بڑی اماں نے تفصیل بتائی۔

'کون گنیشوا؟ پریگوا کا بیٹا؟' — بڑی بھابی نے انتہائی تعجب سے پوچھا۔

'گنیشوا پاسی اور ایک دم صاحب کی طرح' — چھوٹی بھابی کو بھی جھٹکا لگا۔

'ہاں ہاں لونڈا گنیشوا ہی تھا، تب ہی کہا قیامت اب آچلی۔ دونوں پاؤں میں انگریزی بوٹ جوتا، اس کے اندر اچھا اچھا تیا پانچا، ہاتھ میں سونے کی طرح ایک دم سے چمکتی ہوئی گھڑی — اپنے چھوٹے کی طرح کوٹ پہنے، بال جھاڑے آنکھ پھاڑے میرے سامنے کھڑا ہو گیا، اور بڑی اماں سانس لینے کو رکیں۔

'اب ہم شریف لوگوں کی زندگی تھوڑی ہے' — بڑی بھابی

مایوسی کے عالم میں بولیں۔

تب ہی تو بھیّا یہاں سے چلے گئے۔ اب امّاں کو خرچ نہیں بھیج پاتے تو کیا ہوا۔ کسی طرح زندگی کٹ جائے گی، پاؤں تو قبر میں لٹکا ہی چکی ہیں، چھوٹی بھابی کو آج موقع مل گیا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے نظریہ کے حق میں کچھ کہہ دیں۔ دراصل ان کے اکلوتے بھائی اپنی بیوی کے ساتھ پاکستان چلے گئے تھے اور وہاں جا کر اپنی بوڑھی ماں کو قطعی بھول گئے تھے۔

'اب تم اپنے بھائی کی بُرائی مت کرو، لیکن اتنی بات درست ہے کہ ہم شریفوں کی مٹّی یہاں بھاری ہے' بڑی امّاں نے چھوٹی بھابی کو خاموش کر دیا۔ اس لئے کہ ان کو اس بات کا بڑا رنج تھا کہ چھوٹے بھیّا اپنی ساس کے اخراجات کا بار اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور بڑی امّاں نے پھر کہا — " لونڈے نے قریب آ کر مجھے سلام کیا۔ میں نے پوچھا تو ہے موئے گنیشوا؟ تو وہ ہنسا اور اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

اتنا کہہ کے بڑی امّاں دروازے کی طرف لپکیں، انھیں ابھی پڑوس کو یہ خبر دینی باقی تھی۔ ویسے انھیں رہ رہ کے یہ خیال آ رہا تھا کہ اس وقت بڑے ابّا ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا، انھیں یہ سب کچھ بتایا جاتا، اس گاؤں میں اب شریفوں کی عزّت کہاں رہی جو پاسی اس انداز سے رہے۔

تھوڑی دیر میں بڑی امّاں گنیشوا کے بارے میں ساری باتیں محلّے کو سنا آئیں اور جب تھک گئیں تو جا کے نماز پہ بیٹھ گئیں۔

بڑے ابّا بڑی دیر سے آئے۔

'اجی سنتے ہو' دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور تم ہو کہ بیٹھے حقّہ گڑگڑا رہے ہو' بڑی امّاں کو حقّے سے ہمیشہ سے چڑ رہی تھی۔

'کھوگی بھی' دنیا کو کیا ہو گیا'۔ بڑے ابّا نے حقّہ کا ایک زوردار کش لیا اور دھواں فضا میں چھوڑ دیا۔

وہ جو پیرگوا کا لونڈا ہے نا۔ شہر سے آیا ہے۔ صاحب بہادر بن کے، اپنے چھوٹے کی طرح سوٹ بوٹ میں' بڑی امّاں نے آخر خبر دے دی۔

بڑے ابّا کو یہ بات بڑی بُری لگی کہ بڑی امّاں نے گنیشوا کو ان کے چھوٹے سے ملا دیا۔ ویسے یہ خبر ان کے لئے نئی نہیں تھی۔ انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ گنیشوا بڑی شان سے پورے سات برس بعد گاؤں واپس آیا ہے۔ انھیں یہ بھی پتہ تھا کہ اس نے ایم۔ اے تک پڑھ لیا ہے اور اب پٹنہ میں کسی دفتر میں ملازم ہے۔

'صاحب بن گیا تو کیا ہوا، ہے تو پاسی ہی' بڑے ابّا کو کچھ جواب دینا تھا سو انھوں نے دے دیا اور بڑی امّاں جیسے مطمئن ہو گئیں کہ چلو کچھ بھی ہو لیکن یہ کمبخت اپنی ذات تو نہیں بدل سکتے۔ لیکن اسی دوران بڑے ابّا کو کچھ پچھلی باتیں یاد آنے لگیں۔ ان کے منہ کا حقّہ منہ ہی میں رہا اور چلم ٹھنڈی ہو گئی — بدتمیزوں کے پر نکل آئے ہیں۔ آسی پاسی بھی پڑھنے لگے۔ کیسی آزادی ہے توبہ، نہ چھوٹے کی تمیز نہ بڑے کی — اور پہلے کا زمانہ! اسی گنیشوا کے دادا کو پائے سے باندھ کر مارا تھا، میں اس کے گھر کی طرف سے گزرا تھا تو وہ پلنگ سے اٹھا نہ تھا۔ لعنت ہے آج کی زندگی پر، کیسا زمانہ ہے یہ — اور زبو کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں۔ یہاں تحویل میں کچھ نہیں ہے۔ جانے زمینداری کا کمپنسیشن کب ملے۔ لڑکے والوں کی طرف سے جلدی بھی ہے، پھر زبو کا اکیسواں چڑھ رہا ہے — آٹھ دس ہزار روپئے تو خرچ ہوں گے ہی۔ بڑے ابّا سوچتے سوچتے ایک دم گھبرا گئے۔

اور جب انھیں آج معلوم ہوا کہ ان کی پُرانی حویلی کے سامنے گنیشوا ایک پختہ مکان بنانے کا ارادہ کر رہا ہے تو ان کا پارہ ایک دم سے چڑھ گیا اور زمینداری کے وقت کا جلال ایک بار پھر آ گیا۔ انھوں نے فوراً اپنے نوکر کو آواز دی اور پیرگوا کو بلا بھیجا۔

پیرگوا حاضر ہوا۔

'تیرا لڑکا شہر سے آ گیا ہے نا — ؟ بڑے ابّا پیرگوا

سے بولے۔

"ہاں سرکار۔" پرگیوا اب بھی ان سے ڈرتا تھا حالاں کہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

"تیرا کوئی پختہ مکان میری حویلی کے پاس بن رہا ہے؟" بڑے ابّا کی آواز رعب دار تھی۔

"ہم نہ جانیں سرکار، او تو چھٹکا.... چھٹکا۔" پرگیوا ہکلانے لگا۔

"ارے تیرے بیٹے نے ذرا سا پڑھ کیا لیا کہ اس کا دماغ آسمان پر چڑھ گیا۔ اچھا تو اسے ابھی یہاں بھیج۔" اور پرگیوا سر جھکائے گھر واپس چلا گیا۔

"آداب دادا!" اور گنیشوا کا یہ طرزِ تخاطب بڑے ابّا کو ذرا بھی نہیں بھایا۔ اب تک تو وہ پاسیوں سے سرکار ہی سنتے آئے تھے، پھر بھی وہ گنیشوا پر لیکا یک برس نہ سکے۔ گو کہ ان کا لہجہ ان کے اختیار میں نہ تھا۔ بولے — "تو شہر سے کب آیا؟"

"ایک مہینہ ہو گیا، بس دوسرے ویک میں چلا جاؤں گا۔"

اب کے دادا کو گنیشوا کا اندازِ گفتگو بالکل اپنے چھوٹے کی طرح معلوم ہوا۔

"سنا ہے میری حویلی کے سامنے اینٹ کا مکان بنا رہا ہے۔" بڑے ابّا نے جل بھن کر پھر ایک سوال کیا۔

"جی ہاں، ارادہ تو ہے، لیکن آپ کی حویلی تو —" گنیشوا نے بڑے اطمینان سے سب کچھ کہہ دینا چاہا لیکن بڑے ابّا برس پڑے۔

"ابے تیرے باپ دادا کبھی اینٹ کے مکان میں رہے تھے — پھر میری حویلی کے سامنے، یعنی۔ یعنی۔" بڑے ابّا کے ضبط کی قوت ختم ہو گئی۔

"وہ تو سب کچھ درست ہے پر آپ کی حویلی میرے مکان سے کافی دور رہے گی — اچھا میں پھر کبھی آؤں گا —" بڑے ابّا گنیشوا کی ایسی بے باک گفتگو سے پیچ و تاب کھا کر رہ گئے اور اسے راہِ راست پر لانے کی اسکیم سوچنے لگے کہ ڈاکیے نے لفافہ دیا۔

لفافہ چاک کر کے انھوں نے خط نکالا اور پڑھا، ایک بار اور پڑھا۔ پھر ان کا منہ ایک دم اتر گیا۔ زبیدہ کا جہاں رشتہ ہونے والا تھا خط وہیں سے آیا تھا۔ لڑکے والوں نے لکھا تھا کہ اگلے تین ماہ کے اندر شادی نہیں ہوئی تو پھر نسبت کو ختم سمجھنا چاہیئے۔

خط کا مضمون فوراً ہی بڑی امّاں کو معلوم ہو گیا۔ بڑی اماں نے بڑی بھابی کے کان میں کچھ کہا، بڑی بھابی چھوٹے بھیا سے کچھ بولیں، چھوٹے بھیا نے زبیدہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر جلدی سے گھر سے باہر نکل گئے۔

بڑے ابّا کو زمینداری کے کمپن سیشن سے چار پانچ ہزار روپے مل سکتے تھے۔ زبیدہ کی شادی ان ہی روپوں سے انجام پا سکتی تھی۔ بڑے بھیّا اسکول میں پڑھاتے تھے۔ انھیں جو رقم ماہانہ ملتی تھی خود ان کے اخراجات پورے نہیں کر پاتی تھی۔ چھوٹے بھیّا ریلوے میں ٹی۔ ٹی۔ ای ہو گئے تھے۔ ان کے سر پر ان کی ساس کے اخراجات بھی تھے اور ملازمت بھی نئی تھی۔

اور تب شام کے وقت ایک جگہ بڑے ابّا، بڑی امّاں، بڑے اور چھوٹے بھیّا بیٹھے۔ پہلے آہستہ آہستہ باتیں ہونے لگیں۔ پھر باتیں زور زور سے ہوئیں۔ بڑے بھیّا نے کسی قسم کی مدد سے اپنے آپ کو بالکل معذور ثابت کیا، چھوٹے بھیّا نے اصرار کیا کہ زبیدہ کی سسرال والوں کو لکھا جائے کہ وہ کم از کم دو سال اور انتظار کریں۔ بڑی امّاں کسی بات سے بھی مطمئن نہیں ہوئیں اور آخر یہ فیصلہ ہوا کہ بڑے ابّا کمپن سیشن کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں۔ بات یہ طے پائی کہ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو جب بڑے بھیّا کو تنخواہ ملے تو بڑے ابّا کچھ روپے لے کر پٹنہ چلے جائیں اور وہاں زمینداری کمپن سیشن کے افسر سے خود مل لیں۔

بڑے ابّا پٹنہ آ گئے۔

انھیں کمپن سیشن افسر سے ملاقات کرنے میں بڑی ہی مشکل پیش آئی۔ دفتر کے ایک کلرک نے دوسرے کلرک کی میز کی طرف اشارہ کیا

کاکو براہِ راست انھیں دیکھتے ہیں۔ اس طرح انھیں بہت سی مینٹل سے گزرنا پڑتا۔ آخر کار ایک کلرک نے تفصیل بتائی کہ ان کے کاغذات ابھی ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ اس طرح پیسے کی نکاسی میں ایک عرصہ لگ جائے گا۔

بڑے ابا پہلے تو ایک دم مایوس ہو گئے، لیکن پھر انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کمپنسیشن افسر سے براہِ راست مل لینے کے لئے چپڑاسی کے ذریعہ سلپ بھجوائی۔ انھیں چیمبر میں چلے جانے کی اجازت مل گئی۔

'کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟' بڑے ابا غیر ضروری اجازت چاہتے ہوئے کچھ گھبرا سے گئے۔

"یس - کم اِن -" اندر سے ایک آواز آئی۔

جیسے ہی وہ کمرے کے اندر داخل ہوئے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہاں گنیشوا بیٹھا تھا۔

"ت .. ت .... م .... آپ" بڑے ابا ہکلا گئے۔

"واہ، آپ نے کیسے تکلیف کی۔" گنیشوا فوراً کرسی سے اُٹھا اور بڑے ابا کو شانہ پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر گھنٹی بجائی اور چپراسی کو ناشتہ لانے کے لئے کہا۔

جب بڑے ابا نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تو پیشانی سے پسینے کے قطروں کو رومال سے جذب کرتے ہوئے پوچھا۔ "آپ یہاں کس طرح؟"

"جی میں یہاں کمپنسیشن افسر ہوں۔ آپ کا کوئی کام ہے کیا؟"

بڑے ابا نے تفصیل بتا دی۔

دوسرے ہی دن جب پانچ ہزار کا چیک گنیشوا نے دستخط کر کے بڑے ابا کے حوالے کیا تو ان کا سر ایک دم سے جھک گیا۔ انھوں نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بڑی عقیدت سے گنیشوا کو دیکھا اور بڑی مشکلوں سے اتنا کہا — "میں آپ کا ممنون ہوں گنیش بابو۔"

نسیم کی ڈولی رخصت ہو گئی تو بڑے ابا پریاگوا کے یہاں گئے، جو اپنے نئے مکان میں منتقل ہو چکا تھا۔

"نیا مکان مبارک ہو، پریاگ چودھری -- اور ہاں گنیش بابو کو خط لکھو تو میرا سلام ضرور لکھنا" بڑے ابا بولے۔

پریاگوا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ بے وقوفوں کی طرح بڑے ابا کا منہ تکنے لگا اور بڑے ابا فخر سے سینہ پھلائے اور سر اُٹھائے اپنی حویلی میں واپس آ گئے۔

قومی دفاعی فنڈ میں ۵۹ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے

۳۱ - اکتوبر ۱۹۶۴ء کو قومی دفاعی فنڈ کے نئی دہلی کے مرکزی کھاتے میں کل ۵۹ کروڑ ۱۰ لاکھ روپے جمع ہو چکے تھے۔ اس میں سے ۳۰ لاکھ روپے کی رقم برطانیہ سے اور ۲۳ لاکھ روپے کی رقم دیگر ملکوں سے بھیجی گئی۔

علاوہ ازیں قومی دفاعی فنڈ میں ۴۲ لاکھ ۷ گرام یعنی دو لاکھ ۵ ہزار ۲۳۰ تولہ سونا اور سونے کے زیورات کے عطیات بھی جمع کئے گئے ہیں۔

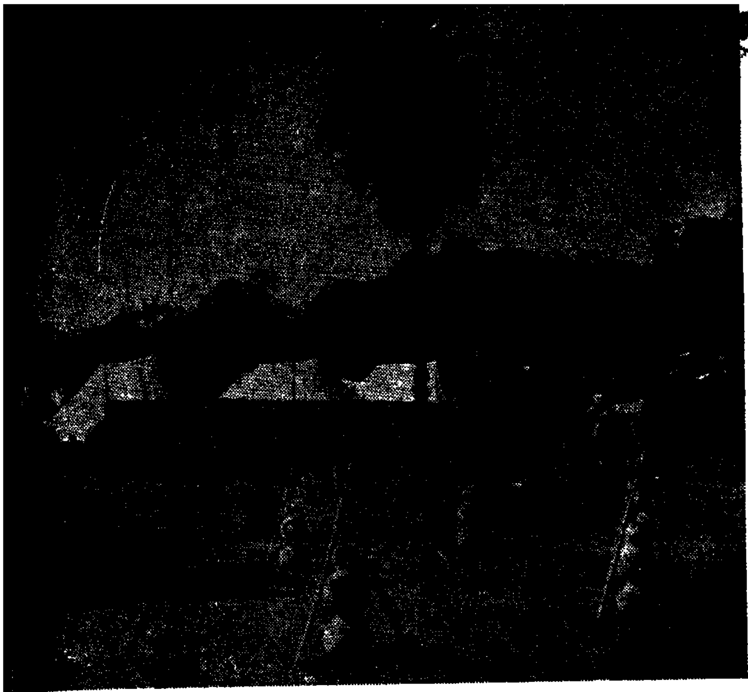


۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے مجاہد نانا صاحب

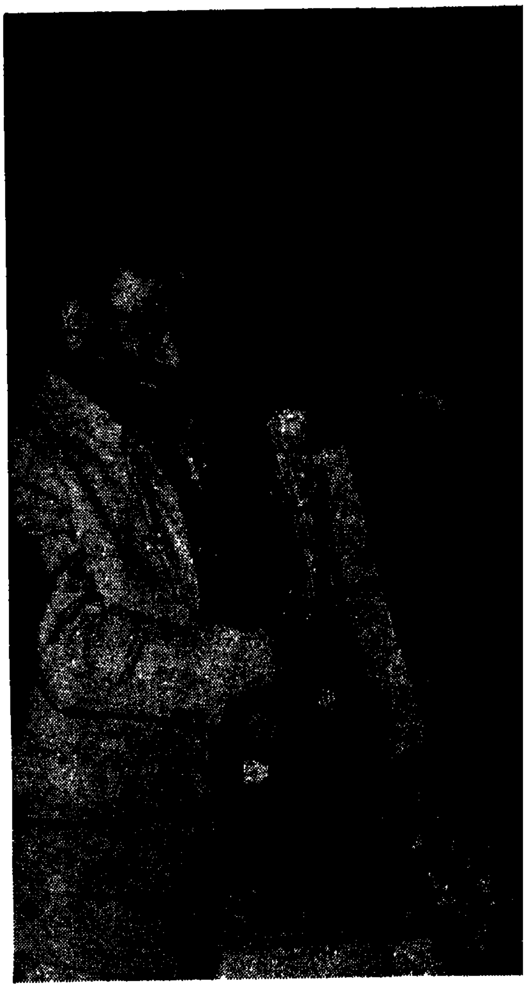
متعلقہ مضمون صفحہ ۳ پر ملاحظہ فرمائیے (تصویر بہ شکریہ بندی بھون کالپی)

نواں انٹر یونیورسٹی یوتھ فیسٹیول

منعقدہ نئی دہلی ۲۴ نومبر ۱۹۶۴ء تا ۲، نومبر ۱۹۶۴ء



یوتھ فیسٹیول کیمپ



نا یوتھ فیسٹیول میں بمبئی یونیورسٹی کی ٹیم کو اول قرار دیا گیا

شری ہمایوں کبیر ٹرافی دے رہے ہیں

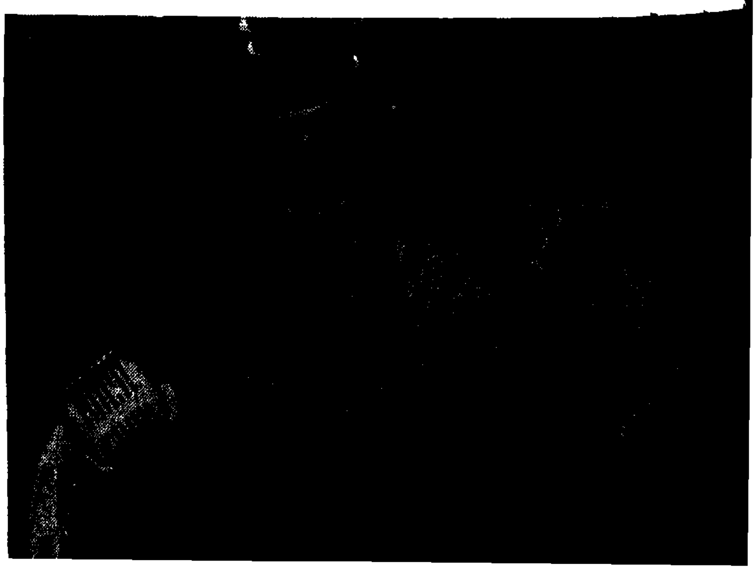
وزیر اعظم شری لال بہادر شاستری افتتاح کر رہے ہیں





بھنگڑا

سازندے



پگ گھنگھرو باندھ میرا ناچے رے



دیتے ہیں، چہرے کو بوندیں دلھن کے چہرے کی طرح 'چیت' دیتی ہیں، ساری کا ہر حصہ جسم سے چپک کر اس کے ہر نشیب و فراز کو، اس کی ہر گولائی اور عمودیت کو ظاہر کر دیتا ہے، تو وہ لائقِ صد تماشا بن جاتی ہے یا نہیں؟ میں معلّم و مدرّس، یہ بھول گیا کہ ان بوڑھوں، بچّوں اور عورتوں میں زیادہ تر وہ تھے جو اپنے چہیتوں کو لام پر بھیجنے، یا اسٹیشنوں اور ہوائی اڈّوں پر دیکھنے یا اسپتالوں میں ان کے کٹے پھٹے جسموں پر اپنے نرم یا کھردرے ہاتھوں کا مرہم رکھنے پٹنہ گئے تھے اور اب گھر کے دھندے انھیں واپس لیے جا رہے تھے۔ مجھ عرشے پر بیٹھنے والے کو ان کے دلوں کے زخم کی کیا فکر تھی؟ میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ ایک دوشیزہ پانی میں بھیگی ڈیک کے اس حصے پر کھڑی ہے جو عرشے سے دکھائی دیتا ہے اور اس کا جسم میلی ساری میں بھی اتنا حسین ہے کہ حسن کے بین الاقوامی مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

عرشے پر کینوس کی چھت کا سایہ تھا۔ یوں بھی گہرے بادلوں کے رُخِ روشن پر مشرقی دلھنوں جیسا لمبا گھونگھٹ کھینچ رکھا تھا۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ میری شیروانی کے دامن اور میرے بڑے مُہری کے پائجامے کی پھڑپھڑاہٹ سے رقص کے تال، سم پیدا ہوتے تھے۔ میں انسانی جسم کی غیر موزوں شکلوں پر اور پھر ان کے مجموعے کے حیرت انگیز حسن اور بے پناہ کشش کے اسباب پر غور کرنے لگا۔

میں نے سوچا حسن نہ کسی جسم میں ہے، نہ دیکھنے والے کی آنکھوں میں، بلکہ صرف تماشائی کے جذبے میں۔ میں جس منظری کیفیت و موسمی خوش گواری پر مسرور ہو رہا ہوں وہی ڈیک والوں کے لیے بھیانک اور تکلیف دہ ہے۔ یہ کیوں؟ اور مجھے دفعتہً جنگ یاد آ گئی۔ جلتے ہوئے شہر، بھڑکتی ہوئی لاشیں، بموں کا طغیان، منڈلاتے ہوئے گدھ۔ اور میں نے نصف زینہ اتر کر نیچے نظر ڈالی۔ پورے ڈیک پر سوائے دو تین فوجی بھرتی کرنے والے جوانوں کے کسی کے چہرے پر نہ بشاشت تھی نہ مسکراہٹ۔ ڈیک بھیگا ہوا تھا، مسافر بھیگے تھے، کچھ بوڑھے اکڑوں بیٹھے بیڑی کے کش لے رہے تھے۔ ہر ایک کے چہرے پر فکر، ملال اور دکھوں کی لکیریں پڑی ہوئی۔

کچھ بڑھیاں خاموش سر جھکائے بیٹھی تھیں، دو ایک ایک دوسری بڑھیا کے کھچڑی میل سے اٹے بالوں سے جوئیں پکڑ کر چٹاچٹ مار رہی تھیں۔ کچھ مائیں گود کے بچّوں کو گلے سے چمٹائے تھیں، یا ساڑی کے پلّو کی آڑ کیے انھیں دودھ پلا رہی تھیں، اور ایک جوان لڑکی بھیگی ہوئی منڈی میں کھڑی، عرشے کے زینے سے ٹیک لگائے، سردی سے ہانپ رہی تھی۔ میرے ہولڈال اور سوٹ کیس میں سوتی اور ریشمی کئی چادریں تھیں۔ بے ساختہ جی چاہا انھیں کھول کر اسے کوئی چادر اوڑھا دوں، مگر دیکھنے والے سگریٹوں پر لمبے لمبے کش لیتے ہوئے اسے للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے، بڑی بوڑھیاں اس پر شک و شبہ کی نظریں ڈال رہی تھیں، بوڑھوں نے گو اس کی طرف سے منھ پھیر لیا تھا، مگر اسے کنکھیوں سے دیکھے جاتے تھے۔ جوان مائیں اس کو ایک طرح کا خطرہ سمجھ رہی تھیں، میں دوسرے مذہب و ملّت کا آدمی، دوسرے طبقے کا انسان، عرشے کا مسافر اگر میں اس طرح کی نیکی بھی کروں تو لوگ اسے کیا سمجھیں گے؟ میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ یقینی اس طرح کے فعل کو "ڈورے ڈالنا" سمجھیں گے! اور گھر پر جو بیوی کو چادروں کا حساب دینا پڑے گا، تو اس وقت کیا کہوں گا؟ کیا ان کو میری نیک نیتی پر، انسانی ہمدردی پر یقین آئے گا؟ عقل نے راہِ پناہ سجھائی — "چند منٹ میں سون پور آ جائے گا بلکہ دیکھو اس کے نشانات ابھی سے دکھائی دے رہے ہیں، جذبات میں نہ بہو!" غرض میں اُلجھتا ہوا پھر عرشے پر چڑھ آیا۔ بے وجہ اپنے کو مشکوک و مشتبہ بننے کے وسواس نے مجھے ایک احمقانہ نیکی سے بچا لیا!

گھاٹ سے اسٹیشن تک کے لیے بڑی مشکلوں سے ایک قلی ملا۔ یہ کوئی جوان نہ تھا، ایک پچاس سالہ بوڑھا تھا، اس کے چہرے مہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اُسے تنفسی دورے بھی پڑتے ہیں لیکن نہ اس کے پاس دوا کے دام ہیں اور نہ اس گرانی میں پیٹ بھر کھانے کے پیسے۔ جب وہ ہانپتے ہوئے میرا سوٹ کیس بستر کے نیچے رکھ کر اور ہولڈال کھول کر [illegible] لے چلا

تو میں نے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے کہا۔ "نہیں رہنے دو، میں بچھا لوں گا۔" اور اسے مقررہ مزدوری سے دگنے پیسے دے دیئے۔ وہ پیسے نکال کر جب نمستے کر کے دعائیں دیتا چلا گیا تو میں نے ایک برتری و بلندی سی محسوس کی۔ "میں بھی اس قابل ہوں کہ میں دو چار پیسوں کے عوض لوگوں کی دعائیں خرید سکتا ہوں۔!" اسی جذبے کے ساتھ میں نے ہولڈال خود کھول کر بستر بچھایا اور جوتے کے فیتے کھول کر لیٹنا چاہا۔ مگر ویسے ہی یاد آیا — "ارے لیٹ تو لوں گا، مگر کتاب کہاں ہے؟"

میرے لئے سفر میں دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک تو لیٹنے کی جگہ، دوسرے دو تین انگریزی ناول۔ کمر اور پیٹھ کی وہ ساری اسپرنگیں، جو دس سے چار تک اسکول اور کالج میں کرسی پہ بیٹھے یا کلاس میں کھڑے ہو کر پڑھاتے وقت، میرے جسم کو کسے رہتی ہیں، سفر میں بالکل ہی کھل جاتی ہیں۔ میں بغیر کمر سیدھی کئے سفر نہیں کر سکتا۔ میرا دوسرا لازمی ہم سفر ہے ناول۔ یہ لباس کی طرح ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔ ناول بینی میرا مرض ہے چار پانچ گھنٹے روزانہ اس کی نذر کرنا ضروری ہیں۔ نیا نہ ملے گا تو پرانا ہی سہی، مگر اس کی مزاولت میں فرق نہ آئے گا۔ بغیر اس کے نہ تو اچھی نیند آتی ہے، نہ جاگتے میں سکونِ قلب میسر ہوتا ہے۔ اور سفر تو بغیر اس کے کٹ ہی نہیں سکتا۔ مہندرو گھاٹ سے سوار ہوا تھا۔ وہاں کوئی بک اسٹال نہ تھا، سون پور میں موجود تو تھا ضرور، مگر ڈبے میں میں اکیلا تھا۔ سوٹ کیس اور بستر چھوڑ کر چلے جانے میں ان کے چوری جانے کا خطرہ تھا۔ اس زمانے میں چوریاں ڈکیتیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ جہاں کوئی مجرم پکڑا گیا اس نے جھٹ اپنے کو فوج میں بھرتی کرا لیا۔ پھر نہ کوئی مقدمہ چلتا اور نہ تھانے پولس والے رپٹ لکھتے۔ غرض میرے لئے ڈبے کی تنہائی بھی قیدِ تنہائی بنی۔ کھڑکی سے سر نکال کر ادھر ادھر دیکھا، اپنا بوڑھا قلی بھی نہ دکھائی دیا کہ اسی کو سامان کی حفاظت سپرد کر کے بک اسٹال سے کتاب خرید لاتا۔ دکھائی دیا تو ٹرین کا گارڈ۔ سیٹی بجاتا، سبز جھنڈی ہلاتا ہوا۔

مجبوراً اپنی سیٹ کی طرف آ کر میں نے سوٹ کیس کی تلاشی لی۔ اپنے ہی کچھ مسودے ملے۔ سادے کاغذ کا پیڈ اور پنسل نکالی۔ سوچا، لاؤ آج کے سفر میں کوئی کہانی لکھ ڈالوں۔ مگر میں تو مصرع طرح والے غزل گو شعراء جیسا افسانہ نویس ہوں۔ مدیروں یا دوستوں کے تقاضے میرے لئے مصرع طرح کا کام دیتے ہیں۔ اس وقت کسی مؤقر جریدے کے مدیر کے خط کا خیال نہ آیا۔ ایسے ویسے پرچے تو مضمون اور افسانے مانگا ہی کرتے ہیں۔ ان میں لکھنے سے ان کی تو شہرت ہوتی ہے اور اپنی وقعت گھٹتی ہے۔ معاوضہ دینے کا اردو کے رسالوں میں اس وقت رواج ہی نہیں تھا۔ بس دو ایک پنجاب والے تو بیس پچیس دے دیتے تھے، ورنہ یوپی والے سوکھا ٹرخاتے تھے۔ پھر لکھنے کا فائدہ ہی کیا، نہ تو صاحبانِ نظر نے اسے پڑھا اور نہ پیسا ہی ہاتھ آیا — نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم! پھر بھی وقت کیونکر کاٹا جائے۔ لاکھ لاکھ دماغ پر زور دیا، کروٹیں بدلیں، بائیں کروٹ لیٹ کر کہنی کے نیچے تکیہ دبایا، شیونگ سٹ سے ایک بلیڈ نکال کر پنسل کی نوک باریک سے باریک تر کی۔ اس کے پچھلے حصے کو دانتوں سے خوب خوب دبایا، کاٹا، چبایا مگر سوائے اسٹیمر کے سفر کے منظر کے کہانی آگے نہ بڑھی۔

بارے چھپرے کا اسٹیشن آگیا۔ گاڑی کے اسٹیشن میں داخل ہوتے ہی میں دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اسٹیشن پر کافی چہل پہل تھی۔ میرا ڈبا اتفاق سے وہیلر کی دوکان کے سامنے ہی آ کر رکا۔ میں نے چاہا جھپٹ کر بک اسٹال سے دو ایک کتابیں لے لوں، مگر ویسے ہی ایک جوان سیٹھ کئی آدمیوں کے ساتھ ڈبے میں داخل ہونے کے لئے بڑھے۔ دو تو مزدور تھے۔ ایک کے سر پر ایک قیمتی سوٹ کیس تھا، دوسرے کے سر پر ایک نیا ہولڈال، اور منیم جی کے ہاتھوں میں ایک چمڑے کا بیگ اور ایک بے ٹونٹی کا جرمن سلور کا لوٹا اور اس کے اندر اسی

دھات کا ایک گلاس ۔ میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا ۔ دل میں سوچا ۔ یہ لوگ اپنی اپنی جگہ لے لیں، تو میں بک اسٹال جاؤں ۔ مزدوروں نے سوٹ کیس اوپر کی برتھ پر اور ہولڈال نیچے کی برتھ پر رکھا ۔ منیم جی نے بٹوا، لوٹا، گلاس سب اوپر ہی رکھ کر ہولڈال اپنے ہاتھ سے کھولا ۔ بستر بڑے احتیاط سے بچھایا چادر کی شکنیں بڑے احترام سے برابر کیں اور سیٹھ صاحب اس پر بیٹھ گئے ۔

یہ کوئی بتیس پینتیس برس کے جوان تھے، ساڑھے پانچ فٹ قد، گورا رنگ، ذرا پھیلا پن لئے ہوئے، پیشانی چوڑی بھویں گھنی، ناک کا بانسا پھیلا ہوا، آنکھیں اوسط، مگر ان کی پتلیوں میں خلافِ معمول بڑی عیارانہ چمک، چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں، ہونٹ ذرا موٹے، گھٹی ہوئی ٹھوڑی ذرا نوکیلی ۔ گردن نسبتاً چھوٹی اور موٹی ۔ ہاتھ پاؤں متناسب ۔ سر پر ایک پگڑی نما منڈیل تھی، جو کسی قیمتی کپڑے کی تھی، اس لئے کہ بار بار چمکتی تھی ۔ جسم میں ایک بنگالی ریشمی کرتا تھا، جس کے گلے کے بٹن سونے کے تھے، ٹانگوں میں نہایت ہی باریک سفید کنارے دار دھوتی تھی اور پاؤں میں کڑ کا نوک دار سیاہ پمپ تھا ۔ ایک کان میں ان کے ایک ہیرے کا آویزہ تھا اور انگلی میں ہیرے ہی کی انگوٹھی ۔

سیٹھ صاحب بستر پر پمپ اتار کر چار زانو بیٹھ گئے ۔ انھوں نے سر پر سے پگڑی بہت آہستہ سے اتاری، اسے منیم جی کی طرف بڑھایا ۔ انھوں نے بڑے احترام سے ۔ بلاتشبیہ جس طرح مسلمان قرآن کو لیتا ہے، اپنے آقا کے دستِ مبارک سے اس مقدس سرپوش کو لیا اور اسے سوٹ کیس کی رحل پر رکھ دیا ۔ سیٹھ صاحب نے مزدوروں سے کہا "تم لوگ جاؤ ۔" ان کے ساتھ ہی میں ڈبے سے نکل گیا ۔

میں بک اسٹال سے وو وائلڈ ویسٹ' ناول خرید کر پلٹا ۔ ممکن ہے آپ کو میرا پسند پر تعجب ہو ۔۔۔ مگر میں کیا کروں، مجھے جاسوسی اور جنسی ناولوں سے کہیں زیادہ 'کاؤ بوائز' (گوالوں) کے یہ قصے ہی اچھے معلوم ہوتے ہیں ۔ ان میں اچھے بُرے کردار شروع ہی سے نمایاں ہوتے ہیں ۔ سپید و سیاہ ملا کر مجوبہ سیرتیں نہیں پیش کی جاتی ہیں، اور نہ تحلیلِ نفسی کی افراط ہوتی ہے ۔ یہ کھلی فضا میں زندگی بسر کرنے والے جفاکش گنوار، گھوڑے بازی کرتے ہیں ۔ شرابیں پیتے ہیں، لڑتے ہیں، مرتے ہیں، اور ان کے خونیوں تک میں مردانگی، جوانمردی اور غیرت و حمیت کے وہ جوہر ہوتے ہیں، جو میری رومان پسند طبیعت کو انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا یقین دلاتے ہیں ۔

میں جب ڈبے میں داخل ہوا تو منیم جی جا چکے تھے اور سیٹھ جی بستر پر دراز تھے ۔ میری چیزیں بھی اپنی اپنی جگہ پر تھیں ۔ ان کی چیزیں بھی ۔ صرف چمڑے والا بیگ اب تکئے سے نصف دبا سرہانے تھا ۔ وہ خود میری سیٹ کی جانب پشت کئے ہوئے لیٹے تھے ۔ میں نے نئے ناول کے مطالعہ کو ترجیح دی اور تھوڑی دیر میں اپنے ٹکسن ہیرو اور اس کے مشکی گھوڑے کے کارناموں میں اس طرح محو ہوا کہ میں سیٹھ جی کے وجود ہی کو بھول گیا ۔ گاڑی چلتی رہی ۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے اسٹیشن پر مسافر اترتے، چڑھتے اور شور مچاتے رہے ۔ مگر سیٹھ جی خراٹوں کے ساتھ سوتے رہے ۔ میں ناول پڑھنے میں محو رہا ۔ کوئی ہمارے ڈبے میں نہ آیا ۔

بلیا کے اسٹیشن پر ایک اور سیٹھ داخل ہوا ۔ یہ صورت شکل، قد و قامت، وضع قطع سے بالکل سیٹھ تھا ۔ کالا بھی اور موٹا بھی اور ٹھگنا ذرا اور چھوٹی ٹانگوں پر بڑی سی توند کا بوجھ بھی سنبھالے ہوئے تھا ۔ اس نے عرض والی برتھ پر قبضہ کیا اور قلی سے مزدوری پر اس قدر زور زور سے جھگڑا کیا کہ پورا ڈبا گونجنے لگا ۔ قلی امریکی سپاہیوں سے روپیہ دو روپیہ بخشش پانے کا عادی ہو گیا تھا ۔ یہاں سیٹھ چونی تھما رہا تھا وہ منہ پھلائے کھڑا رہا ۔ بس یہی کہے گیا ۔ "بہت کم ہے ۔ مہنگی ہے، کال کا سمے ہے!" ہر آدھ آنے پر لڑتے لڑتے آخر آٹھ آنے پر صلح ہوئی ۔ قلی خفا خفا ادھر گیا اور یہ "ٹوٹا سہے

ٹوٹ !" بڑبڑاتا اور ایک چارخانے کے انگوچھے سے منہ پونچھ کر اسے زور سے ہوا میں پھٹکتا ہم دونوں مسافر ساتھیوں کی طرف ہمدردی کے لئے پلٹا۔ میں نے تو ناول عمداً منہ کے سامنے کر لیا۔ مگر سوتا فتنہ جاگ گیا تھا۔ وہ پہرچیں بہ جبیں ہو کر کہنی کے بھل اُٹھ کر اس شور کرتے بنٹیے کو دیکھ رہا تھا۔ ادھر میری طرف سے گھومتی ہوئی نظر جب اس رُخ گئی تو بجلی کی سی تیزی سے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔ کچھ تعجب، کچھ خوف، پھر احترام کی وہ کیفیت جو کسی بزرگ کو اچانک دیکھ کر کسی سعید چھوٹے کے چہرے پر خوف کے آثار کے ساتھ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جلدی سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "ارے چھما کرنا سیٹھ جی، میں نے شاید آپ کی نیند کھراب کر دی۔"

وہ بولے "نہیں، کوئی بات نہیں!"

مگر اب وہ کھیسے نکال کر اسی برتھ کی طرف بڑھا۔ "یہ آپ اِدھر کہاں؟"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "ارے ایک چھوٹا سا اپنا کام یہاں چھپرے میں بھی ہے!"

"اچھا!"

"ہاں، پارسال سے فوج کے لئے گھی کا ٹھیکہ ایک نئے فرم کے نام سے لے لیا ہے۔ وہ یہیں سے سپلائی ہوتا ہے!"

"تو ہوگا یہی پچاس ساٹھ ہزار کا؟"

وہ مسکرایا۔ گویا اسے اس چھوٹے سیٹھ کی کم ظرفی پر ترس آرہا تھا۔ وہ بولا "نہیں پارسال چار لاکھ کا تھا، اب کے چودہ لاکھ کا ہے۔"

میں اب تک تو نظریں ناول پر جمائے تھا۔ ان کی باتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ مگر جب لاکھوں کی باتیں ہوں تو غریب مدرس کا دھیان کتاب میں نہیں لگ سکتا۔ ہم جس دولت کا عمر بھر خواب دیکھا کرتے ہیں، وہ ان کا روزمرہ کا کھیل ہوتی ہے۔ ہم جو انھیں عقل و حکمت، اقتصادیات و تجارت کے اصول سکھاتے ہیں، وہ کون سا گر ہے جو ہمیں نہیں آتا اور انھیں بغیر سکھائے آتا ہے؟ یہ کیا بات ہے کہ گڑ گڑ ہی رہتا ہے اور چیلا چینی بن جاتا ہے؟ اس لئے میں نے کان کھڑے کئے۔ 'کاڈ بوائز' کی دھائیں دھائیں بھولا اور سیٹھوں کی کھسر پھسر پورے دھیان سے سننے لگا۔

موٹے سیٹھ نے "شیو شیو!" کہہ کر لمبی سانس لی۔ پھر بولا۔ "ارے تو اپنا دیش چھوڑ کر یہاں چھپرے میں کاہے فرم کھولا۔"

گورا سیٹھ بولا۔ "بنگال میں تو کال تھا۔ وہاں گائے بھینس کہاں؟ اناج کی طرح گھی بھی غائب تھا۔ پھر سارا کام ایک ہی فرم کو دے دیا جائے تو سرکار کی بدنامی ہوتی ہے۔ اس لئے نام اور جگہ تو بدلنا ہی پڑتا ہے۔"

موٹا سیٹھ بولا۔ "تو ہم کو کاہے نہ یاد کیا۔ ہم جیسے کال کے سمے میں گیہوں، آٹا، چاول، دالیں بیچا یا ویسے ہی گھی کا انتظام بھی کرتا۔ ہمارا بھی تو پرورس جرودی تھا۔"

گورا سیٹھ ذرا جھڑکنے والے انداز میں بولا۔ "تو یہ کال کاہے تھوڑے تھا کہ تم نے سڑا گلا جیسا بھی مال بھیج دیا، وہ سب کھپ گیا!"

موٹا سیٹھ سٹ پٹا کر بولا۔ "جی! جی! ایسا نہ کہو۔ بڑا سیٹھ کھد بولا تھا۔ جیسا بھی ہو لش بھیجو....."

گورا سیٹھ بولا "وہ تو سمے ہی ایسا تھا۔ سڑا۔ کیڑا پڑا ہوا بھی روپے کا تین چھٹانک آدھ پاؤ بیچ لیا۔ پر یہ تو فوج کا معاملہ ہے۔ بس اسی سے سمجھو کہ پارسال چار لاکھ کے ٹھیکے میں بس پچاس ہزار کا نفع ہوا....."

موٹا بولا "ایں، یہ کیسے؟"

گورا ہنس کر بولا "ارے ٹھیکہ ملنا کوئی مذاک تھوڑے ہے۔ دفتر کے چپراسی سے لے کر ڈائرکٹر جنرل سپلائی تک سب ہی کو تو پرساد چڑھانی پڑتی ہے۔ اب کے سوچا تھا لمبی رکم ملے گی، سو وہ بھی یہاں کے آدمیوں نے کام کھراب کیا۔ چودہ لاکھ میں چھ لاکھ کے نفع کی امید تھی....."

موٹے سیٹھ نے پھر "شیو! شیو!" کہہ کر لمبی سانس

تی۔ پھر وہ بڑے اہتمام سے بولا۔ "چیر لاکھ!"

اس نے کہا۔ "ہاں، پر ان موذکھوں نے بجر بجرانے میں کمی کی۔ سارا مال دلی سرکار نے ریجکیٹ کر دیا۔ پورے آٹھ لاکھ اصل کے بھی ڈوب رہے تھے۔ جب ہی تو میں کُھدا آیا....."

موٹے سیٹھ نے کہا "تو کیا آپ دوسرا مال تیلائی کیا؟"

گورا ہنسا۔ "نہیں جی! بابو جی نے ایسی کچی گولی نہیں کھیلی ہے۔"

موٹے نے ذرا اور قریب کھسک کر پوچھا۔ "فر؟"

گورا ہنسا۔ "انھوں نے مجھ سے کہا تم جا کر دیکھو، یہ کیا گول مال ہے۔ میں نے یہاں آکر پوچھا" اگرنٹی صاحب سے ملے تھے۔ اینٹی صاحب کے رِرشن کو گئے تھے۔ معلوم ہوا نہیں..."

موٹے سیٹھ کے پیٹ میں جیسے درد ہو رہا تھا۔ پوچھا "یہ کون شاہب لوگ ہے؟"

وہ بولا "یہ دونوں اپنے ہی کلکتہ سے دلی گئے ہیں۔ جمانے میں ہمارے ساہتہ کے ممبر تھے۔ کال کے سمے میں ایسی ایسی پیچ، ایسی ایسی پیچ...."

اور وہ دفعتہً چپ ہو گیا اور اُس کی آنکھیں نہ جانے کون کون سی صورتیں فضا میں دیکھنے لگیں۔

موٹا ذرا اور کھسکا، اس نے کہا "میں سمجھا نہیں سیٹھ!"

گورا دفعتہً چونک کر کھسیانی ہنسی ہنسا اور اس نے موٹے کے پیٹ میں انگلی چبھو کر کہا "ارے تم کیا کرو گے سمجھ کے۔ تمھاری اب وہ عمر ہی نہیں!"

موٹا اپنی خفت مٹانے کے لئے ہنسا "ہاں بابا ہمارا اب وہ رشن کہاں!" پھر کچھ سوچ کر بولا "تو کیا اس کا بھی بیوپار ہوتا تھا؟"

وہ کچھ چڑ کر بولا "ارے جب پیٹ جلتا ہے تو سب کچھ بکتا ہے۔ ایسے مال کی کھپت پنجاب اور سرحد میں بہت تھی۔ بیسیوں اپنے جانے پہچانے لوگ اس دھندے سے بن گئے...."

موٹا ہاتھ ملنے لگا۔ بے ساختہ شیو! شیو! کہا۔ پھر ذرا گمبھیر ہو کر بولا۔ "یہ بڑا نیچ دھندا ہے!"

گورے نے جھڑک کر ایک بالکل ہی نیا سرمایہ دارانہ نظریہ پیش کیا۔ "سیٹھ جی، دھندا اسی وقت تک اونچ نیچ ہوتا ہے، جب تک دس پانچ روپیوں کا معاملہ ہو۔ مگر جب ہجاروں لاکھوں کی بات چیت ہو تو کوئی بھی دھندا نیچ نہیں کہا جا سکتا۔"

موٹے نے سٹ پٹا کر کہا "سچ ہے، ٹھیک بولا آپ!" وہ جلدی سے اصل موضوع کی طرف پلٹا۔ "تو آپ شاہب لوگوں سے ملا؟"

گورے نے اپنی فتحیابی جھوم جھوم کر اور چٹخارے لے لے کر بیان کی۔ "ہاں، اگرنٹی صاحب، ڈائرکٹر جنرل کے پی۔ اے تھے اور اینٹی صاحب سارے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ۔ میں نے اگرنٹی صاحب سے ملتے ہی رونی صورت بنا کر کہا۔ "میں تو لٹ گیا! دس بارہ لاکھ ڈوب گئے!" وہ بولے "میں کیا کرتا، سرکاری حکم ہے کہ دس فی صدی میل ہو سکتا ہے، چیف کیمسٹ نے رپورٹ دے دی کہ اس میں بیس فی صدی میل ہے!" میں نے چپکے سے پانچ ہزار کے نوٹ ان کی جیب میں ڈال کے کہا "کام بنواؤ صاحب۔" وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا "اپنے صاحب سے تو چلو ملوا دوں۔ دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔" اس کے بعد وہ اکیلے بڑے صاحب کے پاس گیا۔ ان سے کچھ باتیں کر کے مجھے اندر بلا لے گیا۔ صاحب نے کہا "ول سیٹھ!" اور اپنا ہاتھ ملانے کو بڑھایا۔ میں نے جلدی سے جھک کر پاؤں پکڑ لیا "میں مر گیا ہجور! میں مر گیا!" وہ مجھے جھک کر اُٹھانے لگے تو میں نے ایک لفافہ ان کے جوتوں پر رکھ دیا۔ اس میں ہجار ہجار کے پچاس نوٹ رکھے تھے۔ انھوں نے مجھ کو اُٹھاتے ہوئے لفافے کو کنکھیوں سے دیکھا۔ میری پیٹھ ٹھونک کر کرسی پر بٹھایا۔ اگرنٹی نے چپکے سے میرا کندھا دبایا، اور وہ کمرے کے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی بڑے صاحب نے بڑی بے پرواہی

سے لفافہ اُٹھایا، نوٹوں کی گڈی کو انگوٹھے سے پھڑپھڑایا، اور اسے اپنے دراز میں ڈال دیا۔ پھر پوچھا۔ "دل کیا چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "حضور، میرا مال اتنا خراب نہیں۔ غلطی سے نمبر ایک کی جگہ میرے آدمیوں نے نمبر دو کا ٹین بھیج دیا۔ نمبر ایک میں اپنے ساتھ لایا ہوں وہ بھجوا لیا جائے۔" انھوں نے گھنٹی بجا کر اگرٹن کو بلایا اور حکم دے دیا کہ چیف کیمسٹ کو ان کا یہ گھی جانچنے کا حکم دے دیا جائے۔ پھر کہا انیٹنی کو بھیج دو۔ وہ آئے تو ان سے بولے "تم چیف کیمسٹ کا بنگلہ جانتے ہی ہو۔ ان کو لے جا کر ان کی میم صاحب کے ذریعے ان سے ملوا دو۔" میں نے انیٹنی صاحب کی جیب میں بھی پانچ ہزار ڈالے اور ان کے ساتھ جا کر چیف کیمسٹ کی بیوی کو بھی پچیس ہزار نذر کئے۔ سنا تھا کہ وہ بڑا سخت آدمی ہے مگر یوروپ والا بھولا ہی کا کیوں نہ بنا ہو میم صاحبوں کے ہاتھ میں موم کا ہو جاتا ہے۔ اس نے بہت چھون بچھان کیا مگر میم صاحب نے کہا "یہ ہمارا آدمی ہے۔ اس کا کام کرنا ہی پڑے گا!"

غرض دوسرے دن پھر گھی جانچا گیا۔ تھا وہی پہلے والا' بس ٹین بدلا ہوا تھا۔ اور ہر ٹین پر نمبر ایک کی مہر لگی تھی۔ ادھر تو گھی جانچا جانے لگا۔ ادھر میں گھسا دفتر میں۔ وہاں بڑا بابو تھا اپنے دیش کا ایک بنگالی۔ اس سے پہلے سے جان پہچان تھی۔ اس نے کہا "تم کیا سمجھتے ہو کہ اس دفتر میں بغیر چکنئی لگائے کام ہو جائے گا۔ لاؤ بائیں ہاتھ سے نکالو ٹینیٹ سے رقم۔!" میں نے وہاں بھی دو ہزار دئے۔ صاحب نے بلا کر کہا۔ "یہ تو ہی گھی ہے میں بیس سے گھٹا کر اسے پندرہ فی صدی لکھے دیتا ہوں۔ اس سے کم نہیں کر سکتا!" میں خوشامد کرنے لگا مگر وہ خفا ہو گیا۔ بولا۔ "ہم کہاں تک بے ایمانی کرے، بس جاؤ۔" بڑا بابو مجھے جلدی سے اٹھا لایا۔ صاحب نے پندرہ انگریزی عدد میں لکھا تھا۔ دفتر نے بہت آسانی سے اسے تیرہ کر دیا۔ مگر تین ہزار اور لئے۔ دوسرے دن اگرٹن صاحب سے جا کر کہا۔ انھوں نے کہا۔ "یہاں بھی دفتر میں کھسر پھسر ہے، ان سب کو ملاؤ۔ نہیں تو کام نہیں بنے گا۔ گھبراؤ نہیں۔ ہم اور انیٹنی صاحب پھر ادور دیں گے کہ دس کی جگہ تیرہ فی صدی میل کی اجازت دے دی جائے۔ تو بھائی دفتر میں پانچ ہزار بانٹنے کو دئے، صاحب کے چرن پر بیس ہزار اور چڑھائے۔ حکم نکلا کہ "جنگ کی ضرورتوں کی وجہ سے دس کی جگہ تیرہ فی صدی میل کی اجازت دی جاتی ہے۔" اگرٹن اور انیٹنی کو تگڑا ڈنر دیا۔ اچھی سے اچھی شراب پلائی اور ایک ایک بانکی لونڈیا کا انتظام کیا اور خوش خوش گھر پلٹا۔۔"

موٹے سیٹھ نے "شیو شیو" کہہ کے لمبی سانس لی، پوچھا "کل کتنا کھرچ بیٹھا؟"

وہ بولا۔ "ارے سب ملا کر سمجھو ڈیڑھ لاکھ کے پیٹے میں آ گیا۔"

موٹے نے دیدے نکال کر کہا۔ "شیو! شیو! ڈیڑھ لاکھ!"

گورا بڑی بے پروائی سے بولا۔ "ارے چلو، کیا گھاٹا رہا؟ چھ لاکھ کی جگہ ساڑھے چار لاکھ نفع رہا۔ ساڑھے نو لاکھ اصل پر منافع پچاس فی صدی سے کچھ ہی کم تو پڑا! اور پھر اگلے ٹھیکے کے لئے راستہ بھی صاف ہو گیا!"

میں سنتا جاتا تھا اور کھولتا جاتا تھا۔ دونوں نے جب اپنی تجارتی حرفتوں کی کامیابی پر فاتحانہ قہقہہ لگایا، تو میرا پیمانۂ صبر چھلک اُٹھا۔ مدرّس کو بے راہ روی پر ٹوکنے، جھڑکنے اور ملامت کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ اسی خراب عادت نے مجھے ان کی آپس کی گفتگو میں دخل در نامعقولات کرنے پر مجبور کیا۔ میں پوچھ بیٹھا۔

"کیوں سیٹھ جی، آپ کے گھی میں دراصل میل کتنا تھا؟"

اس نے ذرا گھبرا کر مجھے دیکھا۔ کوئی خفیہ پولس کا آدمی سمجھا۔

میں نے کہا۔ "آپ گھبرائیں نہیں، میں ایک معمولی ماسٹر ہوں۔"

چھوٹے نے ناک سکوڑ کر کہا "کسی اسکول میں پڑھاتے ہو؟"

میں اس کے لب ولہجہ میں جو حقارت تھی اسے پی گیا۔

میں نے کہا "جی ہاں، پڑھاتا ہوں، اسی لئے تو پوچھتا ہوں کہ وہ اصل کتنا میل تھا۔ مجھ کو اس طرح کے سوالات آپ کے بچوں کو روزانہ حل کرانے پڑتے ہیں!"

گورے سیٹھ نے مجھے بے ضرر محسوس کرکے ذرا اطمینان سے جواب دیا۔ "پچیس فی صدی۔ دس فی صدی تو گوالے گھر سے ملاکر دیتے ہی ہیں، میاں جی! اب پندرہ فی صدی کارخانے میں نہ ملایا جائے تو فائدہ ہی کیا ہو؟"

اس 'میاں جی' کے برمحل استعمال پر جی جل گیا۔ مگر میں نے ضبط کرکے کہا۔ "یہ صحیح ہے۔ مگر آپ دو باتیں بھول گئے۔ ایک تو یہ کہ یہ گھی ہمارے ہی ہندوستانی فوجی جوان کھائیں گے۔ ان کی صحت پر کیا اثر پڑے گا؟"

چھوٹا بات کاٹ کر بولا "ہمارا جوان کنکر پتھر پچا لیتا ہے' گھی تو پھر گھی ہی ہے۔! اُس پہ وہ تو مرنے جا ہی رہا ہے۔ وہ ہمارا گھی کھاکے مرے یا پاکی گولی سے!" اور اس نے اپنی حاضر جوابی پر قہقہہ لگایا۔ بڑا سیٹھ پڑھا لکھا تھا، وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔

میں تلملا اُٹھا۔ جی چاہا کہہ دوں۔ "ہاں تو دونوں برابر ہی ہوئے — آپ اور دشمن!" مگر بے وقوف ملا کی طرح پھر غصہ پی گیا۔ البتہ اپنے فرض سے باز نہ آیا۔

میں نے کہا۔ "آپ نے یہ بھی سوچا کہ رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔"

دونوں اس طرح اُچھل پڑے جیسے میں نے ان کی [illegible] کے [illegible] ہو۔ چھوٹا سیٹھ پیچ رخ خفا ہو گیا۔

وہ بولا "رشوت، گھوس! بنا گھوس کے دنیا کا کون سا دھندا چلتا ہے میاں جی؟ یہ ساری دنیا گھوس پہ چلتی ہے! بالک کو چاہتے ہو کہ ہنسے، جھنجھنا دو، رنگ برنگ کا گُبارہ دو! گؤ ماتا کو چاہتے ہو، دودھ دے اچھا اچھا چارہ دو۔ پتی کو چاہتے ہو کہ تم کو اچھا اچھا بھوجن کھلائے، دیکھتے ہی آنکھ مٹکائے، اس کو گہنا دو! اچھا اچھا وستر دو۔ دین دھرم چاہتے ہو ٹھیک رہے، مندر میں جا کر پرشاد چڑھاؤ، کالی ماتا کو بکرا دو! ارے بھگوان تک گھوس لیتا ہے بابا! بھگوان تک! کوئی کام بنا گھوس کے نہ یہاں سپھل ہوتا ہے، نہ پرلوک میں!"

میں انھیں رشوت کے نقصانات، اس کی اخلاقی خرابیاں اس کی بے ایمانی اور اس کی خود غرضی وغیرہ پر پورا لکچر دینا ہی چاہتا تھا کہ "شہباز قلی" کے اسٹیشن کا سواد دکھائی دینے لگا۔ مجھے وہیں اُترنا تھا۔ میں نے جلدی سے بستر سمیٹا، ہولڈال باندھا اور اپنا سوٹ کیس اور ہولڈال دروازے کے پاس رکھا۔ جیسے ہی اسٹیشن آیا جلدی سے پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ گاؤں سے مزدور آئے تھے۔ انھوں نے اسباب سنبھال لیا۔ اب میں نے اپنے ڈبے پر نظر ڈالی۔ بڑا سیٹھ مسکرا رہا تھا اور چھوٹا سیٹھ ہنسے جا رہا تھا۔ جیسے اس نے اپنی دلیل سے مجھے بالکل ساکت ہی نہ کر دیا ہو، بلکہ مجھے فرار پر بھی مجبور کر دیا ہو!

راستے بھر میں سرمایہ داروں، پونجی پتیوں کے اخلاقی معیار پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ کتنے ذلیل ہوتے ہیں، یہ بڑے بزنس والے۔ ان کو اپنے نفع کے آگے کسی دوسرے کے نقصان کا، تکلیف کا، بلکہ جان تک کا کوئی خیال ہی نہیں رہتا! لیکن جب گھر پہنچ کر نہا دھو کر ناشتہ کرنے بیٹھا تو احمد صاحب کی بیٹی کے جہیز کا ذکر چھڑا۔ دس دن میں اس کی برات آنے والی تھی۔ ڈھیر سے ہیرے سونے کے زیورات، چاندی کا پاندان، خاصدان، چاندی کی پلنگڑی، چاندی کی چوکی دی جانے والی تھی۔ اکیس بھاری جوڑے تیار ہو چکے تھے ابھی اور نہ جانے کتنے بن رہے تھے۔ سارا گاؤں آنے والی برات کے اہتمام میں لگ رہا تھا۔ ہر ایک کے ہاں حسب حیثیت اس شادی میں

شرکت کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میرے گھر سے ان سے عزیزداری تھی، اماں کو اپنے لئے تو نہیں، مگر اپنی بہو کے لئے نئے جوڑے بنوانے کی فکر تھی۔ پھر ہر رسم پر کچھ نہ کچھ دینا ہی ہوگا۔ غرض پورے ڈیڑھ سو روپے کا تخمینہ تھا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر اماں سے کہا "آج جون کی ۲۸ ہے۔ دو دن میں مہینہ ختم ہے۔ جولائی کی پہلی یا دوسری کو دفتر والے تنخواہ کا منی آرڈر روانہ کر دیں گے۔ ۵ یا ۶ جولائی تک روپے آجائیں گے۔ اس میں سے ڈیڑھ سو لے لیجئے گا!"

اماں منہ بنا کر جھڑکنے والے انداز میں بولیں۔ "ہونہہ! تمہاری موئی بے برکت والی تنخواہ میں رکھا ہی کیا ہے۔ تم نے اتنا پڑھا لکھا، بڑی بڑی ڈگریاں لیں۔ اکیس بائیس برس تم کو جھک جھک کرتے، لونڈوں سے اپنا مغز چٹواتے بیت گئے اور ملتا ہے۔ وہی بندھے بندھائے، گنے گنائے تین سو روپلی!

اور انہوں نے رُک کر گویا میں ایک بڑی بپتا کہی۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ میں پولس کا داروغہ ہوتا اور میں بنا مدرس! وہ سمجھانے والے انداز میں بولیں — "ارے اسی محمود احمد کو دیکھو، آٹھواں پاس ہے، تنخواہ کہنے کو باون روپیہ ماہوار پاتا ہے، مگر ہُن برستا ہے، ہُن۔ اس کے ہاں ایسا ہی کوئی منحوس دن ہوگا کہ وہ پچیس تیس اوپر سے کما کر نہ لاتا ہو۔ اس کو کہتے ہیں برکت بیٹا!"

میں نے رشوت کی نئی تعبیر ماں کے منہ سے سنی حیرت سے ان کا منہ دیکھا اور گردن جھکائے خاموش، جلدی سے باہر چلا آیا۔ یہاں کی بے برکتی تو قسمت میں تھی ہی، وہاں کی بے برکتی کیوں مفت مول لیتا۔

ع کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے



تبصرہ نگاری

وہ جو ہوٹل میں چکھ رہے ہیں کباب — سامنے رکھ کے اک دبیز کتاب
آیئے میں بتاؤں کیا ہیں آپ — ماہرِ فنِ تبصرہ ہیں آپ
ایک گھنٹے میں دس کتابوں پہ — آپ لکھتے ہیں تبصرے فرفر
ادب و فلسفہ و علم کلام — سارے موضوع آپ کے ہیں غلام
لاکھ موٹی سہی، کتاب ، مگر — ڈالتے ہیں یہ سرورق پہ نظر
آپ کا خامۂ گہر افشاں — ہونے لگتا ہے دفعتاً جولاں
بلکہ اکثر ہوا ہے ایسا بھی — دُور کتابوں کی دُور سے سونگھی
اور جھٹ سے سنبھال کر خامہ — فکر کو فن کا دے دیا جامہ
یہ بھی مشہور ہے کہ آپ کا فن — اُن کتابوں پہ بھی ہے خامہ زن

طبع ہونے کی بات دُور رہی
بطنِ فن کار میں جو گم ہیں ابھی

میں نے اک روز ان سے یہ پوچھا — میرے حضرت، بتایئے تو ذرا
آپ ہر قسم کی کتابوں پہ — لکھتے رہتے ہیں تبصرہ کیونکر
وقت اتنا کہاں سے لاتے ہیں — جو ہرِ فن جو یوں دکھاتے ہیں
کرتے ہیں کب مطالعہ حضرت — کیسے ملتی ہے اس قدر فرصت

ہنس کے بولے مطالعہ کیسا
پڑھ کے لکھا تو تبصرہ کیسا

فنِ تجرید کا یہ فیضاں ہے — کارِ مشکل جو سہل و آساں ہے
زورِ ابہام کا بڑھا جب سے — میرے فن کو ملی جلا تب سے
اب تو ہر آرٹ کا ہے یہ دستور — بات جس درجہ بھی ہو فہم سے دُور
ہوگی مقبولِ خاص و عام وہی — سر دھنیں گے اسی پہ آپ سبھی
آیئے میں بتاؤں گُر کی بات — تاکہ واضح ہوں آپ پر حالات
کسی موضوع پر ہو کوئی کتاب — نظم ہو، نثر ہو کہ علمِ حساب
تبصرے کے لئے جب آتی ہے — میری تخئیل رنگ لاتی ہے
فنِ تجرید کا دکھا کے کمال — مبہم الفاظ کا بچھا کر جال
کچھ خیالاتِ مثبت و منفی — کچھ اشاراتِ منجلی و خفی
مغربی ناقدوں کے کچھ فقرے — چیدہ اقوال سربراہوں کے
کچھ اِدھر کچھ اُدھر سے لیتا ہوں — اور مضموں گھسیٹ دیتا ہوں
اصل میں، تبصرہ نگاری کا — فن بھی اک کھیل ہے مداری کا
تھی ابھی ان کی گفتگو جاری — اور مجھ پر تھی محویت طاری
اتنے میں سامنے سے اک لڑکا — گنگناتا ہوا یہ شعر گیا

"نہ محقق بود نہ دانش مند
چارپائے برو کتابے چند"

دھونڈو پنت نانا

دھونڈو پنت نانا ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا وہ جیالا رہنما تھا جس نے میدانِ جنگ میں شکست کھائی مگر اپنے ہم وطنوں کے دلوں پر حکومت کی۔ انگریز حکمرانوں نے اس کے سر کی قیمت ایک لاکھ روپیہ رکھی مگر انگریز فوج اور پولیس کا کوئی فرد اس کی ہوا تک کو نہ چھو سکا، اور یہ شخص جو انگریزوں کے لئے معمّہ تھا ہندوستانیوں کے لئے روایت بن گیا۔

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ نانا صاحب کی کہانی ۱۸۵۷ء سے شروع ہوئی لیکن آج تک کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکا کہ یہ کہانی کب اور کہاں ختم ہوئی۔

انگریز پولیس افسر حوالات کے باہر نہایت کشمکش و پیچ کے عالم میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہل رہا تھا۔ طرح طرح کے وسوسے اس کے دماغ میں جنم لے رہے تھے۔ اگر یہ شخص واقعی نانا صاحب ہوا تو ——؟ چلتے چلتے وہ ٹھٹک جاتا اور سلاخوں کے ساتھ آنکھیں لگا کر نہایت غور سے اندھیری کوٹھڑی کے اندر پڑی ہوئی اس غلیظ سی گٹھڑی کو تکنے لگ جاتا جس میں لپٹا ہوا انسان بے بس بھی، پھر بھی اس کا مقدر چمکا دینے کی توفیق رکھتا تھا۔ کیونکہ اگر اس پولیس افسر کا شبہ درست نکلتا تو اس قیدی کے سر کی قیمت ایک لاکھ روپیہ ہوتی۔

یہ واقعہ ۱۸۹۵ء کا ہے۔

کیا وہ نیم پاگل سادھو جو اس وقت راج کوٹ سے تیس میل دور حوالات میں بند تھا، واقعی نانا صاحب تھا؟ —— اور اگر وہ واقعی [illegible]

[illegible]

گنگا میں اپنی کشتی ڈبو کر خودکشی کر لی تھی؟ — اور وہ جس کی موت ۱۸۵۹ء میں نیپال میں ہوئی تھی؟

"میں پیشوا ہوں —" وہ نیم پاگل سادھو تمام رات بڑبڑاتا رہا تھا۔ "جنگ بہادر راناؔ، میری حفاظت کرو۔" ظاہر ہے اس عجیب و غریب بیان کو سن کر غدر کے بعد کے اڑتیس سال فوراً اس انگریز پولیس افسر کے ذہن میں کوند گئے ہوں گے —— اڑتیس سال۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۹۵ء تک —— ان اڑتیس برسوں میں ہندوستان پر کیا کچھ نہ بیت گیا۔ لیکن ان اڑتیس برسوں کا حلیہ مراٹھا سلطنت کے اس چشم و چراغ کے لئے (اگر وہ نیم پاگل سادھو واقعی نانا صاحب ہی تھا، تو ——) کیا تھا؟ یہی نا، موت کی وہ افواہیں، ان گنت بہروپ، اور اب حوالات کی یہ کوٹھڑی —— بعد بس ——

[illegible]

اس ملاقات کے چند ماہ بعد یعنی اپریل ۱۸۶۱ء میں ایک اجنبی شخص علم دین نے بتایا کہ پانچ ماہ ہوئے اس نے نانا صاحب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق نانا صاحب گیروے کپڑے پہنے رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہزاروں آدمی ہیں۔ اس کے علاوہ بیگم اودھ کے نوکر نے بھی یہ بیان دیا کہ نانا صاحب زندہ ہے اور کسی ان جانی جگہ چلا گیا ہے۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد ایک فقیر نے میجر پیرس کے اردلی کو بتایا کہ جب جنگ بہادر رانا اپنی فوج کے ہمراہ نانا صاحب کے کیمپ میں پہنچا تو نانا صاحب نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ جنگ بہادر - - - - - - - - - کی نیت صاف نہیں۔ چند دن بعد اس اردلی کی ملاقات ایک سادھو سے ہوئی اور اس سادھو نے اسے بتایا کہ اس نے نہ صرف نانا صاحب کو دیکھا ہے بلکہ اس سے بات چیت بھی کی ہے۔ "میں کتی ناتھ جا رہا تھا۔ راستے میں ایک دن میں بان گنگا میں اشنان کر رہا تھا کہ ایک جٹا دھاری سادھو ہاتھی پر سوار ادھر سے گزرا۔ اور جب اس سادھو کو یہ پتہ لگا کہ میں کتی ناتھ جا رہا ہوں تو اس نے اپنے بٹوے میں سے کچھ روپے نکالے اور مجھ کو دے دیئے۔ اس کے بعد گاؤں والوں نے مجھے بتایا کہ وہ سادھو ایک بہت بڑا مرہٹا راجہ ہے۔ پھر جب اس اردلی نے کتی ناتھ سے آنے والے دوسرے یاتریوں سے پوچھ گچھ کی تو انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ کتی ناتھ کے پاس ایک مرہٹا راجہ رہتا ہے جو بہت دان پن کرتا ہے۔"

جب یہ قصے اخباروں میں چھپنے لگے تو جنگ بہادر نے ایک عجیب و غریب تجویز سرکار کے سامنے رکھی۔ اس کی شرط یہ تھی کہ انگریزی فوجیں نیپال آ کر نانا صاحب کی تلاش کر سکتی ہیں، اور اگر وہ اسے ڈھونڈ نکالیں تو وہ خود نانا صاحب کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دے گا۔ لیکن اگر [illegible]

یہ تجویز انگریزوں کو منظور نہ تھی۔

اس کے بعد جنگ بہادر نے ایک ایسا بیان دیا جس سے پتہ لگتا تھا کہ اسے خود بھی نانا صاحب کی موت کا یقین نہ تھا لیکن اس نے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ بالفرض محال اگر نانا صاحب زندہ ہوا بھی تو وہ نیپال یا تبت میں ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ واپس ہندوستان چلا گیا ہوگا۔

جنگ بہادر کے اس بیان کے بعد انگریزوں کو شک گزرا کہ ہو نہ ہو نانا صاحب ہندوستان میں ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔ ۱۸۶۲ء میں کراچی میں ایک شخص ہری برہمچاری کو اس جرم میں گرفتار کر کے کلکتہ لے جایا گیا کہ اس کی شکل نانا صاحب سے ملتی جلتی تھی۔ وہ بے چارہ جو پہلے ہی بیمار تھا، ہسپتال میں مر گیا۔

جون ۱۸۶۳ء کو جمعدار مولا دکا تیواری نے اجمیر کے ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دی کہ نانا صاحب شہر کے ایک مندر میں قیام پذیر ہے۔ فوراً مندر کے محاصرے کا پلان بنایا گیا۔ مگر اسی وقت مخبر نے اطلاع دی کہ نانا صاحب نے اپنی جائے رہائش تبدیل کر لی ہے۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد ڈپٹی کمشنر کو اس دوسرے مکان کا سراغ بھی مل گیا۔ مولا دکا تیواری پہلے سے ہی دروازے پر موجود تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ جب ڈپٹی کمشنر اس سے پوچھے گا: "تم لوگ کون ہو؟" تو وہ جواب دے گا۔ "ہم فلاں فلاں ہیں اور پنڈت جی وہ رہے۔" اور جس شخص کی طرف وہ اشارہ کرے گا وہ نانا صاحب ہوگا۔

اس شخص کا حلیہ نانا صاحب سے اس حد تک ملتا جلتا تھا کہ ڈپٹی کمشنر کو اس کے نانا صاحب ہونے میں رتی بھر شک نہ تھا۔ اسے گرفتار کرنے کے بعد ڈپٹی کمشنر نے فوراً نصیر آباد چھاؤنی سے کمک بھی منگوا لی تاکہ اگر نانا صاحب کو چھڑانے کی کوشش کی جائے تو اس کا تدارک کیا جا سکے۔ لیکن ایک ہی دن میں [illegible] اور یہ کہ یہ شخص [illegible] تھا اس شخص [illegible]

اچھی طرح شناخت تھے، ان کا فوری فیصلہ یہ تھا کہ اس شخص میں نانا صاحب کی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایک سارجنٹ نے بڑے وثوق سے اس شخص کو نانا صاحب قرار دے دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ نانا صاحب کو بڑی اچھی طرح جانتا ہے کیونکہ میرٹھ میں ایک بار اس کا نانا صاحب سے جھگڑا ہو چکا تھا۔

آخرکار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہندوستان کی انگریزی سرکار دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ کلکتہ والوں کی رائے میں وہ شخص ہرگز نانا صاحب نہ تھا مگر شملہ والے اسے نانا صاحب ماننے پر مصر تھے۔ اس اختلاف رائے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب لفٹننٹ گورنر نے اس کی رہائی کا حکم دے دیا تو بمبئی کے پولیس کمشنر نے اس پر اعتراض کیا۔ اس مقدمے کا خاتمہ بالخیر تب کہیں جا کر ہوا جب ۹-نومبر کو کان پور کے مجسٹریٹ نے فیصلہ دیا کہ یہ شخص جسے اجمیر میں نانا صاحب سمجھ کر گرفتار کیا گیا تھا، درحقیقت نانا صاحب نہیں ہے۔

ابھی اس واقعہ کی بازگشت مدھم نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور نانا صاحب میواڑ میں آ نکلا۔ لیکن اب تو ان نانا صاحبوں کی اس قدر بھرمار ہو چکی تھی کہ ان "نئے" نانا پر کسی نے کوئی توجہ نہ دی۔ بلکہ کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ سرکار کو چاہیئے کہ ان نانا صاحبوں کو ان کے اپنے ہی بیان کی بنا پر پھانسی پر لٹکا دے تاکہ یہ روز روز کا قصہ ختم ہو۔ اس کے باوجود نانا صاحب آتے رہے اور جاتے رہے حتٰی کہ وزیر ہند نے عاجز آ کر مئی ۱۸۷۳ء میں یہاں تک کہہ دیا "اگر میرا بس چلے تو میں ہندوستان کو نانا صاحب کے حوالے کر کے اپنا پیچھا چھڑاؤں۔" قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس بیان کے صرف ڈیڑھ سال بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہندوستان اور انگلستان دونوں ملکوں میں سنسنی پھیلا دی۔

یہ واقعہ ۱۲-اکتوبر ۱۸۷۴ء کا ہے۔ اس شام ایک قاصد نے گوالیار کے مہاراجہ کی خدمت میں نانا صاحب کا ایک رقعہ پیش کیا جس میں لکھا تھا۔ "کافی مصیبتیں سہنے کے بعد میں گوالیار آ پہنچا ہوں۔ اس وقت میں بے یار و مددگار ہوں۔ اور چونکہ آپ کے باپ دادا میرے باپ دادا کے وفادار اور بہی خواہ تھے، اس لئے میں بے جھجک آپ کی گود میں اپنا سر رکھ رہا ہوں تاکہ آپ میرے ساتھ جو جی میں آئے، سلوک کریں۔"

مہاراجہ اس قاصد کے ہمراہ ہو لیا اور ایک دُبلے پتلے سادھو کو اپنے محل میں لے آیا۔ اور جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ سادھو واقعی نانا صاحب ہی ہے تو اس نے آدھی رات کو انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کو مخبری کر دی۔ صبح ہوتے ہی وہ سادھو اور اس کے ساتھی انگریزوں کے حوالے کر دئیے گئے۔

گوالیار سے یہ سادھو کان پور لایا گیا اور اس کی شناخت کی کارروائی شروع ہوئی۔ ڈاکٹر برنارڈ جس نے ۱۸۵۷ء میں کئی بار نانا صاحب سے ملاقات کی تھی اس کو نانا صاحب ماننے سے منکر تھا اس کے علاوہ ان دو انگریز افسروں میں سے جنہیں وائسرائے نے خاص اس آدمی کی شناخت کے لئے کان پور بھیجا تھا، ایک نے اسے نانا صاحب ماننے سے یکسر انکار کر دیا اور دوسرے نے یہ تجویز پیش کی کہ اس سادھو کی داڑھی منڈوا کر اسے مرہٹہ سرداروں کا لباس پہنایا جائے تاکہ اسے پہچاننے میں آسانی رہے۔ جب ایسا کیا گیا تو اس سادھو کی شکل حیرت انگیز طور پر نانا صاحب جیسی نکلی۔ مگر اس کے باوجود وہ انگریز افسر اس شخص کے نانا صاحب ہونے کی قسم کھانے کو تیار نہ ہوا اور اس نے یہ کہہ کر کہ مشابہت واقعی غیر معمولی ہے، اپنا پیچھا چھڑا لیا۔

اس کے برعکس نانا صاحب کے ایک رشتہ دار بابا آپٹے کو اس شخص کو نانا صاحب ہونے میں مطلق شک نہ تھا۔ مہاراجہ سندھیا تو نہایت وثوق سے اسے نانا صاحب کہہ رہا تھا۔ اس کے اس یقین کی بھی ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ جب ۱۸۵۶ء میں مہاراجہ کی ملاقات کان پور اور بٹھور میں نانا صاحب سے ہوئی تھی تو مہاراجہ نے نانا صاحب کو مرہٹہ سردار پیشوا کا جانشین مانتے ہوئے ایک جڑاؤ تلوار اس کی نذر کی تھی اور اس سادھو نے اس تلوار کا ذکر بھی کیا تھا حالانکہ اس نذرانے کا علم سندھیا اور نانا صاحب کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔

[illegible] اس معاملے کی تفتیش کے لئے ایک انگریز افسر مقرر کیا گیا اور بہت چھان بین کے بعد [illegible] یہ سادھو نانا صاحب نہیں ہے۔

اس واقعہ کا ایک دلچسپ پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ اگر یہ شخص نانا صاحب نہیں تھا تو اس نے نانا صاحب بننے کا ڈھونگ کیوں رچا جب کہ اسے یہ علم ہونا چاہیئے تھا کہ اگر سرکار اسے واقعی نانا صاحب مان لیتی تو اس کی سزا پھانسی ہوتی۔ اس بارے میں دو رائیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس شخص کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ مہاراجہ سندھیا انگریزوں سے اس کی جان بخشی کروا لے گا اور اگر یہ توقع پوری ہو جاتی تو نانا صاحب بننے میں اسے فائدہ ہی فائدہ رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ جونہی انگریز پولیٹیکل ایجنٹ نے اس قسم کی کوئی گارنٹی دینے سے انکار کر دیا، تو اس شخص نے فوراً اپنے بیان سے انحراف کر لیا۔

دوسری رائے یہ تھی کہ وہ شخص جسے مہاراجہ نے اپنے محل میں گرفتار کیا تھا، درحقیقت نانا صاحب ہی تھا، مگر جب انگریزوں نے اس کی جان بخشی کرنے سے انکار کر دیا تو سندھیا نے اصلی نانا صاحب کو کہیں چھپا دیا اور اس کی جگہ اس کا ایک ہم شکل آدمی ان کے حوالے کر دیا۔

ان کے علاوہ ایک تیسری رائے یہ بھی تھی کہ نانا صاحب اس روز واقعی گوالیار میں موجود تھا اور اس نے مہاراجہ کا اور انگریزوں کا ردعمل جاننے کے لئے اپنے اس ہم شکل آدمی کو آگے کر دیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد بھی نانا صاحب کا چرچا ختم نہیں ہوا۔ ۱۸۷۷ء میں [illegible] کے اخبار میں یہ خبر چھپی کہ نانا صاحب روس میں ہے اور ایک روسی لشکر کے ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ بمبئی کی منڈیوں میں ہلچل مچا دی تھی۔ [illegible] اخبار کے ایک نامہ نگار نے قسطنطنیہ سے ایک عجیب و غریب خبر بھیجی۔ اس خبر کے مطابق نانا صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ایک انگریز لڑکی کو اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا۔ وہ لڑکی بیس سال تک اس کے ساتھ منسلک رہی اور پھر وہ دونوں ہندوستان سے مکہ شریف چلے گئے اور وہاں سے قسطنطنیہ۔ ایک دوسری خبر کے مطابق ۱۸۷۷ء میں نانا صاحب مکہ میں ہی تھا جہاں وہ اور بہادر شاہ ظفر کی اولاد میں سے ایک شہزادہ فیروز شاہ کے ساتھ انگریزی سرکار کا تختہ الٹ دینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

اگر نانا صاحب ۱۸۷۷ء میں مکہ میں تھا تو [illegible]ء میں وہ لاچ کوٹ کیسے پہنچ گیا؟ اور پھر اس بات کا کیا ثبوت تھا کہ وہ نیم پاگل سادھو جو حوالات میں بند تھا واقعی نانا صاحب ہی تھا؟؟ یہ سوال یقیناً اس انگریز پولیس افسر کو پریشان کر رہے ہوں جو سلاخوں کے ساتھ آنکھیں لگائے کلکتہ سے آنے والی ہدایات کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ سرکار کو اب نانا صاحب میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ کیونکہ اگلے ہی روز کلکتہ سے تار کا جواب آ گیا۔ "اس شخص کو رہا کر دیا جائے۔"

ضروری گزارش

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوشخط لکھیے۔

۲۔ غیر مطبوعہ مضامین [illegible]

[illegible]

غلام محمد راحل

جاپان کی تمدنی زندگی

جاپان کے ساتھ میرا کچھ ذاتی لگاؤ ہے۔ کیونکہ ۱۹۳۹ء کے لگ بھگ میں کوئی تین چار برس وہاں رہا اور جاپانی ملک، جاپانی عوام اور جاپانی تہذیب و تمدن کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ جاپان میں جو تبدیلیاں و ترقیاں ہوئی ہیں میں ان کا ذکر یہاں کروں گا۔

کسی ملک کی تمدنی زندگی کا جائزہ وہاں کے اخبار، ریڈیو، علم و فن، سینما، تھیٹر اور کھیلوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے جاپان کی تمدنی زندگی پر نظر ڈالنا معلومات سے خالی نہ ہوگا۔

تعلیم

۱۸۶۸ء میں جاپانی شہنشاہ میجی نے جو انقلابی اصلاحات رائج کیں ان کے نتیجہ میں تعلیم کا ایسا دور دورہ ہوا کہ جاپانی زبان کے حروف کی پیچیدگی کے باوجود چند ہی سالوں میں وہاں کا ہر فرد تعلیم یافتہ ہو گیا۔ ۱۸۷۲ء میں لازمی تعلیم کو قانوناً رائج کر دیا گیا۔ [illegible] پرائمری اور ہائی اسکول کھول دئے گئے اور چھ سال تک تعلیم مفت قرار دے دی گئی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد تعلیمی ڈھانچے کو اور بھی آسان کر دیا گیا اور اس [illegible] میں دو اہم قانون بنا دئے گئے [illegible] حرمت [illegible] ہے کہ ایسے خود [illegible]

[illegible]

اور انسانی حقوق کا احترام کرنے والے ہوں۔ قانون یہ بھی اجازت دیتا ہے کہ اپنی اپنی قابلیت کے مطابق ملک کے ہر شہری کو تعلیم کا پورا پورا موقع دیا جائے۔ قانون کسی قسم کے نسلی، مذہبی، سماجی، اقتصادی یا خاندانی امتیاز کی اجازت نہیں دیتا۔ مرد عورت کے فرق کو نہیں مانتا۔ دونوں کو بیک وقت تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے۔

قانون، علم، سیاسیات اور مذہبی آزادی کی اہمیت پر زور دیتا ہے مگر تعلیمی ذرائع کے لئے سیاسی و مذہبی پارٹیوں کے ساتھ کسی تعلق کی اجازت نہیں دیتا۔ اسکولوں میں سماجی مضامین کی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے۔ لائبریریوں، عجائب گھروں وغیرہ کے بنانے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

جاپانی طرزِ تعلیم کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:۔

(۱) پرائمری اسکول (چھ سال) (۲) سیکنڈری اسکول (تین سال) (۳) ہائی اسکول (تین سال) اور (۴) یونیورسٹی (چار سال)۔ یونیورسٹی کے بعد کی اعلیٰ تعلیم کا بھی خاطر خواہ بندوبست ہے۔

نو سال تک تعلیم کا حاصل کرنا سب کے لئے مفت اور لازمی ہے۔ تعلیم کا نظام کچھ اس ڈھنگ کا ہے کہ مقامی بورڈ ہی اس کے لئے ذمہ دار ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کے لئے نصابی کتب کے لئے وزارتِ تعلیم سے منظوری لینی پڑتی ہے۔

گھر ان کا چناؤ زیادہ تر بورڈ ہی کرتے ہیں۔

تعلیمی اداروں، استادوں اور طالب علموں کی تعداد کے بارے میں جو اعداد دستیاب ہیں وہ ۱۹۶۲ء کے ہیں۔ ان سے وہاں کی تعلیمی صورت کا قریباً صحیح خاکہ مل جاتا ہے۔ خاکہ درج ذیل ہے:-

قسم اسکول	تعداد	استادوں کی تعداد	طالب علموں کی تعداد
چھوٹے بچوں کے اسکول	۷۵۱۵	۳۹۴۴۸	۸۵۵۵۳۹
پرائمری اسکول	۲۶۶۱۵	۳۴۲۶۷۷	۱۱۰۵۶۹۱۵
سیکنڈری اسکول	۱۲۶۴۷	۲۵۷۷۶۴	۷۳۲۸۳۴۴
ہائی اسکول	۴۶۳۷	۱۶۲۸۰۷	۳۲۸۱۴۷۴
چھوٹے کالج	۳۰۵	۱۵۳۴۱	۱۰۷۷۱۴
کالج اور یونیورسٹی	۲۶۰	۶۷۲۶۹	۷۲۷۱۰۴
اندھوں کے لئے اسکول	۷۸	۲۳۷۰	۱۰۱۲۷
بہروں کے لئے اسکول	۱۰۵	۳۷۶۰	۲۰۱۸۰
اپاہجوں کے لئے اسکول	۸۶	۱۰۴۲	۸۲۸۸

لائبریریاں، عجائب گھر اور دوسرے ادارے بھی تعلیم کو بڑھانے میں کارگر ثابت ہوئے ہیں۔ ۱۹۶۱ء کے اخیر میں جاپان میں ۷۳۶ عوامی لائبریریاں تھیں جہاں ۱۷۶۰۳۷۷۳ کتب موجود تھیں۔ سارے سال میں ۵ کروڑ ۷۰ لاکھ لوگوں نے ان لائبریریوں سے استفادہ حاصل کیا۔

غیر ملکی طلبا بھی جاپان کی یونیورسٹیوں میں داخل ہو سکے ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں ۴۷۷۲ غیر ملکی طلبا زیر تعلیم تھے۔

قصہ کوتاہ جاپان میں تعلیم اور موزوں تعلیم پر کافی زور دیا جاتا ہے اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ یہ ملک دوسرے ایشیائی ممالک سے آگے بڑھا ہوا ہے۔

اخبار اور ریڈیو

جاپان میں اخبار، رسالے، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما بہت ہر دل عزیز ہیں۔ اخباروں اور رسالوں کی اشاعت اس قدر ہے کہ جس کی مثال نہیں۔

اس وقت جاپان میں ایک سو سے زیادہ روزنامے ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو دن میں کئی بار چھپتے ہیں۔ سب اخباروں کی کل اشاعت تین کروڑ ستر لاکھ روزانہ ہے۔ ان کا مقابلہ دوسرے بڑے ملکوں سے کیجئے۔ انجمن اقوام متحدہ کے دفاتر سے شائع کئے گئے اعداد و شمار بیان کرتے ہیں کہ روزانہ چھپنے والے اخباروں کی کل اشاعت بڑے بڑے ملکوں میں اس طرح ہے:-

امریکہ:-	۵ کروڑ	۸۰ لاکھ
سوویت روس	۳ کروڑ	۷۰ لاکھ
برطانیہ	۲ کروڑ	۷۰ لاکھ
مغربی جرمنی	۱ کروڑ	۷۰ لاکھ
فرانس	۱ کروڑ	۱۰ لاکھ

جاپان کے بارے میں یوں کہیئے کہ ہر گھر میں روزنامے دو بار پڑھے جاتے ہیں۔ ان روزناموں میں سب سے بڑے تین ہیں۔ اساہی شمبن - مائی نچی شمبن اور یومی اُری شمبن - ان تینوں کی روزانہ اشاعت تیس تیس پینتیس پینتیس لاکھ کے قریب ہے۔ انگریزی زبان میں بھی چار روزنامے شائع کئے جاتے ہیں۔

جاپانی روزناموں کے مدیروں کی انجمن کی جنوری سنہ ۱۹۶۳ء کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ کل ملا کر ۱۰۸ اخبار، ۹ اخباری ایجنسیاں اور ۲۵ ریڈیو و ٹیلی ویژن ادارے اس کے ممبر ہیں۔ جاپانی اخباروں کو خبریں چھاپنے کی مکمل آزادی ہے۔ کسی بھی روزنامے کا کسی بھی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر ایک اپنی اپنی آزادانہ پالیسی پر گامزن ہے۔

خبریں نشر کرنے والی دو بڑی ایجنسیاں ہیں (۱) کیودو اور (۲) جی جی پریس۔ [illegible] غیر ملکی نامہ نگار جاپان میں [illegible]

جاپان میں اخباروں کے علاوہ ۲۲۰۴ کتبے یا اشاعتی ادارے ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں انھوں نے دو کروڑ سے زیادہ کتب کی اشاعت کی۔ جاپان میں شائع ہونے والے رسالوں کی تعداد ۵۸۰۴ ہے۔

اخباروں کے بعد ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ۱۹۶۲ء کے اخیر میں جاپان میں رجسٹرشدہ ۲۰ لاکھ ریڈیو سیٹ اور ۱۴ لاکھ ٹیلی ویژن سیٹ تھے۔ ریڈیائی نشریات جاپان میں ۱۹۲۵ء میں شروع ہوئی تھیں۔ آج جاپان میں ۲۶۸ ریڈیو سٹیشن ہیں۔ ٹیلی ویژن ۱۹۵۳ء میں شروع ہوا مگر آج وہاں ۲۰۷ ٹیلی ویژن اسٹیشن ہیں۔

ریڈیو کی کمرشل سروس کا آغاز ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ اس سے ملک کو ۲۰ کروڑ روپے سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے۔

امریکہ کے بعد جاپان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں ٹیلی ویژن پر رنگین پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ آج وہاں چار بڑے ٹیلی ویژن سٹیشن ہیں جہاں سے رنگین پروگرام پیش ہوتا ہے۔

ادب

جاپانی ادب بذاتِ خود ایک وجودِ کامل ہے۔ جاپانی ادب کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ جس طرح بھارت کے ادب میں دو پرانی کتابیں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یعنی جو اہمیت یہاں رامائن اور مہا بھارت کو ہے وہی جاپان کی دو پرانی کتب کو حاصل ہے۔ ایک کا نام ہے 'کوجی کی' اور دوسری 'نہن یوشو۔' یقین کیا جاتا ہے کہ پہلی کتاب کو ۷۱۲ء میں اور کتب دوم کو ۷۲۰ء میں لکھا گیا۔

نویں صدی اور اس کے بعد جاپانی ادیبوں نے جو ادب پیدا کیا اس میں غیر ملکی اثر شامل نہ تھا۔ انھوں نے جاپانی زبان کے حروف کو بھی آسان کرنے کی کوشش کی۔ پرانی قسم کے جاپانی حروف کو 'ہیراگانا' کہا جاتا ہے وہ پیچیدہ ہیں۔ آسان کئے گئے حروف کا نام 'کاتاکانا' ہے۔ انھیں سمجھنا مشکل نہیں۔

کہا جاتا ہے [illegible] پہلا ناول 'تاکے توری مونوگاتاری' [illegible] کے بعد گیارھویں [illegible]

صدی کا 'گینجی مونوگاتاری' ایک مشہور دیوان ہے جس میں عشقیہ نظمیں جمع کی گئی ہیں اور جو اس وقت کی شاہی زندگی کو بیان کرتی ہیں۔

بارھویں صدی میں اور اس کے ڈیڑھ سو سال تک رزمیہ نظمیں ہر دل عزیز ہوئیں۔ مگر عشقیہ نظموں کی ہر دل عزیزی میں بھی کوئی کمی نہ آئی۔

بعد ازاں تیرھویں صدی میں ایک ناول 'ہیکے مونوگاتاری' لکھا گیا جسے جاپانی ادب میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔

سولھویں صدی میں خانہ جنگی کا زور تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک ادب پیچھے رہ گیا مگر سترھویں صدی میں 'سائیکاکو' کے ناولوں اور 'چکامتسو مون زامون' کے ناٹکوں نے ایک نئی دنیا پیدا کر دی۔ ان ہی دنوں 'باشو' نے 'ہائیکو' کی طرز کے ادب کو ایک نئی صورت میں پیش کیا۔

انیسویں صدی میں مغربی تمدن و مغربی ادب نے ایک حملہ سا کر دیا جس کے نتیجے سے جاپانی ادب کو فائدہ بھی ہوا اور کچھ انتشار بھی پیدا ہوا۔ تاہم جاپانی ادب نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ مشہور و معروف ادیب 'اوگائی موری' اور 'سوسیکی ناتسومے' اسی ادبی انقلاب کی پیداوار تھے۔ اس ادبی انقلاب کی وجہ ہی سے شیکسپیئر، ٹالسٹائی، گیٹے کے نام جاپانی ادب میں رائج ہوگئے۔

آج مغربی ادب کا جاپانی ادب پر بڑا اثر ہے مگر پرانی نثر اور پرانی نظم کے ڈھنگ کی ہر دل عزیزی میں کوئی بھی فرق نہیں آیا۔ آج جاپانی ادیبوں کے قلم سے لکھے گئے ادبی پارے دوسرے ملکوں میں پہنچ رہے ہیں اور ان کے ترجمے دوسری زبانوں میں ہو رہے ہیں اور خاص کر انگریزی زبان میں تو بہت سے کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

ہنر اور فنِ مصوری

جاپانی مصوری دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس کی نزاکت اپنی مثال نہیں رکھتی۔ اس فن کے پرانے سے پرانے نمونے آپ کو جاپانی عجائب گھروں میں مل جائیں گے۔ نیز یہ کہنا صحیح ہوگا

کو بدھ مذہب کے نافذ ہونے کے بعد اس فن کو اور بھی عروج حاصل ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ۶۲۲ء سے ۷۴۴ء تک جاپان کے راجہ نے مہاراجہ اشوک کے نام پر اپنا نام "آسوکا" رکھا تھا۔ ان کے زیر سایہ جاپان میں بے شمار بدھ مندر بنائے گئے۔ "نارا" کا مشہور معروف "ہوریوجی مندر" اسی زمانے کا ہے۔ لکڑی کا بنا ہوا یہ مندر دنیا کی سب سے پرانی اور شاندار عمارت ہے جس کی بناوٹ کی مثال نہیں ملتی۔

بت تراشی پر بھی بدھ مذہب کا اثر تھا۔ بت تراشی میں سنجیدگی کا دھیان رکھا جاتا تھا۔ ۷۱۰-۷۹۴ء کے زمانہ میں کچھ تبدیلی آئی۔ ہنر میں سنجیدگی کی جگہ لطافت اور خوب صورتی نے لی۔ مگر ۷۹۴-۱۱۰۰ء کے زمانہ میں بدھ مذہب کی چھاپ تھی۔ ان کے نمونے "نارا" مندر کے آس پاس ملتے ہیں۔

بعد ازاں "شوگن" کے زمانہ میں جاپان میں بدھ مذہب کا اثر گھٹا۔ جو کوئی دو سو سال رہا۔ پھر "فوجی وارا" خاندان کا اثر بڑھا اور ساتھ ہی جاپانی فن میں بھی ایک نمایاں تبدیلی ہوئی۔ اس زمانہ میں نہ صرف بت تراشی میں جسمانی خوب صورتی کو ترجیح دی گئی بلکہ فن تعمیر کو بھی نازک بنایا گیا۔ اس کا نمونہ ہوؤ ڈو کا "ہوودو" ہال ہے۔ اس زمانے میں مصوری پر خاص دھیان دیا گیا۔ اسی زمانہ میں باتصویر رومانس کا آغاز ہوا۔

اس کے بعد ۱۱۹۲-۱۳۳۳ء "کاماکورا" کے زمانہ میں زین بدھ مذہب کا دور تھا۔ اس زمانہ کی بت تراشی میں اصل سے اصل ہو چیزیں پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔

۱۳۳۳-[illegible]ء کے زمانہ میں برش کے ساتھ کالی سیاہی سے [illegible] کا دور شروع ہوا۔ اس ڈھنگ کی تصویروں کو "سومی" کہا جاتا ہے۔

اب [illegible] "ٹوکوگاوا" زمانہ تھا جو ۱۶۰۳ء سے [illegible] تک رہا۔ اس زمانے میں فن مصوری نے جو ترقی کی اس کا اثر صنعت و حرفت پر بھی پڑا۔ اس سلسلہ میں کیوٹو کے [illegible] کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اس کا تعمیری

ڈھانچہ، اس کے اندر باغبانی کے نمونے اپنی مثال آپ ہیں۔

جاپانی لوگ خوبصورت چیزیں پسند کرتے ہیں۔ وہ ہنر اور فن کو اپنی زندگی کا ایک حصہ بنا لیتے ہیں۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ چاہے مصوری ہو یا کشیدہ کاری، دستکاری ہو یا بت تراشی، وہ اس میں نزاکت اور خوب صورتی بھر دیتے ہیں۔ جاپانی آرٹسٹوں کے فن کا کمال آپ کو دنیا کی ہر بڑی اور اہم گیلری میں دکھائی دے گا۔

مذہب

جاپانی باشندوں پر مذہب کا گہرا اثر ہے۔ وہاں لوگوں کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہے۔

اس وقت جاپان میں بدھ مذہب کا اثر زیادہ ہے۔ ۵۰ کروڑ باشندے بدھ مذہب کو مانتے ہیں۔ صرف چھ سات لاکھ کے قریب عیسائی مذہب کے پیروکار ہیں۔ ایک اور عقیدہ وہاں رائج ہے "شنتو پوجا"۔ یہ کوئی مذہب نہیں۔ یہ ایک طرح سے مقامی عقیدہ ہے جس کے مطابق شاہی خاندان اور ہر کسی کے آباواجداد کی پوجا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں فوجی حکام اس پر بہت زور دیتے تھے۔ اب جنگ کے بعد اس کا وہ زور نہیں رہا۔ پھر بھی عوام پر اس کا گہرا اثر ہے۔ یہ عقیدہ بدھ مذہب کے ساتھ ساتھ عوام کا ایک طرح سے مذہب بن چکا ہے۔

بدھ مذہب ہندوستان سے چھٹی صدی میں جاپان تک پہنچا اور اب تک وہاں کی اکثریت اس کی پیروکار ہے۔

سینما

سینما کا جاپان میں بول بالا ہے۔ پہلی جاپانی پکچر آج سے پچاس سال پہلے بنائی گئی۔ آج جاپان میں ۲۰۰۰ سینما گھر ہیں۔ اور سالانہ دیکھنے والوں کی تعداد ۷۰ کروڑ سے اوپر ہوتی ہے۔

وہاں کے فلم اسٹوڈیو دنیا کے اعلیٰ ترین اسٹوڈیو میں سے ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں وہاں ۵۳۰ پکچریں تیار کی گئیں۔ بہت سی

جاپانی فلمیں غیر ملکوں کو بھیجی جاتی ہیں اور کئی ایک بین الاقوامی مقابلوں میں اول انعام حاصل کر چکی ہیں۔

۱۹۶۱ء میں جاپان نے ۱۹۲۲ فلمیں غیر ملکوں کو بھیجیں اور صرف ۲۲۹ باہر سے منگوائیں۔

کھیل

جاپان میں ہر طرح کا مغربی کھیل کھیلا جاتا ہے، حالانکہ جاپانی روایتی کھیل 'سمو' 'جوڈو' اور 'کنیتیدو' بھی رائج اور ہر دل عزیز ہیں۔ جاپانی کھلاڑی ہاکی، فٹ بال، بیس بال، سائیکل دوڑ وغیرہ ہر کھیل میں آگے آگئے ہیں۔

جاپان ایک ایسا ملک ہے جس نے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی ہے اور یہ دکھا دیا ہے کہ ترقی کا میدان صرف مغربی لوگوں کے لئے ہی وقف نہیں۔ ایشیا اور ہندوستان کو جاپان سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔

صدیق نظر

نذرانہ

اس دھرتی سے دُور خلا میں اک روشن سیارہ
سوچ میں گم بیچارہ

دنیا والے شاید کل تک میرے گھر آئیں گے
مہماں بن جائیں گے
ان کا استقبال کرے گی کیسے میری الفت
نذرانہ میں کیا دوں گا!

میرے گھر میں کیا ہے بس لے دے کر کچھ ٹیلے ہیں
ریت ہی ریت ہے میدانوں کی
صحرا ہی صحرا ہے
پھول اور پھل کی باس نہیں ہے
امرت رس کی دھار نہیں ہے
پیاس بجھے گی کیسے!

لیکن ہاں جو میری ماں ہے
روز و شب بُنتی رہتی ہے
دودھ سا سُندر سُوت

سوچ رہا ہوں میرے جگ میں
جب دنیا والے آئیں گے
میں اس سندر سُوت کے کپڑے
نذر کروں گا ان کی
جس میں کوئی داغ نہ دھبہ
میل نہیں جنگ و نفرت کا
نرمل ہے جو گنگا جل سا
پاون ہے جو من مندر سا

اس دھرتی کے سُندر انساں
جب پہنیں وہ سُندر کپڑے
پریم کو اپنا دھرم بنائیں
پریم کی دنیا میں کھو جائیں!!

ع۔م

نئی کتابیں

حالی کے کاویہ سدھانت (ہندی)

مصنف :۔ ویش راج سنگھ بھاٹی ایم۔ اے۔ ناشر۔ کلاپرکاشن جی۔ٹی روڈ، آزادپور دہلی۔ قیمت چھ روپے۔ صفحات ۱۴۴

ہندی میں لکھی گئی اس کتاب کے ذریعہ ویش راج سنگھ بھاٹی نے ہندی قارئین کو اردو کے مایۂ ناز شاعر حالی اور اس کی شاعری سے روشناس کراکر ہندی اور اردو زبان کے شیدائیوں پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس سے نہ صرف ہندی ادب میں دل چسپی رکھنے والے حالی کی شاعری سے روشناس ہوں گے بلکہ ہندی اور اردو زبانیں ایک دوسرے کے قریب آئیں گی۔ اس کتاب میں قابل مصنف نے حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کے ایک حصّے کا ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ ایسی کتابوں کی ہمارے ملک میں انتہائی ضرورت ہے۔

سرقہ اور توارد

نریش کمار شاد پبلشر نیوتاج آفس پوسٹ بکس نمبر ۱۷۴۹ دہلی قیمت دو روپے پچیس پیسے۔

نریش کمار شاد کا یہ طویل مقالہ سرقہ اور توارد کے فرق کو ظاہر کرنے کی ایک قابلِ تحسین کوشش ہے۔ مقالہ بہت دل چسپ ہے اور اشعار کی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاد نے اس موضوع سے انصاف کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ان کی محنت اور جستجو قابلِ ستائش ہے۔ اس موضوع پر یہ حرف آخر بھی نہیں پھر بھی حرفِ معتبر ضرور ہے۔

شروعا نجلی

از کاوش بدری۔ ناشر مجلس مصنفین مدراس ۲۔ قیمت ایک روپیہ۔

کاوش بدری دکن کے ایک ابھرتے ہوئے نوجوان اردو شاعر ہیں۔ انھوں نے ایک طویل مسدس میں پنڈت جواہر لال نہرو کا مرثیہ لکھا ہے۔ ان کے بیان میں روانی اور تاثیر ہے اور مسدس کے جو خصوصیات ہیں وہ ان کی نظم میں ہمہ جہت موجود ہیں۔

قومی کتابیات

ناشر بھاشا وبھاگ۔ اترپردیش سرکار، لکھنؤ۔

مُدیر۔ بی۔ ایس کیشون۔ نائب مدیر۔ سید جمیل احمد۔ قیمت چار روپے پچاس پیسے۔

۱۹۶۲ء کی اردو مطبوعات کی یہ فہرست بڑی مفید ہے اور ریسرچ کا کام کرنے والوں کے کام کی چیز ہے۔

انوارِ حیات

نورالدہر مروش امراپور بمبئی اسٹیٹ کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر مرکز ادب بھوپال۔ قیمت ۷۵ پیسے۔

مختصر تاریخِ کشمیر

مترجم۔ محمد امین پنڈت۔ قیمت تین روپے۔

اصل تالیف فارسی میں مترجم کے والد مرحوم سیف الدین پنڈت ہے اور اس کا تاریخی نام معجز التواریخ ہے۔ کشمیر کی حال کی تاریخ اس کتاب میں شامل نہیں لیکن جو کچھ درج ہے وہ معتبر آخذ سے لیا گیا ہے۔ کتاب بڑی محنت سے لکھی گئی ہے اور قدیم راجاؤں کے اس کے بعد محمود غزنوی کی آمد اور حکومت سلاطین کشمیر کے حالات درج ہیں۔ ملنے کا پتہ :۔ مترجم، انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ سری نگر۔



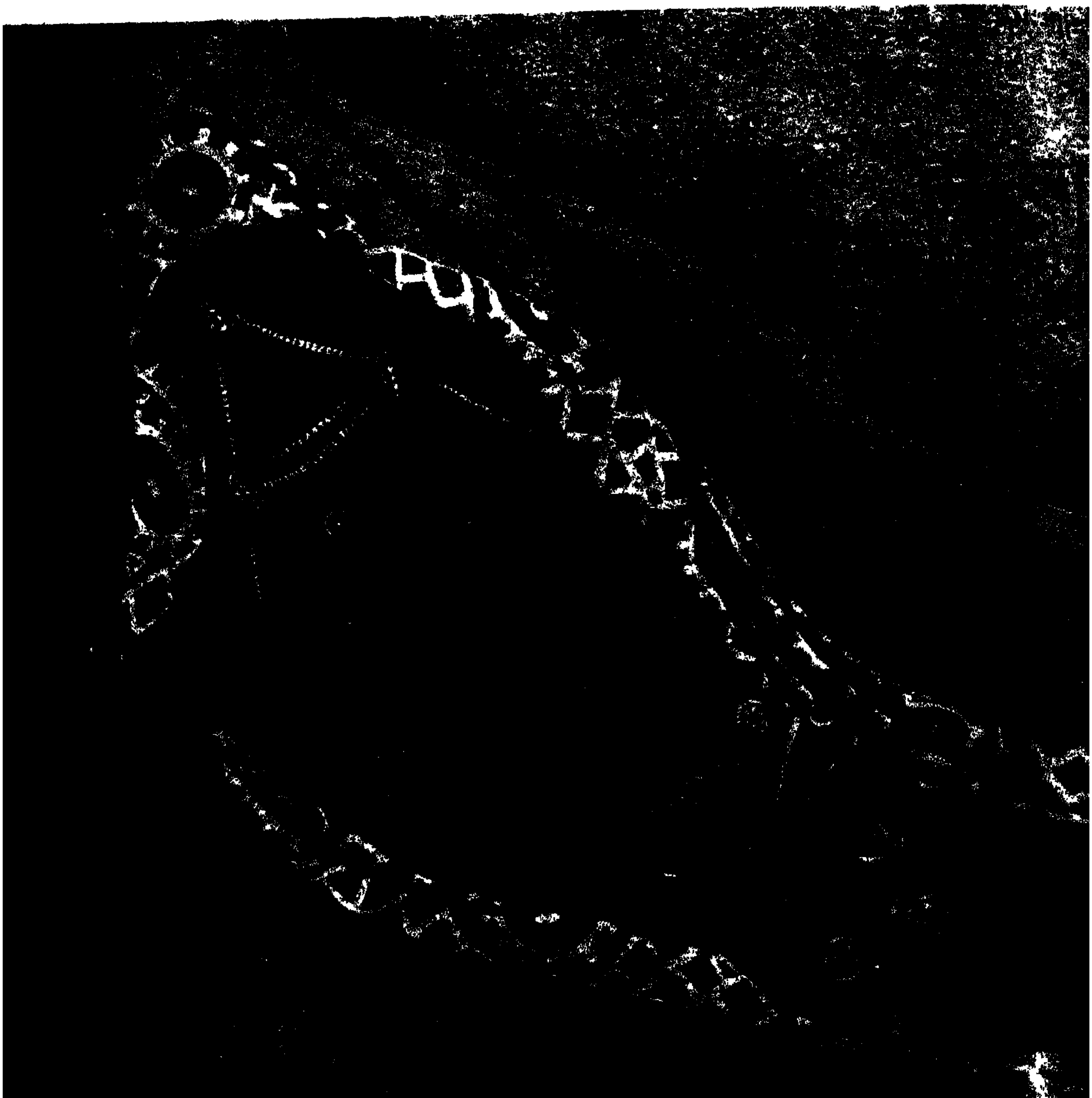
پھیرن



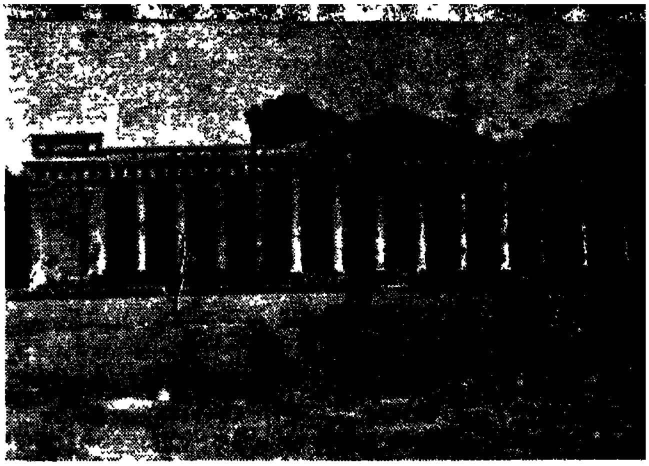
آجکل

۶۰ پیسے

ماگھ شک ۱۸۸۶
فروری سنہ ۱۹۶۵



فیض آباد



عجائب خانہ ولائبریری مان سنگھ



کچہری دیوانی



گلاب باڑی مقبرہ نواب شجاع الدولہ



ٹاؤن ہال فیض آباد

اردو کا مقبول عوام معتبر ماہنامہ

آج کل دہلی

ترتیب

مجلس ادارت

محمد مجیب	جامعہ ملیہ دہلی
گوپی ناتھ امن	دہلی
خواجہ احمد فاروقی	دہلی
عبدالقادر سروری	سری نگر

یو۔ ایس موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن

ششنکر دیال ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)

جی نجنا ناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)

بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو (سیکشن)

مدیر مسئول

اسسٹنٹ ایڈیٹر:۔ شہباز حسین

سرورق:۔ دلہن

سرورق کی پشت پر:۔ فیض آباد میں مقبرۂ بہو بیگم (امتہ الزہرا خانم عرف بہو بیگم زوجۂ نواب شجاع الدولہ)

سالانہ چندہ:۔
ہندوستان میں:۔ سات روپے
پاکستان میں:۔ سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے:۔ ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ
ہندوستان میں:۔ ۶۰ پیسے
پاکستان میں:۔ ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے اشلنگ یا ۱۵ سینٹ

جلد ۲۶ - نمبر ۷

ماگھ شک سنہ ۱۸۸۹

فروری ۱۹۶۸ء

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

خط و کتابت کا پتہ
... اردو، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

خوراک کا مسئلہ بڑی نازک صورت اختیار کر گیا ہے۔ اناج کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور ملک کے کئی حصوں میں ہیجان اور افراتفری کا عالم ہے۔ لیکن اعداد و شمار کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں یہ مسئلہ اناج کی کمی کا نہیں بلکہ کسانوں، تاجروں اور عوام کے غلط طرزِ عمل کا ہے۔

۱۹۶۳-۶۴ء میں ۳۴۹۶ء۷ کروڑ ٹن اناج پیدا ہوا جبکہ ۱۹۶۲-۶۳ء میں یہ مقدار ۴۴ء۷ کروڑ ٹن تھی۔ چاول کی پیداوار بھی ۱۹۶۳-۶۴ء میں پچھلے تمام ریکارڈ مات کر گئی اور ۳ء۶۶ کروڑ ٹن تک پہنچ گئی۔ اس سال ۴۰ء۶ لاکھ ٹن گندم دوسرے ملکوں سے درآمد کر رہے ہیں جبکہ گزشتہ سال اور اس سے پہلے یہ مقدار ۷۱ء۴ لاکھ ٹن رہی ہے۔ آبادی میں اضافے کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی ملک میں خوراک کی کمی نہیں ہونی چاہیئے۔ اب اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ظاہرا طور پر خوراک کی جو کمی نظر آ رہی ہے اس کی ذمہ داری یا تو ان بڑے بڑے کسانوں پر ہے جنہوں نے اپنی پیداوار کو منڈی میں لے جانے سے روک رکھا ہے یا ان تاجروں پر ہے جو اناج کے بڑے بڑے اسٹاک اس غرض سے دبائے ہوئے ہیں کہ قیمتوں میں اضافہ ہو اور ان کو زیادہ منافع ملے۔

حکومت اس قسم کے وطن دشمن لوگوں کے خلاف ضروری کارروائی کر رہی ہے اور اس سلسلے میں ایک آرڈی نینس بھی جاری کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں صورتِ حال کو بہتر بنانے کا فرض حکومت پر عاید ہوتا ہے وہاں عوام کی ذمہ داری بھی ہے۔ ہمیں ہر طریقے سے اناج کو ضائع ہونے سے بچانا چاہیئے۔ بڑی بڑی دعوتوں سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اناج جمع نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اتنا ہی خریدنا چاہیئے جتنا فوری طور پر ضروری ہو۔

نئی فصل کے آنے تک ہمیں امید ہے کہ صورتِ حال بہتر ہو جائے گی۔

مقامِ مسرت ہے کہ دارالمصنفین اعظم گڑھ نے خدمتِ علم و ادب کے پچاس سال ختم کر لئے ہیں۔ اس ادارے کا جشنِ طلائی ماہ فروری ۱۹۶۵ء میں منایا جا رہا ہے۔ اس ادارے نے اردو علم و ادب اور تاریخ و فلسفہ کی بہت بڑی خدمت کی ہے اور یہاں کے مطبوعات دنیائے ادب میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ سب سے قابلِ فخر بات یہ ہے کہ اس ادارے کے بانی مولانا شبلی نعمانی کے بعد جتنے بھی کارکن آئے ہیں انھوں نے ادب کی بے لوث خدمت کی ہے۔

انسدادِ رشوت ستانی کے باب میں حکومت کے اقدامات مؤثر ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس مرض سے ہماری سوسائٹی کو شفا مل گئی ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اعمالِ ... [illegible]

[illegible]

آر کے گل دہلی

غالب کا ایک نیا خط

غالب کے فارسی دیوان میں ایک قصیدہ سر چارلس تھیوفلس مٹکاف[1] کی مدح میں ہے، جو انھوں نے ۱۸۳۵ء میں ممدوح کی خدمت میں پیش کیا تھا[2] (قصیدہ ۳۵)

سر چارلس بیٹے تھے، ٹامس تھیوفلس مٹکاف کے، جو اوّل بنگال کی انگریزی فوج میں میجر کے عہدے پر فائز رہے اور بعد کو ترقی کرکے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹر بن گئے تھے۔ اسی زمانے میں انھیں سر اور بیرونٹ کا خطاب بھی ملا۔

مسٹر ٹامس کے چار بیٹے تھے۔ سب سے چھوٹے (ہنری) کا صغر سنی میں انتقال ہوگیا، البتہ تین ان کے بعد زندہ رہے۔ سب سے بڑے تھیوفلس جان مٹکاف تھے (ولادت ۱۹ ستمبر ۱۷۸۳ء) یہ ملازمت کے سلسلے میں چین گئے۔ یہاں ان کا بیشتر قیام کانٹن میں رہا۔ یہیں [illegible] اگست ۱۸۲۲ء کو ان کا انتقال ہوا۔

دوسرے بیٹے یہی غالب کے ممدوح سر چارلس تھیوفلس مٹکاف تھے۔ یہ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہوکر یہاں ہندوستان آئے (۱۸۰۱ء)۔ انھوں نے بہت عروج حاصل کیا۔ مدتوں دلّی اور حیدرآباد میں ریذیڈنٹ رہے، اور ۱۸۲۷ء میں گورنر جنرل کی کونسل کے رکن بن کر کلکتے پہنچے۔ جب لارڈ ولیم بنٹنک[3] گورنر جنرل بہت بیمار ہوگئے اور فروری ۱۸۳۵ء میں انھیں صحت کی بحالی کے لیے دکن کے پہاڑی مقام نیلگری جانا پڑا، تو ان کی غیرحاضری کے زمانے میں سر چارلس نائب صدر مقرر ہوئے۔ غالب کے ان سے تعلقات اس زمانے سے تھے، جب یہ دلّی میں ریذیڈنٹ تھے۔ اب یہ حکومت مرکزی کے نائب صدر مقرر ہوئے، تو انھوں نے یہ قصیدہ ان کی خدمت میں گزرانا۔

جب آب و ہوا کی تبدیلی سے بھی لارڈ ولیم بنٹنک کی صحت بہتر نہ ہوئی تو وہ مارچ ۱۸۳۵ء میں اپنے عہدے سے مستعفی ہوکر ولایت چلے گئے۔ اب کونسل کے رکنِ اعلیٰ کی حیثیت سے سر چارلس ان کی جگہ قائم مقام گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ سال بھر بعد ۱۸۳۶ء میں لارڈ آک لینڈ[4] مستقل گورنر جنرل مقرر ہوکر یہاں آئے، تو سر چارلس صوبۂ غرب و شمال (حال یوپی) کے لفٹنٹ گورنر مقرر ہوئے اور صوبے کا صدر مقام الٰہ آباد کی جگہ آگرہ قرار پایا، لیکن ایک اختلاف کی بنا پر انھوں نے ۱۸۳۸ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ولایت واپس چلے گئے۔ اس کے بعد یہ جمیکا کے

---

[1] Sir Charles Theophilus Metcalfe

[2] کلیاتِ فارسی [illegible] قصیدہ [illegible] کی مدح میں تھا، جس میں [illegible] سر چارلس سے منسوب کر دیا۔

[3] Lord William Cavendish Bentinck

[4] Eden George, Earl of Auckland

[illegible] اور کینیڈا کے گورنر جنرل رہے۔ ان کا دسمبر ۱۸۴۶ء [illegible] میں ولایت میں انتقال ہوا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کمپنی کی پوری تاریخ میں سر چارلس مٹکاف کی سی غیر معمولی قابلیت، دیانتداری، دور اندیشی، احساس فرض کے بہت کم افسر ہندستان آئے۔[۱]

[illegible] بھائیوں میں سب سے چھوٹے ٹامس تھیوفیلس مٹکاف[۲] تھے جن کا نام اپنے والد کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہ ۲ جنوری ۱۷۹۵ء کو لندن میں پیدا ہوئے اور کمپنی کی ملازمت میں داخل ہو کر ۳۰ اپریل ۱۸۱۳ء کو ہندستان آئے۔ تین مہینے تک کلکتے میں کام کرنے کے بعد ان کا تبادلہ دلی ہو گیا۔ ان دنوں یہاں ان کے بڑے بھائی سر چارلس ریذیڈنٹ تھے۔ ٹامس ان کے نائب مقرر ہوئے۔ جب سر چارلس ۱۸۱۹ء میں گورنر جنرل کے دفتر میں کلکتے چلے گئے، تو ان کے [illegible] ٹامس نے بھی ریذیڈنسی چھوڑ دی اور [illegible] علاقہ کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے نائب بن گئے۔ اس عہدے پر انھوں نے [illegible] کام کیا اور ۱۸۲۶ء میں اسی محکمے میں ان کی ترقی ہو گئی۔ پانچ برس بعد اپریل ۱۸۳۱ء میں وہ دلی کے مرکزی دفتر [illegible] میں قائم مقام کلکٹر مقرر ہوئے اور اگلے برس فروری ۱۸۳۲ء میں مستقل کلکٹر ہو گئے۔ وہ یہاں [illegible] ۱۸۳۵ء تک رہے۔ اسی سال مارچ ۱۸۳۵ء میں ریذیڈنٹ اور گورنر جنرل کے ایجنٹ ولیم فریزر کو ایک میواتی کریم خاں نے قتل کر دیا۔ [illegible] ٹامس [illegible] کریم خاں ہی کو پھانسی [illegible] نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروز پور جھرکہ [illegible]۔ فریزر کے بعد ٹامس مٹکاف ان کی جگہ ریذیڈنٹ اور ایجنٹ [illegible] گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے اور اپنی وفات تک ۲۰ برس کے طویل زمانے کے دوران میں یہ فرائض سر انجام دیتے رہے۔ اسی زمانے میں انھیں بہادر شاہ کی طرف سے "معظم الدولہ، امین الملک، اختصاص یار خاں، فرزند ارجمند، فیروز جنگ" کا خطاب عطا ہوا۔ جب بڑے بھائی کی وفات پر ۱۸۴۶ء میں خاندانی خطاب بیرونٹ ملا، تو اب یہ سر ٹامس تھیوفیلس مٹکاف بن گئے۔

پرانی دلی میں جمنا کے کنارے کا مٹکاف ہاؤس اپنی سر ٹامس نے اپنی اور اپنے خاندان کی سکونت کے لیے تعمیر کیا تھا۔ اس عمارت کے تیار ہونے کی ٹھیک تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔ ایک مصنف[۳] ۱۸۳۰ء کے قریب لکھتا ہے، دوسرا[۴] ۱۸۳۵ء اور ایک اور[۵] ۱۸۴۴ء۔ اس زمانے کا عام رواج یہ تھا کہ انگریز یہاں سے ہر طرح کا سامان وغیرہ چھوڑ کر انگلستان لے جاتا تھا۔ اس کے برعکس سر ٹامس اس مکان کی ترتیب و تزئین کے لیے اپنا تمام خاندانی فرنیچر اور اثاث البیت ولایت سے یہاں دلی لے آئے تھے۔ اس مکان کے علاوہ انھوں نے ایک مکان قطب میں بھی تیار کروایا تھا۔ یہ دراصل اکبر کے کوکا محمد قلی خاں کا مقبرہ تھا[۶]۔ انھوں نے اس کی مرمت کروائی اور بعض حصوں میں مناسب تبدیلی کے بعد اسے رہنے کے قابل بنا لیا۔ اس کا نام انھوں نے "دلکشا" رکھا تھا۔

سر ٹامس کا [illegible] دلی میں ۳ نومبر ۱۸۵۳ء کو انتقال ہوا۔

---

[۱] یہ سب حالات سر چارلس کی تصنیف Life and correspondence of Charles Lord Metcalfe لندن (۱۸۵۴) [illegible] سے ماخوذ ہیں۔

[۲] Thomas Theophilus Metcalfe

[۳] Twilight of the Mughuls [illegible] کیمبرج، (۱۹۵۱) ص ۱۰۲

[۴] Delhi [illegible] (۱۹۲۰) ص ۱۵۰

[۵] Garden [illegible] (۱۹۴۴) [illegible]

[illegible]

کے خاندان میں یہ روایت چلی آرہی ہے[۱۲] اور دلی میں بھی ان کے بارے میں یہ عام افواہ تھی کہ یہ خاندانِ شاہی کے ولی عہدی کے جھگڑوں کا شکار رہے۔

مغلوں میں سب سے پہلے شاہ عالم ثانی نے انگریزوں سے وظیفہ لینا قبول کیا اور اس طرح گویا ان کی ملک کے انتظامی معاملات اور شاہی خاندان کے نجی حالات میں مداخلت قبول کر لی۔ شاہ عالم کے بعد اکبر شاہ ثانی تک تو کوئی بات نہیں ہوئی، لیکن اب انگریزوں نے اتنا اقتدار حاصل کر لیا تھا کہ ان کی مرضی کے بغیر ولی عہد تک مقرر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مدتوں میرزا جہانگیر اور میرزا ابوظفر (بہادر شاہ ظفر) کے درمیان ولی عہدی کی کشمکش رہی۔ وہ تو حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا اور میرزا جہانگیر نے بھی پے در پے بعض ایسی حرکات کیں کہ انگریزوں نے اسے رد کر دیا اور پھر اس کا انتقال ہو گیا، ورنہ بہادر شاہ کے بادشاہ بننے کا امکان کم ہی رہ گیا تھا۔

یہی صورت خود بہادر شاہ کے عہد میں پیش آئی۔ جب میرزا دارا بخت ولی عہد کا جنوری ۱۸۴۹ء میں انتقال ہو گیا تو بہادر شاہ چاہتے تھے کہ اب ان کے سب سے چھوٹے بیٹے میرزا جواں بخت[۱۳] ولی عہد تسلیم کر لیے جائیں، جو ان کی چہیتی ملکہ زینت محل کے بطن سے تھے۔ اس وقت ان کی عمر مشکل سے نو برس کی تھی۔ سر ٹامس مٹکاف نے بحیثیت ریزیڈنٹ اس تجویز کی سفارش نہ کی اور صدر میں اس کے خلاف رائے لکھ کر بھیج دی۔ ملکہ زینت محل قدرتی طور پر اس باعث ان سے سخت ناراض تھیں۔ عام شبہہ یہ تھا کہ زینت محل نے انھیں کھانے میں زہر دلوا دیا ہے۔[۱۴]

(۲)

غالب کو اپنے چچا میرزا نصر اللہ بیگ خان مرحوم کی خدمات

---

[۱۲] (مخطوطہ) از میری سٹوارٹ Family Records ... مٹکاف کی بیٹی۔ موجودہ انڈیا آفس لائبریری، لندن

[۱۳] ... کی شادی پر غالب اور ذوق نے اپنے ...

کے صلے میں انگریزی سرکار سے جو پنشن ملتی تھی، اسے وہ دلی ریزیڈنسی سے وصول کرتے تھے، اس لیے لازماً انھیں یہاں کے سارے عملہ و فلو سے میل جول رکھنا پڑتا تھا، خاص طور پر جو ریزیڈنٹ بھی یہاں آتا، وہ اس سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیتے تھے۔ جب ٹامس مٹکاف ریزیڈنٹ مقرر ہوئے تو انھوں نے ان سے بھی مراسم بڑھائے۔ میرا خیال ہے کہ وہ انھیں جانتے تو پہلے سے ہوں گے، کیونکہ وہ ان کے بڑے بھائی سر چارلس کو اچھی طرح سے جانتے تھے اور ان کے پیشرو ولیم فریزر سے بھی ان کی دوستانہ راہ و رسم تھی۔

غرض غالب نے مندرجہ ذیل مدحیہ قطعہ ٹامس مٹکاف کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا:

"بحضور معظم الدولہ، امین الملک، اختصاص یار خاں، فرزند دلبند ارجمند، بجانِ پیوند سلطانی بارنٹ ٹامس تھیافلس مٹکف صاحب بہادر فیروز جنگ"

امینِ ملک و ممالک معظم الدولہ   امیرِ شاہ نشان و کریم ایر نوال
مراں بہ معرکہ فیروز جنگ خوانندش   زہے بطالع فیروز خویش فرخ فال
ستودہ مٹکف و فرزانہ تھیافلس ٹامس   ریاضِ شان و شکوہ و بہارِ جاہ و جلال
آثرِ قلمش نورِ دیدۂ دولت   مکارمِ کرمش روحِ قالبِ اقبال
ز ترکتازِ سوارانِ موکبِ جاہش   بسانِ سبزہ شود چرخِ نیلگوں پامال
بہ منظرش چہ زنی دم ز نیرِ رخشاں   کہ آں ولی حسرتِ ہوا ماند تشنہ اندیں بال
کدام نیرِ رخشاں کہ خود ز منظرِ او   پدید گشتہ در آئینۂ فلک تمثال
زہے عطائے تو کشافِ عقدۂ حاجات!   خجے نگاہ تو دمّابِ صورتِ آمال!

---

[۱] سر ٹامس مٹکاف کے حالات ان کتابوں سے ماخوذ ہیں: (۱) بنگال سول سرونٹس (۱۷۹۰ء۔ ۱۸۴۲ء) از ڈاڈویل و مائلز،
(۲) Burke's Peerage and Baronetage (۱۹۴۹ء)
(۳) Twilight of the Mughuls (ایڈیشن) ص ۱۳۷، از پیرسیوال سپیر ص ۱۵۶۔۱۴۳ — قومی دفتر خانہ ہند، نئی دلی میں حوالہ اور ماخذ کی تلاش میں جناب اکبر علی ترمذی نے میری بہت مدد کی ہے جس کے لیے ان کا شکریہ مجھ پر واجب ہے۔

نہ بیندچشم روزگار افسانہ داور م · قضا نگیرد تمام نگرود بہ وہم و خیال
گر خدا سے جہان آفریں بشوکت و جاہ · بیافریدہ ترا در جہان عدیل و مثال
یکے منم ز سیاد ماہ فرق کلام · یکے منم ز سپہر اوج کمال
گر چنانچہ بمدحت تو آوردم ، فرمایم · زبان زنکتہ سرائی چنان کہ گردد لال
بہ آنکہ و تو گرزآسمان دروحنش · بہ کلام بستن تحفہ دعا ارسال
تراکہ رونق این گلشن ، مبارک باد · طرب فزائی پیوند میوہ نہال
ثمر فشانی این نخل بینی و بجہان · زنخل عیش و طرب برخوری ہزاران سال
عرضہ اشت نجم الدولہ ، دبیر الملک ، اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ غالب تخلص"۔

اب انھیں فکر ہوئی کہ اس قطعے کو بجنسہ و خوبی کسی خوش نویس سے لکھوا کر ممدوح کی خدمت میں گزرانا جائے۔ اس مقصد سے انھوں نے حکیم غلام نجف خان کو یہ خط لکھا[1]:

"... صاحب، یہ پندرہ بیتیں ہیں۔ تقسیم اس کی اسی طرح رکھنا کہ پہلے ایک سیدھی سطر میں صاحب ایجنٹ کا نام مع اجزائے خطابی بخط نستعلیق لکھا جاوے، اور پھر ترچھی پانچ پانچ بیتیں تین بار لکھی جاویں، اور آخر کو یہی سطر جو میں نے اپنے نام کی مع خطاب و تخلص لکھ دی ہے جس طرح کہ ہے اسی طرح لکھی جاوے، کاغذ البتہ بڑا ہوگا، اور تقسیم اچھی طرح کیا جاویگا۔ ان دو سطروں اور پندرہ شعر پہ قطعہ بہت اچھی ہوگی۔ یہ ایک نمونہ ہے اگر نمونہ اچھا ہے۔ تم کسو شخص سے اس کی نقل کرواؤ اور کاتب خوش نویس یعنی مرزا عباد اللہ بیگ سے لکھواؤ۔ اب آپ اس کو جلد تیار کروائیے اور .... آپ کو اب کے مہینے ہی میں ملیگا۔
والسلام ..."

اور اس کے ساتھ اپنے ہاتھ سے مندرجہ صدر قطعہ لکھ کر انھیں بھیجا کہ اسے میرزا عباد اللہ بیگ سے لکھوا دیجئے۔ میرزا عباد اللہ بیگ اس دور کے مشہور خوش نویس میر محمد امیر پنجہ کش کے شاگرد تھے۔ میر پنجہ کش کے شاگردوں میں سے ان دو شخصوں نے بہت نام پیدا کیا۔ ایک ارمنی النسل آغا میرزا جنھیں اعتماد الدولہ کہتے ... میرزا عباد اللہ بیگ نے۔ آغا میرزا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک "گلستان" ... کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ روایت ہے کہ اس پر آغا کے پندرہ برس اور بہادر ابراہیم کا سوالاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا[2]۔ اس نسخے کے لیے غالب نے تاریخ لکھی تھی، جو میرے مرتب کردہ نسخہ سبد چین میں شامل ہے۔ میرزا عباد اللہ بیگ کے والد میرزا عبد اللہ بیگ تھے۔ میرزا عباد اللہ بیگ کے معاصرین نے ان کے کمال کا اس طرح اعتراف کیا کہ دربار شاہی سے انھیں 'زمرد رقم' خطاب ملا، اور دوست ان کے نام کے ساتھ 'اعجاز رقم' بطور لقب لکھتے تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دلی سے ترک وطن کر کے پٹیالے چلے گئے تھے۔ وہیں پچھلی صدی کے آخر میں انتقال کیا۔ میں نے ان کی لکھی ہوئی متعدد وصلیاں دیکھی ہیں۔ بہت پختہ اور دیدہ زیب خط ہے۔ ان کی ایک وصلی نئی دلی میوزیم میں بھی ہے۔

(۳)

اس خط کی آخری دو سطریں مخدوش ہیں۔ اگر میرزا نے اس کے آخر میں تاریخ لکھی تھی، تو وہ بھی مٹ گئی۔ لیکن اندرونی شہادت کی بنا پر اس کی کتابت کے زمانے کی حدود معین کی جاسکتی ہیں۔

(۱) ٹامس مٹکاف کا انتقال نومبر ۱۸۵۳ء میں ہوا۔ اس لیے لازماً یہ خط اس سے پہلے کا ہے۔

(۲) لکھتے ہیں: صاحب ایجنٹ کا نام مع اجزائے خطابی بخط نستعلیق لکھا جاوے۔

ٹامس مٹکاف، جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں، ایجنٹ لیفٹیننٹ گورنر ...

---

[1] یہ خط ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوا۔

[2] مجموعہ خوش نویساں، باہتمام اقبال احمد شاہ ... ۱۹۰۶ء
[3] ایضاً، ص ۱۲۷

کی وفات کے بعد ریزیڈنٹ اور ایجنٹ مقرر ہوئے تھے۔ پس یہ خط مارچ ۱۸۳۵ء اور نومبر ۱۸۵۳ء کے درمیان کسی وقت لکھا گیا۔

(۳) قطعے کے عنوان میں غالب نے ٹامس تھیافلس مٹکاف کے نام سے پہلے ان کا خاندانی خطاب 'بارنٹ' بھی لکھا ہے۔ یہ انھیں اپنے بڑے بھائی سر چارلس تھیافلس مٹکاف کی وفات (۱۶ دسمبر ۱۸۴۵ء) کے بعد ورثے میں ملا تھا۔ پس یہ خط ۱۶ دسمبر ۱۸۴۵ء اور ۳ نومبر ۱۸۵۳ء کے درمیانی زمانے میں لکھا گیا۔ اس خط کی صحیح تاریخ معلوم کرنے کا ایک اور قرینہ بھی ہے، لیکن افسوس کہ میں اسے استعمال نہیں کر سکتا۔ اس کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ شاید کوئی اور صاحب یہ کام کر سکیں۔ وھوہذا:-

قطعے کے آخری دو شعر ہیں:-

ترا کہ رونق این گلشنی مبارک باد — طرب فزائی پیوند نو دمیدہ نہال
ثمر فشانی این نخل بینی و در جہان — زنخل عیش و طرب برخوری ہزاران سال

بظاہر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ قطعہ اس موقعے پر لکھا گیا جب مسٹر ٹامس مٹکاف کے گھر میں کوئی بچہ پیدا ہوا ہے۔

مسٹر ٹامس کی اولادِ نرینہ صرف دو لڑکے تھے (۱) سر جان تھیوفلس مٹکاف۔ یہ ۲۲ نومبر ۱۸۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ (۲) چارلس تھیوفلس مٹکاف۔ ان کی تاریخ ولادت ۲۷۔ اگست ۱۸۳۶ء ہے۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ خط دسمبر ۱۸۴۵ء کے بعد لکھا گیا تھا، پس ان شعروں میں ان دونوں بیٹوں میں سے کسی کی طرف اشارہ نہیں ہو سکتا۔

ان دو بیٹوں کے علاوہ ان کی تین بیٹیاں بھی تھیں (نام لکھنے کی ضرورت نہیں) یہی ممکن ہے کہ ان میں سے کسی کی ولادت کی تقریب میں یہ قطعہ کہا گیا ہو، لیکن پوری کوشش کے باوجود مجھے ان میں سے کسی کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ہو سکی۔

بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ یہ خط ۱۶۔ دسمبر ۱۸۴۵ء کے بعد اور ۳ نومبر ۱۸۵۳ء سے پہلے کسی تاریخ کو لکھا گیا۔

(۴)

اس خط کے مکتوب الیہ حکیم غلام نجف خاں سے غالب کے بہت گہرے تعلقات تھے۔ یہ بڑے عالی خاندان شخص تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچتا ہے۔ ان کے اجداد میں ساتویں پشت میں نواب قطب الدین خان عہد اکبری میں بہار کی صوبہ داری پر متمکن تھے اور جہانگیر کے زمانے میں بنگال اور اڑیسہ کے صوبہ دار رہے۔ اسی عہد میں انھیں پنج ہزاری ذات اور سوار کا منصب بھی ملا۔ ان کے بیٹے فرید بھی عہد جہانگیر کے نامور امیر ہیں، وہ بھی پنج ہزاری ذات اور پنج ہزاری سوار کے منصب سے سرفراز تھے۔ جہانگیر نے ان کی درخواست پر موضع مولیا (ضلع بدایوں) میں چار ہزار بیگہ زمین انھیں عطا فرمائی۔ شیخ فرید نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا اور اس کا نام بادشاہ کے نام پر شیخو پور رکھا۔ جہانگیر کا اصلی نام سلیم تھا، جو اکبر نے شیخ سلیم چشتی رح سے اپنی ارادت اور عقیدت کے اظہار کے لیے بطور تفاؤل رکھا تھا، لیکن وہ اسے ازراہِ ادب سلیم کی بجائے شیخو کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ شیخ فرید نے بھی اب اس نئی بستی کا نام اسی مناسبت سے شیخو پور رکھا۔

حکیم غلام نجف ۵۔ اکتوبر ۱۸۰۷ء (۲ شعبان ۱۲۲۲ھ) بروز پنج شنبہ پیدا ہوئے[۱۸] ان کے والد کا نام حافظ محمد مسیح الدین تھا اور وہ شیخو پور کے عمائد میں سے تھے۔ غلام نجف پانچ برس کے سن میں اپنے خالو میر سید علی کے ساتھ دلی آئے اور اس کے بعد گویا یہیں کے ہو رہے۔ تعلیم و تدریس کی عمر کو پہنچے تو طب پر توجہ کی۔ اس علم کی کتب درسیہ کی تحصیل و تکمیل حکیم شریف خاں کے فرزند رشید حکیم صادق علی خاں[۱۹] سے کی۔ اور نسخہ نویسی اور

---

[۱۸] مکتوب سید فرخ جلالی بنام راقم

[۱۹] یہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے دادا تھے۔

علمی مباحث کی مشق اور مہارت احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان سے بہم پہنچائی۔ سر سید احمد خان صرف اتنا لکھ کر رہ گئے ہیں کہ "ان کو حاذق الملک دبیر حکیم احسن اللہ خان سے قرابت قریبہ بھی تھی" لیکن خود حکیم غلام نجف خان کے خاندان کی یہ روایت ہے[20] کہ ان کا حکیم احسن اللہ خان کی ہمشیرہ سے نکاح ہوا تھا۔ غالباً سر سید کا اشارہ بھی اسی طرف ہے۔ خاندانی روایت کے مطابق یہ شادی ۱۰ فروری ۱۸۴۳ء کو ہوئی تھی۔ غالب سے انھوں نے فارسی پڑھی تھی۔

حکیم غلام نجف خان اپنے زمانے کے مشہور اطبّا میں سے تھے۔ انھیں دربار شاہی میں بھی بار حاصل تھا اور بہادر شاہ ظفر کی طرف سے انھیں "عضد الدولہ حکیم غلام نجف خان بہادر" کا خطاب ملا تھا۔[21]

ان کی ایک طبی کتاب "نزہت العاشقین" کے عنوان سے مطبع ہاشمی میں ۱۸۶۰ء میں طبع ہوئی تھی۔ یہ مرض سوزاک سے متعلق ہے۔

غالب کے مکتوب الیہم میں ایک صاحب حکیم ظہیر الدین احمد بھی ہیں اور ان کے نام کا ایک خط چھپ چکا ہے[22] یہ انھی حکیم غلام نجف خان کے بیٹے تھے۔ راشٹرپتی کے سابق طبیبوں میں ایک حکیم ناصر الدین خان (عرف چھوٹے میاں) تھے، یہ حکیم ظہیر الدین کے پوتے (اور شفاء الملک حکیم رضی الدین خان کے بیٹے) تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

خطوط غالب میں حکیم غلام نجف خان کے نام کے ۲۳ خط ملتے ہیں، لیکن ان میں سے ایک یعنی نمبر ۹[23] غالباً ان کے نام کا نہیں اور غلطی سے ان سے منسوب ہو گیا ہے۔ اس کے بعد دو خط اور ان کے نام کے ملے، جو غلطی سے عبدالحق کے نام سے چھپ رہے ہیں[24] موجودہ خط کو ملا کر اب گویا ان کے نام کے خطوں کی تعداد ۲۵ ہو گئی، اور اسے بلحاظ ترتیب سب مطبوعہ خطوں سے پہلے جگہ ملنا چاہیے۔

---

[20] مکتوب سید فرخ جلالی بنام راقم

[21] یہ تمام حالات "آثار الصنادید" (سر سید احمد خان) اور "واقعات دار الحکومت دہلی" از بشیر الدین احمد جلد دوم سے ماخوذ ہیں۔

[22] اردوئے معلی، ص ۴۷، (مطبع مجیدی، لاہور، ۱۹۲۲ء)

[23] خطوط غالب (۱)، ص ۲۷۸-۲۷۹ (سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ۱۹۴۷ء)

[24] اردو (دلی)، اپریل ۱۹۴۲ء (دو خط)، نیز غالب کی نادر تحریریں (خلیق انجم)، ص ۱۳۱-۱۴۹، جہاں یہ خط اردو سے نقل ہوئے ہیں۔

غزل

سلام سانگری

بُت خانہ رہے گا نہ حرم یاد رہے گا
سجدوں کو ترا نقش قدم یاد رہے گا

کب تک یہ ستم اور یہ کرم یاد رہے گا
تم یاد دلاتا ہمیں کم یاد رہے گا

کر دوں گا ہر اک گردشِ دوراں کو فراموش
جو تم نے دیا ہے وہی غم یاد رہے گا

ہم جامِ سفالیں کو نہ بھولیں گے ابد تک
جمشید کو پیمانۂ جم یاد رہے گا

کیا طاقِ حرم کیا کسی بُت خانے کی محراب
مجھ کو تری انگڑائی کا خم یاد رہے گا

چھوٹے گی نظر کیا تری محفل کی بہاریں
افسانۂ گلزارِ ارم یاد رہے گا

انجام میں ناداریٔ گل دیکھ رہا ہوں
غنچے تری مٹھی کا بھرم یاد رہے گا

وہ محو کریں گے نہ کبھی میری وفائیں
مجھ کو بھی سلام ان کا ستم یاد رہے گا

نیّر مسعود رضوی

غالبؔ اور مرزا رجب علی بیگ سرورؔ

مرزا رجب علی بیگ سرور کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انتزاعِ سلطنتِ اودھ سے پہلے وہ دہلی گئے تھے۔ "تذکرۂ غوثیہ" میں سیّد غوث علی شاہ پانی پتی کا یہ بیان ملتا ہے کہ دہلی میں سرور مرزا غالب سے ملنے گئے اور دورانِ گفتگو میں "فسانۂ عجائب" کی زبان کے متعلق ان کی رائے پوچھی۔ غالب کو معلوم نہ تھا کہ یہی سرور ہیں لہٰذا انھوں نے بے ساختہ کہا:

"اجی لاحول ولا قوۃ! اس میں لطفِ زبان کہاں؟
ایک تک بندی اور بھٹیارخانہ جمع ہے!"

جب سرور کے جانے کے بعد غالب پر اصل حال کھلا تو انھیں بہت افسوس ہوا اور دوسرے دن وہ غوث علی شاہ کو لے کر سرور کی قیام گاہ پر ان سے ملنے پہنچے۔ اور یہ ظاہر کر کے کہ رات کو انھوں نے "فسانۂ عجائب" غور سے پڑھی ہے، اس کی عبارت کی بہت تعریف کی۔ اس طرح انھوں نے سرور کو خوش کر لیا۔ دوسرے دن غالب نے سرور کی دعوت کی جس میں غوث علی شاہ کو بھی مدعو کیا۔[۱]

"تذکرۂ غوثیہ" کی سندی حیثیت مشکوک ہے اس لیے اس بیان کی صحت یا عدمِ صحت کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس واقعے کو صحیح نہ ماننے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں نظر آتی۔ بہرحال جب سرور نے مہاراجا بنارس کی فرمائش پر طلسمی کی رمزیہ فارسی تالیف "حدائق العشاق" کو "گلزارِ سرور" کے نام سے اردو میں منتقل کیا تو اس کی تقریظ (غالباً سرور ہی کی فرمائش پر) مرزا غالب نے لکھی اور اس میں سرور کے اسلوب کی بہت تعریفیں کیں۔ اس تقریظ کے چند فقرے حسبِ ذیل ہیں:

"... یہ جو "حدائق العشاق" کا فارسی زبان سے عبارتِ اردو میں نگارش پانا ہے، ارم کا زمینِ دنیا سے اٹھ کر بہارستانِ قدس کا ایک باغ بن جانا ہے۔ وہاں حضرت رضوانِ ارم کے نخل بند و آبیار ہوئے، یہاں مرزا رجب علی بیگ سرور "حدائق العشاق" کے صحیفہ نگار ہوئے۔ اس مقام پر یہ ہیچ میرزا جو موسوم بہ اسد اللہ خاں اور مخاطب بہ نجم الدولہ اور متخلص بہ غالب ہے، خدائے جہاں آفریں سے توفیق کا اور خلق سے انصاف کا طالب ہے۔ ہاں اے صاحبانِ فہم و ادراک! سرورِ سحر بیاں کا اردو کی نثر میں کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام شاہدِ معنی کے واسطے کیا گراں بہا پیرایہ ہے!

رزم کی داستان گر سنیے
ہے زبان ایک تیغ جوہر دار

---

[۱] "تذکرۂ غوثیہ" (ترمیم) تالیف مولوی شاہ گل حسن، مطبع جوہر ہند، دہلی ۱۳۳۱ھ ص ۱۰۱-۱۰۲

بندہ کا احترام کیجیے
ہے قلم ایک ابر گہر بار[1]

جیسے دعویٰ تھا کہ انداز بیان اور شوخیِ تحریر میں "فسانۂ عجائب" بے نظیر ہے جس نے میرے دو خطوں اور "فسانۂ عجائب" کی یکتائی کو مٹا دیا، وہ یہ تقریظ "گل رعنا" [سرور] ہے۔ کیا ہوا اگر ایک نقش دوسرے کا ماخذ ہے، یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقاش واحد نہیں ہے۔ مانی نقاش بے معنی صورتیں بنا کر پیمبری کا دعویٰ کرے، کیا عقل کی کمی ہے! یہ بندۂ خدا معنی کی تصویر کھینچ کر دعویٰ خلاقی نہ کرے! کس حوصلے کا آدمی ہے!! سچ تو یوں ہے کہ جناب مہاراجا صاحب والا مناقب، عالی شان، ایسری پرشاد نارائن سنگھ بہادر [والی بنارس] جس باغ کی آرائش کے کارفرما ہوں اور پھر اس پر طرہ یہ کہ مرزا سرور جیسے آرائش، وہ باغ کیا ہوگا، بہشت نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا!"[2]

۱۸۶۰ء میں غالب کے شاگرد اور قالب بر لون کے معرکے میں غالب کے لشکر کے ایک سپاہی سیف الحق میاں داد خاں سیاح بنارس پہنچے۔ ان کے نام غالب نے جو خط اس زمانے میں لکھے ان میں سرور کا نام بھی آتا ہے جو اس وقت مہاراجا بنارس کے ملازم اور بنارس

میں مقیم تھے۔ ایک خط میں غالب سیاح کو لکھتے ہیں:

"اپنے دوست بہ خلوص مرزا رجب علی بیگ سرور کو سلام کہتا ہوں۔ کہہ دیجیے گا، بلکہ یہ رقعہ دکھا دیجیے گا۔"[3]

اسی خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

"جس بحر میں کوئی اسم یا کوئی لفظ نہ آسکے اس کی تدبیر فردوسی و خاقانی سے بھی نہ ہوگی۔ میں کیا کروں گا۔ نام تمھارا آسکتا ہے لیکن الف دبا رہتا ہے۔[4] خدا کے واسطے اس کی تدبیر سرور صاحب سے بھی ضرور پوچھنا۔"[5]

غالب نے ایک خط میں سیاح کو یہ ہدایت بھی کی:

"تذکیر و تانیث کے باب میں مرزا رجب علی بیگ سے مشورہ لیا کرو اور جتنے ہو سکے حروف بھی ان سے پوچھ لیا کرو۔"[6]

اس ہدایت کا شاید سیاح نے برا مانا اور غالب کو اس کی شکایت لکھی کیونکہ اگلے خط میں غالب ان کو لکھتے ہیں:

"بھائی! ہم نے تم کو یہ نہیں لکھا کہ مرزا رجب علی بیگ کے شاگرد ہو جاؤ اور اپنا کلام ان کو دکھاؤ۔ ہم نے یہ لکھا کہ تذکیر و تانیث کو ان سے پوچھ لیا کرو۔ دکن بنگالے کے رہنے والوں کو اس امر خاص میں اہل لکھنؤ کے روزمرہ کا تتبع ضرور ہے۔"[7]

---

[1] یہ غالب کے اس قطعے کے قریب کے دو شعر ہیں جو انھوں نے بہادر شاہ کے نام اپنی تنخواہ کی ماہ بہ ماہ ادائگی کی درخواست کے طور پر لکھا تھا۔ مکمل شعر یوں ہیں:

بندہ پرور کے کف دست کو دل کیجیے فرض | ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بندہ کا احترام کیجیے | ہے قلم میرا ابر گہر بار

[عنوان "گزارش مصنف بہ حضور شاہ"]

[2] "گل رعنا"، دیباچہ، مطبع... لکھنؤ۔ "عود ہندی" مطبع... لکھنؤ ... ص ۳۵۵-۳۵۶ ["عود ہندی" میں شامل ... تقریظ ... مختلف ہے]

[3] "عود ہندی": "اردوئے معلیٰ"، دار المطابع لکھنؤ ۱۳۲۲ھ، حصہ دوم، ص ۳۶۲

[4] غالب کی یہ رائے بظاہر سیاح کے اس شعر کے بارے میں ہے:

"مہ و رخ کا زہے نشان، ہو رواں درد کا کاروان
ہر گہ رقم میاں داد خاں جو مرزا ہے شاگرد غالب"

[5] ایضاً، "اردوئے معلیٰ" ص ۳۱۱

[6] سیاح اورنگ آباد (دکن) میں پیدا ہوئے اور مستقل سکونت سورت میں رکھتے تھے (دیکھیے "میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام" از ڈاکٹر سید معین الدین عقیل)

غالب اور سرور دونوں اپنی اپنی جگہ کثرت سے خط کتابت کرتے تھے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ دونوں کے درمیان خط کتابت بھی ہوئی ہو، خصوصاً "گلزارِ سرور" کی تقریظ کے سلسلے میں دونوں نے ایک دوسرے کو خط ضرور لکھے ہوں گے۔ مجھے ایک ذریعے سے معلوم ہوا تھا کہ سرور کے متبنّیٰ فرزند مرزا احمد علی کے خاندان میں سرور کے نام غالب (اور بعض دوسرے مشاہیر) کے خطوط موجود ہیں لیکن افرادِ خاندان نے اس کی تصدیق نہیں کی۔

سرور نے "شبستانِ سرور" (تکمیل ۱۲۷۹ھ) میں مرزا غالب کا ایک شعر درج کیا ہے:

"بہ قولِ اسد اللہ خاں غالب ؎

غالب چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں" [۱]

غالب منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"خدا تم کو سلامت رکھے، منتخبات سے ہو رجب علی بیگ سرور نے جو افسانۂ عجائب لکھا ہے، آغازِ داستان کا شعر مجھ کو بہت مزہ دیتا ہے ؎

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ

یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرعِ ثانی کتنا گرم ہے اور 'یاد رکھنا' فسانے کے واسطے کتنا مناسب!" [۲]

[لیکن دراصل مصرعِ ثانی میں 'یاد رکھنا' کے بجائے 'سُن رکھو تم' ہے]

نظم اور نثر کے ان دونوں استادوں کے حالات میں کچھ مماثلتیں بھی ملتی ہیں، مثلاً

۱۔ دونوں مرزا تھے

۲۔ دونوں منشیات استعمال کرتے تھے مگر اعتدال کے ساتھ غالب شراب اور سرور افیون [۱] کے عادی تھے۔

۳۔ دونوں کو جرائم میں ماخوذ ہونا پڑا۔ غالب قمار بازی کے الزام میں دو مرتبہ گرفتار ہوئے [۲] اور سرور "در علّتِ خون گرفتار" ہوئے تھے اور عام خیال یہ تھا کہ انھیں سزا ئے موت ہو جائے گی [۳]

۴۔ دونوں کی نسل انھیں پر ختم ہو گئی۔

۵۔ اولادِ نرینہ کی کمی کو پورا کرنے کے لیے دونوں نے فرزندِ متبنّیٰ کا سہارا لیا۔ غالب نے زین العابدین عارف کو اور سرور نے مرزا احمد علی متبنّیٰ کیا۔ البتہ غالب زیادہ بدقسمت تھے کہ انھیں عارف کا بھی داغ دل پر سہنا پڑا۔ مرزا احمد علی سرور کے بعد تک زندہ رہے اور انھوں نے 'انشائے سرور' کے نام سے سرور کے خطوں کا مجموعہ مرتب کیا۔

۶۔ دونوں نے اپنے پیش رو استادوں پر حملہ کر کے اپنے لیے مخالف ماحول تیار کر لیا۔ غالب نے قتیل پر اعتراض کر کے قتیل کے شاگردوں اور سرور نے میر امن کی تضحیک کر کے اہلِ دلی سے عداوت مول لے لی۔

۷۔ دونوں کو بادشاہوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ غالب کے

---

[۱] "شبستانِ سرور"، مطبع نجم العلوم، لکھنؤ ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء۔ جلدِ دوم ص ۲۲۲۔ "شبستانِ سرور" چار جلدوں میں قریب دو لاکھ الفاظ پر مشتمل الف لیلہ کی داستانوں کا مجموعہ ہے جس کو سرور نے نہایت [illegible] حالات اور اتنے ہی شگفتہ اسلوب میں لکھا ہے۔

[۲] "[illegible]"، حصۂ اوّل ص ۵۵

[۱] سرور ایک خط میں افیون کے معائب بیان کرتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں: "چالیس برس سے نزلے کے باعث لت لگا تا ہوں اچار تی سے زیادہ نہیں ہونے پائی ہے۔" ("انشائے سرور"، رقعہ ۴۶)

[۲] تفصیلات کے لیے دیکھیے مضمون "غالب اور حادثۂ اسیری" از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ رسالۂ 'نقوش' لاہور، اگست ۱۹۶۰ء

[۳] "انشائے سرور"، رقعہ سوم فارسی

سرپرست بہادر شاہ اور سرور کے سرپرست واجد علی شاہ اپنے اپنے سلطنت کے آخری بادشاہ تھے جن کو اپنی زندگی ہی میں حکومت سے محروم ہونا پڑا اور ان دونوں سرپرستوں کا انتقال جلاوطنی کے عالم میں ہوا۔

۸۔ دونوں نے واجد علی شاہ سے متعارف ہونے کے لیے اُن کی خدمت میں نظم بھی پیش کی اور نثر بھی، غالب نے قصیدہ و عرض داشت اور سرور نے قطعۂ تاریخ جلوس اور عرض داشت۔ اور بادشاہ کی خدمت میں دونوں کی نظم و نثر کو ایک ہی شخص یعنی قطب الدولہ قطب علی خاں نے پیش کیا۔[1]

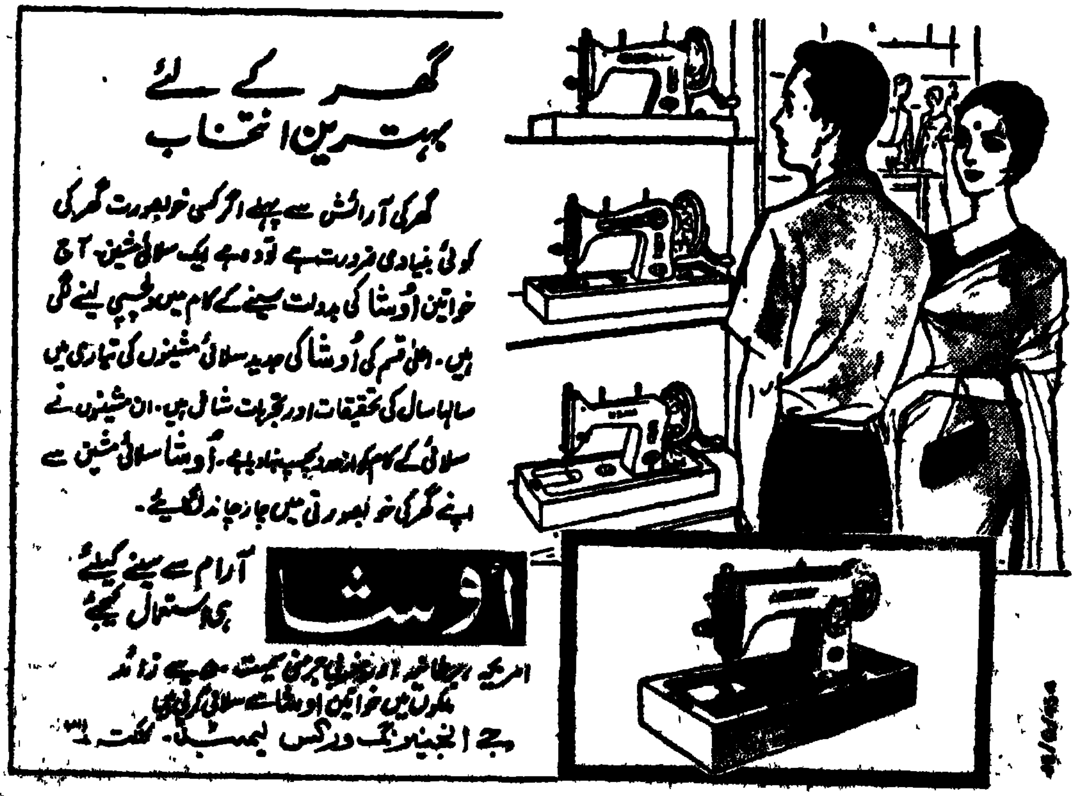
---

[1]۔ "پنج آہنگ"، آہنگ پنجم۔ مکتوبِ غالب بنام نواب محمد علی خاں عرف میرزا حیدر۔ ("کلیاتِ نثرِ غالب" مطبع نول کشور کانپور ۱۸۷۵ء ص ۲۲۱

۹۔ غالب اور سرور دونوں نے ایک ہی سال یعنی ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

" سرور سلطانی"، مرزا رجب علی بیگ سرور۔ مطبع نامی لکھنؤ، ۱۸۸۸ء۔ سبب تالیف ص ۴ اور " فسانۂ عبرت"، مرزا رجب علی بیگ سرور مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب (احوالِ واجد علی شاہ ص ۷۷)

[2] خبر انتقالِ سرور: "اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ" مورخہ ۱۴ مئی ۱۸۶۹ء ص ۳۰۷ (فائل مسلم یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ) "خیابانِ تواریخ" از سید محمد علی جویا مراد آبادی قطعۂ تاریخ وفاتِ سرور از جویا: ۱۲۸۶ھ (مطابق ۱۸۶۹ء) بحوالۂ مضمون "تاریخ لطیف" از رشید حسن خاں: رسالہ "فکر و نظر" دہلی۔ اپریل ۱۹۶۲ء



کتب خانہ

شعور و فکر کا گہوارہ علم و فن کا امیں
چھپا ہوا ہے یہاں ہر کرشمۂ سائنس

کھلے ہوئے ہیں ہر اک سمت رنگ رنگ کے پھول
فسونِ شعر و سخن، نورِ فلسفہ کی رمق

ثنا ہی ہے خموشی جہاں متاعِ اصول
طلسمِ لفظ و بیاں، سوزِ آرزو کے ورق

جہاں حیات کے پوشیدہ راز ہنستے ہیں
کہیں ہے سلسلۂ ارتقائے انسانی

سکوں کے ہونٹوں پہ لفظوں کے ساز ہنستے ہیں
تھما ہوا ہے کسی آنکھ میں کہیں پانی

جہاں معانی و اسرار جگمگاتے ہیں
کھلے ہوئے ہیں کہیں گیسوئے شبِ تاریخ

دماغ و ذہن کی ہر لحظہ شمع جلتی ہے
گدازِ سینۂ گیتی، غرورِ دورِ فلک

یہ روشنی تو زمانے کے ساتھ چلتی ہے
سحر کا رنگ بدلتا رہا ہے شام تلک

ازل سے غور و تفکر ہے آدمی کا عمل
میں جب بھی فکر سے کرتا ہوں گفتگوئے حیات

کھلا رہا ہے جہنم میں زندگی کے کنول
نیا چراغ جلاتی ہے جستجوئے حیات

معائبِ شاعری

معائبِ شاعری کے کئی قاعدوں پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ بعض قاعدوں کو کسی زمانے میں قبولِ عام کی سند نہیں ملی۔ کچھ ضابطے ایسے ہیں، جن کو مانا سب نے، لیکن کم سے کم لوگ ان کی پابندی کر سکے۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ جن اساتذہ نے ان قاعدوں کو بنایا، یا ان کی پابندی پر زور دیا، انھوں نے ضرورت یا جلن کے بجائے، فارسی کی تقلید اور دبستانی مفروضات کو پیشِ نظر رکھا۔ کچھ قاعدے محض ذاتی پسند و ناپسند کے آئینہ دار ہیں — اس زمانے میں کچھ لوگوں کا کام باقاعدہ، بامحاورہ، بارعایت شعر کہنا، بلکہ شعر بنانا تھا، اس لیے طرح طرح کی دقت پسندیاں، مذاقِ مشکل پسندی کو خوب راس آتی تھیں۔ ان لوگوں نے دائرۂ شاعری کو اپنے لیے چند اصناف تک محدود کر لیا تھا، اس بنا پر زیادہ پریشانی کا احساس نہیں ہوتا تھا — جن مقامات پر ہم عصر اساتذہ کا اجتماع ہو گیا تھا، (جیسے رام پور میں بعہد کلب علی خاں) وہاں ایسی پابندیوں اور موشگافیوں کو پروان چڑھنے کا خوب موقع ملتا تھا۔

بعض استاد، انفرادیت یا کمالِ استادی کے اظہار کے لیے، کچھ مفروضات کی پابندی کو اپنے اوپر لازم کر لیتے تھے۔ جیسے بعض اساتذہ نے اس کا التزام کیا تھا کہ آسمان، جان کی قسم کے الفاظ کو بحالتِ مفرد، بہ اعلانِ نون ہی نظم کیا جائے۔ منیر بھی اس قاعدے کو مانتے تھے۔ ایک جگہ بہت مجبور ہو کر کہتے ہیں ؎

منیر افسردہ ہوں پابندیٔ عطف و اضافت سے
نہیں تو لطف دکھلاتا مضامینِ غریباں کا

(کلیات ص ۲۲۶)

محترمی حضرت اثر لکھنوی نے ایک اور دلچسپ روایت لکھی ہے: — "منیر شکوہ آبادی شاگردِ ناسخ نے ایک مطلع کہا۔ ہاتھ ملتے تھے اور کہتے تھے ہائے کیا خوب مطلع ہے، مگر دیوان میں نہیں رکھ سکتا، کیونکہ آسماں بے عطف و اضافت نظم ہوا ہے، تاہم اعلانِ نون نہیں ہوتا۔ ؎

گنبدِ قبرِ دوستاں ٹوٹے
اے زمیں تجھ پہ آسماں ٹوٹے "

(رسالہ الحمرا لاہور مارچ ۱۹۵۵ء)

ایسی پابندیاں محض لزوم مالایلزم کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے یہ قائم نہیں رہ سکتی تھیں نہ رہیں۔ فنِ شاعری کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ خون، جان، دین، کی قسم کے الفاظ جب بہ عطف و اضافت آئیں، تو ان میں نون کا اعلان درست نہیں۔ لیکن اساتذۂ متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے یہاں اعلانِ نون کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

امیر مینائی نے اپنے ایک شاگرد کو، جس کے ایک شعر میں لفظِ سیہ بختی کی ی ساقط ہو گئی تھی، متنبہ کیا ہے "سیہ بختی میں یائے تحتانی کا اسقاط نہ چاہیے۔" (مکاتیب

امیر مینائی (مکتوب بنام کوثر خیر آبادی) لیکن خود اُن کے دواوین میں عربی فارسی الفاظ کے آخر سے سقوطِ یائے معروف کی سو دو سو مثالیں بہ آسانی مل جائیں گی —— منیرؔ شکوہ آبادی کا مسلک اخفا و اعلانِ نون کے بارے میں سب کو معلوم ہے، ابھی اس کا ذکر بھی آ چکا ہے۔ یہی منیرؔ انتہائے مجبوری کے عالم میں لکھتے ہیں ——

"و یک دو لفظ مثل جہاں، یہ اخفای نون و امثالہا کہ در بعض مادۂ تاریخ بلحاظِ ضیقِ مقام معتمداً آوردہ ام، معذورم دارند" (کلیاتِ منیرؔ ص ۷)

ہمارے زمانے کے اساتذہ میں حضرت اثرؔ لکھنوی، ایطا کو من جملہ معائب مانتے ہیں۔ فراقؔ پر اعتراض بھی کیا ہے، موصوف نے غزلوں میں حتی الامکان اس کی پابندی بھی کی ہے، لیکن اُن کے منظوم ترجمہ گیتا، "نغمۂ جاوید" میں، ایطائے جلی کی خاصی مثالیں موجود ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اس قبیل کی غیر ضروری پابندیاں بہت سے ان حضرات سے بھی نہیں نبھائی جا سکیں جنھوں نے اُن کی باضابطہ تائید کی۔ اور یہ کہ جن لوگوں نے جیسے تیسے غزلوں میں ان کو ایک حد تک نبھا بھی لیا، لیکن جب انھوں نے تنگنائے غزل سے نکل کر مثنویات وغیرہ کے کوچے میں قدم رکھا، تو یہ مفروضات ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے۔

متعدد قاعدے، بے ضرورت پابندیوں کی وجہ سے غیر ضروری تفصیلات کا مجموعہ، بلکہ گورکھ دھندا بن کر رہ گئے ہیں۔ عالم یہ ہے کہ قاعدے کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں، جن کا سمجھنا اور یاد رکھنا، ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ نہ ان کی مکمل پابندی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اگر ان قاعدوں پر نظرِ ثانی کی جائے، غیر ضروری پابندیوں اور خواہ مخواہ کے اُلجھاووں کو ختم کر دیا جائے، تو اس سے دو بڑے فائدے ہوں گے۔

ایک تو یہ کہ بہت سے اختلاف خود بہ خود ختم ہو جائیں گے —— دوسرے یہ کہ ان کو سمجھنا آسان ہوگا اور ان کی پابندی بھی ہو سکے گی جن پابندیوں کا تعلق کچھ استادوں کی ذاتی پسند و ناپسند یا صرف "خاندانی" احترام سے ہے، اور ان کی لازمی پابندی حسنِ کلام کے نقطۂ نظر سے ناگزیر نہیں، اُن کو سرے سے ختم ہو جانا چاہیے۔

اس ذیل میں سقوطِ حروفِ علت، اعلانِ نون، تراکیبِ ہندی اور قافیہ و ردیف کے قاعدے، خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس مضمون میں انھیں قواعد پر اسی ترتیب کے ساتھ بحث کی جائے گی۔ اس سلسلے کا یہ پہلا مضمون پیش کیا جاتا ہے۔

سقوطِ حروفِ علت

لفظ کے آخر سے خواہ وہ کسی زبان کا ہو، حروفِ علت کا دبنا یا گرنا اساتذۂ متقدمین کے نزدیک کوئی عیب نہیں تھا۔ بیشتر اساتذۂ متوسطین کا بھی یہی مسلک تھا۔ یہ صراحت ضروری ہے کہ حروفِ علت میں سے "ی" کا دبنا، عام تھا۔ اسم، فعل، حرف، ہر حرف کے آخر سے، حسبِ ضرورت اس کا سقوط روا رکھا جاتا تھا۔ حروفِ مغیرہ، حروفِ ربط اور ضمیروں کے آخر سے الف اور واو کو بھی بلاتکلف گرا دیتے تھے۔ البتہ مفرد اسموں کے آخر سے واو اور فعلوں کے آخر سے الف کا گرانا، اس قدر عام نہیں تھا۔ اس میں احتیاط کی جاتی تھی۔ اگرچہ مثالیں ملتی ہیں۔

اردو نظم میں، گفتگو کی طرح، حروفِ علت کا دب کر نکلنا عام بات ہے کبھی یہ شعر کی روانی پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتا، لیکن کبھی روانیِ کلام بے طرح مجروح ہو جاتی ہے۔ غالبؔ نے میر مہدی مجروحؔ کو ایک خط میں لکھا تھا:

"ہائے وہ لب پہ آ کے رہ جانا ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

کیوں حضرت! "ابھی کچھ" کی تحتانی کا دبنا غیر فصیح نہیں؟

کچھ ابھی بات کر نہیں آتی۔ کیا اس کا نعم البدل نہیں؟"

(غالب کی نادر تحریریں ص ۵۶)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اساتذۂ متوسطین، حروفِ علت کے اس طرح دبنے کو جس سے فصاحتِ کلام پر حرف آ جائے، اچھا نہیں سمجھتے تھے، اور اس ضمن میں عربی و فارسی اور ہندی الفاظ کی تفریق ان کے پیشِ نظر نہیں رہتی تھی۔ غالبؔ کے کلام میں متعدد جگہ فارسی و عربی الفاظ کے آخر سے یائے معروف کے سقوط کی مثالیں موجود ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ حروفِ علت کے دبنے کو مطلقاً غلط

نہیں سمجھتے تھے۔ اصل مقصد فصاحتِ کلام کا باقی رہنا تھا۔ جہاں اس پر حرف آجائے، وہاں وہ اس کو غلط سمجھتے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ صحیح و غلط کا یہ معیار نہایت مناسب تھا۔

کہا جاتا ہے کہ شیخ ناسخ کے زمانے میں اس عام اصول کو اس قاعدے میں تبدیل کر دیا گیا کہ عربی و فارسی الفاظ کے آخر سے حروفِ علت کو گرانا، غلط ہے، اس دلیل کے ساتھ کہ فارسی میں اس کی مثال نہیں ملتی ——— "شیخ ناسخ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے تلامذہ کو اخیر زمانے میں جو ہدایتیں کی تھیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کلمے کے آخر سے الف، واو، ی کو بے تکلف گرا دینا اچھا نہیں مگر بقول مولوی حیدر علی صاحب دکدا (لمبالمبا؟) شیخ کی اس وصیت پر کسی سے عمل نہ ہو سکا۔ لفظوں کی ہڈیاں پسلیاں توڑ کر مصرع میں بھر دینا، اردو شاعری میں رواج پا گیا۔ شیخ کا متنبہ کرنا اس بنا پر تھا کہ فارسی میں کہیں ایسا نہیں دیکھا کہ میکی و میروی میں سے ی کو گرا دیں۔ یا گفتگو و شست و شو میں واو، و دریا و گویا کا الف ساقط ہو جانے دیں۔"

(مولانا حسرت موہانی۔ معائبِ سخن ص ۱۷)

مولانا حامد حسن قادری نے بھی، اصلاحاتِ تاریخ کے ذیل میں اس قاعدے کا ذکر کیا ہے ——— "عربی فارسی الفاظ کے آخر سے حروفِ علت (ا۔ و۔ ی) دبنے نہ پائیں .... لیکن ہندی حروف میں دبنا جائز رکھا گیا" (تاریخ و تنقیدِ ادبیاتِ اردو ص ۹۹) اساتذۂ متاخرین نے اس پابندی کو صحتِ بیان کا لازمی جُز قرار دیا۔ امیر مینائی کی رائے اوپر پیش کی جا چکی ہے۔ داغ نے مولانا احسن مارہروی کی فرمائش پر عیوبِ شاعری سے متعلق ایک طویل قطعہ لکھا تھا جس میں اپنے شاگردوں کو ان عیوب سے بچنے کی ہدایت کی تھی؛ اُس میں اس کا بھی ذکر ہے؛

عربی فارسی الفاظ جو اردو میں کہیں ::: حرفِ علت کا برا ان میں ہے گرنا دبنا
الف وصل اگر آئے تو کچھ عیب نہیں ::: یکساں ان کا نہیں اردو کیا کرتا ہے روا

(یادگارِ داغ۔ ص ۱۹۰)

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حروفِ علت یعنی الف اور واو اور یا، اس بحث سے خارج ہیں۔ فارسی میں واو کا سقوط مسلمات میں سے ہے۔ اس قاعدے کے بنانے والوں نے اردو میں سقوطِ حروفِ علت کو اس لیے غلط بتایا ہے کہ فارسی میں اس کی مثال نہیں ملتی؛ اس لیے واو اس فہرست سے خود بخود خارج ہو جاتا ہے۔ رہا الف، سو عربی فارسی الفاظ کے آخر سے اس کا سقوط نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف یائے معروف اس بحث کا مرکز ہے۔ اساتذہ نے جہاں جہاں حروفِ علت کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بیشتر مقامات پر در حقیقت یائے معروف کا سقوط ہی معرضِ بحث میں ہے۔

قابلِ لحاظ یہ بات ہے کہ اس قاعدے کو مانا بہتوں نے لیکن اس پر پوری طرح عمل نہیں ہو سکا، نہ اُن سے جنھوں نے اس قاعدے کو بنایا تھا، اور نہ اُن سے جنھوں نے محض تقلیداً اس کی پابندی کا اعلان ضروری سمجھا۔ اچھے اچھے استادوں کے یہاں اس کی مثالیں موجود ہیں اور خاصی تعداد میں۔ خاص طور سے جن شاعروں نے غزل کے علاوہ، مثنویاں یا نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں سے بیشتر اس کی پابندی کو نہیں نبھا سکے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پابندی تھی ہی بے اصولی۔ بہت سے مقامات پر حرفِ علت کا دبنا نہایت بُرا معلوم ہوتا ہے، اس اعتبار سے شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بات کا لحاظ رکھے کہ محض ان حروف کے دبنے سے کلام میں ناہمواری نہ پیدا ہو۔ لیکن اس سلسلے میں عربی و فارسی اور ہندی الفاظ کی جو تفریق کی گئی ہے، وہ سرے سے غلط ہے۔ دو وجوہ سے:

(الف) اردو ایک مستقل زبان ہے۔ علم زبان کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ کسی زبان میں دوسری زبانوں کے جو الفاظ شامل ہو جاتے ہیں وہ اسی زبان کا جُز بن جاتے ہیں۔ اردو میں دنیا کی بہت سی زبانوں کے لفظ موجود ہیں۔ اب یہ سب لفظ اردو کے ہیں۔ ان پر اردو کے قواعد کا اطلاق ہوگا۔ اس لیے کسی تفریق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

(ب) حروفِ علت کے دبنے سے کلام میں جو عیب پیدا ہوتا ہے، وہ عام ہے۔ پھر اس کو فارسی و عربی الفاظ سے مخصوص کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس قاعدے کا تعلق حسنِ کلام اور چستیٔ بندش سے ہے۔ اور ان دونوں محاسن کے لحاظ سے بہت سے مقامات پر ہندی الاصل الفاظ میں حروفِ علت کا دبنا اتنا ہی برا معلوم ہوتا ہے، جتنا غیر ہندی الفاظ میں۔ اصولاً دونوں میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً درجِ ذیل مصرعوں میں خط کشیدہ الفاظ کو دیکھیے، ان میں ایسے حروفِ علت ساقط ہو گئے ہیں، جن کا گرانا قاعدے کے لحاظ سے جائز ہے، لیکن فصاحتِ کلام ہوا ہو گئی ہے:

عمر اپنی کٹی دنیا کے ستم گاروں میں (تسلیم) دنیائے عشق میں بڑے نام نام امتحاں کے ہیں (ایضاً) لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے، رنج بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے (داغ۔ پہلی غزل کی یہی صورت ہے۔) کرتا بیمارِ محبت کا مسیحا جو علاج (ذوق) مجھے تو اجل کی ہے آرزو، اسے غم ہے کہ یہ مر گیا (نظم طباطبائی) نہیں اٹھ سکتا مجھ سے جنبشِ مژگاں کا صدمہ بھی (ایضاً) ہمہ تن محو رہا گو کہ تو خود بینی میں (عزیز لکھنوی) صحرا میں جب ہوئی مجھے خوش چشموں کی تلاش (امیر مینائی) آیا ہیں تیری مدد کے لیے قصدِ فیصل (امیر) بال کھولے پریاں پھرتی ہیں سرِ دیوار پہ (امیر)

اس قاعدے کی بنیاد جس تفریق پر رکھی گئی ہے، وہ غلط ہے۔ حروفِ علت کے دبنے سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے، اس کا تعلق مجموعی طور سے حسنِ کلام سے ہے، نہ کہ الفاظ کی تقسیم سے۔ قاعدہ یہ ہونا چاہیے کہ جس لفظ میں کوئی حرفِ علت دب رہا ہو، اور اس سے فصاحتِ کلام پر اثر پڑے، تو یہ عیب ہے۔ اس سے کوئی بحث نہیں ہونا چاہیے کہ وہ لفظ کس زبان کا ہے۔

[illegible] ناسخ اور اس کے بعد کے اساتذۂ لکھنؤ کے یہاں [illegible] مثالیں پیش کی جاتی ہیں، جن میں فارسی و عربی [illegible] سے حروفِ علت کا سقوط نمایاں ہے۔ یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ لکھنؤ میں ناسخ اور ان کے تلامذہ نے اس قاعدے پر بہت زور دیا تھا، لیکن آتش اور ان کے تلامذہ کے یہاں اس کی مثالیں عام ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اس کو کوئی عیب ہی نہیں مانا۔ جو لوگ ان دونوں دبستانوں سے علاحدہ تھے، جیسے میر انیس، ان کے یہاں بھی اس ناسخی قاعدے کی پابندی نظر نہیں آتی۔ شعرائے دہلی نے بہ استثنائے داغ، اس کو کبھی من جملۂ عیوب نہیں سمجھا۔ اسی لیے ان کے یہاں اس کی مثالیں بہ کثرت ہیں۔

لکھنؤ میں اساتذۂ متاخرین میں امیر مینائی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ وہ عربی و فارسی کے الفاظ کے آخر سے حروفِ علت کے سقوط کو عیب سمجھتے تھے (حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے) لیکن ان کے یہاں سقوطِ یائے معروف کی نہ معلوم کتنی مثالیں موجود ہیں۔ اس سے بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ درجہ بندی والا قاعدہ، محض رسماً دہرایا جاتا رہا، عملاً اس کی خلاف ورزی ہوتی رہی، اور اس وجہ سے کہ ہندی و غیر ہندی الفاظ کی تفریق اصولاً غلط تھی۔ درجِ ذیل مثالیں محض 'مشتے نمونہ از خروارے' کا حکم رکھتی ہیں۔

وحشی ہوں آدمی کے جنگل کا — ناسخ (کلیات مطبوعہ نولکشور پریس ١٩٢٣ء، ص ٢)
کام جو نرینی ہے اس یوسفِ بازاری کا — ناسخ (ص ١١)
آیا ہے یاد پیری میں عالمِ شباب کا — " (ص ١٩)
مجھ کو تو یار سے ہے ہم آغوشی کا خیال — " (ص ٨٨)
الٰہی خنجرِ سفاک آبدار نہ ہو — " (ص ١٢٥)

مشکل کے وقت حامی ہوا آزِ خلیل کا — آتش (کلیات نولکشور پریس ص ٢)
ناقص ہے دوستداری میں کامل نہیں ہے تو — " (ص ٨)
آزادی سے زیادہ اسیری میں لطف ہے — " (ص ٨)
فتنہ پردازی جسے کہتے ہیں فن ہے کس کا — " (ص ١٨)
منہ کتابی قلمی ہے، خطِ حاشیہ ہے میر کا — " (ص ٢١)

دانہ بھی قتل ہے پشیمانی کی تحریر کا۔ آتش (ص ۲۶)

مولت کرتی ہی کا جو میں نے کیا ارادہ 〃 (ص ۳۴)

زلف والا فتنی ہے، یاں داغ جگر ہر ہے 〃 (ص ۳۸)

موجو اس کی ہے سیہ روزی ہماری آتش 〃 (ص ۴۰)

گمان ساقی پہ صیاد کا ہوا مجھ کو 〃 (ص ۵۴)

یہی دیوانگی میری ہے، بہار آنے دو 〃 (ص ۴۴)

حرف الف کی ردیف میں ابھی آتی ہی اور مثالیں مل سکتی ہیں۔

دل کی بے تابی نے پیار سے مجھے ناچار کیا۔ امانت لکھنوی (دواوین امانت ص ۱۱)

آپ بد مستی سے شاید تو نہیں ڈرتا ہے 〃 〃

دل کی بے تابی سے گودی میں اٹھایا اس کو 〃 〃

کردی اک تفرقہ اندازی کی صورت باہم 〃 〃

جب کہ عیاری میں کامل ہوا وہ ماہ تمام 〃 〃

میں نے اس گل کو جو یکتائی میں کامل پایا 〃 〃

میں بھی تو آدمی کی جان ہوں، حیوان نہیں 〃 〃

کبھی کہتا ہوں پریشانی میں شام ہجراں 〃 〃

آگے اس بت کے خود بینی تری ہے بے کار 〃 〃

وصل سے شادی ہوئی، کھل گئے عقدے دل کے 〃 〃

خاموشی میں یاں لذت گویائی ہے انیس (روح انیس ص ۲۷۶)

فرط غاشیہ برداری کو شوکت آئی 〃 (ص ۲۱۳)

تنہائی میں آہ کون ہوئے گا انیس 〃 (ص ۲۷۶)

اندوہ صفائی، ہو میں نہ تر ہوئی 〃

ابن زہرا تری مظلومی کے ہیں شیر نثار 〃

جب عالم تنہائی میں آہ آتا ہے وطن یاد 〃

پائمالی میں تری نہیں مجھے کا خلل۔ رند لکھنوی (دیوان مطبوعہ نولکشور پریس) (ص ۲)

آئی ہے جو گھٹا کی بہار پہنچے 〃 (ص ۴)

بے زاری کی تکلیف نہ دے روز میں ساقی۔ رند لکھنوی (ص ۱۱)

ایسا ملاقات تھی خاموشی ہماری 〃 (ص ۱۱)

دم میں دم باقی ہے جب تک نہ اٹھا یار کا ہاتھ 〃 (ص ۱۱)

پاکدامانی کا دعویٰ نہ کرے اس رو سے (ص ۱۳)

پھر راتیں کاٹنے لگے اختر شماری میں 〃 (ص ۱۴)

جوہر وہ خاکساری نے پیدا کیا مری 〃 (ص ۱۵)

دیوان رند ۲۱۶ صفحات پر حاوی ہے۔ مندرجہ بالا مثالیں شروع کے صرف ۱۵ صفحات سے پیش کی گئی ہیں۔

دکھلایا ناتوانی نے گھر یار کا مجھے۔ صبا لکھنوی (دیوان صبا موسوم بہ غنچۂ آرزو ص ۱۶)

خود بینی کا دماغ کبھی پیشتر نہ تھا 〃 (ص ۵۳)

سودائی کس قدر ہے شب تار کا مزاج 〃 (ص ۵۴)

خالی کرے ہے قاتل کا مکاں کیونکر 〃 (ص ۶۵)

جو گلفشانی کی جا، ہے تگرگ بار چراغ 〃 (ص ۶۷)

درازدستی یہ کس بے ادب نے کی دم قتل مومن (دیوان مومن مرتبہ ضیا احمد بدایونی ص ۱۳۴)

یہ بے حجابی مری، مگر مجھی کو حیا نہ تم 〃 (ص ۱۳۴)

غزل سرائی کی مومن نے کیا کہ رشک سے آج 〃 (ص ۱۳۸)

مری تسلی کو روز جزا کے آنے کی 〃 (ص ۱۹۳)

دربدر تا میکدہ ساقی سے کیا ہوتا ہے 〃 (ص ۲۲۸)

بیزار زندگانی کا جینا محال تھا 〃 (ص ۲۳۶)

مرے شعلے اٹھتے ہیں آنکھوں کے دریا جلتی ہے 〃 (ص ۱۸)

آہ بیکسی میں ہے خواب زلیخا مجھ کو غالب (دیوان غالب مرتبہ عرشی صاحب ص ۱۶۶)

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے 〃 (ص ۱۹۳)

خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے 〃 (ص ۲۱۶)

[illegible] ہیں۔ غالب (ص ۱۰۳)

[illegible] سے ملتا ہے بہ تیغِ کہسار " (ص ۲)

بیضۂ قمری کے آئینے میں پنہاں صیقل " (ص ۴)

ناخن کو جگر کاوی میں بیرنگ نکالوں " (ص ۶۰)

الٰہی جلوہ ہے کس بت کا آج مسجد میں۔ ذوق - (دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد ص ۴۷)

الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا " (ص ۴۷)

کریں جدائی کا کس کس کی رنج ہم اے ذوق " (ص ۷۵)

الٰہی خیر ہو، مانندِ شعلہ سرکش " (ص ۱۱۸)

کہ سینہ کاوی میں یاں ناسور کو دیکھتے ہیں " (ص ۱۴۷)

الٰہی چشم کے چشمے کو اتنا آب تو دے " (ص ۱۹۸)

الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے " (ص ۲۱۰)

نہیں وہ آدمی، لیکن سب آدمی کے ڈھنگ " (ص ۳۹۸)

نقش سجدے کا ہے پیشانی کا ٹیکا ہم کو " (ص ۱۶۷)

حنائی پنجہ ہوں تاکِ چنار و بید انجیر " (ص ۳۶۳)

سچ ہے محبوب جو لاثانی ہے، وہ یکتا ہے۔ محسن کاکوروی (کلیاتِ نعت محسن ص ۳۸)

عرش پر کرسی بچھائے ہے مرا ذہنِ رسا " (ص ۳۸)

اک رگِ مخفی ہے مابینِ دو ابروئے سیاہ " (ص ۴۰)

آئی ہونے میں بھلا آپ کے شبہ کیا ہے " (ص ۴۲)

رہے خونریزی کا نقشہ ذبح کے [illegible] میں " (ص ۴۳)

سیکڑوں [illegible] کو کھلاؤں میں " (ص ۸۸)

اس کی پیشانی پہ دیباچۂ ماقلّ و دلّ " (ص ۹۴)

کیسی افسردگی کیا بات ہے مرجھانے کی " (ص ۱۰۹)

اک وابستگی [illegible] ہے " (ص ۱۲۴)

[illegible] دریا الٰہی " (ص ۱۲۷)

باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے۔ نواب مرزا شوق لکھنوی [illegible]

سختی ساری بتوں کے دل کو دی " "

ثانی رکھی نہ تھی وہ صورت میں " "

میری رسوائی کا خیال رہے " "

رسائی کچھ نہیں دشوار بام تک اس کے۔ امیر مینائی (صنم خانۂ عشق ص ۲)

چھپ کے تنہائی میں اغیار سے رویا ہوگا " (ص ۴۱)

تیری بیدردی ہی اچھی تھی ترس کھانے سے " (ص ۲۲۹)

پاس یکتائی کا اس شوخ کو ایسا ہے امیر " (ص ۳۳۹)

طرفۃ العین میں وہ روشنی پہنچی جو قریب " (مراۃ الغیب ص ۳۵)

بستیاں ہوتی ہیں آبادی سے اکثر باہر " (ص ۲۰۰)

یہ شیخ سعدی ہے جس نے کہ چشمِ روشن کو " (ص ۲۷)

نہ بے وفائی کا غم تھا، نہ ڈر جدائی کا " (ص ۸۴)

الٰہی، تو نے ہمیں کس بلا میں ڈال دیا۔ داغ (گلزارِ داغ مطبوعہ مطبع تیغ بہادر لکھنو ص ۱۳)

مثالِ عارض صفائی رکھتا، بہ رنگِ کاکل کجی نہ کرتا " (ص ۱۴)

وہ بت کرے خدائی کی باتیں، خدا کی شان " (ص ۱۹)

کیا جانے، وہ خدائی کا مارا، کہاں ہے اب " (ص ۷۲)

الٰہی، شیخ بھی مے خوار ہو مغاں کی طرح " (ص ۸۲)

الٰہی، قاصد کی خیر گزرے کہ آج کوچے سے فتنہ گر کے " (ص ۱۰۰)

الٰہی دم مری آنکھوں میں پھیر کھا کے نہ آئے " (ص ۱۰۸)

الٰہی، غیر نے کی کون سی وفاداری " (ص ۱۴۱)

الٰہی، تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا " (ص ۱۵۲)

اس بت میں اک خدائی کا جلوہ ہے، اور شیخ " (ص ۱۶۱)

الٰہی، جائیں گے کس گھر یہ ہم سے وحشت ناک " (ص ۱۹۵)

اُکی، خیر ہو، وہ خشم ناک آتے ہیں۔ داغ (ص ۲۳۳)

گھر میں جو پسیتی چار سو تھی ۔ احمد علی شوق قدوائی (مثنوی ترانۂ شوق)
دانتوں سے کھودی لب پہ آئی 〃 〃
چاندی کی رگڑ سیاہی لائی 〃 〃
دانائی تھی ختم اس پری پہ 〃 〃
آزادی کو مشتری نے کھویا 〃 〃
تقدیر کی نارسائی کب تک 〃 〃

تنہائی میں بن شب یلدا ہے قیامت ۔ حسرت موہانی (دیوانِ ششم ص ۷)
رعنائی میں آفت ہیں ترے لب بہ تبسم 〃 (ص ۷)
اب بھی کیا ہم تری یکتائی کا دعویٰ نہ کریں 〃 (دیوانِ چہارم)
یعنی جب یہ ہے کہ فکرِ بے نوائی پھر کہاں 〃 〃
پھر بھی ہے تم کو مسیحائی کا دعوا دیکھو 〃 〃
یعنی ہم نے کس لیے غلطی جتائی آپ کی 〃 (دیوانِ ہشتم)

چاہیے کھائیے یا کوئی قربانی دے ۔ آثر لکھنوی (نغمۂ جاوید، ترجمہ گیتا)
وہ اٹھے ہیں دانائی سے کوسوں دور 〃 〃
خوشی سے مصیبت کوشی مضبوط ہے ۔ 〃 〃
ہستی ہوتی ہے اتنی ہی مبہم ۔ 〃 (نو بہار ص ۱۷۱)
ہستی وہ جو ہم سخن تجھ سے ہوئی ہو برملا 〃 (ص ۱۱۵)

یہ بات پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ لفظ کے آخر سے حروفِ علت کا دبنا اگر بُرا ہے اس لیے اس کو غلط کہنا، بے معنی بات ہے۔ بہت سے مقامات ایسے بھی ہوتے ہیں، جہاں حرفِ علت کا سقوط ہی مناسب بلکہ فصیح ہوتا ہے۔ حروفِ مغیرہ، یعنی کا، کو، اکے، نا، نی، نے، را، ری، رے، اور جو، سو، میں، سا، کر، میں یہ صورت اکثر پیش آتی ہے۔ مثلاً، تم کو ہے وصلِ غیر سے انکار ۔ منہ اس نے چھپایا تو ہنسی آ گئی مجھ کو ۔ تنگ میخانہ تھا میں ساقی نے یہ کیا کر دیا

ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن ۔ دنیا کا ...[illegible] باب مختصر ہیں۔

لیکن یہ قاعدۂ کلیہ نہیں۔ اسماء کی جمعیں (جن کے آخر میں یے یا وے ہوں) یا ایسے افعال جن کے آخر میں یہ حروف یکجا ہوں جیسے تصویریں، دکھیں، دکھیں، ۔۔ ان میں بھی بہت سے مقامات پر حروفِ علت کا سقوط بُرا نہیں معلوم ہوتا ۔۔ اسماء جمع کے بعد اگر کوئی لاحقہ آجائے، جیسے گیسوؤں والا، اس صورت میں عموماً حروفِ علت کا سقوط ہی اچھا معلوم ہوتا ہے، جیسے:
گُل ہیں چراغ گیسوؤں والوں کے سامنے۔

مفرد الفاظ کے آخر سے بھی کبھی کبھی واؤ کا دب کر گھلنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً: ۔ دعویٰ زبان کا لکھنؤ والوں کے سامنے۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ اس کا کچھ تعلق بول چال سے بھی ہے۔ بات چیت میں جن لفظوں میں آخری حرف دب جاتے ہیں، ان کا سقوط شعر میں بھی بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً لفظ گیسو، بہ اظہارِ واؤ مستعمل ہے، لیکن گیسوؤں والا، عموماً بہ سقوطِ واؤ بولا جاتا ہے۔ گیسو رُخ پر ہوا سے ہلتے ہیں (زہرِ عشق) اس مصرع میں گیسو کے واؤ کا دبنا، کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن گُل ہیں چراغ گیسوؤں والوں کے سامنے، اس میں سقوط ہی فصیح ہے ۔ غالب کے اس مصرع میں، لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی واؤ کا اشباع کچھ بھلا نہیں لگتا۔ بات یہ ہے کہ سقوطِ حروفِ علت کا کوئی قاعدہ کلیہ نہیں بنایا جا سکتا۔ درحقیقت اس کا تعلق محلِ استعمال سے ہے۔ اور اس اعتبار سے اس کی خوبی و خامی کا فیصلہ کرنا چاہیے۔

افعال کے آخر سے عموماً اور بہت سے اسما کے آخر سے خصوصاً الف کا گرنا، مخلِ فصاحت ہوتا ہے، جیسے داغ کی اس غزل کی ردیف میں: ۔ لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
رنج بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

ایسے آپ ہندی و فارسی الفاظ کی مفرد شکل کو ... کا بہانہ کر کے اس کو جائز بتاتے رہیے، فصاحتِ کلام منہ پھیرے گی۔

ایسے مرکبات جن میں پہلے لفظ کے آخر میں یائے معروف ہو، گفتگو میں عموماً یہ یؔ دب کر نکلتی ہے۔ نظم میں بھی اس کے دبنے سے کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی، بلکہ حسنِ گفتگو باقی رہ جاتا ہے۔ جیسے یونانی علاج، ہوائی جہاز، کوئی ویرانی سی ویرانی ہے، پیاری پیاری کلائیاں اس کی۔ اس سلسلے میں آرزو لکھنوی مرحوم کے ایک خط کا اقتباس افادیت سے خالی نہیں ہوگا:

"الف، واو اور ی، عربی کے لیے حروفِ علت ہیں۔ مگر اردو کے لیے حروفِ اتمامِ حرکات ہیں، اس وقت کے تلفظ میں دبتے ہوئے آئیں (کذا)، لہٰذا کتابت میں ان کا آنا صرف اظہارِ حرکت کے لیے ہوتا ہے۔ ایسے تمام حروف کا استعمال جائز ہے۔ چاہے وہ عربی و فارسی کے کیوں نہ ہوں۔ مثلاً نفسی نفسی میں پہلی یی بولتے وقت دبتی ہے، لہٰذا اس کا اسقاط ہی فصیح ہے۔ فارسی میں ہائے مختفی کا اسقاط ہی فصیح سمجھا جاتا ہے۔ 'کہ' اور 'چہ' کا واو بھی ظاہر ہو تو غیر فصیح ہے۔ اب یقین ہے کہ آپ سمجھ جائیں گے۔ جو لوگ ہندی کے الفاظ میں بھی ناجائز سمجھتے ہیں، وہ اپنی سمجھ کے مالک ہیں۔ ہمیں دوسروں کے مسلک سے کیا واسطہ۔"

(مکتوب آرزو بنام نفیس منگلوری۔ شائع شدہ ہماری زبان (علی گڑھ)، شمارہ یکم فروری ۶۲ء)

اس خط کے حاشیے میں آرزو صاحب کا یہ شعر بھی لکھا ہوا ہے، جس میں لفظِ نفسی نفسی آیا ہے، اور پہلے لفظ کی یائے معروف ساقط ہو گئی ہے: پڑی ہے ہر اک کو اپنی اپنی، ہے انبیا میں بھی نفسی نفسی
تمھیں کو اک رٹ ہے امتی کی، شفیعِ روزِ جزا تمھیں ہو

آرزو صاحب نے جس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اردو میں حروفِ علت کی کیا حیثیت ہے، وہ خاص طور سے توجہ طلب ہے۔ یہ مسلمات میں سے ہے کہ آرزو صاحب، بہت سے مدعیانِ زبان دانی و قواعد آشنائی سے کہیں زیادہ ان مسائل کے متعلق علم رکھتے تھے۔

جن افعال کے آخر میں یائے معروف ہو، ان کے متعلق کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ کہیں سقوط ناگوار ہوگا، کہیں گوارا۔ یہی صورت اسما کی ہے۔ اس کا تعلق محض محلِ استعمال سے ہے۔ مثلاً یہ مصرعے دیکھیے:

الٰہی خیر کہ اب آگ پاس آن لگی
در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے
آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

ان مصرعوں میں سقوط یا مخلِ فصاحت نہیں ہے لیکن ان مصرعوں میں:

مرے شعلے اٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جاری ہے
مجھ کو تو یار سے ہے آغوشی کا خیال

سقوط قطعاً مخلِ فصاحت ہے۔

مختصر یہ کہ لفظ کے آخر سے حروفِ علت کا دبنا قابلِ قبول بھی ہو سکتا ہے اور ناقابلِ قبول بھی۔ اس کا انحصار محلِ استعمال پر ہے۔ نہ اس میں ہندی و غیر ہندی الفاظ کی تفریق کی جاسکتی ہے، نہ کوئی قاعدۂ کلیہ بنایا جاسکتا ہے کہ یہاں غلط ہے، وہاں صحیح۔ اصل معیار یہ ہے کہ جہاں بھی حروفِ علت کے دبنے سے مصرع کی روانی پر اثر پڑے، وہاں اس کا دبنا غلط ہے، خواہ وہ لفظ کسی زبان کا ہو۔ جہاں یہ صورت نہ ہو، وہاں مطلق عیب نہیں۔

رشوت لینا بہت بڑا گناہ ہے

احترامِ وقت

وقت بہتی ہوئی ایک چنچل ندی
موج در موج ہے وقت کا بانکپن

وقت شام و سحر کا حسیں سلسلہ
وقت کی داستاں انجمن انجمن

وقت بڑھتے ہوئے ایک طوفاں کا نام
وقت وہ قافلہ ہے جو رکتا نہیں

وقت کی کج کلاہی زمانہ شکار
وقت خود سر کسی در پہ جھکتا نہیں

وقت مانندِ پیمانہ گردش میں ہے
فطرتِ وقت ہے اضطرابِ دوام

وقت ہے ایک باغی صفت رہنما
وقت کی مانگ ہے انقلابِ دوام

وقت ہے پرچمِ شوخ و شنگ یوں
جس طرح گل رخوں کا حسیں پیرہن

پیکرِ وقت حرکت میں شعلہ فشاں
رقص میں جس طرح نرتکی کا بدن

وقت کی رہگذر تیرہ و تار بھی
وقت ہی روشنی کا استارا بھی ہے

وقت [illegible] امن و تسکینِ جاں
وقت ٹوٹے دلوں کا سہارا بھی ہے

ایک حالت میں دیکھا نہیں وقت کو
وقت شعلہ بھی ہے وقت شبنم بھی ہے

وقت [illegible] وقت قاتل ادا
وقت ہی زخم دے کا مرہم بھی ہے

وقت [illegible] ہے
وقت اک گیت بھی وقت اک چیخ بھی

وقت کیا ہے فقط ایک قصۂ ماہ و سال
وقت کا کارنامہ ہے تاریخ بھی

وقت نے ڈھا دئیے کتنے اونچے محل
کتنے ایوان نذرِ زمیں ہو گئے

وقت کی مہربانی سے کتنے گدا
تاجور بن گئے شہ نشیں ہو گئے

وقت کے آگے کس کی چلی ہم نشیں
وقت شاہ و گدا سب کا سرتاج ہے

وقت کی سلطنت چند روزہ نہیں
از ازل تا ابد وقت کا راج ہے

وقت ہر لمحہ پیشِ نظر ہے مگر
چہرۂ وقت آنکھوں سے روپوش ہے

جس کی آواز کانوں میں آتی نہیں
وقت کا ساز وہ سازِ خاموش ہے

وقت گزرا تو پھر ہاتھ آتا نہیں
نظمِ وقت کا ہے عجب انتظام

وقت کرتا نہیں ہے کسی کو معاف
وقت لیتا ہے ناقدروں سے انتقام

ساقیٔ وقت کے آخریں ہاتھ سے
زندگی کا چھلکتا ہوا جام ہے

وقت سے بے نیازی کچھ اچھی نہیں
وقت کی قدر کر وقت کا نام لے

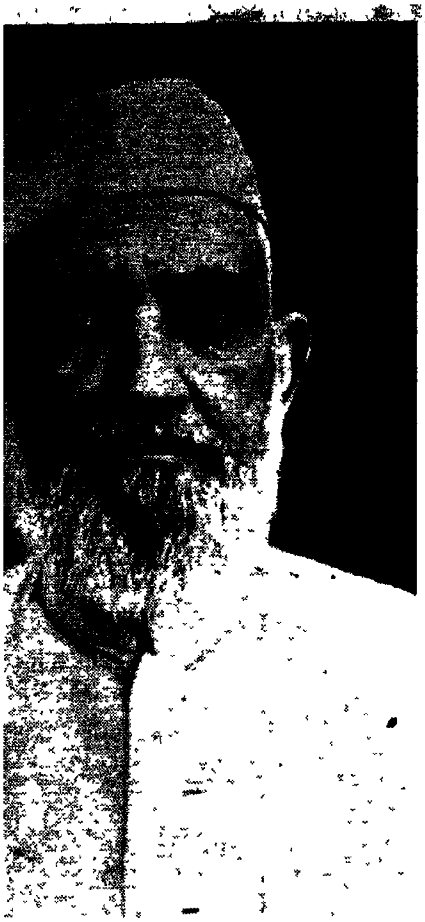
صنو وقت پر جھپٹ لے وہ [illegible]
جن کی تابندگی تا قیامت رہے

وقت کے ساتھ کچھ ایسا بر تاؤ کر
وقت [illegible]

دارالمصنّفین
شبلی اکیڈمی
اعظم گڑھ



مولانا شبلی نعمانی (بانی)



موجودہ ناظم علمی

شاہ معین الدین احمد ندوی



شریک ناظم

صباح الدین عبدالرحمٰن

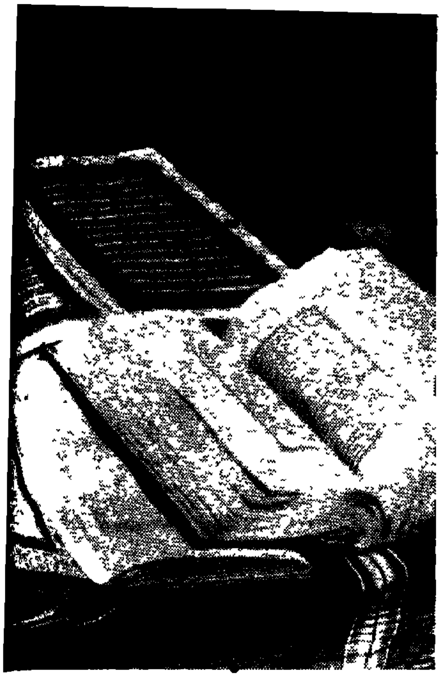


دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے کتب خانے کی عمارت



لائبریری



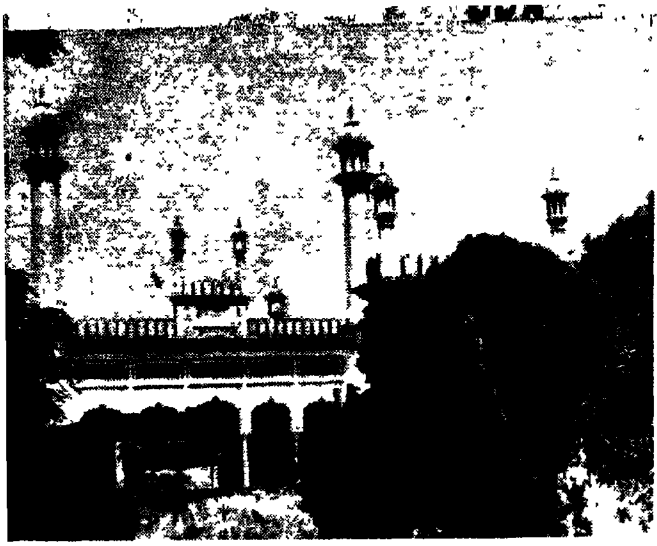


کتسا

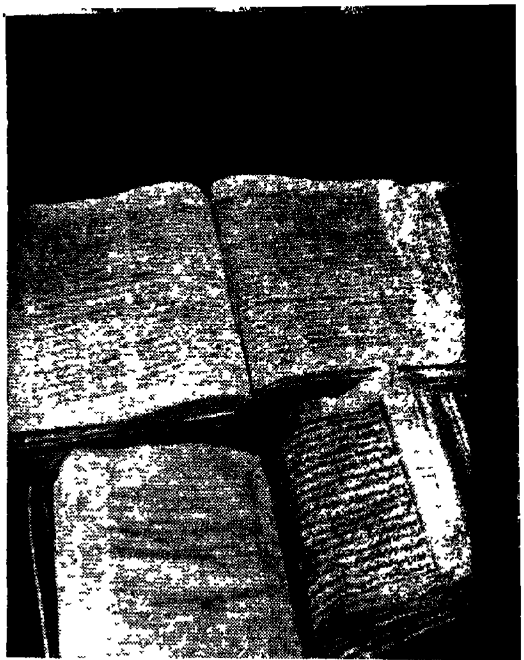
دارالمصنفین



مطبع کے

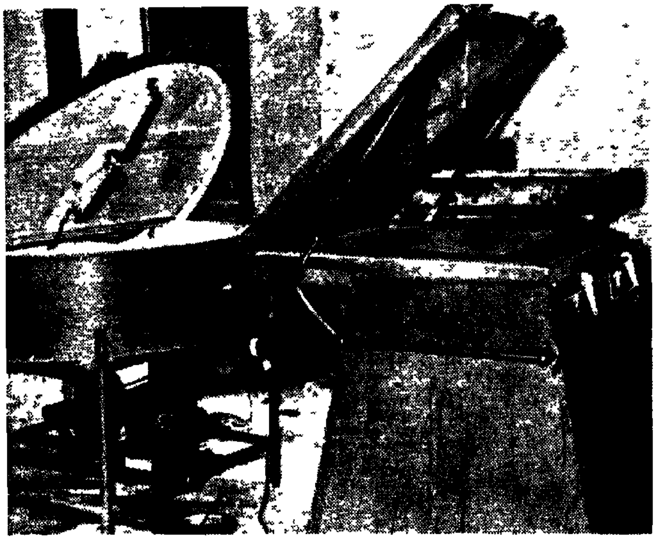


دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی مسجد



طوطات

می اعظم گڑھ

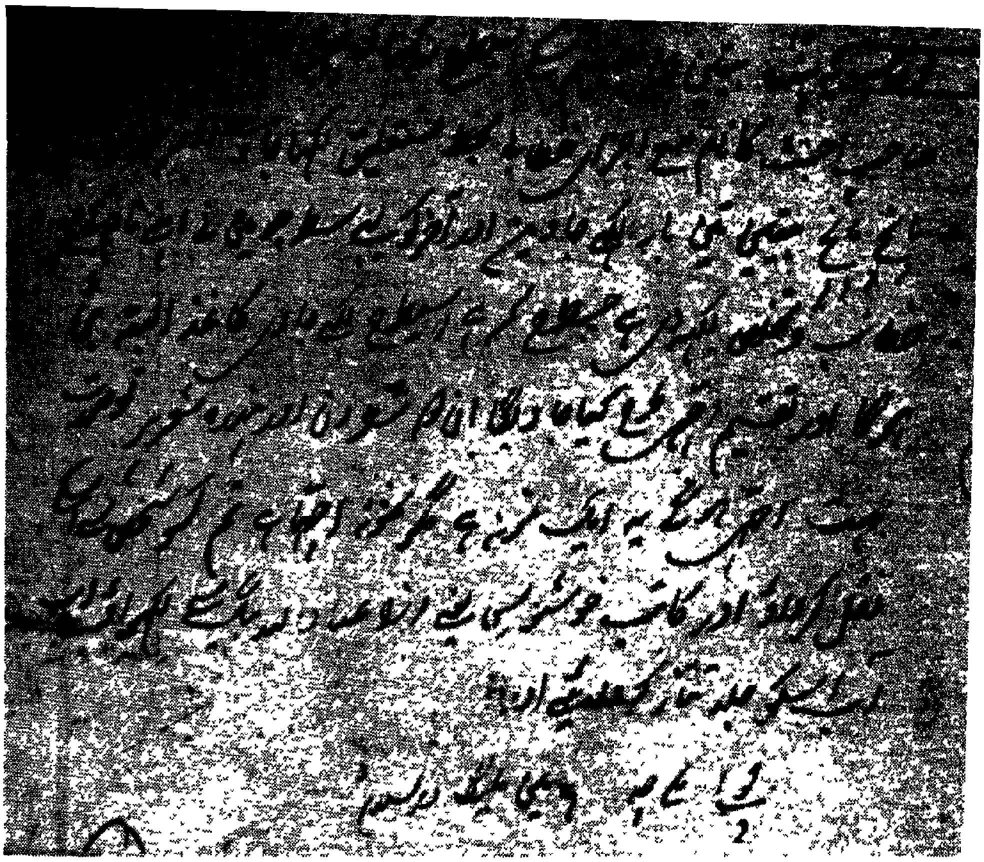


مطبع کی ونڈائنگ مشین



سنگ





غالب کا خط

حکیم غلام نجف خاں کے نام

"تصاویر متعلقہ مضمون" غالب کا ایک نیا خط"

از مالک رام صفحہ ۳ تا ۸



غالب کا قطعہ

ٹامس مٹکاف کی مدح میں

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

دار المصنفین کا طلائی جشن ۲۰-۲۱-فروری ۱۹۶۵ء کو عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند کی صدارت میں منایا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں امید ہے کہ اس کی مختصر تاریخ کا مطالعہ آج کل کے ناظرین کے لیے مفید اور دلچسپ ہوگا۔

یہ ادارہ علوم ہندوستان کے مائۂ ناز ادیب اور اہل قلم مولانا شبلی نعمانی کی آرزوؤں اور تمناؤں کا گہوارہ ہے۔ ان کے ذہن میں اس کا ابتدائی خاکہ ۱۹۱۰ء میں آیا تھا، جبکہ وہ چاہتے تھے کہ مصنفوں کے لیے ایک ایسا پُرسکون اور پُرامن گوشہ بنایا جائے جہاں وہ صرف تصنیف و تالیف کے کاموں میں لگے رہیں۔ ان کو دُکھ تھا کہ جب کوئی مصنف کسی کتاب کو لکھنے کی خواہش کرتا ہے تو اس کے لیے مواد کی تلاش اس کے لیے بڑا ہی صبر آزما ہوتا ہے۔ خود مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ "ان کو اپنی کتاب الفاروق کے لیے مصر اور قسطنطنیہ جانے کی ضرورت ہوئی جہاں ان کو تمام کتب خانوں کو کھنگالنا پڑا۔" اس لیے ان کی خواہش ہوئی کہ جس طرح ایک قوم کا [illegible] بنائی جاتی ہے اسی طرح ایک قومی کتب خانہ [illegible] جس میں ہر قسم کے علوم و فنون کا سرمایہ ہو، اور یہ کتب خانہ [illegible] وقف عام ہو تاکہ پورے ہندوستان کے [illegible] فائدہ اٹھا سکیں اور وہاں تصنیف و تالیف کا کام ہوتا رہے۔

مولانا شبلی کا یہ ارادہ روز بروز پختہ ہوتا چلا گیا اور یہاں تک کہ انھوں نے ۱۹۱۴ء میں مولانا ابوالکلام کے مشہور اخبار الہلال کلکتہ کے ذریعہ سے اس تجویز کو عام طور پر ملک کے سامنے پیش کیا۔ مخصوص احباب کو خاص طور پر اس کی طرف توجہ دلائی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس سے پوری دلچسپی لی۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ کتب خانہ اور ادارہ کہاں قائم ہو۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں قائم ہو، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اپنے وطن بھیکم پور کو اس کے لیے انتخاب کیا، لیکن دار المصنفین کے مرکز کے مسئلہ کا قطعی فیصلہ خود بخود اس طرح سے ہو گیا کہ مولانا شبلی اگست ۱۹۱۴ء میں اپنے عزیز بھائی محمد اسحاق مرحوم وکیل کی وفات کے بعد اعظم گڑھ آئے، تو یہاں ان کو سکون و اطمینان نظر آیا، اور اسی شہر کو اپنے مقاصد کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

مولانا نے اعظم گڑھ میں دار المصنفین کی بنیاد ڈالنی چاہی تو سب سے پہلے اپنے ذاتی باغ اور بنگلہ کو وقف کیا۔ پھر یہ قدر قیمتی کتابیں مہیا کرنی شروع کیں جو بہت جلد چھ سات الماریوں میں بھر گئیں۔ پھر دار المصنفین کے لیے قواعد بنائے، جن کا ایک ضروری جزو یہ تھا کہ اس میں وہی شخص شامل ہو سکتا ہے، جو ادب و انشاء کا ذوق سلیم رکھتا ہو۔ ان سب مرحلوں کے طے ہونے کے بعد اہل قلم

کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا، مولانا کی نظر ندوۃ العلماء کے چند فارغ التحصیل طلبہ کی طرف اٹھی لیکن مولانا نے ان اہل قلم کو جمع کرنے سے پہلے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو داعی اجل کو لبیک کہا، لیکن اپنے بستر مرگ پر اپنے عزیز شاگردوں میں سے مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی مسعود علی صاحب کو تار دے کر بلا لیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی اس وقت پہنچے جب مولانا عالم نزع میں تھے، لیکن ان کی آخری وصیت تھی کہ جس کام کو وہ چھوڑے جا رہے ہیں، اس کو ہر طرح مکمل کریں۔

مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی صاحب نے اعظم گڑھ میں قیام منظور کر لیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی اس وقت دکن کالج پونہ میں پروفیسر تھے، لیکن استاد کی وصیت کی تکمیل کی خاطر اس ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور ایک بہت ہی قلیل رقم میں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں آکر قیام کرنا گوارا کر لیا۔ بعد میں مولانا عبدالسلام ندوی بھی دفتر الہلال کلکتہ سے اعظم گڑھ چلے آئے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اخبارات میں مضامین لکھ کر دارالمصنفین کے قیام کی اطلاع شائع کی۔

مولانا کے ان مخلص شاگردوں کے پاس ایک سترہ بیگھہ کا باغ، ایک کچا بنگلہ اور کتابوں کی چند الماریاں تو ضرور تھیں، لیکن ان کے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا، البتہ ان کے پاس خدمت، ایثار اور اخلاق کا بے پناہ جذبہ تھا، مولانا شبلی کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین نے بھی آگے بڑھ کر اپنے اخلاص کا پورا ثبوت دیا۔ مولانا حمید الدین حیدرآباد میں کافی رسوخ رکھتے تھے۔ انھوں نے حیدرآباد پہنچ کر دارالمصنفین کے لیے مولانا شبلی مرحوم کے وظیفے کی ماہوار رقم دارالمصنفین کے نام منتقل ہو جانے کی کوشش فرمائی۔ جس میں کامیابی ہوئی۔ یہ رقم تین سو روپے ماہوار کی تھی۔ اور اسی چھوٹی سی رقم سے دارالمصنفین کی ابتدا ہوئی، پھر ریاست بھوپال سے بھی اس کے لیے دو سو روپے کی سالانہ امداد مقرر ہوئی۔ ۴ جون ۱۹۱۵ء کو لکھنؤ میں یہ ادارہ دارالمصنفین یا شبلی اکاڈمی کے نام سے رجسٹرڈ ہوا، اور اسی کے ساتھ اس کا کام بھی باقاعدہ طور پر شروع ہو گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی تاسیس میں پورا حصہ لیا، اور اس کا کانسٹی ٹیوشن بھی بنایا، چناں چہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"میں نے طریق عمل و اصول کار کو اسی زمانے میں بصورت اسکیم قلم بند کر لیا تھا، اور وہ موجود ہے۔"

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"دارالمصنفین کے قواعد اعظم گڑھ سے آئے ہیں۔ سوائے چند دفعات کے سب بہتر و انسب ہیں۔ اب آپ جلد رجسٹرڈ کرا لیں اور عملی کام کی صورت نکالیں، ایک دو آدمی بھی ہوں تو کام شروع کرنا چاہیے۔ یہ ایسا معاملہ تھا کہ اس کے متعلق بالمشافہ صحبتیں ضروری تھیں۔"

اور پھر جب ان کو اس ادارے کا آنریری فیلو بنایا گیا تو وہ لکھتے ہیں :۔

"دارالمصنفین کا پراسپکٹس پہنچا۔ مجھے اس سلسلہ میں جو کچھ بنانا چاہیں منظور ہے، آنریری فیلو تو ایک عمدہ بات ہے اگر اس میں کوئی جگہ قلی کی ہو، جب بھی میں منظور کر لوں گا، بشرطیکہ کام ہو اور صحیح صحیح و خالص۔"

پھر رقم طراز ہیں :۔

"دارالمصنفین کے دائرہ کو جس قدر تنگ رکھیے گا اسی قدر وہ حقیقی اور عملی ہوگا، دو چار آدمی اچھے کام کر سکتے ہیں لیکن مجمع جلابیہ کار ہے۔ بڑی چیز یہ ہے کہ آیندہ ایسے نمونے قائم کیے جائیں جن میں حقیقت ہو، اور رسم پیستی و رسم سے احتراز کیا جائے۔ آپ دارالمصنفین کو اس کا پہلا نمونہ بنائیے۔"

پھر ایک دوسرے خط میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

"دارالمصنفین کے لئے ضروری ہے کہ اسے حقیقت اور اصلیت کا نمونہ بنایا جائے اور اس کے دائرہ کو اتنا وسیع نہ کیا جائے کہ ہر اڈیٹر اہل قلم اور ہر مضمون نگار

مصنّف ہو ورنہ سب کچھ بے سود ہے۔ وہ وقت ابھی سے
پیدا کرنا چاہیے کہ اس کا نام سند اور سارٹیفکیٹ کا کام
دے۔"

دارالمصنّفین کے مقاصد پر پھر نظر ثانی کی گئی اور اس کا مقصد یہ قرار پایا کہ اس ادارے کے ذریعہ ملک میں اعلیٰ مصنّفین اور اہلِ قلم کی جماعت پیدا کی جائے، بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف ہو، ان کا غیر زبانوں میں ترجمہ بھی ہو اور ان کی طباعت و اشاعت کا سامان بھی کیا جائے۔

اس کی ایک مجلسِ انتظامیہ بھی تشکیل ہوئی، جس کی صدارت نواب عماد الملک بہادر نے قبول فرمائی۔ انھوں نے اپنے قیمتی مشورں اور گراں قدر عطیوں سے دارالمصنّفین کی امداد کی۔ جسٹس کرامت حسین مرحوم نے نائب صدر ہونا قبول کیا، جنھوں نے علومِ جدیدہ کی ترتیب و تالیف کے اصول پیش کر کے دارالمصنّفین کی رہ نمائی کی۔ اسی مجلسِ انتظامیہ میں سے ایک مجلسِ عاملہ بنائی گئی، جس کی صدارت مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کو تفویض ہوئی، وہ عربی زبان کے بہت بڑے عالم تھے، ان کا وجود ان کی وفات تک دارالمصنّفین کے لیے سرمایۂ اعتماد اور بڑا سہارا بنا رہا۔ مولانا شبلی مرحوم کے محبوب شاگرد مولانا سیّد سلیمان ندوی اس ادارے کے ناظم مقرر ہوئے اور مولانا مسعود علی ندوی کو اہتمام کے فرائض سپرد ہوئے۔ مجلس انتظامیہ میں پندرہ ارکان رکھے گئے جو ملک کے مشاہیر اہلِ قلم اور اہلِ علم تھے۔ دارالمصنّفین کے قیام کے دو سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد اس کے متعدد شعبے علیحدہ علیحدہ قائم ہو گئے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

۱۔ شعبۂ تصنیف و تالیف
۲۔ شعبۂ طباعت
۳۔ شعبۂ اشاعت
۴۔ شعبۂ رسالۂ معارف
۵۔ شعبۂ کتب خانہ

یہ تمام شعبے دارالمصنّفین کے سترہ بیگھے کے احاطے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اب اس کے لیے علیحدہ علیحدہ عمارتیں بھی بن گئی ہیں، جن میں کتب خانہ کی ایک وسیع عمارت ہے۔ دارالاشاعت کا ایک علیحدہ دفتر ہے، پریس اور گودام کی علیحدہ عمارتیں ہیں۔ ناظم، مہتمم اور رفقائے دارالمصنّفین کی سکونت کے لیے علیحدہ علیحدہ مکانات اور کمرے ہیں۔ ایک آرام دہ مہمان خانہ بھی ہے، اور ایک خوبصورت مسجد بھی ہے۔

دارالمصنّفین کے علمی شعبہ میں کام کرنے والے افراد ۲۴ گھنٹے اسی احاطے میں رہتے ہیں۔ وہ گویا اس کے ۲۴ گھنٹے کے ملازم ہیں۔ وہ اپنے تمام اوقات صرف پڑھنے لکھنے میں صرف کرتے ہیں اور یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں شاید کوئی ایسا علمی ادارہ نہیں ہے، جس کی ہر چیز اپنی ہو یعنی اس کا اپنا کتب خانہ بھی ہو، اپنے ۲۴ گھنٹے کے مصنّف بھی ہوں، اپنا مطبع بھی ہو، اپنا دارالاشاعت بھی ہو۔ شروع میں اس کے علمی شعبہ میں صرف مولانا سیّد سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کے سوا کوئی نہ تھا لیکن رفتہ رفتہ ایک اچھی خاصی جماعت یہاں آ کر کام کرنے لگی اور گزشتہ پچاس سال کے اندر اس ادارے نے مختلف علوم و فنون پر حسب ذیل تعداد میں کتابیں شائع کیں:-

(۱) سیرۃ النبی ۶ جلد (۲) سوانح ۲۳ جلد (۳) تاریخ اسلام ۱۴ جلد (۴) تاریخ ہند ۱۷ جلد۔ (۵) ادب ۱۵ جلد (۶) اخلاقیات ۲ جلد (۷) فلسفہ ۱۰ جلد (۸) علم الکلام ۱ جلد (۹) فقہ اسلامی ۲ جلد۔ (۱۰) تعلیمات ۱ جلد (۱۱) لغت ۱ جلد (۱۲) مقالاتِ شبلی ۹ جلد (۱۳) عربی کی کتابیں ۵ جلد (۱۴) متفرقات ۱۱ جلد

ان تمام کتابوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۴۱۴۰۳۹ ہوتی ہے۔

اس ادارے کا ماہوار رسالہ معارف ہے، جو ۱۹۱۶ء سے

پذیر شائع ہوتا ہے اور اب تک ہر مہینہ کی ٹھیک ۱۰ تاریخ کو شائع ہو جاتا ہے، اور گزشتہ پچاس سال میں ایک مہینہ کے پرچہ کی بھی اشاعت میں تاخیر نہیں ہوا۔

دارالمصنفین کی مطبوعات میں سب سے زیادہ مقبولیت سیرۃ النبی کو حاصل ہوئی۔ اس کی پہلی جلد مولانا شبلی مرحوم نے لکھی تھی۔ ان کے بعد ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کو چھ حصوں میں مکمل کیا، جو اس وقت اردو زبان کی مقبول ترین تصانیف میں ہے، اس کا ترجمہ گجراتی زبان میں ہو چکا ہے۔ بنگالی زبان میں بھی اس کو منتقل کیا جا رہا ہے۔ انگریزی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہوا ہے، ترکی میں اس کا ترکی زبان میں اور مصر میں عربی میں ترجمہ ہوا ہے۔ الفاروق مؤلفہ مولانا شبلی نعمانی، سیرت عائشہ مولانا سید سلیمان ندوی اور خلفائے راشدین مؤلفہ حاجی معین الدین ندوی ترکی زبان میں منتقل ہو چکی ہیں۔ شعرالعجم مؤلفہ مولانا شبلی نعمانی کی پانچوں جلدوں کا ترجمہ افغانستان اور ایران کے مصنفوں نے مل کر فارسی زبان میں کیا ہے۔ اسی طرح خیام مؤلفہ سید سلیمان ندوی کا ترجمہ ایران میں فارسی زبان میں ہوا۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے کا ترجمہ بنگالی زبان میں ہو رہا ہے۔ شعرالہند مؤلفہ مولانا عبدالسلام ندوی، گل رعنا مؤلفہ مولانا عبدالحی، تاریخ اسلام مؤلفہ شاہ معین الدین احمد ندوی، تاریخ دولت عثمانیہ مؤلفہ ڈاکٹر محمد عزیز، تاریخ اندلس مؤلفہ سید ریاست علی ندوی اور دوسری کتابیں ہندوستان اور پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں۔ ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد کی طرف سے خیام مؤلفہ سید سلیمان ندوی اور حیات شبلی مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی پر پانچ پانچ سو کے انعامات ساہتیہ اکاڈیمی دہلی کی طرف سے گل رعنا مؤلفہ مولانا عبدالحی صاحب پر پانچ ہزار کا انعام اور اتر پردیش سرکار کی طرف سے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمن اور ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمن پر ایک ہزار اور بارہ سو کے انعام ملے۔

دارالمصنفین کی مطبوعات کی بدولت اس کی شہرت ہندوستان سے نکل کر دوسرے حصوں اور ملکوں میں بھی جا پہنچی ہے۔ اس کے علمی کارناموں کی بدولت افغانستان، ایران، عراق، عرب، مصر، ترکی، انگلستان، فرانس، جرمنی اور امریکہ کے علمی حلقوں سے اس کا تعارف اور علمی ارتباط قائم ہو گیا ہے اور ان ممالک کے اہل علم اور دارالمصنفین کے رفقاء اور مصنفین کے درمیان علمی مسائل اور تحقیقات میں استفادہ، مراسلت اور تبادلۂ خیالات کا ایک سلسلہ قائم ہے، ۱۹۲۱ء میں جب شام کے شہر دمشق میں ایک علمی اکاڈیمی المجمع العلمی العربی قائم ہوئی تو اس نے ہندوستان میں سب سے پہلے دارالمصنفین کی طرف اپنی خیرسگالی کا ہاتھ بڑھایا اور اپنے رسالے المجمع العلمی العربی میں یہاں کی مطبوعات پر حوصلہ افزا تقریظیں لکھیں، اسی طرح مصر کے بلند پایہ رسائل المقتطف، المنار، الزہرا وغیرہ میں دارالمصنفین کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور تصنیفات پر عمدہ تنقیدیں لکھیں۔ معارف کے مضامین بھی ان میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئے۔ اسی طرح دارالمصنفین کی کتابوں کے ترکی ترجموں کی تقریب سے دارالمصنفین اور اس کے رفقاء و مصنفین کے متعلق قسطنطنیہ اور انگورہ کے اخبارات و رسائل میں بلند پایہ مضامین نکلے، اور ان کی علمی خدمات کو سراہا گیا۔ انگورہ میں جب تدقیقات و تالیفات اسلامیہ ہیئت سی کی تاسیس ہوئی اور اس مجلس کو ہندوستان سے علمی تعلقات پیدا کرنے کا خیال ہوا، تو اس نے دارالمصنفین کو اپنا واسطہ بنایا اور اس کے ذریعہ اس ملک سے تعلقات پیدا کیے، فرانس کے ممتاز علمی رسالۂ 'مذہب مسلمان' میں ایک سے زیادہ مرتبہ دارالمصنفین کا نمایاں تذکرہ آیا اور امریکہ بھی دارالمصنفین کے آوازۂ شہرت سے خالی نہیں رہا، مشہور مستشرق پادری زویمر اور مسٹر مرسے وغیرہ نے وہاں کے رسائل میں ہندوستان میں

اسلام اور مسلمان" کے موضوع پر لکھتے ہوئے دارالمصنفین کا تذکرہ کیا اور اس کو "ڈریٹ کنزرویٹو" کا خطاب دیا گیا۔ علاوہ ازیں وہاں کے رسائل کے بعض مضامین میں دارالمصنفین کو "مسلمانوں کی جدید اصلاحی تحریک" کا مرکز قرار دیا گیا۔ کیلے فورنیا یونیورسٹی میں اس ادارے کی علمی سرگرمیوں سے پوری دلچسپی لی جارہی ہے، اور وہاں کے کئی مخطوطے میں اس کی علمی خدمات کی تحسین کی گئی ہے۔ انھیں مختلف ذرائع سے یورپ کے ممتاز اور نامور مستشرقین کے حلقوں تک بھی دارالمصنفین کی علمی خدمات کا آوازۂ شہرت پہنچا۔ ان میں سے خصوصیت کے ساتھ پروفیسر براؤن، ڈاکٹر نکلسن، موسیو لیوی ماسنان، پروفیسر مارگولیتھ، پروفیسر گویلم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر براؤن کو مولانا شبلی کی شعر العجم سے انتہائی عقیدت کی وجہ سے دارالمصنفین سے دلی لگاؤ تھا۔ فرانس کے مشہور مستشرق موسیو لیوی ماسنان کو جب پیرس یونی ورسٹی میں "اسلام میں پیشہ کی اجتماعی حیثیت" پر لکچر دینے کی ضرورت ہوئی، تو انھوں نے بعض معلومات کے لئے مشرق کی اس علمی انجمن کی طرف بھی مراجعت کی۔ ڈاکٹر نکلسن نے معارف کے ناقدانہ مباحث مستشرقانہ معلومات اور مشرقی اور مغربی علوم و خیالات کی آمیزش کی داد دی، اور اس حیثیت سے ہندوستان کی ترقی پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ انگلستان کے پروفیسر گولیتھ اور پروفیسر گویلم سے اور دارالمصنفین کے درمیان بڑی بڑی علمی معرکہ آرائیاں ہو چکی ہیں۔

'معارف' کے سنجیدہ اور تحقیقی لٹریچر کی طرف بھی لوگوں کی توجہ برابر قائم رہی۔ مولانا محمد علی جوہر کو اس رسالہ سے بڑا اُنس تھا وہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میرے متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کر مجلد تیار کرائی جائیں گی۔"

[illegible] ایک خط میں مولانا سید سلیمان کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔ صرف یہی ایک پرچہ ہے، ورنہ ہر طرف سناٹا ہے، بحمداللہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہیں گئیں۔ صرف آپ کی بدولت ایسی جگہ بن گئی ہے، جو خدمت علم و تصنیف کے لیے وقف ہے۔"

پاکستان کے مشہور صاحب قلم عبدالمجید سالک صاحب نے ایک مضمون میں لکھا ہے:۔

"۱۹۱۶ء میں دارالمصنفین کا مشہور و معروف علمی رسالہ معارف جاری ہوا جو بلا مبالغہ دنیا ئے اسلام کا بہترین علمی و تحقیقی رسالہ ہے اور جس نے ہماری تاریخ و تحقیق کے ذخیرے کو مالا مال کر دیا ہے۔"

دارالمصنفین کی علمی شہرت بڑھی تو سیاسی لیڈروں اور رہنماؤں کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھیں، تحریک خلافت اور تحریک نان کوآپریشن کے زمانے کے قریب قریب تمام مشاہیر رہنما اس کے مہمان ہوئے، اور اب بھی وہ ایک ایسا مرکز ہے جہاں مسلمان اور ہندو آنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، بی اماں، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید محمود، خواجہ عبدالمجید، مصطفیٰ احمد خاں شروانی، رفیع احمد قدوائی، چودھری خلیق الزماں، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، سرور نیر حسن، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حفظ الرحمٰن، سید علی ظہیر، مفتی عتیق الرحمٰن، آصف علی فیضی، ڈاکٹر ضیاء الدین، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محفوظ الرحمٰن نامی کے علاوہ گاندھی جی، مالوی جی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر سمپورنانند، اچاریہ نریندر دیو، سے پرکاش نرائن، ونوبا بھاوے جی، شری لال بہادر شاستری، پنڈت گووند بلبھ پنت، پنڈت برودے ناتھ کنزرو، شری وی وی گری، بی رام کرشنا راؤ، سی۔ بی گپتا، کیشو دیو مالویہ

آشوک مہتا، مادام بالا سکسینہ، پروفیسر فراق گورکھپوری، پیارے لال اور سیتا رام بھی یہاں آئے۔ اور اس ادارے کے کاموں اور سرگرمیوں کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ پنڈت موتی لال نہرو یو۔پی کے مشرقی اضلاع کے دورے کے سلسلے میں اعظم گڑھ آتے تو ہمیشہ دارالمصنفین کے مہمان ہوتے، پنڈت جواہر لال نہرو کا بھی ہمیشہ یہی طریقہ رہا۔ اس ادارے سے نفس واپسیں تک ان کو بڑا لگاؤ تھا اور اپنی جیب خاص سے ایک ہزار کی رقم دے کر اس کے لائف ممبر بھی ہو گئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو اس ادارے کی تاسیس ہی کے زمانہ سے بڑی دلچسپی رہی۔ رفیع احمد قدوائی مرحوم بھی اس کے لائف ممبر تھے اور اس کی مالی دقتوں کو دور کرنے میں پوری دلچسپی لیتے رہے۔ اس وقت اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر ڈاکٹر سید محمود سابق وزیر خارجہ حکومت ہند ہیں، اور اس کی مجلس عاملہ کے صدر مولانا عبدالماجد دریابادی ہیں۔ گزشتہ ۱۵ سال سے اس کی مجلس انتظامیہ کے ایک اہم رکن ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریۂ ہند ہیں۔

اس ادارے کی قابل فخر روایت یہ بھی رہی ہے کہ اس نے اپنے کاموں کے لئے کوئی عام چندہ نہیں کیا، بلکہ یہاں کے مصنفین ایثار و قربانی کے ساتھ علم کی خدمت انجام دیتے رہے اور انھوں نے جس قلیل معاوضہ پر اس کام کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں اس کی مثال کسی دوسرے علمی ادارے میں نہیں مل سکتی ہے۔ اس ادارے کے قیام کے زمانہ میں دو عالمگیر بڑی لڑائیاں لڑی گئیں۔ اسی زمانے کی ہوش ربا گرانبازاری اور گرانی میں یہاں کے مصنفین میں بدستور ثابت قدمی باقی رہی۔ اور ان کے ایثار اور استقلال کی وجہ سے اطمینان و سکون کے ساتھ اپنے علمی مشاغل میں لگا رہا۔ تقسیم ہند کے بدلے ہوئے حالات میں اس کی مالی حالت خراب ہو گئی تھی۔ حیدرآباد اور بھوپال کی ریاستوں سے جو سالانہ امدادیں ملتی تھیں وہ بند ہو گئیں۔ جب اس ادارے کی مالی حالت کی طرف پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کو توجہ ہوئی تو انھوں نے حکومت [illegible] ایک رقم امداد [illegible]

یہ ادارہ حکومت کا بے حد ممنون ہے۔ اس امداد سے ادارے کی مالی حالت درست کرنے کی کوشش کی۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی وفات سے کچھ دن پہلے حکومت کشمیر کی طرف سے پانچ ہزار سالانہ کی رقم منظور فرمائی جو ۱۹۶۴ء تک جاری رہی۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے اپنی وزارت سائنٹفک تحقیقات اور ثقافتی امور کی طرف سے تقریباً تاریخ ہند کی تدوین کے سلسلہ میں تیس ہزار کی امداد دی، جن سے (۱و۲) ہندوستان عربوں کی نظر میں جلد ۱و۲، (۳) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام (۴) گجرات کی تمدنی تاریخ (۵) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے اور (۶) ہندوستان کے عہد کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے کی اشاعت ہوئی۔ ان کتابوں کی اشاعت پر پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی نے دارالمصنفین کو لکھ کر داد دی کہ یہ انڈولوجی کی بڑی خدمات ہیں۔ دارالمصنفین کے پیش نظر علمی کاموں میں تاریخ ہند پر ۲۵ جلدیں شائع کرنا بھی ہے، جن میں ۱۷ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ آٹھ جلدیں زیر ترتیب ہیں۔ آخر میں دارالمصنفین کی طرف سے یہ کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا کہ یہ ادارہ اس کا عملی نمونہ ہے کہ کم سے کم خرچ میں کس طرح زیادہ سے زیادہ کام کیا جا سکتا ہے۔ اس ادارے کے موجودہ ناظم علمی مولانا معین الدین احمد ندوی ہیں۔ ناظم امور انتظامی مولانا مسعود علی صاحب ندوی ہیں لیکن انھوں نے اپنی ضعیفی اور علالت کی وجہ سے اپنا سارا کام راقم حروف کے سپرد کر دیا ہے، جو اس وقت شریک ناظم علمی و امور انتظامی کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ اس وقت کتب خانہ کے علمی شعبہ میں حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی، مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی، مولوی [illegible] صاحب ندوی اور دوسرے رفقاء کام کر رہے ہیں۔ اعزازی رفقاء بھی علمی تعاون کیا کرتے ہیں جو اعظم گڑھ سے باہر رہتے ہیں۔ کتب خانہ میں تقریباً بیس ہزار منتخب کتابیں ہیں جن میں ایک ہزار مخطوطات بھی ہیں۔ مختلف شعبوں میں اس وقت نو افراد کام کر رہے ہیں۔

غزل

شباب گردشِ لیل و نہار کیا کہنا   خرام یار و نسیم بہار کیا کہنا
روش روش پہ وہ رنگینیاں خدا کی پناہ   کلی کلی کے وہ نقش و نگار کیا کہنا
نظر نظر میں وہ حرفِ شرابِ عشق علے   رگوں رگوں میں وہ کیفِ خمار کیا کہنا
چھپک چھپک کے اُگا ہے ہر ایک سُو سبزہ   شجر شجر میں وہ جوشِ بہار کیا کہنا
وہ ہلکی ہلکی چھائیں وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا   وہ شاخِ گل وہ لب جوئبار کیا کہنا
وہ بھینی بھینی سی خوشبو فضائے رنگیں میں   وہ مست مست نسیم بہار کیا کہنا
وہ بھولی بھولی سی ساقی کی سُرمگیں آنکھیں   وہ سُرخ سُرخ لب شعلہ بار کیا کہنا
وہ رنگ رنگ کی رکھی ہوئی پیالوں میں   وہ تیز تیز نگاہوں کے وار کیا کہنا
چھلک چھلک کے وہ گرنا لرزتے ہاتھوں سے   جھجک جھجک کے نگاہوں کا پیار کیا کہنا
وہ تاک تاک کے اٹھنا نگاہِ ساقی کا   امید و بیم دل بے قرار کیا کہنا

اسی بہار سے پیدا ہوں ہاشمی وہ شعر
ہر ایک دل کہے دیوانہ وار کیا کہنا

امیدوار و شبِ انتظار کیا کہنا   خیالِ یار و دلِ بے قرار کیا کہنا
جنوں نوازیٔ افتادِ دل خدا کی پناہ   فسوں طرازیٔ اندازِ یار کیا کہنا
تکلّمِ لبِ سحر آفریں معاذ اللہ   تبسمِ نگہِ شرمسار کیا کہنا
تخیلات کی رنگینیاں پناہ پناہ   تصورات کے نقش و نگار کیا کہنا
نگاہ و حشر امید و بیم یا اللہ   نیاز و ناز کے قول و قرار کیا کہنا
دلِ فسردہ نے کھینچی ہے غم کی اک تصویر   پریدہ رنگ کے نقش و نگار کیا کہنا
حسابِ ساعتِ امید و بیم یا اللہ   کتابِ قدرتِ پروردگار کیا کہنا
بہ عشوہ عشوہ نگاہ ہے بہ ناز ناز کرم   بہ قطرہ قطرہ مئے خوشگوار کیا کہنا
ترقیٔ اثر وحشت و جنوں توبہ   تلوّنِ نگہِ ناز یار کیا کہنا
ہر ایک رگ میں لہو بن کے بجلی دوڑا ہے   ادائے جنبشِ مژگانِ یار کیا کہنا

سناؤ ایک سخن ور کو ہاشمی یہ کلام
ترنّمِ دلِ آشفتہ کار کیا کہنا

رشید احمد

فیض آباد

"فیض آباد" پر ایک مضمون قیوم نظر صاحب کا 'صحیفہ' لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔
سید رشید احمد صاحب کا یہ مضمون اس سے قبل ہمیں موصول ہو چکا تھا۔ (ع م)

<u>مقدس سرزمین جس پر شہر فیض آباد آباد ہوا</u>

شہر فیض آباد کی بنیاد ۱۷۲۲ء میں اودھ کی اس مبارک سرزمین پر رکھی گئی جو اپنی عظمت و تقدس اور قدامت کے لحاظ سے سارے عالم میں مشہور ہے، جسے عرف عام میں اجودھیا کہتے ہیں اور جسے قدیم سنسکرت ادب میں اُتر کوشل، ساکیت اور اودھ کے نام سے منسوب کیا گیا ہے، اور جو رام و لچھمن اور سیتا جیسی مقدس ہستیوں کا گہوارہ اور مسکن رہا ہے۔ قدرت نے اسی سرزمین پر اطاعت و فرمانبرداری، صبر و رضا، محبت و صداقت اور وفاکیشی کا وہ عظیم الشان امتحان لیا ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی اور جس کی داستان کو والمیکی کے جادو نگار قلم نے لافانی بنا کر شہرتِ جاوداں حاصل کر لی ہے اور جسے عہد اکبری میں ہندی کے مشہور کوی گوسوامی تلسی داس نے رام چرت مانس یا تلسی رامائن کے روپ میں منتقل کر کے عوام کے لئے غذائے روح بنا لی ہے۔

قدیم ہندو دیومالا کے بموجب جس وقت خالق کون و مکاں شری برہما نے دنیا کی تخلیق کی تو سب سے پہلے اجودھیا کو آباد کیا اور ان کے لڑکے منو کو رہنے اور دارالسلطنت بنانے کو عطا فرمایا۔ دریائے سرجو اسی خطۂ پاک کے بائیں گزرتا ہے۔ اس کی پیدائش پرانوں میں اس طرح مذکور ہے کہ آغازِ آفرینش میں نارائن کی ناف سے کنول کا ایک پھول نکلا جس سے شری برہما پیدا ہوئے۔ وہ ہزار برس تک عبادت حق سبحانہٗ تعالیٰ کرتے رہے۔ نارائن نے خوش ہو کر برہما کو دعا دی اور وفورِ جذب و شوق کے عالم میں نارائن کی آنکھ سے آنسو کے چند قطرے ڈھلک پڑے جنہیں برہما نے ہتھیلی پر لے کر اپنے کمنڈل میں ڈال لیا۔ جب منو پہلا راجہ اجودھیا کا ہوا تو اس کے بیٹے اکشواک نے برہما کی عبادت کر کے دعا کی کہ اس اقلیم کی شادابی کے لئے ایک دریا مرحمت کیا جائے۔ برہما نے خوش ہو کر وہی آنسو کے قطرے اپنے کمنڈل سے نکال کر زمین پہ ڈال دیئے اور دریائے سرجو رواں ہو گیا۔ اسی سرزمین پر شری رام چندر نے اوتار لے کر اپنے بے مثل کردار اور جذبۂ ایثار و قربانی سے سارے عالم کو درسِ استقامت اور صبر و رضا دیا اور قطرہ قطرہ دریائے سرجو کا گناہگاروں کے حق میں دریائے رحمت بن گیا۔

والمیک نے رامائن میں اقلیم اجودھیا کا رقبہ طول میں بارہ یوجن یعنی اڑتالیس کوس اور عرض میں تین یوجن یعنی بارہ کوس تحریر کیا ہے، اور ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں اسے ۴۸ کوس لمبا اور ۴[illegible] کوس چوڑا بیان کیا ہے۔ اقلیم اجودھیا میں راجہ منو سے ۵۵ پشتوں کے بعد راجہ رام چندر کا اوتار ہوا اور راجہ سمترا پر جاکر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ کل ۱۰۰ پشتیں اس خاندان میں حکمراں رہی ہیں۔ اس خاندان کے راجاؤں نے [illegible] ، ترتیا ، دواپر [illegible]

[illegible] کی ۔ اس خاندان کے راجگان جے پور، جودھ پور
اود سے پور اور جموں وغیرہ ہیں ۔ بعد اختتام خاندان راجہ رام چندر اجودھیا بالکل اُجاڑ ہو گئی تھی ۔ مدت تک اجودھیا پر ویرانی کا عالم طاری رہا ۔ بالآخر چوتھی صدی عیسوی کے خاتمہ کے قریب راجہ چندر گپت بکرما جیت نے اسے اپنی قلمرو میں شامل کر کے اس کی از سرِ نو تعمیر و تزئین شروع کی ۔

مادہ لفظ اجودھیا کا سنسکرت میں اجودھ ہے اور اجودھ کے معنی نامغلوب کے ہیں ۔ نیز لج نام برہما کا ہے ۔ لہٰذا اجودھیا کے معنی خالق کا نامغلوب شہر ہے ۔ اجودھیا کو اودھ بھی کہتے ہیں ۔ اودھ کے معنی وعدے کے ہیں ۔ چونکہ راجہ رام چندر نے چودہ سال جلا وطنی اختیار کی تھی اور چودہ سال کے بعد واپس آنے کا وعدہ کیا تھا اس وجہ سے اودھ کہلاتا ہے ۔ ڈاکٹر ولسن نے اس کا مادہ یُدھ بتایا ہے جس کے معنی جنگ ہوتے ہیں اور ان کی تشریح کے بموجب چونکہ یہ شہر بہادر چھتریوں کی جگہ ہے لہٰذا اس نام سے موسوم ہوا ۔ مسٹر گرفتھ پرنسپل سنسکرت کالج بنارس نے نہایت خوبی کے ساتھ رامائن والمیکی کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے اور اس میں اس عہد کے اجودھیا کی شادابی و خوشحالی اور آئین و آرائش کے مرقعے نہایت حسن و خوبی سے پیش کئے ہیں ۔ مشہور چینی سیاح فاہیان اور ہیونتسانگ نے اپنے سفرناموں میں اجودھیا کی آبادی اور شان و شوکت کے ترانے گائے ہیں ۔ اور اودھ کے اس قدیم ترین دیوتائی دربار کے حالات اور اجودھیا کا اس عہد کا جاہ و جلال والمیکی نے ایسی معجز نما فصاحت کے ساتھ دکھایا ہے کہ وہ ہر عقیدت کیش کے لوحِ دل پر لکھ گیا ہے ۔ غرض کہ اس مقدس سرزمین کی عظمت و روایات کی تفصیل سے قدیم سنسکرت لٹریچر بھرا پڑا اور مالا مال ہے اور جس کے سرسری ذکر کے لئے بھی ایک دفتر درکار ہے ۔ اس سے قطع نظر ان سطور کی نگارش سے یہاں محض شہر فیض آباد کی بِنا اور اس کے مابعد کے دربارِ اودھ کے کچھ تاریخی اور تمدنی حالات کا ایک مرقع پیش کرنا مقصود ہے ۔

میر محمد امین کی ہندوستان میں آمد

شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب شہزادہ فرخ سیر سریر آرائے سلطنت تھے ۔ سادات نیشاپور کے ایک فرد وحید میر محمد امین تلاش معاش میں ہندوستان آئے ۔ وہ ایک اچھے مدبر اور جری و بہادر سپاہی تھے ۔ جولائی ۱۷۱۰ء میں اولاً وہ سربلند خاں فوجدار کڑا مانک پور کی ملازمت میں داخل ہوئے اور ۱۷۱۲ء میں اس سے مستعفی ہو کر شاہجہان آباد دہلی پہنچے ۔ یہاں باوجودیکہ شاہی کارخانہ درہم برہم ہو چکا تھا پھر بھی ایک عالی نسب مدبر اور جری و بہادر سپاہی کے لئے معیشت اور ترقی کے دروازے بالکل بند نہ تھے ۔ بعض امرائے دربار کی قدر شناسی سے برسرِ روزگار ہو گئے ۔ رفتہ رفتہ دربارِ شاہی میں رسائی ہو گئی اور بالآخر آگرہ کے صوبہ دار مقرر ہو گئے ۔ سادات بارہہ کی بیخ کنی کے سلسلہ میں حضور شاہ سے سعادت خاں برہان الملک کا لقب اور منصب ہفت ہزاری عطا کیا گیا اور محمد شاہ کے معتمد خاص مقرر ہو گئے ۔

اودھ کی صوبہ داری پر تقرر

یہ دورِ طوائف الملوکی تھا، جبکہ نااہل اور خود غرض اعیانِ حکومت طرح طرح کی سازشوں میں مصروف تھے اور مرکزی حکومت بازیچۂ اطفال بنی ہوئی تھی ۔ بادشاہ کی توجہ خاص اور قدردانی دیکھ کر بعض حاسد اور کم ظرف متوسلین دربار در پردہ برہان الملک کے خلاف ہو گئے اور طرح طرح کی تدبیروں اور سازشوں کے ذریعہ ان کے روز افزوں اثر و اقتدار کو مٹانے اور ان کی کارگذاریوں پر پانی پھیرنے کی کوشش کرنے لگے ۔ اس طرح ایک زبردست جماعت برہان الملک کے خلاف پایۂ تخت دہلی میں تیار ہو گئی ۔ مگر یہ امر واقعہ تھا کہ اس زمانہ میں برہان الملک مسلمہ طور پر سب سے قابل جنرل اور بہترین مدبر خیال کئے جاتے تھے ۔ خداوند عالم نے ان کو ازل ہی سے قوت و امارت کا اہل بنایا تھا اور ان کی فطرت کو جوہرِ حکومت و سلطنت سے آراستہ کیا تھا ۔ ان کے مخالف ہر وقت

[illegible] رجحانات اور ولولوں میں ان کی موجودگی اپنے مضبوطی کے ثبوت پیش کرتے تھے۔ اس لئے جب محمد شاہ نے برہان الملک کی تعریف و توصیف کر کے ان کو اودھ کا صوبہ دار بنا کر دہلی سے روانہ کر دیا گیا جس کی انتظامی حالت ابتر و خراب ہو رہی تھی۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ان کا مقصد ایک جدید سلطنت کی بنیاد ڈالنا تھی اور اس طرح مشرقی تہذیب و تمدن ابھی کچھ اور دنوں قائم رہنا تھا جس کی بدولت اودھ کے ہندو مسلم شرفاء کے خاندان سلطنت مغلیہ کے مٹ جانے کے سوا سو برس بعد تک ادبار و افلاس کے حملوں سے محفوظ رہے اور مشرقی علوم و فنون اور ہندوستان کے اہل کمال کو غیر معمولی سرپرستی حاصل ہوئی۔

نواب سعادت خاں برہان الملک ۱۷۲۲ء میں بادشاہ دہلی کی طرف سے صوبہ اودھ کے نائب مقرر ہو کر آئے تو اجودھیا میں دریائے سرجو کے کنارے لچھمن گھاٹ کے پاس پچھم جانب ایک بلند ٹیلے پر اپنے خیمے نصب کرائے۔ یہاں دور تک کیوڑے کے جنگل کا ایک سلسلہ تھا جس کی وجہ سے وہ خطہ کیوڑے کی خوشبو سے معطر رہتا تھا۔ چند روز کے بعد وہاں پر ایک بنگلہ خس پوش برسات گزارنے کے لئے تیار کرایا۔ اس بنگلہ کے ارد گرد کچی دیواروں کا ایک وسیع احاطہ اتنا لمبا چوڑا تیار کرایا کہ تمام پیادہ و سوار و توپ خانہ اور دوسرے امارت کے کارخانے اس میں سما گئے۔ احاطے کے گوشوں پر چند برج بھی بنائے گئے۔ بعد میں یہی احاطہ قلعۂ مبارک کے نام سے موسوم ہوا۔ نواب کو پختہ عمارتوں سے شوق نہ تھا اس لئے بیگمات کے رہنے کے لئے بھی مکانات مٹی سے بنوائے گئے۔ نواب جب ملک کے دورے سے واپس آتے تو اسی بنگلہ میں قیام فرماتے۔ وہ ایک پیدائشی جری اور بہادر سپاہی تھے۔ ان کو ملکی مہمات و فتوحات و نیز انتظامی امور سے اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ تعمیر شہر پر اپنا وقت صرف کر سکے۔ نیز انھوں نے فطرت سے ایسی سادہ طبیعت پائی تھی جو نمود و نمائش سے یکسر بیگانہ تھی۔ ان کو وقتاً فوقتاً اپنے صوبہ سے باہر بھی مہمات جنگی پر جانا پڑتا۔ اس لئے فیض آباد کی شہرت ان کے وقت میں برائے نام رہی۔

صفدر جنگ کی ہندوستان میں آمد [illegible]

برہان الملک کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ انھوں نے ہندوستان میں اپنا اقتدار جمانے کے لئے اپنی بہن اور بھانجے ابو المنصور مرزا مقیم کو جو بعد میں صفدر جنگ کے لقب سے مشہور ہوئے، ہندوستان بلا لیا اور اپنی بیٹی صدر جہاں بیگم سے شادی کر کے ان کو خانہ داماد بنا لیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اپنے ماتحت ان کو اودھ کی نائب صوبہ داری کے عہدے پر مامور کرا کے امور ملکی سے پوری طرح ماہر کر دیا تھا۔ صفدر جنگ کی علمی استعداد غالباً ماموں سے زیادہ تھی۔ البتہ فنون سپہ گری اور سیاست میں وہ برہان الملک کے سامنے طفل مکتب تھے۔ مگر خدا کی قدرت زمانہ نے موافقت کی، انھوں نے ماموں سے زیادہ ترقی کی اور ۱۷۳۹ء میں برہان الملک کے انتقال کے بعد وہی ان کے جانشین اور صوبہ دار اودھ مقرر ہوئے اور اپنی حسن کارکردگی کی بدولت وزارت کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے صوبہ داران نواب وزیر کے لقب سے موسوم ہوئے۔ برہان الملک کی وفات کے بعد عہد صفدر جنگ میں یہ شہر جسے عوام بنگلہ کہتے تھے فیض آباد کہلانے لگا۔

صفدر جنگ کا زمانہ جس قدر پُر آشوب تھا اتنا ہی ترقی کرنے کے مواقع سے پُر تھا۔ دہلی انقلابات کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ انھوں نے شہر فیض آباد کی تعمیر و تزئین پر مقابلتاً اپنے ماموں برہان الملک سے زیادہ توجہ کی۔ ایسے پُر آشوب زمانہ میں صفدر جنگ کو اپنی طاقت بڑھانے کے نہایت عمدہ مواقع ملے۔ دہلی اور اودھ دونوں ان کی ترقی کے زینے تھے۔ اگر دہلی میں ان کے حریف اور مقابلہ کرنے والے موجود تھے تو اودھ کا میدان بالکل خالی اور صاف تھا اور یہاں خود مختار سلطنت کے قائم کرنے کا بہترین موقع تھا۔ غرض صفدر جنگ نے تھوڑے ہی زمانہ میں اتنی طاقت حاصل کر لی کہ اودھ اور دہلی میں صرف نام کا تعلق باقی رہ گیا۔ فیض آباد کی عمارتیں صفدر جنگ کی سادگی مزاج اور مصروفیت کا پتہ دیتی ہیں۔ سپاہی کو سوائے قلعے اور پڑاؤ کا سامان درست کرنے کے اور کیا مشغلہ ہو سکتا ہے۔ ان کی عالیشان عمارتوں

پسند ہے بجائے اونچی اونچی عمارتوں کے حسن و فن کو قائد نظر سے دیکھنے کا وقت کہاں، اس کے لئے تو محض وقتی فرودگاہوں اور موسمی شدائد سے بچنے کے واسطے پھوس کے چھپر اور اسی طرح کے کم خرچ اور فوری پوری کرنے والی عمارتوں کی حاجت ہوتی ہے اور اس کا اصول تو یہ ہوتا ہے کہ سے ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

شجاع الدولہ کی پیدائش اور تعلیم و تربیت

صفدر جنگ کے بیٹے جلال الدین حیدر بلقب شجاع الدولہ ۱۷۳۱ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ جن کی تعلیم و تربیت پر باپ کی توجہ خاص مبذول ہوئی۔ باکمال استادوں سے انھوں نے فنون سپہ گری اور علوم متداولہ حاصل کئے۔ وہ قوی ہیکل بلند قامت کے خوش رو نوجوان اور فطرتاً نہایت فیاض، جری اور شجاع واقع ہوئے تھے۔ ان کی شادی محمد شاہ بادشاہ دہلی کی بھتیجی منہ بولی بیٹی امۃ الزہرا بیگم عرف بہو بیگم کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے ہوئی جسے شاہِ وقت نے انتہائی تزک و احتشام کے ساتھ جہیز میں بہت کچھ نقد و جواہر دے کر رخصت کیا تھا۔ ۱۷۵۶ء میں صفدر جنگ کی وفات کے بعد شجاع الدولہ سربراہ ریاست اور نواب وزیر مقرر ہوئے جو اودھ کے نوابوں میں سب سے زیادہ عالی ہمت، مشہور اور قابل گزرے ہیں۔ ان کے مخالف بھی ان کی فوجی اور سیاسی قابلیت اور ان کی عالی ہمتی کے معترف و مدّاح تھے۔ صفدر جنگ کے انتقال تک فیض آباد کی آبادی منتشر اور خراب رہی۔ شجاع الدولہ نے اولاً لکھنؤ میں بیشتر اپنا قیام رکھا تھا۔ کبھی سیر کے طور پر فیض آباد آتے تو ایک دو رات رہ کے گورکھپور اور بنارس کی طرف چلے جاتے۔ درحقیقت معرکۂ بکسر میں انگریزوں سے شکست کھانے کے بعد شجاع الدولہ کا گزر شہر فرخ آباد میں ہوا جہاں احمد خاں بنگش سے ملاقات ہوئی جو اس زمانے کے پرانے تجربہ کار شجاعوں میں خیال کئے جاتے تھے۔ انھوں نے شجاع الدولہ کو مشورہ دیا کہ اب کے جب تم جا کے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینا تو میری دو باتوں کو نہ بھولنا۔ ایک تو یہ کہ مغلوں کا کبھی اعتبار نہ کرنا، دوسرے لکھنؤ کا رہنا چھوڑ کر فیض آباد کو اپنا دارالحکومت بنانا۔ یہ باتیں شجاع الدولہ کے دل میں بیٹھ گئیں اور انگریزوں سے معاہدہ ہونے کے بعد فیض آباد کو اپنا مستقل دارالحکومت قرار دیا۔ نئی فوج بھرتی کرنا شروع کی۔ نئے رسالے مرتب کئے اور نئی عمارتوں کی بنیاد ڈالی اور ۱۶ اگست ۱۷۶۵ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے عہد نامہ تحریر ہونے کے بعد وہ فیض آباد کی شہریت کی ترقی پر ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔

شجاع الدولہ کا مستقل قیام فیض آباد

جیسے ہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اپنا مستقر قرار دیا ہے ایک دنیا کا رُخ ادھر پھر گیا۔ ہزارہا خلقت آ آ کے آباد ہونا شروع ہوئی۔ شاہجہان آباد میں یہ حالت تھی کہ جسے دیکھئے فیض آباد جانے کے لئے تیار ہے۔ چناں چہ دہلی کے اکثر باکمالوں نے وطن کو خیرباد کہا اور پورب کا رُخ کیا۔ شب و روز لوگوں کے آنے کا تانتا بندھا رہتا تھا اور قافلوں پہ قافلے چلے آتے تھے جو آ آ کے یہاں بستے اور فیض آباد کی سواد میں کھپتے جاتے تھے۔ چند ہی روز کے اندر ہر قوم و ملت کے خوش باش، اہل قلم، اہل سیف تاجر، صناع اور ہر طبقے اور درجے کے لوگ یہاں جمع ہو گئے اور جو آتا آتے ہی اس چکر میں پڑ جاتا کہ کوئی قطعہ زمین حاصل کر کے مکان بنا لے۔

شجاع الدولہ نے سعادت خاں کی پرانی فصیل کو اعلیٰ پیمانہ پر از سرِ نو تعمیر کرایا اور اس کے گرد ایک گہری خندق تیار کرائی جو دو میل سے زیادہ لمبی قلعہ کے کنارے کنارے چلی گئی تھی جس میں ان کے مصاحب اور فوجی افسران رہتے تھے۔ علاوہ اس کے سوا دیگر دو بڑی دیواریں بطور شہر پناہ کے تعمیر کرائیں۔ فوج کا زیادہ حصہ شہر پناہ کی دیوار پر پہرہ دیتا تھا۔ شہر پناہ جس کی تکمیل ۱۷۷۲ء میں ہوئی تھی کچی بنائی گئی تھی۔ جس کا زیریں حصہ تیس فٹ موٹا اور بالائی حصہ پندرہ فٹ موٹا تھا۔ شجاع الدولہ کا نیا کچا قلعہ اور محل جو دریائے گھاگھرہ (سرجو) کے کنارے تعمیر ہوا تھا وہ جنوری ۱۷۷۳ء سے بنایا جا رہا تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر پر ہزا

مزدور روزانہ کام کرتے تھے۔ اس نئے قلعہ کی دیواریں ساٹھ فٹ موٹی بنائی گئی تھیں اور ایسی مضبوط تھیں کہ ہاتھی کے قدم کے نشانات تک ان پر نہ پڑتے تھے۔ ایک بڑا بازار چوک بھی بنایا گیا تھا جو قلعہ کے جنوبی پھاٹک سے الہ آباد والی سڑک کے پھاٹک تک چلا گیا تھا اور وہ اتنا کشادہ تھا کہ اس کی سڑک پر بیک وقت دس چھکڑے ساتھ ساتھ چل سکتے تھے اور اسی شاہراہ پر تین محرابوں والا پھاٹک ترپولیا تعمیر ہوا تھا۔ شہر پناہ کی دیواروں کے اندر تین نہایت عمدہ پھولوں اور پھلوں کے باغات نصب کئے گئے تھے۔ انگوری باغ جو قلعہ کے اندر تھا۔ موتی باغ جو چوک بازار کے قلب میں تھا اور لال باغ جو سب میں بڑا اور خوب صورت باغ تھا اور جو ٹھیک قلعہ کے باہر تھا۔ شہر کی فصیل کے اندر دو اور باغات تھے۔ عیش باغ اور بلند باغ۔ یہ دونوں شہر کے مغربی کنارے پر واقع ہوئے تھے۔ دیوان آتمارام کے بیٹوں نے سعادت خاں کے احاطہ کے پچھم ایک لمبی بازار جہاں دہلی دروازہ واقع ہے بنوایا۔ اسی طرح اسمٰعیل خاں رسالدار نے وہ بازار بنوایا جو اسمٰعیل گنج کے نام سے مشہور ہے اور بہت سے دیگر مکانات سوداگروں اور دوسرے لوگوں نے تعمیر کرائے اور بعض مغل امراء نے اپنی تفریح کے لئے وسیع باغات لگائے۔

رونق آبادی، ترقی اور خوش حالی

فیض بخش مصنف تاریخ فرح بخش (جو شجاع الدولہ کے ہم عصر تھے) اور غلام علی مصنف عمادۃ السعادت لکھتے ہیں کہ اگر شجاع الدولہ کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو فیض آباد دوسرا دہلی بن جاتا۔ وہ روزانہ صبح و شام دونوں وقت سوار ہو کر خود شہر میں گشت کرتے اور سڑکوں اور گلیوں کی درستی، بازاروں کی ترتیب و صفائی، اور دوکانداروں اور اہل حرفہ کی حالت اور مظلوموں کی دادرسی، یہاں تک کہ رعایا کے متعلق تمام باتوں کو وہ خود دیکھتے اور طے کرتے تھے۔ تجارت کی ترقی اس درجہ تھی کہ افلاس کا پتہ نہ تھا۔ اسی طرح ماہرین فن مثلاً اطباء، شعراء، تاجر، معمار، صناع وغیرہ دوسرے شہروں کو چھوڑ کر فیض آباد آ کر رہنے لگے تھے۔ شہر کی آبادی میں اس قدر تیزی سے اضافہ ہوا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے میں کافی وقت صرف ہوتا اور شاہراہ سے شہر پناہ تک بھی اس قدر کثیر تھی کہ شہر سے باہر ایک بہت بڑی چھاؤنی قائم کرنا پڑی۔ ایک لاکھ بیس ہزار تو صرف پیادہ سپاہی تھے۔ بائیس ہزار سوار اور مخبر تھے جو ہر ساتویں دن دکن اور پندرھویں دن کابل کی خبریں پہنچاتے تھے۔ مرہٹوں، نظام اور ضابطہ خاں وغیرہ کے سفیر بھی نواب کے دربار میں حاضر رہتے تھے۔ عہد شجاع الدولہ میں فیض آباد نے وہ ترقی اور خوش حالی حاصل کی جو اسے پھر کبھی نصیب نہ ہوئی۔

ایران، توران، چین اور یورپ کے سوداگر اکثر شہر میں آیا کرتے تھے جو بیش قیمت سامان لاتے اور نفع کے ساتھ فروخت کرتے۔ مگر نواب نے سونے چاندی کی برآمد کو ممنوع قرار دیا تھا اور تجارت کا ایک توازن قائم کیا تھا جس کی وجہ سے غلہ، کپڑا اور دیگر اشیاء روزمرہ کی ضروریات کی بہت افراط کے ساتھ پائی جاتی تھیں اور انگریزی علاقہ کے مقابلہ میں ارزاں اور سستی بکتی تھیں۔ شہر کی وسعت اور رونق و ترقی کا یہ عالم تھا کہ لکھنؤ سے فیض آباد آنے والی سڑک پر شہر کے چوک سے چار میل دور ممتاز نگر سے شہری آبادی کی چہل پہل شروع ہو جاتی تھی اور باہر سے آنے والے مسافر کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شہر میں داخل ہو گیا ہے۔ سڑک کے کنارے خوانچہ فروش طرح طرح کی مٹھائیاں، پراٹھے، کباب، سالن روٹی اور فرینی کے پیالے فروخت کیا کرتے تھے۔ مختلف قسم کے شربت اور فالودے بھی بکتے تھے اور سبیلیں رکھی جاتی تھیں۔

مشہور مقامات

اجودھیا کی خاک کا ذرہ ذرہ یوں تو متبرک اور مقدس سمجھا جاتا ہے مگر حسب ذیل مقامات اپنی تاریخی عظمت اور تقدس کے لحاظ سے زیادہ اہمیت اور خصوصیت رکھتے ہیں اور کافی مشہور ہیں۔

۱۔ رام کوٹ۔ یہاں راجہ رام چندر کا قلعہ تھا۔ پہلے اس کی عمارت بہت وسیع اور شاندار تھی۔ کتب قدیمہ کے مطابق [illegible]

[illegible] کے نام سے منسوب اور متعلق تھے۔ قلعہ کے [illegible] کی رانیوں کے محل تھے۔ جنم بھوم وہ مقام [illegible] رام چندر کی ولادت ہوئی۔ یہاں شری چیت کو رام نومی کا عظیم اشنان [illegible] ہوتا ہے۔ اسی مقام پر محمد ظہیر الدین بابر شاہ نے ۱۵۲۸ میں ایک بڑی مسجد تعمیر کرائی۔

۲۔ منی پربت۔ روایت ہے کہ جس وقت راجہ رام چندر نے لنکا پر چڑھائی کی اور وہاں پر لڑائی میں اندر جیت کے ہاتھ سے لچھمن جی سخت زخمی ہوئے اور کوئی امید زیست باقی نہ تھی۔ راجہ رام چندر سخت غم و اندوہ میں مبتلا ہوگئے۔ آخر سنکھیا بید کو طلب کیا۔ اس نے سجیون بوٹی بتائی اور کہا کہ اگر صبح ہونے تک یہ بوٹی پہنچ جائے تو البتہ زندگی لچھمن جی کی ہو سکتی ہے۔ چناں چہ اس بہادرانہ خدمت کو ہنومان جی نے اپنے ذمہ لیا اور دوناگرھ پہاڑ پر جا کر شناخت بوٹی سے جب معذور رہے تو اس پہاڑی کو اٹھا کر لنکا لے آئے کہ بید خود بوٹی کو شناخت کر لے۔ اسی پہاڑ کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر اجودھیا میں گر پڑا تھا وہی منی پربت کہلاتا ہے۔ جنرل کننگھم نے اس کی اونچائی ۶۵ فٹ لکھی ہے۔ اس پر ایک چھوٹا سا مندر بنا ہوا ہے۔

۳۔ سورگ دوار۔ دریائے سرجو کے کنارے ۱۲۰۰ گز طول میں ہے۔ کتب قدیم کے بموجب یہ مقام دنیا بھر سے زیادہ متبرک خیال کیا جاتا ہے۔ جو شخص یہاں نہاتا ہے ہزار جنم کے گناہ اس کے معاف ہو جاتے ہیں۔ اس جگہ راجہ نہتا ورسنگھ (راجہ اجودھیا) نے مندر [illegible] درست کر تعمیر کرایا تھا جو اب بھی موجود ہے۔

۴۔ ہنومان گڑھی۔ یہ ایک خاص مقام ہے جو راجہ رام چندر کے متعلق [illegible] کے اندر واقع ہے۔ فتح لنکا کے بعد سری رام چندر نے اپنے [illegible] سرداروں کے متعلق ایک ایک مقام کر دیا تھا۔ چناں چہ یہ مقام ہنومان جی کے متعلق ہوا جو قلعہ کا پھاٹک تھا۔ یہاں ایک [illegible] کا درخت تھا اور اسی کے نیچے ہنومان جی کی پوجا ہوتی تھی۔ [illegible] نواب ابو المنصور صفدر جنگ کے عہد میں ۱۷۴۵ء [illegible] ایک بڑا فقیر کامل تھا۔ ہنومان جی نے اس کو خواب میں اپنے درشن دئے اور تعمیر مندر کی اس جگہ ہدایت کی۔ [illegible] دنوں میں نواب صفدر جنگ اتفاقیہ سخت علیل ہوئے اور [illegible] سے رجوع لائے۔ فقیر نے دعا کی اور دعا کی برکت سے نواب صحت پا کر اس کے نہایت مشکور ہوئے اور فقیر سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ ابھے رام نے کہا کہ وہ اس مقام پر چاہتا ہے کہ ایک مندر بن جائے۔ چناں چہ نواب کے حکم سے یہ مندر تعمیر ہو گیا۔

۵۔ گپتار گھاٹ۔ دریائے سرجو کے کنارے یہ وہ مقام ہے جہاں راجہ رام چندر نے دنیا چھوڑی ہے اور یہیں سے سورگ کو روانہ ہوئے ہیں۔ یہ مقام نہایت متبرک سمجھا جاتا ہے اور جو شخص یہاں اشنان اور پوجا کرتا ہے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ یہاں دریائے سرجو کے کنارے عالی شان مندر بنے ہوئے ہیں۔ کارتک اور کنوار کی پندرھویں تاریخ کو یہاں کثیر تعداد میں لوگ اشنان کے لئے آتے ہیں۔

میلے

اجودھیا میں خاص میلے حسب ذیل ہوتے ہیں:

۱۔ رام نومی۔ راجہ رام چندر کا جنم دن ماہ چیت میں چاند کی نو تاریخ ہے۔ اس میلہ میں ملک کے ہر حصہ سے یاتری بہ تعداد کثیر آ کر دریائے سرجو میں اشنان کرتے ہیں۔ ان کی تعداد کا تخمینہ چار لاکھ ہے۔ دریائے سرجو میں اشنان کرنے کے بعد مندر جنم استھان، کنک بھون اور ہنومان گڑھی میں جا کے درشن کرتے ہیں جو ان ایام میں خاص طور سے سجائے جاتے ہیں۔ اور جہاں شب میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ رام کی پیدائش آدھی رات میں منائی جاتی ہے جب ساری اجودھیا سنکھوں کی صدا سے گونج اٹھتی ہے۔ اسی طرح سیتا جی کا جنم بیساکھ کی نویں تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر بھی مندروں کو خوب آراستہ کیا جاتا ہے اور شب میں چراغاں ہوتا ہے۔

۲۔ ساون کا جھولا۔ ساون کے مہینہ میں دوسرے پاکھ کے تیسرے دن سے شروع ہوتا ہے اور مہینہ کے آخر میں تمام

ہوتا ہے۔ مورتیوں کو (رام، لچھمن اور سیتا کی) خوب سجا کر جھولے پر بٹھایا جاتا ہے۔ مندروں میں جھولا جھلانے کے بعد مورتیوں کو جلوس میں منی پربت پر بھی لے جا کر جھولا جھلایا جاتا ہے۔ جہاں ایک انبوہِ کثیر جھلانے میں شریک ہوتا ہے۔ مختلف درختوں کی شاخوں میں بھی اسی طرح جھولا ڈال کر جھلایا جاتا ہے۔ اس کے بعد مورتیوں کو پھر مندر میں لا کر اپنی اپنی جگہ رکھ دیتے ہیں۔ جھولے کے رسم میں بھی مندر خوب سجائے جاتے ہیں اور چراغاں رات میں ہوتا ہے۔

۳۔ <u>کارتک اشنان</u>۔ اس موقع پر ملک کے ہر گوشہ سے لاکھوں یاتری اجودھیا آتے ہیں اور دریائے سرجو میں نہاتے ہیں اور زیادہ عقیدت مند لوگ پورے مہینہ اجودھیا میں قیام کر کے اور مندروں کے گرد و نیز پوری اجودھیا کے گرد گھوم کر پرکرما (طواف) کرتے ہیں اور اپنا وقت گیان دھیان میں بسر کرتے ہیں۔

۴۔ <u>جل وہار</u>: بھدوا (بھادوں) کی اکادشی کی رات میں (گیارھویں دن) لوگ رام اور سیتا کی مورتیوں کو سجا کر دریائے سرجو پر لے جاتے اور خوب صورت کشتیوں میں رکھ کر انھیں چلاتے اور مذہبی گیت گاتے ہیں۔ کشتیاں روشنی سے جگمگاتی ہیں۔ یہ رسم جل وہار کہلاتی ہے اور رات کے وقت چراغاں سے دریا میں عجیب دلکش منظر پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ <u>رام لیلا</u>۔ یہ رام کی زندگی ڈرامائی روپ میں دکھائی جاتی ہے۔ ماہ اسوج میں مختلف مقامات پر اجودھیا میں ہوتی ہے اور خاص طور پر راج دوار اور لچھمن قلعہ پر منائی جاتی ہے۔ آخری دن راون کی شبیہہ جلائی جاتی ہے۔ اس موقع پر کثیر اجتماع ہوتا ہے:

<u>عمارات</u>

فیض آباد میں چوک کے شاہی پھاٹکوں (تریپولیا) ایک در و اور ترپولیا (تینوں)، کے سوا حسب ذیل عمارتیں عہدِ شاہی کی خاص یادگار ہیں:

۱۔ <u>گلاب باڑی</u>۔ یہ نہایت عالی شان مقبرہ نواب شجاع الدولہ

[illegible]

بہادر کا ہے۔ جو ایک وسیع اور پختہ فصیل کے درمیان واقع ہے۔ فصیل کے چاروں کونوں پر عالی شان برج ہیں اور صحن میں چہار جانب پختہ نہریں ہیں۔ جن میں بے شمار فوارے لگے ہوئے ہیں۔ یہ مقبرہ چوک بازار سے پورب جانب تقریباً دو فرلانگ پر واقع ہے جس میں داخلہ کے لئے دو نہایت بلند اور شان دار پھاٹکوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس کے اندرونی صحن میں انواع و اقسام کے گلاب کے پھول لگائے گئے ہیں اور اسی خصوصیت سے اس کا نام گلاب باڑی رکھا گیا ہے۔ اسے بہو بیگم صاحبہ نے تعمیر کرایا تھا۔

۲۔ <u>مقبرہ بہو بیگم</u>

اس کی عمارت مقبرہ گلاب باڑی سے زیادہ وسیع، شاندار اور بلند ہے۔ اس میں بھی داخلہ دو عالی شان پھاٹکوں کے نیچے سے ہوتا ہے۔ اسے بہو بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد نواب سعادت علی خاں نے تعمیر کرایا تھا۔ اور یہ مقبرہ صفدر جنگ دہلی کے نمونے پر تعمیر کیا گیا جو صفدر جنگ کے مقبرہ سے زیادہ شان دار ہے۔ چھٹی تاریخ محرم کی شب میں یہاں سے ہر سال ایک بڑا جلوس مہندی کا نکلتا ہے جو چوک بازار سے گزرتا ہوا امام باڑہ جواہر علی خاں میں تمام ہوتا ہے۔

۳۔ <u>کوٹھی دل کشا</u>۔ یہ چوک بازار سے جانب اُتر قریب ڈیڑھ فرلانگ پر دریائے سرجو کے کنارے واقع ہے۔ دریا کا دھارا اب یہاں سے ہٹ کر دور چلا گیا ہے۔ اسے شجاع الدولہ نے اپنے قیام کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے گوشوں میں دو مثمن برج بھی بنائے گئے تھے جو اب منہدم ہو گئے۔ انتزاعِ سلطنت کے بعد اس کوٹھی کو محکمہ افیون نے خرید لیا ہے اور اب اس میں اسی محکمہ کے حکام رہتے ہیں۔ اس کی تعمیر ۱۷۶۵ء میں ہوئی تھی۔

۴۔ <u>موتی محل</u>۔ کوٹھی دل کشا کے احاطے سے ملحق دکھن جانب اسے نواب شجاع الدولہ نے اپنے حرم کے قیام کے لئے تعمیر کرایا تھا اور اسی میں بہو بیگم صاحبہ اور دیگر مخدراتِ عالیہ کا قیام تھا۔ عہدِ انگریزی میں مزدوری مرمت اور دیگر حیال (؟) نہ ہونے کے باعث

اس [illegible] ہے۔ صرف چند بوسیدہ دیواریں کھڑی ہوئی اپنے مکین کا ماتم کر رہی ہیں۔ یہ ۱۷۶۴ سے ۱۷۷۵ء تک تعمیر کیا گیا۔

۵۔ امام باڑہ جواہر علی خاں۔ یہ عالی شان امام باڑہ چوک بازار کے شمالی پھاٹک ایک دروے کے باہر اور موتی محل کے درمیان بہو بیگم صاحبہ کے خواص جواہر علی خاں نے تعمیر کرایا تھا جو مذہباً ہندو تھے اور اپنی آقا کے ایسے عقیدت کیش تھے کہ پورے مراسم عزاداری خود انجام دیتے تھے۔

۶۔ مسجد حسن رضا خاں۔ یہ عالی شان مسجد ٹھیک بازار چوک میں پچھم جانب نواب شجاع الدولہ کے مہتمم باورچی خانہ حسن رضا خاں نے تعمیر کرائی تھی جو آج بھی اسی شان و شوکت سے موجود ہے۔

ماں بیٹے کا اختلاف۔ بہو بیگم کا عطیہ وثیقہ

نواب بہو بیگم صاحبہ نے نہایت عالی دماغ، فیاض، مدبر و منتظم اور نیک دل خاتون تھیں۔ ان کے پاس کافی دولت تھی جس کا معتد بہ حصہ وہ اپنے باپ محمد شاہ بادشاہ دلّی کے یہاں سے لائی تھیں اور کچھ حصہ یہاں انھوں نے اپنے حسنِ انتظام کی بدولت ذاتی جاگیروں سے پس انداز کیا تھا۔ ماں بیٹوں (آصف الدولہ) میں یہی امر باعث خفگی و ناراضگی ہوا کہ شجاع الدولہ کے مرتے ہی ان کے بیٹے آصف الدولہ تخت پر بیٹھتے ہی اپنے عیش و عشرت اور طرح طرح کے شوق پورے کرنے کے لئے ماں سے دولت کے طالب ہوئے۔ ماں نے ان کی لطفلانہ خواہشات اور نمود و نمایش پر پیسہ ضائع کرنے کے لئے نہیں دیا۔ اسی پر وہ ماں سے خفا ہو کر لکھنؤ سدھار گئے۔ ماں نے جب تک وہ زندہ رہیں اپنا قیام بدستور فیض آباد میں رکھا اور مرنے سے پہلے اپنی ذاتی دولت اور املاک کو ایک معاہدے کے تحت سرکار انگریزی کے حوالہ کر دیا۔ بہو بیگم ایسی دوراندیش، عالی حوصلہ، فیاض اور نیک دل خاتون تھیں کہ انھوں نے نہ صرف اپنے اعزا اور متوسلین کو بلکہ سارے ملازمان کو جس میں ہندو مسلمان سب ہی شامل تھے ان کی پرورش اور بسر اوقات کے لئے دائمی وثیقے مقرر کر کے ان کی ایک باقاعدہ فرد مرتب کرائی اور اپنی وصیت میں شامل کر دی جس کی رو سے قریب ساڑھے ستائیس ہزار روپیہ ماہوار ان کے پس ماندگان کو بصورت وثیقہ ملتا ہے۔ بہو بیگم کی وفات ۱۵۔ دسمبر ۱۸۱۵ء کو فیض آباد میں ہوئی اور ۱۸۱۷ء سے بعد تحقیقات سرکار انگریزی نے بموجب فہرست یہ وثیقہ تقسیم کرنا شروع کیا جو تا حال جاری ہے۔ نواب بہو بیگم نے بروقت وفات علاوہ دیگر املاک کے قریب نوے لاکھ روپیہ (۸۹۱۶۴۸۹ روپیہ) اور دس لاکھ روپے کے جواہرات وغیرہ چھوڑے تھے۔ انھوں نے مقبرہ صفدر جنگ دہلی، مقبرہ شجاع الدولہ (گلاب باڑی فیض آباد) وغیرہ کے اخراجات مرمت و صفائی، روشنی و قرآن خوانی اور مراسم عزاداری کے لئے مقرر کروائے تھے۔

وفات شجاع الدولہ

شجاع الدولہ نے ۱۷۷۵ء میں دفعتاً ران میں گلٹی نکلنے اور زہر باد کا مادّہ پھیل جانے سے انتقال کیا اور ان کے بیٹے یحییٰ خاں مرزا امانی جو نواب آصف الدولہ کے لقب سے مشہور ہوئے ستائیس برس کی عمر میں ان کے جانشین ہوئے اور تاریخ جلوس یہ لکھی گئی

گشت از پائے آصف الدولہ ؛ رونق مسند وزارت ہند

نواب آصف الدولہ کی شادی دہلی کے رئیس اعظم خان خاناں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اس وجہ سے لکھنؤ اور فیض آباد کو دہلی کے ساتھ ایک دوسرا پیوند محبت نصیب ہو گیا تھا۔ نواب کی ماں امۃ الزہرا بیگم معروف بہ بہو بیگم محمد شاہ بادشاہ دہلی کی بڑی چہیتی بیٹی تھیں۔ ان کا اصلی وطن دہلی تھا۔ اس وجہ سے ان کو اپنے اہل وطن یعنی دہلی والوں سے کمال محبت و ہمدردی تھی اور ان کے ساتھ علی قدر مراتب بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتی تھیں۔ کچھ شعرا پر موقوف نہیں۔ دہلی کے تجار ارباب حرفہ و پیشہ، ارباب نشاط، غرض کہ ہر جماعت اور پیشہ کے لوگ فیض آباد میں بکثرت موجود تھے۔ مشہور تو یوں ہے کہ بہو بیگم صاحبہ کی داد و دہش کا شہرہ سن کر آدھی دہلی ادھر کھچ کر آ گئی تھی۔ پس کچھ عجب نہیں کہ فیض آباد میں اتنا مجمع ہو گیا۔ پھر جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کا رُخ کیا اور اس کو

پیاستقل دارالحکومت بنایا تو یہ ساری محفل فیض آباد سے اُٹھ کر لکھنؤ چلی گئی۔

نواب آصف الدولہ کی فیاضیوں کی خاص و عام میں شہرت تھی اور دُور دُور کے شہروں میں ان کی داد و دہش کا تذکرہ ہوتا تھا۔ لوگ اُٹھتے بیٹھتے عزت و محبت سے ان کا نام لیتے اور اُن کے تمام ذاتی عیوب فیاضی کے دامن میں چھپ کے نظروں سے غائب ہوگئے تھے۔ اور عوام کو نواب کی صورت میں ایک عیش پرست فرماں روا نہیں بلکہ ایک بے نفس اور درویش صفت ولی نظر آتا تھا۔ ہندو دکان دار آج تک صبح کو آنکھ کھلتے ہی بوش عقیدت سے کہتے ہیں۔ "یا آصف الدولہ ولی۔"

فیض آباد کی ادبی اور ثقافتی زندگی کا ذکر

بہو بیگم کے موجود رہنے سے فیض آباد کو ان کی زندگی تک تھوڑی بہت رونق حاصل رہی۔ اگرچہ ان کی زندگی میں نواب آصف الدولہ کی دراز دستیوں نے بیگم کے اطمینان میں خلل ڈالا۔ مگر اس محترم خاتون کی زندگی تک وہ جھگڑے اور ہنگامے بھی ایک گونہ باعث رونق ہو جایا کرتے تھے۔ بہو بیگم کی وفات پر فیض آباد کی تاریخ ختم ہوگئی اور لکھنؤ کے دور کا آغاز ہوا۔

فیض آباد کی اس عہد کی زندگی کا سب سے دلچسپ اور ضروری حصہ اس کی ادبی اور ثقافتی زندگی کا بیان ہے۔ دہلی کی بربادی کے زمانے میں نواب شجاع الدولہ کے مبارک قدم کا شہرہ سن کر اور ان کی بیگم نواب بہو بیگم صاحبہ کی اہلِ علم کے ساتھ شفقت و محبت اور سرپرستی کا حال سن کر دہلی کے بڑے بڑے نامور شعراء اور دیگر اہلِ کمال دہلی سے چلے آئے تھے۔ باہر سے آنے والے شعراء کے علاوہ خود سرزمین فیض آباد کو بھی مشہور اساتذۂ فن کے مولد و مسکن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اُن میں ناسخ و آتش، میر انیس، نواب سید محمد خاں رند، میر علی اوسط رشک، شیخ علی حزیں، منشی امیر اللہ تسلیم، پنڈت برج نرائن چکبست خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے سوا اردو، فارسی اور بھاکا کے بعض ایسے نامور شعراء اور ادباء بھی یہاں گزرے ہیں جن کے ذکر سے ادبی تاریخ اور تذکرے خالی ہیں۔ اردو شعراء کے علاوہ سرزمین اودھ (اجودھیا اور فیض آباد) ہندی اور سنسکرت کے اکثر نامور علماء و فضلاء، شعراء اور ادباء اور دیگر اہلِ کمال کا ملجا و ماویٰ رہی ہے جن کے ذکر سے اردو کا دامن شاید ابھی تک خالی ہے۔ ان سب کا حال بیان کرنا اس مضمون میں ممکن نہیں۔ اسی طرح انتزاعِ سلطنتِ اودھ کے بعد سے زمانۂ حال تک فیض آباد کے تاریخی، تمدنی، اقتصادی اور ثقافتی حالات وغیرہ کا بیان جداگانہ مستقل موضوعات ہیں جو کبھی آئندہ پیش ہو سکتے ہیں۔

ضروری گزارش

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھئے
۲۔ غیر مطبوعہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جبکہ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ اس کے ہمراہ ہوں۔

ریشم کا دل

"تتلیوں کی طرح رنگ برنگ فراک میں ملبوس لڑکیوں میں سے ایک کا نام پرل ہے۔ پرل بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ کرسمس کی تیاریوں میں معروف ہے۔ کیرول بہت اچھا گاتی ہے مگر وہ عیسائی نہیں ہے۔ اس کی ماں جس کی وہ لے پالک ہے، کہتی ہے کہ وہ کرسچن ہے۔ آٹھ سال پہلے اس نے پرل کو یروشلم میں پایا تھا۔ جہاں حضرت عیسیٰ کے جنم دن کی خوشی میں عظیم الشان میلہ لگتا ہے۔ وہاں بھیڑ بھاڑ میں مسز ڈیوڈ کو پرل فوارے کے قریب روتی ہوئی ملی تھی۔

لیکن کالونی کے سبھی لوگ جانتے ہیں، یہ بات درست نہیں مسز ڈیوڈ آٹھ سال پہلے سال بھر کے لئے کالونی سے باہر نہ گئی تھی مگر فلسطین نہیں فلسطین وہ جا ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے پاس اتنے پیسے کہاں۔ مسٹر ڈیوڈ انتہائی تنگ دستی کے عالم میں مرا تھا۔ البتہ مسز ڈیوڈ خواب میں اکثر یروشلم جایا کرتی۔ اور ظاہر ہے خواب میں پرل نہیں ملتی۔

زندگی کے بہتے ہوئے میلے سمندر میں پرل ایک گلاب کا پھول ہے جو ساحل کی تلاش میں بہے جا رہا ہے اور کنارا ہے کہ ملتا ہی نہیں۔

میں نے ایک دن اس کی ممی مسز ڈیوڈ کے کان میں کہا تھا جب میں کرسمس پر ملنے گئی تھی اور مٹھائی بٹ رہی تھی۔ اور اس نے مجھے میری الساڑی دنیا سے باہر کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ پرل میری بیٹی ہے وہ کوئی گلاب کا پھول وول نہیں اور میں اس کی اصل ماں ہوں جس کی گود ہی اس کے لئے کنارا ہے اور باقی سب بکواس ہے۔ اسے کسی چیز کی تلاش نہیں۔

"نام پرل ہے بہت اچھی لڑکی۔ دن بھر پڑھتی رہتی ہے۔ وہ آٹا اور انڈے سے سینڈوچز بہت اچھے بناتی ہے۔ وہ دریچے کے سلاخ سے لگتے ہوئے اسپرنگ سے ہاتھ پہنچتی ہوئی سینڈوچز کی ڈش میرے قریب کر دیتی ہے، اور اپنی اس ٹانگ کو دکھاتی ہے جو تین سال سے پلاسٹر میں قید ہے۔

"اب میں اچھی ہو جاؤں گی مسٹر گدری!"

"اس کی ماں ناراض ہوتی ہے۔" میں نے کتنی بار کہا ہے بےبی مسٹر نہیں انکل گدری بولو۔"

"آئی ایم ساری! مجھے معاف کر دو انکل گدری، پھر وہ اپنی ٹانگ پھیلا کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور سلسلۂ کلام جاری رکھتی ہے۔" پھر جب میرا پلاسٹر کٹے گا ٹھیک اس کے ستر ہویں دن کرسمس ہے۔"

جانتے ہو انکل میں کرسمس میں کیا کروں گی؟"

"تم کرسمس میں چرچ جاؤ گی اور کالونی کی لڑکیوں کے ساتھ عیسیٰ کی ولادت کے گیت گاؤ گی۔

یہ سن کر پرل کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں اور اس کے پاؤں تھرتھرانے لگتے ہیں۔ وہ پاؤں بھی جو پلاسٹر میں دبا ہے۔

مگر کالونی کے تمام لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ مسز ڈیوڈ اس بڑھاپے میں لاکھ جھوٹ بولیں، لوگ یہ ماننے کے لئے تیار

نہیں ہے کہ پہل اس جیسی سو پیر کی لڑکی نہیں ہے جو آٹھ سال پہلے
کالونی کے اکثر گھروں میں جھاڑو دینے کے لئے آتی تھی اور آٹھ سال
قبل ٹی۔بی جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہو کر مر گئی ہے۔

"جانتے ہو مسٹر گرتی!" اس کی ماں مسز ڈیوڈ مسکراتی ہے اور
چھوٹی میز سے گلدان اٹھا کر اس میں نئے موسم بہار کے خوش رنگ پھول لگا کر سجاتی
ہے اور بڑی مسرت سے سینکڑوں بار کے دہرائے ہوئے قصے کی یاد
دہانی کرتی ہے۔

"جانتے ہو، اس وقت رات بھر برف گرتی رہنے کے بعد
صبح صبح آفتاب طلوع ہوا تھا اور یروشلم میں اس بار اتنی بھیڑ تھی، اتنی
بھیڑ تھی، اتنی بھیڑ تھی کہ میں کیا بتاؤں...... (انکل جوزف کہتا ہے، وہ
بتا ہی نہیں سکتی کہ کتنی بھیڑ تھی اس لئے اتنا کہہ کر رہ جاتی ہے)...
سانتا کلاز نیلی پہاڑیوں میں سے لمبی ٹوپی لگائے کسی گاڑی پر سوار
نکلا نہیں تھا......"

"یہ سانتا کلاز کون ہے انکل یونو؟"
ایک روز پلنگ پر بیٹھے بیٹھے پہل نے اپنی مفلوج ٹانگ کو سیدھا
کرتے ہوئے کہا تھا۔ میں نے اس کی مدد کرتے ہوئے اسے بٹھا دیا۔
یعنی فادر کرسمس۔ یہ بڈھا حضرت عیسیٰ کی ولادت کی خبر لے کر
آتا ہے بے بی۔ اور ننھے ننھے بچوں کے لئے خوشیوں کا پیغام لاتا ہے
اور بہت سارے کھلونے اور چاکلیٹ کے ڈبے....."

"اور جانتی ہو پہل، میری بات کاٹ کر مسز ڈیوڈ کہنے لگتی ہے'
جو بچے بھولے ہوں، معصوم ہوں، اُن کے لئے بھی کرسمس کے تحفے لاتا ہے
اور اگر دروازے بند ہوں تو روشن دان اور چمنی کے راستے اپنے سُرخ
لبادے کو سمیٹ کر اندر داخل ہوتا ہے اور بچوں کو کھلونے دیتا
ہے!"

مگر پہل مچل جاتی ہے۔ "نہیں نہیں ممی اس بار میں چرچ
ضرور جاؤں گی اور خوب خوب اچھلوں گی۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب
ہو کے کہتی ہے [illegible] کیا
[illegible]

"انکل [illegible] جانتے ہو [illegible] کتنی قسم کے پھول کھلتے
ہیں۔"

"کتنی قسم کے؟" میں مسرت سے پوچھتا ہوں۔
"سات قسم کے!" اور پہل خوشی سے جھوم اٹھتی ہے۔
"اور کتنے رنگ کے جانتے ہو؟"
"کتنے رنگ کے؟" میں ذرا اور تعجب سے پوچھتا ہوں۔
"چار رنگ کے۔" وہ تالی بجا کر کہتی ہے۔
جواب میں میں نفی میں گردن ہلاتا ہوں۔ "غلط، پانچ
رنگ کے۔"

"نہیں چار رنگ کے!" اس کی تیوری چڑھ جاتی ہے۔ پھر
میں اصرار کرتا ہوں، جواب میں پھر پہل انکار کرتی ہے۔
"سچ بولتی ہو تم بے بی، چار رنگ کے......" میں
اپنی شکست مانتا ہوں، پانچواں رنگ کا پھول تو مسز ڈیوڈ کے گملے
میں کھلا ہے۔" یہ کہہ کر میں اس کی پیشانی چوم لیتا ہوں۔
اور یہ سن کر مسز ڈیوڈ انتہائی خوش ہو کر تالیاں بجاتی ہے۔
"کرکٹ مسٹر گرتی، کرکٹ...... بالکل سچ...!"

پھر مسز ڈیوڈ پہل کی پیشانی کا بوسہ لیتی ہے۔ تب اس کی
آنکھیں چھلک پڑتی ہیں۔ جسے وہ پلکیں جھپکا جھپکا کر گھونٹنے
کی کوشش میں باہر نکل جاتی ہے۔

"میں شام کو بہت جلد لوٹوں گی۔ اور جب تک تمہارے انکل
بھی آفس سے لوٹ آئیں گے۔ دس بج رہے ہیں۔"

باہر نکل کر مسز ڈیوڈ خاموشی سے دروازہ بند کرتی ہے۔ بڑا
سا تالا لگاتے وقت اس کی آنکھیں پھر چھلک پڑتی ہیں......
"جانتے ہو مسٹر گرتی اپنی بیلمی دو دو قیدیں لیتی ہے۔ ایک پلاسٹر
کی قید میں، اور دوسری [illegible] قید میں ... تاکہ وہ
باہر نہ نکل سکے اور کالونی کے گندے لوگ [illegible] جیسی باتیں
نہ کریں......"

[illegible] باتیں
کیا ہوتی ہیں مسٹر [illegible]
مسز ڈیوڈ کو نہیں [illegible] تو ہے۔ مگر کالونی

[illegible] ہیں کہ مسز ڈیوڈ ننھی پرل کو کس ایسی ویسی بالکل [illegible] نہیں جانتی ہے کہ خود مسز ڈیوڈ - وہ دن بھر دفتر میں کام کرتی ہے اور فرصت ملتے ہی جلدی جلدی بازار سے ضرورت کی چیزیں خریدتی ہے اور لپکتی ہوئی اپنے گھر لوٹتی ہے۔ جہاں ننھی پرل اپنی مجبور ٹانگ لئے اس کا انتظار کیا کرتی ہے۔

"جانتی ہو پرل آج میں نے بازار میں کیا دیکھا؟"

جواب میں پرل ممی کو یوں دیکھتی ہے جیسے وہ آج پھر کوئی من گھڑت قصہ سنا کر اس کا دل بہلانے کی کوشش کرے گی۔

"میں کیا بتاؤں مسٹر گلتی، پرل جتنی چھوٹی ہے اتنی ہی بڑی بھی ہے - وہ بڑے ہوشیارانہ پن کی طرح میری طرف تاکتی ہے - اور میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں گویا وہ اس سے پہلے ہی سے واقف ہو چکی ہو۔ کیونکہ جب میں اسے بتاتی ہوں کہ بازار کے نکڑ پر ایک مرغ کو میں نے ڈانس کرتے دیکھا، ایک دم سے فاکس ٹراسٹ ڈانس - تو وہ خوش کر ہنستی نہیں، مسکراتی تک نہیں ہے۔ بلکہ میری طرف ایسے دیکھتی ہے گویا میں بہت بڑی جھوٹی ہوں!"

مسز ڈیوڈ چپ ہو جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کی آواز اس کا ساتھ نہیں دیتی - اس کی آنکھیں چھلک پڑتی ہیں — "میں کیا کر سکتی ہوں گاڈ، میں اس کا دل بہلانے کے لئے اور کیا کر سکتی ہوں...."

"مسٹر گلتی! وہ چھوٹی سی بچی دراصل سب کچھ جانتی ہے، سب کچھ...."

میں گرم گرم چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھاتا ہوں جس کی گہری سنہری سطح سے ہلکے ہلکے بھاپ اٹھ رہی ہوتی ہے۔ پنکھے کی تیز ہوا مسز ڈیوڈ کے سفید بالوں کو پریشان کئے دیتی ہے - وہ [illegible] سڑپ سڑپ چائے پینے لگتی ہے۔

"[illegible] کیا جانتی ہے وہ مسز ڈیوڈ؟"

[illegible] اٹھتی ہے - "کچھ نہیں، کچھ بھی [illegible]

مگر میں اداس ہو جاتا ہوں۔ مسز ڈیوڈ کے [illegible] کون سا راز چھپا پڑا ہے، اس کے اظہار کے لئے وہ تیار نہیں!

کرسمس کے ٹھیک سترھویں دن بے بی کا پلاسٹر کھلے گا مگر لوگ کہتے ہیں کہ وہ پھر بھی چیچ نہیں جا سکتی....!

"کیوں نہیں جا سکتی مسز ڈیوڈ؟" میں اسے چھیڑتا ہوں تو وہ چمک اٹھتی ہے۔

"سب جھوٹ بولتے ہیں مسٹر گا.... دی.... سب جھوٹ بولتے ہیں، کسی کی مجال ہے...."

پھر وہ بہت دیر تک بولتی رہتی ہے۔ اور میں مسکراتا رہتا ہوں - پھر کافی دیر ہو جاتی ہے تو وہ گھر جانے کی اجازت چاہتی ہے - اور چلتے چلتے پلٹ کر میرے کان کے پاس منہ کر کے رازدارانہ انداز سے کہتی ہے۔ "مگر مسٹر گلتی پرل کے سامنے ایسی بات مت کرنا۔ کبھی نہیں، پلیز....!"

پرل ایک مجبور پرندے کی طرح سارا دن کھڑکی سے نیچے سڑک پر آنے جانے والوں کو دیکھا کرتی ہے اور جب اس سے اکتا جاتی ہے تو سڑک کے پرے کیتھولک چرچ کی خاموش لان کو تکتی ہے۔ جس کے بیچوں بیچ ایک چبوترے پر یسوع مسیح گردن جھکائے صلیب پر جھول رہے ہیں جن کے ہونٹوں پر تبسم ہے۔ پرل ایک ایک پل اس دن کا انتظار کرتی ہے جب اس کا بایاں پاؤں پلاسٹر کی قید سے آزاد ہوگا اور ٹھیک اس کے سترھویں دن کرسمس ہوگا۔ جب وہ سفید اسکرٹ پہنے گی اور ڈھیر سے سفید پھول کراسٹ کے قدموں پر ڈال کر شکریہ ادا کرے گی۔

مگر ننھی پرل کی یہ خوبصورت خواہش پوری ہوتی نہیں دکھتی اس کے پلاسٹر والے پاؤں میں بون ٹی۔بی ہے اور یہ پلاسٹر لگ بھگ سات برس تک تو رہے گا ہی - اس کی ماں مسز ڈیوڈ بالآخر ایک دن کہتی ہے۔ تین سال سے پرل کی خواہش ہے کہ وہ کرسمس کی خوشیاں منا سکے اور وہ ہر سال اس کو آئندہ سال پر ٹالتی آ رہی ہے۔

" مگر اس پاس کرنا مشکل ہے مسز ڈیوڈ کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔" پھر میں کیا کر سکتی ہوں۔ یسوع مسیح کی یہی مرضی ہے۔ جہاں میں جھوٹ بولتی آئی ہوں۔ اب مجھ میں یارا نہیں۔ مسٹر گلری۔ تم ہی اسے سمجھاؤ نا۔!"

" لیکن میں کیا کر سکتا ہوں، پرل کے آگے میں بہت مجبور ہو جاتا ہوں۔ میں اسے بہلا ہی نہیں سکتا!"

" مائی سویٹی! تم چاہو تو، فادر کرسمس خود چل کر یہاں تمہارے کمرے میں آ سکتا ہے۔ خواہ دروازے بند ہوں، کھڑکیاں بند ہوں۔۔۔۔!"

" تم جھوٹ بولتے ہو انکل۔" وہ فیصلہ کن انداز سے کہتی ہے اور ہنستی ہے۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے، جب دروازے بند ہوں کھڑکیاں بند ہوں۔"

" ہو سکتا ہے۔ وہ روشن دان کے راستے آ سکتا ہے۔ آتش دان کی چمنی کے ذریعے آ سکتا ہے۔۔۔۔"

" تو میں بھی باہر جا سکتی ہوں چمنی کے راستے، روشن دان کے راستے سے؟"

مسز ڈیوڈ کہتی ہے۔" اسی لئے میں ڈرتی ہوں۔ اور جب گھر سے باہر جاتی ہوں تو دروازے کو اچھی طرح بند کر دیتی ہوں۔۔۔"

موتیوں کی طرح خوبصورت پرل وقت کے کالے جنگلوں میں ایک شگفتہ گلاب کی طرح چکر کاٹ رہی ہے۔ زندگی کا وہ آن جانا ریلا کب آئے گا جو اسے گردشِ دوام سے نجات دلا سکے اور اس کو سرکش کے ساحل پر لگا سکے۔

اس کے لئے ابھی کم از کم تین برس اور انتظار کرنا پڑے گا۔

مگر پرل اس کے لئے قطعی تیار نہیں۔

مگر میں ڈبیہ میں سے مسز ڈیوڈ نے پیکٹ سے سگریٹ نکالا۔ اس کو ڈبیہ پر کھٹکھٹایا۔ پھر اپنے ہونٹوں میں دبانے کی بجائے ڈبیہ میں واپس رکھ دیا۔ اس کا چہرہ آج غیر معمولی طور پر افسردہ تھا۔ میں نے ڈبیہ سے پھر سگریٹ نکال کر اس کے ہونٹوں کے

درمیان لگا دیا۔ اور دیا سلائی دکھا کر ۔۔۔۔۔ آج مسز ڈیوڈ تمہیں بُری طرح یاد آ رہی ہیں؟"

" نہیں مسٹر گلری، ڈیوڈ تو مجھے یاد آتے ہی نہیں۔ جب سے میں نے پرل کو پایا ہے، میں سب کچھ بھول گئی ہوں۔ مگر پرل میری اپنی بچی نہیں ہے نا۔ دوسرے کے بچے اپنے کیسے ہو سکتے ہیں!"

یہاں پہنچ کر اس کی آواز رک گئی۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور آنسو خشک کرنے لگی۔ "آج پرل نے صاف صاف لفظوں میں مجھ سے کہہ دیا کہ وہ میری بچی نہیں ہے اور اسی لئے میں اسے کھیلنے نہیں دیتی۔ اس کو قفل میں بند کر کے رکھتی ہوں۔۔۔۔!"

مسز ڈیوڈ نے خاموشی سے گردن جھکالی۔ اس وقت میں نے دیکھا اس کے چہرے پر اندرونی کرب کا گہرا سایہ منڈلانے لگا۔ اس کی آنکھیں خلا کی طرف اٹھ گئیں اور اس کی جھریوں میں درد کی لہریں بیدار ہونے لگی ہیں۔

" اور اس نے مجھ سے یہ بھی کہا۔ مسٹر گلری کہ وہ زیادہ دن میرے پاس نہیں رہے گی۔ جیسے ہی اچھی ہو گی اپنی ماں کو ڈھونڈ نکالے گی۔ اس غم سے وہ بہت افسردہ بھی رہنے لگی ہے۔ اور شام کے وقت اسے بخار بھی آنے لگا ہے۔"

" مسز ڈیوڈ، پرل ہزار تمہاری بچی نہ ہو، مگر تم تو اس کی ماں ہو! اس سے کون انکار کر سکتا ہے اور وہ خواہ ساری دنیا میں تلاش کر کے دیکھے، ماں کے روپ میں اسے تم ہی ملو گی!"

مسز ڈیوڈ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

غالباً مسز ڈیوڈ کو میری بات سے تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے اپنی خوشیوں کو بیس کشتی میں ڈال رکھا ہے جس کی کوئی سمت اور بے مروتی کے تیز بہاؤ میں بہہ جانے سے مسز ڈیوڈ اس کا تعاقب نہیں کر سکتی۔ وہ کسی مضبوط اور ایک سہارے کی تلاش میں ہے۔ اور تنہائی کے عذاب سے بچنے

[illegible] ایک عزیز کے لئے بھول بیٹھی
ہے۔ اور [illegible] زخم کا اندازہ نہیں کرسکتی۔ مسز ڈیوڈ کا خیال [illegible] کا ردعمل ہے اس کی پرل کے دماغ میں زہر بھر [illegible]

لیکن [illegible] میں کاہن کے لوگوں کا قصور نہیں اور نہ ہی پرل کے دماغ میں کوئی زہر بھر چکا ہے جو اسے اس کی پیاری ممی کے خلاف سوچنے پر تیار کر رہا ہے۔ یہ تو اس کی اپاہج زندگی اور مسلسل حبس ہے جس نے اسے الٹی سیدھی باتیں سوچنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ پابندی، پابندی..... ایک واقعتاً غیر فطری پابندی نے اسے چڑچڑا بنا دیا ہے۔ جیسے ہی وہ نجات پائے گی، ننھی پرل گلاب کی نوشگفتہ کلی کی طرح ہو جائے گی۔

تین ماہ کے بعد جب میں گاؤں سے واپس لوٹا، تو کرسمس گزر چکا تھا۔ گاؤں میں رہ کر میں پرل کے لئے کوئی تحفہ نہ بھیج سکا۔ اس لئے شہر پہنچ کر میرا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ بازار سے چند اچھے اچھے کھلونے اور چاکلیٹ کا ڈبہ خریدا، نکڑ والی دکان سے چھوٹے چھوٹے جوہی کے پھول لیئے اور سیدھا مسز ڈیوڈ کے دروازے پر دستک دی۔

"ایکسکیوز می مسز ڈیوڈ، میں کرسمس میں حاضر نہ ہو سکا،" میں نے کھلونے، چاکلیٹ کا ڈبہ اور پھولوں کا پیکٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "یہ پرل کے لئے ہے!"

اس نے گردن اٹھا کر خاموشی اور تعجب سے میری طرف دیکھا۔ "پرل یہاں نہیں ہے مسٹر گلتی!"

"کیوں، کہاں گئی؟" میں نے اندر کمرے میں جھانکنے کی کوشش کی۔

"وہ [illegible] میں چلی گئی، روشن دانوں کے راستے سے!"

"کیا۔؟" میں سمجھ نہ سکا۔

"ہاں وہ مر گئی!" مسز ڈیوڈ خاموشی سے پانی میں بھیگی ہوئی دیوانی کی طرح کرسی پر بیٹھ گئی۔

"مگر کب؟ کیسے؟؟"

"ٹھیک کرسمس کی رات کو، اس کو تیز بخار تھا۔ صبح تک وہ بستر میں گٹھڑی کی طرح پڑی رہی۔ میں اسے لاکھ جگانے کی کوشش کرتی رہی، مگر اس نے آنکھیں ہی نہ کھولیں۔ پھر بہت دیر بعد ہڑبڑا کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔ اور بلند زور سے چلانے لگی۔ میں جاؤں گی، میں چرچ جاؤں گی..... پھر اسے قے آئی، خون کی قے....."

"مسٹر گلتی، نیچے شور ہوتا رہا۔ لوگ چیخ چیخ کر کیرول گاتے رہے۔ اور پرل نے دم توڑ دیا....."

مجھے تعجب ہو رہا تھا۔ ساری باتیں مسز ڈیوڈ کتنے اطمینان سے کہہ رہی تھی۔ جیسے کوئی غیر متوقع واقعہ نہ ہوا ہو!

"یہ کیسی عجیب بات ہے مسٹر گلتی، فادر کرسمس کسی کے لئے تحفے لاتا ہے، ولادت کی خوشیاں لاتا ہے اور کسی کے لئے.....!"

پھر وہ خود مجھے بہت دیر تک تسلی دیتی رہی۔ گویا وہ غم مجھے ہی ہوا ہے۔ میں چپ چاپ گردن جھکائے، اس کی باتیں سنتا رہا۔ جب میں چلنے کے لئے کھڑا ہوا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مجھے کہیں سے ایک چھوٹا سا بچہ لا دو مسٹر گلتی....!" مسز ڈیوڈ پھوٹ پڑی۔ "جو یہ نہ جان سکے، میں اس کی ماں نہیں ہوں۔ اور..... جو مجھے چھوڑ کر چلا نہ جائے... اس کے ضبط کا بند ٹوٹ پڑا.....

ایک دھواں سا کہیں سے اٹھا اور میرے احساسات پر طاری ہو گیا۔ میرا حلق خشک ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر مسز ڈیوڈ کا بوڑھا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کی جھریوں میں درد ہی درد کروٹ لے رہا تھا۔ ایک لمحے تک اسے تکتا رہا۔ پھر اس کی پیشانی پر ایک افسردہ سا بوسہ دے کر اپنے کلیجے سے لگا لیا.....!

سرمایہ لگانے کا
ایک اچھا منصوبہ

اب تک ۱،۲۰،۰۰۰ سے زائد اشخاص یونٹ خرید چکے
ہیں اور ہر روز مزید درخواستیں موصول ہو رہی ہیں

اہم فائدے کیا ہیں؟

جب آپ یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا کے یونٹ خریدتے ہیں، تو ۱۰۰ سے زائد صنعتی اداروں پر مشتمل مختلف کفالتوں یعنی ٹرسٹ کی تمام سرمایہ کاریوں میں آپ کا مفاد قائم ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے لئے یونٹوں میں لگے سرمائے کی طرف سے اندیشہ کم سے کم ہو جاتا ہے۔

آپ کو مسلسل آمدنی بھی ہوتی ہے۔ یونٹ ہولڈروں میں جو منافع تقسیم کیا جاتا ہے، وہ سرکاری کفالتوں، صنعتی ڈی بنچروں، ترجیحی حصص اور عام حصص پر مشتمل ایک خوب متوازن ڈھیر کی آمدنی پر مبنی ہوتا ہے۔

فرد یونٹ ہولڈروں کو ۱۰۰۰ روپے تک کی دی جانے والی آمدنی انکم ٹیکس سے بری ہوتی ہے کیونکہ ان کی کل آمدنی کا حساب لگاتے وقت یہ رقم شمار نہیں کی جاتی۔

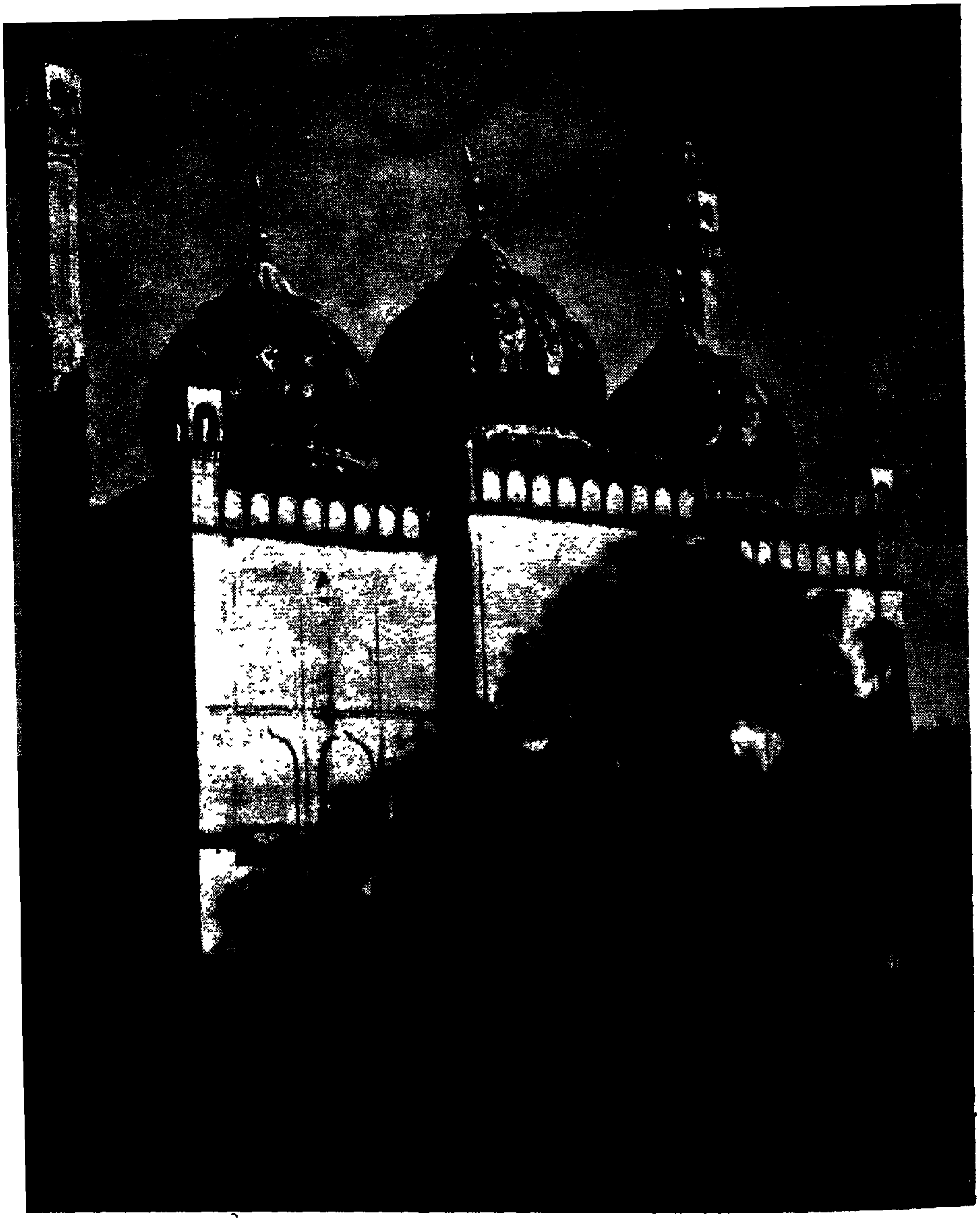
یونٹوں میں لگا سرمایہ آپ واپس کر سکتے ہیں کیونکہ آپ یونٹ ٹرسٹ کی روزانہ معین و اطلاع کردہ قیمت پر یونٹ واپس بیچ سکتے ہیں۔

یونٹ خریدیئے، یہ بچتوں کو سرمایہ بنانے کا بہترین ذریعہ ہیں

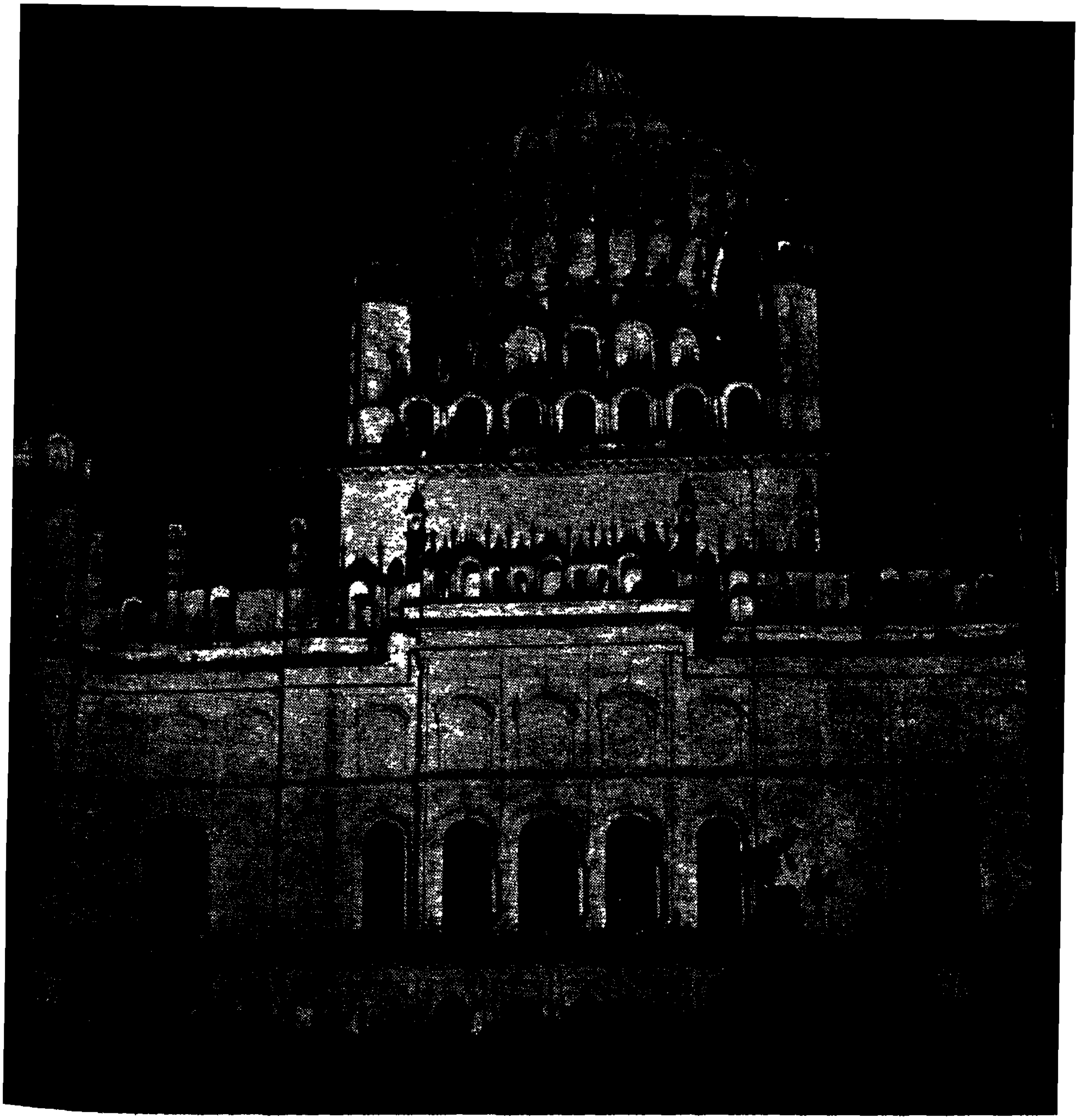
یونٹ اب ملک بھر کے چیدہ شیڈولڈ بنکوں کی سبھی شاخوں سے خریدے جا سکتے ہیں

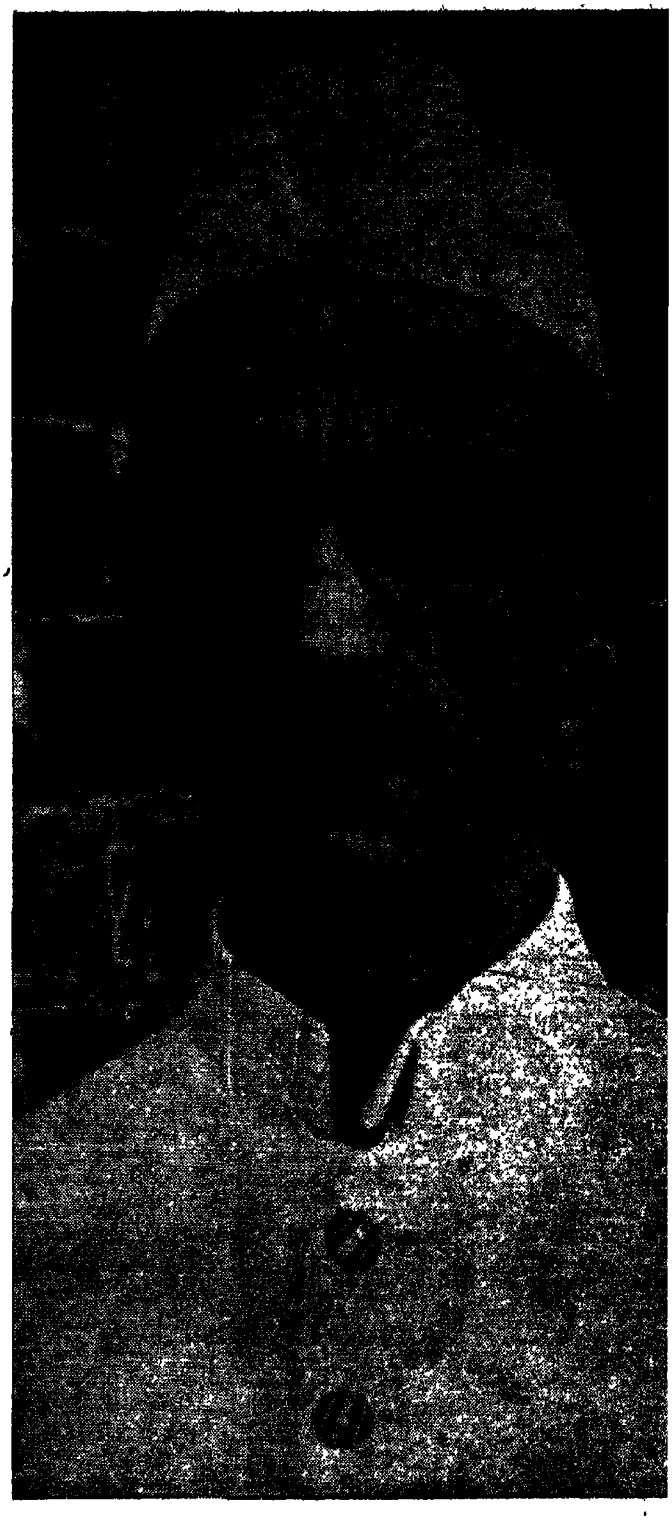
یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا

امر بلڈنگ، فیروز شاہ مہتہ روڈ، بمبئی ۱



گلاب باڑی مسجد فیض آباد





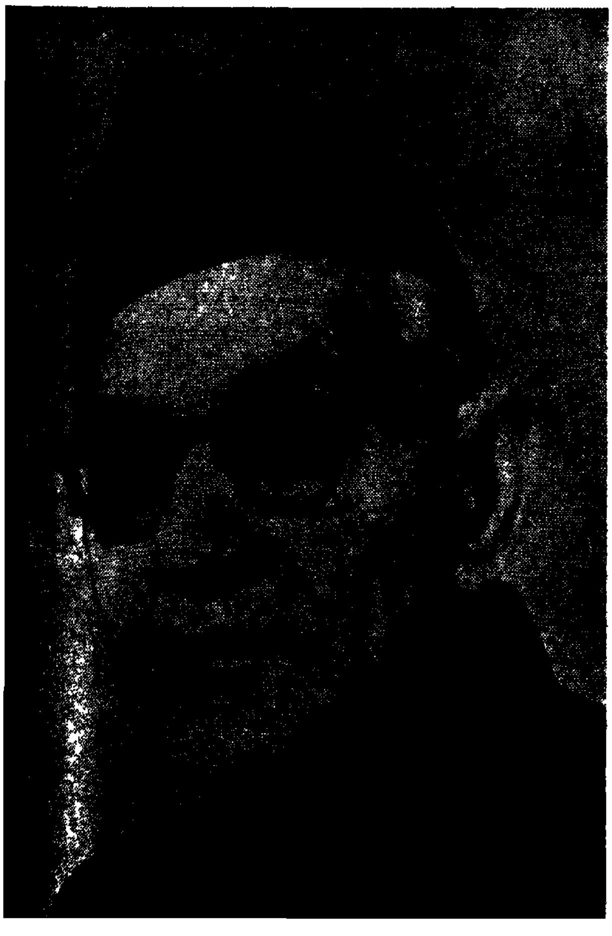
جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر اور اردو کے مشہور ادیب

پروفیسر محمد مجیب

آپ کو 'پدم بھوشن' کا اعزاز ملا ہے

پنڈت آنند نرائن ملا

میری حدیثِ عمرِ گریزاں آپ کے مجموعۂ نظم کو اس سال ساہتیہ اکادمی کا پانچ ہزار روپے کا انعام ملا ہے۔



ہندوستان کا مجلہ اردو ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:۔ عرش ملسیانی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:۔ شہباز حسین

ترتیب

سرورق:۔ جشنِ جمہوریہ کا جلوس

رسالہ کی پشت پر:۔ بدھ جینتی پارک

سالانہ چندہ:۔
ہندوستان میں:۔ سات روپے
پاکستان میں:۔ سات روپے (پاکستانی)
غیر ممالک سے:۔ اشلنگ یا پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ
ہندوستان میں:۔ ۷۰ پیسے
پاکستان میں:۔ ۷۰ پیسے (پاکستانی)
غیر ممالک سے:۔ اشلنگ یا ۱۰ سینٹ

جلد ۲۳ — نمبر ۸

پھاگن شک سمت ۱۸۸۶

مارچ سنہ ۱۹۶۵ء

مرتبہ وزارت نشر و اطلاعات

ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ

مضامین و خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر آج کل، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ملاحظات

اس سال بھی ۲۶ جنوری کو جشنِ جمہوریت منایا گیا۔ یہ جشن ہندوستان کی قومی یکجہتی اور تہذیبی ترقی کا آئینہ دار ہے۔ اس روز یہ جشن اہلِ ملک کو یہ پیام دیتا ہے کہ انھیں آپس میں مل جل کر رہنا ہے۔ رواداری، یگانگی اور محبت ان کا شعار ہونا چاہیئے تاکہ وہ دنیا کو دکھا سکیں کہ ہندوستان کے عوام مختلف مذہبوں کے پیرو ہوتے ہوئے مختلف عقیدوں کو مانتے ہوئے اور مختلف زبانیں بولتے ہوئے بھی ایک ہیں۔ ان کا اتحاد محکم ہے اور وہ دنیا میں بقائے امن کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔

انڈونیشیا نے مجلسِ اقوامِ متحدہ کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ یہ امر نہایت افسوس ناک ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ جو ملک اس مجلس کے رکن نہیں وہ رکن بن جائیں نہ کہ جو رکن ہیں وہ بھی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں۔

انڈونیشیا کو آزادی حاصل کئے بہت مدت نہیں ہوئی ہے۔ اسے ترقی و بہبود کو تمام دنیا سے وابستہ کرنا چاہیئے۔ کچھ سیاسی مبصروں کا یہ خیال ہے کہ انڈونیشیا جنوب مشرقی ایشیا میں چین کی پالیسی کا ہم نوا ہوتا جا رہا ہے۔ اگر یہ ایسا ہے تو واقعی افسوس ناک ہے لیکن ابھی تک ایسا یقین کرنے کے لئے ہمارے پاس وجوہ نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ملائشیا اور انڈونیشیا کا جھگڑا وقت کے ساتھ ختم ہو جائے گا اور یہ فساد گالا وقت جلد آئے گا کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ دونوں ملکوں میں سے کوئی ملک بھی جنگ کا خواہاں نہیں۔

سرونسٹن چرچل کا انتقال ہو گیا اور ایک بہت بڑی ہستی چل بسی۔ انھوں نے بڑی طویل عمر پائی اور ان کے کارنامے نمایاں اختصار کے ساتھ بیان کرنا ایک مشکل سی بات ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں نیشنل گورنمنٹ بنی تو یہ وزیراعظم تھے۔ انھوں نے ملک میں افسردگی پھیلنے نہیں دی۔ اپنے تدبر اور اپنی بہادرانہ تقریروں سے برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کے حوصلے پست نہیں ہونے دئے۔ آخر کار ہٹلر اور اس کے خون آشام ساتھیوں کا خاتمہ ہوا اور فتح کا سہرا سب سے زیادہ چرچل کے سر تھا۔ وہ ایک بہت بڑے مقرر تھے ان کی تقریروں میں فصاحت کے ساتھ ساتھ طنز کا تیکھا پن بھی ہوتا تھا وہ دشمن کو کبھی معاف نہیں کرتے تھے۔

انھوں نے ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کو کبھی پسند نہیں کیا اور وہ ہندوستان کو آزادی دینے کے مخالف رہے۔ اس کے باوجود ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ وہ ایک بڑے سیاست دان، رہبرِ ملک اور مقرر تھے۔

انگریزی کے مشہور شاعر اور نقاد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا بھی انتقال ہو گیا۔ انھوں نے جدید نظم اور تنقیدِ جدید کی بہت خدمت کی ہے۔ صرف انگریزی بولنے والوں ہی میں نہیں بلکہ دوسری زبانیں بولنے والوں میں بھی ان کے معتقد بڑی تعداد میں ملیں گے۔ انھوں نے دنیا کے ادب پر بڑا اثر چھوڑا ہے۔

مقامِ مسرت ہے کہ ملک کی غذائی صورتِ حال پہلے سے بہتر ہو گئی ہے۔ اب وہ افراتفری اور واویلا دکھائی نہیں دیتا۔ اناج کی قیمتیں کم ہو رہی ہیں اور اس پر امید بھی نظر آ رہی ہے کہ اگلی فصل بہت اچھی ہوگی۔ اہلِ ملک کو اس صورتِ حال میں بھی کسی قسم کی غلط روی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ ذخیرہ بازی سے پرہیز لازم ہے کیونکہ غذائی مشکلیں پیدا کرنے میں اسی کا ہاتھ ہے۔

مظفر قریشی بھنڈاروی

ناگ پور

ناگ پور اہلِ ہنر اہلِ درایت کا مقام — صنعت و حرفت کی منڈی، نفع گاہِ خاص و عام
ست پڑہ کے چہرۂ شفاف کا فخر و غرور — بمبئی صوبے[1] کی پیشانی کا سورج، دل کا نور
ہند کے وسطی علاقوں میں سکوں پرور مقام — جیسے رُکنِ شعر میں "تسکینِ اوسط" کا قیام
ناگ ندی کا تموج، وین گنگا[2] کا چڑھاؤ — وجہِ جوشِ سیلِ کنہان اور وردھا کا بہاؤ
خوش نما، خوش رنگ ٹیلے، لالہ در دامنِ پہاڑ — کف[3] بہ کف، گرداب در آغوش پرنالوں کی باڑ
گونڈ راجاؤں کی سعیِ کامران و دل پسند — یادگارِ خاص و تاسیسِ یدِ "بخت بلند"[4]
خاندانِ "راجہ اعظم شاہ" کا نقشِ حسیں — "راجہ رگھوجی" کی تاریخِ امارت کا امیں
سیتا بلڈی کی پہاڑی، "قلعۂ لو" کی بہار — فوجیوں کے امن و آسائش کی پختہ یادگار
مرہٹوں کا خون، افرنجی پسینہ اس میں ہے — حوصلہ مندی و حکمت کا دفینہ اس میں ہے
"ناگیوں"[5] کی جنم بھومی، پنڈتوں کی آرتی — سادھوؤں کی "دان پتری"، جوتشیوں کی آرسی
خوش نما بارہ دری، در عرصۂ "کستور چند"[6] — یادگارِ "گونڈوانہ"، بے نظیر و دل پسند
آج سے دو سو برس پہلے یہ خطہ تھا اُداس — پندرہ سولہ گھروں پر تھی فقط اس کی اساس

"بھونسلوں"[7] کی سطوتِ شاہی اسے راس آگئی
مرہٹوں کی بود و باش اس گاؤں کو پھیلا گئی

---

[1] مہاراشٹر صوبہ [2] ناگ، وین گنگا، کنہان اور وردھا، یہ چاروں ندیاں ناگپور کے اطراف واکناف میں بہتی ہیں [3] جھاگ [4] یہ شہر راجہ بخت بلند [illegible] تھا [5] ناگ قوم جو ناگ پور کی وجہ تسمیہ ہے۔ [6] یہاں کا مشہور کھیلوں کا میدان [7] یہاں انگریزوں سے پہلے بھونسلوں کی حکومت تھی۔

پل ہے، سڑکیں ہیں، تعمیرِ بُت خانے ہوئے — قلعے کی اونچی فصیلوں پہ شگفتگی کے جلوے
[illegible]، صنعت بڑھی، مزدور آ آ کر بسے — مسکرائے فاقہ کش، روزی کے دروازے کھلے
آج اس بستی کی آبادی ہے سولہ سترہ میل — اس کے دروازے بلند اور پختہ تر اس کی فصیل
درمیانِ شہر عمدہ پارچہ سازی کے مِل — مسکراتے ہیں جہاں ہر وقت مزدوروں کے دل
شہر سے کچھ دور 'تاج الدین بابا' کا مزار — زائرینِ خوش عقائد کی مُرادوں کا دیار
وہ دیارِ پاک 'تاج آباد' کہتے ہیں جسے — مرکزِ روحانیانِ شاد کہتے ہیں جسے
درمیانِ شہر دیگر اولیاء کے مقبرے — خوش نما تابوت، اونچے اونچے پختہ حاشیے
مسجدیں، گرجا، مقابر، گردواروں کی بہار — جابجا اونچے منادر پُرشکوہ و پُر وقار
ریلوے جنکشن، ہوا بازوں کا نادر مستقر — مرکزِ آلاتِ نشر الصوت فنِ معتبر

خوبصورت پارک، آئینہ صفت اک اک چمن
خوش نما لانیں، روش اندر روش سرو و سمن

اک طرف نادر عجائب خانہ و 'مہاراج باغ' — ایک جانب دُور سونے گاؤں کے رنگیں چراغ
ایک جانب 'میڈیکل کالج' وقارِ ایشیا — ایک جانب 'بینک' کی تعمیرِ نَو کا اعتلا
اک طرف 'کوٹھی گورنر' کی بفرقِ کوہسار — ایک جانب 'ہائی کورٹ' اورنگِ جاہ و اقتدار
کالجوں کا سلسلہ، مشہور یونی ورسٹی — اونچی اونچی درسگاہیں، دل کشا و دیدنی
روئی کی مشہور منڈی، غلہ و سبزی کا گنج — جن کے قبضہ گیر ہر دم تاجرانِ نکتہ سنج
گھوڑے والا، امبا جیری، اس کے دو مشہور تال — جمعہ تالاب اور 'پھٹارہ' بھی ہیں آپ اپنی مثال
'بھونسلا' شاہی کا نادر شہر، دارالسلطنت — جس پہ غالب آگئی تھی چار دن برطانیت
صوبۂ سابق کا یہ دارالخلافہ بھی رہا — دَور میں افرنگیوں کے اس نے پائی اوجِ جا

سنترے، نارنگیاں مشہور اس کی دُور دُور
ہے جو ہندوستاں کے وسط الوسط میں وہ ناگپور

[illegible] بھونسلہ [illegible] کپاس کی منڈی [illegible] گھوڑے والا، امبا جیری [illegible]
[illegible] مرکز وسطِ ہند [illegible]

میکش اکبرآبادی

آگرے کے میلے

بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کسی زمانے میں آگرے میں سات دن اور آٹھ میلے ہوتے تھے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ سستا سمے تھا۔ روپیہ کم مگر فراغت زیادہ تھی۔ کمانے سے زیادہ لوگ خرچ کرنے کے رستے نکالتے رہتے تھے۔ کنبے، برادری، دوست احباب کو جمع کرنے اور کھانا کھلانے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے۔ شادی بیاہ، موت اور غمی کا تو ذکر ہی کیا، کچھ نہ ہوا تو میلاد اور کتھا ہی کے نام سے سب کو جمع کر لیتے۔ بچہ ماں کے پیٹ میں آیا اور بدیت رسمیں شروع ہو گئیں۔ آج نسلوڑ ہے کل ستوانسہ پرسوں نو ماسا اور مہنوں کا پکوان ان رسموں میں بٹ جاتا۔ عقیقے ختنے، بسم اللہ اور منگنی میں ہی اچھی خاصی مہمان داری ہو جاتی کرکمینوں کو جوڑے بیڑے، سواسنوں کو نیگ جوگ غرض جہاں نت نئے ہنگامے رہتے ہوں وہاں میلوں ٹھیلوں کا پوچھنا ہی کیا۔ ایک ایک میلے کا پورے سال انتظار رہتا، مہینوں پہلے شوقین تیاریاں کرتے۔ ان میلوں میں زیادہ تر میلے مذہبی تھے لیکن کوئی میلہ بھی ایسا نہ تھا جس میں ہندو مسلمان برابر شریک نہ ہوتے ہوں۔ اگر کسی کو معلوم نہ ہو تو صرف دیکھ کر کوئی نہیں پہچان سکتا تھا کہ یہ میلہ ہندوؤں کا ہے یا مسلمانوں کا۔ کتنے ہی میلے ایسے [illegible] مذہب سے تعلق نہ تھا۔ جیسے پیراکی کا میلہ، [illegible] میلہ وغیرہ۔

پیراکی کا میلہ

آگرے کی پیراکی مشہور ہے۔ معلوم نہیں کب سے یہ میلہ چلا آرہا ہے۔ اس میلے سے پیراکی کا فن زندہ ہے اور اس فن کے مظاہرے کے لیے یہ میلہ ہوتا ہے۔ برسات ہوئی دریا چڑھا اور پیراکوں کے دل میں پیرنے کی امنگ لہریں لینے لگی۔ یہ میلہ بھادوں کی نوچندی کو ہوتا ہے مگر ایک مہینے پہلے سے پیراکوں کے غول اپنے نشان (جھنڈے) لئے ہر جمعرات کو دریا جانے شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر بھادوں کی نوچندی جمعرات سے پہلے جو منگل آتا ہے اس دن ایک میلہ ہوتا ہے اسے سبھا کا پیالہ کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سبھا پیراکی کے کسی استاد کی لڑکی تھی اور قوم کی ساقن[1] تھی۔ نوچندی کے میلے میں سبھا حقہ لے کر تیرتی اور

---

[1] ساقی یہاں حقہ پلانے والوں کو کہتے تھے جس زمانے میں حقے کا رواج عام تھا تو شارع عام اور خصوصاً چوراہوں پر کچھ لوگ کمر کسے گلے میں چمڑے کا تھیلا، تھیلے میں کوئلے تمباکو لئے اور ہاتھ میں حقہ اٹھائے کھڑے رہتے تھے۔ جاتے آتے لوگ دو چار دم لگاتے دو چار باتیں کرتے اور کوئی کوئی دو ایک پیسے ان کے ہاتھ پر رکھ کر چلے جاتے۔ ان میں بعض بڑھی عورتیں بھی یہ کام کرتی تھیں۔ انہیں ساقن کہتے تھے۔ بچپن میں ان لوگوں کو میں نے دیکھا ہے۔

پیراکوں کو حقہ پلائی جاتی۔ بھیا کا انتقال نوچندی جمعرات سے پہلے منگل کو ہوا اس لئے تیراکوں نے اس کی یادگار میں یہ میلہ قائم کیا۔ یہ میلہ نوچندی سے دو دن پہلے منگل کو ہوتا ہے جس جگہ پہلے پہل تیراکوں نے بھیا کی فاتحہ دلائی تھی وہ مقام اب بھیا مائی کا پیا کہلاتا ہے۔ اب بھی پیراک وہاں فاتحہ کراتے ہیں۔[1]

اصل میلہ نوچندی جمعرات کو ہوتا ہے۔ پہلے سب پیراک سید کے باغ جاتے ہیں وہاں ایک مزار ہے جہاں چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ کوئی چادر اور کوئی پنکھا۔ سب لنگوٹ باندھے ہوئے جاتے ہیں۔ ہندو ہو یا مسلمان کوئی کپڑے پہن کر نہیں جاتا۔ عام اعتقاد یہ ہے کہ وہاں چڑھاوا چڑھانے کے بعد کوئی پیراک ڈوبتا نہیں ہے۔

دریا جانے سے پہلے پیراکوں کے غول اپنے اپنے نشان لئے اپنے استاد کا نام لے کر "... استاد کے کھیڑے کا بھلا" کے نعرے لگاتے، ڈھول تاشے باجے کے ساتھ ہندو ملنڈے بھی کھیلتے ہوئے خاص خاص بازاروں کا گشت کرتے ہوئے دریا جاتے ہیں۔ کسی کے ساتھ کاغذ کے شیر، مینڈھے اور دوسرے جانور ہوتے ہیں۔ کوئی اپنا بیڑا سجائے اس پر پورے ساز سامان کے ساتھ گاتے ناچتے جاتے ہیں اور اسی طرح دریا میں اتر جاتے ہیں۔ تیرنے میں پتنگیں بھی اڑتی ہیں اور کبوتر بھی۔ ناچ رنگ بھی ہوتے ہیں اور دوسرے کھیل تماشے بھی۔

پیرنے کی بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ کوئی چت پیٹھ کے بل تیرتا ہے کوئی پیٹ کے بل کھڑا ہو کر جیسے کھڑی لگانا کہتے ہیں۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ سینے تک بدن پانی سے باہر رہتا ہے۔ بہت سے پیراک جمنا کے پل سے پانی میں کودتے ہیں۔ بہت سے استادوں کی سب سے اونچی منزل سے۔ دریا کے کنارے جدھر جدھر سے پیراک گزرتے ہیں۔ بے انتہا تماشائیوں کا ہجوم ہوتا ہے اسی طرح آرام باغ [illegible] تماشائیوں سے بھرا ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں طوائفیں اچھے اچھے طائفے لے کر آرام باغ پہونچ جاتی تھیں گانے بجانے ہوتے اور میلے کی رونق دوگنی ہو جاتی۔ اب تقریباً ہر نشان کے ساتھ گانے والے جاتے ہیں۔ شیر چیتے بھی بنے ختم ہو گئے ہیں اور باجے تاشے بھی۔

آگرے میں پیراکی کے بڑے بڑے استاد گزر رہے ہیں۔ اب یہ فن بھی روبہ زوال ہے۔ میں نے ایک آخری استاد دستو خاں کو دیکھا تھا۔ گورا بدن، لمبا قد، سر پر پٹے، منہ پر ڈاڑھی، دو پلی ٹوپی، انگرکھا پہنے۔ اب بڈھے ہو گئے تھے۔ مگر جب کوئی بڑا آدمی آتا تو فتح پور سیکری کی باؤلی میں اپنے پٹھوں کو لے کر جاتے اور پیراکی کے کرتب دکھاتے۔ ان کے لئے پانی اور زمین میں کوئی فرق نہ تھا۔ پالتی مارے بیٹھے ہیں کروٹ لے کر لیٹ گئے، چت ہو گئے۔ غرض بیسیوں کمال دکھاتے اور دیکھنے والے خوش ہو جاتے۔ بندھے پانی اور بہتے ہوئے پانی کی پیراکی میں فرق ہے۔ مگر ان کے لئے بندھا اور بہتے ہوئے پانی میں بھی کچھ فرق نہ تھا۔ ایک پیراک نے مجھے بتایا کہ مجھے میرے استاد نے مشق کرائی تھی کہ گھر سے چلتے وقت میں سانس روکتا تھا اور دریا پر پہونچ کر سانس ٹوٹتی تھی۔ لیکن خشکی میں اتنی دیر سانس روکنے کی مشق کے باوجود دریا میں اتنی دیر سانس نہیں روکی جا سکتی۔ پہلے زمانے میں فن بھی مخصوص طبقوں ہی میں رکھے جاتے تھے لیکن آگرے کے ایک استاد جن کا نام بلا تھا انھوں نے مہتروں کو بھی یہ فن سکھا دیا۔ مہتروں نے جب ان کی خوشامد کی تو وہ چاندنی رات میں انھیں دریا لے جاتے اور تیرنا سکھاتے۔ آخر میں انھوں نے مہتروں کو نشان بھی دے دیا تھا۔ مہتر بھی اپنا نشان لے کر تیرنے جاتے ہیں۔

پہلے شہر [illegible] میں [illegible] تک ہے کہ [illegible]

---

[1] ماخوذ [illegible] اکبرآبادی

[illegible]

جو دریا اپنے دلدار کے ساتھ آگرہ سے گئے تھے۔ اس تیراکی (تیراکی) کی نسبت اپنی کتاب معدن الجواہر میں یوں تحریر فرماتے ہیں :۔

"ہمارا گھر جمنا سے قریب تھا۔ جب ہم دریا کی سیر کو جاتے تو اکثر اوقات پیراکوں کو دیکھتے کہ وہ بے شمار صنعتیں اس فن میں دکھاتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص موتی مشہور نام کا تھا جس کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ وہ اتنا ماہر تھا کہ اپنے ہاتھوں کی دسوں انگلیاں دس آدمیوں کو پکڑا دیتا اور پھر انھیں تیرتا ہوا دریا کے اس پار لے جاتا اور پھر واپس لے آتا۔ ایک دوسرا شخص مجو نامی مشہور تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دریا میں ڈال دیتے اور وہ اسی ہیئت میں غوطے لگاتا برسات کے دریا کو جو دونوں کناروں سے ٹکراتا تھا پار کر لیتا اور پھر واپس آ جاتا۔"[2]

شہباز نے تیراکی کے میلے کے متعلق نظیر کی ایک فارسی نثر نقل کی ہے جس میں تیراکوں کے کمال کا ذکر کیا ہے کہ وہ سطحِ دریا کو چاندنی کا فرش اور موجوں کو سیتل پاٹی سمجھتے تھے۔ اب یہ کمالات خواب و خیال ہو گئے ہیں۔ جاننے والے اگر ہوں گے بھی تو روشناسِ خلق نہیں ہیں۔ البتہ فتح پور سیکری میں ایسے لوگ ضرور ہیں کہ آپ اگر پیسہ جھالرے میں پھینک دیں تو وہ غوطہ مار کر نکال لاتے ہیں۔

میاں نظیر کا میلہ

شہباز نے لکھا ہے :۔

"جب نظیر کا انتقال ہوا کئی ہزار آدمی ہندو مسلمان جمع تھے۔ چونکہ ان کا مذہب اثنا عشری تھا، بڑی دھوم سے نمازِ جنازہ حسبِ مذہب اثنا عشری پڑھائی گئی مگر دو نمازیں ہوئیں جس قدر ان کے شاگرد اہلِ سنت تھے انھوں نے الگ اپنا گروہ کر کے نماز پڑھی [illegible] کی چادر اُن کی پارچہ پارچہ کر کے اہلِ ہنود لے گئے جنہیں معلوم ہندو شاگردوں نے پارچہ رکھے، جلائے کیا کیا۔ شاگردوں نے ان کی قبر سنگین بنائی۔ ہندو شاگردوں نے سوم کے دن مزار پر میلا کیا۔ ناچ، رنگ اور شعر خوانی ہوئی اور (شاہ) غلام رسول کی مسجد میں ان کے پھول ہوئے۔

میلہ سال کے سال اب بھی ہوتا ہے۔"[1]

"مرقعِ اکبرآباد" کے مصنف مولوی سید احمد مارہروی نے لکھا ہے :

"نظیر کے انتقال کے بعد برسوں تک ہولی دوالی دسہرہ عید بقر عید کے تہواروں پر ہندو مسلمان جمع ہو کر مشاعروں کے جلسے کیا کرتے تھے۔"

مگر یہ میلہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں ۱۹۳۱ء سے شروع ہوا ہے اس زمانے میں آگرے میں آرتی اور نماز کے سلسلے میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ بات کچھ اور تھی بنا دی گئی کچھ اور، اس طرح شہر کی فضا مکدر ہو گئی۔ دس پانچ آدمیوں کے سر پھوٹ گئے، دس پانچ آدمی رستہ چلتے چوٹ کھا گئے۔ اس زمانے کی لڑائی میں سر ہی پھوٹتے تھے۔ گرے ہوئے آدمی پر کوئی ہاتھ نہیں چھوڑتا تھا نہ کوئی چاقو چھری کا نام جانتا تھا اس وقت شہر کے صلح پسند ہندو مسلمانوں نے مل کر طے کیا کہ میاں نظیر کا میلہ پھر جاری کیا جائے تاکہ آپس میں میل ملاپ بڑھے اور غلط فہمیاں دور ہوں۔ اتفاق کی بات کہ بسنت قریب تھی اس لئے تجویز ہوا کہ میلہ بسنت کے دن ہو اور شہر سے ہندو مسلمانوں کا ایک جلوس بسنتی کپڑے پہن کر نظیر کے مزار پر چلے اور وہاں جلسہ ہو

---

[1] [illegible]

[2] [illegible]

---

[1] زندگانیٔ بے نظیر ص ۱۴۰

پڑھے بسنت تو کسی نے چھپنے منظور ہے کہ گویہ حال سب نے بسنتی پگڑیاں باندھ رکھی ہیں۔ اس کے لئے ایک کمیٹی بزم نظیر کے نام سے قائم ہوگئی جس کے اراکین میں رائے صاحب پنڈت برج ناتھ گوسوامی، بابو متھرا پرشاد ٹکلڑ، ڈاکٹر گورکھ رام نندا بابو درگا پرشاد دہرا، سید صاحب تاج علی مفتی انتظام اللہ شہابی ممنون اکبرآبادی اور راقم الحروف اور کتنے ہی دوسرے اصحاب مقرر ہوئے۔ شروع میں یہ میلہ اس طرح ہوتا تھا کہ تجویز و تحریک صدارت کے بعد سیکرٹری اپنی رپورٹ پڑھتا تھا۔ صدر صاحب اپنا خطبہ پڑھتے تھے۔ پھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد میاں نظیر کے شاگردوں کے سلسلے کے لوگ میاں نظیر کا کلام پڑھتے تھے۔

ایک مرتبہ اس میلے میں جوش ملیح آبادی نے اپنی نظم

کیا کیا ٹھسک دکھاتے ہے ڈنڈا فقیر کا

پڑھی تھی۔ لیکن کمیٹی نے یہ محسوس کیا کہ عوام و خواص سب ہی یہاں میاں نظیر کی نظمیں سننے آتے ہیں نہ کہ دوسرے شاعروں کو، اس لئے مشاعرہ موقوف کر دیا گیا۔ اب تقریب صدارت سیکرٹری کی رپورٹ اور ایک آدھ مقالہ نظیر پر پڑھا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہزاروں آدمی یہ انتظار کرتے ہیں کہ نظیر کی نظمیں کب شروع ہوں۔ اس میلے میں ہندو مسلم اہل علم یونیورسٹیوں کے فاضل، حکومت کے ارباب حل و عقد، شاعر سب ہی شریک ہوتے ہیں اور ان کے دوش بدوش ہزاروں عوام دلچسپی کے ساتھ گھنٹوں خاموش بیٹھے نظیر کی نظمیں سنتے رہتے ہیں۔ نظیر کی نظمیں جو لوگ گاتے ہیں وہ تقریباً سب ہی بے پڑھے ہوتے ہیں لیکن یہ نظمیں انہوں نے اپنے استادوں سے یاد کی ہیں۔ یہ لوگ ایک خاص انداز سے یہ نظمیں پڑھتے ہیں اور اپنے کو میاں نظیر کے شاگردوں کے سلسلے سے وابستہ بتاتے ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ پارسال خلیفہ [illegible] کا انتقال ہوگیا۔ وہ اس گروہ کے بہترین پڑھنے والے تھے۔ [illegible] کی کوشش سے [illegible]

اس سال یہ تجویز منظور کرلی ہے کہ میاں نظیر کی قبر پر ایک پارک بنوا دیا جائے۔

ہولی

ہولی، دیوالی، دسہرہ، رام لیلا اور عید بقرعید محرم ہندوستان میں کہاں نہیں ہوتے۔ پھر بھی ان کی تفصیل سے قطع نظر چند خصوصیات کا ذکر کرنا کافی ہوگا جس سے آگرے کی گزشتہ معاشرت کا اندازہ ہو سکے۔

ہولی سے چند روز پہلے بازاروں میں چہل پہل شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے عموماً دیہاتی مذاق کا نشانہ بنائے جاتے تھے۔ کبھی کوئی مزدور آ پھنسا تو اس سے مٹکا اٹھوا کر لے چلے اور جب بیچ بازار میں آئے تو مٹکا توڑ دیا اور مزدور رنگ میں شرابور ہوگیا۔ ہندو ہو یا مسلمان جو بھی مذاق کا نشانہ بنتا ہنستا ہوا چلا جاتا۔ عام طور پر سفید پوش اور شائستہ آدمیوں کا لحاظ رکھا جاتا۔ دھولینڈی کے دن تو گلال اور عبیر کا مینہ برس جاتا تھا۔ ہوا کے ساتھ گلال اڑ کے مکانوں کے اندر تک پہونچ جاتا۔ بازاروں میں رنگ کی کثرت کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ بہت سی ٹولیاں ڈھول یا ڈھپلی (دف) پر ہولی گاتی نکلتی تھیں۔ ایک ٹولی بیس پچیس آدمیوں کی تاج گنج سے شہر آتی تھی۔ یہ بے نواؤں کا سوانگ بھرے، زرد کپڑے پہنے، گلے میں سیلیاں ڈالے، منہ پر بھبھوت ملے، سر پر حلقہ کی صورت کی پگڑیاں باندھے، دف، ستار اور دوسرے سازوں پر ہولیاں گاتے آتے تھے۔ یہ سب مسلمان تھے اور اپنے کو میاں نظیر کا شاگرد کہتے تھے۔ ان پر کوئی رنگ نہیں ڈالتا تھا نہ یہ کسی پر رنگ ڈالتے تھے۔ ہولی کے دن شام سے ہی جلوس نکلنے شروع ہو جاتے۔ ہر محلے کا جلوس علیحدہ علیحدہ دنوں میں نکلتا۔ یہ جلوس اب بھی نکلتے ہیں لیکن ڈھول کے علاوہ ہر بازار میں رات کو تخت ڈال دئے [illegible] کا [illegible]

کا پھول ڈول ہے گلی اس محلے کا۔ اب برسوں سے بے نواؤں کا سہاگ نہیں آتا نہ طوائفوں کا مجرا ہوتا ہے۔ طوائفوں کی جگہ ٹھکی ہوا ہے لڑکوں اور خیال بازوں نے لے لی ہے۔

شب برات، ہولی اور عید کے بعد تاج گنج میں ٹرکا میلہ ہوتا تھا۔ اور شہر کے عوام و خواص سب شریک ہوتے تھے۔ ل۔ احمد صاحب اکبرآبادی اپنے ماموں سے سنا ہوا بیان کرتے ہیں کہ ایک وکیل صاحب جو آگرے کے کالستھ خاندان سے تھے، تاج کے ہر میلے میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ نوکر قالین گاؤتکیہ اور حقہ لے کر پہونچ جاتا اور تاج کے درمیانی سنگ مرمر کے حوض کے شمال مشرقی کونے پر قالین تکیہ لگا دیتا۔ وکیل صاحب اس پر حقہ لے کر بیٹھ جاتے۔ دوست ملاقاتی جاتے آتے رہتے۔ جب میلہ ختم ہوتا تو مع سامان گھر لوٹ آتے یہ اُن کا معمول تھا۔ ایک سال کچھ لوگوں کو شرارت سوجھی اور انھوں نے وکیل صاحب کا سامان پہونچنے سے پہلے اُسی جگہ فرش کرکے ایک طوائف اور اس کے ساتھیوں کو بٹھا دیا۔ وکیل صاحب اپنے وقت پر آئے۔ دیکھا کہ ان کی جگہ خالی نہیں ہے۔ نوکر نے سامان ایک طرف رکھ دیا۔ خود دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے رکھے ٹہلتے رہے۔ یہاں تک کہ میلہ ختم ہوگیا اور طوائف اُٹھ گئی تو نوکر کو حکم دیا کہ قالین تکیہ رکھو۔ اس نے وہیں قالین بچھایا۔ وکیل صاحب بیٹھے، حقہ پیا اور تب وہاں سے واپس ہوئے۔

ہولی کے دن شام کو اب کئی شائستہ محفلیں بھی ہوتی ہیں۔ ان میں شری دینک نندن چترویدی سابق ممبر اسمبلی کی کوٹھی پر جو محفل ہوتی ہے وہ مخصوص ہے۔ شہر کے تمام قوم پرست ہندو مسلمان ان کے یہاں جمع ہوتے ہیں۔ پان، شربت اور چندن سے سب کی تواضع ہوتی ہے۔ کچھ مزاحیہ کویتائیں، کچھ نظمیں اور تقریریں پھر جلسہ ختم ہو جاتا ہے۔

[illegible] شام کو میٹ پارک میں (جس کا نام اب پالیوال [illegible] ایک بہت [illegible] میلا ہوتا ہے جس میں ہزاروں آدمی ہوتے ہیں۔ مگر سب پُرسکون۔ مختلف [illegible] کیمپ ہوتے ہیں جہاں سپاری الائچی سے تواضع ہوتی [illegible] میلا مہاپالیکا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس دن اور اس میلے کا سب سے دلچسپ منظر وہ تقریب ہوتی ہے جو ۱۹۶۲ء سے "وردھ جن سمان سمیتی" کی طرف سے کی جاتی ہے۔ اس کے بانی اور صدر شری ہری کشن گپتا ہیں۔ یہ بیلن گنج کے پرانے رئیس اور سابق زمیندار ہیں۔ اس جماعت کا مقصد یہ ہے کہ بوڑھے آدمیوں کی عزت کی جائے اور سوسائٹی میں انھیں کم نگاہی کا شکار نہ ہونا پڑے۔ گپتا جی اس تحریک کو عالمگیر تحریک بنانا چاہتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ۱۹۶۲ء میں انھوں نے جاپان کا سفر بھی کیا تھا اور ایک تاج محل کا موڈل اپنے ساتھ لے گئے تھے جو ٹوکیو کے معمر ترین انسان کو پیش کیا گیا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں ٹوکیو کا معمر ترین انسان اٹھانوے سال کا تھا۔ آگرے میں ہر سال وہ معمر ترین آدمی کی تلاش کرتے ہیں اور ہولی کے دوسرے دن کے میلے میں ایک ٹینٹ لگتا ہے اس میں اسٹیج پر اس آدمی کو بٹھایا جاتا ہے اور نہایت شوخ سرخ رنگ کے مخمل کا زردوزی سے کڑھا ہوا تاج اور ایک چغہ اُسے پہنایا جاتا ہے اور اس کی عمر کے اعتبار سے فی سال ایک روپیہ کے حساب سے ایک تھیلی اُسے پیش کی جاتی ہے۔ جلسہ حسب دستور صدر کے انتخاب اور تقریروں سے شروع ہوتا ہے۔ نظمیں ہوتی ہیں۔ گانا اور قوالی ہوتی ہے اور پھر یہ جلسہ ختم ہو جاتا ہے۔ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۳ء میں یہ انعام ایک رفیوجی شری لبھا رام نے حاصل کیا۔ ان کی عمر ایک سو چھ سال تھی۔ ۱۹۶۲ء میں انھیں ایک سو چھ اور ۱۹۶۳ء میں ایک سو سات روپیے پیش کیے گئے۔ اس سال شری لبھا رام کا انتقال ہو چکا تھا لہٰذا ۱۹۶۴ء کا انعام تاج گنج کے رہنے والے شری کریم الدین اور مسماۃ بتشیا بشوریہ کو دیا گیا۔ شیخ کریم الدین کو ان کی عمر کے حساب ایک سو چار روپیہ اور مسماۃ بتشیا کو ایک سو دو روپیہ پیش کیے گئے۔ شریمتی بتشیا تاج محل کے [illegible]

بجائے ہٹنے کے سرخ مخمل کی چادر اڑھا دی گئی۔ شیخ کریم الدین اپنی صحت کے [illegible] چار چند نظر آرہے تھے۔ ان کی آنکھیں بھی [illegible] اور سب حواس بھی درست تھے۔ البتہ [illegible] آنکھوں اور کانوں سے بالکل معذور تھیں۔ ان کے [illegible] گردوں نے کر آئے تھے۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ کہیں [illegible] توڑ دیں۔

[illegible] اس سلسلے میں اب تک صرف آگرے ہی میں ایک ہزار روپیہ کے قریب خرچ کر چکے ہیں۔ پوشاک ہی میں فی آدمی سو روپیہ سے زیادہ صرف ہو جاتے ہیں۔ خیمہ وغیرہ میونسپلٹی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس سال اس جلسے کی صدارت کاکا کالیلکر نے کی۔

کیلاش کا میلہ

شواتری کو کیلاش کا میلہ ہوتا ہے۔ کیلاش ایک مقام ہے جو سکندرے کے مغرب میں جمنا کے کنارے ہے۔ یہاں مہادیو جی کا مندر ہے جہاں لوگ جاکر چڑھاوا چڑھاتے اور پوجا کرتے ہیں۔ لیکن اصل میلہ سکندرے میں ہوتا ہے۔ اس میلے کی خصوصیت یہ تھی کہ مسلمانوں کی تعداد کسی طرح ہندوؤں سے کم نہیں ہوتی تھی۔ اس زمانے میں کوئی میلہ بغیر طوائفوں کے میلہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ طوائفوں کے ڈیرے اور بستر سکندرے میں ہوتے تھے اس لئے سارا میلہ سکندرے میں ٹوٹ پڑتا تھا۔ تماش بینوں اور شوقینوں کو پہلے سے فرمائشیں پوری کرنا پڑتی تھیں کبھی رقابت میں اور کبھی فرمائش پوری نہ کرنے میں [illegible] اور خودکشی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔

سیتلا کا میلہ

کیلاش کے علاوہ سیتلا کا میلہ بھی مشہور ہے۔ اس میں [illegible] ہے۔ یہ میلہ پیر کے پیر ہوتا ہے۔ آخری پیر [illegible] میلہ ہوتا ہے۔ یہ میلہ ایک دن عورتوں کا ہوتا [illegible] سیتلا کا [illegible] جاری سے آگے

ہے۔

کمال خاں کا میلہ

آگرے کے جنوب میں آگرہ کینٹ اسٹیشن سے میل ڈیڑھ میل چل کر کمال خاں کی قبر ہے۔ قبر اتنی مشہور نہیں ہے جتنا کمال خاں کا کنواں مشہور ہے۔ اتنا بڑا کنواں شاید کہیں اور ہو۔ اسی کنوئیں کے پاس ہی کمال خاں کی قبر ہے۔ کہتے ہیں کہ اکبر نے ایک باغ لگوایا تھا جس میں نو لاکھ درخت تھے اس لئے اس جگہ کو نولکھا کہتے ہیں۔ اس باغ کو پانی دینے کے لئے یہ کنواں بنوایا تھا۔ عوام میں کمال خاں کی کرامتیں بہت مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ ہاتھی کے مہاوت تھے اور ہاتھی سمیت اس کنوئیں میں کود گئے تھے۔ سال کے سال اس کنوئیں پر میلہ لگتا ہے۔ گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے سے لاکھوں آدمی آتے ہیں۔ اٹاوے اور مین پوری تک کی خلقت یہاں جمع ہوتی ہے۔ یہ میلہ چار روز رہتا ہے۔ کھیل تماشے، چرخ، ہنڈولے، بازار سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ کنوئیں کے اندر ایک بڑا لوہے کا کڑا لگا ہوا ہے جو زنجیروں سے اوپر سے لٹکا دیا گیا ہے۔ مزار پر بکرے ذبح ہوتے ہیں۔ تیل اور چنے کی دال، دہی، پورا آٹے کے بنے ہوئے چراغ چڑھتے ہیں۔ کچھ گوشت چڑھا دیا جاتا ہے۔ باقی لوگ کھانے کے کام میں لے آتے ہیں۔ بچوں کے منڈن ہوتے ہیں۔ پوجا ہوتی ہے گیت گائے جاتے ہیں۔ مجاور سوکھی چیزیں رکھ لیتے ہیں۔ تیل اور پیسے کنوئیں میں ڈال دیتے ہیں۔ میلے کے بعد تو زنجیروں کی مدد سے اوپر کھینچ لیتے ہیں اور پیسے نکال کر بانٹ لیتے ہیں۔ کمال خاں کے معتقدین میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ میلہ بھی ہندو مسلمانوں کا ملا جلا میلہ ہے۔

دلی چھیٹ کا میلہ

یہ میلہ اس لئے عوام و خواص کی دلچسپی کا مرکز اور مشہور ہے کہ اس میلے میں [illegible] ختم ہونے کی وجہ سے اب [illegible]

سے شروع ہو کر فرح (دیہرے) تک ہوتی ہے۔ فرح ایک گاؤں ہے جو آگرہ متھرا کے درمیان واقع ہے۔ اس دوڑ کے لئے سال سال بھر گھوڑوں کو تیار کیا جاتا ہے۔ ایک ایک گھوڑے پر سیکڑوں کی بازی لگتی ہے اور گھنٹوں میں ہزاروں روپیہ کی ہار جیت ہوتی ہے۔

قلقلیں

دیوچھٹ سے زیادہ دل چسپ اور مشہور قلقلوں کا میلہ ہے۔ قلقلیں اڑائے جانے والے کبوتروں کو بھی کہتے ہیں اور کبوتر اڑانے کو بھی۔ پہلے یہ میدان سکندرے کے باہر ہوتا تھا پھر تاج کے باہر ہونے لگا۔ معلوم ہوا ہے کہ اس سال پولیس نے بند کر دیا ہے کیونکہ کبوتروں کے ساتھ آدمی بھی لڑ جاتے تھے۔ اب کبوتروں پر بھی ٹیکس لگ گیا ہے اس لئے شاید یہ ہمیشہ کے لئے ہی ختم ہو جائے۔

بانس کی کھپچیوں کا ایک بڑا سا ڈربا سا بناتے ہیں۔ اس میں چار پہیے ہوتے ہیں۔ ایک ایک گاڑی میں سیکڑوں کبوتر بند ہوتے ہیں۔ یہ گاڑیاں لے کر مختلف ٹولیاں میدان میں جمع ہو جاتی ہیں اور اپنے اپنے کبوتر اڑاتی ہیں۔ ہزاروں کبوتروں سے آسمان چھپ جاتا ہے۔ کبوتروں کا ایک غول دوسرے غول میں گھس جاتا ہے اور گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ ادھر کبوتر بازوں کی آوازوں اور زٹیلوں سے ایک محشر زمین پر بپا ہو جاتا ہے۔ پھر جب کبوتروں کی ٹولیاں حریفوں کو گھیرے ہوئے اپنی چھتری پر اترتی ہیں تو کبوتر بازوں میں قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ جس کے کبوتر دوسرے کبوتر باز نے پکڑ لئے اس کی ناک کٹ گئی۔ کسی نہ کسی طرح وہ اپنے کبوتر اس سے واپس لے گا، خوشامد سے پیسے سے اور جیسے بھی بنے۔ ایک ایک کبوتر دس سے لے کر سو سو روپے تک دے کر واپس لیا جاتا ہے۔ صرف آبرو ہی کا سوال نہیں ہے بلکہ نسل کا بھی سوال آ پڑتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے کبوتروں کی نسل دوسرے کے یہاں چلی جائے۔ کبوتروں کو مختلف قسم کی غذائیں اور مقویات دے کر تیار کیا جاتا ہے۔ سیکڑوں نسخے سینہ بسینہ چلے آتے ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار نادار اب اس مرض میں مبتلا ہیں۔ آگرے میں کبوتر بازی کے بڑے بڑے استاد تھے۔ آخری استادوں میں نائی کی منڈی والے حکیم اسحاق تھے۔ شاعری میں سیماب اکبرآبادی کے شاگرد تھے۔ پہلوانی اور بانک بنوٹ میں دم بھرتے تھے۔ حکیم بھی نامی تھے۔ سانپ پالنے کا بھی شوق تھا۔ غرض آگرے کے ایک مخصوص دور کے پورے نمائندے تھے۔

گن گوروں کا میلہ

گن گوروں کا میلہ راجستھان اور خصوصاً جے پور میں دھوم دھام سے ہوتا ہے مگر یو۔پی میں شاید صرف آگرے ہی میں یہ میلہ ہوتا ہے اور آگرے میں بھی ایک مخصوص محلے موتی کٹرے کو یہ خصوصیت حاصل ہے۔ ہر سواری میں دو مورتیاں ہوتی ہیں۔ ایک شو جی کی اور ایک پاربتی جی، انھیں گنگور کہتے ہیں۔

یہ گنگوریں مختلف برادریوں کی ہوتی ہیں۔ ان کا جلوس آگے پیچھے ہوتا ہے۔ اگروالوں کی اوسوالوں کی، برہمنوں کی، ٹھاکروں کی، مالیوں کی، اہیروں کی۔ ایک ایک گنگور ایک ایک لاکھ کا زیور پہنے ہوتی ہے۔ اس موقع پر ہر برادری اپنے زیورات اور مالیت کی نمائش کرتی ہے اور ایک کا دوسرے سے مقابلہ ہوتا ہے۔ عام ہندوؤں کے جلوسوں کی طرح اس میں ڈنڈے نہیں کھیلے جاتے ہیں۔ صرف اہیروں کے جلوس میں ڈنڈے کھیلے جاتے ہیں ویسے باجا گاجا پورا لوازمہ ہوتا ہے۔ یہ میلہ ہولی کے کچھ دن بعد ہوتا ہے۔ جب سے گولڈ کنٹرول ہوا ہے۔ زیوروں کی نوعیت بھی بدل گئی ہے۔ اب سونا کم اور جواہرات زیادہ ہوتے ہیں۔ گنگوروں کے گیت بھی مخصوص ہیں۔ راجستھانی گیتوں میں کچھ ترمیم کر لی گئی ہے۔

رام لیلا اور دسہرہ

میں نے بچپن میں گوالیار کے مہاراجہ کی دسہرے کی سواری دیکھی ہے جسے دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور زمانہ سے

قائم ہو گئی تھی جیسے جے پور میں ہولی اور دسہرے کی سواری تھی۔ جن لوگوں نے یہ جلوس نہیں دیکھے وہ اس کی شان شوکت، زیب زینت، ٹھاٹ اور دبدبے کا تصور بھی نہ کر سکیں گے۔ جے پور کے جلوس میں کئی چیزیں ایسی دیکھیں جن کا نام ہی سنا تھا۔ مثلاً ماہی مراتب، پیلی ڈوری، سانڈنی سوار وغیرہ۔ اس ریاست نے مغلوں کے ڈھلے ہوئے اعزاز اور روایات کو آخر دم تک بڑی احتیاط کے ساتھ قائم رکھا۔ اب ریاست کے ساتھ وہ روایات بھی زیب داستاں ہو گئیں۔

آگرے میں دسہرے کے دن خاص شہر میں کچھ نہیں ہوتا۔ البتہ رام لیلا کے میدان میں لاکھوں آدمی راون کو جلتا ہوا دیکھ کر رام چندر جی کی جے بولتے اور اس طرح ذات پات کے بندھنوں سے بلند ہو کر حق اور انصاف کی فتح پر خوشی مناتے ہیں لیکن رام لیلا کی برات کا جلوس اور اس سے پہلے اور بعد کے تمام جلوس جیسے گنیش جی کی سواری، بن باس، دھنش یگ، سیتا ہرن اور راون کی ٹوٹا ٹی، بھرت ملاپ سب شہر میں نکلتے ہیں۔ رام چندر جی کی برات کے دن بازاروں میں سب سے زیادہ ہجوم ہوتا ہے۔ مٹی کے کھلونے بیچنے والے جس طرح رنگ برنگ کے کھلونے اوپر نیچے قطار در قطار چن دیتے ہیں بالکل اسی طرح رنگ برنگ کے لباس پہنے عورتیں اور بچے مکانوں کی چھتوں، چھجوں، برآمدوں، گوکھوں اور دکانوں پر لدے ہوتے ہیں۔ جدھر جدھر سے برات گزرتی ہے ہجوم ادھر ادھر ہی منتقل ہوتا رہتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ بوجھ سے کوئی چھجہ ٹوٹ پڑا ہے اور کئی جانیں ضائع ہو گئی ہیں۔ برات کا جلوس منکامیشور کے مندر سے شروع ہوتا ہے اور شہر کے خاص خاص بازاروں کا گشت کر کے پھر وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ گشت تقریباً ۱۲ گھنٹے کا ہوتا ہے۔ یعنی شام کے چار بجے سے صبح کے تین چار بجے تک۔ منکامیشور کا مندر آگرے کا قدیم ترین اور مقدس ترین مندر سمجھا جاتا ہے۔ برات [illegible] سب ہی کے ہوتے ہیں لیکن اس جلوس

میں آگرے کے تجارتی حلقوں کی پوری نمائندگی ہوتی ہے۔ ایک ایک ٹھیلا ایک چلتی پھرتی دکان ہوتی ہے اور زینت کے علاوہ اس طرح دوکان کا اشتہار بھی خوب ہو جاتا ہے۔ بیل گاڑیوں میں گانے والوں کی ٹولیاں ہوتی ہیں جو قوالی ٹھمکا بجاتے گاتے جاتے ہیں۔ کوئی ان میں سانپ گلے میں ڈالے ہوتے ہیں کوئی چھریاں اور تکلے گردن پیٹ اور زبان کے آر پار چبھوئے اور کوئی منہ سے شعلے نکالتے چلے جاتے ہیں۔ دسرتھ جی وششٹ جی اور دوسرے رشیوں کی سواریاں ہوتی ہیں اور آخر میں بینڈ کے ساتھ آٹھ دس ہاتھیوں کا جلوس ہوتا ہے جس میں رام چندر جی کے بھائی اور آخر میں رام چندر جی دولہا بنے ہاتھی پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ رام لیلا کا بھی ایک فنڈ ہے جس میں کاروباری اور لین دین کرنے والے سب حصہ لیتے ہیں یہاں تک کہ قرض لینے والوں کو مہاجن جو روپیہ دیتے ہیں اس میں سے پہلے رام لیلا کے لئے روپیہ مجرا کر لیتے ہیں۔

اس برات کا ایک واقعہ مجھے ہمیشہ یاد آتا ہے۔ بہت دن کی بات ہے ریاض خیرآبادی کے چھوٹے بھائی سید نیاز احمد آگرے میں کوتوال تھے۔ کسی زمانے میں ان کے والد سید طفیل احمد صاحب بھی آگرے میں کسی عہدے پر تھے اور ریاض خیرآبادی اور سید نیاز احمد صاحب میرے والد محترم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس تعلق سے سید نیاز احمد صاحب ہمارے یہاں آتے جاتے تھے۔ ایک دن جب رام لیلا کی برات نکل رہی تھی اور ہم لوگ گوکھ میں بیٹھے دیکھ رہے تھے کوتوال صاحب وردی پہنے ہوئے کانسٹیبلوں کو ساتھ لئے ہمارے یہاں گھبرائے ہوئے آئے۔ کرسیاں کہاں ہیں؟ انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔ ہمارے یہاں پرانے زمانے کی چار پانچ کرسیاں پڑی ہوتی تھیں۔ دوسرے کمرے میں وہ خود اور کانسٹیبل کرسیاں [illegible] لے گئے اور گوکھ میں ڈال دیں۔ اتنے میں تین چار انگریز [illegible] یہ

رکس [illegible] ان کے ساتھ جنٹ مجسٹریٹ، اور سپرنٹنڈنٹ پولیس وغیرہ تھے۔ اس زمانے میں ان عہدوں پر عموماً انگریز ہی ہوتے تھے ہم لوگ شال کرکے باہر آگئے۔ مسٹر فرگسن نے ہم سے معذرت کی اور پوچھا اب آپ لوگ کہاں سے دیکھیں گے۔ میں نے کہا سب سے اوپر کی منزل سے دیکھیں گے ہمیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اس زمانے میں میری گیارہ بارہ سال کی عمر تھی۔ کوئی اور مرد ہمارا سرپرست نہ تھا جو کوا منع کرتا۔ یہ فرض بھی کو قوال صاحب ہی کو انجام دینا پڑا۔ اتنے میں ایک کھٹیک نے اپنی بیل گاڑی میں سے ایک سیب پھینکا وہ جنٹ صاحب کے گال پر پڑا سو وہ غصے کے مارے کھڑے ہو گئے۔ کلکٹر صاحب کو ناگوار گزرا مگر کو توال نے سمجھایا کہ یہ لوگ تواضع اور تعظیم کے اظہار کے لئے ایسا کرتے ہیں تب وہ پھر بیٹھ گئے۔

کرشن لیلا

رام لیلا کی طرح کرشن لیلا بھی ہوتی ہے۔ یہ رام لیلا کے بعد ہوتی ہے۔ جعفر خاں کے روضے میں ایک گؤشالہ ہے وہاں سے اس کا جلوس نکلتا ہے۔ ہر جھیلے پر ایک جھانکی ہوتی ہے جن میں سری کرشن کی زندگی کے مختلف مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ رام لیلا کی طرح اس کا فنڈ بھی جمع ہوتا رہتا ہے۔ اب بھی سنا ہے ڈھائی تین لاکھ روپیہ اس مد میں جمع ہے۔ رام لیلا کے منتظم شری کو کامل اور کرشن لیلا کے منتظم شری کالی چرن ہیں جو گؤشالہ کے سکرٹری بھی ہیں۔ ویسے جنم اشٹمی پر بڑی دھوم دھام رہتی ہے۔ جگہ جگہ ہنڈولے سجائے جاتے ہیں اور محرم کی سبیلوں کی طرح ان میں مختلف قسم کے مناظر بنائے جاتے اور سجاوٹ کی جاتی ہے۔ آگرے میں پہرے رام گوپال کا پیپر ٹیڑ کا ہنڈولہ مشہور ہے۔ جنم اشٹمی پر جاٹو برادری کا جلوس بھی بڑے دھوم دھام سے نکلتا ہے۔

[illegible] میلوں کے علاوہ اور بھی کئی میلے ہوتے ہیں جن میں بلکیشر کا میلہ بھی مشہور ہے اور جب سے پنجابی آگئے ہیں تو جمنا کے کنارے صبح کے وقت بیساکھی کا میلہ بھی ہونے لگا ہے۔

آگرے کے محرم

ہماری طرف آگرہ بھی پور اور گوالیار کے محرم مشہور تھے۔ گوالیار کے مہاراجہ مادھو سنگھ تو خود تعزیہ داری کرتے فقیری پہنتے، مجلسیں کراتے اور دوسروں کو ننگے پاؤں ننگے سر تعزیے کے ساتھ جاتے۔ وہاں کے محرم کا کہنا ہی کیا۔ مگر آگرے والو کو آگرے کے محرم سے زیادہ کہیں کے محرم نہ بھاتے۔ مشہور بات تھی کہ آگرے کے آدمی کہیں ہوں محرم پر آگرے آجاتے ہیں۔

محرم کے دنوں میں آگرہ بالکل بدل جاتا تھا۔ بازاروں اور گلی کوچوں میں تعزیوں، سبیلوں کی آرائش و زیبائش اور چہل پہل کا یہ عالم ہوتا کہ دیکھے ہوئے گلی کوچے پہچانے نہ پڑتے مسلمان تو مسلمان بہت سے ہندو تعزیہ داری کرتے، فقیری پہنتے اور فاتحہ درود کرتے تھے۔ ہندو عورتیں اپنے بچوں کو لے کر تعزیوں کے نیچے سے نکلتیں، چڑھاوا چڑھاتیں، مرضیاں بانٹتیں اور ہاتھ جوڑے کھڑی رہتیں۔ قدم قدم پہ سبیلیں لگی ہیں محلے محلے بازار بازار تعزیے رکھے ہیں۔ سیکڑوں آدمی سبز کپڑے پہنے اِدھر سے اُدھر گھومتے رہتے۔ سال بھر جو لوگ کسرت نہ کرتے وہ بھی محرم سے ایک مہینہ پہلے کسرت شروع کر دیتے اور پھر اپنے ڈنڈ بیلے خود دیکھتے اور دوسروں کو دکھاتے۔ بانکے بنے سارے شہر کا گشت لگاتے پھرتے اور پھر جب محرم ختم ہو جاتے تو سارے شہر پر ایک سناٹا چھا جاتا۔ دل بجھ جاتے اور آنکھیں پُرنم ہو جاتیں۔ ہندو دوکان دار ایک سے پوچھتے رہتے محرم میں کتنے دن ہیں۔ جتنی بکری اُن کی ان بارہ دنوں میں ہوتی سال بھر میں نہ ہوتی۔ فقیروں کے گروہ کے گروہ اور غول کے غول حسینؑ کی خیرات لیتے اِدھر سے اُدھر گھومتے رہتے۔ سارا شہر یا حسینؑ یا حسینؑ اور نعرۂ حیدری یا حسینؑ اور ڈھول تاشوں کی آوازوں اور مرثیوں کی صداؤں سے گونجتا رہتا۔ پندرہ بیس دن چاندرات سے پہلے ایک فقیر سر پہ سبز کسا وہ کسے، سبز کرتا پہنے ایک ہاتھ میں علم ایک میں مورچھل

[illegible] ہوتا [illegible] بند ہو جاتا اور رستہ [illegible] پر ہندو مسلمان کی کمائی سے [illegible] اور ہندو مسلمان سب اسے چھوتے تھے [illegible] کے [illegible] بچے کے سہرے [illegible] سب جان لیتے محرم آ گئے۔

چاند اگر انتیس کا ہو گیا تو مغرب کے بعد نہیں تو تیس تاریخ کو مغرب سے پہلے گشت کے علم اٹھتے تھے۔ محرم کا چاند فرش تعزیہ دار ہی دیکھ کر مرثیے پڑھتے تھے اور کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ [illegible] گھرانے کے نامی گرامی تھے اور نئی بستی میں [illegible] گلی میں رہتے تھے وہیں ان کے علم رکھے جاتے تھے۔ [illegible] کا جلوس نئی بستی سے کشمیری بازار، کناری بازار [illegible] کے بازار ہوتا ہوا [illegible] کے راستے سے پھر نئی بستی پہونچ جاتا تھا۔ جلوس میں شیعہ سنی کے عوام و خواص سب ہی ہوتے تھے۔ [illegible] تاشے ہوتے اس کے پیچھے مجمع ہوتا۔ علم ٹھہر جاتے تو تاشے بند ہو جاتے اور سوز خوانی شروع ہو جاتی۔ [illegible] گھرانے کے نامی فنکار سب ہی سوز خوانی کرتے۔ آفتاب موسیقی فیاض حسین خاں، استاد تصدق حسین خاں، استاد ولایت حسین خاں، استاد [illegible] خاں اور ان کا سارا خاندان ہی سوز خوانی کرتا تھا۔ علم ان کے گھر کے ہی تو تھے۔ یہ علم اب گشت کو نہیں اٹھتے مگر اپنے مقام پر بدستور رکھے جاتے ہیں اور مجلسیں ہوتی ہیں۔ آفتاب موسیقی کے زمانے میں بڑے بڑے نامی گرامی [illegible] انہیں سننے کے لئے اس مجلس میں آتے تھے۔ پہلی دوسری [illegible] میں بہت سے تعزیے [illegible] اٹھتی تھیں۔ کسی زمانے میں [illegible] بالکل خالی تھی۔ پھر [illegible] نامی [illegible] کے ایک شخص نے [illegible] کر کے ایک تعزیہ نکالنا شروع کر دیا۔ یہ تعزیہ [illegible] تھا۔ تمام قسم کے تاشے اور [illegible] بنائے جاتے تھے۔ چوتھی تاریخ کو [illegible]

[illegible]

[illegible] بعد میں ایک سبیل بھی ایسی ہی تھی [illegible] ایک [illegible] کہتے ہیں جو کسی مقام پر [illegible] اور پانی یا شربت وہاں پلایا جاتا ہے۔ اور ایک سبیل تعزیے کی قسم ہے۔ ان سبیلوں میں بڑی صنعت دکھائی جاتی تھی۔ ابرک اور پنی سے چوکھٹوں میں مختلف مقامات کے خوب صورت نقشے بنے ہوتے۔ جو ڈوری کھینچنے سے ایک کے اندر سے ایک نکل کر بلند ہو جاتے تھے اور پھر انہیں نیچا کر دیا جاتا تھا۔ تعزیہ داری میں تعزیے کے علاوہ علم، شدّے، براق، سبیل، ذوالجناح، تابوت اور ضریح رکھے جاتے تھے۔ ضریح شیعوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ سنیوں میں کم اور شیعوں میں مجلس کا رواج زیادہ تھا۔ شاہ گنج کی مجلسوں کے علاوہ شہر میں شیخ بزرگ علی کے یہاں پانچویں کی، مسجد [illegible] خانے کے امام باڑے کی آٹھویں کی مجلس بہت مشہور تھی۔ ان مجلسوں میں ہندو مسلم شیعہ سنی معززین شہر اور اہل علم سب ہی شریک ہوتے تھے۔ آٹھویں کی مجلس میں شیرمال تقسیم ہوتی تھی۔ امام باڑے کی وسیع عمارت میں کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی اور جو لوگ دیر سے آتے انہیں اندر جانا مشکل ہو جاتا۔ گھنٹہ گھنٹہ بھر مجلس ختم ہونے کے بعد بھی باہر آنا مشکل تھا۔ پانچویں کو پیک [illegible] جاتے تھے۔ ایک خاص قسم کی [illegible] وردی ہوتی۔ [illegible] قسم کی پگڑی سر پر، [illegible] کمر میں [illegible] گھنٹیاں بندھی ہوتی۔ بیس بیس چالیس چالیس [illegible] [illegible] تاریخ کو [illegible] پھرتے [illegible] ایک آدمی [illegible] پڑھتا:

ع کیا پھول کربلا سے [illegible] حسین کی [illegible]

[illegible]

[illegible] تھا ایک خاص بھیڑ ہو جاتی۔
[illegible] ہوتے تھے۔ ایک جس روز وہ
[illegible] ان تعزیوں کی وجہ سے تعزیہ داروں
کا نام زندہ تھا۔ ورنہ بتائیے شہدی بوٹ کا نام کون جانتا۔ مگر وہ
[illegible] سے اپنے تعزیے کے ساتھ ہوتی تھیں اور کسی نہ
کسی سے جھگڑا کر ڈالتیں۔ اس وجہ سے لوگ انھیں شہدی بوٹ
کہتے تھے۔ اسی طرح بی پیاری کا تعزیہ، کالے چودھری کا تعزیہ،
حکیم شیخ اللہ اور صفدر خاں کے تعزیے، جو لالا کے علم جیسا کی براق
اور اس طرح کے بہت سے تعزیے تھے جو رکھنے والوں کے نام سے
مشہور تھے۔ بہت سے محلوں کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی وجہ
سے ایسے ایسے محلوں کے نام سننے میں آ جاتے تھے جنھیں عام طور سے
لوگ نہیں جانتے اور بہت سے تعزیے اپنی صنعت کاری کی وجہ
سے مشہور تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ آگرے والوں نے اپنے فن اور صنعت
کا کمال ان تعزیوں میں صرف کر دیا تھا۔ ایسا حسین اور باریک
کام اب شاید دیکھنے میں نہ آئے۔ جیسا کی براق پر سنا ہے چھ مہینے
پہلے سے کام شروع ہو جاتا تھا۔ کوئی چیز شاید ہی ایسی باقی رہی ہو
جس کا تعزیہ بن سکتا ہو اور لوگوں نے نہ بنایا ہو۔ مثلاً روئی کا تعزیہ،
ابرک کا تعزیہ، چوڑی کا تعزیہ، کاٹھ کا تعزیہ، سرکی کا تعزیہ، موم
کا تعزیہ، رانگ کا تعزیہ، کاغذ کے پھولوں کا تعزیہ، سچے پھولوں
کا تعزیہ، مٹی کا تعزیہ، گھاس کا تعزیہ، ناج کا تعزیہ، مٹھائی کا
تعزیہ، قالین کا تعزیہ، کپڑے کا تعزیہ یہاں تک کہ سونے چاندی
کا تعزیہ بھی تھا۔ یہ تعزیہ گشت نہیں کرتا تھا۔ ہر تعزیے میں صنعت کار
اپنی صنعت اور فن کی پوری نمائش کرتا تھا۔ پھر گشت کے وقت
[illegible] کی نمائش ہوتی۔ تعزیوں کا تعزیوں سے اور
براقوں کا براقوں سے مقابلہ ہوتا۔ اسی طرح تاشے والے تاشے
والوں سے مقابلہ کرتے۔ ان کا مقابلہ یہ تھا کہ دونوں گروہ آمنے
سامنے [illegible] باری باری تاشے نوازی کا کمال دکھاتے
[illegible] جو ہٹ جائے وہی ہار جائے۔ اس
[illegible] کر صلح کرا دیتے اور دونوں چوکیاں ایک ساتھ

[illegible]

[illegible] محلے کی ایک مشہور گت تھی [illegible]
[illegible] آگرے میں چار تعزیے اپنی [illegible]
تھے۔ مٹھائی کا تعزیہ، قلعے کا تعزیہ، [illegible] کا تعزیہ [illegible]
کا تعزیہ۔ مٹھائی کا تعزیہ پوری مٹھائی سے بنایا جاتا تھا۔ یہ
مٹھائی والے اور بتاسے والے رکھتے تھے۔ قلعے کا تعزیہ قلعے میں
رکھا جاتا تھا۔ یہ قلعے کے سپاہی رکھتے تھے۔ یہ چاروں تعزیے
بہت بلند اور مینار کی شکل کے ہوتے تھے۔ ایک ایک تعزیے
میں کتنے ہی کھن ہوتے تھے جو علیحدہ علیحدہ بنائے جاتے اور پھر اوپر
نیچے رکھ کر کس دیے جاتے تھے۔ کھنوں میں چاروں طرف رسیاں
باندھ دی جاتی تھیں جنھیں لوگ چاروں طرف سے کھینچے رہتے تھے
تاکہ چلنے میں توازن قائم رہے اور تعزیہ کسی طرف جھک نہ جائے۔
قلعے کے تعزیے کی بیچ پر کاغذ کے مور ناچتے رہتے تھے اور
بالو گنج کے تعزیے پر کاغذ کی پھرکنیاں۔ مٹھائی کے تعزیے کی
دو برجیاں ہوتیں جن کے کلس شکر سے بنائے جاتے تھے۔ سارے
تعزیے پر بتاسوں سے پھول بیل بنائے جاتے۔ بہت سے دینی تاشے
اور دوسری مٹھائیاں ہوتی تھیں۔ شہر میں اونچی عمارتیں
سے یہ تعزیے اونچے ہوتے اور بازار کے قریب رہنے والوں کو اپنے
صحن میں نظر آ جاتے تھے۔ مٹھائی کا تعزیہ بلا استاد رکھتے تھے۔ مذہب
سے ہندو اور پیشہ کے اعتبار سے بتاسے والے تھے۔ یہ پرانے
بھی استاد تھے۔ تعزیے کی محبت اور اعتقاد سے آخر عمر میں مسلمان ہو
گئے تھے۔ وصیت کے مطابق کربلا میں جہاں ان کا تعزیہ دفن کیا
جاتا تھا اسی کے برابر دفن ہوئے۔ ان کا تعزیہ آٹھویں کی رات کو
اٹھتا تھا اور لے جا کر راوت پاڑے میں سڑک پر رکھ دیا جاتا تھا
پھر صبح سات بجے وہاں سے اٹھا کر دوسرے تعزیوں کے ساتھ گشت
میں شریک ہو جاتا۔ ایک سال تعزیہ سڑک پر رکھا تھا کہ [illegible]
جھاڑ دینا شروع کر دی اور تعزیے پر خاک پڑنے لگی۔ راوت پاڑہ
ہمیشہ سے خالص اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور تجارت پیشہ لوگوں کا
محلہ ہے۔ ان لوگوں نے جھنگیوں کو روکا۔ جھنگی نہ مانے اور نوبت
مار پیٹ تک پہنچ گئی۔ آخر خود بلا استاد نے صلح کرا کے معاملہ

[illegible] مار پیٹ

رفع دفع کیا۔ اکبری گیٹ میں کاسہ محل کے قریب چھتہ ہے پر گجا والوں کی حویلی ہے۔ یہ وہاں کے سب مکانوں سے بلند ہے اور مشاق کا تعزیہ اس سے بھی بلند ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے حویلی کی بالائی منزل پر کنگرے رکھوا کر اسے اور اونچا کر دیا۔ مشاق کے تعزیے والوں کو خبر ہو گئی۔ انھوں نے راتوں رات ایک کلس بنا کر اور لگا دیا اور جب تعزیہ حویلی کے مقابل پہنچا تو تعزیہ اونچا رہا۔

سات تاریخ کو آگرے کا مقبول ترین تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ یہ بیچ گلاب کے پھولوں سے بنتا ہے اور ردیکیوں کے کڑے میں رکھا جاتا ہے اور تعزیوں کی طرح اس کا بھی گشت موقوف ہے۔ اس میں کئی من پھول صرف ہوتے ہیں اور گلاب، جو اس پر عقیدت سے لوگ چھڑکتے ہیں اس کا تو کوئی حساب نہیں جب یہ گشت کرتا تھا تو جن جن راستوں سے گزرتا تھا بلا مبالغہ گلاب کی کیچڑ ہو جاتی تھی۔ سات تاریخ کو جب یہ تعزیہ بازار میں آتا تو بازار دوسرے تعزیوں سے بھرا ہوتا تھا مگر احتراماً تمام ڈھول تاشے بند ہو جاتے تھے۔ یہ تعزیہ مرثیوں سے گشت کرتا تھا۔ یہ تعزیہ اب بھی رکھا جاتا ہے اور ہر مذہب اور ہر فرقے کے زائرین اس کی زیارت کرتے ہیں۔

تعزیوں کے علاوہ محرم میں بڑی تعداد اکھاڑوں کی تھی جن میں فنونِ سپہ گری کی نمائش ہوتی تھی۔ ان میں ایک مشہور اکھاڑہ ننھے استاد منیر خلیفہ کا تھا۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ ان کے باپ ببکن خاں کہیں باہر سے وارد ہوئے تھے۔ انھیں ایک بنّوٹ گتکے کا داؤں ایسا رواں تھا کہ اچھے اچھے استادوں کے گھٹنے پٹے رکھوائے تھے۔ دونوں بھائی اکنگ، گتکا، ظفر سیکری، بانا، بنوٹ، بھرا، پٹہ سب ہی کچھ جانتے تھے اور بقول خود بانک بنوٹ کے بھی ماہر تھے۔ محرم کی آٹھ تاریخ کو ان کا اکھاڑا اکبری بالا میں چوراہے سے ہٹ کر لگتا تھا۔ بی کا ایک گنڈا بازار کی ایک طرف کی گوک پر رکھ دیتے۔ ان میں دستوں کے چھوٹے بڑے کئی کئی چھوٹے بڑے چیزیں سب پہ لال ٹل ٹل پر گھنٹی بیچ بازار میں تخت بچھ جاتے۔ جوانوں اور لڑکوں کی ٹولیاں کسرتی بدن رنگ لباس پہنے ہوئے ان چبوتروں پر اور تختوں پر طرح طرح کی کسرتیں قلابازیاں اور جمناسٹک کے کرتب دکھاتے۔ اسی کے ساتھ کرتب پٹے کے کمالات کی نمائش کرتے نیز خلیفہ شاگردوں کے ہاتھ پہ ککڑی رکھ کر تلوار سے کاٹ دیتے اور پیٹ پر پان رکھ کر ایسا ہاتھ لگاتے کہ پان کے برابر سے دو ٹکڑے ہو جاتے۔ کیا مجال جو ہاتھ یا پیٹ پر ذرا بھی آنچ آ جائے۔ ساتویں کو بلوچپورہ سے شدّے اور تاج گنج سے ذوالفقار اور شدّے آتے تھے۔ تاج گنج کی چھوٹی کی مہندیاں مشہور تھیں۔ نویں کے دن شام تک سارے باجے تاشے سے گشت کرنے والے تعزیے گشت ختم کر دیتے اور دسویں شب میں جتنے تعزیے کہ مرثیے سے اٹھتے تھے وہ گشت کرتے۔ صبح ہر تعزیے پر شہیدی پڑھی جاتی۔ پھولوں کے تعزیے کی شہیدی بڑی مشہور اور پُراثر تھی جسے سننے کے لئے دور دور سے لوگ آتے تھے۔ پھر دس تاریخ کو تمام تعزیے کربلا لے جائے جاتے اور دفن کر دئے جاتے۔ سب سے آخر میں جوالا کے علم آتے۔ اسے دیکھتے ہی لوگ سمجھ لیتے کہ اب شہر میں کوئی تعزیہ کربلا جانے کو باقی نہیں رہا۔ یہ علم بھی ایک ہندو کے تھے۔ محرم کے ڈھول تاشے باجے سب ایک ہی مخصوص تال سے بجائے جاتے۔ اسے ماتم کہتے تھے۔ سن کر معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ محرم کا ماتمی باجا ہے۔ ۱۹۴۶ء سے آگرے کے محرم ختم ہو گئے اور باجے تاشے والے بھی اپنا فن بھول گئے۔ اپنے اپنے مقام پر تعزیے اب بھی رکھے جاتے ہیں مگر مشکل سے سو میں دس۔ فاتحہ، خیر خیرات اور مجلسیں اب بھی ہوتی ہیں مگر بہت کم۔ دس تاریخ کو اب کئی سال سے دس بیس تعزیے کربلا جانے لگے ہیں مگر نا خوشی کے ساتھ

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

فرشتہ

(عہدِ وسطیٰ کا ایک مایۂ ناز مؤرخ)

تاریخ کا مشکل ہی سے کوئی ایسا طالبِ علم ہوگا جس نے عہدِ وسطیٰ کے اس عظیم مؤرخ اور ہندوستان کے اس مایۂ ناز مؤلف کا نام نہ سنا ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر فرشتہ اپنی شہرۂ آفاق تالیف "گلشنِ ابراہیمی" نہ لکھتا تو دورِ وسطیٰ کی تاریخ کا ایک بہت بڑا حصہ ہمیشہ کے لئے تاریکی میں رہتا۔

محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ کی تاریخ پیدائش میں بڑا اختلاف ہے۔ ہارون خان شیروانی اپنی کتاب "دکن کے سلاطین بہمنیہ" میں لکھتے ہیں کہ وہ ایران کے ایک مقام استرآباد میں ۱۵۵۲ء میں پیدا ہوا۔ اس کے برخلاف جان بریگس اور وسنٹ سمتھ کا خیال ہے کہ وہ بحرالکاہل کے ساحلی علاقہ میں ۱۵۷۰ء میں پیدا ہوا۔ جبکہ جیولس موکل کا کہنا ہے کہ وہ ۱۵۵۰ء میں پیدا ہوا۔ موکل کی بتلائی ہوئی تاریخ پیدائش زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اور تاریخ ہند کے مشہور مؤلف ایچ۔ ایم۔ الٹ کا بھی یہی خیال ہے۔

فرشتہ کے والد غلام علی شاہ بارہ سال کی عمر میں ہی اسے اپنے ساتھ احمد نگر لے آئے تھے۔ چونکہ وہ ایک اچھے عالم تھے اس لئے جلد ہی والیٔ احمد نگر مرتضیٰ نظام شاہ نے ان کو میران حسن کا اتالیق مقرر کر دیا لیکن شومیٔ قسمت کہ وہ اپنے انتخاب کے چند دن بعد ہی انتقال کر گئے اور فرشتہ کم عمری میں ہی یتیم ہو گیا۔

مرتضیٰ نظام شاہ کی نظرِ کرم سے فرشتہ جلد ہی شاہی محل کا سپہ سالار مقرر ہوا اور مرتضیٰ اکثر ضروری باتوں میں اس سے صلاح و مشورہ کیا کرتا تھا۔ سلطنت نظام شاہیہ احمد نگر میں اپنے زوال کی آخری منزلیں طے کر رہی تھی جس کی وجہ سے احمد نگر کی سیاسی فضا نہایت مکدر تھی۔ مرتضیٰ نظام شاہ خود اپنے بیٹے میران حسن کے ہاتھوں معزول کر دیا گیا اور اسی خانہ جنگی کے دوران شاید فرشتہ مارا جاتا لیکن میران حسن نے وقت پر پہنچ کر اپنے اتالیق کو موت کے منہ سے بچا لیا۔ فرشتہ احمد نگر کے اس سیاسی انتشار سے جلد ہی بیزار ہو گیا اور احمد نگر سے وہ بیجاپور چلا آیا۔ جس وقت فرشتہ بیجاپور آیا اس کی عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ جیمس ڈگلس کا خیال ہے کہ اس وقت وہ صرف بیس سال کا تھا لیکن یہ درست نہیں ہے۔ ایچ۔ ایم۔ الٹ کہتا ہے کہ چونکہ فرشتہ اہلِ تشیع تھا اس لئے احمد نگر میں وہ اپنے لئے کوئی خاص مقام پیدا نہیں کر سکا۔ یہ خیال صحت پر مبنی نہیں ہے۔ دراصل فرشتہ یہاں کی طوائف الملوکی سے تنگ آ چکا تھا اور پھر بیجاپور کی سلطنت ان دنوں ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں دکن کی سب سے زیادہ طاقت ور اور ترقی یافتہ سلطنت بن گئی تھی اور یہاں کا دربار اپنے زمانے کے علماء فضلا کا مرکز تھا۔ ملک قمی، ملا ظہوری اور جمال دکنی

شعراء شاہ نواز خاں جیسے عالم اور ماہر فنون تیر، رفیع الدین شیرازی جیسے مؤرخ اور بیجاپور کے عالم اس دربار سے وابستہ تھے۔ ظاہر ہے کہ ساری باتیں اور عادل شاہی بیجاپور کی فیاضانہ سرپرستی نے فرشتہ کو اپنی جانب راغب کیا ہوگا کہ احمد نگر کو جہاں کی سیاسی فضا میں انتشاری کیفیت پیدا ہو چکی تھی خیرآباد کہہ دے اور بیجاپور کا رُخ کرے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب اس نے احمد نگر چھوڑا ہوگا تو اس کی طرف حسرت و یاس سے دیکھنے کی بجائے فرشتہ نے اطمینان اور سکون کا سانس لیا ہوگا۔

بیجاپور میں دلاور خاں، وکیل السلطنت نے فرشتہ کی خوب آؤ بھگت کی اور اس کو اپنے آقا ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار میں باریاب کرایا۔ ابتداً ابراہیم نے فرشتہ کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ ۱۵۹۳ء کے بعد عنایت خاں شیرازی نے دوبارہ ابراہیم کے دربار میں فرشتہ کو باریاب کرایا۔ اس مرتبہ ابراہیم نے فرشتہ کی عزت افزائی کی اور اس کو وہ کام سونپا جس کے لئے ہی شاید فرشتہ پیدا ہوا تھا اور جس نے اس کے قلم کو لافانی بنا دیا۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کی یہ خواہش تھی کہ اس کے دربار کے شعراء و علماء میں سے کوئی اس کے حالاتِ زندگی تفصیل لکھے اور ساتھ ہی ہندوستان میں اسلامی اخوت کی تاریخ بھی قلمبند کرے۔ اس نے ابتدا میں عبدل سے کہا تھا جس نے دکنی زبان میں اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی۔* اب اس نے فرشتہ کو روضۃ الصفاء کا ایک نسخہ دیتے ہوئے کہا کہ ابھی تک مسلمانوں کی تاریخ تسلی بخش طور پر کسی نے بھی نہیں لکھی ہے سوائے نظام الدین بخشی کے۔ لیکن وہ بھی بڑی حد تک مختصر اور تشنہ ہے اور دکن کے حالات تو اس میں بالکل نظرانداز کر دئے گئے ہیں۔ ابراہیم نے فرشتہ سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی کتاب میں [illegible] فیروزی اور [illegible] کام دے۔

اپنے آقا کا حکم ملنے پر فرشتہ نے تاریخ کی تدوین کا کام شروع کر دیا۔ فرشتہ خود ابتدائیہ میں اس طرح رقم طراز ہے کہ ابتدائی عمر سے ہی اس کو ہندوستان میں اسلامی فتوحات کی تاریخ اور چند اعلیٰ مقام بزرگانِ دین کا احوال لکھنے کا شوق تھا لیکن احمد نگر کے حالات نے اس کا موقع نہیں دیا۔ اب ابراہیم شاہ نے جو خود بہت بڑا عالم اور تاریخی کتب کا شوقین ہے اس کا موقع فراہم کیا ہے کہ وہ اپنی اس دیرینہ خواہش کو پورا کرے۔

فرشتہ اپنی تاریخ کی تالیف سے پہلے بیجاپور کی فوج میں ملازم رہا۔ کچھ دن وہ جمال الدین کی قید میں بھی تھا لیکن وہ جلد ہی وہاں سے آزاد ہو گیا اور زندگی کے باقی ایام آرام اور سکون سے گزارے۔ ۱۵۹۴ء میں وہ بیگم سلطانہ دختر ابراہیم ثانی کے ساتھ احمد نگر بھی گیا تھا۔ جب اس کی شہزادہ دانیال کے ساتھ مونگی پیٹن کے مقام پر شادی ہوئی تو فرشتہ وہاں موجود تھا اور وہ دلہن کے ساتھ برہان پور تک جو ان دنوں خاندیس کا صدر مقام تھا، گیا تھا۔ بریگس کا خیال ہے کہ ابراہیم نے فرشتہ کو جہانگیر کے دربار میں بھی روانہ کیا تھا کہ وہ اپنے آقا کی طرف سے مغل شاہنشاہ کو تخت نشینی پر مبارکباد پیش کرے۔

فرشتہ کی تاریخ وفات کے بارے میں اتنا ہی اختلاف ہے جتنا کہ اس کی تاریخ پیدائش کے بارے میں۔ بریگس کا خیال ہے کہ اس کی وفات ۱۶۱۲ء میں ہوئی، برخلاف اس کے موہل کا کہنا ہے کہ وہ ۱۶۲۳ء میں مرا اور اس وقت اس کی عمر تقریباً ۶۳ سال کی تھی۔ فرشتہ کے حالاتِ زندگی کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد ۱۶۲۳ء زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔

فرشتہ کی تاریخ گلشنِ ابراہیمی کو جو زیادہ تر تاریخ فرشتہ کے نام سے [illegible]

---

* عبدل دہلوی دکنی۔ ابراہیم نامہ [illegible] نہیں ہوئی ہے [illegible] کتب خانہ سالار جنگ [illegible] موجود ہے۔

[illegible] فرشتہ کی تاریخ کی خصوصیات ہیں ۔

عہد وسطیٰ کی اس عجیب تاریخ کی تکمیل میں پانچ سال (۱۶۰۶ء تا ۱۶۱۱ء) کا عرصہ لگا جو کتاب کی ضخامت اور واقعات کی تفصیل کے لحاظ سے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہے۔ ایچ۔ ایم۔ الٹ کا خیال ہے کہ تاریخ فرشتہ کا پہلا مسودہ شاید ۱۶۰۶ء میں ابراہیم ثانی کو دکھایا گیا تھا لیکن جب تک فرشتہ زندہ رہا وہ اپنی تالیف کے مطالب و ابواب میں کمی بیشی اور ضروری اصلاح کرتا رہا ۔

فرشتہ نے اپنی کتاب میں تقریباً پینتیس کتابوں کا حوالہ دیا ہے جن سے اس نے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً طبقاتِ اکبری، بہمن نامہ، سراۃ التواریخ، تحفۃ السلاطین، حالات محمود گاواں وغیرہ وغیرہ۔ بہت سے واقعات کا فرشتہ خود عینی شاہد تھا اور یقیناً اس کو اس سے اپنی کتاب میں مدد ملی ہوگی۔ چونکہ فرشتہ احمد نگر میں شاہی سلحدار، بیجاپور میں ابتداً فوجی ملازم اور بعد میں ابراہیم ثانی کے دربار سے وابستہ رہا اور پھر اس نے برہان پور اور لاہور کا سفر بحیثیت سفیر کیا اور ان مواقعوں سے اس نے کافی فائدہ اٹھایا ہوگا اور تاریخ فرشتہ میں اس قسم کے حوالوں کی کمی نہیں ہے ۔

تاریخ فرشتہ بلاشبہ عہد وسطیٰ کی اہم ترین تاریخ ہے۔ اور اس کے فوراً بعد جو بھی تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر اسی تاریخ کی نقل معلوم ہوتی ہیں۔ تاریخ فرشتہ کے مواد سے نہ صرف مشرقی مورخین بلکہ مغربی عالموں نے بھی خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ گلشنِ ابراہیمی ہندی قلم سے لکھا ہوا ایک ایسا تحقیقی مرقع ہے جس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ مورخ نے کہیں بھی تعصب اور جانب داری سے کام نہیں لیا ہے اور قابلِ تحسین امر تو یہ ہے کہ اس نے اپنے آقا کے وقت کی بھی غیر ضروری تعریف و توصیف سے کام نہیں لیا ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جس کی وجہ سے تاریخ فرشتہ بلاشبہ عہد وسطیٰ کی تمام تاریخوں سے زیادہ مکمل اور [illegible] ہے۔

تاریخ فرشتہ ۱۲ ابواب اور پیش لفظ پر مشتمل ہے[1] [illegible] مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے پہلے کی تاریخ کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے۔ اصل تاریخ ہندوستان میں اسلامی فتوحات سے شروع ہوتی ہے جو نہایت تفصیل سے درج ہیں۔ کتاب میں سلاطینِ دکن کے حالات بھی بڑی تفصیل سے قلمبند کئے گئے ہیں جو ہندوستان کی اکثر تاریخوں میں نایاب ہیں۔

فرشتہ اگرچہ عہد وسطیٰ کا عظیم مؤرخ مانا جاتا ہے لیکن وہ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے غلطیوں اور خامیوں سے مبرا نہیں ہے۔ ہارون خاں شروانی کہتے ہیں کہ فرشتہ واقعات کی صحت اور ان پر تبصرہ کے تعلق سے زیادہ دلچسپی سے کام نہیں لیتا جیسا کہ اس کی شہرت ہے اور یہ کہ بعض اوقات مبالغہ آمیزی سے کام لیتا ہے جس کی وجہ سے اس کی کتاب میں کچھ دلچسپی پیدا ہو تو ہو اس کی تاریخی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ ونسنٹ سمتھ بھی کہتا ہے کہ فرشتہ صرف واقعات قلمبند کرتا جاتا ہے اور واقعات کی تہہ تک پہنچنا یا ان پر تبصرہ نہیں کرتا۔ الٹ اور ڈگلس اس کو متعصب اور تنگ نظر بتلاتے ہیں لیکن مسلم مؤرخوں کے تعلق سے مغربی مؤرخوں کا اکثر یہی طرزِ عمل رہا ہے۔ جہاں تک مبالغہ آمیزی اور بادشاہوں کی تعریف و توصیف کا تعلق ہے اس میں شک نہیں فرشتہ کو اس سے مبرا نہیں سمجھا جا سکتا، لیکن اس امر سے انکار کرنا بھی مشکل ہے کہ جس زمانے میں فرشتہ نے اپنی شہرۂ آفاق تاریخ لکھی اس وقت مبالغہ آمیزی اور بادشاہوں کی تعریف و توصیف نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں بھی ایک عام اور پسندیدہ فعل تصور کیا جاتا تھا۔

ان تمام فطری کمزوریوں کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ گلشنِ ابراہیمی، عہد وسطیٰ کی تمام تاریخوں میں واقعات اور اعداد و شمار کے لحاظ سے ممتاز درجہ رکھتی ہے[2]

گلشنِ ابراہیمی پہلی مرتبہ ۱۸۳۲ء میں [illegible] طباعت

---

[1] اگر شاہانِ ملتان سے متعلق باب کو درج کر لیا جائے جس کو بریگز نے نظر انداز کر دیا ہے تو ابواب کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔

[2] ونسنٹ سمتھ ۔ اکبر مغلِ اعظم

سے آراستہ ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں دوبارہ طبع کی گئی۔ اس کے کچھ حصوں کا ترجمہ الگزنڈر ڈو نے ۱۷۶۸ء میں تین جلدوں میں کیا اور اس کے بعد جانا تھن اسکاٹ نے ۱۷۹۴ء میں دو جلدوں میں کیا۔ فنی اعتبار سے اسکاٹ کا ترجمہ زیادہ بہتر ہے جبکہ ڈو کا ترجمہ فنی کمزوریوں کے باوجود اپنی روانی اور سلاست کے لئے بہت مشہور ہے۔ ڈو کا ترجمہ دنیا کے مشہور مؤرخ گبن نے پڑھا تھا اور اس کی بہت تعریف کی تھی۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان کے مشہور عالم ڈاکٹر جانسن اور برک نے بھی اس کا ترجمہ پڑھا تھا اور کہا تھا کہ یہ سولھویں صدی کے کسی مسلم عالم کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے لیکن جنرل برجس پہلا عالم ہے جس نے ۱۸۲۹ء میں پوری کتاب کا چار جلدوں میں بڑی جانفشانی سے ترجمہ کیا ہے اور زیادہ تر فارسی سے نابلد عالم اسی کا ترجمہ پڑھتے ہیں۔ اگرچہ برجس نے بزرگانِ دین سے متعلق بارھویں باب کا ترجمہ نہیں کیا ہے جس کی تاریخی اہمیت گو کم سہی لیکن چند بزرگانِ دین نے بارھویں صدی کی سیاسی تحریکوں میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اسی لئے اس قسم کی اور دوسری کمزوریوں کا خیال کرتے ہوئے الٹ اور سمتھ نے برجس کے ترجمہ پر نظرثانی کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اور اگرچہ تمام کتاب کا دوبارہ ترجمہ کار سے وارد ہے نظرثانی کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

برجس کا ترجمہ چند خامیوں کے باوجود سب سے جامع اور مستند مانا جاتا ہے اور اس کے لئے وہ یقیناً ہمارے شکریے کا مستحق ہے کہ اگر وہ تاریخ فرشتہ کا ترجمہ نہ کرتا تو ہماری تاریخ کا ایک بہت ہی اہم حصہ فارسی سے نابلد عالموں کے مطالعہ میں کبھی نہ آتا اور کیا عجب کہ اس کی وجہ سے اس زرّیں عہد کے کتنے ہی گوشے آج تاریکی میں رہتے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے شعبۂ تالیف و تصنیف کی طرف سے تاریخ فرشتہ کا چار جلدوں میں اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے جو ترجموں کے باب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

خوردنی تلہن کی پیداوار

بتایا گیا ہے کہ ۱۹۶۶-۶۷ء کی مونگ پھلی کی فصل گزشتہ برس کی پیداوار کی بے مثال سطح یعنی ۵۳ لاکھ میٹرک ٹن سے بھی ۴ فیصد زیادہ ہوئی۔ ایک تخمینے کے مطابق پیداوار ۶۰ لاکھ میٹرک ٹن کی سطح تک پہنچ جائے گی۔

ملک بھر کے مونگ پھلی کے زیر کاشت رقبے میں لگ بھگ ۵ فیصد اضافہ ہوا۔ چنانچہ پیداوار میں اضافے کا زیادہ تر سبب فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ ہے۔

تقریباً ہر ریاست میں سال گزشتہ کی نسبت زیادہ مونگ پھلی پیدا ہوئی۔ صرف ریاست گجرات میں جہاں ملک بھر کے مونگ پھلی کے زیر کاشت رقبے کے ایک چوتھائی حصے میں مونگ پھلی کی کاشت کی جاتی ہے۔ گزشتہ سال کی پیداوار میں ۷،۵ فیصد اضافہ ہوا۔

اس برس ربیع کی فصل میں سرسوں اور تِلی کے بیج موافق موسمی حالات میں بوئے گئے ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ اس برس زیادہ رقبے میں کاشت کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس برس پالے جیسی قدرتی آفات سے بھی فصل بچ رہی ہے اور سرمائی برسات کی بھی کمی ہے۔ اتر پردیش اور پنجاب کی ریاستوں میں جہاں کل فصل کی تین چوتھائی سے زیادہ پیداوار ہوتی ہے، گزشتہ برس کی نسبت زیادہ رقبے میں کاشت کی گئی ہے۔ اب تک کی اطلاع کے بموجب توقع ہے کہ گزشتہ برس کی ۹ لاکھ میٹرک ٹن کی پیداوار اور غالباً ۱۹۶۲-۶۳ء کی ۱۳ لاکھ میٹرک ٹن کی پیداوار کی نسبت اس برس بہت اچھی فصل ہوگی۔

شاہکارِ فطرت

دستِ فطرت کا تراشا ہوا شہکار ہو تم

نرم و نازک مہ و خورشید کی تنویر ہو تم — انجم اندام ہو تم حسن کی تصویر ہو تم
میری رنگینیٔ جذبات کی تفسیر ہو تم — جانے کس شاعرِ خوش بخت کی تقدیر ہو تم
تم ہی شاعر ہیں جو رقصاں ہیں وہ اشعار ہو تم
دستِ فطرت کا تراشا ہوا شہکار ہو تم

ماہ رو، آئینہ رو، شمعِ فروزاں تم ہو — غیرتِ تابِ رُخِ یوسفِ کنعاں تم ہو
مخزنِ تازگیٔ فصلِ بہاراں تم ہو — سیلِ انوار ہو تم، سروِ خراماں تم ہو
حور وش سرو قد و جنتِ انوار ہو تم
دستِ فطرت کا تراشا ہوا شہکار ہو تم

خمِ گردن پہ ہے حسنِ خمِ چوگاں بھی نثار — ناز و انداز پہ ہے شوخیٔ خوباں بھی نثار
مستیٔ چشم پہ ہے چشمِ غزالاں بھی نثار — جسمِ سیمیں پہ ہے رنگِ سمنستاں بھی نثار
شوخ ادا، مست نظر، رشکِ سمن زار ہو تم
دستِ فطرت کا تراشا ہوا شہکار ہو تم

مسکراہٹ پہ ہے پھولوں کا تبسم قرباں — لحنِ رفتار پہ موجوں کا ترنم قرباں
رخِ پُر نور پہ ہے تابشِ انجم قرباں — طرزِ گفتار پہ کلیوں کا تکلم قرباں
نازشِ کاہکشاں، نادرہ گفتار ہو تم
دستِ فطرت کا تراشا ہوا شہکار ہو تم

تم جو چاہو تو ہوائیں مئے پُر زر برسائیں　　　تم جو کہہ دو تو خزائیں گلِ تر برسائیں
مسکرا دو تو فضائیں بھی گہر برسائیں　　　تم جو رو دو تو گھٹائیں بھی شرر برسائیں
شعبدہ بازِ فسوں سازِ فسوں کار ہو تم
دستِ فطرت کا تراشا ہوا شہکار ہو تم

تم جو چاہو تو مرے غم کا ازالہ ہو جائے　　　تابِ رُخ سے شبِ فرقت میں اُجالا ہو جائے
بدلو تیور تو خمِ ابرو بھی بھالا ہو جائے　　　آنکھ بدلو تو زمانہ تہہ و بالا ہو جائے
کبھی شاخوں کی لچک ہو کبھی تلوار ہو تم
دستِ فطرت کا تراشا ہوا شہکار ہو تم

تم وہ نُزہت ہو کہ ایسی گل و ریحاں میں نہیں　　　تم وہ طلعت ہو کہ جو بزمِ چراغاں میں نہیں
تم وہ صُورت ہو کہ جو شہرِ نگاراں میں نہیں　　　تم وہ رنگت ہو کہ جو گوہر و مرجاں میں نہیں
ملکۂ شہرِ نگاراں دُرِ شہوار ہو تم
دستِ فطرت کا تراشا ہوا شہکار ہو تم

دلِ پُر شوق کا ہر راز ہے تم سے منسوب　　　میرے تخیل کی پرواز ہے تم سے منسوب
میرے اشعار کا اعجاز ہے تم سے منسوب　　　سازِ افکار کی آواز ہے تم سے منسوب
راحتِ قلب و نظر، حاصلِ افکار ہو تم
دستِ فطرت کا تراشا ہوا شہکار ہو تم

کارِ دشوار کی تکمیل بہت مشکل ہے　　　لفظوں میں نور کی تشکیل بہت مشکل ہے
شرحِ تنویر کی تکمیل بہت مشکل ہے　　　الغرض حُسن کی تفصیل بہت مشکل ہے
مہ گسل، انجم شکن، قابلِ دیدار ہو تم
دستِ فطرت کا تراشا ہوا شہکار ہو تم

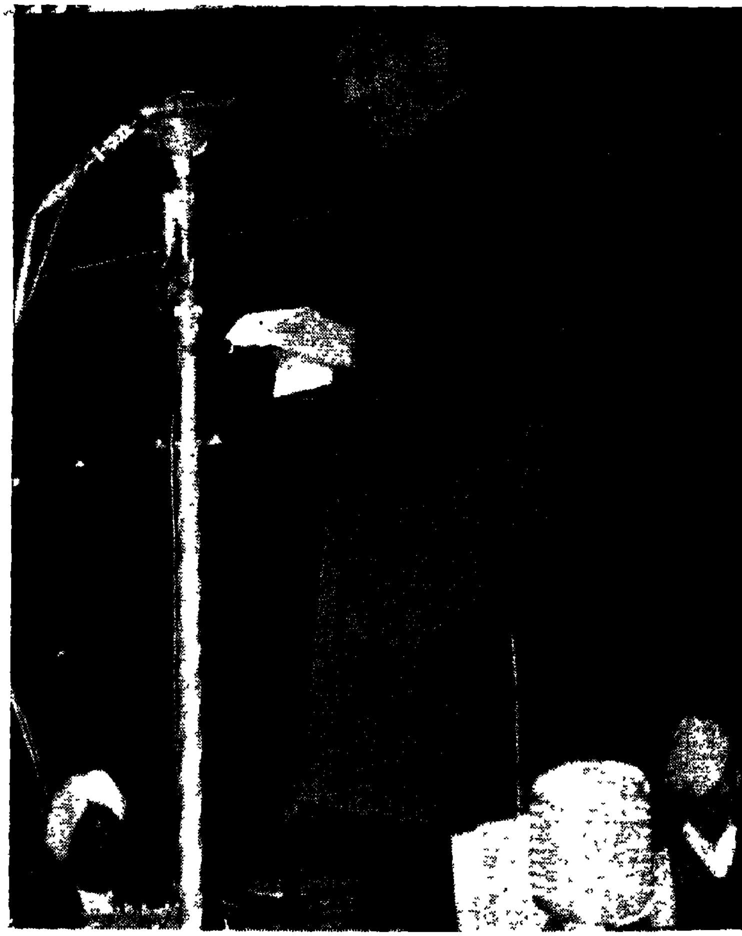
تصحیح

جناب سید علی عباس حسینی کی کہانی "[illegible]" شائع شدہ آجکل جنوری ۱۹۶۷ء میں یہ تصحیح کر لی جائے

صفحہ ۲۷ پہلا کالم سطر ۱۲ ｝ سرچند کی جگہ سے
صفحہ ۲۸ دوسرا کالم سطر ۱۹ ｝ پہیلیوا پڑھا جائے

مشاعرۂ جشن جمہوریت

۲۴-جنوری ۱۹۶۵ء



خواجہ غلام السیدین نے مشاعرے کا
افتتاح کرتے ہوئے ایک
بصیرت افروز تقریر فرمائی

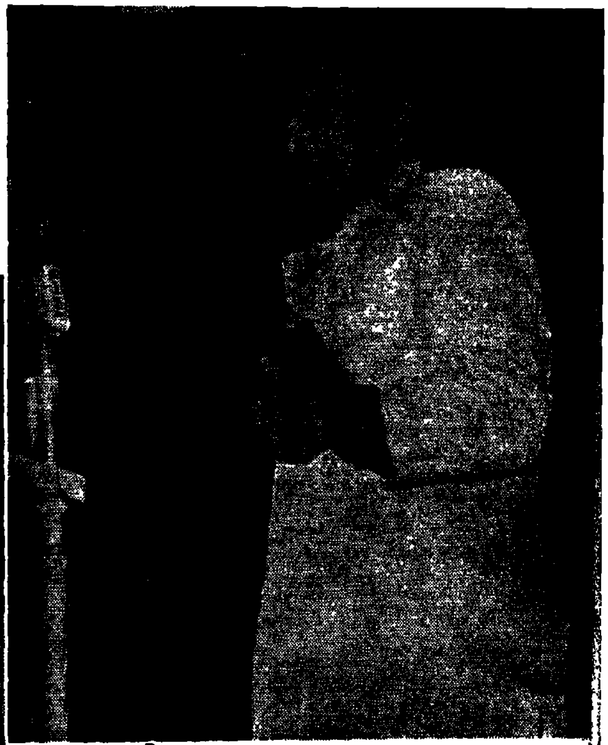
جناب گوپی ناتھ امن جناب تلوک چند محروم
صدر مشاعرہ کو ہار پہنا رہے ہیں۔



• جوش ملیانی

انکار کیجئے نہ کمالاتِ جوشؔ سے
کم گو سہی مگر وہ سخن در ضرور تھا





فراق گورکھپوری

آئی تھی شاعری سے گلے ملنے روحِ عصر
کہہ کر تجھے فراقؔ کو سونپا گذر گئی

ساحر لدھیانوی

جسم مٹ جانے سے انسان نہیں مر جاتے
دھڑکنیں رُکنے سے ارمان نہیں مر جاتے



غلام ربانی تاباں

فرصت کہاں جو دل کی جراحت کا غم کریں
اک شیرا و رکھائیں کہ آنکھوں کو نم کریں





مخدوم

زہر بھی آبِ حیاتِ لب و رخسار بھی ہے
زندگی دلبر بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے

جذبی

جب کبھی کسی گُل پر اک ذرا نکھار آیا
کم نگاہ یہ سمجھے موسم بہار آیا



فلم فیسٹیول



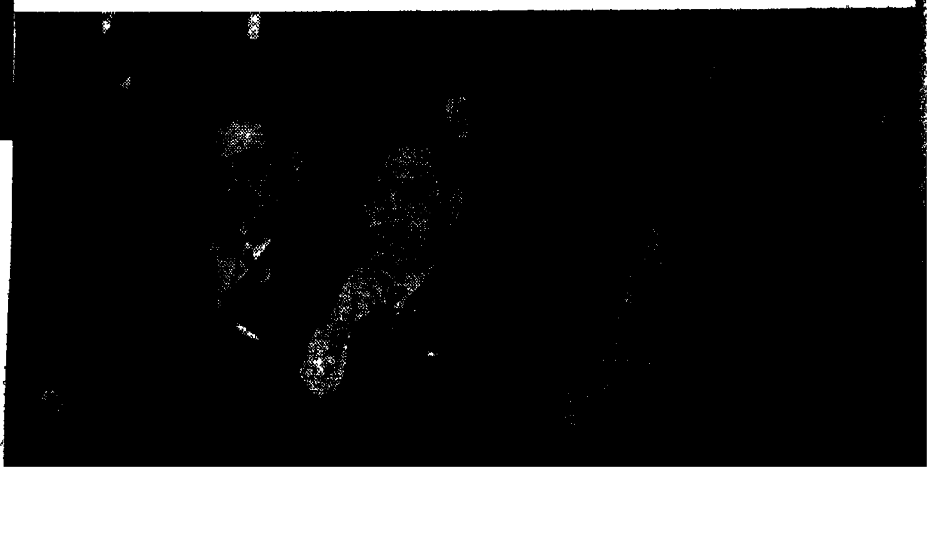
لنکا کی فلم گمپریلیا بہترین قرار دی گئی
نائب صدر جمہوریہ فلم پروڈیوسر کو
طلائی مور کا اعزاز دے رہے ہیں



ستیہ جیت رائے روس کی
ایک نمائندہ خاتون کے ساتھ



یوگوسلاویہ کی
مس مریا گرانو یورے
جو خاص دعوت پر فلمی
میلے میں تشریف لائیں



فلمی میلے کے افتتاح کے وقت
راجندر کمار، راج کپور
اور راشد

رفعت صدیقی

تضاد

میں جب اس دن سو کر اٹھا تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی اور سبھی اپنے روز کے معمول میں بڑی سرگرمی سے مشغول تھے۔ وہ معمول جو ہر صبح ایک ہی سا ہوتا ہے۔ وہی یکسانیت — لیکن لوگ کتنی دلچسپی لے رہے تھے!

گو میں دیر تک سوتا رہا تھا لیکن طبیعت بڑی بوجھل ہو رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ اس دن مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ وہ تاریخی دن جبکہ ہر تنخواہ دار آدمی اپنے آپ کو ہیرو سمجھتا ہے۔

میں پرسش کرنے لگا۔ باہر سے ہماری نوکرانی آئی اور اس نے میری بیوی کو ایک خبر سنائی۔ یہ خبر میں نے بھی سنی۔ میں کسی قدر بوجھل قدموں سے قریب پڑی کرسی تک گیا اور اس پر بیٹھ گیا۔ طبیعت اچانک بجھ گئی تھی۔ میں دیر تک چپ چاپ وہیں بیٹھا رہا۔

نوکرانی نے جو خبر سنائی تھی وہ بظاہر ایک معمولی سی خبر تھی — "جبل کے بیٹے کا انتقال ہو گیا —" میں نے کبھی اس بچے کو دیکھا نہیں تھا۔ ہاں! اس کے بارے میں سنا ضرور تھا پھر کیا بات تھی کہ اس خبر کا مجھ پر اتنا اثر ہوا تھا؟ جبل میرا کوئی رشتہ دار بھی نہیں تھا نہیں اسے میں اپنا دوست ہی کہہ سکتا ہوں۔ ایک معمولی رکشا والے کو مجھ جیسا گزیٹڈ افسر دوست کیسے کہہ سکتا ہے؟

لیکن ایک بات ضرور تھی جس کے پس منظر سے واقف ہونے کے بعد اور شاید آپ بھی اتنے ہی متاثر ہو سکتے۔ اس پس منظر سے جان پہچان کے لئے آپ کا یہ جاننا ضروری ہے کہ جبل سے میرا تعارف کیسے ہوا؟

اس شام میں ایک دوست سے ملنے کے لئے موٹر سائیکل باہر نکال ہی رہا تھا کہ اچانک میرے سامنے ایک طویل قامت آدمی آ گیا۔ مضبوط ہاتھ پیر، چھوٹی سی مونچھیں، تانبے کی سی رنگت اور تیل میں ڈوبے ہوئے بال، خاکی نیکر اور سوتی بنیڈوم کپڑے کی قمیض پہنے وہ کھڑا تھا اور اس کی پُر گوشت بالوں بھری پنڈلیوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی سنولائی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ "کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ مجھے اس کی صورت جانی پہچانی لگ رہی تھی لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھا ہے۔

"صاب! ذرا یہ محضر ہم رکشا والوں کا، لائسنس کے بارے میں لکھا ہوا دیکھ لیجئے۔" ایک ملگجے کاغذ پر ٹوٹے پھوٹے حروف میں قواعد کی غلطیوں سے بھرپور تحریر تھی لیکن محضر کے مواد میں بڑی شدت تھی۔

"کس نے لکھا ہے؟"

"میں — میں نے۔" وہ کسی قدر جھینپ گیا۔ میں چونک اٹھا۔ ہاں! میں نے اسے دیکھا ہے بار بار۔ شاید روزانہ یہی اس کا مخصوص انداز — کس میں دیکھا ہے؟ کس میں دیکھا ہے ...

[illegible]

... غلطیاں درست کر لیتا۔

[illegible] ایک سائق تھا جو غلط
[illegible] اس کے چہرے [illegible]
[illegible] ہاں ہاں!! یہ وہی تو ہے۔
[illegible]

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"عبدل — عبدالجبار —" اس نے اپنی بھاری آواز میں بتایا۔

"تو میاں عبدالجبار تم ہی ہو میرے ساتھ تیسری جماعت میں پڑھتے تھے؟ اتنے دنوں تک تم کہاں رہے میرے دوست؟" میرے اندر [illegible] لیکن میرے بالغ اور سماجی مرتبے کا احساس رکھنے والے وجود نے اس سے پوچھا۔ "کہاں تک پڑھے لکھے ہو؟"

"جی ہاں — وہ جھینپ گیا۔ تیسری تک پڑھا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ پھر میں نے تعلیم چھوڑ دی کیونکہ اس سال فیل ہو گیا تھا اور میری ماں یہ نقصان برداشت نہ کر سکتی تھی۔"

تیسری میں تو میں بھی فیل ہوا تھا لیکن میں ایک جج کا بیٹا جو تھا۔ میں نے تمام غلطیاں درست کر کے ایک آخری نظر [illegible] سے ڈالی اور کہا "میں اسے ٹائپ کروا دیتا ہوں۔ تم اسے میرے ہی پاس رہنے دو۔"

"بہت بہت شکریہ۔ لیکن — اگر — وہ دیکھئے — ہم سب [illegible]" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

"[illegible] کوئی بات نہیں۔ میں ٹائپ کروا کر رکھ دیتا ہوں [illegible]" اس نے شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے

[illegible]

[illegible]

میں نے [illegible] انڈل نذیل کر چکا تھا۔

"کتنا بن جاتا ہے تمہیں رکشا سے؟" میں نے پوچھا

"کبھی جو دو سو — کبھی کچھ — یہ سب قسمت پر ہے۔" اس نے بڑے فلسفیانہ انداز سے کہا۔ اب اس کی جھجک کسی قدر دور ہو چکی تھی۔

"شادی ہو چکی ہے؟"

"شادی؟" ایک عجیب مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھری اور اس نے ایک طویل سانس لی — "جی ہاں — ہو چکی ہے۔"

"بچے؟"

"جی نہیں — بچے — ایک ہی ہے۔"

چائے ختم کر کے وہ جلدی چلا گیا۔ اس کے بعد وہ اکثر گلی میں نظر آتا۔ اس کا گھر قریب ہی کہیں تھا۔ وہ ایک بار شہر کی سڑکوں پر بھی دکھائی دیا۔ ہر بار وہ سلام کرتا اور پھر بڑی پھرتی سے رکشا کے پیڈل مارنے لگتا۔

ایک بار پھر وہ میرے گھر آیا۔ میں اس وقت اخبار پڑھنے میں منہمک تھا۔ میں نے اسے اندر بلا لیا۔ وہ سلام کر کے بیٹھ گیا۔

"صاحب ایک کام سے آیا ہوں آپ کے پاس!"

اس کا لہجہ بڑا گمبھیر تھا۔

"کہو کیا کام ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ چند لمحوں تک خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ جیسے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا ہو کہ مجھے بتائے یا نہیں۔ پیشانی پر پڑی ہوئی سلوٹیں اور گہری ہو گئیں۔

"[illegible] روپوں کی ضرورت ہے؟"

"[illegible]" میں نے سوال کیا۔

[illegible]

میں نے نوکرانی کو آواز دی اور اس کے آنے پر اسے اندر سے تین روپے لانے کو کہا۔ روپے لے کر وہ شکریہ ادا کرکے بھی بیٹھا رہا۔ میں نے پھر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ — صاب۔ ایک بات پوچھوں۔"

"ضرور!" میں نے کہا۔

"صاب! اگر کسی آدمی کی بیوی اچھی نہ ہو تو وہ کیا کرے؟"

"اچھی سے کیا مراد ہے تمہاری؟" میں نے پوچھا۔"صورت شکل کی یا کردار کی؟"

"صورت شکل کی بھی اور کردار کی بھی۔" وہ بولا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں تمہاری بات۔"

"صاب! اگر کسی آدمی کی بیوی پھوہڑ ہو۔ بدسلیقہ ہو اور چڑچڑی ہو تو — ؟"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

"۔۔اور اگر۔" وہ پھر کہنے لگا۔ "وہ بدصورت بھی ہو۔ اس کا رنگ بے حد کالا ہو۔ اس کے دانت بڑے بڑے ہوں اور اس کے کانوں سے پیپ بہتی ہو تو — ؟"

میں نے ایک جھرجھری سی لی۔

"لیکن — یہ ہے کون عورت اور یہ آدمی کون ہے؟"

"فرض کیجئے کہ —" وہ رک گیا — "فرض کیوں کیجئے — وہ میں ہی ہوں تب؟"

"تم؟" مجھ سے کچھ اور نہ کہا گیا۔ "تو کیا تمہاری بیوی ایسی ہے؟"

"ہاں!" اس کا سر جھک گیا۔

"جب تم نے اس سے شادی کی تھی تو تم نے یہ سب کچھ دیکھا نہیں تھا؟"

"کیوں نہیں دیکھا تھا؟" وہ جھٹ سے بولا۔ "لیکن میں اس وقت لونڈا سا تھا۔ اٹھارہ انیس برس تو ہوگی میری عمر اور پھر مجھے ہوش بھی نہیں تھا۔ میں تو اس بات سے خوش تھا کہ میری شادی ہونے والی ہے۔ شادی میرے لئے بڑی ہی ملفوف کر دینے والی چیز تھی۔ میرے دوستوں میں کسی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اپنے ہم عمروں میں سب سے پہلے دولہا بننے کی مجھے بڑی خوشی تھی۔ پھر شادی کا مطلب تھا اچھے اچھے کپڑے۔ بچپن سے مجھے بڑی تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ روکھی سوکھی روٹی اور پھٹے پرانے کپڑوں پر گزر ہوا تھا۔ بس اسی بات سے میرے ماموں نے — اس کی —" اس کے منہ پر شاید کوئی گالی آ گئی تھی لیکن اس نے بڑی خوبی سے اسے ہونٹوں سے باہر آنے سے روکا — "میرے ماموں نے بس اسی کا فائدہ اُٹھایا اور اپنی بدصورت بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ میرا ماموں بڑا امیر تھا۔ اس کی آٹے کی دو گرنیاں شہر میں چلتی تھیں پھر یہ رکشا بھی مجھے اسی نے جہیز میں دی تھی۔ میری ماں اپنے بھائی کی دولت پر ریجھ گئی تھی۔ اس نے آنکھ بند کرکے یہ شادی کی۔ اسے تو یہ امید تھی کہ وہ دو گرنیاں بھی مجھے مل جائیں گی۔ مگر میرے دو سالے بھی تو تھے۔ انھوں نے گرنیوں پر قبضہ کرلیا۔" وہ کھانسنے لگا۔

میں ہمہ تن گوش تھا۔

"شادی کے بعد میری آنکھ کھلی تو مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا کیا گیا ہے۔ زندگی بھر کے لئے دھوکا۔ تب سے میں اپنی بیوی سے بیزار ہوں۔ اس کی صورت دیکھتے ہی مجھے بخار چڑھ آتا ہے۔ بڑی سخت نفرت ہے مجھے اس سے۔ میں تو ایک پل بھی اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے ہمیشہ کے لئے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔" وہ چپ ہو گیا۔

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

"مگر اب تو — اب کیا ہو سکتا ہے؟ اب تو ایک بچّہ بھی ہو چکا ہے۔ سچ مانئے صاب! بس اسی بچّے کی وجہ سے ہی میری زندگی عذاب میں ہے۔ یہ بچّہ نہ ہوتا تو کبھی کے — قسم خدا کی۔ کبھی کے دوسری بیوی کر لاتا اور بھجوا دیتا اس چڑیل کو اس کے باوا کے گھر —" وہ پیشانی کھجانے لگا۔ "لیکن

[illegible] ... اور [illegible] تجھ [illegible]
[illegible]
[illegible] ... وہ [illegible] ہو گیا۔

میں [illegible] میں کا [illegible] تھا۔ کوئی باپ اتنا ظالم بھی ہو سکتا ہے؟ جبل اس کے بعد فوراً [illegible] تھا اور [illegible] اور اب یہ خبر!

میں [illegible] ہو گیا۔ دن بھر دفتر میں مجھے جبل کا [illegible] اور اس کی [illegible] کا خیال رہا کیا [illegible] ہے!

اس [illegible] جبل میرے [illegible] جذبات سے [illegible] ایک [illegible]

"مجھے بہت افسوس ہے جبل" میں نے ہمدردی سے کہا "لیکن خدا کی مرضی یہی تھی اور پھر — پھر تم تو ابھی [illegible] ہی تھے۔" نہ جانے آخری جملہ کیسے میرے منہ سے نکل پڑا تھا میں سخت پچھتا رہا تھا۔

لیکن جبل خاموش رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی صورت میں سلوٹیں ابھرنے [illegible] گئے اور چہرے کے نقوش میں کچھ سختی سی آ گئی۔ لیکن یہ سختی عارضی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ پھوٹ پڑا۔

"لیکن — صاحب! وہ میرا بچہ تھا — میرا اپنا بچہ — میرا خون میرے جگر کا ٹکڑا — خدا! یہ کیا کر دیا تو نے؟" اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔

ظفر حمیدی

غزل

ٹوٹے نہ طلسم آج مسیحا نفسی کا — پھر کوئی سوالی ہے تری چارہ گری کا

گلشن میں جہاں کوئی حسیں پھول کھلا ہے — دیکھا ہے وہیں عکس تری گل بدنی کا

نغموں کی گھلاوٹ میں فضا ڈوب گئی ہے — اللہ رے عالم تری شیریں سخنی کا

پھر تیشۂ فرہاد کو چمکاؤ رفیقو — پھر مرحلہ آیا ہے وہی کوہ کنی کا

پھر بزم میں کہرام مچا خیر ہو ساقی — افشا ہوا پھر راز مری تشنہ لبی کا

جانا ہے بہت دور ظفر تیز چلیں ہم
آیا ہے کہاں وقت ابھی نرم روی کا

ذہنِ ہندی کی ایجادی مسابقت

آج کی دنیا میں جاپان، روس، امریکہ اور یورپ کے تقریباً ہر ملک میں ایسی نت نئی چیزیں عالمِ ایجاد میں آ رہی ہیں جن کو کبھی چشمِ عقل نے دیکھا اور نہ گوشِ تصور نے سنا۔ موجودہ اختراعی دور میں جرمنی کا محیرالعقول دماغ کلیدی حیثیت کا مالک رہا ہے اور دنیا کے ایجاد دوست دماغ اس کے ذہنِ اختراعی کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرتے آئے ہیں۔ اب امریکہ اور روس کے ایجادی ذہن اور تخلیقی دماغ دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کر رہے ہیں۔ ان کی ایجادات کے آفتاب سے پوری دنیا جگمگا اٹھی ہے۔ لیکن ذہنِ ہندی کو موجودہ دور کے ایجادی ذہن سے زیادہ با صلاحیت اور مخترع کہا جا سکتا ہے۔ موجودہ ذہن وسعتِ علمی کی بنا پر شعور کی پختگی پر پہنچ چکا ہے لیکن جب قدیم کا عام دماغ شعور کی اتنی بلندی پر نہیں پہنچ سکا تھا اس وقت ذہنِ ہندی کی ایجادی صلاحیت کو اختراعی مسابقت سے تعبیر کرنا صحیح مبالغہ میں نہیں آ سکتا۔ ذہنِ ہندی کی ایجادی صلاحیت کسی خاص شعبۂ فن تک محدود نہیں بلکہ ہر رنگ میں اس کی اختراعی فطرت نمایاں نظر آتی ہے۔ اس نے دنیا کو علوم و فنون کی دولت سے اس طرح مالا مال کیا کہ عام ذہنیتیں پستی سے ابھر کر بلندی کی طرف [illegible] سارا [illegible] سلسلۂ علم و فن کا یہ بین ثبوت [illegible] تا ہے [illegible] لیکن اس نے ایسا [illegible] [illegible] ہر شعبہ [illegible] جا سکیں [illegible]

رعنائیاں اس کے حصے میں آگئیں۔ یہاں اگر [illegible] وحشت [illegible] تھی تو اس کی بدولت [illegible] روشن اور [illegible] پر نہ صرف اجرامِ فلکی کے رازوں کو بے نقاب کیا [illegible] اس کے اجرام کو مسخر کرنے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ مشرق و مغرب کے فصلِ مکانی پر اس نے ایسا قبضہ جمایا کہ بعد مکانی 'قصۂ پارینہ' کا مصداق بن گیا۔ فطرت نے کرۂ ارض کے [illegible] پر صرف سلسلہ ہائے کوہ کو ابھارا تھا لیکن علم کی طاقت نے [illegible] گردوں مینارہ، طلسم نشان اور فلک بوس [illegible] پر کھڑے کر دیے۔ غرض کہ علم ہی کی بدولت [illegible] راحت و رنگ [illegible] اور [illegible] رنگینیاں اور جلوہ فروشیاں پیدا ہوئیں کہ [illegible] بہار ہی نہیں بلکہ صد جلوۂ جاناں بن گیا [illegible] کہ فطرت کی فیض بخشی کی بنا پر علم کا آغاز اسی سرزمین [illegible] سے ہوا یعنی دنیا کی پہلی کتاب اسی ارضِ دانش پر تصنیف ہوئی۔ مولانا آزاد بلگرامی نے 'غزالانِ ہند' میں شیخ [illegible] کی کتاب
'[illegible] الاوائل و مآثر الاواخر' سے یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ
'اول من وضع فی الکتب والنجوم منہا [illegible] الہند'
یعنی سب سے پہلا جس سرزمین پر کتاب لکھی گئی اور جہاں سے علم و حکمت کا چشمہ نکلا وہ ہندوستان ہے۔
مشہور صوفی شاعر امیر خسرو نے مثنوی 'نہ سپہر' [illegible]

مستقل باب ہند کی علمی اولیت اور ایجادی سابقت کے متعلق ترتیب دیتے ہوئے اس حقیقت کو منکشف کیا ہے کہ

(۱) یہاں تمام دنیا کی نسبت علم نے زیادہ وسعت اختیار کی۔ اسی بنا پر ہر حصۂ عالم سے لوگ حصولِ علم کے لئے آتے رہے لیکن کوئی ہندوستانی اس سلسلہ میں کبھی بھی ہندوستان سے باہر نہیں گیا۔

(۲) علم حساب میں صفر ہندوستان کی ایجاد ہے۔

(۳) شطرنج کی ایجاد کا فخر بھی اہل ہند کو حاصل ہے۔

(۴) افسانوی ادب کی سب سے مشہور کتاب کلیلہ دمنہ جس کا تمام دنیا کی مہذب زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے ہندوستان کی تصنیف ہے۔

(۵) فنِ موسیقی کو جو ترقی ہند کی نغمہ بار فضا میں ہوئی اور جو راگ راگنیاں یہاں ایجاد ہوئیں وہ کسی اور جگہ نہیں۔

امیر خسرو کا یہ پہلا ترتیبی بیان واقعہ کی ایک حقیقت افروز تعبیر ہے۔ یقیناً اس خاکِ دل نشیں سے علم و حکمت کے وہ طویل و عریض چشمے جاری ہوئے جن سے سرزمین عالم سیراب ہوتی رہی۔ تمثیلی رنگ میں ڈوبا ہوا نغمۂ اقبال

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

صرف شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ حقائق نگاری ہے۔ دنیا کا کوئی صاحب فکر اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ

سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغ عالم تھی سرزمیں ہماری

مشہور انگریز مصنف مسٹر تھارنٹن نے اپنے رسالہ مظلوم کسان میں اس حقیقت کو بڑے دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے،

"یورپ کو تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی روشنی سے منور کرنے والے یونان و روما جب خود ہی وحشیانہ حالت میں تھے ہندوستان اس وقت علم و تہذیب کے بام عروج پر پہونچا ہوا تھا، یہاں ہر فن کے ایسے جید عالم موجود تھے جن کی مثال روئے زمین پر ملنی مشکل ہے۔"

موصوف نے اپنی دوسری تصنیف "ہند قدیم کی حالت" میں اسی حقیقت کو دوسرے انداز سے پیش کیا ہے،

"جس وقت دریائے نیل کے پہلے اہرام تعمیر بھی نہ ہوئے تھے اور موجودہ تہذیب کے گہوارے یونان و روما صرف وحشی درندوں کی بھیانک اور جگر شگاف آوازوں سے معمور تھے ہندوستان کی وسیع فضا اس سے بہت پہلے آفتاب علم کی ضیا پاشیوں سے جگمگا رہی تھی۔ ہندی صناع اور معمار و مہندس اپنی تحیر خیز صلاحیتوں سے ملک کا نام روشن کر رہے تھے۔"[1]

مشہور انگریز مؤرخ مسٹر پی ڈینوی کو بھی اقرار ہے کہ،

"اہلِ ہند بہت ہی قدیم زمانہ سے زیورِ علم سے آراستہ تھے اور اپنی ایجادی صلاحیتوں کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور تھے۔"

عرب کے مشہور متکلم اور فلاسفر ابن جاحظ نے سا کنانِ عالم کے ذہن و دماغ کی کیفیات کے سلسلہ میں ایک رسالہ مرتب کیا تھا جس میں موصوف نے دلائل عقلیہ کی روشنی میں ہند کی ایجادی اور تخلیقی قوتوں کو مرجح ثابت کیا ہے[2] الغرض کہ میگستھنیز سے لے کر فاہیان، ہیونگ سانگ اور دوسرے قدیم یونانی و رومی اور عرب مؤرخین اس حقیقت کے معترف ہیں کہ آفتاب علم کی ضیا پاشیوں سے سب سے پہلے ارض ہند روشن و منور ہوئی۔ قدیم ہندو سنیاسی اور بودھ اچاریہ تعلیم و تعلم کے خاص علمبردار رہے ہیں۔ ان کا ایک مشہور تعلیمی ادارہ تھا جو تاریخ کے اوراق نالندہ اور جامعہ تکشلا کی علمی مرکزیت کے آج بھی گواہ ہیں۔ یہی وہ دارالعلوم ہے جہاں چین و جاپان اور دوسرے مشرقی ممالک کے صدہا طالبانِ علم حصولِ علم کی خاطر لاکھوں مصیبتیں جھیل کر آئے اور دولتِ علم سے مالامال ہو کر واپس ہوئے[3] صرف نالندہ میں ڈیڑھ ہزار سے زائد اساتذۂ فن درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ اسی سے

---

[1] پرکاش صفحہ ۱۴۴ - ادارہ حالی کرشن کرچی

[2] قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۱۴۲

[3] یوسف رکیار ڈس آفندی ولیشرن صلنا جلد صفحہ ... آکسفورڈ پبلی ... ۱۹...

[illegible] کی قیمت کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نصابِ تعلیم، مذہبیات، ریاضی، ہیئت، طبعیات، کیمیا اور طب کے مضامین پر مشتمل تھا۔ رگ وید اور بعض اپنشدوں کے مطالعہ سے استاد اور شاگرد کے معیار کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ایک معیاری معلم اور متعلم کے لئے پابند ضابطہ، صدق مقال، خوش مزاج اور صاحبِ اخلاق تہذیب ہونا ضروری تھا اور صرف کتابی تعلیم پر قناعت متعلم کی کم عقلی کی دلیل تھی کیونکہ رشی منو کے قول کے مطابق انسانی علم کا ایک رُبع استاد ہے اور باقی تین ثلث خود اپنی ذات، اپنے ساتھیوں اور کتابِ زندگی سے حاصل کرتا ہے۔ امیر خسرو کے اسی بیان کا یہ حصہ بھی حقیقت پسندانہ ہے کہ کسی ہندوستانی نے حصولِ علم کی غرض سے باہر قدم نہیں نکالے بلکہ باہر کے تشنگانِ علم یہاں برابر آتے رہے۔

سطورِ ماقبل میں سرزمینِ ہند کی علمی مرکزیت واضح طور پر بیان کی جا چکی ہے اور چوں کہ علومِ ہندیہ جسدِ بے رُوح نہ تھے، ان میں روح تھی، صداقت و کشش تھی ایسی صورت میں دنیا کی طرف نظر اُٹھانا ہی بے سود تھا۔ گھر ہی جب جواہراتِ علمیہ سے معمور ہو تو دوسری طرف نظر افگنی کی کیا ضرورت۔ اسی بنا پر تاریخی اوراق کسی ایسے شخص کے نام سے خالی ہیں جو حصولِ علم کی غرض سے باہر گیا ہو۔ ہاں مشرق و مغرب کے صدہا طالبانِ علم و تحقیق نے اس وسعت آبادِ علم میں بصد ادب قدم رکھا اور فیوضِ علمیہ سے فیض یاب ہو کر واپس ہوئے۔ چنانچہ ہسٹری آف فلاسفی کے مصنف ڈاکٹر ان فیلڈ نے یونان کے قدیم نوشتہ جات کے حوالے سے یونان کے متعدد فلسفیوں کا ہندوستان آنا ثابت کیا ہے جن میں فیثا غورث جیسا بالغ نظر فلسفی بھی شامل ہے حتیٰ کہ مسئلۂ تناسخ کے یونان پہونچنے کا ذریعہ اسی حکیم فلسفی کو بتایا جاتا ہے بلکہ تلاش و جستجو کے نتیجہ میں ایسی روایات بھی مل جاتی ہیں جن سے یونان کے بہت سے علماء و فضلا کا علمِ الٰہیات کے مطالعہ کے لئے مشرق کا سفر کرنا ثابت ہوتا ہے جن میں ڈاکلس اور ڈیماکریٹس وغیرہ کو بھی شامل بتایا جاتا ہے[3] ظاہر ہے کہ اُس وقت کی علمی مرکزیت کی بنا پر مشرق سے مراد ہندوستان ہی ہو سکتا ہے۔

یونانی جبر و مقابلہ کے معلمِ اوّل 'ورادومینٹ' کی ہند میں آمد اور علومِ ہندیہ کی تحقیق کا حال بھی تاریخی اوراق سے معلوم ہوتا ہے[1]۔ قدیم یونانی تاریخوں میں ہند کے آنکھوں دیکھے حالات کا ذکر کثرت سے ملتا ہے جس سے قدیم یونانی مورخوں کی ہند میں آمد و قیام کی تصدیق ہوتی ہے۔ سیاحانِ چین میں فاہیان ہیونگ سانگ اور آئسنگ وغیرہ کی ہند میں آمد اور علومِ ہندیہ کے حصول کے شوق میں ہند کے گوشہ گوشہ کا چکر لگانا کوئی راز کی بات نہیں۔ تاریخ راجپوتانہ کے مطالعہ سے ایران کے قدیم بادشاہ 'بہرام گور' کا ہندی موسیقاروں کو ایران لے جانے کے لئے ایک وفد بھیجنا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن 'کتاب المعارف' کے مصنف 'ابن قتیبہ' کے نزدیک وہ خود ہی اپنے ابتدائی ادوارِ حکومت میں بھیس بدل کر ہندوستان چلا آیا تھا اور معمولی آدمی کی طرح زندگی گزار کر موسیقارانِ ہند سے اپنے ذوقِ نغمہ کی تکمیل کی تھی۔ ایران کے ساسانی نسل سلاطین کے عہد میں ایران کے مشہور منکر اور طبعیات کے مسلمہ استاد حکیم برزویہ کا ہند میں آنا سب ہی کو مسلم ہے۔ یہی وہ مصنف ہے جس نے خسرو نوشیرواں کی تفریحِ طبع کے لئے کلیلہ دمنہ کا ایرانی زبان میں سب سے پہلا ترجمہ کیا تھا[2]۔ معبدانِ مجوسں کا بھی ہند میں آمد و قیام کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ 'دبستانِ مذاہب' کے مصنف نے متعدد معبدانِ مجوسں کا تزکیۂ نفس کے سلسلہ

---

[1] سنسکرت لٹریچر صفحہ ۴۲۲ - از پروفیسر میکڈانلڈ و ہسٹری آف ہندو کیمسٹری صفحہ ۷۶

[2] البرامکہ جلد اوّل از مولانا عبدالرزاق کان پوری و عہدِ قدیم مشرق و مغرب

[3] - قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب و عرب و ہند کے تعلقات و البرامکہ جلد اوّل

میں ہند میں آمد کا ذکر کیا ہے جن میں آذرکیوان اسفندیاری، اور بہرام بن فرہاد گودرزی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ "نظریۂ وحدت الوجود" کے مخترع 'منصور حلاج' کی بھی ہند میں آمد بتائی جاتی ہے۔ صوفیوں کے اس نظریہ اور ہندو ویدانت کے عقیدہ 'ادویت واد' میں بہت کچھ نظری مماثلت پائی جاتی ہے اس لئے علامہ سید سلیمان صاحب کے نزدیک اس بات کا امکان ہے کہ وہ نعرہ زنِ "انا الحق" یہیں سے اپنا "نظریۂ وحدت الوجود" اور ہندی یوگیوں کے کچھ اسرار و غوامض عراق لے گیا ہو۔ طبِ ہندی کی تحقیق اور عقاقیر (جڑی بوٹیاں) کی تلاش و جستجو کے سلسلہ میں خلفائے عباسیہ کے متعدد درباری اطبا کی ہند میں آمد تاریخی اوراق میں صاف طور سے مذکور ہے۔ فلسفہ و ہیئت کے مسلمہ استاد البیرونی کا علومِ ہندیہ کی تحقیق کے شوق میں آنا اور برسوں قیام کرکے ہندی فلسفہ اور سنسکرت میں نام پیدا کرنا کوئی راز کی بات نہیں۔ دنیائے اسلام کے مشہور مفکر اور ہیئت دان محمد بن اسماعیل تنوخی نے ہیئت و نجوم کی مزید تعلیم کے لئے رختِ سفر باندھا اور یہاں رہ کر مختلف علوم و فنون کی تکمیل کی۔[1]

صفر کی ایجاد

علم حساب میں صفر کی ایجاد کا سہرا بھی امیر خسرو نے اہلِ ہند کے سر باندھا ہے جس کی تصدیق دیگر ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس کا زمانۂ ایجاد اور موجد کی شخصیت متعین و مشخص نہ ہو سکی۔ عرصہ ہوا کہ پنجاب کے کسی مقام پر بھوج پتر پر لکھی ہوئی ایک ایسی کتاب دستیاب ہوئی تھی جس میں ترقی یافتہ شکل کے اعداد استعمال کئے گئے تھے۔ اعدادِ قدیمہ کے ماہرین نے اس کا زمانہ تقریباً تیسری صدی عیسوی قرار دیا ہے، اگرچہ ڈاکٹر ہارنل نے اس قیاس تعیین کی تائید کی ہے لیکن مشہور ماہر اعداد مسٹر بیور کی رائے میں اس قیاس کو صحیح مان لینے پر ترقی یافتہ اعداد اور صفر کا زمانۂ ایجاد سن عیسوی کا آغاز ملتا ہے۔ لیکن محققین کی کثرتِ آراء کے مطابق صفر کی ایجاد اور ترتیب اعشاریہ اس کی مدد [illegible] چھٹی صدی عیسوی قرار پائی ہے۔

علم حساب میں صفر ہی ذہنِ ہندی کی ایجاد نہیں بلکہ ریاضی کے بہت سے دوسرے قاعدے بھی اس کی قوتِ اختراع کا نتیجہ ہیں۔ اگرچہ ہند کا ابتدائی رسم الاعداد بھی فنیشیوں، مصریوں، چینیوں، یہودیوں اور یونانیوں کے قدیم اعداد کی طرح پیچیدگیوں سے خالی نہ تھا لیکن ذہنِ ہندی کی اصلاحی صلاحیت نے اس کو سب سے پہلے سہل تر بنایا اور اعداد کی نوک پلک درست کی۔ چنانچہ البیرونی کی تحقیق کے بموجب اہلِ ہند نے دوسری قوموں کی طرح حروفِ ابجد سے کام نہیں لیا۔ اس نے جن قوموں کے عددی لغات کا مطالعہ کیا تھا ان میں کوئی قوم بھی ایک ہزار سے زائد شمار نہیں کر سکتی لیکن اہلِ ہند کے پاس اس کی تحقیق کے مطابق ایک ہزار سے زائد کے اعداد تھے جو اٹھارہ درجوں تک جاتے تھے اور یہ طریقہ پراردھ کے نام سے موسوم تھا۔ اس کی رائے میں اس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اہلِ ہند جہاں قاعدوں کی ایجاد میں دنیا سے بہت آگے رہ چکے ہیں اور انھوں نے دیگر اقوام کو جو متعدد باتیں سکھلائیں ان میں سب سے اونچا درجہ علم الاعداد اور رسم الاعداد کا ہے۔ ہندِ قدیم کی ریاضی کی کتابوں میں ریاضی کے ابتدائی قاعدوں سے لے کر مربع، مکعب، جذر المربع، جذر المکعب اور اسی کے ساتھ کسر، رقبہ، سود مرکب اور کسور کے دیگر قاعدے بھی تفصیلی طور پر ملتے ہیں۔ خصوصاً اعشاریہ، کسرِ اعشاریہ اور اعدادِ اعشاریہ جن کا اب ساری دنیا میں عام استعمال ہو رہا ہے ہندی ریاضی دانوں کی ایجاد ہیں۔ مؤرخ نے تیسری صدی عیسوی کے قریب یوگ سوتروں کی تشریح میں اعدادِ اعشاریہ کی بہت صاف مثالیں تحریر کی ہیں یعنی اس رسم الاعداد میں جو عدد داہنی سے بائیں

---

[1] مقالاتِ شبلی جلد سوم صفحہ ۱۰۱

[illegible] کی قیمت دس گنی ہو جاتی ہے اسی وجہ سے [illegible] کہلایا لیکن اس کا زمانۂ ایجاد بھی متعین [illegible] انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے ہندی علم الاعداد کے [illegible] نے کسور اعشاریہ کی چال کے ایجاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے طریقے سب سے پہلے صوبہ گجرات کے قدیم کتبوں سے معلوم ہوئے ہیں۔ اس لئے اس کی رائے میں یہیں کے منجمین یا ریاضی دانوں نے سب سے پہلے ان طریقوں کو ایجاد کیا ہوگا۔ چین میں اعشاریہ کا طریقہ ہندوستان ہی سے پہنچا اور عربوں کے ذریعہ یورپ تک رسائی حاصل کی۔ الجبرے میں آریہ بھٹ، برہم گپت اور بھاسکر نے نفی کی مقادیر کا اضافہ کیا۔ مثلث کے قاعدوں کی ایجاد اور اس کے رقبہ نکالنے کا قاعدہ بھی آریہ بھٹ کی ایجاد بتایا جاتا ہے۔ ہندی جبر و مقابلہ کے اصول پر کچھ لوگوں کو یونانی اثرات کا شبہ ہوتا ہے لیکن اس کی پشت پر کوئی مضبوط تاریخی شہادت موجود نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یونانی جبر و مقابلہ کا معلم اول 'ڈایوفینٹ' خود ہندوستان آکر اس کی مزید تحقیق نہ کرتا۔ صحیح یہ ہے کہ بارھویں صدی عیسوی تک ذہین ہندی نے الجبرے وغیرہ میں جو اصول ایجاد کئے تھے اہل مغرب ان سے پورے طور پر سترھویں صدی کی ابتداء میں واقف ہو سکے[1]

ہسٹری آف میتھیمیٹکس کے مصنف مسٹر کاجوری نے فن حساب اور علم الاعداد پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے ہندی جبر و مقابلہ کو یونانی اثرات سے پاک و صاف ہونا ثابت کیا ہے۔ مصنف مذکور کی رائے میں ہندی جبر و مقابلہ کا عمل خالص ہندوستانی ہے [illegible] ساحل گنگا پر بسنے والے برہمن ہمہ گیر تعریفوں کے مستحق ہیں [illegible] بھی مصنف مذکور کی اس رائے سے متفق ہیں کہ ہندی حساب اور جبر و مقابلہ پر یونانی اثرات کا کوئی گمان نہیں بلکہ اس کی رائے میں اہل ہند اس باب میں یونانیوں سے بہت آگے ہیں۔ عمر خیام نے بھی اپنی تصنیف 'جبر و مقابلہ' میں قدما کے یہاں اس فن میں کوئی باقاعدہ تصنیف نہ ملنے کا اعتراف کیا ہے۔ اس کی رائے کے مطابق ممکن ہے کہ ان کا ذہن غور و فکر کے باوجود اس سلسلے میں کامیاب نہ ہوا ہو۔ لیکن ہندی ریاضی دانوں کے یہاں اس کے قاعدوں کی موجودگی اس کو بھی تسلیم ہے۔

وَلِلہندِ طُرُقٌ "فی استخراجِ اضلاعِ المربعات والمکعبات مبنیۃ "علی استقراءٍ قلیل"

یعنی ہندیوں کے یہاں مربعات اور مکعبات کے اضلاع نکالنے کے طریقے ضرور ملتے ہیں جو اگرچہ تھوڑے سے استقراء پر مبنی ہیں۔ اقلیدس کے متعلق تو اس کی رائے یہ ہے کہ وہ جبر و مقابلہ کے اکثر اصول اور شکلیں سمجھ بھی نہ سکا۔

تاریخی اوراق کی چھان بین سے پتہ چلتا ہے کہ ذہین ہندی نے الجبرے میں ترتیب کے جو اصول مقرر کئے، منفی اعداد کا جو طریقہ اخذ کیا، ایک درجہ سے کئی درجوں تک جو مساواتی اصول ایجاد کئے اور مربع مساوات کی جو تکمیل کی اہل یونان اس سے قطعاً نابلد تھے۔ اسی طرح علم ہندسہ (جامیٹری) بھی یونانی اثرات سے قطعی پاک ہے۔ اس کا ذکر ہند کی قدیم ترین کتابوں کے سوتروں میں ملتا ہے اور قربان گاہوں اور کنڈلوں کے بنانے میں استعمال ہوتا تھا اس لئے یگیہ وغیرہ کرنے والے پروہت اس کے اصول زمانۂ قدیم سے جانتے تھے حتیٰ کہ مستطیل کا رقبہ مربع میں نکال سکتے تھے۔ قدیم ہندی ریاضی دان دو مربعوں کے مجموعہ یا فرق کے برابر دوسرا مربع بنانے، مربعوں کو دائروں کی صورت میں لانے، دائروں کا رقبہ نکالنے، نامساوی الربعۃ الاضلاع میں وتر قائم کرنے کے اصول سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے اس بات کی بھی تحقیق کی کہ مثلث قائم الزاویہ کے دو اضلاع کے مربعوں کا مجموعہ وتر کے مربع کے مساوی ہوتا ہے۔ برہم گپت کی طرف بھی متعدد حسابی قاعدوں کی ایجاد منسوب ہے۔ جیسا کہ [illegible]

۱؎ ہسٹری آف میتھیمیٹکس از مسٹر کاجوری

۲؎ [illegible]

ہ سلسلے بھی پہلے یہیں قائم ہو گئے تھے۔ مشہور ہندی ریاضی داں وراہ مہیر
نے قوس کا نقیہ معلوم کرنے کے لئے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ اس طرح
وش نے تقریباً پانچ سو سال قبل اعشاری کسرات کی ایجاد کر
۔ بھاسکرا چاریہ نے اس کا نجوم کے حل میں استعمال کیا تھا۔
الکرڈسل کے بیان کے مطابق بھاسکرا چاریہ کے اعدادی عملیات
رشیدس کے اصول سے زیادہ روشن ہیں۔ انھی ترقیاتی سلسلہ
کی بنیاد پر ساتویں صدی عیسوی کے قریب حساب ہندی کی شہرت
سرحدِ ہند سے باہر پہونچی۔ سب سے پہلے عربوں کے شوقِ تجسس
نے استفادہ کیا بلکہ علامہ سید سلیمان صاحب کے بقول لائق شاگرد
نے استاد کا نام روشن رکھنے کے لئے اس کا نام بھی حساب ہندی یا
ارقام ہندیہ رکھا۔ عربوں کی وساطت سے جب یہ فن مغرب میں پہونچا
تو اہلِ مغرب نے عربوں کو اس کا حقیقی موجد خیال کرتے ہوئے اس
کو عربک فگرز کا نام دیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے مقالہ نگار
کے نزدیک یورپ میں یہ فن مع صفر کے بارھویں صدی عیسوی کے
آغاز میں عربوں کی معرفت پہونچا اور ان اعداد سے بنا ہوا
علم "الگورتھم یا الگورزم" کہلایا۔ چونکہ حساب ہندی یا اعداد
ہندیہ کا سب سے بڑا شارح الخوارزمی ہے اس لئے اس کے
نام کی مناسبت سے اس فن کا یہ نام رکھا گیا۔

کلیلہ دمنہ

امیر خسرو نے ہند کی علمی اوّلیت کے بیان میں افسانوی ادب
کی سب سے قدیم اور مشہور ترین کتاب کلیلہ دمنہ کو ہند کے تصنیفی دماغ
کا اوّلین کارنامہ بتایا ہے۔ عرب کے مشہور فلسفی اور متکلم ابن جاحظ نے بھی
اس بیان کی تصدیق کی ہے۔ عراق کے قدیم ترین تمثیل نگار شاعر
ابان بن عبدالحمید کاتب نے اس تصنیفی اوّلیت کے بارے میں بڑے
دلچسپ انداز میں لکھا ہے:

هذا کتاب ادب وحکمه ... وهو الذی یدعی کلیله دمنه
فیه احتیالات وفیه رشد ... وهو کتاب وضعه الهند

یعنی یہ کتاب ذہن ہندی کی ایک اُپج ہے اور عربی میں اس کو
کلیلہ دمنہ کہتے ہیں۔ اس میں مکر و فریب کے افسانوی پردہ میں
رشد و ہدایت کی تعلیم موجود ہے اور اسی بنا پر یہ مجالس میں ہنسی
تفریح کا ذریعہ بھی ہے۔

مذاہب عالم کی کتب مقدسہ کے بعد ہندی دماغ کی یہ پہلی
اور آخری کتاب ہے جس کا ترجمہ تقریباً ۱۵۰۰ سال سے دنیا کی
تمام متمدن زبانوں میں ہوتا چلا آیا ہے۔ ممکن ہے دنیا کی کسی اور
زبان میں بھی افسانوی ادب کی کوئی خاص کتاب شائع ہوئی ہو
لیکن تاریخی اوراق میں اس نوع کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس کے
فارسی ترجمہ کی ابتدائی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تمثیلی قصہ
کی کتاب کو پنڈت بیدپا نے گجرات کے راجہ داب شلیم کے لئے
دس بابوں میں تصنیف کیا تھا اور مقصدِ تصنیف شخصی کیرکٹر کی
گمراہیوں کی "در مدیث دیگران" عنان گیری تھا اور بعض تاریخی
نقادوں کے خیال میں کشمیر کے وشنو نامی ایک برہمن نے تیسری
صدی عیسوی میں شہزادگان کی اخلاقی تربیت اور حکمرانی کی تعلیم
کے لئے یہ کتاب تصنیف کی تھی۔ البیرونی نے اپنی تحقیق کی بنا پر اس
کا اصل سنسکرتی نام پنچ تنتر لکھا ہے اور عہد اسلام
کے طلوع ہونے سے بہت پیشتر بتایا ہے۔ عربی حلقوں میں یہ کتاب
نوشیرواں کے درباری طبیب برزویہ کے فارسی ترجمہ کی وساطت
سے پہونچ کر اس درجہ مقبول خاص و عام ہوئی کہ اس کے دسوں
تراجم ہوئے اور متعدد مقدمے بھی لکھے گئے جن میں عبداللہ بن
المقفع کے مقدمہ کو اوّلین مقدمہ اور انشاء عالیہ کا ایک بہترین
نمونہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ نثری ترجموں کے علاوہ اس کے
متعدد نظمیہ ترجمے بھی شائع ہوئے اور مترجمین نے ہزاروں
لاکھوں دینار صلہ و انعام میں پائے۔ مختصر یہ کہ ہند کے قدیم
تصنیفی دماغ کی یہ وہ کتاب ہے جس کی شہرت بقول ایلفی پروفیسر

لہ عرب و ہند کے تعلقات۔ ڈاکٹر طارا چند۔ ہندوستانی مشرق و مغرب او
قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب

جدید قدیم عرب آج بھی ایران و عرب ریاستوں میں قائم ہے اور بابِکو بیلی ڈینیس کے پروفیسر سلطانوں کے بیان کے مطابق اس دل چسپ کتاب کی بہت سی کہانیاں آذربائیجان کی لوک کتھاؤں میں بھی شامل ہو گئی ہیں۔

شطرنج

ذہنی تفریح کے کھیلوں میں شطرنج کو بھی امیر خسرو نے ذہنِ ہندی کی ایجاد بتایا ہے۔ اگرچہ بعض مؤرخین کو اس کی ایجاد کا سہرا ہند کے سر باندھنے میں تامل ہے اسی بنا پر کینٹش نے اس کو ایک قدیم یونانی فلاسفر فلی ڈمیڈ کی ایجاد کہا ہے اور مسٹر ارنیٹ کی تحقیق کے بموجب لنکا کے راجہ راون کی رانی مندودری تھی جو خلوت میں اپنے شوہر سے کھیل کر اس کو معرکۂ رزم کی مشق کراتی تھی۔ ایرانی مؤرخین نے اس کو اصل 'ہشت رنگ' بتا کر اس کے مہروں کے نام پر بھی ایرانی چھاپ لگا دی۔ مگر تحقیق کی عدالت میں ان کا دعویٰ قابلِ سماعت نہ ٹھہرا۔ ہاں عربوں کے ساتھ غلط دعویٰ نہ کرنے کی بنا پر یہ رعایت ملحوظ رکھی گئی کہ اس کا نام نہ چترنگ رکھا گیا، نہ شترنج اور نہ ہشت رنگ، بلکہ عربی تلفظ میں ایک ایسا بین الاقوامی نام عطا کیا گیا ہے کہ خود اپنی جائے ایجاد میں اسی نام سے مشہور ہے۔

حقیقت میں شطرنج ہندوستان کی قدیم ترین ایجادوں میں سے ہے۔ راماین میں یہ 'چترنگ' نام سے مشہور ہے اور بعض قدیم تذکروں میں شترنج بھی اس کا نام ملتا ہے۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں گجرات کے لوتھال نامی مقام پر آثارِ قدیمہ کی تلاش کے دوران جو قدیم نادر اشیاء برآمد ہوئی ہیں ان میں شطرنج سے متعلق بھی متعدد چیزیں شامل ہیں جن سے ہندوستان میں شطرنج کے کھیل کا ثبوت ڈھائی ہزار قبل مسیح ملتا ہے۔ بعض قدیم تذکرہ نویسوں کے خیال میں ہندوستان کے مہا تما صلے ل کر اس کو ایجاد کیا تھا۔ مسٹر ڈبلو جونس نے اپنے مرتبہ رسالۂ شطرنج' میں اس کو ہندی الایجاد ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"قنوج کے ایک راجہ نے نوشیرواں کے پاس بیش بہا صنعت کے بہت سے تحائف بھیجے تھے جن میں شطرنج کا تختہ بھی شامل تھا جس کو نوشیرواں عادل کے وزیرِ با تدبیر بزرجمہر نے حل کر کے اس کے موجد کی عقل و دانش کو سراہا تھا اور اس کے جواب میں تحفۂ نرد (چوسر) ہندوستان بھجوایا تھا۔"

مگر عرب محقق یعقوبی کی تحقیق کے بموجب چوسر بھی ہندی کی ایجاد ہے۔ اس کے نزدیک ہند کے ایک پنڈت نے پہلے چوسر بنا کر ایک راجہ کی خدمت میں پیش کی اور شطرنج ایک دوسرے پنڈت نے بعد کو اسی راجہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ دسویں صدی عیسوی کے مشہور سیاح اور مؤرخ المسعودی جس نے ہندوستان کی ایک ایک چیز کا مشاہدہ کیا تھا، شطرنج اور چوسر دونوں کو ہندی ایجاد بتایا ہے۔ ابن خرداذبہ اور ابن جاحظ کا بیان بھی اسی مؤرخ کی تصدیق و تائید کرتا ہے۔ علامہ سید سلیمان صاحب کی تحقیق کے بموجب بھی یہ دونوں کھیل ہند کے اختراع پسند ذہن کی ایجاد ہیں اور موصوف کے خیال میں یہ کھیل ایران کی وساطت سے پہلی اور دوسری صدی ہجری میں عرب علاقوں میں پہنچے۔ چوسر پہلی صدی ہجری کی ابتدا ہی میں عرب پہونچ چکی تھی کیوں کہ اس کا ذکر احادیث میں لہو و لعب کے سلسلہ میں ملتا ہے۔

عرب محققین کی تشریح کے مطابق یہ دونوں کھیل صرف لہو و لعب کے دائرہ میں نہیں آتے بلکہ ان کی بنیاد حساب، ہیئت کے نازک مسائل کے علاوہ فلسفہ کے دو مختلف الخیال اسکول تشریحات پر قائم ہے۔ چوسر مسئلۂ جبر کی نشان دہی کرتی ہے یعنی اس بات کی مظہر ہے کہ انسان کے سیاہ و سپید کی باگ ڈور کسی دوسری طاقت کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے برعکس شطرنج کی بساط انسان کی ذاتی کوششوں کی مظہر ہے یعنی یہ حقیقت ظاہر کرتی ہے کہ سارے ارتقائی منازل انسان کی اپنی کوششوں کے ذریعہ طے ہوتے ہیں۔

شطرنج کے مہروں کی ساخت میں بھی ہند کے صناعوں نے وہ اختراعی جدتیں پیدا کی تھیں کہ شاہانِ عالم ان کو ایک یادگاری صنعت کے طور پر اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ ہارون رشید کے پاس ہندی ساخت کی شطرنج کا ایک سٹ موجود تھا جس کی صناعی ہندی صنعت کاری کا عجیب و غریب نمونہ تھی۔ تمام مہرے ہاتھی دانت کے بنے ہوئے تھے جن پر نامہروں کے علاوہ مختلف النوع نقش و نگار بھی موجود تھے۔ ان مہروں میں ہاتھی بڑا شاندار تھا جو اپنی سونڈ اس انداز سے اٹھائے تھا گویا وہ اسپانِ بساط پر حملہ کرنے ہی کو ہے، اس پر ایک فیل بان بھی ہندی نمونے کے زیورات یعنی کانوں میں مرکیاں گلے میں ہار اور پنڈلیوں میں کنگنی پہنے بیٹھا تھا۔ ہارون رشید نے یہ قیمتی سٹ شاہ فرانس کو ایک قیمتی اور نادر تحفہ کے طور پر شاہ کی فرستادہ سفارت کے ذریعہ بھیجا تھا۔[۱]

فنِ موسیقی

حضرت امیر خسرو کے بیان کے مطابق موسیقی کی قدامت اور انضباطی اوّلیت کا شرف بھی سرزمینِ ہند کو حاصل ہے۔ موصوف کے اس بیان کی تصدیق و تائید دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ مشہور عرب فلاسفر اور متکلم ابن جاحظ 'طبقات الامم' کے صفحہ ۱۴ پر ہندی موسیقی کے ارکانِ ثلاثہ کی بحث کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ

"اہلِ ہند کا فنِ رقص و نغمہ نہ صرف اشرمیں ڈوبا ہوا ہے بلکہ حقیقت میں وہ وہاں کے موجد و مخترع ہیں۔"

اسپین کے مشہور مؤرخ قاضی صاعد کا بیان بھی اسی سے ملتا جلتا ہے۔ مسز رولسن کی رائے میں اگر اہلِ ہند اپنے رقص و نغمہ کی قدامت و جامعیت پر فخر کرتے ہیں تو یہ فخر ان کو زیب بھی دیتا ہے کیونکہ ان کے ابتدائی رقص اور نشانات نغمہ سب سے قدیم ہیں۔[۱]
انگریز مؤرخین میں سر ولیم ہنٹا اور پروفیسر میکس اس کی قدامت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اہلِ ہند کا فنِ رقص و نغمہ سب سے قدیم ہے اور اس نے سب سے پہلے ایران میں قدم جمائے اور ایران کی بالواسطہ سرزمینِ عرب میں قدم رکھا اور عرب سے گیارھویں صدی عیسوی میں یورپ میں رسائی حاصل کی۔"

ایران میں قدم جمانے کا زمانہ بہرام گور جیسے قدیم بادشاہ کے عہد سے شروع ہوتا ہے جس نے ہزاروں ہندی اساتذۂ فن کو ایران آنے کی دعوت دی تھی[۲] اگرچہ ایران کے ذریعہ ہندی موسیقی کا عرب حلقوں میں پہونچنے کا زمانہ ساتویں صدی عیسوی متعین کیا گیا ہے لیکن تلاش و تحقیق کے نتیجہ میں معلوم ہوتا ہے کہ ہندی راگ راگنیاں انسانی نقل مکانی کے ذریعہ حضرت عیسٰی سے صدہا سال قبل سرزمینِ عرب پہونچ چکی تھیں۔ ابن جاحظ نے کتاب الحیوان میں عرب کے قدیم شاعر کا ایک رجز نقل کیا ہے جس میں اس نے مچھر کی آواز کو جاٹوں کے نغمہ سے تشبیہ دی تھی۔

اذا تغنین غناء الزط

آزاد بلگرامی نے 'غزالانِ ہند' میں ہندی حساب و موسیقی کی انضباطی اولیت کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ

"جمہور اتفاق دارند کہ ہندیاں در حساب و موسیقی پیش قدم اند و این ہردو فن را بجائے رسانیدہ کہ فوق آن متصور نیست و قواعد علم موسیقی را دانایان ولایت دیگر تا ازیں زمان از نغمہ سرایان ہند اخذ کردہ اند کہ اختصاص این ہردو فن تا حال بہ ہند مسلم است۔"

یعنی جمہور اس حقیقت پر متفق ہیں کہ اہلِ ہند حساب و موسیقی میں

---

[۱] الرائکہ از مولانا عبدالرزاق کانپوری

[۱] قرونِ وسطٰی میں ہندوستانی تہذیب
[۲] تاریخ ادبیاتِ ایران جلد اوّل صفحات ۹ و ۱۰ و ۳

دنیا میں علم موسیقی کو ترقی کی آخری منزل پر اہل ہند نے ہی پہنچایا اور موسیقی کے اصول و قواعد دنیا کے موسیقار ہندی نغمہ سراؤں سے برابر حاصل کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ یہ دونوں فن ہندیوں کے ساتھ مخصوص سمجھے گئے۔

اسی کتاب میں آزاد موصوف نے دوسرے موقع پر لکھا ہے کہ:

"در آمدم بریں کہ دانایان ہند در اختراع فن موسیقی بخود اند نہ از خرمن عرب خوشہ چیدہ و نہ از آب عجم قطرہ چشیدہ۔"

یعنی اہل ہند نے موسیقی کے متعلقات و مبادیات کسی دوسری قوم سے حاصل نہیں کئے بلکہ وہ خود اس کے موجد ہیں۔ انھوں نے نہ نغمہ سرایانِ ادب سے کچھ استفادہ کیا اور نہ عجمی فن کاروں سے کچھ حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی راگ راگنیاں اس غنا پرور اور نغمہ دوست ملک میں عالم ایجاد میں آئیں وہ کسی اور جگہ نہیں۔ چونکہ ہندو میتھالوجی کے نقطۂ نظر سے موسیقی کے موجد اوّل مہادیوجی ہیں اس لئے سرزمین ہند میں اس کو مذہبی تقدیس حاصل ہوئی اور ہند میں اس کی ترقی کا اصل راز بھی اسی میں مضمر ہے جس کی تائید رگ وید اور زمانہ مابعد کے ان بھجنوں اور گیتوں سے ہوتی ہے جو پری جمال اور حور وش دوشیزائیں مقدس دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے مندروں میں گایا کرتی تھیں چناں چہ اسی بنا پر متھرا، اجودھیا، کاشی اور سومنات جیسے مقدس مقامات ہندی موسیقی کے اصل مرکز رہے ہیں۔ سومنات کے بارے میں قزوینی کا بیان ہے کہ اس میں پانچ سو دوشیزائیں رقص و سرود کے لئے مقرر تھیں جن کا گزارہ وقف کے اسی ہزار دیہات کے مالیہ سے ہوتا تھا۔ ہند کی قدیم مذہبی کتابوں پر نظر ڈالنے سے بھی ہندی موسیقی کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ سام وید کا ایک حصہ گیتوں پر مشتمل ہے جو سام گان کے نام سے مشہور ہے۔ ویدک زمانہ میں قربانی کے موقع پر سام گان کا عام رواج تھا۔ ہند میں رقص و موسیقی کی ترقی کا ایک خاص سبب فن دوست حکمرانوں کا ذوقِ نغمہ بھی ہے۔

چنانچہ قدیم تہذیبی تاریخ کی ورق گردانی سے ان فرماں رواؤں کا بھی پتہ چلتا ہے جن کی فن دوستی نے نغمہ کو بام عروج پر پہنچایا۔ اس ہنر پروری کی مثال میں بیجانگر کے حکمرانوں کا نام خصوصیت سے لیا جا سکتا ہے جن کی قدردانیوں کے نتیجہ میں شہر بیجانگر کے موسیقاروں کی آمدنی اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ ان کی آمدنی کے ٹیکس محکمہ پولیس کی تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں[1]

ذوق عام کا ایک اور ثبوت دیہات کے ان ناموں سے بھی ملتا ہے جو بعض حکمرانوں نے شاستریہ سنگیت کے راگوں پر رکھے تھے۔ چناں چہ پنجاب کی ریاست جیند میں مال کونس، کلیان، شام کلیان، بھاگیشوری اور بھیرویں وغیرہ ناموں کے دیہات پائے جاتے ہیں۔ ایرانی راگ اگرچہ دل کش اور نشاط انگیز ہیں لیکن ہند کے قدیم فن کاروں نے موسیقی کے راگ اجرام کا دیہ سے مطابقت کرکے چوبیس گھنٹوں میں تقسیم کئے۔ جو نفوسِ انسانیہ میں جذب و انگیخت پیدا کرنے میں مثال نہیں رکھتے۔ تال سُر کا فن بھی ہندی موسیقاروں کی ایجاد ہے جو مغنی کو سرگم سے علاحدہ نہیں ہونے دیتا۔

موجودہ دور کے واضعین فن نے رقص و موسیقی کے جو جدید اصول وضع کئے ہیں ان کے بنیادی ماخذ ویدک عہد کے اصول و ارکان ہیں جو آج سے ہزاروں سال پہلے مرتب ہو چکے تھے چناں چہ رگ وید، اتھرو وید کا تھک سنگھتا اور تیتریہ سنگھتا کے اوراق سے بھی اس کی تصدیق و تائید ہوتی ہے۔

رقص کو بھی سرزمینِ ہند میں انضباطی اور تدوینی اوّلیت حاصل ہے۔ اس کی تفصیلات و جزئیات پر متعدد ایسی تصانیف کا پتہ چلتا ہے جو اس فن میں بنیادی حیثیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ہندو اوتاروں کے بعض پوز خود اس فن کی قدامت کی نشان دہی

---

[1] البرامکہ جلد اوّل از مولانا عبدالرزاق کان پوری

رقاصی میں [illegible] مدراس کے مہابت تاد میں شیوجی کا جو مجسمہ رکھا ہوا ہے اس میں وہ تانڈو رقص کی صورت میں نظر آتے ہیں تاریخی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ سو قبل مسیح نہ صرف رقص کو سرزمین ہند میں فنی حیثیت حاصل ہو چکی تھی بلکہ متعدد اقسام رقص بھی عالم ایجاد میں آ چکے تھے جن میں فن رقص کو خصوصی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور بقول مصنف البرامکہ، رقص کا یہ محاکاتی انداز دنیا کی کسی رقصیہ صورت میں موجود نہیں۔ کیونکہ اس انداز رقص کے موجد خود اہل ہند ہیں [1]

رقص و نغمہ کی ایجادوں کے علاوہ مزامیر کی ایجاد اختراع میں بھی ذہن ہندی دوسروں سے بہت آگے ہے چنانچہ قاضی صاعد اندلسی اور عراقی فلاسفر ابو جاحظ نے لکھا ہے کہ ذہن ہندی نے کنکلہ نام کا ایک تارہ ایجاد کیا تھا جو ستار اور بھانجھ کا کام دیتا تھا۔ اس کے علاوہ ایسے سازوں کی بھی ایجاد کا پتہ چلتا ہے جو صرف رقص کے موقع پر استعمال ہوتے تھے۔ مغربی محققین کے نزدیک تار کے سازوں کا استعمال رقص دوست قوموں میں ہوا کرتا ہے۔ اسی بنا پر ستار، مردنگ اور سارنگی وغیرہ قطعاً ہندی الایجاد ہیں [2]

---

[1] البرامکہ جلد اول از مولانا عبدالرزاق کانپوری

[2] شارٹ اکاؤنٹ آف ہندو سسٹم آف میوزک صفحہ ۵ د

قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب

عبرت صدیقی بریلوی

غزل

جسارت لب فسانہ کہے گی — کیا کہا جائے گا کیا کہے گی

دل پہ غم کا نکھار آ تو جائے — عالم نور دنیا کہے گی

میں تو بن جاؤں دیوانہ لیکن — تیرا دیوانہ دنیا کہے گی

نقش سجدہ کی عظمت کو دنیا — جب سمجھے گی کعبہ کہے گی

جرم اقرار توبہ تو کر لوں — رحمت میکدہ کیا کہے گی

جب کھلے گی زباں آنسوؤں کی — صرف تیرا فسانہ کہے گی

قافلہ آرزوؤں کا میری — کب لٹا گرد صحرا کہے گی

با اثر ہو تو جائے محبت — وہ نظر میرا قصہ کہے گی

جو نظر آج ٹھکرا رہی ہے
کل وہ عبرت کو اپنا کہے گی

شیر کا شکار

کیا آپ کے لئے اس زمانے میں بھی یہ ممکن ہے کہ کسی دولت مند راجا کی طرح ہندوستان کے جنگلوں میں ڈیرا ڈالیں اور ہاتھی پر سوار ہو کر کسی شیر کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنائیں۔ ہندوستان میں شکاریوں کی مدد کرنے والی ٹولی یا لوگ ہوتے ہیں جو ہر طرح سے شکاریوں کی مدد کرتے ہیں۔ انھیں جنگلاتی زمین کا علم ہوتا ہے اور شیروں کی عادات سے واقفیت ہوتی ہے۔ انھیں شکاریوں کی رہنمائی میں دس سال سے زیادہ کا تجربہ ہوتا ہے۔ ایجنٹ شکاری جماعت کی تنظیم کرتا ہے۔ وہ آپ کی بخوبی خبرگیری کرے گا اور آپ اپنی سلامتی کے لئے اس پر بھروسا کر سکتے ہیں۔

آپ کو اپنے ساتھ جن چیزوں کے لے جانے کی ضرورت ہے ان میں ایک ایسا دل بھی ہونا چاہیئے جو جوکھوں کو سر کرنے پر آمادہ ہو۔ آپ کے پاس سگرٹ، ہتھیار اور گولہ بارود ہونا چاہیئے۔

اتر پردیش میں جو پہاڑیاں ہمالیہ کے دامن میں ہیں ان میں شیر کے شکار کے لئے چند بہترین شکارگاہیں ہیں اور ہاتھی پر سوار ہو کر شکار کرنے کے لئے تو یہ شکارگاہیں بہت زیادہ موزوں ہیں۔ جوش اور ہیجان پیدا کرنے کے معاملے میں یہ تجربے اپنا جواب نہیں رکھتا۔ جب شکار کا بہترین زمانہ ہوتا تھا اور جب شیروں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی نیز جب جنگلی جانوروں کی حفاظت کے سلسلے میں کوئی قانون وضع نہیں ہوا تھا۔ ہاتھی پر چڑھ کر شکار بہت کم ہوتا تھا اور صرف مہاراجوں یا انھیں کی طرح دولت مند اور متمول اشخاص کو اس کی استطاعت ہوتی تھی۔ اس زمانے میں نہایت تیزی کے ساتھ جنگلی جانوروں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ اس لئے ان کے تحفظ کی غرض سے قوانین کا نفاذ سختی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے دلدادگانِ شکار کے لئے نشانہ بازی کے خاص بلاک مخصوص کر دئے گئے ہیں اور تمام ہندوستان میں شکار کرنے والی جماعتوں کے لئے باقاعدہ اور منظم سہولتیں مہیا کر دی گئی ہیں۔ آپ کے شکار کی مہم کا سلسلہ بالعموم پندرہ روز تک جاری رہے گا۔ حالانکہ آپ شیر کو اپنا خصوصی نشانہ بنانا چاہیں گے۔ آپ کو اپنے دسترخوان کے لئے چھوٹے چھوٹے جانوروں مثلاً تیتر، ہرن اور نیل گائے کا شکار کرنے کے مواقع حاصل ہوتے رہیں گے۔

اگر بالفرض محال آپ بھدّی چال سے چلنے والے ہاتھیوں کی پیٹھ پر بیٹھنا پسند نہ کریں تو شیر کو گرفت میں لانے اور اس کی طرف پیش قدمی کرنے کے اور بھی طریقے ہیں۔ شکاری ایجنٹ شکار کے لئے مخصوص علاقوں میں شیر کے ہانکے کا بندوبست کر دے گا یا پھر آپ مچان پر بیٹھ جائیں گے۔ اس مچان سے آپ شیر پر اس وقت گولی چلا سکتے ہیں جب وہ اس منتخب مقام پر

جہاں تک رائفل کا نشانہ پہنچ سکتا ہے اچانک ہانکا نے کے لئے
ہنکئے۔ شکار کے دوران آٹھ یا دس بھینس کے بچے رکھے جاتے
ہیں جنہیں مختلف مقامات پر باندھ دیا جاتا ہے۔ ہمالیہ کے دامن
کی پہاڑیوں میں ہانکنے کے لئے بالعموم ہاتھی کام میں لائے جاتے
ہیں۔ ان جنگلوں میں اونچی اونچی گھاس پیدا ہوتی ہے اور اس
میں بڑے بڑے جانور آکر چھپ جایا کرتے ہیں۔

شکاری کو شیر کے شکار سے ہی شادمانی حاصل ہوتی ہے
لیکن آپ کو ہمالیہ کے دامن کی پہاڑیوں میں نسبتاً زیادہ بلند
مقامات پر ریچھ بھی دستیاب ہو سکتا ہے۔

ملک کا خواہ کوئی بھی حصہ کیوں نہ ہو اس میں شکار کا
بہترین زمانہ اکتوبر کے وسط اور مئی کے خاتمے تک کا زمانہ
ہوتا ہے۔ حالانکہ اکتوبر، نومبر، اپریل اور مئی کا زمانہ کافی اچھا
ہوتا ہے لیکن دسمبر سے مارچ تک کا زمانہ بہترین زمانہ ہوتا ہے۔
اپریل اور مئی گرمی کے مہینے ہوتے ہیں۔ ہمالیہ کے دامن میں
جو پہاڑیاں واقع ہیں ان میں شکار کے اجازت نامے بالعموم ان
مہینوں کے نصف حصے میں دئے جاتے ہیں کیونکہ مہینے کا
پہلا حصہ جنگلی جانوروں کے لئے آرام اور فراغت کا زمانہ
قرار دیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں شکار
کے اجازت نامے مہینے کے کسی بھی حصے میں دئے جا سکتے ہیں۔

ہمالیہ کے دامن میں جو پہاڑیاں واقع ہیں۔ ان میں
وہ عورتیں اور بچے جو شکاری جماعتوں کے ہمراہ جاتے ہیں بڑے
آرام سے پڑاؤ کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ پڑاؤ ان پتھر کے بنے
ہوئے صحرائی ریسٹ ہاؤسوں (آرام گاہوں) میں ڈال دیا جاتا
ہے یا پھر ان چوڑے اور دوہرے خیموں میں رہائش کی جاتی ہے
جن میں دریاں بچھی ہوتی ہیں اور جن کے ساتھ ہی برآمدے بنے
ہوتے ہیں۔ جوش دیا ہوا اور چھانا ہوا نہایت اعلیٰ قسم کا پانی
پینے کے لئے مہیا کیا جاتا ہے۔ کھانا نفیس اور ذائقہ دار ہوتا ہے۔
شکاری پڑاؤ دس روز تک جاری رہتا ہے اور ایک جماعت میں
صرف دو آدمی ہوں تو بہت اچھا ہے۔

اگر آپ شیر کو اپنے ہتھیار سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو آپ
ایک رائفل اپنے ساتھ لے چلئے جو ۳۰۰ میگنم سے کم کی نہ ہو۔
اتر پردیش اور چند دوسرے علاقوں میں ہلکی مار کی رائفل سے
شیر کا شکار کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔ ہندوستان
میں شکار کے لئے غیر ملکی شکار کھیلنے والے تین عدد آتشیں
اسلحے لا سکتے ہیں جن پر کوئی محصول نہیں ادا کرنا پڑتا اس
شرط پر کہ وہ انہیں اپنے ساتھ واپس بھی لے جائیں گے، اور
اس کے ساتھ سو راؤنڈ گولہ بارود بھی لے جا سکتے ہیں۔ وہ کسٹم کا
محصول ادا کرنے پر ۲۰۰ مزید راؤنڈ گولہ بارود بھی لے جا سکتے
ہیں۔ اس اسلحہ اور گولہ بارود کے لئے جو وہ باہر سے ہندوستان
میں لانا چاہیں ملکیت کی اجازت حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔
اور اگر وہ چاہیں تو ان کے اجازت نامے کا پیشگی بندوبست دہلی
کا شکاری ایجنٹ کر سکتا ہے۔

ہندوستانی جنگلات کا حقیقی بادشاہ شیر ہوتا ہے۔ یہ
اپنے لئے ایک چھوٹی سی مملکت بنا لیتا ہے اور اس کی آمد و رفت
بالعموم اسی حدود میں رہتی ہے۔ شکاری اس کی چال ڈھال
کا مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ اس کا کھاجا ایک ایسے مقام پر باندھ
دیتا ہے جس طرف سے ہو کر شیر کے گزرنے کا علم ہوتا ہے۔

شیر پہلے اپنے شکار کی گردن توڑ دیتا ہے اور اس کے
بعد اس کے مردہ جسم کے پچھلے حصے کو کھانا شروع کرتا ہے۔ اس
کی قوتِ شامہ خاص طور پر تیز نہیں ہوتی لیکن سازگار حالات
میں اس کو انسان کی بو تقریباً ۵۰ میٹر کے فاصلے ہی سے آنے
لگتی ہے۔ شیر پہلے آنکھوں اور کانوں پر جھپٹا مارتا ہے، اپنے
شکار کی گردن پکڑ لیتا ہے اور اس کے مردہ جسم کو ایک ایسی
جگہ لے جاتا ہے جہاں وہ اسے کسی جھاڑی میں یا ایک ایسی
جگہ جہاں گھاس لگی ہوتی ہے، چھپا کر رکھ دیتا ہے۔ شیر کا خاصہ
یہ ہے کہ جب وہ اپنے شکار کو ہلاک کر چکتا ہے تو پانی پینے

کے لئے ہوتا ہے۔ پھر اس کا خون چوستا ہے اور مُردہ جسم کو ایک محفوظ مقام پر لے جاکر رکھ دیتا ہے۔ یہ مقام اس جگہ سے دُور ہوتا ہے جہاں اس نے اپنے شکار کو ہلاک کیا تھا۔ پھر وہ پلٹ آتا ہے۔ تھوڑا سا گوشت کھاتا ہے اور کسی ایسی جگہ جاکر جو زیادہ دُور نہیں ہوتی بیٹھ جاتا ہے اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے وہ اپنے کھاجے کی نگرانی کرتا ہے۔ نشان دہی کرنے والے اشخاص علی الصباح ہی یہ دیکھنے کے لئے جاتے ہیں کہ شیر نے اپنے شکار کو کس جگہ ہلاک کیا ہے اور قریب ہی ایک آرام دہ درخت پر بانسوں اور تازہ کاٹی ہوئی شاخوں سے ایک مچان بنا لیا جاتا ہے تاکہ اُسے قریب نظر دیا جاسکے۔

شکاری اُسی مچان پر بیٹھ جاتا ہے اور انتظار کرتا رہتا ہے کہ شیر دوبارہ اپنی خوراک کہاں جاکر رکھتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب نشانہ سر کیا جاتا ہے اور بندوق کے گھوڑے کو حرکت دی جاتی ہے۔

جس وقت شیرنی اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے اس وقت اس کے قریب جانا حد درجہ خطرناک ہوتا ہے اور ایسے درندوں کو تنہا ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔

زخم خوردہ شیر بہت جلد آدم خور بن جاتا ہے۔ حالانکہ کلکتہ کے جنوب میں سندربن کے جنگلات کے شیر زیادہ تر آدم خور ہوتے ہیں۔ اگر آپ میں کسی آدم خور شیر کو اپنا نشانہ بنانے کی ہمت ہو تو آپ استقلال سے کام لیں اور اس قسم کے شیروں کے رہنے کی جگہ کے متعلق ضروری تفصیلات علاقائی حکومت سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

ایک شیر کی اوسط لمبائی ۳ میٹر سے کچھ کم ہوتی ہے اور شیرنیوں کی لمبائی اس سے کسی قدر کم ہوتی ہے۔ ان کا وزن عام طور پر ڈیڑھ اور دو سو کلوگراموں کے درمیان ہوتا ہے لیکن مویشیوں کو اُٹھا لے جانے والے شیروں اور شیرنیوں کا وزن اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

اگر آپ کسی شیر کو کسی خاص جگہ پر محصور کرنا چاہتے ہوں تو نشانہ اس کی گردن پر لگائیے۔ اگر اس کے پیٹ میں گولی چلی جائے تو وہ بھاگ کر سو میٹر تک جاسکتا ہے۔

اور آخری بات یہ ہے کہ ایک زخم خوردہ شیر کا تعاقب کرنے کے لئے آپ کو بہت زیادہ احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ شیر یا تو اپنی جگہ سے اُٹھ کر کہیں اور چل دیتا ہے یا کسی گھنی جگہ میں جاکر لیٹ جاتا ہے۔ اور جب آپ کو خطرے کا شبہ ہو اس وقت آپ پر جھپٹ پڑتا ہے۔

نئی کتابیں

نغمۂ سرمد

پنڈت بال مکند صاحب عرش ملسیانی کی تازہ ترین تصنیف رباعیاتِ سرمد کا ترجمہ نغمۂ سرمد ہے۔ سرمد کی رباعیاں ہندوستان کے فارسی ادب میں خاص مقام رکھتی ہیں۔ سرمد صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ صوفی اور جاں باز صوفی تھے۔ عرش صاحب نے سرمد کی رباعیوں کا ترجمہ اردو نظم میں رباعیوں کی صورت میں کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ ایک تو عرش صاحب خود ہی نغز گو شاعر اور اچھے فارسی دان ہیں، پھر ان کے والد بزرگوار جناب جوش ملسیانی کی نظرِ ثانی سونے پر سہاگہ کا مضمون ہے۔

سرمد کی رباعیوں کا ترجمہ اس اعتبار سے بھی بر وقت ہے کہ ان میں قومی یک جہتی کا بھی پیغام ہے۔ وہ یک جہتی نہیں جو محض مصلحتوں کی بنیاد پر ہوتی ہے بلکہ وہ یک جہتی جو دل کی وسعت اور نظر کی بلندی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے عرش صاحب نے سرمد کے سوانح اور شاعری کے عنوان سے اس کتاب کی تمہید کے طور پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی نہ صرف پُر از معلومات بلکہ نہایت مفید ہے جس سے سرمد کے کلام کا پس منظر معلوم ہوتا ہے اور تقاضائے حال کے مطابق اس کی اہمیت۔

کتاب کے آخر میں ایک غلط نامہ بھی دیا گیا ہے اس کے ماسوا بھی چند غلطیاں رہ گئی ہیں۔

کتابت طباعت اچھی، کاغذ سفید دبیز۔ قیمت پانچ روپے

ملنے کا پتہ:۔ مرکزِ تصنیف و تالیف نکودر (پنجاب)

بچوں کی دنیا

یہ پروفیسر تلوک چند صاحب محروم کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ نہ محروم صاحب محتاجِ تعارف ہیں نہ ان کا کلام۔ گذشتہ ساٹھ سال سے ان کا کلام شایع ہوتا رہا ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق استادِ فن ہی نہیں بلکہ اعلیٰ پایہ کے مصلح بھی ہیں۔ ان کے کلام میں رکاکت اور ابتذال نام کو بھی نہیں۔ بیشتر نظمیں اپنے اندر پیغام رکھتی ہیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ معلمی میں گزارنے کی وجہ سے انھیں بچوں کے نفسیات کا پورا علم ہے۔ بہارِ طفلی بھی اُن کی ایسی نظموں کا مجموعہ تھا جو بچوں کے متعلق تھیں۔ یہ کتاب بھی اسی موضوع پر ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے محروم صاحب کا ذکر ایک نامور شاعر اور ایک اچھے انسان کی حیثیت سے کیا ہے اور پروفیسر آل احمد سرور بھی حضرت محروم کے شاندار ادبی کارنامے کے قائل ہیں۔

یہ مجموعہ ۱۳۰ نظموں پر مشتمل ہے۔ زبان سہل اور رواں۔ مضمون دل کش، بندشیں چست اور محاورے برجستہ ہیں۔ چونکہ اب فارسی کا علم بچوں میں کم ہوتا ہے۔ اس لیے محروم صاحب نے کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ درج کر دیا ہے۔ حجم سوا سو صفحے کاغذ سفید دبیز قیمت چار روپے۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی۔

گل و سنگ

یہ جناب جعفر یوسفی کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ اس کے آخر میں

چند نظمیں بھی ہیں۔ جناب خضر تمیمی شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ اس سے پہلے "باتیں دلّی کی" نام کی ان کی ایک نثری تصنیف شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بیشتر غزلیں مسدّس ہیں۔ کتاب کا انتساب شریمتی اندرا گاندھی کے نام ہے اور ملک کے مشہور اخبار نویسوں اور شاعروں نے اس پر دیباچہ تقریظ، پیش لفظ وغیرہ لکھا ہے۔ جناب ماہر القادری ایڈیٹر "فاران" ان کے کلام کو نوخیز اور نو مشق شاعروں کی رہنمائی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی کی رائے ہے کہ "ان کے کلام میں سادگی، واقعات اور ان کی اپنی کیفیات کا عالم پایا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں یک سوئی، ہم آہنگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ اسلوب و انداز بیان کا حسن ہے" اسے کیا چاہیئے۔

کتابت طباعت اچھی ہے۔ کاغذ سفید چکنا اور ٹائٹل بہت خوب صورت ہے۔ ملنے کا پتہ: سنگم کتاب گھر اردو بازار دہلی۔ قیمت ڈھائی روپے۔

(گ۔ن۔ا)

نیرنگِ معانی

ترلوک چند محروم کی نظموں کا چوتھا مجموعہ۔ ناشر مکتبۂ جامعہ جامعہ نگر، نئی دہلی۔ قیمت پانچ روپے۔ ضخامت ۱۹۶ صفحے۔ تقطیع $\frac{۲۲ \times ۳۶}{۱۶}$۔ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش معیاری۔ محروم صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا۔ محروم صاحب نے ہر صنفِ سخن میں دادِ سخن دی ہے۔ ان کے کلام پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے ملک کی قومی، مذہبی اور ادبی خدمت کی ہے اور اس خدمت کی مدت بڑی طویل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ملک ان کی کوشش کلام کی پوری قدر کرے گا۔

ذکرِ غالب

[illegible] پانچواں ایڈیشن۔ صفحات ۲۷۶۔ تقطیع $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$ ناشر مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ قیمت چار روپے [illegible]

غالبیات کے سلسلے میں مالک رام صاحب کی یہ مقبول معروف تصنیف اہلِ ادب سے بہت داد حاصل کر چکی ہے۔ اگرچہ مختصر مگر جامع کتاب میں موصوف نے غالبیات کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا۔ اس ایڈیشن میں انھوں نے بہت سے اضافے کیے ہیں۔ چناں چہ انڈیا آفس لائبریری لندن اور نیشنل آرکائیوز نئی دہلی سے بھی جو معلومات غالب کے باب میں مل سکتی تھیں اس ایڈیشن میں ان کو بھی شامل کر لیا ہے۔ غالب کے بارے میں یہ کتاب درجہ استناد رکھتی ہے۔ سوانح حیات، تصنیفات اور عادات و اخلاق پر پوری تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ اور کوئی تفصیل حوالہ اور سند کے بغیر نہیں۔

کبیر اور انسانیت ۔ از پنڈت سندر لال
امیر خسرو اور ہندوستان ۔ از ڈاکٹر تارا چند
لائف آف امیر خسرو (انگریزی)
از پروفیسر ایم حبیب۔

یہ تینوں کتابچے امیر خسرو اکیڈمی نئی دہلی کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ پہلی دو کتابوں پر قیمت درج نہیں۔ تیسری کتاب انگریزی میں ہے اور اس کی قیمت ۷۵ پیسے ہے۔

پنڈت سندر لال نے کبیر کے دوہوں سے مثالیں دے کر کبیر کی اخوت پسندی پر روشنی ڈالی ہے۔ صوفیوں اور سنتوں کے دیگر اقوال بھی کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتابچہ اس دور میں بڑا ہی مفید کام کرے گا جب کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہندوستان میں رہنے والے آپس میں مل جل کر رہیں۔

ڈاکٹر تارا چند کا مقالہ "امیر خسرو اور ہندوستان" ان کے علمی تجربہ پر دال ہے۔ خسرو ہندوستان کی خاک میں پیدا ہوئے اور اسی مٹی میں دفن ہوئے۔ وہ ہندوستان اور ہندوستان کے علوم کے عاشقِ صادق تھے۔ ان پر کبھی کبھی یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ مذہبی تعصب کے مریض تھے لیکن مقالہ نگار نے ان کی صفائی میں بہت کچھ پیش کیا ہے اور ہندوستان سے ان کی ہمہ گیر محبت ان کے کلام سے ظاہر کی ہے۔

مقالہ انگریزی میں امیر خسرو کے سوانح ہیں۔ اس میں امیر خسرو جیسے شاعر و ہمہ دان کی زندگی کے حالات اس مقالے میں مستند طریقے سے آگئے ہیں۔ اس کی ضمانت مقالہ نگار کا نام نامی ہے جو ہندوستان کے مشہور ترین ماہرینِ تاریخ میں سے ہیں۔

لمعاتِ اُفق

ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی کا مختصر تذکرۂ زندگی اور مجموعۂ کلام۔ اسے افق کے قابل فرزند منشی بشیشر پرشاد منوّر لکھنوی نے مرتب کیا ہے۔ ناشر آدرش کتاب گھر، فیض گنج، دریا گنج دہلی۔ قیمت دس روپے۔ ضخامت تقریباً ۶۰۰ صفحات۔ تقطیع $\frac{۲۲ \times ۳۶}{۱۶}$۔

افق بڑے قادر الکلام شاعر، نثر نگار اور مترجم تھے۔ ان کے یومِ ولادت کے سو سال بعد اور انتقال کے تقریباً پچاس برس بعد اس ضخیم کتاب کا شائع ہونا مستحسنات میں سے ہے۔ افق سینٹنری کمیٹی دہلی اور خاص طور پر اس کمیٹی کے چیئرمین حضرت امن لکھنوی قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اُفق کے یومِ ولادت کا صد سالہ جشن نومبر ۱۹۶۴ء میں دہلی میں منایا اور یہ ضخیم کتاب شائع کی۔ افق کے ادبی کارنامے اس قابل نہیں کہ ہم انھیں فراموش کردیں ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب ہندوستان کی ہر لائبریری کی زینت بنے گی۔

[illegible] غازی پوری

[illegible] غازی پوری کا مجموعۂ کلام قیمت تین روپے۔ کتابت طباعت [illegible] ناشر مکتبۂ صبا [illegible] [illegible] دہلی [illegible]

[illegible]

ذوق

● سوانح اور انتقاد۔ مصنف ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ ناشر مجلسِ ترقیٔ ادب۔ ۲ کلب روڈ لاہور۔ کتاب ٹائپ میں خوبصورت چھپی ہے۔ ضخامت ۵۰۶ صفحے۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت آٹھ روپے۔ مقدمہ سید عابد علی عابد نے لکھا ہے۔ ذوق کے سوانح پورے طور پر نہیں ملتے تھے۔ مصنف نے بڑی محنت اور جستجو سے ذوق کی زندگی اور حالات پر معلومات حاصل کی ہیں۔ سوانح سے پہلے اس زمانے کا سیاسی اور سماجی پس منظر بھی پیش کیا ہے۔ ذوق کی زندگی اور کردار، ذوق کا عہد، ذوق کی غزل گوئی، ذوق کی قصیدہ نگاری، خدماتِ زبان و ادب، تلامذۂ ذوق، ذوق کا کچھ نایاب کلام، اس کتاب کے ابواب ہیں۔ کتاب میں کچھ نایاب تصویریں بھی ہیں جن میں ظفر کے تخلص سے کہی گئی ایک غزل کی بڑی دلچسپ تصویر ہے۔ مصنف نے یہ بات قریب قریب صاف کردی ہے کہ ذوق معروف اور ظفر کے لئے کہتے تھے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب جس نے تحقیق کا ایک خاص گوشہ بے نقاب کیا ہے مقبول ہوگی۔

اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو (بعد نظر ثانی و اضافہ)

مصنف ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ ناشر آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی ۶۔ قیمت ایک روپیہ نوے پیسے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔ نئے ایڈیشن میں صوتیاتی تجزیے پر تیس صفحے بڑھا دئے گئے ہیں اور اردو کی بنیادی اور ذیلی آوازوں کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے [illegible]، [illegible] اختلافات کی تفصیل بھی دے دی گئی ہے لسانیات [illegible] کے لئے یہ کتاب بڑی [illegible]

[illegible]

[illegible] کا ضمیر ادبی تھا۔ چنانچہ ان کی غزلوں، نظموں اور دوسرے افکار میں جہدِ تمنا کی ایک روشنی پائی جاتی ہے۔ شفیق بڑے خوش مقال اور مخلص شاعر ہیں۔

سرودِ چراغاں

جویاؔ نولوی کا مجموعۂ کلام۔ ناشر انجمن جویائے سخن بدایوں قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

منشی رام بہادر لال جویاؔ بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ بہت اچھا ہوا کہ ان کا یہ مجموعۂ کلام شائع ہو گیا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے؛

پردہ دارِ نقشِ پائے یار ہوں میں غبار کوچۂ اغیار ہوں
تصویرِ دل کو آئینۂ دل اٹھا کے دیکھ
پروانے کے غبار کو شمیں جلا کے دیکھ
جواب نامۂ اعمال کیا دوں پسینے پر پسینہ آ رہا ہے

گیتا

ترجمہ ہندوستانی نظم میں۔ از ستیہ پرکاش جناب پسروری۔ پبلشر نرنجن پرکاش شنکر بھون، دہلی، شاہدرہ۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

یہ ترجمہ نہایت آسان زبان میں ہے۔ یہاں تک کہ کسی شعر میں فارسی عطف و اضافت بھی نہیں۔ دو دو اشلوک کا ترجمہ مسدس کے ایک بند میں ہے۔ مصنف کی یہ کاوش قابلِ داد ہے اور گیتا کے جو اب تک منظوم ترجمے شائع ہوئے ہیں ان میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

مشعلِ سنگ

کوثر چاند پوری اردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے ڈیڑھ درجن افسانوں کا یہ مجموعہ ہمدرد اکیڈمی نیو ٹاؤن کراچی ۵ سے شائع [illegible] ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے اور [illegible]
[illegible] کے مرحوم [illegible] کا
[illegible]

تجربات مترشح ہیں۔ انھوں نے اپنے [illegible] افسانوں کے ذریعے سماج کے کئی گھناؤنے چہروں کو بے نقاب کیا ہے۔ (ع ۔ ح)

موصولات

گلہائے پریشاں ۔ فراق گورکھپوری صفحات ۱۲۸۔ قیمت ایک روپیہ

غالب اور اس کی شاعری ۔ مرتب نریش کمار شادؔ " "

میر کا کلام منتخب ۔ نریش کمار شادؔ " "

یہ تینوں کتابیں پاکٹ بک سیریز میں اسٹار پبلیکیشنز ۲/۱۵۔ دریا گنج دہلی نے شائع کی ہیں۔ اردو میں پاکٹ بک سیریز میں کتابیں شائع کرنے کا بڑا مفید سلسلہ شروع ہوا ہے۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ پنجابی پستک بھنڈار دریبہ کلاں دہلی سے طلب کی جا سکتی ہیں۔

عرفانِ حافظ ۔ مؤلف:۔ پنڈت ششیا چرن داس۔ ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ جامع مسجد۔ دہلی۔ قیمت ایک روپیہ۔ صفحات ۸۰۔ مجلد مع جلد پوش۔ حافظ کے چیدہ چیدہ اشعار کی تشریح اچھے انداز سے کی گئی ہے۔

گیان گنگا مرتب بال کشن بترہ صاحب وکیل کان پور۔ پند و نصائح اور اقوال یکجا کئے گئے ہیں۔

جمالِ صابر کلیری وحید احمد مسعود صاحب نے حضرت مخدوم علاؤ الدین علی احمد صابر کلیری کی سوانح عمری مرتب کی ہے۔ ناشر نظامی پریس بدایوں۔ صفحات ۴۷۔ قیمت ایک روپیہ

دردِ مشترک ۔ بیتاب علی پوری۔ فکار انگری اور آزاد سوہنی کی غزلوں کا مجموعہ۔ صفحات ۸۴۔ قیمت ایک روپیہ۔ ناشر ماہنامہ اشوک۔ رام بازار۔ سونی پت۔

شادؔ شاد عارفی مرحوم کی چند منتخب غزلیں ایک کتابچے کی صورت میں شائع کی گئی ہیں صفحات ۳۲۔ قیمت پچاس پیسے۔ (ناشر "نیا خواب" رام پور (یو۔ پی)

(ش ۔ ح)



فلم فیسٹیول ۱۹۶۵ء



امریکی فلم 'امریکہ امریکہ'
کا ایک سین



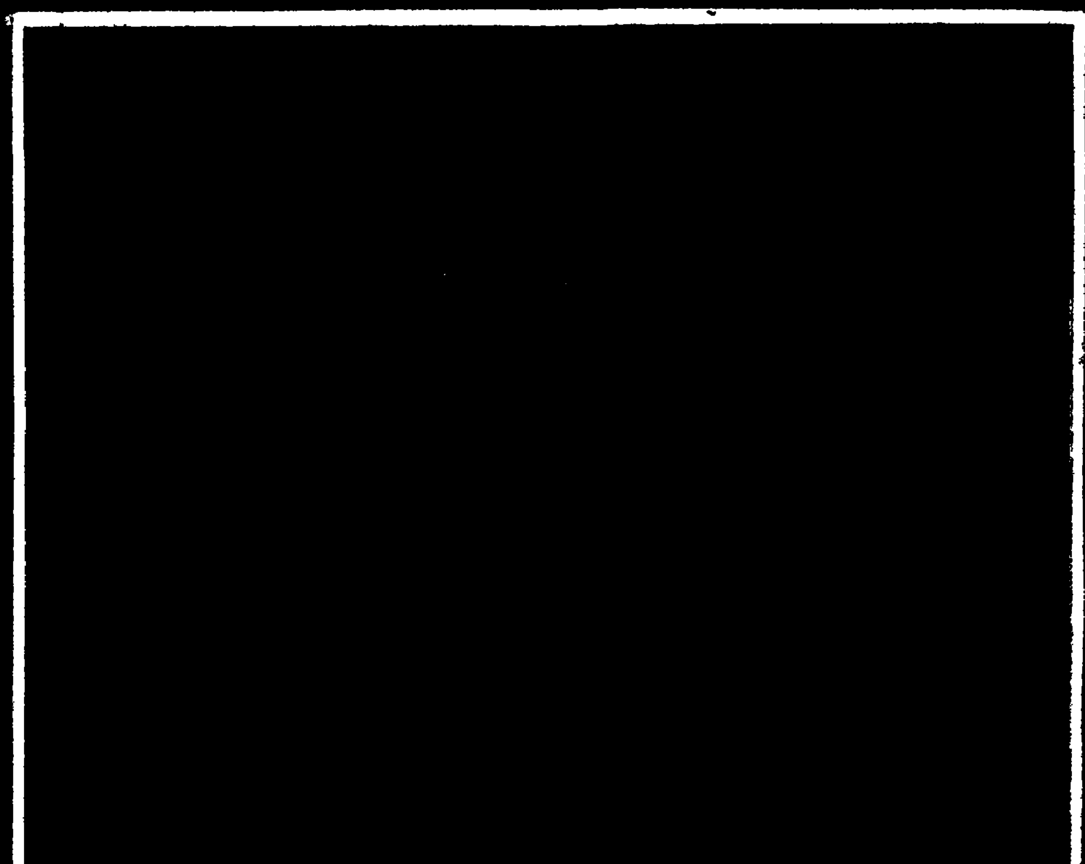
روسی فلم 'ٹیل آف دی ڈان'
کا ایک سین

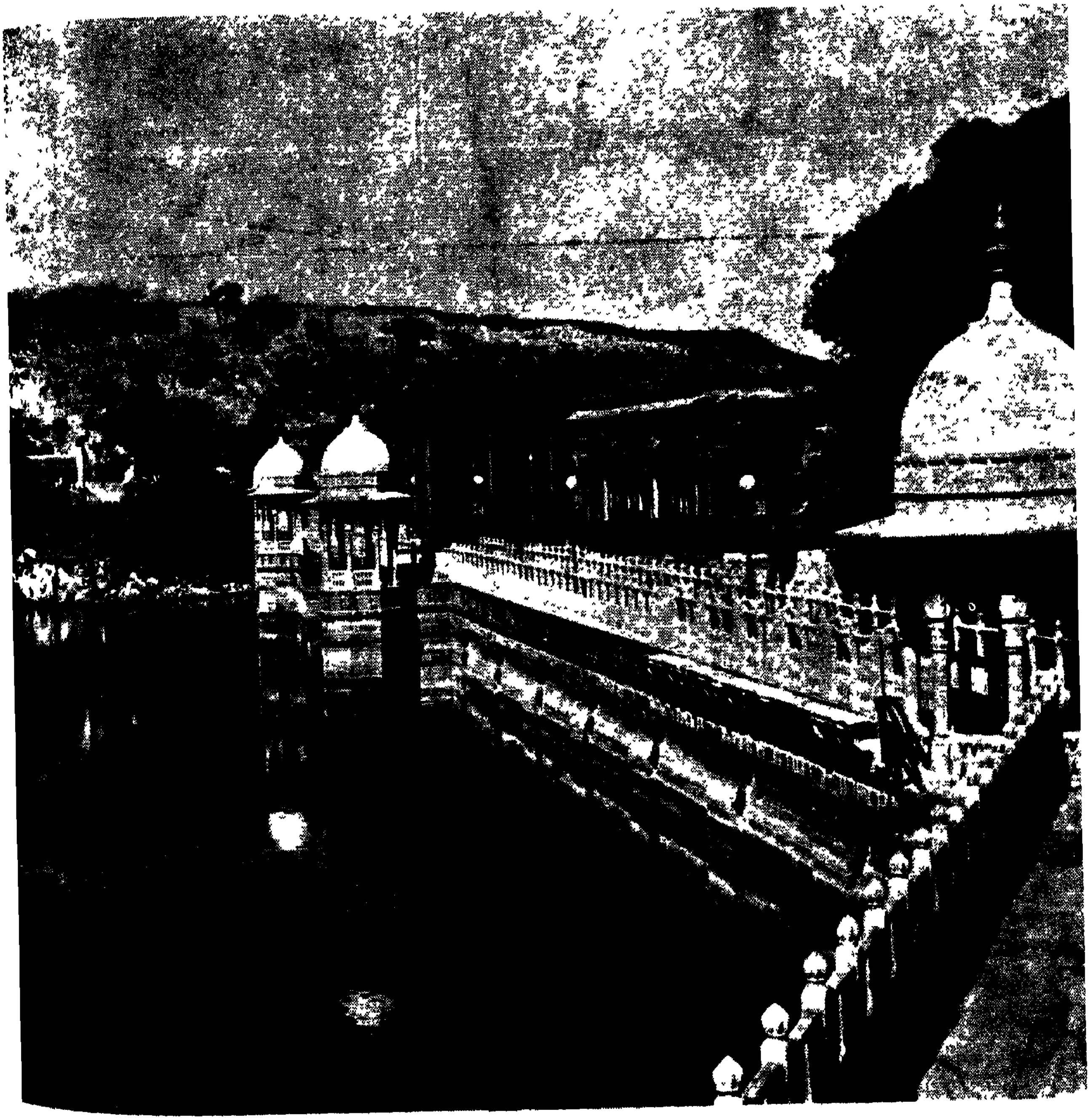


فرانس کی فلم کا ایک سین



مغربی جرمنی کی فلم
کا ایک سین





جودھپور کا بال سمند تالاب

اردو کا مقبول عوام معتبر ماہنامہ

آج کل دہلی

ایڈیٹر:۔ عرش ملسیانی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:۔ شہباز حسین

سالانہ چندہ:۔ { ہندوستان میں:۔ سات روپے
پاکستان میں:۔ سات روپے (پاکستانی)
غیر ممالک سے:۔ ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر }

قیمت فی پرچہ:۔ { ہندوستان میں:۔ ۶۰ پیسے
پاکستان میں:۔ ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے:۔ ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ }

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن [illegible]

ترتیب

سرورق:۔ پتلیوں کا تماشہ
رسالے کی پشت پر:۔ چتوڑگڑھ کے جین مندر کی بت تراشی

جلد ۲۳ - نمبر ۹

رجسٹرڈ نمبر ۱۵۵۷
اپریل ۱۹۶۵ء

ہندوستان میں چندہ بھیجنے کا پتہ
[illegible] آج کل اردو اور اسسٹنٹ سکرٹریٹ دہلی

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

ملاحظات

۱۹۹۰ء [illegible] تعاون و اشتراک کے سال کی حیثیت سے منایا جا رہا ہے۔ اس خیال کے محرک مرحوم پنڈت جواہر لال نہرو تھے جن کی ساری [illegible] کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنے اور [illegible] کرنے میں گزری ہے۔ دنیا کے سامنے اس وقت [illegible] ہیں جو اس قدر باہم [illegible] ہتھیاروں کے ذریعے دنیا کی تباہی و بربادی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دنیا کی قومیں مل کر مسائل کی [illegible] جھگڑوں اور اختلافات کو بات چیت سے حل کریں۔ [illegible] اس بات کا داعی رہا ہے اور دنیا کی [illegible] قومیں اس کی ہم نوا ہوتی جا رہی ہیں۔

عالمی تعاون و اشتراک کی بہت سی صورتوں میں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ دنیا کے عوام کی صحت بہتر ہو۔ اس سلسلے میں عالمی ادارۂ صحت نے [illegible] کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ ملیریا، چیچک، ہیضہ اور طاعون جیسی [illegible] بیماریوں کو ختم کر دینے کے لئے ساری دنیا میں وسیع پیمانے پر [illegible] ہیں۔ ۷ اپریل کا دن عالمی یوم صحت کی حیثیت سے منایا جاتا ہے۔ [illegible] دنیا میں پھیلی ہوئی بیماریوں کے خلاف ایک [illegible] ہندوستان [illegible] [illegible] [illegible] امید ہے کہ [illegible]

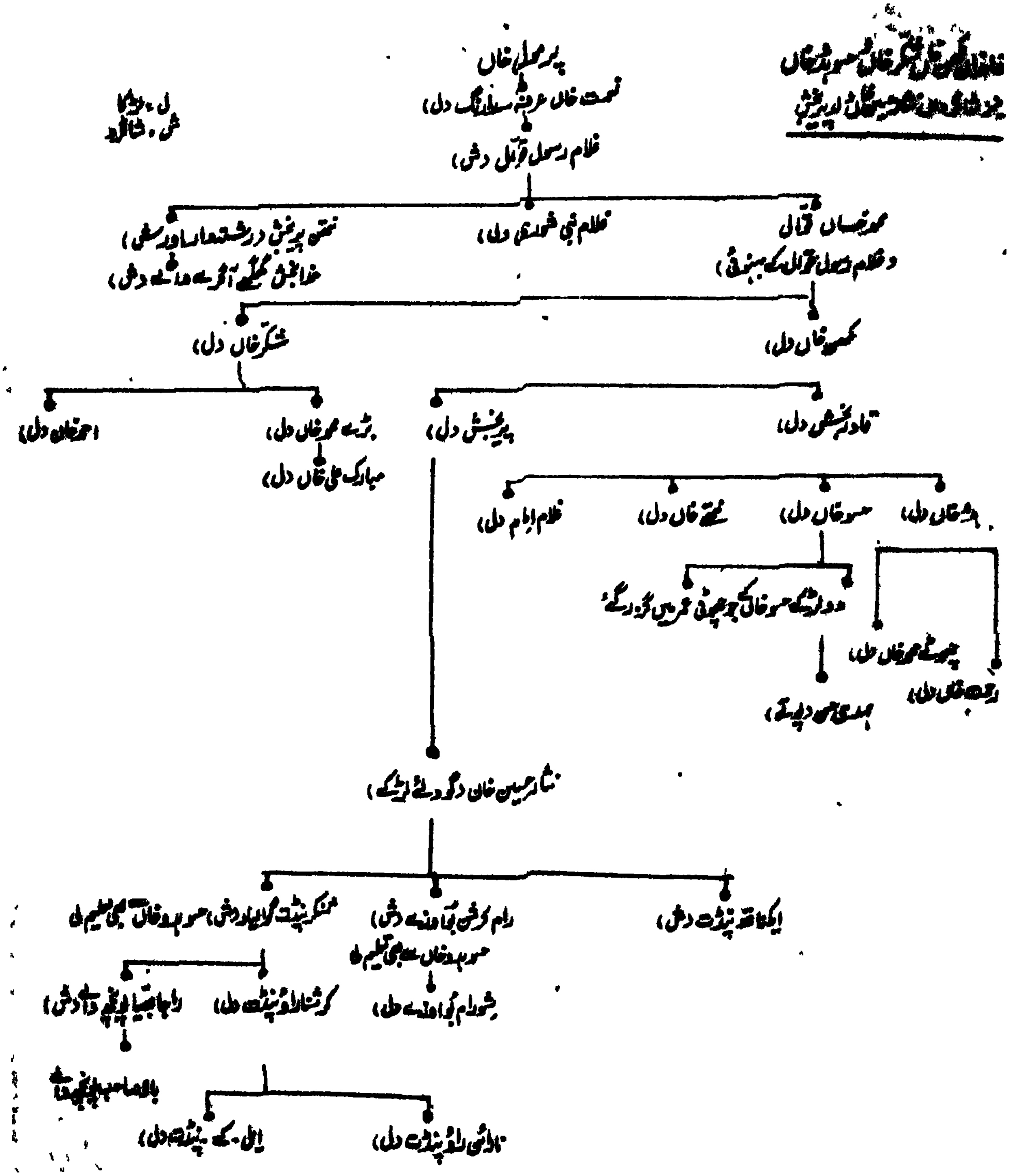
[illegible]

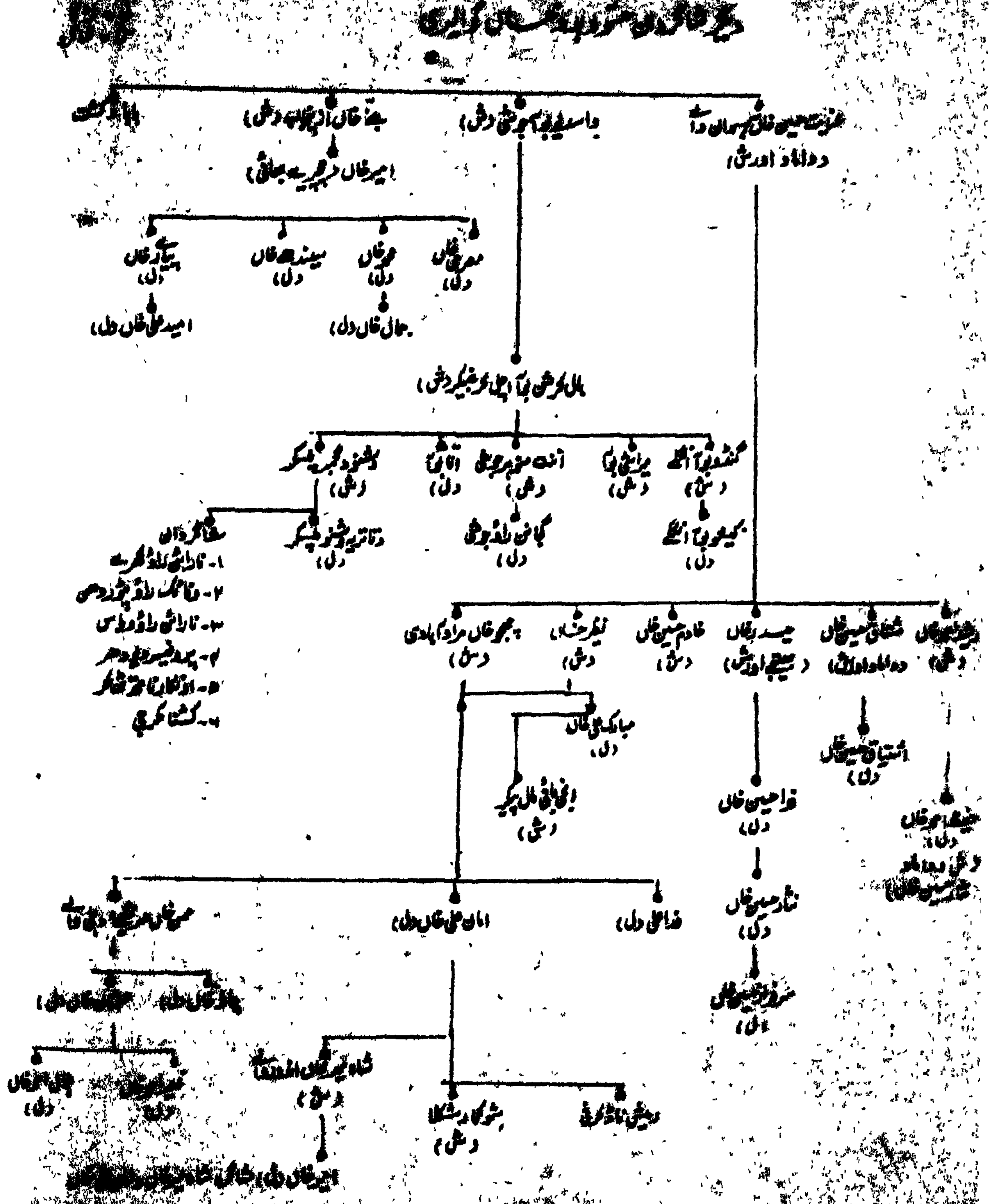
صرف اس کے نفاذ کے سلسلے میں ہے۔ گزشتہ دنوں قتل اور آتش زنی کے جو واقعات اس سلسلے میں رونما ہوئے ہیں وہ کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں ہیں۔ زبان کا مسئلہ خالص لسانی مسئلہ ہے اس پر پوری ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کرنے کی ضرورت ہے۔ غیر ہندی داں لوگوں کی مشکلات کا بھی پورا اندازہ ہے اور ان کی سہولتیں پوری طرح پیش نظر رکھی گئی ہیں۔ وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ امید ہے ان کے فیصلے تمام ملک کے لئے قابل قبول ہوں گے۔

۲۰-۲۱ فروری کو دارالمصنفین اعظم گڑھ کا جشن طلائی بڑی شان و شوکت سے منایا گیا۔ ہندوستان کا یہ عظیم علمی و ادبی ادارہ اس بات کا مستحق ہے کہ ارباب حل و عقد علم نواز حضرات اس کی طرف توجہ دیں۔ نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ریاست کی [illegible] کے [illegible] دارالمصنفین نے تحقیق کے جو بہت سے چراغ روشن کئے ہیں ان کی بدولت دارالمصنفین [illegible] ثابت ہوا ہے۔ آپ نے اس ادارے کا [illegible] کرتے ہوئے کہا کہ "میری آپ سے التجا ہے کہ [illegible] کی تعداد [illegible] [illegible] آپ [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

گوالیار گھرانا





امیر خان
جمال خان (دل)
امید علی خان (دل)
امان علی خان (دل)
فدا علی (دل)

جیون لال متو

گوالیار گھرانا

گوالیار کی دھرپد گائیکی

یوں تو گوالیار کا نام بہت سے واقعات کی وجہ سے تاریخ میں زندہ رہے گا، لیکن وہ چیز جس نے اسے لافانیت بخشی ہے وہ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کی ترقی و ترویج میں اس کا اہم رول ہے۔ ویسے تو اس فن کا اثر اس ملک میں کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ ہی قائم رہا ہے لیکن جس دور پر اور جس دور کی خصوصیات پر ہم روشنی ڈالنا چاہتے ہیں، وہ کئی وجوہ کی بنا پر اس فن کی زندگی میں اہم ترین موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس دور میں علاوہ اس کے کہ تان سین جیسی شخصیتیں پیدا ہوئیں، بہت کچھ تعمیری اور اصلاحی کام بھی ہوا۔

راجہ مان سنگھ تومر

گوالیار کے راجا مان سنگھ تومر جو اکبر کے عہد میں گوالیار کے راجہ تھے، اس دور کی عظیم ترین شخصیت تھے۔ ان کے زمانے تک موسیقی کی گرامر اور فنی اصطلاحات ٹھیٹ سنسکرت میں تھیں، اس کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ فنِ موسیقی سے عوام دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ یہ وہ دور ہے جس میں سنسکرت کا اثر تیزی سے گھٹ رہا تھا اور مقامی زبانیں سر اٹھا رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ تمام وہ علوم و فنون جن کی زبان سنسکرت تھی ہندی میں منتقل کئے جا رہے تھے۔

راجہ مان سنگھ نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر ہندی میں کچھ کتابیں اس مضمون پر نہ ہوں گی تو کچھ عرصے کے بعد صحیح اور غلط علمِ موسیقی میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا۔ کیونکہ ایک فنکار میں لذت کی خاطر فن کے بنیادی اصولوں کی پابندی نہ کرنے کا رجحان فطرتاً موجود ہے۔ اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے ملک کے دوسرے حصوں سے بھی ماہرین کو بلایا اور ایک سال کے مسلسل بحث و مباحثے کے بعد ایک کتاب لکھی جس کا نام 'مان کتوہل' رکھا۔ اس کتاب کا ہندی نسخہ تو اب نایاب ہے لیکن ایک فارسی ترجمے سے ہمیں اس کتاب کی جامعیت کا علم ہوتا ہے۔

اس کتاب کے مترجم فقیر اللہ صوبے دار کشمیر ہیں۔ یہ بزرگ شاہجہان اور اورنگ زیب کے زمانے میں کشمیر کے صوبے دار تھے اور فنِ موسیقی کے نظری و عملی پہلوؤں سے بخوبی واقف تھے۔ فقیر اللہ صاحب نے راجہ مان سنگھ کی 'مان کتوہل' میں دئیے ہوئے مواد پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ شاستر کے اصولوں کا خیال رکھتے ہوئے بہت سے تصرفات کئے جو قابلِ ستائش ہیں۔

'مان کتوہل' کا یہ فارسی ترجمہ حال ہی میں دستیاب ہوا ہے۔ جن ماہرینِ فن نے اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے مباحث میں حصہ لیا۔ ان کے نام یہ ہیں: (۱) نایک بخشو (۲) نایک پانڈوی (۳) محمود لوہنگ، نایک کرن وغیرہ۔

نایک بخشو راجہ مان سنگھ کے ہی تربیت دئیے ہوئے تھے۔ اس دور میں دو گویے مل کر گاتے تھے لیکن نایک بخشو اکیلا ہی اچھا گاتا تھا۔ یہ بعد میں راجہ مان سنگھ کے قائم کردہ گان ودیالیہ، جو انھوں نے اپنی رانی مرگ نینی کے

عام پر شروع کیا تھا، موسیقی کی تعلیم دیتے رہے، یہ پہلا باقاعدہ موسیقی کا اسکول ہے جہاں طالب علم کو نظری و عملی پہلوؤں سے بخوبی واقف کرایا جاتا تھا۔

تان سنگھ راجہ مان سنگھ کی وفات کے دس سال بعد پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم بھی حضرت غوث گوالیاری کی وساطت سے اسی گان ودیالیہ میں ہوئی۔ گو اس وقت نایک بخشو تو حیات نہیں تھے لیکن ان کے دو شاگرد مچھو اور بھنو اب تک وہاں تعلیم دیتے تھے۔ راجہ مان سنگھ کی وفات کے بعد بھی یہ ودیالیہ ۴ سال تک رانی مرگ نینی کی سرپرستی میں فنِ موسیقی کی ہر ممکن خدمت کرتا رہا۔

راجہ مان سنگھ صرف مصنف ہی نہیں تھے مجتہد بھی تھے، محققینِ فن ان کو دھرپد کا موجد تسلیم کرتے ہیں، دھرپد سے پہلے چھند پربندھ مروج تھے لیکن دھرپد کے وجود میں آتے ہی یہ طرز زوال پذیر ہو گئے اور کچھ ہی عرصے میں دھرپد ملک بھر میں رائج ہو گیا۔ دھرپد کی خصوصیات اس دور میں یہ خیال کی جاتی تھیں۔ (۱) راگ کی صحیح شکل، (۲) سُر کی سچائی اور سُر کی انفرادیت کا پورا پورا خیال (۳) اور ایک خاص حد تک لے کا استعمال۔ میاں تان سین بھی دھرپدیے تھے۔ اکبر سے لے کر محمد شاہ رنگیلے تک موسیقی کا میدان دھرپد کے ہاتھ ہی رہا۔

اس حقیقت سے ہم سب ہی واقف ہیں کہ میاں تان سین بھی گوالیار ہی کے رہنے والے تھے۔ یہ ذات کے گوڑ برہمن تھے اور ان کی جائے پیدائش موضع بھینٹ ہے جو گوالیار سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں ان کے والد مکرند پانڈے کا موروثی مکان تھا۔ مکرند پانڈے پر حضرت غوث گوالیاری کی بڑی عنایت تھی۔ لوگوں کا خیال ہے کہ تان سین حضرت غوث کی دعاؤں سے ہی پیدا ہوئے۔ حضرت غوث گوالیاری کے ایما پر تان سین کچھ دنوں راجہ مان سنگھ کے گان ودیالیہ میں تعلیم کے لئے گئے تھے لیکن بعد میں سوامی ہری داس بندرابن والوں سے بندرابن رہ کر تعلیم لینی شروع کی۔ جب تعلیم ختم کر کے گوالیار واپس آئے تو حضرت غوث اور رانی مرگ نینی کے زور دینے پر ان کی شادی حسینی براہمنی سے کر دی گئی۔

فنِ موسیقی پر کوئی کتاب یا تذکرہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ایک مستقل باب راجہ مان سنگھ کی خدمات کی ستائش پر نہ لکھا جائے۔ ان کے اسکول کی وجہ سے آس پاس کے علاقوں میں بھی موسیقی کا بڑا چرچا ہوا، خصوصاً چتوڑ، جون پور اور مانڈو بہت متاثر ہوئے۔ مانڈو اس دور میں مالوہ کا دارالخلافہ تھا اور یہاں کے حکمران بھی اس فن سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

راجہ مان سنگھ کے اس گان ودیالیہ میں جہاں نایک بخشو تعلیم دیتے تھے، بڑے بڑے گویے اور سازندے تیار ہوئے۔ یہ سب لوگ تعلیم لینے کے بعد آس پاس کے علاقوں میں گئے اور فن کا پرچار کیا۔ ان میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) میاں ڈھالو دھاڑی (۲) لال خاں کلاونت (۳) جگن ناتھ کبیرائے اور کرشن سین وغیرہ وغیرہ۔

ان حقائق سے گوالیار کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ راجہ مان سنگھ ۱۴۸۶ء میں گدی نشین ہوا۔ ۱۵۱۶ء میں فوت ہوا۔ نایک بیجو عرف بیجو باورا اس کا گویا تھا۔ نایک بخشو اس کا تربیت دیا ہوا تھا۔ اکبر کے دربار میں ۳۶ بڑے فن کاروں میں سے ۱۶ گوالیار کے تھے۔ راجہ مان سنگھ نے گوالیاری زبان میں نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اس زبان کو لوگوں نے ٹکسالی ہندی مانا ہے۔

گوالیاری گویوں میں یہ نام قابلِ ذکر ہیں (۱) بابا رامداس (۲) تان سین (۳) لال کلاونت (۴) نایک چرجو (۵) سوجان خاں ان کا اصلی نام سُرجان خاں تھا۔ یہ حج کے لئے مکہ گئے اور وہاں ہی کے ہو رہے۔ وہاں بھی نعت پڑھنے میں بڑی شہرت حاصل کی۔ بچھتر خاں، یہ ایک اکبری گویا تھا۔

دھرپد کا زوال اور خیال کی ابتداء

اکبر سے لے کر (۱۷۰۷ء) معظم شاہ عرف بہادر شاہ اول ۱۷۰۷ء تک، (یہ معظم شاہ عرف بہادر شاہ، اورنگ زیب کا فرزند و جانشین تھا) دھرپد بہت مقبول رہا۔ ۱۷۰۷ء سے اس کا زوال شروع ہو گیا۔ ویسے تو بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں لیکن

محققین کا خیال ہے کہ اس کی مقبولیت میں کمی کی وجہ فن کاروں کی آپس میں چشمک ہے۔ دھرپدیے اور بکھاوجی یا بین کار اور پکھاوجی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش نے اس فن کا مزاج ہی بدل دیا تھا۔ اس میں اب وہ پہلی سی گہرائی و گیرائی نہیں پائی جاتی تھی بلکہ ایک خاص انداز کا اوپری پن پیدا ہوگیا تھا۔ یہ کھوکھلا پن نتیجے کے طور پر فن کے تاثر پر بھی اثر انداز ہوا، اور جوں جوں اثر کم ہوتا گیا، دھرپد کی مقبولیت بھی گھٹتی گئی۔

اس دور کی چند کتابوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مغلِ موسیقی راگ رنگ کم اور راگ جنگ زیادہ ہوا کرتی تھی۔ اہلِ نظر و اربابِ فن نے اس تبدیلی کو شدت سے محسوس کیا اور لاشعوری طور پر ایک ایسے انداز کی تلاش شروع ہوگئی جس میں تاثر و کیفیت، گہرائی و گیرائی بدرجہ اتم موجود ہو۔ بہادر شاہ اول سے لے کر محمد شاہ رنگیلے کے زمانے تک محفلِ موسیقی میں فن کار ایک دوسرے کی پگڑی اچھالتے رہے، یوں کہئے کہ دھرپد گانے کے فن میں بد مذاقی اپنے کمال کو پہنچ گئی تھی۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ راجہ مان سنگھ تنور کے زمانے تک موسیقی کی اصطلاحات اس کی شاعری سب سنسکرت میں تھے۔ جیسا کہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر ملک کی موسیقی پر وہاں کی دیو مالا و رسم و رواج کا گہرا رنگ ہوتا ہے لیکن ہندوستانی موسیقی پر یہ رنگ اور دوسرے ممالک سے بھی زیادہ گہرا تھا۔ کیونکہ مسلمان فرماں روا اور فن کار دونوں ہی اس پس منظر سے ناواقف تھے اس لئے اُن کے لئے موسیقی سے پورے طور پر لطف اندوز ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد سے تقریباً ہر دور کے ہندو و مسلمان فن کاروں نے اس بات کی کوشش کی کہ کوئی ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ موسیقی کی برکت سے سب لوگ برابر فیض یاب ہوں۔ لہٰذا کہا جاتا ہے کہ امیر خسرو نے گانے کے ایک انداز کی اختراع کی اور اس کا نام انھوں نے 'خیال' رکھا۔ امیر خسرو کو خیال کا موجد ماننے پر لوگ متفق نہیں ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ امیر خسرو نے علاوہ قول، قلبانہ، نقش، گل، سوہلا، منڈھا، ترانہ اور ترووٹ کے 'خیال' بھی ایجاد کیا۔ اس کے تقریباً دو سو سال بعد سلطان حسین شرقی کے نام سے بھی اس کی اختراع کو منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن آج کل حضرت امیر خسرو کے ایجاد کردہ خیال گائیکی کا پتہ لگانا ناممکن ہے، ان کے ایجاد کردہ قول، قلبانہ وغیرہ کی بندشیں اب بھی ملتی ہیں اور حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر عرس کے موقع پر سننے میں آتی ہیں۔ ترانہ اور ترووٹ گویّے اب بھی گاتے ہیں لیکن ان کے ایجاد کردہ خیال کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ اس کے ساتھ ساتھ حسین شرقی کے ایجاد کردہ خیال گائیکی کا بھی کوئی پتہ نہیں چلتا۔ گو حسین شرقی کے بنائے ہوئے چند راگ اب تک مستعمل ہیں، مثلاً جون پوری وغیرہ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر خسرو اور سلطان حسین شرقی کے خیال کی شکلیں ایسی نہ تھیں کہ قبولِ عام کی سند حاصل کر سکیں، لہٰذا اس وقت کے چھند پربندھ اور دھرپد کے مقابلے کی تاب نہ لا کر حافظوں سے سہو ہو گئیں۔

نعمت خاں عرف سدا رنگ

خیال کی موجودہ شکل کے موجد نعمت خاں عرف سدا رنگ ہیں۔ یہ محمد شاہ رنگیلے کے دربار میں ملازم تھے، دھرپد بہت اچھا گاتے تھے اور بین بھی بجاتے تھے۔ ان کے والد کا نام پرمول خاں تھا۔ انھوں نے موسیقی کی تعلیم اپنے والد کے علاوہ تاتاری قوّال، بنگالی نوڑا اور دیودت کولیشر سے حاصل کی۔ نعمت خاں اپنے وقت کے بہترین دھرپدیے اور بین کار تھے۔ ایک طرح سے یہ تان سین کی اولاد میں سے بھی ہوتے ہیں۔ اکبری دربار میں ٹھاکر سموکھن سنگھ عرف مصری سنگھ بہت ہی اچھے بین کار تھے۔ یہ تان سین کے گانے کے ساتھ بین پر

سنگت کیا کرتے تھے۔ بین بہت میٹھی بجانے کی وجہ سے اکبر نے انھیں مصری سنگھ کا خطاب دیا تھا۔ تان سین نے اپنی لڑکی سرسوتی دیوی کی شادی مصری سنگھ سے کر دی۔ شادی کے بعد یہ نوبات خاں کے نام سے پکارے جانے لگے۔ ان ہی نوبات خاں کی نویں پیڑھی میں نعمت خاں پیدا ہوئے۔

یہاں ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ محمد شاہی دربار میں ایک دھرپدیہ گلاب خاں بھی ملازم تھا۔ اس کے ساتھ نعمت خاں کو بین پر سنگت کرنی پڑتی تھی۔ دراصل محمد شاہی دور میں بین کاروں کی کوئی خاص وقعت نہیں تھی لہٰذا نعمت خاں کو گلاب خاں کا سنگت کرنا بڑا شاق گزرتا تھا۔ نعمت خاں نے اس بیزاری کا ذکر بادشاہ سے کیا۔ بادشاہ پر یہ بات گراں گزری اور اس نے نعمت خاں کو فتح پور سیکری کے پاس ایک گاؤں میں نظر بند کر دیا۔ نعمت خاں نے پہلے تو اپنے بیٹوں کو یہ نیا انداز سکھانے کی کوشش کی لیکن ان کے بیٹے سیکھنے پر رضامند نہیں ہوئے۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ راگ کو خیال کے انداز میں پیش کرنے سے راگ کی شکل بگڑ جاتی تھی۔ لہٰذا نعمت خاں نے دو یتیم دھاڑی بچوں کو جو نہایت خوش گلو تھے خیال گائیکی سکھا کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ کو گانے کا یہ انداز بہت پسند آیا۔ یہ معلوم ہونے پر کہ اس جدید انداز کے موجد نعمت خاں عرف سدا رنگ ہیں، بادشاہ نے نہ صرف انھیں رہا کر دیا بلکہ شاہی گنی جن خانے میں دوبارہ بحال کر دیا۔

سدا رنگ خود دھرپدیے تھے اور بین کار بھی، ان کے ہم عصر دھرپدیوں اور بین کاروں نے اس نئے انداز کی داد نہیں دی بلکہ طنزاً یہ کہا کہ یہ میاں سدا رنگ کا اپنا خیال ہے یعنی ایک قسم کا وہم ہے۔ اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ اس گائیکی کا نام خیال یوں پڑا۔ نہ صرف مغل دربار میں بلکہ اس کے باہر بھی گویّے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ خیال کو رائج کرنے میں سدا رنگ کے بھتیجے اور داماد فیروز خاں عرف ادا رنگ نے سدا رنگ کی بڑی مدد کی۔ ادا رنگ اور سدا رنگ نے سیکڑوں خیال بنائے اور ان کے بول بھی خود لکھے۔

(۱) میاں سدا رنگ کے بنائے ہوئے ایک خیال کے بول یہ ہیں:

راگ بہاگ

استھائی:- اب گھر آون کہہ گئے اجہوں نہ آئے مورے پیتم
وا نہ جانوں کون ڈھنگوا رہے

انترہ:- رات کٹت موہے رتیاں بیتی تارے گنت گنت ارو دو کھے
سدا رنگ برہا جیارا ستاوے

سدا رنگ نے زیادہ تر شرنگار رس پر دھان خیال بنائے۔ ان ہی کے بنائے ہوئے ایک دوسرے خیال کے بول ملاحظہ ہوں

راگ کیدارا

استھائی: نِس نیند نہ آوے نہ بھاوے موکو پیا بن سیج

انترہ:- جیسو سدا رنگیلی چاند نی تیسے ہی آبھوشن تے
وتیا بن آئیں یا سے
محمد سا سدا رنگ کو ڈو یہو بھیج

میاں سدا رنگ کے بنائے ہوئے خیالوں کی بندش سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زیادہ تر شرنگار رس اور بادشاہ کی مدح میں رچنائیں بناتے تھے، لیکن ادا رنگ کے خیالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی طبیعت کچھ صوفیت اور فلسفے کی طرف مائل تھی۔

میاں ادا رنگ کا ایک خیال نمونے کے طور پر پیش ہے۔

راگ آساوری:

استھائی:- جوگی کا کے میت، جو اُن سنگ پریت کرے
سو بڑو ہی نادان

انترہ:- بنا تا تھ کو پریت کا ہو سوں نہ جانت
ادا رنگ کی بات سانچی مان

محمد شاہ رنگیلے کے دور میں سدا رنگ اور ادا رنگ نے خیال کی گائیکی کو اس درجہ پہنچا دیا کہ دھرپد کا رنگ پھیکا پڑ گیا، ان دو استادوں کے خیال آج بھی گائے جاتے ہیں اور مستند مانے جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے میاں سدا رنگ سے خیال کی تعلیم لی ان کے نام یہ ہیں:

(۲) میاں غلام رسول قوال لکھنؤ والے (۳) برادران بہادر خاں و [illegible] (۴) میاں شتی ننگ اور (۵) حسن خاں دھاڑی؛

قوال بچے

میاں غلام رسول، شکر خاں و مکھن خاں

میاں غلام رسول لکھنؤ والے میاں سامتی قوال کے خاندان سے تھے۔ یہ سامتی قوال حضرت معین الدین چشتی کے مرید بھی تھے۔ میاں غلام رسول کے خاندان کے شاگرد اور گویے قوال بچے کہلاتے ہیں۔

غلام رسول قوال کے بیٹے غلام نبی عرف میاں شوری کی آواز پتلی اور چھوٹی تھی اس لئے یہ خیال کی تعلیم نہیں لے سکے، البتہ غلام رسول قوال کے بہنوئی محمد خاں قوال کے بیٹے شکر خاں و مکھن خاں نے اپنے ماموں غلام رسول قوال سے خیال کی تعلیم لی۔ انھوں نے کچھ ہی عرصے میں خیال گانے میں بڑا کمال پیدا کیا اور نواب شجاع الدولہ کے دربار میں ملازم ہو گئے۔

قبل از وقت کامیابی اور شہرت سے دونوں بھائیوں کو بہت غرور ہو گیا۔ حتیٰ کہ انھوں نے اپنے استاد و ماموں غلام رسول قوال سے ایک دن مقابلے کی درخواست کی۔ میاں غلام رسول کو اس حرکت سے بڑی تکلیف پہنچی۔ انھوں نے اپنے دور کے بھتیجے نتھو پیر بخش کو تعلیم دینی شروع کی اور بہت جلدی لائق بنا دیا۔ یہ نتھو پیر بخش دور سے شکر خاں و مکھن خاں کے چچیرے بھائی بھی ہوتے تھے۔

مکھن خاں

مکھن خاں کے دو لڑکے ہوئے (۱) قادر بخش (۲) پیر بخش، قادر بخش کے چار لڑکے ہوئے۔ نتھو خاں، غلام امام، ہدو خاں اور حسو خاں۔ ان چاروں نے خیال کی تعلیم اپنے والد قادر بخش اور چچا پیر بخش سے حاصل کی۔ یہ چاروں بھائی نہایت خوش گلو، تیار، [illegible] خیال کے گانے والے تھے۔

[illegible] نتھو خاں تو [illegible] ہی کم [illegible] رہے [illegible] گر یہ [illegible] ثابت ہوئے۔

ہدو خاں و حسو خاں گوالیار گائیکی کے موجد

یہ سب لوگ ۱۸۴۰ء کے قریب مہاراجہ دولت راؤ والئی گوالیار کے ملازم تھے۔ قادر بخش اور پیر بخش درباری گویے تھے۔ قادر بخش کے بڑے لڑکے نتھو خاں مہاراجہ دولت راؤ کے ولی عہد جیا جی راؤ شندھے کو موسیقی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ مہاراجہ دولت راؤ کی موت کے بعد جیا جی راؤ گدی نشین ہوئے۔ اس ہی عرصے میں قادر بخش کا انتقال ہو گیا اور جیا جی راؤ نے ہدو خاں و حسو خاں کو شاہی گنی جن خانے میں داخل کر لیا۔

اس وقت گوالیار کے درباری گویوں میں محمد خاں بہت مشہور تھے۔ یہ محمد خاں حضرت امیر خسرو کے شاگردوں کے خاندان سے تھے اور ہدو خاں و حسو خاں سے عمر میں بہت بڑے تھے۔

کہتے ہیں کہ محمد خاں نے ۴۵ سال ریاض کر کے عام جلسوں میں گانا شروع کیا تھا اور اپنی گائیکی میں اس قدر مشکل بول چھندے رکھے تھے کہ عام سننے والا مبہوت ہو جاتا تھا۔ دوسرے گویے ان کے سامنے گانے سے پرہیز کیا کرتے تھے، مبادا کوئی کچھ لے اڑے [illegible] ہنر دور ہو جائے۔

جیا جی راؤ شندھے، محمد خاں کی بہت قدر کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ محلات میں محمد خاں ہاتھی پر بٹھا کر لائے جاتے تھے، کہا جاتا تھا کہ جب یہ گھر سے نکلتے تھے تو کانوں اور ناک میں روئی ٹھونس لیتے تھے تاکہ کوئی بری آواز یا بدبو دماغ پر اثر نہ کرے۔

جیا جی راؤ کی بڑی خواہش تھی کہ ہدو خاں و حسو خاں (جو بہت ہونہار تھے) محمد خاں کے ڈھنگ پر گائیں، لہٰذا ایک دن دربار میں ہدو خاں و حسو خاں نے مہاراجہ کے ایما پر محمد خاں سے عرض کیا کہ وہ ان دونوں بھائیوں کو اپنا شاگرد کر لیں، لیکن محمد خاں اس پر رضامند نہیں ہوئے۔ یہ بات مہاراجہ کو بہت ناگوار گزری۔

مہاراجہ نے اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک چال چلی۔ انھوں نے اپنے لئے ایک اتنا بڑا تخت بنوایا جس کے نیچے ہدو خاں و حسو خاں آسانی سے چھپ کر بیٹھ سکیں۔ تا دوسرے

کے مطابق محمد خاں تخت کے سامنے بیٹھ کر گاتے تھے۔ یہ دونوں تخت کے نیچے چھپ کر ان کا گانا سنتے تھے اور اگر کبھی کوئی تان یا راگ سمجھ میں نہیں آتا تھا تو یہ مہاراجہ سے کہتے جو دوبارہ محمد خاں کو بلا کر اس راگ یا تان کی فرمائش کرتے اور یہ دونوں اس کی نقل کر لیتے۔ چھ مہینے کے عرصے میں انھوں نے محمد خاں کا مکمل چربہ اتار لیا۔ کچھ عرصے کے بعد محمد خاں نے گوالیار میں ایک طوائف کو شاگرد کیا۔ اس تقریب میں بہت سے گویے اور بہت سے شائقینِ فن بھی موجود تھے۔ جب طوائف کی شاگردی کی تمام رسومات ختم ہو گئیں تو ہدو خاں وحسو خاں نے محمد خاں سے عرض کیا کہ انھیں بھی شاگرد کر لیا جائے۔ حسبِ معمول محمد خاں نے پھر انکار کیا۔ اس پر ہدو خاں وحسو خاں نے کہا کہ اگر آپ ہمیں شاگرد نہیں کر سکتے تو کم از کم ہمارا گانا تو سن لیجئے۔ اور لوگوں نے بھی اشتیاق ظاہر کیا۔ لہٰذا ہدو خاں وحسو خاں نے گانا شروع کیا۔ حاضرین بہت متعجب ہوگئے کیوں کہ انھوں نے محمد خاں کے فن کی ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھ دی تھی۔ اس پر محمد خاں بہت ناراض ہوئے اور مہاراج پر دھوکے کا الزام لگایا، لیکن ہدو خاں وحسو خاں کو شاگرد کر لیا۔ جب یہ دونوں بھائی تعلیم کے لئے محمد خاں کے مکان پر گئے تو محمد خاں نے ان کو تعلیم دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جو تم نے چوری سے اڑا لیا ہے یہی تمہارے مانگ کھانے کے لئے بہت ہے۔ محمد خاں مہاراجہ کی اس حرکت سے اس قدر بددل ہوئے کہ گوالیار کی نوکری چھوڑ کر ریوا دربار میں ملازمت کر لی۔

ہدو خاں وحسو خاں کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ تمام ہندوستان سے لوگ ان سے گانا سیکھنے آیا کرتے تھے۔ دراصل گوالیار گائیکی کے موجد ہی یہ دو بھائی ہیں۔ ہدو خاں وحسو خاں کے انداز کو لشکری گائیکی بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے بھائی غلام امام اور نتھو خاں بھی اچھے گویے تھے لیکن ہدو خاں وحسو خاں کو نہیں پہنچتے تھے۔ نتھو خاں کے کوئی لڑکا نہیں تھا اس لئے انھوں نے اپنے ایک عزیز نثار حسین کو گود لے لیا تھا۔ غلام امام بھی اولادِ نرینہ سے محروم رہے۔ حسو خاں ۱۸۵۹ء میں گزر گئے اور ان کے ایک سال بعد غلام امام بھی چل بسے۔ ہدو خاں کا لڑکا جس کو چھوٹے محمد خاں کہتے تھے ۱۸۷۴ء میں جوانی ہی میں مرگیا۔ نتھو خاں کے گزر جانے کے بعد نثار حسین گوالیار کے درباری گویے بن گئے۔ ان کا انداز بھی بے مثل سمجھا جاتا ہے لیکن گوالیار گھرانے کا نام اور شہرت آج بھی ہدو خاں وحسو خاں سے ہی متعلق ہے۔ گوالیار گھرانے کی خصوصیات یوں بیان کی جاتی ہیں:-

(۱) دھرپد انگ کے خیال (۲) زوردار اور کھلی آواز میں گانا (۳) گانے میں الاپ کا حق ادا کرنے کے لئے بہلاوے لینا (۴) گمکوں کا خاص استعمال (۵) سپاٹ تانوں کا تیاری میں استعمال (۶) بول تان اور بول بانٹ میں لے کا خوبصورت استعمال (۷) آروہی کی تانیں تیاری میں لینا (۸) ٹھپے مارنا، وغیرہ وغیرہ۔

۱۸۵۷ء میں حکیم محمد کرم امام خاں نے ایک کتاب 'معدن الموسیقی' لکھی۔ حکیم صاحب فنِ موسیقی کے رموز و نکات سے بخوبی واقف تھے۔ اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے بیشتر گویے حکیم صاحب نے سنے اور اکثر ان کے ساتھ تبادلۂ خیال بھی کیا۔ یہ کتاب حکیم صاحب نے ہاتھ سے اردو زبان میں لکھی جسے ۱۹۲۵ء میں ان کے ایک عزیز سید واجد علی شاہ نے ہندوستانی پریس لکھنؤ سے چھپوا کر شائع کرائی۔ اس کتاب میں حکیم صاحب نے ہدو خاں وحسو خاں اور ان کے بھائیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۳۰۶۔ سطور ۱ تا ۵ پر درج ہے:-

"ہدو خاں وحسو خاں و نتھو خاں و غلام امام بلند لہجہ ہم زاد سب اچھے اور کلاں و بنکے گویے ہیں اور اپنے رو برو دوسرے کو کم سمجھتے ہیں۔ بندے نے ان کو بہت سنا۔ حقیقت میں بہت کرارے ہیں۔ منجملہ ان کے حسو خاں و غلام امام فوت ہوئے۔ یہ لوگ ساکن گوالیار، اس ہی سرکار میں ملازم ہیں بہ تنخواہ معقول چار چار یا پانچ پانچ سو۔"

اس ہی کتاب کے صفحہ ۳۰ پر سطور ۱۰ تا ۱۷ پر درج ہے۔

"رجب علی اور فضل علی ساکن لکھنؤ جن کا اور بڑے محمد خاں کا ایک خاندان ہے (یہاں بڑے محمد خاں سے مراد شکر خاں کے لڑکے محمد خاں سے ہے) خیال بہت نستعلیق (نستعلیق) گاتے ہیں، منجملہ ان کے فضل علی نے وفات پائی اور مسمٰی مینڈھو خاں بھانجا آن کا ان کی وضع سے علیحدہ جبڑا فیل ہدو خاں زیادہ تیار ہے بہرحال اچھا ہے۔"

اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید ہدو خاں جی نے اپنی گائیکی میں جبڑے کا استعمال بھی کیا ہے، آج بھی گوالیار گھرانے کے شاگردوں میں کچھ لوگ جبڑے کا استعمال کرتے ہیں۔

حسو خاں کے دو لڑکے تھے لیکن بدقسمتی سے دونوں کو فنِ موسیقی میں دلچسپی نہیں تھی البتہ حسو خاں کے پوتے مہدی حسین نے اپنے دادا سے تعلیم لی اور اچھا گایا۔ ہدو خاں کے دو لڑکے تھے چھوٹے محمد خاں اور رحمت خاں، چھوٹے محمد خاں کی گائیکی کا لوہا سب ہی مانتے تھے لیکن یہ ۱۸۷۴ء کے قریب چھوٹی عمر میں وفات پا گئے۔ ان کے دوسرے لڑکے رحمت خاں نے زیادہ عمر پائی اور ۱۹۲۲ء میں انتقال فرمایا۔ مجھے ۱۹۱۶ء میں رحمت خاں کو بمبئی میں کافی سننے کا اتفاق ہوا۔ گو اس وقت یہ ۷۵ کے پیٹے تھے اور خللِ دماغی میں مبتلا تھے لیکن گانے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ آواز اس قدر سُریلی اور میٹھی تھی جیسے شہد میں بھیگا ہوا انگور، یہ محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی ۲۰ یا ۲۵ سال کا جوان گا رہا ہو۔ آواز میں بڑی وسعت تھی۔ بھاسکر بوا بکھلے اور فتح علی خاں کا ذکر آگے آئے گا۔ ان کی آوازیں بھی بے مثل تھیں لیکن رحمت خاں کی آواز ان دونوں سے بہتر تھی۔

رحمت خاں نے صرف اپنے والد ہدو خاں اور چچا حسو خاں کے شاگردوں کو ہی تعلیم دی، اور خود بھی بہت شاگرد بنائے۔

ہدو خاں اور حسو خاں کے شاگرد

ہدو خاں اور حسو خاں کے بے شمار شاگرد ہوئے لیکن ان میں قابلِ ذکر یہ ہیں:-

(۱) واسو دیو بوآ جوشی (۲) عنایت حسین خاں سہسوان والے۔ (۳) بنے خاں نوشہرہ ننگل ضلع امرتسر والے (۴) بابا دکشت دکن والے

واسو دیو بوآ جوشی

واسو دیو بوآ جوشی اپنے وقت کے مشہور گویے تھے۔ ان کے شاگرد بال کرشن بوآ اچل کرنجیکر کے نام سے تقریباً سب ہی لوگ واقف ہیں کیوں کہ یہ پنڈت وشنو ڈگمبر پلسکر کے استاد تھے۔ بال کرشن بوآ موضع چینڈور نزد کولھا پور کے رہنے والے تھے اور یہاں ہی ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کو بھی اس فن سے بڑا لگاؤ تھا۔ انھوں نے ستارا (مہاراشٹر) کے بالاجی بوآ خیا لیے سے خیال گائیکی سیکھی تھی۔ بالاجی بوآ کھن خاں کے پوتے کے شاگرد تھے لیکن بال کرشن بوآ کی پہلی تعلیم وشنو بوآ جوگلیکر سے ہوئی جو کیرتن کار تھے، پھر ریاست جت (مہاراشٹر) کے علی داد خاں سے ہوئی پھر بھاؤ بوآ کاگواڑکر کولھا پور والوں سے سیکھنے لگے۔ لیکن کاگواڑکر بال کرشن بوآ سے اس بات پر ناراض ہو گئے کہ بال کرشن بوآ نے کاگواڑکر کی چلم بھرنے میں دیر کر دی۔ بال کرشن بوآ گوالیار جا کر واسو دیو بوآ جوشی کے شاگرد ہو گئے اور ان سے تعلیم لینے کے بعد رحمت خاں کے بھائی چھوٹے محمد خاں (جو ہدو خاں کے صاحبزادے تھے) سے چھ سال تعلیم لیتے رہے۔ اس طرح بال کرشن بوآ پر پورے طور پر گوالیار کی چھاپ لگ گئی۔ اس کے بعد یہ پہلے ریاست اوندھ اور پھر ریاست اچل کرنجی میں درباری گویے ہو گئے اور بہ وقت انتقال یعنی ۱۹۲۶ء تک وہاں ہی رہے۔ یہ بھی بہت اچھے گویے تھے اور گوالیار کی تمام خصوصیات ان میں موجود تھیں میں نے ۱۹۲۴ء میں بمقام لاہور ان کا گانا سنا ہے، اس وقت ان کے بڑے لڑکے انا بوآ بھی ان کے ساتھ تھے۔ انا بوآ بھی نہایت کرارا اور تیار رہتے۔ لیکن انا بوآ، بال کرشن بوآ سے پہلے ہی بھری جوانی

میں چل بسے، بال کرشن بوآ کے شاگردوں میں جن لوگوں نے شہرت حاصل کی ان کے نام یہ ہیں:-

(۱) آننت منوہر جوشی (۲) وشنو ڈگمبر پلسکر (۳) یشونت سداشیو مراشی دکھن والے (۴) گنڈو بوآ انیگلے اوندھ والے۔

آننت منوہر جوشی نے بھی اپنے وقت میں اچھی شہرت حاصل کی۔ یہ پہلے ریاست اوندھ کے درباری گویے تھے، لیکن بعد میں بمبئی میں گورو سمرتھ ودیالیہ کھولا اور دو تین کتابیں گانے پر اور ہارمونیم پر لکھیں۔ ان کے لڑکے گجانن راؤ جوشی اچھے گائک اور وائلن وادک ہیں اور آج کل بمبئی ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہیں۔

بال کرشن بوآ اچل کرنجیکر کے شاگردوں میں سب سے زیادہ نام پنڈت وشنو ڈگمبر پلسکر نے پایا۔ وشنو ڈگمبر پلسکر ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے، لیکن ۱۸۹۷ء میں اپنا وطن چھوڑ کر پنجاب آگئے اور بابا سر گورو بخش سنگھ بیدی راولپنڈی والوں (یہ گورو نانک کی اولاد میں سے تھے) کے ملازم ہو گئے۔ یہاں یہ باباجی کے لڑکوں کو سنگیت کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ایک برس کے اندر ہی اندر یہ مہاراجہ کشمیر کے گنی جن خانے میں پہنچ گئے۔ اس زمانے میں پنجاب کے مشہور گائک فتح علی خاں اور بڑے غلام علی خاں کے والد علی بخش اور بڑے غلام علی خاں کے چچا استاد کالے خاں بھی وہاں ملازم تھے۔ وشنو ڈگمبر جی کے ساتھ پکھاوج بجانے کے لئے گورو دیو پٹوردھن، ونایک راؤ پٹوردھن کے چچا بھی کشمیر میں ملازم تھے۔ لیکن دو سال کے مختصر عرصے میں انھوں نے مہاراجہ کشمیر اور کشمیر کے ایک منسٹر سر راجا دیا کشن کول سے مالی امداد لے کر ۱۹۰۰ء میں بمقام لاہور ایک موسیقی کا اسکول کھولا جس کا نام گندھرو مہا ودیالیہ رکھا۔

ان دنوں پنجاب، صوبہ سرحد، اتر پردیش اور راجستھان میں فنِ موسیقی کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ فن ان لوگوں میں جا چکا تھا کہ شرفا اس کا نام لیتے ہوئے شرماتے تھے۔ موسیقی کو سیکھنے اور اپنانے کا خیال تو پیدا ہی نہیں ہوتا۔ لیکن پنڈت جی نے اس فن کو دوبارہ شرفا میں پھیلانے کے لئے بڑی قربانیاں دیں۔ یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یہ فن دوبارہ شرفا میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

کچھ مذہبی خیالات رکھنے والوں کو خیالوں کی پرانی بندشوں پر بڑا اعتراض تھا، کیونکہ ان میں شرنگار رس زیادہ تھا۔ لہٰذا پنڈت جی نے سدا رنگ وادا رنگ کے مستند خیالوں کو زیادہ تر بالائے طاق رکھا اور رامائن کے مصنف تلسی داس کی لکھی ہوئی کتاب "ونے پتریکا" سے کچھ بھجن لے کر ان کو موسیقی کا جامہ پہنا دیا اور کوشش کی کہ ان میں خیالوں کا سا تاثر پیدا ہو جائے۔ وشنو ڈگمبر جی یہی گاتے تھے اور یہی شاگردوں کو سکھاتے تھے۔ یہ بھی پنڈت جی کی ذہانت کا ثبوت ہے کہ استاد سے کچھ اور سیکھا اور لوگوں کو کچھ اور سکھایا۔ لیکن ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کو دوبارہ اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ موسیقی ہندوستانی کلچر کا ایک اہم جز ہے۔ ۱۹۰۷ء میں پنڈت جی نے سینڈہرسٹ روڈ بمبئی میں ایک بہت بڑی بلڈنگ بنا کر اس کو گندھرو مہا ودیالیہ کا صدر مقام قرار دیا۔ اور تمام ہندوستان میں اس کی ۵ شاخیں قائم کیں۔ ویسے تو پنڈت جی نے بہت سے خیال اور بھجن بنائے۔ لیکن ایک دھن "جے جگدیش ہرے" اور ایک بھجن "رگھوپتی راگھو راجا رام" جو مہاتما گاندھی کو بہت پسند تھے اب امر ہو چکے ہیں۔ پنڈت جی نے موسیقی پر کئی کتابیں لکھیں اور ایک جدید موسیقی کا Notation بھی ایجاد کیا۔

پنڈت جی کا صرف ایک لڑکا دتاتریہ پلسکر تھا جو عین جوانی میں چل بسا۔ یہ لڑکا بہت شریف اور بہت ہی اچھا کلاکار تھا۔

پنڈت جی کے چند شاگرد قابلِ ذکر ہیں:-

(۱) نارائن راؤ کھرے جو اب حیات نہیں ہیں۔
(۲) ونایک راؤ پٹوردھن (۳) نرائن راؤ ویاس
(۴) ٹھاکر اونکار ناتھ (۵) بابو راؤ گوکھلے، پروفیسر دیودھر اور کرشن کر جی وغیرہ وغیرہ۔

وشنو ڈگمبر جی کے بھجنوں کو خیال بنا دینے سے ان کی گائیکی بھجن انگ کی ہو گئی۔

سہسوان

حیدر خاں نے اپنی لڑکی کی شادی عنایت حسین خاں سہسوان (ضلع بدایوں) والوں سے کی اور بعد میں انھیں گوالیار کی خیال گائکی کی تعلیم دی۔ اس سے پیشتر عنایت حسین خاں دُھرپد کی تعلیم بہادر خاں سے لے چکے تھے جو تان سین کے خاندان سے تھے۔

عنایت حسین خاں بہت اُجلے دماغ کے گوّیے تھے اور اپنے وقت کے چند استادانِ فن میں سے ایک تھے۔ آپ نے بہت سے خیال بنائے لیکن نمونے کے طور پر آپ کی راگ چھایانٹ میں بنائی ہوئی ایک بندش پیش کی جاتی ہے۔

راگ چھایانٹ

استھائی: جھن نن نن جھن نن نن جھن نن نن بچھوا باجے
پیا کے ملن کو چلی جات اپنے مندر سوں مائی

انترہ:۔ پوجا کرن کو نکسی گھر سوں، ہوں اکیلی نار چونکی
عنایت بار بار رمائی

عنایت حسین خاں کے بھائی محمد حسین بین کار کے لڑکے حیدر خاں بھی بہت بڑے گوّیے تھے۔ حیدر خاں کے لڑکے فدا حسین کو میں نے ۱۹۴۵ء میں لاہور میں سُنا تھا۔ اس وقت تقریباً ۷۰ برس کے تھے اور منہ میں ایک دانت نہیں تھا۔ چہرے پر ضعیفی کے تمام آثار تھے، لیکن گانے میں ضعیفی کی کوئی علامت نہیں تھی۔ بڑے ملنسار اور منکسر المزاج تھے۔ اس عمر میں آواز کا یہ عالم تھا جیسے مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ یہ بہت عرصے تک رام پور دربار میں ملازم رہے۔ ان کے لڑکے نثار حسین خاں اب تک گا رہے ہیں اور خیال نہایت نستعلیق انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ انداز میں گوالیاری روایات کے مطابق ہے۔ ترانے میں اب تک کوئی ان کو نہیں پہنچا۔ کھُلے گلے سے گاتے ہیں اور جبڑے کا استعمال بالکل نہیں کرتے۔ ان کے صاحبزادے سرفراز حسین خاں اس وقت دہلی ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہیں اور ان کے داماد اور شاگرد حفیظ احمد خاں بمبئی ریڈیو میں ملازم ہیں۔ یہ دونوں نوجوان بہت ہونہار ہیں۔

عنایت حسین خاں کے بھتیجے حیدر خاں کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ حیدر خاں کے داماد مشتاق حسین خاں نے موسیقی کی تعلیم حیدر خاں سے لی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے والد کلن خاں اور اپنے دو ماموں محبوب خاں درس اور پُنّن خاں اتر دلی (ضلع علی گڑھ) والوں سے بھی تعلیم لی۔ دربار رام پور میں سہسواں والوں کا ہمیشہ دَور دورہ رہا۔ لہٰذا مشتاق حسین خاں صاحب بھی بہت عرصے دربار رام پور سے متعلق رہے۔ بعد میں بھارتیہ کلا کیندر دہلی میں تعلیم دیا کرتے تھے۔ انھوں نے بھی اچھی شہرت حاصل کی۔ سرکار سے 'پدم بھوشن' کا خطاب پایا۔ ریڈیو کے میوزک اوڈیشن بورڈ کے رکن رہے اور مرکزی سنگیت ناٹک اکاڈمی سے بھی متعلق رہے۔ ۱۳۔ اگست ۱۹۶۴ء کو دہلی میں انتقال فرمایا۔ ان کے بڑے لڑکے اشتیاق حسین ریڈیو سے گاتے ہیں۔ ان کی تعلیم بھی ان کے والد مشتاق حسین خاں صاحب سے ہوئی ہے۔

سہسوان والے گوالیار گائکی کے صحیح نمائندے کہلانے کے مستحق ہیں۔

چھجو خاں، نظیر خاں اور خادم حسین خاں مراد آباد والے

عنایت حسین خاں سہسوان والوں کے شاگردوں میں چھجو خاں، نظیر خاں اور خادم حسین خاں مراد آباد والوں کا ذکر لازمی ہے۔ یہ بھی گوالیار والوں کے شاگرد ہوئے اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد بمبئی چلے گئے جہاں بھنڈی بازار میں رہنے کی وجہ سے بھنڈی بازار والے کہلانے لگے۔ یہ لوگ خیال کے علاوہ دُھرپد بھی گاتے تھے اور سارنگی بھی بجاتے تھے۔ چھجو خاں، نظیر خاں اور خادم حسین خاں کے بنائے ہوئے کئی دُھرپد اور دھماروں کا نوٹیشن راجہ نواب علی خاں نے معارف النغمات کے حصّہ دوم میں دیا ہے۔ یہ کتاب وشنو نارائن بھاتکھنڈے کے مشورے اور مدد سے پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

چھجو خاں کے دو لڑکے تھے۔ فدا علی خاں اور امان علی خاں، ان دونوں کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ فدا علی خاں کو اس

فن سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ نذیر خاں اور خادم حسین خاں دونوں کے یہاں ایک ایک لڑکا ہوا۔ نذیر خاں کے لڑکے کا نام مبارک علی خاں اور خادم حسین خاں کے لڑکے کا نام لائق علی خاں تھا۔

بھنڈی بازار والوں نے سادرہ (جھپ تال جو س ماترے) میں کئی خیال باندھے ہیں۔ چھجو خاں صاحب اور ان کے بیٹے امان علی خاں صاحب نے علاوہ سادرہ کے روپک تال (سات ماترہ) میں کئی چیزیں باندھیں۔ اس خاندان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ چھوٹی تالوں میں خوب صورت لفظوں کو سمو کر خیال کو ایک لطیف اور ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیا جائے، جو عام سننے والے کو جلدی متاثر کرے اور گانے والے پر کوئی زور نہ پڑے۔ یہ انداز ان لوگوں میں جو فنِ موسیقی کی بنیادی قدروں سے ناواقف تھے بہت مقبول ہوا۔ اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیئے کہ یہ دونوں بھائی بڑی تالیں مثلاً جھومرہ، تلواڑہ یا ولمبت اکتالہ وغیرہ نہیں برتتے تھے۔ انھوں نے کئی خیال بڑی تالوں میں بھی باندھے ہیں۔ بھنڈی بازار والوں نے کچھ کرناٹک راگوں میں چھوٹے چھوٹے خیال باندھے اور ساتھ ہی کرناٹک انگ کے سرگم کرنے کے انداز کو شمالی ہند کی موسیقی میں لائے۔ نذیر خاں کے لڑکے مبارک علی خاں پلٹا اور سرگم میں بہت تیار تھے اور نہایت صاف ستھرا گاتے تھے، لیکن تپ دق کی بیماری سے جلدی ہی مر گئے۔ بمبئی کی مشہور گائیکہ انجنی بائی مال پے کر نذیر خاں صاحب کی شاگرد ہیں۔ چھجو خاں نذیر خاں کے شاگردوں میں ایک ممن خاں سارنگیے اور سُر ساگر نواز ہوئے ہیں۔ یہ بڑے اونچے پائے کے فن کار تھے، دہلی کی ناک سمجھے جاتے تھے، دربار پٹیالہ سے متعلق تھے، ان کے داماد بندو خاں بھی بہت مشہور سارنگی نواز ہوئے ہیں، ممن خاں کے لڑکے چاند خاں آج کل دہلی میں گاتے ہیں۔

چھجو خاں کے ایک شاگرد شاہ میر خاں جو سارنگی بجاتے تھے اور دربار اندور سے متعلق تھے، اندور والے کہلاتے تھے۔ دراصل یہ شاہ میر خاں والا امیر خاں ریاست جیند (سنگرور) کے رہنے والے ہیں۔ شاہ میر خاں کے لڑکے امیر خاں اس وقت ہندوستان کے گنے چنے چند فن کاروں میں سے ہیں۔ امیر خاں نے کچھ عرصہ امان علی خاں صاحب سے بھی تعلیم لی لیکن اب ان کی گائیکی زیادہ تر کیرانہ گھرانے سے متاثر ہے۔ گو یہ کبھی کیرانہ گھرانہ والوں کے شاگرد نہیں ہوئے۔ علاوہ ان کے امان علی خاں کے بمبئی اور دوسرے مقامات پر کئی شاگرد ہیں۔ ان کے کئی شاگرد شو کمار شکلا آج کل بڑودہ میوزک کالج کے وائس پرنسپل ہیں۔ ان کے دوسرے شاگرد رمیش ناڈکرنی اندور ریڈیو پر ملازم ہیں۔ یہ دونوں اچھے گائیک ہیں۔ امان علی خاں صاحب اپنی بندشوں میں امر پیا تخلص کرتے تھے اور کبھی صرف امر ہی سے کام چلا لیتے تھے۔ یہاں ان کی ایک بندش کے بول نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:-

راگ گوجری ٹوڈی – امر پیا – امان علی خاں

استائی۔ آج مورے من لاگو لگن گروا
گن رنگ رس ادھک جوت متوار وسجنی
سندر سُگھر جن ما

انترہ۔ رنگ سُو گھندن چیزن انگت
بول شبد نیکے رس من ہر
گات روپ گت امر سوہت منوا

بڑے خاں نوشہرہ ننگلی پنجاب

نوشہرہ ننگلی کے بڑے خاں، بڈو خاں گوالیار والوں کے شاگرد ہوئے۔ پنجاب آکر بڑے خاں نے اپنے چچیرے بھائی امیر خاں کو تعلیم دی۔ امیر خاں کے چار لڑکے ہوئے۔ (۱) پیارے خاں (۲) سینڈے خاں (۳) محمد خاں (۴) مہری خاں۔ پیارے خاں بڑے دبنگ خیالیے تھے اور کافی عرصے امیر کابل کی خدمت میں رہے، ان کے لڑکے امید علی خاں اب پاکستان میں رہتے ہیں، لیکن اکثر کسی نہ کسی کانفرنس میں ہندوستان آتے رہتے ہیں۔ پیارے خاں کے دوسرے بھائی سینڈے خاں کو تعلیم بھی بڑے خاں سے ہوئی۔ اچھے گائیک تھے لیکن منشیات کے استعمال

کی وجہ سے ۴۳ سال کی عمر میں دماغی توازن کھو بیٹھے۔ بعد میں فقیری اختیار کر لی اور بمبئی چلے گئے۔ جہاں پروفیسر دیودھر نے ان کی بڑی امداد کی۔ تیسرے بھائی محمد خاں پنجاب میں ہی گاتے بجاتے۔ ان کے لڑکے جمال خاں عرف چھمو خاں زیادہ تر امرت سر میں رہے۔ پیار خاں کے چوتھے بھائی مصری خاں حیدرآباد سندھ میں جا بسے اور اس طرح گوالیار کی گائیکی سندھ میں پہنچی جہاں بڑے اونچے پایہ کے گویّے بیبے خاں اور گامن خاں ہوئے۔ نوشہرہ ننگلی والوں نے گوالیار کے انداز کو برقرار رکھا البتہ گانے میں جبڑا استعمال نہیں کیا۔

بابا دکشت دکن والے

بابا دکشت کی تعلیم ہدو خاں اور حسو خاں سے گوالیار میں ہوئی۔ کچھ عرصہ گوالیار میں رہ کر یہ بنارس اور اُتّر پردیش کے دوسرے ضلعوں میں رہے۔

بابا دکشت زیادہ تر مندروں میں رہتے تھے اور لوگ ان کا گانا وہاں ہی سُن لیا کرتے تھے۔ فقیر طبیعت انسان تھے اور شاگرد بنانے کا شوق نہیں تھا۔

اوپر کا تذکرہ مکھن خاں کے لڑکے قادر بخش اور ان کے بیٹے حسو خاں اور ہدو خاں وغیرہ کے خاندان اور ان کے شاگردوں کا ہے۔

قادر بخش کے دوسرے بھائی پیر بخش نے اپنے ایک رشتہ دار نثار حسین کو گود لیا تھا۔ یہ نثار حسین گوالیار دربار سے متعلق رہے اور حسو خاں و ہدو خاں کی صحبت میں رہے۔ یہ سب کچھ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ ان نثار حسین کے شاگردوں میں تین نام قابلِ ذکر ہیں۔ (۱) رام کرشن بوآ وزے (۲) پنڈت ایکناتھ (۳) شنکر پنڈت۔

شنکر پنڈت اور رام کرشن بوآ وزے نے ہدو خاں صاحب سے بھی تعلیم لی۔ رام کرشن بوآ وزے کے صاحبزادے بشو رام بوآ وزے نے حال ہی میں وفات پائی ہے۔ یہ بھی اچھے گائیک تھے۔

شنکر پنڈت نے اپنے لڑکے کرشنا راؤ پنڈت کو تعلیم دی۔ ان کا گانا کافی زوردار ہے اور ٹپے کی قسم اچھی کرتے ہیں۔ نثار حسین خاں نے مرحوم راجہ بھیا پونچھ والے کو بھی تعلیم دی جن کے لڑکے بالا صاحب پونچھ والے حیات ہیں اور گوالیار میں رہتے ہیں۔

شکر خاں برادر مکھن خاں کا سلسلہ

شکر خاں کے دو لڑکے بہت مشہور گویّے ہوئے۔ ان میں سے بڑے محمد خاں شکر خاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد دربار جے پور میں ملازم ہو گئے۔ بڑے محمد خاں کے لڑکے مبارک علی خاں بھی جے پور دربار ہی سے متعلق رہے۔ مبارک علی خاں نے تان کی تیزی اور پیچیدگی پر خاص توجہ دی۔ لہٰذا ہندوستان بھر ان کو تان پر دھان مانتا ہے۔

اللہ دیا خاں کولہا پور والے خواجہ احمد خاں کے بیٹے تھے اور دُھرپد کی تعلیم اپنے والد سے ہی حاصل کی تھی، دراصل خواجہ احمد خاں و اللہ دیا خاں اترولی ضلع علی گڑھ کے رہنے والے تھے۔ اللہ دیا خاں کسی تقریب میں جے پور آئے اور انھیں مبارک علی خاں کا گانا سننے کا اتفاق ہوا، مبارک علی خاں کا گانا سُن کر اللہ دیا خاں کا دل دُھرپد سے بیزار ہو گیا اور خیال گانے لگ گئے۔ مبارک علی خاں کی نقل کرتے کرتے خود ایک صاحبِ طرز خیالئے بن گئے۔

اس میں شک نہیں کہ شکر خاں اور اُن کی اولاد بھی قوّال بچّوں میں سے تھے اور میاں سدا رنگ کے شاگردوں کے سلسلے میں سے شمار کئے جاتے ہیں لیکن انھیں گوالیار خاندان میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

گوالیار گھرانے کی ابتداء ہدو خاں اور حسو خاں سے ہوئی۔ ہدو خاں و حسو خاں شکر خاں کے برادرِ حقیقی مکھن خاں کے پوتے تھے۔ ہدو خاں اور حسو خاں کی تعلیم اپنے والد قادر بخش کے علاوہ محمد خاں سے بھی ہوئی۔ یہ محمد خاں امیر خسرو کے شاگردوں کے سلسلے میں سے تھے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ہدو خاں و حسو خاں، محمد خاں کے شاگرد ہونے سے پہلے بھی اُن سے بہت متاثر تھے، لہٰذا گوالیار گھرانے کی گائیکی سدا رنگ کی گائیکی اور محمد خاں کی گائیکی کا ایک مجموعہ ہے

اگر صرف سدارنگ کے سلسلے کو دیکھا جائے تو یہ بھی معمولی نہیں ہے، اس سلسلے میں بہت بڑے بڑے فن کار پیدا ہوئے ہیں۔ مثلاً ان کے شاگرد بہادر خاں جن کی اولاد اور شاگردوں میں بڑے بڑے فن کار پیدا ہوئے جیسے ' غازی خاں، نظر علی، زین العابدین خاں، اچپل میاں، رام باغ علی بھاؤ والے، ترمبک راؤ گوڈ بولے، تان رس خاں، امین خاں مظفر خاں اور مہادیو بوا گوکھلے، فتح علی خاں پٹیا والے، جرنیل علی بخش پٹیالہ والے وغیرہ وغیرہ۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ان لوگوں کی گائیکی اور گوالیار گائیکی میں بڑی مماثلت ہے۔

اب تک ہم نے گوالیار کے ضمن میں آگرہ گھرانے کے کسی فرد کا نام نہیں لیا۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اکبری دربار میں ایک حاجی سجان بڑے مشہور دھرپدیے تھے۔ ان کی چوتھی پشت میں ۱۸۰۰ء کے قریب ایک گھگّے خدا بخش ہوئے جن کی آواز ان کے بزرگوں گھرانے میں گانے کے لائق نہیں تھی۔ یہ ناراض ہو کر گھر سے نکل گئے اور نتھن پیر بخش سے (جن کو شکر خاں مکھن خاں کے استاد ماموں غلام رسول قوال نے تعلیم دی تھی) خیال کی تعلیم حاصل کی۔ خدا کی عنایت سے آواز بھی ٹھیک ہو گئی اور ایسا گاتے کہ لوگوں کو رُلا دیا۔ اس طرح خیال آگرہ گھرانے میں پہنچا۔

خدا بخش گھگّے کے لڑکے غلام عبّاس خاں ہوئے جن کے نواسے فیّاض خاں صاحب تھے جن سے سب ہی واقف ہیں۔ یہ سلسلہ بھی گوالیار سے علیحدہ ہے۔ اور بھی کئی گھرانے خیالیوں کے ہیں۔ مثلاً کیرانہ گھرانہ، جو گوالیار گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے، لیکن سب سے زیادہ بڑا اور پھیلا ہوا گھرانا گوالیار ہی ہے۔

کرشن موہن

غزل

دُنیا تو آخر دُنیا ہے، کوسے گی الزام دھرے گی
اپنے چاہنے والوں کو بھی نرموہی بدنام کرے گی

میرا من تھا کتنا چنچل، اندھیارے کو سمجھا کاجل
دھیان کہاں تھا عقل کی مایا پلکوں کی چھایا سے ڈرے گی

ایسا وقت بھی آنے کو ہے جس میں اُجیارا جیتے گا
پریت کی نرمل جوت جلے گی، نفرت اپنی موت مرے گی

مست پون چلتی ہے بن بن، گلشن گلشن، آنگن آنگن
پیار بھرا ہے اس کا جوبن، پیار کیا ہے پیار کرے گی

پیار کی جوت ہو تیرے اندر، تو سارا سنسار ہے مندر
بِرہن دھوپ بھی کومل چھایا بن کر تیرے من کو ہرے گی

اس بَیری سنسار میں کچھ دن پیار کا اک اوتار آیا تھا
جس کے برہ میں سُندر رچنائیں ٹھنڈی آہیں بھریں گی

جس کا تن تھا موہت بھوگی، جس کا من تھا رمتا جوگی
اک البیلا شاعر جس کو دنیا برسوں یاد کرے گی

"آج کل" دہلی

صالحہ عابد حسین

لکشمی

"نام؟"

"لکشمی"

"کتنے دن کا ہے؟"

"تین مہینے کا"

"بچے کے باپ کا نام"

"باتی — ایک ہو تو بتاؤں۔"

لہجے کی تلخی اور جملے کی کاٹ اس کے دماغ میں جا کر چبھ گئی۔ گھبرا کر اس نے سامنے دیکھا، اُسے لگا مُرجھایا پھول، ٹوٹے کھنڈر، کچلا حسن زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی ہے۔ اس عورت کے چہرے کی معصومیت کو معصیت نے دبا لیا تھا۔ گمان جیسے ہونٹوں پہ لاتعداد ننھی ننھی لکیریں اور خراشیں پڑی تھیں۔ نتھنے پھڑک رہے تھے۔ آنکھوں سے جیسے چنگاریاں اُمڈ رہی تھیں اور چہرے پہ بیک وقت غم، غصّے، طنز، حقارت، بےبسی اور مجبوری کے جذبات ناچ رہے تھے۔ کبھی یہ عورت، جسے لڑکی کہنا زیادہ صحیح ہوگا، بہت حسین ہوگی۔ مگر اب؟ کوئی گلاب کو دونوں ہتھیلیوں میں مسل کر پھینک دے، کوئی تاج محل کو مسمار کر دے، کوئی مڈونا کی تصویر پہ گندے رنگ اُچھال دے؟ لکشمی کے حسن کو بھی اسی طرح مسخ کر دیا گیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ نیم باز آنکھوں سے جنہیں گھنی سیاہ پلکوں نے ڈھک رکھا تھا ایسے زہریلے تیروں کی باڑھ نکل رہی تھی کہ اُسے اپنے سارے جسم میں سوئیاں سی چبھتی محسوس ہونے لگیں۔

اپنی پانچ سالہ مدّتِ ملازمت میں اسے ایسے کئی کیسوں سے سابقہ پڑا تھا جو سماج کی ٹھکرائی، کسی درندے کی ہوس کا شکار یا اپنے جذبات کی رَو میں بہہ کر حماقت سے اس گندے ماحول میں آ پھنسی تھیں جسے سماج اپنے جسم کا پھوڑا سمجھتا، ناسور کہتا ہے مگر اس کا مناسب علاج نہیں کرتا۔ مگر اس لڑکی کے ہونٹوں پہ طنز و حقارت کی جو لہریں، آنکھوں میں غم و غصّہ کا جو طوفان اور سارے وجود پر بےبسی کی سی کیفیت طاری تھی..... ایسے 'کیریکٹر' سے وہ آج تک دوچار نہ ہوئی تھی۔

اُس نے جلدی جلدی کام نبٹا لیا۔ پھر آہستہ سے اُٹھ کر لکشمی کے پاس آئی جو اب اکیلی بنچ پر بیٹھی اُسے گھور رہی تھی۔

"لکشمی بائی — میں تم سے الگ باتیں کرنا چاہتی ہوں .... اپنے گھر کا پتہ ..."

"گھر؟ میرا گھر؟ ہنھ، ہم بدنصیب عورتوں کے گھر نہیں ہوتا مس صاحب — وہ تو تم جیسی خوش نصیب لڑکیاں چھین لیتی ہیں۔"

"لکشمی بائی، تم جہاں کہو وہیں میں تم سے ملنے آ جاؤں گی مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" اس نے غصّے کو دبا کر لہجے کو نرم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

" تم! تم اونچے گھرانے کی پڑھی لکھی لڑکیاں! ان گندی نالیوں میں کیسے پیر دھروگی جہاں ہم جیسے موری کے کیڑے رینگتے ہیں..."

" مگر لکشمی بائی میں جو کہتی ہوں..."

" تم لوگ ہم ابھاگنوں پر اپنی نیکی اور پارسائی کا رعب جماتی ہو۔ پیسہ کمانے کے لئے سوشل سروس کا ڈھونگ رچا کر ہمیں احساس دلاتی ہو کہ دیکھو ہم کتنے نیک، کیسے شریف۔ کتنے بلند ہیں تم سے، پھر بھی کتنے اچھے ہیں کہ تمہیں...."

" بہن مجھ پر بھروسا کرو۔" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ گلا بھر آیا تھا اور آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ لکشمی اُسے دیکھتی رہی.... دیکھتی رہی.... دھیرے دھیرے اُس کے چہرے کا رنگ بدلنا شروع ہوا۔ ہونٹوں کے گوشے کانپے آنکھوں میں آگ کی جگہ پانی نے لے لی۔ خلوص کی دو بوندوں نے اس کے چہرے پر سے ایک خول سا اُتار دیا۔

" بائی — میں یہ نہیں سہار سکوں گی کہ تم جیسی پوتر لڑکی اس کوڑے کے ڈھیر پر پیر دھرے — نہیں نہیں بائی میں تمہیں "اپنا گھر" نہیں دکھاؤں گی۔" کانپ کر اُس نے کہا،

" مگر میرا تو یہ کام ہی ہے لکشمی بہن — میں تو ایسے محلوں میں جایا ہی کرتی ہوں۔"

" تم نے مجھے بہن کہا! بہن!! آہ تو بہن۔ بہن کا یہ حال کیسے دیکھ سکے گی؟"

" اچھا تم کل میرے گھر آجانا۔"

" تمہارے گھر؟ جہاں تمہارے ماں باپ، بھائی بہن ہوں گے؟" اُس کی آواز میں ایسی حسرت، ایسا درد تھا جیسے کلیجہ چیر کر نکال رہی ہو — " تمہارے پاک مقدس گھر میں میرے گندے پیر — نہیں نہیں بائی — مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے کسی کی ہمدردی نہیں چاہیئے — مجھے کسی سے کوئی بات کرنا نہیں ہے یہاں سب خود غرض ہیں — وحشی ہیں — درندے — بے درد — ظالم — ہوس پرست...."

وہ چیخ رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ رہی تھی۔ یہاں تک کہ تھک کر بنچ پر گر پڑی۔ دیکھا تو بے ہوش تھی۔

اُسے موقع مل گیا۔ اسپتال کے جنرل وارڈ میں اسے داخل کرا دیا۔ منتظموں کی خوشامد کی کہ اس سے فی الحال کچھ پوچھ گچھ نہ کی جائے۔ نرسوں کی منت سماجت کی کہ اُس کا خاص خیال رکھیں اور ڈاکٹر سے کہا کہ اُسے نیند اور سکون کی ایسی دوا دے کہ وہ آٹھ دس گھنٹے آرام سے سو جائے۔

مگر جب وہ یہ سب کچھ کر کے گھر کی طرف جا رہی تھی تو اُس کا سر بھاری، جسم شل اور دل بے چین تھا۔ گھر پہنچ کر نہ اماں ابا سے باتیں کیں نہ چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ ہنسی کھیلی نہ اچھی طرح کھانا کھایا۔ رات کو دیر تک تو سو ہی نہ سکی۔ جب بہت دیر بعد آنکھ جھپکی تو بھیانک خواب دیکھتی رہی۔ ایک بار اس نے دیکھا کہ ایک عورت جس کے جسم پر گندے پھوڑے ہیں اور کیڑے رینگ رینگ کر زمین پر پھیل رہے ہیں اس کے برابر کھڑی ہے۔ وہ ڈر کر پرے ہٹتی ہے تو عورت بھیانک قہقہہ لگا کر کہتی ہے — " بچے کے باپ کا نام — ایک ہو تو بتاؤں — ایک ہو تو بتاؤں —" اور پھر اپنا منہ اس کے منہ کے قریب کر دیتی ہے۔

اس نے چلانا چاہا مگر لگا جیسے کسی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ رکھا ہے۔ ایک گھٹی ہوئی چیخ اُس کے گلے سے نکلی۔ عورت کی صورت خود اس جیسی تھی۔

اماں گھبرا کر اٹھ بیٹھیں — " کیا ہوا بی بی — ڈر گئی کیا؟ آ میرے پاس آجا۔"

اور جب وہ اماں کے سینے پر سر رکھ کر لیٹی تو لکشمی کا دھیان کر کے اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اگلے دن گیارہ بجے تک وہ اسپتال میں اپنے منصبی کاموں میں اُلجھی رہی۔ کئی کیس تھے۔ کسی کا یہیں اسپتال میں داخلہ کرانا تھا۔ ایک کو چھوت کی بیماریوں کے اسپتال میں داخل کرنے کا انتظام کرنا تھا۔ ایک اپریشن کا کیس تھا۔ وہ ان کاموں میں لگی تھی مگر اس کے ذہن میں لکشمی ہی کا خیال پورے وقت رہا۔

اور جب وہ سب کام نپٹا کر اوپر کی منزل میں لکشمی سے ملنے کے لئے چلی تو اس کا دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے کسی بچھڑی سہیلی سے مدّت بعد ملاقات ہونے والی ہو۔

اس نے آہستہ سے پردہ ہٹایا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں صرف دو پلنگ تھے جن میں سے ایک اس وقت خالی تھا۔ کھڑکی کے برابر کے پلنگ پر صاف ستھرے بستر پر گلے تک سفید چادر سے اپنا جسم ڈھانکے لکشمی لیٹی ہوئی تھی۔ سر ڈھلک کر تکیے سے نیچے آگیا تھا۔ نفرت، وحشت اور دکھ کے سیاہ سائے اس وقت اس کے خوابیدہ پُرسکون چہرے سے بہت دُور تھے۔ ہاتھی دانت کے سے زردی مائل سفید چہرے پر سیاہ پلکوں کا سایہ اور رچی بھویں کتنی بھلی لگ رہی تھیں۔ گمان جیسے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔ پھر پلنگ کے پاس پڑے اسٹول پر بیٹھ کر اس کا ایک نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلانے لگی۔

لکشمی نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف دیکھا پھر بند کر لیں۔ جیسے خواب سمجھ رہی ہو۔ ذرا دیر بعد گھبرا کر پھر آنکھیں کھول دیں۔ حیران حیران نظروں سے ہر طرف دیکھا، ہاتھ سے آنکھوں کو ملا۔ پھر نگاہیں آکر اس پر ٹک گئیں۔ نگاہیں جن میں حیرانی، اجنبیت، درد اور محبت کے رنگ یوں ملے جلے تھے جیسے آسمان پر قوس قزح کے رنگوں کا امتزاج جن کو پہچانا جا سکتا ہے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اور پھر لکشمی نے اپنی دونوں باہیں پھیلا دیں ' دیدی' اور وہ جھک کر اس کے گلے سے لپٹ گئی جیسے مدّتوں کی بچھڑی بہنیں مل گئی ہوں اور ان دونوں کے بیچ ذات، پات، مذہب، نسل، ماحول، سماج، طبقے، نیکی اور بدی کی جو دیواریں کھڑی تھیں وہ خود بخود مسمار ہو گئیں۔

اور لکشمی کی بپتا سن کر وہ سناٹے میں رہ گئی۔ اس نے گناہ کے گڑھے میں گری بہت سی عورتوں کی کہانیاں سنی تھیں جن میں کچھ حماقت کا شکار رہی تھیں، کچھ ہوس پرستی کی بھینٹ چڑھی تھیں، کچھ مفلسی کی ماری تھیں، کچھ کے رنگے سیار شوہروں نے انھیں روپیہ کمانے کی مشین بنا رکھا تھا — اور یہ سب سن سن کر وہ غصّے سے لرز لرز اُٹھی تھی۔ مگر لکشمی کی داستان نے تو اس کے دل و دماغ کو شل کر دیا۔ اُف، دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے؟ باپ خود اپنی معصوم بیٹی کو یوں بھینٹ چڑھا دے۔

اُس کا پاک دیس! تہذیب و تمدّن کا یہ گہوارہ، روحانیت کا مامن، امنِ عالم کا علم بردار، ہزاروں سال کی سنسکرتی پہ نازاں، اُس کا یہ پیارا، یہ مقدّس دیس — اب بھی یہاں ایسی وحشت ناک رسمیں موجود ہیں؟ اب بھی رواج اور مذہب کے نام پر ایسے کھیل کھیلے جا سکتے ہیں؟ اُس کا جی چاہتا تھا کسی بات کا یقین نہ کرے۔ مگر لکشمی مجسّم اس کے سامنے تھی۔ وہ کیسے اپنے کو دھوکا دے؟

لکشمی کا ایک ایک لفظ اُس کے دل پر نقش تھا۔

" دیدی کیوں پوچھتی ہو، کون ہوں؟ کہاں کی ہوں؟ بس یہی سمجھ لو کہ اسی بمبئی کی کسی گندی نالی میں جنم ہوا ہوگا۔ یہاں ہی پل کر جوان ہوئی ہوں گی جہاں ہر روز ایک نئے مرد سے رشتہ جوڑتی ہوں۔ ہزاروں ان بدبخت بیسواؤں میں سے مجھے بھی سمجھ لو جن کو بھانت بھانت کے مردوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ رنگ رنگ کے، طرح طرح کی زبانیں بولتے مرد، وحشی، اجڈ، گنوار، جاہل مرد اور مہذّب، تعلیم یافتہ، فیشن پرست مرد، خدا جانے کہاں کہاں کے مرد — دور دور دیسوں سے آئے غیر ملکی — سبھی آتے ہیں اور ہم جیسی بدبختوں سے دل بہلا کر چلے جاتے ہیں۔ یوں سمجھو دیدی، ہم ایسی بنجر زمینیں ہیں جن پر کوئی نرم دل کسان ہل چلا کر بیج نہیں ڈالتا، لہلہاتی کھیتی کی تمنّا نہیں کرتا بلکہ ہوس کے بندے، ظلم و ستم کے پھاوڑے چلا کر ہمارے ذہن، جسم، دل اور دماغ کو روندتے گزر جاتے ہیں اور مڑ کر نہیں دیکھتے — میں نہیں جانتی دیدی یہ بدنصیب جان جو میری کوکھ میں پل رہی ہے۔ کب، کیسے، کہاں سے آئی؟ یہ بدنصیب معصوم روح — جس کا کوئی باپ نہ ہوگا — کوئی گھر نہیں

ہوگا۔ کوئی عزت نہیں ہوگی — آہ — جس کا اپنا کوئی دیش بھی نہ ہوگا۔"

پھر وہ تکیے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

لیکن وہ آج ارادہ کرکے آئی تھی کہ لکشمی کی کہانی سن کر اس کے دل کا بوجھ ذرا ہلکا کرکے اور ہو سکا تو اُس کی بہتری کی کوئی صورت نکال کر ہی واپس جائے گی۔ اور آخر وہ کئی گھنٹے صرف کرنے کے بعد اس کوشش میں کامیاب ہوئی۔ اگرچہ جب شام ڈھلے وہ واپس اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی تو اپنے دل کا سکون لٹا چکی تھی۔ اُس تیس سالہ کنواری شریف نادی کو اُس دن یہ محسوس ہوا تھا جیسے اُس کی اپنی بیٹی اس کیچڑ میں دھکیل دی گئی ہو۔

بڑی کوشش کرکے میں نے اپنے ماضی کو جھلایا ہے۔ اُن ناموں کو ذہن سے کھرچا ہے جنھوں نے مجھے جنم دیا تھا۔ اُس علاقے کو بھولی ہوں جہاں کی سوندھی پوتر مٹی میں گھروندے بنا کر بچپن بتایا تھا۔ دیدی میں بھول جانا چاہتی ہوں کہ کبھی میرا اپنا کوئی سندر گاؤں تھا جس کی سہانی رُت میں، پیڑوں کی چھایا میں، میں نے سکھیوں کے ساتھ جھولے ڈالے تھے۔ میں اُن پھولوں کی بو باس یاد کرنا نہیں چاہتی جن کو بالوں میں سجاتی تھی، اُن ندیوں کی جھنکار جن کے آئینے میں اپنے حسن کی بہار دیکھ کر لوٹ پوٹ ہو جاتی تھی، اُن پنچھیوں کے مدھر چہچہے اور کلکاریاں جن کو سن کر سپنوں کے دیس بسانی تھی — ہاں ہاں میں نہیں یاد کرنا چاہتی۔ اپنی پانچوں بڑی بہنوں کا لاڈ پیار، اُس ابھاگن ماں کی ممتا جو مجھے سب سے زیادہ چاہنے کا ڈھونگ رچاتی تھی۔ اس پاپی باپ کے کنرے کی سواری جس سے مجھے آتنا پریم تھا اور جس کی بدولت آج بھی اس حال کو پہنچی ہوں۔ اس ننھے منے بھائی کی موہنی صورت جس کے جنم لینے کی قیمت ایک کنواری، پوتر کنیا کی لاج سے چکائی گئی ... دیدی — دیدی میں بھول گئی تھی اپنے پریمی کی وہ پریم بھری نگاہیں، وہ شہد جیسے بول، وہ مضبوط توانا جسم اور اس کی وہ ڈینگیں کہ وہ اپنی لچھمی کے لئے ساری دنیا کو چھوڑ سکتا ہے، ساری دنیا سے ٹکر لے سکتا ہے .... میں اپنے کو یہ یقین دلاتی رہی ہوں کہ وہ کوئی سپنا تھا، میرے تخیل نے کوئی افسانوی دنیا گھڑی تھی — مگر ہائے، یہ پاپی من — یہ تو کبھی نہ مانا۔ ہاں دیدی، یہ سب باتیں کبھی ٹھوس حقیقت تھیں — اسی سورگ میں تمہاری بدنصیب لکشمی نے اپنا بچپن اور نوجوانی کا سندر دور گزارا تھا۔

"اپنے وطن کا نام نہ بتاؤں گی۔ سارے جہان کی رسوائیاں سہار کر بھی میں اس پیاری پوتر سرزمین کا نام بدنام نہیں کرنا چاہتی جہاں میں نے جنم لیا تھا۔ ہائے یہاں سے بہت دور، مہاساگر کے کنارے، کھجور اور تاڑ کے پیڑوں کی چھایا میں میرا سندر گاؤں اب بھی وہاں کی معصوم کنواریوں کی سورگ بنا ہوگا —

"بڑا اونچا، بڑا پرانا پریوار تھا ہمارا — چاند سورج سے ناتا جوڑنے والا، بڑی پرانی رسمیں اب بھی وہاں موجود تھیں۔ پھر بھی میرے باپ نے اپنی لڑکیوں کو دیسی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی پڑھوائی — شاید اس لئے کہ بیاہ کے بازار میں اونچی قیمت لگ سکے۔

"ایک کے بعد ایک، ایک ایک دو دو سال کے وقفے سے ہم چھ بہنیں پیدا ہوئیں۔ میں سب سے چھوٹی تھی۔ میرا باپ ہر بار بیٹے کی آس لگاتا، تیاریاں کرتا، مرادیں مانگتا، اور ہر بار مایوس ہو کر غصے سے پاگل ہو اٹھتا جس کا خمیازہ میری گائے جیسی بے زبان ماں کو بھگتنا پڑتا۔ بیٹا جو لوک پرلوک میں اُس کی نجات کرائے گا اُسے نصیب نہ ہوا اور بیٹیاں یہاں بھی نرک ہے اور شاید وہاں بھی نرک ہی نصیب ہو۔ ایک کے بعد ایک آتی چلی گئیں۔ وہ دعائیں اور دوائیں کرتا رہا مگر میرے بعد ماں کی کوکھ ہری نہ ہوئی۔

"اور آخر اس نے نیا بیاہ رچا لیا۔ ساٹھ برس کے بڈھے کو دولت کے بل پر پندرہ برس کی کنیا مل گئی۔ اب تک وہ سب باتوں کے باوجود اپنی بیٹیوں کو بہت چاہتا تھا۔ مگر اب — اب نئی بیوی کے چاؤ چونچلوں اور بیٹے کی تمنا میں وہ سب کچھ بھول گیا

گو کئی سال گزر گئے۔ نئی ماں کے کوئی بچہ نہ ہوا۔ باپ منتیں مرادیں اور زیادہ کرتا گیا۔ اور پھر — پھر . . . . . "

اُس کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کر وہ لرز اٹھی۔

" ایک بار یہ سب کہہ ڈالو لکشمی تو تمھارے دل کو سکون مل جائے گا۔ "

" سکون ؟ میرے دل کو سکون ؟ پاپوں میں گلے گلے ڈوبی ہستی کو تو شاید تمھارا بھگوان بھی سکون نہ دے سکے۔ "

دکھ بھری ہنسی کے ساتھ اُس نے کہا اور خلا میں اس انداز سے تکنے لگی جیسے اُسے کچھ نظر آرہا ہو۔

" آخر نئی ماں کا پاؤں بھاری ہوا۔ باپ کی خوشی اور بدحواسی کی انتہا نہ تھی۔ کہیں اس بار بھی جنم جنم کی بیری ، بیٹی نہ جنم لے اسی فکر میں وہ گھلا جارہا تھا — اور اکثر اس نے کچھ ڈھونگی لوگوں کے سکھانے سے ایک بہت پرانی رسم کو تازہ کرنے کی منت مانی — بیٹے کے پیدا ہونے پر اپنی سب سے قیمتی ، سب سے سندر ، سب سے پیاری شے ، بھگوان کو بھینٹ کرنے کی - سینکڑوں سال پہلے اس کے پریوار میں یہ رسم موجود تھی۔ پھر اب کیا ہرج تھا اس کو کرنے میں بھلا ؟ جانتی ہو وہ شے کیا تھی ؟ -- باپ کے بیٹا ہوا۔ ماں دن رات روتی ، بہنیں گھبرائی گھبرائی نظر آتیں۔ مگر میں بہت خوش تھی۔ ننھا سا پیارا سا پیدا ہوا تھا نا ؟ کیا جانتی تھی کہ یہ بھیا نہیں کالا ناگ ہے جو مجھے ڈسنے آیا ہے . . . .

" اور بھیا کے نام رکھنے کی شبھ گھڑی کے سمے باپ نے اپنی سب سے پیاری سب سے سندر بھینٹ چڑھادی۔ وہ مجھے سب سے زیادہ چاہتا تھا نا تو پھر بھگوان کے چرنوں میں کوئی گھٹیا شے کیسے بھینٹ کرتا ؟ میں سب بہنوں میں سب سے سندر بھی تو تھی بدنصیب۔

" سجا بنا کر — ہزاروں اینڈی بینڈی رسمیں کرنے کے بعد ، حیران پریشان چودہ برس کی الھڑ ، نادان چھوکری کو ، ایک پرانے کھنڈر کے راکھشس صورت کھوسٹ مرد کے سامنے لے جا کر مجھے بھینٹ کر دیا گیا۔

" آہ دیدی — آج -- اس حال کو پہنچ کر بھی - وہ شرمناک اور بھیانک گھڑی نہیں بھول پائی ہوں -- میں روئی ، چیخی ، چیخی ، چلائی ، سب کو مارا کاٹا ، اس راکھشس کو تو نیم جان ہی کر دیا۔ مگر کبھی سنا ہے تم نے کہ بھیڑیوں میں گھری ہرنی ان سے جیت پائی ہو۔

میرے باپ کو غیرت نہ آئی ، میری ماں نے ڈوب کر گلو خلاصی نہ کیا ، میرے منگیتر کا خون نہ کھولا ، میری بہنوں نے شرم سے جان نہ دے دی ، آسمان نہ پھٹا ، زمین نہ دھنسی !

" پھر ایک دن میں وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی - اور جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتی ، کیا کچھ سہتی یہاں تمھارے بمبئی پہنچی عزت کی روٹی - محنت کی کمائی ایسی جوان ، ایسی حسین اور پھر ایسی بدبخت کے نصیب میں کہاں نہ تھی — مگر خوب جگہ ہے یہ تمھارا بمبئی بھی . . . . یہاں ہر چیز کا سودا ہوتا ہے ، ہر شے کا بیوپار - یہاں عورت کی قیمت ایک ، دو روپیہ بھی لگتی ہے اور ہزاروں لاکھوں بھی — اور تمھاری یہ ابھاگن لکشمی ہر قیمت پہ بکی - اس کی لاج کے سودے کا لابھ ہمیشہ بیچ کے آدمی نے اٹھایا ہے - اس کے دکھ ، شرم کا پہاڑ میں نے جھیلا ہے - پر آج سے پہلے کسی نے یہ نہ پوچھا تھا کہ تو کون ہے ؟ کیوں کر یہاں آپھنسی ؟ کیا تیرا کوئی مرتا جیتا نہیں ، جو یوں اپنا تن ، جوانی ، اپنی صحت اور لاج بیچتی پھرتی ہے۔

" ہائے دیدی یہ سب مرد ایک سے ہوتے ہیں - لچھمن میرا عاشق ، میرا منگیتر لچھمن ، اس نے بھی تو مجھے ٹھکرا دیا جب میں اس نرک سے بھاگ کر نکلی تو سب سے پہلے اس کے پاس تو گئی تھی - مگر وہ مجھے دیکھ کر ایسا گھبرایا ، یوں بھاگا جیسے میں کوئی چھوت کی بیماری ہوں - دوسروں کے پاپوں کی سزا اس نے مجھے دی - اُس کے ہم جنسوں کے کرتوتوں کا بدلہ خود اس نے مجھ سے لیا دیدی — یہ ممتا — یہ پریم — یہ نیکی - بدی ، ماں باپ سب جھوٹ ہے - جھوٹ ہے دیدی — جھوٹ ہے -- "

وہ سر جھٹک کر جھوٹ ہے، کی گردان کرتی رہی - اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے، مٹھیاں بھنچ گئی تھیں - منہ سے جھاگ اُڑ رہا تھا۔

اس نے لکشمی کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور زبردستی لٹا کر اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگی - دھیرے دھیرے وہ سنبھلی، اور پھر اُس کے سینے میں منہ چھپا کر ننھے بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

اور وہ اُسے تھپکے جا رہی تھی — "بس بس اب چپ ہو جاؤ — شاباش - کیسی اچھی بچی ہے میری لچھی بیٹی — ہاں اب ہم اپنی لچھی کو نرس کی ٹریننگ دلوائیں گے — اور پھر یہ وہ اسپتال میں کام کرے گی - مریضوں کی خدمت، دُکھیوں کی سیوا میں وہ اپنا سارا دکھ درد بھول جائے گی - اور ہاں پھر مُنا آئے گا - اور وہ مزے سے اپنے بچے کے ساتھ رہا کرے گی۔ اور جب میں اُس کے پاس جایا کروں گی تو خوب میری خاطر کیا کرے گی اور ہم تینوں مل کر خوب کھیلیں گے - خوب کھیلیں -- خوب ہنسیں گے .... اور نہیں تو کیا....."

جانے کتنی دیر تک وہ اپنی گری، مدھر، دھیمی آواز میں یہ لوری سناتی رہی — پھر جو جھک کے دیکھا تو لکشمی گہری میٹھی نیند کی آغوش میں تھی - شرم، دکھ، غم اور غصّے کے سیاہ بادل چھٹ گئے تھے اور ننھے بچّے کی سی معصومیت اور مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔

وہ جھکی - ایک گہرا بھرپور بوسہ اس نے لکشمی کے چاند جیسے ماتھے پر ثبت کیا تو اس کی آنکھوں سے کئی تارے ٹوٹے اور لکشمی کے چاند جیسے ماتھے پر پھسل پڑے۔

دوارکا داس شعلہ

غزل

کبھی تو چمن در چمن زندگی | کبھی محض رنج و محن زندگی

اجل در اجل ہم کو جینا پڑا | رہی ہے کفن در کفن زندگی

ہو جدّت کی تخلیق کیوں کر، اگر | نہ دے مہلتِ دم زدن زندگی

کبھی روح فرسا عفونت، اگر | کبھی رشکِ مشکِ ختن زندگی

کبھی بد مذاقی کی آئینہ دار | کبھی اَوجِ اعجازِ فن زندگی

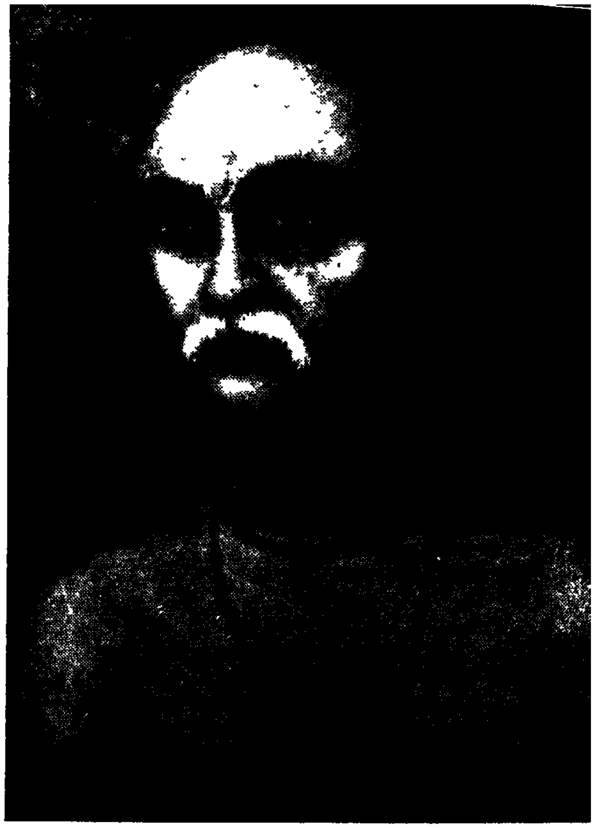
کبھی باعثِ ذلّتِ ہر نفس | کبھی راحتِ جان و تن زندگی

کبھی مژدۂ سرفرازی مگر | کبھی جاں فگن دل شکن زندگی

کبھی اس کی گردان بس تو ہی تو' | کبھی حاصلِ ما و من زندگی

کبھی عیش و عشرت تو شعلہ کبھی
سزاوارِ دار و رسن زندگی

شمالی ہندوستان کے قدیم موسیقار



سوامی ہری داس



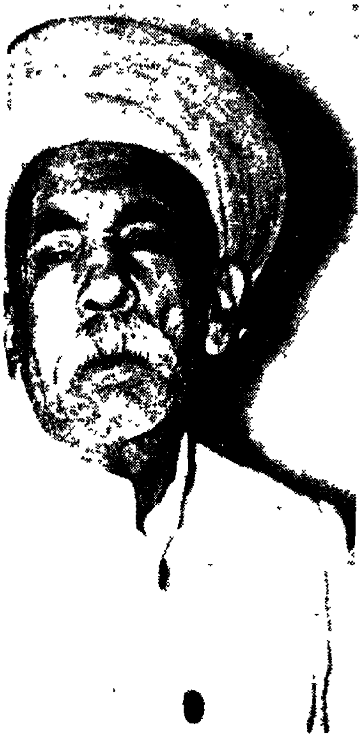
تان سین

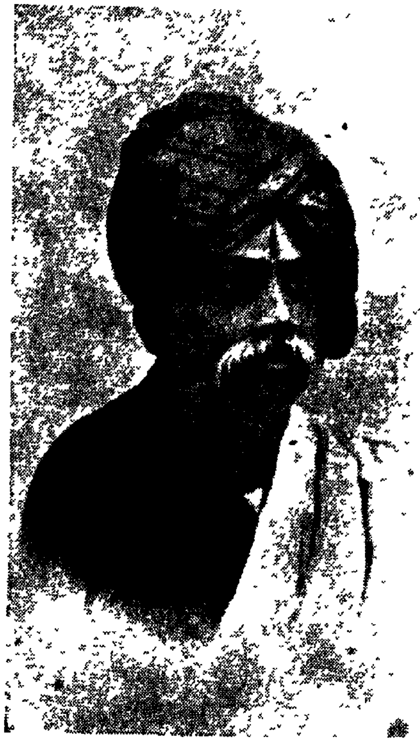
بیجو باورا

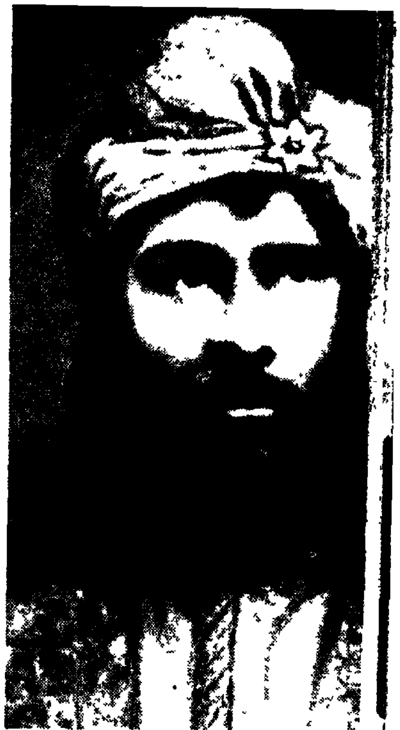


مصری سنگھ عرف نوبت خاں





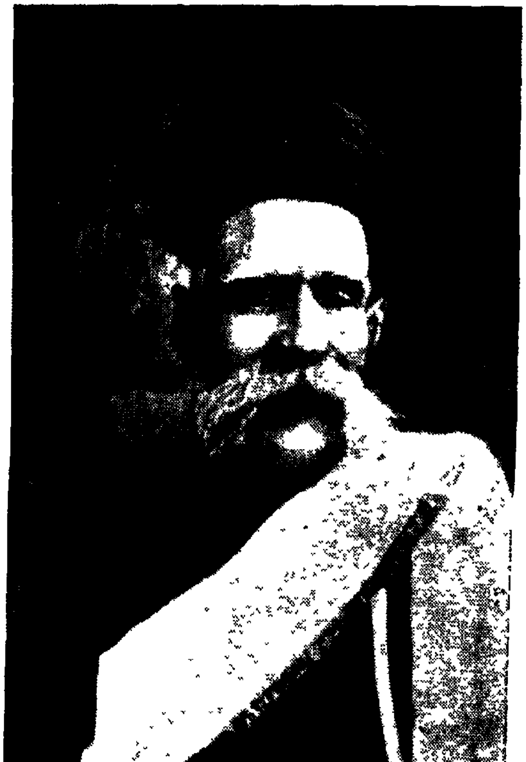




راجہ بھیا پونچھ والے

پنڈت گنڈولوآ
انگلے اونڈھار

ت خاں



بال کرشن بوآ

ہندوستا

رحمت خاں





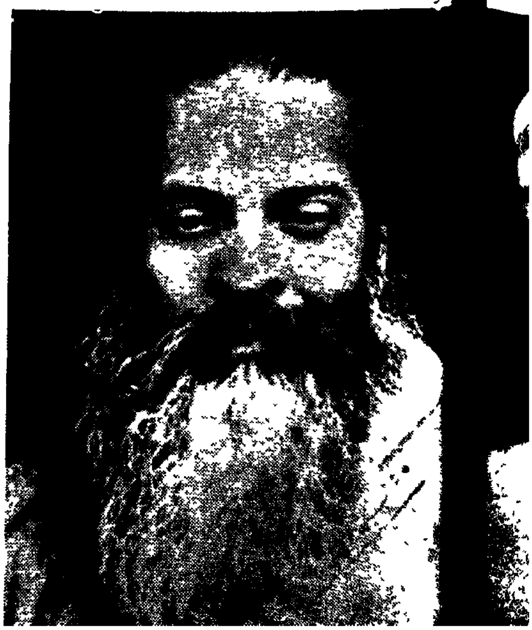




یشونت سداشیو
براشی بو

اللہ دیا خاں

ان شہور موسیقار



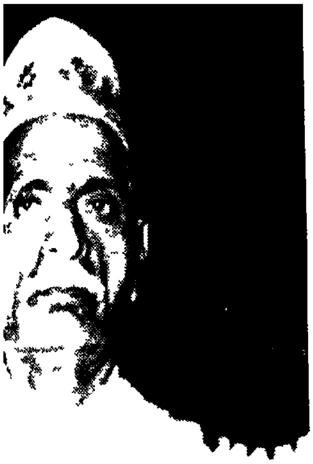
وشنو ڈگمبر پلسکر



بھاسکر راؤ آباکھلے



اننت منوہر جوشی



کرشنا راؤ شنکر پنڈت



مشتاق حسین خاں

امیر خاں



اونکار ناتھ ٹھاکر



پُرانے کرداروں کی کہانی

<u>دھرتی</u>

ہزاروں برس تک
یہ پھیلا ہوا آسمان
پانیوں سے بھرے بادلوں سے گھرا
تلملاتا رہا
اور زمیں اپنے سینے پہ پھیلے ہوئے
کالے سایوں میں ٹھنڈی ہواؤں کے پُر زور جھونکوں کو
محسوس کرتی رہی

تیرگی

از زمیں تا فلک
ایک ڈائن کی مانند
دھرتی کے پیڑوں کی ہریالیوں کو چباتی رہی
نیلگوں آسمانوں کی میٹھی سی لذت اُٹھاتی رہی

اور سورج

چپ، سرخ لاوے کو اپنے بدن میں سمیٹے رہا
یہ زمیں ابس خموش اور حیرت زدہ
سوچتی ہی رہی

میرا دشمن سمندر!
مجھے خود میں ضم کرنے کی آس میں
کس قدر باؤلا ہو گیا ہے

اُسے

میری ہریالیاں نوچ کر کیا ملے گا بھلا؟
اور وہ سورج کہاں ہے؟

مرا دیوتا!
جو مجھے تیاگ کر جانے کن رہگذاروں پہ
دل کا سکوں ڈھونڈتے ڈھونڈتے کھو گیا ہے

سمے

جس نے بے رحم بن کر مری مانگ سے سرخیاں چھین لیں
جانے کس کے ارادوں کی شمعیں بجھانے کی دُھن میں
گرفتہ رہو گا

برستے ہوئے بادلو! — اور برسو!
یہاں تک کہ ساتوں سمندر کا پانی مری چھاتیوں پہ گرا دو
کہ خود کو
میں ہر آنے والی مصیبت میں اُلجھانے کی سوچتی ہوں

کہ ممکن ہے اے سورج

مرا دیوتا!

جو مری دھڑکنوں میں بسا ہے ازل سے

مرے دُکھ سے لاچار ہو کر گرے

اور مرے جسم کو اپنے آغوش میں بھر کے جادو بھری

لذّتیں بخش دے

اور اونچے درختوں، جواں پربتوں، نیلے پانی کی جھیلوں

کو اس اوّلیں روشنی سے مِلا دے

کہ جس کی تمنّا میں یہ سالہا سال سے

تیرگی کے سمندر میں ڈوبے رہے ہیں

گنواتے رہے ہیں جوانی کے پُرنور لمحوں کا جادو

لٹاتے رہے ہیں نظاروں کی خوشبو

(۲)

یونہیں دیر تک

یہ زمیں بَین کرتی رہی

آنسوؤں سے بدن اپنا دھوتی رہی

دُکھ پروتی رہی

پھر بھی بادل

سمندر کا پانی لیے، لاکھوں صدیوں تلک، بے رُکے

اُس پہ یلغار کرتے رہے

پھر زمیں چپ رہی

اس کی آنکھوں کا پانی بھی اب منجمد ہو گیا

وہ کہاں ہے؟

اُسے سدھ یہ جاتی رہی

دل ہی دل میں یونہی بلبلاتی رہی

اور بادل مسرت سے، بجلی کی چلمن کے پیچھے کھڑے

مسکراتے رہے

اور کہیں وقت نے آنکھ کھولی، تو چاروں طرف

تیرگی کا سمندر تھا پھیلا ہوا

وہ اُٹھا

دُور تک اس نے ڈالی نظر

اور تیزی سے اپنے پُرانے سفر پر روانہ ہوا

اور افق سے پرے

زرد سورج نے آواز دی

اے زمیں

میری من موہنی

آ تجھے میں گلے سے لگا لوں

تری مانگ بھر دوں میں کرنوں کے سیندور سے

اور پہنا دوں تجھے

دھوپ کی اوڑھنی

میری من موہنی!

(۳)

تب زمیں

نیند سے ایک انگڑائی لے کر اُٹھی

اور سورج نے جھک کر اسے گرم کرنوں کا بوسہ دیا

ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں نے خوش ہو کے شہنائیاں چھیڑ دیں

پربتوں پر چمکتا ہوا نرم سونا بکھرنے لگا

اور درختوں کی شاخوں سے لپٹے ہوئے

سبز پتّے بھی سیٹی بجانے لگے

اور اسی لمحہ

پھولوں کے آغوش خوش رنگ میں

ساعتِ وصل میں

پہلا انساں زمیں پر اُتر آ گیا

اپریل ۱۹۶۵ء

وقت

اُسے پربتوں نے بلایا
اسے ساگروں نے صدا دی
بلند آسمانوں پہ ہنستے ہوئے چاند تاروں نے
اس کے بدن پر چمکتی ہوئی نرم چاندی کا ابٹن مَلا
چاند نے اس کی راہوں کو روشن کیا
آبشاروں نے مستی بھرے گیت گائے
رگوں میں تھا اس کی لہو موجزن
وہ اُٹھا
اور ستاروں کی چھاؤں میں ہر خوف سے بے خبر
اپنی اَن جانی منزل کو پانے کی دھن میں روانہ ہوا
راہ سے پربتوں کو ہٹاتا ہوا
اونچے، لمبے درختوں، گھنی جھاڑیوں، تیز کانٹوں میں
رستہ بناتا ہوا
گنگناتا ہوا
پھر کہیں پیڑ کی ٹہنیوں میں چھپا، چاند آیا نظر
رکھ کے پتھر پہ سر
نرم سبزے کی چادر پہ وہ سو گیا
چاند کو دیکھ کر
خواب میں کھو گیا

(۲)

اس نے دیکھا کہ اک باغ کے کنج میں
شاخِ گل کے تلے
پھول سے شوخ، نازک، چہکتا ہوا
چاند سے بھی حسیں جسم
اپنی اداؤں میں کھویا ہوا
تھوڑا جاگا ہوا
تھوڑا سویا ہوا
روبرو اس کو پاکر کے بل کھا گیا
شاخِ گل کی طرح
چار سو ایک خوشبو سی بکھرا گیا
اور اچانک کہیں زرد سورج نے اس کو یہ آواز دی :
اے زمیں کے خدا
تیرے خوابوں کا یہ مسکراتا بدن
یہ مہکتی کرن
ایک سایا ہے ہنستے ہوئے پھول کا
تو اسی سائے سی
ہُو بہُو
مسکراتی ہوئی کوئی صورت بنا
اور اپنی خدائی کا
پھیلی ہوئی اس زمیں کو
انوکھا سا جادو دکھا

(۳)

اور اسی لمحے
جب آنکھ اس کی کھلی
کوئی ٹہنی نہ تھی
کوئی سایہ نہ تھا
ایک وہ تھا سراسیمہ - حیرت زدہ
ایک رستہ تھا دشوار - کانٹوں بھرا
ایک اَن دیکھی منزل دکھاتا ہوا
دُور جاتا ہوا —

انسان

سال ہا سال تک
وہ تڑپتا رہا
ذہن میں بس رہی تھی جو صورت
وہ سورج کی گرمی کی خواہش میں بے چین تھی
سال ہا سال سے

اور اس نے کئی بار
چمکیلے پہاڑوں کی اونچی، جواں چوٹیوں سے کہا :
مجھ کو چکنا، بدن رنگ کا
کوئی پتھر دلا دو
مگر کوئی آواز آئی نہیں
صرف جھونکے ہواؤں کے آتے رہے اور جاتے رہے
پھر اچانک کسی دن
سمندر نے اس کو یہ پیغام بھیجا :
کہ چمکیلے پہاڑوں کے آغوش میں
کوئی بھی ایسا پتھر نہیں ہے
کہ جس سے
تمہارے تصور کی خواہش مٹے
اور تم کب تلک اس خموشی میں گم سم سے بیٹھے رہو گے ؟
اٹھو !
اور میری تہوں میں پڑے
پتھروں کو ٹٹولو
تمہیں ایک دن ایسا پتھر یقیناً ملے گا
مگر یہ حقیقت بھی کتنی عجب ہے
کہ جب وہ
سمندر میں اترا
تو پتھر تو لاکھوں پڑے تھے وہاں پر
مگر ویسا پتھر کہیں بھی نہیں تھا
جو وہ چاہتا تھا
ہزاروں برس تک
وہ موجوں کے سینے پہ سر رکھ کے روتا رہا

(۲)

پھر اچانک کسی دن
بلند آسمانوں نے آواز دی
پربتوں، ساگروں سے تمہیں کیا ملے گا ؟
ادھر آؤ — تم کو یہاں ایسے لاکھوں
بدن رنگ، چکنے سے پتھر ملیں گے
مگر وہ وہاں سے بھی ناکام لوٹا

(۳)

تو اس نے زمیں سے کہا :
ماں !
اگر تیرے آغوش میں
کوئی چکنا، بدن رنگ پتھر نہیں ہے
تو مجھ کو ہی تو شاپ دے کر
بدن رنگ پتھر بنا دے
کہ ممکن ہے، لاکھوں برس بعد
اس راہ سے
کوئی مجھ سا ایسا فنکار گزرے
تو مجھ کو
لگن سے تراشے
مری سوچ، میرے تصور کو ایک
جاوداں حسن بخشے

غلام احمد فرقت کاکوروی

مولانا مظہر الحق

ہماری آزادیٔ وطن کی تاریخ میں آپ کو بہت سی ایسی کوہِ نور جیسی سیاسی ہستیاں ملیں گی جن کی کسی زمانہ میں سیاسی، علمی اور اخلاقی بصیرت کی لوگ قسمیں کھاتے تھے اور جن کی حب الوطنی، حرّیت پرستی اور صداقت کے ایک زمانہ میں ڈنکے پٹے ہوئے تھے مگر افسوس کہ زمانہ کے سرد و گرم نے انھیں ایک ایسی تاریک فضا میں پھینک دیا کہ آج ان کے کارنامۂ نمایاں کو ٹٹول ٹٹول کر منظرِ عام پر لانا پڑتا ہے انھیں سورماؤں اور مجاہدینِ وطن میں ایک سب سے بالا و برتر ذات بہار کے مجاہدِ وطن مسٹر مظہر الحق بیرسٹر کی تھی۔

ان کے جدِ امجد داؤ نگر ضلع مظفر پور کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا قاضی رمضان علی صاحب نے چھپرے میں آ کر نیل کا ایک بہت بڑا کارخانہ قائم کر لیا تھا اور یہ کاروبار ان کو ایسا راس آیا کہ انھوں نے چند ہی سال کے اندر اندر چھپرہ میں عالیشان کوٹھیاں اور عمارتیں کھڑی کر لیں اور ان کا شمار چھپرے کے رئیسوں میں ہونے لگا۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف جب سازش کی اور اس جرم کا انکشاف ہوا تو انھیں پا بزنجیر برہنہ پا انگریز کمشنر ٹیلر نامی کے روبرو پیش کیا گیا۔ اس زمانہ میں ایسے لوگوں کو عموماً پھانسی کی سزا دے دی جاتی تھی مگر خدا جانے انھوں نے کس ذہانت سے اپنے مقدمہ کی پیروی کی کہ سزا تو علیحدہ رہی انھیں بجائے پھانسی دئے جانے کے چھپرا کا انچارج بنا دیا گیا کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے ـــــ چھپرہ میں وہ چھ ماہ تک اس عہدہ پر مامور رہے۔ مسٹر مظہر الحق کے والد کی شادی اپنی خالہ زاد بہن سکینہ بیگم سے ہوئی تھی جو قاضی مہدی صاحب کی لڑکی تھیں۔ مسٹر مظہر الحق تین بھائی بہن تھے۔ ان کے نانا اور ماموں پٹنہ کے مشہور اور نامور حکیم تھے۔ ۲۲ دسمبر ۱۸۶۶ء کو مسٹر مظہر الحق موضع بہپورہ تھانہ منیر ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے ۱۸۷۶ء میں پٹنہ کالجیئٹ اسکول میں داخل ہوئے اور ۱۸۸۶ء میں انھوں نے وہاں سے میٹرک پاس کر کے ۱۸۸۷ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ لکھنؤ کی فضا اس زمانہ میں چونکہ شعر و ادب میں رچی بسی تھی اس لئے زمانۂ طالب علمی میں انھیں شعر و ادب سے بھی دلچسپی رہی۔ افسوس ہے کہ ان کا اس دور کا کوئی مضمون یا شعر اب کہیں نہیں ملتا۔ مگر بعض لوگوں کا بیان ہے کہ وہ خود بھی فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔

۱۸۸۸ء میں گھر سے اجازت لئے بغیر سید علی امام اور حسن امام کے ساتھ ولایت کو روانہ ہو گئے۔ مگر چونکہ روپیہ پیسہ پاس نہ تھا اس لئے ایک مہینہ کے لئے عدن میں ٹھہر گئے اور جب والد نے انھیں روپیہ بھیجا تو لندن روانہ ہو گئے۔ اتفاق سے اسی جہاز میں مہاتما گاندھی بھی لندن جا رہے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں بے حد دوستی ہو گئی لندن پہنچ کر انھوں نے بیرسٹری کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان بھی سیکھ لی۔ ۱۸۹۱ء میں جب بیرسٹری پاس کر کے ہندوستان آئے تو ایک انگریز جوڈیشل کمشنر یو۔پی نے انھیں صفی پور ضلع اناؤ میں

منصف مقرر کردیا۔ وہاں کے دو ڈھائی سال کے قیام میں وہ حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب کے مُرید ہو گئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ مگر اس کے بعد ہی انھوں نے منصفی کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور چھپرہ میں آکر بیرسٹری شروع کردی اور تھوڑے ہی عرصہ میں یو۔پی کے مشرقی اضلاع اور اتری بہار کے نامور بیرسٹروں میں شمار کئے جانے لگے۔ اسی دوران میں جب چھپرہ میں ایک زبردست قحط پڑا تو وہاں کے لوگوں کی آپ نے ایسی مدد کی کہ آج تک لوگ ان کا دم بھرتے ہیں۔

۱۹۰۰ء میں فرید پور ضلع سارن میں بیالیس بیگھہ زمین خرید کر ایک باغ لگایا اور وہیں ایک بنگلہ تعمیر کرایا جس کا نام آشیانہ رکھا۔ یہ آشیانہ ایک زمانہ تک بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں کی جائے رہائش اور مہمان خانہ بنا رہا۔ کہتے ہیں کہ چھپرہ میں جو میونسپل بورڈ قائم ہے اس کے بانی مسٹر مظہر الحق ہی تھے۔ ۱۹۰۵ء سے انھوں نے ملکی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ پٹنہ میں سر علی امام اور حسن امام صاحب کے ہمراہ بیرسٹری کرتے رہے اور بہت جلد بہار کے مشہور بیرسٹروں اور قومی رہنماؤں میں شمار کئے جانے لگے۔ اس زمانہ میں مسٹر مظہر الحق کی جرح کے بارے میں لوگ کہا کرتے تھے کہ جس مقدمہ کی مسٹر حسن امام اور علی امام پیروی کر رہے ہوں اور مسٹر مظہر الحق اس میں جرح کریں کسی حاکم کی مجال نہیں جو مقدمہ کا فیصلہ ان کے خلاف کردے۔ ۱۹۰۹ء میں بہار میں آپ ہی کی کوشش سے کانگریس کمیٹی قائم ہوئی جس کا نائب صدر آپ کو منتخب کیا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں آپ کو امپیریل لیجسلیٹو کونسل کا ممبر منتخب کیا گیا اور ۱۹۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے آپ نے طویل دورے کئے۔ ۱۹۱۲ء میں جب بانکی پور کانگریس کا ستائیسواں سالانہ اجلاس ہوا تو مجلس استقبالیہ کے آپ ہی صدر منتخب ہوئے۔

جس زمانہ میں آپ لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے اس زمانہ میں صرف تین ہی ہندوستانی ایسے تھے جن کی تقریریں ولایت کے اخبارات میں شائع ہوتی تھیں اول مسٹر گوکھلے، دوسرے پنڈت مدن موہن مالویہ اور تیسرے مسٹر مظہر الحق۔ جب طرابلس اور بلقان کی جنگ ہوئی تو انھوں نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں ایسی شعلہ انگیز تقریریں کیں کہ ملک بھر میں ان کی دھوم مچ گئی۔

۱۹۱۳ء میں جب کانپور کی مچھلی بازار والی مسجد کا واقعہ پیش آیا تو آپ پہلے شخص تھے جو بیرسٹروں کا ایک جھنڈ لے کر گرفتار شدگان کی پیروی کرنے کانپور پہنچ گئے۔ جو مشہور لوگ ان مقدمات کی پیروی کرنے کے لئے مسٹر مظہر الحق لے گئے تھے ان میں سر راس مسعود، عبدالمجید خواجہ، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر ناظر حسن خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان مقدمات کے سلسلہ میں مسٹر ٹیلر سے جو اس زمانے میں کانپور کا کلکٹر تھا آپ کی بڑی سخت بات چیت ہوئی۔ اُن کی اس طرح پر مقدمہ کی پیروی اور تقریروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے رہنے والوں میں انگریزوں سے نفرت اور حقارت کا جذبہ حد درجہ بڑھ گیا۔ اس کے بعد حالت یہ ہو گئی کہ ہندوستان کے ہر قومی معاملہ میں یا مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی ہر تحریک میں وہ پیش پیش رہے اور ان کی وجہ سے پٹنہ دو چار سال تک مسلم پالیٹکس کا ایک مرکز بنا رہا۔

۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں جب وقار الملک مرحوم نے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تو اس کا سارا کا سارا کانسٹی ٹیوشن وقار الملک کی موجودگی میں مسٹر مظہر الحق نے پٹنہ میں بیٹھ کر بنایا۔ اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں جب کانگریس کا اجلاس پٹنہ میں ہوا تو مسٹر مظہر الحق کو اس کی مجلس استقبالیہ کا چیئرمین منتخب کیا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں مسٹر مظہر الحق مسلم لیگ کے بمبئی کے اجلاس کے صدر منتخب ہوئے وہاں انھوں نے اپنا وہ معرکۃ الآرا خطبہ صدارت پڑھا جسے سن کر انگریزی حکومت کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ لارڈ ولنگڈن جو اس زمانہ میں بمبئی کے گورنر تھے انھوں نے انتہائی کوشش کی کہ بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس کانگریس کے ساتھ نہ ہو مگر انھیں کامیابی نہ ہوئی اس زمانہ میں سر وزیر حسن مسلم لیگ کے سیکرٹری تھے۔ چناں چہ سر وزیر حسن اور مسٹر جناح اس کے لئے

تیار نہ ہوئے۔ انگریزوں نے یہ دیکھ کر بمبئی میں مسلمانوں کی ایک جماعت مسلم لیگ کے مقابلہ میں کھڑی کر دی اور اس جماعت کے ارکان نے مسلم لیگ کے اجلاس میں جاکر ہنگامہ بپا کرنے کی کوشش کی اور بڑا اودھم مچایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں سے اجلاس ملتوی کرکے تاج محل ہوٹل میں کیا گیا۔ ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ کے اجلاس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان آزادیٔ وطن کے معاملہ میں اتحاد ہو گیا ———

۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں گاندھی جی چمپارن جانے کے مقصد سے پٹنہ تشریف لے گئے اور وہاں مسٹر مظہر الحق ہی کے مہمان ہوئے اور انھیں کے صلاح و مشورہ سے چمپارن جاکر انھوں نے اپنا کام شروع کیا۔ چمپارن میں گاندھی جی کی یہ تحریک ہی ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی بنیاد تھی اس میں مسٹر مظہر الحق کا مشورہ ہر ہر قدم پر شامل رہا۔ جب مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے سلسلہ میں مسٹر مظہر الحق امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے تو وہاں پہنچ کر انھوں نے ایسی دھواں دھار تقریریں کیں کہ وطن کا گوشہ گوشہ بیدار ہو گیا۔

پھر رولٹ ایکٹ کو حکومت برطانیہ نے ہندوستانیوں کے ایما کے خلاف جبریہ پاس کرایا تو مسٹر مظہر الحق نے کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۱۹ء میں کلکتہ میں کانگریس کا اجلاس ہوا تو مسٹر مظہر الحق اس میں پوری سرگرمی سے شریک ہوئے۔ وہ تاریخی اجلاس تھا جس میں مہاتما جی نے پہلی بار کانگریس کا ترنگا جھنڈا لہرایا۔ ۱۹۲۰ء میں جب مہاتما جی نے عدم تعاون کی تحریک پیش کی تو مسٹر مظہر الحق بلا چوں و چرا اس میں کود پڑے اور انھوں نے اپنی اعلےٰ ترین بیرسٹری اور آرام دہ رہائش ترک کرکے بانکی پور سے کئی میل دور ایک کچے بنگلہ میں مقیم ہو گئے۔ عدم تعاون کی تحریک کا ایک بنیادی پروگرام یہ تھا کہ ان اسکولوں اور کالجوں سے طلباء ہٹا لئے جائیں جو سرکاری ہیں یا جنھیں حکومت سے امداد ملتی ہے۔ مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ بہار میں قومی کالج (راشٹریہ مہاودیالیہ) قائم کیا جائے۔ انھوں نے وہ سات آٹھ ہزار روپے بھی جو بہار میں جمع کئے گئے تھے مقامی رہنماؤں کے حوالے کر دئے۔ چنانچہ ۵۔ جنوری ۱۹۲۱ء کو بہار نیشنل کالج کے نام سے ایک دار العلوم قائم کر دیا گیا۔ اس کے امیر جامعہ یعنی وائس چانسلر مسٹر مظہر الحق اور نائب امیر جامعہ بابو برج کشور پرشاد مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں ایک تاریخی واقعہ کا ذکر بھی ضروری ہے جسے ڈاکٹر راجندر پرشاد آنجہانی نے اپنی کتاب 'آتم کتھا' میں بھی لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :-

"بہار اسکول آف انجینرنگ کے وہ طلبا مسٹر مظہر الحق کے پاس پہنچے جنھوں نے عدم تعاون کی تحریک کے سلسلہ میں کالج چھوڑ دیا تھا اور انھوں نے کہا کہ ان کے لئے مناسب سامان مہیا کیا جائے۔ حق صاحب ان رہنماؤں میں نہیں تھے جو صرف کاغذ پر تجویزیں پیش کرنا اور پلیٹ فارموں پر تقریریں کرنا ہی جانتے ہیں۔ وہ ایک سپاہیانہ حوصلے کے آدمی تھے جو صرف عمل پر اعتماد رکھتا ہے۔ اس لئے انھوں نے فوراً اپنی آراستہ و پیراستہ عالیشان قیام گاہ 'سکندر منزل' چھوڑ دی اور ان طلباء کو ساتھ لے کر پٹنہ دانا پور روڈ پر دیگھا کے ایک باغ میں چلے آئے اور وہاں کچھ جھونپڑیاں کھڑی کی گئیں۔ پھول لگائے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک کٹی (آشرم) قائم ہو گئی۔ مظہر الحق نے اس قیام گاہ کا نام صداقت آشرم رکھا۔ جو اُس وقت سے اِس وقت تک قائم ہے۔ یہاں انھوں نے طلباء کو چرخے پر سوت کاتنے کی تعلیم دی اور خود زمین پر چٹائی بچھا کر لیٹنا شروع کر دیا۔"

اس کے کچھ عرصہ بعد انھوں نے 'مدر انڈیا' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ منظور لشیر مشرا کو مدراس سے بلا کر اس کا نائب ایڈیٹر مقرر کیا اور خود اس کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اس میں ایسے بلند پایہ مضامین اور انگریزی حکومت پر ایسی زبردست تنقیدیں ہوتی تھیں کہ حکومت کے ایوان اس سے کانپتے تھے۔

چناں چہ چند ماہ کے اندر اندر اخبار کی اشاعت اور شہرت اتنی بڑھی کہ حکومت کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔ یہ اخبار آٹھ صفحات پر ہوتا اس کی ایک آنہ قیمت تھی اور صداقت آشرم پریس سے چھپتا تھا۔ چنانچہ حکومت نے اسے بند کرنے کے لئے فوراً ایک بہانہ کھڑا کر دیا اور کرنل بناٹ والا انسپکٹر جنرل جیل کے ذریعہ ایک فوجداری استغاثہ داخل کرا دیا۔ جب مقدمہ چلا تو مسٹر مظہر الحق نے نہ اس میں جرح کی اور نہ حصہ لیا۔ مگر ان کے ہمراہ مظفر پور کے ایک کانگریسی ملزم اور تھے جنھوں نے بیرسٹر اور وکیل مقرر کئے اور مقدمہ کی پیروی شروع کی۔ یہ مقدمہ بکسر جیل کے واقعہ سے متعلق تھا جہاں کی سو سیاسی قیدیوں نے بھوک ہڑتال کر دی تھی۔ یہ کانگریسی صاحب بھی اس وقت جیل میں تھے تو انھوں نے سرچ لینڈ میں صحیح واقعات لکھ دیئے۔ چناں چہ اس واقعہ کی تحقیق کے لئے پٹنہ کے کمشنر کو مقرر کیا گیا، جنھوں نے جا کر جیل کا معائنہ کیا اور سیاسی قیدیوں کا بیان بھی لیا۔ انھوں نے تحقیقات کے بعد اعلان کیا کہ کوئی بھوک ہڑتال ہی نہیں ہوئی۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر سید محمود بھی سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل میں علیحدہ قید تھے۔ جب ڈاکٹر محمود نے واقعہ کی تصدیق کی تو کمشنر صاحب نے کہا کہ میں ڈاکٹر صاحب کو جھوٹا نہیں بتاتا مگر چونکہ ڈاکٹر صاحب عام قیدیوں کے ساتھ نہیں تھے اور علیحدہ تھے اس لئے ان کو اس واقعہ کی کیا اطلاع ہو سکتی ہے۔ اس موقع پر پبلک پراسیکیوٹر نے چار روز تک ڈاکٹر محمود پر جرح کی۔ مجسٹریٹ اس درمیان میں بار بار پبلک پراسیکیوٹر کو اجلاس کے باہر لے جاتا تھا اور کہتا تھا کہ تم جرح کر کے مقدمہ کو اور خراب کر رہے ہو۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ بکسر جیل کے راشن کے رجسٹروں کو بدل دیا گیا اور جس زمانہ میں بھوک ہڑتال تھی اس زمانہ میں بھی راشن کی پوری تقسیم دکھا دی گئی۔

اس کے بعد اخبار اسٹیٹس مین میں ایک خبر شائع کی گئی کہ بمبئی سنٹرل خلافت کمیٹی کا سارا روپیہ غبن ہو گیا ہے اور وہاں سرکاری آڈٹ تک نہیں ہوا۔ اس کا مقصد صرف خلافت کمیٹی کو بدنام کرنا تھا۔ چناں چہ اس رپورٹ کے چھپنے پر سارے ہندوستان میں ایک سنسنی پھیل گئی۔ گورنمنٹ کو بے حد خوشی ہوئی کیونکہ اس زمانہ میں خلافت تحریک اور کانگریس کمیٹی ساتھ ساتھ چل رہی تھیں چناں چہ جب مقدمہ چلا تو ڈاکٹر سید محمود سنٹرل خلافت کمیٹی کی ساری فائلیں اور سامان دو گاڑیوں میں لے کر عدالت پہنچے اور انھوں نے ایک ایک فائل کا معائنہ کرایا۔ اس پر پبلک پراسیکیوٹر کے حواس گم ہو گئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید محمود اس سارے دفتر کو لے کر کلکتہ گئے اور وہاں عام پبلک کو دکھانے کے لئے کہ جو کچھ اسٹیٹس مین نے شائع کیا تھا وہ محض کانگریس اور خلافت کو بدنام کرنے کے لئے تھا اور وہ سارا ریکارڈ اور رجسٹر عوام کو دکھائے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد کو اسٹیٹس مین کو اپنے بیان کی تردید کرنا پڑی اور معافی مانگنا پڑی مگر مسٹر مظہر الحق کو حکومت نے معاف نہیں کیا اور ان پر ایک ہزار روپیہ جرمانہ کیا اور عدم ادائیگی جرمانہ پر تین ماہ کی قید رکھی۔ چونکہ مسٹر مظہر الحق نے جرمانہ دینے سے صاف انکار کر دیا اس لئے انھیں جیل بھیج دیا گیا جہاں ان کو چارپائی تک نہ دی گئی۔ جیل میں زمین پر سونے کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہو گئی اور وہ سخت بیمار ہو گئے۔ جب ان کی بیماری کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی اور عوام میں ہیجان پیدا ہونا شروع ہوا تو حکومت نے پولیس مجسٹریٹ بھیج کر ان کے گھر کی تلاشی کرائی۔ گویا

خود قتل بھی کرے ہے خود لے ثواب الٹا

اور گھر کی تلاشی لیتے وقت زبردستی ان کا بکس توڑ کر ایک ہزار روپیہ جرمانہ کا نکال کر انھیں چھوڑ دیا۔

جہاں تک ان کے ذاتی کردار کا تعلق ہے وہ بلا کے ذہین تھے۔ کسی شخص کو دیکھ کر اس کی اگلی پچھلی صلاحیتوں کا اندازہ کر لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چناں چہ ڈاکٹر راجندر پرشاد آنجہانی نے "آتم کتھا" میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ،

" صداقت آشرم میں ایک نہایت ذہین اور فطین طالب علم آیا۔ اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر مسٹر مظہر الحق اس کو بہت ماننے لگے۔ مگر ایک دن اسے اس الزام میں

نکال دیا کہ وہ فرقہ وارانہ باتیں کرتا ہے جو حق صاحب کے سیاسی نصب العین کے خلاف اور آشرم میں نظم و ضبط اور تصوّر و دعوت کے منافی تھا۔ لوگوں نے حق صاحب سے سفارش کی کہ وہ اسے معاف کر دیں مگر انھوں نے کسی کی بات نہ مانی اور اپنے فیصلہ پر بدستور قائم رہے۔ انھوں نے اس لڑکے کے بارے میں یہ قطعی رائے قائم کر لی تھی کہ وہ آگے چل کر فرقہ وارانہ فسادات کا محرک اور بانی ہوگا۔ چناں چہ اس طالب علم کو آشرم چھوڑ دینا پڑا۔ آگے چل کر اس لڑکے نے اتر پردیش میں اور کئی جگہوں پر فرقہ وارانہ فسادات کرائے۔"

آخری ایام میں مسٹر مظہر الحق ایک سفید لمبی داڑھی سے مزیّن اور سادہ اُجلے کرتہ پائجامہ میں ملبوس ایک صوفی یا درویش کی ہیئت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ان کی درویشی اس حد تک متجاوز ہو گئی تھی کہ انھوں نے اپنے کو سارے دفاتر، اعزازات، عہدوں اور مجالس سے کنارہ کش کر لیا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس گوہاٹی سیشن کے لئے ان ہی کا نام پیش ہوا تھا۔ مسٹر بی۔ الف بھروچہ نے بمبئی کرانیکل مورخہ ۱۲ جولائی ۱۹۲۶ء میں لکھا تھا۔

"گیا کانگریس ہی کے وقت میں نے مستقلاً فیصلہ کر لیا اور اہل بہار کے ساتھ سیاسی دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی ہندوستانی ایک افسر اعلیٰ کی حیثیت سے مہاتما گاندھی کا قائم مقام اور جانشین ہو سکتا تھا تو وہ مسٹر مظہر الحق تھا۔ . . . . .
آج مظہر الحق وہ فیشن ایبل حق نہیں جو ۱۹۱۵ء کا تھا۔ وہ فقیر ہے، آہنی عزم و عمل کا انسان ہے، اسے بہار کے سارے ہندوؤں اور مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہے۔ تمام ہندوستان کے مسلمان اس کا احترام کرتے ہیں۔ اگر مظہر الحق کا انتخاب عمل میں آتا ہے تو مستقبل قریب میں ہندو مسلم اتحاد ایک یقینی امر ہو جاتا ہے۔ میں سارے اختلافات کے باوجود عرض کروں گا کہ ملک کی موجودہ حالت کے پیش نظر آنے والے سال کا صدر پھر دوبارہ گاندھی جی کو منتخب کیجئے۔ اور اگر وہ انکار کرتے ہیں تو فرید پور کے فقیر آہنی عزم و عمل کے انسان اور ہندو مسلم اتحاد کے پیغامبر مظہر الحق کو صدر منتخب کیجئے۔

مگر چونکہ مسٹر مظہر الحق نے شرکت سے مطلقاً انکار کر دیا تھا اس لئے سری نواس آئینگر صدر چنے گئے۔

اسی طرح ڈاکٹر پٹابھی سیتا رمیہ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب 'انڈین نیشنل کانگریس' میں ان کی درویشانہ زندگی سے متاثر ہو کر لکھا ہے:

"ان کی قوم پروری کی پاکیزگی، ان کی درویشانہ روش کی وجہ سے ممتاز اور فائق ہو گئی تھی جس نے لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی اور انھیں عام طور سے ہندوستانی عوام اور خاص طور سے اہلِ بہار کی نظر میں محبوب اور محبوب بنا دیا تھا۔ انھوں نے عمر کا آخری حصہ نہ صرف ایک خلوت نشیں کی حیثیت سے بلکہ ایک تارک الدنیا سچّے فقیر کی صورت میں گزارا۔"

اپنے لندن کے دورانِ قیام میں انھوں نے ایک 'انجمنِ اسلامیہ' قائم کی جو بعد میں ترقی کر کے 'پان اسلامک سوسائٹی' کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی خودداری اور انصاف پسندی کا اندازہ آپ اس سے بھی کر سکتے ہیں کہ انھیں اعلیٰ درجہ کے گلاب کے پھول اور عمدہ نسل کے کتّے پالنے کا بڑا شوق تھا اور وہ اس کی وفاشعاری اور خدمات کے گرویدہ تھے اور اس پر خاصا روپیہ صرف کرتے تھے۔ چناں چہ غیر ملکی کتّوں کی کئی جوڑیاں ان کے یہاں پلی ہوئی تھیں۔ گویا انگریزوں کے مقابلہ میں وہ یورپ کے کتّوں تک کو پسند کرتے تھے۔ چناں چہ ایک مرتبہ ایک انگریز جوڈیشل کمشنر نے جن کے ماتحت وہ اس وقت صفی پور ضلع اناؤ میں منصف کی حیثیت سے کام کر رہے تھے گرے ہاؤنڈ کا ایک جوڑا مانگ لیا۔ حق صاحب نے نہ صرف یہ کہ اس کے دینے سے انکار کر دیا بلکہ اپنے افسرِ اعلیٰ کو ملامت بھی کیا اور کہا کہ یہ بات ایک بڑے افسر کے شایانِ شان نہیں کہ وہ ندامت اور سبکی محسوس کئے بغیر اپنے

کسی ماتحت کے سامنے کسی معاملہ میں دستِ سوال دراز کرے۔ ایک افسر جو اپنے ماتحت سے ایک دن کچھ مانگ سکتا ہے وہ دوسرے دن پھر کچھ اور بھی مانگ سکتا ہے۔ انگریز جوڈیشل افسر اور وہ بھی اپنے ایک ماتحت ہندوستانی سے اس قسم کا جواب سننے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ چنانچہ بظاہر تو وہ خاموش ہوگیا مگر وہ حق صاحب کا بدترین دشمن ہوگیا۔ حق صاحب بھی اس چیز کو تاڑ گئے اور عزتِ نفس کی خاطر انھوں نے اپریل ۱۸۹۶ء میں منصفی کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

۲ جنوری ۱۹۳۰ء کو فرید پور میں بعارضہ فالج ان کا انتقال ہوگیا اور آشیانہ کے دکھنی کونہ پر اپنے باغ میں دفن ہوئے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اکبر علی خاں

ایک مشہور ترین شعر — استفادہ یا توارد

اردو کے چند شاعر ایسے بھی ہیں جن کی شہرت کا قصر اُن کے کسی ایک ہی شعر کی بنیاد پر قائم ہے۔ مثال کے طور پر:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

یا
شہر کے لڑکوں کی بر آئی مراد
بند سے دیوانہ رہا ہو گیا

یا
انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

یا
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

یا
آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

ان میں سے پہلا شعر راجہ رام نرائن موزوں، دوسرا نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رام پور، تیسرا میاں ذکریا شاہ نظام رام پوری، چوتھا ثاقب لکھنوی اور پانچواں سراج لکھنوی کا ہے۔ یہ پانچوں شعر بڑے مقبول و معروف شعروں میں سے ہیں۔ اگر ان کا سارا کلام مفقود ہو جائے تب بھی صرف ان اشعار کی شہرت کی وجہ سے موزوں، ناظم، نظام، ثاقب اور سراج کو کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان حضرات کے باقی ماندہ کلام میں خوب سے خوب تر کی جستجو نہیں کرنا چاہیئے۔ خصوصیت سے نواب ناظم کے پیش نظر تو یہ کہنا بہت ہی غلط ہوگا اس لیے کہ غالب و مومن کے عہد میں اگر کسی شخص نے بلند پایہ شعری مواد تخلیق کیا ہے تو وہ ناظم کی ذات تھی۔ اگرچہ ان کی یہی خوش گوئی ان کے حق میں مُضر بھی ہو گئی۔ چناں چہ آج تک جب کہ ان کے کلام پر غالب کی اصلاحات کو شائع ہوئے عرصہ گزر چکا ہے لوگوں کو علیٔہ غالب کا شک گزرتا ہے۔

خیر تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اردو کے ایسے ہی مشہور اشعار میں سے ایک مشہور ترین شعر یہ بھی ہے ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا[1]

---

[1] اس غزل کے بقیہ اشعار یہ ہیں:

قفس لے اڑوں میں ہوا اب جو سنکے — مدد اتنی اے بال پرواز دینا
کرے دل کا بیوپار کیا ان سے کوئی — بصد شوق لینا بصد ناز دینا
نہ خاموش رہنا مرے ہم صفیرو — جب آواز دوں تم بھی آواز دینا
کوئی سیکھ لے دل کی بے تابیوں سے — ہر انجام میں رنگِ آغاز دینا

دلیلِ گرانباریٔ سنگِ غم ہے
مَتیٰ ٹوٹ کر دل کا آواز دینا

دیوانِ صفی (ص ۱۳۰-۱۳۱)

اس شعر کے کہنے والے لکھنؤ اسکول کے آخری دور کے نمایندہ شاعر مولانا صفی مرحوم ہیں۔ ان کی استادی خلاقی اور مشاقی سے انکار ممکن نہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے یہی ایک شعر بہت ہے۔ اردو شعر و سخن سے جس شخص کو ذرا سا بھی مس ہوگا اس نے یہ شعر کبھی نہ کبھی ضرور گنگنایا ہوگا۔ یہ شعر اپنے اندر بڑی دل کشی اور جاذبیت رکھتا ہے اور اس کے پڑھتے پڑھتے کچھ عجیب سی رنگینی دل و دماغ پر چھانے لگتی ہے۔ اس شعر کے الفاظ نے جتنی کامیابی سے ایک خاص قسم کا ماحول بنایا ہے اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ شاعر نے ان الفاظ کے پردے میں آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک جہانِ معنی چھپا دیا ہے جس کا حسن اظہار میں نہیں صرف محسوس کرنے میں ہے۔ ذرا سوچئے کہ غزل جیسے نازک احساسات و جذبات کی حامل الفاظ کی ایک موج کو شاعر نے کس کی آواز کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ وہی ہے جس کے بارے میں مومن نے کہا تھا کہ:

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

یعنی غزل چھڑے اور وہ بھی دیپک جیسی تان رکھنے والی غیرتِ ناہید کے لبوں سے طلوع ہو تو پھر شاعر کا یہ مطالبہ کتنا برمحل اور حق بجانب ہو جاتا ہے کہ اسے ساز دیا جائے اور اگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی آرزو کرے کہ اس کی عمرِ رفتہ اسے لوٹا دی جائے تو کیا یہ انصاف پر مبنی نہ ہوگا۔ اس شعر کے محاسن اور اس کے اندر چھپے ہوئے نہ درنہ نازک جذبات و احساسات کی جو ایک نرم رو رواں دواں ہے اس کا احاطہ تحریراً ناممکن ہے۔

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اردو کے اس مقبول ترین شعر کا مماثل ایک پرانا فارسی شعر بھی ہے۔ ان دونوں شعروں میں اس حد تک مماثلت ہے کہ فارسی شعر کے پہلے مصرع کا قافیہ اور دوسرے مصرع کا نصف سے زائد حصہ اردو شعر میں جوں کا توں رکھ دیا گیا ہے۔ مفہوم بھی قریب قریب یکساں ہے۔ دوست کی موجودگی، اس کی آمد پر ساز کے ذریعے بزم کو طربیہ رنگ بخشنے کی کوشش، عمرِ رفتہ کو لوٹانے کی آرزو، دونوں شعروں کے مشترک اجزا ہیں۔

ان دونوں شعروں کو سامنے رکھ کر یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے کوئی ایک شعر دوسرے کا استفادہ نہیں — بلکہ اس یکسانیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ استفادہ سے سے زیادہ ترجمہ کہا جائے بہرحال توارد کہنا تو قطعاً غلط ہے اس لیے کہ توارد کی صورت میں مضمون ایک ہو سکتا ہے لیکن سارے کا سارا ماحول اور اس کے لوازم حد یہ ہے کہ لفظی پیکر کی بھی نمایاں خصوصیات سرمو نہ بدلیں۔ ایسا ہونا بغیر استفادے کے ممکن نہیں۔ چونکہ فارسی کا شعر ایک ایسے شخص کا کہا ہوا ہے جو اردو شعر کہنے والے سے کئی سو سال پہلے گزرا تھا اس لئے استفادہ کرنے والا اردو شاعر ہی مانا جائے گا فارسی شعر کہنے والا اکبری عہد کا ایک شاعر ملا ابوالہادی قزوینی ہے۔ اس کا ذکر میر علاءالدولہ قزوینی نے نفائس المآثر میں کیا ہے اور انتخاب اشعار کے ذیل میں زیرِ بحث شعر بھی نقل کیا ہے۔ تذکرے کی مکمل عبارت یہاں درج کی جاتی ہے۔

"ہادی مشہور بابوالہادی ست۔ از طبقۂ مجازیۂ قزوین است آبا و اجدادش ہمیشہ اہلِ دانش و کمال بودہ بامر تدریس علوم عقلی و نقلی و فتوی مذہب حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ اشتغال می فرمودند۔ صاحب تاریخ گزیدہ نوشتہ کہ ایشاں از نسل حذیفہ یمانی اند کہ بادشاہ یمامہ بودہ و حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم با و نامہ نوشتہ بودہ، باں اعتبار ایشاں را یمنی می گویند۔ مولانا ابوالہادی نیز تحصیل فضائل نمودہ و آشنائی تمام بعلوم دارد و در فن شعر و موسیقی طبعش ملائم است و نستعلیق نیک می نویسد۔ ایں اشعار را کہ نقش بستہ و مشہور است باں ترنم می نمایند:

مرا گفتی "چو من یارے نداری"
تو ہم چوں من گرفتارے نداری
نباشد غیر آزارِ منت کار
بجز آزار من کارے نداری

شمہ ظاہر آ چہ میرم درد وفا نیست
گرچہ ہادی وفادار سے نزاری

این مطلع نیز از دست

یار مہمانست، اے مطرب، نوائے ساز کن
از برائے رشک عمر رفتہ را آواز کن

در سلخ شوال در عنفوان جوانی سنہ ست و ستین و تسعمائہ (۹۶۶ھ)
در قنوج فوت شد

منہ

پئے عبرت زلیس این حرف، ہمہم، بر مزار من
مرا کشت و نیا بدار پئے تابوت یار من
منم از بعد مردن چشم می بہم کہ شاید بار
دمے یابد چو بیند باز چشم انتظار من
نخواہم ہرگزم از سر بدل رفتی ہوائے او
بیا و بے نیازی گر دہد گردون غبار من"

(نسخہ رام پور ورق ۱۶۵ الف و ب)

مذکورہ بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ہادی کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جس کی علوم و فنون کے میدان میں ایک نمایاں حیثیت تھی اور درس و تدریس کا فیضان بھی اس گھرانے سے جاری تھا۔ یہ خاندان حنفی المذہب تھا اور علوم دینیہ میں مقام افتا پر فائز تھا۔ صاحب تاریخ گلزار نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ وہ حوزہ حنفی کی نسل سے تھا جو بادشاہ یمامہ تھے اور جن کے نام آں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مکتوب مبارک بھی بھیجا تھا۔

خود مولانا ابوالہادی بھی صاحب علم و فضیلت شخصیت تھی اور فن شعر کے ساتھ موسیقی میں بھی دخل رکھتے تھے۔ نیز نستعلیق خوب لکھتے تھے۔ پہلے تین شعروں کو درج کرتے ہوئے صاحب تذکرہ نے یہ بھی بتلایا ہے کہ ان شعروں کی نقش بندی (اصطلاح موسیقی: مطلب دھن۔ لے) بھی خود شاعر نے اپنے آپ کی تھی اور لوگ اسی کے مطابق ان شعروں کو گاتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو شعر بے حد خوب صورت اور دل کش ہے لیکن فارسی شعر کئی پہلوؤں سے زیادہ لطافت اور شکوہ و حسن کا حامل ہے۔ آئیے اس شعر کا تفصیلی جائزہ لیں۔

۱۔ یہاں شاعر نے اپنے محبوب کو زحمت آواز نہیں دی۔ اس کے بجائے دوست کی آمد کے اعزاز میں مطرب کو دعوت نغمگی دی ہے۔

۲۔ یہاں اس نے 'برائے رشک' کہہ کر بھی زیادہ حقیقت پسندانہ اور حسین انداز برتا ہے جو انسانی فطرت سے کہیں قریب ہے۔ وہ عمر رفتہ کو بلاتے ہوئے حسرت بھرا لہجہ اختیار نہیں کرتا نہ وہ اس لیے بلانا چاہتا ہے کہ عمر رفتہ آ کر اسے کچھ عطا کرے گی۔ وہ تو صرف اس لیے عمر رفتہ کو بلانا چاہتا ہے کہ جو چیز عمر رفتہ اسے نہ دے سکی یعنی 'وصل دوست'، وہ اسے اب مدتوں کی تمنا اور ناکامی کے بعد نصیب ہوا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اپنی اس کامیابی پر عمر رفتہ کو جلائے اور رشک کا جذبہ عمر رفتہ میں بیدار کر کے اپنے لیے ایک تسلی اور تسکین کا پہلو نکال سکے۔

عمر رفتہ کو اگر وہ اس پرحسرت لہجے میں پکارتا جو اردو شعر میں شاعر نے اختیار کیا ہے تو دوست کے موجود ہوتے ہوئے بھی ایک طرح کی محرومی اور لذت میں کمی کا احساس باقی رہتا اور اس مسرت کی تکمیل کا انحصار پھر عمر رفتہ کے لوٹ آنے پر ہو جاتا لیکن موجودہ صورت میں کہ وہ اپنی عمر رسیدگی کو وصل دوست کی وجہ سے ایام شباب پر ترجیح دے رہا ہے۔ یہ تکمیل مسرت و انبساط اسے حاصل ہے اور اس کی نظریں عمر رفتہ کی طرف صرف اس لیے اٹھ رہی ہیں کہ وہ اسے شرمندہ اور خجل کر سکے۔

اس ساری گفتگو کے بعد بے خطر کہا جا سکتا ہے کہ مولانا صفی کا شعر خوب صورت اور کامیاب ترجمے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ فارسی شاعری سے اردو کے تقریباً سارے ہی کلاسکی شاعروں نے بہت کچھ لیا ہے اور اردو میں فارسی ماخذ کے مفاہیم و مضامین کو بعینہ ادا کیا جاتا رہا ہے مگر اتنی بھرپور اور مکمل مثال جو ترجمے کے بعد بھی اپنا حسن برقرار رکھتی ہے شاید بہت کم نظر آئے۔

نریش کمار شاد

شانِ نزول

اکبر الٰہ آبادی خواجہ حسن نظامی کے مہمان تھے۔ کھانا کھانے لگے تو خواجہ صاحب کی صاحبزادی حور بانو سے کہنے لگے۔ "بھئی یہ آلو کہاں سے آئے ہیں بڑے اچھے ہیں۔"

حور بانو نے جواب دیا کہ میرے خالو بازار سے لائے ہیں۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد اکبر نے مسکراتے ہوئے فی البدیہہ یہ شعر موزوں کر دیا ؎

لائے ہیں ڈھونڈ کے بازار سے آلو اچھے
اس میں کچھ شک نہیں ہیں حور کے خالو اچھے

جن دنوں جگر مرادآبادی کی اس غزل کا بہت چرچا تھا ؎

وصل سے شاد کیا ہجر سے ناشاد کیا
اس نے جس طرح سے چاہا مجھے برباد کیا

جوش ملیح آبادی بھی جو اصولی طور پر غزل کے مخالف ہونے کے باوجود اسی زمین میں غزل کہنے پر مجبور ہو گئے اور اپنی غزل کا مقطع انھوں نے جگر کے اس مطلع کی ہنسی اڑاتے ہوئے کہا ؎

کچھ نہیں اس کے سوا جوش حریفوں کا کلام
وصل سے شاد کیا ہجر سے ناشاد کیا

بے خود دہلوی جب کسی ریاست میں ملازم تھے تو ایک

رئیس کی محفلِ خاص روزانہ رات کو سجتی تھی۔ شراب کا دور چلتا اور رئیس کی منظورِ نظر طوائف جام بھر بھر کر مقربین کو پیش کرتی۔ ان مقربین میں بے خود بھی شامل تھے۔ پرہیزگار ہونے کے باوجود طوائف سے انکار کرنے کی مجال تو انھیں نہ ہوتی اس سے جام لے لیتے لیکن منہ تک لے جا کر چپکے سے اپنے گریبان میں الٹ لیتے۔ اس دلچسپ صورتِ حال کے پیشِ نظر انھوں نے یہ شعر کہا ؎

بے خود کے لب بھی تر نہ ہوئے وقتِ مے کشی
آلودۂ شراب گریبان ہی رہا

فراق گورکھپوری کی نظر سے جب پہلی بار میکسم گورکی کا یہ جملہ گزرا کہ Our earth is a shining planet

تو بے اختیار انھوں نے یہ شعر موزوں کر دیا ؎

مجھے دکھائے اگر کوئی آنکھ والا ہو
زمیں بھی ایک چمکتا ستارہ ہے کہ نہیں

۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان کے بارے میں یہ اعلان کیا تھا کہ تمام فرقوں کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے لیکن بعد میں لارڈ کرزن نے جب اس اعلان کے متعلق یہ کہا کہ یہ تو محض

ملک کی ایک خواہش تھی تو جوش ملسیانی نے یہ شعر کہا ؎

نا اہل ہے وہ اہلِ سیاست کی نظر میں
وعدے سے کبھی جس کو مکرنا نہیں آتا

جامع مسجد دہلی کے قریب ایک قہوہ خانے میں کچھ شاعر بے خود دہلوی اور سائل دہلوی کا ذکر کر رہے تھے۔ ایک شاعر نے ایک شعر سنایا جس میں ان دونوں استادوں کے تخلص نظم تھے۔ شعراء میں حیدر دہلوی بھی موجود تھے۔ شعر سن کر کہنے لگے کہ اس شعر میں بے خود اور سائل کے الفاظ صرف تخلص معلوم ہوتے ہیں۔ کمال تو یہ تھا کہ شعر میں دونوں کے تخلص بھی نظم ہوتے اور اس کے باوجود محض تخلص معلوم نہ ہوتے۔

"یہ کیوں کر ممکن ہے؟" کسی شاعر نے جھلّا کر کہا۔

"یہ اس طرح ممکن ہے ——" اتنا کہہ کر حیدر دہلوی نے چند لمحوں کے تامل کے بعد یہ شعر موزوں کر دیا ؎

پڑا ہوں مے کدے کے در پہ اس انداز سے حیدرؔ
کوئی سمجھا کہ بے خود ہے کوئی سمجھا کہ سائل ہے

اجمیر کے ایک مشاعرے میں منتظمینِ مشاعرہ نے بطور سازش سیماب اکبر آبادی کو شرمندہ کرنے کے لئے سب سے پہلے شمع ان کے سامنے رکھ دی۔ ادھر شمع سیماب صاحب کے سامنے رکھی گئی ادھر مجمع سے ایک شور اُٹھا۔ "ہائیں ہائیں یہ کیا کر رہے ہو مشاعرہ سیماب صاحب سے شروع نہیں ہوگا۔" لیکن سیماب صاحب نے شمع کو اپنی گرفت میں لے کر اپنے سامنے سے نہ ہٹنے دیا۔ سیماب صاحب کو غصّہ بے حد تھا اور کچھ خفت سی بھی۔ اسی حالت میں جب لوگ شمع اُٹھانے پر اصرار کر رہے تھے، سیماب صاحب نے ایک رباعی برجستہ کہی اور شمع کے اُٹھتے اُٹھتے سنا ہی ڈالی۔

کچھ عیب نہیں غزل کا پڑھنا اوّل
پڑھنا ہے تو کیا بعد میں اور کیا اوّل
سیماب یہ شمع مجھ سے کہتی ہے کہ آج
تیرا ہے سخن وروں میں درجہ اوّل

تلوک چند محروم نے کشمیر کے متعلق جوش ملیح آبادی کی یہ رباعی

ممنوع شجر سے لطف پیہم لینے
عصیاں کی گھنی چھاؤں تلے دم لینے
آوارۂ و کاشمیر آ پہنچا جوشؔ
اللہ سے انتقامِ آدم لینے

جب پہلی بار کسی اردو اخبار میں پڑھی تو جذباتی طور پر انھیں کچھ ایسا صدمہ پہنچا کہ اسی وقت اس کے جواب میں بے اختیار یہ رباعی کہہ دی

کشمیر میں لطف جام لینے والے
عصیاں کے شجر سے کام لینے والے
اللہ کی لاٹھی میں نہیں ہے آواز
اللہ سے انتقام لینے والے

۱۹۳۱ء میں گجرات جیل کے اسپیشل کلاس کے پولیٹیکل قیدیوں میں میلا رام وفا بھی شامل تھے۔ جب ان قیدیوں میں دہلی کے قیدی رہا ہو کر دہلی جانے لگے تو وفا صاحب نے کہا

دہلوی جا رہے ہیں دہلی کو
شاد و بشاش و خرّم و خورسند
دل سے میرے نکلتی ہے یہ دعا
بسلامت روند و باز آیند

شملہ میں کچھ نوجوان کسی ہال میں ایک ڈراما کر رہے تھے جس کا نام تھا "تمنا"۔ پنڈت ہری چند اختر جب ایک تماشائی کی حیثیت سے وہاں پہونچے تو انھیں معلوم ہوا کہ ڈرامے کی ہیروئن کسی بات پر ناراض ہوکر وہاں سے اپنے گھر چلی گئی ہے اور ڈرامے کے منتظمین بے حد پریشان ہیں۔ اختر صاحب نے ایک لمحہ کے لئے صورتِ حال کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کے بعد منتظمین اور تماشائیوں سے خطاب کرتے ہوئے یہ شعر موزوں کر دیا ؎

تھی جس پہ کامیابی منحصر چل دی وہی لڑکی
تمنا کی جگہ خونِ تمنا دیکھتے جاؤ

نوح ناروی ایک بار اپنی جائداد کے جھگڑے کے سلسلے میں عدالت کے چکر میں پھنس گئے۔ مجسٹریٹ کے کسی فیصلے کی نقل آپ کو درکار تھی۔ اسے حاصل کرنے کے لئے آپ کو جس مضحکہ خیز صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا اس کا اظہار زبانِ شعر میں آپ نے یوں کیا

جب یہ پوچھا حکم کیا لکھا گیا درخواست پر
کہہ دیا دفتر سے تم کو نقل لینی چاہیئے
اور دفتر سے اگر طالب ہوا میں نقل کا
تو وہ بولے اس کی بھی درخواست دینی چاہیئے

کسی خاص پڑھے لکھے شخص کی زبان سے پطرس بخاری نے جب یہ شعر سنا ؎

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا
اسی کو اہلِ جہاں انقلاب کہتے ہیں

تو پطرس صاحب چیں بجبیں ہوکر کہنے لگے کہ اگر آپ کو اس پایے کے اشعار یاد رکھنے اور دہرانے کا شوق ہے تو یہ شعر بھی نوٹ کر لیجئے ؎

ابھی سفید تھے بال اور ابھی سیاہ ہوئے
اسی کو لوگ عموماً خضاب کہتے ہیں

تقسیمِ ملک سے پہلے جب مسلم لیگ عروج پر تھی اور ہندوستان کے معتدد مسلمان دھڑا دھڑ اس میں شامل ہو رہے تھے مولانا ابوالکلام آزاد کی ثابت قدمی دیکھ کر عرش ملسیانی نے یہ شعر کہا ؎

تنہا روی نے رکھی ہمارے جنوں کی لاج
گو اہلِ کارواں نے پکارا کبھی کبھی

حیدرآباد دکن کے جونیر پرنس شہزادہ معظم جاہ بہادر کے دربار ہل فورٹ میں عید کی رات کا جشن منعقد تھا کہ ایک خوبصورت لڑکا جو نرت کرنے میں ماہر تھا عطر میں بسا ہوا سامنے سے گزرا۔ شاعرِ دربار صدق جائسی کو دیکھ کر ایک خوشگوار تبسم کے ساتھ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر سر جھکا دیا۔ صدق صاحب نے بھی اسی طرح سلام کا جواب دیا۔ خوشبو سے ماحول معطر ہوگیا تھا اور اس عنبریں ماحول سے متاثر ہوکر صدق صاحب نے یہ شعر موزوں کر دیا ؎

خوشبو سے ہو رہا ہے معطر مشامِ جاں
چلتی ہے کس طرف کی ہوا کچھ نہ پوچھئے

تقسیمِ وطن سے پہلے لاہور میں آنکھوں کے امراض کے ماہر ڈاکٹر متھرا داس بالعموم شام کو حاجی لق لق کے میزبان ہوا کرتے تھے۔ ایک دعوت میں ڈاکٹر صاحب کے کسی عزیز نے لق لق سے فرمائش کی کہ حاجی صاحب اپنے مخصوص رنگ میں ڈاکٹر صاحب کے متعلق کوئی شعر ارشاد فرمائیے۔ چند لمحوں تک سوچنے کے بعد لق لق نے کہا کہ شعر تو ہوگیا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب سے زیادہ اُن کے مریض نرگس سے متعلق ہے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں نرگس کو آنکھ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ عرض کرتا ہوں ؎

ہے وہ متھرا داس کے زیرِ علاج
آج کل نرگس ذرا بیمار ہے

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

نئی کتابیں اور رسالے

غالب سے معذرت کے ساتھ

مرتب احمد جمال پاشا ۔ ناشر نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ قیمت تین روپے پچاس پیسے ۔

غالب اتنے خوش قسمت شاعر ہوئے ہیں کہ ان کے باب میں کچھ نہ کچھ تحریر میں آتا ہی رہتا ہے ۔ بہت سے مزاحیہ مضامین غالب پر یا غالب سے متعلق لکھے گئے ہیں ۔ مرتب نے بڑی محنت سے ان سب کو جمع کرکے کتابی صورت میں شائع کردیا ہے ۔ یہ مجموعہ غالبیات میں ایک دل چسپ اضافہ ہے ۔ مضمون نگاروں میں ہری چند اختر کنہیا لال کپور، فلک پیما، شوکت تھانوی، یگانہ چنگیزی، صالحہ عابد حسین اور کتنے ہی قابل ادیبوں کے نام ہیں ۔ قریب قریب پچاس مضامین اور نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں ۔ ابتداء میں احمد جمال پاشا نے مرزا غالب کی طرف سے ایک دل چسپ پیش لفظ بھی لکھا ہے ۔

خرمن

شفیق جونپوری کا مجموعۂ کلام ۔ ناشر نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ ۔ شفیق جونپوری کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے روش صدیقی نے ان کا قطعۂ تاریخ "جانشین جناب حسرت مرد" سے نکالا ہے ۔

اس مجموعے میں مرحوم کی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں ۔ نظمیں مذہبی بھی ہیں اور سیاسی بھی ۔ شفیق کی شاعری کا سب سے بڑا کارنامہ اظہارِ خلوص ہے ۔

قیمت دو روپے ۔

فنِ تقریر

مصنف مظاہر حسن ۔ ملنے کا پتہ ۔ بک لینڈ محلہ کلیانی مظفر پور (بہار) قیمت تین روپے ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ۔ ضخامت ۱۷۶ ۔ کاغذ، کتابت، طباعت اوسط ۔

اس موضوع پر اردو میں غالباً کوئی اور کتاب نہیں ۔ کتاب دل چسپ ہے اور مصنف نے موضوع سے پورا انصاف کرنے کی کوشش کی ہے ۔ کتاب مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے :

(۱) احساسِ کمتری اور اس کے نقصانات (۲) احساسِ کمتری اور فنِ تقریر (۳) روانی (۴) تقریر کی تیاری ۔ (۵) ابتداء کیسے کریں (۶) اختتام کیسے کریں ۔ (۷) مقرر کی شخصیت (۸) مقرر کی ادا (۹) تقریر کو مؤثر بنانے کے چند اہم اصول ۔

یادگارِ جگر

مرتب ۔ احمد اسلام ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو و فارسی لکھنؤ یونی ورسٹی لکھنؤ ۔ ملنے کا پتہ ۔ دانش محل بک سیلرز امین الدولہ پارک لکھنؤ ۔ قیمت دو روپے ۔

جگر کے کلام کے تین مجموعے 'داغِ جگر'، 'شعلۂ طور' اور 'آتشِ گل' شائع ہوئے تھے لیکن اس پر بھی ان کا کچھ کلام غیر مطبوعہ رہا اور کچھ تلف ہوا ۔ مرتب نے غیر مطبوعہ اور تلف شدہ کلام کو تا حدِ امکان جمع کرکے شائع کیا ہے ۔ یہ اردو کی بڑی خدمت

ہے اور جگر دوستوں پر ایک احسان۔

چراغِ دیر و حرم

ڈاکٹر سید صفدر حسین کی غزلوں کا مجموعہ۔ ناشر۔ بارگاہِ ادب ۵/۱۳۰۲ ڈرگ کالونی۔ کراچی۔ ۲۵۔ قیمت چار روپے۔ کاغذ، کتابت، طباعت نہایت عمدہ۔

اس سے قبل صفدر حسین صاحب کی کتاب 'رقصِ طاؤس' پر ہم تبصرہ کر چکے ہیں۔ صفدر صاحب کا اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان دونوں قابلِ ستائش ہیں۔ سب سے بڑی بات ان کے کلام میں یہ ہے کہ اس میں نیا پن نظر آتا ہے۔ غزلوں میں کہیں کہیں یہ حقیقت غلط بھی ثابت ہوتی ہے پھر بھی مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کلام میں سوقیانہ مضامین نہیں۔ نظموں میں ان کا کمال زیادہ نمایاں ہے پھر بھی ان کی غزل کے بعض اشعار سحرِ حلال ہیں۔

ضربِ آتشیں

قمر ساحری۔ ناشر مکتبۂ سحری ۱۳/۴ نیو بلڈنگس اعظم آباد حیدرآباد۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

قمر ساحری نوجوان اور حساس شاعر ہیں۔ انھیں بقول سجاد ظہیر، ظلم، جہالت، تاریکی اور توہم پرستی سے نفرت ہے۔ چنانچہ یہی رنگِ سخن ان کی نظموں اور غزلوں کا جوہر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ افقِ شعر پر یہ ایک تابدار ستارہ بن کر چمکیں گے۔ جو نتائج یہ مرتب کرتے ہیں ان سے کسی کو لاکھ اختلاف ہو لیکن ان کی شاعری کے خلوص سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ یہ اسم بامسمّیٰ ہے۔

پھول اور کانٹے

محترمہ موہنی زتشی کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر موہنی پبلیکیشن ۱۱۔ وزیر حسن روڈ لکھنؤ۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔

زتشی صاحبہ ایک زمانے سے شعر کہتی ہیں۔ ان کی نظمیں اخلاقی بھی ہیں وطنیہ بھی۔ اور ان کی غزلیں بڑی سادہ اور خوش گوئی کی اچھی مثال ہیں۔ حبیب احمد صدیقی صاحب نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے۔ پھول اور کانٹے کی رعایت سے ان کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے:

پھولوں سے ہم نے کچھ کانٹے نہ۔ پُر نہ کبھی جھگڑا
پھولوں کی گر ہے چاہ تو کانٹے گلے لگا
کانٹوں کو ہی سمجھیں گے بس اب زیست کا حاصل
تو یہ ہے گلِ تر کی تمنا نہ کریں گے

کردار

مصنفہ سیدہ صفی مرتضیٰ۔ قیمت دو روپے پچیس پیسے ناشر نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ۔

کردار ان انفرادی خصوصیات کا نام ہے جن کی وجہ سے ایک شخصیت دوسری شخصیت سے ممتاز ہوتی ہے۔ اس کتاب میں اسی قول کی تفصیل ہے۔ کتاب کے ابواب یہ ہیں:
گھر کی تربیت، حلقۂ احباب، عمل، ہمّت، ضبطِ نفس، شرافت مزاج، اطوار، مطالعہ، شریکِ حیات، تجربہ کی نظم
کتاب محنت سے لکھی گئی ہے اور دلچسپ ہے۔

ذکرِ اردو

یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی کل پاکستان اردو کانفرنس ۱۹۶۴ء میں پڑھے گئے۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔ مضمون نگاروں میں ڈاکٹر وزیر آغا، ممتاز حسین، مرزا ناصر احمد اور وحید قریشی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

رنگِ بہار

قاضی غلام کبیر راحل کا مجموعۂ کلام۔ ملنے کا پتہ:۔ حکیم محمد یوسف حسن۔ ۴۱ جامع مسجد روڈ راولپنڈی۔

راحل صاحب کا رنگِ سخن اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں پختہ ہے۔ ان کے کچھ منتخب اشعار ذیل میں درج ہیں جن سے ان کی خوش گوئی آشکار ہوگی:

ہر نوکِ خار میرے لہو سے ہے لالہ گوں
کافی ہے یہ ثبوت ورودِ بہار کا

غمِ دوراں تو کوئی غم ہی نہیں ہے راحلؔ
غم وہ ہے جس پہ گمانِ غمِ جاناں گزرے

نے وید کسی کی نہ ملاقات ہوئی ہے
کیوں موردِ شبہات میری ذات ہوئی ہے

سارا جہان قیدِ محبت میں آگیا
ہے کائنات کو بھی مری آرزو پسند

ذرۂ ناچیز کسبِ نور از خورمی کند
عالمِ خاکی جلا یابد ز تابِ روی تو

تا ابد آورد نباشد ہیچ فکرِ جام می
آنکہ از روزِ ازل گشتہ خرابِ روی تو

مکن چنداں غرورِ حسن خود ای غنچہ نورس
کہ غنچہ تا گلی گردد شود فصلِ بہار آخر

اتحاد ـــ ہماری ہار

مصنف ڈوگلس ہائڈ۔ مترجم جے۔کے شرما۔ نظرِ ثانی گوپال متل۔ناشرین نیشنل اکاڈمی۔ ۹۔انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی۔قیمت ایک روپیہ۔

کمیونسٹوں نے دنیا میں اتحاد کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کتاب میں ایسے مضامین شامل ہیں جن میں اس مطالبے پر شک کا اظہار کیا گیا ہے۔ نقطۂ نظر سے قطعِ نظر کتاب ایک دل چسپ مطالعہ ہے۔ مصنف اوّل اوّل کمیونسٹ تھا۔ ۱۹۴۸ء میں اس نے کمیونزم کو خیرباد کہا تھا اس لحاظ سے یہ کتاب اور بھی دل چسپ ہے۔

شعلۂ نوا

تلوک چند محروم کی غزلوں کا مجموعہ۔ ملنے کا پتہ:۔مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی۔قیمت چھ روپے پچاس پیسے۔

یہ کتاب پہلے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تھی۔اب اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ نظم محروم صاحب کا میدان ہے لیکن رباعی اور غزل پر بھی انھیں بڑی دسترس ہے۔آپ اخلاقی قدروں کے پرستار ہیں اس لئے ان کی غزلوں میں بھی اخلاقیات کا درس ملتا ہے۔
الاماں کچھ اگر غمِ الفت گراں ملے نقصان نہیں اگر عوضِ نقدِ جاں ملے

نہ طلب ہے شاہد و شمع کی نہ غرض ہے بادہ و جام سے
کہ ہجومِ نور و سرور ہے ترے ذکر سے ترے نام سے

محروم صاحب اگلے وقتوں کے لوگوں میں سے ہیں محض اس لئے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ قدامت پرست ہیں۔ پُرانے نظامِ زندگی سے موجودہ زمانے کی جنگ کا ذکر یوں فرماتے ہیں:

نہ امیدیں امن و اماں کی ہیں نہ نویدِ راحتِ زندگی
کہ زمانہ برسرِ جنگ ہے ابھی اپنے کہنہ نظام سے

زندگی بھر پریشانیوں میں مبتلا رہنے والا شاعر محرومیٔ تقدیر اور حادثاتِ تقدیر کا ذکر یوں کرتا ہے

ساقی نے ادھر ہاتھ بڑھایا تھا بہ مشکل
تقدیر نے ساغر کو کہاں توڑ دیا ہے

ان کا بہت پُرانے زمانے کا شعر ہے لیکن یوں نظر آتا ہے کہ تیر بول رہا ہے

قرارِ محرومِ منتظر کو کہاں شبِ انتظار آیا
نہ نیند آئی نہ چین پایا نہ موت آئی نہ یار آیا

من سمجھاون

مرتبہ سیّدہ جعفر۔ ملنے کا پتہ:۔ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ خیریت آباد حیدرآباد۔قیمت کتاب پر درج نہیں کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔جلد اور جلد پوش سے آراستہ ہے۔

مہاراشٹر کے سنت رام داس کی کتاب 'مناچے شلوک' سے متاثر ہوکر مشہور صوفی شاہ تراب نے مثنوی کی بحر میں سبق آموز مسدس نما طویل نظم کہی ہے۔ ترکِ دنیا، اخلاقیات، نیکی اور صداقت کا درس اس نظم میں ہے۔ قومی یک جہتی کے لئے بھی یہ نظم ایک اچھا پیغام ہے۔ڈاکٹر سیّدہ جعفر اس سے پہلے ماسٹر رام چندر پر ایک تحقیقی کتاب شائع کر چکی ہیں۔لیکن اس کتاب میں ان کی تحقیق کا پایہ بلند تر ہے۔ من سمجھاون کی تصنیف کا زمانہ اٹھارھویں صدی کے وسط کا زمانہ ہے۔ مرتبہ کی تحقیق کے مطابق شاہ تراب نے رام داس کی مشہور کتاب اور ان کے شاہکار 'داسا بودھ' سے بھی بعض مطالب اخذ کئے ہیں۔ مصنفہ نے چھ مخطوطوں سے

اصل نظم کا متن تیار کیا ہے۔ اور آخر میں فرہنگ بھی دیا ہے۔ مین کھاون کی زبان بڑی پیاری اور میٹھی ہے جس میں ہندی اور فارسی کا ایک بڑا حسین امتزاج ہے۔ کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان آج کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ پہلے دو بند یہاں درج کئے جاتے ہیں جن سے شاہ تراب چشتی کے صوفیانہ انداز اور ان کی اخوت پرستی پر روشنی پڑے گی۔

صفت کر اوّل اوس کی جو رام ہیگا
اوسی رام سون ہم کو آرام ہیگا
سدا رام کے نام سون کام ہیگا
ہمیں دھیان اوس کا صبح شام ہیگا
وہی گل وہی مل وہی جام ہیگا
وہی ساقی بزم گلفام ہیگا

الک نام اللہ نرنجن ہری ہے
نرنکار نرگن وہ پرمیسری ہے
صفت اوس کی ہر شئے میں دائم ہری ہے
وہ گنگا وہ جمنا وہ گوداوری ہے
وہی ذوالجلال اور اکرام ہیگا
وہی ساقی بزم گلفام ہیگا

کتاب کا پیش لفظ کہئے یا دادِ سخن ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونی ورسٹی نے لکھا ہے۔ پھر شاہ تراب کے متعلق پوری واقفیت شاہ تراب کا زمانہ ان کے ہم عصروں اور ان کے دیگر کلام کے باب میں مفصل معلومات ہے۔

<u>دیدۂ بینا</u>

کوثر چاندپوری کے مضامین کا مجموعہ۔ قیمت چار روپے ملنے کا پتہ نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ کوثر صاحب ایک مشہور افسانہ نگار ہیں لیکن ان کی نثر نگاری صرف افسانہ یا ناول تک محدود نہیں۔ انھوں نے بہت اچھے ادبی مضامین بھی لکھے ہیں۔ اس مجموعے میں ان کے پندرہ مضامین شامل ہیں۔ آج تک ہم نے کوثر صاحب کی کوئی نظم تو نہیں دیکھی لیکن ہمیں امید رکھنا چاہیے کہ اتنا شستہ تخلص بے کار نہیں جائے گا۔

<u>زنداں کی ایک رات</u>

ش۔ اختر کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت دو روپے ملنے کا پتہ سب رنگ بک ڈپو امین روڈ رانچی۔

ش اختر معروف افسانہ نگار ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان کا یہ مجموعہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

<u>مغرب اور اسلام</u>

قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ محمد عباس طالب صفوی، شمس آباد ضلع فرخ آباد یوپی۔

مصنف بڑے مشہور و معروف مضمون نگار ہیں۔ مذہبیات کا تقابلی مطالعہ اور فلسفۂ مذہب آپ کا خاص میدان ہے۔ آپ کے قابلِ قدر مضامین "نگار" میں ایک مدت سے شائع ہوتے رہے ہیں اس کتاب میں بھی انھوں نے موضوع کتاب سے بڑا انصاف کیا ہے ہمیں امید ہے کہ ایک صاحب علم کی اس کاوش کو غور سے پڑھا جائے گا۔ اس کتاب کے ذریعہ مصنف نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ مسلمان ممالک میں سلطانی جمہور کا زمانہ آئے گا۔ انھوں نے اس بات کی ضرورت بھی محسوس کی ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے دماغ سے اس زہر کو بھی نکالا جائے جو تیرہ سو برس کی مسلسل جنگ سے دونوں کے سینوں میں موجود ہے۔

<u>زیبِ گل</u>

عظمت عبدالقیوم خاں کا مجموعۂ نظم۔ اس مجموعہ میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ عظمت صاحبہ ایک خوش گو شاعرہ ہیں۔ ان کی زبان اور اندازِ بیان بہت صاف ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمایئے:

تیری مسکراہٹ سے روشن زمانہ میری آہ سے بھی تجھے بدگمانی
عشرتِ صبح بہارِ زندگی چند لمحوں کی ہنسی کا نام ہے

تاج پر بھی ان کی ایک نظم ہے

وفا کی آنکھ سے ٹپکا ہوا حسین آنسو
کسی کے جذبۂ صادق کا ایک نذرانہ

تصورات کی دنیا کی دل نواز سحر
جہانِ عشق کا اک شاہکار افسانہ
شعرائے اردو عام طور پر تعلی پسند واقع ہوئے ہیں لیکن
عظمت کی یہ تعلی بے جا نہیں

ایک جادو ہے مری نغمہ سرائی عظمت
محفلِ شب میں سحر بن کے نکھر آتی ہے

قیمت چار روپیہ۔ مقام اشاعت خیاباں امیر پیٹھ حیدرآباد
تجلیات المعروف حیاتِ جاوید
آسی محمدی کے کلام کا مجموعہ۔ ملنے کا پتہ:۔ نواب
محمد عبدالسعید خاں آسی عرف چھبن میاں رئیس محمدی ضلع کھیری
آسی صاحب محض رئیس ہی نہیں رئیس الکلام بھی
ہیں۔ اس کتاب میں مناجات، نعت نبی کریم، منقبتِ امام
کے بعد نہایت پاکیزہ غزلیں ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو

میری زندگی ہے فریبِ مسلسل
فریبِ نظر ہو کے کیا کیجیے گا

مزے سے سن رہے تھے داستانِ دردِ محبت کی
ہمارا نام آتے ہی مذاقِ داستاں بدلا

دل کی آواز تھی ساقی کہ ہوا جام شکست
ایک جھنکار سی کانوں میں مرے آئی ہے

قیمت دو روپیہ۔

موصولات

مدرسۂ ابتدائی کی کہانی حصۂ اوّل۔ عبدالغفار مدھولی
ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔
ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت درج نہیں ہے۔ عبدالغفار
صاحب نے جامعہ کے ابتدائی درجات کے قیام کی کہانی
لکھی ہے۔

عزم و عمل۔ پیارے لال رتن۔ زمین شور، پیر نا بالغ اور
خودکشی یہ تین نظمیں یک جا شائع کی گئی ہیں ملنے کا پتہ۔
۵/۰۰۶ کھنہ ضلع لدھیانہ پنجاب

شگفتِ گل۔ عرش صہبائی کے کلام کا مجموعہ۔ صفحات ۱۲۰
مجلد مع جلد پوش۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔ ناشر
مکتبۂ اردو ادب کچی چھاؤنی جموں (کشمیر)

لمعاتِ شاد۔ مرتب فاطمہ بیگم۔ شاد عظیم آبادی کے
کلام کا انتخاب ہے۔ قیمت دو روپے۔ مجلد مع جلد پوش۔
صفحات ۱۱۰۔ ناشر عزیز الرحمان۔ نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ۔

غمِ فردا جناب نریش ایم۔ اے کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔
ناشر نوجوت پبلیکیشنز مالیر کوٹلہ۔ پنجاب۔ قیمت دو روپے
پچاس پیسے۔ مجلد مع جلد پوش۔ صفحات ۱۱۲

طبِ یونانی کی سرگزشت۔ نیّر واسطی۔ یکے از مطبوعات
مجلس بو علی سینا۔ لاہور (پاکستان) قیمت آٹھ آنے۔ کتابت
طباعت قابلِ تعریف ہے۔

کومل کومل گیت۔ کمار جیوتیشور پتھک کے گیتوں کا مجموعہ
صفحات ۶۰ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔
ہائی وے پبلیکیشنز پُرانی منڈی جموں (کشمیر)

سالِ مسعود (مثنوی) از معزز شفیق سنجر۔ قیمت
چالیس پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ سردار پبلیکیشنز رفعت کدہ،
برکت پورہ حیدرآباد

رسالے

قومی زبان بابائے اردو نمبر۔ قومی زبان انجمن ترقی اردو پاکستان
کا ماہوار ترجمان ہے۔ اگست ۱۹۶۴ء میں مولوی عبدالحق مرحوم کی
یاد میں اس کا بابائے اردو نمبر شائع ہوا ہے۔ قیمت چار روپے
ضخامت ۴۵۵ صفحات۔ اس ضخیم نمبر میں مولوی عبدالحق مرحوم
کی شخصیت اور ان کی اردو پرستی پر تفصیلی معلومات ملیں گی۔ مولوی
عبدالحق نے تمام عمر ہندوستان اور پاکستان میں اردو کی خدمت کی اور
یہی خدمت کرتے کرتے وہ عالمِ بقا کو سدھارے۔ اگرچہ اس شمارے
کے بعض مضامین سے ہمیں اختلاف ہے پھر بھی بہت اچھا کیا کہ

قومی زبان نے ایک اچھا نمبر مرحوم کی یاد میں شائع کیا۔

شیرازہ - جواہر لال نہرو نمبر۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجیز سری نگر کے دوماہی جریدے شیرازہ کا یہ شمارہ جواہر لال نہرو کی یاد میں شائع ہوا ہے۔ عام شماروں کی قیمت دو روپے ہوتی ہے۔ اس شمارے کی قیمت تین روپے ہے۔ یہ شمارہ حسین تصویروں سے آراستہ ہے۔ ان تصویروں میں بیشتر نہرو اور کشمیر سے متعلق ہیں۔ مضمون نگاروں میں بڑے معروف نام ہیں۔ اس شمارے کے شروع میں ایک بڑی حسین رنگین تصویر دی گئی ہے جس میں ایک کشمیری لڑکی جواہر لال نہرو کو پھولوں کی سوغات پیش کر رہی ہے۔ ضخامت ۱۰۰ صفحات۔ کاغذ کتابت طباعت عمدہ۔

صبح انجمن ترقی اردو ہند شاخ دہلی کا یہ سہ ماہی رسالہ ہے۔ زیرِ نظر شمارہ بہادر شاہ کی یاد میں شائع کیا گیا ہے۔ رسالے میں تصویریں بھی ہیں جن میں بقرعید کے موقع پر گاؤکشی کی ممانعت کے حکم کا عکس بھی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظفر کا عہد بڑی رواداری کا عہد تھا۔ مضامین اور نظمیں سب معیاری ہیں۔

چٹان لاہور - مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں چٹان لاہور نے اپنا ایک خاص نمبر شائع کر کے مولانا ابوالکلام آزاد کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

انوواد ٹرانسلیٹرز ایسوسی ایشن آف انڈیا کا یہ سہ ماہی رسالہ ہندی اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے جس میں ترجمے کے باب میں بہت اچھے مضامین ہوتے ہیں۔ ترجمہ ایک نہایت ہی مشکل فن ہے۔ اچھا ترجمہ کرنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ یہ رسالہ ایک اہم ضرورت کو پورا کرے گا۔ اچھے ترجمے بھی پیش کرے گا اور ترجمہ کرنے والوں کو مفید ہدایت بھی دے گا۔ عام چندہ ۱۲ روپے سالانہ اور طلباء سے دس روپیہ۔ ملنے کا پتہ ایف ۷/۲ ماڈل ٹاؤن، دہلی ۹۔

شانِ نزول - صفحہ ۲۴ سے آگے

ایک شاعر اپنے عہدِ جوانی میں کسی حسینہ کے شباب سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے جس کا اظہار وہ اپنے بعض شعروں میں بھی کر چکے تھے۔ جیسے ؎

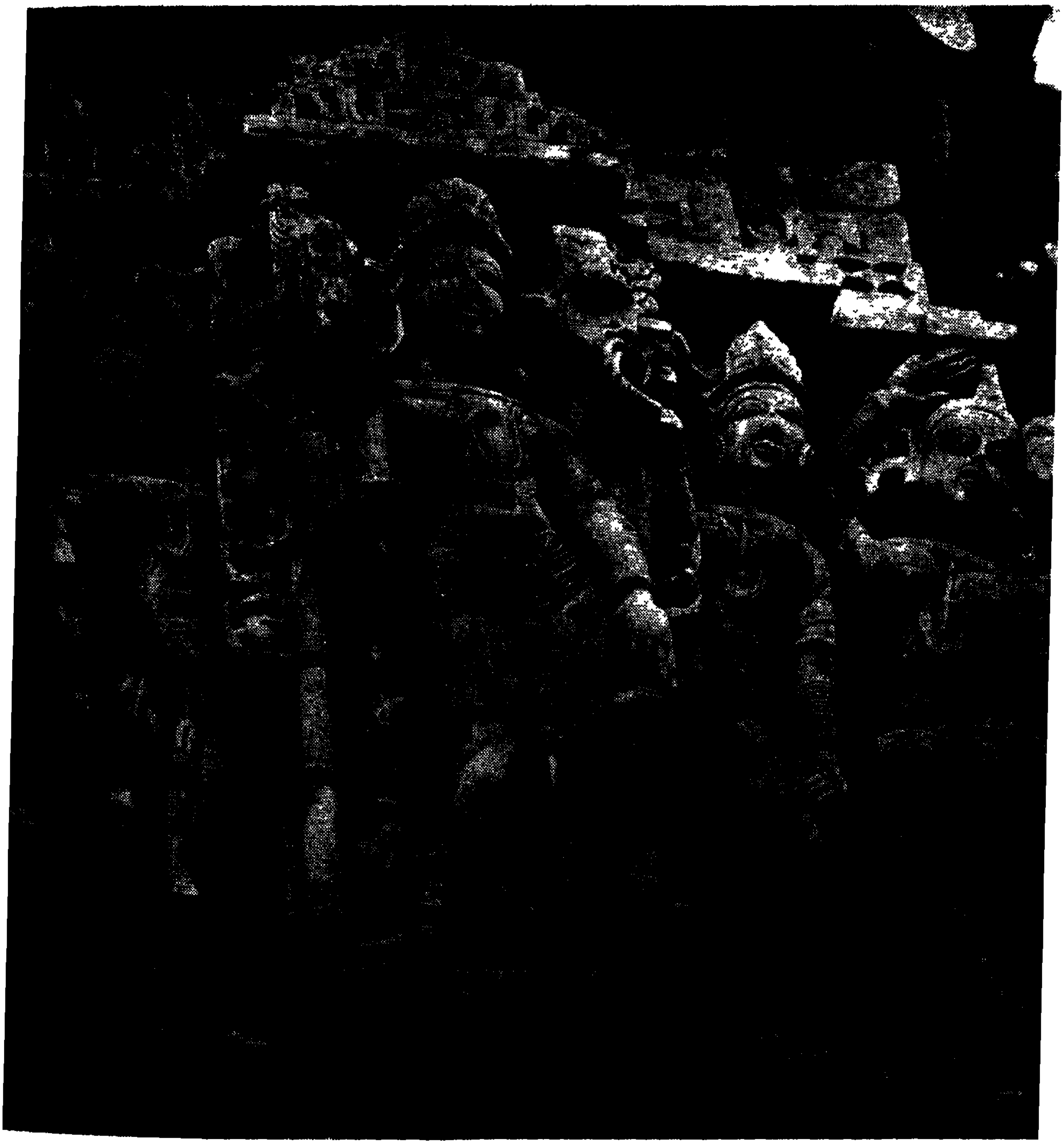
ان کا شباب دیکھ کے ہوتا ہے یہ خیال
دنیا میں اب شباب کسی پر نہ آئے گا

اور ؎

کافر خدا کرے کہ وہ تیرا شباب ہو
مر جاؤں جس گناہ سے توبہ کئے بغیر

کچھ سال بعد اس حسینہ سے ملاقات ہوئی تو شاعر صاحب جو کبھی اسے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ہمت نہیں کر سکتے تھے محسوس کرنے لگے کہ اس کا شباب ڈھل چکا ہے۔ اس حقیقت کا اس حسینہ کو بھی شدت سے احساس تھا اس لئے وہ کوشش کے باوجود شاعر سے آنکھیں چار نہ کر سکی۔ اس صورت کو دیکھ کر شاعر نے بڑے قلق سے یہ شعر کہا ؎

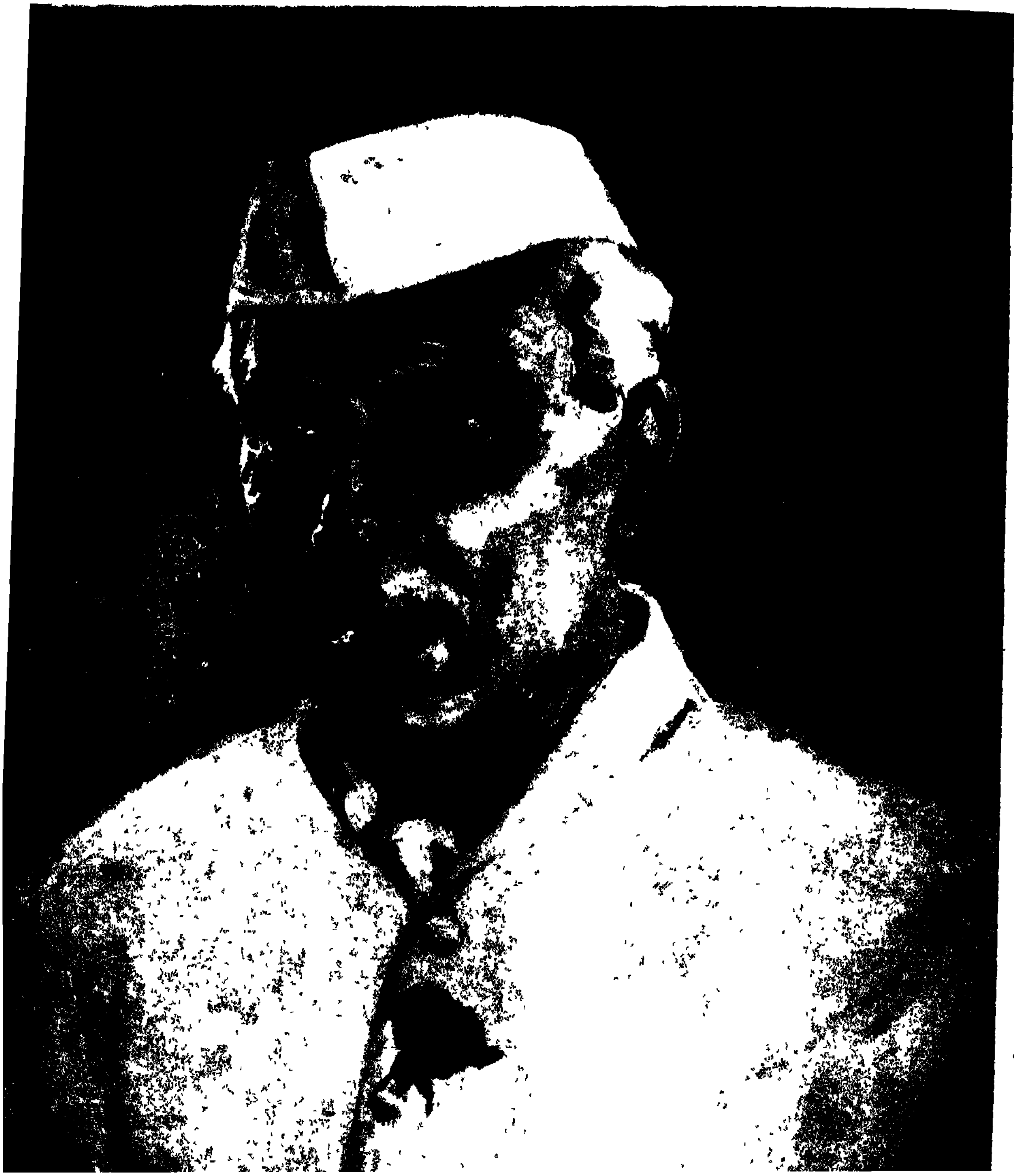
مری نظر کو نہ تھی تاب ان کے جلوؤں کی
اب ان کے جلوؤں کو میری نظر کی تاب نہیں



Edited & published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
Printed by Union Printers Co-op. Industrial Soc'ety Ltd., Karol Bagh, New Delhi-5

Regd. No D-509

آجکل





ہندی کے مشہور شاعر

میتھلی شرن گپت مرحوم



اردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر

عرش ملسیانی

اسسٹنٹ ایڈیٹر

شہباز حسین

ترتیب

سرورق :- شری جواہر لال نہرو
(رنگین بھٹا چاریہ)

رسالے کی پشت پر :- شری جواہر لال نہرو، لداخ میں
(۱۹۴۹ء)

جلد ۲۳ - نمبر ۱۰

ویشاکھ شک سمت ۱۸۸۷

مئی ۱۹۶۵ء

سالانہ چندہ :- ہندوستان میں :- سات روپے
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ :- ہندوستان میں :- ۶۰ پیسے
پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ حکومت ہند

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو اولڈ سیکریٹریٹ دہلی

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ملاحظات

ہمارے محبوب رہنما شری جواہر لال نہرو کو ہم سے بچھڑے ہوئے ایک سال کا عرصہ ہو گیا - ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کی دوپہر کو یہ آفتاب اچانک ڈوب گیا اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ مگر اس اندھیرے میں ان کا پیغام اور آدرش اپنے ملک اور ساری دنیا کے لئے ان کی بے لوث خدمت اور سب سے بڑھ کر ان کی شرافت ایک ایسی روشن مشعل کی حیثیت رکھتی ہے جو ہمیشہ ہمیں روشنی دکھاتی رہے گی اور ان کا پیغام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے الفاظ میں "ہم اس سے اچھا کوئی کام اور نہیں کر سکتے کہ ان آدرشوں کے حصول کی کوشش کریں جو انھیں بے حد عزیز تھے۔ یہی وہ بہترین خراج عقیدت ہے جو ہم اپنے سے جدا ہونے والے رہنما کی خدمت میں پیش کر سکتے ہیں۔"

روس نے خلائی پرواز کے سلسلے میں ایک حیرت انگیز اور نہایت اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ کرنل لیونوف کا اپنے جہاز واشکوڈ دوم سے نکل کر دس منٹ تک فضائے بسیط میں رہنا بڑے دور رس نتائج کا حامل ہے۔ اس کارنامے نے ترقی کے بڑے امکانات پیدا کر دئے ہیں۔ تسخیر فطرت کی اس مہم میں انسان نے بڑی زبردست کامیابی حاصل کی ہے اور اب یہ یقین کر لینا جائز ہوگا کہ وہ عشق کے امتحان میں پورا اتر کر ستاروں سے آگے کی دنیا میں جلدی پہنچ جائے گا۔

رسل و رسائل اور نقل و حمل کے میدان میں نت نئے ایجادات و انکشافات نے دنیا کو نزدیک اور قریب لانے میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ اب متمدن دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں رہا ہے جس کے بارے میں ہم نہ جانتے ہوں یا جہاں ہم پہونچ نہ سکتے ہوں۔ ساری دنیا انسانوں کی ایک برادری بن جائے، اس کی کوشش کرنے والوں میں ہمارے مرحوم وزیر اعظم جواہر لال نہرو تھے اور سال رواں کو اشتراک و تعاون کے عالمی سال کی حیثیت سے منائے جانے میں ان کی تحریک بھی شامل تھی۔

۷ مئی ۱۹۶۵ء کو رسل و رسائل کی بین الاقوامی یونین کو قائم ہوئے سو سال ہو جائیں گے۔ اس یونین نے رسل و رسائل کے سلسلے میں بڑی مفید خدمات انجام دی ہیں۔

دنیا میں ہندوستان کی اہمیت اور مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سے غیر ملکوں سے براہ راست تار اور کیبل، ریڈیو ٹیلی فون اور ریڈیو فوٹو سروس کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے۔ آنے والے برسوں میں ان میں مزید اضافہ ہوگا۔ ہمیں امید رکھنی چاہئے کہ ذرائع آمد و رفت اور پیغام رسانی میں روز افزوں اضافے کی وجہ سے قوموں کے درمیان شکوک و شبہات اور منافرت میں کمی آئے گی اور رفتہ رفتہ پوری دنیا انسانوں کی ایک برادری بن جائے گی۔

۷ مارچ ۱۹۶۵ء کو ہمارے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے کانڈلہ میں آزاد تجارت کے حلقے کا افتتاح کیا ہے۔ احمد آباد قومی شاہراہ پر واقع یہ بندرگاہ جغرافیائی محل وقوع کے علاوہ کئی اور وجوہ سے افریقہ اور ایشیا کے ملکوں کے ساتھ تجارت میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ کانڈلہ میں آزاد تجارت کا حلقہ قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی برآمدات میں اضافہ ہو اور ہم زیادہ زر مبادلہ کما سکیں اور اس علاقے میں روزگار کے امکانات میں اضافہ ہو۔ ہندوستان میں تعمیر و ترقی کی جو سرگرمیاں جاری ہیں ان میں کانڈلہ بندرگاہ کی تعمیر بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

شمیم کرہانی

رخصتِ محبوب

(پنڈت جواہر لال نہرو)

رخصتِ رہبرِ محبوب ہے، جوشِ غم ہے
حرم و دیر میں یکساں اثرِ ماتم ہے
تھرتھراتی ہے زمیں، آنکھ فضا کی نم ہے
پرچمِ نیّرِ اقبالِ ہمالہ خم ہے

ہند کے تاج کا انمول گہر ٹوٹ گیا
آخری سلسلۂ نورِ سحر ٹوٹ گیا

اُٹھ گیا وہ جو غمِ عشق کا سودائی تھا
جانِ اخلاص تھا، تصویرِ دل آسائی تھا
پیکرِ حسن تھا، آئینۂ رعنائی تھا
سر بسر عزم تھا، ایثار تھا، سچائی تھا

کارواں کو جو سوئے راہِ ابد موڑ گیا
چہرۂ وقت پہ جو اپنی چمک چھوڑ گیا

جس کا بچپن نہ خلش میں نہ محن میں گزرا
مسکراتا ہوا خوشیوں کے چمن میں گزرا
سُکھ کے سنسار میں سپنوں کے گگن میں گزرا
پھول کی سیج پہ آنند بھون میں گزرا

جب کشش حد سے بڑھی منزلِ آزادی کی
اسی خسرو نے محل چھوڑ کے فرہادی کی

اس کا چہرہ تھا کہ پونم کا روپہلا مہتاب
ذہن سرسبز، لہو گرم، تمنا شاداب
دل تھا سینے میں کہ بھیگا ہوا شبنم میں گلاب
کس مہرو کی جوانی تھی کہ نہرو کا شباب

حُسن اور قیدِ غلامی کے سیہ خانوں میں
ایسے یوسف تو ہمیشہ رہے زندانوں میں

راہ مشکل تھی مگر عزمِ سفر رکھتا تھا
جو قدم رکھتا تھا بے خوف و خطر رکھتا تھا
غم کی راتوں میں تمنائے سحر رکھتا تھا
پاؤں کانٹوں میں، ستاروں پہ نظر رکھتا تھا

مل گئی منزلِ گل، وادیٔ پُرخار گئی
راہرو جیت گیا، راہگزر ہار گئی

میرِ محفل متواضع تو سرِ دار غیور
کہیں بیباک سپاہی کہیں قیدی رنجور
کہیں ماضی کا تاثر کہیں فردا کا شعور
کہیں بادل کہیں بجلی، کہیں سایہ، کہیں نور

ہمدمِ خلق، پسندیدۂ مخلوق بھی تھا
ہائے کیا شان تھی، عاشق بھی تھا معشوق بھی تھا

دل کو پہلو سے چرا لیتا تھا پہلا دیدار
اور پھر دل میں اُتر جاتی تھی دلکش گفتار
سب کا من موہ لیا کرتا تھا اونچا کردار
تجھ پہ کرتے تھے فدا جان، ترے عاشقِ زار

جذبۂ عشق کے اظہار کی صورت نہ رہی
اب کہاں جائیں بچاری کوئی مورت نہ رہی

جب کسی پر کبھی بھولے سے خفا ہوتا تھا
دوسری آن میں مصروفِ دعا ہوتا تھا
نگرِ لطف میں کیا جانئے کیا ہوتا تھا
پھول سا غم زدہ انسان کھلا ہوتا تھا

روٹھنے والا غمِ دل کی فضا بھول گیا
مُسکراہٹ تری دیکھی تو گِلہ بھول گیا

وہ محبت کا تبسم، وہ عنایت کی نظر
جیسے بادل کے گریباں سے جھلک جائے سحر
جیسے پھولوں پہ ٹپک جائیں غمِ شب کے گہر
چاندنی رات میں جیسے کسی خوشبو کا سفر

پرتوِ حسن سے گوشہ کوئی محروم نہ تھا
کہکشاں ٹوٹ کے گر جائے گی معلوم نہ تھا۔

مردِ بیباک، جواں عزم، جفاکش جرّار
سر بسر جذبۂ اخلاص، سراپا ایثار
کوہکن، قافلۂ اہلِ جنوں کا سردار
میرے محبوب! تری ذات میں جلوے تھے ہزار

مردِ پیکار بھی، درویشِ حق آگاہ بھی تھا
اک دُکھی قوم کا بے تاج شہنشاہ بھی تھا

تھی ترے دل میں امنگوں کی جگاتی ہوئی روح
وادیٔ ہند کے آنچل میں بسائی ہوئی روح
حسنِ تہذیب کے چشموں میں نہائی ہوئی روح
سیکڑوں سال کی پیمان چڑھائی ہوئی روح

ایک دیرینہ تمدن کی جوانی تھا تو
آخری اپنے بزرگوں کی نشانی تھا تو

تیری نظروں میں جہاں چند اشارے چمکے
بے سہارا سی فضاؤں میں سہارے چمکے
دشت روشن ہوئے، دریا کے کنارے چمکے
چاندنی رات نکل آئی، ستارے چمکے

حوصلہ تو نے دیا، دل سے نئی آگ اُٹھی
زندگی جاگ اُٹھی، جاگ اُٹھی، جاگ اُٹھی

ضبط ویردں کا تو رشیوں کی دعا بھی تجھ میں
بھیم کی آن تو ارجن کی ادا بھی تجھ میں
رام کے عہد کی خوشبوئے وفا بھی تجھ میں
کسی معصوم حسینہ کی ادا بھی تجھ میں

تجھ سے دھرتی کا ہر اک روپ نکھر آیا تھا
دیوتا تھا کہ ستاروں سے اُتر آیا تھا

مسکراتا ہوا دکھ درد کو جھیلا کرتا
آگے بڑھنے کے لئے دیش کو ٹھیلا کرتا
جو نہ لاکھوں سے ہوا وہ کام اکیلا کرتا
ایسا بوڑھا تھا کہ بچوں میں بھی کھیلا کرتا

پھول ہی پھول ہوں جس میں وہ گلستاں تھا تو
چاہتے تھے جسے معصوم وہ انساں تھا تو

وہ تری ذات کی ہیبت وہ تری باتوں کی شان
وہ ترے عزم کی شوکت وہ تری رزم کی آن
تیرے پیکر میں کئی حسن کے ملتے تھے نشان
جیسے بادل سے جھلکتی ہوئی ست رنگ کمان

تو مجاہد بھی تھا مونس بھی تھا ہمدم بھی تھا
رن میں شعلہ ہی نہیں بزم میں شبنم بھی تھا

تو نے لیلائے ادب کے بھی سنوارے گیسو
بخشے الفاظ کو معنی کے ہزاروں پہلو
ایسے فقرے جو دلِ سرد میں دوڑا دیں لہو
سحر تھا تیری نگارش میں، قلم میں جادو

کیا جنوں خیز تھی آشفتہ بیانی تیری
بھول سکتی ہی نہیں میری کہانی تیری

امنِ عالم کے لئے، تجھ کو پریشانی تھی
تیری فطرت ہی انیسِ غمِ انسانی تھی
تو جو موجود تھا خوشیوں کی فراوانی تھی
زندگی غم کے اندھیرے میں بھی نورانی تھی

یوں تبسم سے ترے عشق کے ساغر ڈھلکے
جیسے مشرق کے کٹورے سے اُجالا چھلکے

تیری پرچھائیاں ہر رُخ سے ٹکراتی تھیں
انکھڑیاں سب کی نئے خواب سے بھر جاتی تھیں
مائیں بچوں کو ترے نام سے بہلاتی تھیں
گوریاں گاؤں میں ڈھولک پہ تجھے گاتی تھیں

ایک اک فرد وطن کا ترا دلدادہ تھا
مہوشوں کے لئے تو خواب کا شہزادہ تھا

ذہن، پختہ تھا تو پیکر میں توانائی تھی
عزم، محکم تھا تو جذبات میں گہرائی تھی
روح، دل کش تھی تو انداز میں رعنائی تھی
اک نئے دور کا عالم تری انگڑائی تھی

عزم سیلاب تھا، طوفاں تھا تکلم تیرا
ناؤ شاہی کی ڈبوتا تھا تلاطم تیرا

پاؤں دھرتی پہ، ستاروں کی فضاؤں میں خیال
بحر کا حوصلہ، شاہیں کی نظر، شیر کی چال
مچلا ایسا کہ ہولی میں اڑاتا تھا گلال
کبھی سونا، کبھی موتی، کبھی ہیرا، کبھی لال

ایسے پائے نہ کہیں باطن و ظاہر ہم نے
دیکھ لو ہم کو کہ دیکھے ہیں جواہر ہم نے

عزم افراد کے خیالات کا آئینہ تھا
ذہن اقوام کی مساوات کا آئینہ تھا
قلب، جمہور کے جذبات کا آئینہ تھا
یہ نیا ہند تری ذات کا آئینہ تھا

ترے پرتو سے چمکتا تھا ہمالہ تیرا
وادی وادی نظر آتا تھا اُجالا تیرا

صبحِ آزادی کی تنویر عطا کی تو نے
تپشِ جذبۂ تعمیر عطا کی تو نے
اک نئے دور کی تصویر عطا کی تو نے
ہند کے خواب کو تعبیر عطا کی تو نے

کارخانوں کو اجنتا کا بدل کہتے ہیں
بھاکڑہ باندھ کو اب تاج محل کہتے ہیں

بٹ گیا ہند تو انساں کے افکار بٹے
اڑ گئی خاک فضا میں، گُل و گلزار بٹے
شہر تقسیم ہوئے کوچہ و بازار بٹے
کیا قیامت ہے کہ دل بٹ گئے دلدار بٹے

کون اُس دَور میں اُلفت سے مُتسلیم رہا
اک ترا دل کہ جو ناقابلِ تقسیم رہا

تو نے الفت کے نشانات کو زندہ رکھا
دَیر و مسجد کی روایات کو زندہ رکھا
باہمی عشق کے جذبات کو زندہ رکھا
آدمیت کی ہر اک بات کو زندہ رکھا

کون کہتا ہے کہ تو موت کا زندانی ہے
عشق مرتا ہے کہیں، عشق تو لافانی ہے

ذہن تاجرانہ تھا نہ رجحانِ عمل بیوپاری
پیار ہر ملک سے ہر قوم سے تیری یاری
دل بنانے سے ترے دل کو رہی بے زاری
تیرے مسلک میں بڑا جرم تھی جانب داری

امن کا دوست تھا، انساں کا دمساز تھا تو
دہر میں وحدتِ اقوام کی آواز تھا تو

یہ ترا جذبۂ بیدار، امانت ہے تری
امن کی گرمیٔ بازار، امانت ہے تری
نوعِ انساں کے لئے پیار، امانت ہے تری
تیری سیرت ترا کردار، امانت ہے تری

اس امانت کو کلیجے سے لگا رکھیں گے
دیپ جو تو نے دیا ہے وہ جلا رکھیں گے

بجھنے دیں گے نہ کبھی تیری وفا کا شعلہ
کاروانوں کو جگائے گا درا کا شعلہ
دھڑکنیں دل کی بڑھائے گا نوا کا شعلہ
روشنی دے گا ہمیں تیری چتا کا شعلہ

راکھ تیری جو فضاؤں میں بکھر جائے گی
چاندنی پیار کی، کچھ اور نکھر جائے گی

یاد تیری ہمیں فردا کا اشارا دے گی
روشنی ڈھونڈنے والوں کو ستارا دے گی
ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو کنارا دے گی
لڑکھڑاتی ہوئی دنیا کو سہارا دے گی

کوئی مشکل ہو، نہ چھوٹے گا کبھی ساتھ ترا
سب کے سر پہ نظر آئے گا سدا ہاتھ ترا

رخصت اے قافلۂ ہند کے سالارِ عظیم
شاعرِ قوم کا دل ہے ترے صدمے سے دونیم
گل فشاں مجھ پہ رہی تیری عنایت کی نسیم
تیرے الطاف نہ بھولے گا کبھی تیرا شمیم

کیا کروں نذر، بجز احساسِ وفا کچھ بھی نہیں
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں

خطۂ ہند کے غمخوار، جہاں کے ہمدم
مشعلِ راہِ تمنّا ہے ترا نقشِ قدم
کوئی تجھ سا نہ تھا ہمدردِ وطن تیری قسم
جھک رہا ہے ترے اعزاز میں تیرا پرچم

مہر و اخلاص کا پیغام دوامی لے لے
آخری بار ترنگے کی سلامی لے لے

ایوب سید

نہرو اور عرب ممالک

"ہندوستان اور مصر عہدِ قدیم میں عظیم تمدن کی تکمیل کے بانی مبانی رہے ہیں۔ دونوں ممالک نے دنیا کو علم، فراست و اخوت کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ اب موقع ہے کہ عہدِ ماضی میں شروع کئے ہوئے اس کارِ عظیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ ہمارے اسلاف نے اس مشعل کو کبھی ہاتھ سے گرنے نہیں دیا۔ اس وقت اس روشنی کو عوام کی زندگی تک پہنچانا ہمارا فرضِ اولین ہے۔" یہ تھے وہ الفاظ جو آج سے تقریباً نو سال قبل جمال عبدالناصر کا خیر مقدم کرتے ہوئے جواہرلال نہرو نے ادا کئے — صدر ناصر اس وقت بنڈونگ کانفرنس میں شرکت کے لئے جاتے ہوئے دہلی سے گزر رہے تھے۔ اس کانفرنس کے دوران ان دونوں ممالک کے لیڈر ایک دوسرے کے نزدیک آگئے۔ حال میں جو سائنٹیفک معاہدہ ہندوستان اور مصر کے درمیان ہوا ہے، عرب ممالک سے ہمارے خوش گوار تعلقات کی ایک اور تازہ مثال ہے۔ یہ معاہدہ جس پر ہندوستان کے وزیر تعلیم شری چھگلہ اور مصر کے وزیر سائنٹیفک ریسرچ جناب ریاض ترکی نے دستخط کئے ہیں ایک اہم اقدام ہے۔ کیونکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں یہ باہمی تعاون، ہندوستان اور عرب ممالک کے نزدیک ہو جانے کی بیّن دلیل ہے۔

ہندوستان اور عرب ممالک میں اس معاہدہ کو ہند و عرب دوستی کی تاریخ کا ایک سنگِ میل گردانا گیا ہے۔ اس معاہدے پر رائے زنی کرتے ہوئے قاہرہ کے الاہرام نے لکھا کہ "اس معاہدے نے باہمی مفاد کے بہت سے نئے دائرہ ہائے کارکردگی میں تعاون کے نئے مواقع فراہم کر دئے ہیں۔ یہ معاہدہ اس گہری عقیدت کا نتیجہ ہے جو ہندوستان اور عرب ممالک ایک دوسرے کے لئے محسوس کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح کے معاہدے اس وقت تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکتے جب تک متعلقہ ملک ایک دوسرے کے لئے خیر سگالی کے جذبات نہ رکھتے ہوں۔"

یہ باہمی عقیدت درحقیقت بہت گہری ہے۔ حال ہی میں وقوع پذیر دو اہم واقعات اس دوستی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ پہلا واقعہ مصر پر تین ممالک یعنی اسرائیل، فرانس اور برطانیہ کا مشترکہ جارحانہ حملہ تھا۔ اور دوسرا واقعہ ہندوستان کی شمالی سرحد پر چین کا غاصبانہ اقدام — تنازعۂ نہر سویز کے دوران ہندوستان نے مصر کو پورا تعاون دیا اور جارحانہ کارروائی کرنے والے ممالک کی کھلی مذمت کی۔ جواہرلال نہرو نے مصر کے اس حادثہ کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھا۔ جواہرلال نہرو مصر کے نوجوان اور پُر جوش رہنما جمال عبدالناصر کی جرأت سے بہت متاثر ہوئے۔

نہر سویز پر بمباری کے تین یوم بعد حیدرآباد میں کانگریس پارٹی کے اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے جواہرلال نہرو نے

کہا — "پچھلے دو تین دنوں میں عجیب و غریب واقعات پیش آئے ہیں۔ پہلا واقعہ مصر کے حدود پر اسرائیل کا اچانک حملہ ہے۔ یاد رکھئے کہ کوئی اعلان جنگ نہیں کیا گیا تھا۔ مصر کی سرزمین پر اسرائیل کا یہ اچانک اور غیر متوقع جارحانہ حملہ ہے۔ یہ صلح نامہ کی کھلی خلاف ورزی ہے — اقوام متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی ہے — یہ ایک کھلم کھلا غاصبانہ کارروائی ہے — بین الاقوامی معاملات سے اپنی واقفیت کے تمام عرصے میں برطانیہ اور فرانس کے اس جارحانہ اقدام سے زیادہ بھیانک اور کسی واقعہ کی مثال نہیں دے سکتا —" برطانیہ و فرانس کے ان غاصبانہ حربوں نے ہندوستان اور اس کے رہنما کے ذہن کو مشتعل کر دیا۔ ہفتوں جواہرلال نہرو سویز کے مسئلے اور اس کے پُرامن حل کے لئے پریشان رہے۔ پنڈت نہرو کو پورا یقین تھا کہ ایشیائی افریقی ممالک پر اس سامراجی کارروائی کا ردعمل بہت ہلاک ہو سکتا ہے۔ اگر سامراجی طاقتیں اس جارحانہ پالیسی میں کامیاب ہو گئیں تو تمام ایشیائی ممالک کی تحریک آزادی کو انتہائی نقصان پہنچے گا۔ مصری عوام کے لئے اپنا پیغام ہمدردی بھیجتے ہوئے جواہرلال نہرو نے صدر ناصر کو لکھا — "اگر مصر میں سامراجیت دوبارہ اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئی تو تاریخ کا دور ہی پلٹ جائے گا۔ سامراجیت ان تمام ممالک پر پھر سے مسلط ہو سکتی ہے جہاں سے اس کو دیس نکالا مل چکا ہے۔ لہذا مصر میں سامراجیت کا غلبہ ہرگز برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر یہ پورے ایشیا و افریقہ کے لئے ایک نئی جنگ کا اعلان ہوگا —"

جواہرلال نہرو کے ان الفاظ کا عرب عوام، عرب رہنما اور عرب صحافت پر بہت گہرا اثر پڑا اور ان سب نے یک زبان ہو کر پنڈت نہرو کی ان کوششوں کو سراہا جس سے حملہ آور ملکوں کے مقاصد طشت از بام ہوئے اور عرب مقصد کو دوسرے ممالک میں رائے عامہ کی موافقت حاصل ہوئی۔ عرب ممالک میں پنڈت نہرو کو "رسولِ امن" اور "مجاہدِ فلاح" کے لقب سے نوازا گیا۔ صدر ناصر نے مصری سیاست کے اس نازک مرحلے پر ہندوستان کے تعاون کا بار بار اعتراف کیا۔ چند سال قبل اپنے پچھلے دورۂ ہند کے دوران صدر ناصر نے پنڈت نہرو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا — "ہندوستان کے اخلاقی تعاون کا عالمی رائے عامہ پر بہت گہرا اثر پڑا۔ ہندوستان کی مادی امداد نے مصر کو اس وقت بہت سہارا دیا جبکہ حملہ آور ملکوں نے مصر کا معاشیاتی بائیکاٹ کر دیا تھا —" جواہرلال نہرو کے بارے میں صدر ناصر نے کہا — "میرے ہم وطنوں کو اس عظیم انسان سے ملاقات کا شرف حاصل ہے جس نے نئی تاریخ کو جنم دیا ہے اور جو دورِ حاضر کا بہترین دماغ ہے۔ میرے ہم وطن (نہرو کے توسط سے) ہندوستان سے بھی ملتے رہتے ہیں۔ اس راستے پر جو ہمارے مستقبل کے عروج کی طرف گامزن ہے —" سویز حادثہ کے بعد سے دونوں ممالک کے رہنما ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے اور اکثر اہم بین الاقوامی معاملات پر ایک دوسرے کو آگاہ کرتے رہے۔

وہ کھلی اظہارِ تعاون جو تقریباً تمام عرب ممالک نے ہندوستان سے چینی حملے کے سلسلے میں کیا اس کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ جغرافیائی، تاریخی، سیاسی اور تمدنی لحاظ سے بھی ہندوستان اور عرب ممالک ایک دوسرے سے بہت قریب رہے جبکہ عربوں نے چین کو ہمیشہ 'دور دراز ملک' مانا ہے۔ ہندوستان نے چین کے جارحانہ حملے کے خلاف قدم اُٹھایا تو بیشتر عرب ممالک سے پورا پورا تعاون ملا۔ کئی عرب ممالک نے ہندوستان کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کیا جبکہ کسی بھی عرب ملک نے چین کی ملک گیر پالیسی کا ساتھ نہیں دیا۔ اردن کے وزیراعظم وصفی التل کا پیغام اس ضمن میں مخصوص پیغامات میں سے تھا جس میں انھوں نے ہندوستان کو یقین دلایا تھا کہ اس نازک مرحلے میں ان کے ملک کی ہمدردیاں ہندوستان کے ساتھ ہیں۔ صرف اس لئے نہیں کہ ہندوستان اور اردن رشتۂ دوستی میں منسلک ہیں بلکہ اس لئے کہ ہمیں محکم یقین ہے کہ ہندوستان امن انصاف کے دائرہ میں امنِ عالم کے اصولوں کی پاسبانی کرتا ہے۔"

عرب صحافی، اہلِ سیاست، اہلِ دانش سب ہندوستان سے ہمدردی و تعاون میں ایک زبان تھے۔ عراق میں وہاں کے وکلاء، ڈاکٹر، صحافی، اہلِ دانش اور اہلِ سیاست نے جن میں حسین جمیل، ہندوستان میں عراق کے سابق سفیر بھی شامل ہیں، ایک اعلانیہ میں چین کی غاصبانہ ملک گیری کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ اس اعلانیہ میں کہا گیا کہ "چین نے جس علاقہ پر غاصبانہ دعویٰ کرتے ہوئے فوجی قبضہ کر لیا ہے، بین الاقوامی قانون کی رو سے مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہم اس تنازعہ میں ہندوستان کے ساتھ ہیں اور یہ توقع ہے کہ مخالف جماعت اپنے اس اقدام کی سنگینی کا احساس کرے گی۔" عراق کے اہلِ دانش کے اس اعلانیہ کے بعد اسی طرح کے بیانات اکثر عرب ممالک کے سرکاری و غیر سرکاری اداروں کی طرف سے جاری کیے گئے۔ افریشیائی اتحاد کمیٹی کے اجلاس بغداد نے چین پر نکتہ چینی کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ "چین اس سرحد تک واپس چلا جائے جو ہندوستان و چین کے درمیان مانی ہوئی سرحد ہے۔"

اردن اور عراق کے علاوہ ٹیونیشیا، مراقش، لبنان، سعودی عرب، کویت، لیبیا کی حکومتوں نے تعاون و امداد کا اعلان کیا۔

حملۂ چین کے دوران اور اس کے بعد جواہر لال نہرو اور صدر ناصر کے درمیان مسلسل رابطہ قائم رہا۔ متحدہ عرب جمہوریہ کی ہمدردیاں ہندوستان کے ساتھ ہیں، اس کا تو علم تھا ہی، لیکن جب متحدہ عرب جمہوریہ نے چین کے مستمر رویہ سے پیدا شدہ پیچیدگیوں کا پُرامن اور قابلِ قبول حل ڈھونڈنے کی تجویز رکھی تو حکومت ہند نے اس کا استقبال کیا۔ لہٰذا صدر ناصر کی یہ تجویز کہ فوراً جنگ بند کر دی جائے اور چینی فوجیں اس مقام پر واپس چلی جائیں جس جگہ وہ ۲۰ اکتوبر کے حملہ سے قبل تھیں، یعنی اس جگہ تک جہاں چینی فوجیں ۸ ستمبر کو خیمہ زن تھیں، ہندوستان نے فوراً قبول کر لی۔ لیکن پیکنگ نے اس تجویز کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا۔ بایں ہمہ متحدہ عرب جمہوریہ کے اکابرین نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ وزیر اعلیٰ علی صبری، جمال ناصر کی تجویزوں کو منوانے کے خیال سے پیکنگ گئے، اور واپسی پر ہندوستان بھی تشریف لائے۔ کولمبو کانفرنس میں علی صبری نے اصرار کیا کہ ناصر تجاویز کو فریقین کے درمیان مصالحت کی گفت و شنید کی شرطِ اوّلیں قرار دیا جائے۔ چین نے پھر اس سلسلے میں مطابقت نہ کرتے ہوئے متحدہ عرب جمہوریہ پر "ہند دوستی" کا الزام لگایا۔ اس مقام پر متحدہ عرب جمہوریہ ہندوستان سے اپنی ہمدردیاں نہ چھپا سکا۔ نیم سرکاری جریدہ 'الجمہوریہ' نے چینی موقف پر سخت تنقید کرتے ہوئے چین کو غاصب، حملہ آور گردانا۔ اور 'الاہرام' کے مدیر حسنین ہیکل نے لکھا کہ "جنگ فوراً بند کر دی جائے اور فریقین اس مقام پر واپس لوٹ جائیں جہاں لڑائی کے آغاز سے قبل ان کی فوجیں تھیں۔" دوسرے عرب ممالک کے اخباروں نے اور بھی زیادہ سخت الفاظ میں چین کی جارحانہ کارروائیوں کی مذمت کی۔

یہ دو واقعات جن کے دوران ہندوستان اور عرب ممالک ایک دوسرے کے معاون بن کر شانہ بشانہ کھڑے ہوئے اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ ان ملکوں کے عوام رشتۂ دوستی میں منسلک ہیں۔ اس گہری دوستی کی بنیادیں نوآبادیاتی نظام کے خلاف تحریک پر قائم ہوئیں اور غیر ملکی اقتدار کے خلاف عوامی مہم دھیرے دھیرے ان کے درمیان ایک مشترک رابطہ بن گئی۔

جواہر لال نہرو آزاد بھارت کے لئے آزاد عرب کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ بیسویں صدی کے ثلث اوّل کے اواخر میں جب پنڈت نہرو کانگریس کے ایک با اثر رہنما اور پارٹی کی بین الاقوامی پالیسی کی نیابت کے ذمہ دار مان لئے گئے تو ان کے تعلقات عرب اہلِ دانش اور جنگِ آزادی کے جانبازوں سے قائم ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں برسلز کانفرنس کے انعقاد میں، جو سامراجیت اور ملک گیری کے خلاف کی گئی تھی۔ ان کی ملاقات عرب اہلِ دانش اور مجاہدینِ آزادی کی ایک بڑی تعداد سے ہوئی۔ نہرو جی کو ان کی جرأت و بیباکی پسند آئی اور ان کے اس محکم یقین سے کہ وہ ضرور نوآبادیاتی نظام پر غالب آئیں گے، بہت متاثر ہوئے۔ کل ہند کانگریس کمیٹی کو اپنی روداد بھیجتے ہوئے انھوں نے ان جانبازوں کے لئے پُرجوش عقیدت کا اظہار کیا۔ نہرو جی نے لکھا۔ "سیریا اور شمالی افریقہ کے یہ عرب، ہم

سے بہت مختلف ہیں۔ یہ مثالی جنگ بازِ آزادی اور اس کے لئے جان دینا اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری باتوں کی قطعی پروا نہیں کرتے۔ وہ اس غلامانہ ذہنیت سے جو زیادہ دانش مند نسلوں کی خصوصیت ہے بالکل مبرا ہیں۔" جوان، تیز فہم اور جذبۂ انقلاب سے چُور جواہرلال جلدی ہی کانفرنس میں مرکزِ توجہ بن گئے۔ وہ عرب مدبّرین جنھوں نے نہرو کے متعلق بہت کچھ سُنا تھا ان کے ساتھ طویل گفتگو میں منہمک ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد ہی سے نہرو ہند و عرب ممالک کی تحریکِ آزادی کے مابین ایک ناگزیر رابطہ بن گئے۔ کانفرنس میں آئے ہوئے عرب نمائندے نہرو جی کی عربوں کے مفاد کے لئے کی گئی جدوجہد سے بے طرح متاثر ہوئے۔ انھوں نے میسوپوٹیمیا (جو آج کل عراق کے نام سے موسوم ہے) پر ایک قرارداد کا مسودہ تیار کیا، کیونکہ اس ملک کا نمائندہ شریک نہ ہوا تھا۔ نہرو نے محسوس کیا کہ میسوپوٹیمیا کے جذبات کا اظہار ان کی ذمہ داری ہے کیونکہ ہندوستانی فوجی دستے نے اس کو مغلوب کیا تھا جسے وہاں تعینات کیا گیا تھا۔ ہندوستانی کلرکوں اور دوسرے ملازمین کی ایک کثیر تعداد اس ملک سے استفادہ حاصل کرنے میں شریک تھی۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس قابض فوج کو واپس بلائے جانے کے لئے آواز اٹھائیں۔ یہ کہہ دیں کہ ہم اس سامراجی سٹے بازی میں حصہ نہیں لینا چاہتے۔"

ان کے دورۂ یورپ سے ہندوستان واپس آنے پر افریقی۔ ایشیائی ممالک کے سلسلے میں کانگریس کی پالیسی بنیادی تبدیلی کے بعد متعین کی گئی۔ اب کانگریس کی پالیسی نوآبادیاتی نظام کے خلاف عالمی تحریک کے ضمن میں زیادہ محارب اور بے دھڑک تھی۔ ۱۹۲۸ء میں ہونے والے کلکتہ سیشن میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے یہ قرارداد منظور کی "ہندوستان ان تمام عرب ممالک کے ساتھ ہے جو مغربی سامراجی شکنجے سے نکلنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ کانگریس کی رائے میں مغربی سامراجیت ہندوستان کی جہدِ آزادی کے لئے بھی ایک بڑا خطرہ ہے۔" ٹیونشیا کی دستور پارٹی کے ایک عظیم قومی رہنما شیدی بن مصطفےٰ نے، جن کی ملاقات جواہرلال نہرو سے برسلز میں ہوئی تھی، کانگریس کے صدر موتی لال نہرو کو ایک مراسلہ بھیجا — "آزادی کے لئے ہندوستان کی جدوجہد مغلوب قوموں کو آزادی بخشنے کی عالمی تحریک کا ایک ضمنی جزو ہے۔ اس موقع پر جب آپ سامراجی طاقتوں سے کسی قسم کی مصالحت کرنے کے لئے تیار نہیں، میری جماعت کی تمام تر ہمدردیاں، تائید اور یقین آپ کے ساتھ ہیں۔ میرے عزیز ساتھی، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اہلِ ٹیونیشیا کی سب سے پُر شوق خواہش ہندوستان کا اس جدوجہد میں سرخرو ہونا ہے۔"

ہندوستان کے مجاہدینِ آزادی نے اس مراسلہ کا دلی خیر مقدم کیا۔ نوآبادیاتی نظام کے خلاف تحریک کے دوران مصر کی وفد پارٹی نے پہلے سعد زغلول پاشا اور اُن کے بعد مصطفےٰ نحاس پاشا کی سربراہی میں کانگریس پارٹی اور اس کے رہنماؤں جواہرلال نہرو اور گاندھی جی سے رابطہ قائم رکھا۔ ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد جب گاندھی جی واپس ہوئے تو انھوں نے مصر کے عظیم قومی رہنما زغلول پاشا کی بیوہ صفیہ زغلول سے ملاقات کی۔ زغلول نے گاندھی جی کو 'روح المشرق' کا خطاب دیا تھا۔ مصر کے مشہور شاعر شوقی نے گاندھی جی کی مصر میں آمد کو 'دو بڑی تہذیبوں اور نیل و گنگا کے سنگم" سے عبارت کیا۔ گاندھی جی پر مصر کی سیاسی زندگی کی غیر مذہبی (سیکولر) خصوصیت کا گہرا اثر پڑا۔ دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر یورپ سے واپس ہوتے ہوئے جواہرلال نہرو نے اسکندریہ میں قیام کیا۔ جہاں انھوں نے وفد جماعت کے نوعمر ممبروں کے ایک اجلاس میں شرکت کی۔ وفد پارٹی کے رہنما نحاس پاشا سے بھی نوآبادیات کی جدوجہد کے مختلف پہلوؤں پر طویل گفت و شنید ہوئی۔ نہرو جی نے نحاس پاشا کو کانگریس پارٹی کے آئندہ اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ ۱۹۲۹ء میں

پانچ نمائندوں پر مشتمل ایک وفد نے محمود باسیونی کی سربراہی میں کانگریس کے تری پورہ اجلاس میں شرکت کی۔ اس اجلاس نے 'مصری بھائیوں' کی آمد اور ان کو خوش آمدید کہنا قابلِ فخر سمجھا۔ کانگریس کے صدر سبھاش چندر بوس نے اس وفد کی موجودگی کو "مصر و ہند کی تحریک آزادی میں ہم آہنگی" سے تشبیہہ دی۔ سبھاش چندر بوس نے عرب قوم کی قربانیوں، اولوالعزمی اور ہمت کے لئے ہندوستانیوں کے جذبۂ تحسین کا ذکر کرتے ہوئے عربوں سے ان کے بلند مقاصد میں مکمل کامیابی کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اپنے قیام ہندوستان کے دوران وفد کے رہنماؤں نے یہ پوری طرح واضح کر دیا کہ مذہب اور سیاست زندگی کے دو بالکل مختلف پہلو ہیں۔ انھوں نے مسلم لیگ کے اس اجلاس میں شرکت کرنے سے بھی انکار کر دیا جو خاص طور پر ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔

قاہرہ، دمشق اور بیروت کے اخباروں نے بڑے پُرجوش اداریے لکھے جس میں انھوں نے عرب اور ہندوستان کی قومی تحریکوں میں زیادہ منظم رابطہ اور اشتراکِ عمل قائم کرنے پر زور دیا۔ جواہر لال نہرو عرب ممالک میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف سرگرمیوں کی علامت سمجھے جانے لگے۔ بیروت سے لے کر خرطوم اور کاسابلینکا سے عدن تک تمام عرب اہلِ دانش اور طلباء کو نہرو کی شخصیت میں انتہائی کشش نظر آئی اور نہرو کے پُرعزم اور پُرجوش خیالوں نے ان کے دلوں میں شعلے بھڑکا دئے۔ خرطوم میں طلباء کو ان کے برطانوی اساتذہ نے کبھی سرزنش کی اور کبھی جسمانی سزا دی، کیونکہ وہ نہرو کی تصانیف پڑھنے اور نہرو کی تصاویر کی نمائش سے باز نہیں آتے تھے۔ عرب اہلِ دانش نے ہندوستان کی قومی تحریک کا غائر مطالعہ کیا اور مختصر عرصے میں چند بڑی معرکۃ الآرا تصانیف اس موضوع پر شائع کیں۔ سعد زغلول کے سوانح نگار عباس محمود العقاد نے مہاتما گاندھی کی سوانح عمری میں ہندوستانی قومی تحریک کی روحانی گہرائی پر زور دیا ہے۔ ایک اور عرب دانشور احمد قاسم غمرا، جو کانگریس کے تری پورہ اجلاس میں موجود تھے اور بعد میں 'الجمہوریہ' کے مدیرِ خاص مقرر ہوئے، ان کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب A Giant from the East ہے' جو ہندوستان پر لکھی گئی ہے۔ بیروت اور قاہرہ کے اشاعتی ادارے مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کی تصانیف اور تقاریر کا عربی ترجمہ شائع کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ گاندھی جی کی سوانح حیات لکھی اور شائع کی گئی ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی تصانیف کا مشہور عربی ادیبوں نے ترجمہ کیا۔ الجزائر کے ادیب ملک بن النبی کی مشہور تصنیف L'Afro-Asianisme کا مرکزی خیال گاندھی جی کا عدم تشدد کا فلسفہ ہے۔ ملک نے لکھا ہے کہ افریقہ و ایشیا کی نوآبادیاتی نظام کے خلاف تحریک گاندھی جی کی مرہونِ منت ہے۔ کیونکہ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے افریقہ و ایشیا کے ذہنوں میں انقلابی جوش پیدا کیا، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے دل میں یورپ کے عوام کے لئے کوئی جذبۂ انتقام یا نفرت نہیں تھا۔

عرب ممالک کا ہندوستانیوں کے جذبۂ حریت کو اس قدر نظرِ تحسین سے دیکھنے کی اہم وجہ ہندوستان کا وہ واضح رویہ ہے جو اسرائیل کے سلسلے میں برقرار رکھا گیا۔ انڈین نیشنل کانگریس نے جو آزادی سے قبل کے ہندوستان کے رائے عامہ کی ترجمان تھی، مسئلۂ فلسطین کے بارے میں برطانوی کارمنصبی کے خلاف لگاتار قرار دادیں پاس کیں۔ لہٰذا مسئلۂ فلسطین میں عرب مقاصد کا ساتھ دینا آزادی کے بعد کی چیز نہیں۔ ۱۹۳۷ء میں ہی آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے فلسطین میں ان کارروائیوں اور دہشت و ہیبت کی عملداری جو برطانیہ نے عرب ممالک پر اس لئے مسلط کر دی تھی کہ عرب تقسیم فلسطین کے مجوزہ پلان کو مان لینے پر مجبور ہو جائیں، سخت مذمت کی تھی۔ ایک سال بعد تری پورہ اجلاس میں کانگریس نے دوبارہ برطانیہ کے

تقسیمِ فلسطین کے فیصلے پر جو عرب مخالفت کے باوجود کیا گیا تھا نکتہ چینی ما مجتناب کیا۔ کانگریس کے تریپورہ اجلاس نے ان صیہونیاتی عناصر کی سخت سرزنش کی جنھوں نے اپنی رعایاتِ خصوصی کے استدلال کے لئے برطانوی مسلح فوجوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کیا تھا۔ ہندوستانی عوام تقسیمِ فلسطین سے خوش نہیں تھے۔ ۱۹۴۶ء میں لندن جاتے ہوئے جواہر لال نہرو نے قاہرہ میں قیام کیا۔ عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل مسٹر اعظم پاشا سے ملاقات ہوئی تو عرب مقصد کے لئے ہندوستان کی ہمدردیاں ان تک پہنچائیں۔ جولائی ۱۹۵۲ء کے انقلابِ مصر کے چند ماہ بعد ہی کل ہند کانگریس کمیٹی نے ایک قرارداد کے ذریعہ اس نئے جمہوریہ کے قیام کا خیر مقدم کیا اور مصر کے اختیارِ خود مختاری کے دعویٰ کا ساتھ دیا۔ تیونسیا اور الجزائر کی تحریکِ آزادی کو بھی ہندوستان کا پورا پورا اخلاقی اور مادی تعاون حاصل تھا۔ ان دونوں تحریکوں کے انقلابی دفاتر دہلی میں قائم ہوئے جو اپنے ملک کی آزادی کے مقصد کے لئے آواز اٹھاتے رہے۔

چناں چہ آزاد ہندوستان اور اُبھرتے ہوئے عرب ممالک کے آپسی تعلقات، دوستی کا تجزیہ ان مشترک لائحۂ عمل کی روشنی میں کرنا چاہئیے۔ لہٰذا چند سال قبل جب صدر ناصر نے ایک برطانوی نامہ نگار کو بتایا کہ جواہر لال نہرو کی شخصیت ان کے لئے فیضانِ قلبی کا مستقل منبع ہے تو وہ صرف ایک رسمی جملہ نہیں دہرا رہے تھے۔ اس ہندوستانی راہنما نے بھی اپنا یہ اصول بنا لیا تھا کہ وہ جب بھی قاہرہ سے گزرتے چند یوم ضرور مصر کے انقلابی رہنماؤں کے ساتھ گزارتے۔

متحدہ عرب جمہوریہ کے نائب صدر مسٹر محمد شافعی نے حال ہی میں راقم کو بتایا کہ مصری اکابر اس کے متمنی تھے کہ نہرو جی کے تجربات سے اس طویل گفتگو کے دوران جبکہ "وہ بولتے اور ہم ہمہ تن گوش رہتے۔" جو کچھ حاصل کر سکیں کر لیں۔ وہ پنڈت نہرو سے مطالبہ کرتے کہ وہ ناوابستگی کی پالیسی، اشتراکیت اور منصوبہ بندی پر روشنی ڈالیں کیونکہ نوجوان مصری رہنما ان کی بابت زیادہ نہیں جانتے تھے۔

بھارت میں اسلام کے اصولوں کا احترام

بنڈونگ میں حال ہی میں منعقدہ افریقی اور ایشیائی ملکوں کی اسلامی کانفرنس میں جس بھارتی وفد نے شرکت کی اس کی آخری پبلک مصروفیت جکارتہ کی یونی ورسٹی میں رہی جہاں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے مولینا سعید احمد اکبرآبادی اور مدراس کے مسلم کالج کے پرنسپل مولینا عبدالوہاب بخاری نے "بھارت میں اسلام" کے موضوع پر تقریریں کیں ---- مولانا بخاری نے اس امداد، حوصلہ افزائی اور مساویانہ سلوک کا ذکر کیا جو بھارت کے مسلمانوں کو نہ صرف غیر مسلموں بلکہ بھارت سرکار سے بھی حاصل ہوئے جن سے اسلام بھارت میں عوام کے ایک بڑے مذہب کے طور پر فروغ پا سکا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا ملک بھارت اتنا ہی سیکولر ہے جتنا کہ انڈونیشیا۔ تمام لوگ ذات، عقیدے اور مذہب کے لحاظ کے بغیر مساوی حیثیت رکھتے ہیں اور ملک کے آزاد شہری ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اپنی تقریر میں بھارت کے متعدد اداروں کا ذکر کیا جو اسلامی علوم کے لئے وقف ہیں اور کہا کہ دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی بھارت میں اسلام کے فروغ کی زندہ مثال ہیں۔ مولینا موصوف نے بھارت کی جدوجہدِ آزادی کا بیان کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق بھارت کے مسلمانوں نے برطانوی استعماریت کے خلاف جنگ میں اپنے غیر مسلم برادرانِ وطن کے ساتھ شانہ بشانہ حصّہ لیا۔

گڑھوالی آرٹ کا آخری فن کار

جوالارام

١٨٤٨ء - ١٧٨٨ء

جوالارام کے بزرگ گڑھوال کیسے آئے ؟

جوالارام (١٨٤٨ - ١٧٨٨ء) گڑھوالی آرٹ کے شہرۂ آفاق مصور مولارام (١٨٣٣ - ١٧٤٣ء) کا فرزند تھا۔ مولارام فن کار کے علاوہ شاعر بھی تھا۔ مولارام نے کئی منظوم کتابیں لکھی ہیں جو ابھی تک قلمی مسودے کی صورت میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک نظم میں مولارام نے اپنے آباد اجداد کے گڑھوال آنے کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ اس منظوم کتاب کا زیادہ تر حصہ ہم "گڑھ راج اتہاس جولارام کے شبدوں میں" ہندی میں شائع کریں گے!

جوالارام کے بزرگ شام داس اور ہرداس دارا شکوہ کے فرزند (اورنگ زیب کے بھتیجے) سلیمان شکوہ کے ساتھ مئی ١٦٥٨ء میں سری نگر میں گڑھوال کے راجہ پرتھی پت شاہ (١٦٦٧ — ٧٢) کی پناہ میں آئے تھے۔ یہ ایک صحیح تاریخی واقعہ ہے۔ اس کے بارے میں مولارام نے اپنے گڑھ راج کی منظوم تاریخ میں لکھا ہے کہ سلیمان شکوہ نے نگینے سے گڑھوال کے حکمران پرتھی پت شاہ کو تحریر کیا تھا کہ اورنگ زیب کی فوج میرا تعاقب کر رہی ہے۔ مجھے پناہ دیجئے۔ گڑھوال کے راجہ پرتھی پت شاہ نے اپنے دارالخلافہ سری نگر سے سلیمان شکوہ کو تحریر کیا کہ آپ بصد شوق تشریف لائیے لیکن گڑھوال ایک غریب ملک ہے یہاں اشیائے خوردنی کی کمی ہے لہٰذا اپنے ساتھ تھوڑے افراد لائیے۔ سلیمان شکوہ اپنے لشکر کے علاوہ ساتھیوں اور نوکر چاکروں کو نگینے میں چھوڑ کر صرف ١٧ افراد کو ہمراہ لے کر سری نگر آیا۔ وہاں راجہ نے سلیمان شکوہ کو بہ حیثیت مہمان اپنے محل میں ٹھہرایا۔ اورنگ زیب نے گڑھوال کے حکمران کو کہا کہ سلیمان شکوہ کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ جب بوڑھا بادشاہ پرتھی پت شاہ، شاہزادے سلیمان شکوہ کو اورنگ زیب کے پاس بھیجنے پر رضا مند نہ ہوا تو اورنگ زیب نے گڑھوال کے تلہٹی کا لاگرھ کے پاٹلی دون میدان میں (جہاں اب کوربیٹ پارک ہے اور جہاں رام گنگا پر ٠، کروڑ روپے کی لاگت سے ایک ڈیم تعمیر کیا جا رہا ہے) اپنے لشکر کو گڑھوال (سری نگر) پر چڑھائی کرنے کے لئے بھیجا۔ راجہ گھبرا گیا۔ اس کے دنیا دار شہزادے میدنی شاہ اور خود غرض درباریوں نے ایک ڈھونگ رچا۔ سلیمان شکوہ کو گڑھوالی فوج کا سپہ سالار بنا کر اورنگ زیب کے لشکر سے لڑنے کے لئے پاٹلی دون کی طرف روانہ کر دیا اور مصور شام داس اور ہرداس کو شاہزادے کی دولت کے ساتھ سری نگر میں ہی روک لیا۔ دارا کا لشکر لاہور میں اورنگ زیب کی فوج کا مقابلہ کر رہا تھا۔ سلیمان کا ارادہ تھا کہ پہاڑ کے راستے لاہور جائے۔ اورنگ زیب کی فوج الہ آباد سے سلیمان شکوہ کے گروہ کا تعاقب کرتی آ رہی تھی۔

اور باقی دون کے میدانِ جنگ میں شاہزادے کو اورنگ زیب کی فوج کے سپرد کردا دیا۔ جوالارام کے اجداد شام داس اور ہرداس کو سری نگر میں راجہ نے اپنے مصدی اور درباری فن کار کی حیثیت سے مامور کر دیا۔ راجہ ان سے فارسی بھی سیکھنے لگے۔ یہی گڑھوالی مصوری کا بنیادی پتھر ہے۔ ان کی نسل سے ہی جوالارام پیدا ہوا[1]۔ یہاں ہم اس بارے میں مولارام کے الفاظ پیش کرتے ہیں۔ مولارام نے تحریر کیا ہے کہ جب اورنگ زیب کی فوج کالاگڑھ میدانِ جنگ کے لئے روانہ ہو گئی تو راجہ نے۔

سب منتری تب پاس بلائے
راجہ کہے کہا اب کیجے
کون بھانت شہزادہ دیجے
کھیتا کہیں بانڈھ لے جے ہے
وہاں بگڑی کے سونپ دئے ہیں
دوجے کہیں یہ مت ٹھہراؤ
جگت جتن کری کے سمجھاؤ

اورنگ زیب کی فوج کا مقابلہ کرنے کا ڈھونگ رچا گیا اور سلیمان شکوہ سے کہا گیا:

حضرت فوج کتی آئی
چلئے جلدی کریں لڑائی
قلی پا چھے جنس لا دیں
سنگ دیوان جی تنکے آ دیں
شام داس جو کے ہر داس
پتا پتر رہیں مال کے پاس

- - - - - -

- - - - - - -

پکڑ شہزادہ سلیم لے گئے

- - - - - -

جو (مال) شہزادہ کو گڑھ چھوڑیو
مال بادشاہی سب لوٹیو
جیہ دیوان مصدی کہنے
راکھے تیہ دوٹ سب لینے
شام داس ارو رام داس ہی
پتا پتر دوہوں راکھے پاس ہی
تو نور جان دیوان ہی جانے
راکھے پت سوات من مانے
تب سو ہم گڑھ مانجھ رہائے
ہمارے پرکھا یا ودھ آئے
تنکے ونس جنم ہم دھارا
مولا رام نام ہمارا
پانچ روپیہ روز لگائیو
ساٹھ گاؤں جاگیر ہی دینے
اپنے یہ استاد ہی کینے
پڑھی پارسی تنکے پاس ہی
رہے ہوئے جو تنکے داس ہی

جوالارام کے بزرگوں کے نام

شام داس کا لڑکا ہرداس تھا اور اس کا بیٹا تھا ہیرالال۔ ہیرالال کا بیٹا منگت رام تھا۔ اس کا لڑکا مولارام، اور مولارام کا لڑکا جوالارام۔ جوالارام کے لڑکے تیج رام کا جنم ۱۸۳۳ء میں ہوا تھا۔ اسی سال مولارام کی وفات ہو گئی۔ تیج رام کا لڑکا بالک رام راقم الحروف سے ۱۰ برس بڑے تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۵۶ء میں ہوا ان کی پیدائش ۱۸۶۷ء کی تھی۔ تیج رام اور بالک رام کے مکان نئے سری نگر میں میرے مکان کے سامنے واقع ہیں۔ پرانے سری نگر میں ہم لوگوں کے مکان ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھے پشتوں سے ہم لوگ سری نگر میں پڑوسی کی حیثیت سے رہتے آئے ہیں۔ اب بھی بالک رام کے بیٹے بیج ناتھ تومر وہیں ہمارے مکان کے

---

[1] شام داس۔ ہرداس۔ ہیرالال۔ منگت رام۔ مولارام۔ جوالارام
[2] راجپوت [3] براہمن

سامنے رہتا ہے۔ ہم تیج رام ساہ جی کو روزانہ زیور وغیرہ بناتے ہوئے دیکھتے تھے۔ گڑھوال میں سونے چاندی کا کام کرنے والے کلاکاروں کو ساہ کے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ الموڑہ میں تجارت کرنے والے ویش لوگوں کو ساہ کہا جاتا ہے۔ گڑھوال کے شاہی خاندان کے لوگوں کو 'شاہ' کہا جاتا ہے۔ یہ 'شاہ' کا خطاب بہلول لودی نے گڑھوال کے حکمران بہادر شاہ کو اس کی بہادری کی وجہ سے دیا تھا۔ تیج رام جی کے بعد ان کے خاندان میں ہمارے ہمعصر اور عزیز دوست تُلسی رام (۱۸۸۷-۱۹۵۰ء) کے علاوہ یہ کام کسی اور نے نہیں کیا۔ وہ لوگ تجارت کرنے لگے۔ بالک رام ساہ اپنا نام بالک رام تومر لکھنے لگے تھے۔ ان کے فرزندِ ارجمند بیج ناتھ بھی اپنے کو تومر لکھتے ہیں۔ ان کا بھی پیشہ تجارت ہے۔ بیج ناتھ کو بھی تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ وہ لکھنؤ آرٹ اسکول کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ لیکن فن سے دلچسپی رکھنے والوں کی کمی کی وجہ سے بیج ناتھ تومر نے روزی کے لئے خاندانی فن سے تعلق قائم رکھنا فائدہ مند نہیں سمجھا۔ اس طرح بھارت کا قدیم پہاڑی فنِ مصوری پہاڑوں میں ہی غائب ہو گیا۔

مولا رام کے بعد دو قابلِ ذکر فن کار، مولا رام کے فرزند جوالا رام (۱۷۸۸-۱۸۴۴ء) اور مکند رام ساہ کے بیٹے تُلسی رام (۱۸۸۱-۱۹۵۰ء) ہوئے ہیں۔ جوالا رام اور اس کے فن کے بارے میں ہم اس مضمون میں لکھ رہے ہیں۔ تُلسی رام کے فن کا ذکر ہم پھر کبھی کریں گے۔ تُلسی رام نے قدرتی مناظر اور شکار کی مغربی طرز کی کئی تصاویر بنائی ہیں جو ہمارے پاس موجود ہیں۔

گورکھوں کا حملہ

یہاں ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ گڑھوال کے شاہی خاندان کی منظوم تاریخ مولا رام نے کیوں لکھی۔ اٹھارھویں صدی تک یہ طریقہ رائج تھا کہ جو کچھ بھی لوگ لکھتے تھے وہ منظوم یا تک بندی میں لکھتے تھے۔ جب ۱۸۰۳ء میں گورکھوں نے گڑھوال پر حملہ کیا اور گڑھوال کے شاہی خاندان کو سری نگر چھوڑ کر دہرہ دون جانا پڑا اور گڑھوال میں بارہ سال تک گورکھوں نے ظلم و جبر کے ساتھ حکمرانی کی تو مولا رام نے گڑھوال راج کی تاریخ اور اپنے آرٹ کے بارے میں گورکھا گورنر کے اصرار پر ہی قلم اُٹھایا۔ پہلا گورکھا گورنر ہستی دل چوترا سری نگر میں حکومت کرنے لگا تو اس نے مولا رام سے کہا:۔

کانتی پور میں کیرتی تمہاری سنت رہے
اب آنکھ نہیری چتر وچتر تمہارے دیکھے

— — — — — — — —

— — — — — — — — —

کہو کوی گڑھ راج کی اب اُتپتی دیُو سنائی
ودپورک اب دیُو سنائی، مولا رام کہو سمجھائی

کیونکر راج ہاتھ نہ آئیو، اپنا راج کیسے گنوائیو
ہستی دل بوجھے تم سو، کہو یہاں کی بات ہم سو

گورکھا حکمرانوں نے بارہ سال تک گڑھوال میں اتنے جبر و استبداد کے ساتھ حکمرانی کی کہ گڑھوال میں اب تک جب ظلم و تشدد یا طوائف الملوکی کے آثار دکھائی دیتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ یہ 'گورکھا ویانی' ہو رہی ہے۔

گورکھا حملہ الموڑہ سے شروع ہوا تھا۔ گورکھوں کے حملے سے پیشتر گڑھوال کے راجہ کرت شاہ کا بڑا لڑکا پردمن شاہ آٹھ سال تک الموڑے کے تخت پر براجمان رہا۔ اصلی حکومت کی باگ ڈور ہرش دیو جوشی کے ہاتھ میں تھی۔ جب گڑھوال میں جے کرت شاہ کی وفات ہوئی، تب گڑھوال کی گدی کے لالچ میں آ کر پردمن شاہ الموڑے کا راج چھوڑ کر سری نگر (گڑھوال) آ گیا۔ یہاں شاہی تخت کے لئے دو بھائیوں پرم شاہ، پرکرم شاہ اور کنور سدرشن شاہ کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس وقت دہرہ دون گڑھوالی راج کے ماتحت تھا۔ وہاں گڑھوال کے راجہ کا فوجدار (گورنر) گڑھوال کے راجہ کی جانب سے حکومت کرتا تھا۔ راجہ جے کرت شاہ کی حکمرانی کے دور میں ہی فوجدار عجب رام نے بغاوت شروع کر دی تھی۔

گورکھوں (جنھوں نے الموڑے پر قبضہ جمالیا تھا) نے گڑھوال پر دوسری بار ١٨٠٣ء میں حملہ کیا۔ ان کا پہلا حملہ ١٧٧٠ء میں ہوا تھا۔ مگر اس وقت لینڈون کے نزدیک بھیروں گڑھی میں گڑھوالیوں نے انھیں شکست دی اور وہ وہیں سے لوٹ گئے تھے۔ پردمن شاہ (١٧٩٧-١٨٠٤ء) سری نگر چھوڑ کر اپنے ٹہری کے علاقے میں سے ہوتے ہوئے گورکھوں سے لڑتے لڑتے ہٹتے ہوئے دہرہ دون پہنچے۔ یہاں پردمن شاہ ٨ جنوری ١٨٠٤ء کو کھڑبڑا محلے میں گورکھوں کی گولی سے زخمی ہو کر انتقال فرما گئے۔

مولارام سری نگر ہی رہے اور گورکھا گورنر ہستی دل اور کنور سدرشن جوالاپور میں مقیم رہے۔ مولارام چوتریا اور امر سنگھ تھاپا کے درباری فن کار کی حیثیت سے مقرر ہو گئے اور وہ سری نگر میں ہی مصوری اور شاعری کرتے رہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولارام کی اپنے بیٹے جوالارام سے نہیں بنتی تھی یا جب جوالارام نے دیکھا کہ فن کے قدردان گڑھوال میں اب نظر نہیں آتے تو جوالارام الموڑے (جوالا باغ) میں کمایوں کے کمشنر سر ہنری رامجے کی خدمت میں حاضر ہوگئے اور کمشنر کے اہلمد مقرر ہو گئے اور فرصت کے اوقات میں تصویریں بھی بناتے رہے۔ جوالارام کی کافی عمر گڑھوال سے باہر سرکاری نوکری میں گزری۔ اس لئے جوالارام کی تصاویر گڑھوال کے اندر (سری نگر میں) کم دستیاب ہوئی ہیں۔ ایک البم میں جوالارام کے ہاتھ کی ٢١ رنگین تصاویر گڑھوال کے مشہور تیرتھ استھانوں اور گنگا کے کنارے کے شہروں کی، ہری دوار سے کیدار ناتھ اور بدری ناتھ تک کی موجود ہیں۔ یہ البم ہمیں ہمارے عزیز دوست اور بچپن کے ساتھی تلسی رام کے پاس ملی۔ اس میں سے کچھ تصاویر اس مضمون کے ساتھ دی جاتی ہیں۔ جوالارام کی ایک رنگین تصویر ٹہری میں دستیاب ہوئی اور تین تصاویر مسٹر رندھاوا کو کانگڑہ میں لمبا گاؤں کے راجہ کے مجموعہ سے حاصل ہوئیں۔ ان میں سے دو تصویریں مہادیو پاروتی کی — اس مضمون میں دی جا رہی ہیں۔

ان تصویروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولارام نے جوالارام کو رنگ تیار کرنے کا طریقہ نہیں بتایا تھا جس کے تین وجوہ ہو سکتے ہیں۔ یا تو مولارام جوالارام سے خفا تھا یا کلاکاروں کی بری عادت کے مطابق وہ اپنے لڑکے تک کو بھی خاص راز کی باتیں نہیں بتانا چاہتا تھا، یا جوالارام مولارام کے پاس نہیں رہا، اور اپنے والد کے نگار خانے میں اس نے مصوری نہیں کی۔

یاترا کے راستے پر واقع تیرتھ استھانوں کی رنگین تصاویر

جو ٢١ تصاویر گڑھوال کی یاترا کے راستے کے شہروں کی جوالارام نے بنائیں وہ بہت گھٹیا قسم کی ہیں۔ اُن میں قلم کی باریکی بھی نہیں ہے۔ یہ یاترا کے راستے میں پڑنے والے شہروں کی تصاویر ممکن ہے جوالارام نے اپنے حاکم، کمشنر سر ہنری رامجے کے لئے بنائی ہوں، جب وہ کمشنر کے سررشتہ دار یا اہلمد کی حیثیت سے صاحب کے ساتھ دورے پر گڑھوال گئے ہوں۔ اس وقت گڑھوال میں صرف ایک ہی راستہ ہری دوار سے سری نگر ہوتے ہوئے گنگا کے کنارے کنارے تبت کی سرحد ہمالیہ تک جاتا تھا۔

جوالارام نے ہمالیائی پرندوں کی تصاویر بھی بنائیں۔ یہ بھی انھوں نے کمشنر رامجے کے لئے تیار کی تھیں۔ ان میں سے کچھ تصاویر کے بنانے کا مقام (ہلدوانی) اور کچھ تصویروں کے تیار کرنے کا عرصہ بھی لکھا ہے۔ مثلاً مُنال جو گڑھوال کے ہمالیہ کا سب سے حسین پرندہ (جو سات آٹھ ہزار فٹ کی اونچائی تک گھنے دیودار کے جنگلوں میں رہتا ہے) اس کی رنگین تصویر — جوالارام نے ١٧ دسمبر ١٨٢٢ء کو ہلدوانی منڈی ضلع نینی تال[1]

---

[1] دیکھیے سات پہاڑی چتریاں

[1] ہری دوار، دیوپراگ، جہاں بھاگیرتھی اور الکنندہ کا سنگم ہے

[2] ایک عورت حقہ پی رہی ہے

[3] سری نگر (گڑھوال کا دارالخلافہ)

[4] جوشی مٹھ (بدری ناتھ)

میں بنائی تھی۔ کولی پھوا چسٹیا جو بھادر، ہمالیہ کے دامن میں جاڑے کے دنوں میں رہتی ہے، اس کی تصویر ۲۲ دسمبر ۱۸۲۲ء کو کشن پوری (کاشی پور) میں بنائی۔ ظاہر ہے کہ راجہ صاحب جو جاڑوں میں بھادر کا دورہ کر رہے تھے اور وہاں شکار کھیلتے تھے ان کی تفریح کے لئے جوالارام نے پرندوں کی تصویریں بنائیں۔

خاکوں کا البم

جوالارام کے ۴۶ خاکوں کا ایک البم مول باغ الموڑہ سے ۷ میل (جو اس وقت انگریز حکمران راجہ صاحب کا صدر مقام تھا) کی دوری پر ملا ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے مذکورہ تصویروں کا مجموعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس کے ایک صفحے پر جوالارام نے فارسی حروف میں درج کیا ہے کہ یہ تصاویر جوالارام نے اپنے دوست بچھا زرگر (سنار) کی فرمائش پر جول باغ میں ۱۵۔ فروری ۱۸۴۳ء کو تیار کی تھیں۔ جوالارام کے الفاظ ہیں:۔

خاکے بتاریخ پنج دہم ماہ فروری ۱۸۴۳ء در مقام جول باغ برائے خاطر بچھا زرگر نوشتہ در دستخط جوالارام مصور

جوالارام نے اس البم میں بچھا زرگر کا خاکہ بھی بنایا ہے۔ اس کے شانے پر ایک بندر بیٹھا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے بچھا سنار بندر کا بڑا شیدائی تھا اور وہ جوالارام کا گہرا دوست اور اس کا ہم پیشہ تھا۔ جوالارام نے اپنے کو مصور بھی تسلیم کیا ہے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ پہاڑی فن کار ۹۰ فی صد زرگری کے کام کے ساتھ مصوری بھی کرتے تھے۔ اگرچہ مولارام اپنے آپ کو تومر راجپوت بتاتے ہیں۔ تومر ہوتے ہوئے تصویریں بنانا کوئی حقیر کام نہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہندوؤں میں مصوروں اور سناروں کو نگاہِ حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ چانکیہ نے ارتھ شاستر میں فن کاروں کا شمار بھانڈ، بازی گر وغیرہ کے ساتھ کیا ہے۔ اس بات کو مسٹر رندھاوا نے بھی تسلیم کیا ہے کہ کانگڑہ کے فن کاروں میں ۹۰ فی صد سنار ذات کے تھے۔ مولارام اپنے کو مصور بتاتے ہوئے شرماتا تھا۔

ظاہراً ایک ہی (اب تک دستیاب) خاکے 'مستانی' میں جو ۱۹۳۶ء میں ملا۔ اس کے اوپر اس تصویر کی تفصیل دینے کے سلسلے میں مولارام نے اپنے کو مصور تسلیم کیا ہے۔ ہم مولارام کا شعر نیچے درج کرتے ہیں۔

'مستانی' تصویر ۱۷۷۱ء

مستانی چال مست، مرادی بیٹھی اپنے کھانے میں
سن راگ جھکی جھکی جھانکی رہی سکھی پیالہ دے وستانے میں
پتو بھر بھر پھر پھر مانگت ہے ترا تر دانے میں
کوی مولارام مصور کھینچی اسے تصویر رجھانے میں
سمت ۱۸۲۸ (۱۷۷۱ء) سال چیت ۱۶ تاریخ۔

اس تصویر میں مولارام نے کسی خاتون کو نہانے کے بعد سنگھار کرنے سے پہلے بیٹھ کر شراب پیتے دکھایا ہے۔ یہ مستانی (جس کے بیٹھنے کے ڈھنگ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مستانی ہے) برابر اپنی سہیلیوں سے مے کے پیالے مانگ کر پی رہی ہے۔ مولارام نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ اس مصور (چتر کار) کو ایک مسلم دوست نے بتایا کہ نواب واجد علی شاہ کی ایک داشتہ کا نام مستانی بیگم تھا۔

مولارام نے صاف طور پر اس میں اپنے کو مصور تسلیم کیا اور لکھا ہے کہ اس نے اس تصویر کو اپنی تفریح طبع کے لئے بنایا اور اس کے بنانے کا سن ۱۷۷۱ء بھی لکھا ہے۔ یہ خاکے مغل طرز کے ہیں اور بڑے اعلیٰ پیمانے کے ہیں۔ ہم نے کہیں دوسری جگہ یہ ثابت کیا ہے کہ مولارام ۳۰ برس کی عمر تک مغلوں کے طرز کی تصویریں بناتا رہا اور اس کے بعد وہ کانگڑہ (پہاڑی) طرز کی تصویریں بنانے لگا۔

جے دیو وزیر کی تصویر اور اس کی خصوصیات

ایک اور بڑی اہم رنگین تصویر (۱۱ انچ × ۵ انچ) جے دیو وزیر کی مولارام نے کھینچی ہے۔ اس کے اوپر مولارام نے شعروں میں تحریر کیا ہے

داتا گیاتا، گیان مے جے دیو وزیر
لاجونت، سور ویر، ست وادی گمبھیر

وچن کہے سکرے، ہرسے نہ تانے چیت
سوم دیکھی صورت یہ تج اپنی وِت
جے دیو وزیر کی ! اسے تصویر لکھی جب
ڈیوڑ دوسالہ تری، ایک سوایک تب
راکھی بچن پرتیت، جیت جگ میں جس لینو
گڈھیں مترپرسن، سوم، اریکو دُکھ دینو
سنوسنت تب کان دے، مولارام وچار کہیں
سرم وارسوں کام ہے، اور کہ کے جا چکنہیں

مذکورہ بالا شعروں سے صاف عیاں ہے کہ مولارام چترکار (مصور) تھا اور مذکورہ تصویر کو پیش کرنے کے لئے فراخدل دیوان نے اپنی یہ تصویر بنانے کے لئے کافی تحفے مولارام کو دئے۔ ایک دوشالہ، ایک پگڑی اور ایک سوایک روپیہ۔ جے دیو وزیر گڑھوال کے راجہ پردمن شاہ (۱۷۸۵-۱۸۰۴ء) کا دیوان تھا۔ اس کا ثبوت راقم الحروف کو ۲۵۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو شری نگر (گڑھوال) میں ملا۔ کملیشور کے موجودہ مہنت شری گوبند پوری کی پرانی جاگیر کی سندوں میں سے ۱۱ کارتک ۱۸۴۴ سمت کی ایک سند مہاراجہ پردمن شاہ کے حکم سے اُن کے دیوان جے دیو نے مہنت گوسائیں نرمل پوری کے نام کاتب ہری دت کھنڈوڑی سے لکھوائی تھی۔ یہ سند گڑھوالی بولی میں ہے۔ اس کے آخری الفاظ ہیں:

حکومت وزیر جے دیو جی نے چھاپ لکھائی
ہری دت کھنڈوڑی پاس سمت ۱۸۴۴ کارتک
۱۱ گتے۔

اس تصویر میں مولارام نے جے دیو کو ہرنیلے رنگ کے بھوٹیا گھوڑے پر سوار اپنے خادموں (جن میں چوب دار اور حقہ بردار بھی شامل ہیں) کے ساتھ راج دربار کی طرف جاتے دکھایا ہے۔ اس تصویر میں مولارام نے اپنے آپ کو صاف طور پر مصور تسلیم کیا ہے، اگرچہ وہ شاعر کہلانے میں فخر سمجھتا ہے۔

مولارام کی تصویریں گڑھوال سے باہر

مولارام کی کچھ تصاویر مسٹر رندھاوا کو کانگڑے میں لمباگاؤں کے راجہ کے محل سے دستیاب ہوئی ہیں۔ ان میں سے دو تصویریں مہادیو پاربتی کی اس مضمون کے ساتھ دی جا رہی ہیں۔ تصویریں گڑھوال کی راجکماری کے ساتھ لمباگاؤں گئی تھیں۔ شاہی خاندان میں یہ رواج رہا ہے کہ راجکماریوں کی شادی میں جہیز کے ساتھ تصویریں بھی دی جاتی تھیں۔ مولارام کی تصاویر بھی لمباگاؤں کے دربار میں ملی ہیں۔ راجستھان اور پہاڑ کے شاہی درباروں میں جو مختلف فن کاروں اور مختلف طرح کی تصاویر آویزاں ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے۔ دوسری وجہ راجاؤں کا آرٹ سے پیار ہے اور تیسری وجہ ان کو خوش کرنے کے لئے مختلف فنون کی تصاویر راجاؤں کو بھینٹ کرنا ہے۔ ان وجوہ سے پہاڑی ریاستوں میں دوسری ریاستوں کے فن کی تصاویر پائی جاتی ہیں۔ جب کانگڑے کے سب سے بڑے اور مشہور راجہ سنسار چند (۱۷۶۶-۱۸۲۳ء) کے فرزند انرُدھ چند نے ٹہری گڑھوال کے راجہ سدرشن شاہ کو اپنی دو بہنیں ایک ساتھ بیاہ دیں تو ان کے جہیز میں کانگڑہ فن کی تصاویر بھی ٹہری گڑھوال میں رانیوں کے ساتھ آئیں۔ پہاڑی فن سے روشناس حضرات کو اسی وجہ سے اکثر غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ جہاں اُن کو تصاویر دستیاب ہوئیں، اُنکو اسی جگہ کے فنکاروں کی تخلیق بتانے لگے۔ مثلاً مرحوم ننالال مہتہ نے ٹہری کے مہاراجہ نریندر شاہ کے مجموعہ میں کئی پہاڑی تصاویر دیکھیں تو انہیں ٹہری کے فن کاروں کی تخلیقات مان کر اپنی انگریزی کتاب 'ہندوستانی مصوری کا مطالعہ' میں ایک باب ٹہری گڑھوال کورٹ پینٹرز لکھا۔ حالانکہ ٹہری گڑھوال شہر اور حکومت کی بنیاد ۱۸۱۵ء میں پڑی اور ٹہری میں فن کار باہر سے وہاں آکر نہیں بسے۔ گڑھوال کے حکمراں کے ٹہری میں آکر بسنے تک تو پہاڑی فن کا تنزل شروع ہو گیا تھا۔ گڑھوال کے فن کار شری نگر چھوڑ کر نئی دارالحکومت ٹہری میں نہیں آئے۔ اس کی کچھ وجہیں تھیں جنہیں یہاں درج کرنا بہت ضروری نہیں

ہے۔[1]

ٹہری کے راجہ سدرشن شاہ کا چچا پریتم شاہ ٹہری سے شری نگر میں مولا رام کے پاس مصوری سیکھنے آتا تھا۔ کنور پریتم شاہ نے شکایت کی:

ٹہری سیتی رت رہے، گورو وو وارے سے شری نگر
آوت جاوت ہی پگ تھکے، دیو نہیں سگر
ہم پہ کیوں نہیں آوتے تم کو ی مولا رام
کہت ہیں پریتم شاہ تم بیٹھ رہت نج دھام

ٹہری گڑھوال میں رانیوں کے ہمراہ گلیر اور کانگڑہ سے تصاویر آئیں

جب راجہ پرتاپ (۱۸۷۱-۱۸۸۶) کی شادی گلیر کی ایک شہزادی کے ساتھ ہوئی تو اس کے جہیز میں گلیر اور منڈی کے فن کاروں کی تخلیقات بھی آئیں، جن میں سے کچھ اب بھی ٹہری کے شاہی خاندان کے لوگوں کے پاس ہیں اور کچھ برگیڈیر جیال کے مجموعہ میں موجود ہیں اور کئی تصاویر پٹنہ کے مسٹر مانک کے ذریعہ لنڈن پہنچ گئی ہیں۔ کچھ تصویریں آرٹس ڈیلرز کی معرفت بنارس، الہ آباد اور لکھنؤ کے عجائب گھروں میں پہنچ گئی ہیں۔ کئی تصاویر ٹہری گڑھوال میں باہر سے آئی ہیں جو فن کاروں نے ٹہری میں نہیں بنائیں۔ سدرشن شاہ کی دو رانیوں (کانگڑہ کی راجکماریوں) کے ساتھ بھی کانگڑہ طرز کی تصاویر ٹہری گڑھوال پہنچی تھیں۔ رانیوں کے ہمراہ جو تصاویر آئی تھیں انھیں دیکھ کر مسٹر آرچر کو خیال گزرا کہ کانگڑہ اور گلیر سے آکر کلاکار ٹہری میں بس گئے تھے اور انھوں نے گڑھوالی فن کی بنیاد ڈالی تھی۔ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ۱۸۲۰ء سے پہلے ٹہری میں نہ راجہ تھا اور نہ وہاں کوئی شہر تھا۔ گڑھوال کے راجاؤں کے تعلقات کانگڑہ، گلیر، منڈی وغیرہ ریاستوں سے تب شروع ہوئے جب وہ ۱۸۰۴ء میں شری نگر چھوڑ کر چلے گئے تھے اور ۱۸۱۵ء میں ٹہری میں مکان تعمیر کر کے رہنے لگے۔ اس سے پیشتر ٹہری کوئی شہر نہیں تھا۔

مولا رام کے دیگر لڑکے

مولا رام کے اور بھی کئی لڑکے تھے مگر مولا رام نے اپنے لڑکوں کے بارے میں کچھ تحریر نہیں کیا۔ اس کے خاندان والوں کا کہنا ہے کہ مولا رام کے تین بیٹے شری نگر (گڑھوال) کو خیر باد کہہ کر ادھر ادھر چلے گئے تھے ان کی بابت ہمیں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ جوالا رام جو مولا رام کا سب سے بڑا لڑکا تھا، اس کی پیدائش ۱۷۸۸ء میں ہوئی اور وفات ۱۸۴۸ء میں۔ وہ الموڑہ چلا گیا تھا۔ اس کے پڑپوتے ابھی شری نگر میں موجود ہیں۔ مولا رام کا دوسرا لڑکا شو رام (۱۷۹۰-۱۸۵۵ء) مصوری کرتا تھا لیکن وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی۔ یہ پوجا پاٹھ میں مگن رہتا تھا۔ مولا رام کا ایک پڑپوتا تلسی رام (۱۸۸۱-۱۹۵۰ء) جو راقم الحروف سے چار سال بڑا تھا۔ اس کے مغربی طرز کے فنِ مصوری پر ہم پھر کبھی لکھیں گے۔ اگرچہ جوالا رام کی وفات کے ساتھ ہی گڑھوالی

---

[1] ۱۸۰۳ء میں گورکھوں نے گڑھوال ریاست پر حملہ کیا۔ گڑھوال کا شاہی خاندان گڑھوال چھوڑ کر دہرہ دون چلا گیا جو اس وقت ریاست گڑھوال کے ہی ماتحت تھا۔ بارہ سال گورکھوں نے گڑھوال پر حکومت کی۔ ۱۸۱۵ء میں نوجوان گڑھوالی راجہ سدرشن شاہ (۱۸۵۰-۱۸۰۴ء) کی مدد انگریز سرکار نے کی اور گورکھوں کو گڑھوال سے مار بھگایا۔ گڑھوال راج کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ ایک حصہ جس میں آبادی زیادہ تھی، الک نندہ ندی کے سرچشمہ سے بائیں جانب کا سارا علاقہ ہری دوار تک اور الک نندہ کے دائیں کنارے کا گڑھوال منداکنی کے بائیں طرف رودر پراگ تک برٹش سرکار نے برٹش گڑھوال کا نام دے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ باقی گڑھوال منداکنی اور الک نندہ کی داہنی جانب ہردوار تک گڑھوالی راجہ سدرشن شاہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اس نئی ریاست کو ٹہری گڑھوال کے نام سے موسوم کیا گیا۔ راجہ سدرشن شاہ نے اپنی نئی راجدھانی ٹہری ۱۸۱۵ء میں جا گیر تھی اور الک نندہ کے سنگم پر بسائی تب برٹش گڑھوال اور ٹہری گڑھوال کی سرحد گنگا کی بائیں طرف ہری دوار تک تھی۔ برٹش گڑھوال کا نیا صدر مقام شری نگر کی بجائے پوڑی پہاڑ پر قائم کیا گیا۔

فنِ مصوری کا خاتمہ ہو چکا تھا اور جوالا رام ہی گڑھوال کا آخری ممتاز فن کار تھا۔

جوالا رام کے بزرگوں کا گڑھوال (پہاڑی) میں دہلی سے آنا اور جوالا رام کی وفات کے ساتھ گڑھوالی فنِ مصوری کا تنزل، پہاڑی فن کی پیدائش اور تنزل سے متعلق ایک تاریخی واقعہ ہے جس سے دیگر پہاڑی ریاستوں کے فنِ مصوری کے ارتقا اور اس کے زوال کی وجہیں ثابت ہوتی ہیں جس طرح سے ایک خارجی وجہ سے جوالا رام کے آبا و اجداد شری نگر گڑھوال میں سترھویں صدی میں آئے تھے اسی طرح ہماچل کی پہاڑی ریاستوں کانگڑہ، گلیر، منڈی وغیرہ میں ۱۶ ویں اور ۱۷ ویں صدی میں دیگر فن کار مغل بادشاہوں کے دربار سے پہاڑی راجاؤں کے دربار میں آئے۔ اور جس طرح آسرا دینے والوں کی کمی سے پیدا ہونے والی مایوسی کی وجہ سے گڑھوال کا فن غائب ہو گیا۔ اسی طرح پنجاب کی پہاڑی ریاستوں کانگڑہ او گلیر میں بھی فنِ مصوری کا تنزل ہوا۔ پہاڑی فن کے تنزل کی ایک فطری وجہ ہے۔ سبھی ممالک میں فن بام عروج پہنچ کر تنزل کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ پہاڑی فن کے زوال کی بھی یہی فطری وجہ ہے۔ اسے نئے سرے سے جنم دینا آسان نہیں۔ ہمارے درمیان اب بھی کچھ فن کار موجود ہیں جو راجپوت اور پہاڑی طرز فن کی تصویریں بنانے میں ماہر ہیں۔ کاش ان کی تعداد روز بروز بڑھتی۔

ہمیں یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیئے کہ ہندوستانی فنِ مصوری اور فنِ بُت تراشی دنیا کو ہمارے ملک کی خاص پیش کش ہے۔ فنِ مصوری اور فنِ مجسمہ سازی کی تخلیق اس ملک کے باشندے ہندوستانی روایات اور علمِ صنعت کے مطابق کر سکتے ہیں۔ ہمارے شالی اور روایتی فن کی وجہ سے سارے عالم میں ہمارا نام ہے۔ ہمارے فن کار دنیا میں فن کی وجہ سے تبھی شہرت حاصل کر سکتے ہیں جب وہ اپنے بزرگوں کے فن کی تقلید کر کے ایسی تصویریں اور مجسمے بنائیں جنھیں دوسرے دیشوں کے لوگ نہیں بنا سکتے۔

دنیا کے مختلف ممالک کی تہذیب اور فن میں بھی فرق ہے ہر ملک کی اپنی پیش کش ہے۔ مغربی ممالک کا فن چینی، جاپانی، ایرانی، افریقی، میکسیکن اور ہندوستانی فن سے مختلف ہے۔ اگر ہندوستانی کلاکار ہندوستانی فن کی تعمیر نہیں کریں گے، تو دنیا کو وہ فن نصیب نہیں ہوگا جو صرف ہمارے ملک کے فن کار ہی دے سکتے ہیں۔ امید ہے ہمارے فن کار اپنے فرائض کو نبھاتے ہوئے ہندوستان کی تہذیبی شہرت کا جھنڈا لہراتے رہیں گے۔

شمسی طہرانی

شامِ جدائی

اے دوست! اے انیسِ دل وجاں کہاں ہے تُو — اے یارِ نغمہ سنج و غزل خواں کہاں ہے تُو
آشوبِ دہر و آفتِ دوراں کہاں ہے تُو — اے شہریارِ کشورِ خوباں کہاں ہے تُو

بارِ غمِ فراق سے دل پائمال ہے
آئینۂ حیات پہ گردِ ملال ہے

تُو کیا گیا کہ دل سے ہر ارماں چلا گیا — گردوں سے جیسے نیّرِ تاباں چلا گیا
کنعاں سے جیسے یوسفِ کنعاں چلا گیا — گلشن سے جیسے عہدِ بہاراں چلا گیا

آنکھوں سے آرزوئے تماشا چلی گئی
تُو کیا چلا گیا کہ تمنّا چلی گئی

ساون کی پُرسرور گھٹائیں نہیں رہیں — وہ بربطِ طرب کی صدائیں نہیں رہیں
وہ صحنِ گلستاں کی ہوائیں نہیں رہیں — شامِ وصال کی وہ فضائیں نہیں رہیں

میں جی رہا ہوں ہجر میں یوں بے دلی کے ساتھ
جیسے کہ واسطہ ہی نہ ہو زندگی کے ساتھ

بجتا ہے دیرِ مرگ میں ناقوسِ زندگی — بادِ فنا کی زد میں ہے فانوسِ زندگی
وحشت سے پارہ پارہ ہے ملبوسِ زندگی — حد ہے کہ زندگی بھی ہے مایوسِ زندگی

گزری تھی جو کبھی تری زلفوں کی چھاؤں میں
وہ زندگی گھری ہے الم کی گھٹاؤں میں

کچھ یوں قریبِ ختم ہے افسانۂ حیات — جیسے رہینِ درد ہو ریحانۂ حیات
یا قحطِ مے سے بند ہو میخانۂ حیات — یا جیسے بھرنے والا ہو پیمانۂ حیات

ہیں بند مجھ غریب پہ راہیں حیات کی
بنیاد ہل نہ جائے کہیں کائنات کی

جب تو نہیں تو کوچۂ اصنام بند ہے — فردی پہ فیضِ ربِّ ذوالاکرام بند ہے
بابِ نشاطِ حافظ و خیّام بند ہے — دل پر حریمِ دولتِ الہام بند ہے

مُلکِ سخنوری کی وہ شاہی نہیں رہی
گویا زباں پہ وحیِ الٰہی نہیں رہی

مئی ۱۹۶۵ء

کب سے ہے انتظار ترا جانِ انتظار　　ہر لمحہ شامِ زیست کی ظلمت سے ہوں دوچار
اے یارِ ماہ برآمد و خورشید در کنار　　روئے مبیں دکھا مجھے یوں آ کے ایک بار
میرا سیاہ خانۂ غم جگمگا اُٹھے
قلبِ حزیں سے نعرۂ صلِّ علیٰ اُٹھے
رقصاں رُخِ صبیح پہ گیسوئے عنبریں　　جیسے قرینِ شامِ ابد صبحِ اوّلیں
جبریل ہو نثار، وہ گفتارِ دل نشیں　　غارت گرِ شکیب و دل و جان و ہوش و دیں
"بالابلند، عشوہ گرِ سرو نازِ من
کوتاہ کرد قصۂ زہدِ دراز من　(حافظ)
رقصِ نجوم، رنگِ شفق، رامشِ بہار　　نازِ نسیم، نورِ سحر، نغمۂ ہزار
سحرِ سخن، سرودِ صبا، سازِ آبشار　　بوئے گلاب، برگِ حنا، برقِ شعلہ بار
ان سب کے امتزاج سے تیرا وجود ہے
تو شاہ کارِ قدرتِ ربِّ ودود ہے
مجنوں کی ہو نگاہ تو لیلیٰ کہوں تجھے　　موہن کا ہو جمال تو رادھا کہوں تجھے
اختر کی شاعری ہو تو سلمیٰ کہوں تجھے　　حیراں ہوں میری جاں کہ کیا کیا کہوں تجھے
"آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے"　(غالب)
کہتے ہیں لوگ تجھ کو صبا پیکِ معتبر　　قسمت سے سوئے شہرِ نگاراں جو ہو گزر
کہنا کہ اے جہانِ تمنا کے چارہ گر　　بیمار کی خدا کے لئے جلد لے خبر
جینے سے تنگ عاشقِ ناکام آگیا
"اب آفتابِ زیست لبِ بام آگیا"
کہنا کہ اے دیارِ ترنم کے کردگار　　شہنازِ شعر پرور و شہرودِ نغمہ بار
عبداللہ شان و بُتِ برہمن شکار　　گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
مانا کہ جس پہ ناز تھا وہ دل نہیں رہا
سازِ نفس کی شعلہ نوائی کا واسطہ　　بزمِ سخن کی زمزمہ سرائی کا واسطہ
شوقِ جوان و شامِ جدائی کا واسطہ　　اے بُت تجھے خدا کی خدائی کا واسطہ
آجا شباب و شعر کی دُنیا لئے ہوئے
چہرے پہ آب و رنگِ تمنا لئے ہوئے



ایک خاتون حقہ پی رہی ہے

(جوالارام)



بے دیو وزیر

(جوالارام)

جوالارام کے دو شاہکار

(بشکریہ شری ایم. ایس رندھاوا)



شو پاروتی



مہادیو



جوالارام
کے
اسکیچ



دوسادھو

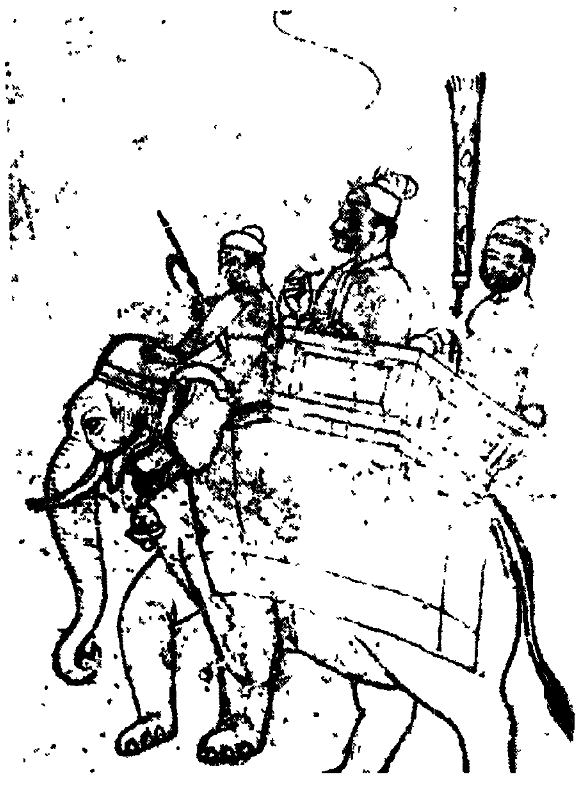
گج گرھ





شیر پر سوار
دُرگا





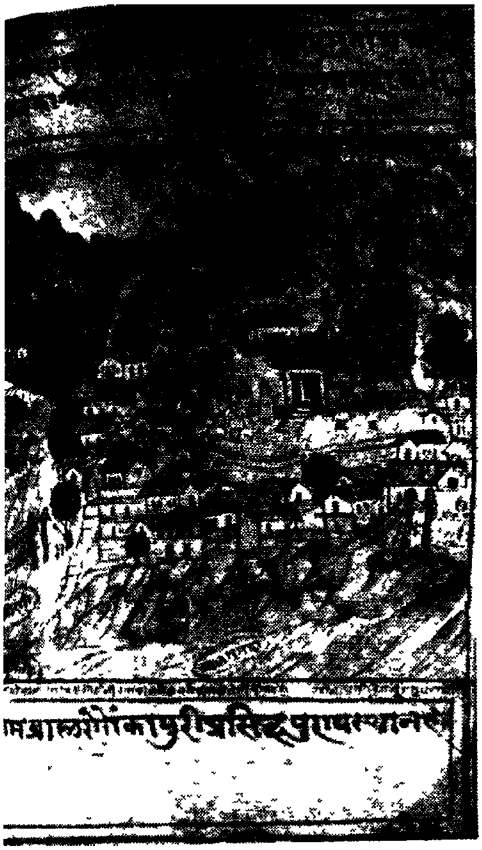
ہاتھی پر سوار
راجہ جے کرت



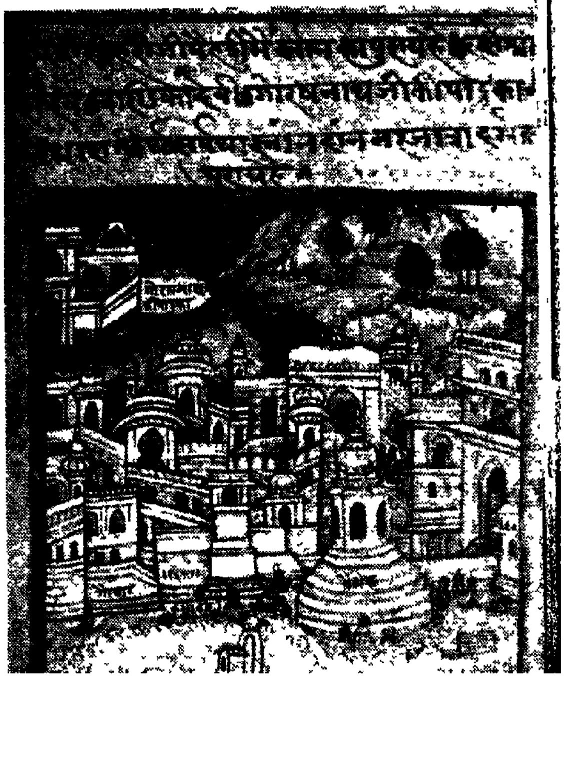
چار
تیرتھ ستھانوں
کے اسکیچ



ہردوار



دیوپریاگ



جوشی مٹھ



بدری ناتھ

اعجاز صدیقی

غزل

ہو جسے ربط دل و روح سے، وہ ساز تو لاؤ
کوئی مانوس سی تبدیلیٔ آواز تو لاؤ

بزم کی بزم ہے اربابِ وفا سے خالی!
کسی دلدار کو ڈھونڈو، کوئی دمساز تو لاؤ

ہمصفیروں سے الگ ہو کے یہ اُڑنا کیسا
اپنی پرواز میں اک جدتِ پرواز تو لاؤ

میکشی عادتِ رندانِ خوش اوقات سہی
کیفِ انجام کو سرمستیٔ آغاز تو لاؤ

خونِ دل ہم بھی اُچھالیں گے سرِ دامنِ شوق
لیکن ایسا کوئی تم عہدِ جنوں ساز تو لاؤ

ہمتیں کچھ تو اسیرانِ قفس کی بڑھ جائیں
پر اُٹھیں یا نہ اُٹھیں، گرمیٔ پرواز تو لاؤ

ایک ہی جام میں کھل جائیں سب اسرارِ وجود
ہم سے رندوں کو بھی میکدۂ راز تو لاؤ

مہ و خورشید سے آنکھ ملانے والو!
ہو اگر کوئی جوابِ نگہِ ناز تو لاؤ

تختۂ دار ہو، یا فرشِ گل و لالہ ہو
رقص کرنے کے لئے رقص کا انداز تو لاؤ

زندگی خواب بھی ہے، خواب کی تعبیر بھی ہے
ہو جو تردیدِ خیالِ دلِ اعجازؔ تو لاؤ

پربھاکر ماچوے

آگنس

آگنس سے میری ملاقات سین فرانسسکو میں ہوئی۔ ایک چھوٹے سے روسی ہوٹل میں ہم بیٹھے تھے جہاں کی ویٹرس روسی بولتی تھی اور جہاں 'بورش' مخصوص روسی انداز سے پکایا جاتا تھا۔ میرے دوست اسپنسر بیرگ مجھے وہاں لے گئے تھے۔ ہم انھیں 'بیرگ' کہتے تھے۔ ہم الحاد پر باتیں کر رہے تھے کہ وہاں ایک امریکی عورت 'اکیڈو' کے معاملے میں بے پڑا آئی۔ دور سے ہی بیرگ نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے اپنی میز پر بلا لیا۔

آگنس آئی اور مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

بیرگ نے کہا۔ "ہمارے ہندوستانی دوست ہیں۔ ڈاکٹر ہری داس چودھری کے یہاں ملاقات ہوگئی تھی۔ فلسفہ ادب کے باعث ہم دونوں ساتھ آئے ہیں۔"

آگنس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ہوا میں ایک ہاتھ سے سارے فلسفیوں کو اس طرح سے ٹالتے ہوئے جیسے سُوکھے پتے ہوں، کہا "اوہ! ڈاکٹر چودھری! بھلا آدمی ہے۔ مجھے بھی کچھ کتابیں دی تھیں —— 'ڈیوائن لائف' یا ایسا ہی کچھ عنوان تھا۔ نیند آنے کے لئے اکسیر دوا ہے۔ بیرگ، اب بتاؤ میری زندگی میں کچھ بھی ملکوتی ہو سکتا ہے؟"

بیرگ نے بڑی ذہانت سے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا "روسی کیویر کھاؤ گی؟ مجھے معلوم ہے تمہیں بورش پسند نہیں ہے۔ پہلے یہ بتاؤ آگنس، تم اس روسی ریستوران میں کیوں آتی ہو؟"

آگنس نے پھر آنکھیں نیم وا کرکے جواب دیا —— "تم جانتے ہو بیرگ، میں ہر امریکی چیز سے پتہ نہیں کیوں اوب گئی ہوں۔ تم نہیں جانتے اب میں شراب بھی غیر ملکی پیتی ہوں —— فرنچ یا اٹالین۔ جرمن ہو تو بیئر چل سکتی ہے، ورنہ پتہ نہیں کیوں اس ملک سے بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔"

بیرگ نے کہا۔ "پیس کور میں شامل ہو جاؤ —— افریقہ پہنچ جاؤ گی۔"

"وہ سب اتنی مشقت کا کام اپنے سے نہیں ہوگا، بابا۔ جب یہیں اندر ہی نہیں ہے تو باہر کیا دیں گے؟ پر تم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ ہندوستانی دوست کرتے کیا ہیں؟"

"ان کا نام سوہن ہے اور یہ ماڈرن پینٹنگ کرتے ہیں۔ ویسے بہت سی چیزوں میں ان کی دلچسپی ہے۔ کورے فلسفی نہیں ہیں۔"

اب آگنس کے چہرے پر کچھ فطری انداز نمایاں ہوئے۔

"بیرگ کبھی میں بھی پینٹنگ کرتی تھی۔ میں نے کتنی بڑی بڑی خوبصورت تصویریں بنائی تھیں! وہ ظالم ڈین، اس نے سب جلا ڈالا۔"

میں نے پوچھا۔ "ڈین کون؟"

بیرگ نے بیچ بچاؤ کیا —— "آگنس کا پہلا خاوند جسے ڈائیورس دے چکی ہے۔ وہ بڑی دردناک کہانی ہے۔ آگنس

بھی سنائے گی۔"

میں نے کہا۔ "پہلا ڈائیورس کیا ہوا خاوند؟"

برگ نے پھر بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "آگنس کے گھر کبھی جانا۔ اس نے دو بار محبت کی، دو بار شادی کی، دو بار ٹھگی گئی۔ دو بار ڈائیورس لیا۔ اب اسے مرد کے نام تک سے نفرت ہو گئی ہے۔"

آگنس: ۔ "نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں اب بھی بیلے کلاس میں جاتی ہوں۔ میرا پیانو ماسٹر مجھ پر ریجھا ہوا ہے۔ کبھی کبھی وہ ایفیمی شاعر ولیم بھی آ کر لمبی آہیں بھر بھر کر شاعری کے نام پر پتہ نہیں کیا کچھ بے معنی سناتا ہے۔ میں ان سب کو برداشت کر لیتی ہوں۔ برگ یہ سارے لوگ مکار ہیں۔ انھیں محبوب، شریکِ حیات، رفیقِ شب کچھ نہیں چاہیئے۔ ان سب کو ایک ماں کی ضرورت ہوتی ہے جس کی آغوش میں دبک کر وہ کچھ پیار حاصل کریں۔ اب میں بڑی عمر کے ایسے بچوں سے تنگ آ گئی ہوں۔ جب مجھے بچہ چاہیئے تھا، تب تو ڈرین نے....."

پھر وہ آنکھیں سرخ کر کے تقریباً ہسٹریائی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے جاتے کہہ گئی ۔۔ "برگ، ابھی مجھے ایک اوپرا میں جانا ہے تم تو جانتے ہی ہو، اپنی زندگی یونہی شراب اور تھیٹر میں کٹ جائے گی۔ اور کوئی ایسی صورت نہیں جس کے لئے مزید جینے کی تمنا کی جائے۔ کبھی اپنے ہندوستانی دوست مسٹر سوہن کو گھر پر لانا....."

میں نے پھر برگ سے پوچھا ۔۔ "آخر کیا تکلیف ہے اس نوجوان عورت کو؟" وہ اس طرح اکھڑی اکھڑی کیوں پھرتی ہے؟"

برگ بولے۔ "کسی دن اس کے گھر جانا۔ وہ آپ ہی اپنی کہانی سنائے گی۔"

کئی دن گزر گئے۔ اپنی تصویروں کی نمائش کے سلسلے میں میں بے حد مصروف تھا۔ ایک دن برگ کا فون آیا ۔۔ "آج شام آگنس کے گھر چلیں گے۔"

میں خالی تھا۔ حامی بھر لی۔ ہم لوگ سین فرانسسکو کی اونچی اونچی گلیاں پار کر کے ایک ایسے علاقے میں پہنچے جو بہت خوبصورت نہیں تھا۔ ظاہر تھا کہ آگنس کے پاس سرمایہ نہیں تھا۔ برگ نے بتایا کہ وہ کہیں بھی جم کر کام نہیں کر پاتی۔ گو بے حد ذہین اور ہوشیار ہے۔ اب کہیں کسی بڑی فرم میں سیکرٹری (ٹائپسٹ) ہے۔

ہم جب آگنس کے گھر پہنچے تو اس کے چھوٹے سے فلیٹ میں کچھ اور ہی عالم تھا۔ ریکارڈ بج رہے تھے۔ ایسا لگا کئی بوتلیں کھل چکی تھیں۔ برگ بھی شامل ہو گیا۔ قہقہوں اور دوستوں میں شام گزر گئی۔ وہی ایفیمی شاعر ولیم تھا لمبے لمبے بال، مخمور آنکھیں، کوٹ کی جیب میں بہت سے کاغذ۔

وہ بڑی سنجیدگی سے نظم سنانا چاہ رہا تھا، مگر سارے لوگ بڑی بے دردی سے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ لوگ زیادہ نہیں تھے۔ چار پانچ مرد، ایک آدھ کی بیوی بھی ساتھ تھی۔

آگنس اس محفل میں بے حد مسرور تھی اور بڑی چلبلی اور خوب صورت باتیں کر رہی تھی۔ موسیقی، فن، شاعری اور ادب پر اس کی گرفت خاصی گہری تھی۔ وہ احمق نہیں تھی۔ شراب نے اس کی ذہانت میں اور چمک پیدا کر دی تھی۔ لوگ اس کی بات کی کاٹ کر کے اسے چھیڑتے جاتے تھے اور وہ ایک دم سارے لوگوں کے خلافِ توقع باتیں کہہ کر سب کو چونکا رہی تھی۔ مثلاً اس نے کہا۔ "ہماری موسیقی بھی ایک سی 'ری ری' میں گھٹنے لگی ہے۔ ہاں 'جاج' نے کچھ دھکا دیا ہے....." یا "نئے فارم میں سب آدمی دیہاتیوں جیسی سادگی لانا چاہتے ہیں۔ یہ غلطی ہے۔ ان کی زندگی بالکل اس سے مختلف ہے۔ بالکل پُرتصنع اور کسی بھی طرح کی سادگی سے دُور اسپاٹ......" یا "ولیم! کیوں بور کرتے ہو؟ عشقیہ شاعری ہر لڑکا لڑکی آغازِ جوانی میں کر ہی لیتا ہے۔ لیکن وہ شاعری کیسے ہوئی؟ وہ تو صرف ایک جسمانی ردِ عمل ہے، جیسے پسینہ، کپکپی یا شرم سے سمٹ جانا۔ شاعری کچھ اور گہری چیز ہے ولیم، صرف گنگناتے الفاظ نہیں۔ یہ تمھارا درد مجھے اُدھار کا لگتا ہے۔ ایسے درد کہیں بندھے بندھائے اوزان میں بہتے ہیں؟ تم سارے فن کار اور شاعر اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہو، فریب دیتے ہو۔"

یوں آگنس بولتی جاتی تھی۔ سب بتاتے تھے اس نے بڑا مطالعہ کیا ہے، بہت سے میوزیم دیکھے ہیں، لیکن زندگی میں کہیں ایک کنجی گم ہو گئی ہے اور وہ سارا علم اور ساری تعلیم بے کار ضائع ہو رہی ہے۔ جس کی توئی مری پڑی ہے۔ لیکن جب وہ کافی پی چکی ہوتی تو اس کے باطن کے خوابیدہ دروازے وا ہو جاتے اور یادوں کے سرچشمے اُبل پڑتے۔

یہ سب کچھ گھنٹوں تک ہوتا رہا۔ تھک کر سب لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے۔ میں سب کے آخر میں رخصت لے رہا تھا کہ آگنس نے ہاتھ کھینچ کر مجھے روک لیا۔ بولی۔ "تم ٹھہرو، مجھے تم سے کچھ بے حد ضروری باتیں کہنی ہیں۔ یہ سب مجھے جانتے ہیں۔ وہ سب مجھ سے وہ مانگنے آتے ہیں جو میں انھیں نہیں دے سکتی۔ لیکن تم نئے ہو، ٹھہرو"

میں خاموش سحر زدہ سا اس کے اپارٹمنٹ میں آ گیا اور اس کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اچانک وہ زار و قطار رونے لگی۔ میں نے اُسے سہارا دینے اور سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کے آنسو نہیں تھمے۔ وہ میرے شانے پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔

میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ کس مصیبت میں پھنس گیا۔

آگنس پھر کچھ سنبھل گئی اور اس نے اپنی کہانی شروع کی۔ وہ پوری کہانی نیلے، کالے اور بھورے رنگوں کی کہانی تھی — ناامیدی اور گہری مایوسی سے بھری ہوئی۔

آگنس نے کہا۔ "میرا پہلا عشق ڈین کے ساتھ ہوا۔ میں بچپن سے کیتھولک گھرانے میں پلی۔ بے شمار بندشوں میں — ڈین پروٹسٹنٹ تھا۔ پھر بھی میں نے کچھ پروا نہ کی۔ میرے والدین فرنچ اور انگریز نسل سے ہیں۔ ڈین جرمن تھا۔ اب میرے دل میں جرمنوں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی ہے اور اسی ضد سے میں نے جرمنوں کے دشمن ایک یہودی سے دوبارہ عشق کیا، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ میری قسمت ایک ٹوٹا ہوا گلاس ہے۔ وہ جڑ نہیں سکتی۔

میں نے کریدا — "کیا یہ تمھارے دونوں ڈائیورس محض مذہبی اختلافات کے باعث ہوئے؟"

آگنس پھر اُبل پڑی۔ "مذہب کیا ہوتا ہے، مسٹر اڈین؟ وہ بھی من کا ایک بڑا دھوکا ہے۔ میری ماں ابھی زندہ ہے۔ اسّی میل دوری پر تنہا رہتی ہے۔ اسے فکر ہے کہ اس کی بیٹی کس جہنم میں پڑی ہے، صبح شام بائبل پڑھتی ہے اور اپنے دل کو تسلی دے لیتی ہے۔ میں سال میں ایک دن، جب اس کی سالگرہ ہوتی ہے، اس کے پاس جاتی ہوں تو حریص نظروں سے دیکھتی رہتی ہے کہ کیا پریذنٹ لائی ہے اس کی بیٹی! ستّر برس بائبل پڑھنے پر اس بڑھیا نے سیکھا یہی ہے! دراصل مذہب ہم اپنے اوپر لادے ہوئے اعتقادوں کو کہتے ہیں۔ جیسے لباس کے اندر ہم سب ننگے ہیں۔ مذہبی چولے سب اُتر جاتے ہیں۔ وحشی آدمی کی بربریت بار بار اُبھرتی ہے......"

میں نے کہا۔ "ڈین کی کسوٹی پہ سارے آدمیوں کو کیوں پرکھتی ہو آگنس؟"

"وہ آدمی تھا یا حیوان! خاصا پڑھا لکھا، ایم۔ ایس۔ سی فزکس میں بھی نئی سے نئی تحقیقات سے واقف۔ وہ ایٹمی ہتھیاروں کے کسی کارخانے کے تجربہ گاہ میں کام کرتا ہے۔ اور معاملوں میں بڑے قاعدے کا آدمی ہے۔ مجھے ہر طرح کی آزادی دی۔ آرٹ اسکول میں داخلہ لے دیا۔ رنگ، روغن سب لا دیئے۔ بڑا ہنس مکھ اور لطیفہ باز۔ مگر سب سے بڑا سوال تب آیا جب شادی کے تین سال بعد مجھے ایک بچے کی خواہش ہوئی۔ کون عورت ماں بننا نہیں چاہتی!"

میں نے بھولے پن سے کہا — "تو اس میں اس قدر اختلاف کی کیا بات تھی؟"

آگنس کی آواز میں اب غصہ اور درد اُبھر آیا۔ بولی۔ "پہلے تو ڈین نے کئی بہانے تراشے — میری تندرستی خراب ہو جائے گی، شادی کے بعد اتنی جلدی ماں بننے کی کیا ضرورت ہے، کئی باتیں کہیں۔ بعد میں اس کا راکھشسی روپ سمجھ میں آیا — وہ باپ بننے کی ذمہ داری نہیں چاہتا تھا۔ اسے بچے کے نام سے نفرت تھی۔ وہ اکیلا اکلوتا بڑھا تھا۔ میں پھر بھی نہیں مانی اور گھر میں چھوٹے موٹے

جھگڑے شروع ہو گئے۔"

ایک دن اس نے میری لکھی نظموں کی کاپی آگ میں جلا دی۔ محض مجھے چڑانے کے لئے۔ میں خاموشی سے وہ ذلت سہہ گئی۔ اس سے بہت کچھ کہا سنی ہو گئی۔ میں نے کہا۔ نہیں لکھوں گی ابھی نہیں لکھوں گی نظمیں۔ اور اس بات کو آج سات برس ہو گئے۔ میں نے ایک لائن بھی نہیں لکھی۔ نظمیں پڑھنے تک سے مجھے متلی ہونے لگی......

میں نے اس سے جھوٹ بول کر بچے کی ماں بننے کا فیصلہ کیا اور جب ایک دن اُسے پتہ چلا تو اس نے میرے سارے پینٹنگ پیلیٹ نائف سے اور چاقو سے پھاڑ دیئے۔ اس دن میری اس کی اتنی باتیں ہوئیں کہ مارے غصے کے میں بے ہوش ہو گئی۔ ہوش میں آنے پر معلوم ہوا کہ وہ کہیں چلا گیا ہے — مجھے تنہا چھوڑ کر۔ گھر میں کوئی نہیں ہے اور گھر میں کٹے پھٹے ٹکڑے پڑے ہیں میری تصویروں کے۔ میرے دل میں ایک ان جانے خوف نے جھانکا۔ میرے بچے کے ساتھ بھی تو ایسا ہی سلوک کرے گا — خیر اتنی دیکھی جائے گی۔ میں طلاق لے لوں گی۔ بچے کو کہیں لے کر چلی جاؤں گی۔ کام کروں گی.....!"

میں نے کہا — "پھر کیا ہوا؟ ڈین میں کوئی رحم دلی باقی نہیں رہ گئی تھی؟ اپنے ننھے بچے کو دیکھ کر کیا اُسے خوشی نہیں ہوئی ہو گی؟

"آگنس اپنی ساری کہانی سنانے پر جیسے تل گئی تھی — "سچ سچ میں اپنے آپ کو نشے سے ہوش میں لانے کے لئے گہری بلیک کافی بنا کر پیتی جاتی — جس دن مجھے بچہ ہوا اور میں شدید تکلیف میں تھی۔ ڈین نے وقت پر ڈاکٹر نہیں بلایا۔ جو ڈاکٹر آیا بھی وہ ایسے نازک موقع پر میری مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں صرف ایک بار اپنے بچے کو کلکاری کرتے ہوئے دیکھ سکی۔ میری آنکھ جھپک گئی۔ بعد میں سنا کہ ڈاکٹر نے یا تو مناسب دوا نہیں دی، یا ڈین میرے خوابوں کو چکنا چور کرنے میں شیطانی لذت لیتا تھا — پتہ نہیں کیا ہوا، بچہ بچ نہ سکا۔

جب زچگی سے اُٹھی تو بے حد نزار و نحیف تھی۔ چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو پہلا کام میں نے ڈین سے طلاق حاصل کرنے کے لئے کورٹ میں درخواست دینے کا کیا۔ اور پھر فوراً میں الگ ہو گئی۔"

میں نے آہ بھری اور کھڑکی سے باہر کا اداس منظر دیکھنے لگا۔ سردیوں کی رات تھی اور کہرا چھایا ہوا تھا۔ دور گرجا گھر کا کراس بہت دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ دونوں طرف کے پیڑ اور جھاڑیاں ایسے لگتی تھیں جیسے شمشان سے لوٹی ہوئی منڈلی ہو۔ کہنے کو کچھ نہیں ہے اور خاموش ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے حیرت زدہ دیکھ رہی ہو۔ اکے دُکے مکان کی کھڑکیوں میں روشنی اونگھ رہی تھی۔

میں نے آگنس کے ساتھ کافی پی اور آگنس اپنی کہانی آگے سنانے لگی — "اس طرح دو سال اکیلے، در در ٹھوکریں کھاتی ہوئی میں پریم پیاسی گھوم رہی تھی۔ ایک دن میری زندگی میں ٹام آیا۔ ٹام یہودی تھا۔ بڑا اچھا پیانو بجاتا تھا۔ بے حد عقل مند۔ شاید سوشیالوجی کے ریسرچ سینٹر میں کام کرتا تھا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ ایک دن وہ مجھے بھی اپنے تجربہ گاہ کا ایک حقیر کیڑا سمجھ کر چھوڑ کر چلا جائے گا۔"

میں نے ٹام کے لئے کیا نہیں کیا! اس کی دوستوں سے اُسے ملنے دیا۔ اتنا ہی نہیں، اس کی ایک بیمار دوست کی تیمارداری کی۔ پینسی کو خون کی قے ہوتی تھی، وہ میں اٹھاتی رہی — لیکن ٹام بڑا دھوکا باز نکلا۔ یہ نہیں کہ اس کا دل پینسی پر آیا ہوا تھا۔ یہ بات نہیں تھی۔ ٹام سے میرا اختلاف اب اسی بچے کی بات کو لے کر ہوا... .. "

"کیوں، کیا وہ بھی باپ بننا نہیں چاہتا تھا۔" میں نے پوچھا۔"

"نہیں — اس بار بات بالکل برعکس تھی۔ ٹام کی بڑی خواہش تھی کہ میں ماں بنوں۔ لیکن اس پورے تجربے کے بعد پتہ نہیں کیا ہوا — جسمانی یا نفسیاتی — اب میں ممتا نام کے لفظ تک سے نفرت کرنے لگی تھی۔ کیا پتہ، کیسا شوہر ملے! کیا پتہ کیسا بچہ نکلے —!

اب میں ان سب جھنجھٹوں میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ جیسے میں نے مصوری چھوڑ دی، شاعری ترک کر دی، ویسے ہی میں نے اپنے ہاتھوں اپنے اوپر اپنی مرضی سے بے حسی طاری کر لی۔"

تخلیق کے نام تک سے میرا یقین اٹھ گیا۔ تم کہو گے میں کیسی بے رحم ظالم عورت ہوں! پر سچ کہوں، یہ سب بے کار ہے۔ یہ ہے خانہ داری، یہ بچے، یہ پڑ پوستے، کوئی کام نہیں آتے۔ میری ماں ہی میرے کیا کام آتی ہے!"

وہ اچانک خاموش ہو گئی اور اس نے پھر کوئی دوا کھائی۔

میں اس بے حد ذہین، باشعور اور خوب صورت عورت کو دیکھ کر حیران تھا۔ اس کی زندگی میں جیسے کچھ چوک ہو گئی تھی اور وہ بکھر گئی تھی۔ ہر آدمی، ہر عورت اپنی ذاتی زندگی کے تجربے پر ہی دنیا کے متعلق اپنی رائے قائم کرتا ہے؟ اور وہ کس قدر غلط ہو سکتی ہے! پھر بھی آدمی ہے کہ رائے بنانے سے باز نہیں آتا۔ اس سے بچ نہیں سکتا۔

آگنس سے بعد میں بھی میں ایک آدھ بار ملا۔ دو ہفتے بعد سین فرانسسکو چھوٹ گیا۔ پر وہ رات یاد ہے جب میں سین فرانسسکو میں آگنس کا وہ اپارٹمنٹ رات کے ڈیڑھ بجے چھوڑ رہا تھا اور آگنس خواب آور گولیاں کھا رہی تھی۔ اسے بے خوابی کی پرانی شکایت تھی، شاید آگنس عادی ہو چکی تھی۔ اور میں نے آسمان کی طرف دیکھا ایک بھورا اکھڑا سیسے کی طرح، کوئی بھی تارا نہیں۔ ہوا میں مسلے ہوئے پھولوں کی مہک تھی۔

(مترجم۔ ظفر احمد)

میتھلی شرن گپت

گزشتہ دسمبر میں میتھلی شرن گپت کے انتقال کے ساتھ ہی ہندی کا ایک دور ختم ہو گیا۔ بھارتیندو دور نے ہندی کو ادب کی مختلف اصناف سے مالا مال کرنے کا جو کام کیا تھا، اُسے آگے بڑھانے کا کام سرسوتی کے ایڈیٹر کی حیثیت سے آچاریہ مہاویر پرساد دویدی نے کیا۔ میتھلی شرن گپت 'دویدی عہد' کی ایک اہم ہستی تھے۔ لیکن بعد ازاں اُن کی شہرت اور اثر و رسوخ میں بہت اضافہ ہوا۔

گپت جی کی پیدائش نیشنل کانگریس کے قیام کے دنوں میں ہی ہوئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد آہستہ آہستہ بغاوت کی آگ تو دب گئی لیکن برطانوی سامراج کے بڑھتے ہوئے اثر کے خلاف عوام میں غم و غصہ اور بے چینی بڑھتی رہی۔ علاوہ بریں ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ گپت جی کا علاقہ جھانسی کی رانی کا علاقہ تھا۔ ان کے والد بزرگوار رام چرن جھانسی سے ۷ میل دور چرگاؤں نام کے ایک قصبے میں بیوپار کرتے تھے۔ وہ سکھی بھگتی شاخ کے رام بھگت تھے۔ اسی وجہ سے ان کے گھر میں حب الوطنی کے ساتھ ہی رام بھگتی کا بھی ماحول تھا اور گپت جی پر بچپن سے ہی اس کا گہرا اثر تھا۔

گپت جی کی ابتدائی تعلیم چرگاؤں میں ہی ہوئی۔ پھر وہ جھانسی کے میکڈونل ہائی اسکول میں داخل کر دئیے گئے لیکن پڑھائی کی طرف ان کا رجحان شروع سے ہی کم تھا۔ اکثر وہ کلاس سے غیر حاضر رہا کرتے تھے۔ آخر چھٹی جماعت کے بعد انھوں نے اسکول کو خیرباد کہہ دیا اور گھر میں ہی پڑھنے اور والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگے۔

اپنے خاندانی کاروبار میں بھی گپت جی کا دل نہیں لگا اور وہ گھر پر ہی رہ کر علم کی کھوج میں نئی پرانی کتابیں پڑھنے لگے۔ گھر والے اُس سے خوش تو نہیں ہوئے مگر اُن کے کام میں کسی نے دخل بھی نہ دیا۔ اس طرح گپت جی نے ہندی، اردو، بنگلہ، فارسی اور سنسکرت وغیرہ کئی زبانیں سیکھیں اور ان کے ادب کا بھی مطالعہ کیا۔ ہندی عروض کا گپت جی نے خاص مطالعہ کیا تھا۔

مطالعے کے بعد گپت جی کا رجحان لکھنے کی جانب ہوا۔ پہلے کچھ دنوں تک وہ برج بھاشا میں اور بعد ازاں کھڑی بولی میں نظمیں لکھنے لگے۔ منشی اجمیری کا، جو بڑے اچھے گویے اور شاعر تھے، گپت جی کے گھر آنا جانا تھا۔ لہٰذا ابتداء میں گپت جی اپنی تخلیقات، مشورے اور اصلاح کے لئے انھیں دکھاتے تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی اور اصلاح سے گپت جی اچھی نظمیں کہنے لگے۔ ان کی سب سے پہلی تخلیق کلکتے سے شائع ہونے والے 'ویشیوپکارک' میں چھپی تھی۔ ایک بار ان کی ملاقات جھانسی میں محکمہ ریل کے ملازم پنڈت مہاویر پرساد دویدی سے ہوئی جو ہندی سنسکرت کے اچھے عالم تھے اور اُن دنوں 'سرسوتی' کے ایڈیٹر بھی تھے۔ انھوں نے گپت جی سے کچھ نظمیں مانگیں اور ان کو درست کر کے 'سرسوتی' میں چھاپ دیا۔ اس سے گپت جی ہندی ادب کی دنیا میں ایک نئے شاعر کی حیثیت سے اچانک چمک اُٹھے۔ ۱۹۱۰ء میں شواجی

کے بہادر جرنیل باجی راؤ دیش پانڈے کے بارے میں لکھی گئی ان کی ایک ابتدائی نظم کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے :

تھے ویر جن کے ایسے وشِشٹھ
ہوتے شوا جی نہ سمرتھ کیسے
نوین راشٹر استھی ہوگیہ کاریہ
بھلا کہاں ہو سکتے اکیلے ؟
نہ آج باجی پر بھولوک میں ہیں
تو بھی بنی ہے اُن کی شُکیرتی
بھلا کہیں کبھی ویر مرے ہیں
سوچو نہ یہ وارتا ہے سُکی

نظموں کے علاوہ ان کی کھنڈ کاویہ (واقعاتی نظمیں) بھی مسلسل سرسوتی میں شائع ہوتی رہیں۔

عملی طور پر گپت جی رام کے معتقد تھے لیکن رابندر ناتھ کی نظموں اور گاندھی جی کے خیالات کا بھی ان پر کافی اثر پڑا تھا۔ انھوں نے رابندر ناتھ کی نظموں سے متاثر ہوکر کئی بنگالی تخلیقات کا باریکی سے مطالعہ کیا اور اس سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے مائیکل مدھو سودن کے 'میگھ ناد ودھ' اور نوین چندر سین کے 'پلاسیر یدھ' کا ترجمہ کیا۔ بعد ازاں انھوں نے برج انگنا، ویرانگنا، سوپن واسودتم وغیرہ کے بھی بہت اعلیٰ ترجمے کئے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ بچوں کی کہانیوں کی بنا پر کچھ چھوٹی چیزیں لکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا ایک 'منگلا چرن' دیکھئے :

وہ سگریو ویری ہے، کیوں وبھیشن آرہا
شرناگت جو بھی ہو، آنے دے رام نے کہا

ان سطور میں پناہ میں آئے ہوئے دشمن سے رام کی رواداری کا کتنا خوب صورت بیان ہے۔

جلیانوالہ باغ کے خونی واقعہ اور گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون نے ملک میں ایک ایسی ہلچل مچائی جس سے گپت جی بھی نہ بچ سکے۔ ان میں جوش اور ولولہ پیدا ہوا اور وہ قومی جذبات کو بیدار کرنے والی جوشیلی نظمیں لکھنے لگے۔ جس وقت گاندھی جی سیاست میں نہیں آئے تھے۔ اس وقت گپت جی نے ملک کی خوابیدہ خودداری کو جگانے کی زبردست کوشش کی تھی۔ اس کی سب سے بڑی مثال 'بھارت بھارتی' ہے جو ان دنوں بچے بچے کی زبان پر تھی۔ اُن کی ان سطروں کو لوگ آج بھی نہیں بھولے :

مانو بھون میں آریہ جن، جن کی اُتاریں آرتی
بھگوان بھارت ورش میں گونجے ہماری بھارتی

'بھارت بھارتی' میں کیا ہے، اس کا خلاصہ اس طرح ہے

ہم کیا تھے، کیا ہو گئے
اور کیا ہوں گے ابھی
آؤ، وچاریں آج
مل کر یہ سمسیائیں سبھی

آچاریہ رام چندر شکل کے الفاظ میں 'بھارت بھارتی' میں 'مسدس حالی' کے ڈھنگ پر ہی ہندوستانیوں کے ماضی اور حال کی مصیبتوں کو مدِ نظر رکھ کر مستقبل کا تعین کیا گیا ہے۔ اس نے ملک کے خوابیدہ عوام کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا ہے۔ انھیں عظمتِ ماضی کی یاد دلائی ہے اور مستقبل کو حسین اور مسرت آمیز بنانے اور آزاد ہونے پر اُکسایا ہے۔ اس طرح شمالی ہندوستان میں قومی بیداری لانے میں گپت جی کی اس تخلیق نے جو حصہ لیا ہے اس کا اندازہ شاید کوئی مستقبل کا تاریخ دان ہی کر سکے۔ ان کے 'سودیش سنگیت' اور 'جے بھارت' میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے۔

گاندھی جی کی طرح وہ بھی رام کے معتقد تھے مگر یہ اعتقاد کسی مذہب یا فرقے کی بنا پر نہیں تھا بلکہ انصاف، سچائی اور تہذیبی عظمت کے مجسمہ کی صورت میں تھا۔ انھوں نے بڑے فطری انداز میں فرمایا تھا :

رام تمھارا چرت سوئم ہی کاویہ ہے
کوئی کوی بن جائے، سہج سمبھاویہ ہے

انھوں نے انگریزوں کے خلاف جنھوں نے ہندوستانیوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا، اسی زور شور سے آواز بلند کی جس

زور شور سے اچھوتوں یا مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی تفریق کے خلاف یا مظلوم ہندو عورتوں کی ناگفتہ بہ حالت کے خلاف۔ ان سبھی میں رام کے آدرشوں نے ان کی آواز کو بڑی قوت اور اعتماد بخشا۔ 'جیدرتھ ودھ' کے کرداروں میں ان کا انسانی آدرش صاف آشکارا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے گیتا کے اپدیشوں کو بھی بڑے خوبصورت ڈھنگ سے اس میں تحریر کیا ہے۔ ناانصافی اور بے اصولی کے خلاف لڑنے والی ہستیوں کے لئے ان کے دل میں ہمیشہ عزت رہی ہے۔ 'رنگ میں بھنگ' راجپوت بہادروں کو شجاعت و دلیری کا ایسا ہی نمونہ ہے۔ 'وکٹ بھٹ' بھی اسی طرح کی ایک دوسری تخلیق ہے۔

لیکن گپت جی کی سب سے قابلِ ذکر تصنیف 'ساکیت' ہے۔ اس میں انھوں نے رامائن کی نظرانداز ہستی اُرملا کے کردار کو ہی پیش نہیں کیا بلکہ کیکئی اور مانڈوی کے ساتھ بھی انصاف کیا ہے۔ لکشمن کی رفیقۂ حیات اُرملا اور بھرت کی بیوی مانڈوی پہلے پہل اسی تصنیف کے ذریعہ ایک نئے آدرش کے روپ میں سامنے آتی ہیں۔ اُرملا کے منہ سے اپنے شوہر کی جدائی کے سلسلے میں کبھی کوئی لفظ نکلنا تو ایک طرف رہا اُس کے دل میں کبھی کوئی خیال تک نہیں آیا۔ کیکئی تک کو جس کے ساتھ تلسی داس یا بالمیکی نے اپنی رامائنوں میں انصاف نہیں کیا۔ گپت جی نے ایک ضدی اور مغرور عورت کی صورت میں نہیں، بلکہ ایک آدرش ماں اور عورت کے روپ میں پیش کیا ہے۔ بھرت کو راج ملے اور رام کو بن باس' اس سے تلسی داس نے جہاں منتھرا کی طرح ہی کیکئی کو بھی خوش ہوتے دکھایا ہے وہاں گپت جی نے اس کے منہ سے بھرت کو یہ کہلوایا ہے کہ راون بڑا ضدی ہے اس کے خلاف لڑائی کی تمہیں پوری تیاری کرنی چاہیئے۔ اسی طرح 'کیشودھرا' میں گوتم کی رفیقۂ حیات کا دلی دُکھ ہی نہیں عورت کی عظمت اور شوہر کے بغیر کچھ کہے چلے جانے کے تذبذب سے ہونے والی دلی کشمکش کے باوجود عورت کی خودداری ہی دکھائی ہے۔ اس کے برعکس 'وشنو پریہ' میں مہاپربھو کی رفیقۂ حیات کی وفاشعار مثالی عورت کے روپ میں تخلیق ہوئی ہے۔ عورت کی زندگی کے بارے میں گپت جی کے یہ مصرعے ہندی ادب میں لافانی ہو گئے ہیں۔

ابلا جیون ہائے تمھاری یہی کہانی !
آنچل میں ہے دودھ اور آنکھوں میں پانی

اس کے علاوہ 'دواپر' میں انھوں نے کہا ہے :-

کا مک چاٹ کا رِت ہی تھی
کیا وہ بُری تھا ری
ایک نہیں دو دو ماترائیں
نر سے ناری بھاری

قومی اتحاد، ملک کی عظمت، ملک کی تہذیبی روایت اور آدرش کی چھاپ گپت جی کے مختلف کرداروں میں بڑی صاف دکھائی دیتی ہے۔ 'ورتا لک'، 'کنال'، 'پرتھوی پتر'، 'سرلچ' 'ہرنج دتی'، 'ہندو'، 'گورو کل'، 'انگھ'، 'کسان'، 'جھنکار' وغیرہ اُن کی دیگر تخلیقات میں بھی گپت جی کے آدرشوں نے بڑی حسین اور مؤثر صورت پائی ہے۔

گپت جی نے کبھی بھی سیدھے ڈھنگ سے سیاست میں حصہ نہیں لیا، مگر ان کا مکان سیاسی کارکنوں کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ چرگاؤں میں شاید ہی کوئی ایسا جلسہ ہوتا ہو جس میں براہِ راست یا بالواسطہ گپت جی یا ان کے خاندان کے کسی نہ کسی فرد کا ہاتھ نہ رہتا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۱ء میں برطانوی حکمرانوں نے آپ کو بھی گرفتار کر لیا اور فیض آباد جیل بھیج دیا۔ وہاں رہنے سے گپت جی کو دو فائدے ہوئے۔ پہلا تو یہ کہ برطانوی سرکار کی ناانصافی اور جیل کی زندگی سے وہ روشناس ہوئے۔ دوسرا یہ کہ دیش کے رہنماؤں کے قریب آنے کا بھی موقع نصیب ہوا۔ اس سے سیاست کی طرف ان کا اور زیادہ رجحان ہو گیا۔ جب ملک آزاد ہوا تو گپت جی راجیہ سبھا کے ممبر نامزد ہوئے اور بارہ سال تک دہلی میں مقیم رہے۔ اس عرصہ میں ان کا دربار ایک ادبی دربار کی حیثیت سے ہندوستان بھر میں مشہور ہو گیا۔ انھوں نے راجیہ سبھا میں اپنی تقریر ہمیشہ ہندی نظم کی صورت میں پڑھی اور ہندی کے سرکاری زبان بننے کے بارے میں بھی انھوں نے

بڑا کام کیا ہے۔

گپت جی کی تخلیقات کو پڑھ کر زیادہ تر لوگوں کا یہ خیال بن جانا فطری بات ہے کہ وہ اپنی گھریلو زندگی میں بڑے کٹر یا تنگدل رہے ہوں مگر درحقیقت بات اس سے بالکل برعکس تھی۔ رام کے حقیقی معتقد ہونے کے ناتے وہ آدمی آدمی میں کوئی تفریق نہیں کرتے تھے۔ ان کے یہاں سبھی یکساں طور پر عزت و احترام پاتے تھے۔ ان کے گہرے دوست منشی اجمیری جی مسلمان ہوتے ہوئے بھی گپت جی کے ہی خاندان کے ایک فرد مانے جاتے تھے اور سب لوگ اُن کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے تھے۔ ان کے بارے میں تحریر فرماتے ہوئے انھوں نے پہلی سطر یہ لکھی تھی :

"ان مسلمان ہرین پر کوٹن ہندو وارئیے"

(یعنی ایسے مسلمانوں پر کروڑوں ہندو قربان کئے جاتے چاہئیں)

گپت جی نے پرانے کرداروں کو اپنی تخلیق کی بنیاد ضرور بنایا، مگر انھیں نئے شالی افسانوں کی داستانوں کی شکل دے کر انسان کی عظمت اور اعلیٰ کردار کی تکمیل کی اور اس طرح انھیں ہم گزشتہ اور نئے دور کے بیش بہا عقیدے کو جوڑنے والی ایک اہم کڑی کہہ سکتے ہیں۔ ہندی ادب انھیں کبھی بھی بھلا نہیں سکے گا۔ خود انھوں نے بھی اپنے آخری دنوں میں فرمایا تھا :

مار مجھے نہ سکے گا
کال! کچل کر تیرا کرال ہاتھی
یدی جیوت رکھیں گے
اپنی سمرتی میں کر پالو میرے ساتھی

اپنی موت سے کچھ دن پیشتر ہی انھوں نے آکاش وانی میں اپنی ایک نظم ریکارڈ کروائی تھی، جس میں ان کی رجائیت اور روشن مستقبل کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ نظم یہ ہے :

جل ہے دیپک، جل تو
جن کے آگے اندھیارا ہے
اُن کے لئے اجل تو

جوتا، بویا، کُتنا جنھوں نے
شرم کر اوٹا، دُھنا جنھوں نے
بتی بٹ کر تجھے سنجویا
اُن کے شرم کا پھل تو! جل ہے ....

اپنا تل تل پروایا ہے
تجھے سنیہہ دے کر پایا ہے
اُرح ستھان دیا ہے گھر میں
رہ ادی چل جھلمل تو، جل ہے .....
یہ جولھا چھوڑ کر جلایا تجھ کو
کیا نہ دیا جو پایا تجھ کو
بھول نہ جانا کبھی اوٹ کا
وہ پنیت انچل تو جل ہے ....
کچھ نہ رہے گا، بات رہے گی
ہوگا پرات، نہ رات رہے گی
سب جاگیں، تب سونا سکھ سے
تات، نہ ہوگا چنچل تو، جل ہے....

مگر ان کی سب سے زیادہ عقیدت انسان میں تھی۔ اسی کو وہ ایشور کا روپ، اسی کی قوت کا ایک عنصر مانتے تھے۔ اُسے اپنی ادائیگیٔ فرض کے لئے مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے :

جیون لیش سمان گھن
سنسان سکھ سب مرم کے
تجھ کو پر نتوشتا انش بھی
لگتے نہیں نج دھرم کے

اسی لئے 'انگھ' میں انھوں نے اپنے بارے میں بھی فرمایا ہے :

نہ تن سیوا، نہ من سیوا
نہ جیون اور دھن سیوا

مجھے ہے اشٹ جن سیوا
سدا سچی تیواو سیوا

انسان کی آواز ہمیشہ ونتی رہے اور وہ مصائب سے ڈر کر کبھی پیچھے نہ ہٹے۔ اس بارے میں "ایک جھنکار" میں ایک حوالہ دیکھئے:

اس شریر کی سکل شرائیں
ہوں تیری تنتری کے تار
آگھاتوں کی کیا چنتا ہے
اُٹھنے دے اونچی جھنکار
ناچے نیتی، پرکرتی سرسادھے
سب سُر ہوں سجیو، ساکار
دیش دیش میں، کال کال میں
اُٹھے گمک گہری گنجار

ان کا یہ احساس دلانا کتنا موثر ہے

نر ہو نہ نراشں کرو من کو
کچھ کام کرو، کچھ کام کرو

رام کو بھی انھوں نے انسان کے روپ میں ہی مان کر کہا ہے

رام تم مانو ہو؟
ایشور نہیں ہو کیا؟
وشو میں رمتے ہوئے نہیں
ہمیں ہو کیا؟
تب میں نریشور ہوں
ایشور کشما کرے
تم نہ رمو، تو من
تم میں رما کرے

انسان کی عظمت کا سکہ انھوں نے اندرتک سے منوا لیا ہے

نارائن، نارائن، دھنیہ نر سادھنا
اندر پد نے بھی کی اسی کی سشبھ ارادھنا

ونوبا جی کو انھوں نے نر نارائن کے روپ میں دیکھا ہے:۔

جب نر کے نارائن آئے
جگ جگتی کے جائے، جب نر کے
ہل مل بھومی بھوگنے کا ہی
سادھو سندیش لائے
سویم سادھو، نارائن کے نر
جب ان کا سندیش وہن کر
آئے اُسے سنانے گھر گھر
شکرتی جوشن پائے
جب نر کے نارائن آئے

شریکِ غم

برآمدے میں صبا کی لاش ایک سفید چادر میں لپٹی ہوئی رکھی تھی۔ اس کے اردگرد ہالہ ڈالے نوجوان لڑکیاں زار و قطار رو رہی تھیں۔ زار و قطار روتی ہوئی لڑکیوں میں صبا کی بہنیں شیلا اور شہلا، اس کی نندیں مہجبیں و مہ پارہ سبھی شامل تھیں۔ سارے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ گھر میں اندر ہر طرف عورتیں اور باہر مرد بھرے پڑے تھے۔ کچھ لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔ کچھ صبر کئے چپ چاپ بیٹھے تھے اور کچھ ایسے موقعوں پر اُلٹی سیدھی باتیں کر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے عادی اپنے کام میں مصروف تھے۔

اندر گھر میں صبا کی لاش سے تھوڑی ہی دور ڈاکٹر صاحب کی بیوی بیٹھی تھیں۔ شادی اور غمی کی تقریبات میں شرکت کرنا ان کا معمول تھا۔ شہر میں کہیں پر کوئی بھی مرے وہ ضرور جاتی تھیں۔ گویا یہی ان کی تفریح کا واحد ذریعہ تھا۔ ان کو اس سلسلے میں اتنی شہرت نصیب ہوئی تھی کہ اگر کسی کو وہ اپنے محلے میں کسی طرف جاتی دکھائی دیتیں تو وہ شخص ان کی صورت دیکھ کر پریشان ہو جاتا کہ ہو نہ ہو کہیں کچھ ہوا ضرور ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی بیوی چاہے کسی غمی میں ہوں یا خوشی کی تقریب میں سڑک پر چل رہی ہوں یا عورتوں کی کسی کانفرنس میں رضاکارانہ خدمات انجام دے رہی ہوں، ہر جگہ اُن کی انفرادیت نمایاں رہتی۔ اُن کی چال ڈھال اٹریل ڈول اور بات چیت کا انداز ہی کچھ ایسا تھا جو اُن کو سیکڑوں کیا ہزاروں کے مجمع میں بھی نمایاں رکھتا تھا۔ وہ بات چیت کچھ ایسے انداز سے کرتی تھیں کہ لاکھ بے تعلق ہونے کی کوشش کرنے پر بھی عورتیں دھیرے دھیرے ان کے پاس کھسکتی چلی آتی تھیں اور تھوڑی ہی دیر میں ان کے گرد اچھا خاصا جمگھٹا ہو جاتا تھا۔ باتیں کرتے وقت وہ کبھی بھی اس بات کی پروا نہیں کرتی تھیں کہ وہ کیسی محفل میں ہیں۔ اس وقت بھی وہ صبا کی لاش سے تھوڑی دور بیٹھی برابر بولے جا رہی تھیں۔

"ارے چی چی کیسی جوان موت مری بے چاری —— خدا دشمن کو بھی اس موت سے بچائے —— ابھی بے چاری کی شادی ہی ہوئے کتنے دن ہوئے تھے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی تو نہیں۔ ہا ہا۔ بیچاری کے ارمان بھی پورے نہ ہو سکے۔"

عورتیں دھیرے دھیرے کھسک کر ان کے قریب آنے لگیں اس لئے وہ برابر بولے گئیں۔

"وہ تو مر گئی خیر—— کوئی اُس کے دولہا شبّو کے دل سے پوچھے۔ اس بے چارے پر کیا گزری ہوگی —— ہا بے چارے کی زندگی کیسی برباد ہو گئی ——"

"ہاں واقعی وہ قابلِ رحم ہے۔" کسی عورت نے اُن کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس پر وہ خاموش ہو گئیں اور تھوڑی دیر تک خاموش رہیں۔ مگر زیادہ دیر تک اُن سے خاموش نہ رہا گیا۔ اس لیے ایک عورت کے کان کے پاس اپنا مُنھ

لے جاکر بولیں:

"اسے شبّو کیا ملتا ہے؟"

"ارے انجینئر ہے انجینئر، کوئی ایسا ویسا ہے۔" کسی دوسری عورت نے اُن کی بات سُن کر جواب دیا۔ جواب پاکر وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہیں۔ پھر ایک دوسری عورت سے نہایت رازداری سے بولیں۔ "اندازاً شبّو کتنی تنخواہ پاتا ہوگا؟"

"ارے ہزار سے کم کیا پاتا ہوگا۔ انجینئر ہونا کوئی معمولی بات تھوڑی ہے۔"

"ہاں ہاں اور کیا آج کل انجینئروں ہی کا تو زمانہ ہے۔" ڈاکٹر صاحب کی بیوی نے عورت کی بات کو اہمیت دی۔ پھر ایک تیسری عورت کے کان کے قریب منہ لے جاکر بولیں:۔

"سنتی ہو دلہن شبّو صورت شکل کا تو اچھا ہے اور ابھی عمر بھی کچھ نہیں ہے۔"

"ہاں ہاں ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ ارے پڑھ گیا، جلدی نوکری مل گئی، اس لئے شادی کر دی گئی۔ اے خدا کا کرنا ایسا کہ سب کام جلدی ہوا تو بیوی بھی جلدی ہی مرگئی۔ ایک ہی ہفتے میں چٹ پٹ ہوگئی۔ نہ بیماری نہ دُکھ۔ بیچاری رات کو اچھی خاصی سوئی صبح کو معلوم ہوا غائب۔" عورت نے ڈاکٹر کی بیوی کی بات سنتے ہی جواب دیا۔

"ارے خدا کی مرضی میں کس کو دخل۔ کیا معلوم اس میں خدا کی کیا مصلحت پوشیدہ ہے۔" ڈاکٹر کی بیوی نے ٹکڑا لگایا۔

"ہاں بس یہی ٹھیک ہے۔ انسان ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرے۔" اسی عورت نے کہا۔ اسی اثنا میں آہ و زاری بڑھ گئی کیونکہ صبا کی لاش غسل کے لئے جارہی تھی۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کی بیوی برہنہ پا اُٹھ کھڑی ہوئیں اور پاس ہی کھڑی ہوئی ایک عورت سے مخاطب ہوئیں — "اسے کون غسل دے گا؟"

"ارے وہی احترام میاں کی لڑکی غسل دے گی۔ وہی بے چاری تو یہ سب کام کرتی ہے۔" عورت نے بے رُخی سے جواب دیا۔

"ہاں بے چاری بڑا کام کرتی ہے۔ بڑے ثواب کا کام ہے یہ بھی۔ ورنہ آج کل کون مرنے کے بعد کسی کو پوچھتا ہے اور کون جانتا ہے یہ سب کام۔ وہ تو خیر سے احترام میاں اللہ والے ہیں۔ اس لئے ان کے گھر والے بھی دین و مذہب سے واقف ہیں۔" ڈاکٹر صاحب کی بیوی کہتی ہوئی لاش کے پاس پہونچ گئیں۔

لاش جب غسل دینے کے لئے غسل خانے لے جائی گئی تو ڈاکٹر صاحب کی بیوی پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئیں — "بہت دیر ہوگئی ہے۔ اب جلدی سے غسل دے کر دفنانے کا انتظام کرنا چاہیئے۔ لاش کو زیادہ دیر گھر میں رکھنا مناسب نہیں۔"

جلد ہی صبا کی لاش کو غسل دے دیا گیا اور کفنی پہنایا جانے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کی بیوی پھر زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکیں۔ وہ بول ہی پڑیں — "آخری لباس پہنایا جارہا ہے۔ ہائے کیسی عبرت کی بات ہے۔ ابھی کل اس کو عروسی لباس پہنایا جارہا تھا، آج کفن پہنایا جارہا ہے۔"

"دنیا کی بے ثباتی کا کہاں تک رونا رویا جائے۔" اُن کے پاس بیٹھی ہوئی ایک بزرگ خاتون نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

صبا کی لاش کو کفن دو، پہنا دیا گیا۔ عورتیں پردے میں ہوگئیں اور مردوں کو بلا لیا گیا۔ جنازہ گھر سے نکلتے ہی آہ و بکا سے آسمان پھٹنے لگا۔ یہ رونے پیٹنے کا آخری موقع تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو رونا کیا آتا۔ ان کو رنج ہی کاہے کا تھا لیکن چونکہ سب رو رہے تھے لہذا ان کو بھی رونا تھا۔ انہوں نے ایک ایسی چنگھاڑ ماری کہ سبھی عورتیں اپنا رونا پیٹنا چھوڑ کر ان کو دیکھنے لگیں۔ پھر انھوں نے دو ایک چنگھاڑیں اور بے ہوش ہوگئیں۔ گھر میں ایک دوسری آفت آگئی کوئی پانی لینے دوڑا تو کوئی ڈاکٹر کو بلانے۔

جلدی ہی ڈاکٹر اور پانی آگیا اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بیوی

کو ہوش بھی آگیا۔ انھوں نے ہوش میں آتے ہی منہ دھویا مگر منہ دھونے سے پہلے حمام میں آویزاں بڑے سے آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ وہ چہرے سے غم کی ماری معلوم ہو رہی ہیں۔

منہ دھونے کے بعد وہ پھر اپنی جگہ پر پہلے ہی کی طرح جا کر اطمینان سے بیٹھ گئیں۔ حالاں کہ جنازہ گھر سے گئے دیر ہو رہی تھی۔ اس لئے دھیرے دھیرے سبھی عورتیں واپس جانے لگی تھیں مگر وہ اطمینان سے خاموش بیٹھی رہیں اور عورتوں کو جاتے دیکھتی رہیں۔

دھیرے دھیرے جب سبھی خواتین اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو گئیں اور گھر والے ڈاکٹر صاحب کی بیوی کے علاوہ اکیلے رہ گئے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور صبا کی غمگین ساس کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر تک وہ رنج و غم کا مجموعہ بنی رہیں۔ پھر انھوں نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔

"نئی نویلی بہو کی موت واقعی بڑی دردناک بات ہے —— بے چاری چار دن بھی تو سہاگ کے مزے نہ لوٹ سکی —— میں تو کہتی ہوں شبّو کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ نوجوان لڑکا اور کیسا بھاری غم —— ہائے —— مگر شبّو کی ماں، تم صبر کرو —— خدا صبر کرنے والوں کو عزیز رکھتا ہے —— اور پھر یہ بھی سوچو موت برحق ہے ایک دن سبھی کو مٹّی میں ملنا ہے۔ کوئی آج مرا تو کوئی کل، بس فرق اتنا ہی ہے۔"

شبّو کی ماں ڈاکٹر صاحب کی بیوی کی باتیں سنتی رہیں۔ وہ غم کے مارے کچھ بھی نہ بول سکیں۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بیوی تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوئیں، پہلو بدلا اور پھر شبّو کی ماں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتی ہوئی بولیں

"اے شبّو کی ماں میرا کہنا مانو تو غم و ماتم کرنے سے کچھ نہیں ہوتا جو کچھ ہونا تھا سو ہو گیا۔ تم ذرا شبّو کی فکر کرو —— نئی نویلی بیوی کی موت نوجوان آدمی کے لئے کوئی معمولی حادثہ تھوڑی ہوتا ہے۔ تم تو خیر پھر بھی ساس ہو۔ وہ تو صبا کا شوہر ہے شوہر ذرا سوچو اس کے دل پر کیا کیا گزر رہی ہوگی۔"

وہ ذرا سا رکیں، چاروں طرف دیکھا اور پھر بولنا شروع کیا۔

"نوجوان آدمی کی بیوی مر جائے تو اس کے غم کو صرف اسی طرح ہلکا کیا جا سکتا ہے کہ اس کو اس کی بیوی سے زیادہ خوب صورت اور خوش سلیقہ بیوی دے دی جائے۔ شبّو کی ماں تم میری بات پر عمل کرو اور لڑکی کی فکر بالکل نہ کرو —— میری شمیم تمھاری ہی بیٹی ہے۔ صورت شکل میں تم خود ہی جانتی ہو کہ ہزاروں میں ایک ہے۔ اے یہ تو ہندوستان ہے انگلستان تو ہے نہیں کہ لڑکی کے بال اور آنکھوں کا رنگ دیکھا جائے۔ یہاں تو جس لڑکی کی چمڑی سفید اور جسم گٹھا ہے وہی خوب صورت ہے۔ میری شمیم میں سو ایسی کوئی کمی نہیں خدا کے شکر سے وہ گوری اتنی ہے کہ فرنگی بھی رشک کریں اور ڈیل ڈول یا جسم کا کہنا ہی کیا ہے۔ بی۔ اے سیکنڈ ڈویژن پاس ہے۔ اس کے دو نمبر کسی موئے نے جلن میں کم کر دیئے۔ ورنہ فرسٹ تھی —— شبّو کے لئے بالکل مناسب رہے گی۔ یوں تو اس کے پیغام خدا کے شکر سے ہزاروں آچکے ہیں۔ ابھی کل ہی ڈیپٹی صاحب کے لڑکے کا پیغام آیا ہے۔ مگر میں نے ابھی کچھ جواب نہیں دیا ہے۔ تم کہو تو انکار کر دوں اور جب تمھاری مرضی ہو دو بول پڑھا کر اپنے گھر لے آؤ۔"

شبّو کی ماں ڈاکٹر صاحب کی بیوی کی ایسی باتیں سن کر حیرت میں رہ گئیں۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بیوی ان کے پاس سے اٹھتی ہوئی بولیں،

"تم بہت غمگین تھیں۔ میں نے کہا تمھارا دھیان اسی طرح دوسری طرف کر کے رنج ہلکا کر دوں —— کچھ خیال نہ کرنا —— اور ہاں جو باتیں میں نے کہی ہیں بھولنا نہیں —— ویسے جلدی نہیں ہے۔ اطمینان سے سوچ سمجھ لینا — اب میں جاتی ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب کی بیوی نے اتنا کہا۔ دونوں پائنچوں کو اُلٹایا، زور سے جھاڑا، نوکرانی کو لیا اور سلام کرتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چل دیں۔

غلام ربانی

اجنتا کی نقاشی کی کہانی

ہندوستان کی تاریخ چٹانوں، پتھروں اور ستونوں پر لکھی ہوئی ہے، جناں چہ ان کی مدد سے قدیم تہذیب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن پرانی تہذیب کو اگر آنکھوں سے دیکھنا ہو تو اس کے لئے اجنتا کی گپھاؤں میں جانا پڑے گا۔ یہاں کی تصویروں میں پرانا ہندوستان سانس لے رہا ہے۔ پہلے لوگوں کی وضع قطع، ان کے لباس، مکان، کھانا پینا، برتن، بھانڈے، تخت، چوکیاں، اوزار، گلی کوچے، بازار، شادی، بیاہ، رسم ورواج، پوجا پاٹھ، ناچ رنگ کی محفلیں، طرح طرح کے ساز، میدانِ جنگ میں لڑائی کے نقشے، جنگی ہاتھیوں کی ریل پیل، لڑائی کے ہتھیار، سمندری سفر، جہاز کی غرقابی، راجاؤں کے دربار، عورتوں کے سنگھار، ان کے زیور وغیرہ کون سی چیز ہے جو یہاں پیش نہیں کی گئی۔

زمانہ بہت سخت گیر ہے، یہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتا، اجنتا کے غاروں پر ہزاروں موسم برس چکے ہیں۔ چھتوں میں دراڑیں پڑ گئیں جن سے پانی ٹپکنے لگا۔ اندر مخنوں مخنوں پانی کھڑا رہتا تھا جس سے دیواروں اور ستونوں کے نچلے حصوں کو بہت نقصان پہنچا۔ بعض جگہ ستون گر بھی گئے تھے، لیکن سب سے زیادہ نقصان ان تصویروں کو پہونچا جو دیواروں، چھتوں اور ستونوں پر بنی ہوئی تھیں، یہ اس قدر خستہ ہو گئی تھیں کہ ہاتھ لگانے سے ریزہ ریزہ ہو جاتی تھیں۔ بعض جگہ پپڑیاں بن بن کر گر رہی تھیں۔ ان کی دیکھ بھال کا بھی کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ سیلانی جو یہاں آتے تو جا بجا ان پر نوک دار چیز سے اپنا نام کھود دیتے تھے اور تحفہ کے طور پر تصویر کے ٹکڑے کھرچ کھرچ کر لے جاتے تھے۔ کپتان گریسں ایک ٹکڑا کھرچ کر انگلستان لے گیا اور لندن میں یہ ایک مربع انچ ٹکڑا ایک ہزار پونڈ میں نیلام ہوا۔ اس وقت یہ ٹکڑا بوسٹن (امریکہ) کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔

غرض اجنتا کی نقاشی تباہی کے کنارے آ گئی تھی۔ اب اسے مہاتما بدھ کی کرامات سمجھئے یا ان گمنام آرٹسٹوں کے عقیدہ کا اثر کہ حکومت حیدرآباد کو ان کی حفاظت کا خیال پیدا ہوا اور ان کے تحفظ پر اس دریا دلی سے روپیہ خرچ کیا گیا کہ اس کی نظیر کسی دوسرے ملک میں ملنی مشکل ہے۔

حیدرآباد میں محکمہ آثارِ قدیمہ قائم ہوا اور ڈاکٹر غلام یزدانی اس کے ناظم مقرر ہوئے۔ مرحوم نے سرجان مارشل[1] سے مشورہ کیا اور طے پایا کہ ان تصویروں کے تحفظ کے لئے اٹلی سے ماہر بلائے جائیں۔ اس سلسلہ میں لارڈ کرزن نے بھی مدد کی۔ ان کی کوششوں سے روم کے برطانوی سفیر نے پروفیسر چیکلنی اور کاؤنٹ آرسینی کو اجنتا بھجوایا۔ ان کی تنخواہوں پہ بارہ ہزار روپیہ ماہانہ خرچ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ روم سے اجنتا تک آمد و رفت کے اخراجات حکومت حیدرآباد کے ذمہ تھے۔ اجنتا میں ان کے رہنے اور کھانے پینے کا انتظام بھی کیا گیا۔ ساتھ ہی ان کی روحانی غذا کا بھی انتظام کیا گیا جس کے لئے ایک

---

[1] سرجان مارشل ڈائرکٹر جنرل آف آرکیالوجی ہند

پادری اقوار کو یہاں آکر مسرت کرتا تھا۔

ان اطالوی ماہروں نے تصویروں کے مشاہدے کے بعد ایک کیمیاوی مرکب تیار کیا جو تحفظ کے کام میں بہت کامیاب ثابت ہوا۔ نوعیت کے لحاظ سے کام جن طریقوں پر کئے گئے، وہ یہ ہیں:۔

۱۔ نقاشی کے جو حصے اکھڑ کر سطح سے اُبھر آئے تھے ان کو مسالے سے جمانا۔

۲۔ تصویروں میں جہاں جہاں رخنے پڑ گئے تھے ان کے کناروں کو محفوظ کرنا۔

۳۔ مسٹر گریفتھ[1] جو ۱۸۷۲ء میں تصویروں کی نقلیں حاصل کرنے آئے تھے، انھوں نے تصویروں پر کوپل وارنش پھیر دیا تھا تاکہ نقش صاف دکھائی دیں اور نمی کے اثر سے محفوظ رہیں لیکن یہ سستا نسخہ بعد کو بہت مہنگا پڑا۔ چند سال کے عرصہ میں یہ تصویریں وارنش سے اور مدھم ہو گئیں اور بعض جگہ بالکل سیاہ ہو گئیں۔ اس وارنش کو کیمیائی عمل سے دھویا گیا۔

۴۔ کیڑے جا بجا تصویروں میں سوراخ کر کے اپنا گھر بنا رہے تھے، ان کو ختم کیا گیا۔

۵۔ چمگادڑوں کی بیٹ جو مدتوں سے تصویروں پر جم گئی تھیں ان کو دھویا گیا۔

۶۔ ان غاروں میں عرصۂ دراز تک جوگی اور سنیاسی رہے ہیں۔ ان کے رہنے سہنے سے گرد اور دھوئیں کی تہ تصویروں پر جم گئی تھی اس کو دُور کیا گیا۔

ان اطالویوں نے دو موسم سرما (۱۹۲۱-۲۲ء) یہاں گزارے اسی دوران میں انھوں نے سررشتہ کے لوگوں کو یہ کام سکھایا چنانچہ چالیس سال سے تحفظ کا یہ کام جاری ہے جس سے تصویروں کو نئی زندگی مل گئی ہے۔

چٹانوں پر دو ہزار برس تک تصویروں کا قائم رہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے سطح اس طرح تیار کی جاتی تھی کہ چٹان کو کھردرا کر کے اس پر گلاوا پھیر دیا جاتا تھا۔ گلاوے میں مٹی، گوبر، دھان کا بھوسا اور دوسرے نباتی ریشے ہوتے تھے۔ گلاوے پر مہین خلا سے تہ جما دی جاتی تھی۔ اس طرح زمین تیار ہونے کے بعد اس پر تصویر کا خاکہ اور پھر رنگ آمیزی کی جاتی تھی۔

یہاں کے رنگوں میں بڑی چمک دمک باقی ہے۔ خصوصاً نیلا رنگ تو اتنا شوخ ہے گویا ابھی تیار کیا گیا ہے۔ یہ رنگ سیدھے سادے ہیں اور سب اجنتا کی وادی میں موجود ہیں۔ یعنی سفیدہ کاجل، گیرو، پیلی مٹی، ہری مٹی، ہار سنگار کے پھول وغیرہ لاجورد ہندوستان میں نہیں ہوتا۔ یہ شاید سیلون یا ایران سے منگایا گیا ہوگا لیکن اس بات کا اب تک پتہ نہیں چلا کہ رنگوں کی آمیزش میں لیس دار چیز کون سی استعمال کی جاتی تھی۔ نقاشی کی قدیم کتابوں میں بیل گری کے لیس اور جانوروں کی رگوں وغیرہ کے سریش کا ذکر ہے۔

تصاویر اجنتا کی نقلیں حاصل کرنے کی داستان بڑی طویل ہے۔ ۱۸۲۴ء میں جنرل سر جیمس نے ریاست حیدرآباد کا دورہ کیا۔ انھوں نے یہاں کی نقاشی کا کچھ مختصر حال رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو بھیجا جو چند سال بعد شائع ہوا۔ اس کی اشاعت سے انگریز سیاحوں کا تانتا بندھ گیا۔ ۱۸۴۳ء میں مسٹر فرگسن نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سامنے ایک مقالہ ہندوستان کے تراشیدہ مندروں[2] پر پیش کیا جس میں اجنتا کے فن تعمیر اور نقاشی پر بہت زور دیا تھا۔ اس مضمون نے بڑی دل چسپی پیدا کر دی اور دوسرے ہی سال سوسائٹی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ کو توجہ دلائی کہ ان تصویروں کی نقلیں حاصل کر لی جائیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ضائع ہو جائیں۔ سوسائٹی کی اس تحریک کا بہت اچھا اثر ہوا۔ کمپنی نے حکومت ہند کو توجہ دلائی نتیجہ یہ ہوا کہ مدراس فوج کے میجر گل کو جو اچھے آرٹسٹ تھے، اجنتا بھیجا گیا کہ وہ تصویروں کی نقلیں تیار کریں۔ اس کام میں ان کو ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی گئی سواری کے لئے ان کو ہاتھی دیا گیا۔ میجر گل کو یہ جگہ ایسی پسند آئی کہ

---

[1] مسٹر گریفتھ جے جے اسکول آف آرٹس بمبئی

[2] Rock-cut Temples of India

وہ یہیں رہ پڑے ۔ اجنتا کی ایک میوفی (بیرو) سے شادی کرلی اور مرتے دم تک گپھاؤں میں کام کرتے رہے ۔

انھوں نے ۱۸۶۱ء تک کام کیا اور کوئی تیس نقلیں تیار کیں جن کو وقتاً فوقتاً لندن بھیجتے رہے ۔ یہ تصویریں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عجائب خانہ میں رکھی گئیں ۔ لیکن ان میں سے چھبیس نقلیں جو کرسٹل پیلس میں نمائش کے لئے رکھی گئی تھیں، کچھ دن بعد وہاں کی آتش زدگی میں تباہ ہوگئیں ۔ میجر گل کا بچا کھچا کام جو اب باقی رہ گیا ہے اس کو مسز اسپائرس نے اپنی کتاب قدیم ہند Ancient Indra میں شائع کردیا ہے ۔

انھیں دنوں مسٹر فرگسن نے انڈیا آفس سے درخواست کہ ان نقلوں کی بجائی کی جائے اور ڈاکٹر برجس سے مشورہ کیا جو اس وقت بمبئی میں اس کام کی انجام دہی کے لئے بہترین ذریعہ ہو سکتے تھے ۔ چنانچہ حکومت بمبئی نے مسٹر گرفتھ کو حکم دیا کہ وہ اجنتا جاکر صورت حال کی رپورٹ پیش کریں ۔ ان کی رپورٹ پر ایک بڑی رقم منظور ہوئی اور مسٹر گرفتھ نے اپنے طلبا کی مدد سے کام شروع کیا ۔

استاد اور شاگردوں کی جماعت نے کوئی چار سال کام کیا ۔ جس پر پچاس ہزار روپیہ خرچ ہوا ۔ اس دوران میں ایک سو پچیس نقلیں تیار ہوئیں جن کو سیکرٹری آف اسٹیٹ کے پاس بھیج دیا گیا ۔ مسٹر گرفتھ نے ہر چند چاہا کہ یہ نقلیں بمبئی ہی میں رکھی جاتیں ۔ مگر ان کی بات نہیں مانی گئی اور سب تصویریں انڈین میوزیم میں رکھ دی گئیں لیکن پھر وہی آتش زدگی پیش آئی اور پچاسی نقلیں جل کر راکھ ہوگئیں

مسٹر گرفتھ ۱۸۹۵ء میں پھر اجنتا گئے ۔ اس دفعہ ان کو بڑی مایوسی ہوئی ۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ بعض وہ تصویریں جن کی نقلیں انھوں نے پہلے تیار کی تھیں غائب ہوگئی ہیں ۔ اس پر انھوں نے بیان دیا کہ اگر ان قدیم بودھی آرٹسٹوں کے کام کی نقلیں تیار نہیں کرائی گئیں تو دنیائے فن کے لئے بہت بڑا نقصان ہوگا ۔ کیوں کہ ان عقیدت مندوں نے یہ تصویریں اس مقام پر جس عمدگی سے بنائی ہیں اس کی نظیر کہیں بھی نہیں ہے اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فن نقاشی میں وہ لوگ کتنے بلند مقام پر پہنچ گئے تھے ۔

کچھ دن بعد مسٹر گرفتھ نے اپنی یادگار کتاب 'اجنتا کی نقاشی'[1] حکومت ہند کے لئے لکھی جو ۱۸۹۶ء میں لندن سے شائع ہوئی ۔ اس کے بعد لیڈی ہیرنگھم اجنتا آئیں ۔ ان کو یہاں کی نقاشی اس قدر پسند آئی کہ چار سال کے عرصہ میں انھوں نے اجنتا کے تین چکر لگائے ۔ اس کا نتیجہ ان کی وہ پاکیزہ کتاب ہے جس کا نام 'اجنتا فریسکوز' ہے ۔

اجنتا کی شہرت اب اہل فن کے لئے خوابوں کی دنیا بن گئی تھی ۔ دور دور سے اہل علم اور صاحبان فن یہاں آنے لگے ۔ جاپان سے کئی مشہور آرٹسٹ اور جامعات کے پروفیسر یہاں آئے ۔ انھوں نے یہاں کی بہت سی تصویروں کے فوٹو، نقلیں، خاکے اور سینکڑوں چربے حاصل کئے مگر شاید یہ تصویریں اجنتا سے باہر رہنا پسند نہیں کرتیں ۔ ان میں سے بہت سی نقلیں جاپان کے زلزلہ میں تباہ ہوگئیں ۔ اب صرف چند تصویریں کیوٹو یونیورسٹی میں محفوظ ہیں ۔

تصاویر اجنتا کی کہانی میں خان بہادر سید احمد کا نام بھی یادگار رہے گا ۔ مرحوم نے لیڈی ہیرنگھم کے ساتھ کام کیا تھا وہ بہت اچھے آرٹسٹ تھے ۔ اسی بنا پر وہ غار لمئے اجنتا کے مہتمم مقرر ہوئے انھوں نے اپنے مددگاروں مولوی جلال الدین مرحوم اور مولوی نظر محمد کے تعاون سے تمام تصویروں کی نقلیں تیار کیں ۔ ان کے خاکے اور چربے لئے ۔ ان کی کچھ نقلیں حیدرآباد کے اجنتا پویلین میں آویزاں ہیں ۔ خان بہادر کے ہاتھ کی کچھ نقلیں بمبئی کے پرنس آف ویلز میوزیم میں موجود ہیں ۔

اجنتا کی تصویریں اب تک ہاتھ سے تیار کی جاتی تھیں ۔ ڈاکٹر غلام یزدانی نے ان کی نقلیں رنگین فوٹوگرافی کے ذریعہ تیار کرائیں ۔ یہ رنگین عکاسی مسٹر براؤن اور مسٹر والس نے کی ۔ انھیں دنوں مسٹر مارٹل بیئر اتفاق سے حیدرآباد آئے ہوئے تھے ۔ یہ اس جرمن جماعت کے فوٹوگرافر تھے جو مونٹ ایورسٹ کی مہم پر گئی تھی ۔ سررشتہ آثار قدیمہ نے ان کو اجنتا بھیجا ۔ چناں چہ انھوں نے غاروں میں جاکر رنگین فوٹو تیار کئے ۔

---

[1] The paintings in the Budhist caves of Ajanta

اس تمام جد و جہد کا نتیجہ آخر کار ڈاکٹر غلام یزدانی کی معرکۃ الآرا کتاب "اجنتا" کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس کتاب کی اشاعت نے علم و فن کی دنیا میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ ہندوستان کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے علمی رسالوں میں اس پر جو تبصرے ہوئے ہیں ان کو جمع کیا جائے تو اچھا خاصا ایک رسالہ تیار ہو سکتا ہے۔ اس مقام پر ایک دو کا بیان بے محل نہ ہوگا۔

برلنگٹن میگزین لندن نے مئی ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کے اقتباس کے کچھ حصے یہ ہیں:-

"۔۔۔ اس کتاب کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دنیا کی ان مشہور تصاویر کا بیان اگرچہ اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اور حال میں مسٹر گریفتھ اور لیڈی ہیرنگھم کی کتابوں میں نقول بھی نہایت خوبی سے چھاپی گئی ہیں لیکن ان سب کی بنیاد دستی نقول پر ہے۔ کوئی انسان کتنا ہی ماہر ہو صحت کے لحاظ سے فوٹو کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ موجودہ کتاب کی شاندار تصاویر کا جب پہلی تالیفات کی تصویروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو لیڈی ہیرنگھم کے اسی قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ "اصلی تصاویر کے فنی محاسن ایسے محکم اور مکمل ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی ان کو خاطر خواہ نقل نہ کر سکا۔"

ہز ایگزالٹڈ ہائی نس نظام کی شاہانہ فیاضی اور شوق کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ ایشیا کے ان عجوبہ روزگار تصاویر کی نقول کی تیاری میں موجودہ زمانہ کے علم و کمال سے پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے اور اب صحیح اور مکمل شائع ہو گئیں۔"

رسالہ انڈین اینٹی کیوری نے اگست ۱۹۳۱ء کے شمارہ میں اس کتاب کی بڑی لمبی چوڑی تعریف کی ہے اور اخیر میں ان لفظوں پر ختم کیا ہے:-

"۔۔۔ دنیائے فن اعلیٰ حضرت کی فیاضی اور سرپرستی اور ان کے قابل وزیر مالیات سر اکبر حیدری کی تدبیر کی رہین منت ہے کہ یہ عظیم الشان کارنامہ اس خوش اسلوبی سے شائع ہو گیا ہے۔"

لندن ٹائمز اور نیویارک ٹائمز نے بھی اس کتاب پر تبصرے کئے۔ فرانس کی ایشیاٹک سوسائٹی نے بھی اس کو سراہا ہے۔

یہ کتاب ڈاکٹر غلام یزدانی کی پچیس سال کی دیدہ ریزی اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہے اور اس قدر پاکیزہ ہے کہ انگلستان اور امریکہ میں نمائش کے طور پر رکھی جاتی ہے[1]

---

[1] اس کتاب کی قیمت چھ سو روپے ہے اور محکمہ اطلاعات حیدرآباد سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

موسمیات کی اہمیت

وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ نے پانچویں یوم عالمی موسمیات اور موسمیات سے متعلق نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا ـــ گزشتہ تیس برس میں علم موسمیات نے تیز رفتاری سے ترقی کی ہے اور انسانی سرگرمیوں کے تمام حلقوں میں موسمیات کی اہمیت اور کسی ملک کی اقتصادی ترقی میں موسمیات کے کردار کا آج اس قدر شہرہ ہے کہ ہر ملک خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا موسمیات کے محکمے کا وجود لازمی تصور کرتا ہے۔ علم موسمیات قومی تعمیر کی متعدد سرگرمیوں میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۶۵ء کا یہ سال جسے اقوام متحدہ نے بین الاقوامی تعاون کے سال سے تعبیر کیا ہے بھارت کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ ۱۹۶۱ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ہمارے سورگیہ پردھان منتری شری جواہر لال نہرو کی پیش کردہ تجویز کے مطابق منایا جا رہا ہے۔

صابر شاہ آبادی

اُردو ادب اور فلسفۂ حیات

(ایڈیٹر کا مضمون نگار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں)

تغزّل اب مقبولیت کی اس منزل پر ہے کہ اس کے بغیر غزل تو غزل بلکہ کسی ادبی صنف کا صحیح تصوّر نہیں ہو سکتا۔ یہ تغزّل ہی کا فیضان ہے کہ غزل جیسی قدیم و عاشقانہ صنف اس 'عہدِ برق و باد' میں بھی نہ صرف زندہ ہے بلکہ 'آبروئے تہذیب' بھی کہلاتی ہے جو اس کی 'عہد شناسی' کا بھرپور ثبوت ہے۔ جب متغزلانہ ادب علمی دور کے علاوہ عملی دور میں بھی مقبول رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ قدرتی طور پر اس سے کوئی تعمیری و مقصدی خدمت سرانجام نہ ہوئی ہو کیونکہ تعمیری خصوصیت جب کسی آرٹ کے مزاج میں شامل ہو تو یہ ناممکن ہے کہ اس سے ہمیشہ صرف غیر تعمیری خدمات ہی سرانجام ہوئی ہوں۔ ہاں یہ ہے کہ ادب کی یہ پوشیدہ خصوصیت جاننے کے لئے اس کا محتاط و منصفانہ مطالعہ ضروری ہے۔ اگر افادیت حسین و لطیف ہو کر بھی افادیت ہی کہلاتی ہے تو ماضی کے اردو ادب کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔

مگر زندگی صرف 'سود و زیاں' ہی کا نام نہیں ہے اور نہ یہ روش 'زندگی' کے لئے مناسب ہے، کیوں کہ یہ تاجرانہ نظریہ ہم میں منفی حقائق کی طرف سے 'گریز' تو پیدا کرتا ہے مگر ان حقائق سے نجات نہیں دلا سکتا، اس لئے غم و اندوہ کی طرف سے بے سروپا چشم پوشی محض عبث ہے اور بس! —— انسانی مصائب کی تاریخ گواہ ہے کہ 'گریز' کسی بھی موڑ پر کسی بھی منزل پر مشکلاتِ حیات کا دیرپا اور صحیح حل ثابت نہیں ہو سکا ہے ؎

گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کا
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست (اقبال)

یہ ڈاکٹر اقبال کا محض رجائی احساس نہیں ہے بلکہ شعورِ حیات کی طرف سے گریز پیدا کرنے والی کمزوریوں پر تحریک آفریں طنز ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ گریز 'عقیدے' کی حد تک پختہ ہو کر بھی لاعلمی اور صرف لاعلمی ہی پیدا کر سکتا ہے۔ زندگی کی پیچیدہ حقیقت سے 'ناواقفیت' کسی بھی طرح نشاطِ حیات کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ نفسیاتی اعتبار سے دانستہ لاعلمی ایک عارضی سکون تو ضرور دے سکتی ہے مگر زندگی سے بلاؤں کو خارج نہیں کر سکتی۔ قدیم زمانے میں 'نظامِ کائنات' سے اجتماعی ناواقفیت کے سبب وسیع و بے کراں سمندر، سورج کی تمازت، بجلی کی کڑک، ہولناک بیابان، خوفناک جانور، سخت اندھیرے اور طوفانی برسات نظامِ فطرت کی ایسی ہیبت و خونخوار حقیقتیں تھیں کہ جن پر قابو پانا اس وقت کے بے خبر انسان کے لئے ناممکن تھا۔ اس احساسِ کمتری کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ ان خوفناک حقائق کی تحقیق یا —— مقابلے کے بجائے انھیں رام کرنے کے لئے ان کی پرستش کی جاتی، سو وہی ہوا، ظاہر ہے کہ ان بھیانک مظاہرِ فطرت کی تحقیق کے لئے 'علم' ضروری تھا جو ناپید تھا اور مقابلے کے لئے اتحاد ضروری تھا جو مفقود تھا۔ اس لئے ان مظاہر کا عہدِ وحشت پر بڑا سوگوارانہ اثر پڑا۔ مگر انسان چوں کہ

بزدل ہی نہیں عقلمند بھی ہے اس لئے زندگی کی مسلسل سوگواری نے اسے حالات بدلنے پر مجبور کیا۔ چناں چہ قدیم اتحاد کے ابتدائی نقوش اسی مشترکہ فکر کا نتیجہ ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ نظامِ فطرت کی سخت گرفت سے آزاد ہونے کی آرزو قدیم و فطری ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انسان کی یہ قدیم و مشترکہ آرزو ہزاروں سال بعد اب تک مکمل نہ ہو سکی۔ اس ناکامی کے کئی اسباب ہیں، لیکن یہ بہر حال غلط بات ہے کہ عالمِ انسانیت نے نظامِ فطرت کو اپنے مطابق بنانے کی مشترکہ فکری و عملی کوشش نہ کی ہو۔ چنانچہ فنونِ لطیفہ اسی دیرینہ آرزو کی تکمیل کا ایک خارجی و دماغی ذریعہ ہے جو اب دل فریبی کی منزل سے گزر کر مقصدی رفعتوں پر جلوہ گر ہے لیکن اس قدیم آرزو کو صرف صد مقصدی اور غیر جمالیاتی بتانا انصاف نہیں ہے۔ چناں چہ شاداب اور لہلہاتی ہوئی فصلیں دیکھ کر قدیم کسانوں کا ایک بے نام مسرت کے زیرِ اثر اچھلنا، کودنا اور بے اختیار طرح طرح کی آوازیں بلند کرنا، معاشی احساس کے علاوہ ان کی جمالیاتی دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ زندگی کی 'مادی تعبیر' کے لئے قدیم حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کرنا عوام کو 'تاریخ' سے حاصل ہونے والے قدرتی فوائد سے محروم کرنا ہے۔

خصوصاً قدیم اردو ادب کی حیات ناشناسی کا سبب وہ 'روحانیت' اور تقدیر پرستی ہے جس سے انسان فطرت کا غلام ہو کر رہ گیا۔ چناں چہ ابتدائی 'ادب پر تصوف' کی چھاپ شعورِ عامّہ کے عجز اور تابع حالات ہونے کا نتیجہ ہے۔ چوں کہ اس عقیدت مندانہ فضا میں 'حالات' کو تابع کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا اس لئے اردو ادب میں 'خارجیت' سے زیادہ 'داخلیت' نمایاں ہے۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ وقت سے مشورہ یا مخالفت کے بغیر بغاوت یا انقلاب کا تصور ہی نہیں ہو سکتا تھا اور چوں کہ عقیدت مندانہ طرزِ تعلیم کے سبب بادشاہ 'ظلِ سبحانی' کہلاتا تھا اس لئے ناموافق حالات کو بدلنے کے لئے 'خداوند' سے عداوت معلوم! بغاوت کا دوسرا سنجیدہ و کامیاب ذریعہ ادب بھی ہے جس میں غزل کی دیرینہ مقبولیت کے سبب 'شاعر نسبتاً' زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ مگر چوں کہ زمانۂ قدیم میں شاعر 'سماجی فرد' کم اور 'ملہمِ غیب' زیادہ تھا اس لئے اسے کیا پڑی تھی کہ وہ 'تخلیق' پر 'تنقید' کو ترجیح دے اور لقمۂ دار ہو جائے۔ یہ ہیں وہ قدیم حالات جن کے سبب اردو ادب 'مقصدیت' سے مکمل طور پر وابستہ نہ ہو سکا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی غلط ہے کہ قدیم اردو ادب محض عیش پسند شاعروں کی جنسی تمناؤں کا عکس ہے یا یہ کہ کلاسکی ادب محض فن کے دیوتا پر چڑھائے ہوئے روایاتی افکار کا پشتارہ ہے۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ قدیم ادب میں کہیں کہیں ہی سہی لیکن سماج کی جانب داریوں کا پردہ چاک کرنے کی 'متحزلانہ' کوشش یقیناً کی گئی ہے۔ قدیم ادب نے گو حیات و کائنات کی حقیقت و ماہیت جاننے کی فلسفیانہ کوشش نہیں کی لیکن اس کے باوجود مایوس کن حالات میں 'بقائے انسانیت' کے لئے مستقل قدروں کی حفاظت کر کے تہذیب و تمدّن کی زبردست خدمت کی ہے۔ چناں چہ قدیم ادب اپنی داخلیت کے باوجود تشبیہات و استعارات کے پردے میں مثبت و مفید حقائق کی اتنی مؤثر ترجمانی کر چکا ہے کہ اُسے مسیحائے حیات نہ سہی لیکن بجا طور پر تصورِ حیات کہا جا سکتا ہے۔ اگر خلوص و محبت انسانی زندگی میں حقیقتاً کوئی افادیت رکھتے ہیں اور اس افادیت سے قدیم ادب ہم کنار ہے تو یوں بھی اس ادب کی اہمیت ظاہر ہے۔ اسرارِ زندگی سے فلسفیانہ واقفیت کے لئے ضروری ہے کہ ہم غم واندوہ سے جذباتی گریز کے بجائے ان کے صحیح حرکات کا سراغ لگا کر انھیں ختم کریں۔ مگر یاد رہے کہ محرکاتِ غم کی تلاش میں 'نظامِ فطرت' کا لحاظ بھی ضروری ہے ورنہ ہمارا مادی نقطۂ نظر 'موت' کے تدارک میں دن رات ایک کر کے بھی ناکام ہو جائے گا اور احساسِ کمتری سے سماج کی لعنتوں کو بھی اٹل سمجھے گا۔ اس طرح ہم فاتحِ فطرت کے بجائے فطرت کے علاوہ 'سماج' کے بھی یا تو غلام ہو کر رہ جائیں گے یا پھر ایسے 'صوفی' بن جائیں گے جنھیں سوسائٹی کے علاوہ 'خدا' بھی دھتکارے۔ ظاہر ہے کہ وہ ایسی سرد و منجمد لاش کو کسی طرح اپنا نائب نہیں بنا سکتا!

چوں کہ تحقیقِ غم کے بغیر انسدادِ غم محال ہے اس لئے حسب تمنا زندگی گزارنے کے لئے فطرت اور زندگی کی قدرتی کشاکش اور فرد و سماج کے رشتوں کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ مگر زندگی کی الجھی پیچیدگیوں کو سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ادیب و شاعر زندگی کے متعلق اپنے فلسفیانہ تجربے دل پذیر اور مؤثر پیرائے میں بیان کریں تاکہ اجتماعی راحت کے امکانات روشن ہوں اور زندگی ' ڈراؤنے خواب ' کے بجائے عرصۂ کیف و نشاط نظر آنے لگے۔ اس باب میں روحانی ورجائی انداز بھی 'خشتِ بالیں' کو 'زانوئے حور' بنانے کے مرادف ہے جو زندگی کی عملی راہوں میں کوئی آسانی نہیں پیدا کر سکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جذباتی ادب اجتماعی آلام کو آرام سے ہرگز نہیں بدل سکتا۔ ظاہر ہے کہ ' ماحول ' پر عمل ہی اثر کر سکتا ہے الفاظ نہیں۔ ہاں مناسب الفاظ کا یہ معجزہ مسلّم ہے کہ وہ حالات بدلنے کے لئے عوام کو بیدار و تیار کر سکتا ہے۔ اس لئے ادب کی تعمیری معاونت و اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس باب میں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہی الفاظ زیادہ اثر کر سکتے ہیں جو عملی طور پر تکمیل مقصد کو آسان بنائیں۔ محض خوش رہنے پر زور دینے سے کلام میں وہ معقول اثر پیدا نہیں ہو سکتا جو خوش رہنے کے طریقوں کا عملی تصور دینے سے ہو سکتا ترقی پسند تحریک اس لحاظ سے قابلِ مبارک باد ہے کہ اس نے شعر و ادب کی داخلیت کو مقصدیت سے ہم کنار کر دیا لیکن ' تحقیقِ غم ' پر ' توہینِ غم ' کو ترجیح دینا اور غمِ عام پر ' غمِ مزدور ' کو فوقیت دینے سے وہ اتنی کامیاب نہ ہو سکی جتنا ممکن تھا اس ناکامی کی تہہ میں ترقی پسندوں کی شدید ماحول پرستی اور بیانیہ بے ربطی بھی کارفرما ہے۔

زندگی کی پیچیدہ حقیقت کو متحرک انداز میں بتلانے کے لئے ڈاکٹر اقبال نے بھی ممکنہ کوشش کی لیکن بیک وقت کئی متضاد فلسفیوں کو اپنانے سے ان کا نظریۂ حیات واصلاح معقول کم اور گنجلک زیادہ ہو گیا۔ اقبال چونکہ حیات شناسی میں ' علم ' پر ' ایمان ' کو ترجیح دیتے ہیں اس لئے ان کا فلسفۂ حیات عقلیت سے زیادہ روحانیت پر مبنی ہے جس کا کوئی واضح اور معقول مفہوم متعین کرنا مشکل ہے۔ چناں چہ وہ ' محبت ' کو فراری جذبے کے بجائے ' حیات افروز ' تحریک بتاتے ہیں اور ارتقاء پسندی کو اس کی مرکزی خصوصیت تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن جب ' محبت ' تجربے کی کسوٹی پر کھری نہیں اترتی تو وہ ' محبت ' کے متعلق اپنا نظریہ بدلنے کے بجائے اُسے ایک جذبۂ متضاد بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اندازِ تحقیق ' حقیقت ' کے اصلی خط و خال نمایاں نہیں کر سکتا لیکن اتنا تو طے ہے کہ فلسفۂ اقبال میں ' عمل و ارتقا ' بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے ان کا یہ اندازِ نظر غیر حکیمانہ ہونے کے باوجود قابلِ احترام ہے۔ چناں چہ اقبال کا مجموعی کلام انسانی زندگی کو ایک متوازن راحت سے ہم کنار کرنے کی بڑی مخلصانہ کوشش ظاہر کرتا ہے ———

تلاشِ مسرت میں ضروری ہے کہ ہم تہذیبی تقاضوں کو نظر انداز نہ کر دیں ورنہ توسیعِ مسرت کے غیر تہذیبی اور گندے پہلو ' فروغِ ادب ' کے بجائے ہماری تہذیبی پستیوں کی ترجمانی کریں گے۔ یہاں توسیعِ مسرت میں غلط ذریعہ کا اندیشہ محض اس لئے ظاہر کیا گیا ہے کہ یہی احساس شدید ہو کر حکمرانوں کی مجرمانہ غفلتوں کا باعث ہوا اور ' ادب ' میں نظم ' انتقام ' اور میراجی کی بعض تخلیقات کا محرک ثابت ہوا۔ چونکہ ' مسرت ' اہتمام سے پیدا ہونے والی اختیاری کیفیت نہیں ہے اس لئے شاعر و ادیب پر فراوانیٔ مسرت کی شرط مناسب نہیں۔ ہاں یہ احتجاج ضرور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں اجتماعی حیات کے لئے راحت آفریں طرز کو مرکزی اہمیت دیں! ——— ' ادب ' میں آفاقیت بھی اتنی ہی اہم چیز ہے جتنی ' ماحولیت '۔ حق تو یہ ہے کہ ' ماحول ' ہی کے وسیع تصور کا نام ' آفاقیت ' ہے۔ ظاہر ہے کہ ' دل ' کی ترجمانی کی طرح ' دنیا ' کی ترجمانی بھی ماحول ہی کی ترجمانی ہے۔ مگر چوں کہ ' مقصدیت ' کی رو میں اقتصادی اور سماجی امور ہی کی ترجمانی کو ' ماحول پسندی ' کا نام دیا گیا ہے۔ اس لئے قدیم اردو ادب

کو ماحول پسندی کے مناظر بتلایا گیا ہے جو انصاف پر مبنی نہیں ہے، چناں چہ جہاں 'مزدور' کے پسینے کا رفیقانہ احساس لازمی ہے وہاں 'خواب شوق' کے آنسوؤں کا ہمدردانہ لحاظ بھی ضروری ہے کیونکہ دولت و افلاس کا فرق ہی عشق کو ازدواج سے بدلنے میں اکثر حائل رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ہر دو حقیقتیں ارتقائے حیات کے منافی ہیں۔ پھر 'پسینے' کی اہمیت ظاہر کرنے والا 'ادب' ترقی پسند کیوں؟ اور 'اشکوں' کی ترجمانی کرنے والا ادب رجعت پسند کیوں؟ جب کہ 'زندگی' محنت و معاوضہ ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اور بھی سینکڑوں حقیقتیں ہیں جو زندگی سے گہرا اور مسلسل تعلق رکھتی ہیں جنھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا اور نہ انھیں فراموش کرکے زندگی کو راحت سے اور 'ادب' کو آفاقیت سے ہمکنار کیا جا سکتا ہے۔ اقتصادی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن 'ادب' جیسی عظیم حقیقت کو صرف اسی کے لئے وقف کر دینا مجموعی زندگی اور ارتقائے تہذیب پر نامبارک حملہ ہے۔ دراصل ادب میں آفاقیت کا یہی مقصد ہے کہ ہم تہذیبی اعتبار سے ان ممالک کے دوش بدوش کھڑے ہو سکیں جو مہذّب اور متمدّن کہلاتے ہیں اور یہ کہ ہمارا ادب انقلاب کے بعد بھی مستقل اور تہذیبی قدروں کے سہارے زندہ رہ سکے ورنہ صدفی صد اقتصادی ادب کا عہد خوش گوار میں باقی رہنا معلوم! غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ بقائے تہذیب کے بغیر ہم اوروں سے متعارف نہیں ہو سکیں گے۔ مختصر یہ کہ ادب کو زندۂ جاوید بنانے والا اگر کوئی قوی عنصر ہے تو وہ آفاقیت اور صرف آفاقیت ہے جو جمالیاتی اضافوں سے مزیّن ہو کر 'تغزّل' کہلاتا ہے۔ بقائے تغزّل کے لئے قدیم اردو ادب نے جو تاریخی خدمات انجام دی ہیں وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔

جس طرح 'ادب' جیسی عظیم حقیقت کو 'پیٹ' سے منسلک کر دینا بے بصری ہے اسی طرح اُسے تنہا خانۂ دل میں قید کر دینا بھی سراسر ظلم ہے مگر چونکہ عہدِ قدیم میں ادب کی 'داخلیت' کے بنیادی اور ضرر رساں اسباب کا واضح علم نہ تھا اس لئے ہم اس ادب کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ حاکمِ وقت کی خوشنودی کے لئے 'عوام' کو آزادی سے محروم کرنے کا آلۂ کار ہے۔ ہاں اب جبکہ عہدِ قدیم کی اجتماعی غفلت کے نقصانات کا علم سب کو ہو چکا ہے اور بادشاہ 'ظلِ سبحانی' خادمِ ملک اور شاعر 'ملہمِ غیب' کے بجائے سماجی رکن کہلاتا ہے جن کے اہم فرائض عوام کو خوش حال رکھنا ہیں، البتہ ایسی صورت میں ادب کو حسب سابق 'داخلیت' کا اسیر کر دینا ناقابلِ معافی جرم ہوگا۔

میں پھر عرض کروں گا کہ 'زندگی و فطرت' کا عقلی تجزیہ کئے بغیر اور سماج و فرد کا باہمی رشتہ جانے بغیر محض رجائی و رومانی اندازِ نظر کوئی عملی آسانی ہرگز نہیں پیدا کر سکتا۔

مضمون نگار حضرات سے

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھئے

۲۔ غیر مطبوعہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جبکہ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ اس کے ہمراہ ہوں۔



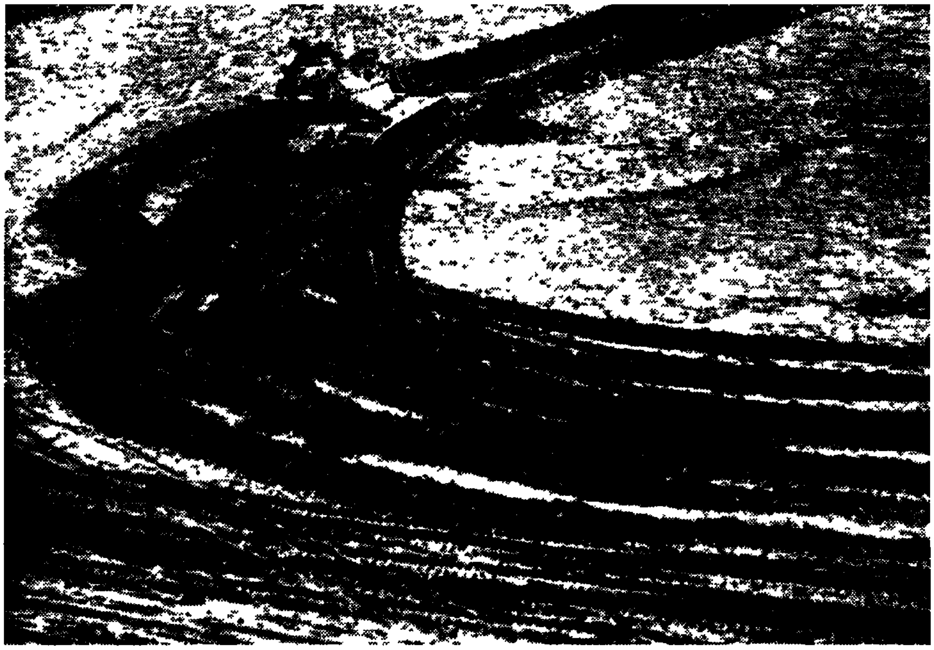
پنڈت جواہر لال نہرو، کشمیر میں



Edited & published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
Printed by Union Printers Co-op. Industrial Society Ltd., Karol Bagh, New Delhi-5

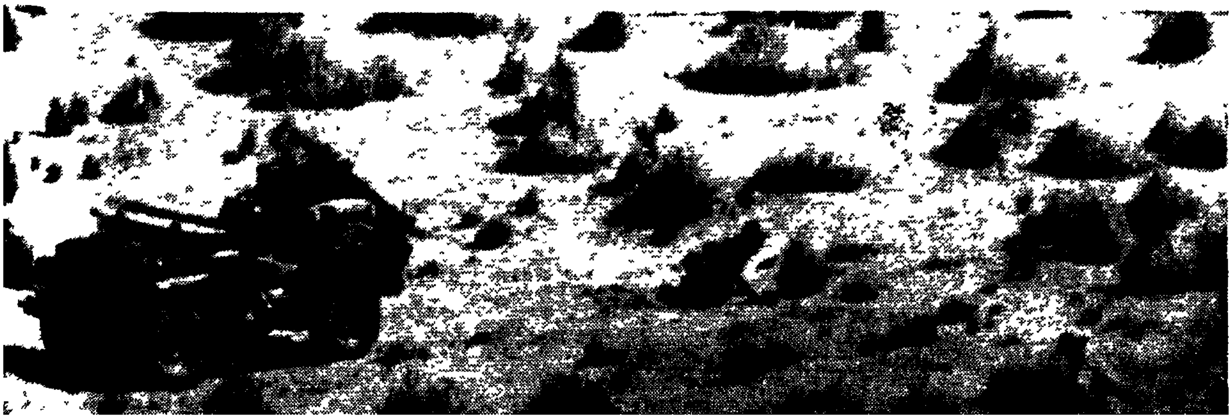
Regd No D-509





پاکستان کو جو ٹینک امریکہ نے امداد کے طور پر دے انھیں پاکستانی
فوجیں ہندوستانی علاقے میں ہندوستان کے خلاف استعمال کر رہی ہیں

امریکہ سے فوجی امداد میں ملی ہوئی ۱۰۶ ملی میٹر کی ریکوائل لیس توپ جسے
کچھ سرحد پر پاکستان ہندوستان کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔



اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر
عرش ملسیانی

اسسٹنٹ ایڈیٹر
شہباز حسین

ترتیب

سر ورق :- کلو کی وادی

رسالے کی پشت پر :- جھیل ڈل میں غروب آفتاب

جلد ۲۳ — نمبر ۱۱

جیشٹھ شک سمت ۱۸۸۷

جون ۱۹۶۵ء

سالانہ چندہ :-
ہندوستان میں :- سات روپے
پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

قیمت فی پرچہ :-
ہندوستان میں :- ۶۰ پیسے
پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :- ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

ہندوستان کا ہمیشہ یہ مسلک رہا ہے کہ وہ امن کی راہ پر چلے تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کی طرف سے یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان لڑائی نہ کرنے کا معاہدہ ہونا چاہیئے۔ سب سے پہلے یہ تجویز ہندوستان نے ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کو کی تھی۔ اس کے چند دن بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے پاکستان کے پرائم منسٹر کو اس موضوع پر لکھا تھا۔ ان کا یہ قول تھا کہ آپس کے تنازعات دوستانہ گفت و شنید سے ہی حل ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ اس بات کا اعلان انھوں نے ۲۹ مارچ ۱۹۵۶ء کو کیا۔ ۱۹۶۲ء میں انھوں نے صدر ایوب خاں کو ایک خط میں لکھا،

"ہندوستان اور پاکستان اس وقت بڑے تعمیری کام کر رہے ہیں جس سے ان کے باشندوں کا معیارِ زندگی بلند ہو۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان سے کسی قسم کی مخاصمت ہمارے تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کا مستقبل باہمی رواداری اور دوستی میں مضمر ہے۔"

ہمارے موجودہ وزیرِ اعظم شری شاستری نے بھی صدر ایوب کو ۱۵ جون ۱۹۶۴ء کے مراسلے میں لکھا کہ ہندوستان اور پاکستان کو چاہیئے کہ صبر اور سکون سے اپنے اختلافات کو دور کریں۔ یہی بات انھوں نے ۱۵ اگست ۱۹۶۴ء کو قوم کے نام پیغام میں دہرائی لیکن افسوس کہ پاکستان نے ان جذبات کی کبھی قدر نہیں کی۔ وہ کچھ مدت سے باقاعدہ طور پر ہندوستان کے درپے آزار رہا ہے کبھی کشمیر کی سرحد پر گولہ باری کبھی مشرقی بنگال میں اور کبھی آسام کی سرحد پر۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں رن کچھ میں پاکستان نے زبردستی ہندوستانی علاقے پر قبضہ کرکے جارحیت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ اقدام مشرق میں قیامِ امن کے ہی نہیں بلکہ دنیا میں قیامِ امن کے خلاف ایک بڑا بھاری اقدام ہے۔ ہمارے ملک کی پارلیمنٹ نے اس صبر آزما صورتِ حال کا سختی سے مقابلہ کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ہمارے پردھان منتری شری لال بہادر شاستری نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ "دنیا میں کسی بھی حکومت کو حکومت کہلانے کا حق نہیں پہنچتا اگر وہ کسی جارح پڑوسی کو اس کی اجازت دے کہ وہ زبردستی اس کے علاقوں کو اپنے علاقوں میں ملا لے۔ بھارت سرکار پاکستان کو جارحیت کی اجازت کبھی نہیں دے گی۔ ہم نے اب تک ضبط سے کام لیا ہے۔" ایسے حالات میں اہلِ ملک کا یہ فرض ہے کہ وہ پورے طور پر متحد رہیں۔ ایک عظیم قوم ہونے میں فخر محسوس کریں۔ اپنے کام کو صحیح لگن سے انجام دیں۔ یہ سب کچھ ہوگا تو کامیابی ہمیشہ ہمارا ساتھ دے گی۔

گیان چند

اُردو میں تمثیل نگاری

جس طرح مولیر کا ایک کردار ساری عمر نثر میں گفتگو کرتا رہا لیکن محض آخری عمر میں اس پر انکشاف ہوا کہ نثر کس کو کہتے ہیں اسی طرح اردو میں کئی صدیوں تک تمثیل نگاری ہوتی رہی۔ لیکن انیسویں صدی کے آخر میں محمد حسین آزاد نے اردو والوں کو اس کا درک دیا۔ اس کی تکنیک بتائی اُس کا نام سمجھایا۔ انگریزی اصطلاح allegory کا ترجمہ انھوں نے تمثیل کیا جو زبانوں پر چڑھ جانے کی وجہ سے ایک ادبی اصطلاح بن گیا۔ اب بعض حضرات کو اعتراض ہے کہ چونکہ تمثیل کے معنی ڈرامے کے بھی لئے جاتے ہیں اس لئے ایلی گری کو رمزیہ کہا جائے۔ لیکن عرفِ عام میں تمثیل کہہ کر ایلی گری ہی مراد لیا جاتا ہے۔ اگلے وقتوں کے چند بزرگ ڈرامے کے لئے اس لفظ کا استعمال کرتے ہوں تو انھیں کچھ نہ کہئے۔ دوسری طرف رمزیہ سے عموماً سمبالزم مراد لیا جاتا ہے اس لئے اسے ایلی گری کے مترادف قرار دینے سے خلطِ معنی کا اندیشہ ہے۔ تمثیل نگاری بیسویں صدی کی ابتداء میں ختم ہو گئی اس لئے اس مرحوم اسلوب کے لئے آزاد کی اصطلاح پر اکتفا کی جا سکتی ہے۔ سمبالزم اردو شاعری کی جدید تحریکوں میں سے ہے اس کے لئے رمزیہ کی عام فہم اصطلاح کو مختص کر سکتے ہیں۔

تمثیل نگاری ایک صنف نہیں۔ یہ مختلف اصنافِ نظم و نثر مثلاً مثنوی، نثری افسانہ، انشائیہ، ڈراما وغیرہ میں ہو سکتی ہے۔ اسے اسلوب کہنا بھی ٹھیک نہیں کیونکہ یہ سب رس اور گلزارِ سرور کے مرصع اور مسجع طرزِ نگارش میں بھی ملتی ہے اور شرر اور راشد الخیری کی سلیس انشا میں بھی۔ اسلوب ور اسلوب نہیں ہو سکتا۔ اسلوب کا تعلق ہیئت اور الفاظ سے ہے جبکہ تمثیل خالص معنوی فن ہے۔ تمثیل کو بیان کی ایک تکنیک، ایک صنعت کہہ سکتے ہیں۔ قدما کو اس کا احساس نہ تھا ورنہ اسے بھی علمِ بیان میں جگہ دے دی جاتی۔

allegory دو یونانی لفظوں سے مرکب ہے۔ allos بمعنی دوسرا اور agorie بمعنی بولتے ہوئے یعنی جس میں ایک بات کہہ کر دوسری بات مراد لی جائے۔ تمثیل کے کردار دراصل کسی دوسرے کردار کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ ان سے وہ مراد نہیں جو ظاہراً نظر آتا ہے بلکہ ان کے نیچے موج تہ نشین کی طرح کچھ اور معنی چھپے رہتے ہیں۔ اس طرح تمثیل استعاروں کی ایک زنجیر ہوتی ہے۔ تمثیل اور استعارے میں خاص فرق یہ ہے کہ استعارہ محض ایک شعر یا جملے میں ہوتا ہے جب کہ تمثیل کہیں زیادہ مفصل ہوتی ہے مثلاً ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے (چکبست)

اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لئے (اقبال)

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں (فیض)

ان اشعار میں صیاد، گلشن اور سحر استعارے ہیں تمثیل نہیں۔ اس موقع پر فراموش شدہ علم بیان کی یاد تازہ کر لینا نامناسب نہ ہوگا۔

اگر ایک لفظ کے غیر حقیقی معنی مراد لئے جائیں تو دو صورتیں ہو سکتی ہیں مجاز اور کنایہ۔ مجاز میں محض مجازی معنی مراد لئے جاتے ہیں حقیقی نہیں۔ کنایے میں مجازی اور حقیقی دونوں معنی مراد لئے جا سکتے ہیں۔ مجاز کی دو قسمیں ہیں۔ استعارہ اور مجاز مرسل۔ اگر مجازی اور حقیقی معنی میں تشبیہ کا تعلق ہے تو استعارہ کہتے ہیں اگر کوئی اور تعلق ہے تو مجاز مرسل کہیں گے۔

پیچھے تمثیل کو استعاروں کی لڑی کہا گیا تھا۔ یہ تو تمثیل کی غالب قسم ہوئی لیکن بعض تمثیلی تحریریں کنایہ ہوتی ہیں یعنی ان میں مجازی اور حقیقی دونوں معنی مراد لئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ملک محمد جائسی نے پدماوت کے آخر میں تمثیلی توجیہہ کر دی ہے کہ چتوڑ انسانی جسم ہے اور راجہ روح ہے۔ سنگھل دل ہے اور پدم نورِ الوہیت ہے۔ طوطا مرشد، راگھو برہمن شیطان اور علاء الدین مایا ہے۔ پدماوت کو تاریخی یا نیم تاریخی قصہ سمجھ کر پڑھا جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں اور ملک محمد کی توجیہہ کے مطابق اسے روح اور جمالِ الٰہی کا معاملہ سمجھا جائے تب بھی معنی کی چول بآسانی بیٹھ سکتی ہے۔ لیکن سپیدہ سحر، گلزار سوئے اور رنگ خیال میں محض مجازی معنی مراد ہیں حقیقی نہیں انہیں استعاروں کا سلسلہ کہیں گے۔

انگریزی میں حکایات کی دو قسمیں ہیں Fable اور Parable فیبل کے کردار حیوان یا بعض اوقات غیر ذی روح ہوتے ہیں جو انسانوں کی طرح بولتے چالتے ہیں۔ اس مختصر کہانی کے انجام میں کوئی اخلاقی سبق پوشیدہ ہوتا ہے۔ پیریبل کے کردار انسان ہوتے ہیں۔ حیوانات کا ذکر آتا ہے تو بطور حیوان کے اور وہ بھی ضمنی طور پر۔ اس کا پلاٹ فیبل کی نسبت زیادہ قرینِ امکان اور فطری ہوتا ہے۔ پیریبل کے معنی ہیں تقابل۔ اس میں کسی تمثیلی دلیل سے کوئی اخلاقی اصول ثابت کیا جاتا ہے۔ فیبل اور پیریبل کو مختصر تمثیل کہا گیا ہے۔ فیبل کی حد تک تو یہ صحیح ہے لیکن پیریبل کو بمشکل تمثیل کہا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں مختصر اصناف تمثیل کی شرح و بسط کی حریف نہیں ہو سکتیں۔ یہ تمثیل کا نقشِ اوّل ہیں۔ ذیل کی فیبل ملاحظہ ہو:

"ایک لومڑی نے سارس کی دعوت کی اور قاب میں کھیر لا کر سامنے رکھ دی۔ سارس محض دو چار چونچ مار سکا تھا کہ میزبان تمام کھیر کو چٹ کر گئی۔ چند روز بعد سارس نے لومڑی کو مدعو کیا اور ایک صراحی میں چنے کے دانے رکھ دیئے۔ سارس نے چونچ ڈال کر تمام دانے کھا لئے۔ لومڑی کو محض وہ چند دانے ملے جو سارس نے جان بوجھ کر گرا دئے تھے۔ سچ ہے جیسے کو تیسا۔"

ظاہر ہے کہ کوئی لومڑی یا سارس قاب اور صراحی میں دعوت کرنے سے رہے۔ یہاں دراصل انسان مراد ہیں۔ اس لئے یہ فیبل ایک مختصر تمثیل ہے لیکن وہ حکایات جن میں جانور جانوروں کے سے کام کرتے ہیں تمثیل کی ذیل میں نہیں آتیں۔ عرفِ عام میں جانوروں کی طویل رمزیہ کہانیوں ہی پر تمثیل کا اطلاق کیا جاتا ہے مختصر حکایات پر نہیں۔ ان کے برعکس پیریبل کا انداز یہ ہوتا ہے

"ایک بوڑھے نے اپنے بیٹوں کو بلا کر سوت کی ایک آنٹی توڑنے کو دی۔ کوئی نہ توڑ سکا۔ اس کے بعد آنٹی کا ایک ایک تار نکال کر دیا۔ ہر دھاگا توڑ دیا گیا۔ اس پر باپ نے کہا کہ تم اتفاق سے رہوگے تو کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ تم میں پھوٹ پڑی تو ہر کسی سے مار کھا جاؤ گے۔"

اس حکایت میں سوت کی آنٹی ایک علامت ہے لیکن محض اس کی وجہ سے اس حکایت کو تمثیل نہیں کہا جا سکتا۔

تمثیل اور رمزیت یا علامت نگاری SYMBOLISM

انگریزی میں کہا گیا ہے کہ تمثیل محض ادب تک محدود نہیں وہ

بُت تراشی اور مصوری میں بھی ہو سکتی ہے۔ میری رائے میں ان فنون میں تمثیل نہیں رمزیہ یا علامیہ ہوتا ہے۔ مجرد آرٹ abstract میں جو ہنگم سے خطوط ہوتے ہیں جنھیں بغور دیکھ کر بھی یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ وہ بھول بھلیاں ہے کہ عورتوں کا جمگھٹ کہ آبشار ان میں ایک ایمائیت ہوتی ہے جو ہمارے خیال کے تاروں کو جھنجھنا دیتی ہے۔ اسی طرح جدید بُت تراشی میں جو غیر متناسب انسانی مجسمے تراشے جاتے ہیں۔ وہ بھی کسی خاص جذباتی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ علامتوں کا استعمال انسان نے ہمیشہ کیا ہے۔ خود زبان ایک صوتی علامیہ ہے۔ رسم الخط بالخصوص تحریر کی ابتدائی منزل یعنی تصوری رسم الخط صوتی علامات کا مجموعہ ہے۔ قبائلی تہذیب میں رمزیہ اشیا کو بڑا دخل تھا۔ ٹونے، ٹوٹکے، کالے جادو اور ابتدائی مذاہب میں برکت پر اسرار قوتوں والی اشیا سے الٹ پھیر کیا جاتا تھا۔ آج کے بڑے بڑے فلسفیانہ مذاہب بھی اپنے ظاہری ارکان و رسوم میں علامتوں کا سہارا لیتے ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں رمزیت ادبی تحریک کے طور پر رائج ہوئی۔ یہ غیر متمدن انسان کی سیدھی سادی رمزیت نہیں بلکہ جدید شعور کی گہرائیاں ٹٹولنے کے لئے وضع کی گئی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جو لوگ متوسط طبقے کی اقدار کے خلاف شدید عقائد رکھتے تھے۔ انھوں نے پردہ داری کی خاطر علامتوں کا استعمال کیا۔ بعد میں رمزیت ایک نفسیاتی عمل کو بیدار کرنے کی کلید ہو گئی۔ زبان اور الفاظ انسانی تجربات و احساسات کی تصویر کشی کے حریف نہیں ہو سکتے۔ انسان کی نفسیاتی اُلجھنوں کا درک پیدا کرنے کے لئے شاعر علامتوں میں بات کرتا ہے جو بڑی بلیغ ہوتی ہیں جو اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتی ہیں جو تخیل پر مہمیز کرتی ہیں۔ علامیہ ادب انسان کے عقائد و اوہام کی تاریخ رفتہ میں جھانک کر دیکھتا ہے اور اُن کو نظر کے سامنے لاتا ہے خواب اور حقیقت، تحت الشعور اور شعور کی خلیجوں کو پاٹتا ہے۔ شاذ تمکنت کی نظم "خوں بہا" ملاحظہ ہو:

صلیبِ قیصر مقتلِ شبِ خموشی
در و بام و ایواں ہیں گھرے میں عطاں
کوئی شہر میں داد گر تک نہیں ہے
میں صدیوں سے ہوں نے بلب داد ساماں
سنے کون صورِ سرافیل نغمہ
کہ ہیں پنبہ در گوش شب زندہ داراں

مرا بختِ اسکندری کوچہ کوچہ
ہر اک سنگ سے آئینہ مانگتا ہے
ایاغِ سفالیں کا جمشید حاضر
کوئی نو بہ نو حادثہ مانگتا ہے
میں وہ آبلہ پا ہوں نجدِ دکن کا
ببولوں سے جو خوں بہا مانگتا ہے

اس نظم میں فن کار اپنے فن کی ناقدری کا شکوہ کرتا ہے۔ صدیوں سے اسے قدرداں کی تلاش رہی ہے لیکن بے سود۔ کئی بلیغ علامتوں کے استعمال سے شاعر نے احساس کی شدت جس بھرپور طریقے سے ظاہر کر دی ہے وہ براہِ راست طریقِ اظہار سے ممکن نہ تھی۔ یہ چند سطور ماضی کے طویل سناٹے اور بے حس فضا کی بھی بڑی چابک دستی سے عکاسی کرتی ہیں۔

تمثیلی علامت نگاری کی تیز گامی کے مقابل جرسِ کارواں کے نالے میں محو ہے۔ ماضی و حال کے بہت سے ایسے تجربے جو الفاظ میں نہیں سما سکتے علامیہ ہی کے فتراک میں اسیر ہو پاتے ہیں۔ تمثیل میں صرف انھیں اصولوں کی ترجمانی کی جاتی ہے جن سے ہم پہلے سے واقف ہیں لیکن رمزیہ تخیل کی قلمرو کی سیر کرا دیتا ہے۔ "تمثیل پانی کی بالٹی کی طرح ہے۔ اس میں جتنا پانی ڈال دیا گیا ہے ہم اس سے زیادہ نہیں لے سکتے۔ رمزیت لامتناہی چشمہ ہے۔" تمثیل حافظے کی

The lastRomantics by Graham Hough 1961 P-228 ۱؎

۱۹۷۰ء ۲؎

ہ ک ۔

پیداوار ہے جونلی کی نہیں ۔ ایٹس Ye 2TS رمزیہ کو تمثیل پر اس لئے بھی ترجیح دیتا تھا کہ تمثیل کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں لیکن رمزیہ علامت کے سو آدمی سو معنی لے سکتے ہیں ۔ رمزیہ کی علامات شخصی ہوتی ہیں اس لئے وہ مبہم پیچیدہ اور پُراسرار ہو جاتی ہے ۔ تمثیل سریع الفہم ہے ۔

اردو میں تمثیل کی یہ تعریف مشہور ہے کہ اس میں غیر مرئی کو مرئی بنا کر یعنی مجسم کرکے پیش کیا جاتا ہے ۔ لیکن یہ صحیح نہیں ۔ چیمبرس انسائیکلوپیڈیا میں صراحت کردی گئی ہے کہ تمثیل غیر مرئی کی تجسیم تک محدود نہیں ۔ کلیلہ و دمنہ میں گیدڑ، شیر اور بیلوں کے پردے میں بادشاہ، وزیر اور امرائے دربار کی تمثیل دی گئی ہے اور یہ ہستیاں غیر مرئی نہیں ۔ ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ ذی روح کو غیر ذی روح کے بھیس میں پیش کیا گیا ۔ افلاطون نے Phaedrus میں روح کی تمثیل ایک رتھ سے کی ہے جس میں دو گھوڑے جُتے ہیں ایک کالا دوسرا سفید ۔ بائبل کے ۸۰ ویں زمرے psalm میں یہودی قوم کی نشو و نما انگور کی بیل کے روپ میں پیش کی گئی ہے ۔ غرض اہم یہ نہیں ہے کہ غیر مرئی کو مرئی سے تمثیل دی گئی یا انسان کو حیوان سے ۔ بلکہ تمثیل کی شناخت کا واحد اصول یہ ہے کہ اس کے اشخاصِ قصہ سے مراد کچھ اور ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اخوان الصفا اور طوطی نامہ کو بھی تمثیل فرض کرلیا ہے لیکن ان میں سے کسی گروہ نے دوسرے گروہ کی ترجمانی نہیں کی اس لئے ان کتابوں پر تمثیل کا اطلاق نہیں ہو سکتا ۔ طوطی نامہ تو متعدد داستانوں اور حکایتوں کا مجموعہ ہے اسے تمثیل سے کیا علاقہ ۔ ہاں فارسی میں منطق الطیر ضرور تمثیل ہے ۔

بیشتر تمثیلی تحریریں مجرد تصورات و اوصاف کی تجسیم کرتی ہیں ۔ چوں کہ ذہنِ انسانی کو مجرد تصورات بالخصوص اخلاقی تصورات کو گرفت کرنا مرغوب نہیں اس لئے انھیں مجسم کرکے افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا تاکہ قارئین دل چسپی سے پڑھ سکیں ۔

اس طرح ابتداً تمثیل خام ذہنوں کے لئے اختراع کی گئی لیکن بعد میں ادیبوں نے اسے اپنے اسلحہ خانے میں سجا لیا ۔ اس میں شک ہے کہ لوگ تمثیل کو تزکیۂ نفس کے لئے پڑھتے ہیں ۔ غالباً افسانوی دل کشی اصل جاذبِ توجہ ہے ۔ تمثیل نگاری حالانکہ انشائیے اور نظم میں بھی ہوتی ہے لیکن اکثر اس میں افسانوی انداز ہوتا ہے کیونکہ اس میں کچھ نہ کچھ کردار ہوتے ہیں جو کچھ نہ کچھ کرتے بھی ہیں ۔ چنانچہ نیرنگِ خیال کے انشائیے بھی افسانے کی طرف مائل ہیں ۔ نکولس ڈی گلڈ فورڈ کی نظم اُلّو اور بلبل The owl and the Nightingale جیسی مثالیں کم ہیں اس میں اُلّو عقل کی اور بلبل شباب کی علامت ہے ۔ دونوں میں مباحثہ ہوتا ہے ۔ مصنف عقل کو شباب پر ترجیح دیتا ہے ۔ یہ نظم افسانہ نہیں ایک مناظرہ ہے ۔ اردو میں نظیر اکبر آبادی کی نظم ہنس نامہ، حالی کی مناظرۂ رحم و انصاف اور شرر اور محسن الملک کے چند مضامین غیر افسانوی تمثیلیں ہیں ۔

انگریزی میں تمثیل کے موضوع میں بڑا تنوع ہے ۔ اخلاقی، مذہبی، طنزیہ، علمی، سیاسی غرض ہر قسم کی تمثیلیں ملتی ہیں ۔ سوئفٹ کی Tale of a Tub مشہور طنزیہ ہے ۔ حال میں جارج آرویل نے Animal Farm میں روس کے اشتراکی انقلاب اور اشتراکیت کی نشوونما کو حیوانات کی تمثیل میں پیش کیا ہے ۔ اردو تمثیل کے موضوع میں اتنی رنگا رنگی نہیں لیکن یہ بھی نہیں کہ اردو تمثیل بسم اللہ کے گنبد ہی میں اسیر ہو ۔ میر کی مثنوی اژدر نامہ ادبی طنزیہ ہے ۔ نظیر کی نظم ہنس نامہ زندگی کی تمثیل ہے ۔ شیون کی طلسمِ حیرت میں طلسم بلبناس انسانی جسم کا نقشہ ہے ۔ بوستانِ خیال کا طلسم اجرام و اجسام نظامِ شمسی اور کائنات کا عکاس ہے ۔ عاشق حسین بزم کا طلسمِ کن فیکون حیاتِ انسانی کا خاکہ ہے ۔ محسن الملک کا مضمون "موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ" ایک علمی مسئلے کو پیش کرتا ہے ۔

حیوانی تمثیلات مجرد اوصاف کی تجسیم سے زیادہ پُرانی

لہ ادبی انشائیے ص ۳۰

ہیں - جانوروں کو انسانی عقل و دانش سے متصف کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ قدما آواگون پر اعتقاد رکھتے تھے - ان کے نزدیک دیوی دیوتا بعض اوقات جانوروں کی جون میں ظاہر ہوتے تھے - یونانی تمثیل سے لطیف تر تمثیل غیر مرئی کی پیش کش ہے - یونانیوں اور ہندوستانیوں نے کئی اوصاف و جذبات کے شعبے دیوی دیوتاؤں سے متعلق کر رکھے تھے - وینس، امروا، کیوپڈ، لکشمی سرسوتی، کام دیو وغیرہ غیر مرئی کی تجسیم کی مکمل مثالیں ہیں - جو اقوام ان کی تخلیق کر سکیں وہ اگر تمثیل نگاری کو وضع نہ کرتیں تو جائے حیرت ہوتی - عربی، فارسی اور اردو پر اس معاملے میں بڑی دبدھا کا عالم بیتا ہے - مسلمانوں میں بت گری اور تصویر کشی تو درکنار اداکاری تک ممنوع ہے - وہاں مذہب سے ان بن کئے بغیر تجسیم کی جائے تو کیونکر - اس کا حل یہ نکالا گیا کہ صفات کو انھیں کا نام دے کر انسان فرض کر لیا گیا -

بندہ نواز گیسو دراز کا رسالہ شکار نامہ اردو کی ابتدائی کتابوں میں سے ہے - یہ ایک معمہ نما افسانہ ہے جس میں معرفت کے رموز سربستہ ہیں - مراٹھی میں یہ صنف ابھنگ کہلاتی ہے - اس کا بیان تمثیلی انداز میں ہوتا ہے لیکن معنی کی دقت اور علامتوں کی اجنبیت کی وجہ سے یہ علامیہ سے بھی زیادہ مبہم ہو جاتا ہے - شکار نامے کی ابتداء یوں ہے :

" نو بایاں ہور سات ماؤاں کے ہیں چار فرزنداں، تین ننگے، یکس کوں کپڑا نچ نیں، جسے کپڑا نچ نہیں اس کی آستین میں پیسے تھے - چار مل کر بازار کوں گئے - او بازار جو ہیں جنیاں کا تھا - اوس بازار میں چار کماناں تھیاں، تین ٹوٹیاں یکس کوں چلہ ہور گوشہ نہ تھا -"

یہاں نو باپ سے مراد سات مقام ناسوت - لاہوت وغیرہ یا سات اعضا اور سات ماؤاں سے مراد سات اندرونی اعضا اور چار فرزنداں سے مراد چار نفس یعنی امارہ، لوامہ وغیرہ ہیں - یہ رسالہ تمثیل تو نہیں لیکن اس میں تمثیل کے عناصر شامل ہیں -

اردو کی پہلی مکمل تمثیل وجہی کی سب رس ہے جو نقش اول ہونے کے باوجود نقش آخر کی نوک پلک رکھتی ہے - یہ فتاحی نیشاپوری کی مثنوی دستور عشاق اور اس کی نثری تلخیص قصۂ حسن و دل سے ماخوذ ہے - اس کے کردار حسن، دل، عشق، عقل، ہمت، نظر وغیرہ ہیں - گو بظاہر قصے کا مقصود آب حیات کی تلاش ہے لیکن دراصل اس تمثیل میں حسن و دل کی باہمی کشمکش اور عقل و عشق کی باہمی آویزش کا بیان ہے - حسن کو عشق کی بیٹی قرار دیا گیا ہے اور دل کو عقل کا بیٹا - رشتوں کا یہ تعین قصے کی کمزوری ہے - پلاٹ میں دو معرکے بیان کئے گئے ہیں - ایک خارجی ہے یعنی حسن اور دل کے درمیان - دوسرا داخلی ہے عقل اور عشق کے بیچ - یہ کشمکش ایک ہی فرد کے دل و دماغ میں واقع ہوتی ہے - سب رس مثالی قسم کی تمثیل ہے - اس میں مجرد اوصاف و جذبات کی تجسیم کی گئی ہے - لیکن اسلامی روایات کے تحت انھیں دیوی دیوتا بنا کر پیش نہیں کیا گیا بلکہ انسان فرض کر کے ان کے اصلی ناموں سے ظاہر کیا گیا ہے - اس طریق کار میں تمثیل کی باریک چلمن عریانی کے مترادف ہو کر رہ جاتی ہے - یہ بھرم نہیں قائم رہتا کہ ایک کردار دوسرے کی نمائندگی کر رہا ہے - ناموں کے چپکنے کی وجہ سے کردار نگاری میں کسی پھیلاؤ اور لچک کی گنجائش نہیں رہتی -

قصۂ حسن و دل کی تمثیل کے مزید اردو ترجمے یہ ہیں :

۲- مثنوی گلشن حسن و دل از شاہ میر اللہ بحری ۱۰۸۶ھ یا ۱۱۱۴ھ
۳- مثنوی وصال العاشقین از شاہ حسین ذوقی ۱۱۰۹ھ
۴- مثنوی حسن و دل - مصنف نامعلوم - مملوکہ مولوی عبدالحق -
۵- مثنوی قصۂ دل و حسن - از غلام شاہ بھیک ۱۸۰۱ء فورٹ ولیم کالج
۶- مثنوی جان جہاں از حکیم میر علی خاں عاجی ۱۸۴۴ء / ۱۲۶۱ھ

۷- مثنوی حسن و دل از خیرالدین خواجہ ۱۲۶۴ھ

آخری تین ترجمے شمالی ہند کے ہیں۔

اردو کی دوسری قابل ذکر تمثیل پدماوت کا نیم تاریخی افسانہ ہے۔ اردو میں اس کے پانچ نسخے ملتے ہیں۔

۱- دکنی مثنوی پدماوت از غلام علی ۱۰۹۱ھ

۲- مثنوی رتن و پدم از میر محمد فیاض ولی ویلوری

۳- مثنوی پدماوت از ضیاء الدین عبرت دہلوی و میر غلام علی عشرت بریلوی ۱۲۱۱ھ

۴- پدماوت بھاکا مترجم منظوم از محمد قاسم علی بدایونی ۱۸۷۱ء - ۱۲۸۶ھ

۵- نثری نسخہ از مرزا عنایت علی بیگ لکھنوی ۱۸۹۸ء

جائسی کا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخی شخصیتوں سے تمثیل کا فائدہ اٹھایا۔ کتاب کے آخر میں وہ اگر تمثیل کے رُخ سے نقاب نہ اٹھا دیتا تو کسی کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ چتوڑ سے مراد انسانی جسم راجہ سے مراد روح، سنگھل سے مراد دل اور پدماوت سے مراد نورِ الٰہی ہے۔ طوطا مرشد، علاؤالدین مایا اور راگھو برہمن شیطان ہے۔ اس طرح سے یہ قصہ مکمل تمثیل ہو جاتا ہے اور جہاں تک تمثیل کا تعلق ہے یہ سب رس سے زیادہ فن کارانہ ہے کیونکہ فن کی پوشیدگی بھی ایک فن ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے چند تمثیل پاروں کی یاد تازہ کر لی جائے۔ سودا کے ذیل کے قصیدے میں خوشی کو بڑا حسین پیکر عطا کر کے مجسم کیا گیا ہے

فجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک
دی وہیں آکے خوشی نے درِ دل پر دستک

اس سے ایک کا مفصل سراپا رقم کرتے ہیں۔ میر کی مختصر مثنوی اژدر نامہ طنزیہ تمثیل ہے۔ اس مثنوی میں ہم عصر شعراء کو مینڈک، چوہا، چھپکلی، لومڑی وغیرہ ٹھہرایا ہے اور خود کو ایک اژدر خونخوار قرار دیا ہے۔ حشرات الارض جمع ہو کر اس سے لڑنے کو جاتے ہیں۔ اژدہا ایسا دم کھینچتا ہے کہ سب غریقِ بحرِ فنا ہو جاتے ہیں۔

کلیلہ و دمنہ کے قصے میں شاہی دربار و دراس کی سازشوں کا بیان ہے۔ دکن و شمال میں نظم و نثر میں اس کے کئی ترجمے اور خلاصے ہوئے۔ سب سے زیادہ قابل ذکر میر بہادر علی حسینی کی اخلاق ہندی، حفیظ الدین احمد کی خرد افروز اور فقیر محمد خاں گویا کی بستانِ حکمت (۱۲۳۶ھ)۔ کلیلہ و دمنہ کے پہلے دو بابوں کا قصہ اور چوتھے باب میں زاغ و بوم کی لڑائی صاف صاف تمثیلی رنگ میں ہیں۔

نظیر اکبرآبادی کی نظم ہنس نامہ

آیا تھا کسی شہر سے ایک ہنس بچارا

اس دنیا میں انسان کے ورود اور رخصت کی بڑی حسین تمثیل ہے۔

گارساں دتاسی ۱۸۵۵ء کے خطبے[1] میں بتاتا ہے کہ "الہ آباد کے اخبار امین الاخبار کے مدیر عزیز الدین خاں نے پلگرمس پروگرس کے طرز پر ایک کتاب جواہر اصل لکھی۔ اس کی عبارت میں نظم اور نثر دونوں ملی ہوئی تھیں۔ غالب نے اپنے ایک خط بنام علاء الدین خاں میں اپنے وجود کو قیامِ زنداں سے اور اہل و عیال کو ہتھکڑی اور بیڑی سے تمثیل کیا ہے۔ خط مختصر ہے لیکن تمثیل بڑی برجستہ ہے۔

یہ تمثیل پارے اپنے اختصار یا پھر ادبی حسن کی کمی کی وجہ سے تمثیلی ادب میں ممتاز نہیں۔ سب رس کے بعد اس کے رنگ کی دوسری تمثیل رجب علی بیگ سرور کی تالیف گلزارِ سرور (۱۲۷۵ھ اور ۱۲۷۹ھ کے درمیان) ہے۔ یہ ملا محمد رضی تبریزی ابن محمد شفیع کی فارسی مثنوی حدائق العشاق کا ترجمہ ہے۔ اس قصے میں ملکِ روحانیاں کا حاکم روح ہے۔ دل اس کا فرزند اور عقل وزیر ہے۔ عشق بادشاہ کی بیٹی حسن ہے۔ عشق ملکِ روحانیاں پر چڑھائی کر دیتا ہے اور ظفریاب ہو کر روح اور عقل کو قلعۂ جسم میں اسیر کر دیتا ہے۔ ادھر دل حسن کو دل دے بیٹھتا ہے۔ حسن کو دیارِ حقیقت میں بھیج دیا جاتا ہے۔ دل اپنے محبوب سے ملنے کے لئے فنا کی منزل سے گزر کر حسن تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد قلعۂ جسم کو مسمار کر کے روح کو دیارِ حقیقت میں بلا لیا جاتا ہے۔

---

[1] خطباتِ گارساں دتاسی ص ۴۷۹

قصہ بڑا دل کش اور روح افروز ہے۔ جذبات کی نمائندگی اور ان کا باہمی تعلق سب رس سے زیادہ فطری ہے۔ ابتدا میں عشق اور روح کے لشکروں کے سرداروں کے سات مبارزات بیان کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے یہ عارفانہ تمثیل رزمیہ ہو گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں سب رس رومانی داستان ہے جس کی نثر شعر کی تمام ادائیں لئے ہے۔

مثنوی حدائق العشاق کا ایک منظوم اردو ترجمہ بھی ملتا ہے۔ یہ عبدالرحمٰن حیرت تلمیذ امام بخش صہبائی کی مثنوی جنگِ حیرت (۱۸۷۰ء/۱۲۸۶ھ) ہے جو ۱۳۰۰ھ میں شائع ہوئی۔ ادبی حیثیت سے یہ نظم بڑی نہیں۔

فوقِ فطری داستانوں میں تمثیل کے طلسم تیار کئے گئے ہیں۔

جعفر علی خاں شیون نے ۱۸۷۲ء میں طلسم حیرت لکھی۔ اس میں طلسم بلیناس جسمِ انسانی کی تمثیل ہے۔ آنکھوں کی جگہ دوربین، کانوں کی جگہ نقارے، معدے کی جگہ مطبخ، دل کی جگہ محبوبہ کا محل ہے۔ اس طلسم پر شہزادہ حملہ کرتا ہے تو اس کے ساتھی امراضِ مجسّم ہیں جیسے سعال، فالج، زکام وغیرہ۔ اہالیانِ طلسم میں سے ان کی مدافعت کے لئے جرنیل صندل جنگ بہادر، ہلیلہ، سیاہ زنگی، اسبغول وغیرہ سامنے آتے ہیں۔ بوستانِ خیال کا طلسم اجرام و اجسام کائنات کا نمونہ ہے۔ اس میں پوری کائناتِ شمسی، کواکب، بروج وغیرہ کو متشکل کر دیا گیا ہے۔ اردو ترجمے کی دوسری جلد اسی طلسم پر محیط ہے۔ اسی قسم کی ایک اور کوشش عاشق حسین بزم کی غیر مطبوعہ داستان طلسم کن فیکوں ہے۔ یہ بڑے سائز کی چار ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی۔ اب اس کی دو جلدیں نول کشور پریس میں محفوظ ہیں۔ دو دیمکوں کی نذر ہو گئیں۔ اس طلسم میں بزم نے حیاتِ انسانی کی تمثیل پیش کی ہے۔ طلسم کن فیکوں کا بانی خدا ہے۔ اس طلسم کی شکست محشر میں ہوگی۔ تمام انسان اس طلسم کے طلسم کشا ہیں۔ ہر شخص کا دل لوحِ طلسم ہے۔ کن فیکوں کے دو حصے ہیں۔ طلسمِ باطن عدم ہے اور طلسمِ ظاہر عالمِ وجود ہے۔ باطن سے ظاہر میں آنے کا راستہ ایک مرحلۂ تاریک یعنی شکمِ مادر سے ہے اور جانے کا راستہ دہانِ گور ہے۔ طلسمِ ظاہر کے تین دربند ہیں۔ عالمِ طفلی، عالمِ جوانی اور عالمِ پیری۔ غرض یہ ہے کہ بزم نے حیاتِ انسانی کو بڑی خوبی سے طلسم ہوش ربا بنا دیا ہے۔

اردو میں تمثیل نگاری کا نام لیا جاتا ہے تو سب سے پہلے نیرنگِ خیال کا نام ذہن میں آتا ہے۔ جو لوگ سب رس سے واقف ہیں وہ بھی آزاد کو تمثیل کا مجدّدِ ثانی سمجھتے ہیں۔ معلوم نہیں کیونکر آزاد کو یہ بھرم تھا کہ وہ اردو میں تمثیل نگاری کا افتتاح کر رہے ہیں۔ وہ سب رس سے واقف نہ تھے۔ جائے حیرت نہیں لیکن اچنبھے کی بات یہ ہے کہ وہ گلزار سرور سے بھی متعارف نہیں جو غدر سے بعد کی تصنیف ہے اور جس پر غالب نے تقریظ لکھی۔ بہرحال قابلِ ذکر یہ ہے کہ تمثیل میں آزاد کی پہلی کوشش نیرنگِ خیال نہیں۔ وہ اس سے کئی سال قبل ۱۸۷۴ء کے مشاعرے میں پانچ تمثیلی مثنویاں پیش کر چکے تھے اور یہ نیرنگِ خیال کا پیش خیمہ تھیں۔ مثنوی صبحِ امید میں شہزادی امید پہاڑ کی چوٹی پر ایک گلزار میں متمکن ہے۔ مختلف پیشوں کے لوگ اس کی طرف جاتے ہیں۔ نیرنگِ خیال میں یہ "گلشنِ امید کی بہار" ہے۔ خوابِ امن میں خسروِ امن کا دربار لگتا ہے لیکن دوسری طرف کوہ پر ایک مردِ دلاور آشوبِ جہاں نامی کھڑا ہے۔ وہ ساری رعایا کو اپنی طرف ملا کر امن کو زک دیتا ہے۔ نیرنگِ خیال میں یہی ماجرا "آغازِ آفرینش میں عالم کا کیا رنگ تھا اور کیا سے کیا ہو گیا۔" میں پیش کیا گیا ہے۔ 'دادِ انصاف' اور 'وداعِ انصاف' نیرنگِ خیال کے 'سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ' کا نقشِ اوّل ہیں۔ مثنوی گنجِ قناعت کے اجزا بھی نیرنگِ خیال کے بعض مضامین میں شامل کر لئے گئے۔

حالی نے بھی مثنوی "نشاطِ امید" اور "مناظرۂ رحم و انصاف" میں امید، رحم اور انصاف کو انسان بنا کر پیش کیا لیکن پھر بھی وہ بھرپور تمثیلی رنگ نہیں جو محمد حسین آزاد کی نظموں کا مابہ الامتیاز ہے۔ آزاد کا شاہکار نیرنگِ خیال ہے۔ اس کے اکثر مضامین

انگریزی سے ماخوذ ہیں۔ چناں چہ نیرنگِ خیال کے بعض کردار یہ راز بالکل فاش کر دیتے ہیں۔ "سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ" اور "علوم کی بدنصیبی" میں سلطانِ آسمانی کا ذکر ہے۔ ملکہ صداقت زمانی اور ملکہ علم افروز اس کی بیٹی ہیں۔ اس کا بیان جس طرح ہے اس سے مراد خدا نہیں ہو سکتا۔ 'علوم کی بدنصیبی' اور علمیت اور ذکاوت کے مقابلے میں عالمِ بالا کے پاک نہادوں کا بھی ذکرِ خیر ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان سے مراد یونان کے اولمپس پہاڑ کے باسی دیوتا اور سلطانِ آسمانی سے مراد ان کا سردار جیوپیٹر ہے۔

آزاد نے بھی وجہی کی طرح جذبات اور اوصاف کو انھیں کے ناموں سے یاد کیا لیکن بعض اوقات وہ داستانِ امیر حمزہ کی طرح کچھ لقب بھی نام کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں مثلاً

دروغ دیوزاد سلطان محنت پسند خردمند

یہ بھی محض اتفاق ہے کہ اردو میں تمثیل نگاری کے لیے رنگین بیانی کو لازم سمجھ لیا گیا۔ سب رس کی فارسی اصل بڑی مرصع و مسجع ہے۔ وجہی نے وہی رنگ اڑایا لیکن کچھ اور بھی شوخ کر کے۔ سرور شہیدِ اسلوب تھے وہ گلزارِ سرور میں کیا کیا کرشمے کیوں نہ دکھاتے۔ رہے محمد حسین آزاد تو انھیں ہمیشہ سے بات بنانے کا لپکا تھا۔ وہ مغرب کی بات کرتے تھے لیکن مشرق کو دیکھتے تھے۔ وہ قدیم و جدید کی کشاکش میں پھنسے تھے۔ وہ قدیم ادب کی رنگینی اور تصنع پر ماتم کرتے ہیں لیکن خود تشبیہ و استعارہ کے بغیر لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ اس طرح اردو کے تین بڑے بڑے تمثیل نگاروں نے تمثیل کو بھی اسلوبیات کی ایک شاخ بنا دیا۔ قارئین ان کے رنگین الفاظ کے نقش و نگار میں اس طرح کھو گئے کہ معنی کی طرف کسی نے توجہ ہی نہ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ کوئی سب رس یا گلزارِ سرور کو پڑھ کر صوفی صافی ہو سکتا ہے نہ نیرنگِ خیال کو پڑھ کر کسی کی اصلاحِ اخلاق ہو سکتی ہے۔ رعنائی گفتار اس طرح داد طلب ہے کہ اس کے پیچھے دیکھنے کی کسی کو فرصت ہی نہیں۔

۱۸۸۳ء میں شاد عظیم آبادی کی طویل تمثیلی مثنوی مادرِ ہند شائع ہوئی۔ مادرِ ہند کے دو بیٹے رام اور رحیم ہیں۔ جن کے جھگڑوں سے تنگ آ کر مادرِ ہند انھیں چھوڑ دیتی ہے۔ انگریز ملکہ اسے پناہ دیتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد مادرِ ہند ان بیٹوں کو ملکہ کے جبلی دربار میں لے جاتی ہے اور ان کے لیے رحم و کرم کا سوال کرتی ہے جس پر ملکہ جواب دیتی ہے کہ ابھی پچاس سال اور صبر کرو۔ میرا پوتا انھیں سوراج دے گا۔' مثنوی میں ہندو مسلم اتحاد پر جو زور دیا ہے وہ قابلِ قدر ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ انگریزوں کی قصیدہ خوانی اور خوشامد اس بے غیرتی کے ساتھ کی گئی ہے کہ پڑھ کر افسوس ہوتا ہے۔

آزاد کے نیرنگِ خیال نے اردو کے کئی لکھنے والوں کو متاثر کیا۔ محسن الملک کا مضمون 'موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ' آزاد ہی کے رنگ میں ہے۔ شرر نے دل گداز میں جو انشائیوں کا انبار لگا دیا تھا ان میں چند تمثیلی بھی تھے مثلاً اتفاق و اختلاف کا مناظرہ، دماغی دربار، عقل و نقل کا جھگڑا۔ پہلے مضمون میں اتفاق کو صبیحہ اور اختلاف کو ملیحہ کے نام سے دو حسینوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ عقل و نقل کے جھگڑے میں بھی دونوں کو ملکہ قرار دیا گیا ہے۔

لیکن تمثیل میں آزاد کے سچے مقلد مولانا راشد الخیری ہیں۔ ان کا ناول منازل السائرہ ان کے مخصوص رنگ کا سماجی اصلاحی ناول ہے لیکن اس کے بیچ قصے کے عام رنگ سے ہٹ کر زندگی کی چار منزلوں یعنی شیرخوارگی، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے کی تمثیلی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ چمنستانِ شباب سے ملا ہوا شہرِ معیشت آباد ہے۔ اس میں ایک محلہ سسرال پورہ ہے۔ اس میں دو گلیاں ہیں۔ "مظلوموں کی گلی" اور "زبانِ درازوں کا کوچہ"۔ یہ گویا بیویوں کی دو قسمیں ہیں۔ چمنستانِ شباب کے کنارے دریائے انحطاط ہے جو نیرنگِ خیال کے 'سیرِ زندگی' کی صدائے بازگشت ہے۔ ملاحظہ ہو:

"دریائے انحطاط میں ایک جزیرۂ ندامت نظر آیا۔ چند نیک صورت بزرگ پھونس کی جھونپڑیاں ڈالے سرنگوں

بیٹھے تھے۔ ان کی سپید داڑھیاں ان کے چہروں پر نور برسا رہی تھیں۔ فضیلت کے بڑے بڑے عمامے سر سے بندھے ہوئے تھے۔ مگر فتنہ پردازی کی چھینٹیں پڑی ہوئی تھیں اور رگڑے پڑی ہوئی پیشانیوں پر کلنک کا ٹیکہ چمک رہا تھا۔ افعالِ گزشتہ کا تاسف اور اعمال کی پشیمانی چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔

بڑھاپے کے بعد سرحدِ عدم آباد آتی ہے جس کی فلک بوس فصیلوں میں عبرت کا پورا سامان موجود ہے۔ تمام بیانات اتنے بھرپور اور سہانے ہیں کہ ان پر آزاد کے قلم کا دھوکا ہوتا ہے۔ غرض منازل السائرہ کی یہ چاروں فصلیں تمثیل نگاری کے بڑے دل کش نقوش ہیں لیکن اپنے اصل ماحول میں پٹ ماٹ میں ریشم کا پیوند ہو کر رہ گئے ہیں۔

آزاد کی طرح درگا سہائے سرور نے بھی ذیل کی تمثیلی نظمیں لکھیں[لہ]:

نیچرل شاعری۔ اجڑی ہوئی دلھن۔ شیونِ عروس۔ جلوۂ امید۔ امید اور طفلی۔ دنیا کی اجڑی ہوئی محفل۔ سالِ گزشتہ۔

پہلی تین تمثیلیں اردو شاعری سے متعلق ہیں۔ جلوۂ امید میں مادرِ وطن کو تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ امید اور طفلی امید کے بارے میں ہے۔ دنیا کی اُجڑی ہوئی محفل ایک قصیدہ ہے جس میں موت کی تمثیل ہے۔ سرور نے ان نظموں میں تمثیل کے ساتھ ساتھ شاعری کا حق بھی ادا کیا ہے۔

زبانِ اردو کو انسان سے تمثیل کرنے کی رسم محمد حسین آزاد نے شروع کی۔ نیرنگِ خیال کے دیباچے کا وہ بیان معروفِ عام ہے کہ زبان اردو ایک لاوارث بچہ تھا کہ اردوئے شاہجہانی میں پھرتا ہوا ملا۔ وغیرہ۔ آزاد کے بعد سرور جہاں آبادی نے اردو کو تمثیل میں پیش کیا۔ ان کے بعد بہار کے ایک ادیب سید وصی احمد بلگرامی نے اپنے مضمون[ٹہ] 'بیاہی کی بیٹی' میں اردو کو ایک بڑھیا کے روپ میں ڈھالا ہے۔ حال میں کنھیا لال کپور نے اپنے مضمون 'برقع بانو' میں تقسیمِ ہند کے بعد اردو کے حالِ زار پر ماتم کیا۔

کرشن چندر کا طنزیہ شاہکار 'ایک گدھے کی سرگزشت' بھی ایک حد تک تمثیلی ہے اس میں محض ایک کردار یعنی گدھا زمانہ ساز لیڈر کی تمثیل ہے لیکن بقیہ کوئی کردار کوئی واقعہ تمثیلی نہیں اس لئے پورے قصے پر تمثیل کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ کتاب ایک راستہ ضرور دکھاتی ہے یعنی یہ کہ طنز نگار کے لئے آج بھی تمثیل نگاری بڑا کامیاب حربہ ہو سکتی ہے۔ گدھے کے کردار سے کرشن چندر نے اپنی دو اور کتابوں میں کام لیا ہے۔

بیسویں صدی میں تمثیل نگاری کا زوال ہو گیا۔ اردو میں سرور اتفاق سے اس کے لئے رنگین بیانی لازم ہو گئی تھی اور اس مصروف کاروباری زمانے میں کسی کو الفاظ کے خوش نما پھول پتوں میں کھو جانے کی فرصت نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تمثیل میں بات کو براہِ راست نہیں کہا جاتا۔ بلکہ کچھ اور ہیں منشا کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ طرق آج کل پسندیدہ نہیں۔ اب پردہ پوشی کا زمانہ نہیں۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ مافی الضمیر کو بغیر گھماؤ پھراؤ کے صاف صاف ادا کر دیا جائے۔ یوں بھی ذہنِ انسانی اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ غیر مرئی تصورات کو گرفت کرنے میں کوئی دشواری نہیں کسی بہروپ کی حاجت نہیں۔ آج کے سماج اور ذہن کے مسائل اتنے پیچیدہ ہیں کہ وہ تمثیل میں بمشکل سما سکتے ہیں۔ نظم میں انھیں علامت نگاری کے ذریعے منکشف کیا جا سکتا ہے۔ گویا تمثیل وہ زینہ ہے جو ہمیں حکایت سے علامیہ تک لے آیا ہے۔

لہ درگا سہائے سرور۔ حیات اور شاعری' غیر مطبوعہ مقالہ از حکم چند نیر ص ۲۰۱

ٹہ شائع شدہ 'ندیم گیا' بابت ستمبر ۱۹۴۰ء و قومی زبان کراچی بابت ۱۶- اگست ۱۹۶۴ء

اردو کے تمثیلی ادب کی تاریخ زیادہ تابناک نہیں۔ اس طویل دھندلکے میں صرف تین شاہکار ایسے ہیں جو روشنی کے مینار کی طرح ہر طرف نور برسا رہے ہیں۔ سبدرس، گلزار سرور اور نیرنگ خیال۔ یہ تینوں معرفت یا سماجی اصلاح کی بات کرتے ہیں۔ انھوں نے ادب کی سطح کو ایک رفعت عطا کی، موضوع کے اعتبار سے بھی اور اسلوب کے لحاظ سے بھی لیکن ان کے باوجود تمثیل نگاری اب محض ایک تقویم پارینہ ہے جسے ہم عظمتِ ماضی کی یادگار کے طور پر سینے سے لگائے رہیں گے۔ مستقبل کا عکس اس کے آئینے میں نہیں۔

اقوامِ عالم میں تعلیمی و تہذیبی اشتراک

"ہم کشمکش اور تناؤ کی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ اس کے باوجود دنیا کا کاروبار قائم ہے۔ بلاشبہ اس کی وجہ قوموں اور افراد کا تعاون ہے۔"
۱۰ نومبر ۱۹۶۱ء کو مرحوم وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو نے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں یہ الفاظ کہے تھے۔

اقوامِ متحدہ کے قیام کا مقصد یہی ہے کہ دنیا کی قومیں جنگ و جدال کی بجائے گفت و شنید اور مفاہمت کے ذریعے نزاعی مسئلے حل کریں۔ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے قدم اٹھائیں اور رنگ و نسل اور مذہب و ملت کی حدود سے بالاتر ساری دنیا کو ایک انسانی برادری سمجھیں۔

اپنے قیام سے لے کر اب تک اقوامِ متحدہ نے انسانی زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں بڑے کارِ نمایاں انجام دئے ہیں اور دنیا سے بیماری، بھوک اور جہالت کو دور کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے اور قوموں کے درمیان مفاہمت اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں قابلِ قدر حصہ لیا ہے۔

دنیا کے تمام ملکوں میں تعلیم کی اہمیت اور اس کے وسائل کی توسیع پر بے حد زور دیا جا رہا ہے مگر اس کے باوجود دنیا کے کل بچوں کی تعداد کا ۴۵ فی صدی حصہ اسکول نہیں جاتا۔ یونیسکو کے ایک اندازے کے مطابق دنیا میں ۱۵ سال سے زیادہ عمر کے ایسے ۷۰ کروڑ مرد و عورت ہیں جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے۔ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ میں ایسے ممالک ہیں جن میں ناخواندگی کا تناسب ۴۰، ۹۰ فی صدی ہے۔ یونیسکو کے ڈائرکٹر جنرل کے الفاظ میں "جب سائنس کی ترقی کی بدولت انسان ستاروں تک پہونچ رہا ہے۔ دنیا کی ۲/۳ آبادی کا جہالت کی تاریکی میں رہنا بے حد افسوس ناک ہے۔"

دنیا سے جہالت کو ختم کرنے کے لئے یونیسکو نے ایک منصوبہ تیار کیا ہے اور ساری دنیا میں تعلیم کو پھیلانے کی ایک مہم شروع کی گئی ہے اور اقوامِ متحدہ کی امداد سے خاص طور پر پس ماندہ ممالک میں اساتذہ کی تربیت کے اسکول اور کالج اور سائنس کی تعلیم کے مرکز قائم کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے بہت سے اقدامات کئے گئے ہیں جو آنے والے برسوں میں ہزاروں انسانوں کو تعلیم کی دولت سے مالامال کر دیں گے۔

تہذیبی میدان میں بھی اقوامِ متحدہ نے بڑے کارِ نمایاں انجام دئے ہیں۔ یونیسکو اپنی مختلف سرگرمیوں کے ذریعے قوموں کے درمیان مفاہمت کا جذبہ پیدا کرتا ہے تاکہ بین اقوامی اشتراک کے لئے سازگار فضا پیدا ہو۔ اساتذہ، نوجوانوں اور کارکنوں کو دنیا کے مختلف ملکوں کے دورے پر بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ دوسرے ملک کے لوگوں سے ملیں، انھیں جانیں اور سمجھیں۔ اس سلسلے میں یونیسکو کی ایک خاص کوشش یہ ہے کہ مشرق اور مغرب کے درمیان زیادہ سے زیادہ مفاہمت پیدا ہو۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے مشرق کے ملکوں پر مغرب کا اثر بہت زیادہ غالب آ گیا ہے۔ اس کے برعکس مشرقی تہذیب و ثقافت سے مغرب کی دنیا بڑی حد تک ناآشنا ہے۔ یونیسکو کی کوشش ہے کہ مشرق کا تہذیبی سرمایہ بھی دنیا کے سامنے لایا جائے۔ اس سلسلے میں یونیسکو نے کئی اقدامات کئے ہیں جن میں مشرقی ممالک کی تقریباً سو ادبی کتابوں کا ترجمہ بھی شامل ہے۔

مصطفیٰ احسن رضوی

تمباکو، تاریخ کی روشنی میں

آج کل دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ہو جہاں عام طور پر تمباکو پینے، کھانے یا ناک میں رکھنے کا رواج نہ ہو۔ کسان، مزدور، فقیر، امیر، بوڑھا، جوان، تعلیم یافتہ اور جاہل غرض کہ انسانوں کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس میں تمباکو کا استعمال کسی نہ کسی صورت میں نہ کیا جاتا ہو۔ اس کے استعمال کے کئی طریقے ہیں۔ کوئی حقہ یا سُلفہ پیتا ہے، کوئی سگار اور سگرٹ، کوئی منہ میں تمباکو رکھ کر اس کا رس چوستا ہے اور کوئی پان، سپاری، کتھے اور چونے کے ساتھ ملا کر کھاتا ہے۔ کچھ لوگ پیس کر اس کا سفوف ناک میں رکھتے ہیں اور اسے نسوار کہتے ہیں۔ تمباکو کے نقصانات انسان کو پوری طرح معلوم ہو چکے ہیں اور اب وہ یہ اچھی طرح جان گیا ہے کہ تمباکو کے استعمال سے فائدے کم اور نقصان زیادہ ہیں۔ مگر اس کے باوجود لوگ اس کے ترک پر کسی طرح تیار نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ ہر سال کروڑوں روپیہ کا تمباکو استعمال کر ڈالتے ہیں۔

تمباکو کی دریافت

تمباکو کا اصل گھر امریکہ ہے۔ پرانی دنیا کو اس کا علم اس وقت ہوا جب کولمبس نے نئی دنیا دریافت کی۔ سمندروں میں گھومتا پھرتا جب اس کا جہازی بیڑہ جزیرہ کیوبا پہونچا تو کولمبس نے اپنے دو ملاحوں کو اس جزیرے کے حالات معلوم کرنے کے لئے بھیجا۔ انھوں نے یہاں کے جنگلی اور وحشی باشندوں کو جو ریڈ انڈین کے نام سے مشہور ہیں اپنے منہ سے دھواں اڑاتے دیکھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایک قسم کی پتی پیتے ہیں جس میں ہلکا سا نشہ یا سرور ہوتا ہے اور جس کے پینے کی عادت جب ایک مرتبہ پڑ جاتی ہے تو پھر مشکل سے چھوٹتی ہے۔

امریکہ کے ریڈ انڈین تمباکو کی پتی کو بڑا مقدس سمجھتے تھے۔ ان کے عقیدے میں ایک مرتبہ آسمان سے ایک روح دنیا کو دیکھنے بھالنے اور سیر کرنے زمین پر آئی۔ وہ جب گھومتے پھرتے تھک گئی تو اس نے آرام کرنا چاہا۔ چناں چہ اس نے ایک جگہ آگ روشن کی اور اس الاؤ کے کنارے وہ لیٹ کر سو گئی۔ جب وہ بے خبر سو رہی تھی تو اس کا ایک دشمن وہاں پہونچا اور اس روح کو دھکا دے کر آگ میں ڈال دیا۔ روح گھبرا کر بیدار ہوئی۔ اس کے سر کے بالوں میں آگ لگ چکی تھی۔ وہ بدحواس ہو کر جنگل میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔ ہوا کے جھونکوں نے اس کے بالوں کو امریکہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا دیا اور اس کے بال جھڑ جھڑ کر جہاں جہاں گرے وہاں وہاں ان سے تمباکو کے پودے اُگ آئے۔ امریکہ کے قدیم باشندوں کا ہر قبیلہ اپنا ایک مخصوص پائپ رکھتا تھا اور اس کا بڑا احترام کرتا تھا۔ جب کسی تقریب کے سلسلہ میں ریڈ انڈین کہیں جمع ہوتے تو اس وقت تک تقریب شروع نہ ہوتی جب تک کہ پورا مجمع اس مخصوص پائپ کا ایک ایک کش نہ لگا لیتا۔ ان کی ہر رسم متبرک پائپ پینے

میں تمباکو پینا نسبتاً کم نقصان رساں ہے۔ اس لئے کہ چلم میں جو تمباکو ہوتا ہے اس کا دھواں بہت لمبا راستہ طے کر کے اور حقے کے پیندے میں بھرے ہوئے پانی کے اندر ٹھنڈا ہوکر انسان کے منہ تک پہونچتا ہے۔ اس طرح تمباکو کے بہت سے مضر اجزا حقے کی نگالیوں اور پیندے کے پانی میں رہ جاتے ہیں اور بہت کم مضرتیں انسان تک پہونچ پاتی ہیں لیکن سگرٹ، بیڑی، سگار اور پائپ پینا اس لئے زیادہ مضر ہے کہ اس کا دھواں براہ راست انسان کے حلق میں پہونچتا ہے اور وہاں سے سانس کی نالی میں سے ہوکر پھیپھڑوں میں پہونچتا ہے۔

تمباکو میں اس کا وہ جز سب سے زیادہ مضر ہوتا ہے جسے نکوٹین کہتے ہیں۔ اصل میں یہ تمباکو کا زہر ہے جو اتنا مہلک ہوتا ہے کہ اگر نکوٹین کا ایک قطرہ کتے کو دے دیا جائے تو وہ فوراً ہلاک ہو جائے گا۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے پرندے تو صرف اس کی بو ہی سے مر جاتے ہیں۔ اب تصور کیجئے کہ ایسا مہلک زہر جب تمباکو کے کھانے یا پینے سے رفتہ رفتہ انسان کے معدے میں پہونچتا رہے گا تو یقیناً صحت بگڑے گی۔ چانڈو، چرس، سلفا اور سلک پینے سے جتنا نقصان پہونچتا ہے اس سے کچھ ہی کم تمباکو پینے یا کھانے سے پہونچتا ہے۔ تمباکو تمام نظام جسمانی کو متاثر کر دیتا ہے اس سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں خصوصاً دماغی اور اعصابی بیماریاں مثلاً دوران سر، درد سر، تشنج، ضعف بصارت، ضعف حافظہ، ضعف باہ، نامردی، مراق، سکتہ، بے خوابی، پاگل پن، اندھاپن، کھانسی، اختلاج، کمزوری اعصاب اور آواز کا بیٹھ جانا۔ تمباکو کے استعمال سے سب سے زیادہ جو مہلک اور موذی مرض پیدا ہوتا ہے وہ ہے کینسر جس کا علاج ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔

تمباکو کے فوائد

ان مضرتوں کے ساتھ ساتھ تمباکو نوشی کے کچھ فوائد بھی ہیں تمباکو پینا یا کھانا کاسر ریاح ہے اور پیٹ کے اپھارے کو دور کرتا ہے۔ اسی طرح پیٹ کے ریاحی درد میں اگر تمباکو کی پتی پیس کر مالش کی جائے تو ریاح خارج ہو کر درد جاتا رہتا ہے۔ وہ جراثیم کش بھی ہے اس لئے اچھے منجن کا ایک اہم جز ہے۔ تمباکو کی کیٹ جو حقے کی نگالی میں جم جاتی ہے آنکھ میں لگانے سے رتوندا دور ہو جاتی ہے۔ تمباکو کے زہر کا تریاق دودھ ہے۔ چنانچہ دارا شکوہی کے مؤلف نے لکھا ہے کہ دودھ تمباکو کی ساری مضرتوں کو دور کر دیتا ہے۔ اس نے اپنے اس دعوے پر یہ دلیل پیش کی ہے کہ جو کپڑا دھوئیں سے رنگین ہو جائے وہ سوائے دودھ کے کسی چیز سے صاف نہیں ہوتا۔

جس طرح انسان کو شراب، افیون، چانڈو اور بھنگ پینے کی عادت ہو جاتی ہے اسی طرح تمباکو پینے یا کھانے کی لت بھی پڑ جاتی ہے۔ دنیا کے ہر ملک اور قوم میں آج کل تمباکو نوشی کا رواج پایا جاتا ہے۔ بس ہندوستان میں ایک سکھ فرقہ ایسا ہے جو تمباکو کے استعمال کو مذہباً ناجائز خیال کرتا ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ اپنے اس مذہبی حکم کی بڑی سختی سے پابندی کرتا ہے۔

تمباکو کے اقسام

آج کل دنیا میں کئی قسم کے تمباکو کی کاشت ہوتی ہے۔ امریکہ میں جو تمباکو بویا جاتا ہے اسے ورجینیا تمباکو کہتے ہیں۔ ورجینیا امریکہ کی ایک ریاست کا نام ہے جو صدیوں سے اچھے تمباکو کی پیداوار کے لئے مشہور ہے۔ تمباکو کی دوسری قسم ایران میں بوئی جاتی ہے اور تیسری قسم ٹرکی میں۔

تمباکو تیار کرنے کا طریقہ

تمباکو کی پیداوار کا اوسط بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ایک اونس تمباکو کے بیج سے کوئی چالیس ہزار پودے اُگتے ہیں۔ پہلے سب بیج ایک جگہ تھوڑی سی زمین میں بو دئے جاتے ہیں۔ جب وہ اُگ آتے ہیں اور پودے کچھ بڑے ہو جاتے ہیں تو انھیں پیاز یا گوبھی کی پود کی طرح اُکھاڑ

کر کھیتوں میں لگا دیا جاتا ہے۔ تمباکو کے پودے کی ساری پتّیاں کام کی نہیں ہوتیں اس لئے بہت سی ناکارہ پتّیاں توڑ کر پھینک دی جاتی ہیں۔ جب پودے پر پھول آجاتا ہے تو یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اب فصل تیاری پر آگئی ہے۔ پودے سے جس طرح کا گھٹیا یا بڑھیا تمباکو حاصل کرنا ہوتا ہے اسی لحاظ سے پیڑ پر پتّیاں باقی رکھی جاتی ہیں۔ اگر ان پودوں سے سگار یا حقّے کا تمباکو حاصل کرنا ہوتا ہے تو پودوں پر بیس بیس پتّیاں چھوڑ دی جاتی ہیں۔ اور اگر سگرٹ یا پائپ کا تمباکو تیار کرنا ہوتا ہے تو صرف بارہ پتّیاں ہی باقی رکھی جاتی ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ مہینے بعد یہ پتّیاں پک کر بالکل تیار ہو جاتی ہیں اور انھیں توڑ کر اکھٹا کرنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ ساری پتّیاں ایک ساتھ نہیں توڑی جاتیں بلکہ جو جو پتّی پکتی جاتی ہے اُسے توڑتے رہتے ہیں۔ مگر ہمارے ہندوستان میں زیادہ تر تمباکو کا پورا کھیت ایک ہی دفعہ میں کاٹ لیا جاتا ہے اور سکھا کر گڈیاں باندھ لی جاتی ہیں۔

امریکہ اور یورپ میں تمباکو تیار کرنے میں سائنسی طریقوں سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ تمباکو کے پودوں کو ایک ایسے کمرہ میں ڈھیر کر دیا جاتا ہے جس کا درجۂ حرارت ۱۷۰ ڈگری فارن ہائٹ ہو۔ اس کے بعد پتّیوں کو ڈنٹھل سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد گھٹیا، بڑھیا اور اوسط درجہ کے تمباکو کو چھانٹ کر الگ الگ باندھ دیا جاتا ہے۔ پھر ان بنڈلوں کو کم و بیش مہینہ بھر تک ۱۳۰ درجہ کی حرارت میں رکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تمباکو کا رنگ بھورا ہو جاتا ہے اور اب وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اسے استعمال کیا جا سکے۔

ہندوستان میں تمباکو کی پیداوار

ہندوستان میں چار قسم کے تمباکو پیدا کئے جاتے ہیں۔ پہلی قسم دیسی کہلاتی ہے، دوسری کلکتیا، تیسری پوربی اور چوتھی وہ قسم ہے جو گجرات اور مالوے میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی گجراتی تمباکو کا دوسرا نام سورتی تمباکو ہے۔

دیسی تمباکو کے پتّے لمبے، نوک دار اور کچھ پتلے ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ سیاہی مائل سبز ہوتا ہے اور پھول گلابی۔ کلکتیا تمباکو کا پھول دیسی تمباکو کے پھول سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کے پتّے بڑے اور گول ہوتے ہیں جن کے سروں پر نوکیں نہیں ہوتیں۔ پتّوں کا رنگ ہلکا ہرا ہوتا ہے۔ پوربی تمباکو کے پودے پر پتّے کم لیکن لمبے ہوتے ہیں۔ وہ اوپر کو کھڑے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ چاروں طرف پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کی چوڑائی بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ تمباکو زیادہ کڑوا بھی نہیں ہوتا۔ سورتی تمباکو بھی بہت مشہور ہے اور بہت زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے حسب ذیل علاقوں میں تمباکو کثرت سے پیدا ہوتا ہے:۔

(۱) اترپردیش کے اکثر اضلاع میں خصوصیت سے ضلع فرخ آباد میں۔

(۲) پنجاب کے اضلاع فیروزپور اور جالندھر میں۔

مندرجہ بالا دونوں صوبوں میں جو تمباکو پیدا ہوتا ہے وہ پان میں کھانے اور حقّے میں پینے کے کام آتا ہے۔

(۳) مدراس کے جنوبی علاقہ میں۔ یہاں کے اضلاع کوئمبٹور اور مدورائی میں کھانے اور نسوار کا تمباکو پیدا ہوتا ہے۔

(۴) اندھرا پردیش کے اضلاع گنٹور، کرشنا، مشرقی گوداوری، مغربی گوداوری اور تلنگانہ میں۔ آخر الذکر علاقے میں ورجینین تمباکو پیدا ہوتا ہے۔

(۵) شمالی بہار کے اضلاع مظفرپور، دربھنگا اور پورنیہ میں کئی قسم کے تمباکو کی کاشت ہوتی ہے جو پینے، کھانے اور نسوار لینے کے کام آتا ہے اور جنھیں اس علاقے میں ولایتی، میتھاری اور جیٹھی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

(۶) مغربی بنگال کے اضلاع برہم پور، مالدا، جلپائیگوڑی اور دیناج پور میں بھی شمالی بہار کی طرح کئی قسم کے تمباکو پیدا ہوتے ہیں جو کھانے، ناس لینے اور حقّے میں پینے کے کام آتے ہیں۔

(۷) گجرات کے ضلع کیرا کے آنند، بورساد، پٹلاد اور ندیاد تعلقوں میں کئی طرح کے تمباکو پیدا کئے جاتے ہیں۔ یہاں کا تمباکو بڑا مشہور ہے اور زیادہ تر بیڑی بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔

(۸) مہاراشٹر کے اضلاع کولہاپور، ستارا، سانگلی اور میرج میں جو تمباکو پیدا ہوتا ہے وہ بھی زیادہ تر بیڑی بنانے ہی میں کام آتا ہے۔

(۹) میسور کے ضلع بیلگام میں بھی بیڑی میں کام آنے والا تمباکو بہت کثرت سے پیدا ہوتا ہے جو نیپانی تمباکو کے نام سے مشہور ہے۔

اندھرا پردیش تمباکو کی پیداوار کے اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ پورے ملک کی پیداوار کا چالیس فیصدی تمباکو تنہا اندھرا پردیش پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح ملک میں ورجینین تمباکو کی پیداوار کا ۹۵ فی صدی صرف اندھرا پردیش مہیا کرتا ہے۔

ہمارے ملک میں جو تمباکو پیدا ہوتا ہے۔ نباتاتی اعتبار سے اس کی خاص خاص دو قسمیں ہیں ایک نکوٹیانا رسٹیکا اور دوسرے نکوٹیانا ٹیاکم۔

اول الذکر کی زیادہ تر کاشت بالائی ہندوستان میں ہوتی ہے۔ یہ تمباکو حقے میں پینے، پان کے ساتھ کھانے اور نسوار کے طور پر سونگھنے میں کام آتا ہے۔ ملک بھر میں تمباکو کی پیداوار کا ۸۰ فی صدی حصہ صرف نکوٹیانا رسٹیکا ہوتا ہے۔

ہندوستان میں پیدا ہونے والے تمباکو کی دوسری قسم جسے نکوٹیانا ٹیاکم کہتے ہیں سارے ملک میں جگہ جگہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ سگار، چروٹ، سگرٹ اور بیڑی بنانے کے کام آتا ہے۔ وہ حقے اور پائپ میں بھی پیا جاتا ہے اور اس کی ناس بھی لی جاتی ہے۔

تمباکو کی پیداوار کے لحاظ سے دنیا میں ہندوستان کا تیسرا نمبر ہے۔ سب سے زیادہ تمباکو امریکہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد چین میں اور چین کے بعد ہندوستان میں۔ اس کی پیداوار سے ہمارے ملک کے کسانوں کو ہر سال پچاس کروڑ روپیہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ تمباکو حکومت کی آمدنی کا بھی ایک اچھا ذریعہ ہے۔ تمباکو سے اسے سالانہ کم و بیش پندرہ کروڑ روپیہ کا زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے اور کم سے کم پچاس کروڑ روپیہ سالانہ اکسائز ڈیوٹی اور زرعی ٹیکس وغیرہ سے ملتا ہے۔

ہندوستان میں تقریباً ۹ لاکھ ایکڑ رقبہ میں تمباکو کی کاشت ہوتی ہے اور سالانہ پیداوار کا اوسط ستر کروڑ روپیہ سے زائد ہے۔ ہمارے تمباکو کا سب سے بڑا خریدار برطانیہ ہے۔ ہم جتنا تمباکو برآمد کرتے ہیں اس کا تقریباً نوے فی صدی سگرٹ میں کام آنے والا تمباکو ہوتا ہے۔ ہندوستان میں تمباکو کی صنعت سب سے زیادہ اندھرا پردیش اور بمبئی میں ہے۔ اس صنعت میں اول الذکر کا حصہ ۳۵ فی صدی اور آخر الذکر کا ۲۵ فی صدی ہے۔ حکومت ہند نے ۱۹۴۵ء میں ایک خود مختار ادارہ انڈین سنٹرل ٹوبیکو کمپنی کے نام سے قائم کیا تھا جو اب تک کام کر رہا ہے۔

سگرٹ نوشی سب سے زیادہ مضر

جیسا کہ ہم اوپر بتا آئے ہیں تمباکو جن جن طریقوں سے پیا جاتا ہے وہ سب انتہائی مضر ہیں مگر سگرٹ نوشی سب سے زیادہ مضر ہے اس لئے ہم اس کا بیان یہاں مفصل طور پر کر رہے ہیں۔ سگرٹ میں نکوٹین سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ سگرٹ کے ہر کش میں ۵۰ فی صدی نکوٹین ہوتا ہے۔ ایک سگرٹ پینے میں چوتھائی گرام نکوٹین پینے والے کے جسم میں چلا جاتا ہے اور ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ ایک گرام نکوٹین انسان کے جسم میں زہریلے اثرات پیدا کر دیتا ہے۔ جتنی نکوٹین ڈیڑھ سو سگرٹ پینے سے انسان کے جسم میں پہونچتی ہے۔ اگر وہ ایک ساتھ کھا لی جائے تو انسان فوراً ہلاک ہو جائے۔

سگرٹ نوشی صحت کو اتنا زیادہ نقصان پہونچاتی ہے کہ بعض اوقات وہ موت کا سبب بن جاتی ہے۔ چناں چہ برطانیہ کے شاہ ایڈورڈ ہفتم اور شاہ جارج پنجم کی موت کو بھی

سگرٹ نوشی کی کثرت کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

یوں تو تمباکو نوشی انسان کو ہر عمر میں نقصان پہونچاتی ہے مگر ابتدائی عمر میں تو وہ حد درجہ مضرت رساں ہے۔ اسکول کے لڑکے، لڑکیوں کو سگرٹ سے پوری طرح اجتناب کرنا چاہیئے اس لئے کہ لڑکپن میں سگرٹ پینے سے بہت ہی زیادہ نقصانات پہونچتے ہیں۔ حافظہ کمزور ہو جاتا ہے۔ حساب، مساحت اور جیومیٹری کے سوال مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں۔ دل اُچاٹ اور طبیعت بدمزہ رہتی ہے۔ جسم میں سستی پیدا ہوتی ہے۔ ہونٹ اور گلے پر سگرٹ نوشی کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ سگرٹ کے اندر بھرے ہوئے تمباکو اور اوپر لپٹے ہوئے کاغذ کا دھواں سانس کی نالی اور پھیپھڑوں میں پہونچ کر بہت زیادہ نقصان پہونچاتا ہے۔ جس صورت سے حقے کی نگالی میں دھوئیں کی وجہ سے کیٹ جم جاتی ہے اسی طرح حقہ اور سگرٹ پینے سے انسان کی سانس کی نالی میں بھی کیٹ جم جاتی ہے جس کی وجہ سے سانس چڑھنے لگتی ہے اور دمہ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

حال ہی میں شہر نیو یارک کے ماہرینِ امراض صدر و قلب چودہ ہزار افراد پر تجربے کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ جو لوگ تمباکو نوشی ترک کر دیتے ہیں وہ تمباکو پینے والے اشخاص کی بہ نسبت قلبی بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔

دنیا کا ایک ملک بھی ایسا نہیں جہاں سگرٹ نوشی قانوناً ممنوع قرار دی گئی ہو۔ شاید اس لئے کہ اوّل تو تمباکو کی مد سے حکومت کے خزانہ میں کروروں روپیہ آجاتا ہے دوسرے اس لئے کہ ارکانِ حکومت میں سے زیادہ تر خود سگرٹ نوشی کے عادی ہوتے ہیں۔ امریکہ میں سگرٹ فیکٹریوں کو حال ہی میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ سگرٹ کے پیکیٹ پر یہ ضرور لکھیں کہ سگرٹ نوشی صحت کے لئے سخت مضر ہے اور اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

فضا ابنِ فیضی

گُل زمیں

فضائیں مست و خوابگوں   گھٹائیں شوخ و پُرفسوں
نسیم کوچۂ جنوں   بجا رہی ہے ارغنوں
میں کیسے ہوش میں رہوں
خزاں کو بھی لیے ہوئے
چمن کی سمت چل پڑوں
مرے جنوں کا رقص ہے
یہ موجِ گُل، وہ موجِ خوں
یہ تیشہ بارِ ہمتیں
یہ کوہکن یہ بیستوں
اک آبجوئے شیر ہے یہ کوہ کن کی سرزمیں
حسین ہے جمیل ہے مرے وطن کی سرزمیں

یہ انجمن در انجمن   شباب و حسن و شعر و فن
یہ شہرِ سرو و نسترن   یہ خاکِ لالہ پیرہن
یہ جلوہ گاہِ جان و تن
ہوا ہے کاروانِ گُل
نئی ادا سے گامزن
نکھر چلا ہے دیکھنا!
رُخِ تمدّنِ وطن
عروسِ زندگی نے پھر
بدل لیا ہے پیرہن
کچھ اور لالہ پیرہن ہوئی چمن کی سرزمیں
حسین ہے جمیل ہے مرے وطن کی سرزمیں

یہ کائنات شبنمیں		یہ حسن زارِ مرمریں
فسوں طراز و دلنشیں		غزل کدوں کے مہ جبیں
نظر کہیں ہے دل کہیں
کرشمہ ہائے حسن کا
کوئی شمار ہی نہیں
یہ بمبئی کے لالہ رخ
یہ لکھنؤ کے نازنیں
یہ مہ وشانِ کاشمر
یہ پنج آب کے حسیں
یہ سرزمیں یہ آہوان گل بدن کی سرزمیں
حسین ہے جمیل ہے مرے وطن کی سرزمیں

•

شراب و شاہدِ غزل		ملیں تو ساتھ لے کے چل
یہ عشوہ ہائے بے بدل		کرشمہ ہائے برمحل
ہیں حسنِ فکر کا محل
کچھ اور شوخ ہو گئے
جبینِ دلبری کے بل
کھلا ہوا لبِ چمن
یہ تاج کا حسیں کنول
اے نافۂ دارِ ارتقا
سنبھل کے اپنی راہ چل
کہ آہوؤں نے ڈھونڈ لی نئے ختن کی سرزمیں
حسین ہے جمیل ہے مرے وطن کی سرزمیں

نفس سرودِ دلنشیں		نظر بہار کی امیں
یہ خلدِ عشرتِ یقیں		خرابۂ گماں نہیں
ہر ایک موڑ ہے حسیں
یہ گیان دھیان کا چمن
ثقافتوں کی گل زمیں
یہ شہر شہر دل کشا
متاعِ جیب و آستیں
ہیں اپنے گنگ او جمن
کہ جوئے شیر و انگبیں
یہ مہر و مہ کی رہگزر گل و سمن کی سرزمیں
حسین ہے جمیل ہے مرے وطن کی سرزمیں

•

نسیمِ شوق تو چلے		کہ غنچۂ جنوں کھلے
کچھ اس ادا سے چھیڑ دے		بہارِ نو کے زمزمے
کہ خود حیات جھوم اٹھے
یہ وقت ہے کہ جام میں
شرابِ زندگی ڈھلے
ابھر چلے ہیں خاک سے
نئے نئے غزل کدے
اٹھا ہے آذرِ وطن
نئے صنم تراشنے
نیا سرور دے گئی مئے کہن کی سرزمیں
حسین ہے جمیل ہے مرے وطن کی سرزمیں

جون ۱۹۶۵ء

یہ عشوۂ برہمنی حریفِ ہوش و آگہی
یہ خال و خط کی تازگی یہ آب و تابِ دلبری
نظر نظر ہے چاندنی
یہ گوپیوں کا بُت کدا
یہ شہرِ رقص و نغمگی
اسی کی گود میں پلا
مرا مذاقِ آذری
ملا اسی کی چھاؤں میں
مجھے جمالِ آگہی
یہ شبنموں کے آئینے ، نئی کرن کی سرزمیں
حسین ہے جمیل ہے مرے وطن کی سرزمیں

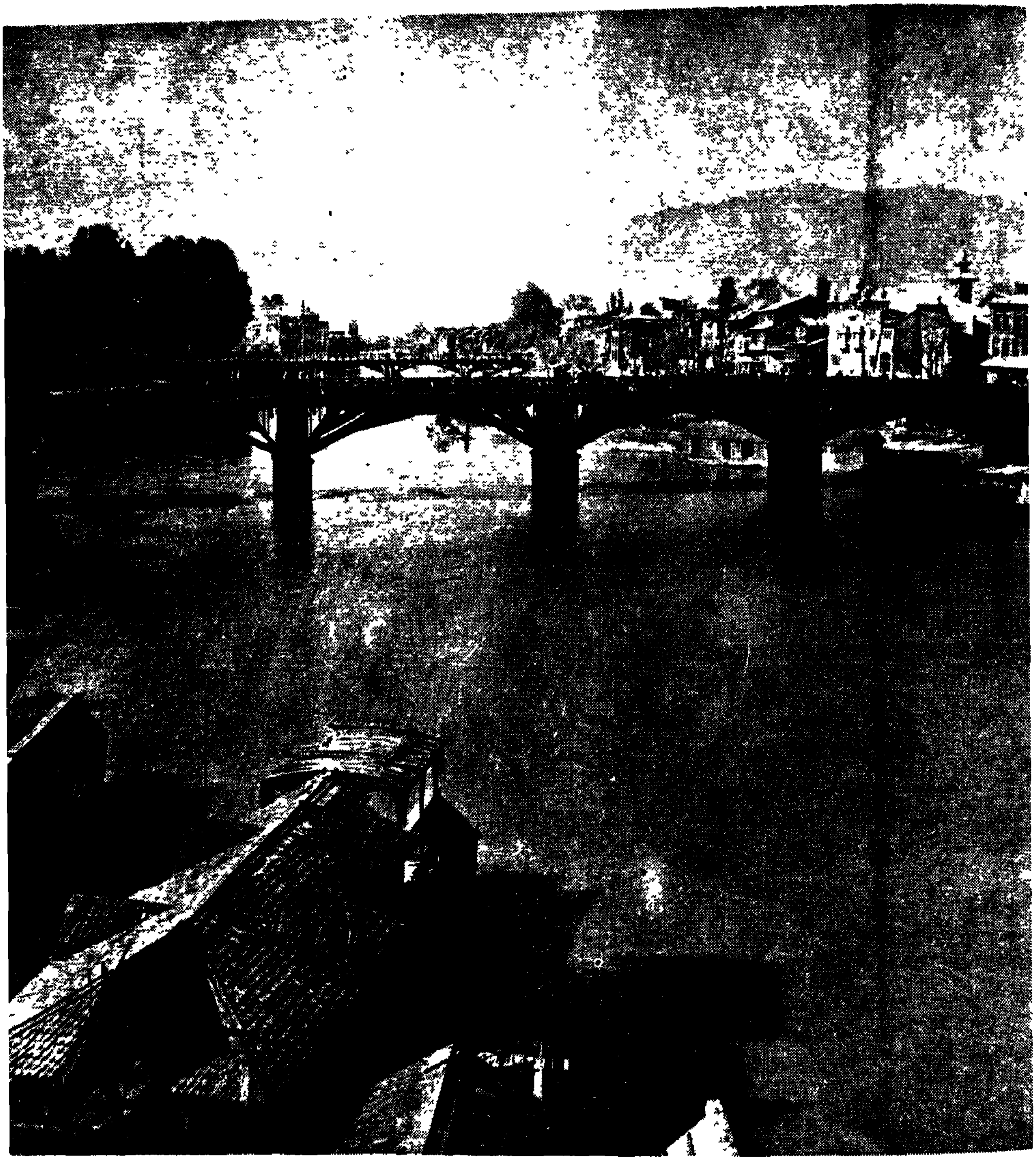
•

کہاں اب آنسوؤں کا نم بدل گیا مزاجِ غم
اداشناسِ کیف و کم جنون و ہوش کے صنم
ہیں منزلیں قدم قدم
یہ کس نے باز کر دیا
درِ بصیرتِ اُمم
نئی فضا ، نئے چمن
نئے جنوں کے پیچ و خم
نئی خیال کی لپک
نیا کرشمۂ قلم
نئے شعور کا وطن ، نئے سخن کی سرزمیں
حسین ہے جمیل ہے مرے وطن کی سرزمیں

یہ سوز و سازِ یہ سبو سرور و شوق و جستجو
یہ چاندنی کی آب جو یہ موجِ کیف و رنگ و بو
یہ دلّی اور لکھنؤ
یہ سجدہ گاہِ اشتغال
یہ شعر و فن کی آبرو
مرے قلم کی یہ شفق
مری جبیں کا یہ لہو
انھیں کے آب و رنگ سے
ہے دل فریب و سرخرو
مرے اودھ کی گل زمیں ، مرے دکن کی سرزمیں
حسین ہے جمیل ہے مرے وطن کی سرزمیں

•

میں حسن کا فسانہ گر میں عشق کا پیام بر
مرا شعور خوش نظر مرا مذاق دیدہ ور
مرا جنوں ہے خودنگر
گرا ہوں اوس بن کے میں
شگوفۂ حیات پر
ہے میری موجِ آگہی
صدف صدف ، گہر گہر
مرے قلم کے شعبدے
مجاز و جذبی و جگر
مرے لہو سے نم ہوئی یہ شعر و فن کی سرزمیں
حسین ہے جمیل ہے مرے وطن کی سرزمیں



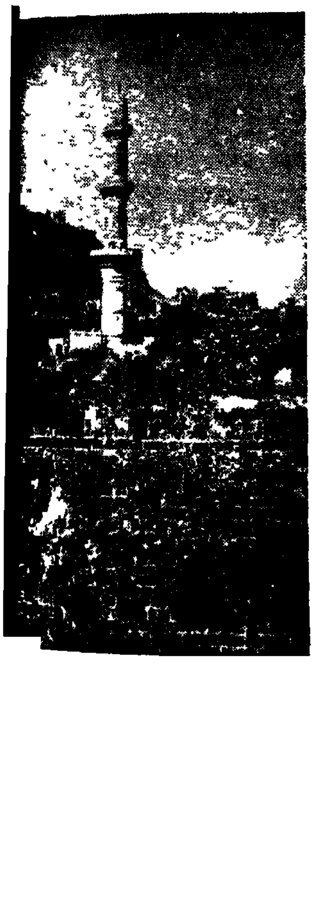
سری نگر میں دریائے جہلم پر امیرا کدل پُل

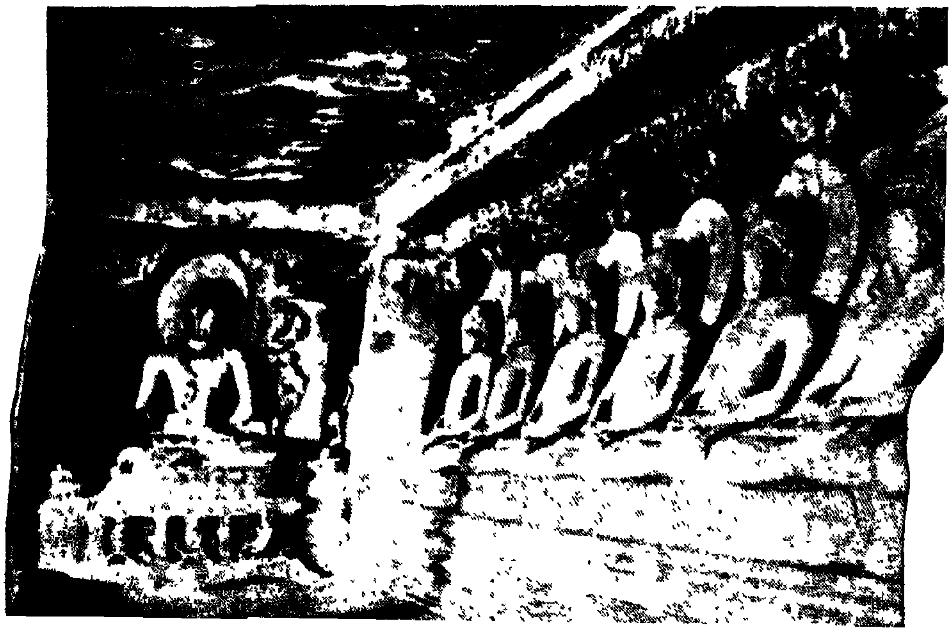
اورنگ آباد



پنڈت جواہرلال مرحوم اور موجودہ وزیر دفاع مسٹر چوہان اورنگ زیب کے مزار پر حاضری دینے کے بعد روضے کے باہر۔ گنبد بائیس خواجہ کے مزار کا نظر آ رہا ہے جن کی درگاہ میں شاہ عالمگیر مدفون ہیں۔

(فوٹو ڈگشت)

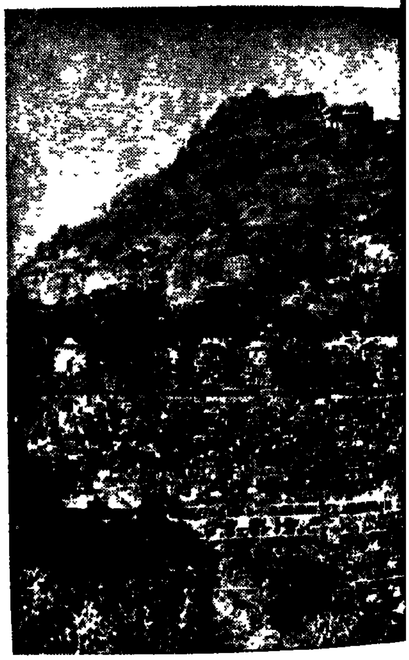




ایلورا کے غار میں مہاتما بدھ کے بت



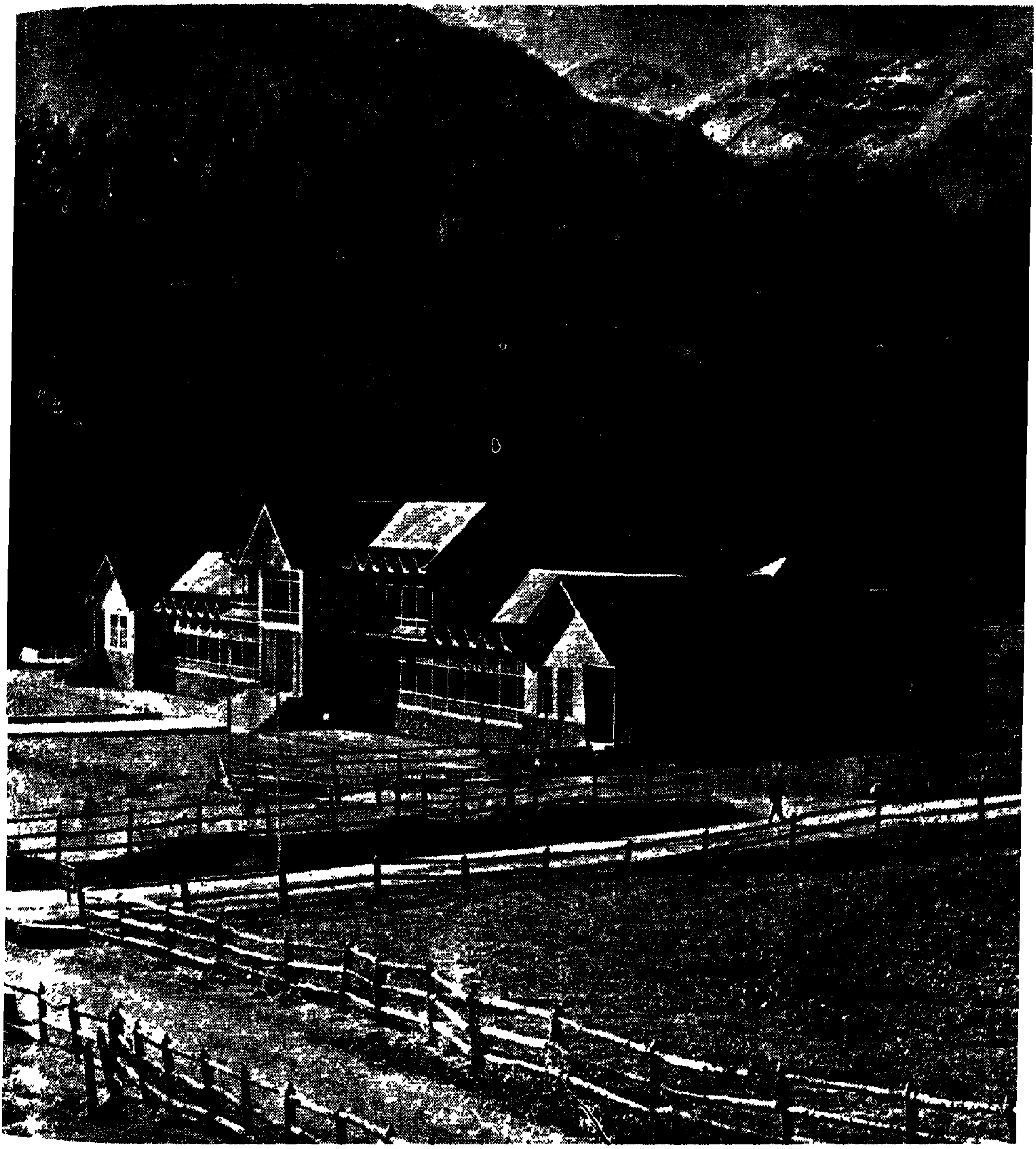
بی بی کا مقبرہ



ن آباد



مرحوم پنڈت جواہر لال اور
لیڈی ماؤنٹ بیٹن اجنتا کے
حسن سے متاثر نظر آرہے ہیں۔
(فوٹو ڈاکٹ)



ٹورسٹ کلب پہل گام

شروَن کمار ورما

دُوسری عورت

ہماری بیویاں میکے گئی ہوئی تھیں اور ہم سگریٹ اور رمی سے جی بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

جب اس طرح بھی بوریت دُور نہ ہوئی تو ہم اُن لڑکیوں اور عورتوں کا ذکر کرنے لگے جو جسم کا خوانچہ اُٹھائے گھوما کرتی ہیں اور اتنی ملنسار ہوتی ہیں کہ غیر مردوں سے ہمیشہ تنہائی میں ملنا پسند کرتی ہیں۔ بلدیو نے اپنے دو چار دوستوں کے ساتھ پیش آنے والے ایسے واقعات بیان کئے۔ مجھے بھی ایک دوست کا قصہ یاد آگیا جو حال ہی میں اس نے مجھے سنایا تھا۔ اس کی ملاقات سفر کے دوران ایک اُستانی سے ہوگئی تھی۔ جلد ہی وہ سڑکوں اور پارکوں کی بجائے کمروں میں ملنے لگے۔ میں نے تعلقات کے ساتھ لفظ 'ناجائز' کا اضافہ کیا تو وہ مسکرا کر بولا — "جانِ من! تعلقات صرف تعلقات ہوتے ہیں — 'جائز' و 'ناجائز' بے معنی الفاظ ہیں —" میں نے پوچھا۔ کیا وہ اس سے شادی کا ارادہ رکھتا ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ لڑکی کا نام و پتہ دریافت کیا تو وہ ہنسا اور کہنے لگا — "تم اتنا ہی یاد رکھو کہ وہ ایک جان دار عورت ہے۔ نام، پتے سے تمہیں کیا لینا۔ شادی وہ خود نہیں کرنا چاہتی کہ اُسے اس کا تلخ تجربہ ہے، اس کا ایک بچّہ ہے —" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا کہ یہ سلسلہ کب تک چل سکتا ہے؟ اس نے لاتعلقی سے جواب دیا۔ "جب تک وہ چاہے گی۔" "وہ چاہے گی!" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ تو وہ ہنسا اور بولا — "ہاں وہ ایسی ہی عورت ہے۔"

میں نے یہ کہانی بلدیو کو سُنائی۔ جب یہ کہانیاں بھی ختم ہوگئیں اور ریڈیو نے ہندی میں خبریں سنانا شروع کردیں تو میں اس سے ہاتھ ملا کر نیچے اُتر آیا۔

ابھی میں آخری سیڑھی پر ہی تھا کہ ایک کھنکتی ہوئی شگفتہ سی نسوانی آواز سنائی دی۔ میں ٹھٹھک گیا۔ جنوری کی رات، دس کے بعد کا سماں، جب سارا قصبہ نیند کی آغوش میں تھا، اس طویلے میں عورت کی آواز — آواز کی لوچ، مٹھاس اور نرمی سے جو عورت میرے ذہن میں اُتری، وہ ایک صحت مند، خوب صورت اور جوان عورت تھی۔ میرے اندر جیسے پنکھے چلنے لگے۔ اس طویلے میں ایسی کوئی عورت نہیں رہتی تھی۔ کچھ گودام تھے جو مقامی ٹرانسپورٹ کمپنی اور بینک کے قبضے میں تھے۔ سیڑھیوں کے ساتھ پہلا کمرہ بُوا جے دئی کا تھا۔ وہ بوڑھی بیوہ سرِ شام چراغ بجھا کر سو رہتی۔ آخری کمرہ بھی ٹرانسپورٹ کمپنی والوں کے پاس تھا، جہاں رات کو جلدی ٹرک لے آنے والے ڈرائیور اور کنڈکٹر بیٹھ کر شراب پیا کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کوئی ڈرائیور راستے سے کسی کو پھانس لایا ہے۔ لیکن وہ لہجہ کھیتوں میں کام

کرنے والی یا سڑکوں سے گوبر اٹھانے والی کا نہیں تھا ۔ ۔
کبھی کبھی کوئی فلم قصبے کی ٹورنگ ٹاکی میں آ جاتی تو ایسا لگتا جیسے تماشائی دے جاتا ۔

وہ بوا جے دئی سے باتیں کر رہی تھی ۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ یہ کرشنا ہے ۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔ مکند لال کھتری کی لڑکی ، راجاں کی بڑی بہن ، جسے اسکول جاتے میں اپنی کھڑکی سے دیکھا کرتا تھا ۔ نظریں جھکائے ، کتابیں سینے سے لگائے ، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ، وہ صبح شام میری کھڑکی کے سامنے سے گزرتی تھی ۔ قصبے کے وہ تمام نوجوان جو شہر جا کر فلمیں دیکھا کرتے تھے اس پر عاشق تھے ۔ اس کی نظریں کسی کی قسمت کا فیصلہ ہی نہیں کرتی تھیں ۔ ادھر یہ حال تھا کہ لڑکوں کی آپس میں ایک آدھ لڑائی روز ہو جاتی ۔ میں دبلا پتلا تھا اس لئے میرا عشق بھی خاموش تھا ۔ یعنی کھڑکی سے اتر کر سڑک پر کبھی نہیں آیا ۔

کرشنا کبھی کبھار ہمارے ہاں آ جایا کرتی تھی ۔ جب میرا دل اس کی آہٹ پر ہی دھڑکنے لگا تو میں نے بلدیو کو رازدار بنا لیا ۔ اس نے رائے دی کہ اردو شاعری کچھ عرصہ کے لئے پڑھنا بند کر دوں اور حالِ دل کرشنا سے کہہ دوں ۔ ایک دوپہر جب وہ ہمارے یہاں آئی تو میں چپکے سے نیچے اتر گیا اور ڈیوڑھی میں اس کا انتظار کرنے لگا ۔ صدیاں گزر گئیں تو وہ سیڑھیوں میں نمودار ہوئی ۔ اس نے نظر بھر کر شاید پہلی مرتبہ میری طرف دیکھا قریب سے گزرتے ہوئے ٹھٹھکی بھی لیکن مجھ سے بات نہ ہو سکی ۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی اور میں اپنے کمرے میں جا کر دیر تک تکیہ بھگوتا رہا ۔

کچھ دنوں کے بعد کرشنا کے گھر ایک خوبصورت نوجوان آ کر رہا ۔ اڑتی اڑتی خبر ملی کہ وہ کرشنا کی موسی کا لڑکا ہے ۔ وہ روز صبح کھیتوں کی طرف جاتا ۔ شام کو ریلوے سٹیشن چلا جاتا اور لائنوں کے ساتھ ساتھ دور نکل جاتا ۔ میں اسے اس طرح دیکھتا جیسے وہ کوئی ڈاکو ہے ۔ جب بھی میں اور بلدیو اکٹھے ہوتے شہر کے لڑکوں کا ذکر کرتے ۔ شہر کے لڑکے آوارہ ، بدچلن اور کمینے ہوتے ہیں ۔ بھولی بھالی لڑکیوں کو خراب کرتے ہیں ۔ نہ انھیں رشتے کی شرم ہوتی ہے نہ عزت کا خیال ۔

کچھ دن رہ کر وہ نوجوان چلا گیا ۔ ایک دوپہر جب کرشنا ہمارے ہاں آئی تو میں گھر میں اکیلا تھا ۔ ماں وغیرہ شہر گئی ہوئی تھیں ۔ وہ انھیں تلاش کرتی ہوئی میرے کمرے میں آ گئی ۔

" چاچی نہیں ہیں گھر پر ؟ "

" نہیں ۔ " میں نے روکھائی سے کہا ۔

وہ جانے لگی تو میں نے کہا ۔ " بات سن ۔ "

وہ ٹھہر گئی ۔ اس کی نظریں جھک گئی تھیں ۔ چہرہ گلابی ہو گیا تھا اور وہ دوپٹے کے کنارے کو مروڑے جا رہی تھی ۔ میں ایک لمحہ اسے دیکھتا رہا پھر بولا ۔

" بہت اچھا ہے نا وہ ۔ "

" کون ! ۔ " اس نے حیرت اور معصومیت سے میری طرف دیکھا ۔

" کون ۔ " میں نے اس کی نقل اتاری ۔ " وہی جو کھیتوں میں مجنوں بنا گھوما کرتا تھا ۔ "

" راجیش ! " وہ حیرت سے بولی ۔ " وہ میری موسی کا لڑکا ہے ۔ "

" موسی کی بچی ۔ " مجھے ایک دم غصہ آ گیا ۔ " میں سب جانتا ہوں یہ کزن وزن کے چکر ، بدمعاش کہیں کی ۔ "

وہ زخمی شیرنی کی طرح پلٹی ۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے ، چہرہ تمتما گیا تھا ۔ ایک ثانیہ وہ مجھے گھورتی رہی پھر تیزی سے باہر نکل گئی اور کبھی ہمارے ہاں نہیں آئی ۔

الف ۔ اے کے بعد میں نے شہر جا کر بی ۔ اے میں داخلہ لے لیا ۔ آہستہ آہستہ میں کرشنا کو بھولنے لگا ۔ بلدیو کا خط کبھی کبھار آ جاتا اور حالات سے آگاہی ہو جاتی ۔

اگلی سردیوں میں بلدیو کا خط آیا کہ کرشنا کا بیاہ ہو گیا ہے۔ بلدیو نے لکھا تھا کہ دولہا چالیس کے پیٹے میں ہوگا۔ چہرے سے مریض معلوم ہوتا ہے۔ اس رات میں نے وہسکی دوبارہ پڑھی اور خوب سگریٹ پیئے۔

اس کے بعد کبھی کبھار کوئی آکر سُنا جاتا۔ کرشنا کو فلاں جگہ دیکھا ہے۔ وہ کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ کوئی کہتا، نہیں پڑھتی ہے۔ بی۔ ٹی کرنے کے چکر میں ہے۔

آج بارہ سال بعد اس کی آواز سُنی تھی۔ بُوا جے دئی نے اُسے صبح آنے کی تاکید کرکے شاید کوٹھڑی کا دروازہ بند کر لیا تھا، کیونکہ چراغ کی زرد، مدھم سی روشنی سمٹ گئی تھی اور طویلے میں تاریکی پھیل گئی تھی۔ میں آخری سیڑھی سے دھپ سے اُترا۔ کرشنا نے اندھیرے میں میری طرف دیکھا۔ میں جرأت کرکے اس کی طرف بڑھ گیا۔

"کہو، کیسی ہو کرشنا؟"

"اچھی ہوں، تم سناؤ۔"

"کب آئیں؟"

"آج شام۔"

"کہاں ٹھہری ہو؟"

"اسکول میں۔"

"میرا گھر جو تھا۔"

اس نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ نچلا ہونٹ ایک دوبار دانتوں سے کاٹا۔ پھر پھاٹک کی طرف دیکھ کر پکارا "تارا سنگھ۔"

ایک لمبا، پتلا سا سکھ کمبل لپیٹے پھاٹک کے پیچھے سے نکل کر ہمارے قریب آگیا۔ اس کے کندھے سے سر لگائے شاید کوئی بچہ سو رہا تھا۔ میں نے تارا سنگھ کا جائزہ لے کر کرشنا کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا شال درست کر رہی تھی۔ میں نے تارا سنگھ کے وجود کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"جلدی نہ ہو تو آؤ، ایک ایک پیالی چاہ پی لیں۔"

اس نے گہری اور کریدنے والی نظروں سے مجھے ٹٹولا۔ جیسے کچھ سوچنے لگی۔ انکار کا موقع نہ دیتے ہوئے میں نے جلدی سے کہا۔

"آؤ تم سے ایک ضروری بات بھی کرنی ہے۔" پھر تارا سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا — "تم بھی آؤ تارا سنگھ۔"

"میں زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکوں گی۔" وہ بولی۔

میں نے سوچا عورتیں ایسی شرائط رکھا ہی کرتی ہیں۔ یہ اپنی شرافت کی دھاک بٹھانے سے کبھی باز نہیں آتیں۔ میں نے کچھ کہا نہیں، اسے لے کر باہر آگیا۔ باہر سردی زیادہ تھی۔ میں نے کوٹ کے کالر کھڑے کر لئے اور تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا۔ کرشنا میرے ساتھ ساتھ نظریں جھکائے چل رہی تھی۔ تارا سنگھ ہمارے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ اس خاموشی اور تاریکی میں معنی آچلے تھے۔ جب ہم اس لیمپ پوسٹ کے قریب پہنچے جو کرشنا کے گھر کے سامنے تھا اور جس کے سہارے کھڑے ہو کر میں اس کی کھڑکی کی طرف دیکھا کرتا تھا تو میرے قدم خود بخود رُک گئے۔ ایک ہی لمحہ میں میں نے کرشنا کی طرف اور اس نے میری طرف دیکھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں تو میں نے کہا۔

"یہ لیمپ پوسٹ یاد ہے؟"

"چلو، سردی بڑھ رہی ہے۔"

"اچھا نہیں لگا۔"

وہ خاموش رہی۔ میں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ میرے دل میں ایک کسک سی اُٹھ رہی تھی۔ میں نے سوچا یہ کون سا جذبہ ہے۔ پچھلے کئی سال سے میں نے کرشنا کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ میری بیوی تھی، بچے تھے اور ہمارا چھوٹا سا سنسار۔ پھر یہ کیا تھا، جو جنوری کی اس سرد رات میں میرے اندر دھیرے دھیرے پگھل رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ وہ چونک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے تارا سنگھ کی طرف دیکھا۔ وہ آسمان پر چاندنی کی پکی سی

کشتی کو دیکھ رہا تھا۔

ہم پھر چلنے لگے۔ کمرے میں پہنچ کر میرے ذہن سے کرشنا نکل گئی، محض وہ عورت رہ گئی جس کا شانہ بھرا بھرا سا تھا اور جو میرے ہاتھ کے لمس سے چونکی تھی۔ میں نے اُسے نظر بھر کر دیکھا۔ وہ دیوار پر آویزاں میری بیوی کی تصویر دیکھ رہی تھی۔

"تارا سنگھ! بچے کو کمرے میں سُلا دو۔" میں نے کہا۔

تارا سنگھ بچے کو سلا کر پہرے دار کی طرح ایک کرسی پر آ بیٹھا تھا۔ کرشنا کمرے کی ایک ایک چیز کو غور اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ میں صوفے کے ایک کونے میں دھنسا اُسے نگاہوں سے پی رہا تھا۔

"تمہاری بیوی کافی سُگھڑ اور ایجوکیٹڈ معلوم ہوتی ہیں۔" اس نے کمرے کا جائزہ لے کر کہا اور گول میز پر بچھے میز پوش کو دیکھ کر بولی ــ "سلائی کڑھائی میں بھی ماہر ہیں۔"

میں نے سگریٹ سُلگا لیا۔ کرشنا یہ تمام باتیں میری طرف پیٹھ کیے کہہ رہی تھی۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کی شادی ایک چالیس سالہ مریض سے ہوئی تھی، جس نے کچھ سال ہوئے اِسے چھوڑ دیا ہے اور اس کا جسم خاصا صحت مند اور متناسب ہے۔ ایک بچے کی ماں ہے تو کیا ہوا۔ ایک دم مجھے احساس ہوا کہ تارا سنگھ میرے تمام خیالات حرف بہ حرف پڑھ رہا ہے۔ مجھے کوفت ہونے لگی۔

کرشنا میز سے ہٹ کر کارنس کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی اور میری بیوی اور بچی کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔

"تمہاری بیوی خوب صورت ہیں، نین نقش تو تیکھے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔

"تمہاری بیوی ــ" اس نے دیوار پر آویزاں ایک پینٹنگ کو دیکھ کر کہا۔

میں اُٹھ کر اس کے قریب چلا گیا اور آہستہ سے کہا ــ "یہ تمہاری بیوی کا ریکارڈ کب تک بجے گا۔"

"آرٹسٹ بھی ہیں شاید ــ" اس نے مجھے نظرانداز کر کے اپنا جملہ مکمل کر دیا۔

"دیکھو، وہ سب کچھ ہے، تم بارہ سال کے بعد مل رہی ہو اور باتیں بھی ہیں۔"

"اور باتیں!" وہ مسکرا دی ــ "پرتاپ سنگھ کی، رُوں اور منجا سنگھ کے بارے میں بات کریں۔"

"نہیں امتحانوں پر گفتگو کرتے ہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں چند سیکنڈ کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ پھر جا کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ وہ ذرا پرے سرک گئی۔ مجھے اس کی یہ ادا اچھی نہیں لگی۔ اپنا غصّہ دبا کر میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"یہ کیا چیز ہے؟"

وہ میرا اشارہ نہیں سمجھی تھی، اس لئے سنجیدگی سے بولی:

"کون سی؟"

"وہ جو کمبل پیٹھے کُرسی پر رکھی ہے۔"

وہ مسکرا دی، پھر بولی:-

"میرا چپراسی ہے۔"

"یہ دیوار گرائی نہیں جا سکتی؟"

اس نے نظریں جھکا لیں۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ ایک پتنگا نہ جانے کہاں سے کمرے میں آ گیا تھا اور اب بلب سے بار بار ٹکرا رہا تھا۔ وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میں نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھایا اور باہر نکل گیا۔ میرا خیال تھا کہ چاء بنائی جائے۔ پیالیاں سامنے رکھ کر شاید گفتگو کا کوئی موضوع نکل آئے۔ کچن میں جا کر میں نے سٹوو جلایا اور پانی اُبلنے رکھ دیا اور کھڑکی کھول کر آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھنے لگا۔

میرے پیچھے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کرشنا کھڑی تھی۔

"کیا کر رہے ہو؟"

"آسمان کو دیکھ رہا ہوں۔"

"چاء بنانے آئے ہو۔" اس نے سٹوو پر رکھی کیتلی

کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس کے لئے مجھے بھی کہہ سکتے تھے۔"

"تم میری بیوی کے گن گا رہی تھیں۔"

وہ مسکرا دی پھر بولی

"تارا سنگھ کا کے کو لے کر چلا گیا ہے۔"

میں نے غور سے دیکھا، جیسے یقین نہ آرہا ہو۔ وہ خاموش کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لئے۔ سٹوو کی آواز کہیں دُور چلی گئی۔ کھڑکی سے آنے والی ہوا میں حدت آگئی اور ان نرم ملائم ہاتھوں سے پگھل پگھل کر کچھ میرے اندر سمانے لگا۔ میں نے اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔ لگا ساون کی گھٹا جھکی ہوئی ہے اور دُور کہیں گرجن ہو رہی ہے، رہ رہ کر بجلی چمک جاتی ہے۔

تبھی ایک چوہا شیلف سے آٹے کے پیپے پر کودا۔ کرشنا نے چونک کر ہاتھ کھینچ لیے۔

"چوہا ہے، تارا سنگھ نہیں۔" میں نے شوخی سے کہا۔

اس نے شوخ نظروں سے میری طرف دیکھا اور گردن کو خم دے کر بولی:

"تم جا کر بیٹھو، میں چاء بنا کر لاتی ہوں۔"

"مارو گولی چاء کو۔"

"چلو، چلو۔" اس نے پیار سے مجھے باہر دھکیل دیا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے سگریٹ سلگایا اور صوفے میں دھنس کر سوچنے لگا کہ اب تارا سنگھ نہیں ہے، فضا ہلکی ہلکی محسوس ہو رہی تھی۔ کچن سے آنے والی سٹوو کی آواز سینکڑوں پیغام لا رہی تھی۔ سارا گھر مہکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور میں آنکھیں موندے کرشنا کا بھرپور بدن اپنے میں جذب کئے جا رہا تھا۔ مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ رات رنگین ہوگی — ہر عورت کے اندر قلو پطرہ چھپی ہوتی ہے۔

کرشنا چاء کی ٹرے لے آئی اور میرے ساتھ صوفے پر ہی بیٹھ گئی۔

"یہ رات کتنی حسین ہو گئی ہے۔" میں نے جذبات میں ڈوبی آواز میں کہا

وہ خاموشی سے پیالیوں میں چائے انڈیلتی رہی۔

"کرشنا! ان سالوں میں کبھی تمھیں میری یاد آئی ہے؟" میں نے اس کے قریب ہو کر کہا۔

وہ اور بھی سمٹ گئی اور پیالی میری طرف بڑھا کر بولی

"لو۔"

میں نے پیالی لے کر میز پر رکھ دی اور اس کی کلائی تھام لی۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے۔" وہ کسمسائی۔

"بڑی ظالم ہو۔"

"سیدھے ہو کر بیٹھو۔"

"بارہ سال تمھارا انتظار کیا ہے کرشنا اور آج۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔" اس نے آنچل سینے پر پھیلا لیا جیسے مُرغی چوزوں کو پروں میں چھپا لیتی ہے

"میں بے وقوف ہوں۔" میں نے اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہا۔

"تم ضدی ہو۔"

"چلو یونہی سہی۔"

اس نے اپنی پیالی لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں نے روک دیا اور اپنی پیالی اُٹھا کر اس کے لبوں سے لگا دی۔ سپ کرنے سے پہلے اس نے ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر ایک گھونٹ بھر لیا۔ دوسرا گھونٹ میں نے بھرا اور اس طرح ہم نے پیالی خالی کر دی۔ وہ ایک دم اُٹھی اور کارنس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کئی برسوں سے اپنے خاوند سے الگ رہ رہی تھی۔ اُسے خدا نے بنایا تھا۔ وہ گوشت پوست کی عورت تھی۔ بھاگوتی تلسی داس کی ہیروئن نہیں۔ اس نے کارنس پر سر رکھ دیا۔ میں اُٹھ کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا اور آہستہ سے ہاتھ اس کی کمر پہ رکھ دیا۔ تبھی میں نے اس کی سسکی سُنی اور میں برف ہو گیا۔

"کرشنا۔"

"میں اب جاؤں گی۔" اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

" بات کیا ہوئی ہے؟ " میں نے اسے بازوؤں سے تھام کر پوچھا۔

" جانے دو مجھے۔" اس نے بھیگی آواز میں کہا۔

" چلی جانا۔ لیکن اس طرح روتے ہوئے نہیں۔" میں اسے صوفے پر لے گیا۔ وہ میرے پہلو میں بیٹھی، میرے رومال سے آنسو خشک کر رہی تھی۔

" تم تو بالکل بچی ہو۔"

وہ رومال کا گولا بناتی رہی۔

میں نے انگلی سے وہ آنسو کی لکیر مٹانا چاہی جو اس کے دائیں گال پر صاف نظر آرہی تھی۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی میں نے جھٹکے سے اُسے سینے سے لگالیا۔ وہ میرے شانے پر سر رکھے بیٹھی رہی۔

" کرشنا۔"

"ہوں۔"

" سنا ہے تمہاری اپنے خاوند سے ان بن ہوگئی تھی۔"

" ہاں، طلاق ہوگئی ہے۔"

" کیوں؟ "

" وہ مجھ پر شک کرنے لگا تھا۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور میری آنکھوں میں جھانک کر بولی — " اس کا خیال تھا میں آوارہ اور بدچلن ہوں۔ میرے کئی یار ہیں۔ جہاں میں جاتی، میرا پیچھا کرتا، اپنے دوستوں سے جاسوسی کرواتا — ایسے آدمی کے ساتھ کیسے رہا جا سکتا ہے — اس نے ایک روز تہمت لگائی کہ بچہ اس کا نہیں ہے۔ میں نے قبول کر لیا۔ اس نے مجھے گالیاں دیں اور مارا —"

" مارا۔"

" ہاں — کمزور مرد کا یہی آخری ہتھیار ہوتا ہے۔"

" لیکن تم بدچلن نہیں ہو سکتیں۔"

اس نے جیسے چونک کر میری طرف دیکھا۔ پھر مسکرا دی۔

" تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟ "

" میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ شاید تم خود بھی اپنے بارے میں اتنی اچھی طرح نہیں جانتی ہو۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں جما کر کہا۔ " میں نے تم سے محبت کی ہے۔ شاید تمہیں علم نہ ہو۔"

" میں جانتی ہوں۔" اس نے گمبھیرتا سے کہا۔ " اس روز بھی جانتی تھی جب تم نے مجھ پر شک کیا تھا اور گالی دی تھی، کوئی اور ہوتا تو میں اس کا منہ نوچ لیتی۔"

" مجھے ہمیشہ اپنی اس غلطی کا احساس رہا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا اور اس کے ہاتھ تھام لئے۔ پھر نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ اس کے قدموں میں دو زانو ہو گیا اور سر اس کی گود میں رکھ دیا۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی، پھر جیسے وہ میرے بال کھینچنے لگی۔ اس کی تکلیف میں عجیب سی لذت کا احساس تھا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے اپنے سر پر اس کی چھاتیوں کا نرم دباؤ محسوس کیا۔ میرے دونوں ہاتھ اس کی کمر کے گرد تھے اور میرے اندر جیسے بادل گرج رہے تھے۔ میں نے سر اٹھایا۔ اس کی طرف دیکھا اور بڑھ کر اس کے لب چوم لئے۔ وہ سٹپٹا کر اُٹھی اور مجھے علیحدہ کر کے کھڑی ہو گئی۔

" میں جا رہی ہوں۔"

" کرشنا۔"

" میں اور زیادہ نہیں بیٹھ سکتی۔"

" تم نے مجھے غلط سمجھا ہے کرشنا۔"

" میں نے نہیں، تم نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ تمہارا خیال ہے میں نے تارا سنگھ کو بھیج دیا ہے اس لئے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔"

"نہیں، میں نے ایسا نہیں سوچا۔ میں صرف تمہیں اپنے قریب، بہت قریب محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ میری بیوی اچھی خاصی عورت ہے، اس نے کبھی مجھ سے بے وفائی نہیں کی، لیکن ان بارہ سالوں میں میں نے ہمیشہ تمہاری کمی محسوس کی ہے۔"

"میرا راستہ چھوڑ دو۔"

"آج مجھے سب کچھ کہہ لینے دو۔" میں نے اسے بازوؤں سے تھام لیا۔ "اپنی بیوی سے مجھے سب کچھ ملا ہے، لیکن جب بھی میں نے اسے باہنوں میں لیا ہے، تمہارا چہرہ میرے سامنے آگیا ہے۔"

"تمہیں ایک غیر عورت سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

"تم غیر نہیں ہو۔ میری ہو۔ کرشنا تم ہمیشہ سے میری ہو۔ جب کبھی کسی نے تمہارا ذکر کیا ہے میں کھو سا گیا ہوں۔ جب بھی کسی نے بتایا کہ اس نے تمہیں دیکھا ہے میں نے اس کی آنکھوں کو بغور دیکھا ہے۔"

"بھگوان کے لئے چپ رہو۔"

"تم غیر کب سے ہو گئیں۔ مجھے تو خبر نہیں ہوئی۔ میں نے تو تمہیں اپنی رگ رگ میں محسوس کیا ہے۔ میں نے کبھی تمہیں غیر نہیں سمجھا اور آج جب تم اتنی مدت بعد ملی ہو تو یہ معمولی سی بھیک بھی نہیں دے سکتیں۔"

"نہیں — نہیں — نہیں —" وہ تقریباً چیخ پڑی اور خود کو چھڑا کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

"پھر سچ کہہ رہی ہو؟"

"بھگوان کے لئے مجھے جانے دو۔"

میں نے جھٹکے سے اُسے سینے سے لگا لیا اور اس کے لبوں پر جھک گیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"کرشنا۔ ایک لمحہ —"

"بھگوان کے لئے —" وہ مردہ سی ہو رہی تھی۔

میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے جھک کر فرش پر سے اپنا شال اُٹھایا اور تیزی سے سیڑھیاں اُتر گئی۔ میں نے اپنا مڑا ہوا رومال فرش سے اُٹھایا۔ اسے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور کالر کھڑے کر کے سیڑھیاں اُتر گیا۔

وہ لیمپ پوسٹ کے قریب کھڑی تھی۔ میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ایک منٹ ہم خاموش کھڑے رہے، پھر سنسان سڑک پر چپ چاپ اس کے اسکول کی طرف چلنے لگے۔

اثر فاروقی

اورنگ آباد

(علم وادب، قدیم تہذیب وثقافت کا گہوارہ)

جس طرح بعض شخصیتیں تاریخ میں امٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں اور اپنے یادگار کارناموں کے سبب جنھیں دوام حاصل ہو جاتا ہے اور جن کے بغیر تاریخ کے ابواب کی ترتیب نہ صرف ادھوری اور نامکمل سی رہ جاتی ہے بلکہ جن کے نام ہی سے تاریخ بنتی ہے اسی طرح بعض شہر بھی ایسے ہوتے ہیں جو تاریخ بناتے ہیں، تاریخ میں نئے ابواب کا اضافہ کرتے ہیں اور جن کا ذکر تاریخ بڑے احترام وادب اور خراج عقیدت کے ساتھ کرتی ہے۔ گویا یہ شہر نہ ہوتے تو تاریخ کے ابواب کی رونق میں قابلِ قدر اضافہ نہ ہوتا اور تاریخ کا تسلسل، تواتر اور اس کی اہمیت وافادیت بھی ایک طرح سے کم ہو کر رہ جاتی۔ حالانکہ بنیادی طور پر یہ اتفاقی واقعات و حادثات ہی ہوتے ہیں جو شخصیات کو ذریعہ بنا کر ان شہروں کی تاریخی حیثیت کو مسلّم بنا دیتے ہیں۔ اورنگ آباد کا شمار بھی اسی قسم ونوعیت کے شہروں میں کیا جانا چاہیئے جس نے نہ صرف تاریخ کے صفحات پر اپنے گہرے نقوش ثبت کئے ہیں بلکہ شعروادب علم وفن، تجارت وصنعت اور زندگی کے مختلف شعبوں کو ہمیشہ ترقی پذیر رکھنے اور زندگی کی عام اقدار میں اضافہ کے لئے بیش بہا واقعات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے جن میں تاریخی تسلسل بھی ہے اور تہذیب وثقافت کی قدیم جھلکیاں بھی۔ جن میں حسن و خوب صورتی بھی ہے اور تمدن کے ارتقاء کی کہانیاں بھی پوشیدہ ہیں۔ جہاں پن چکی کے جھرنے کی مترنم آواز میں انسانی فن کی بلندی کا راز ہے اور جہاں اجنتا وایلورا کے نقوش نہ صرف انسان کے فن کے کمال کی انتہا کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ جنھیں دیکھ کر انسان اس قدر حیرت واستعجاب میں پڑ جاتا ہے کہ اُسے اپنی سانس رُکتی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے اور نرم ونازک انگلیوں کی چابکدستی ومہارت حسین پتھروں میں دل کی دھڑکن کا درجہ اختیار کر لیتی ہے جیسے یہ اس کے اپنے دل کی آواز ہو۔

اورنگ آباد کی تاریخ

اورنگ آباد چھوٹی چھوٹی خوب صورت پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا نشیب وفراز کا شہر ہے۔ جس طرح اورنگ آباد کی گلیوں، سڑکوں اور عام شاہراہوں کی خصوصیت ان کا نشیب وفراز ہے اسی طرح اورنگ آباد کی تاریخ میں بھی کئی اُتار چڑھاؤ ملتے ہیں۔ اورنگ آباد کی تاریخ کے متعلق کئی روایات مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اورنگ آباد کا نام پہلے کھڑکی تھا۔ اس قیاس کی بنیادی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اورنگ آباد کے اطراف واکناف میں باون کھڑکیاں موجود ہیں۔ کھڑکی غالباً اس زمانے میں مضبوط پتھر کے دروازوں کو کہا جاتا تھا کیونکہ اورنگ آباد میں مہر کل اور رمتی دروازہ جیسے مد وسیع اور عظیم دروازے بھی موجود ہیں۔ یہ کھڑکیاں اس زمانے میں شہر کا باب الداخلہ

کہلاتی تھیں۔ یہ کھڑکیاں جو بڑے بڑے دروازوں سے کم نہیں آج بھی اپنے روایتی انداز میں ہر آنے والے مسافر کو خوش آمدید اور جانے والوں کو 'خدا حافظ' کہتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔ تاریخ فرشتہ میں بھی اورنگ آباد کا قدیم نام کھڑکی ہی بتایا گیا ہے جو بعد ازاں اورنگ زیب کی عملداری میں اورنگ آباد بن گیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گوداوری کی بائیں سمت میں مونگی نام کی بستی سے بھی اس مقام کا تعلق تھا۔ ان سنی سنائی باتوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو آندھرا ساتوان، چالوکیہ، راشٹرکٹ اور یادو جیسے عظیم ہندو دور سے اورنگ آباد کی تاریخ کا سلسلہ ملتا ہے۔

جبکہ بہمنی اور احمد نگر کے نظام شاہی مسلم دور سے اورنگ آباد کی تاریخ کا وابستہ ہونا تحقیق کے بعد پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ یادو خاندان یہاں کے ہندو راجاؤں کے اقتدار کی آخری نشانی ہے۔ ۱۲۹۵ء میں راجہ رام دیو رائے یادو کے ناقابل فتح قلعہ، قلعۂ دولت آباد کو علاء الدین خلجی نے فتح کر لیا جس کے بعد اورنگ آباد کی جغرافیائی و تاریخی تبدیلیوں کا سلسلہ مغلیہ دور سے جا ملتا ہے۔ علاوہ اس کے ۱۳۰۰ء میں اورنگ آباد سے ۹ میل دور واقع دولت آباد کو محمد تغلق نے اپنا دلی کے بجائے پایۂ تخت و مرکز قرار دیا۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں شہر اورنگ آباد سے آبادی کا سلسلہ شروع ہو کر دولت آباد سے تقریباً چھ میل دور واقع خلد آباد تک چلا گیا تھا۔ بعض تاریخی عمارات کے کھنڈر آج بھی جگہ جگہ اپنی خاموش داستان گوئی کے ذریعہ کھوج، تلاش و جستجو کے جذبات تاریخ کے طالب علموں میں پیدا کئے بغیر نہیں رہتے۔ محمد تغلق کا خیال تھا کہ جنوب کے اس دیوگری یا دولت آباد کے قلعہ کو اس زمانے کے حالات و واقعات کے پیش نظر پوری طرح استعمال کیا جائے جو نہ صرف سیاسی برتری کے لئے بلکہ جنگی نقطۂ نظر سے بھی ایک اہم بات تھی۔ کیوں کہ جنوب کے اس عظیم الشان و ناقابل تسخیر قلعہ پر قبضہ جمائے رکھنا اس دور کے دیگر ذی اقتدار افراد کو مرعوب کرنے کے لئے ضروری تھا۔ محمد تغلق کے اس تاریخی کارنامے کے بعد دوسرا اہم ورق اورنگ آباد کی تاریخ میں اس وقت اُلٹا جبکہ اورنگ زیب نے اپنی زندگی کے آخری پچیس برس یہیں گزارے۔ وقت و زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ہی تہذیب و تمدن میں تغیر و انقلاب آجاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مغلیہ تہذیب و تمدن کی گہری چھاپ اس علاقہ پر پڑی۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے انتقال کے تقریباً سو برس بعد یہ علاقہ نظام شاہی دورِ حکومت کے زیر اقتدار آگیا۔ چناں چہ اورنگ آباد کو یادو خاندان، مغلیہ عہدِ حکومت اور آصف جاہی (نظام شاہی) دور کی تہذیب، تمدن و ثقافت کا سنگم قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

آج سے تقریباً پچیس سو سال پہلے کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہ علاقہ ایک متمول اور مالدار علاقہ تھا۔ اورنگ آباد نہ صرف تہذیب و ثقافت کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھے ہوئے تھا بلکہ یہ تمول معاشی، اقتصادی، زرعی و صنعت و حرفت کی زندگی میں بھی رچ بس گیا تھا۔ اس زمانے میں مذہب و سیاست، علم و فن، یکسانیت و مساوات، حکمت و انصاف، صنعت و حرفت اپنے عروج پر تھی کسی قسم کی کوئی تفریق نہ تھی۔ عام انسانی زندگی کے دھاروں کو ان کی نشو و نما کی قوتوں کے مطابق فروغ حاصل کرنے کی پوری پوری سہولت حاصل تھی۔ اگر اورنگ آباد اس زمانے میں صنعت کاروں و تاجروں کا مرکز تھا تو اہلِ علم و فن کا گہوارہ بھی تھا۔ اگر شجاعت و بہادری میں یکتا تھا تو شعر و ادب میں اس کی اہمیت کسی طرح کم نہ تھی جس کی بہترین مثال پیٹھن کے ایکناتھ مہاراج ہیں جن کے بحرِ علوم سے آج بھی سینکڑوں فیض یاب ہو رہے ہیں۔ الغرض اورنگ آباد کو اس زمانے میں ایک ایسے میلے کی حیثیت حاصل تھی جہاں تاجر تھے تو صناع بھی۔ صنعت و حرفت کے ماہرین تھے تو علم و ادب کے متوالے بھی۔ سیاس و دانش ور تھے تو مذہبی عالم و فاضل بھی۔ فن تھا تو فن کے قدر دان بھی تھے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اتنی مکمل مساوات و یکسانیت کی مثال شاید ہی کوئی دوسرا شہر پیش کر سکے۔ اسس زمانے میں اورنگ آباد

کے تجارتی مرکز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یونان کے تاجروں کا رابطہ اس تجارتی منڈی سے قائم تھا۔ یونان کے تاجروں کی اورنگ آباد میں آمد اس کی اولیت و اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اورنگ آباد کی رنگا رنگ ترقی پذیر تہذیب و تمدن سے ڈولوی سیاح اس قدر متاثر ہوا کہ وہ اپنے گہرے تعجب و حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا۔ آہستہ آہستہ تاریخ کی رفتار میں اضافہ ہوتا گیا اور متعدد واقعات و حادثات، زمانے کے سرد و گرم، حالات کے نشیب و فراز سے گزر کر اورنگ آباد نے وہ مقام حاصل کر لیا جسے آج کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ گزشتہ پندرہ سو برسوں کی جنوب کی تاریخ اورنگ آباد کے ذکر کے بغیر لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ حتیٰ کہ جنوب کی تاریخ کی تکمیل کا اورنگ آباد کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں اس قدر اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ نہ صرف جنوب بلکہ پورے ہندوستان کے علاوہ اورنگ آباد نے دنیا کی نظر میں بھی اپنا ایک مقام بنا لیا ہے۔

اورنگ آباد کی قدیم صنعت

جہاں اورنگ آباد کو بہت سی ناقابل فراموش باتیں ورثہ میں ملی ہیں، وہیں ہمرو، مشروع اور کمخواب کی صنعت کو بھی اورنگ آباد کا قدیم ورثہ ہی قرار دیا جانا چاہیئے۔ دستی صناعی، مہارت و ہوشیاری کا یہ انسانی فن جو اپنی اچھوتی اور منفرد نزاکتوں کی بلندیوں کو چھوتا ہے اپنے حسن و خوب صورتی میں بے پناہ جاذبیت رکھتا ہے۔ فن اور انسانی محنت کا یہ نتیجہ انسان کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فن محمد تغلق کے زمانہ میں ہندوستان آیا۔ ہمرو، مشروع اور کمخواب کی تیاری میں بے پناہ محنت، نزاکت، ندرت و جدت کے علاوہ اس کی تمام تر باریکیوں کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اسی لئے اس دستکاری کو سب سے زیادہ مشکل کہا جاتا ہے جس پر قابو پانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس مشکل کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی جو دن بھر میں آسانی کے ساتھ آٹھ یا نو گز کپڑا بن سکتا ہے وہ ہمرو کا صرف آدھ گز کپڑا بھی نہیں بن سکتا۔ جب ہمرو کی صنعت اپنے شباب پر تھی اس زمانے میں تقریباً ڈیڑھ سو خاندان ہمرو بافی میں مشغول تھے۔ زمانے کی تبدیلیوں اور عروج و زوال کی کہانیوں نیز سماج کی بدلتی ہوئی قدروں نے اس صنعت کو بھی بُری طرح متاثر کر دیا ہے۔ آج شہر اورنگ آباد میں صرف سات ادارے ایسے ہیں جو ہمرو، مشروع اور کمخواب کی اس قدیم صنعت کی لاج رکھے ہوئے ہیں۔ ان ادارہ جات میں سے دو ادارے امداد باہمی کے اصولوں پر قائم ہیں۔ جن میں اکیانوے صنعت کار شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اورنگ آباد کی پٹھنی صنعت (ساڑیاں) بھی بے حد مقبول و مشہور تھی۔ آج کے اس دور میں پٹھنی صنعت و دستکاری جاننے والے کم و بیش مفقود ہو گئے ہیں۔ ان فن کاروں نے اپنی روزی کے لئے دیگر ذرائع اختیار کر لئے ہیں۔ مرکزی حکومت کے علاوہ حکومت مہاراشٹرا بھی اس صنعت کو وسعت و فروغ دینے کی امکانی کوشش کر رہی ہے۔ چناں چہ اورنگ آباد میں امداد باہمی انجمنوں کے قیام کے علاوہ بھاری رقم اس فن کے سکھانے پر حکومت خرچ کر رہی ہے۔ بیرونی سیاحوں کے لئے ہمرو، مشروع اور کمخواب کی شالیں بے پناہ جاذبیت و دلچسپی کا باعث ہیں اور ہندوستان بھر کے اہم شہروں میں اس فن کی بڑی قدر ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اورنگ آباد کے مذکورہ ادارہ جات ہندوستان بھر کے مختلف تجارتی مراکز کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ آنجہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے جب اورنگ آباد کا دورہ کیا تھا تو بطور خاص انھوں نے اس صنعت کے کارخانوں کا معائنہ کیا تھا اور فن کاروں کے کمال کی داد دی تھی۔ زمانے کے انقلاب و تغیر کے ساتھ آج کے اس دور میں اورنگ آباد میں بھی مشینوں کی گڑگڑاہٹ سبک رو دست و بازو کی فنی پختگی پر غالب آ گئی ہے جس کے نتیجے میں اورنگ آباد نہ صرف بڑے بڑے کارخانوں اور صنعتوں کا مرکز بنتا جا رہا ہے بلکہ یہاں کے ایک کارخانے میں بھاری فوجی ضروریات کا سامان بھی بننے لگا ہے۔ کاغذی پورہ کی کاغذ کی صنعت بھی بے حد مقبول رہی ہے مرہٹواڑہ وقف بورڈ

کھادی کمیشن کے تعاون سے اس قدیم صنعت کے احیاء کے لئے کوشاں ہے۔

اجنتا و ایلورا

اورنگ آباد کی عالمگیر و شہرۂ آفاق غار ہائے اجنتا و ایلورا کے متعلق اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اگر اسے یک جا کر دیا جائے تو پڑھنے ہی میں ایک طویل مدت گزر جائے۔ ان غاروں پر تحقیقاتی کام بھی مکمل ہو چکا ہے اور پہلی بار پروفیسر آر۔ ایس گپتے نے ان غاروں پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی ہے۔ اجنتا کے غاروں کو اولاً دنیا سے متعارف کروانے کا سہرا ڈاکٹر غلام یزدانی کے سر ہے۔ اجنتا کے غار حسن و فن کا ایسا حسین مرقع ہیں کہ جنہیں دیکھنے والا پتھروں میں زندگی محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اجنتا کے غار گہرائی میں ہیں اور جب تک بالکل ہی قریب نہ جائیں اس وقت تک غاروں کی شروعات کا پتہ نہیں چلتا۔ اجنتا کے غاروں کی جملہ تعداد (۲۹) ہے جن میں فنِ حسن و خوب صورتی، سنگ تراشی اور رنگوں کے لحاظ سے ایک، چار، سترہ، انیس اور چھبیس نمبر کے زیادہ مقبول ہیں۔ اجنتا کے غار سب کے سب بودھ فکر و نظر کے غماز ہیں۔ اجنتا کے غاروں میں مہاتما بدھ کی ایک مکمل مورتی ایسی ہے جو تین مختلف مقامات سے دیکھنے پر ان کی تین مختلف کیفیات غور و فکر، معصوم مسکراہٹ اور اداسی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اجنتا کے غاروں نے نہ صرف عالمگیر شہرت حاصل کر لی ہے بلکہ اورنگ آباد کو بھی دنیا کے اہم ترین تفریحی مراکز میں شامل کر دیا ہے۔ اجنتا کی سنگ تراشی، فنی رچاؤ، انسانی کمال، رنگوں کے مناسب استعمال اور اس کی جدت و ندرت کے متعلق کچھ لکھنا بے سود معلوم ہوتا ہے کیونکہ قلم میں ہرگز وہ طاقت پیدا نہیں ہو سکتی جو اجنتا کی جیتی جاگتی تصویروں کو نظروں کے سامنے رقصاں ہونے پر مجبور کر دے البتہ اشتیاقِ دید میں اضافہ ضرور ہو سکتا ہے:

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی
تصدق جن کے ہر خط پہ تحیر خانۂ مانی

مشکل ہے شباب و حسن میں تخیلِ انسانی
تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی

حسینانِ اجنتا کا جنوں سرتاج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

(سکندر علی وجد)

اجنتا کے جمالیاتی حسن، تہذیبی و ثقافتی آثار اور اس کی تاریخی اہمیت و افادیت کے علاوہ اجنتا کے غاروں کی تکمیل دراصل انسان کے مضبوط و مستحکم ارادوں کی تکمیل ہے اور یہ غار انسان کی قوتِ تسخیر کا شاہکار ہیں۔ اجنتا میں رنگوں کا استعمال جہاں اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے وہیں ایلورا کے سادہ غار اپنے اندر فن کی سادگی و پُرکاری رکھتے ہیں۔ ایلورا کے غاروں کی جملہ تعداد (۳۴) ہے جن میں (۱۲) بودھ، (۵) جین اور (۱۷) برہمنی فکر و نظر کے حامل ہیں۔ ان غاروں میں (۱۶) نمبر 'کیلاش' کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ کیلاش میں ویدک دھرم، عورت کے بناؤ سنگار کے علاوہ شیو پاربتی کی اٹھکھیلیاں سیاحوں کا من جیت لیتی ہیں۔ سلی نے 'ونڈرس آف ایلورا' میں لکھا ہے کہ کیلاش کا شمار دنیا کے عجائب میں کیا جانا چاہیئے۔

تصورات کے پیکر تراش ڈالے ہیں
دیئے وہ دل جو ہمیشہ دھڑکنے والے ہیں (وجد)

بی بی کا مقبرہ و پن چکی

(۳۰۹۳۶) مربع میل رقبہ اور دس لاکھ آبادی والے اس ضلع میں جہاں دنیا کے نوادرات، عجائب، دلکش و دیدہ زیب اشیاء موجود ہیں وہیں بی بی کا مقبرہ جیسی حسین و نازک احساسات و خیالات میں فرحت پیدا کرنے والی خوب صورت تاریخی عمارت بھی موجود ہے جسے اورنگ زیب کے بڑے بیٹے اعظم شاہ نے اپنی ماں دلرس بانو المعروف بہ رابعہ دورانی کی یاد میں تعمیر کیا ہے جسے جنوب کا تاج بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عمارت تاج محل آگرہ کا Replica ہے اور طرزِ تعمیر میں مغلیہ فن کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ پن چکی آب رسانی کے بہترین ذرائع کے استعمال کا مظہر

کے تجارتی مرکز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یونان کے تاجروں کا ربط اس تجارتی منڈی سے قائم تھا۔ یونان کے تاجروں کی اورنگ آباد میں آمد اس کی اولیت و اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اورنگ آباد کی رنگا رنگ ترقی پذیر تہذیب و تمدن سے ٹولمی سیاح اس قدر متاثر ہوا کہ وہ اپنے گہرے تعجب و حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا۔ آہستہ آہستہ تاریخ کی رفتار میں اضافہ ہوتا گیا اور متعدد واقعات و حادثات، زمانے کے سرد و گرم، حالات کے نشیب و فراز سے گزر کر اورنگ آباد نے وہ مقام حاصل کر لیا جسے آج کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ گزشتہ پندرہ سو برسوں کی جنوب کی تاریخ اورنگ آباد کے ذکر کے بغیر لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ حتیٰ کہ جنوب کی تاریخ کی تکمیل کا اورنگ آباد کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں اس قدر اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ نہ صرف جنوب بلکہ پورے ہندوستان کے علاوہ اورنگ آباد نے دنیا کی نظر میں بھی اپنا ایک مقام بنا لیا ہے۔

اورنگ آباد کی قدیم صنعت

جہاں اورنگ آباد کو بہت سی ناقابل فراموش باتیں ورثہ میں ملی ہیں، وہیں ہمرو، مشروع اور کمخواب کی صنعت کو بھی اورنگ آباد کا قدیم ورثہ ہی قرار دیا جانا چاہیئے۔ دستی صناعی، مہارت و ہوشیاری کا یہ انسانی فن جو اپنی اچھوتی اور منفرد نزاکتوں کی بلندیوں کو چھوتا ہے اپنے حسن و خوب صورتی میں بے پناہ جاذبیت رکھتا ہے۔ فن اور انسانی محنت کا یہ نتیجہ انسان کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فن محمد تغلق کے زمانہ میں ہندوستان آیا۔ ہمرو، مشروع اور کمخواب کی تیاری میں بے پناہ محنت، نزاکت، ندرت و جدت کے علاوہ اس کی تمام تر باریکیوں کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اسی لئے اس دستکاری کو سب سے زیادہ مشکل [illegible] ہے جس پر [illegible] ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس [illegible] لگایا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی [illegible] [illegible] کپڑا بُن سکتا ہے وہ ہمرو کا صرف آدھا گز کپڑا بھی نہیں بُن سکتا۔ جب ہمرو کی صنعت اپنے شباب پر تھی اس زمانے میں تقریباً ڈیڑھ سو خاندان ہمرو بافی میں مشغول تھے۔ زمانے کی تبدیلیوں اور عروج و زوال کی کہانیوں نیز سماج کی بدلتی ہوئی قدروں نے اس صنعت کو بھی بُری طرح متاثر کر دیا ہے۔ آج شہر اورنگ آباد میں صرف سات ادارے ایسے ہیں جو ہمرو، مشروع اور کمخواب کی اس قدیم صنعت کی لاج رکھے ہوئے ہیں۔ ان ادارہ جات میں سے دو ادارے امداد باہمی کے اصولوں پر قائم ہیں۔ جن میں اکیانوے صنعت کار شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اورنگ آباد کی پیٹھنی صنعت (ساڑیاں) بھی بے حد مقبول و مشہور تھی۔ آج کے اس دور میں پیٹھنی صنعت و دستکاری جاننے والے کم و بیش مفقود ہو گئے ہیں۔ ان فن کاروں نے اپنی روزی کے لئے دیگر ذرائع اختیار کر لئے ہیں۔ مرکزی حکومت کے علاوہ حکومت مہاراشٹرا بھی اس صنعت کو وسعت و فروغ دینے کی امکانی کوشش کر رہی ہے۔ چناں چہ اورنگ آباد میں امداد باہمی انجمنوں کے قیام کے علاوہ بھاری رقم اس فن کے سکھانے پر حکومت خرچ کر رہی ہے۔ بیرونی سیاحوں کے لئے ہمرو، مشروع اور کمخواب کی شالیں بے پناہ جاذبیت و دلچسپی کا باعث ہیں اور ہندوستان بھر کے اہم شہروں میں اس فن کی بڑی قدر ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اورنگ آباد کے مذکورہ ادارہ جات ہندوستان بھر کے مختلف تجارتی مراکز کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ آنجہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے جب اورنگ آباد کا دورہ کیا تھا تو بطور خاص انھوں نے اس صنعت کے کارخانوں کا معائنہ کیا تھا اور فن کاروں کے کمال کی داد دی تھی۔ زمانے کے انقلاب و تغیر کے ساتھ آج کے اس دور میں اورنگ آباد میں بھی مشینوں کی گڑگڑاہٹ سبک رو دست و بازو کی فنی پختگی پر غالب آ گئی ہے جس کے نتیجے میں اورنگ آباد نہ صرف بڑے بڑے کارخانوں اور صنعتوں کا مرکز بنتا جا رہا ہے [illegible] کارخانے [illegible] بھاری [illegible] ضروریات کا سامان [illegible] [illegible]

کھادی کمیشن کے تعاون سے اس قدیم صنعت کے احیاء کے لئے کوشاں ہے۔

اجنتا و ایلورا

اورنگ آباد کی عالم گیر و شہرۂ آفاق غارہائے اجنتا و ایلورا کے متعلق اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اگر اسے یکجا کر دیا جائے تو پڑھنے ہی میں ایک طویل مدت گزر جائے۔ ان غاروں پر تحقیقاتی کام بھی مکمل ہو چکا ہے اور پہلی بار پروفیسر آر۔ ایس گپتے نے ان غاروں پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلی ہے۔ اجنتا کے غاروں کو اولاً دنیا سے متعارف کروانے کا سہرا ڈاکٹر غلام یزدانی کے سر ہے۔ اجنتا کے غار حسن و فن کا ایسا حسین مرقع ہیں کہ جنہیں دیکھنے والا پتھروں میں زندگی محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اجنتا کے غار گھڑ نعلی ہیں اور جب تک بالکل ہی قریب نہ جائیں اس وقت تک غاروں کی شروعات کا پتہ نہیں چلتا۔ اجنتا کے غاروں کی جملہ تعداد (۲۹) ہے جن میں فن، حسن و خوب صورتی، سنگ تراشی اور رنگوں کے لحاظ سے ایک، چار، سترہ، انیس اور چھبیس نمبر کے زیادہ مقبول ہیں۔ اجنتا کے غار سب کے سب بودھ فکر و نظر کے غماز ہیں۔ اجنتا کے غاروں میں مہاتما بدھ کی ایک مکمل مورتی ایسی ہے جو تین مختلف مقامات سے دیکھنے پر ان کی تین مختلف کیفیات غور و فکر، معصوم مسکراہٹ اور اداسی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اجنتا کے غاروں نے نہ صرف عالمگیر شہرت حاصل کرلی ہے بلکہ اورنگ آباد کو بھی دنیا کے اہم ترین تفریحی مراکز میں شامل کر دیا ہے۔ اجنتا کی سنگ تراشی، فنی رچاؤ، انسانی کمال، رنگوں کے مناسب استعمال اور اس کی جدت و ندرت کے متعلق کچھ لکھنا بے سود معلوم ہوتا ہے کیونکہ قلم میں ہرگز وہ طاقت پیدا نہیں ہوسکتی جو اجنتا کی جیتی جاگتی تصویروں کو نظروں کے سامنے رقصاں ہونے پر مجبور کردے البتہ اشتیاقِ دید میں اضافہ ضرور ہوسکتا ہے:

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی
تصدق جن کے ہر خط پہ تحیر خانہ و مانی

مشکل ہے شباب و حسن میں تخیل انسانی
تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی
حسینانِ اجنتا کا جنوں سرتاج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

(سکندر علی وجد)

اجنتا کے جمالیاتی حسن، تہذیبی و ثقافتی آثار اور ان کی تاریخی اہمیت و افادیت کے علاوہ اجنتا کے غاروں کی تکمیل دراصل انسان کے مضبوط و مستحکم ارادوں کی تکمیل ہے اور یہ غار انسان کی قوتِ تسخیر کا شاہکار ہیں۔ اجنتا میں رنگوں کا استعمال جہاں اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے وہیں ایلورا کے سادہ غار اپنے اندر فن کی سادگی و پرکاری رکھتے ہیں۔ ایلورا کے غاروں کی جملہ تعداد (۳۴) ہے جن میں (۱۲) بودھ، (۵) جین اور (۱۷) برہمنی فکر و نظر کے حامل ہیں۔ ان غاروں میں (۱۶) نمبر 'کیلاش' کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ کیلاش میں ویدک دھرم، عورت کے بناؤ سنگار کے علاوہ شیو پاربتی کی اٹھکھیلیاں سیاحوں کا من جیت لیتی ہیں۔ سلی نے 'ونڈرس آف ایلورا' میں لکھا ہے کہ کیلاش کا شمار دنیا کے عجائب میں کیا جانا چاہیئے۔

تصورات کے پیکر تراش ڈالے ہیں
دیئے وہ دل جو ہمیشہ دھڑکنے والے ہیں (وجد)

بی بی کا مقبرہ و پن چکی

(۶۳۹۸٫۳) مربع میل رقبہ اور دس لاکھ آبادی والے اس ضلع میں جہاں دنیا کے نوادرات، عجائب، دل کش و دیدہ زیب اشیاء موجود ہیں وہیں بی بی کا مقبرہ جیسی حسین و نازک احساسات و خیالات میں فرحت پیدا کرنے والی خوب صورت تاریخی عمارت بھی موجود ہے جسے اورنگ زیب کے بڑے بیٹے اعظم شاہ نے اپنی ماں ولرس بانو المعروف بہ رابعہ دورانی کی یاد میں تعمیر کیا ہے جسے جنوب کا تاج بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عمارت تاج محل آگرہ کا Replica اور طرزِ تعمیر میں مغلیہ فن کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ پن چکی آب رسانی کے بہترین ذرائع کے استعمال کا مظہر

ہے۔ عنبری نہروں سے اورنگ آباد شہر نہ صرف پوری طرح مستفید ہوتا رہا ہے بلکہ آج بھی شہر کا ایک بڑا حصہ انہیں عنبری نہروں کا پانی استعمال کرتا ہے۔ اورنگ آباد میونسپلٹی نے طے کیا ہے کہ ملک عنبر کی یاد میں دلّی دروازے کے قریب ایک لاٹ تعمیر کی جائے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ ملک عنبر کی قبر پنچکی سے تقریباً دو سو گز کے فاصلہ پر واقع ہے۔ آج کل اس قبر کو سرکاری میڈیکل کالج کے احاطے میں شامل کر دیا گیا ہے جس کی نگرانی مرکزی محکمۂ آثارِ قدیمہ کے تفویض ہے۔ پنچکی حضرت بابا شاہ مسافر رح کی آخری آرام گاہ ہے اور نہایت دل فریب منظر پیش کرتی ہے۔ ان تاریخی مقامات کے علاوہ اورنگ آباد کے غار، بیبی کا مقبرہ، دولت آباد کا قلعہ، چاند مینار، خلد آباد کے بزرگوں کے مزارات و گنبدیں ہیں، ایلورا اور اجنتا کے غار، ایکناتھ مہاراج کا مندر بھی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر رح، آصف جاہ اول رح، حضرت خواجہ منتخب الدین رح وغیرہ کے مزارات و روضہ جات یہاں سے تقریباً پندرہ میل دور خلد آباد میں واقع ہیں۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ اورنگ آباد میں نئی نئی عمارتوں کا بے حد اضافہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے گزشتہ دس سال کے اور آج کے اورنگ آباد میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ سرکاری میڈیکل کالج کی پانچ منزلہ عمارت، پالی ٹکنک کی خوب صورت عمارت اور مرہٹواڑہ یونیورسٹی کے زیرِ تعمیر عمارات جو بی بی کے مقبرہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر سنہری محل کے تاریخی کھنڈرات کے پاس ہیں، قابلِ ذکر ہیں۔ مرہٹواڑہ یونیورسٹی کا افتتاح آنجہانی وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ۲۳۔ اگست ۱۹۵۸ء کو کر کے اس علاقہ میں علم کی روشنی کو استقلال عطا کیا۔ مرہٹواڑہ یونیورسٹی کی عمارات (۷۲۵) ایکڑ کے رقبہ پر تقریباً دو کروڑ روپیہ کے صرفے سے تعمیر کی جا رہی ہیں۔ اب تک ان پر چالیس لاکھ چھتیس ہزار دو سو چھیاسی روپے خرچ کیے جا چکے ہیں۔

علم و ادب کا گہوارہ

جس طرح اورنگ آباد زمانۂ قدیم میں فنون و علوم کا مرکز تھا اسی روایت کو اورنگ آباد کے اہلِ قلم حضرات نے آج بھی زندہ رکھا ہے اور نہ صرف ولی و سراج، صفی اورنگ آبادی، لچھمی نارائن شفیق وغیرہ کی اردو شعر و ادب میں بیش بہا و گراں قدر اضافے کی روایات کو آگے بڑھایا ہے بلکہ اورنگ آباد کی علمی و ادبی حیثیت کو مستحکم کر دیا ہے۔ اسی طرح ایکناتھ مہاراج کی منوّر کی ہوئی علم و ادب کی شمع آج بھی ہزاروں پروانوں کو امن و شانتی کی راہ دکھلاتی ہے۔ یہ بہت ہی دلچسپ اتفاق ہے کہ جس طرح مرہٹی زبان کی جنم بھومی اورنگ آباد ہے اسی طرح اردو کی جائے پیدائش بھی اورنگ آباد ہی کہی جاتی ہے۔ ایکناتھ مہاراج نے مرہٹی زبان کی داغ بیل ڈالی تو ولی نے اردو شاعری کو پہلی بار دلّی تک پہنچایا۔ مرحوم ڈاکٹر زور نے اپنے دورۂ اورنگ آباد کے وقت درگاہ حضرت شاہ گھڑاتی صاحب رح (اورنگ آباد) ہی کے احاطہ میں ولی کے مزار کی نشان دہی کی ہے۔ اسی طرح شاہ سراج کا مزار اورنگ آباد کے قبرستان قلعہ ارک میں ہے جو واحد گنبد کی شکل میں موجود ہے۔ حکومت آندھرا پردیش نے دکن کے فن کاروں کا ایک تعارف شائع کیا ہے جس میں اورنگ آباد کے سبھی اہلِ قلم موجود ہیں۔ بالکل ہی نئے اور جدید فن کاروں، اردو کے خدمت گزاروں میں دکھنی جالنوی، سید صدیقی (ایم۔ اے) ڈاکٹر سریندر کمار مہرا، محمود عشقی، الیاس فرحت، رفعت نواز، محمود مجاز، محمود شکیل، سنیل کمار مہرا، رشید الدین، عروج احمد عروج، رشید انور، غوث ساجد اور جاوید احمد وغیرہ شامل ہیں۔ مختصر یہ کہ اورنگ آباد وہ شہر ہے جس میں فن اپنی تمام تر رنگینیوں اور بلندیوں کے ساتھ موجود ہے۔

مادرِ وطن کی حفاظت کے لیے متحد ہو جاؤ

گھنشیام سیٹھی

لیونارڈو ڈا ونسی کا شہر — میلان

میلان کے ریلوے اسٹیشن پر ٹرین سے اترتے ہی مجھے مطلع کر دیا گیا کہ شہر کے مغربی حصے میں واقع "پینسیان بے تانی" میں قیام کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ میلان اٹلی کا جمشید پور ہے اور دوسرے صنعتی شہروں کی طرح ہی یہاں کے لوگوں کے مقدر میں فرصت اور فراغت کا دخل کم ہی ہے۔ اٹلی میں تو ہر غیر جذباتی اور ضرورت سے زیادہ معروف آدمی کو "میلانز" کہا جاتا ہے۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو بے تانی کا پتہ بتلایا۔ اس نے سامان رکھ کر اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پوچھا "ہندوستانی؟"

"ہاں۔" میں نے باہر پھیلے ہوئے دبیز کہرے میں جھانکنے کی بے کار کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"خوش آمدید" اس نے خوش ہو کر کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

بوندا باندی شروع ہو گئی تھی اور نیون لائٹیں بھیگ بھیگ کر ایسے چمک رہی تھیں جیسے اندھیرے میں جگنو چمکتے ہیں۔ ایلپس کے نیلے اور کھلے آسمان کی چھاؤں تلے کٹے ریل کے خوش گوار سفر کے بعد مجھے میلان ایک دم پھیکا اور بے رنگ سا لگا۔ دھند کے پردے میں لپٹی اداس اور اندھیری دوپہر نے "پٹس برگ" میں گزارے ان دنوں کی یاد تازہ کر دی جب شہر کے "سموک کنٹرول" کا نظام بگڑ گیا تھا اور سڑکوں پر لگے برقی قمقمے دن بھر جلا کرتے تھے۔ دل میں آیا کہ ابھی جا کر فلورنس کا ٹکٹ لے لوں۔ لندن اور میونک میں بھی کہرے اور بارش نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اب میلان میں بھی وہی سماں دیکھا تو دل بجھ سا گیا۔ مجھے لگا کہ میں اس اجنبی دنیا کی وسعت میں بالکل اکیلا ہوں۔ سڑکوں کو کاٹتی اور گلیوں کو تیزی سے طے کرتی ہوئی ٹیکسی اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

عہد گزشتہ کے مورش کنگوروں کو سر پر اٹھائے بے تانی اداس سا کھڑا تھا۔ کونے والا ٹاور سالسبرگ کے کھیتوں میں کھڑے دھان کے کھلیانوں کی یاد دلا رہا تھا۔ بالکل ویسا ہی ڈھانچہ تھا۔

گھنٹی بجانے کے تھوڑی دیر بعد ایک عورت نے دروازے کا ایک پٹ کھولا۔ میں نے اپنا نام بتلایا۔ اندر کسی کی پکار ہوئی اور دروازہ پورا کھل گیا۔ ایک دبلی پتلی، نازک سی خوب صورت لڑکی ہماری طرف آئی۔ اس کی کٹوری نما آنکھوں میں کالی کالی پتلیاں بڑی بے چینی سے ادھر ادھر متحرک رہی تھیں۔ پیشانی پر ترشے ہوئے سیاہ بال کندھوں سے نیچے تک بڑی بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے میری طرف نہیں دیکھا صرف جھک کر میرا سامان اٹھا لیا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا، وہ چپٹے، بھدے اور اس کے جسم کے مقابلے میں قطعی غیر متناسب تھے۔

جون ۱۹۶۵ء

بے تائی کا یہ لاؤنج بھی ایک قدیم عجائب گھر سے کم نہیں تھا۔ دیواروں اور لکڑی کے ستونوں پر جا بجا نقاشی اور کھدائی کی گئی تھی۔ چھتوں سے پرانے فانوس اور قیمتی بلوریں جھالریں لٹک رہی تھیں۔ ایک شاندار پیانو پر سفری ریڈیو پڑا تھا۔ سامنے کی دیوار پر "الحمرا" کی قدِ آدم تصویر بنی ہوئی تھی۔ شیشے کی ایک بکس نما الماری میں کوئی قدیم نسخہ رکھا تھا۔ ٹائلوں پر آہستہ ایڑی کی ٹھک ٹھک سن کر میں چونک پڑا۔ یہ بے تائی کی مالکن تھی جس کے پیچھے پیچھے ایک شانِ بے نیازی سے اس کا السیشین کتا چلا آ رہا تھا۔

"ریپریزنٹیشنز آف یونیسکو فار اے رائٹر؟"

"ہاں" میں نے کہا۔

"رائٹر آف واٹ؟"

اور اس سے قبل کہ میں کوئی جواب دے سکتا اس نے بکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"وین یو ول بی انٹرسٹیڈ ان مائی دانتے"

میں نے کہا یہ دولت تو خوش نصیبی ہے۔

اس نے یہ بھی بتلایا کہ یونیسکو مشن پر آیا ہوا مصور جم پرپیٹ میرے ساتھ والے کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ پہلی بار مجھے یہ محسوس ہوا کہ اجنبیت کے اس سمندر میں میرا کوئی دوست بھی ہے۔ جم سے میں پیرس میں مل چکا تھا۔

اس دُبلی پتلی اور حسین لڑکی کے ذمے مجھے میرے کمرے تک پہنچا دینے کا کام سپرد کر کے سینورا بے تائی لاؤنج سے چلی گئی۔ نہ جانے کیا سوچتا ہوا میں اس کے پیچھے پیچھے چکردار سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ٹاور کی اوپر والی منزل پر اُمس اور گھٹن سے بھرا ایک تاریک کمرہ تھا۔ جدھر سے روشنی آتی تھی وہاں مخمل کا ایک بھاری مگر بوسیدہ پردہ لٹک رہا تھا۔ اس تاریکی میں بھی ستونوں پہ بنے سنگِ مرمر کے مجسمے چمک رہے تھے۔ میں نے پردہ ہٹایا یہ بالکنی کی طرف کھلنے والا دروازہ تھا۔

کمرے میں ایک بیسن لگا ہوا تھا جس کے نل میں صرف ٹھنڈا پانی چل رہا تھا۔ بیزار ہو کر میں نے اپنے آپ کو پلنگ پر گرا دیا۔ گدوں اور کمبل پر چڑھے غلافوں میں سے بھی امس اُٹھ رہی تھی۔ پلنگ پر پڑے پڑے مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں ایک قیدی ہوں۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ جم پرپیٹ نے اندر آ کر کہا "بڑھیا نے مجھے بتلا دیا تھا کہ تم آنے والے ہو۔ مگر تم نے خبر ہی نہیں دی۔"

پرپیٹ اطالوی خوب بول لیتا تھا۔ اس نے مجھے بتلایا۔ 'کھانے اور رہنے کی تکلیف گوارا کر سکو تو یہ ملک بے مثال ہے اور اتنا یاد رکھنا کہ ساتھ والا کمرہ میرا ہے۔'

جم پرپیٹ نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ نچلی منزل میں کوئی فرنچ ریکارڈ بج رہا تھا۔ "یہ پیرس ہے۔ ہم اسے 'فرنچی' کہتے ہیں۔" پھر ایک لمحہ وہ خاموش رہا اور بولا — "ایک غیر معمولی فرانسیسی۔"

میں نے کہا کہ کئی لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ وہ کوئی بھی کام خاموشی سے دیکھنا یا کرنا نہیں چاہتے۔"

اس نے کہا۔ "نکڑ والے کمرے میں ایک سوئس ہے۔ ٹیرون — اطالوی زبان سیکھ رہا ہے — لیکن سب سے پہلے تمہیں سوئس بیرونیس کے بارے میں جاننا چاہیئے۔" زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے یہ سنا کہ سوئٹزرلینڈ میں بھی یہ طبقہ موجود ہے۔

وہ اپنے آپ کو بیرونس کہتی ہے۔ انگریزی بھی جانتی ہے۔ یوں اس کا کمرہ دوسری منزل پر ہے۔ لیکن اکثر وہ غسل خانے میں ہی رہتی ہے۔ شاید اب بھی وہیں ہے۔ اپنا دروازہ کھلا رکھو اور نظریں دروازے کے باہر....."

یہ کہہ کر پرپیٹ نے لات مار کر دروازے کے دونوں پٹ باہر کی طرف دھکیل دئے۔ غسل خانے کا دروازہ بالکل ہمارے سامنے تھا۔

"پہلی جھلک میں ہی دیدار ہو جائیں گے پیارے۔

اور اسی خشکی میں بھی خون کو اُبال آجائے گا۔"

قبل اس کے کہ میں کچھ کہہ پاتا غسل خانے کا دروازہ کھلا اور اس میں سے بھاپ کے ایک تودے میں لپٹی، لچکیلی سی ایک دراز قد عورت برآمد ہوئی۔ اتنی سردی میں بھی اس نے ریشم کا ایک گاؤن پہنا ہوا تھا۔

"ہیلو۔" اس نے کہا۔ اس کی مردانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہیلو۔" پرت پچیٹ نے ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔

"میں تمہارے دوست سے اس وقت نہیں مل سکتی۔ میری حالت غیر مہذب سی ہے۔"

آواز بڑی تھکی تھکی سی تھی۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی اور اپنے پیچھے لیونڈر کی خوشبو کے بادل چھوڑ گئی۔

جم نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ دیکھا۔ میں نے کہا تھا نا۔

کھانے کا کمرہ تہ خانے میں تھا اور بے تائی کے باقی کمروں کی طرح ہی امس اور تاریکی میں بسا ہوا تھا۔ کئی چھوٹے چھوٹے میز ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ وہی نازک سی، بھدے ہاتھوں والی مولی سب کو پروس رہی تھی۔ میری نشست بھی جم پرت پچیٹ کے میز پہ لگی ہوئی تھی۔ کمرے کے درمیان میں سینورا بے تائی کتے کو گود میں لئے ہوئے بیٹھی تھیں۔ زیادہ تر میزوں پہ ایک ایک کرسی لگی تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے چلا چلا کر باتیں کر رہے تھے۔ کمرے میں اطالوی، فرانسیسی، جرمن اور انگریزی جاننے والے سبھی طرح کے لوگ موجود تھے۔ یہ ان کی گفتگو سے عیاں ہو گیا۔

"جالی ہیل —— یہ کہرا اور دھند۔" چڑیا کے ڈیل ڈول والا ایک انگریز کہہ رہا تھا۔ "لندن کی دھند تو کوئی چیز ہی نہیں۔ کل رات کو جو بھٹکا تو دو گھنٹے در بدر ٹھوکریں کھانے کے بعد اس عجائب گھر کا پتہ چلا۔ چائے کے ایک پیالے کے لئے گھنٹوں ہاتھ پیر مارے۔ یقین نہیں کرو گے تم کہ اس ملک میں چائے کے نام پر کون کون سی خرافات بکتی ہے اور ریلوے اسٹیشن پر ملنے والی چائے، جس پہ میلان فخر کرتا ہے، کاڑھے سے کم نہیں۔"

"یہ جیمز ہے —— میلان میں سکاٹ لینڈ کے 'ٹویڈ' درآمد کرتا ہے۔" جم نے کہا۔

بھدے بھدے ہاتھوں نے 'سوپ' کی پلیٹوں کو میز پر رکھا۔

"یہ امیلیا ہے۔" جم نے کہا۔ "بے تائی میں قیام کرنے والوں کی مولی۔ بالکل 'رم پڈنگ' کی طرح ترش۔ میرا خیال ہے خانساماں اس کا رشتہ دار ہے۔ اس ہوٹل میں کل چار ملازم ہیں۔ میریا، جو جھاڑ پونچھ کرتی ہے۔ خانساماں جو صرف سینورا بے تائی کی تعریفوں کے پل باندھتا رہتا ہے۔ باورچی جس کے ہاتھ سے بنا یہ واہیات کھانا کھا کر جی چاہتا ہے کہ اسے گولی مار دوں اور امیلیا، جس کے ہاتھوں یہ واہیات کھانا کھا کر بھی یوں لگتا ہے گویا سین کے کنارے میگزیم میں بیٹھے طعام کر رہے ہیں۔ سینورا بے تائی بڑی گرم مزاج ہیں اور چاروں ملازموں پہ سوار رہتی ہیں اور یہ ملازم امیلیا پہ۔ یہ بیچاری صبح سات بجے سے رات کے دس بجے تک کام کرتی ہے۔ شاید یہ لوگ اسے مارتے بھی ہیں۔ میں نے کئی بار اسے روتے ہوئے دیکھا ہے۔"

سوپ کی پلیٹیں ہٹالی گئیں۔ دوسری پلیٹ لگانے سے پہلے میں نے اسے غور سے دیکھا وہ بے مرغوب صورت تھی لیکن اس کی آنکھوں میں یاس کا ایک بے پناہ سمندر چھلک رہا تھا۔ انہیں ہاتھوں نے مچھلی کا ایک ٹکڑا پلیٹ میں رکھا اور میں نے ان سوجی ہوئی بھدی انگلیوں کو دیکھا۔ شاید اس نے میری چوری پکڑ لی اور تیزی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

کسی میز پر سے کوئی چلایا —— "ان کا خیال ہے کہ میں اسے بنا دودھ کے ہی پیئوں۔ اور یہ بھلا کیا بتلاتے ہیں دودھ نہیں ہے۔"

ٹویڈ کے تاجر نے بیچ میں ٹانگ اڑائی —— "ہاں صاحب اس کمرے میں دودھ دینے کے لئے گائے کون ڈھونڈے۔"

"لائک ہر —— ڈونٹ یو۔" جم نے مجھ سے سوال کیا۔

"خوب صورت ہے"۔ میں نے کہا۔

"اینڈ ڈیپ تو — ٹینڈر پیچ"، جم نے کہا

جم نے کھانے کے بعد ری وستا دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ ہیدس نے ری وستا کی کسی اطالوی اداکارہ سے دوستی گانٹھ لی تھی، اس لئے ہمیں ٹکٹ نہیں خریدنے پڑے۔ سنیما اور اوپرا کے بعد ری وستا ہی اٹلی کا ہر دل عزیز اسٹیج ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی اسٹیج کے مقابلے میں یہ معمولی اور سستے قسم کا شو ہوتا ہے۔

ہم چاروں دھند میں ایک ساتھ چلتے گئے۔ یکایک فرینچی نے جم سے پوچھا۔

"تم شادی شدہ ہو؟"

"نہیں۔" جم نے کہا۔

"تب تم طلاق شدہ ہو گے۔" فرینچی نے بڑی خود اعتمادی سے کہا۔

جم ہنسنے لگا۔ میں نے فرینچی سے پوچھا۔ اس نے یہ اندازہ کیسے لگالیا۔

"تم نہیں جانتے — امریکن تو ہمیشہ ہی شادی اور طلاق کے چکر میں رہتے ہیں۔ امریکن ازدواجی زندگی کے نام سے غیر واقف ہیں۔ ہم آٹھ بھائی بہن ہیں۔ اور میرے ماں باپ آج بھی اتنے ہی خوش ہیں جتنے آج سے تیس برس پہلے شادی کے دن تھے۔"

جم نے اُسے مبارک دی اور دعا کی کہ آئندہ بھی وہ ایسے ہی رہیں۔

"ایسا ہی ہوگا۔" فرینچی نے بڑی ڈھٹائی سے انگلیاں نچاکر کہا۔ "میری منگیتر مجھے روزانہ ایک خط لکھتی ہے۔ مجھے چاہتی ہے اور کبھی کسی دوسرے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتی۔ میں بھی کسی اور لڑکی کی طرف نہیں دیکھتا۔ لیکن تم امریکن — تم کیا جانو یہ سب کیا ہے۔'

جم نے فرینچی کو سمجھانے کی بے سود کوشش کی کہ ہر ہالی وڈ ہی امریکہ نہیں ہے۔

ہال میں مہنگے ٹکٹوں والی اگلی نشستوں پر اطالوی تاجروں کا تھکا ماندہ طبقہ بیٹھا تھا۔ دو سو لیرے کا ٹکٹ لے کر کھڑے رہ کر دیکھنے والے تماشائیوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ سارے ہال میں موٹا سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔

پردہ اٹھتے ہی ایک درجن لڑکیوں کا رقص شروع ہوا۔ رقص ویانا، میڈرڈ اور میونک کے مقابلے میں قطعی غیر معیاری تھا۔ بس عریانی کی ایک نمائش تھی۔

تماشائیوں نے سب سے زیادہ داد اس سکٹ کی دی، جس میں امریکنوں پر طنز کیا گیا تھا۔ ایک منظر میں ناٹو کی سرپرستی میں چلنے والے ایک چکلے کا منظر تھا۔ ایک دبلا پتلا امریکن سپاہی مہینوں سے اس چکلے میں جانے کے لئے تیاری کر رہا ہے۔ آخر منظوری کا پروانہ لے کر وہ منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے لیکن چکلے کے دروازے پر اسے دوسرا امریکن سپاہی روک لیتا ہے کیونکہ وہ سپاہی شادی شدہ ہے اور اس کے پاس اس کی بیوی کی یہ تحریری اجازت نہیں ہے کہ وہ چکلے میں جا سکتا ہے۔

ایک دو سکٹ اور بھی پیش کئے گئے۔ ان میں بھی امریکی تمدن پر چوٹ تھی۔ آخر میں پھر وہی ایک درجن لڑکیاں ایک سفید گھوڑے پر چڑھ کر اسٹیج پر آئیں۔ آدھی رات کے اس لمحے تک سارے تماشائی اور وہ لڑکیاں شناسائی کی ایک ڈور میں بندھ چکے تھے۔ سارا ہال ان کے ساتھ گایا اور چلایا۔

آدھی رات گزر چکی تھی جب ہم ٹرام پر چڑھے۔ ٹرام کھچا کھچ بھری تھی۔ دھکے پر دھکا لگ رہا تھا۔ باہر دھند گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑائی۔ تو دیکھا دھکم دھکے میں ہم ٹرام کے اگلے دروازے کے قریب جا پہنچے تھے۔ تبھی کنڈکٹر نے ٹکٹ مانگا۔ میں نے ٹکٹ دکھا دیئے۔ گلابی رنگ کی ٹکٹوں پر اس نے نیلی پنسل سے ایک نشان بنا دیا اور ٹکٹ مجھے واپس کر دیئے۔ ہمارے ساتھ کھڑے تین امریکن ابھی ری وستا کے تماشے

پر رائے زنی کر رہے تھے۔ کنڈکٹر نے ان سے بھی ٹکٹوں کے لئے پوچھا۔ گلابی ٹکٹ انھوں نے بھی کنڈکٹر کے ہاتھ میں تھما دئے۔

"رانگ کلر" ٹوٹی ہوئی انگریزی میں اس نے کہا۔ "گلابی ٹکٹ دن کے لئے اور نیلے ٹکٹ رات کے لئے ہیں۔"

"رنگ کی بات ہم نہیں جانتے۔ ابھی پچھلے دروازے پر ہمیں یہی ٹکٹ ملے ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"یہ ٹکٹ پرانے ہیں!" کنڈکٹر چلایا۔

اور سارے مسافر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ کسی نے انگریزی میں کہا۔ "دولت مند امریکی ٹرام میں بنا ٹکٹ کے سفر کرتے ہیں۔" "تم پچھلے دروازے پر کھڑے کنڈکٹر سے پوچھ سکتے ہو۔"

ان کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔

کنڈکٹر نے شانے جھٹکتے ہوئے کہا۔ "ٹکٹ لو یا ٹرام سے اتر جاؤ۔"

میں بُت بنا کھڑا تھا۔ میری جیب میں بھی گلابی ٹکٹ تھے۔ اسی کنڈکٹر نے ان ٹکٹوں کی جانچ بھی کی تھی۔ انھوں نے دوبارہ ٹکٹ لئے۔

دھند اتنی گہری تھی کہ سڑکوں کے نام تک اوجھل ہو گئے تھے۔ رات کے دو بجے تھے جب ہم بے تانی میں داخل ہوئے۔ اندر روشنی نہیں تھی۔ دیا سلائی جلا جلا کر سیڑھیاں طے کیں۔

دوسرے دن جم پریچیٹ مجھے لیونارد و لینسی کی تصاویر دکھلانے کے لئے کریلو سفارجیسکو کے جھکورسے دار کمروں میں لے گیا۔ پندرھویں صدی کا یہ قلعہ سفارجہ خاندان کی نشانی ہے جسے لیونارد و لینسی نے سجایا ہے۔ یہ قلعہ بجائے خود ایک عظیم عجائب خانہ ہے جس کی چھت کے نیچے انسانی فطانت کے معراج اور استعداد کے جملہ کمالات کا دنیا میں سب سے بڑا خزانہ ذوقِ نظر کے لئے چشم براہ ہے۔

میں نے پیرس کے لوور میں اور میونک کے عجائب گھر میں بھی یہ خزانے دیکھے ہیں۔ لیکن لیونارد و لینسی کے عریاں تصاویر

دیکھ کر میں ہونچکا رہ گیا۔ میرا ذہن مختل ہو گیا۔ وہ جسمانی حسن سے پُر نور تھے۔ درندوں کی وہ وحشی حرکات، انسان کی کمینگی اور گراوٹ کے وہ منظر اور معصوم بچوں کے چہروں پر چھائی وہ بے لوث اور بے داغ مسکراہٹیں، ان سب کو کینوس پر اُتارنا ایک معجزے سے کم نہیں لگا۔ پریچیٹ مجھے سمجھا رہا تھا۔ فن مصوری کی باریکیوں سے مجھے روشناس کرا رہا تھا۔

دوسرے دن ہم لیونارد و لینسی کی شہرۂ آفاق تخلیق 'لاسٹ سپر' دیکھنے کے لئے 'سانتا ماریا' گئے۔ پچھلے کئی دنوں سے میں اصرار کر رہا تھا کہ مجھے 'سانتا ماریا' لے چلو۔ لیکن جم کا کہنا تھا کہ لاسٹ سپر کو سمجھنے کے لئے لیونارد کی تخلیقات کو دیکھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ جم نے مجھے ۱۹۴۵ء کی اس بمباری کے بعد تباہ شدہ سانتا ماریا کے گرجے کی تصویر بھی دکھائی۔ اسے قدرت کا ایک کرشمہ ہی کہنا چاہیئے کہ بمباری کے بعد صرف وہی دیوار سلامت بچی جس پر یہ تصویر بنی ہے۔ باقی عمارت ملبے کا ایک ڈھیر بن گئی تھی۔ یوں تو لاسٹ سپر اتحادی حملے سے بہت پہلے ہی زمانے کے بے رحم ہاتھوں کا شکار ہو چکی تھی اور کو ایلیئر کیوا سے لے کر پیلیکول تک کئی فن کاروں نے یہ کوشش کی ہے کہ لیونارد کے رنگوں میں اس عظیم تصویر میں پھر سے رنگ بھرے جائیں۔ لیکن وہ رنگ مل بھی جائیں تو بھی وہ برش نہیں مل سکے گا۔ مدھم روشنی میں میں نے لیونارد کے اس شاہکار کو نظر بھر کر دیکھا۔ مسیح کے بارہ چیلے کھانے کی میز پر چار چار کے تین گروہوں میں بٹے ہوئے بیٹھے ہیں۔

کچھ ہی دیر پہلے مسیح نے کہا تھا۔ "تم میں سے ایک میرے ساتھ دغا کرے گا۔"

تصویر میں ہر شخص کا چہرہ اس کے دل کی داستان بنا ہوا ہے۔ ان سب کے درمیان میں مایوس اور غمگین۔ مسیح۔ بائبل کی اس کہانی کو لیونارد کے برش نے جلا دیا ہے۔ میں اسی عہد اور فضا میں ڈوبا ہوا گرجے سے نکلا۔

میلان کے قیام کی اس آخری رات کو سینورا بے تابی

کی اجازت لے کر میں امیلیا کو 'لا اسکالا' میں آسکا سینز کی سمفنی دکھانے کے لئے لے گیا۔

رجم بھی میرے ساتھ کچھ دنوں کے لئے فلورنس چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔

کمرے میں جمپی اس صبح کے وقت ہم بے تاتی کے لاؤنج میں ٹیکسی کا انتظار کر رہے تھے۔ سینورا نے میرے بل میں دو ہزار لیرے فالتو جوڑ دئے تھے۔ یہ امیلیا کو باہر لے جانے کی فیس تھی۔ وہ بے حد افسردہ سی لگ رہی تھی۔ فرینچی میرے پاس بیٹھا ہوا تھا اور اس کا گراموفون گونگا ہو گیا تھا۔

امیلیا نے ٹیکسی تک میرے بیگ اُٹھائے۔ میں نے سہارا دینا چاہا تو وہ رو پڑی۔ میں نے اُسے پانچ ہزار لیرے کا ایک نوٹ دیا۔ جسے اس نے میرے کوٹ کی جیب میں ٹھونس دیا۔ وہ روئے جا رہی تھی۔

ہم ٹیکسی میں بیٹھے تو روندھے ہوئے گلے سے اس نے پوچھا۔ "رٹورنا؟"

"ہاں" میں نے سر ہلایا۔ میں ضرور لوٹوں گا۔ وہ آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ چلی اور دوڑ کر اندر چلی گئی۔

ام دریامو، رجم نے ڈرائیور سے کہا۔ وہ خود بے حد اداس اور افسردہ نظر آ رہا تھا۔ راستے میں نہ وہ بولا اور نہ میں۔ میں اس حسین سنڈریلا کی بات سوچ رہا تھا جسے بدنصیبی نے بے تاتی کے قلعے میں قید کر رکھا تھا اور وہ کسی پرنس چارمنگ کا انتظار کر رہی تھی۔ کسی امریکن پرنس چارمنگ کا۔

ٹرین تباہ شدہ شہروں، قصبوں اور گاؤں کے درمیان بھاگی چلی جا رہی تھی۔ میلان کی دھند چھٹ گئی تھی اور نیلا آسمان وینس کی یاد تازہ کر رہا تھا اور نیلے آسمان میں چھٹکے ہوئے سفید بادل وینس کی ندیوں میں تیرتے ہوئے سفید ہنسوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ کھیتوں میں ہوا کے جھونکوں سے اطالوی لڑکیوں کے سکرٹ پھہرا رہے تھے۔ کبھی وہ سکرٹ تھامتیں، کبھی گھاس کا گٹھا اور کبھی اپنا آپ۔

"گیز!" رجم نے ٹھیٹھ امریکی انداز میں کہا ——

"ویٹ مولی — واٹ اے ٹینڈر رچ!"

اس کی آنکھوں میں آنسو چھل چھلا آئے۔

چیچک کے خاتمے کی مہم

دنیا میں جتنی مہلک بیماریاں ہیں۔ ان میں چیچک اس لحاظ سے ایک بہت ہی خطرناک مرض ہے کہ جان لیوا ہونے کے علاوہ یہ انسانوں کو معذور اور اس قدر کریہہ المنظر بنا دیتا ہے کہ زندگی موت سے بدتر ہو جاتی ہے۔

چھوت کی اس بیماری کو ختم کرنے کے لئے عالم گیر پیمانے پر کوششیں کی جا رہی ہیں اور اقوامِ متحدہ کا ادارۂ صحت اس سلسلے میں بڑی بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔

۱۹۵۸ء میں دنیا کے ۵ لاکھ آدمی اس موذی مرض میں گرفتار ہوئے لیکن چیچک کے خاتمے کے لئے عالمی ادارۂ صحت نے جو عالمی مہم شروع کی تھی اس کے ۵ سال بعد یعنی ۱۹۶۳ء میں صرف ایک لاکھ کے اس مرض میں گرفتار ہونے کی اطلاع ملی۔ اس میں دو تہائی مریض ہندوستان کے تھے۔ ہندوستان سے اس مرض کو بالکل ختم کرنے کے لئے زور شور سے کام جاری ہے اور آبادی کے ۵۳ فی صدی حصّے کو اس کا ٹیکہ لگایا جا چکا ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کے تعاون سے ہماری وزارت صحت ٹیکے لگانے کے علاوہ اور بہت سے اقدامات کر رہی ہے جس سے اس موذی مرض پر قابو پایا جا سکے۔

نئی کتابیں اور رسالے

ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں

مصنف ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ناشر مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ۔ ضخامت ۳۶۶ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ قیمت آٹھ روپے۔

ہندوستان میں یک جہتی بھی ہے اور انتشار بھی۔ یہ تو اس ملک کی مجموعی حیثیت کا نقشہ ہے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کا عالم کچھ ایسا ہے کہ

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اردو ادب کے پیش روؤں میں سے ہیں۔ ایسے پیش رو جو ایک سچے مسلمان ہوتے ہوئے بھی ایک سچے قوم پرست ہیں۔ انھوں نے آئینۂ ایام میں ہندوستانی مسلمانوں کو دیکھا اور ان کی تصویر صفحۂ قرطاس پر کھینچ دی۔ جب طبیعت میں جولانی، دل میں خلوص اور بیان میں روانی ہو تو دل سے محسوس کی ہوئی بات ایسی تحریر میں ڈھل جاتی ہے جو سراپا تاثیر ہو۔ مصنف نے محسوس کر کے لکھا ہے اور ان کے ارشادات مسلمانوں کے لئے تازیانۂ عبرت بھی ہیں اور مستقبل کے لئے مشعلِ راہ بھی۔

کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ حصۂ اول کل کی پرچھائیاں، حصہ دوم آج کا دھندلکا، حصہ سوم کل کیسی روشنی یا اندھیرا۔ پہلے حصے میں انھوں نے مسلمانوں کی سیاست کے رجحانات اس زمانے کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ بیان کئے ہیں اور قریب قریب ہر اس تحریک کا ذکر کیا ہے جس کا مسلمانوں سے تعلق ہے۔ آخر میں یہ حصہ تصادم اور تقسیم پر ختم ہو جاتا ہے۔ مصنف نے ہر تحریک پر بے باکی سے تنقید کی ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ملک کی تقسیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی جماعت بھی تقسیم ہو گئی۔ فرقہ پرور اور قوم پرور مسلمانوں کی لڑائی میں اول الذکر کو فتح ہوئی۔ ان کا قول ہے کہ مسلمانوں کا مسئلہ اس پر بھی حل نہیں ہوا۔

دوسرا حصہ حالات و مشکلات، خیالات و رجحانات پر مشتمل ہے۔ یہاں بھی انھوں نے بڑی بے باکی سے لکھا ہے کہ سیکولر خیال کے قوم پرور مسلمان لیڈر اب تک اپنے ہم مذہبوں کو صحیح طور پر سمجھانے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

تیسرے حصے میں انھوں نے بنیادی فیصلے کے طور پر لکھا ہے کہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ تحریکیں جدید مغربی تہذیب کے چیلنج کا جواب نہیں جو مسلمانوں کے مختلف طبقوں نے اپنے اپنے طور پر دیا۔ لیکن چونکہ ان لوگوں نے مغربی تہذیب کو بے لاگ معروضی نظر سے نہیں بلکہ اس لحاظ سے دیکھا تھا کہ وہ حکمران انگریز قوم کی تہذیب ہے اس لئے ذ

نہ اس کی حقیقی نوعیت کو سمجھ سکے اور نہ اس کے ساتھ کوئی معقول اور مرلوط رویہ اختیار کر سکے۔

یہ حصہ نہایت بصیرت افروز ہے جس میں صرف مسلمانوں ہی کے لئے ہی نہیں بلکہ ہندوؤں کے لئے بھی سامانِ بصیرت موجود ہے۔ آخر میں انھوں نے 'ایک آرزو ایک خواب' کے عنوان سے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ یہ تحریر اردو کی پُرخلوص تحریروں میں ہمیشہ کے لیے یادگار رہے گی۔ اس مختصر سے باب کو اس کتاب کا منتہائے مقصد، نتیجہ یا خلاصہ کہنا چاہیئے۔ ایک مختصر سا اقتباس اس باب کا ملاحظہ فرمایئے۔ ہندوستانی مسلمان کے باب میں لکھتے ہیں:

" وہ اپنے رفیقوں کی مدد سے رزمِ حق و باطل میں جو ہندوستان میں بیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوئی تھی نمایاں کامیابی حاصل کر چکا ہے۔ اس نے مقامی، لسانی اور مذہبی فرقہ پروری کی انتشار انگیز قوتوں کو زبردست شکست دے کر ہندوستان کو ایک متحدہ قوم اور اقوامِ عالم کے خاندان کا ایک محبوب رکن بنانے میں، اپنے ملک میں جہالت اور تاریک خیالی کو دور کر کے علم و حکمت کی روشنی پھیلانے میں، خود غرضی اور باہمی مقابلے پر مبنی مطلق العنان معیشت کو لگام دے کر منضبط اور منصوبہ بند معیشت بنانے اور رفاہی ریاست قائم کرنے میں نمایاں اور اہم حصہ لیا ہے۔ اس نے اس مہلک عالم گیر جوہری جنگ کو جو سرمایہ دارانہ جمہوریت اور استبدادانہ، ملحدانہ اشتراکیت میں چھڑنے والی تھی رد کرنے اور ان دونوں حریفوں کو ایک دوسرے کے اور خطِ اعتدال کے قریب لانے میں قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔"

اس کتاب کو ہر لائبریری کی زینت ہونا چاہیئے۔ مذہب اور سیاست سے تعلق رکھنے والے طلبا اور اساتذہ کے لیے بڑی مفید کتاب ہے۔

ترجمان القرآن (جلد اوّل)

مولانا ابوالکلام آزاد۔ صفحات ۱۰+۴۵۵+۱۲۔ مجلد ٹائپ۔ ساہتیہ اکاڈمی، نئی دلی۔ قیمت ۲۲ روپیہ۔

نہ قرآن کسی تعارف کا محتاج ہے نہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم۔

مولانا آزاد کی شخصیت کے گوناگوں پہلو تھے ــــ اور ان کی خدمات ہماری قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں اتنی اہم اور نمایاں ہیں کہ ان کی ذات " ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما " کی مصداق بن گئی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان کی علمی حیثیت سب پر بھاری ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کا جو بیش قیمت خزانہ اپنی یادگار چھوڑا ہے، وہ ان کے ہم وطنوں کے لیے مدتوں رہنما کا کام دیتا رہے گا۔

ساہتیہ اکاڈمی نے فیصلہ کیا ہے کہ مرحوم کی تمام تحریروں کو مرتب کروا کے بحسن و خوبی شائع کیا جائے اور اس کام کا آغاز ان کے شاہکار 'ترجمان القرآن' سے کیا ہے۔

قرآن کا یہ ترجمہ اور تفسیر (جسے افسوس کہ وہ مکمل نہ کر سکے) ان کی زندگی میں دو مرتبہ چھپا، لیکن اب اس کا مستند ایڈیشن بہت عرصے سے ناپید تھا۔ پہلے یہ دو حصوں میں تھا؛ اکاڈمی نے اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا حصہ جو زیرِ نظر ہے، سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ بقیہ دونوں حصے بھی عنقریب شائع ہوں گے۔

مولانا مرحوم صاحب طرز ادیب تھے اور اگرچہ انھوں نے الہلال کے دور میں بہت مشکل زبان لکھی لیکن ترجمان القرآن میں ان کا اسلوبِ تحریر بہت آسان اور عام فہم ہو گیا تھا؛ اور یہ ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ یہ تفسیر وہ ہر طبقے کے لوگوں کے لیے لکھ رہے تھے۔

سورۂ فاتحہ کو 'ام الکتاب' کہا گیا ہے اور ان آٹھ مختصر آیتوں میں قرآنی تعلیمات جس اختصار سے بیان کر دی گئی ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے، یہ سورت اس نام کی صحیح مصداق بھی ہے۔ مولانا مرحوم نے نہایت دل نشین انداز میں خداوند تعالےٰ کے قرآنی تصور کی وضاحت کی ہے اور اس ضمن میں دوسرے مذاہب

کا اسلامی نظریات سے موازنہ اور مقابلہ کیا ہے۔

سورۂ فاتحہ میں خدا کی چار صفات بیان ہوئی ہیں:

۱۔ ربّ العالمین؛ ۲۔ الرّحمٰن؛ ۳۔ الرّحیم؛ ۴۔ مالکِ یوم الدّین۔

مولانا نے ان چاروں صفاتِ الٰہیہ کی تشریح اور شرک کے رواج کی تفصیل بیان کی ہے۔ چونکہ تمام مذاہب کا اصلی مقصود خدا کی ذات کا ادراک اور اس کی عبادت ہے، اس لیے ان کی یہ تفسیر گویا مطالعۂ مذہب کی تمہید ہے اور ہر طرح مطالعے کے لائق۔

کتاب بہت عمدہ ٹائپ میں چھپی ہے اور مضبوط پورے کپڑے کی جلد ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مولانا مرحوم کی تحریروں کے شائقین اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

ساہتیہ اکاڈمی بھی مبارکباد کی مستحق ہے جس نے اس علمی شاہکار کو اس خوب صورتی اور عمدگی سے شائع کیا ہے۔

باغ و بہار

میر امّن دہلوی۔

باغ و بہار کا ایک نیا ایڈیشن مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس کے مرتّب ہیں زبان و فن کے ماہر جناب رشید حسن خاں۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۷۶۔ اس کے علاوہ ۴۰ صفحے کا فرہنگ بھی شاملِ کتاب ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت نہایت عمدہ۔ قیمت دو روپے۔

میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے فارسی کتاب 'قصّۂ چہار درویش' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ترجمہ کی زبان مقفّیٰ جملوں اور مرصّع عبارتوں پر مشتمل ہے۔ تحسین کے اس ترجمے کا نام 'نوطرزِ مرصّع' ہے۔ میر امّن نے جب وہ فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے نوطرزِ مرصّع اور اصل فارسی قصّے کو سامنے رکھ کر باغ و بہار تصنیف کی اور کتاب اس انداز سے لکھی جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔ اب تک بہت ایڈیشن باغ و بہار کے چھپ چکے ہیں۔ مرتّب نے بڑی محنت سے صحیح ترین نسخہ تیار کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ مکتبہ جامعہ نے اردو کی معیاری کتابوں کے سستے ایڈیشن پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اس سلسلے کی کتابوں کی ترتیب میں مندرجہ ذیل امور کو خاص طور سے ملحوظ رکھا جائے گا:

۱۔ اس بنیادی اصول کے تحت کہ کتابوں کا متن معتبر ترین اشاعت پر مبنی ہو۔ ان کتابوں کے اوّلین ایڈیشن یا بصورتِ دیگر قابلِ ذکر اشاعتیں پیشِ نظر رکھی جائیں گی اور دوسرے قدیم نسخوں سے بھی مدد لی جائے گی۔

۲۔ جن کتابوں کے معتبر ایڈیشن موجود نہیں ان کے معتبر قلمی نسخوں کو متن کی بنیاد بنایا جائے گا۔

۳۔ بیشتر کتابوں کے آخر میں ضروری الفاظ کی فرہنگ ہوگی۔

۴۔ عربی، فارسی اور ہندی کے وہ لفظ جو آج کل کم استعمال ہوتے ہیں یا متروک ہو چکے ہیں، یا جن کے تلفّظ میں کسی غلطی کا احتمال ہو سکتا ہے ان کو احتیاط کے ساتھ مع ضبطِ حرکات درج کیا جائے گا۔

اس کتاب میں بھی ان تمام امور کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ طلبا اور اساتذہ دونوں اس سلسلے سے مستفید ہوں گے۔ عام لوگوں کو اچھی کتابیں صحیح متن کے ساتھ کم قیمت میں دستیاب ہوں گی۔ اس سے ان کے ذوقِ سخن کی تسکین کے ساتھ ساتھ اردو کی اچھی کتابوں کی اشاعت بھی بڑھے گی۔

رسالہ — 'صبحِ نو' علی عباس حسینی نمبر

ضخامت ۲۹۶ صفحے۔ قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے۔ وفا ملک پوری صاحب بڑے استقلال کے ساتھ صبحِ نو نکال رہے ہیں۔ پہلے یہ پورنیا سے نکلتا تھا اب کئی سال سے بہار سے شائع ہوتا ہے۔ یہ خاص نمبر اردو کے مشہور ادیب سیّد علی عبّاس حسینی سے متعلق مضامین کے لئے وقف ہے۔

حسینی صاحب بڑے کہنہ مشق ادیب ہیں۔ افسانہ، ناول، تنقید ہر میدان میں آپ نے دادِ سخن دی ہے۔ ایک پڑھے لکھے صاحبِ فن، فن کار کے فن کی اس کی زندگی میں قدر کرنا بڑی اچھی بات ہے۔ ہم ہندوستانی عام طور پر مردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ اس رسالے میں فراق گورکھپوری، حبیب احمد صدّیقی، صالحہ عابد حسین اور بہت سے ادیبوں کے مضامین ہیں۔ رسالے میں بہت سی بلاک کی تصویریں بھی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ شمارہ مقبول ہوگا۔

سرمایہ لگانے کا
ایک اچھا منصوبہ

یکم مارچ ۱۹۶۵ء تک یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا کے یونٹوں
میں کُل ملک ۱۹ کروڑ روپیہ لگانے کے
سلسلے میں ۱۳۲۰۰۰ درخواستیں موصول ہو چکی تھیں

یونٹوں میں لگا روپیہ محفوظ رہتا ہے اور منفعت اور دوسرے فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں ..

- یونٹوں میں روپیہ لگانے سے پونجی محفوظ رہتی ہے کیونکہ یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا کو سرمایہ لگانے کی پالیسی سرمایہ کاری کے معقول اور محتاط اصولوں پر مبنی ہوتی ہے۔
- یونٹ ٹرسٹ متوازی اور خوب منتخب شعبوں میں روپیہ لگانے کے اصول پر کام کرتا ہے اور ہر وہ شخص، جس کے پاس کچھ یونٹ ہیں، سرکاری سکیورٹیوں، صنعتی ڈی بینچروں، ترجیحی حصص اور عام حصص پر مشتمل تمام سرمایہ کاریوں میں شریک ہوتا ہے۔ اس طرح سرمایہ کاری کی طرف سے اندیشہ کم سے کم حد تک گھٹ جاتا ہے۔ یونٹوں سے جہاں آپ کے سرمائے کو تحفظ ملتا ہے وہاں معقول منافع بھی حاصل ہوتا ہے اور سرمائے میں اضافے کی گنجائش بھی رہتی ہے۔
- سرمایہ لگانے کے لئے یونٹ ایک بے مثال ذریعہ ہیں۔ ان کے کئی فائدے ہیں۔ ان سے مستقل آمدنی ہوتی ہے۔ یونٹ خریدنے والوں کو ٹیکس کی اہم رعایتیں بھی دی جاتی ہیں ..... روپیہ ضرورت پڑنے پر انہیں بھنایا بھی جا سکتا ہے۔

یونٹ اب ملک بھر کے چیدہ شیڈولڈ بنکوں کی سبھی شاخوں سے خریدے جا سکتے ہیں

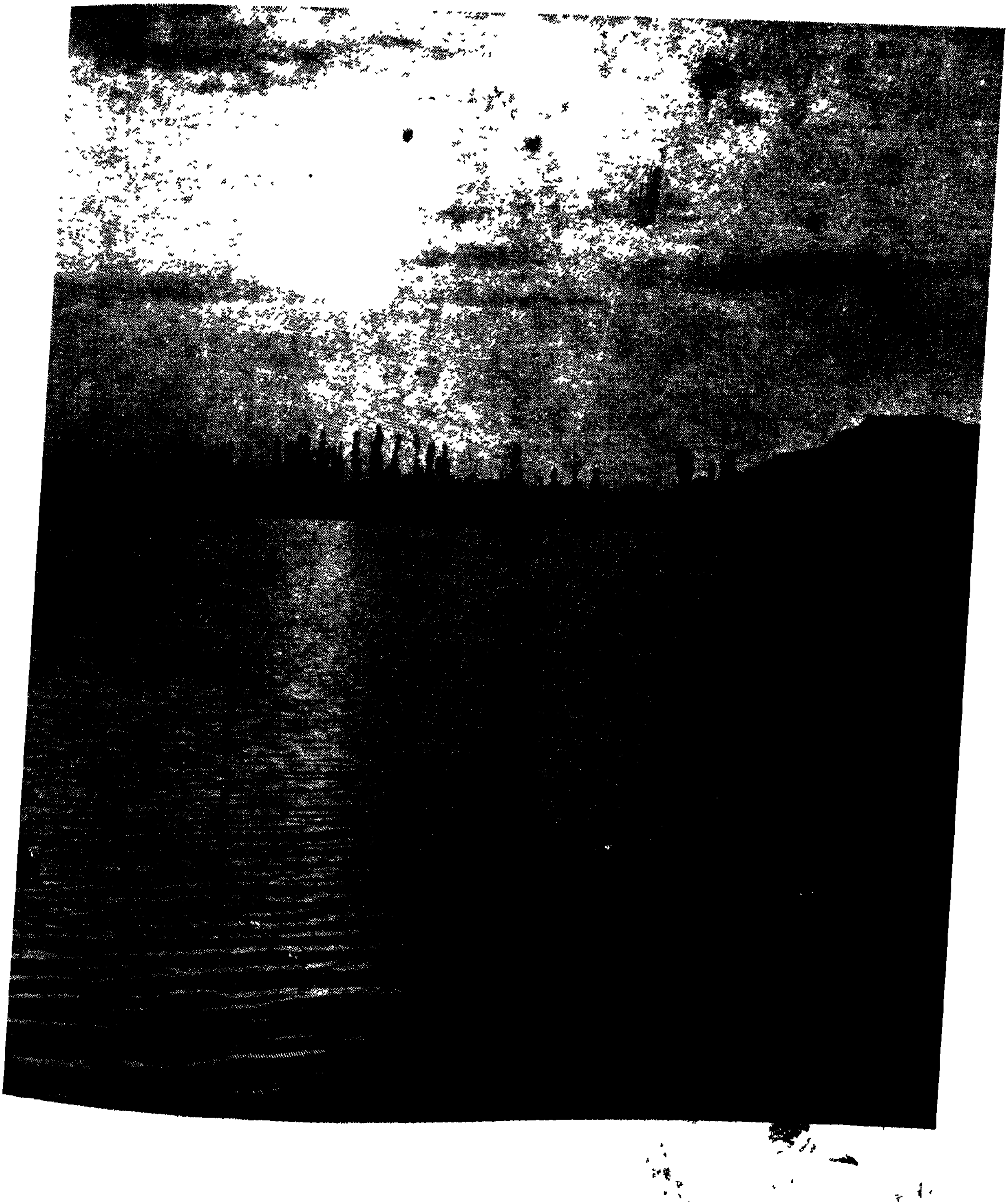
یونٹ خریدیئے
یہ بچتوں کو سرمایہ بنانے کا بہترین ذریعہ ہیں

یونٹ ٹرسٹ آف اِنڈیا

صدر دفتر: بمبئی لائف بلڈنگ، ۴۵/۴۷، ویر نریمان روڈ، پوسٹ بکس ۱۱۰۰، بمبئی ۱
شاخیں: ریزرو بنک آف انڈیا بلڈنگ، نیتا جی سبھاش روڈ، پوسٹ بکس ۰۵۲، کلکتہ ۱ ... نارتھ بیچ روڈ، مدراس۔



دارجلنگ سے کنچن جنگا کا منظر



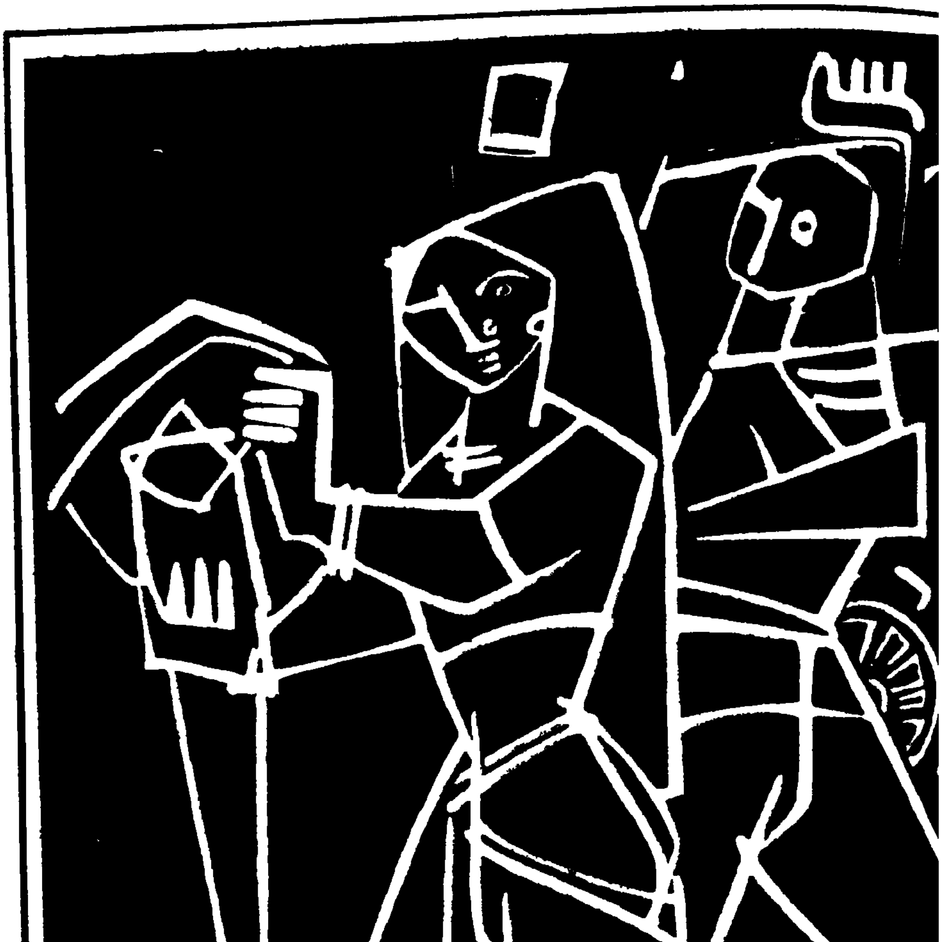
Edited & and published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
Printed by Union Printers Co-op. Industrial Society Ltd., Karol Bagh, New Delhi-5

Regd. No. D-589

آجکل

اساڑھ شک سمت ۱۸۸۷

جولائی ۱۹۶۵ء



۶۰ پیسے



اختر شیرانی

متعلقہ مضمون صفحہ ۴۰ پر دیکھئے

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل
دہلی

ایڈیٹر
عرش ملسیانی

اسسٹنٹ ایڈیٹر
شہباز حسین

ترتیب

سرورق :- محنت کش (عمل دل ویر ورما)
رسالے کی پشت پر :- برسات

جلد ۲۳ - نمبر ۱۲

اساڑھ شک سمت ۱۸۸۷
جولائی ۱۹۶۵ء

سالانہ چندہ :-	ہندوستان میں :- سات روپے
	پاکستان میں :- سات روپے (پاک)
غیر ممالک سے :-	۱۰ شلنگ ۶ پینس یا ڈیڑھ ڈالر
قیمت فی پرچہ :-	ہندوستان میں :- ۶۰ پیسے
	پاکستان میں :- ۶۰ پیسے (پاک)
غیر ممالک سے :-	ا شلنگ یا ۱۵ سینٹ

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو - اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ :-
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ - دہلی

ملاحظات

ایورسٹ کی چوٹی کو متواتر چار بار سر کرنا ایک ایسا شاندار کارنامہ ہے جو کوہ پیمائی کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ ہندوستان کی کوہ پیما ٹیم کو یہ شاندار کامیابی، دو بار کی ناکامی ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۲ء کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ لفٹننٹ کمانڈر کوہلی کی سرکردگی میں ہندوستانی ٹیم کے افراد نے سخت مشکلات اور صبر آزما حالات کا سامنا کرتے ہوئے دنیا کی سب سے بلند چوٹی پر پہنچ کر نہ صرف خود کو سرفراز اور سربلند کیا ہے بلکہ اپنے ملک کو بھی سرفرازی اور عزت بخشی ہے۔

وزیر اعظم لال بہادر شاستری کا حالیہ دورۂ روس کئی لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہندوستان اور روس کی دوستی کا بیج وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی میں بویا گیا تھا جو اب ایک تناور درخت بن گیا ہے۔

ہندوستان کے بہت سے نکتہ چین بار بار یہ اعلان کرتے یں کہ ناوابستگی اور غیر جانب داری کی پالیسی پر عمل پیرا ہونا ہمارے لئے فخر ہے مگر حالات اور واقعات نے ہمیشہ یہ ثابت کیا ہے کہ یہی یح اور درست پالیسی ہے۔ ہمارے وزیر اعظم سری لال بہادر شاستری بھی اس امر کا اعادہ کیا ہے کہ وہ اسی پالیسی پر گامزن رہیں گے ینکہ اسی میں ہندوستان اور دنیا کی بھلائی ہے۔

سری لال بہادر شاستری کے دورۂ روس کے بعد جو مشترکہ اتیہ جاری کیا گیا ہے اس میں ان کے اس دورے کو 'ایک اہم ب میل' کہا گیا ہے۔ خود شاستری جی نے ہندوستان روانہ نے سے پہلے یہ فرمایا — "ہندوستان کے لئے روس کی دوستی زیہ سچا اور حقیقی ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اس دورے نے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کیا ہے اور ہمارے رشتۂ اتحاد کو مضبوط و مستحکم بنایا ہے۔

ہندوستان کی سرحدوں پر پاکستانی فوجوں کا اجتماع، ان کی سرحدی خلاف ورزیاں اور گولہ باری ہمارے لئے تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ کسی بھی جارحانہ کارروائی کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم ہر طرح چوکس اور تیار ہیں۔ مگر اس کے باوجود ہماری یہ خواہش ہے کہ یہ مسئلہ پُر امن طور سے حل ہو جائے اور ہمارے وزیر اعظم نے کئی بار کہا ہے کہ امن کا راستہ اب بھی کھلا ہے۔ ضرورت ہے کہ باہمی گفت و شنید کے ذریعے تمام سرحدی مسئلے طے کر لیے جائیں مگر پاکستان کے ارباب حل و عقد جنگجویانہ سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور خواہ مخواہ تناؤ اور کشمکش کی فضا کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ کاش پاکستانی حکام اور سیاست دان اس سیدھی سی بات کو سمجھ لیں کہ ان کا نفع ہندوستان کے ساتھ دوستی میں ہے لڑائی میں نہیں۔

گیہوں کی نئی فصل بازار میں آنے سے اناج کی قیمتوں میں قابلِ ذکر حد تک کمی آئی ہے۔ امریکہ سے گیہوں اور چاول کی درآمد جاری ہے۔ پیداوار کے جو تخمینے لگائے گئے ہیں وہ بڑے امید افزا ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ رفتہ رفتہ اناج کی قیمتوں میں استحکام پیدا ہو گا اور ان کی قیمتیں ایک مناسب حد کے اندر رہیں گی۔

علی گڑھ یونی ورسٹی میں تشدد اور ہلڑ بازی کے واقعات بڑے افسوس ناک ہیں۔ حکومت ہند نے اس سلسلے میں جو قدم اُٹھایا ہے۔ حالانکہ اس کے متقاضی تھے۔ یونیورسٹی سے خراب عناصر کو نکال کر اب اس میں صحت مند ماحول پیدا کیا جا سکے گا۔

آج کل دہلی

چار راتیں

پہلی رات

اک کرن ہے کہ تیری نظر ہے
یہ رگِ جاں ہے یا نیشتر ہے

آدمی کیا ہے یارو خبر ہے؟
دونوں عالم وہ المختصر ہے

مرحبا فکرِ شاعر کی پرواز
اف یہ پرواز بے بال و پر ہے

خود سے بے گانگی اللہ اللہ
شکل جو ہے بہ شکلِ دگر ہے

ہے جھلک کس کی ارض و سما میں
جلوہ کس کا در و بام پر ہے

عیب بیں کو سنا دو مرا قول
سب جہاں حسن و حسنِ نظر ہے

کھل کے کاندھے پہ اتری ہیں زلفیں
رات سوئی ہوئی دوش پر ہے

جس کو کہتے ہیں دورِ مسرّت
مسکراتا ہوا اک شرر ہے

بزمِ آفاق کی یہ سجاوٹ
سب ترا انتظامِ نظر ہے

جیسے اک بات وہ کہہ رہے ہوں
وہ بھی کچھ مختصر مختصر ہے

اب ہے موجِ نشاط اپنی ہر سانس
آج دریائے غم جوش پر ہے

عقل اور عشق کا فرق سمجھو
وہ خبر یہ عزیز و نظر ہے

زندگی غرقِ عصیاں ہے لیکن
ہو کے آلودہ پاکیزہ تر ہے

میں نہ دیکھوں گا تجھ کو بتا دے
اے مری جانِ جاں تو کدھر ہے

دی بُروں کو جو اچھوں پہ ترجیح
یہ مرا انتخابِ نظر ہے

ایک سے ایک ہیں حسن والے
پر ترا حسن چیزِ دگر ہے

تابشِ مطلعِ ہر غزل دیکھ
تھرتھراتی ہوئی اک سحر ہے

میں وہاں ہوں جہاں اے زمانہ
خود مرا بھی بمشکل گذر ہے

دیکھتے ہی فراقؔ اس کو غش تھے
دوستو اپنی اپنی نظر ہے

دوسری رات

آدمی یوں تو بے بال و پر ہے
تا بہ افلاک اس کا گذر ہے

کوئے جاناں سے جا روشنی مانگ
ذرہ ذرہ جہاں دیدہ ور ہے

ہیں خبر جس کی چاند اور ستارے
آدمی بھی اسی کی خبر ہے

اب دو عالم کی تقدیر ہوں میں
میری سانس اب قضا و قدر ہے

حسن نغموں میں ڈھلنے سے پہلے
خوب تھا اور اب خوب تر ہے

میرے نقشِ قدم ہیں دو عالم
گوشۂ دل مرا مستقر ہے

زندگی اور شیرِ زمانہ
ہاں مگر فرصتِ یک نظر ہے

اک جہاں قدر کر کے رہے گا
میرے اشعار میں کچھ اگر ہے

اتری جاتی ہے دل سے جگر تک
نرمیٔ گفتگو نیشتر ہے

دیکھ بکھرا وہ اس کا تبسم
بزمِ احباب اب رنگ پر ہے

یہ شبِ زندگی کاٹنا ہے
دوستو رات بھر کا سفر ہے

سرخ روئی کی قیمت! ہر اک گل
اپنے ہی خون میں تر بتر ہے

جیسے کچھ نیند میں اک کرن ہو
وہ تبسم کی ہاں ہونٹ پر ہے

اک سکوتِ ابد ہے جب انجام
کیوں زمانے میں یہ شور و شر ہے

دین اسی کی ہے تہذیبِ اقوام
غم بہت بیش قیمت ہنر ہے

کون ہے جو نہیں آج غمگیں
غم زدہ دل مرا خاص کر ہے

پڑھ رہا ہوں جہاں سے یہ اشعار
واں فراق آہ کس کا گذر ہے

تیسری رات

تو ہمارا غبارِ سفر ہے
موت کچھ تجھ کو اس کی خبر ہے

یہ زمیں جو قریب اس قدر ہے
آسمانوں سے بھی دور تر ہے

کون لڑتا قضا و قدر سے
لڑ گئے ہم ہمارا جگر ہے

مجھ سیہ بخت کی خاک اے دل
سرمۂ چشمِ شمس و قمر ہے

اختیار اور جبر ایک دھوکا
سب تری ذات پر منحصر[1] ہے

پیار جی بھر کے کر لو پتنگو
شمع کی زندگی رات بھر ہے

ہم بھی ایسے نہیں بے سہارے
پر یہ بات آپ کی بات پر ہے

ہے دمِ واپسیں اس میں شامل
ہر نفس آخرت کا سفر ہے

ایک خمیازے کی ہے شبِ غم
میں نے انگڑائی لی اور سحر ہے

سب جہاں وقفِ سود و زیاں ہیں
زندگی کا وہاں کب گزر ہے

کتنی بے ساختہ ہیں یہ غزلیں
جن کا ہر شعر تیری نظر ہے

خواب میں بدلے جاتی ہے پہلو
زندگی کس قدر بے خبر ہے

خواب و خور بھول بیٹھا ہوں اے دوست
ان دنوں تیرے غم پر گزر ہے

طفلِ معصوم کی اک نظر سی
میری عرضِ وفا مختصر ہے

دے نظر کی اسیروں کو توفیق
جس کو دیوار سمجھے ہیں در ہے

مے کشو جانبِ غیب دیکھو
روشنی کیسی یہ جام پر ہے

دوستو دوسرا ذکر چھیڑو
دل کا رونا تو اب عمر بھر ہے

اب جھپکنے لگی ہیں وہ آنکھیں
داستانِ نظر ختم پر ہے

اے فراقؔ آج ہے غیب کی سیر
اس طرف اتفاقاً گزر ہے

---

[1] صحیح تلفظ منحصِر (بکسر صاد) ہے لیکن میں نے یہاں غلط العام کی تقلید کی ہے ۔ فراق

یہ چوتھی رات

کاروانِ بشر کا سفر ہے — سر پہ ابلیس کا عکس پر ہے
لالہ زار و کہاں اس کا گھر ہے — کس کی قاصد نسیمِ سحر ہے
منصبِ اہرمن دردِ سر ہے — آدمیت تو دردِ جگر ہے
دستِ یابی سے پہلے ہر اک چیز — دُور تھی اور اب دُور تر ہے
میرے نغموں نے بوسے دئے ہیں — حسنِ آفاق اب معتبر ہے
بس یہ مجھ میں ہے طور و سلیقہ — کتنا کم یاب غم کا ہنر ہے
کام لیتا ہے ناکامیوں سے — شغل اپنا یہی عمر بھر ہے
وقت شعلہ ہے سازِ جرس کا — غیب سے دو جہاں کا سفر ہے
کس کی پرچھائیاں ہیں مہ و مہر — ہر جھلک ایک عکسِ نظر ہے
وحدتِ آدمیت بھلا کر — آدمی کس قدر بے خبر ہے
سن رہا ہوں جسے دُور سے میں — ساز کا نغمہ منتظر ہے
جس کو تو کہتا آیا ہے ایماں — شیخ وہ تیری حدِ نظر ہے
سنتے آئے ہیں صبحِ ازل سے — زندگی دُور کی اک خبر ہے
ہے چراغِ سرِ رہ ہر پھول — نقشِ پائے نسیمِ سحر ہے
سب عطیہ ہے خونِ جگر کا — رنگ جو میرے اشعار پر ہے
عشق ہی ہے وہ مجبور جس کو — انتظار اپنا شام و سحر ہے
ہر نگاہ اس کی تازہ بہ تازہ — نو بہ نو داستانِ نظر ہے

ہیں فراق اپنی قدر آپ کر لوں
ناشناسوں کی بستی میں گھر ہے

اختر اورینوی

تنقید اور قدروں کا مسئلہ

تنقید کی اہمیت دن بہ دن واضح تر ہوتی جاتی ہے۔ یوں تو تخلیقِ ادب و شعر کے کسی دَور میں، سخن فہمی و سخن شناسی کے کسی عہد میں بھی تنقیدی شعور حلقۂ ادب کے اندر ہرگز نایاب نہیں رہا۔ تفہیمِ ادب و شعر کی قدر و قیمت کا احساس ملّا وجہی کو گہرے طور پر تھا۔

شعر بولنا گرچہ اپروپ ہے   ولے فاما کہنے تے خوب ہے

تنقیدِ صحیح کے لئے چھچھلی ذہانت کافی نہیں، گہری عقل کی ضرورت ہے

سچ تھوڑی لوگاں ہیں چھل بھوت ہے

پارکھ کے پاس 'عقل' اور 'گیان' ہونے کی ضرورت ہے، نیز 'انصاف'

ہنر کیاں ہیں یو باریکیاں لاف نین
دو آدمی نہیں جس میں انصاف نین

عقل، گیان اور انصاف کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ فن کے 'کانچ' اور 'پاچ' میں تمیز کی جا سکے اور اس امر کا اظہار بھی ہو کہ کون سا نمونہ بلور ہے اور کون سا محض معمولی شیشہ۔

پرکھ دیک تون کانچ ہور پاچ کوں
برابر نہ کر دود ہور چھاچ کوں

تنقید کا کام دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرنا ہے۔ معیاری تنقید اُسی شخص کی ہوتی ہے جسے فن کی اقدار کا عرفان حاصل ہو۔

جو کوئی جوہری ہے سو پہچان کر
منگے گا رتن کوں قدر جان کر

اعلیٰ تنقید نگاری ہمیشہ اقدارِ فن کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اور اہلِ خبر و نظر فن کی قدر و قیمت سے واقف اور ان کے عارف ہوتے ہیں۔

نہ یو بات ہر ایک کے سات ہے
جکوئی عارف ہے اس سوں یو بات ہے
توں پھل چاک دیکھ ہور لذّت کوں فام
نہ کر مول سب کا سگٹ یتن دام

مُلا وجہی دکنی نے شاعری کی اقدار کا تجزیہ بھی کیا ہے کیونکہ تنقید مانی ہوئی قدروں کی ترازو پر نمونہ ہائے فن کو تولنے کا نام ہے۔ فن تنقید کی فیصلہ کن قدریں دراصل اصنافِ فن کی بنیادی قدریں ہی ہیں۔ "شعر گو" فا منے کے لئے ... در شرحِ شعر گوید۔"

سلاست نہیں جس کیری بات میں
پڑیا جائے کیوں جز لے کر ہات میں
جسے بات کے ربط کا فام نین
اُسے شعر کہنے سوں کچھ کام نین

وجہی سلاست، تکمیل، ربط، تازگی، لفظ و معنی میں ہم آہنگی، ضوابط و معیار کی پابندی، سنوار اور سنگار،

زورِ بیان، ندرت و تازہ کاری، چنچلتا اور چلبلا پن کو شاعری کی بنیادی خوبیوں میں شمار کرتے ہیں۔ وہ شاعری کی داخلی، القائی اور الہامی قدروں کو بھی نہایت اہم قرار دیتے ہیں۔

یو نرمول ہے بات اسے مول نین
ھر یک بول ہے وحی یو بول نین
ہوا جیو جب شعر یو بولنے
خزینے لگیا غیب کے کھولنے
رتن یو اتھے ول کیرے کھان میں
وھاں تی لے آیا ھون دکان میں

مندرجہ بالا گذارشات سے یہ بات روشن ہوئی کہ اردو شاعری کے دکنی دور میں بھی شعر فہمی و سخن شناسی کی بحث کے سلسلے میں اقدارِ تنقید اور اقدارِ شاعری کا مسئلہ ابھرا تھا ذوقی تنقید نشیب و فراز سے گزر کر عصرِ جدید میں نمایاں فروغ حاصل کر رہا ہے۔ اب تنقید ایک سائنس بھی بن چکی ہے اور اسے ایک فن کی حیثیت بھی مل گئی ہے۔ تنقید نہ تو من مانی رہی اور نہ ادھوری۔ پسند و ناپسند کا آمرانہ اظہار تنقید نہیں۔ فقط ذہنی طور پر اقدارِ فن کو سامنے رکھ کر اظہارِ خیال کر دینے سے بھی تسلی بخش تنقید رونما نہیں ہوتی۔ تنقیدِ جدید اقدارِ فن کی تشریح کرتی اور ان اقدار کی روشنی میں فن کے نمونوں کو تفصیل کے ساتھ جزوی اور کلی طور پر جانچتی ہے۔

تخلیقِ فن کو تنقیدِ فن پر ہمیشہ اولیت و فوقیت حاصل ہوگی کیونکہ اقدار و معیارِ حسن کا سرچشمہ فن کے اعلیٰ نمونے ہی ہوتے ہیں۔ یوں تو تخلیق و تنقید توام ہیں۔ لیکن ان کا اظہار اور عمل علیحدہ علیحدہ بھی ہو سکتا ہے۔ تنقیدی عمل تخلیقی عمل کی طرح بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔ اس کے دو قطبین ہیں۔ اس کا محور انھیں قطبین کے درمیان گھومتا ہے۔ تعینِ اقدار اور اقدار کی کسوٹی پر فنی نمونوں کی پرکھ تنقید کی پہلی منزل فلسفۂ فن، نظریہ ہائے فن، اصولِ فن، اصنافِ فن کی ٹکنیک اور اسالیب سے گہری واقفیت حاصل کرنی ہے۔ حسن کیا ہے؟ قبح کیا ہے؟ مختلف اصنافِ فن میں وہ کون سی قدریں ہیں جو حسن آفریں ہیں؟ بنیادی قدریں کون سی ہیں اور ضمنی و ثانوی کون سی؟ حسنِ معنی اور حسنِ صورت سے آگاہی ناقد کے لئے لازمی ہے۔ اُسے حسن کی صفات، تجلیات، جلوہ گری کے شیوؤں، عشوؤں اور اداؤں کا واقف و عارف ہونا چاہیئے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مبصر ہونے کے ساتھ ساتھ مفسرِ حسن بھی ہو۔ بغیر تفسیرِ حسن کے تنقیدِ فن تسلی و اطمینان کا موجب نہیں ہو سکتی۔ اقدارِ حسن و جمال کی تعین و تشریح کے بعد معیار آفرینیِ فن اور انتقادِ فن کو لاقانونیت سے بچاتی ہے۔ اقدارِ فن آئینِ فن ہیں۔ قانون اور ضابطے کے بغیر زندگی اور فن کی دنیا میں اطمینان و استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔

تنقید کی دوسری منزل اقدار و معیار کے نکتوں کی وضاحت کے بعد زیرِ تنقید نمونۂ فن میں ان اقدار کی تلاش ہے۔ فنی نمونوں میں اقدار کی تلاش ایک تفصیلی و تجزیاتی عمل ہے۔ چھان بین ہے۔ چھان پھٹک ہے۔ ناپ تول ہے۔ یہ تنقید کا عملی حصہ ہے۔ ریاضِ فن کی طرح ریاضِ تنقید بھی ضروری ہے۔ عملی تنقید معمل کی کاروائی ہے۔ جس طرح سائنس کی لیبوریٹریوں میں اشیاء کی جانچ کا کام ہوتا ہے اسی طرح تنقیدی سائنس کے معمل میں فن کے نمونوں کی جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ اجزاء کی مقدار کی تول، ان کے ہونے نہ ہونے اور ان کی خاص ترکیبوں کی پرکھ کی جاتی ہے۔ اچھے ناقد کے سامنے ہمیشہ اقدار کی 'چارٹ' ہوتی ہے۔ اسی مقررہ اور تسلیم شدہ معیاری چارٹ کے نکات کے مطابق عملِ تنقید ترتیب وار رونما ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ تنقید کے دو حصے ہوتے ہیں، نظری اور عملی۔ نظری حصہ کے لئے عرفانِ حسن چاہیئے اور عملی کے لئے ریاضت۔

تخلیقِ فن اور تنقیدِ فن دونوں میں اقدار کا مسئلہ نہایت بنیادی ہے۔ قدریں کس طرح پیدا ہوتی ہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ کیا ناقدِ فن شریعتِ فن کے قوانین مقرر کرتا ہے؟

یا فن کار پیغمبرِ حسن و شارحِ جمال ہے؟ آخر فنونِ لطیفہ کی دنیا میں قدریں کس طرح رونما ہوتی ہیں؟

فن کار ہی اپنے ذوقِ سلیم اور روحِ حسن آشنا کی کارفرمائی سے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اقدارِ فن کا عملی اظہار کرتے ہیں۔ انسانی سماج میں ثقافت کی تدریجی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ ادب و شعر بھی ثقافتِ انسانی کے اظہارات ہیں۔ یہ بھی ارتقا پذیر ہیں۔ ثقافت و تہذیب کی دنیا میں زوال کے دور بھی آتے رہتے ہیں۔ فن کار تخلیقِ ادب و شعر میں مشغول رہتے ہیں اور ان کے کامیاب فنی کارناموں میں محاسنِ فن کی جلوہ گری ہوتی رہتی ہے۔ یہی محاسن اقدارِ فن قرار پاتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کی قدروں کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ ان میں آفاقی، صنفی اور مقامی اہم پہلو ہیں۔ انسانی ثقافت اور انسانی نفسیات کے اعتبار سے حُسن کی کچھ مطلق قدریں ہیں جو عالمگیر اور آفاقی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن ان کا شعور کامل تدریجی طور پر حاصل ہوتا ہے۔ انسانی تہذیب کے درجات اور فن کار کے ذہنی و نفسی ارتقا کے مطابق یہ آفاقی قدریں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

صنفی قدریں انواع و اصنافِ فن کے تقاضوں کے مطابق ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ شاعری، ادبی نثر اور ان کی مختلف صنفوں کا منفرد خصوصیتیں اپنی اپنی ضرورتوں اور تقاضوں کے لحاظ سے فن کار کو صنفی اقدار پیدا کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہیں۔ المیہ، رزمیہ، طربیہ، غنائی شاعری، ناول، مختصر افسانہ، انشائیہ وغیرہ کی علیحدہ علیحدہ قدریں بھی ہوتی ہیں۔

مقامی قدریں کسی مخصوص معاشرہ کی تہذیبی خصوصیات اور زمان و مکان کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں۔ مقامی رنگ و آہنگ رکھنے والی قدریں ثانوی ہوتی ہیں۔ ان پر ملکی و قومی مزاج و ماحول کا اثر پڑتا رہتا ہے۔

بہرحال فن کار ہی عملِ تخلیق سے قدریں پیدا کرتے رہتے ہیں یا یوں کہیے کہ انھیں ہی سب سے پہلے عرفانِ اقدار ہوتا ہے، وہ قدر آفریں بنتے ہیں اور ان کی فنی تخلیقات اقدار کی مظہر ہوتی ہیں لیکن ہر مہذب معاشرہ میں سخن فہموں، سخن شناسوں اور سخن سنجوں کا ایک طبقہ ہوتا ہے جو فن میں حسن کی اداؤں کو پہچانتا ہے اور اقدارِ فن تک پہنچ جاتا ہے۔ اہلِ نظر کے اس طبقہ کے کچھ خاص افراد حسنِ فن کی اداؤں کا تجزیہ کرتے ہیں اور اقدار کی ترتیب و تعیّن کے بعد ضابطہ و معیارِ فن کی تشخیص کر دیتے ہیں۔ ماضی و حال کے اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ درجے کے فن کاروں کی تخلیقات کا گہرا اور تقابلی مطالعہ ان کی رہ نمائی کرتا ہے۔ یہ لوگ آمرانہ طور پر اقدار مقرر نہیں کرتے بلکہ وہ اعلیٰ درجہ کی کامیاب و موثر تخلیقاتِ فن میں اقدار کی جلوہ گری کا نظارہ کرا دیتے ہیں۔ وہ چاند اور سورج کی طرف اہلِ نظر و اہلِ ذوق کو متوجہ کر کے بالاعلان یہ بتاتے ہیں کہ یہ روشنی ہے، یہ دھوپ ہے، یہ چاندنی ہے۔ یہی افراد مبصر و ناقد کہلاتے ہیں۔ تدوین و تشریحِ اقدار ان کا کام ہے۔ معیار کی وضاحت کر کے اس پر وہ اور نمونہ ہائے فن کو جانچتے اور پرکھتے بھی ہیں۔ اقدارِ فن کو منضبط کرنے کے علاوہ وہ نکاتِ فن کی بصیرت افروز تشریحیں کرتے اور حسن کی لطیف تجلیوں کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ ایسی مثالیں بھی بہت ملتی ہیں کہ خالقِ فن خود ہی شارح و ناقدِ فن بھی ہوتا ہے اور ویسے تو ہر خالقِ فن عملِ تخلیق سے گزرتے ہوئے داخلی طور پر اپنی تخلیقات کی خود ہی تنقید کرتا جاتا ہے لیکن یہاں اس تنقیدی کاوش کا ذکر ہے جو عملِ تخلیق سے علیحدہ ہو کر کارفرما ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا گزارشات سے یہ ظاہر ہوا کہ تنقید کی قدریں کس طرح پیدا ہوتی ہیں اور یہ کہ تنقید کی قدریں دراصل فن کی قدریں ہیں۔

ایک مہذب معاشرہ میں جب اہلِ نقد اقدارِ فن کا انکشاف کرتے ہیں تو یہ قدریں ابھرتے ہوئے فن کاروں کی ہدایت کا موجب بنتی ہیں اور مجموعی طور پر معاشرہ کے ذوقِ ادب و فن کی تربیت کرتی ہیں۔ سماج کے خوش مذاق لوگوں کی صلاحیتِ تمیز ترقی کر جاتی ہے، پرکھ کا مادہ فزوں

ہوتا ہے اور عملی تنقید کی نظر تیز ہو جاتی ہے۔ ہوش مندانہ تنقید ادب و شعر کے ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان جیتا جاگتا تعلق پیدا کر دیتی ہے۔

یہ امر واضح طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ انسانی معاشرہ متحرک ہوتا ہے، ترقی پذیر ہوتا ہے یا زوال پذیر حیات میں ٹھہراؤ نہیں۔ زندگی کے اجتماعی مظاہر میں بھی سکون نہیں۔ سماج ایک بدلتی ہوئی حقیقت ہے۔ لیکن اس تبدیلی میں تسلسل ہوتا ہے اور ثبات کی جلوہ پاشی بھی ہوتی ہے۔ ثقافتِ انسانی کے ہر شعبہ میں زندگی کے اس اصل کا اظہار ہوتا ہے۔ ادب و شعر کی قدریں بھی اس ارتقائی قانون کے ماتحت ہوتی ہیں۔

انسانی معاشرہ کی کسی اکائی میں ان گنت جہتوں سے تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مختلف تہذیبی اکائیاں ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔ لہٰذا ادب و شعر کی قدروں کے پہلو بدلتے رہتے ہیں۔ بنیادی قدروں کے سمجھنے بوجھنے پر اثر پڑتا ہے نئی صنفیں رائج ہوتی ہیں اور اس طرح نئی اقدار کا شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ مقامی میلانات و مذاق متاثر ہوتے ہیں اور اس اثر پذیری سے مقامی قدریں بھی بدلنے لگتی ہیں۔ دوسری جہت یہ ہے کہ ایک مخصوص حلقے کے اندر بھی نئے ذہن پیدا ہوتے رہتے ہیں اور یہ تازہ اذہان نیا شعورِ فن نئی بصیرتِ اقدار اور تازہ کار صلاحیتِ تنقید لاتے ہیں۔ سنئے لوگ دوسری تہذیبوں سے اثر قبول نہ بھی کریں تو بھی ان کے ذوق و نظر میں تبدیلی ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تو ہے کہ نئے فن کار تخلیق کا کام جاری رکھتے ہیں اس لئے نئی اقدارِ حسن کی پیدائش کے امکانات باقی رہتے ہیں اور جب فن کار نئی قدریں پیش کرتے رہیں گے، ناقدینِ فن کے لئے نئے مواقع پیدا ہوتے جائیں گے اور وہ سماج کے سامنے نئی فنی قدروں کی تشریح یا پرانی اقدار کی ترمیم کرتے رہیں گے۔ مزید براں یہ بات بھی ہے کہ اہلِ نقد کی بحث و مذاکرہ سے فن کے نئے نکتے واضح ہوتے رہتے ہیں، مسائل و اقدار پر نئی روشنی پڑتی ہے اور تازہ قدریں منکشف ہو جاتی ہیں۔ غرض یہ کہ اقدارِ فن کی تفہیم، تشکیل اور تشریح کا عمل جاری رہتا ہے اور مختلف سماجی حلقوں، ادبی دبستانوں، تحریکوں اور دوروں میں اقدارِ فن کے اظہار و بیان میں تھوڑی یا بہت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اقدارِ شعر و ادب کی تعیین و تشریح میں شخصی میلانات بھی اختلاف پیدا کرنے کے موجب ہوتے ہیں۔ ان معروضات کے پیشِ نظر یہ سوال اٹھتے ہیں کہ آخر معیاری قدریں کس طرح رونما ہوتی ہیں اور فن کی دنیا میں امن و استحکام کی کیا سبیل نکلتی ہے؟ کیا حسنِ فن کی اٹل بنیادی قدروں کا کوئی وجود بھی ہے یا نہیں؟ کیا تخلیقِ ادب اور تنقیدِ ادب ہمیشہ لاقانونی کی شکار ہوتی رہتی ہیں؟ کیا اقلیمِ سخن میں مستقل مزاج رہتا ہے؟

اگر غور کیا جائے تو واضح ہوگا کہ ہر آدمی اپنی پسند یا ناپسند کا ایک پیمانہ بنا لیتا ہے۔ ہر سماج اپنی قدریں، پیمانے، معیار اور ضابطے پیدا کر لیتا ہے اجتماعیت تراج کو روا نہیں رکھتی ہے معاشرہ ہمیشہ قدروں کے سہارے جنم لیتا ہے۔ ہر معاشرہ کی تہذیبی قدریں ہوتی ہیں۔ افراد اجتماعی اقدار کی قماش میں ترمیم و اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ فرد جب تک سماج کے اندر ہے سماجی قماش سے یکسر انحراف نہیں کر سکتا۔ وہ بغاوتیں بھی اس لئے کرتا ہے کہ سماج کی تشکیلِ نو کرے۔ ہر انقلاب کچھ دنوں کے بعد نئی سماجی روایت بناتا ہے اور اگر نئی روایتوں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ سماجی مفاہمتیں ہیں۔ طریقۂ کار خواہ تشدد آمیز ہو یا پُرامن، برق رفتار ہو یا تدریجی۔ تہذیب ایک معاہدۂ عمرانی ہے۔ شعر و ادب کی قدریں بھی تسلیم شدہ معاہدہ کی صورت اختیار کرتی ہیں اور اس سماجی راضی نامہ کو استحکام و پائندگی بخشنے کا میلان معاشرہ میں بہت قوی ہوتا ہے۔ انقلاب تکلف سے روایت شکلت نہیں لیکن انسانی سرشت میں انقلاب و ارتقاء کے میلانات بھی ہیں۔ غرض یہ کہ فطرتِ انسانی کی نفسی نوعیت اور معاشرہ

کے متضاد رجحانات کی وجہ سے ادب و شعر کی قدروں میں بھی استحکام و انقلاب کے دوگونا عمل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ اختلاف اور اقدار کی وجہ سے بالکل نراج پیدا ہو جائے۔ عام طور سے ادبی دنیا کے حلقوں میں استواری اور استحکام پایا جاتا ہے۔

کچھ سوال اور اُٹھتے ہیں۔ کیا حُسن کی مطلق قدر تک کبھی انسانی ذہن کی رسائی ہوگی؟ کیا الفاظ کے قالب میں حُسنِ مطلق کی جلوہ گری اٹل قاعدوں کے تحت ہو سکتی ہے؟ کیا اقدارِ شعر و ادب اور معیارِ تنقید زمان و مکان سے آزاد، آفاقی، ازلی و ابدی ہو سکتے ہیں اور کیا عالمی تہذیبِ انسانی کبھی اس مقام پر پہنچے گی؟ ان سوالات کا جواب مشکل ہے۔ ہمیں ایک 'فرضیہ' سے مسئلہ کی وضاحت کا آغاز کرنا ہوگا۔ مذہب، آرٹ، عمرانیات یہاں تک کہ سائنس کو بھی 'فرضیوں' Hypothesis سے سفر شروع کرنا پڑتا ہے۔ یوں فرض کیجئے کہ ادب و شعر اور نقدِ فن کی ازلی و ابدی عالمگیر قدریں ہوتی ہیں۔ یہ عالمِ مطلق Absolute میں موجود ہیں۔ لیکن اس دنیائے آب و گِل میں حسن و صداقت کے اظہارات اضافی Relative طور پر ہوتے ہیں۔ اس لئے اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہم ہر شعبۂ تہذیب کا ایک آدرش رکھتے ہیں اور اسی آدرش کے حصول کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ انسانیت، روحانیت، مذہب، اخلاق، فنونِ لطیفہ، فلسفہ اور سائنس کی عالمگیر بنیادی قدریں بالقوی موجود ہوتی ہیں اور بالفعل ان کے نفاذ کے لئے انسانوں کے تہذیبی حلقے اپنی مقامی خصوصیات کے ساتھ شعوری یا غیر شعوری طور پر کوششیں کرتے ہیں لیکن ارتقائے حیات کا قانون تضاد کے ساتھ جدلیاتی رنگ میں عروج و زوال کی گردشوں سے گزرتا ہوا نافذ ہوتا ہے۔ ثقافت انسان کے ارتقاء کی قاش بھی یہی ہے۔ ادب و شعر کی تخلیق و تنقید کے ڈھنگ بھی یہی ہیں۔ آفاقی اور ازلی و ابدی اقدار تک رسائی حاصل کرنے کے لئے تہذیبِ انسانی حسن و صداقتِ مطلق کی طرف بڑھ رہی ہے۔ انسانی ذہن و دماغ اور روح و قلب اسی مطلق حسن و عظمت کی زیارت کے لئے رختِ سفر باندھ چکے ہیں۔ ہم جانیں یا نہ جانیں، ہم انھیں مطلق و مثالی اقدار کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتے ہیں اور اپنے اعمال میں انھیں کے نقوش مرتسم کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ لیکن ہم لغزش و افتاد کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہم سے بنیادی، آفاقی، مثالی و مطلق اقدار کی تفہیم میں کوتاہیاں اور غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ غرض کہ اقدارِ تہذیب و فن مستقل و مطلق ہیں۔ تخلیقِ فن و تنقیدِ فن کی اقدار میں اختلاف کے باوجود بنیادی استحکام پایا جاتا ہے اور ہمیں چاہیئے کہ اس عالمگیر استحکام کو اور مستحکم بنائیں۔ کیونکہ اسی میں امن و سلامتی ہے اور یہی حُسن و حق ہے۔

ادبی و تنقیدی قدروں کے تعین کے میدان میں سلامتی کا راستہ بنانا اور منزلِ حسن و مقامِ حق تک رسائی حاصل کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ میرے خیال میں اس مقصد کا حصول مندرجہ ذیل ذریعوں سے ممکن ہے۔

ادبیات اور دوسرے فنونِ لطیفہ کے وسیع مطالعہ سے معیاری اقدار تک رسائی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ مختلف فن کاروں، صنفوں، دوروں، دبستانوں، ملکوں، زبانوں کو مطالعہ کے احاطہ میں لانے سے وسعتِ نظر اور تیز تر نگاہ پیدا ہوتی ہے۔ نیز توازنِ خیال رونما ہوتا ہے۔ قدروں کے مختلف سانچے اور آہنگ سامنے آتے ہیں اور پائندہ معیار کے شعور میں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

غیر جانب داری اور تعصب سے اجتناب بے حد ضروری باتیں ہیں۔ جنبہ داری، نظریہ بازی، تعصباتِ معاشرہ و دبستانوں کے غلو اور تحریکوں کے تشدد سے ادب و شعر اور نقد و نظر کی اعلیٰ ترین اقدار کی تفہیم ناممکن ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ان سے فکر و نظر کے دامن کو بچانا چاہیئے۔

لیکن مہذب سماج میں موازنہ و مقابلہ کا عمل جاری

رہنا چاہیئے۔ آزاد اور ترقی پسند ملاکرسے ہوتے رہنے چاہئیں۔ ان سے جرأت اور بصیرت دونوں حاصل ہوتی ہیں۔ ادب و شعر کی دنیا میں بھی بار بار تعمیر جدید کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اس طرح پردے اٹھتے اور آنکھیں کھلتی ہیں۔ اُفق وسیع ہوتا ہے۔ مغالطے دور ہوتے ہیں اور خود فریبیاں رفع ہوتی ہیں۔ تعمیر نو کے باب میں اگر رجعت پرستی بُری ہے تو عجلت پسندی بھی مہلک ہے۔ کلاسیکی متانت، توازن، رکھ رکھاؤ اور مسلّمہ اقدار کا ہوش مندانہ احترام گمرہی سے بچاتا ہے اور رومانی تازہ کاری، نئے تجربوں کے لئے حوصلہ مندی، آزادانہ پرواز، ولولہ و شوق اور جذبۂ بت شکنی فسادگی، جمود اور اندھی حد بندیوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ مختصر یہ کہ کلاسیکی اور رومانی محاسن کا امتزاج اور ان کی کمزوریوں سے اجتناب کامیابی کی دلیلیں ہیں۔

خوش ذوقی، ذہانت اور لگن یہ تین نعمتیں تو ایسی ہیں کہ ان کے بغیر دنیائے تہذیب و تمدن کے کسی شعبہ میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ بے حد کم یاب ہوتے ہیں جو ان سہ گانہ نعمتوں سے بہرہ یاب کئے جاتے ہیں۔ معیاری اقدار کے تعین میں ہمیشہ پیغمبروں اور مجددوں کی دست گیری کام آتی ہے۔ صاحب دل، صاحب نظر، روشن ضمیر، بلند طبع اور کار فرما شخصیتیں شعر و ادب اور تنقید شعر و ادب کی معیاری و مثالی بلندیوں سے معاشرۂ انسانی کو آگاہ کرتی رہتی ہیں

ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

حاصلِ کلام یہ ہے کہ مثالی بلندیوں تک پہنچنے کے لئے ریاضت و مراقبہ کی ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن ایک شرارۂ الٰہی کی حاجت جب بھی باقی رہ جاتی ہے۔ ذہانت و ذوق، لگن اور شوق وہبی صلاحیتیں ہیں جو سفرِ ارتقا میں منزل بہ منزل رونما ہوتی رہتی ہیں، خلق کی رہنمائی کرتی اور تہذیب انسانی کی ہدایت کی موجب بنتی ہیں۔ تعیینِ اقدار، استحکام معیار، امن اور سلامتی کے لئے ان پر ایمان لانا ہر عصر میں لازمی ہوتا ہے۔

می شود پردۂ چشم پر کاہے گاہے
دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

نئی مطبوعات

آئینۂ غالب۔ غالبیات کے ماہروں کے ۲۲ مقالے۔ قیمت ۵ روپے

لبِ دریا کنارے (ناول) علی عباس حسینی قیمت ایک روپیہ

ہندوستانی ڈراما مقدمہ (جسے حکومت یو۔پی نے ۵۰۰ روپے کا انعام دیا) تین روپے ۷۵ پیسے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی - ۶

شمیم احمد

رپورتاژ کا موضوع

ہماری نثری اصنافِ ادب میں ایک نئی صنف داخل ہوئی ہے جسے رپورتاژ کہا جاتا ہے۔ رپورتاژ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کا براہِ راست انگریزی لفظ رپورٹ سے تعلق ہے۔ فرانسیسی میں اس کا تلفظ "رپوتاژ" اور رومن رسم الخط میں املا Reportage ہے۔ یہ لفظ بڑی حد تک رپورٹ کے معنوں میں ہی مستعمل ہوتا ہے۔ دیگر ترقی یافتہ اصناف کی طرح اس میں موضوع کی اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس کے فن سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی، کیونکہ اس صنف کو رپورٹ اور صحافت سے اس کا فن ہی علیحدہ کرتا ہے۔ اس کا موضوع اگرچہ (بڑی حد تک) صحافتی ہے، لیکن فن قطعی ادبی ہے۔ یہ صنف خارجی عناصر کی ترجمان ہوتے ہوئے بھی داخلی کیفیات اور تاثرات کی حامل ہوتی ہے۔ جہاں تک اس کے موضوع کا تعلق ہے، تو خارجی عناصر اس کی تشکیل کے لئے درکار ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں فن کا سوال آتا ہے تو اس کے مصنف کی داخلی کیفیات اور تاثرات کی رہنمائی ناگزیر ہو جاتی ہے، تبھی اس کے موضوع میں تنوع، ہمہ گیری اور نکھار اور فن میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں خارجیت اور داخلیت کا ایک حسین امتزاج ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے شیر و شکر ہوتی ہیں اور دونوں ہی اس صنف کے معیار کا تعین کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔

رپورتاژ صرف چشم دید واقعات پر لکھا جا سکتا ہے، سُنے سنائے پر نہیں۔ سُنے سنائے واقعات پر لکھی گئی کوئی تخلیق، افسانہ، ناول یا ڈراما تو ہو سکتی ہے، رپورتاژ نہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ داخلی کیفیات اپنی تمام تر شدت کے ساتھ اسی وقت پیدا کی جا سکتی ہیں، جبکہ مصنف نے واقعات کا بذاتِ خود موقعۂ واردات پر جا کر جائزہ لیا ہو یا وہ واقعات اس کی ذات پر ہی کبھی بیتے ہوں۔ سنے ہوئے واقعات نہ صرف مخصوص داخلی کیفیات کو مجروح ہی کر سکتے ہیں بلکہ واقعات کی صداقت کو بھی ٹھیس پہنچا سکتے ہیں۔ واقعات کی صداقت میں جس ذمہ داری کو آنکھیں پورا کر سکتی ہیں کان نہیں، بلکہ وہ اس میں رنگ آمیزی کر کے ایک طرح کی خیانت کے ہی مرتکب ہو سکتے ہیں۔ سُنے ہوئے واقعات کو ترتیب دینے سے تخلیق میں خارجی اثرات کا غلبہ ہو جانے کا خدشہ بھی لاحق رہتا ہے، جبکہ محض خارجیت ہی تو ایک اچھے رپورتاژ کی تعمیر و تشکیل کے لئے کافی نہیں ہے۔ جب تک اس میں ادیب کے داخلی جذبات اور تاثرات کی کارفرمائی نہ ہوگی وہ ایک اچھا رپورتاژ نہیں بن سکتا۔ جب ایک ادیب کسی واقعہ یا حادثہ کا بہ نفسِ نفیس مشاہدہ کرنے کے بعد رپورتاژ لکھتا ہے تو اس میں خارجی عناصر کی تمام تر بڑی صحیح، حقیقی اور دلآویز ہوتی ہیں اور خارجیت کی صداقت

ہی دراصل داخلیت کی محرک بن جاتی ہے۔ کیونکہ ایک چیز کا بغور مشاہدہ کئے بغیر اس کے بارے میں حقیقی جذبات اور تاثرات کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ ایک اچھے رپورتاژ کی تخلیق کے لئے واقعات کی صداقت اور اسی کے ساتھ جذبات و تاثرات کی گہرائی اور خلوص کا ہونا بہت ضروری ہے اور اس کے لئے آپ کا بچشمِ خود مشاہدہ کرنا ناگزیر ہے۔

رپورتاژ کا ماحول افسانہ اور ناول کے بہ مقابلہ زیادہ حقیقی اور صداقت آمیز ہوتا ہے کیونکہ افسانہ اور ناول کی حقیقت نگاری عام طور سے چند بندھے ٹکے مفروضوں کے پردے میں کی جاتی ہے، یعنی ایسے مفروضے جو انسانی زندگی، معاشرے اور ماحول سے مشابہ اور مماثل ہوں۔ ضروری نہیں کہ ان کا فی الواقع وجود بھی ہو، بہ الفاظ دیگر ایک افسانہ، ناول اور رپورتاژ میں سب سے بڑا اور بنیادی فرق واقعات کی صداقت اور غیر صداقت، وجودیت اور غیر وجودیت کا ہے۔ رپورتاژ کسی نمائندہ مفروضہ کی بجائے اسی واقعہ پر ٹک جائے گا جو فی الاصل کبھی وقوع پذیر بھی ہوا ہو، مثلاً ایک ناول میں چند منافع خوروں اور سماج دشمن عناصر کو کالا بازاری اور کسی مجرمانہ عمل کا مرتکب ہوتے دکھانا مقصود ہے تو مصنّف کسی ایسے واقعہ کی وقوع پذیری کا انتظار نہیں کرے گا بلکہ عام سماجی ماحول اور معاشرتی جرائم کے پیشِ نظر اس طرح کا کوئی پلاٹ سوچ کر اپنی کہانی یا ناول کا کینواس تیار کرے گا۔ یہ سب کچھ رپورتاژ نگار نہیں کر سکتا، اس کا قلم تو اسی وقت اٹھے گا جب فی الحقیقت اس طرح کا کوئی واقعہ یا حادثہ رونما ہوگا۔ اس مثال سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ افسانہ اور ناول نگار سماج کے حقائق کا پس منظر دکھاتا اور بالواسطہ طور پر اپنی بات قاری تک پہنچاتا ہے، جبکہ رپورتاژ لکھنے والا سماجی حقائق کا پیش منظر دکھاتا اور براہِ راست اپنے مدعا کا اظہار کرتا ہے۔ وجودیت اور غیر وجودیت کی یہ فضا، افسانہ، ناول اور رپورتاژ کی کردار نگاری کے فرق کو بھی واضح کرتی ہے۔ افسانہ اور ناول کے کردار وہ فرضی افراد ہوتے ہیں جو عام انسانی خوبیوں کے حامل ہونے کی وجہ سے ایک مخصوص اور عصری معاشرہ کی اجتماعی ترجمانی کا فرض انجام دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک رپورتاژ کے کردار عام انسانی خوبیوں اور برائیوں کے نمائندہ افراد کی بجائے صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا واقعی وجود بھی ہو۔ اس طور پر ناول نگار اور افسانہ نویس کے مقابلہ میں رپورتاژ کا مصنّف اپنے کرداروں کے نظریات، حرکات و سکنات، احساسات اور شخصیت کے ایک ایک پہلو سے بخوبی واقف ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ ان کو بذاتِ خود جانتا ہے اور اکثر اوقات وہ اس کے دوست، عزیز یا قریبی حلقے سے تعلق رکھنے والے افراد ہوتے ہیں'۔ رپورتاژ میں مصنّف خود ایک مخصوص کردار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے اور اکثر حالتوں میں تو وہ مرکزی کردار بھی بن جاتا ہے جبکہ افسانے اور ناول کا مصنّف اپنی شخصیت اور اپنے خیالات و نظریات' کسی دوسرے کردار کے پردے میں پوشیدہ رکھتا ہے اور اس کردار کی زبان سے ہی بولتا ہے۔ رپورتاژ کا مصنّف نہ صرف خود چلتا پھرتا ہے بلکہ اپنے منہ میں زبان بھی رکھتا ہے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ قاری رپورتاژ نگار کی شخصیت سے بہت جلد اور بہ آسانی پوری طرح ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ افسانہ اور ناول نگار کی شخصیت سے ہم آہنگ ہونے میں سوچنا پڑتا ہے اور وقت بھی لگتا ہے۔

سماجی اور معاشرتی تصوّرات سے قطع نظر کر کے اگر ہم افسانہ اور ناول کے وسیع کینواس کو دیکھیں تو اس میں قطعی فرضی بے بنیاد، ناقابلِ یقین، غیر ممکن، قطعی تخیلی اور یہاں تک کہ Fantastic قصوں کہانیوں اور نہ صرف بالکل فرضی بلکہ غیر انسانی کرداروں کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ رپورتاژ میں ان سب کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

ایک اچھے رپورتاژ کے لئے ہر قسم کے اوقات میں سے کسی ایک یا چند اہم واقعات کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ یہاں افسانہ اور رپورتاژ تقریباً ایک دوسرے کے نزدیک ہو جاتے ہیں، کیونکہ انسانی زندگی واقعات و حادثات کا مجموعہ ہے اور

اس مجموعے میں سے اہم واقعات کی ہی افسانہ اور رپورتاژ کے لئے گنجائش نکل پاتی ہے، کیونکہ یہ دونوں اصناف خود نوشت سوانح نگاری اور ناول کی طرح کسی تاریخی تسلسل سے بے نیاز ہوتی ہیں۔

اس لئے رپورتاژ میں افسانہ اور یک بابی ڈرامے کی طرح وحدتِ زماں کی قید ضروری ہوتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ رپورتاژ جس واقعہ پر لکھا جائے وہ مخصوص وقت میں ہی وقوع پذیر ہوا ہو۔ اس کے اوقات میں زیادہ لمبا عرصہ درکار نہیں ہوتا۔ اگر ایک جنگ کو رپورتاژ کا موضوع بنایا جائے تو اس میں وحدتِ زماں برقرار رہے گی کیونکہ جنگ ایک مخصوص وقت کی پیداوار ہو گی، ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ ایک جھڑپ آج ہو گئی اور دوسری آج سے ٹھیک چار سال بعد اگر یہ صورت بھی ہوئی تو آج کی اور چار سال بعد کی جنگیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے دو مختلف جنگیں ہوں گی اور ان دونوں پر علیحدہ علیحدہ رپورتاژ لکھے جائیں گے۔ اسی طرح کسی مخصوص نوعیت کا فساد کوئی کانفرنس یا اجلاس اپنے جلو میں ایک مخصوص وحدتِ زماں رکھتے ہیں۔ ان پر لکھے گئے رپورتاژ یقینی طور پر اس شرط کو پورا کریں گے۔ اسی کے ساتھ ایک مخصوص واقعہ کسی مخصوص ماحول میں اور مخصوص مقام پر ہی نمودار ہوتا ہے اس لئے یہاں یک بابی ڈرامے کی طرح وحدتِ مکاں کا بھی سوال آتا ہے، مگر رپورتاژ کے لئے یہ شرط ضروری نہیں ہے، کیونکہ آج کے ترقی یافتہ اور سائنسی دور میں وحدتِ موضوع مختلف مقامات پر بھی برقرار رہ سکتی ہے، مثلاً ایک ملک کا ایک تہذیبی اور ثقافتی وفد کسی دوسرے ملک میں کسی خاص مقصد سے جاتا ہے۔ اس خاص مقصد کو واقعہ سمجھ کر کوئی ادیب اسے اپنے رپورتاژ کا موضوع بنانا چاہتا ہے میزبان ملک کی تہذیبی زندگی کو رپورتاژ کا مرکزی خیال بناتا ہے اور اپنے ملک سے روانگی اور دورانِ سفر کا حال بھی بیان کرتا ہے تو اس طرح موضوع کی وحدت کو برقرار رہتی ہے لیکن وحدتِ مکان قائم نہیں رہ پاتی۔ اس شرط کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے ہم اس تخلیق کو رپورتاژ کے دائرے سے خارج نہیں کر سکتے۔ وحدتِ مکاں برقرار رہے یا نہ رہے البتہ ایک رپورتاژ کے لئے وحدتِ موضوع ضرور ہونا چاہیئے — بہ الفاظ دیگر اسے موضوع کی مرکزیت کہہ سکتے ہیں، کیونکہ رپورتاژ افسانے کی طرح کسی ایک یا چند منتخبہ واقعات پر لکھا جاتا ہے، جس میں ناول کا سا پھیلاؤ نہیں ہوتا، تاریخ کا سا تسلسل نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان مخصوص واقعات کو پیش کرتے وقت کچھ معمولی اور چھوٹے واقعات کا تذکرہ ضرور ضمناً آجاتا ہے۔ موضوع کی یہ مرکزیت اور غیر مرکزیت ہی ہے جو رپورتاژ اور سفرنامہ کے فرق کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ سفرنامہ کا کینوس ناول اور تاریخ کی طرح وسیع اور طویل ہوتا ہے۔ سفرنامے کا کوئی مخصوص موضوع نہیں ہوتا بلکہ سفر کے دوران جو بھی منظر، جو بھی کیفیت یا جو بھی واردات یا واقعہ گزر رہا ہے، سفرنامہ لکھنے والا اُسے قلمبند کرتا جاتا ہے۔ سفرنامے میں بغیر کسی موضوعاتی مرکزیت کے شہروں کا جغرافیہ سمجھانے، مناظر قدرت کی ایک ایک تفصیل گنوانے اور تہذیب و تمدن اور انسانوں کے تمام اہم اور غیر اہم خصوصیات پر روشنی ڈالنے پہ ہی سارا زور صرف کر دیا جاتا ہے، جس کے سبب سفرنامہ محض خارجی عناصر کا ایک مرقع بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک رپورتاژ (اگر وہ سفر پر ہی ہے) میں مقامات کے محل وقوع اور مناظر قدرت کے بیان کا عنصر محض ضمنی طور پر آتا ہے، اس میں سب سے زیادہ زور صرف اس مقصد پر ہی دیا جاتا ہے جس کے لئے یہ سفر کیا گیا ہے۔ رپورتاژ کے مصنف کی شخصیت چونکہ ہر جگہ موجود رہتی ہے اس لئے اس کے ذاتی تاثرات اور احساسات کا زیادہ غلبہ ہونے کی وجہ سے رپورتاژ خارجی اور داخلی کیفیات کا خوب صورت مرقع بن جاتا ہے۔ افسانہ میں چھوٹے اور غیر اہم واقعات، جو محض جزئیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ افسانہ کو نقطۂ عروج تک کامیابی کے ساتھ لے جانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں اسی طرح رپورتاژ میں بھی، اسے کامیابی کے ساتھ آگے بڑھانے کے لئے ٹاک جھانک کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور یہ جزئیات اصل موضوع کو دباتی نہیں بلکہ اس کو سہارا اور تاثر ہی بخشتی ہیں۔ موضوع کی مرکزیت برقرار رکھتے ہوئے دوسری

جزئیات کا محض ضمنی بیان رپورتاژ کی خوبی ہے جس میں کسی تاریخی تسلسل وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ تاریخی تسلسل کے نہ ہونے کی وجہ سے فطری طور پر رپورتاژ میں اختصار پیدا ہو جاتا ہے، جسے بعض اوقات رپورتاژ کے لئے ایک اہم شرط سمجھ لیا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ رپورتاژ کے لئے اختصار کی شرط ضروری نہیں، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ رپورتاژ جس مخصوص واقعہ پہ لکھا جا رہا ہو، اس میں کافی وسعت ہو، اس لئے اس کا بیان طویل بھی ہو سکتا ہے۔ فسانہ میں جس طرح طویل مختصر افسانہ کا چلن ہے اسی طرح رپورتاژ بھی طویل مختصر ہو سکتا ہے۔[1]

رپورتاژ کا موضوع سماجی اور اجتماعی مسائل سے متعلق ہونا ضروری ہے وہ حادثات، واقعات اور حالات جو پورے سماج پہ اثر انداز ہو سکتے ہوں، رپورتاژ کا موضوع بننے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان اجتماعی مسائل پہ رپورتاژ لکھنے والے کا انفرادی نقطۂ نظر کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ اس کی ذات تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیئے بلکہ اسے سماجی اور اجتماعی ورثہ ہونا چاہیئے۔ یہاں تک کہ جب ادیب خود پہ گزر رہے ہوئے واقعات کو رپورتاژ کا موضوع بناتا ہے تو اس کے اثرات بھی اجتماعی زندگی پر پڑتے ہیں اور وہ اجتماعی زندگی کے ہی واقعات معلوم ہونے لگتے ہیں۔

"چاہے وہ منظم تحریک کی صورت کی جگہ انفرادی شعور کا کارنامہ ہو جو پھیلی ہوئی شکل میں عمومیت کا درجہ رکھتا ہو یا کسی مجمع میں ایسے مسائل یا ادبی نکات پر گفتگو ہوتی ہو جس کے سننے اور سمجھنے کے لئے کافی لوگ جمع ہو گئے ہوں اور دیکھنے والے نے فضا کی کش مکش کا مطالعہ ایک خاص نظر سے کیا ہو تب ہی رپورتاژ کامیابی کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے۔"[2]

اردو میں اجتماعی شعور کے حامل رپورتاژوں کے بڑے اچھے نمونے موجود ہیں۔ کرشن چندر کے دونوں رپورتاژ 'پودے'، 'صبح ہوتی ہے'، ابراہیم جلیس کا 'دو ملک ایک کہانی' اور فکر تونسوی کا 'چھٹا دریا' مثال کے طور پہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان سب میں اجتماعی مسائل کی پیش کش کی گئی ہے۔ اس کے برعکس جولیس فیوچک کا مشہور رپورتاژ "پھانسی کے سائے میں" Report from Gallows ابراہیم جلیس کا 'جیل کے دن جیل کی راتیں' اور الگزنڈر وائز برگ کا 'ملزم' Accused ہر سہ مصنفین پر جیل میں گزر رہے ہوئے واقعات کی داستان سناتے ہیں لیکن ان میں انفرادیت کے دریچے سے جو عوامی مسائل اور سماجی و اجتماعی مصائب جھانک رہے ہیں، وہ اپنی جگہ خود اس قدر دل سوز اور اثر انگیز ہیں کہ ان کا پڑھنے والا انھیں اپنا ہی دکھڑا سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہر اچھے اور کامیاب رپورتاژ کی یہی خوبی ہونی چاہیئے۔

رپورتاژ چونکہ، اس واقعہ پر لکھا جاتا ہے، جو لکھنے والے کی نظروں سے گزر رہا ہے، اس لئے اس کا تعلق زمانۂ حال سے ہوتا ہے۔ ماضی کے واقعات یا تاریخی کتابوں سے ماخوذ داستانوں کو رپورتاژ کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا۔

صنفِ رپورتاژ ایک ہمہ گیر اور جامع صنف ہے۔ اس کے موضوعات کا دائرہ محدود نہیں ہے، جس قدر زندگی وسیع اور جامع ہے اسی قدر رپورتاژ کے موضوعات کا دامن بھی پھیلا ہوا ہے۔ بہرکیف رپورتاژ کے موضوعات براہ راست انسانی زندگی میں ہونے والے مختلف نوعیت کے واقعات اور انسان کی ہمہ اقسام کی سرگرمیوں سے ہی مستعار لئے جاتے ہیں۔

رپورتاژ جن موضوعات پر لکھے جاتے رہے ہیں، ان میں سے اکثر کسی نہ کسی ہنگامی نوعیت کے حامل رہے ہیں۔ چناں چہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اکثر رپورتاژ کا تاثر وقتی ہوتا ہے۔ چند اُن خاص اور غیر معمولی موضوعات کی نشان دہی کرنا بے جا نہ ہوگی جو عام طور پہ رپورتاژ کے مقصد کے لئے

---

[1] چھٹا دریا، پودے، صبح ہوتی ہے، خزاں کے پھول، جیل کے دن جیل کی راتیں وغیرہ مختصر نہیں بلکہ خاصے طویل رپورتاژ ہیں۔

[2] ڈاکٹر اعجاز حسین (اردو ادب آزادی کے بعد) ص ۲۸۰

استعمال کئے جاتے ہیں، یا اب تک جو اس مقصد کے لئے استعمال کئے جاتے رہے ہیں۔

۱۔ جنگ

جنگ کے مختلف نوعیت کے واقعات، اس کی غیر معمولی کیفیات اور انسانی زندگی پر اس کے دور رس اثرات کو رپورتاژ کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ لکھنے والے کو محاذِ جنگ پر موجود رہ کر سارے واقعات کا بغور اور دردمندی کے ساتھ مشاہدہ کرنا ضروری ہے۔ ایک اچھا رپورتاژ نگار محض جنگ کی تصاویر ہی پیش نہیں کرے گا بلکہ اس کی ہولناکی، تخریبی عمل، پُرسکون اور پُرامن زندگی کا خاتمہ، انسانی جانوں کی بے دردہلاکت، ایثار و قربانی کی بے مثل تصاویر، تباہی و بربادی کے عبرت ناک مناظر، فوجوں کے طور طریق، ان کا غیر یقینی مستقبل، طرزِ رہائش جفاکشی، جدوجہد، وطن کے لئے مرمٹنے کا بے لوث جذبہ، فوجی مورچوں کا محلِ وقوع، غرض ایک ایک قابلِ ذکر واقعہ کو وہ انتہائی جذبات انگیز اور پُراثر انداز میں لکھے گا اور اس کا دل انسانی ہمدردی اور مستقبل کی خوش آیند زندگی سے لبریز ہوگا۔ علاوہ اس کے جنگ کے اثرات جو عام زندگی اور معاشرہ پر مرتب ہوئے ہیں۔ ان کو بھی رپورتاژ کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ جنگ نے کس طور پر ضروریاتِ زندگی کی اشیاء اور اقتصادی ڈھانچہ کو متاثر کیا ہے، جس کی وجہ سے عام انسانی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ غریبی اور مفلسی کے ناگ سر اُٹھانے لگے ہیں، ان پر قابو پانے کے لئے کیا کیا طریقے بروئے کار لائے جا رہے ہیں۔ جنگ سے فائدہ اُٹھا کر کس طرح چند افراد کالا بازاری اور منافع خوری کی غیر اخلاقی و مجرمانہ حرکات میں ملوث ہیں۔ ان سب پہلوؤں پر کڑی نظر رکھنا الیس ضروری ہے۔ تبھی ایک رپورتاژ کامیابی کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے۔ دنیا کی بیشتر زبانوں میں جنگ کے موضوع پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان پر رپورتاژ کی صنعت کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ انھیں ناول یا سفرنامہ وغیرہ کا نام دے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان میں جو خصوصیات ہیں ان کی بنا پر انھیں رپورتاژ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مشہور جرمن صحافی لیوپولڈ ویس جو بعد میں مسلمان ہوئے اور محمد اسد نام اختیار کیا۔ انھوں نے اپنی انگریزی کتاب The Road to Mecca کے ایک طویل باب میں جنگ کے حالات لکھے ہیں۔ وہ مسلمان ہونے کے بعد سنوسوی تحریک کا جائزہ لینے کے لئے محاذِ جنگ پر جاتے ہیں بے شمار تکالیف اور مصائب کا سامنا کرتے ہیں لیکن کامل طور پر جنگ کی نوعیت، اس کے محلِ وقوع کو سمجھتے ہیں۔ ان کی یہ کتاب اگرچہ ایک سفرنامہ ہے لیکن اس کا یہ باب جنگ کے موضوع پر ایک بہترین اور مکمل رپورتاژ ہے۔

فرانسیسی ادیب دیوآمیل Dehumal b. 1894 نے ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگِ عظیم کے بعد دو کتابیں لکھیں جن میں زخمیوں کے حالات، جن کا اس نے جنگ کے دوران ڈاکٹر کی حیثیت سے خود مشاہدہ کیا تھا، بڑے پُراثر انداز میں بیان کئے۔ شہیدوں کی زندگی Lavie de Marty اور تہذیب La Civilization. جنگ کے خونی مناظر کے متعلق فرانسیسی زبان میں بہترین کتابیں خیال کی جاتی ہیں ...... جب وہ ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے جو زخمی ہوئے یا جنگ میں کام آئے تو اس ضمن میں وہ تہذیب کے مستقبل کی نسبت بھی اشارے کر جاتا ہے۔ اس کا دل انسانی ہمدردی سے بھرپور ہے[۱] "ان خصوصیات کی موجودگی میں کوئی وجہ نہیں کہ ان کو رپورتاژ نہ سمجھا جائے۔ بہرکیف جنگ کی ہولناکیوں کے مختلف واقعات ایک رپورتاژ کا موضوع بن سکتے ہیں اور بڑی خوبی سے انھیں پیش کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ بلوے اور فسادات

جنگ کے علاوہ مقامی نوعیت کے لڑائی جھگڑے اور ہنگامی واقعات کو بھی رپورتاژ کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔

---

[۱] ڈاکٹر یوسف حسین خاں (فرانسیسی ادب ص ۵۲۸)

خصوصیت سے جب تقسیم کے نتیجے میں ہندوستان اور پاکستان دو علیحدہ ریاستیں وجود میں آئیں تو دونوں جگہ فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ بے اندازہ جانی اور مالی نقصان ہوا۔ ظلم وستم، بربریت اور بہیمیت کے وہ وہ نظارے دیکھنے میں آئے جن کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ہی تبادلۂ آبادی اور مہاجرین کی آبادکاری جیسے سنگین مسائل سے دونوں ملکوں کو سامنا کرنا پڑا۔ ان پر جہاں دونوں ملکوں کے ادیبوں اور شاعروں نے بے شمار افسانے ناول اور نظمیں لکھیں وہاں ایک خاصی تعداد میں اچھے رپورتاژ بھی لکھے گئے ہیں۔ فکر تونسوی کا 'چھٹا دریا'، لاہور کے فرقہ وارانہ فسادات اور ریلیف کیمپوں کی کس مپرسی کی سچی تصاویر پیش کرتا ہے۔ جمنا داس اختر نے بھی لاہور کے فسادات پر ایک رپورتاژ 'اور خدا دیکھتا رہا' لکھا۔ شاہد احمد دہلوی نے دہلی کے فسادات پر 'دلّی کی بپتا' اور تاجور سامری نے لائل پور کے فسادات اور تبادلۂ آبادی کے موضوع پر 'جب بندھن ٹوٹے' لکھے۔ ان کے علاوہ کسی بھی معمولی یا غیر معمولی نوعیت کے فسادات، بلووں، آپسی جھگڑوں، آزادی کی جدوجہد، باغیانہ سرگرمیوں، سیاسی تحریکوں اقتصادی اور معاشی بحران کی وجہ سے پھیلی ہوئی افراتفری اور ان کے لئے عوامی لڑائیوں وغیرہ پر رپورتاژ لکھے جاسکتے ہیں۔

۳۔ حادثات

ان اجتماعی نوعیت کے مسائل کے علاوہ چند اہم اور غیر معمولی انفرادی حادثات پر بھی رپورتاژ لکھے جاسکتے ہیں۔ کسی بھیانک ایکسی ڈنٹ جس کے نتیجے میں کافی جانیں ضائع ہو گئی ہوں یا مالی نقصان ہوا ہو۔ کسی مقبول و معروف شخصیت کی موت اور اس کے نتیجے میں ساری قوم ماتم گسار ہو گئی ہو، اس کی موت پر لوگوں کی آہ وزاری اور ان کی اضطراری کیفیات کو رپورتاژ میں بڑی خوبی سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ مقصد یہ کہ کسی بھی نوعیت کا حادثہ رپورتاژ کا موضوع بن سکتا ہے۔ مثلاً مجاز کی موت جن افسوسناک حالات میں ہوئی اس پر نذیر ہ جمال نے 'ایک تاثر ۵۔ دسمبر کی ایک رات' سپردِ قلم کیا۔

۴۔ قحط

بنگال کے قحط پر افسانے اور نظمیں وغیرہ لکھی گئی ہیں۔ قحط اور دوسرے حادثات کی طرح کئی مسائل لے کر آتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ لوگ بھوک کی شدت سے تڑپ تڑپ کر جان دے دیتے ہیں، بلکہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے مردہ عمل کر گزرتے ہیں جو اخلاقی اعتبار سے مذموم ہوتا ہے۔ مرد اپنی عورتوں اور بچوں کا سودا کرنے اور عورتیں اپنی عصمت و آبرو کی بولی لگانے میں بھی دریغ نہیں کرتیں، دوسری طرف سماج دشمن عناصر ایسے وقتوں میں نہ صرف کالا بازاری اور منافع خوری کی مجرمانہ حرکات کرتے ہیں، بلکہ مجبوروں اور لاچاروں کی کمزوری اور بدنصیبی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اخلاق سوز اعمال کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔ یہ باتیں کسی خیالی دنیا کی نہیں ہیں، بلکہ بنگال کے تاریخی قحط کے سبب یہ سب باتیں وہاں کے باشندوں کو پیش آئی تھیں۔ چنانچہ ان واقعات پر افسانے اور نظمیں وغیرہ لکھی گئیں۔ اردو میں تو نہیں البتہ ہندی[۱] میں بنگال کے قحط پر کچھ رپورتاژ بھی لکھے گئے ہیں۔

۵۔ ادبی و تہذیبی جلسے اور تقاریب

بیسویں صدی کی اجتماعی زندگی نے عوامی اداروں کو جنم دیا۔ ان میں مشترکہ اور اجتماعی نظریات اور مسائل کو پیش کیا جاتا اور ان پر غور کیا جاتا ہے۔ ادبی جلسے، کونشن، کانفرنسیں یا تہذیبی اور کلچرل پروگرام اور شو، اس اجتماعی نظریے کی دین ہیں۔ ان سب کے علاوہ گھریلو تقریبیں، شادی بیاہ، سالگرہ اور قومی تقریبیں جشن، مثلاً یوم آزادی، یوم جمہوریہ وغیرہ کو رپورتاژ کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ تہذیبی اور ادبی جلسوں کانفرنسوں اور تقاریب پر اردو میں سب سے زیادہ رپورتاژ لکھے گئے ہیں مثلاً انجمن ترقی پسند مصنفین کی مختلف کانفرنسوں پر سجاد ظہیر نے 'یادیں' کرشن چندر نے 'پودے' 'صبح ہوتی ہے' عادل رشید

---

[۱] بحوالہ ڈاکٹر گلاب رائے (کاویہ کے روپ)، ہیمچندر یمن اور رپورتاژ نگار ملک (ساہتیہ وویچن ص ۳۱۰)، اجیت کمار (ہندی ساہتیہ کوش ص ۶۵۰)

نے 'خزاں کے پھول'، عصمت چغتائی نے 'بمبئی سے بھوپال تک'، عبداللہ ملک نے 'مستقبل ہمارا ہے' اور صفیہ اختر نے 'ایک ہنگامہ' وغیرہ چند اچھے رپورتاژ لکھے۔ اسی طرح امن کانفرنسوں پر سجاد ظہیر، سری نواس لاہوٹی، رضیہ سجاد ظہیر، پرکاش پنڈت اور آفاق احمد وغیرہ نے چند رپورتاژ لکھے۔ کل ہندیا صوبائی نوعیت کے مشاعروں پر تو ہر وقت بے شمار رپورتاژ لکھے جاتے رہے ہیں اور اب بھی لکھے جاتے ہیں۔ اردو میں ان موضوعات پر کثرت سے رپورتاژ لکھے جانے کی وجہ سے اکثر رپورتاژ کی صنف کو انھیں تک مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ رپورتاژ زندگی کے اور بھی بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ رپورتاژ کو ادبی جلسوں، کانفرنسوں یا مشاعروں کی روئدادوں تک ہی مخصوص کر دینے سے اس صنف کے مفہوم میں محدودیت پیدا ہو جانے کا خدشہ ہے۔ اس لئے اس بات کو سمجھ لینا چاہیئے کہ رپورتاژ کسی ادبی جلسہ یا مشاعرہ کی افسانوی زبان میں روئداد پیش کر دینے کو نہیں کہتے بلکہ جس طرح افسانہ اور ناول میں زندگی کے بے شمار واقعات کو موضوع بنایا جاتا ہے اسی طرح زندگی کا کوئی بھی سچا اور غیر معمولی واقعہ رپورتاژ کا موضوع بن سکتا ہے۔

۶۔ سیر و سیاحت

دوران سفر کا بیان دراصل سفرنامے سے مخصوص ہوتا ہے لیکن موجودہ دور کے ادیبوں نے اس 'جدید سفرنامے' میں ادبیت، افسانویت، گہرے جذبات اور تاثرات، مسائل پر صحت مندانہ نقطۂ نظر اور افادی گرفت اور موضوع میں وحدت داخل کر کے اسے رپورتاژ کا ہی درجہ دے دیا ہے۔ سفر کے دوران چھوٹے چھوٹے واقعات، مختلف مقامات کی تہذیبی اور سماجی سرگرمیوں اور مسافر کی مختلف النوع تفریحات اور مشغولیات کا ادبی موثر اور رنگین اظہار رپورتاژ کا موضوع بننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ شرط بس اتنی ہے کہ موضوع کی اکائی کا پورا خیال رکھا جائے ورنہ سفرنامہ اور رپورتاژ میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا۔ موضوع کی اکائی اسی وقت برقرار رکھی جا سکتی ہے، جبکہ سفر کے مقصد اور غرض و غایت کو مرکزی حیثیت دی جائے اور دیگر ضمنی مصروفیات اور مشغولیات کو ثانوی، کیونکہ موضوع کی اکائی ہی دراصل سفرنامہ اور رپورتاژ کے راستے علحدہ علحدہ کرتی ہے۔ اردو میں سیر و سیاحت کے موضوع پر 'سپید اور سرخ ستارے کے درمیان' (ابراہیم جلیس)، 'سرخ زمین اور پانچ ستارے' (خواجہ احمد عباس)، 'الف لیلیٰ کے دیس میں' (ظفر پیامی)، 'سفر ایران کے تاثرات' (خواجہ احمد فاروق)، 'یادوں کے چمن' (کلیم اللہ)، 'ایک نامکمل سفر' (سلطانہ حیات)، 'کلانگ اور کنول' (اصغر بٹ)، 'پاکستان میں چند روز' (ظ انصاری)، 'کتابوں کی تلاش میں' (ڈاکٹر گیان چند)، 'تو ابھی رہگذر میں ہے' (قدرت اللہ شہاب)، اور 'ہیگ سے آگے' (کنول نین پرواز)، 'یہ لکھنو ہے' (سالک لکھنوی)، 'کچھ دن المانیہ میں' (صالحہ عابد حسین)، 'پرسپل لندن' (محمود نظامی)، 'سیوٹا سے لندن تک' (صمد)، 'یادوں کی رہگذر' (محمود عزیز)، 'میرا ایران کا سفر' (ڈاکٹر تاراچند، انگریزی سے ترجمہ) اور 'دہلی سے جینوا تک' (ودیا شنکر، انگریزی سے ترجمہ) چند اچھے مختصر رپورتاژ ہیں، جو وقتاً فوقتاً اردو کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔

۷۔ متفرقات

ان تمام اہم اور غیر معمولی واقعات کے علاوہ بھی بیسیوں چھوٹے چھوٹے واقعات پر رپورتاژ لکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً مذہبی تہواروں اور ان کی تقاریب، میلوں ٹھیلوں، نمائش، پکنک، کھیل تماشوں، چھوٹی چھوٹی ادبی اور شعر و شاعری کی محفلوں، گلی کوچوں اور سڑکوں پر آئے دن پیش آنے والے مختلف حادثات وغیرہ، بہرکیف زندگی کے کسی بھی واقعہ کو رپورتاژ کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن ان سب میں کچھ ایسا انداز اختیار کیا جائے اور کچھ ایسا نقطۂ نظر

پیش کیا جائے جو زندگی کے محدود یا انفرادی دائرے سے نکل کر اجتماعی اور سماجی زندگی پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو اور اس سے کوئی صحت مند اور افادی مقصد بھی نکلتا ہو۔

الغرض رپورتاژ کے موضوعات کا دائرہ دوسری اصنافِ ادب کی طرح کافی وسیع اور متنوع ہے اور یہ تمام موضوعات انسانی زندگی کے بیچ ہی سے منتخب کئے جاتے ہیں جن کی بنیاد صداقت اور صرف صداقت پر ہوتی ہے۔ ان کے افراد حقیقی ہوتے ہیں اور خود مصنف ان میں سے ایک اہم فرد ہوتا ہے۔

پرمود یکتا

نقش برآب

مجھ سے یہ گردشِ ایام کے سایوں نے کہا
چھین لیں گے تری آنکھوں سے ترے خواب حسیں
چھین لیں گے ترا رنگینیٔ فردا کا یقیں
مجھ سے یہ کثرتِ اوہام کے سایوں نے کہا

مجھ سے مجموعۂ آلام کے سایوں نے کہا
تری تقدیر میں تسکینِ دل و جاں ہی نہیں
ہو نہ پائے گا تری صبح کا دامن رنگیں
مجھ سے یہ گھرتی ہوئی شام کے سایوں نے کہا

میں نے گھرتے ہوئے سایوں کو دیا ہنس کے جواب
عہدِ امروز سہی تیرہ و تاریک مگر
عہدِ فردا بھی تاریک نہیں ہو سکتا
ناامیدی کے یہ سائے ہیں فقط نقش برآب
آج انسان بھٹکتا تو ہے صحرا میں مگر
کل یہی زیست کی راہوں میں نہیں کھو سکتا

محمد عباس طالب صفوی

غالب کی صد سالہ برسی

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا دیوانِ غالب کو وید مقدس کی
طرح الہامی تسلیم کرنا یقیناً کفر ہے لیکن بہرنہج ڈاکٹر بجنوری مرحوم
کے اس قول پر تو ایمان لانا ہی پڑتا ہے کہ ان چند اوراق میں کیا
ہے جو موجود نہیں ہے اور ایشیا کی دوسری زبانیں نہ سہی
کم ازکم اردو اب تک غالب کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہے۔
اردو کے فدائیوں نے ۱۹۶۹ء سے کم و بیش دس برس
قبل اقلیم اردو کے اس شہنشاہ کی وفات کی صد سالہ برسی
منانے کا عزم کیا اور اس میں کلام نہیں کہ شروع میں جس
جوش و خروش سے کام لیا گیا اور ابتداء میں رسالہ اردوئے معلیٰ
دہلی وغیرہ نے جو غالب نمبر شائع کئے وہ ع اول ما آخر ہر منتہی
کے مصداق تھے لیکن اب جب کہ فروری ۱۹۶۹ء میں چار
برس سے بھی کم رہ گئے ہیں وہ جمود طاری ہو گیا ہے کہ خدشہ
ہوتا ہے کہ کہیں ہم ع آخر ما جیبِ تمنا ہتی کے مصداق
نہ بن جائیں۔ یعنی غالب کی صد سالہ برسی کا یہ مفہوم نہ ہو جائے
کہ کوئی ایسا بڑا آدمی اس کا افتتاح کرے جو شارحینِ غالب
کی مدد کے بعد بھی کلامِ غالب کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ کوئی فلم
ایکٹر غالب کی غزل گا کر شین قاف سے واقف نہ ہونے کی وجہ
سے غالب کی روح کو تڑپائے اور چند پرانے مقالے لباسِ نو
میں پیش کرنے کے بعد اس تماشے کو ختم کر دیا جائے۔
میں ہندوستان کی اس بے حسی سے واقف ہوں کہ آخرت

کے ثواب کی امید اور دنیا کے فائدے کے یقین میں مذہبی اور
سیاسی جلسوں میں پانی کی طرح روپیہ بہانے والے ہندوستانی
کسی ٹھوس ادبی کام کے لئے ایک پیسہ دینا بھی پسند نہیں
کرتے لیکن خوش قسمتی سے میرا اور غالب پر ریسرچ کرنے کے
لئے امریکہ سے علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک سابق طالب علم
نے معتد بہ رقم بھیجی ہے اور غالب کی صد سالہ برسی شایانِ شان
طور سے منانے کے لئے غالب اکادمی کے اراکین کو فقیروں کا
بھیس بدل کر تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔
ہاں ضرورت اس امر کی ہے کہ اس روپے کو بے فائدہ مشاعروں
اور بے کار جلسوں میں صرف کرنے کے بجائے غالب کے دیوان
کا انگریزی میں ترجمہ کرنے اور غالبیات کی ان کتابوں کی
دوبارہ اشاعت میں صرف کیا جائے جو کلاسکس کے درجے میں شامل
ہیں لیکن جو اب جاسوسی اور رومانی ناولوں کے سیلاب میں کچھ
اس طرح بہہ گئی ہیں کہ لوگوں کو یادگارِ غالب، شرحِ طباطبائی،
شرحِ شوکت میرٹھی کا نام بھی یاد نہیں رہا ہے۔
غالب کے غیر مطبوعہ کلام کے متعلق بھی ریسرچ لازمی ہے۔
اس سلسلے میں سب سے پہلے اس مجموعۂ کلام کے متعلق فیصلہ کرنا
چاہیئے جو مولٰنا عبدالباری آسی نے شرحِ کلامِ غالب کے نام
سے شائع کیا تھا اور جسے جناب نالق اپنا نتیجۂ فکر فرماتے ہیں اور
اگرچہ وہ پاکستانی ادیب بن چکے ہیں تاہم مجھے یقین ہے کہ اس

جولائی ۱۹۶۵ء

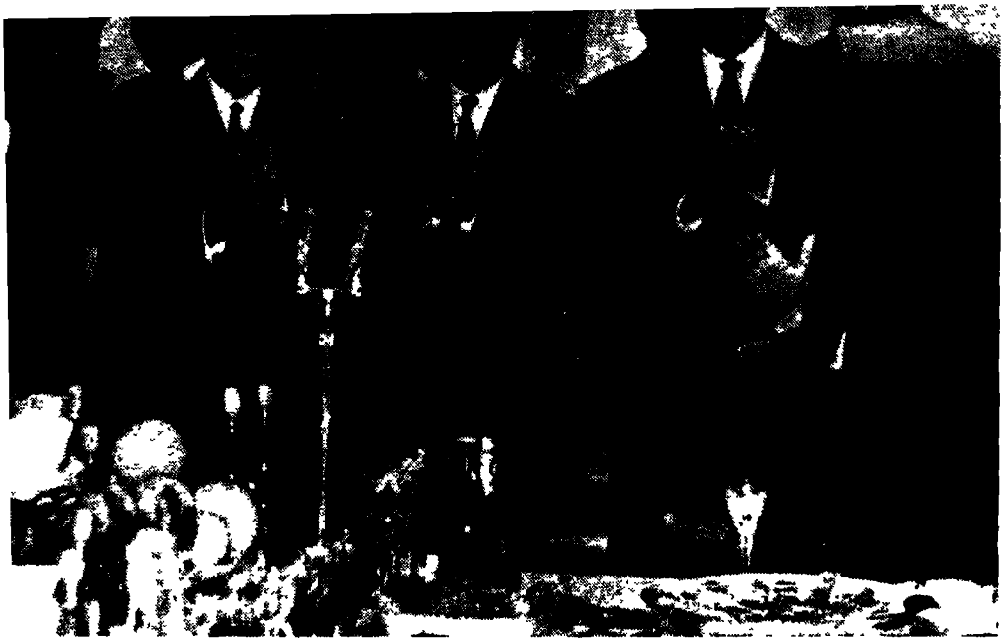
اہم اور بڑی مشکلے میں موصوف جناب آسی مرحوم اور جناب ناطق مرحوم کے تعلقات کو نظر انداز فرما کر حضرت امام شافعی رحمۃ کے حق الحق علی اکبر کے ارشاد پر عمل کر کے اس مسئلہ لاینحل کو شواہد کے ساتھ حل فرمانے کی سعی کریں گے کہ ع بتائیں آپ کہ ہم عارض و گیسو کو کیا سمجھے کی طرح کی سوقیانہ غزلیں یا ؂

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنّا

واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

کی طرح کی بظاہر غالب کے رنگ کی غزلیں حقیقتہً کس کا نتیجۂ فکر ہیں اور جناب آسی اور جناب ناطق کی یہ سعیٔ لاحاصل غالب پرستوں کے امتحان کے لئے تھی یا غالب کو بدنام کرنے کے لئے؟ اس کے بعد ان مختلف اشعار کے انتساب کی تحقیق کی بھی ضرورت ہے جو بیسویں صدی کے اوائل سے اب تک مختلف حضرات نے مختلف کتابوں اور مسودوں کی مدد سے غالب کی طرف منسوب کئے ہیں اور پھر کسی ایسے جامع دیوان کی اشاعت کی ضرورت ہے جس میں متداول دیوان اور نسخۂ حمیدیہ کے اشعار کے ساتھ ساتھ یہ نئے اشعار بھی شامل ہوں۔

اسی طرح غالب کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مکاتیب کی اشاعت اور اُن کے فارسی نظم و نثر کے مجموعے کی اشاعت بھی لابدی ہے۔ لاریب کہ یہ تمام کام آسان نہیں ہیں لیکن اتنے مشکل بھی نہیں ہیں کہ چار برس کی مدت میں باحسنِ وجوہ پورے نہ ہو سکیں اور ہم غالب کی صد سالہ برسی کو شایانِ شان طور سے نہ منا سکیں۔



دریراعظم سری لال بہادر شاستری حکومت روس کی دعوت پر روس تشریف لے گئے تھے۔ کریملن میں
آپ کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا گیا تھا جہاں آپ روسی رہنماؤں کے ساتھ کھڑے ہیں
(بائیں سے دائیں) مسٹر برزنیف، مسٹر وارشلوف، مسٹر مکویان اور مسٹر کوسی ان



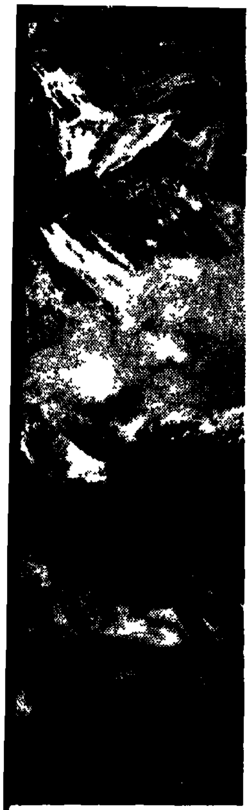
سری لال بہادر شہ
اور اُن کی دھر
ازبک لباسر



کیپٹن چیما



نوانگ گومبو



ایورسٹ کی چوٹی

کیپ



سی پی وہرا



انگ قمی







سونم ونگیال



سونم گیاتسو

لی ہندوستانی ٹیم

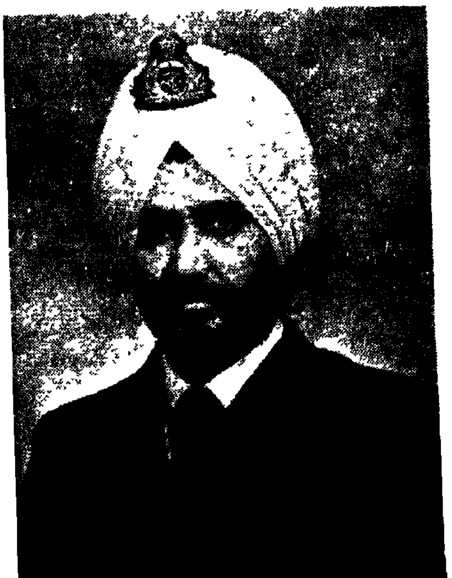
والیہ



ایچ-سی-ایس راوت



ہندوستانی ٹیم کے لیڈر لفٹنٹ کموڈور کو





ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریہ ہند ریاض میں سعودی عرب کے بادشاہ شاہ فیصل کے ساتھ

دو رُخ

کردار:-

۱۔ پنڈت امبیکا پرشاد
۲۔ پنڈت جی کی دھرم پتنی
۳۔ مرزا فرحت اللہ بیگ
۴۔ بیگم فرحت اللہ بیگ
۵۔ بینک کا باوردی چپراسی

[اسٹیج گھومنے والا ہے]

پہلا منظر

[پردہ اُٹھنے پر ایک متوسط درجہ کے ہندو گھر کا آنگن نظر آتا ہے۔ ایک کونے میں دو چارپائیاں بچھی ہیں۔ ایک پر پنڈت امبیکا پرشاد رام نامی چادر اوڑھے سو رہے ہیں۔ دوسری چارپائی خالی ہے۔ دائیں ونگ کی طرف پورے ونگ کو گھیرے ہوئے دیوار ہے جس میں دروازہ ہے۔ یہ دروازہ باہر گلی میں کھلتا ہے۔ بائیں ونگ کی طرف بھی اسی طرف پورے ونگ کو گھیرے ہوئے دیوار ہے۔ اس دیوار میں لگا ہوا دروازہ گھر کے اندر کی طرف کھلتا ہے۔ پردہ اُٹھنے پر پہلے پنڈت امبیکا پرشاد کے خراٹے سنائی دیتے ہیں پھر مرزا فرحت اللہ بیگ مخصوص لکھنوی لباس پہنے کمر جھکائے اور ہاتھ میں لکڑی تھامے دائیں ونگ سے آکر باہر کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں]

مرزا جی۔ (دروازہ کھٹکھٹانے کے ساتھ ساتھ اونچی آواز میں) امبیکا پرشاد۔ اے بھئی امبیکا پرشاد — پنڈت جی۔ اجی او پنڈت جی مہاراج!

[پنڈت جی اسی طرح خراٹے لے رہے ہیں کہ ان کی دھرم پتنی بائیں ونگ کے دروازے سے داخل ہو کر ان کے سرہانے آکھڑی ہوتی ہے۔ پھر پنڈت جی کے منہ پر سے چادر ہٹاتے ہوئے....]

دھرم پتنی۔ اجی میں نے کہا اب اُٹھ بھی جاؤ — دیکھو! باہر مرزا جی کواڑ کوٹ رہے ہیں۔

پنڈت جی۔ (کروٹ بدلتے ہوئے) اوں۔ ہوں۔

مرزا جی۔ (دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے) اماں کوئی کھولے گا دروازہ یا لاؤں یہ بیج کس گھر سے اور کردوں قبضے ڈھیلے...

دھرم پتنی (پنڈت جی کو شانے سے جھنجھوڑتے ہوئے) میں نے کہا باہر مرزا جی کواڑ توڑے ڈال رہے ہیں — اُٹھو، کیا گھوڑے بیچ کر سو رہے ہو۔

پنڈت جی (پھر کروٹ بدل کر) اوں ہوں — کیا مذاق ہے' صبح صبح۔ سونے دو مجھے —

مرزا جی (اسی طرح دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے) اماں دروازہ کھولو — چیخ چیخ کے میرا تو حلق بھی پڑ گیا۔

جولائی ۱۹۶۵ء

[پنڈت جی اسی طرح سوئے رہتے ہیں۔ پنڈت جی کی
دھرم پتنی بڑھ کر دروازہ کھولتی ہے۔ مرزا جی داخل
ہوتے ہیں]

مرزا جی۔ آداب بھابی — یہ امبیکا پرشاد کہاں چلا گیا صبح صبح ؟

دھرم پتنی۔ جی سو رہے ہیں۔

مرزا جی۔ سو رہے ہیں (پھر پنڈت جی کو سویا ہوا دیکھ کر) حد ہے صاحب۔ ایسا من موجی شخص بھی ہم نے نہیں دیکھا۔ سورج سوا نیزے پر آ گیا اور آنحضرت ابھی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں (بڑھ کر پاس کی خالی چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں اور لکڑی کے ٹھوکے سے پنڈت جی کو جگانے کی کوشش کرتے ہیں — اس دوران میں پنڈت جی کی دھرم پتنی بائیں دروازے سے اندر چلی جاتی ہے)

مرزا جی۔ امبیکا پرشاد — اے میاں اٹھو۔ کب تک ٹانگیں پسارے سوتے رہو گے ؟

پنڈت جی (کروٹ بدل کر) اوں ہوں۔ سونے بھی دو۔ کیا صبح صبح .....

مرزا جی۔ صبح صبح ! تو حضرت کے خیال شریف میں یہ علی الصباح ہے۔ دنیا ساری کام دھندے پر جا چکی۔ دوپہر سر پر آ رہی ہے اور آنحضرت ابھی تڑکا سمجھے ہوئے ہیں۔ خوابوں میں نسیم سحری بہہ رہی ہے۔ میں کہتا ہوں اٹھ جاؤ سیدھی طرح ورنہ.......

پنڈت جی۔ اونھوں۔ کیا مذاق ہے بھئی — نیند تو پوری کرنے دو۔

مرزا جی۔ واہ میرے شیر۔ چو مرے اٹھ کے شام کے سات بجے بستر میں گھس جاتے ہو اور صبح کے دس بجے تک تمہاری نیند ابھی ادھوری رہتی ہے — میں کہتا ہوں اٹھ جاؤ چپ چاپ ورنہ الٹتا ہوں تمہاری چارپائی...

(جھنجھلا کر اٹھتے ہوئے) حد ہے مرزا۔ میں تم سے پچاس مرتبہ کہہ چکا ہوں کسی حکیم کو دکھاؤ، تمہیں نیند نہ آنے کی بیماری ہے۔

پنڈت جی۔ یہ کوئی بیماری نہیں، صحت کی نشانی ہے۔ صحت تمہاری اس لئے خراب رہتی ہے، مرزا کہ تم صبح سویرے منہ اندھیرے .....

مرزا جی۔ اچھا تو — یہ منہ اندھیرا ہے (اونچی آواز میں) بھابی !

دھرم پتنی (اندر سے) جی مرزا جی !

مرزا جی۔ کیا بجا ہے بھابی ؟

دھرم پتنی۔ جی ساڑھے دس بجے ہیں مرزا جی۔

مرزا جی — سنا حضرت ساڑھے دس بج رہے ہیں اور حضور کے خیال میں ابھی نصف شب کا چاند بھی طلوع نہیں ہوا۔ خیر سے جوان جہان بیٹے کے باپ ہو، کل کو بہو گھر میں آئے گی تو اس کے سامنے بھی بھری دوپہری تک خراٹے لیا کرنا۔

پنڈت جی۔ (جماہی لیتے ہوئے) خیر جی دیکھا جائے گا۔ تم اپنی سنبھالو، بتاؤ کیسے آنا ہوا صبح صبح ؟

مرزا جی۔ پھر وہی صبح صبح۔ میں پوچھتا ہوں تمہاری صبح ساڑھے دس بجے ہوتی ہے۔

پنڈت جی۔ ساڑھے دس نہیں میری صبح بارہ بجے ہوگی۔ فرمائیے آپ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے — تمہاری طرح نہیں ہوں کہ ابھی چڑیاں تک چہچہانا شروع نہیں کرتیں کہ تم لنگر لنگوٹ کس کے پچھلے اپنے پورے کنبے کو بستروں سے کھینچ کھینچ کر زمین پر کھڑا کر دیتے ہو اور پھر سہانی صبح کا اعلان فرمانے پڑوسیوں کے یہاں اٹھ دوڑتے ہو — میں کہتا ہوں ....

مرزا جی۔ میرا خیال ہے امبیکا پرشاد تم اس وقت کچھ نہ کہو ورنہ میں ہاتھ چھوڑ بیٹھوں گا — آدمی دنیا میں سونے کے لئے نہیں آیا۔

پنڈت جی۔ تو کیا پڑوسیوں کی نیند حرام کرنے آیا ہے ؟

مرزا جی۔ ہاں، خدا کے نیک بندے صبح اٹھ کے خدا کا نام لیتے ہیں۔ اپنی عاقبت سنوارتے ہیں۔

پنڈت جی۔ ضرور لیتے ہیں اور ضرور اپنی عاقبت سنوارتے ہیں بشرطیکہ خدا کے نیک بندوں کو خدا کا نام لینے سے پہلے شیطان نہ آ دبوچے۔

مرزا جی۔ شیطان! لاحول ولا قوۃ! (اونچی آواز میں) سُنا بھابی تم نے! کم بخت مجھے شیطان کہتا ہے۔ ابھی منہ پر ایک جھانپڑ رسید کروں گا تو . . . .

پنڈت جی۔ تو مرزا تم صبح صبح لوگوں کو پریشان کرتے ہی کیوں ہو؟

مرزا جی۔ لوگ! اچھا تو تم اب 'لوگ' ہو گئے۔ لعنت ہے مجھ پر۔ تُف ہے جو کبھی تمہارے گھر میں قدم رکھ جاؤں — آباؤ اجداد کے پڑوس اور نصف صدی کی دوستی کے بعد اب میرے لئے تم (لفظ کھینچ کر) 'لوگ' ہو گئے۔

[پنڈت جی کی دھرم پتنی داخل ہوتی ہے]

دھرم پتنی۔ آپ تو بے کار خفا ہوتے ہیں مرزا جی۔ ان کی عادت تو آپ جانتے ہیں . . . . .

مرزا جی۔ میں کچھ نہیں جانتا بھابی۔ بڑا بول منہ سے نکالتے ہوئے آدمی کو اللہ سے ڈرنا چاہئے۔ کچھ خوفِ خدا نہیں اس شخص کو! میں تو اک ذرا سعادت کی خاطر آیا تھا۔ خبر ہوتی کہ منحوس کے منہ سے ایسے کلمے سننے پڑیں گے تو پہلے سعادت کا گلا گھونٹتا۔ اس کے بعد یہاں آتا۔

پنڈت جی۔ (تعجب سے) سعادت!

دھرم پتنی۔ بھگوان نہ کرے۔ سعادت کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا مرزا جی؟

مرزا جی۔ طبیعت تو اس نالائق کی ہمیشہ ٹھیک رہتی ہے بھابی۔ پر جب سے اس نے انٹرنس پاس کیا ہے اور سانڈوروں کی طرح گلی گلی کڑکڑے لگاتا پھرتا ہے — میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔

پنڈت جی۔ آخر پتہ تو چلے سعادت کو . . . .

مرزا جی۔ تم میرے ساتھ بات مت کرو جی — آج تک تمہارے ناز نخرے برداشت کرتا رہا ہوں۔ ساتھ کھیلے کا تقاضا تھا کہ خاموش رہا ورنہ ان بوڑھی ہڈیوں میں اب بھی اتنا دم خم ہے کہ . . . . .

پنڈت جی۔ اچھا بھئی معاف کر دو — بڑے جوانمرد — میرا مطلب ہے بڑے شہ زور بیٹھے ہو تم — جانتے تو ہو صبح صبح جب کوئی مجھے جگا دیتا ہے تو . . . .

مرزا جی۔ صبح صبح — یعنی ابھی تک تم اسی وہم میں مبتلا ہو کہ میں نے تمہیں مرغ کی بانگ کے ساتھ جگا دیا ہے۔

پنڈت جی۔ خیر چھوڑو۔ بتاؤ کیسے آنا ہوا؟ چائے پیو گے؟

دھرم پتنی۔ ہاں مرزا جی چائے پیجئے گا۔

مرزا جی۔ رہنے دو بھابی — بہت پی میں نے چائے۔

پنڈت جی۔ اماں، چائے بھی دو مرزا — (اپنی دھرم پتنی سے) تم چائے بناؤ جی، دیکھتا ہوں کیسے نہیں پیتا۔

[پنڈت جی کی دھرم پتنی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسٹیج گھومتا ہے۔ اب نصف اسٹیج میں مرزا جی اور پنڈت جی ہیں اور نصف میں پنڈت جی کی دھرم پتنی چائے کا سامان تیار کر رہی ہے۔ درمیان میں دیوار ہے اور بیچ کا دروازہ بند ہے]

مرزا جی۔ میں کہتا ہوں، میں ہرگز نہیں پیوں گا۔ تم ایسے بدتمیز کے یہاں چائے پینا میں اپنی اور چائے دونوں کی توہین سمجھتا ہوں۔

پنڈت جی۔ میرے یہاں چائے پینا تم اپنی اور چائے دونوں کی توہین سمجھتے ہو؟

مرزا جی۔ بالکل!

پنڈت جی۔ تو میں تم دونوں کی توہین کروں گا۔

[دونوں ہنستے ہیں]

پنڈت جی۔ ہاں تو سعادت کی بتاؤ — کیا بات تھی، کیا کہیں سے بلاوا آیا؟

مرزا جی۔ خاک بلاوے آئیں گے میاں! میرا تو اس چھوکرے کی بیکاری کے ہاتھوں ناک میں دم آ گیا۔

پنڈت جی ۔ ہاں مرزا ۔ نوکریوں کی حالت آج کل ایسی ہی ہے ۔
بہت آسامیاں نکل رہی ہیں ۔ لیکن تم جانو ایک کیمپ
میں تو سب نہیں سما سکتے ۔ ہمارے رام اوتار کی طرف
دیکھو ۔ کہاں کہاں اس کی خاطر میں نے جوتیاں نہیں
چٹخائیں ۔ جس کی صورت تک دیکھنا گوارا نہ تھی ۔ اس کے
تلوے چاٹے لیکن ......

مرزا جی ۔ تم تو میاں جھیل بھی سکتے ہو ۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ۔
عمر بھر باپ نے ہاتھ نہیں ہلایا تو اولاد کیا ہلائے گی ۔ اس
پر اکلوتا ہے ۔ جتنے دن فارغ رہے گا ، کچھ ہاتھ پیر نکلیں گے
ہماری طرح پلٹن کی پلٹن تو ہے نہیں ۔ اس پر گھر کی
جو حالت ہے وہ تم سے پوشیدہ نہیں ۔ بیگم بے چاری
پچاس مرتبہ تمہارے یہاں آنے کو کہہ چکی ہیں ۔ کہتے شرم آتی
ہے ۔ مگر سچ پوچھو تو اللہ کی بندی کے پاس کام کا برقع
تک نہیں کہ ......

پنڈت جی ۔ (غصے سے) اور تم صرف میرے ساتھ کشتی لڑنا جانتے
ہو ۔ ہاتھ پیر ہلانا تو جیسے تمہاری شان کے خلاف ہے ۔

مرزا جی ۔ کیا عرض کروں میاں ! ہاتھ پیر اب اس قابل ہی نہیں
رہے ورنہ تم جانو انھیں ہاتھوں سے ہزاروں کمائے اور
لٹائے ۔۔۔ اب لڑکا خیر سے جوان ہو گیا ہے ۔ تعلیم یافتہ
بھی ہے ۔ آج نہیں تو کل ، کل نہیں تو پرسوں ۔۔ کبھی تو
اس کی ملازمت کا انتظام ہوگا ۔

پنڈت جی ۔ کیوں نہیں ۔ کیوں نہیں !

مرزا جی ۔ دراصل میں آیا بھی اسی سلسلے میں تھا ۔

پنڈت جی ۔ تو کیا سعادت کی ملازمت کا انتظام ہو گیا ؟

مرزا جی ۔ ہوا تو نہیں گیا ۔۔ لیکن اللہ نے چاہا تو عنقریب
ہو جائے گا ۔ ایک بار تم نے کہا تھا ۔۔ تم سینٹل بینک
کے منیجر کو جانتے ہو !

پنڈت جی ۔ ہاں ہاں ۔ اس سے تو ہمارے خاندانی مراسم ہیں ۔

مرزا جی ۔ بس ۔۔ تو پھر ٹھیک ہے ۔ اس کے یہاں ایک
کلرک کی آسامی خالی ہوتی ہے ۔ تم ذرا سعادت کو اپنے ساتھ
لے جاؤ ۔ میں سمجھتا ہوں تمہارے کہنے سے ......

[پنڈت جی کی دھرم پتنی اونچی آواز میں پنڈت جی کو
بلاتی ہے]

دھرم پتنی ۔ جی ۔ میں نے کہا ۔۔ ذرا سنیئے تو !

پنڈت جی ۔ (آتا ہوں (پھر مرزا سے) میں ابھی آیا مرزا !

[دروازہ کھول کر دوسری طرف جاتا ہے]

دھرم پتنی ۔ (سرگوشیانہ انداز میں) میں نے کہا اپنا رام اوتار
سال بھر سے بے کار ہے اور تم ہو کہ لکھ لٹ بنے جا
رہے ہو ۔

پنڈت جی ۔ کیا مطلب ؟

دھرم پتنی ۔ مطلب وطلب میں کچھ نہیں جانتی ۔ سینٹل بینک
میں آسامی ہے تو سوچو ، ایسا موقع کب ہاتھ آئے گا ۔

پنڈت جی ۔ (کچھ سوچتے ہوئے) بات تو تم ٹھیک کہتی ہو ۔

دھرم پتنی ۔ ٹھیک کہتی ہوں تو بس ٹھیک ہی ہونی چاہیئے ۔
تم ابھی چائے پی کر سیدھے وہاں جاؤ اور اپنے رام اوتار
کے لئے .....

پنڈت جی ۔ لیکن مرزا کیا کہے گا ۔۔ وہ تو .....

دھرم پتنی ۔ دوسروں کی مدد اسی وقت اچھی لگتی ہے راجہ بھوج
راج ، جب آدمی خود مدد کے قابل ہو ۔۔ سال بھر سے
لڑکا مارا مارا پھر رہا ہے اور تمہارے کان پر جوں تک
نہیں رینگتی ۔ اور اب اگر بھگوان نے موقع نکالا ہے
تو .....

پنڈت جی ۔ اچھی بات ہے ۔ تم چائے بناؤ ۔ میں ابھی مرزا سے
صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ .....

دھرم پتنی ۔ اوہ ہو ۔۔ ڈھنگ سے بات کرنا تمہیں کبھی نہ آیا ۔
صاف صاف کہنے کی کیا ضرورت ہے ۔ بس ٹال دو ۔

پنڈت جی ۔ وہ ٹلنے والی آسامی نہیں ہے بھاگوان

دھرم پتنی ۔ تو کیا ہم نے کسی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے ۔ جان ہے

تو جہان ہے۔

مرزا جی۔ (اونچی آواز میں) اماں، پنڈت وہاں جا کے پھر سو گئے کیا، آؤں جگانے؟

پنڈت جی۔ آ رہا ہوں مرزا — (پھر دھرم پتنی سے) دیکھو چائے پلانے کے بعد تم ذرا مرزا کی بیوی سے مل آنا۔ بیچاری کئی روز سے تمہیں پوچھ رہی ہے۔ یوں بھی آج .....

مرزا جی۔ (اونچی آواز میں، اماں اب آ بھی چکو — بھابی کیا چپڑی چپڑی مکھن اور بادام چٹا رہی ہے تمہیں۔

(پنڈت جی دروازہ کھول کر پھر اپنی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے)

پنڈت جی۔ بڑے بے صبر ہو جی۔ تمہاری بھابی تو صرف یہ پوچھ رہی تھی کہ چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو بنا دوں؟

مرزا جی۔ (اونچی آواز میں) نہیں بھابی! چائے کے لئے بھی خواہ مخواہ تکلف کر رہی ہو۔ میں گھر سے ناشتہ کر کے آ رہا ہوں۔

دھرم پتنی۔ جی۔ بہت اچھا (آ کر دیوار سے کان لگا کر باتیں سنتی ہے)

مرزا جی۔ (پنڈت جی سے) سنو! جب تک چائے آتی ہے تم نہا دھو کے کپڑے پہن لو۔ اتنے میں میں جا کے سعادت کو تیار کروائے دیتا ہوں۔ نیک کام میں دیر نہیں کرنا چاہیئے۔

پنڈت جی۔ وہ تو ٹھیک ہے لیکن بات یہ ہے مرزا کہ ....

مرزا جی۔ ہوں! کیا بات ہے

پنڈت جی۔ بڑا موٹا چشم ہے کم بخت، کٹی انگلی پر پھونک نہیں مارتا۔

مرزا جی۔ کون؟

پنڈت جی۔ دی سینٹرل بینک کا منیجر اور کون — اس پر ہمارے دادا کے زمانے میں کچھ رنجش بھی ہو گئی تھی — میں سمجھتا ہوں ......

مرزا جی — تم نہیں امبیکا پرشاد! میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری نیت میں فتور آ گیا ہے۔ کھوٹ بھرا ہوا ہے تمہارے دل میں۔ منہ پر تم کچھ اور کہتے ہو اور دل میں تمہارے کچھ اور ہوتا ہے۔

پنڈت جی۔ لیکن میں تو ......

مرزا جی۔ خیر جی۔ کوئی بات نہیں۔ جس نے پیدا کیا ہے وہ پیٹ میں دانا بھی ڈالے گا۔ ہم نے کون سے ایسے گناہ کئے ہیں کہ لڑکے کو تا زندگی ملازمت نہیں ملے گی۔ اچھا! بھابی سے میرا سلام کہہ دینا۔ اللہ تم لوگوں کو خوش رکھے۔

[اُٹھ کر جانے لگتا ہے]

پنڈت جی۔ لیکن چائے — مرزا چائے تو پیتے جاؤ — (اُٹھ کر باہر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) ذرا سنو تو مرزا۔ [مرزا جی باہر نکل جاتے ہیں۔ تبھی دوسرے دروازے سے پنڈت جی کی دھرم پتنی تھالی میں دو گلاس چائے لئے داخل ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہیں اور مسکراتے ہیں — پردہ گرتا ہے]

دوسرا منظر

[پردہ اُٹھنے پر ایک متوسط مسلمان گھر کا زنان خانہ نظر آتا ہے۔ سامنے قالین پر جو کسی زمانے میں قالین ہوگا لیکن اب اس میں ٹاٹ کے اتنے پیوند لگ چکے ہیں کہ قالین کا صرف نام رہ گیا ہے — بیگم فرحت النساء بیگ اور پنڈت امبیکا پرشاد کی دھرم پتنی بیٹھی ہیں بیگم بڑی بے چینی سے چھالیا کتر رہی ہیں اور دھرم پتنی کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق اپنی دھوتی کا پلو اُنگلی پر لپیٹ رہی ہیں۔ کھول رہی ہیں — دونوں کے چہروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی ابھی ان میں کافی تیز جھڑپ ہو چکی ہے]

بیگم —! رہنے دو بہن۔ بہت ہو چکا

دھرم پتنی۔ اچھا جی۔ ہو چکا تو ہو چکا۔

بیگم۔ وہ تو میں نے زبردستی مرزا جی کو بھیجا ورنہ جوتی جاتی
تھی ان کی تمہارے یہاں۔
دھرم پتنی۔ جوتی جاتی تھی تو جوتی کیوں نہ آئی۔ خود کیوں تشریف
لے آئے۔
بیگم۔ سوچا کچھ تو ترس مہربانی ہوگا تم لوگوں میں — اور
نہیں تو آنکھ کی شرم تو ہوگی۔
دھرم پتنی۔ نہیں جی، نہیں ہے۔ ڈھل گیا ہے ہماری آنکھ کا
پانی۔ ہم تو تمہاری آنکھ کا کانٹا ہو گئے۔
مرزا جی۔ (داخل ہوتے ہوئے) کیوں ناحق بھابی کو الزام
دیتی ہو بیگم! ہماری قسمت میں جو کچھ لکھا ہے اُسے
یہ تھوڑی بدل سکتے ہیں۔
بیگم۔ آپ ہی بڑے اتراتے پھرتے تھے۔ بڑا ناز تھا آپ کو
پنڈت جی کی دوستی پر۔ جب تک چار چکر نہیں لگا
لیتے تھے کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا — اب دیکھ لیا
تماشا۔
دھرم پتنی۔ جی ہاں، ہمارے گھر میں تو ہر وقت کھیل تماشے
ہوتے رہتے ہیں۔ بھانڈ ہیں ہم لوگ۔
بیگم۔ شُنا!
مرزا جی۔ (غصے سے) میں تم سے کہتا ہوں بیگم خاموش
ہو جاؤ۔
بیگم۔ کیوں خاموش ہو جاؤں — آپ کی کوئی کل دبتی ہوگی
ان کے آگے۔ میں کسی کے یہاں کھانے نہیں جاتی۔
دھرم پتنی۔ تم نہیں جاتیں تو ہم تو تمہارے یہاں روز ٹکڑے
توڑنے چلے آتے ہیں۔ تم ایسی گڑ ہو کہ مکھیاں کھائیں۔
مرزا جی۔ بھابی! تم ہی ذرا خاموش ہو جاؤ۔ اس کا تو دماغ
چل گیا ہے۔
بیگم۔ ہاں ہاں میرا دماغ چل گیا ہے۔ سچی بات کہنے والے
کا دماغ ہمیشہ چل جاتا ہے۔ مجھے تمہاری طرح لگائی
بجھائی نہیں آتی کہ اگلا تو پیٹ پر لات مارے اور تم
منہ میں گھنگھنیاں ڈالے پڑے رہو۔
دھرم پتنی۔ ہاں جی بڑی لات ماردی ہے ہم نے تمہارے
پیٹ پر۔
بیگم۔ اور نہیں تو کیا۔ لڑکا بیچارا کن جتنوں سے آسامی
کی خبر لایا۔ مرزا جی خود تمہارے یہاں جا کے گڑگڑائے
اور تم لوگوں میں اتنی قدر دید نہ ہوئی کہ.....
مرزا جی۔ میں پھر کہتا ہوں بیگم خاموش ہو جاؤ ورنہ میں
منہ کالا کر کے گھر سے نکل جاؤں گا۔
بیگم۔ آپ کے نکلیں دشمن۔ وہ نکلیں جو کسی کو روٹی کھاتے
نہیں دیکھ سکتے۔
مرزا جی۔ (اور بھی غصے سے) میں کہتا ہوں بیگم خاموش
ہو جاؤ۔
بیگم۔ کیوں خاموش ہو جاؤں جی۔ میں کسی کی دبیل نہیں ہوں۔
میرا تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ چھاتی پھٹ رہی ہے میری۔
دھرم پتنی۔ لو بہنا، ہم ہی جاتے ہیں تمہارے گھر سے۔ جتنا نہائے
اتنا پن۔
[اُٹھ کر جانے لگتی ہے]
مرزا جی۔ بھابی — بھابی — میری بات تو سنو۔
دھرم پتنی۔ کیا سنوں مرزا جی — اس سے زیادہ اور کیا
سنوائیے گا۔
[پھر آگے بڑھ کر جانے لگتی ہے]
مرزا جی۔ روکو — بیگم، میں کہتا ہوں بھابی کو روکو۔
[دائیں ہاتھ کے دروازے پر باہر سے دستک
ہوتی ہے۔ پنڈت جی کی دھرم پتنی رُک جاتی ہے
مرزا جی دروازہ کھولتے ہیں]
بینک کا باوردی چپراسی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا مکان
یہی ہے؟
مرزا جی۔ جی ہاں۔ فرمائیے۔ آپ کہاں سے تشریف لائے
ہیں۔

چپڑاسی۔ مرزا سعادت اللہ بیگ کو بلوایا ہے۔
مرزاجی۔ بلوایا ہے ؟ کس نے بلوایا ہے سعادت کو ؟
چپڑاسی۔ سیتل بینک کے منیجر صاحب نے
مرزاجی۔ سعادت کو نہیں بھائی انھوں نے رام اوتار کو بلوایا ہوگا (قدرے اونچی آواز میں) و بھابھی مبارک ہو۔ رام اوتار کی ملازمت کا بندوبست ہوگیا۔
چپڑاسی۔ جی نہیں، مرزا سعادت اللہ بیگ کو بلوایا ہے مرزا فرحت اللہ بیگ کے مکان سے
مرزاجی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مکان سے ــــ مکان کا پتہ کس نے دیا تھا ؟
چپڑاسی۔ جی، نام تو میں ان کا نہیں جانتا۔ منیجر صاحب انھیں پنڈت جی کہہ کر پکارتے تھے۔
مرزاجی۔ پنڈت جی ــــ پنڈت امبیکا پرشاد ــــ
(لوٹ کر بیگم اور پنڈت جی کی دھرم پتنی کے پاس آتے ہوئے) بیگم، غضب ہوگیا بیگم ــــ بھابی، بالکل غضب ہوگیا بھابی!
[پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے]

مظہر امام

غزل

کیا جئے آپ جو مجبورِ تمنا نہ ہوئے ـــ خواب دیکھا کئے یوسف کے، زلیخا نہ ہوئے
بات تھی کچھ تو کہ اس سمت جھکے اہلِ خرد ـــ ورنہ ہونے کو تو ہم آپ بھی کیا کیا نہ ہوئے
ہم نے اچھا کیا صحرا میں بنایا نہ مکاں ـــ آپ شہرِ گل و ریحاں میں تماشا نہ ہوئے
کوئی دیوار تو حائل تھی کہ ہم تم دونوں ـــ ایک ہی گھر میں رہے پھر بھی شناسا نہ ہوئے
اپنے پندارِ خودی ہی کی عنایت تھی کہ ہم ـــ اپنی تنہائی کے لمحوں میں بھی تنہا نہ ہوئے
تیرے قصے میں ابھی تک ہے بہارِ امروز ـــ اور ہم گذرے ہوئے دور کا افسانہ ہوئے
خود پرستی نے سکھایا نہیں یک جا ہونا ـــ ہائے وہ ذرّے جو ذرّے رہے، صحرا نہ ہوئے

اپنے ماضی ہی کو روتے رہے شعروں میں امام
مرثیہ گو تو ہوئے شاعرِ فردا نہ ہوئے

سعادت نظیر

دورِ ماضی کی ایک یادگار ہستی

اللہ اللہ، وہ بھی کیا دن تھے کہ شہر حیدرآباد نہ صرف زندگی کی رنگینیوں میں ڈوبا ہوا تھا بلکہ باہمی خلوص، لسانی وحدت اور گنگا جمنی تہذیب کا ایک دل کش نگار خانہ بنا ہوا تھا، یہاں جاگیرشاہی راج تھا، رسوم وروایات کی پیروی عام تھی، عیش و نشاط کا دور دورہ تھا، رنگارنگ بزم آرائیوں کا رواج تھا، کہیں رقص و سرود کی محفلیں گرم رہتیں تو کہیں شعر وسخن کی پُرکیف مجلسیں۔ اسی زمانے میں سرزمین دکن کے مایۂ ناز سپوتوں میں ایک صاحب دل بزرگ اور باکمال شاعر حضرت میر شمس الدین محمد فیضؒ بھی تھے۔ جنوبی ہند میں ان کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کی زبان وبیاں کا لوہا سب مانتے تھے۔ ان کے شاگردوں کی طویل فہرست میں چند ایسے نام بھی نظر آتے ہیں جو دکن کی ادبی تاریخ میں نمایاں جگہ پانے کے مستحق ہیں، انھیں ممتاز شخصیتوں میں ایک رائے گردھاری پرشاد باقیؔ آنجہانی بھی تھے جنھوں نے فارسی، ہندی اور اردو ادب کی خدمت میں دل کھول کر اپنی صلاحیتیں صرف کی ہیں۔ فارسی میں نظم کی بیس اور نثر کی تین کتابیں لکھیں اور ہندی میں چار۔ ان کی مادری زبان اردو تھی جس سے انھیں کافی لگاؤ تھا۔ اردو نثر و نظم میں بھی انھوں نے چار کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ وہ اپنے اردو کلام پر حضرت فیضؔ سے اصلاح لیتے تھے، انھیں اپنے اُستاد سے خاص عقیدت تھی اور اقرار بھی تھا کہ انھیں جو کچھ حاصل ہوا ہے، وہ سب استاد کا فیض ہے ؎

حضرتِ فیضؔ کا سب فیض ہے، باقیؔ ورنہ
نہ سخن گوئی تھی ایسی نہ زباں دانی تھی

حاصل ہوئی ہے خسرویٔ ملکِ شاعری
باقیؔ! خدا گواہ، یہ فیضانِ فیض ہے

اگرچہ اُن دنوں شمالی ہند میں ذوقؔ، آتشؔ، غالبؔ اور مومنؔ وغیرہ جیسے بلند پایہ شاعر اور یگانۂ روزگار شخصیتوں کی کافی شہرت تھی مگر باقیؔ کی نگہ معتبر میں حضرتِ فیضؔ کے سوا کوئی دوسرا نہیں سما سکا ؎

میر فیضؔ صاحب سے ہیں استاد
دکن سے جائیں کیوں ہندوستاں ہم

وہ صرف فیضؔ ہی پر جان نہیں دیتے تھے بلکہ اپنے ہر استاد سے بے پناہ خلوص رکھتے تھے اور ان کا ادب اپنا اوّلین فرض سمجھتے تھے۔ حضرت محمد علی عاشقؔ جیسے جیّد عالم اور شاعر سے بھی انھیں تلمّذ حاصل تھا۔ جنھوں نے ان میں فارسی ادب کا صحیح مذاق پیدا کیا، ان کا ذوقِ شاعری نکھارا، اشعار درست کیے، زبان وبیاں کے نکات بتائے اور باقیؔ کو باقی بنایا اور باقیؔ نے بھی ہمیشہ اپنے سعادت مند شاگرد ہونے کا ثبوت دیا۔ چناں چہ ان کو اپنے اس استاد محترم سے جو والہانہ عقیدت تھی وہ ان کی اپنی ایک فارسی رباعی

میں جھلکتی ہے ؎

عاشق استادِ کامل باقیؔ شد
زاں مایۂ عشق حاصل باقیؔ شد
از مصقلۂ ذکر و ز تربیتِ فکر
آئینۂ معرفت دلِ باقیؔ شد

۱۸۴۴ء کی بات ہے کہ باقیؔ نے حیدرآباد کے ایک معزز کائستھ گھرانے میں آنکھ کھولی۔ گھر کی فضا علمی اور مذہبی تھی۔ ان کے والد رائے نرہری پرشاد سنسکرت کے ایک مانے ہوئے عالم اور ادیب تھے۔ باقیؔ ان کے بڑے لڑکے تھے۔ ناز و نعم میں پلے، اعلیٰ پیمانے پر تعلیم و تربیت پائی۔ ہندی، سنسکرت، اردو، فارسی اور عربی سیکھی اور دیگر فنونِ لطیفہ مثلاً خطاطی اور موسیقی وغیرہ میں بھی درک پیدا کیا۔ علم و فن کا بے حد شوق تھا، بلا کی ذہانت، غضب کا حافظہ اور قیامت کی جودتِ طبع رکھتے تھے۔ کم عمری ہی میں تعلیم کے اعلیٰ مراحل طے کئے اور نواب رونق علی خاں شاہ یار الملک امیر پائیگاہ کی سرکار سے وابستہ ہو گئے، جہاں قابلیت اور حسنِ انتظام کے باعث ترقی کر کے پانسو روپے ماہوار پر فوج کی سررشتہ داری پر مامور ہوئے۔ ان کے جوہرِ ذاتی سے متاثر ہو کر نواب مختار الملک سالار جنگ اوّل نے باقاعدہ فوج کی ترتیب کا کام بھی انھیں سونپا، جس کو انھوں نے بہت ہی خوبی سے انجام دیا تو انھیں صدر سررشتہ دار مقرر کیا گیا اور جمعیتِ نظامِ محبوب کی سررشتہ داری کے علاوہ دوسری اعلیٰ خدمتوں سے بھی سرفراز کیا گیا۔ نواب سالار جنگ اوّل نے ان کو کم سن بادشاہ نواب میر محبوب علی خاں کا شاہی اتالیق مقرر کیا۔ انھوں نے اس خدمت کو بھی بڑی ایمانداری سے انجام دیا جس کے سبب بعد میں شاہِ موصوف کا اعتماد حاصل کیا اور مقرب خاص بن گئے۔ دیگر امیروں میں بھی ہر دل عزیز رہے۔ دربارِ شاہی سے پہلے 'راجہ بہادر' اور پھر 'راجہ محبوب نواز ونت' کے خطاب پائے اور معقول جاگیر سے بھی نوازے گئے۔

باقیؔ کی ایک نہیں، دو دو شادیاں ہوئیں، عمر کی چودھویں منزل پر پہنچے تھے کہ پہلی شادی رچی اور تئیس سالہ رفاقت کے بعد پہلی بیوی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئیں۔ ان سے چھ اولاد ہوئیں لیکن ان میں سے صرف ایک دختر رہ گئی تھیں اور ایک فرزند، جو اتفاقاً بھری جوانی میں ہاتھی پر سے گر پڑے اور جانبر نہ ہو سکے۔ دوسری رفیقۂ حیات کے بطن سے دس بچے پیدا ہوئے۔ بچوں کا مرنا باپ کی موت ہوا کرتا ہے۔ باقیؔ کو بھی اولاد کا صدمہ تھا۔ وہ زندگی گزارتے تھے مگر اس طرح جیسے زندگی نام ہے غم و آلام کا، آخرکار ۱۸۹۴ء کو باقیؔ راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔

اک شے پئےِ خاطر اپنے تو یاں نہ آئی
باقیؔ، جہاں کا دیکھا بازار چلتے چلتے

باقیؔ ایک وسیع المشرب انسان تھے۔ ہندوستانی تہذیب اور مشرقی شرافت کی ایک جیتی جاگتی مثال تھے۔ مسکینوں اور غریبوں پر بلا لحاظِ مذہب جی کھول کر روپیہ خرچ کرتے اور خوش ہوتے۔ سچ تو یہ ہے انھیں داد و دہش میں مزہ آتا تھا۔ اگرچہ وہ غیر مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے تھے مگر مذہبِ اسلام سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ ہندو اور مسلم میں وہ کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ دونوں گویا ان کی دو آنکھیں تھیں۔ دونوں کے ساتھ ایک ہی طرح کا برتاؤ تھا۔ ہندو دھرم کے جذبے کے تحت انھوں نے بڑے بڑے مندر بنوائے۔ کئی بار کاشی کی یاترا کی۔ رشیوں سے ملتے تو روحانی مسرت پاتے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی دل بستگی کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ وہ حضرت حسین شاہ ولیؒ کے زبردست عقیدت مند تھے۔ ہر سال ان کا عرس بڑی دھوم دھام سے کرتے۔ نیز رمضان میں روزہ داروں کے لئے افطار کا خصوصی انتظام کرتے تھے۔ غرض ان کی زندگی قومی و ملی یک جہتی کا قابلِ تقلید نمونہ تھی۔ انھوں نے سنت سادھوؤں اور دیوتاؤں کی تعریف میں گیت اور بھجن لکھے تو شہیدانِ کربلا سے اپنی دلی محبت کا اظہار سلاموں کی صورت میں کیا اور خوب کیا۔ ان کے ان سلاموں

میں نہ صرف اعتقاد، رنج و غم کا شدید احساس ہوتا ہے بلکہ محاکات اور واقعہ نگاری کی خوبیاں بھی ملتی ہیں ؎

پاؤں میں زنجیر جب سجاد کے ڈالی گئی
غل اٹھا ایسا کہ رن میں حشر برپا ہو گیا
کوئی گھر میں، کوئی زنداں میں، کوئی مقتل میں
کنبے کے کنبے پہ شبیرؑ کے آفت آئی
یاد آئی جو گلگوں کفنی بے کفنوں کی
اشک آنکھوں سے بہنے لگے شبنم سے زیادہ

باقی نے سنت سادھوؤں اور صاحب دلوں کی صحبت کا کم و بیش اثر قبول کیا اور مسلک تصوف اختیار کیا مگر صوفیوں کا سا اثری انداز ان میں آ نہ سکا اور نہ ان کے صوفیانہ تصورات میں ان کی زندگی کے گہرے محسوسات شامل ہو سکے۔ اسی لئے ان کے متصوفانہ شعروں میں نمایاں اثر اور انفرادیت پیدا نہ ہو سکی البتہ کہیں کہیں صوفیانہ رنگ جھلکتا ضرور ہے لیکن واردات کی صورت میں نہیں، روایتی پیرہن میں ؎

پروانۂ غش، کلیم ہے شیدا، فدا چکور
کیا کیا تجلیاں ہیں چراغ جمال میں
مثل موسیٰ دیدۂ حق بیں تو پیدا کر کہیں
طور کا جلوہ نظر آتا ہے ہر کہسار پر
ایمن ہے ہر ایک دشت میں تجھ سے
ہر سنگ ہے کوہ طور تیرا

تصوف آشنائی نے انھیں صوفی منش شاعر خواجہ میر درد کا کلام پڑھنے پر اکسایا۔ انھوں نے بھوپال سے خاص طور پر ان کے قلمی دیوان کی نقل منگوائی اور مطالعہ کیا تو انھیں درد کی غزلیں بھائیں اور فارسی رباعیاں تو اتنی پسند آئیں کہ ان کا اردو ترجمہ کر ڈالا جو "درد باقی و درد ساقی" کے نام سے ان کی وفات کے بعد کتابی صورت میں شائع ہوا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ترجمہ کچھ اس خوبی سے کیا ہے کہ واہ۔ نزاکت فن اور لطافت اظہار کے ساتھ ساتھ طہارت معنی کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے اپنی فارسی اور اردو ادب کی مہارت اور معنوی حیثیت سے اپنی تصوف پسندی کا ایسا ثبوت دیا ہے کہ نقل پر اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر درد کی ایک رباعی اور اس کا ترجمہ باقی کی اپنی زبانی سنیئے:

ہر لحظہ دریں خانہ کہ من می آیم
گم کردہ رہ شناختن می آیم
چوں شعلہ کجا رسیدنم، منظور است
پیوستہ برون ز خویشتن می آیم   درد

معلوم نہیں گھر سے کہاں جاتا ہوں
بھولا ہوا راستہ ہے، گھبراتا ہوں
شعلے کی طرح کہیں پہنچا ہو گا
یوں آپ سے باہر جو نکل جاتا ہوں   باقی

خیالات ہزار بلند اور جذبات لاکھ لطیف سہی مگر جب تک شخصیت پُرخلوص نہ ہو، ان کا اظہار اثر انگیز نہیں ہوتا ہے اور نہ غنائیت ہی سے معمور، زبان و دل کی یکسوئی ضروری ہے اور یہ باتیں باقی کے کلام میں رچی بسی ہیں۔ ان کا اسلوب ان کی پُرجوش شخصیت کا آئینہ ہے جس میں ایک دل آویز سنجیدگی اور کسی قدر شگفتگی بھی محسوس ہوتی ہے۔ وہ لفظوں کے مزاج سے واقف ہیں اسی لئے انھیں برمحل برتتے ہیں اور محاوروں کو برجستہ کھپاتے ہیں۔ ان کے یہاں ہم مزاج لفظوں کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے اور صورت و معنی کی ایک دل نشیں ہم آہنگی

بلبل آتش نفس ہوں ڈر ہے کیا صیاد کا
شعلۂ آواز سے پھونکوں قفس فولاد کا
دوست سے دشمنی یہ کیا اے دوست
مجھ وفا دوست پر جفا، اے دوست
میں نے جب درد دل کہا، بولے
بس، جی، بس چپ رہو، ہوا معلوم
دل میں دنیا کا تماشا دیکھا
موجزن کوزے میں دریا دیکھا

دل میں میرے بھرے ہیں، اے ساقی
آرزو، شوق، مدعا، مطلب

ہوں میں وہ آوارۂ وحشت کہ کوہ و دشت میں
پاؤں کے چھالوں کو شکوہ ہے زبانِ خار پر

باقی کا اردو کلام 'بقائے باقی' ۱۸۸۷ء میں چھپا جس میں ۹۲ غزلیں، ایک مخمس اور ۱۶ سلام شریک ہیں، غزلوں کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مترنم بحریں استعمال کی ہیں، نہ صرف شگفتہ زمینوں کو آسان بنانے کی کوشش کی ہے بلکہ مشکل زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ردیفیں خشتال انگیز نہیں سنجیدہ ہیں اور قافیے ہیں کہ شراب کے پیالوں کی طرح کھنکتے ہیں۔ ردیف و قافیہ کی ہم آہنگی اور لب و لہجہ کی کیف آگینی دل آویز ہے۔ ان کی غزلوں کا خمیر دردمندی، اگرانگی اور دل سوزی سے نہیں، نشاط انگیزی سے اُٹھا۔ خوش حالی نے انھیں بامراد رکھا اور غم کے نقوش گہرے ہونے ہی نہیں دیئے بلکہ بیشتر نظر فروز طربیہ خطوط ہی کو اُبھارا ہے مگر شائستہ اور نکھرے ستھرے رنگ میں، ان کے کلام میں نامے دلکش کی باتیں بھی ہیں اور چشم و زلف کی حکایتیں بھی جن کو سن کر قربتِ محبوب کا احساس ہوتا ہے اور باقی کے نشاط انگیز مزاج کا پتہ چلتا ہے۔

کیا سیر دیدنی ہے رستوں میں مے کدے کے
گرتے ہیں کس مزے سے میخوار چلتے چلتے

یہ تو چہلی ہے مری محفل میں
کون کہتا ہے، نہیں پائے شراب

گر دیکھے ترے شباب کا رنگ
گل ہو کے اڑے گلاب کا رنگ

ہے عکس فگن جو آنکھ میں رُخ
ساغر میں ہے آفتاب کا رنگ

شوق سے باندھئے آپ اپنے گنہگار کے ہاتھ
آپ رو میرے گناہوں کی ہے سرکار کے ہاتھ

اور بھی دشنام سنئے چھیڑ کر
لذتِ قندِ مکرر دیکھئے

باقی کی طبیعت میں خوش حالی کی آفریدہ شوخی بھی تھی مگر سنجیدگی کے لباس میں۔ کبھی کبھی ان کی اس شوخی نے ظرافت کا روپ بھی دھار لیا ہے پھر بھی مذاق کی لطافت اور شستگی برقرار رہی اور شعر ان کے کمالِ فن کا معترف بن گئے ؎

مبارک شیخ صاحب کو عمامہ
اُٹھائیں گے نہ یہ بارِ گراں ہم

باقی کی غزلوں میں نشاطیہ رنگ کے علاوہ ایسے شعر بھی ہیں جن کی فضا میں احساسِ غم کا ایک ہلکا سا ارتعاش محسوس ہوتا ہے۔ یہ ارتعاش دل کی ان دھڑکنوں سے عبارت ہے جو درد میں ڈوبی ہوئی ہیں اور باقی کا درد دردِ لادوا ہے۔ جو خود ان کی آرزو کا حاصل ہے جس کو عرفِ عام میں 'عشق' کہتے ہیں۔ عشق کے بازار میں چور کی طرح خریدار کے ہاتھ بھی کٹتے ہیں اور انھیں اس نظارے پر اچنبھا سا ہوتا ہے۔ ان کا محبوب تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتا ہے تو ان کی جان پر ہزاروں صدمے ہوتے ہیں۔ پھر بھی وہ زلفِ رسا سے سلسلۂ شوق بندھا رکھتے ہیں ؎

توڑیں نہ سلسلہ کبھی زلفِ رسا سے ہم
اے دل! پھنسے رہیں گے بلائیں بلا سے ہم

محبوب کی قربت دوری سے بدل جاتی ہے تو اس دوری میں باقی پر جو کچھ بیت جاتی ہے۔ ان کے دل ہی سے پوچھا چاہیئے کبھی انھیں گزرے ہوئے دن اور عہدِ رفتہ کے کیف آگیں جلسے رہ رہ کے یاد آتے ہیں اور ان کو تڑپا جاتے ہیں تو کبھی محفل میں جام کے چھلکتے ہی کسی چشم میگوں کا خیال آتا ہے اور انھیں خون رلاتا ہے۔

محبت میں ہوئے رسوائے عالم جہاں ہنستا ہے، روتے ہیں جہاں ہم

صاحب خانۂ زنجیر اور شہر جنوں آباد کے باشندے باقی کو گلشنِ عالم کی ہوا بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ کسی پھول میں بوئے وفا محسوس نہیں ہوتی اور کبھی آنکھوں میں آنسو موجزن ہو کر طوفان بن جاتے ہیں جو ہزاروں گھر ڈھا کر آبادی کو ویرانہ کر دیتے ہیں۔

جہاں وہ خاک بسر اِدھر اُدھر گم کردہ راہ مارے مارے پھرتے ہیں تو وحشت رہبری کرتی ہے ؎

رہ گیا ہو کے جو آوارہ بیں ویرانے میں
۔ لوں وحشت کو چلا چل، تری رہ بر میں ہوں

جنگل میں گردِ باد سے لیتا ہوں کارِ خضر
۔ مجھ رہ نورد کو نہیں رہبر کا احتیاج

راہِ طلب میں باقی منزلوں پر منزلیں طے کرتے چلے جاتے ہیں ہر دشت انھیں وادیٔ ایمن نظر آتا ہے تو ہر سنگ کوہ طور، کبھی فرہاد کی تیشہ زنی کا تصور بڑھتا ہے تو کہسار کی طرف دیکھ کر اپنا سر پھوڑ لیتے ہیں مگر مرتے نہیں کہ سخت جاں ہیں اور اب وہ جادۂ شوق میں اس منزل پر پہنچے ہیں جہاں ان کو پرستارِ محبت کا ہر نقشِ کفِ پا ایک چشمِ پُرنم دکھائی دیتا ہے اور اس مشاہدے کا تاثر ان کی زبان سے یوں ادا ہوتا ہے کہ ان کا شاہ کار بن جاتا ہے اور اردو شاعری میں ان کی حیات کا ضامن ؎

یہ کس آشوبِ جہاں کی رہ گزر ہے
کہ ہر نقشِ قدم ایک چشمِ تر ہے

مختصر یہ کہ باقی نے جہاں قریب قریب ہر صنفِ شعر میں مقدور بھر کامیاب کوشش کی ہے، وہاں اصنافِ سخن کی جان غزل میں بھی استادِ فیض کے فیض سے استادانہ رنگ پیدا کیا۔ حسنِ ادا، لطافتِ بیاں، روزمرہ اور محاوروں کا بے تکلف استعمال ان کی غزل کو ہم وار اور دل چسپ بنا دیتا ہے۔ کبھی وہ منفرد لفظوں کے خوش نما اجتماع سے ایک کہکشاں سی چمکا دیتے ہیں تو کبھی مکالماتی انداز اختیار کر کے شعر کے حسن کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ کہیں کہیں ان کے کلام میں رعایتِ لفظی ضلع جگت کی حدود سے جا ملتی ہے۔ جو غالباً ماحول کے تاثر اور ان کے اپنے دَور کے ایک تقاضے کی تکمیل تھی۔ حلاوتِ زبان اور شیرینیٔ بیان کے ساتھ ساتھ معاملہ بندی کا اسلوب بھی، جس سے ان کی شاعرانہ زندگی پر روشنی پڑتی ہے، قابلِ داد ہے اور یہی اسلوب ان کی جدتِ رندانہ اور قدرتِ اظہار کا شاہد ہے۔ مضمون آفرینی یا تنوعِ مضامین نہ سہی۔ پھر بھی فرسودہ و پامال موضوعات ہی کو خوبیٔ زبان و بیان سے بادی النظر میں ایسا بنا کر پیش کیا ہے کہ ان کی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے۔ شعر میں تیور پیدا کرنا کمالِ سخن کا ایک اہم جز ہے اور بڑا مشکل کام ہے۔ مگر اس مشکل کام کو بھی باقی نے آسان کر دکھایا ہے۔ مطالعۂ کلام سے صاف واضح ہوتا ہے کہ باقی نے اور اصنافِ سخن سے زیادہ غزل ہی میں اپنی زباں دانی و شیوہ بیانی کے جوہر دکھائے ہیں اور اس لحاظ سے اردو ادب کی خدمت کرنے والے حیدرآبادی سپوتوں میں باقی بھی دورِ ماضی کی ایک یادگار رہتی ہیں۔

انتخابِ کلام

ہے دگرگوں رنگ اس محفل میں خاص و عام کا
دورِ ساغر ہے نمونہ گردشِ ایام کا

چشمِ بے گوں کا تری اے ساقی! جب آتا ہے خیال
خوں رلاتا ہے مجھے محفل میں ہنسنا جام کا

دلِ پُر داغ کو میں تختۂ لالہ سمجھا
ہے مجھے کنجِ قفس ہی میں بہار اے صیاد

فانوس میں چراغ کو ایسا کہاں فروغ
دیکھو تو اس کے برقع و رخسار کی طرف

کہ مرجاؤں تری محفل سے باہر
برنگِ شمع گو کٹ جائے سر تک

کیا صیاد ظالم نے گرفتار
نہیں نکلے تھے باقی بال و پر تک

ناداں نہیں ہیں خسرو و فرہاد کی طرح
دیکھو گے تم رقیب نہیں یا ہمیں نہیں

جا کب قفس سے مجھ کو سیرِ چمن بہم ہے
کیا غم جو آشیانہ میرا نہیں چمن میں

بیٹھتا ہے مرا یوں شدتِ گریہ سے دل
جیسے بیٹھے کوئی دیوار کہیں پانی میں
آگ دیتا ہوں جگر کو دل سے حقِ ہمسایہ ادا کرتا ہوں
طائرِ رنگِ حنا کی مانند بے پر و بال اڑا کرتا ہوں
باقیؔ زار و درو غ ایک زمانہ جھوٹا
ہاں فقط آپ، جو کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

رسم بازارِ محبت کی نرالی دیکھی
چور کی طرح سے کٹتے ہیں خریدار کے ہاتھ
مجھے اشکوں کی رسوائی کا ڈر ہے
مثل ہے، گھر کے بھیدی سے خطر ہے
نہیں جب دل میں داغِ عشقِ بتاں
بخدا بے چراغ بستی ہے.

اختر شیرانی کے اساتذہ

آنانکہ وصفِ حسنِ تو تفسیر می کنند
خوابِ ندیدہ راہمہ تعبیر می کنند

ادیب الملک، شاعرِ رومان، حضرت شیرانی مرحوم کی لاہور کی زندگی، اور اس کے مختلف گوشوں، نیز ان کی رومانی و تخیلی شاعری پر تو ملک کے بڑے بڑے ادیبوں، نقادوں اور سوانح نویسوں نے سینکڑوں مقالے، تنقیدیں اور مضامین سپردِ قلم کیے۔ لیکن آج تک نہ تو ان کی ابتدائی اور تعلیمی زندگی کے حالات و واقعات کی تحقیق و تفتیش کی جانب کسی نے توجہ دی اور نہ اس بات پر کسی نے روشنی ڈالنا ضروری سمجھا کہ اس رومانی شاعر کی شخصیت کی تعمیر، اس کی ذہن کی ساخت میں کن کن معمارانِ علم و ادب کا ہاتھ رہا ہے اور اس کی پاک و صاف طبیعت نے کس کس علمی و ادبی ماحول و فضا کا اثر قبول کیا ہے نیز اس میں شاعرانہ رجحانات و ادبی ذوق نے کس طرح جنم لیا ہے۔

جہاں تک اختر شیرانی مرحوم کے حالات کا تعلق ہے اس کے ابھی بہت سے گوشے ارباب ادب اور آئمہ تنقید کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ بالخصوص ان کی ابتدائی اور تعلیمی زندگی پر تو ابھی تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا ہے اور زندگی کا یہ اہم گوشہ اب تک پردۂ خفا ہی میں ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں اختر مرحوم کی زندگی کے اسی پہلو کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ اور اُن معمارانِ علم و ادب اور عوامل و اسباب کی نشان دہی کی گئی ہے جن کو اختر کی شخصیت کی تعمیر اور ان کے ذہن کی ساخت و مزاج کی افتاد میں دخل رہا ہے۔

اختر مرحوم، ٹونک کے اس عہدِ زرّیں کی پیداوار تھے جبکہ یہاں کی فضا شعر و شاعری اور علم و ادب سے معمور تھی۔ بسمل و مضطر خیرآبادی کی نواسنجیوں کی گونج مجالسِ شعر و ادب میں باقی تھی اور یہاں کے آسمانِ شعری پر امام الشعراء حضرت کیف، اور جانشین داغ و حالی حضرتِ عاشق جیسے اساتذۂ سخن مہر و ماہ کی طرح چمک رہے تھے۔ شہر میں مختلف علمی اور ادبی حلقے قائم تھے جن میں روزانہ اربابِ ادب و اہلِ علم کی محفلیں جما کرتی تھیں۔

اختر کے والد پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کا شمار اس وقت ٹونک کے جدید تعلیم یافتہ افراد میں ہوتا تھا۔ وہ ۱۹۱۴ء میں لندن سے تعلیم پا کر لوٹے تھے اور فارسی و عربی کے نوادر و مخطوطات کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں اکثر لاہور آمد و رفت رکھتے تھے۔

پروفیسر صاحب نے جب دیکھا کہ اختر، شیرخوارگی و کم عمری کی منزل سے نکل کر اب اس منزل میں پہنچ چکے ہیں جہاں سے ان کی تعلیمی زندگی کا آغاز ہو جانا چاہیئے تو ان کو اختر

کی تعلیم و تربیت کی فکر دامن گیر ہوئی۔ رسمِ زمانہ کے مطابق ابتداً تو گھر ہی پر مختلف استادوں اور اتالیقوں کے ذریعہ ان کی ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا اور قرآن پاک، اردو، ابتدائی فارسی اور خطاطی وغیرہ کی تکمیل کے تمام مراحل گھر ہی پر طے کرائے۔ اس کے بعد ان کو شہر کی مختلف علمی درس گاہوں اور جید اساتذہ کے سپرد کیا۔

اختر کے اساتذہ کے سلسلہ میں ایک نام تو وہی آتا ہے جس کا تذکرہ خود اختر نے بھی اپنے مختلف مضامین اور رسائل کے شذرات وغیرہ میں کیا ہے یعنی مولوی محمد صابر شاکر مرحوم، جو ٹونک کے مشہور علمی خاندان کے ایک ہونہار فرد، اور محقق العلماء مولوی عبدالکریم خاں کے لائق فرزند تھے۔ فارسی زبان و ادب کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ پختہ مشق شاعر تھے۔ تہذیب و شرافت کا مجسمہ تھے اور دارالعلوم خلیلیہ ٹونک، کی درس نظامیہ عربیہ کی جماعتوں میں سے اس وقت کی منتہی جماعت کے ممتاز طالب علم شمار کئے جاتے تھے۔

مولوی محمد صابر شاکر مرحوم، نہ صرف یہ کہ اختر کو ان کے گھر پر ہی پڑھاتے تھے بلکہ وہ ان کو دن کے اکثر اوقات میں اپنے ہمراہ بھی رکھتے تھے۔ اور جب وہ خود حصولِ تعلیم کے لئے دارالعلوم خلیلیہ آتے تو اختر کو بھی اپنے ساتھ لے آیا کرتے تھے۔ اختر دارالعلوم کی عمارت میں ایک طرف بیٹھے ہوئے اسباق یاد کرتے رہتے تھے۔ دارالعلوم میں اختر کا آنا اس اعتبار سے بڑا سود مند ثابت ہوا کہ یہاں انھیں ایک ایسے گروپ کی رفاقت و دوستی حاصل ہو گئی، جو دارالعلوم کے زیر تعلیم و تربیت طلبہ میں ایک ہونہار گروپ تھا اور شہر کے علمی و اعلیٰ خانوادوں کے افراد پر مشتمل تھا۔

مولانا محمد حبیب اللہ خاں فضائی مرحوم، مولانا حکیم سید اظہر احمد برکاتی اور ابوالوفا مولانا جلال الدین (جو اس وقت نہ تو مولانا ہوئے تھے اور نہ حکیم، بلکہ کم سن طالب علم ہی تھے) اختر کے رفیق و ہمدم بنے اور یہاں کی یہ کچی شناسائی رفتہ رفتہ گہرے روابط و تعلقات میں تبدیل ہوتی گئی اور یہ سب ساتھی ایک دوسرے کے لئے اپنے دلوں میں خلوص و مودّت کے بے پناہ جذبات کو موجزن پانے لگے۔

مولانا حبیب اللہ خاں فضائی تو اختر کے استاد شاکر مرحوم کے بھانجہ ہی تھے اس لئے فطری طور پر اختر کی دلچسپی ان میں بڑھ گئی اور ساتھ ہی اس کے چوں کہ وہ اپنے ہم سبقوں میں عمر میں سب سے بڑے تھے اور علمی لیاقت و استعداد میں بھی سب میں نمایاں تھے اس لیے مولوی محمد صابر مرحوم نے بھی اختر کی رفاقت و مصاحبت کے لئے ان کو منتخب کیا۔ اس طرح مولانا فضائی، اختر کے مکان پر بھی جانے لگے اور وہاں .... اختر کے بے تکلف دوست کی حیثیت سے انھیں اسباق کی تکرار اور یادداشت میں مدد دینے لگے۔ رات دن یہ ساتھ اٹھنا بیٹھنا، پڑھنا، پڑھانا، کھیلنا، کودنا باہم قربت و اتحاد کو بڑھاتا رہا، اور اختر جو اپنے گھر کی چہار دیواری میں محصور رہا کرتے تھے۔ اس نئے ماحول اور اس نئی فضا سے آشنا و مانوس ہوئے جو علمی بھی تھی اور ادبی بھی۔

اختر مرحوم نے اپنے اس دور کے کچھ آثار و نقوش بھی دارالعلوم خلیلیہ کی دیواروں پر چھوڑے تھے جن میں سے فارسی کا یہ شعر ؎

گر ظلم و ستم کردی، گر جور و جفا کردی
اما بست بے مہرم از من نہ وفا کردی

اختر مرحوم کا قلمی باوجود مرورِ ایام، آج بھی "نوشتہ بماند سیاہ بر سفید" کے بمصداق، ایک دیوار کے گوشہ میں موجود و محفوظ ہے اور نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔

اختر کو مولوی محمد صابر شاکر مرحوم سے تقریباً ڈھائی تین سال ہی استفادہ اور تعلیم کا موقع ملا، لیکن فاضل استاد نے اس قلیل مدت میں فارسی شعر و ادب کا بہت اچھا مذاق

ان میں پیدا کر دیا، اور چوں کہ اختر خود ایک علمی خانوادے کے فرد تھے، طبیعت میں علم و ادب سے مناسبت قدرتی طور پر موجود تھی، اس لئے انھوں نے بہت جلد فارسی شعر و ادب میں مہارت پیدا کر لی اور بہت چھوٹی عمر میں نہ صرف اردو زبان میں بلکہ فارسی میں بھی شعر و سخن کی مشق بہم پہنچائی۔

۱۹۱۸ء میں جب مولانا محمد صابر شاکر نے عین عالمِ شباب میں بعمر ۳۱ سال اس جہانِ فانی سے کوچ کیا تو یہ سانحہ جہاں ٹونک کے علمی و ادبی حلقوں میں افسوس و ماتم کا سبب بنا، وہاں پروفیسر محمود شیرانی کے لئے بھی اس اعتبار سے زیادہ الم ناک و رنجیدہ ثابت ہوا کہ وہ اپنے چہیتے اور ہونہار فرزند کے ایک شفیق اتالیق اور لائق استاد سے محروم ہو گئے۔

انھوں نے اس سانحہ کو اختر کی تعلیم و تربیت کی جہت سے ایک بڑا سانحہ سمجھا، اور اب انھیں ایک نئے استاد اور اتالیق کی تلاش ہوئی، ٹونک اس وقت اہلِ علم اور اصحاب فضل و کمال سے بھرا ہوا تھا اور یہاں ایک سے ایک اعلیٰ قابلیت رکھنے والا فاضل موجود تھا۔ اس لئے انھیں اس سلسلہ میں کوئی دقت پیش نہ آئی اور انھوں نے ٹونک کے ایک دوسرے فاضل استاد، منشی احمد زماں خاں کو جن کا شمار اس زمانہ کے ماہر فارسی دانوں میں ہوتا تھا، اختر کی استادی کے لئے انتخاب کیا۔

منشی احمد زماں خاں، شرفائے ٹونک میں قدیم تہذیب اور وضعداری کے نمونہ تھے فارسی ادب میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے اور اس وقت صاحبزادہ عبدالرحیم خاں ممبر کونسل ریاست ٹونک کے کتب خانہ کے مہتمم تھے۔

یہ کتب خانہ، جو عربی، فارسی اور اردو کی نادر و نایاب کتابوں کا ایک انمول خزانہ تھا، ٹونک کے بازار علی گنج میں صاحبزادہ صاحب کی شاندار کوٹھی پر واقع تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے کتب خانہ سے استفادہ کی عام اجازت دے رکھی تھی۔ علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے خاص انتظام تھا۔

منشی احمد زماں صبح سے شام تک کتب خانہ میں کام کیا کرتے تھے اور یہاں ہی طلبا کو درس دیتے تھے۔ یہ جگہ اختر کے مکان سے بہت ہی قریب تھی۔ وہ روزانہ یہاں آ جاتے اور دن بھر یہاں رہتے۔ اسباق کا مطالعہ و تکرار اور خالی وقت میں دوسری ادبی کتابوں اور شعراء کے دیوانوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے ——

اختر کے علاوہ ٹونک کے اور دوسرے طلباء بھی اس زمانہ میں ان کے زیرِ تعلیم تھے جن میں سیّد عبید میاں، فخر الزماں خاں، محمد عمر خاں، اور پنڈت گردھر لال کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

اختر کے ساتھی پنڈت گردھر لال، جو آج کل اردو ہندی لغت کی تالیف و تدوین کے اہم کام انجام دے رہے ہیں، بیان کرتے ہیں کہ اختر اس زمانہ میں 'یوسف زلیخا' اور 'سکندر نامہ' پڑھا کرتے تھے اور وہ نہایت ذہین اور ذکی الفہم طالب علم تھے۔ ان کا حافظہ بلا کا تیز تھا، ایک مرتبہ سبق پڑھنے کے بعد پھر کتاب کھول کر نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن انھیں سبق اور اس کا مطلب خوب یاد رہتا تھا۔ وہ طالب علمی ہی کے زمانہ سے بہت اچھے شعر کہنے لگے تھے۔

منشی احمد زماں خاں کے پاس سے اختر کو چار بجے چھٹی ملتی تھی۔ بعدِ عصر ان کو کشتی اور فنِ سپہ گری سکھانے ایک سپاہی زادہ عبدالرحیم خاں نامی ان کے گھر آیا جایا کرتے تھے وہ اختر کو ورزش کراتے، لکڑی، پٹہ، بانک، بنوٹ سکھاتے اور پھر اپنے ساتھ قریب کے تالاب پر لے جاتے اور وہاں تیراکی کی مشق کراتے تھے۔

منشی احمد زماں خاں کے علاوہ اختر نے اپنے حقیقی پھوپا مولوی عبدالرحمٰن خاں سے بھی فارسی کی تحصیل کی تھی۔ مولوی صاحب اس زمانہ میں 'دربار ہائی اسکول ٹونک' کے ہیڈ مولوی تھے۔ مولوی سیّد حامد علی نقوی سابق انسپکٹر تعلیمات ریاست ٹونک کا بیان ہے کہ میں اس زمانہ میں دربار ہائی اسکول میں ٹیچر تھا، میں نے اختر کو مولوی عبدالرحمٰن صاحب سے 'شاہنامہ فردوسی'

پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اختر اسکول میں تو داخل نہ تھے لیکن ان کے اسباق پڑھنے اسکول آجایا کرتے تھے اور مولوی صاحب خالی گھنٹوں میں اسکول کی بالائی منزل کی مینڈیر پر بیٹھ کر اسباق پڑھایا کرتے تھے۔

آخر میں اختر نے جس فاضل استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا وہ منشی یوسف خاں کی سرآمدِ روزگار شخصیت تھی جو اُس دَور کے بڑے محترم اور صاحب فضل وکمال بزرگ تھے اور نہ صرف فارسی ادب میں دستگاہ کامل رکھتے تھے بلکہ عربی ادب کے بھی بڑے رمز شناس تسلیم کیے جاتے تھے اور شعر وشاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ ہندوستان کے مشہور استادِ سخن حضرت ظہیر دہلوی کے مخلص احباب میں تھے۔ استاد ظہیر اپنے ٹونک کے زمانۂ قیام میں ایک مدت تک ان کے مکان پر اقامت گزیں رہے اور ان کا پہلا دیوان یہاں ہی مرتب ہوا تھا۔

منشی یوسف خاں کا حلقۂ درس بڑا وسیع تھا۔ بہت سے لوگوں نے اُن کے علم وفضل سے استفادہ کیا ہے۔ وہ اپنے مکان میں طلبہ کو درس دیا کرتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا انداز بڑا ہی دل نشیں انداز تھا، ان کے شاگرد مولانا فضائی مرحوم اکثر کہا کرتے تھے۔ فارسی ادب کا ایسا متبحر عالم میری نظر سے نہیں گزرا۔ ایک دریا تھا جو رواں تھا، اس خوبی سے پڑھاتے کہ بغیر یاد کئے سبق ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ لغات اس عمدگی سے حل کرتے تھے کہ پھر ذہن سے نہ اترتے تھے۔ ان کو پرانے اساتذہ کے سینکڑوں عربی اور فارسی اشعار یاد تھے اور موقعہ بموقعہ بلا تامل بیسیوں اشعار پڑھتے چلے جاتے تھے۔ پڑھاتے وقت کتاب ہاتھ میں نہ لیتے تھے۔ ان کا حافظہ اس قدر صحیح و تیز تھا کہ اپنی یاد سے پڑھتے چلے جاتے تھے۔

وہ مزاج کے تیز ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے ظریف، بذلہ سنج اور لطیفہ گو بزرگ تھے۔ ان کی باتیں نہایت پُرلطف اور ان کی گپ شپ بڑی دل چسپ ہوتی تھی۔ شہر میں اُن کی ظرافت، طباعی اور بذلہ سنجی کی داستانیں اور ان کے لطیفے زبان زدِ خاص وعام نہ صرف اس زمانہ میں تھے بلکہ پرانے بزرگ آج تک ان کا ذکر کرتے اور ان سے لطف لیتے رہتے ہیں۔

پروفیسر محمود خاں شیرانی کے وہ قریبی دوست اور اسکول کے ساتھیوں میں سے تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں وہ اسکول کی کرکٹ ٹیم کے کیپٹن اور پروفیسر صاحب اچھے کھلاڑی رہے تھے۔ اسی دیرینہ دوستی و تعلق کی بنا پر پروفیسر صاحب نے آخر میں اختر کو اُن کی شاگردی میں پیش کیا اور انھوں نے اس ہونہار طالب علم کو بڑی خندہ پیشانی اور چاؤ سے قبول کیا۔ اور پروفیسر صاحب کے مشورہ سے اختر کو 'منشی فاضل' پنجاب کا کورس شروع کرادیا۔

شہر میں جب یہ خبر پھیلی کہ منشی یوسف خاں کے یہاں منشی فاضل کا نصاب ہو رہا ہے تو جن دوسرے طالبانِ علم کو اس زرّیں موقعہ سے فائدہ اُٹھانے کا خیال آیا۔ اُن میں ایک تو اختر کے پرانے رفیق مولانا حبیب اللہ خاں فضائی تھے۔ دوسرے صاحبزادہ احمد سعید خاں شوق، تیسرے مولانا جلال الدین اور چوتھے منشی یوسف خاں کے فرزند حبیب اللہ خاں تھے، جو مولانا میاں کے عرفی نام سے متعارف ہیں۔ کچھ دنوں بعد اس جماعت میں مولوی سید حامد علی نقوی اور مولوی حافظ محمد شریف خاں بھی شامل ہوگئے تھے۔

اس طرح یہ ایک بڑی اچھی اور شائستہ جماعت بن گئی تھی۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ اس جماعت کے افراد میں سے کوئی مجسٹریٹ اور جج، کوئی دینیات کا ناظم وبہترین مقرر کوئی عربی مدرسہ کا مدرس اوّل، کوئی پولیس کا افسر اعلیٰ اور کوئی تعلیمات کا انسپکٹر ہوکر نمایاں ہوگا اور کسی کی قسمت کا ستارہ اس کو آسمانِ شاعری کا 'اختر تابندہ' بنا کر چمکائے گا۔

منشی یوسف خاں یوں تو سب ہی شاگردوں کا خیال کرتے اور ان سے محبت رکھتے تھے، لیکن اختر سے اُن کی نوعمری بے پناہ ذہانت، شریفانہ اطوار اور معصوم فطرت کی وجہ سے

انھیں خصوصی تعلق خاطر تھا، وہ انھیں اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے اور صبح سے شام تک اپنے ہی پاس رکھا کرتے تھے۔ اختر کا پروگرام یہ تھا کہ وہ روزانہ صبح یہاں آجاتے اور رات کے دس گیارہ بجے تک رہتے۔ اسباق عموماً بعد مغرب ہوا کرتے تھے۔ اسباق کے بعد رات کو بھی اوڑن میں بھی یہ سب ساتھی ایک ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں اسباق کی تکرار اور بحث و مباحثہ کرتے رہتے تھے۔

اس طرح اختر کو ایک اور نئے ماحول اور نئی فضا کا تجربہ ہوا۔ کچھ اور شناسائیاں پیدا ہوئیں۔ اختر کی چونکہ صورت و سیرت دونوں پاکیزہ تھیں۔ وہ شریف اور علمی خاندان کے فرد تھے ذہین و مہذب تھے۔ اس لئے سب ہی ان سے محبّت کرتے تھے اور ان کی شہرت و مقبولیت کم عمری ہی میں ایک اچھے طالب علم کی حیثیت سے ہونے لگی تھی۔ ان کے ایک شریک درس 'مولانا میاں' کا بیان ہے۔

"داؤد (اختر) سے ملاقات کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ اس کی طبیعت بہت تیز اور اس کا دماغ بڑا باشعور ہے۔ وہ بڑے حسّاس دل کا مالک ہے۔ مہذب اور شائستہ لڑکا ہے۔ جولانی اور روانی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

میں اختر سے عمر میں تین برس بڑا تھا لیکن باوجود عمر میں بڑا ہونے کے اپنے میں وہ باتیں نہ پاتا تھا۔ اختر کی طبیعت کی تیزی اور ذوق کی پاکیزگی پر حسرت کیا کرتا تھا۔

ہمارے کورس میں نظیری، قاآنی اور دوسرے فارسی شعراء کے انتخابات بھی شامل تھے۔ جب نظیری کی غزلیں ہم پڑھتے تو محمد داؤد (اختر) سب سے زیادہ اُن سے لطف لیتے تھے۔ اور ان کی طبیعت پر ان اشعار کا کچھ ایسا اثر ہوتا کہ وہ بے اختیار جھومنے لگتے۔ وہ کہتے یہ شعر کس غضب کا ہے۔ اس شعر میں بلا کی تاثیر ہے۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ گنگناتے بھی رہتے تھے۔

میں ان سے کبھی کبھی دریافت بھی کر لیا کرتا تھا کہ داؤد! یہ تم کیا ہر وقت گنگناتے رہتے ہو۔ وہ اس کے جواب میں نظیری کا کوئی شعر پڑھ دیا کرتے تھے اور کہتے تھے مجھے نظیری کے اشعار بڑے اچھے لگتے ہیں اور ان کو گنگنانے میں بڑا ہی لطف آتا ہے۔ والد کے سامنے بھی وہ اس طرح کے جذبات کا کبھی نہ کبھی دبی زبان سے اظہار کر دیا کرتے تھے۔ نظیری ہم بھی پڑھتے تھے لیکن مجھے اس میں ایسا کوئی خاص لطف محسوس نہ ہوتا تھا اور نہ میں اس کے اشعار سے اتنا متاثر اور لذّت گیر ہوتا تھا۔"

('اختر شیرانی کا بچپن' پیام مشرق اکتوبر ۱۹۶۲ء)

درس و تدریس کا یہ سلسلہ ۱۹۲۱ء تک جاری رہا۔ ان دنوں ٹونک میں 'مادھے والی' کا افسوس ناک واقعہ پیش آگیا۔ اس نے جہاں شہر کی دوسری علمی اور ادبی مجلسوں کو درہم برہم کیا وہاں منشی یوسف خاں کی اس تعلیمی بساط کو بھی الٹ کر رکھ دیا۔ پروفیسر محمود خاں شیرانی نقل سکونت کر کے لاہور چلے گئے اور وہاں انھوں نے اورنٹیل کالج لاہور میں فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے اپنی افادی زندگی کا آغاز کیا۔ اختر بھی ان کے ساتھ لاہور روانہ ہوئے۔ مولانا فضائی نے قید و بند کے مصائب جھیلنے کے بعد اجمیر کو مسکن بنایا اور صاحبزادہ احمد سعید خاں شوق نے دلّی کا رُخ کیا۔ اس طرح یہ سب ساتھی تتر بتر ہو گئے۔

لاہور پہنچنے کے بعد اختر نے اورنٹیل کالج لاہور میں داخلہ لیا اور منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اس کے بعد ان کا تعلیمی سلسلہ ختم ہو گیا اور ان کی ادبی، شعری اور صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔

۱۹۰۵ء اختر کا سنِ پیدائش ہے اور ۱۹۴۸ء سنِ وفات۔ بیالیس تیالیس کی عمر میں اختر نے شعر و ادب میں جو بے مثال کارنامے انجام دئے اور رومانی شاعری میں جو لازوال شہرت حاصل کی ہے وہ ہمیشہ اردو ادب کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھی جائے گی۔

چوتھے پلان کا مسودہ

جولائی تک تیار ہو جانے کا امکان

منصوبہ بندی کے مرکزی وزیر شری بی۔ آر بھگت نے منصوبہ بندی کمیشن سے متعلق پارلیمنٹ کی غیر رسمی مشاورتی کمیٹی کو بتایا کہ ذرائع سے متعلق کمیٹی کے سوائے قومی ترقیاتی کونسل کی تمام کمیٹیاں اپنا کام قریب قریب ختم کر چکی ہیں اور چوتھے منصوبے کے مسودے کی تیاری میں ان کی سفارشات کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ انھیں توقع ہے کہ مسودہ جولائی تک تیار ہو جائے گا اور قومی ترقیاتی کونسل کی طرف سے اس کی منظوری کے بعد اسے پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ پارلیمنٹ کو اپنے سرمائی اجلاس میں اس مسودے کو زیر بحث لانے کا موقع حاصل ہوگا۔

کمیٹی کی میٹنگ شری بھگت کی زیر صدارت منعقد ہوئی اور اس میٹنگ میں چوتھے پنج سالہ منصوبے کی تجاویز پر بحث کی گئی۔

یہ تجویز پیش کی گئی کہ بہتر ہوگا کہ منصوبہ بندی کمیشن ہر برس نومبر میں منصوبوں کے بارے میں ایک ترقیاتی رپورٹ پیش کرے جس میں پیش رو مالی سال کی ٹھوس کامیابیوں پر روشنی ڈالی گئی ہو۔

کمیٹی سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر وی۔ کے۔ آر وی راؤ نے کہا کہ ۱۹۶۴-۶۵ء میں غلے کی پیداوار میں ۹ کروڑ ۷۰ لاکھ ٹن کا اضافہ یعنی گذشتہ برس کی پیداوار سے تقریباً ۷۰ لاکھ ٹن زیادہ پیداوار اچھے موسم کے علاوہ بیشتر منظم کوششوں کا نتیجہ تھا۔

چوتھے پلان میں زراعت میں سالانہ پانچ فی صد ترقی کی رفتار کے نشانے کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر راؤ نے یہ امید ظاہر کی کہ ۱۹۷۰-۷۱ء تک پیداوار میں تقریباً ۲۵-۲۹ فی صد یا تقریباً دو کروڑ ٹن مزید خوراک کا اضافہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اس کے لئے تقریباً ۱۰ لاکھ ٹن کھاد کی ضرورت ہوگی۔ جس کے بارے میں پہلے ہی منصوبہ بنایا جا چکا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ترقی کی اس رفتار کے حصول کے لئے پانی، کھاد اور بیجوں کی کافی مقدار میں فراہمی ضروری ہے۔

نئی کتابیں

ہند میں زراعت جلد اوّل

ناشر انڈین اکیڈمی - ۲۹ نریندرا پیلس نئی دہلی

اصل کتاب انگریزی میں ہے - لیفٹیننٹ کرنل اے بی اگروال صاحب نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے تقطیع ۲۲×۱۸ صفحات ۴۲۲ کاغذ، کتابت، طباعت نہایت عمدہ - کتاب نہایت خوب صورت جلد اور جلد پوش سے مزین ہے۔ بہت سی بلاک کی تصویریں بھی شامل کتاب ہیں - یہ کتاب دراصل تین جلدوں پر مشتمل ہوگی - دوسری جلد میں فصلوں اور تیسری میں حیوانات کا ذکر ہوگا - کتاب کی قیمت ۳ روپیہ ہے - اردو میں اس موضوع پر غالباً یہ پہلی کتاب ہے - اردو میں سائنس اور اس قسم کے موضوعات پر اچھی کتابیں بہت کم ہیں۔ یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کی طرف ایک اہم قدم ہے - ہم ناشرین کو اس کتاب پر مبارک باد پیش کرتے ہیں - اتنی خوبصورت کتاب اتنی کم قیمت پر دینا بڑی ناشرانہ ہمت کا کام ہے -

دلّی سے دلّی تک

انشائیے، خاکے اور رپورتاژ - مصنف سیّد ضمیر حسن لکچرر شعبۂ اردو، دلّی کالج، دلّی - ناشر مکتبہ انجمن ترقیٔ اردو اردو بازار دہلی - صفحات ۱۳۶ - کاغذ، کتابت، طباعت جلد، جلد پوش اوسط سے اچھے - قیمت ۲ روپیے ۵۰ پیسے - تعارف پروفیسر سیّد احتشام حسین نے اور ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے - اس کتاب کے مصنف دلّی والے ہیں اور بقول آغا شاعر قزلباش

ہمیں ہیں موجب باب فصاحت حضرت شاعر
زمانہ سیکھتا ہے ہم سے ہم وہ دلّی والے ہیں

ضمیر حسن صاحب بھی خالص دہلوی ہیں - ان کا انداز بیان خالص دلّی کا ہے - انھوں نے یہ انشائیے اور خاکے ٹھیٹھ اردو میں لکھے ہیں - ہمیں امید ہے کہ اگر انھوں نے لکھنا جاری رکھا تو وہ قاضی سرفراز حسین اور ناصر نذیر فراق، مرزا فرحت اللہ بیگ اور ان کے بعد آغا حیدر حسن شاہد احمد دہلوی اور مرزا محمود بیگ کی صف میں کھڑے ہونے کا فخر حاصل کریں گے۔

گلبانگ

سحر عشق آبادی کے کلام کا مجموعہ - صفحات ۱۲۸ - کاغذ، کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش اوسط - قیمت تین روپے -

سحر عشق آبادی مشہور ماہر عروض ہیں - اپنی اس عروض دانی کا کمال انھوں نے اس مجموعے میں بھی دکھایا ہے - ان کی شعر گوئی کی پشت پر ان کا علم ہے - اس مجموعے میں ان کی بہت سی رباعیاں بھی شامل ہیں جن کا موضوع اکثر فلسفہ اور اخلاقیات ہے - ہمیں امید ہے کہ اہل نظر اس مجموعے کی قدر کریں گے - ملنے کا پتہ: سنگرام پبلشرز

- گوبند پورہ دلی ۳۱-

جامعہ کی کہانی (حصہ اوّل)

مصنف عبدالغفار مدھولی - ناشر مکتبۂ جامعہ - جامعہ نگر نئی دہلی - صفحات ۴۹۶ - کاغذ، کتابت، طباعت، جلد، جلد پوش عمدہ - قیمت ۱۰ روپے۔

جامعہ کی یہ کہانی ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک یعنی ۲۷ سال پر مشتمل ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ایک ایسی درس گاہ ہے جس کے قائم کرنے والوں میں وہ ہستیاں شامل ہیں جن کا ایثار اور صبر و استقلال ہزار داد کے قابل ہے۔ اس کو چلانے والے قربانی کے مجسمے تھے اور ہیں۔ انھوں نے ذاتی ایثار اور ترکِ ہوس کی وہ مثال پیش کی ہے کہ باید و شاید۔ ہماری تحریکِ آزادی میں جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ نے بڑا نمایاں حصہ لیا ہے اور اب تعمیرِ وطن میں وہ ایسے ہی کارہائے نمایاں کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ جامعہ کی یہ کہانی ہر شخص کے لئے لطف کا سامان پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ جہد و عمل کا درس بھی ثابت ہوگی۔

شیشہ و تیشہ

مرتب مجتبیٰ حسن - پبلشر آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی حیدرآباد - قیمت تین روپیے۔

مقدمہ مخدوم محی الدین نے لکھا ہے۔ شاہد صدیقی بلا کے ذہین، بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے لیکن ان کی تمام صلاحیتیں نذرِ مے و مینا ہوگئیں اور وہ وقت سے بہت پہلے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کی پاکیزہ غزل گوئی کے سب قائل ہیں لیکن طنز نگاری میں بھی انھوں نے جو تخلیقات چھوڑی ہیں وہ کسی طرح کم معیاری نہیں۔ مرتب نے بڑا کام کیا کہ شاہد کی طنزیہ نثر و نظم کا انتخاب کرکے اس کو شائع کر دیا۔ یہ انتخاب مختلف اخباروں بالخصوص روزنامہ سیاست سے کیا گیا ہے۔

مثنوی سحرالبیان

ایک تہذیبی مطالعہ - مصنفہ رضیہ سلطانہ - پبلشر کتاب بھون ۱۲۱۴ کلاں محل دہلی - قیمت چار روپے۔

مثنوی میر حسن المعروف سحرالبیان محض ایک تفریحی مثنوی ہی نہیں بلکہ اس زمانے کا تہذیبی اور سماجی نقشہ پیش کرتی ہے۔ اس کتاب میں مصنفہ نے اس مثنوی کے مختلف پہلوؤں مثلاً کردار نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری اور تقریبات وغیرہ پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ کتاب کے آخر میں کتابیات کی فہرست درج ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنفہ نے بڑی محنت سے اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔

من سمجھاون

از ڈاکٹر عبدالستار دلوی تقطیع ۱۸×۲۲/۸ - ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳ - ضخامت ۹۶ صفحے قیمت دو روپے پچیس روپے۔

دکن کے صوفی شاعر شاہ نواب چشتی نے مرہٹی شاعر رام داس کی مشہور نظم مناچے شلوک کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کے باب میں حیدرآباد سے ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ایک اچھی کتاب مرتب کرکے شائع کی ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے بھی محنت سے من سمجھاون کا متن، فرہنگ اور اس کتاب سے متعلق اپنا تنقیدی نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔

سفینہ چاہیئے

مرحوم شاد عارفی کے کلام کا مجموعہ - قیمت تین روپے۔

شاد عارفی بڑے طباع، طنز نگار اور صاحبِ فن شاعر تھے۔ ان کی طنز نگاری میں سب سے قابلِ داد عنصر ان کی بے باکی ہے۔ ان کی نظموں کے عنوانات رت جگا، دیہاتی لاری، ہلالِ عید، گنگا اشنان وغیرہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زندگی کے روزمرہ واقعات کو سامنے رکھ کر طنز کا پہلو نکال لیتے اور بے باکی سے اسے شعر کا جامہ پہنا دیتے۔ شاد زندگی بھر عسرت کا شکار رہے لیکن ان کے فکر کا انداز کبھی افلاسِ ذہن کا شکار نہ ہوا اور ان کے نشتر کی تیزی میں کبھی کمی نہ آئی۔ ان کی شاعری کیا تھی خود ان کی زبان سے سنیئے۔

چند کرتیاں کی محفل میں سب گونگے بہرے ہیں بیٹھے
ہاتھوں پہ شکنیں پڑتی ہیں جب سچی سچی کہتا ہوں
اس شاد میں اکثر شعروں میں آشاد میں اکثر نظموں میں
دنیا پہ صادق آتی ہے جب اپنے جی کی کہتا ہوں

تلگو افسانے

بیس تلگو افسانوں کا یہ مجموعہ آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ مترجم ہیں واسترجی صاحب ہندوستان کی دوسری زبانوں سے اردو میں اکثر ترجمے ہو رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ تلگو افسانوں کا یہ مجموعہ دنیائے اردو میں مقبول ہو گا۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔

نقشِ جاوداں

پرنس نقی علی خاں ثاقب کے کلام کا مجموعہ۔ کتاب حسین جمیل چھپی ہے۔ قیمت تین روپے۔

ثاقب شعر کے میدان میں دس سال سے گام زن ہیں۔ ان کی مشقِ سخن پروان چڑھتی نظر آتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کا ذوقِ سخن پاکیزہ سے پاکیزہ تر ہوتا جائے گا۔

ناشر نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد۔۲ (اے پی)

چند ادبی مسائل

از پروفیسر شاہ مقبول احمد۔ ناشر مکتبۂ منّم۔ سبزی باغ پٹنہ ۴۔ قیمت دو روپے۔

شاہ مقبول احمد صاحب مولانا آزاد کالج کلکتہ کے شعبۂ اردو سے متعلق ہیں۔ ان کے مضامین کا یہ مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے اس میں بہار کی عام زبان اور اس کے محاورات سے متعلق مضامین خاص طور سے قابلِ مطالعہ ہیں۔

متاعِ ادب

مرتبہ اظہر زیدی۔ ناشر بشیر احمد چودھری۔ مکتبہ میری لائبریری، چوک مینار لاہور ۸۔ قیمت ۲ روپے ۲۵ پیسے۔

اس کتاب میں جملہ اصنافِ سخن کی تاریخ کا تذکرہ ادبا کی قلمی تحریریں اور جملہ علوم پر اردو کتب کا تفصیلی جائزہ درج ہے۔

سرودِ وقت

محمد فضل الرحمٰن صاحب حیدرآباد کے معروف شاعر اور ادیب ہیں۔ ان کی نظموں کے دو مجموعے 'دھوپ چھاؤں' اور 'نقشِ حیات' بیس برس کے قریب عرصہ ہوا شائع ہوئے تھے۔ یہ کتاب ان دونوں کا مجموعہ انتخاب ہے۔ اس مجموعے میں سائنسی موضوعات پر بھی نظمیں ہیں، مناظرِ قدرت پر بھی اور وطنی آزادی پر بھی۔ فضل الرحمٰن صاحب فکر و فن کے لحاظ سے نئی دنیا کے شاعر ہیں۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی حیدرآباد (اے۔ پی)

موصولات

رہنمائے کتاب داری۔ مصنف غلام رسول۔ ناشر۔ قیمت تین روپے
رہنمائے اردو۔ مرتبہ غلام ربانی۔ قیمت دو روپے
حیدرآباد کے ادیب حصہ اول۔ قیمت غیر مجلد ۴ روپے۔
حیدرآباد کے ادیب حصہ دوم۔ قیمت درج نہیں۔
حیدرآباد کے شاعر۔ حصہ اوّل۔ قیمت غیر مجلد ۴ روپے
حیدرآباد کے شاعر۔ حصہ دوم۔ قیمت غیر مجلد ۵ روپے

یہ کتابیں آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی نے اچھے اہتمام سے شائع کی ہیں اور نظم و نثر کے اچھے تذکروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جوہرِ سخن بدھ پرکاش گپتا جوہر دیوبندی کے کلام کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔
کتاب مصنف سے انصار روڈ سہارن پور کے پتے سے مل سکتی ہے۔





Edited and published by the Director, Publications Division, Old Secretariat, Delhi-6
Printed by the Union Printers Co-op. Industrial Society Ltd., Karol Bagh, New Delhi-5

Regd. N